حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ
کی
سیاسی ڈائری
اخبار و افکار کی روشنی میں
جلد دوم
۱۹۱۹ء تا اختتام ۱۹۳۹ء
عطا فرمودہ
جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی
تالیف و تدوین
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کی

سیاسی ڈائری

اخبار و افکار کی روشنی میں

جلد دوم

۱۹۱۹ء تا اختتام ۱۹۳۹ء

شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کی

سیاسی ڈائری

اخبار و افکار کی روشنی میں

جلد دوم

۱۹۱۹ء تا اختتام ۱۹۳۹ء

عطا فرمودہ

جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی مدظلہ العالی

(استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیت علماء ہند)

تالیف وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

باہتمام: محمد ناصر خان

فرید بُکڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

New Delhi - 110002

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی
سیاسی ڈائری
(جلد دوم)

تالیف وتدوین.................... ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

باہتمام.......... محمد ناصر خان

صفحات.......... 922

اشاعت.......... 2018ء

Maulana Sayyad Hussain Ahmad Madani (R.A.) Ki
Siyasi Diary
Akhbâr wa Afkâr Ki Roshni Mein
(Vol. 2)

Compiled by : Dr. Abu Salman Shahjahanpuri
Edition : 2018
Pages : 922
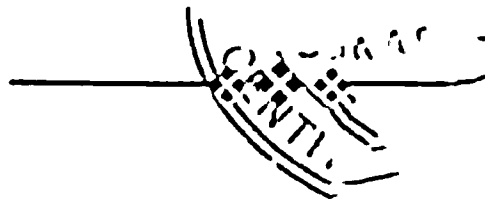
ناشر
فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FBD FARID BOOK DEPOT(Pvt.)Ltd.
2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Ph.: 011-23289786, 23289159 Fax: 011-23279998
E-mail: faridexport@gmail.com | Website: faridexport.com
Printed at : Farid Enterprises, Delhi-2

عرض ناشر

بحمد اللہ، ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) قرآن حکیم، احادیث مقدسہ، اسلامی تاریخ، فقہ، تبلیغی، اصلاحی، ادبی اور دیگر علوم وفنون پر اہم کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے پورے عالم اسلام میں مشہور ومقبول ہے۔ ادارہ کی اس نمایاں کامیابی میں اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت ونصرت اور بانی ادارہ خادم قرآن الحاج محمد فرید خاں مرحوم کا دینی وملی خلوص اور دعائیں شامل ہیں جنھوں نے قرآن مجید اور دینی لٹریچر کی اشاعت کو غیر منفعتی تبلیغی مشن کے طور پر جاری کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بانی ادارہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخِ آزادی علمائے دیوبند کے بے مثال جذبۂ حریت اور جہدِ مسلسل سے روشن ہے۔ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہم اللہ کے جانشین عظیم مجاہد آزادی شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی کی ذاتِ گرامی اسلامی ہند کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ زیر نظر کتاب **''حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری: اخبار وافکار کی روشنی میں''** شیخ الاسلامؒ کی حیات، علمی، دینی وملی خدمات اور وطن کی آزادی میں عدیم المثال قیادت کی مستند و معتبر دستاویز ہے جسے نامور اسلامی دانشور حضرت مولانا ابوسلمان شاہجہانپوریؒ نے مدوّن کیا ہے۔

ادارہ فرید بک ڈپو کو بجا طور پر فخر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں اکابرینِ جمعیۃ علماء ہند کی یاد میں ان شاہکار کتابوں کو شائع کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ 'چراغِ مدنی' اسی آب وتاب سے روشن رہے اور دار العلوم دیوبند و جمعیۃ علماء ہند ملتِ اسلامیہ کی خدمت، حفاظت اور قیادت کی شاہراہ پر پیش رفت کرتے رہیں۔ آمین۔

خادم قرآن

(الحاج) **محمد ناصر خان**

بسم الله الرحمن الرحیم

درود شریف
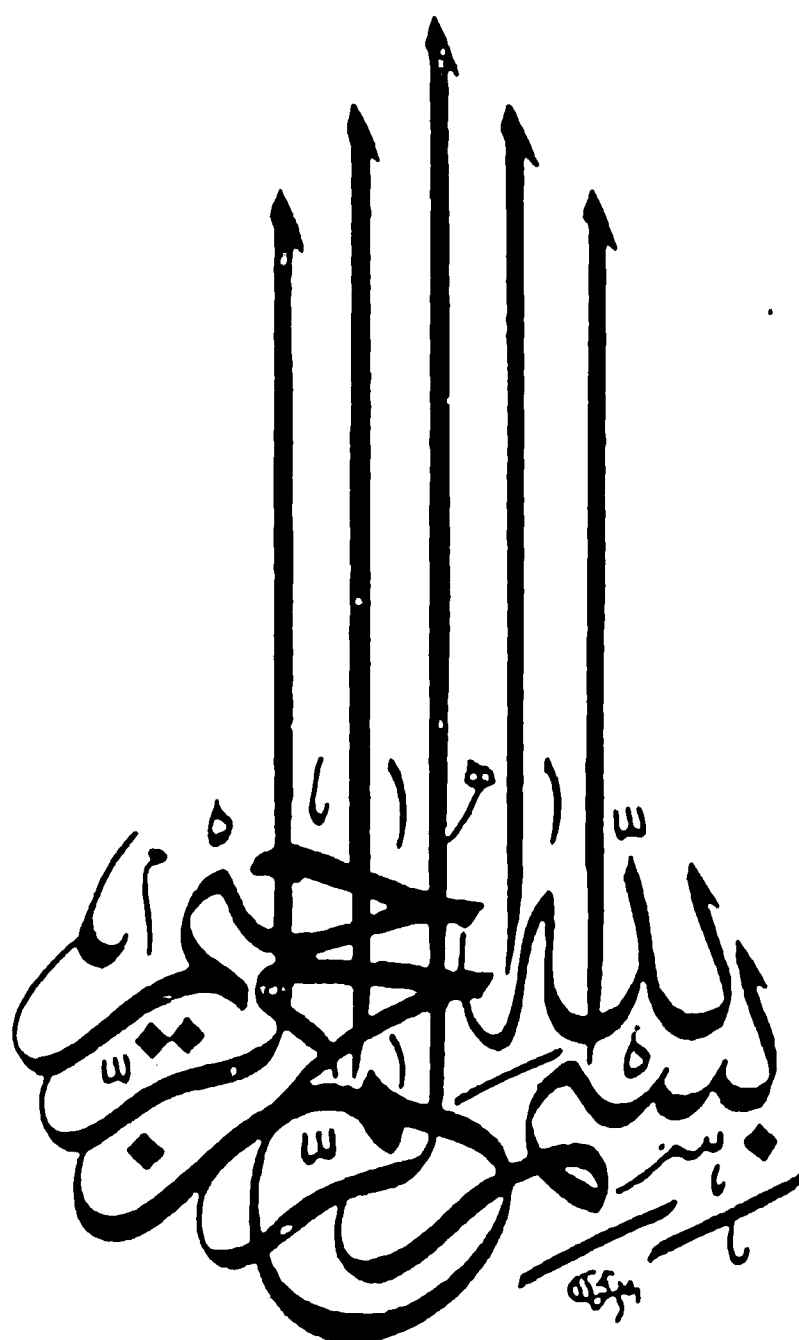
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی
اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ، اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی
مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ
وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ○

کلماتِ شریف

۱۹۸۷ء میں جمعیۃ العلماء ہند نے دہلی میں ''شیخ الاسلام سمینار'' منعقد کیا تھا' اس میں ہند و پاک کے اہل علم و قلم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ پاکستان سے جن کو شرکت کرنی تھی ان میں سے ایک جناب ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہان پوری بھی تھے' لیکن سرکاری ملازمت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس کا تدارک ڈاکٹر صاحب نے اس طرح کیا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی سیاسی خدمات پر مضامین یک جا کیے اور ایک جلد میں اسے ''شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی'' ...... ایک سیاسی مطالعہ'' کے عنوان سے شایع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے وقت ''مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ پاکستان' کراچی'' کی بنا پڑی۔

اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں سے یہ تھا کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی شخصیت' آثار علمیہ' افکار و افادات' ملی اور قومی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق اور تصنیف کا کام انجام دیا جائے۔ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس میں کام یابی بھی ہوئی اور خانوادۂ حضرت شیخ الاسلامؒ کا اعتماد بھی حاصل رہا۔ اس سلسلے کی سب سے اہم تالیف ''حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری'' ہے' جس کی یہ دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ تقریباً پندرہ سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اس کی تالیف کے لیے محترم ڈاکٹر صاحب نے انجمن ترقی اردو کی ملازمت چھوڑی۔ جامعۂ کراچی کے امتحانی پرچے بہ طور ممتحن چیک کرتے تھے' اس سے سبک دوشی حاصل کی' اور مزید یہ کہ پاکستان کے طول و عرض کے طویل طویل سفر بھی کیے اور کئی مرتبہ کیے۔ جہاں قدیم لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ ایسا ہی کٹھن سفر ایک مرتبہ سندھ کے علاقے مسن وڈی کا کیا۔ جو ٹنڈو الہ یار سے آگے ہے۔ مسن وڈی گاؤں میں ایک لائبریری ہے' وہاں جو رسائل و اخبارات ملے انھیں فوٹو اسٹیٹ کرانے کے لیے دو ڈھائی گھنٹے بس

میں کتابوں کے بوجھ کے ساتھ سفر کرتے اور بس میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ ان کے مال مویشی بھی ساتھ ہوتے تھے۔ میرپورخاص جاتے اور وہاں فوٹو اسٹیٹ بنواتے اور شام کو پھر مسن وڈی آتے۔ میرپورخاص میں ایک عمدہ فوٹو اسٹیٹ والا تھا۔ اس سے مطلوبہ صفحات فوٹو کراتے اور اگر اس سے کوئی اور کام کرانے آگیا تو کھڑے رہتے۔ اسی طرح شام کو مسن وڈی جاتے اور اگلے دن پھر آتے۔ کئی کئی دن اس عظیم کتاب کے مآخذ کی تلاش میں لگے۔

جب اس کتاب کا مسودہ تیار ہوگیا تو ہمارے گھر قاری منزل میں ۲ر جنوری ۲۰۰۱ء کو ایک اجلاس مجلس یادگار شیخ الاسلام کا ہوا۔ حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی مدظلہٗ نے مسودات کا جائزہ لیا اور طے پایا کہ اب یہ کمپوزنگ اور طباعت کے مراحل کے لیے دی جائے۔ حضرت مولانا کی ہدایت کے مطابق اس کی کمپوزنگ کرائی گئی اور الحمد للہ! اس کی اب دوسری جلد بھی چھپ کر تیار ہوگئی۔ خدا کرے کہ باقی بھی جلد چھپ جائیں اور یہ عظیم تاریخ حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا ارشد صاحب مدظلہٗ کی سرپرستی میں لوگوں کے سامنے آجائے۔

اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائے اور عبرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے۔ آمین

قاری شریف احمد غفرلہٗ
صدر مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ پاکستان، کراچی

۸ر رمضان المبارک ۱۴۲۴ھ
۴ر نومبر ۲۰۰۳ء

حرفِ چند

الحمدللہ! حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری کی جلد اول شائع ہوگئی۔ اگر چہ جب تک آٹھ جلدوں میں اس کی اشاعت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے، اطمینان کی لذت سے قلب آشنا نہیں ہوسکتا لیکن اس سلسلے کا آغاز اور اس کی جلد اول کی اشاعت بھی ایک سادہ زندگی میں رنگین اور خوش گوار صبح کے نمود کی لذت کا حکم رکھتی ہے۔

پہلی جلد کی اشاعتِ عام کے لیے حضرت مخدومی قاری شریف احمد صاحب دامت فیوضہم اور احباب خاص کی رائے تھی اور اس میں خاکسار مؤلف کی رائے بھی شامل تھی اور اسی کے مطابق فیصلہ یہ ہوا کہ کم از کم دو جلدوں کی تکمیل سے تقریبِ اشاعت کا آغاز کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو حضرت شیخ الاسلام کے مقالاتِ سیاسیہ کی جلد بھی شائع کردی جائے۔ چناں چہ اس کا انتظام کرلیا گیا۔ بہ ظاہر کوئی امر مانع نہ تھا لیکن اندازہ یہ ہوا کہ مؤلف کے صبر کا اصل امتحان کتاب کی تالیف و تدوین کے بعد شروع ہوتا ہے۔ بعد کے مراحل میں ایسی رکاوٹیں پیش آجاتی ہیں جن کا پہلے سان گمان بھی نہیں ہوتا اور ان پر مؤلف کا کوئی بس نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آگے کا ہر کام رک جاتا ہے تا ایں کہ وہ رکاوٹ دور نہ ہو جائے۔ اس لیے یہ وعدہ تو نہیں کیا جاسکتا کہ ڈائری کی دوسری جلد کے ساتھ ہی مقالات سیاسیہ کی ایک جلد بھی آجائے گی لیکن امید ہے کہ ان شاء اللہ ایک ماہ سے زیادہ منت کش انتظار نہ ہونا پڑے گا۔

اگر چہ پہلی جلد ابھی تک کسی عزیز و مخلص کی نظر سے نہیں گزری، اس لیے اس کے مندرجات و مشمولات سے اور اندازِ تالیف و تدوین کے بارے میں کوئی ناقدانہ رائے سامنے نہیں آئی، لیکن

ا۔ اس منصوبے کے بارے میں تکمیل کے گذشتہ پندرہ برسوں میں احباب و واقفین سے مختلف اوقات میں جو تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ہے اور خاکسار نے ہر مفید مشورے اور صائب رائے کی جس طرح پذیرائی کی ہے، اس سے کسی واقف و مخلص کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ

ڈایری میں کیا کچھ ہوگا، اس کی پیش کش کے لیے کیا اسلوب اختیار کیا گیا ہوگا اور اس کا دایرہ کس حد تک وسیع ہوگا؟

۲۔ خاکسار نے اس کی تالیف وتدوین اور مشمولات کی ترتیب میں اور اس کے دایرۂ کار اور وسعت وجامعیت کے بارے میں جو اصول پیش نظر رکھے تھے اور جن کا اظہار خاکسار نے ڈایری کی پہلی جلد کے مقدمے میں کیا ہے۔ اس کا مسودہ چوں کہ ایک علمی جریدے میں چھپوا دیا تھا۔ اس کا ردعمل خاکسار کے لیے بہت ہمت افزا ثابت ہوا۔ بعض کرم فرماؤں نے اپنے مشوروں سے نوازا۔ خاکسار نے ان مشوروں کی روشنی میں دوسری اور تیسری جلدوں پر فی الفور نظر ڈالی اور جہاں تک ممکن ہوسکا، ان مخلصین کے مشوروں سے استفادے میں کوتاہی نہیں کی۔ ان مشوروں کی روشنی میں نظر ثانی کی اہمیت کا اندازہ وہ حضرات فوراً کرلیں گے جو پہلی جلد کے بعد دوسری جلد پر ذوق وتجسس کی نظر ڈالیں گے۔

۳۔ مختلف اوقات میں مجھے اپنے دوستوں اور اصحاب ذوق سے جو مشورے حاصل ہوئے، جو میرے لیے چراغ ہدایت ثابت ہوئے اور جن کی روشنی میں ڈایری کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اس کی اشاعت میں جو واضح اور بیّن خامیاں یا غلطیاں درآئی ہیں، انھیں نظر انداز کرکے حضرت مخدوم ومکرم مولانا سید محمد اسعد مدنی دامت برکاتہم جانشینِ حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ نے جس خاکسار نوازی اور ذرہ پروری کا ثبوت دیا اور جس طرح ہمت افزائی اور تحسین فرمائی وہ میری محنت کے لیے بہت بڑی داد اور اس کام کا بڑا صلہ ہے۔ میرے لیے حضرت امیر الہند دامت برکاتہم کی خوشنودی طبع فخر کی پونجی اور بہت بڑی متاع ہے۔ اس عنایت کے لیے خاکسار مؤلف حضرت عم فیوضہم کا بہ صمیم قلب شکر گذار ہے۔

پہلی جلد میں کاپیوں کی جڑائی میں جو بعض غلطیاں ہوگئی ہیں اور اندراجات کی تاریخوں کے صفحاتِ کئی جگہ پر آگے پیچھے ہوگئے ہیں۔ اس کے لیے سخت شرمندہ ہوں۔ اگرچہ قارئین کرام دیکھیں گے کہ ڈایری کے واقعات وحوادثِ زیر بحث ونظر اور تواریخ کے ذیل میں ہر اندراج اور خبرو نظر کا ہر پارہ ایک مرصع غزل کے شعر کی طرح اپنی مستقل حیثیت، خاص قدر وافادیت اور جدا معنویت رکھتا ہے۔ ان کی کوئی ترتیب بدل دی جائے تب بھی ان کی معنویت متاثر نہیں ہوسکتی لیکن

بہتر تو یہی تھا کہ یہ غلطی واقع نہ ہوتی اور قارئین کرام کے تکدرِ خاطر کا کوئی موجب اور طبع کی گرانی کا کوئی سبب پیدا ہی نہ ہوتا۔ بہ ہر حال یہ اَن ہونی ہوئی اور خاکسار کو شرمندہ اور معذرت خواہ ہونا پڑا۔

کاپی جوڑتے ہوئے کتاب کے صفحات کو کلپ لگا کر جیسے کہ سامنے رکھ لیا جاتا ہے، رکھ لیا گیا تھا۔ لیکن کاپی جوڑنے والے صاحب صفحات کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی ترتیب کا خیال نہ رکھ سکے اور بعض صفحات یا مجموعے آگے پیچھے ہو گئے خبروں اور واقعات کی تاریخوں کی ترتیب پر بھی نظر نہ گئی اور بعض مقامات پر اندراجات میں تاریخی ترتیب قائم نہ رہ سکی۔ مثلاً

۱۔ صفحہ ۳۴۰ کے بعد ۴۸ صفحوں کا مجموعہ الگ ہو گیا اور اگلے سو ڈیڑھ سو صفحوں کی کاپیاں جوڑی جا چکیں تو غلطی کا پتا چلا۔ اب اس کا علاج اس کے سوا کچھ نظر نہ آیا کہ ان صفحات پر ۳۴۰/۱ تا ۳۴۰/۴۸ ڈال کر اس جگہ شامل کر دیے جائیں۔ ان صفحات کی شمولیت کے بعد صفحہ ۳۴۱ سے آگے کاپیاں جڑی ہوئی تھیں۔ ان کے نمبروں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

۲۔ اسی قسم کی غلطی صفحہ ۴۵۲ کے بعد چند صفحوں میں وارد ہوئی ہے۔

یہ غلطیاں تو کاپی جوڑنے کے دوران علم میں آ گئیں اور ان کا حل بھی دریافت کر لیا گیا۔ بعض غلطیاں طباعت کے بعد علم میں آئیں اور ان کے تدارک کا مناسب وقت گزر چکا تھا۔ مثلاً:

۳۔ صفحہ ۱۵۴ (اندراج: آریہ سماج) تا صفحہ ۱۵۶ (حوالہ: ۱۲/اکتوبر ۱۸۷۹) کے حوالے صفحہ ۵۲۳ پر درج ہونا چاہیے تھے۔

۴۔ صفحہ ۳۴۱ (دلی کا محاذ: ۵/جولائی ۱۸۵۷ء تا صفحہ ۴۵۲/۳) کے بعد کے ۱۱۵ صفحات کی صحیح جگہ صفحہ ۱۴۳ کے بعد تھی۔ لیکن صفحات کا یہ مجموعہ اپنی جگہ سے الگ ہو گیا اور ۳۴۱ صفحات کی کاپیاں جوڑنے کے بعد سامنے آیا اور وہیں انھیں پیسٹ کر دیا گیا۔ اور جب ڈائری چھپ گئی تو غلطی کا پتا چلا۔

۵۔ صفحہ ۴۵۳ پر عنوانِ صفحہ ''۱۸۵۷ء'' ہے، نہ کہ ''۱۸۷۵ء'' اس سے کیسے انکار کر سکتا ہوں کہ یہ سہو میرا ہے! پروف ریڈنگ میں نظر چوک گئی!

اسی قسم کی بعض اور مقامات پر بھی غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔ اگرچہ خاکسار ان سب کا خود کو ذمہ دار نہیں سمجھتا، لیکن میری عذر خواہی سب کے لیے ہے۔

امید ہے قارئین کرام میرے لیے عفو و کرم کو کام میں لائیں گے اور دعائے خیر فرمائیں گے۔

لیکن پہلی جلد میں اس گنہ گار سے ایک ایسی غلطی بھی سرزد ہو چکی ہے، جس کے لیے کوئی عذر اور کوئی معافی نہیں۔ اگر عفو و درگذر کے لیے امید کی کوئی کرن ہے تو صرف یہ کہ وہ جس رؤف و رحیم کے نام لیوا، جس دامنِ رحمتِ عامہ سے وابستہ اور جس صاحبِ عفو و کرم کے دامن گیر ہیں، اُس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو فتح مکہ کے روز اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی کمال اختیار و بس کے عالم میں لاتثریب علیکم الیوم کا اعلان فرما دیا تھا۔ بلکہ حضرت ابوسفیان جو اس وقت تک ایمان نہ لائے تھے اور یوم احد کے تمام تر مصائب و آلام کے موجب ہوئے تھے، خانہ کعبہ کے ساتھ ان کے گھر کو بھی دشمنوں کے لیے مامن قرار دے دیا تھا۔ امید ہے کہ حضرت مخدومی بھی اس گنہ گار کی غلطی سے ضرور درگذر فرمائیں گے اور اپنی شفقت و عنایت سے قلب محزوں کی تشفی فرمائیں گے۔

تقصیر یہ ہوئی:

ڈائری کے سلسلے کے تمام کام حضرت مخدومی و مطاعی قاری شریف احمد دہلوی دام فیوضہم صدر ''مجلس یادگار شیخ الاسلام، پاکستان۔ کراچی'' کے زیر اہتمام اور حضرت ہی کی سرپرستی میں انجام پائے اور انجام پا رہے ہیں۔ اگر حضرت کی دعائیں شاملِ حال اور سرپرستی ہمت افزا نہ ہوتی تو اس گنہ گار میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ پندرہ برسوں کی طویل مدت پر پھیلا ہوا اتنا بڑا صبر آزما اور محنت شاقہ کا طالب منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا! افسوس کہ حضرت کے کلماتِ خیر ہی سے کتاب تہی دامن ہے!

خاکسار حضرت سے دست بستہ معافی کا خواہاں اور عفو و درگذر کا طالب ہے اور درخواست کرتا ہے کہ حضرت مخدومی اس گنہ گار نیاز مند کی تشفی کے لیے اس منصوبے کے لیے اپنی خوشنودی کے چند کلماتِ خیر ضرور تحریر فرما دیں تاکہ اپنی غلطی کی صفائی دنیا کے سامنے پیش کر سکوں اور عنداللہ ڈائری کے مقبول ہونے کی سند بن سکے۔

ابوسلمان

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز

کی

سیاسی ڈائری

بعد حسن

اخبار وافکار کی روشنی میں

عطا فرمودہ

صاحبزادہ محترم حضرۃ مولانا سید محمد ارشد مدنی مدظلہ العالی
استاذ الحدیث ازہر الہند دار العلوم دیوبند (انڈیا)

تالیف و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان کراچی

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
کی سیاسی ڈائری (جلد دوم) ایک نظر میں

عنوانات	صفحہ
۱۹۱۹ء	۲۷
دارالعلوم دیوبند کا رویہ	۲۸
امیر حبیب اللہ کا قتل	۲۸
رولیٹ ایکٹ کا نفاذ اور اس پر رد عمل	۲۸
وزیر ہند اور وائسرائے کی کونسلوں کے ممبران	۲۹
رولیٹ بل اور اس کا مقصد	۳۰
ہنٹر کمیٹی رپورٹ	۳۲
۲۵ لاکھ روپیہ کا نقصان	۳۲
مہاتما گاندھی کا ستیہ آگرہ	۳۲
اگر مہاتما گاندھی پنجاب میں جاتے تو بغاوت ہو جاتی	۳۳
گولیاں چلانی ہی پڑیں	۳۳
پیٹ کے بل رینگنا، جبریہ سلام کا حکم	۳۴
ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق	۳۴
جنرل ڈائر کا طرز عمل	۳۵
ڈائر کے متعلق وزیر ہند کی رائے	۳۸
ڈائر کے عقیدے سے روگردانی	۳۹
رینگنے کا حکم قابل تحقیر ہے	۴۰
مارشل لا کی ذمہ داریاں	۴۰
ڈائر اپنے عہدے کے نا قابل ہے	۴۱
مارشل لا کا عمل در آمد	۴۳
گوجرانوالہ میں بم پھینکنے والے طیاروں کا استعمال	۴۵
ہوائی جہاز کے استعمال کی ضرورت	۴۶
مارشل لا کا دستور العمل	۴۷
سر مائی کل اوڈوائر کی بریت	۴۷
مارشل لا کی ضرورت	۴۸
افسروں اور ملازموں کی خدمت گزاری کا اعتراف	۴۹
وائسرائے کا اعتراف	۵۰
انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل کا جلسہ	۵۱
جلیانوالہ باغ کا قتل عام	۵۱
جنگ عظیم میں ہندوستانیوں کی قربانی	۵۴
سوامی شردھانند کی جامع مسجد میں تقریر	۵۴
ستیہ گرہ کا عہد نامہ	۵۶
ملک میں رد عمل	۵۷
ستیہ گرہ کمیٹی کی طرف سے	۵۷

عنوانات	صفحہ
گاندھی جی کے پنجاب میں داخلے پر پابندی	۵۹
پنجاب اور امرتسر کی صورت حال	۶۰
امرتسر کا قتل عام	۶۵
ہندوستان سے ہجرت کا خیال	۶۹
اناطولیہ پر یونان کا حملہ	۷۱
ہندوستان کے انگریز پرستوں کا بیان	۷۲
امرتسر کا مقدمۂ سازش	۷۳
سازش کیس کے مجرم	۷۴
راول پنڈی کانفرنس	۷۴
افغانی بوگی کا ہوا	۷۶
معاہدہ سیورے	۷۷
آل انڈیا مسلم کانفرنس	۷۹
جلسہ خلافت دہلی	۸۳
خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس	۸۵
جماعت "جمعیۃ العلماء ہند"	**۸۵**
۱۹۱۹ء پر تبصرہ	۹۱
عدم تعاون کی تجویز	۱۰۲
مذہب عمل میں تجدید، صدارت کے لیے آمادگی	۱۰۵
بنگال خلافت کانفرنس کا خطبۂ صدارت	۱۰۹
وفد خلافت کو وزیر اعظم برطانیہ کا جواب	۱۱۳
یوم خلافت	۱۱۴

عنوانات	صفحہ
دیوبند کا عظیم الشان جلسہ	۱۱۵
میرٹھ کانفرنس	۱۱۵
عدم تعاون کی تبلیغ عام	۱۱۷
لاہور میں ڈاکٹر کچلو کی معرکۃ الآرا تقریر	۱۲۰
اسیران مالٹا کی واپسی کا سفر	۱۲۱
بمبئی میں حضرت شیخ الہندؒ کا پر جوش استقبال	۱۲۳
جلسۂ عام اور سپاس نامہ	۱۲۴
دہلی کو روانگی	۱۲۴
حضرت شیخ الہندؒ کا اسٹیشنوں پر استقبال	۱۲۵
حضرت شیخ الہندؒ کی اسارت مالٹا سے رہائی اور مراجعت وطن	۱۲۵
علمائے صوبہ متحدہ کا عظیم الشان جلسہ	۱۲۷
نظام حیدرآباد اور تحریک خلافت	۱۲۸
ٹیگور کا خط وائسرائے کے نام...... خطاب واپس کر دیا	۱۲۹
۱۳ اپریل جلیانوالہ باغ کا یادگار دن	۱۳۰
تاریخ آزادی کا ایک یادگار دن	۱۳۰
مولانا ابوالکلام آزادؒ کا پیغام	۱۳۱
ورکرز کانفرنس دہلی	۱۳۲
ٹھوس کام کیجیے...... مولانا فرنگی محلیؒ کی نصیحت	۱۳۲
تحریک نظم جماعت	۱۳۳

عنوانات	صفحہ
خلافت کمیٹی کی میٹنگ	۱۳۴
معاہدہ سیورے (ترکی کے ساتھ شرائط صلح)	۱۳۵
نظام پنجاب پر تحقیقاتی رپورٹ کی اشاعت	۱۳۶
اسیران مالٹا بمبئی پہنچ گئے	۱۳۷
گورنمنٹ کو الٹی میٹم	۱۳۷
۱۹۲۰ء (نصف ثانی)	۱۳۹
شیخ الہند کا خطاب اور قدوم مبارک کی برکات	۱۴۰
تحریک ہجرت	۱۴۴
۱۹۲۰ء	۱۵۲
تحریک ہجرت	۱۵۳
"یکم اگست ۱۹۲۰ء زیر و آور"	۱۵۴
آزادئ وطن کے عظیم رہنما تلک کا انتقال	۱۵۵
کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس	۱۵۸
حضرت شیخ الہندؒ کا سفر علی گڑھ	۱۶۵
میرا (حضرت مدنیؒ کا) علی گڑھ پہنچنا اور حضرت شیخ الہند کا اجلاس کی صدارت فرمانا	۱۶۸
فتویٰ جناب مولانا محمود حسن صاحبؒ	۱۷۲
فتویٰ جناب مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ	۱۷۳
جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد، دہلی واپسی اور اجلاس جمعیۃ العلماء	۱۷۷
میرا کلکتہ کا سفر اور حضرت شیخ الہندؒ سے جدائی	۱۷۹
میرا دہلی سے رخصت ہو کر بچھراؤں اور امروہہ پہنچنا	۱۸۱
امروہہ اترنے کا سبب	۱۸۱
حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری اور وصال	**۱۸۲**
میرا دیوبند پہنچنا	۱۸۷
اکالی دَل	۲۰۵
کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگ پور	۲۰۷
مکتوب مفتی کفایت اللہ دہلویؒ	۲۱۰
دیگر مکتوب مفتی کفایت اللہ دہلویؒ	۲۱۲
مکاتیب حضرت مفتی اعظمؒ بنام مولانا اشرف علی تھانویؒ	۲۱۳
ترک موالات کا فتویٰ	**۲۱۶**
آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ	۲۲۰
تحریک ہجرت (چند خیالات)	۲۲۲
دارالحرب اور ہجرت	۲۲۳
۱۹۲۰ء کی ہجرت افغانستان	۲۲۳
دارالسلام اور نظریہ متحدہ قومیت	۲۲۴
دارالاسلام کا مؤیدین	۲۲۸
دیوبندی اور اہل حدیث کا انقلابی عنصر	۲۲۸
فتویٰ دارالحرب اور قیام پاکستان کی تحریک	۲۳۰

عنوانات	صفحہ
موجودہ ہندوستان ...... دارالحرب یا دار الاسلام	۲۳۱
ہجرت کی حالت	۲۳۴
تحریک ہجرت اور مولانا آزادؒ	۲۳۴
تحریک کی بعض شخصیات	۲۳۶
گاندھی جی اور تحریک ہجرت	۲۳۹
ہجرت کے مختلف واقعات	۲۴۳
مولانا عبیداللہ سندھیؒ	۲۴۲
تحریک ہجرت اور اس کے اثرات	۲۴۳
تحریک کے مخالفین اور ان کے درجے	۲۴۵
۱۹۲۱ء: مسلمان اور کونسل ممبری	۲۴۷
برٹش استعمار سے دوستی کا تعلق...... ناممکن ہے	۲۴۹
موپلے	۲۵۰
مولانا مدنیؒ کی تقریر	۲۵۱
ریزولیوشن	۲۵۶
پرنس آف ویلز کی آمد	۲۶۶
جمعیت علمائے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس لاہور	۲۶۷
مولانا آزادؒ کی تقریر کا خلاصہ	۲۶۸
جزیرہ عرب کا کامل تخلیہ	۲۶۸
ہندوستان کا آزادی	۲۶۹
مالابار کے حالات پر ایک نظر	۲۶۹

عنوانات	صفحہ
جبراً مسلمان بنانے کا پروپیگنڈا	۲۷۰
اسلام اور تشدد	۲۷۰
ترک موالات کی اختیار کردہ راہ	۲۷۱
مقدمۂ کراچی	۲۷۱
فقیہ الملۃ والدین	۲۷۲
جلسے کی پہلی نشست کی کارروائی	۲۷۳
مولانا آزادؒ کی صدارت کی تائید	۲۷۳
جمعیۃ العلماء کے متفقہ واجب التعمیل اعلانات	۲۷۴
۱۔ فتویٰ کی ضبطی کے متعلق سرکاری احکام نہ مانے جائیں	۲۷۴
۲۔ فوج و پولیس تک احکام شرع پہنچادیے جائیں	۲۷۵
۳۔ فوجی نوکری کے حرام ہونے کی وجوہ	۲۷۵
۴۔ ہندوستان کو آزاد کرانا مسلمانوں کا شرعی فرض ہے	۲۷۶
۵۔ جمعیۃ کے وفود دورہ کریں گے	۲۷۶
۶۔ افضل ترین جہاد و عبادات	۲۷۶
۷۔ ولایتی مال خریدنے والے شرعاً مجرم ہیں	۲۷۶
۸۔ ہندوستان بھر کے لیے امیر شریعت	۲۷۷
۹۔ موپلون کے متعلق	۲۷۷
۱۰۔ جمعیۃ کو اعوان و انصار کی ضرورت ہے	۲۷۷

عنوانات	صفحہ
۱۱۔ مبارک باد اور گورنمنٹ کے چیلنج کا جواب	۲۷۷
جمعیت علمائے ہند کے اجلاس پر ایک نظر	۲۷۸
مسئلہ امارات یا امامتِ ہند	۲۷۸
حکومت کا رویہ	۲۸۰
تحریک میں نیا خون	۲۸۰
صلح کی بات چیت	۲۸۱
تمام کارکنان خلافت کے نام پیغام	۲۸۳
زہریلی گیس	۲۸۷
شورش بمبئی	۲۸۸
گورنمنٹ اور پولیس	۲۹۱
شہر کے جنگ آزما مسلمان	۲۹۱
جو ہوا اور جو ہوتا	۲۹۲
وقفہ آزادی کی ایک یادگار تحریر	۲۹۳
اولین مبارک باد	۲۹۶
آخری پیغام	۲۹۶
مرکزی خلافت کمیٹی	۲۹۷
حکیم محمد اجمل خاں صاحبؒ	۲۹۷
انگورہ فنڈ	۲۹۸
جمعیۃ العلماء	۲۹۸
گورنمنٹ بنگال	۲۹۹
تحریک خلافت کا دور عروج۔ ایک سرسری تبصرہ واقعات کی روشنی میں	۳۰۳
علی گڑھ پر دھاوا	۳۰۶
مدرسہ عالیہ کلکتہ پر مولانا آزادؒ کا دھاوا	۳۰۷
مہاتما جی	۳۰۷
قومی مدرسہ اعظم گڑھ	۳۰۹
ایک کروڑ روپے فراہمی کی کہانی	۳۱۰
کھدر کی اسکیم اور پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ	۳۱۱
مہاتما گاندھی کا ملک گیر دورہ	۳۱۱
خواتین	۳۱۳
چند مثالیں	۳۱۴
مولانا آزادؒ کا پیغام	۳۱۷
باپ کا خط بیٹے کے نام	۳۱۷
تحریک خلافت پر تبصرہ ۱۹۲۲ء	۳۱۸
کیرالا میں ترک موالات کی تحریک	۳۲۰
آل پارٹیز کانفرنس	۳۲۲
بردولی میں پھر سول نافرمانی	۳۲۳
چوری چورا کا واقعہ	۳۲۶
گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی	۳۲۸
تحریک عدم تعاون کا التوا	۳۲۹
گاندھی جی کا خط۔ وائسرائے کے نام	۳۳۰
گاندھی جی کی گرفتاری	۳۳۵
مہاتما گاندھی کی گرفتاری	۳۳۶
سوراج پارٹی کا قیام	۳۳۸

عنوانات	صفحہ
کانگریس میں اختلاف	۳۴۰
کانگریس کا خصوصی اجلاس	۳۴۲
گاندھی جی کی رہائی	۳۴۸
خلافت کا خاتمہ	۳۴۸
خلافت کانفرنس بلگام	۳۵۰
ملاپ کانفرنس	۳۵۱
اتحاد کانفرنس دہلی	۳۵۴
مکتوب مولانا عبدالباریؒ بنام حضرت مدنیؒ	۳۶۰
مکتوب مولانا شوکت علیؒ بنام مولانا عبدالباریؒ	۳۶۱
مکتوب مولانا مدنیؒ بنام مولانا عبدالباریؒ	۳۶۳
مکتوب مولانا عبدالباریؒ بنام حضرت مدنیؒ	۳۶۸
مکتوب مولانا کفایت اللہؒ بنام مولانا عبدالباریؒ	۳۶۹
جواب از مولانا عبدالباریؒ	۳۷۲
سوبھاش بابو کی گرفتاری	۳۷۲
۱۹۲۵ء مولانا شاہ بدرالدینؒ کی وفات	۳۷۳
مسودۂ قانون حج پر بحث	۳۷۳
محمد ابن عبدالوہابؒ (نجدی) کے متعلق سابقہ رائے سے رجوع	۳۷۴
کاکوری سازش کیس	۳۷۵
جزیرۃ العرب کے متعلق سترہ احادیث	۳۷۵

عنوانات	صفحہ
احادیث جزیرۃ العرب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۳۷۸
حجاز کانفرنس	۳۸۱
معاہدۂ لوکارنو	۳۸۱
چالیسواں اجلاس کانگریس	۳۸۱
کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا	۳۸۲
راشٹریہ سویم سیوک سنگھ	۳۸۳
حضرت شیخ الاسلامؒ کا ایک تاریخی خط	۳۸۳
تحریک آزادی کی ایک بنیادی دستاویز	۳۸۵
۱۹۲۶ء سلطان عبدالعزیز آل سعود اور مسئلہ حجاز	۳۸۷
عورتوں کی وراثت سے محرومی	۳۸۸
مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کا سانحۂ ارتحال	۳۸۹
نکاح و طلاق کی رجسٹری، جمعیت کا موقف	۳۸۹
حضرت شیخ الاسلامؒ کا ایک تاریخی خط	۳۸۹
حضرت شیخ الاسلامؒ کی مختصر خودنوشت	**۳۹۳**
اصلاح المسلمین کی اہم ضرورت	۳۹۹
قواعد و مقاصد کی تنظیم مسلماناں	۴۰۱
انجمن شعبۃ المشیران (مطوعین)	۴۰۲
قواعد و قوانین دربارۂ شعبہ اصلاح مصارف	۴۰۳
ختنہ عقیقہ وغیرہ	۴۰۶

عنوانات	صفحہ
قواعد	۴۰۷
ترک موالات کی نئی تدبیر	۴۰۹
اجلاس کانگریس	۴۱۱
۱۹۲۷ء	۴۱۱
مسلمانوں کے لیے اتباعِ عمل کا ایک دل نشین پیغام۔ حضرت مدنیؒ کی تقریر	۴۱۳
لاہور کا فساد	۴۱۳
چوری اور سینہ زوری	۴۱۴
سعودیہ عربیہ	۴۱۵
اسیران کاکوری کیس کی رہائی	۴۱۸
ہندوستان کے خلاف امریکہ میں	
پروپیگنڈا۔ انڈیا نیشنل کانگریس کا فرض	۴۲۱
اشفاق اللہ خان کو پھانسی کی سزا	۴۲۶
آئینی کمیشن اور علمائے امت	۴۲۶
حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ	۴۲۶
مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ	۴۲۷
صدر جمعیۃ العلماء کا خطبہ	۴۲۷
علمائے امت کا فیصلہ کمیشن کا مکمل مقاطعہ	۴۲۸
۱۹۲۸ء	۴۳۱
سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ	۴۳۳
حضرت شیخ الاسلامؒ کا قیام دیوبند	۴۳۵
نہرو رپورٹ	۴۳۶
متحدہ قومیت کے جذبے کی تاثیر	۴۴۱

عنوانات	صفحہ
بہ سلسلہ نہرو رپورٹ	۴۴۲
لاہور۔ سائمن گو بیک	۴۴۳
سانڈرس کا قتل	۴۴۳
کانگریس اور نہرو رپورٹ	۴۴۴
کانگریس کا اجلاس کلکتہ	۴۴۴
۱۹۲۹ء: آل انڈیا مسلم کانفرنس کا انعقاد	۴۴۶
ہندوستان کا طرز حکومت وفاقی ہو	۴۴۷
تین چوتھائی نمایندوں کی تائید ضروری ہے	۴۴۷
جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب	۴۴۷
مسلمانوں کا حق نیابت	۴۴۸
مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ضروری	۴۴۸
وزارتوں میں مسلمانوں کا حصہ	۴۴۸
میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں	
مسلمانوں کا حق	۴۴۸
مرکزی مجالس میں ۱/۳ نشستیں	۴۴۸
سندھ کی علاحدگی	۴۴۹
صوبہ جات سرحد اور بلوچستان کے لیے	
اصلاحات	۴۴۹
خدمات ملکی میں مسلمانوں کے حقوق	۴۴۹
اسلامی تمدن کا تحفظ	۴۴۹
دستور اساسی میں تبدیلی	۴۵۰
مسلمانوں کا اعلان	۴۵۰
پروگرام	۴۵۰

عنوانات	صفحہ
ہمدرد دہلی مرحوم ہوگیا	۴۵۱
سائمن کمیشن کی واپسی اور انگلستان میں	
انقلاب وزارت	۴۵۱
مدینہ طیبہ کی ایک صحیح خدمت	۴۵۳
انقلاب افغانستان کی ذمہ داری	۴۵۴
بدیسی کپڑے کا مقاطعہ اور اس کی	
ضرورت	۴۵۶
حقیقی قوم دیہات میں بستی ہے	۴۵۷
اوسط روزانہ آمدنی	۴۵۷
ہر شخص کو تیرہ گز کپڑا	۴۵۸
مقاطعہ کس طرح ممکن ہے	۴۵۹
نئی دنیا کی "ترقیاں"	۴۵۹
ہر ہندوستانی کا فرض	۴۶۰
کیا اب بھی لاپروائی برتی جائے گی؟	۴۶۱
ایک عالم دین کا نعرۂ حق	۴۶۲
شراب خانہ خراب قابل عبرت اعداد	۴۶۳
بڑے "کلوار" کی آمدنی	۴۶۵
مجلس احرار اسلام کا قیام	۴۶۸
مخلوط انتخاب کا فارمولا	۴۷۰
مسلم راج کی رٹ	۴۷۰
مجلس احرار اسلام کے مقاصد قیام	۴۷۱
۱۹۳۰ء: کلوار خانہ کی آمدنی	۴۷۲
وفاداریوں کے انعام	۴۷۲

عنوانات	صفحہ
اعلان آزادی	۴۷۶
نمکین ستیہ گرہ	۴۷۷
وائسرائے کے نام گاندھی جی کا خط	۴۷۹
نمک ستیہ گرہ	۴۸۴
نمک ستیہ گرہ کا آغاز	۴۸۵
قانون نمک اور اس کی خلاف ورزی	۴۹۰
سول نافرمانی اور جمعیت علمائے ہند	۴۹۹
فرمان تھانہ بھون کی حقیقت	۵۰۰
تحریک نمک اور سول نافرمانی: مختلف	
واقعات وتبصرہ	۵۰۴
چند سبق آموز اعدادیہ	۵۰۵
امیر شریعت صوبہ بہار اور موجودہ تحریک	۵۰۶
شقاوت کا کمال	۵۰۷
ولایتی کپڑا	۵۰۸
سرکاری اعداد و شمار	۵۱۰
گول میز کانفرنس	۵۱۲
شیخ الاسلامؒ اور تھانہ بھون کی تحریک	۵۱۸
مقاطعہ کا حیرت انگیز اثر	۵۲۰
اعداد و شمار عام مصنوعات	۵۲۰
سوتی کپڑا	۵۲۱
مصنوعات فولاد و آہن وغیرہ	۵۲۱
بیکاری	۵۲۱
درآمد مصنوعات قطن	۵۲۲

عنوانات	صفحہ
ولایتی کپڑا	۵۲۳
قصہ خوانی فائرنگ سے قرارداد پاکستان تک	۵۲۳
علامہ اقبالؒ کا خطبہ الہ آباد	۵۲۴
تحریک سول نافرمانی میں مسلمانوں کی قربانیاں	۵۳۰
۱۹۳۱ء	۵۳۱
کانگریس رہنماؤں کی رہائی، مشورے اور فیصلے	۵۳۲
موتی لال نہرو کا انتقال	۵۳۳
گاندھی جی وائسرائے معاہدہ	۵۳۵
صوبہ سرحد کی صورت حال	۵۴۰
بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی اور فسادات کان پور	۵۴۲
گنیش شنکر ودیارتھی کا قتل	۵۴۲
گاندھی اردن معاہدہ اور کانگریس کی قرارداد	۵۴۳
سول نافرمانی کے قیدی	۵۴۴
فرقہ وارانہ فسادات	۵۴۴
شراب	۵۴۴
کھدر	۵۴۵
سمجھوتے کی مختلف تجاویز	۵۴۵
مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تجویز	۵۴۶
کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز	۵۴۸
ان تجاویز کو پیش کرنے کے بعد مولانا احمد سعیدؒ فرماتے ہیں	۵۴۹
جمعیت علمائے ہند اور مسلم حقوق	۵۵۰
جمعیت علمائے ہند کی تجاویز	۵۵۱
کانگریس کی قرارداد کراچی	۵۵۳
مجلس احرار اسلام کی قرارداد	۵۵۵
ہندو مہا سبھا کی قرارداد	۵۵۵
شاردا ایکٹ	۵۵۸
محمد دین ملک کا مسودۂ قانون	۵۵۹
جمعیت علمائے ہند کا سیاسی فارمولا ۱۹۳۱ء	۵۶۰
مخلوط زندگی اور اسلامی اثرات کا نفوذ	۵۶۳
تحریک نظم جماعت، امیر الہند کی تجویز اور شیخ الاسلامؒ	۵۷۰
نتائج تحریک آزادی کشمیر	۵۷۲
گول میز کانفرنس اور اقلیتوں کے معاہدے پر تبصرہ	۵۷۳
۱۹۳۲ء	۵۷۵
جانشینِ شیخ الہندؒ سے	۵۷۹
کمیونل ایوارڈ اور پونا معاہدہ	۵۸۰
دیوبند کا ایک نادان دوست	۵۸۱
۱۹۳۳ء: علامہ اقبال اور تحریک ختم نبوت	۵۸۶
امیر شریعت کی رہائی	۵۸۷
رحمت علی کی تجویز پاکستان	۵۸۷

عنوانات	صفحہ	عنوانات	صفحہ
ہٹلر کا اقتدار	۵۸۸	مسلمانوں کا انداز سیاست	۶۱۸
نصب العین آزادی	۵۹۰	پاکستان، انگریز اور مسلمان	۶۱۹
سول نافرمانی جائز ہتیار ہے	۵۹۰	سوشلسٹ پارٹی (ہند)	۶۱۹
سول نافرمانی کے پروگرام کی متابعت	۵۹۰	۱۹۳۵ء: لیگ کانگریس اور گورنمنٹ کی	
بائیکاٹ	۵۹۱	پریشانی	۶۲۰
وائٹ پیپر	۵۹۱	جناح راجندر بات چیت	۶۲۱
گاندھی جی کا برت	۵۹۱	یوم آزادی کے لیے ہدایت اور ریزولیوشن	۶۲۷
بنیادی حقوق	۵۹۱	مسٹر جناح کی تقریر۔ انقلاب پر تبصرہ	۶۲۷
قرآن کا صحیح مکمل تلاوت	۵۹۲	صوبہ سرحد کا شریعت بل	۶۲۷
اسلام اور بھوک ہڑتال	۵۹۳	کراچی میں جلوس جنازہ پر فائرنگ	۶۲۸
علامہ اقبال کا ایک خط	۵۹۴	کوئٹہ کا قیامت خیز زلزلہ	۶۳۰
جانشین شیخ الہند کا قول زرین	۵۹۵	مسجد فنڈ سے سلور جوبلی کا چراغاں	۶۳۱
دعوت ناؤنوش اور تحریک پاکستان	۵۹۷	سیرت مدنی کا تابندہ نقش	۶۳۲
برطانوی اعلان اور اس پر ردعمل	۵۹۷	خواتین اور سماجی خدمات	۶۳۳
۱۹۳۴ء: زلزلۂ بہار	۶۰۰	انڈیا بل کی منظوری	۶۳۴
پنڈت نہرو کی گرفتاری	۶۰۳	ہندوستان کا نیا وائسرائے	۶۳۴
مسٹر تھامسن کے نام علامہ اقبال کا خط	۶۰۹	اسمبلی میں حکومت کی شکست	۶۳۴
سندھ اور پاکستان	۶۱۱	پاکستان کا تعارف	۶۳۴
مجلس عاملہ کا اجلاس مراد آباد	۶۱۲	صدر مہتمم کے عہدے پر حضرت مدنیؒ کا تقرر	۶۳۵
ہٹلر اور جرمنی	۶۱۳	مسجد شہید گنج اور اس کی واگزاری	۶۳۶
سر اکبر حیدری کے خیالات	۶۱۴	۱۹۳۶ء: جارج پنجم کا انتقال	۶۳۹
خواتین اور سماجی خدمات	۶۱۵	انجمن مصالحت قضیہ شہید گنج	۶۴۲
قادیان میں پہلی احرار کانفرنس	۶۱۵	گورنمنٹ پنجاب ایمرسن کا بیان	۶۴۳

عنوانات	صفحہ
سروزیر حسن اور جناح صاحب کی تقاریر	۶۴۵
حریت پسند جماعتوں سے مسٹر جناح کی ملاقاتیں	۶۴۶
مسٹر یامین، سر یعقوب اور دیگر کا ردعمل	۶۴۷
لیگ کا جلسہ اور زعمائے جمعیت کی شرکت	۶۴۹
نواب زادہ لیاقت علی خاں کی علاحدگی	۶۴۹
مسلم یونٹی بورڈ کی حمایت	۶۵۰
مسٹر جناح کی پالیسی سے اختلاف	۶۵۰
شریعت بل صوبہ سرحد...... چند احکام و مسائل	۶۵۱
محمد علی جناح اور مسلم پارلیمنٹری رپورٹ	۶۵۴
ووٹ کا حق دار	۶۵۵
سیٹھ عبداللہ جناح اختلاف	۶۵۵
میثاق منترے	۶۵۶
لیگ پارلیمانی بورڈ میں اختلاف	۶۵۶
رُپیہ لے کر ووٹ دینا	۶۵۸
سر فضل حسین کے جانشین۔ سر سکندر حیات خان	۶۵۸
پنجاب میں انتخابی کش مکش کا آغاز	۶۵۹
یوپی کی صورت حال	۶۶۰
جناح فضل الحق کش مکش	۶۶۰
جناح اور سیاست	۶۶۱
سندھ مسلم پولیٹیکل پارٹی	۶۶۲
بہار میں انتخابی کش مکش	۶۶۳
ووٹ کی قیمت اور مسجد کی تعمیر	۶۶۳
عبداللہ ہارون کا بیان	۶۶۳
سرزمین سندھ	۶۶۴
۱۹۳۷ء: حضرت شیخ الاسلامؒ کا آٹوگراف	۶۶۷
ووٹ کا صحیح حق دار	۶۶۸
حلف نامہ آزادی خلاف قانون قرار دے دیا گیا	۶۶۹
انتخابات اور جمعیت علما کی پالیسی	۶۷۰
ووٹ کا معیار استحقاق	۶۷۱
راجہ غضنفر علی کا بیان	۶۷۲
ہٹلر کا اعلان	۶۷۲
راجا غضنفر علی کی بے وفائی	۶۷۳
سیاسی قیدیوں کی رہائی	۶۷۳
پنجاب میں ناکامی پر مسٹر جناح کا بیان	۶۷۴
عربی تعلیم یافتہ اشخاص کے مسائل	۶۷۵
جمعیت علمائے ہند کا اجلاس	۶۷۷
صوبائی انتخابات کے نتائج	۶۷۷
انتخابات ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی پوزیشن	۶۷۸
ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ	۶۷۹
برما علاحدہ کر دیا گیا	۶۸۰
وزیر اعظم بنگال کا اعلان	۶۸۰
مدنی اور بخاری میں مفاہمت	۶۸۱

عنوانات	صفحہ
اعلان بالفور	۶۸۴
یہودیوں کے قومی وطن کے قیام پر احتجاج	۶۸۶
یہودیوں کا قومی وطن اور مودودی کی منطق	۶۸۶
کانگریس نے وزارتیں قبول کرلیں	۶۸۶
قصہ یوپی میں وزارت سازی کا	۶۸۷
چودھری صاحب کے لیے شرائط نامہ	۶۹۶
چودھری صاحب کی سیرت	۶۹۷
مسٹر ابوالحسن اصفہانی کی دوٹوک رائے	۶۹۹
تحریک آزادی ایک وطنی فرض	۷۰۰
ضمنی انتخاب میں حافظ ابراہیم کی کامیابی	۷۰۱
حضرت شیخ الاسلامؒ اور خاکسار	۷۰۱
حضرت مفتی اعظمؒ کی فتویٰ نویسی اور جمعیت علما	۷۰۱
جمعیت علما اور وطنی وملی خدمات	۷۰۲
تحریک آزادی، کارٹون اور اسلام	۷۰۲
ہٹلر کی پریس کانفرنس	۷۰۴
لیگ آف کونسل کی قرارداد	۷۰۵
شریعت بل	۷۰۵
حافظ محمد عبداللہ	۷۰۶
مسلم لیگ سے اخراج	۷۱۰
بندے ماترم گیت پر کانگریس کا فیصلہ	۷۱۱
مسلمانوں کو کانگریس کی یقین دہانی	۷۱۳
لیگی علما کا رویہ	۷۱۴

عنوانات	صفحہ
مولانا عبیداللہ سندھی کا اعلان	۷۲۰
بندے ماترم کی جگہ	۷۲۷
فتویٰ تھانہ بھون کا جواب	۷۲۷
کفار سے دوستی، اتحاد اور دیگر مسائل	۷۳۱
حاجی ترنگ زئی کا انتقال	۷۳۴
اتخاذ وبطانہ کا مطلب	۷۳۵
غیر مسلم کی سرداری اور اس کی اطاعت	۷۳۶
کانگریس میں شرکت	۷۳۷
لیگ اور قادیانیوں سے تعاون	۷۳۸
صوبائی انتخابات میں لیگ کا تناسب کامیابی	۷۳۹
مسلمانوں کا روشن مستقبل	۷۳۹
صوبہ سرحد......۱۹۳۷ء اور اس کے بعد	۷۴۰
۱۹۳۸ء شیخ الاسلامؒ کی تقریر دہلی اور مسئلہ قومیت کا شاخسانہ	۷۴۲
انقلاب کا اداریہ	۷۴۳
فتویٰ ترک موالات اور تغیر حالات	۷۴۵
کانگریس حکومت کی شرعی حیثیت	۷۴۵
تحریک مسجد شہید گنج	۷۴۷
شیخ الاسلامؒ کے خلاف علامہ اقبال کا قطعہ	۷۴۸
شیخ الاسلامؒ کا ایک تاریخی خط اور مسئلے کی وضاحت	۷۴۸
آل انڈیا کانگریس اور بنیادی حقوق کی ضمانت	۷۵۶

عنوانات	صفحہ
شیخ الاسلامؒ کا ایک اور تاریخی خط	۷۵۹
سندھ وزارت کا خاتمہ	۷۶۲
سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کا خاتمہ	۷۶۲
السپ کمیشن کی رپورٹ	۷۶۳
علامہ اقبالؒ کا اپنی رائے سے رجوع	۷۶۳
حضرت علامہؒ کے قطعے پر ردعمل	۷۶۵
تحریک مدح صحابہؓ	۷۶۷
مسئلے کے حل کے لیے شیخ الاسلامؒ کی کوشش	۷۶۸
مصالحت کا سوال	۷۶۹
مولانا حسین احمد مدنیؒ اور تحریک مدح صحابہؓ	۷۷۱
علامہ اقبال کے رد میں سید سلیمان ندویؒ کا مضمون	۷۷۵
نہرو خاندان سے علامہؒ کی عقیدت	۷۸۹
ارشاد صدر مسلم لیگ	۷۹۱
آزاد قبائل پر بمباری	۷۹۲
شامی پیر	۷۹۲
بہاول پور میں تبلیغ کی بندش	۷۹۴
لیگ اور کانگریس۔ اشتراک و تعاون کی بنیاد	۷۹۵
تبرئی و مدح صحابہؓ پر پابندی	۷۹۵

عنوانات	صفحہ
واردھا تعلیمی اسکیم	۷۹۸
مذہبی تعلیم انتظام	۸۰۸
ودیا مندر اسکیم	۸۱۱
ہندوستان ہمارا اور کل اقوام ہند کا مشترکہ وطن ہے	۸۱۱
ہندوستان مسلمانوں کا قدیمی وطن ہے	۸۱۲
وطنیت کے حقوق لازمہ	۸۱۳
ملک کے ان حقوق میں کوتاہی سے دین بھی برباد ہوگا	۸۱۳
سندھ مسلم لیگ کی قرارداد تقسیم ملک	۸۱۵
پیرپور کمیٹی رپورٹ۔ تصویر کا دوسرا رخ	۸۱۸
سول اینڈ ملٹری گزٹ کا اداریہ	۸۱۹
مولانا آزادؒ کا بیان	۸۲۱
جماعت اسلامی کے قیام کا تاریخی پس منظر	**۸۲۲**
یوپی کی متحدہ زندگی اور جناح صاحب	۸۲۳
تعدد قومی کا لزوم	۸۲۴
مسلم نیشنل کانفرنس سے حضرت مدنیؒ کا خطاب	۸۲۵
فتویٰ حاصل کرنے کا طریقہ	۸۲۶
وفاقی نظام حکومت	**۸۲۷**
مرکزی الیکشن سے مسلم لیگ کا فرار	۸۲۷
جناح وائسرائے ملاقات	۸۲۷

عنوانات	صفحہ
مسلم لیگ کا وفاق سے گریز	۸۲۷
سر عبداللہ ہارون کا تار بنام وائسرائے	۸۲۸
مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ	۸۲۹
لیگ کا مطالبہ اور مرکز میں انتخابات کے عدم انعقاد کا فیصلہ	۸۲۹
وفاقی طرز کا دستور اساسی ازالہ توہمات کا کلید	۸۳۰
چودھری خلیق الزماں کا دعویٰ	۸۳۲
کانگریس کا اجلاس ہری پور اور اقلیتوں کو یقین دہانی	۸۳۳
کانگریس کے آخری سیشن کی قرارداد...... مزید یقین دہانی	۸۳۵
چودھری صاحب کا ایک دعویٰ باطل اور پاکستان کے مسائل	۸۳۵
۱۹۳۹ء: شرکت کانگریس ــ ایک فتویٰ	۸۳۷
زمینداریوں کے خاتمے کی تحریک	۸۳۸
ہندوستانی زبان	۸۴۰
سودے بازی یا اصولی مانگ	۸۴۰
مسلمانوں کا کلچر اتانی	۸۴۲
جمعیت علمائے ہند کی پالیسی کا اعلان	۸۴۳
علامہ اقبالؒ کی تعزیت	۸۴۶
نظارت امور شرعیہ کا منصوبہ	۸۴۸
قرارداد متعلق قانون فسخ نکاح	۸۵۰
واردھا تعلیمی اسکیم پر جمعیت علما کی رپورٹ	۸۵۱
جے پور کا خونی حادثہ	۸۵۵
جمعیت کے جلسے سے عدم سروکار کی نصیحت اور جناح صاحب	۸۵۶
مولانا سندھیؒ کی ہندوستان واپسی	۸۵۷
مظہر الدین شیرکوٹی کا قتل	۸۵۸
محمد علی جناح اور اہل سنت کا فتویٰ	۸۵۸
محمد طاہر قاسمی کا جھوٹ	۸۵۸
مسلم لیگ کے خلاف اہل سنت کا محاذ	۸۶۴
سالانہ جلسۂ احرار اسلام	۸۶۶
"مسئلہ قومیت" از سید مودودی صاحب	۸۶۷
مولانا سندھیؒ کی صدارت میں	۸۷۰
احکام شرعیہ، مسلم لیگ اور اہل سنت	۸۷۱
اسلامی جنگوں میں غیر مسلموں کی شرکت	۸۷۲
بدیشی اشیا کے ترک کی تحریک	۸۷۲
کفار سے موالات و معاملات کے حدود	۸۷۳
جنگ عظیم دوم اور مسلم لیگ	۸۷۵
جنگ عظیم دوم	**۸۷۸**
جنگ عظیم دوم پر کانگریس کا ریزولیشن	۸۷۸
حالات پر مولانا آزاد کا تبصرہ	۸۷۹
گاندھی کی بے چینی	۸۷۹
کانگریس کا پس و پیش	۸۸۰
کانگریس ریزولیشن	۸۸۰

عنوانات	صفحہ
کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا بیان	۸۸۴
جمعیت علمائے ہند کا جلسہ	۸۸۹
خون کی ہولی	۸۹۰
بہانوں کا سہارا	۸۹۱
مذہبی، اخلاقی اور سیاسی غور	۸۹۲
بہانوں کا تار پود اور حقیقت آشکار	۸۹۲
ہندوستان، فلسطین وغیرہ کی غلامی	۸۹۳
طرابلس البانیہ، چیکوسلواکیہ و آسٹریا وغیرہ کی غلامی	۸۹۴
برطانیہ کے خوش آمدیوں کی بے سبب حمایت	۸۹۴
مکمل آزادی کا نصب العین	۸۹۵

عنوانات	صفحہ
خلاصہ بیان اور عدم تعاون کا اظہار	۸۹۵
مسلم لیگ کی وار پالیسی	۸۹۵
لیگ میں ردعمل	۸۹۷
کانگریس کا اقدام اور وزارتوں سے استعفا	۹۰۵
پنڈت جواہر لال نہرو کا خط	۹۱۰
پنڈت نہرو کا تار	۹۱۱
یوم نجات مینی فسٹو کی تیاری	۹۱۸
یوم نجات پر مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان، مسلمانوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ	۹۲۰

۱۹۱۹ء

۹ رجنوری ۱۹۱۹ء: ۹ رجنوری ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ انھوں نے ایک ایسا جامع، پرمغز اور حق گوئی و بیباکی سے مملو خطبہ دیا جس سے تمام ہندوستان کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔ لیکن اس کے بین السطور میں وہی جذبۂ وفاداری کارفرما ہے۔ اگرچہ اس سے بغاوت بھی جھلک رہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

''حضرات! ہم آج ایک نہایت نازک زمانے میں اس جگہ جمع ہوئے ہیں۔ وہ جنگ عظیم جس میں مشرق و مغرب کی قومیں مبتلا تھیں اور جدال و قتال کی وہ گرمی بازاری تو ختم ہوگئی لیکن باوجود ے کہ جنگ ختم ہوگئی ہے اب ہمارے تردداث کی یہ ابتدا ہے۔ کیسے کیسے اہم معاملات کا فیصلہ ہونے والا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجلس صلح کے آخری فیصلے ایک طویل مدت کے لیے یہ طے کر دیں گے کہ حیات انسانی کی تاریخ کیوں کر لکھی جائے۔

مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ خاص طور پر تشویش پیدا کرنے والا ہے۔ یہ صورت تیرہ سو برس کی تاریخ میں بھی جو مد و جزر سے خالی نہیں، مسلمانوں کو کبھی پہلے پیش نہ آئی تھی جو آج نظر کے سامنے ہے۔

برطانوی حکومت نے ہمیشہ اپنے تمام بین الاقوامی معاملات اور تعلقات میں دنیا پر اپنے اس حق کو بارہا جتایا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ چوں کہ شاہ انگلستان مسلمانان عالم کی سب سے بڑی تعداد پر حکومت کرتا ہے اس لیے برطانوی حکومت خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر حق کے ساتھ فرائض بھی ہوتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ملک معظم کی مسلمان رعایا اس امر کا مطالبہ کرے کہ شاہی وزرا جن کے ہاتھ میں سلطنت برطانیہ کی قسمت کی باگ ہے، اپنے ان فرائض کو ادا کریں جو مسلمانانِ ہند سے متعلق ان پر

عائد ہوتے ہیں۔" (تحریک خلافت: از قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۱۰۳)

دارالعلوم دیوبند کا رویہ:

دارالعلوم دیوبند کے اکابرین اپنی بصیرت و فراست سے انگریزوں کو اپنا دشمن قرار دے کر بقاو تحفظ خلافت اسلامیہ اور آزادی ہند کے لیے زمانہ دراز سے عملی جدوجہد کر رہے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، ان کے پیر حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور ان کے سیکڑوں اعوان و انصار اسی دھن میں سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے۔ اس صدی کے سب سے بڑے قائد (شیخ الہند مولانا محمود حسن) ابھی مالٹا میں نظر بند تھے۔ لیکن سب کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں اور صرف دیوبند ہی اس جذبہ اظہار وفاداری سے مستثنیٰ تھا۔

(تحریک خلافت: از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۱۱۸)

امیر حبیب اللہ کا قتل:

۲ر فروری ۱۹۱۹ء: امیر حبیب اللہ جلال آباد شکار کو گئے تھے۔ ۲۰ر فروری ۱۹۱۹ء کو وہ مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے کہ ایک مچھلی تالاب سے باہر نکل کر تڑپنے لگی۔ امیر حبیب اللہ نے کہا اسی طرح ایک دن ہر انسان کی روح تڑپ کر اس کے جسد خاکی سے جدا ہو جائے گی۔ اسی شب میں کوئی شخص ان کے کمرے میں داخل ہوا اور گولی سے ان کو ہلاک کر کے فرار ہو گیا۔

رولیٹ ایکٹ کا نفاذ اور اس پر رد عمل:

رولیٹ بلز کے خلاف دہلی، احمد آباد، بمبئی اور کئی دوسرے شہروں میں خصوصاً پنجاب میں جو اندوہ ناک واقعات رونما ہوئے تھے، ان کی تحقیقات کے لیے ہنٹر کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس کے تین ہندوستانی ممبران پنڈت جگت نرائن، سر چمن لال سیتلواد اور صاحبزادہ سلطان احمد خان نے جو اپنی رپورٹ مرتب کی تھی جسے کثرت رائے کی رپورٹ کہا گیا ہے، جس کا اردو ترجمہ پنجابی پریس لاہور سے چھپوا کر لالہ لاجپت رائے ساہنی پبلشر و تاجر کتب، لاہوری

دروازہ، لاہور نے ۱۹۲۰ء کے اوائل میں شائع کر دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے:

رولیٹ بلز ۱۸ر جنوری ۱۹۱۹ء کو شائع کیے گئے، ۶ر فروری کو کونسل میں پیش ہوئے، ۱۷ر مارچ کو پاس ہوئے، ۶ر اپریل کو ان کے خلاف ہڑتال ہوئی۔ (صفحہ ۱۶ تا ۱۸) پنجاب کے مختلف شہروں میں مارشل لا لگا دیا گیا، امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا، لاہور سے کئی افراد کو جلاوطن کر دیا گیا اور پورے پنجاب میں حکومتی دہشت گردی کا بازار گرم ہو گیا۔ عوام، طلبہ، اساتذہ کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا۔

یہ رپورٹ چھوٹے سائز کے (۳۰×۲۰/۱۶ کے) ۱۹۳ صفحات اور سات ابواب پر مشتمل ہے۔

اگرچہ یہ رپورٹ حکومت کے نقطۂ نظر سے حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی نے مرتب کی ہے اور ظلم و تشدد کے ہر واقعے کے لیے جواز تلاش کر لیا گیا ہے، لیکن اسی کے مطالعے سے انتظامیہ کے انتہائی ظلم و تشدد کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ اسے کثرت رائے کی رپورٹ اس لیے کہا گیا ہے کہ حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی کے تمام ارکان بھی کسی ایک معاملے پر بھی یا انتظامیہ کے کسی اقدام کے جواز پر متفق نہ ہو سکے تھے۔

لیکن یہاں جو خلاصہ درج کیا جاتا ہے، وہ کانگریس کمیٹی کے مقرر کردہ کمیشن کا خلاصہ ہے جو اس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں درج کیا ہے۔ کانگریس کا مقرر کردہ کمیشن پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں مہاتما گاندھی، سی آر داس، عباس طیب جی اور ایم آر جیکار، چار ارکان پر مشتمل تھا۔ اور ''تحقیقاتِ مارشل لا یعنی کانگریس کمیٹی کی رپورٹ'' کے عنوان سے دو حصوں میں ۱۹۲۰ء میں ''پستک بھنڈار۔ لاہور'' سے چھپا تھا۔ میرے پیش نظر ''حصہ دوم (شہادتیں)'' ہے۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ کا یہ خلاصہ اسی سے لیا گیا ہے۔ چند صفحات کے بعد ملاحظہ فرمائیے:

وزیرِ ہند اور وائسرائے کی کونسلوں کے ممبران:

مانٹیگو اصلاحات نے وزیرِ ہند کی کونسل کے ممبروں کی تعداد آٹھ سے بارہ کے درمیان

مقرر کی۔ اس کے نصف ممبروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ آٹھ دس برس ہندوستان میں رہے ہوں۔ وائسرائے کی کونسل کے ہندوستانی ممبروں کی تعداد تین کردی گئی۔ کونسل کے دو ایوان سینٹرل اسمبلی اور کونسل کر دیے گئے۔ اسمبلی کے ۱۴۵ ممبروں میں ۱۰۵ منتخب اور ۴۰ نامزد تھے۔

۶؍ فروری ۱۹۱۹ء کو ولیم ولسنٹ نے کونسل میں ''رولٹ'' بل پیش کیا (یعنی حکومت کو حسب منشا گرفتاری اور مقدمہ دائر کرنے کا اختیار۔) اس سیاہ بل پر بڑی لے دے شروع ہوگئی۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگر یہ بل پاس ہوگیا تو وہ ستیہ گرہ کریں گے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ملک کے بہت سے مقامات کا دورہ کیا اور ستیہ گرہ کے لیے ۲۴؍ فروری کی وارننگ حکومت کو دے دی جو معینہ وقت پر جاری کردی گئی۔

۶؍ مارچ کو گاندھی جی نے ایک بیان دیا کہ سچائی کے ساتھ میرا یہ فیصلہ ہے کہ انڈین کرمنل لا امینڈمنٹ اور کرمنل ایمرجنسی بل غیر انصافی پر مبنی اور انسانیت کے خلاف ہیں۔ اگر یہ منظور کرلیا گیا تو جب تک حکومت اسے واپس نہ لے لے گی ہماری ستیہ گرہ چلتی رہے گی۔ ۳۰؍ مارچ کا دن عام ہڑتال کرنے، دعائیں مانگنے اور جلسہ جلوس کے لیے معین کیا گیا۔ بعد میں ۶؍ اپریل ۱۹۱۹ء کا کردیا گیا لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے یہ اعلان بروقت دہلی نہ پہنچ سکا اور دہلی والے اسی پرانے اعلان پر کاربند رہے۔

ہڑتال کے دن حکومت نے کچھ لیڈروں کو گرفتار کرلیا۔ حریت پسند عوام اپنے گرفتار شدہ لیڈروں سے ملنے کے لیے دہلی اسٹیشن پر پروانہ وار جمع ہوگئے۔ حکومت نے نہتے ہندو مسلم عوام پر بے تامل گولیاں چلوادیں۔ کچھ لوگ ہلاک اور بہت سے زخمی ہوگئے، جنھیں ہسپتال روانہ کردیا گیا۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

رولیٹ بل اور اس کا مقصد:

فروری مارچ ۱۹۱۹ء:

رولیٹ بل کے جابرانہ قانونی کا مختصراً تجزیہ درج ذیل ہے:

(۱) حکام کو اختیار دے دیا گیا کہ جس شخص سے چاہیں ضمانت و مچلکہ یا صرف ضمانت

طلب کرلیں۔

(۲) جس شخص کو چاہیں حکم دے کر اس کو کسی ایک جگہ نظر بند کردیں۔

(۳) امتناعی حکم بعض معمولی معاملات میں بھی جاری کرنے کے حکام مجاز قرار دیے گئے۔ مثلاً اخبار نویسی، پرچے تقسیم کرنا، جلوس یا جلسوں میں شریک ہونا وغیرہ۔

(۴) حکام کسی شخص کو حکم دے سکتے تھے کہ وہ اپنی موجودگی کی رپورٹ پولیس میں اوقات معینہ پر درج کرائے۔

(۵) حکام جس کو چاہیں بلا وارنٹ اور بلا فرد جرم بتائے گرفتار کرلیں۔

(۶) حکام جس کو چاہیں بلا عدالت کی سزا کے قید رکھیں۔

(۷) جو ہندوستانی ملک کے باہر ہیں ان کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع قرار دے دیں۔

(۸) اگر کسی کے قبضے میں کوئی ضبط شدہ کتاب یا مضمون پایا جائے تو خواہ وہ اسے بیچنے یا نشر کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو محض قبضہ میں پائے جانے کی وجہ سے مستوجب سزا ہوگا۔

یہ بل فروری ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ مہاتما گاندھی ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور احمد آباد میں اپنی کمزوری کا علاج کر رہے تھے، وہ سخت بے چین ہوئے، ولبھ بھائی پٹیل سے انھوں نے کہا کہ اگر چند آدمی تحریری احتجاج کردیں اور اس پر راضی کیے جاسکیں تو ستیہ گرہ کی جاسکتی ہے۔ چناں چہ ۲۴ر فروری ۱۹۱۹ء کو ستیہ گرہ آشرم میں ایک چھوٹی سی کانفرنس ہوئی جس میں ولبھ بھائی پٹیل، مسز نائیڈو، بی جی ہارنیمین، عمر سوبانی، شنکر دیال بینکر وغیرہم شریک ہوئے تھے اور وہاں طے کیا گیا کہ ستیہ گرہ کا ایک حلف نامہ تیار کرکے اس پر لوگوں سے دستخط لیے جائیں اور یہ بھی طے ہوا کہ ایک ستیہ گرہ کمیٹی قائم کی جائے۔ وہ جو لائحہ عمل تیار کرے اس کے سب لوگ پابند ہوں۔

مرد میدان گاندھی درویش خو پر اس جابرانہ ایکٹ نے وہی کام کیا جو آگ پر پٹرول کرتا ہے۔ چناں چہ گاندھی نے ستیہ گرہ کرنے کا عزم مصمم کرلیا اور ستیہ گرہ کمیٹی نے ۲۳ر مارچ ۱۹۱۹ء کو فیصلہ کرکے ستیہ گرہ کا یہ طریقہ منظور کیا کہ جو لٹریچر ضبط اور ممنوع قرار دیا گیا ہے اسے چھاپا اور بانٹا جائے اور اخبارات کے رجسٹریشن کے قوانین کی بھی خلاف ورزی کی جائے۔

گورنمنٹ نے بجائے اپنا طریقہ ملائم کرنے کے مارچ ۱۹۱۹ء کو ترمیم ضابطۂ فوجداری کا ایک بل شائع کر کے ۱۸ر مارچ ۱۹۱۹ء کو ایکٹ بنا دیا۔ اس ایکٹ کی رو سے گورنمنٹ نے مزید اختیارات سول آزادی کو سلب کرنے کے حاصل کر لیے تھے۔
(تحریک خلاف: قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۸۲۔۸۱)

ہنٹر کمیٹی رپورٹ

ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ دو سو صفحات میں شایع ہوئی ہے۔ جس کے ساتھ کئی نقشے اور باتصویر قطارے شامل ہیں۔ ایک سو صفحوں میں پانچ انگریز ممبروں اور ساٹھ صفحوں میں ہندوستانی ارکارن کی لکھی جدا جدا رپورٹ ہے۔

۲۵ لاکھ روپیہ کا نقصان:

کمیٹی کی رائے ہے کہ گذشتہ فسادات میں پنجاب کو ۲۵ لاکھ روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

مہاتما گاندھی کا ستیہ آگرہ:

ان فسادات کی ایک بھاری وجہ مہاتما گاندھی کا ستیہ آگرہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ کا اثر، مالی مشکلات، قحط سالی، ہندوستان میں سوراجیہ کی تحریک، مسئلہ ترکی اور گورنمنٹ ہند کے طریق حکومت کے خلاف جذبات کی وجہ سے جو سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو اور بھی بڑھا کر قانون کی طرف سے لوگوں کی طبیعت کو منحرف کر دیا۔
پنجاب میں رنگروٹوں کی بھرتی سے رولٹ ایکٹ کا کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔
یورپین ممبر کی رائے میں گورنمنٹ کا کچھ قصور نہیں ہے۔ مگر انگریز اور دیسی ہندوستانی ممبروں کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ مندرجہ ذیل باتوں میں ہندوستانی ممبر یورپین

ممبروں سے بالکل اتفاق نہیں کرتے۔ فسادات کی نوعیت، مارشل لا جاری کرنے، اور اسے دیر تک قائم رکھنے، پنجاب گورنمنٹ کے طرز حکومت وغیرہ کئی باتوں میں ہندوستانی ممبر یورپین ممبروں سے بالکل اتفاق نہیں کرتے۔

انگریزی ممبروں کی رائے ہے کہ حقیقت میں بغاوت کے لیے کوشش کی گئی تھی۔ لیکن ہندوستانی ممبر اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

اگر مہاتما گاندھی پنجاب میں جاتے تو بغاوت ہو جاتی:

کمیٹی کی رائے ہے کہ اگر مہاتما گاندھی کو دہلی اور امرتسر آنے سے نہ روکا جاتا تو بغاوت ہو جاتی۔ انگریزی ممبروں کی رائے ہے کہ یہ تحریک گورنمنٹ اور یورپین لوگوں کے خلاف تھی۔ مگر ہندوستانی ممبروں کی رائے ہے کہ پہلے کسی قسم کے مخالفانہ جذبات نہ تھے مگر بعد میں ہو گئے۔

گولیاں چلانی ہی پڑیں:

انگریز ممبروں کی رائے ہے کہ جلیانوالہ باغ میں اگر لوگوں کو ہٹ جانے کے لیے کہا جاتا تو وہ ہرگز نہ ہٹتے۔ اس لیے گولیاں چلانی ہی پڑیں۔ یقینی جنرل ڈائر نے بہت دیر تک گولیاں چلائیں، یہ اچھا نہیں کیا۔

جنرل ڈائر نے زخمیوں کو کوئی طبی امداد نہیں پہنچائی۔ جنرل ڈائر نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا۔ وہ اسے اس میں قصوروار نہیں قرار دیتے۔

لیکن ہندوستانی ممبر یہ کہتے ہیں۔ جنرل ڈائر نے جو کچھ کیا وہ انسانیت کے خلاف اور اہل برطانیہ کے نام پر کلنک ہے۔

کمیٹی گوجرانوالہ، امرتسر، لاہور اور قصور میں جو کارروائی ہوئی ہے درست قرار دیتی ہے۔

مگر مارشل لا کی عدالتوں کے سامنے ذرا ذرا سی باتیں لانا ٹھیک نہیں تھا۔

ہندوستانی ممبر عدالتوں کے تقرر، گرفتاریوں اور عدالتوں کے طرزِ عمل کے خلاف سخت غیر مطمئن ہیں۔

پنجاب میں باہر سے وکیلوں کی امداد کے خلاف پابندیاں عاید کرنا، یہ کمیٹی نے پسند نہیں کیا۔

پیٹ کے بل رینگنا،
گوجرانوالہ اور قصور میں جبریہ سلام کا حکم،
لاہور میں طالب علموں پر زیادتی،

اچھا نہیں کیا۔ تمام کی متفقہ رائے ہے کہ یہ طرزِ عمل نہایت خراب تھا۔ ہندوستانی ممبروں کی رائے میں یہ تمام باتیں باہمی نفرت کو بڑھانے والی، اہل ہند کی بے عزتی اور یورپین اور ہندیوں میں تلخی نفرت کے جذبات پیدا کرنے والی ہیں۔

"ہنٹر کمیٹی رپورٹ کے متعلق

وزیر ہند کا مراسلہ
وائسرائے ہند کے نام

انڈیا آفس　　　　　　نمبر ۱۰۸ پبلک

۲۶ رمئی ۱۹۲۰ء

بخدمت ہز ایکسیلنسی رائٹ آنریبل گورنر جنرل باجلاس کونسل یوئر ہز ایکسیلنسی!

اوائل سال گذشتہ میں پنجاب اور دیگر حصص ہند میں جو فسادات واقع ہوئے۔ ان کے متعلق لارڈ ہنٹر کمیٹی نے جو رپورٹ تیار کی ہے۔ اس پر حضور ملک معظم کی گورنمنٹ نے غور و خوض کیا ہے یوئر ایکسیلنسی کی گورنمنٹ نے اس رپورٹ پر جو رائے اپنے مراسلہ مورخہ ۳ رمئی میں ظاہر کی تھی۔ اور جس کا مضمون آپ نے بذریعہ تار مجھے بھیجا ہے۔ اس سے بھی میں نے حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کو مطلع کر دیا ہے۔ رپورٹ میں اور آپ کی مراسلت میں قدرتی طور پر بعض ایسے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ جن کے متعلق حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کا

یہ منشا نہیں کہ ان پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے۔ لیکن حضور کی گورنمنٹ نے اس معاملے پر جو نظر تفصیلی ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے انھوں نے رپورٹ کے بعض اہم تر مسائل کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے اور مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں آپ کی چٹھی کا جواب دیتے ہوئے حضور ملک معظم کے ان فیصلوں کا بیان بھی آپ کی اطلاع کے لیے قلم بند کر دوں۔ لہٰذا اس مراسلہ کے فقرہ ۲ سے ۸ تک وہی بیان اندرلج ہے۔

۲۔ سرسری نظر:

لارڈ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ میں جو کچھ درج ہے۔ وہ ایک طویل اور گہری تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کمیٹی کے اراکین کے نہایت مکمل اور ہوش مندانہ نتائج سے کوئی عملی کام نہ لیا گیا تو ان کی محنت بے سود ہوگی۔ جو نتائج یہاں درج کیے گئے ہیں۔ وہ اس عقیدے پر مبنی ہے کہ رپورٹ سے فائدہ اٹھانے کے لیے حضور ملک معظم کی گورنمنٹ اور حکومت ہند کا سب سے بڑا فرض یہی نہیں کہ سابقہ واقعات کے متعلق چند افراد پر الزامات لگا دیے جائیں یا انھیں سزائیں دے دی جائیں۔ بلکہ حقیقی فرض یہ ہے کہ اگر بدقسمتی سے آیندہ بھی حالاتِ زمانہ کے ماتحت وہی صورتِ معاملات پیش آ جائے، جیسی ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں ہندوستان کے اندر پیش آئی تھی۔ تو اس رپورٹ سے مستفید ہو کر ایسا موقع ہی نہ آنے دیا جائے کہ کوئی کسی پر الزام دے یا کسی کو اپنی حرکات پر افسوس ظاہر کرنا پڑے۔

۳۔ ۱۳/اپریل کو امرتسر میں بریگیڈیر جنرل ڈائر کا طرز عمل:

شہر امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو جو کچھ واقعہ ہوا۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ وہ واقعات لارڈ ہنٹر کمیٹی رپورٹ میں بہت طویل درج کیے گئے ہیں اور بریگیڈیر جنرل ڈائر نے خود کمیٹی کے سامنے جو تحریری و تقریری شہادت دی ہے۔ اس میں تو بے انتہا تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ اب وہ مکمل تفصیلات عوام الناس کو دستیاب ہو سکتی ہیں۔ واقعات کے متعلق تو نہ کوئی شک ہے اور نہ اعتراض اور یہ لازم ہے کہ ہم یہاں ان واقعات کو سادہ اور مختصر

طور پر بیان کردیں۔

بریگیڈیر جنرل ڈائر ۱۱راپریل کی رات کو امرتسر پہنچا اور ۱۳ر کی صبح کو اس نے ایک اعلان شائع کیا جس میں حکم دیا کہ کوئی جلوس شہر کے اندر یا باہر گشت نہ کرے اور اگر چار آدمیوں کا بھی کوئی ایسا جلوس یا جلسہ مجتمع ہوا تو وہ مجمع خلاف قانون قرار دیا جائے گا اور اگر ضروری ہوا تو بزور اسلحہ منتشر کر دیا جائے گا۔ بریگیڈیر جنرل ڈائر خود نو بجے ایک فوج کا دستہ ساتھ لے کر اپنے کیمپ سے نکلا۔ اور یہ اعلان شہر کے مختلف مقامات پر پڑھوا کر عوام الناس کو سنایا اور آخر ڈیڑھ بجے واپس کیمپ میں آیا۔ اپنے کیمپ واقع رام باغ میں واپس آنے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بریگیڈیر جنرل ڈائر نے سنا کہ اس اعلان کے باوجود اسی دن ساڑھے چار بجے بعد دوپہر جلیانوالہ باغ میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہونے والا ہے چار بجے کے قریب اسے یہ اطلاع ملی کہ تقریباً ایک ہزار آدمیوں کا مجمع جلیانوالہ باغ میں جمع ہو چکا ہے۔ چار بجے سے کچھ عرصہ بعد بریگیڈیر جنرل ڈائر رام باغ سے اپنے بھاری دستے ساتھ لے کر چل دیا (کیوں کہ اس سے پہلے اس نے شہر کے بڑے بڑے دروازوں پر پہرہ بٹھا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا) اس وقت اس کے ساتھ ایک خاص دستہ بھی تھا جس میں پچاس ہندوستانی (اسلحہ) سے مسلح تھے۔ دو مسلح موٹر کاریں بھی ساتھ تھیں۔ اس نے اپنے دستوں کو راستے میں چھوڑا اور سیدھا جلیانوالہ باغ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہاں پہنچا تو اپنے پیدل دستہ کو ایک تنگ سی گلی میں سے باغ میں داخل کر کے انھیں دروازے کے دائیں اور بائیں طرف متعین کر دیا۔ چوں کہ گلی بہت تنگ تھی۔ اس لیے مسلح موٹر کاریں باہر ہی چھوڑ گیا۔ اپنے فوجی دستوں کو اس طرح متعین کر کے بریگیڈیر جنرل ڈائر نے فی الفور گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اور سامنے کے گنجان مجمع پر (جو خود ڈائر کے اندازے سے پانچ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا) دس منٹ تک اپنے حسب منشا گولیوں کی بوچھاڑ کروائی حتیٰ کہ گولی بارود کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ ۳۰۳ء نشان ۶ کے ۱۶۵ کارتوس چلائے گئے۔ جنرل ڈائر کی اس گولہ باری سے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ۳۷۹ (افراد) ہلاک ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد کا ابھی صحیح اندازہ نہیں کیا گیا۔ لیکن لارڈ ہنٹر کمیٹی کے اراکین اندازے کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ مجروحین کی تعداد مقتولین سے تگنی ہوگی۔ گولی چلانا موقوف

کرتے ہی بریگیڈیر جنرل ڈائر فوراً اپنے دستے کو رام باغ واپس لے گیا۔ اس قدر شدت سے اور اس قدر دیر تک گولی چلانے کے باوجود جنرل ڈائر نے اس تحریری بیان میں (جو حالات لکھے ہیں اور سولھویں ہندوستانی ڈویژن کے جنرل اسٹاف کو بھیجا گیا تھا اور اس کے بعد لارڈ ہنٹر کمیٹی کے روبرو پیش کیا گیا تھا۔ اس بیان کا کچھ حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''جب تک ہم میں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کی قابلیت مقدار کثیر میں موجود نہ ہو۔ ہم بہادر نہیں بن سکتے۔ میں نے معاملے پر ہر پہلو اور ہر نقطۂ خیال سے غور کر لیا تھا۔ میرے احساس فرض اور میری فوجی تحریک طبعی نے مجھے گولی چلانے پر آمادہ کر دیا۔ میرے ضمیر نے بھی اس امر پر مجھے بالکل ملامت نہیں کی۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ کل ڈنڈا فوج اٹھ کر ہمارے سر ہو جائے گی۔ (لاہور میں بلوائیوں نے اپنے مجمع کا یہی نام رکھا تھا) میں نے گولی چلائی اور برابر چلاتا رہا۔ یہاں تک کہ ہجوم منتشر ہو گیا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ جس قسم کا وسیع اخلاقی اثر پیدا کرنا میرے فرائض میں داخل تھا۔ ویسا اثر پیدا کرنے کے لیے گولیوں کی یہ مقدار بہت کم تھی، اگر سپاہی زیادہ ہوتے تو مقتولوں کی تعداد موجودہ تعداد سے نسبتاً زیادہ ہوتی۔ اس وقت صورت معاملات ایسی تھی کہ صرف ہجوم کو منتشر کرنے کا سوال ہی نہ نظر آتا تھا۔ بلکہ فوجی نقطۂ خیال سے یہ ضروری تھا کہ نہ صرف ان پر جو اس وقت حاضر تھے بلکہ بالخصوص تمام اطراف پنجاب میں ایک زبردست اخلاقی اثر پیدا کیا جائے ایسی حالت میں ناواجب تشدد کا تو کوئی سوال ہی نہ ہو سکتا تھا۔''

گورنمنٹ کی حکمت عملی:

جب دیوانی حکام کی مدد کے لیے فوجی امداد کی ضرورت ہو اس حالت میں طریقہ ہائے عمل کے متعلق جو اصول حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کی حکمت عملی پر حاوی ہوا کرتا ہے۔ اس کا

بیان بالوضاحت اس طرح ہوسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سپاہیوں کی تعداد کم سے کم ہونی چاہیے۔ حضور ملک معظم کی گورنمنٹ نہایت وثوق سے اس امر پر قائم ہے کہ جہاں کہیں بدقسمتی سے ایسے حالات رونما ہو جائیں کہ سلطنت برطانیہ کے اندر دیوانی بدنظمی کو فوجی طاقت کے ذریعے سے دبانے کی ضرورت ہو تو یہی اصول سرکاری حکمت عملی کا ابتدائی عنصر ہے۔

ڈائر کے متعلق وزیر ہند کی رائے:

ان حالات کے ماتحت نہایت افسوس کے ساتھ اور بغیر کسی امکان شبہ کے ماننا پڑے گا کہ بریگیڈیر جنرل ڈائر نے جو کچھ جلیانوالہ باغ میں کیا، وہ اس اصول متذکرہ بالا کی صریح اور پوری پوری خلاف ورزی تھی۔ اس وقت اس کے سامنے صرف یہ کام تھا۔ کہ ایک بہت بڑا لیکن نہتا مجمع اس کے احکام کی خلاف ورزی کر کے اس جگہ جمع ہو گیا تھا۔ اگر اس کو منتشر کرنا ضروری تھا تو انھیں بزور منتشر کر دیتا۔ یہ ممکن ہے کہ اپنے فوجی دستے کی کم تعداد لوگوں کے عظیم الشان ہجوم اور باشندگان شہر کے عام غضب ناک رویے کا خیال رکھ کر بریگیڈیر جنرل ڈائر نے سمجھا ہو کہ جب تک گولی نہ چلائی جائے گی اور جانوں کا نقصان نہ ہوگا اس وقت تک کام کا مؤثر و مکمل طور پر سرانجام ہونا ناممکن ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ

اس نے سپاہیوں کی اس کم سے کم تعداد کو جانچنے کی کوشش نہیں کی۔ جس کے تعینات کرنے پر وہ مجبور تھا۔ جتنے فوجی سپاہی اس نے اس کام پر تعینات کیے وہ بہت زیادہ تھے۔ حال آں کہ صرف ہجوم کو منتشر کرنے کا کام بہت کم آدمی بھی کر سکتے تھے۔ اس زیادتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ افسوس ناک اور بے سود نقصان جان ہوا اور عوام پر سخت مصیبت ٹوٹی۔ لیکن بریگیڈیر جنرل ڈائر کی غلطیوں کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس میں کچھ شک نہیں ہوسکتا کہ مجمع میں کثیر التعداد اشخاص آس پاس کے دیہات سے آئے ہوئے تھے۔ اور انھیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ کوئی اعلان امتناعی نافذ ہو چکا ہے اور وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ اس جلسے میں شامل ہونا سخت خطرے کا موجب ہے۔ اعلان شہر کے صرف ایک حصے میں شائع کیا گیا تھا اور وہ حصہ جلسہ گاہ سے دور واقع تھا۔ پھر گولی چلانے سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا اعلان بھی نہیں کیا

گیا۔ چوں کہ شہر کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور جس دن سے فوجیں شہر میں جنرل کی زیر کمان آئی تھیں۔ اس دن سے انھیں تکلیف بھی بہت اٹھانی پڑی تھی۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ اول الذکر معاملے پر زیادہ زور دیا جائے۔ لیکن گولی چلانے سے پہلے تنبیہ نہ کرنا بالکل ناقابل معافی ہے۔ بریگیڈیر جنرل ڈائر سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایک اور غفلت بھی ہوئی۔ یعنی اس نے جاں بلب اشخاص اور مجروحین اشخاص کو طبی امداد پہنچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن یہ سب سے زیادہ سنگین الزام بریگیڈیر جنرل اوڈوائر پر عاید ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی زبان سے یہ اقرار کرلیا کہ ایسے حالات میں یہ امر اس کے فرائض میں داخل نہ تھا۔

ڈائر کے عقیدے سے روگردانی:

ملک معظم کی گورنمنٹ اس عقیدے سے سخت روگرداں ہے، جس پر بریگیڈیر جنرل ڈائر نے اپنے طرز عمل کی بنیاد رکھی۔ اگر اس کے اپنے بیان ہی کو لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنرل ڈائر کے ماتحت زیادہ جمعیت ہوتی یا ایک جسمانی حادثہ اسے اپنے زرہ پوش موٹر کو کام میں لانے سے مانع نہ آتا۔ تو اس کا طرز عمل اور ہول ناک صورت اختیار کر لیتا۔

۱۳ر اپریل کو جو صورت حالات ہندوستان کے حکام کو عموماً اور بریگیڈیر جنرل ڈائر کو خصوصاً نظر آ رہی تھی۔ اس کی اہمیت اور نزاکت گورنمنٹ سے پوشیدہ نہیں۔ گورنمنٹ یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ جنرل ڈائر نے نظر بحالات اپنے اوپر بہت بڑی ذمہ داری لی اور بخیال خود صحیح طور پر لی۔

گورنمنٹ کی رائے میں یورپینوں کی جانیں اور برطانی و ہندوستانی سپاہ کی سلامتی شاید اس سے زیادہ خطرے میں تھی جو کمیٹی نے ظاہر کیا ہے۔ خود امرتسر میں تین روز پہلے بے رحمانہ قتل وخون اور نہایت وحشیانہ آتش زدگیاں عمل میں آچکی تھیں اور شہر پر مجمع کا تسلط تھا۔ ملحقہ دیہات سے ہر ساعت اسی قسم کے خطرناک فسادوں اور سلسلۂ رسل و رسائل کے انقطاع کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ جن کی رہی سہی کمی ایسی افواہوں سے پوری ہوتی تھی جنھیں نہ تو

کسی طرح تصدیق کیا جا سکتا تھا۔ اور نہ جھٹلایا جا سکتا تھا۔ ایسی حالت میں ایک قلیل جمعیت کے ساتھ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے بریگیڈیر جنرل ڈائر پنجاب کی عام حالت سے طبعاً خالی الذہن ہو سکا اور وہ ان حالت کی مطابقت میں اپنی تجاویز پر عامل ہونے کا مجاز تھا۔ لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وسیع پیمانے پر سزا دینے کے لیے وہ ایک ایسے نہتے مجمع کو منتخب کر لے، جس نے بریگیڈیر جنرل ڈائر کی سزا دہی کے بعد کسی پرسختی سے جرم کا ارتکاب نہیں کیا، نہ سزا دینے والے کے مقابلہ کی کوشش کی اور پھر اس مجمع کے کثیر التعداد اشخاص اس بات سے ضرور بے بہرہ ہوں گے کہ ہم بریگیڈیر جنرل ڈائر کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

رینگنے کا حکم قابل تحقیر ہے:

بریگیڈیر جنرل ڈائر کے ۱۳ اپریل والے طرز عمل پر فیصلہ صادر کرتے ہوئے اس حکم کو نظر انداز کرنا غیر ممکن ہے جو اس نے چھ روز بعد نافذ کیا اور جسے عام اصطلاح میں ''رینگنے کا حکم'' کہا جاتا ہے۔ اس حکم کی نوعیت یا اس کے جاری کرنے کے اسباب کا بیان بے سود ہے۔ اگر یہ حکم ان اشخاص کے خلاف نافذ ہوتا جو فی الواقع اس جرم کے ارتکاب کنندہ تھے۔ جس کی پاداش میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ تو اسے حق بجانب ثابت کرنا دشوار تھا۔ مگر اس کا اطلاق ایسے اشخاص پر بھی کیا گیا ہے جن کا جرم زیر بحث سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر اسے اشخاص مذکور کی تحقیر و تذلیل کا آلہ بنایا گیا ہے کہ اس جرم کی اہمیت اہل امرتسر کے ذہن نشین کر دی جائے جو پبلک کے بعض افراد سے سرزد ہوا ہے ایسی حالت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ حکم مذکور سے مہذب حکومت کے ہر قاعدہ اور قانون کی تحقیر ہوتی ہے۔

۴۔ مارشل لا کی ذمہ داریاں:

اگر کوئی فوجی کمانڈر کسی حریف ملک میں مارشل لا جاری کرے تو اسے اہم ذمہ داری اپنے سر لینی پڑتی ہے۔ مگر جب وہی کمانڈر اس ذمہ داری کو ایک ایسی رعایا پر برتے جو عقیدت

مند ہو اور اسی حکومت کو اپنی پشت پناہ سمجھتی ہو جس کا وہ خدمت گذار ہے۔ تو اس ذمہ داری کے بار گراں کی کوئی حد نہیں رہتی۔

اگر کسی واقعہ کی پیش بندی کے طور پر سخت قواعد وضوابط کے جاری کرنے کی تجویز ہو۔ یا کسی خطرے کے گزر جانے کے بعد بے حد ملامت انگیز نکتہ چینی کی جائے۔ تو کمانڈر کی آزادانہ قوت فیصلہ قایم نہیں رہتی۔ جس سے امن عامہ کے خطرے میں پڑنے کا احتمال ہوتا ہے۔ حال آں کہ وہ اس (کے) قیام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایک خالص فوجی معاملہ کو فوجی نقطۂ خیال ہی سے سرانجام دینا چاہیے۔ ہر چال چلن کے بعض معیار ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں کوئی مہذب حکومت بے باکانہ طور پر نظر انداز نہیں کر سکتی اور جن کی صداقت ہز میجسٹی کی گورنمنٹ بھی ماننے کو تیار ہے۔ چناں چہ ان معیاروں کی رو سے ایک افسر جو مارشل لا کا منصرم ہو بلا روک ٹوک اپنا مفوضہ فرض اس طریق میں انجام دے سکتا ہے۔ جسے وہ اپنے نزدیک نہایت بہتر اور مؤثر سمجھتا ہے۔ اور جب اس کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو اسے بھروسا ہونا چاہیے کہ میرے افسران بالادست میری پوری پوری امداد کریں گے۔

ڈائر اپنے عہدے کے نا قابل ہے:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بریگیڈیر جنرل ڈائر نے نیک نیتی کا اظہار کیا اور اپنے فرض کا جو مفہوم اس کے دل میں آیا۔ اس پر عمل پیرا ہونے کو بے باکی سے تیار ہو گیا۔ لیکن اس کے فرض کا مطلب ان حالات میں جن میں کہ وہ تھا۔ اس مفہوم سے اصولاً بالکل جدا ہے۔ جس کی توقع ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو اپنے افسروں سے ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے بریگیڈیر جنرل ڈائر اب ان ذمہ داریوں کا اہل نہیں ہو سکتا۔ جو اس کے رتبے اور حیثیت نے اس پر عاید کر رکھی ہیں۔ آپ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کمانڈر انچیف نے بریگیڈیر جنرل ڈائر کو ہدایت کی ہے کہ اپنے عہدے سے دست بردار ہو جاؤ۔ تمھیں ہندوستان میں کوئی ملازمت نہ ملے گی اور آپ نے اس رائے سے اتفاق کر لیا ہے۔ میرے نزدیک بھی یہی فیصلہ پسندیدہ ہے اور معاملہ آرمی کونسل (فوجی مجلس) میں پیش کیا گیا ہے۔

مارشل لا کا اعلان اور اس کا مسلسل جاری رکھنا:

لارڈ ہنٹر کی کمیٹی کی جماعت کثیر کا فیصلہ قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ مارشل لا کا اعلان یا پنجاب کے ان اضلاع میں معمولی عدالتوں کی بندش حق بجانب تھی۔ جن میں مارشل لا نافذ کیا گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو باب ٦ جملہ ١٧)

اسے طول دینے کے بارے میں یہ ظاہر ہے کہ مارشل لا کے نفاذ میں یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اسے کب منسوخ کرنا چاہیے عام اصول جو صاف ہے، یہ ہے کہ جب عوام کی سلامتی اس کا تقاضا نہ کرے، مارشل لا بند کر دیا جائے۔ لیکن اس فیصلہ پر پہنچنے کے لیے کوئی صاف قاعدہ موجود نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ بعد کے واقعات کی روشنی میں اس پر فیصلہ کی کوئی نظر بازگشت ڈالی جائے۔ مارشل لا کی موقوفی سے پہلے علانیہ فتنہ وفساد کا رک جانا شاید مارشل لا ہی کی موجودگی کے باعث عمل میں آیا ہو اور اگر اسے جلد بند کر دیا جاتا تو ممکن ہے کہ فتنہ وفساد پھر پھوٹ پڑتا۔ مگر واقعات کی روشنی میں نظر بازگشت ڈالنے سے یہ رائے قایم کرنا جائز ہے کہ مارشل لا کو کچھ مدت پہلے بند کرنا ممکن تھا۔ اگر ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اگر مارشل لا کو اس طریق سے نہ برتا جاتا اور اس کے متعلق کوئی شکایت نہ پیدا ہوتی تو مذکورہ بالا دلیل پر اتنا زور نہ دیا جاتا جتنا کہ اب دیا گیا ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ ان حکام کو قابل ملامت سمجھا جائے۔ جنھیں اپنی پیش بندیوں پر انحصار کرنا پڑا۔

۵۔ قانون نمبر (۴) ۱۹۱۹ء جائز تھا:

اس قانون کا جواز اور اس کا فیصلہ حال ہی میں پریوی کونسل کی جوڈیشنل کمیٹی نے کر دیا ہے۔ نہ یہ امر قابل اعتراض ہو سکتا ہے کہ کسی قانون کو جس کے رو سے مارشل لا کی خاص عدالتیں اور ضوابط قایم کیے جائیں اثر بازگشت دیا جائے۔ تا کہ ان عدالتوں کی حدود سماعت میں ایسے اشخاص لائے جا سکیں، جو علانیہ ایسے سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں، جو مارشل لا کے اعلان اور اس کے جائز ہونے کے محوری اسباب تھے۔ ضلع لاہور اور امرتسر میں جس قانون کے رو سے مارشل لا کی خاص عدالتیں قایم کی گئی تھیں۔ وہ دراصل انھی جرایم کی سماعت کر سکتی

تھیں جو ۱۳؍اپریل یا اس کے بعد ظہور میں آئے۔ اگر یہ تاریخی ترمیم نہ کی جاتی تو مارشل لا کی عدالتیں ان مجرموں کے مقدمات سماعت کر ہی نہ سکتی تھیں۔ جنھوں نے ۱۰؍اپریل کو امرتسر میں فی الواقع کشت و خون، آتش زدگیوں اور اتلاف املاک میں حصہ لیا۔ یا جو ۱۰۔ ۱۱ اور ۱۲؍اپریل کو لاہور کے بلوؤں میں شریک ہوئے۔ یا جو ۱۲؍اپریل کو قصور میں قتل کی وارداتوں کے مرتکب ہوئے۔ اگر حکومت ہند ایسی حالت میں جائز اختیارات کے ہوتے ہوئے بھی اس نقص کو دور نہ کرتی تو وہ امن و امان کی سریع بحالی میں ایک نہایت ضروری اور بدیہی تدبیر سے غافل رہتی۔ مگر ان اشخاص کے خلاف جن کا جرم بس یہیں تک محدود تھا کہ انھوں نے اخبارات میں مضامین لکھے یا ایسے لیکچر دیے جو علانیہ بدامنی کا فوری سبب نہ تھے۔ ان پر اس قانون کو برتنا اور ان پر مارشل لا کے مخصوص طریق سماعت مقدمہ کا قائم کرنا ایک بالکل علاحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرز عمل کے متعلق لارڈ ہنٹر کی کمیٹی کے انگریز ممبروں نے جو ''بدقسمت'' اور ''ناعاقبت اندیش'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ ہرگز مبالغہ آمیز نہیں۔

ان تمام کارروائیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو قانون نمبر (۴) ۱۹۱۹ء کے ماتحت عمل میں لائی گئیں اور جن سے انکار کرنا غیر ممکن نہیں ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو کوئی شک و شبہ نہیں کہ قانون کا مدعا بہت وسیع تھا۔ اور اگر آئندہ اس قسم کا کوئی قانون وضع کیا جائے تو اس ۔ کر اطلاق کی مناسب حد بندی کر دینی چاہیے۔

۶۔ مارشل لا کا عمل درآمد:

ایک بات اور ہے جس کے بارے میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ لارڈ ہنٹر کی کمیٹی کے انگریز ممبروں نے اپنی رائے اس طریق میں ظاہر نہیں کی۔ جو بدقسمتی سے واقعات کے رو سے نہ صرف مناسب بلکہ لازمی تھا۔ کمیٹی کی رپورٹ کے باب دوازدہم میں جملہ نمبر ۱۶ سے لے کر ۲۵ تک انگریز ممبروں نے بالعموم مارشل لا کی سنگین صورت کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس کے ضمن میں نامناسب سختیوں اور غیر واجب سزاؤں اور احکام کی مثالیں بیان کی ہیں۔ ان نظائر کو یہاں دہرانا بے سود ہے۔ جو کمیٹی نے اپنی ہر دو رایوں میں بالتفصیل حوالہ قلم کی ہیں اور

سزا دینے کی غرض سے اس امر کا اندازہ لگانا بے سود ہوگا کہ وہ تمام افسر انفرادی طور پر جوان
احکام کے ذمہ دار تھے کس حد تک قابل مواخذہ ہیں۔ لیکن جن کی روش دوسرے پہلوؤں سے
بری یا نی الواقع قابل تعریف تھی مگر ہز میجسٹی کی گورنمنٹ ان احکام اور سزاؤں پر سخت
ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے اور مجھے آپ کو اس امر کے گوش گذار کرنے کی ہدایت کرتی ہے کہ
آپ اس فرض کی بجا آوری کا خیال رکھیں کہ گورنمنٹ کی یہ ناپسندیدگی ایسی علامت یا کارروائی
سے یقینی طور پر ظاہر ہونی چاہیے، جسے آپ ان افسروں کے متعلق ضروری خیال فرمائیں جن پر
مذکور بالا احکام اور سزاؤں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس وقت تک جو مثالیں پیش کی ہیں۔
وہ اس امر کو حق بجانب قرار دیتی ہیں کہ پنجاب میں مارشل لا کے انتظام کو ایک خاص جذبہ نے
بدنام کر دیا۔ جس نے بدقسمتی سے عمومیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ یہ وہ جذبہ تھا جس نے حکام کو
ایسے احکام کے صادر کرنے اور سزاؤں کے دینے پر برانگیختہ کیا۔ جن سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ
ہندوستانیوں کو ایک قوم کی حیثیت سے ذلیل کیا جائے۔ انھیں ایسی تکلیف پہنچائی جائے جس
سے بعض موقعوں پر بے انصافی مترشح ہو اور اخلاق اور انسانیت کے معیار کو ہنسی میں اڑایا
جائے جس کا نہ صرف ہندوستان کو بالخصوص، بلکہ مہذب دنیا کو بالعموم ان لوگوں سے مطالبہ
کرنے کا حق حاصل ہے جو ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے لیے مامور کیے گئے ہیں۔ یہ امر
باعث افسوس ہے کہ باوجود یہ کہ حکام کی ایک کثیر تعداد کی روش قابل تحسین تھی۔ پنجاب میں
بعض ایسے افسر پائے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا۔ مارشل لا کے
انتظام کی باگ ان کے ہاتھ میں اس غرض سے نہیں دی گئی تھی کہ وہ ایک خاص علاقہ کے
باشندوں کو جہاں گورنمنٹ کے خلاف معاندانہ روش اختیار کی گئی تھی اور جہاں عارضی طور پر
فوجی قبضہ کر لیا گیا تھا۔ (فوجی طاقت سے مطیع کیا جائے۔ بلکہ انھیں مارشل لا کے اختیارات
صرف اس مقصد سے دیے گئے تھے کہ وہ ان لوگوں کے متعلق فوری کارروائی کریں جنھوں نے
ایسے لوگوں کے امن میں خلل ڈالا۔ جن پر شہنشاہ معظم کی اطاعت واجب اور جو عام طور پر تاج
برطانیہ سے دلی ارادت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ یہ خیال کرنا مشکل ہے کہ اگر سول حکام مارشل
لا کے انتظام کے ساتھ ایک بہت بڑا تعلق رکھتے، تو پھر بھی یہ صورت پیدا ہوتی اور اگر بدقسمتی

سے آیندہ مارشل لا کی ضرورت محسوس ہو، تو یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی ایسا ضابطہ تجویز کیا جائے جس سے اس قسم کا تعلق پورے طور پر قایم ہو جائے۔

مارشل لا کی عدالتوں میں مقدمات کی سرسری کارروائی کے نتائج اور طریق عمل پر نظر ثانی کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ ان عدالتوں کے نقائص اور اس عظیم اختلاف کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ جو خاص عدالتوں کے فیصلوں میں پائے جاتے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس طرح سے جو تجربہ حاصل ہوا ہے۔ اس کی بدولت ایسی تجاویز اختیار کی جائیں گی کہ اگر مارشل لا کی عدالتوں کی پھر ضرورت پڑے۔ تو ان کی اصلاح کی جاسکے۔

۷۔ گوجرانوالہ میں بم پھینکنے والے طیاروں کا استعمال:

۱۴/اپریل کو گوجرانوالہ میں بم پھینکنے والے طیاروں کے متعلق لارڈ ہنٹر کی کمیٹی کے انگریز ممبروں نے حسب ذیل رائے ظاہر کی۔

> "ہمارے خیال میں کوئی شخص طیاروں سے بم پھینکنے کی کارروائی کو جائز قرار نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر اشد ضرورت ہو اور سوائے بم پھینکنے کے اور کوئی چارہ نہ ہو، اور وہ بھی خاص قیود اور حدود کی پابندی سے۔ البتہ ایسی کارروائی کو حق بجانب خیال کیا جاسکتا ہے۔ ہماری رائے میں پہلی دو صورتیں پورے طور پر یہاں موجود تھیں۔"

ہم بلوائیوں کے لیے کوئی اس قسم کی سند پیش کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ جب وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں کہ گورنمنٹ اپنے معمولی وسائل کو ان کے خلاف استعمال نہ کرسکے تو وہ ان وسائل کے عمل سے بھی مستثنیٰ ہو جائیں جو گورنمنٹ کے لیے آخری تدابیر ہوں۔

کمیٹی کے انگریز ممبر اپنی رپورٹ میں بیان کرتے ہیں کہ ہوائی جہازوں کے جن افسروں نے احکام کی تعمیل کی۔ ان پر کوئی الزام عاید نہیں کرسکتا۔ لیکن جن احکام کے رو سے یہ

کارروائی کی گئی ہے ان میں نقص نظر آتا ہے۔ انگریز ممبروں نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی ہے کہ آیندہ اس قسم کے واقعات میں اس دستور العمل پر جو ہوائی جہازوں کے افسروں کے لیے مرتب کیا جائے، پورے طور پر غور وخوض ہونا چاہیے۔

ہوائی جہاز کے استعمال کی ضرورت:

ان نتائج کے مرتب کرنے میں ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اس امر کو واضح کردینا چاہتی ہے کہ عام طور پر جن امن پسند ممالک میں بے چینی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہاں ہوائی جہاز کا عام اور صحیح استعمال یہی ہے کہ وہ دیکھ بھال کا فرض بجالائے۔ آمدورفت اور گفت وشنید کے سلسلہ کو قائم رکھے۔ کسی خاص تحریک کی اشاعت کے لیے کاغذات گرائے اور اخلاقی اثر ڈالے۔ لیکن ایسی صورتیں بھی پیدا ہوجاتی ہیں۔ جب کہ فاصلہ زیادہ ہو۔ آمدورفت کے سلسلہ کو نقصان پہنچا ہو۔ ہجوم فساد مچانے، قتل کرنے اور آگ لگانے پر تلا ہوا ہو۔ اور فساد کے اس سیلاب کو روکنے کی کوئی اور تدبیر نہ ہو تو اس وقت ہوائی جہاز کا استعمال نہ صرف حق بجانب بلکہ ضروری ہے۔ لیکن عام یا خاص ہدایات کے اجرا سے اس امر کا ذمہ لینا ناممکن ہے کہ کلدار بندوق کی گولیاں یا بم صرف اسی ہجوم کو اپنا نشانہ بنائیں گے جن پر حکام اس فوج سے جو اگر موقعہ پر موجود ہو گولیاں چلوانے میں حق بجانب ہوں۔ لیکن آیندہ ایسے حالات میں ہوائی جہاز سے بم پھینکنے کے لیے صاف اور صریح احکام کی ضرورت ہے۔ سول حکام کے یہ احکام تحریری ہونے چاہئیں۔ جن میں ہجوم کو مرعوب کرنے کے لیے ایک محدود تعداد تک بم پھینکنے اور کلدار توپ چلانے کی اجازت دینی چاہیے۔ بم اور گولیاں صرف اسی ہجوم پر چلائی جائیں جو فی الحقیقت فساد اور شورش کے جرایم کا ارتکاب کر رہا ہو۔ جس کا اندازہ ہوائی جہاز کا افسر کرسکتا ہے۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے انھیں اصولوں پر ہدایات جاری کی جائیں۔ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ افسوس کے ساتھ لارڈ ہنٹر کی کمیٹی کی اس رائے سے اتفاق کرتی ہے کہ جو ہدایات ہوائی جہاز کے انچارج کو دی گئیں جو فساد کے موقع پر گوجرانوالہ گئے، مفصل نہ تھیں۔

۸۔ سر مائی کل اوڈ وائر نکتہ چینی سے بری نہیں:

جیسا کہ سابقہ جملوں میں کہا جا چکا ہے۔ بعض امور میں جو اس تحقیقات سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ سر مائی کل اوڈ وائر کو نکتہ چینی سے بری خیال نہیں کرتی۔ اور اسی وجہ سے وہ اس ناجائز پسندیدگی کو مصدق نہیں کرتی۔ جو سر مائی کل اوڈ وائر نے بریگیڈیر جنرل ڈائر کے فعل جلیانوالہ باغ کے متعلق ناکافی اطلاع کی بنا پر ظاہر کی۔

ہز میجسٹی کی رائے میں یہ بھی بدقسمتی تھی کہ سر مائی کل اوڈ وائر نے اس وقت اپنے اولین خیال کی متابعت نہ کی۔ ایک ایسے معاملہ کے متعلق جس سے ان کا بحیثیت ایک غیر فوجی افسر کے براہ راست کوئی واسطہ نہ تھا۔ مدح سرائی یا الزام دہی سے پرہیز نہ کیا۔ ان کے وہ خیالات کم تر نکتہ چینی کے متوجب ہیں، جن کے رو سے انھوں نے دوسرا رویہ اختیار کیا۔ اور بعد میں پوری معلومات کی روشنی میں اسے برقرار بھی رکھا۔

مارشل لا کا دستور العمل:

دوسرے یہ بات ہے کہ مارشل لا کے طریق کو بعض مقدمات میں برتنے پر جو رائے پہلے ظاہر کی جا چکی ہے۔ وہی سر مائی کل اوڈ وائر پر اس حد تک چسپاں ہوتی ہے۔ جس حد تک وہ کارروائی زیر بحث کے ذاتی طور پر ذمہ دار تھے۔ مارشل لا کے عمومی انصرام کے بارے میں سر مائی کل اوڈ وائر بظاہر اس قسم کا انتظام کرنا چاہتے تھے کہ غیر فوجی حکام کو ایسی ممتاز حیثیت حاصل ہو کہ وہ فوجی حکمرانی میں مشیر کار بن سکیں۔ اور مارشل لا کے دستور العمل میں جو آپ کی گورنمنٹ کے زیر غور ہے، یہ ضرور ملحوظ رہے کہ آیندہ اس تجویز پر عمل درآمد ہو۔

سر مائی کل اوڈ وائر کی بریت:

ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو سر دست اس عام بحث سے کوئی سروکار نہیں کہ سر مائی کل اوڈ وائر کا عہد حکومتِ پنجاب میں کیسا تھا۔ انھیں معلوم ہے کہ ہندوستان میں اس مسئلہ پر بہت کچھ لے دے ہوئی ہے۔ اور ایک عام احساس پیدا کر دیا گیا ہے کہ حکومت پنجاب ان کے زیر اہتمام

تعلیم یافتہ طبقہ کی دشمن تھی اور نہ صرف ناجائز بلکہ جائز اور آئینی ایجی ٹیشن (شورش) کو بھی دبانے پر تلی ہوئی تھی۔

جہاں ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو خلوص دل سے توقع ہے کہ اس قسم کے خیالات دل سے دور کر دیے جائیں۔ وہاں سے یہ بھی خیال ہے کہ سر مائی کل اوڈ وائر کو سخت مشکل کا سامنا تھا۔ سازش عظیم کے کارندوں کی سرگرمی، خوراک کی گرانی، قلم رو کی ضرورت کے مطابق ہندوستانی فوج کے لیے رنگروٹوں کی ایک عظیم تعداد کا بہم پہنچانا۔ یہ ایسی باتیں تھیں۔ جو خوش قسمتی سے بحیثیت مجموعی صوبے کی وفاداری کو متزلزل نہ کر سکیں۔ مگر ان کے عہد حکومت میں ہمیشہ پریشانیاں پیدا ہوتی رہیں۔ اب وہ عہد اختتام پذیر ہو چکا ہے اور ہندوستان کے ساتھ ایک طویل تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ اس لیے ہز میجسٹی کی گورنمنٹ چاہتی ہے کہ سر مائی کل اوڈ وائر کے زبردست طرزِ حکومت، قوت فیصلہ اور ہمت و جرأت کی تعریف کرے جس کا ثبوت انھوں نے غیرِ معمولی دشواریوں کے زمانے میں دیا اور ان کی خدمات کو بنظر تحسین دیکھے۔

۹۔ مارشل لا کی ضرورت:

دیگر معاملات کے متعلق جو اس رپورٹ سے پیدا ہوتے ہیں یور ایکسیلنسی کی گورنمنٹ نے جو رائے ظاہر کی ہے، میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ میں عام طور سے ان سے متفق ہوں۔ البتہ وہ جملے جو اوپر مذکور ہوئے مستثنیات سے ہیں۔ میں اس بارے میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یور ایکسیلنسی کی گورنمنٹ کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان تحریروں یا دستاویزات کے چھاپ دینے سے جن سے ہندوستان اور یہاں کی پبلک کو بے حد دلچسپی ہے۔ تمام زیر بحث اور بڑے بڑے معاملات کا لازماً تصفیہ نہیں ہو جاتا۔ میں آپ سے بالخصوص توقع رکھتا ہوں کہ آپ مارشل لا کے دستور العمل کا مسودہ جو آپ کے زیر غور ہے۔ بہت جلد میرے ملاحظہ کے لیے بھیجیں۔ میں اس معاملہ کو نہایت اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میری دلی آرزو ہے کہ ان قواعد کے نفاذ کا وقت نہ آئے لیکن اگر موجودہ تحقیقات سے ضوابط کا ایک ایسا دستور العمل مرتب ہو جائے جس کی بنا پر بدامنی کا قلع قمع ہو سکے۔ اور اس کے محرکوں کو سریع اور

مناسب اور قرار واقعی سزا مل سکے۔ اور ساتھ ہی عام طور پر لوگوں کے حقوق اور طریق زیست کو ضرورت سے زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ نیز غیر فوجی عدالتی انتظام اور حکومت بحال رہے تو ایک قابل قدر مقصد پورا ہو جائے گا۔ ان حالات کی موجودگی میں جن سے کسی ریاست کی ہستی معرض خطر میں ہو۔ مارشل لا ایک ضروری تدبیر ہے۔ لیکن اگر اسے دانش مندی اور غور و خوض سے استعمال نہ کیا جائے تو اس کی تمام قدر و قیمت اکارت ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہم سب کا فرض ہے کہ ہم ناجائز استعمال سے اس کی فائدہ مندی کو کسی طرح کم نہ ہونے دیں۔

جلاوطنی کے متعلق بھی میری رائے ہے۔ موجودہ صورت میں یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس سے کام لینا مشکل ہے۔ اور نہ اس کے اثرات کا کوئی صحیح اندازہ لگ سکتا ہے۔

۱۰۔ افسروں اور ملازموں کی خدمت گزاری کا اعتراف:

ہز میجسٹی کی گورنمنٹ زوردار الفاظ میں بعض افسروں کے طرز عمل پر اعتراض کرتی ہے۔ جن کے ذمے مارشل کا انتظام تھا۔ یور ایکسیلنسی کی گورنمنٹ نے آمادگی ظاہر کی ہے کہ پولیس اور دیگر محکموں کے جن ماتحت افسروں کے خلاف اختیارات کے ناجائز استعمال کا جرم ثابت ہوگا۔ ان کے متعلق مناسب کارروائی کی جائے گی۔ لیکن ان مستثنیات سے قطع نظر کر کے ہز میجسٹی کی گورنمنٹ نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ بھی صاف صاف طور پر اس اعتراف کی تصدیق کرے۔ جو یور ایکسیلنسی نے ان اشخاص کی خدمات کے متعلق کیا ہے۔ جس میں مصافی اور غیر مصافی اور برطانی و ہندوستانی افسر اور ملازم شامل ہیں اور جن کے ذمے یہ بار گراں تھا کہ وہ اہل ہند کو وفاداری اور امن پسندی کی شہرت حسنہ از سر نو حاصل کرنے میں مدد دیں۔ یہ بوجھ جو ملک معظم کی ہندوستانی اور برطانی افواج، محکمہ پولیس اور غیر فوجی محکموں کے افسروں اور ملازموں پر عاید ہوا، بہت بھاری تھا۔ حال آں کہ وہ پہلے ہی ایک طویل جنگ کے مصائب و مشکلات بہت ہمت و استقلال سے برداشت کر کے ماندہ ہو رہے تھے۔ اپنے مفوضہ فرایض کی بجا آوری میں ان اشخاص نے اپنی خدمت گذاری کی اعلا روایات کو برقرار رکھا ہے۔

ہز میجسٹی کی گورنمنٹ یور ایکسیلنسی کی گورنمنٹ کے ساتھ ہمنوا ہو کر اس نقصان جان پر سخت متاسف ہے جو ان فسادات سے عمل میں آیا نیز وہ ان اشخاص کے ساتھ پوری ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔ جن کے خویش و اقارب مارے گئے۔

۱۱۔ وائسرائے کا اعتراف:

فی الجملہ میں خوش ہوں کہ مجھے یور ایکسیلنسی کو یہ یقین دلانے کا موقع حاصل ہوا کہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ آپ کی شکر گذار ہے کہ آپ اس اعلا اعتماد میں پورے اترے جو آپ پر کیا گیا تھا۔ گورنر جنرل ہند کے فرائض کا بارگراں ہمیشہ سے ہی بہت زیادہ رہا ہے۔ مگر اب عالم گیر حالات نے مل ملا کر آپ پر اس قدر تفکرات عاید کر دیے ہیں، جو اس سے پہلے شاید کبھی طویل وقفے کے بعد آپ کے کسی ذیشان پیش رو پر عاید ہوئے ہوں گے۔ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کی خواہش ہے کہ آپ یہ سن کر اپنے دل کو تقویت دیں کہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ یور ایکسیلنسی کی قوت فیصلہ پر بدستور سابق پورا پورا اعتماد کرتی ہے۔ جس میں بخیال اس کے اس رعایا کی خیر و بہبود کا مقصد وحید ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔ جس کی عنان حکومت آپ کو تفویض کی گئی ہے۔

یور لارڈ شپ کا نیاز مند

(دستخط) ایڈون ایس مان ٹیگو"

انجمن مؤیدالاسلام فرنگی محل (لکھنو) کا جلسہ:

فروری ۱۹۱۹ء: فروری ۱۹۱۹ء کے اوائل میں انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل کا ایک جلسہ زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل میں منعقد ہوا۔ جس میں طے کیا گیا کہ احکام اسلامیہ کی رو سے بجز موجودہ سلطان ترکی کے کوئی دوسرا خلیفہ نہیں اور شریعت اسلامیہ کی رو سے خلافت کے باب میں امت محمدیہ کے سوا غیر مسلم کی رائے بے اثر ہے۔ مسلمانوں نے جہاں کہیں اس بارے میں آواز بلند کی وہ شریعت اسلامیہ کے بالکل مطابق ہے اور یہ جلسہ اس کی تائید کرتا ہے۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ جلسہ اس تجویز سے اتفاق کرتا ہے کہ ایک فتویٰ احکام خلافت سے متعلق حدود عرب و ممالک اسلامیہ کے علمائے کرام سے دستخط کرا کے اور مشیر قانون سے مشورہ کر کے گورنر جنرل اور وزیر ہند کی خدمت میں روانہ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جو خیالات اسلامی انجمنوں نے ظاہر کیے ہیں وہ احکام شریعت کے بالکل مطابق ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف حکم ظاہر کرے تو وہ شریعت اسلامیہ کا حکم نہ سمجھا جائے اور حکومت کو غلط فہمی نہ ہونے پائے۔

(تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۱۱۱)

یکم مارچ ۱۹۱۹ء: امیر حبیب اللہ خان کے قتل (نعمان کے قلعۂ گوش، ۲۰ر فروری ۱۹۱۹ء) کے بعد امیر مقتول کے بھائی نصر اللہ خان نے جلال آباد میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن چند ہی دن میں کشمکش کے بعد امیر کے بیٹے امان اللہ خان نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو ان کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا۔ امان اللہ خان نے برطانوی اثرات ماننے سے انکار کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اردو دایرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۰ء (اشاعت ثانی) ص ۱۰۰۳)

جلیانوالہ باغ کا قتل عام:

یکم مارچ تا ۳۰ر اپریل ۱۹۱۹ء: یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو ستیہ گرہ کی تجویز مقابلے کے لیے جب پاس ہوئی تو امرتسر اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں بھی دوسرے صوبوں کے مراکز اور اضلاع اور شہروں کی طرح ۶ر اپریل کو ہڑتالیں ہوئیں اور پر جوش مظاہرے کیے گئے۔

گورنمنٹ سختی سے ان مظاہروں کو کچل دینے کے لیے میدان میں اتر آئی۔ فتح اور طاقت کا گھمنڈ عروج پر تھا۔

اپنی سخت کارروائیوں کے ماتحت ۱۰راپریل ۱۹۱۹ء کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۵راپریل ۱۹۱۹ء کو لاہور اور امرتسر میں جہاں تحریک زوروں پر تھی مارشل لا جاری کر دیا گیا۔

۱۵راپریل ۱۹۱۹ء کو اس خبر سے مشتعل ہو کر کہ "گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے"۔ امرتسر میں ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا اور چوں کہ ابھی شروعات تھی اور لوگ ستیہ گرہ کے بنیادی اصول سچ اور عدم تشدد کو سمجھے نہیں تھے، ایک بینک پر حملہ کر دیا۔ بعض انگریز افسروں اور ایک میم کو قتل کر ڈالا۔ ایک عمارت کو آگ لگا دی۔ پولیس جلد حالات پر قابو پا گئی۔ لیکن جنرل ڈائر دو ہزار فوج لے کر امرتسر پہنچا۔ ۱۳راپریل کی صبح کو جنرل ڈائر نے ایک اعلان کے ذریعے کسی قسم کا جلوس نکالنے کو منع کیا۔ چار آدمیوں سے زیادہ جمع ہونے کو خلاف قانون ٹھہرایا اور یہ بھی اعلان کیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو اسلحہ کا استعمال کر کے خلاف ورزی کرنے والے مجمع کو منتشر کیا جائے گا۔ لیکن پبلک نے اس حکم کو نظرانداز کر کے شام کو ساڑھے نو بجے جلیانوالہ باغ میں جلسۂ عام کا اعلان کر دیا۔ جب جنرل ڈائر کو یہ خبر ملی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور مشین گنیں اور فوج لے کر موقع پر پہنچا اور تمام راستہ گھیر کر کہ کوئی بھاگنے نہ پائے فائر کا حکم دیا اور اس وقت تک فائر کرتا رہا جب تک ایک گولی بھی باقی تھی۔ حتیٰ کہ ۳۷۹ آدمی ہلاک اور بارہ سو زخمی ہو کر ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا، نہ پانی تک دیا گیا۔ وہیں پڑے تڑپتے رہے۔ اس کے بعد ڈیڑھ ماہ تک مارشل لا جاری رہا مارشل لا کے تحت شہر کے معززین کو داٹر ورکس اسٹیشن پر حاضر ہو کر احکام سننے پڑتے تھے۔ ۸ بجے شام سے ۵ بجے صبح تک کرفیو رہتا تھا۔ خلاف ورزی کی سزا گولی تھی۔ سب کی موٹریں اور تمام سواریاں بیگار میں لے لی گئی تھیں۔ برقی روشنی اور پنکھے چھین لیے گئے تھے، معمولی شبہ پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ سناتن دھرم کالج پر ایک اشتہار احکام نادری کا چسپاں تھا۔ اسے کسی نے پھاڑ ڈالا تو تمام طلبہ، پروفیسر اور احاطے کے مرد گرفتار کر لیے گئے اور ان کو تین میل پیدل چلایا گیا۔ تب ضمانت پر رہا کیے گئے۔ کالجوں کے ایک ہزار طلبہ کو روزانہ حاضری کا حکم دیا گیا۔ جس کے لیے ان کو روزانہ ۱۶ میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ذرا سے شک پر لوگوں کو تازیانے لگائے جاتے تھے۔ امرتسر میں ایک گلی تھی جہاں کچھ لوگوں نے ایک انگریز پر حملہ کر دیا تھا۔ اس گلی سے لوگوں کو پیٹ کے بل رینگ

کے چلایا جاتا تھا۔ گلی بہت لمبی تھی، کوئی ذرا سا ابھرا تو تازیانے لگتے تھے۔ لائل پور میں حکم ہوا کہ جب کوئی انگریز سامنے سے گزرے تو ہر ایک ہندوستانی گاڑی سے اتر کر اور اگر چھتری لگائے ہو تو چھتری بند کر کے مؤدب کھڑے ہو کر سلام کرے۔ فوجیں دیہات میں بھیج دی گئیں جہاں وہ اندھا دھند جس کو چاہتیں پکڑ لیتیں اور کوڑے لگاتیں۔ ڈرانے کے لیے ہوائی جہاز سے بم پھینکے گئے اور مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کی گئی۔ ایک لائن کی پٹری اکھڑ گئی تھی، قریب کے دیہات والوں پر بلا جانچ گولی چلائی تھی۔

یہ واقعات سن کو تمام ہندوستان ہل گیا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اب یہ ہندوستان گاندھی جی کا ہندوستان تھا۔ ہر چہار جانب سے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ان افعال کی مذمت کی گئی اور جب یہ خبریں انگلستان پہنچیں تو وہاں کی رائے عامہ بھی بے حد متاثر ہوئی۔ ایک بڈھے انگریز نے جس کا بیٹا حال ہی میں آئی سی ایس ہو کر ہندوستان آیا تھا، صبح کو اخبار میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی خبر پڑھ کر غصہ سے دانت پیس کر کہا:

> ''میں نے اپنے لڑکے کو ہندوستان یہ ہولناک جرائم کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ میں اسے واپس بلالوں گا۔''

مارشل لا کے لیے ایک تحقیقاتی ٹریبونل مقرر کیا گیا۔ اس کے سامنے انگریز افسران نے ان مظالم کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ:

> **''ہماری کارروائیوں سے مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے دماغ سے بغاوت کے جذبات فنا کر دیے جائیں۔''**
>
> **''جنگ کے دوران ہندوستان نے لاکھوں سپاہی، دو ارب روپے اور خون اور پسینہ برطانیہ کو دیا تھا اور اس کا یہ صلہ۔''**

۲۰ر اپریل ۱۹۱۹ء کو کانگریس کمیٹی کا جلسہ تھا، لیکن گاندھی جی پنجاب صرف اس لیے نہیں گئے کہ ان کی گرفتاری لازمی تھی اور اس سے پبلک میں مزید ہیجان پیدا ہوتا، اور اس وقت تک کا تجربہ یہ تھا کہ پبلک عدم تشدد پر قائم نہیں رہی تھی۔

حتیٰ کہ ہندوستان کے مشہور فلسفی و دانشور اور نوبل پرائز کا انعام پانے والے رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا ''سر'' کا خطاب ۳۰ر اپریل ۱۹۱۹ء کو واپس کر دیا۔ اس سے ہندوستان کا تمام تعلیم یافتہ طبقہ بے حد متاثر ہوا۔

۳۰/اپریل ۱۹۱۹ء: احمد آباد میں مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی تھی اور احمد آباد جوالا مکھی بنا ہوا تھا۔ وہاں کے لوگوں کی درخواست پر گاندھی جی ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو احمد آباد گئے۔ ۱۴۔اپریل ۱۹۱۹ء کو امن قائم ہوگیا اور مزدوروں نے ہڑتال بند کر دی۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ گاندھی جی کا منشا کسی قسم کا ہڑبونگ نہیں بلکہ شعور کے ساتھ رائے عامہ کو بیدار اور موثر ثابت کرنا تھا۔

اس کے بعد گورنمنٹ نے جلیانوالہ باغ اور دیگر ہولناک واقعات کی جانچ کے لیے ہنٹر کمیٹی مقرر کر دی اور تب گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک روک دی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ ابھی پبلک اہنسا کے لیے تیار نہیں تھی اور ستیہ گرہ کی کامیابی صرف دو بنیادی اصولوں "سچ" اور "اہنسا" پر منحصر تھی، ستیہ گرہ کے روک دینے سے گاندھی جی کا وقار اندرون و بیرون ملک میں آسمان تک پہنچ گیا۔

اسی دوران حکومت نے بمبئی کرانیکل کو بند کر کے اس کے ایڈیٹر ہارنی مین کو جلاوطن کر دیا۔ گاندھی جی نے ینگ انڈیا کے ساتھ ایک اور اخبار "نوجیون" نکالا، جس کے ایڈیٹر مہاتما گاندھی، مہادیو ڈیسائی پبلشر اور شنکر لال بینکر پرنٹر مقرر ہوئے۔ (تحریک خلافت: قاضی عدیل احمد عباسی، ص ۸۸۔۸۶)

جنگ عظیم میں ہندوستانیوں کی قربانی:

۱۳/مارچ ۱۹۱۹ء: "ہز اکسیلنسی کمانڈر انچیف نے وائسرائے کی مجلس قانون ساز میں ایک بیان پیش کیا ہے جس میں دکھلایا ہے کہ ہندوستان نے مختلف رزم گاہوں میں اب تک ۵۷۹۲۵۲ جنگجو آدمی بھیجے ہیں، جن میں ۳۰۲۱۹۹ عراق عرب، ۱۴۰۴۱۹ مصر، ۸۶۳۸۲ فرانس، ۳۴۵۱۱ مشرقی افریقہ، ۲۴۴۰۱ خلیج فارس، ۹۷۱۷ درہ دانیال و سالونیکا اور ۱۱۵۷۳ عدن میں بھیجے گئے ہیں۔ ان افواج کے نقصانات کی تفصیل میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ۱۹۰۱۰ آدمی مارے گئے، ۶۱۹۱۶ زخمی ہوئے، ۳۳۴۱ لاپتا ہیں، ۶۱۴۶ قید ہیں اور ۱۲۲۳ آدمیوں کے متعلق بھی قید کا گمان ہے۔ غیر جنگجو جو ہندوستان سے بھیجے گئے تھے ان کی تعداد ۵ لاکھ سے زائد ہے۔" (مشرق، گورکھپور، ۱۳/مارچ ۱۹۱۹ء، ص ۱۸)

سوامی شردھانند کی جامع مسجد میں تقریر:

۳۰/مارچ ۱۹۱۹ء: دلی میں غلط فہمی کی بناء پر ۳۰/مارچ ہی کو ستیہ گرہ کا دن منایا گیا۔ گورنمنٹ اب پوری طاقت سے اس تحریک کو کچلنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ چناں چہ فوج بلوائی گئی اور دہلی کے

عظیم الشان جلسے کو منتشر ہونے کے لیے کہا گیا۔ فوج اور پولیس ہتھیاروں کے علاوہ مشین گن سے بھی مسلح تھی۔ دو مرتبہ گولی چلی، کچھ آدمی قتل اور بہت سے مجروح ہوئے۔

یہی ۳۰ ر مارچ ۱۹۱۹ء کا دن ہے جب ہندو مسلم اتحاد اتنے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند نے جامع مسجد کے مکبرہ پر کھڑے ہوکر تقریر کی اور مسلمانوں نے ذوق و شوق سے ان کو ایسا کرنے دیا۔ اس کے بعد جب جلوس نکلا اور چاندنی چوک پہنچا تو وہاں گورکھا فوجوں کی سنگینوں کے سامنے سوامی جی نے اپنا سینہ کھول دیا۔ اس واقعے کی عام شہرت ہوئی اور تمام ہندوستان جوش سے دیوانہ ہوگیا۔

وفاداران حکومت تاک میں تھے، فوراً شور وغوغا مچانا شروع کیا کہ ایک ہندو کو مسجد میں کیوں آنے دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو اس وقت رانچی میں نظر بند تھے قلم ہاتھ میں لیا اور ایک رسالہ معہ احادیث صحیحہ تیار کر دیا اور ایک مسکت جواب دیا کہ پھر لوگ خاموش ہی ہو گئے۔ تب کھسیانے ہوکر ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسجد کا مکبرہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جگہ ہے۔ وہاں ان کو کیوں کھڑا کیا، لیکن سانپ نکل گیا تھا۔ اب لکیر پیٹنے سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

صرف دلی اور بمبئی کی شرط نہیں ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا شہر نہ تھا جہاں عظیم پیمانے پر جلسے نہ ہوئے ہوں، جن میں پندرہ ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک کے مجمعے ہوئے۔ لوگ دن بھر بھوکے رہے اور ننگے سر اور ننگے پیر جلسہ گاہ تک جا کر خدا کے سامنے الحاح وزاری سے دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ انصاف کر، اے اللہ انصاف کر۔ تمام ہندوستان ابل پڑا تھا۔ بڑے بڑے لوگ گاندھی جی کے ہمنوا ہوگئے۔ مولانا حسرت موہانی جو گاندھی جی کی ستیہ گرہ کے کبھی موافق نہ ہوئے، اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ حسرت صاحب کو تو آزادی کے لیے لڑنے مرنے کا محاذ ملنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر انصاری، سوامی شردھانند وغیرہ سب میدان میں آگئے۔ اس انوکھی چیز کا نام کسی نے ''خاموش مقابلہ'' رکھا جسے انگریزی میں Passive Resistance کہا گیا ہے۔ گاندھی جی نے ایک گشتی چٹھی نشر کی جس میں رولٹ بل کی خرابیوں کو بیان کرتے ہوئے صاف صاف اعلان کیا کہ ''اصلاحات ممکن ہے کیے جائیں یا نہ کیے جائیں۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلے پر ایک ٹھیک اور واجبی سمجھوتا ہو جانا چاہیے۔ سول سروس جماعت کو سمجھانا چاہیے کہ وہ ہندوستان میں صرف اس کی (ہندوستان کی) خادم بن کر رہ سکتی ہے، فرضی نہیں بلکہ عملی۔ اور برطانوی تجارتی ایوانات کو خیال کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں ان کا وجود اسی حالت میں قائم رہ سکتا ہے جب کہ وہ

اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کریں نہ کہ وہ ہندوستانی صنعت وحرفت اور تجارت کی تباہی وبربادی پر آمادہ ہوں"۔ مسودات مذکورہ کے باعث ہم کو اس حکومت کے خلاف ناراضی وتنفر زیادہ سختی سے دکھلانا چاہیے۔ جس کے استبدادی کارنامے خود اس کی شہادت دے رہے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ اس گشتی کو ایک ستیہ گرہی کی طرح گاندھی جی نے وائسرائے کے پاس بھیج دیا۔
(تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۸۵۔۸۴)

۶/اپریل ۱۹۱۹ء: جس وقت رولیٹ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی اس وقت مہاتما گاندھی بیمار تھے۔ انھوں نے اس کے متعلق لکھا کہ اس کی سفارشات دیکھ کر میں حیران رہ گیا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار (اور آخری بار) وہ رولیٹ بل پر بحث سننے کے لیے مجلس قانون ساز میں گئے۔ شاستری جی (سری نواز شاستری) نے بڑی مدلل اور پرجوش تقریر کی مگر ان کی تنبیہوں کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے لکھا تھا:

گاندھی جی نے کہا۔"میں نے وائسرائے سے بڑی پرخلوص گذارش کی، انھیں ذاتی اور کھلی چٹھی لکھی جس میں، میں نے انھیں بتایا کہ حکومت کے اس قدام سے میرے لیے ستیہ گرہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔"

ستیہ گرہ کا عہد نامہ:

وہ مدراس گئے ہوئے تھے۔ ایک رات ان کے ذہن میں خیال آیا:

"آدھی رات کا وقت ہوگا اور میں کچھ سویا اور کچھ جاگا ہوا تھا کہ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ ہمیں پورے ملک سے عام ہڑتال کی اپیل کرنا چاہیے۔ سارے ہندوستان کے لوگ اپنا کام اور کاروبار بند کردیں اور اس دن برت رکھیں اور عبادت کریں"۔ عوام کے لیے ستیہ گرہ کا جو عہد نامہ تیار کیا گیا تھا اس میں کہا گیا تھا۔"ہم پوری طرح اس بات سے آگاہ ہیں کہ (رولیٹ) بل غیر منصفانہ اور آزادی اور انصاف کے اصولوں کے غیر منافی اور فرد کے ان بنیادی حقوق کو پامال کرنے والا ہے جن پر کسی قوم اور خود ریاست کے تحفظ کا دارومدار ہے۔ ہم عہد صالح کرتے ہیں کہ اگر ان بلوں کو قانون کی شکل دی گئی تو جب تک یہ قانون واپس نہ لیا گیا، ہم اس قانون کو ماننے سے انکار کریں گے۔ اس کے ماسوا ایسے تمام قوانین کی پابندی بھی نہیں کریں گے، جو اس کمیٹی کی نظروں میں ضروری ہوں گے جو کہ

مقرر کی جانے والی ہے۔ ہم یہ بھی عہد کرتے ہیں کہ اس جدوجہد میں ہم بڑی سختی کے ساتھ سچائی پر کاربند ہوں گے اور کسی جان اور مال کے خلاف کوئی تشدد آمیز کارروائی نہیں کریں گے۔"

ملک میں ردعمل:

۳۰ر مارچ ۱۹۱۹ء: پورے ملک میں ہڑتال کے لیے ۳۰ر مارچ ۱۹۱۹ء کا دن مقرر کیا گیا۔ بعد میں یہ تاریخ بدل کر ۶ر اپریل کر دی گئی۔ یہ بڑا معمولی لیکن بڑا انوکھا پروگرام تھا۔ ضبط نفس کے لیے ۲۴ گھنٹے کا برت، تمام کام کاج کو روک دینا، تمام بازاروں اور کاروباری جگہوں کا بند کیا جانا اور جلسے کرنا۔

ہڑتال کی اطلاع لوگوں کو صرف دو ہفتے پہلے دی گئی، لیکن سارے ہندوستان میں بڑی مکمل اور زبردست ہڑتال ہوئی۔

بعض جگہوں میں پہلے کی مقرر کی ہوئی تاریخ ۳۰ر مارچ کو ہی ہڑتال ہوئی۔ راجدھانی میں ہڑتالیوں کے جلوس کو پولیس نے روکا اور ان پر گولیاں چلائیں۔ بعد میں ٹاؤن ہال کے سامنے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ اس جگہ پولیس نے دوبارہ گولی چلائی۔ کم از کم ۱۸ افراد ہلاک ہوئے۔ دہلی میں جبر و تشدد کا دور شروع ہوا۔ گاندھی جی نے لکھا۔ دہلی میں ۶ر اپریل کی ہڑتال پرامن رہی مگر دس دنوں تک جاری رہی۔

(جلیاں والا باغ: حکومت ہند، پبلی کیشنز ڈویژن، (دہلی)، ۱۹۶۹ء ص ۱۱-۱۰)

۶ر اپریل ۱۹۱۹ء: ۶ر اپریل ۱۹۱۹ء کو اس منحوس ایکٹ (جو طاقت کے بل پر پاس کر دیا گیا تھا) کے خلاف سارے ملک میں احتجاج شروع ہو گیا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی رفتار تیز کر دی۔ اب شہر شہر مظاہرے ہونے لگے۔ دہلی، بمبئی، الہ آباد، احمد آباد اور پنجاب کے اکثر مقامات پر گولیاں چلیں۔ کافی جانیں تلف ہوئیں۔ دہلی کی زبردست ہڑتال میں سوامی شردھانند نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دہلی کی جامع مسجد کے ممبر (صحنِ مسجد میں موذن کے چبوترے) سے تقریر کی جو انتہائی پر اثر تھی اور مدتوں اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ ۱۶ر اپریل کو ہی کانگریس اور علمائے کرام نے مل کو ترک موالات اور سول نافرمانی کی تحریک کی پرزور حمایت و تائید کی۔

ستیہ گرہ کمیٹی کی طرف سے:

۶ر اپریل ۱۹۱۹ء کا دن اس کی تجاویز پر عمل درآمد کے لیے مقرر کیا گیا۔ پروگرام یہ تھا

کہ لوگ دن بھر بھوکے رہیں اور شام کو کسی مقام پر جمع ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ لوگ ننگے سر اور ننگے پاؤں مجمع میں جائیں اور تمام کاروبار بند رکھیں گاندھی جی کا ارشاد تھا کہ اس ستیہ گرہ میں بھوکے رہنا اور کاروبار بند کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس سے ہماری روحانی طاقت بڑھے گی۔ اور اس کے بڑھنے سے ہمارے دلوں سے سچی باتیں نکلیں گی اور وہ بلا شبہ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہوں گی۔ انھوں نے بھوکے رہنے کا جواز مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب سے ثابت کیا اور اس کی چاردانگ ہند میں تبلیغ کی گئی۔ جس طرح پیاسے کو پانی مل جائے تمام قوم ہندو اور مسلمان سب اس پروگرام پر عمل درآمد کرنے اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

۶ / اپریل ۱۹۱۹ء کو گاندھی جی نے خود بمبئی میں ستیہ گرہ کا آغاز اس طرح کیا کہ ایک اخبار ستیہ گرہ نام کا بغیر اقرار نامہ داخل کیے جاری کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے وہ تمام کتب و رسائل اور لٹریچر جس کی اشاعت بند تھی فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ان کے ساتھ مسز سروجنی نائیڈو بھی تھیں۔ مگر حکومت نے کوئی باز پرس نہ کی۔ بمبئی میں گاندھی جی نے تمام پبلک کو چوپاٹی کے میدان میں جمع ہونے کا حکم دے دیا۔ وہاں سمندر میں غسل کرنے کے بعد جلسہ اور جلوس نکالا گیا۔ گاندھی جی ساتھ ساتھ تھے۔ پھر گاندھی جی براہ آگرہ و متھرا دہلی کے لیے روانہ ہوئے ۹ / اپریل کو جب گاڑی کوسی پہنچی تو پنجاب گورنمنٹ کے ایک افسر نے آپ کو حکم دیا کہ پنجاب میں داخل ہونے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ گاندھی جی نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جب دوسرے اسٹیشن پلول پر ٹرین پہنچی تو حکومت دہلی اور پنجاب کی طرف سے یہ احکام دیے گئے کہ آپ حدودِ پنجاب میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں اور حکومت ہند کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ کی نقل و حرکت بمبئی میں محدود کر دی گئی ہے۔ اس کو بھی گاندھی جی نے ماننے سے انکار کر دیا۔ یورپین پولیس افسر نے کہا کہ گاڑی سے اتر آیئے مگر گاندھی جی نے انکار کیا اور کہا جب تک میں گرفتار نہ کیا جاؤں گاڑی سے نہ اتروں گا۔ تب پولیس افسر نے گاندھی جی کے شانہ پر ہاتھ رکھا تب وہ اترے۔ وہاں سے متھرا آئے متھرا سے بذریعہ اسپیشل ٹرین بمبئی روانہ کر دیے گئے۔

پلول اسٹیشن پر گاندھی جی نے ایک پیام اہل ملک کے نام لکھا اور مہادیو ڈیسائی کو دیا اور کہا کہ تم میرے قائم مقام ہو۔ پیغام کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) میری گرفتاری مجھ کو آزادی دلاتی ہے۔ مجھے وہی ملا جس کا میں متمنی تھا یعنی رولٹ قانون منسوخ کیا جائے یا میں جیل خانہ بھیج دیا جاؤں۔

(۲) اب آپ کے لیے اپنا وہ فرض ادا کرنا باقی ہے جو ستیہ گرہ کے عہد نامہ کے بموجب آپ پر عائد ہوتا ہے اس فرض کو ادا کیجیے۔ اسی میں کامیابی ہے۔

(۳) ستیہ گرہی جو اس بڑی جنگ میں شریک ہیں وہ سچائی اور حق کے راستہ سے بال برابر بھی ہٹے یا انہوں نے کسی انگریز یا ہندوستانی پر زیادتی کی تو اس مقصد کو سخت نقصان پہنچے گا۔

(۴) مجھے امید ہے کہ ہندو مسلم اتحاد جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ اب سب عوام کے دلوں میں اتر چکا ہے۔ اصل رنگ میں نظر آئے گا۔

(۵) آخر میں میرا ایمان یہ ہے کہ ہماری ترقی اور آزادی کا راز تکالیف و مصیبت برداشت کرنے میں ہے نہ کہ انگلستان کے اصلاحات بخشنے میں خواہ اصلاحات کتنے ہی وسیع اور غیر محدود کیوں نہ ہوں۔

(۶) مجھے امید ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی، اور وہ تمام لوگ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں یا اس ملک میں بود و باش اختیار کر لی ہے اس قومی جدوجہد میں پورا حصہ لیں گے۔ مجھے امید ہے کہ عورتیں اور بچے جتنا ان کو چاہیے حصہ لیں گے۔ (موہن داس کرم چند گاندھی)

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل احمد عباسی، ص ۸۴۔۸۲)

گاندھی جی کے پنجاب میں داخلے پر پابندی:

۸ اپریل ۱۹۱۹ء: کو سوامی شردھانند اور ڈاکٹر ستیہ پال نے پنجاب کے حالات کے پیش نظر گاندھی جی کو بلایا۔ حکومت نے گاندھی جی کو اس سفر سے روکا۔ گاندھی جی نہ مانے۔ آخر دہلی کے قریب پلول اسٹیشن پر حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا اور گاندھی جی پنجاب نہ جا سکے۔

۱۰؍اپریل ۱۹۱۹ء کو حکومت نے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعے گاندھی جی کو بمبئی روانہ کیا۔ اسی روز امرتسر کے مجسٹریٹ نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو جو مذکورہ تحریک کی قیادت کر رہے تھے اپنے بنگلے پر بلوا کر کسی نامعلوم جگہ روانہ کر دیا۔ اس خبر سے سارے شہر میں سنسنی سی پھیل گئی۔ دریافت کرنے کے لیے عوام کا ایک جھنڈ ضلع مجسٹریٹ کے بنگلے پر جا رہا تھا کہ شہر کے درمیانی چوراہے پر پولیس نے روک لیا۔ غم و غصہ سے بھری ہوئی بھیڑ نے بڑے حوصلے کے ساتھ اینٹوں اور پتھروں کی بارش کر دی۔ پولیس نے گولی چلا دی۔ بہت سارے لوگ گھائل ہوئے۔ کچھ کی موت واقع ہوئی۔ اب بھیڑ مُردوں اور گھائلوں کو لے کر واپس ہوئی۔ راہ میں نیشنل بینک کی عمارت جلا دی اور اس کے انگریز منیجر کو مار ڈالا گیا۔ اس طرح بپھرے ہجوم نے یکے بعد دیگرے پانچ انگریزوں کو مار ڈالا۔ ریلوے کا گودام اور مختلف عمارتوں کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ مقامی حکام سے جب یہ معاملہ نہ رک سکا تو شہر کو فوج کے حوالے کر دیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

۶، ۷؍اپریل ۱۹۱۹ء: دہلی میں جو واقعہ ہوا تھا، وہی لاہور اور امرتسر میں دہرایا گیا، گاندھی جی سے بار بار اپیلیں کی گئیں کہ وہ دہلی اور امرتسر آئیں۔ وہ ۷؍اپریل کو بمبئی سے دہلی اور امرتسر کے لیے روانہ ہوئے۔ جب ریل گاڑی پلول کے نزدیک پہنچی تو انھیں ایک تحریری حکم دیا گیا جس کے تحت پنجاب میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا مگر انھوں نے ریل گاڑی سے اترنے سے انکار کر دیا۔ پلول میں انھیں پولیس کی حراست میں لے لیا گیا۔ انھیں متھرا لے جایا گیا اور دوسری صبح کو انھیں بمبئی کی طرف جانے والی ایک مال گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ سوائی مادھو پور میں انھیں دوسری گاڑی میں منتقل کر کے بمبئی لے جایا گیا۔

اس خبر سے سارے ہندوستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بمبئی میں زبردست کشیدگی تھی۔ شہر میں ۶؍اپریل کو مکمل ہڑتال ہو چکی تھی۔ شہر کی گلیوں میں لوگوں کی زبردست بھیڑ کو گھوڑ سوار پولیس کے ذریعے تتر بتر کرایا گیا تھا اور بہت سے لوگ پیروں تلے کچلے گئے تھے۔ گجرات میں وسیع پیمانے پر گڑبڑ ہوئی تھی اور ناڈیاڈ اور ویرم گام میں عوام کے غیظ و غضب کا زبردست مظاہرہ ہوا تھا۔

پنجاب اور امرتسر کی صورت حال:

پنجاب میں سر مائیکل اوڈائر کی مطلق العنانی اور آمرانہ انداز کی وجہ سے لوگوں میں برطانوی

سامراج کے خلاف خاص طور پر غصہ تھا۔ مہاتما گاندھی کی اپیل کا فوری اور زبردست اثر ہوا۔

۳۰ / مارچ کو امرتسر میں زبردست ہڑتال ہوئی۔ اس دن ایک بھاری جلسہ ہوا۔ جس میں ۳۵ ہزار آدمی شریک تھے۔ مقبول عوام رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے اپنی تقریر میں عوام سے گذارش کی کہ ان کی یہ جدوجہد بالکل پرامن ہونی چاہیے۔

امرتسر میں ان دونوں انگریزی سامراج کے خلاف غم و غصے کا بڑا بھرپور مظاہرہ ہو رہا تھا۔ سرمائیکل کے لیے یہ صورت بڑی تکلیف دہ تھی۔ انھوں نے حکم دیا کہ دوسرے مقبول رہنما ڈاکٹر ستیہ پال کو جلسوں میں تقریر کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ انھیں امرتسر میں نظر بند کردیا گیا۔ یہ ۲۹ / مارچ کا واقعہ ہے۔ چار دن کے بعد ڈاکٹر کچلو پر بھی ایسے ہی حکم کی تعمیل کی گئی۔

حکام کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال پر جو پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ ان سے عوام میں اشتعال پیدا ہوگا اور وہ تشدد پر اتر آئیں گے مگر گاندھی جی کا جادو چل چکا تھا۔ ہندو مسلمان اور سکھوں میں مکمل اتحاد اور یگانگت نے بھی پنجاب کی انتظامیہ کو مشتعل کر رکھا تھا۔ سرمائیکل عمداً یہ کوشش کر رہے تھے کہ لوگوں میں پھوٹ پڑ جائے۔ اس لیے وہ اس طرح کی باتیں کرتے تھے کہ ایک فرقہ جنگجویانہ روایات کا حامل ہے اور دوسرا نہیں۔ وہ یہ بھی اشارے کرتے تھے کہ قومی رہنما بعض فرقوں کی تذلیل کر رہے ہیں۔

۶ / اپریل ۱۹۱۹ء: ۶ / اپریل ۱۹۱۹ء کو پنجاب میں سارا کاروبار اور کام ٹھپ ہوگیا۔ زبردست ہڑتال ہوئی تھی۔ امرتسر میں بھی بڑی کامیاب ہڑتال ہوئی اور ہر فرقے کے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ بھیڑ بالکل پرامن رہی اور کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

۶ / اپریل کو ہڑتال کے دن ایک زبردست جلسہ ہوا۔ جس میں ٦٠ ہزار آدمی تھے۔ اس کی صدارت ایک بیرسٹر جناب بدرالاسلام خان نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا۔ ''مہاتما گاندھی کا مشورہ یہ ہے کہ ہم صبر و سکون کے ساتھ تمام دکھ اور تکلیف برداشت کریں اور اس طرح اپنے آپ کو تشدد اور جبر سے محفوظ رکھیں۔

۹ / اپریل ۱۹۱۹ء: ۹ / اپریل کو رام نومی کا تہوار تھا۔ گو کہ یہ ہندوؤں کا تہوار تھا مگر مسلمانوں نے بھی بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ ایک بہت بڑا جلوس نکلا۔ جس میں تمام فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ جلوس بالکل پرامن تھا اور ''مہاتما گاندھی کی جے''، ''ڈاکٹر کچلو کی جے'' اور ''ڈاکٹر ستیہ پال کی جے'' کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر نے خود یہ اعتراف کیا کہ یہ بڑا پروقار

مظاہرہ تھا۔

قومی اتحاد اور سیاسی شعور کے اس زبردست مظاہرے سے سرمائیکل بھڑک اٹھے اور انھوں نے امرتسر کے امن کو پارہ پارہ کرنے کی ترکیب سوچ لی۔

دوسرے دن ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو شہر سے چلے جانے کا حکم دیا گیا اور انہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور شہر میں خود بخود ہڑتال ہو گئی۔ ننگے سر اور بالکل غیر مسلح لوگوں کا ایک مجمع ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی طرف چلا تا کہ اپنے رہنماؤں کی رہائی کی گذارش کرے۔ راستے میں کئی یورپینوں کے گھر ملتے تھے مگر ان میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔

مجمع امرتسر کے خاص خاص راستوں سے ہوتا ہوا ریلوے اوور برج کے پاس پہنچا تو اسے روکا گیا۔ اس پل کی حفاظت فوجی کر رہے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ محض فریاد کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر کے پاس جانا چاہتے ہیں، مگر حکام نے ان کی ایک نہ سنی اور فوجیوں نے اچانک گولی چلا دی۔ جس سے کئی آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا اس کا ثبوت موجود ہے کہ خواہ مخواہ کی یہ فائرنگ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کی گئی تھی۔ مجمع جو اس وقت تک پرامن تھا، بلاوجہ کے تشدد سے بھڑک گیا۔ مجمع میں ان بے گناہوں کی لاشیں پڑی تھیں جنھیں اقتدار و اختیار کے بھیس میں قاتلوں نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ مجمع کئی گروپوں میں بٹ گیا اور لاشوں اور زخمیوں کو اٹھائے ہوئے مختلف علاقوں کو چکر لگانے لگا۔ جلد ہی اوور برج کے پاس ایک بھیڑ جمع ہو گئی اور وہ لاٹھیوں سے مسلح تھی۔

دو بیرسٹوں نے بیچ بچاؤ کرنے اور مجمع کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ابھی یہ لوگ لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوششوں میں لگے ہی ہوئے تھے کہ فوجیوں نے پھر گولی چلا دی۔ جس سے ۲۰ آدمی مارے گئے۔ ایمبولینس اور طبی امداد کو جائے وقوعہ پر پہنچنے نہیں دیا گیا اور ایک انگریز عورت نے چلا کر کہا۔ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جس کے وہ لائق تھے۔'' اب مجمع بالکل قابو سے باہر ہو گیا۔ اس نے بہت سے اداروں جس میں بینک بھی شامل تھے، پر حملہ کیا۔ متعدد عمارتوں میں آگ لگا دی۔ اس ہنگامے میں کچھ یورپینوں کی جانیں بھی گئیں۔

عوام کے غیظ و غضب کے اس مظاہرے سے حکام وقتی طور پر بوکھلا گئے۔ مگر وہ اس کا بدلہ لینے کا فیصلہ بھی کر چکے تھے۔

۱۰، ۱۱/ اپریل ۱۹۱۹ء: لیفٹننٹ گورنر نے کمشنر مسٹر کچن کو لاہور سے امرتسر بھیجا۔ وہ دس اپریل کو

امرتسر بخیر و عافیت پہنچ گئے۔ ۱۱ بجے رات کو فوجیوں سے بھری ایک گاڑی شہر پہنچی۔ ان کے کمانڈر میجر میک ڈونلڈ تھے۔ کمشنر نے ان سے کہا کہ صورت حال قابو سے باہر ہے اور وہ ایسی کارروائیاں کریں جو فوجی لحاظ سے ضروری ہوں۔ ..... حکومت ہند نے بمبئی، دہلی اور پنجاب میں گڑبڑ کے واقعات کی چھان بین کے لیے لارڈ ہنٹر کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے جب ان سے پوچھا گیا کہ سول مجسٹریٹ کو کیوں نہیں بھیجا گیا تو اس کا وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے تھے۔ وجہ صاف ظاہر ہے، سر مائیکل اوڈائر خون کی ہولی کھیلنا چاہتے تھے۔

مسٹر کچن ۱۱ر تاریخ کو لاہور واپس آ گئے۔ ڈپٹی کمشنر مائلز ارونگ نے امرتسر کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اس کی اطلاع لیفٹننٹ گورنر کو دے دی گئی اور انھوں نے اس اقدام کی منظوری دے دی۔ دوسری صبح مسٹر کچن بذریعہ موٹر امرتسر آئے مگر انھیں گڑبڑ اور ہنگامے کا کوئی نشان دکھائی نہ دیا۔

اسی دوران بریگیڈیئر جنرل ریجی لینڈ ایڈورڈ ہیری ڈائر جو جالندھر میں ایک بریگیڈیئر کے کمانڈر تھے امرتسر پہنچے اور انھوں نے رام باغ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور شہر کا پورا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ اندھا دھند گرفتاریاں تھیں۔

لوگوں کا کیا حال تھا، ۱۰ر کی شب میں شہر میں پولیس کا کوئی پہرہ نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود چوری یا لوٹ مار کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ ۱۱ر کی صبح کو لوگوں نے ہلاک ہونے والوں کی تدفین کا ارادہ کیا۔ فوجی حکام جنازے کے ساتھ کسی جلوس کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔ بڑی منت و سماجت کے بعد انھیں جلوس کی شکل میں جانے کی اجازت دی گئی۔ بشرطیکہ جلوس ۲ بجے دن سے پہلے منتشر ہو جائے۔ شہیدوں کے جنازے کے ساتھ خلقت کا اژدہام تھا۔ لوگ بالکل پرامن رہے اور مقررہ وقت پر منتشر ہو گئے۔

اسی دن اور دوسرے دن فوج اور پولیس کے دستے اندھا دھند لوگوں کے گھروں میں گھسے، لوگوں کو گرفتار کرنے اور عورتوں اور بچوں کو مارنے پیٹنے اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔

ان دنوں میں امرتسر ایک فوجی چھاؤنی بنا ہوا تھا۔ پنجاب چیمبر آف کامرس کے ڈپٹی چیئرمین جو ۱۱ر اپریل کو کانپور سے امرتسر پہنچے تھے، بتایا کہ انھوں نے پولیس کے دستوں کو ریلوے اسٹیشن اور ریلوے لائن کی حفاظت کرتے ہوئے دیکھا۔ اسٹیشن خود ایک فوجی کیمپ بنا ہوا تھا۔ وہاں پر نہ کوئی قلی تھا اور نہ کوئی سواری دستیاب تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ ریلوے پل کے پاس پہنچے۔ وہاں

گوری قوم کا پہرہ تھا جو بغیر اچھی طرح تلاشی لیے ہوئے کسی کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ شہر میں قدم قدم پر پولیس اور فوج کے دستے نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفل تھی اور رائفل میں سنگینیں لگی تھیں۔ پانی اور بجلی کی سپلائی بالکل بند تھی۔
اپنے سپوتوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھنے سے پہلے ہی امرتسر نے سیاہ چادر اوڑھ لی تھی۔
(ا ایضاً: ص ۱۵ تا ۱۱)

۱۲؍اپریل ۱۹۱۹: ۱۲؍اپریل کو گوجرانوالہ اور قصور میں زبردست ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کافی خون خرابہ ہوا۔ قصور کا ریلوے اسٹیشن جلا ڈالا گیا۔ گوڈاؤن نذر آتش کیے گئے۔ تار اور سگنل توڑ ڈالے گئے۔ ایک ٹرین جس پر کچھ انگریز بھی سوار تھے روک کر حملہ کر دیا گیا۔ دو سپاہی جان سے مارے گئے، بہتوں کو گھائل کیا گیا۔ پھر ایک برانچ پوسٹ کو لوٹنے کے بعد جنرل پوسٹ کو بھی نذر آتش کر دیا گیا۔ منصفی اور کچہری جلا ڈالی گئی۔ علاوہ بہت سی تخریبی کارروائیاں ہوئیں۔

۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء: ۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر جلیانوالہ باغ میں ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری کے احتجاج میں ہزاروں مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں نے جمع ہو کر اظہار ناراضگی کے لیے ایک زبردست جلسہ منعقد کیا۔ جنرل ڈائر کے حکم سے مسلح فوجوں نے جلسہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور بغیر کسی تاخیر و اجازت کے ہزاروں نہتے افراد پر بے دریغ گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر کے خون کی گنگا جمنا بہا دی۔ نہ جانے کتنے معصوم افراد نے ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر جان گنوائی اس طرح جلیانوالہ باغ یادگار اور تاریخی مقام بن گیا۔
امرتسر کی گلیوں میں ہندوؤں، مسلمانوں کا خون ایک ساتھ مل کر بہا۔ لاہور میں بلاتفریق مذہب و ملت فوجی افسروں کو سلامی نہ دینے اور ان کے آگے سر نہ جھکانے پر انتہائی ظالمانہ اور سفاکانہ رول ادا کیا گیا۔ وفادار ہندوؤں اور مسلمانوں کو بندوقوں اور سنگینوں سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹی گئیں، پیٹ کے بل چلایا گیا۔ بازاری عورتوں کے سامنے شرفاء کو ذلیل کیا گیا۔ پبلک پھانسیاں کھڑی کی گئیں۔ غرضیکہ کوئی ظلم نہ اٹھا رکھا گیا۔ آفرین ہے آزادی ہند کے ان بے مثال دیوانوں پر جنھوں نے ہر قسم کی ذلت و رسوائی کے ساتھ ظلم و تشدد کو اپنے محبوب وطن کی آزادی کے لیے ہنس ہنس کر گوارا کیا اور اپنی عزیز جانوں سے کھیل گئے۔
ہندوستان کے اس جذبۂ حریت کا جائزہ دنیا کی غلام اور آزاد مملکتیں لے رہی تھیں۔ اس بات پر سب کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ خون ناحق ایک دن رنگ لا کر رہے گا اور شاید وہ دن دور بھی نہیں۔
(حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

امرتسر کا قتل عام:

۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء: یہ مربع نما قطعۂ زمین تھا۔ کئی شریک اس کے مالک تھے۔ لندن ٹائمز کے نامہ نگار مسٹر ویلنٹائن کیرول کے الفاظ میں ''کسی زمانے میں یہ باغ تھا مگر اب بے کار جگہ ہے۔ جس میں عام طور سے میلے لگتے یا جلسے ہوتے ہیں۔ اس کا رقبہ لگ بھگ ٹرافلگار اسکوائر کے برابر ہوگا۔ اس کے چاروں طرف دیسی لوگوں کے مکانات کی اونچی اونچی دیواریں ہیں۔

اس میں ایک تنگ گلی کے ذریعہ داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اس خالی جگہ میں تین درخت، ایک شکستہ مقبرہ اور کنواں تھا جسے جلد ہی موت کا کنواں بننا تھا۔

داخلے کا اصل راستہ بھی کچھ کشادہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس باغ میں داخل ہونے یا نکلنے کا کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ نکاسی کی چار پانچ پتلی پتلی جگہیں ضرور تھیں جن سے بمشکل کوئی شخص گزر سکتا تھا۔ داخلے کا راستہ اونچا تھا۔ جس سے پورا باغ بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء کے یادگار دن اس باغ میں ۲۰ ہزار آدمی جمع تھے۔ ان میں بہت سے بچے بھی تھے۔ کئی شیر خوار بچے بھی تھے جو اپنی ماؤں کی گود میں تھے۔ ان کے پاس کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ لڑنے نہیں آئے تھے، بلکہ صرف آزادی کی خواہش کا مظاہرہ کرنے آئے تھے۔

جلیانوالہ باغ کا جلسہ بڑی جلدی میں بلایا گیا تھا۔ ۱۰، ۱۱ اور ۱۲؍اپریل کو امرتسر میں جو واقعات ہوئے تھے اس نے لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ سر مائیکل کے آمرانہ اقدامات ان کے جذبۂ آزادی کو سرد کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس جلسے کے بارے میں شہر میں جو اعلانات کیے گئے تھے وہ بڑے غیر واضح تھے۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ یہ جلسہ کن لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہے اور کون کون لوگ تقریر کریں گے۔ ان کے لیے اتنا ہی جاننا کافی تھا کہ ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر یہ بتانا چاہتے تھے کہ آزادی کی لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، بلکہ شروع ہوئی ہے۔

بریگیڈیئر جنرل ڈائر دو دن پہلے رام باغ میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر چکے تھے۔ وہ ۱۳؍کی صبح کو ایک مسلح دستے کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے اور ایک اعلان کرایا کہ شہر کے اندر یا باہر کسی قسم کے جلسے جلوس کی اجازت نہ ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ اعلان پنجابی اور اردو میں جگہ جگہ پر کیا گیا۔

جنرل ڈائر اعلانچیوں کے ساتھ تھے۔ اس اعلان میں صرف ۲، ۳ گھنٹے لگے اور شہر کے بعض گنجان علاقوں میں یہ اعلان نہیں کرایا گیا۔

۱۳ اپریل کو اتوار تھا۔ اسی دن بیساکھی کا تہوار بھی تھا۔ پنجاب کے کسان فصل کی کٹائی کے بعد یہ تہوار بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں اور دیہاتوں سے بڑی تعداد میں شہروں میں آتے ہیں۔ سکھوں کے لیے یہ ایک مقدس دن تھا کیوں کہ اسی دن ''خالصہ پنتھ'' کا وجود عمل میں آیا تھا۔ قدرتی طور پر سونے کے مندر کے اس شہر میں دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے جن میں سے زیادہ تر متبرک تالاب میں نہانے کے خیال سے آئے تھے۔

۴ بجے شام کو جنرل ڈائر ۹۰ فوجیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہ فوجی رائفلوں اور گُرکیوں سے لیس تھے۔ ان کے ساتھ دو آمرڈ گاڑیاں بھی تھیں۔ وہ پانچ بجے جلیانوالہ باغ پہنچا۔

دیواروں سے گھرے اس باغ میں انسانوں کا جم غفیر موجود تھا۔ چبوترے پر چند لیڈر بیٹھے تھے۔ فوجیوں کے پہنچنے سے پہلے ایک ہوائی جہاز نے اس میدان کے اوپر کافی نیچی اڑان کی۔

جنرل ڈائر باغ میں جانے والے راستے پر جو اونچائی پر واقع تھا، کھڑا ہو گیا اور ۲۵ فوجیوں کو بائیں طرف اور ۲۵ فوجیوں کو داہنی طرف کھڑا کر دیا۔

''جب باغ میں داخل ہوئے تو تم نے کیا کیا؟'' لارڈ ہنٹر نے پوچھا۔

''میں نے گولی چلادی۔'' اس کا جواب تھا۔

''فوراً؟''

''ہاں...... میں نے اس کے بارے میں سوچا تھا اور میرا خیال ہے کہ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کہ میرا فرض کیا ہے ۳۰ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔''

''تمھیں یہ خیال نہیں آیا کہ فائرنگ شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو منتشر ہونے کے لیے کہنا مناسب تھا؟''

''نہیں...... میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے احکامات کی تعمیل نہیں کی گئی ہے۔ مارشل لا کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور میرا فرض ہے کہ رائفل سے فوراً فائرنگ شروع کردی جائے۔''

''مارشل لا کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ تم نے جو قدم اٹھایا وہ بڑا سنگین قدم ہے۔ کیا تم نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ یہ قدم اٹھانے سے پہلے ڈپٹی کمشنر سے صلاح ومشورہ کرلیا جائے، جو شہر میں

امن وامان رکھنے کا ذمہ دار ہے؟''

''اس وقت صلاح کے لیے ڈپٹی کمشنر موجود نہیں تھا۔ میں نے یہ بھی خیال کیا کہ اس سلسلے میں کسی سے پوچھنا عقلمندی نہ ہوگی۔''

''فائرنگ کرانے میں کیا تمھارا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو منتشر کیا جائے؟''

''نہیں جناب، میرا مقصد اس وقت تک فائرنگ کرتے رہنا تھا جب تک کہ لوگ منتشر نہ ہو جائیں۔''

''جب ہجوم کے رویے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ منتشر ہو رہے ہیں تو تم نے فائرنگ روکی کیوں نہیں؟''

''میں نے سوچا کہ میرا فرض اس وقت تک گولی چلاتے رہنا ہے، جب تک ہجوم منتشر نہیں ہو جاتا۔ اگر میں نے محض تھوڑی فائرنگ کرائی ہوتی تو میرا گولی چلوانا بالکل غلط ہوتا۔''

دس منٹ تک گولیاں چلیں، اور ۱۶۵۰ راؤنڈ فائر کیے گئے۔ جنرل ڈائر نے کہا کہ گولیاں چلنی اس وقت بند ہوئیں جب گولیاں ختم ہو گئیں اور اگر جگہ کافی ہوتی تو وہ آرمڈ گاڑیوں کو بھی اندر لے جاتا۔ وقتاً فوقتاً وہ رائفلوں کا رخ ان جگہوں کی طرف کراتا جہاں لوگوں کی بھیڑ گھنی ہوتی کیوں کہ وہ لوگوں کو جلسہ کرنے کے جرم کی سزا دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اس خوں چکاں واقعے کے ایک عینی شاہد لالہ گردھاری لال جنھوں نے اپنے مکان سے موت کا یہ کھیل دیکھا تھا بتایا، میں نے موقع پر سیکڑوں آدمیوں کو مرتے دیکھا۔ تیز فائر کرنے والی رائفلیں استعمال کی گئی تھی۔ سب سے تکلیف دہ بات تو یہ تھی کہ فائرنگ ان راستوں پر بھی کی جا رہی تھی جن سے لوگ باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے، جہاں لوگوں کی بھیڑ زیادہ اکٹھی ہو گئی تھی، اسے بھی نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ فائرنگ کرنے والوں کے سامنے باغ کا جو حصہ تھا اس میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں لوگ کافی تعداد میں نہ مارے گئے ہوں۔ بہت سے لوگ لوگوں کے پیروں تلے کچلے گئے۔ خون کی ندی بہہ نکلی تھی۔ وہ لوگ جو زمین پر لیٹ گئے تھے انھیں بھی نہ چھوڑا گیا۔''

سر ویلنٹائن کیرول نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے:

''کوئی بھی شخص اس وحشت انگیزی کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتا جب تک اس نے جلیانوالہ باغ دیکھا نہ ہو۔ میں اسی تنگ راستے سے اس باغ میں داخل ہوا جس میں جنرل ڈائر رائفلوں سے مسلح ۵۰ فوجیوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ میں اسی اونچی جگہ پر کھڑا ہوا جہاں وہ کھڑا ہوا

تھا اور جہاں سے مجمع کو کوئی وارننگ دیے بغیر محض سو گز کے فاصلے سے اس نے انسانوں کے جم غفیر پر گولی چلانے کا حکم دیا تھا۔ یہ مجمع بالکل نہتا تھا اور کسی لحاظ سے اپنا کوئی بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ گھبرا کر مجمع فوراً منتشر ہونے لگا مگر دس منٹ تک جنرل ڈائر نے انھیں گولیوں کی باڑ پر رکھا اور ۱۶۵۰ راؤنڈ گولیاں چلوائیں۔ انسانوں کا مجمع اس میدان میں اس طرح گھرا ہوا تھا جیسے چوہے پھندے میں پھنسے ہوتے ہیں۔ لوگ تنگ راستوں سے نکلنے کی ناکام کوششوں میں لگے ہوئے تھے یا زمین پر لیٹے ہوئے تھے تاکہ گولیوں کی بارش سے بچ سکیں۔ (جلیاں والا باغ: ۲۰۔۱۷)

اینی بیسنٹ نے لکھا: ہنٹر کمیٹی کے سامنے فوجی حکام کی دی گئی شہادت کو پڑھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا ہے۔ انھوں نے وہی کچھ کیا جو جرمنوں نے بلجیم کے خلاف کیا تھا۔

۱۵؍اپریل ۱۹۱۹ء: امرتسر اور لاہور کے اضلاع میں ۱۵؍اپریل سے مارشل لا لگا دیا گیا۔ اس کے بعد ہی پنجاب کے دوسرے شہروں میں مارشل لا کا نفاذ عمل میں آیا۔ (سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۲۴۴)

سزائے تازیانہ:

۱۹؍اپریل ۱۹۱۹ء سے پہلے: مارشل لا کے تحت پانچ اضلاع کے اندر ۵ سے لے کر ۳۰ بید دوں تک حسب ذیل تعداد کو سزائیں دی گئیں۔

(الف) لاہور	۸۰
(ب) قصور	۷۹
(ج) چوہڑکانہ، سب ڈویژن	۴۵
(د) گوجرانوالہ	۲۴
(ہ) امرتسر	۳۲
(و) گجرات	۳
(ز) لائل پور	۵

یہ کل میزان ۲۶۸ ہوتی ہے۔ اس میں قصور کے اُن چھ لڑکوں کی سزا شامل نہیں ہے اور نہ ان چھ آدمیوں کی سزا شامل ہے جن کو مس شیروڈ پر حملہ کرنے کے خیال سے ضوابط قلعہ کی خلاف ورزی میں دی گئی تھی۔ اور نہ اس میں وہ سزائے تازیانہ شامل ہے جو اس وقت دی گئی تھی جب کہ متحرک کالم نے مختلف دیہات کا دورہ کیا تھا۔ معمولی طور پر یہ کارروائی کی جاتی تھی کہ جس شخص کے

تازیانے لگانے ہوتے تھے اسے برہنہ کر کے ٹکٹکی سے باندھ دیا جاتا تھا اور پھر بیدیں لگائی جاتی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے سول رقبے میں ایک برات کو گرفتار کیا گیا۔ اس وجہ سے کہ مارشل لا آرڈر نمبرا کے خلاف اس میں دس آدمیوں سے زیادہ شامل تھے۔ ان میں سے بعض کے تازیانے لگائے گئے۔ افسر رقبہ نے ان میں سے ایک شخص کے لیے حکم دیتے ہوئے مثل میں لکھا: ''وہ نوجوان ہے۔ تازیانے اس کو فائدہ پہنچائیں گے۔''

لیفٹننٹ کرنل جانسن نے ہمارے سامنے بیان کیا کہ یہ مقدمہ قابل افسوس تھا اور جب مجھے اس کا حال معلوم ہوا تو میں نے افسر سے سرسری کورٹ مارشل کے اختیارات چھین لیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تازیانے پبلک مقامات پر لگائے جاتے تھے۔ لیکن ۱۹۔ اپریل ۱۹۱۹ء سے لاہور میں سینٹرل جیل میں لگائے جاتے تھے۔

ہندوستان سے ہجرت کا خیال:

۲۴راپریل ۱۹۱۹ء: تحریک خلافت کے دوران شدید جذباتی ہیجان کے نتیجے میں اس احساس کے تحت بھی کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اب حکومت برطانیہ خلافت کو بھی نقصان پہنچانے کے در پے تھی، مسلمانوں میں یہ نقطہ نظر عام ہو گیا کہ مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑ کر کسی اسلامی ملک میں چلے جانا چاہیے۔ تحریک خلافت کے قائدین میں سے خود مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے بھی اپنی ایک یادداشت میں جو انھوں نے ۲۴راپریل ۱۹۱۹ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کی خدمت میں پیش کی تھی، اسی نتیجہ پر پہنچے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ جب کوئی ملک اسلام اور مسلمانوں کے لیے محفوظ نہ رہے تو مسلمانوں کے سامنے صرف دو متبادل راستے رہ جاتے ہیں۔ جہاد یا ہجرت۔ یعنی اسے یا تو اپنی ساری قوت کو جو خدا نے اسے بخشی ہے ملک کی آزادی اور اسلام پر عمل پیرا ہونے اور اسے وسعت دینے کی کامل آزادی کے لیے صرف کر دینا چاہیے یا پھر اسے ایک آزاد ملک کو ہجرت کرنا چاہیے۔ ہماری موجودہ خستہ حالی کے پیش نظر صرف ہجرت ہی ہمارے لیے ایک واحد متبادل صورت رہ گئی ہے۔ یہ اقدام جسے ہمیں اب تمام تر سنجیدگی کے ساتھ جو اس کا تقاضا ہے، ترجیح دینی ہے۔ ہماری قوم کی تاریخ میں ہمارے پیغمبر ﷺ کی ہجرت کے بعد شاید سب سے زیادہ فیصلہ کن ہوگا۔

(یادداشت مشمولہ ''افضل اقبال'' "Life and times of Mohammad Ali" (لاہور، ۱۹۷۴ء) ص ۴۵۔۱۳۳، اس یادداشت کا حوالہ مولانا محمد علی نے اپنی ایک تقریر (دہلی ۱۶ر جنوری ۱۹۲۰ء میں بھی دیا تھا۔ مشمولہ ''خطبات محمد علی'' مرتبہ رئیس احمد جعفری (کراچی، طبع اول، ص ۴۳)

۲ر مئی ۱۹۱۹ء: سردار محمد صالح خان کو کماندار بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے ۲ر مئی ۱۹۱۹ء کو کابل سے اعلان جنگ ہونے سے قبل لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ہوائی جہاز سے بم گرائے جس سے اس کا ایک پاؤں زخمی ہو گیا اور چلاتا ہوا پیچھے ہٹا کہ'' پائے من شہید شد، پائے من شہید شد'' امیر امان اللہ نے فوراً اس کو معزول کر دیا اور اس کی سزا کے لیے مشورہ طلب کی۔ سب لوگوں کی رائے تھی کہ قتل کر دیا جائے۔ لیکن امیر امان اللہ خان نے حکم دیا کہ اسے عورتوں کا لباس پہنا کر گھر کے اندر رکھا جائے اور یہ ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ اگر کبھی مرد کے لباس میں گھر کے باہر دیکھا جائے تو ہر شہری پر اس کا خون حلال کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اسے قتل کر دے۔ سردار محمد صالح خان کے فرار سے فائدہ اٹھا کر انگریزی فوج نے ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ اب جنرل نادر خان محاذ جنگ پر آیا اور اس نے تیزی سے حملے شروع کیے اور مارچ کرتا ہوا ٹھل کا محاصرہ کر لیا۔ نادر خان کے مقابلے کے لیے جنرل ڈائر کو روانہ کیا گیا۔ جنرل ڈائر نے اس وقت کے سرکاری انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنا ایک بیان شائع کرایا جس میں کہا کہ نادر خان میری فوج پر اس طرح ٹوٹا جس طرح آسمان سے ستارہ ٹوٹتا ہے۔ جنرل نادر خان نے پشاور کو گھیرنے اور اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ادھر جنرل نادر خان کے بھائی جنرل محمود خان نے انگریزی سپاہ کو دوسرے محاذ پر پے در پے شکست دی تھی مگر ۲۷ر مئی ۱۹۱۹ء کو امیر امان اللہ خان نے جنگ بندی کا فیصلہ کر کے حکم دیا کہ افغانی فوجیں سرزمین ہندوستان کو خالی کر کے سرحد سے ۲۰ میل پیچھے ہٹ آئیں۔

امیر امان اللہ خان کا عالم یہ تھا کہ جب محمد صالح فرار ہوا ہے اور انگریزوں نے ہوائی جہاز سے کابل پر بمباری کی تو وہ رائفل لے کر خود نکلتا تھا اور ہوائی جہاز پر حضرت علیا سلطان کے منع کرنے کے باوجود فائر کرتا تھا۔ اس فعل عبث سے اس کی بے جگری اور دلاوری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ کا منشا صرف یہ تھا کہ انگریز کا دباؤ افغانستان سے اٹھ جائے اور ملک خداداد افغانستان واقعی ملک، خداداد ہو جائے۔ انگریزوں کی دقت یہ تھی کہ ابھی ہندوستان کی افواج واپس نہیں آئی تھیں اور روس میں بالشویک حکومت لینن اور ٹرانسکی کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں قائم

ہو چکی تھی۔ روس اپنی اندرونی دقتوں کے باوجود پوری طرح ہندوستان اور افغانستان اور ہر محکوم ملک کی مہم آزادی کا ہر طرح کا مددگار تھا۔ اس چپقلش میں انگریز کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ افغانستان کو شکل سابق کوئی سبق دے سکتا اور اسی لیے جنگ بندی اس قدر جلد طے ہو گئی۔ (تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۹۱)

اناطولیہ پر یونان کا حملہ:

۶ رمئی ۱۹۱۹ء: عارضی صلح نامہ نے ترکان کے احرار اور دنیائے اسلام کے دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ ابھی عارضہ صلح نامہ کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ۶ رمئی ۱۹۱۹ء کو جہاں صلح کانفرنس بیٹھی ہوئی تھی اور جہاں جرمنی ہر شرط کو جسے وہ اپنے مفاد قومی کے خلاف پاتا تھا، ٹھکرا دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اخباروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کیا ابھی جرمنی میں لڑائی کا دم خم باقی ہے۔ کلیمنشو وزیر اعظم فرانس اور لائیڈ جارج کی تائید سے یونانیوں کو اناطولیہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی۔ عارضی صلح کے بعد حالات بدستور قائم رکھے جاتے ہیں جب تک مکمل صلح نہ ہو جائے۔ لیکن ترکی کے ساتھ مسیحی اور اسلامی جنگ کا نقشہ تھا۔ قانون، روایت، شرافت، اصول، انصاف سب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ انگریز کا یہ دعویٰ تھا کہ اناطولیہ میں ترک اقلیت میں ہیں اور ترکوں کو وہی علاقہ ملے گا جہاں وہ اکثریت میں ہیں اور اس کے لیے صرف پچاس لاکھ کی آبادی کا ایک حلقہ تجویز کیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا بھی (حال آں کہ یہ کذب صریح تھا) تو اس کے لیے رائے شماری کی ضرورت تھی۔ اس کا بھی انتظار نہیں کیا گیا اور ترکی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے ۱۳۔ مئی ۱۹۱۹ء کو اتحادی بیڑوں کی حمایت میں یونانی فوج سمرنا میں اتری جو ایک بندرگاہ بھی ہے، یونانیوں اور اتحادیوں کے لیے یہ ایک نادر موقع اپنے آتش عناد کو بجھانے کا تھا۔

ادھر قسطنطنیہ کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ ظل سلطانی سے وابستہ تھے سب ہمت ہار گئے اور گربہ مسکین بنے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ترکی پر حکم برداری قائم ہو جانے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ مجلس ملی (ترکی پارلیمنٹ) نے کچھ دم خم دکھلایا اور ایک تجویز احتجاج کی مرتب کی۔ لیکن سلطان نے مجلس ملی کو برخاست کر کے داماد فرید پاشا کو وزیر اعظم علی کمال کو وزیر داخلہ اور عادل بے اور محمود علی کو وزارت میں داخل کر کے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یا یوں کہیے کہ غدار داماد فرید پاشا کے سپرد کر دیا۔ ترکان احرار قتل کیے جا رہے تھے۔ اتحادی اور یونانی جنگی جہاز قسطنطنیہ کے سامنے لنگر ڈالے پڑے

تھے۔ بیرون ملک کے افسر کل کلیدی جگہوں پر قابض تھے۔ عوام بے چین تھے۔ ایا صوفیہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ایک لاکھ کے قریب لوگ جمع تھے۔ اس کے اوپر انگریزی ہوائی جہاز پرواز کررہا تھا۔ مفتی اعظم جو مولانا محمود حسن کے ذہنی ساتھی اور ان کے مشن کے حامی تھے، انھوں نے خلیفۃ المسلمین کے کہنے سے مدافعت ترک کرنے کا فتویٰ دینے سے انکار کردیا۔ وہ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے گئے اور دوسرے شیخ الاسلام لائے گئے جو لسان العصر اکبر مرحوم کی زبان میں ''بریگیڈ'' کے مولوی تھے۔ بہ تصرف:

بریگیڈ کے مولوی کو تم جانتے ہو کیا ہے؟
برٹش کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے!

یونان کے حملہ کے ساتھ ہی دنیائے اسلام میں ہر جگہ انگریزوں کے خلاف بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ افغانستان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ عراق میں مجاہدین کی ایک لاکھ فوج بغداد کی طرف کوچ کررہی تھی۔ ایران میں انگریز کی ریشہ دوانیوں کے خلاف بغاوت ابھر رہی تھی۔ بالشویک روس لینن کی سرکردگی میں دنیاے اسلام کو ہر جگہ انگریز سے نبرد آزما ہونے کے لیے ابھار رہا تھا اور ہر ممکن امداد دے رہا تھا۔ انور پاشا اور ان کے ساتھی انگریزوں کے مظالم کے ڈر سے وطن چھوڑ کر یورپ چلے گئے اور یہی حال جمال پاشا اور دیگر ترکان احرار کا تھا۔ وہاں سے انور پاشا فروری ۱۹۲۰ء میں روس آئے۔ چناں چہ لینن نے اقوام مشرقی کی ایک کانفرنس باکو میں منعقد کی۔ وہاں انور پاشا بھی شریک ہوئے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ روس ایران کی انقلابی جماعتوں کو بھی بغاوت کے لیے اکسا رہا تھا۔ (تحریک خلافت: قاضی عدیل احمد عباسی، صفحہ ۵۰۔۱۴۹)

ہندوستان کے انگریز پرستوں کا بیان:

۱۰ر مئی ۱۹۱۹ء: برطانوی حکومت ہند کے خلاف افغانستان کے اعلان جنگ کے بعد وائسراے اور گورنر جنرل ہند مسٹر چیمسفورڈ نے ۱۰ر مئی ۱۹۱۹ء کو اپنی ''وفادار رعایاے شہنشاہ معظم'' کو آگاہ کرنے کے لیے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا ہے:

''ہزایکسیلنسی نے افغانستان کی اس حیرت انگیز بے وقوفی کی ایک وجہ تو یہ قرار دی کہ امیر حبیب اللہ کے قاتلوں کو سزا نہ دینے سے ملک میں بے چینی پھیل رہی تھی اور امیر امان اللہ نے جنگ چھیڑ کر لوگوں کے خیالات کو اس جانب منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہندوستان کی حکومت

کے ساتھ وفا کے رشتے کو توڑنا کسی حد تک دوستان جرمنی مقیم کابل کی ان کوششوں کا کہ وہ امیر مرحوم کو راہ راست اور وفاداری کی منزل کی ترغیب دیتے تھے، بدیر حاصل ہونے والا ثمرہ ہے۔"

"جو شہادت ہز ایکسیلنسی کے ہاتھ میں ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ امیر نے اپنی بغاوت کے لیے یہ بہانہ کیا ہے کہ ہندوستان اس وقت انقلاب کی حالت میں ہے جو ان کے ملک میں ریشہ دوانیوں کا باعث ہوگی۔ امیر نے اپنی رعایا سے بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں نہ تو لوگوں کا مال واسباب سلامتی کی حالت میں ہے نہ مذہب...... امیر نے اس طرح کے کاغذات واعلانات ہندوستان میں پھیلانے کا انتظام کیا ہے اور ایسے اخبارات کو رشوت دینے کا بھی انتظام کیا جن کے متعلق ان کو امید تھی کہ وہ بک جانے کو تیار ہوں گے...... امیر کی یہ خودکشانہ غلطی ہے کہ انھوں نے اپنی طاقت کا ایک ایسی طاقت سے مقابلہ کیا جو دنیا کی سب سے بڑی جنگ میں فتح یاب ومنصور ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کرنے کے لیے ایک فوقیت رکھنے والی اور سب پر چھائی ہوئی طاقت حاصل ہے اور وہ اس حرکت مجرمانہ کی قرار واقعی سزا دے گی۔" (تحریک خلافت، قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۹۱۔۹۰)

امرتسر کا مقدمۂ سازش:

۲رجون ۱۹۱۹ء: امرتسر کے مقدمۂ سازش (جلیانوالہ باغ کیس) میں ۱۵ افراد کے خلاف مقدمہ قائم کیا تھا۔ اس میں سات ہندو، سات مسلمان اور ایک سکھ ملزمان تھے۔ مسٹر حسن امام نے دو کے سوا تمام ملزمان کی طرف سے وکالت کی۔ استغاثہ میں کہا کہ ان پندرہ آدمیوں کے خلاف یہ بیان ہے کہ وہ اس تمام تحریک کے سرغنہ تھے جس کا انجام ۱۰راپریل کو جنگ کرنے کے افعال میں ہوا۔

مختصر طور پر استغاثے کا بیان ہے کہ گورنمنٹ کو خوفزدہ کرنے اور رولیٹ ایکٹ کی تنسیخ کو حاصل کرنے کے لیے دیگر مقامات کے سازشیوں سے مل کر امرتسر میں ایک مجرمانہ سازش مرتب کی گئی۔ یہ مغویانہ سازش ۳۰رمارچ ۱۹۱۹ء کو موجود تھی اور یہ پندرہ آدمی اس وقت اس سازش کے ممبر تھے یا بعد میں (۱۳راپریل ۱۹۱۹ء تک) اس میں شامل ہوئے۔ جو واقعات ۱۰راپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ظہور میں آئے، ان کو سب جانتے ہیں۔ اس لیے ان کی تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر کچلو وستیہ پال ملزمان نمبر ا ونمبر ۲ کو اسی دن صبح کے دس بجے جلاوطن کیا گیا۔ ان کی جلاوطنی

کی خبر جلد ہی شہر میں پہنچائی گئی۔ فوراً شہر میں ہڑتال ہوگئی اور عوام کا ایک مجمع ان دونوں جلاوطنوں کی رہائی کے مطالبہ کے لیے سول اسٹیشن میں ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی طرف چل پڑا۔

ریل کے پل پر اس مجمع کی مڈبھیڑ فوج کے ایک چھوٹے سے محافظ دستے کے ساتھ ہوئی۔ مجمع نے اینٹ پتھر سے اس دستے پر حملہ کیا اور اسے تقریباً دس گز تک پیچھے ہٹا دیا۔ مگر اس موقعے پر مسٹر کارورز امداد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آپہنچے۔ انھوں نے لوگوں کو ٹھہرانے کی کوشش کی مگر بے سود! اور دستے کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس سے بلوائی رک گئے۔ اور اس کے بعد جلدی مسٹر پلومر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسلح پولیس کی ایک جماعت کو لے کر دستے کی مدد کو آگئے۔ اس مجمع کے ایک حصے نے ریل کے مال گودام پر حملہ کر کے گارڈ رابنسن کو ہلاک کر ڈالا اور اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ مسٹر بینٹ پر حملہ کیا۔ ریگو پل کے قریب انھوں نے سارجنٹ رولینڈز، چھاؤنی کے عامل برقیات کو بے تحاشا زدوکوب سے ہلاک کر ڈالا اور تار گھر پر حملہ کر دیا۔ مجمع کے دوسرے حصے نے ریلوے روڈ کے پل پر بزور آگے جانے کی کوشش کی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مجبوراً گولی چلانے کا حکم دینا پڑا۔

شہر میں نیشنل بینک کو جلا کر لوٹ لیا گیا۔ میسرز اسٹورٹ وسکاٹ کو قتل کر دیا گیا۔ الائنس بینک کو لوٹ لیا گیا اور مسٹر طامسن کو مار ڈالا گیا۔ اور چارٹرڈ بینک پر حملہ کیا گیا۔ رلے جس بک سوسائٹی کے بک ڈپو، ٹاؤن ہال اور ہندوستانی عیسائیوں کے گرجا کو جلا دیا گیا۔ لڑکیوں کے نارمل اسکول اور زنانہ ہسپتال پر حملہ کیا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر مسز ایسڈن بال بال بچی اور مسز شیروڈ کو وحشیانہ طور پر نہایت بے رحمی سے زدوکوب کیا گیا۔

شہر بذات خود ۱۳ر اپریل تک باغیوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس امر کی کہ یہ واقعات دیدہ و دانستہ اور ارادی افعال جنگ میں شامل ہیں تردید نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت ملزموں کے فاضل وکیل نے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ جنگ نہیں کی گئی اور ہمیں یہ رائے دینے میں کوئی تامل نہیں کہ ۱۱ر اپریل کو جنگ کی گئی۔

سازش کیس کے مجرم:

۹ر جون ۱۹۱۹ء: عدالت نے پانچ ملزمان کو عدم ثبوت اور شبہ کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ بقیہ دس کو حکومت کے خلاف سازش، بغاوت، قتل، ارادۂ قتل، املاک کے نقصان، فساد اور متعدد دفعات

کے تحت حسب ذیل سزائیں دی گئیں۔

(۱) سیف الدین کچلو	عمر قید بہ عبور دریائے شور
(۲) ستیہ پال ولد منی	عمر قید بہ عبور دریائے شور
(۴) حافظ محمد بشیر ولد محمد حسین	موت و ضبطی جائیداد
(۵) کونول ولد رگھنندن لال	تین سال کی قید بامشقت
(۶) نرائن داس کھنہ ولد تیرتھ رام	تین سال کی قید بامشقت
(۸) انو بھون نند سنیاسی	عمر قید بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائیداد
(۹) دینا ناتھ	عمر قید بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائیداد
(۱۰) گور بخش رائے ولد جے گوپال	عمر قید بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائیداد
(۱۲) غلام محمد ولد مادھو	عمر قید بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائیداد
(۱۳) عبدالعزیز ولد فیروز دین	عمر قید بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائیداد

جن پانچ ملزموں کو بری کر دیا گیا تھا ان کے نام یہ ہیں، بدرالاسلام علی خاں، گوردیال سنگھ سلاریا ولد پیارا سنگھ، غلام نبی ولد غلام رسول، محمد اسمٰعیل ولد عبدالستار اور موتی رام ولد بھنامل

یہ فیصلہ ۲ رجون کو لکھا گیا اور ۹ رجون ۱۹۱۹ء کو صدر مجلس اے بی براڈوے نے فیصلے پر تصدیقی دستخط کر دیے۔

(امرتسر کے مقدمہ سازش کے متعلق مارشل لا کمیشن کا فیصلہ۔'' ناشر: پنجاب پبلسٹی کمیٹی، لاہور، مطبع: کاشی رام پریس، لاہور)

راولپنڈی کانفرنس:

۸ر اگست ۱۹۱۹ء: مستقل صلح کے لیے برطانوی حکومت ہند اور افغانستان دونوں فریقوں کے نمائندے راولپنڈی میں جمع ہوئے اور وہاں ۸ر اگست ۱۹۱۹ء کو دونوں ملکوں کے درمیان معاملات طے ہو گئے۔ اس صلح کے ذریعے انگریزوں نے افغانستان کی موجودہ آزادی کو اور افغانستان نے موجودہ سرحدوں کو تسلیم کیا۔

راولپنڈی کانفرنس میں پہلے انگریز نمائندے سر ہیملٹن گرانٹ نے تقریر کی۔ اس نے بڑی تمکنت سے افغانستان کو جنگ شروع کرنے پر ملامت کی اور پھر کہا کہ ''افغانستان کی کیا حیثیت

تھی جو ہم سے نبرد آزما ہوتا لیکن ہم نے افغانستان پر رحم کر کے لڑائی جاری رکھنا نامناسب سمجھا۔''
اس کے بعد افغانی نمایندے سردار علی احمد خان نے زوردار گفتگو کی۔ اس کو اینگلو انڈین اخبارات نے حیرت خیز قرار دیا۔ افغانی مندوب نے کہا ''لڑائی تم نے شروع کی اور صلح کی درخواست بھی تم نے کی ہے۔ تم کو اپنی طاقت کا بالکل بے جا گھمنڈ ہے، تم جرمنی کے مقابلے میں بہت کمزور تھے مگر دنیا میں اتحاد جیتا ہے، تم کو اتحادی مل گئے اور تم کامیاب ہو گئے۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ ہم کو اتحادی نہ مل جاتے۔'' اس پر کانفرنس عارضی طور پر ملتوی کر دی گئی۔ اصل الفاظ حسب ذیل تھے:

''اس بیان کے متعلق کہ برٹش گورنمنٹ افغان گورنمنٹ سے اس قدر زیادہ طاقتور ہے کہ اگر جنگ جاری رہتی تو نتیجہ صرف برٹش گورنمنٹ کے حق میں ہوتا۔ سردار علی احمد نے تسلیم کیا کہ اس وقت ضرور برٹش گورنمنٹ کے پاس آدمی، توپوں اور آلہ پرواز کی زیادتی ہے لیکن کیا یہی حالت جنگ یورپ میں جرمنی کی نہیں تھی اور کیا جرمنی نے لندن پر اسی طرح بم نہیں گرائے تھے جس طرح کابل پر انگریزوں نے گرائے ہیں۔ لیکن آخر میں کون کامیاب ہوا۔ برٹش نے اس جنگ میں کامیابی حاصل کی کیوں کہ وہ متحدہ ہو گئے تھے۔ ان کو اتحادی مل گئے تھے۔ یہی امکانات اتحاد اور اجتماع کے افغانستان کو بھی حاصل ہیں۔ ایسی صورت میں صلح کانفرنس کا ایک فریق دوسرے سے یہ کہنے کا مجاز نہیں ہے کہ ہم کامیاب ہوتے اگر جنگ جاری رہتی۔ حکومت ہند کو اس غلطی میں نہ پڑنا چاہیے کہ افغانی غافل اور جاہل قوم ہیں۔''

افغانی ہوّا:

مولانا عبیداللہ سندھی آزادی وطن ہند کے لیے بے چین تھے لیکن باہر رہ کر اور باہر کے ملکوں پر بھروسا کر کے انھوں نے یہاں کے ہندوؤں پر اچھا اثر نہیں ڈالا۔ ان کی نیت پر شبہ کیا گیا اور انگریزوں نے خفیہ پروپیگنڈے سے یہ خیال پیدا کر دیا کہ مسلمان افغانستان سے حملہ کرا کے اور خود ان کی مدد کر کے ایک متحدہ قومی جمہوریہ نہیں بلکہ افغانستان کی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ اس پر بحث اور صفائی کئی سال تک جاری رہی۔ ''افغان، ہوّا'' کے نام سے ہر قوم پرور مسلمان صفائی دیتا رہا۔ حتیٰ کہ مولانا محمد علی سے بھی ایک مرتبہ سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر افغانستان ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے آئے گا تو ہم اس کی مدد کریں گے اور اگر وہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے آئے گا تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا

حسرت موہانی نے جوالہ آباد سے واپس ہو کر آئے تھے۔ مجھ (قاضی محمد عدیل عباسی) سے کہا کہ سرتیج بہادر سپرد کے مکان پر اس معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک نشست تھی کہ اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ کردے تو ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ سرتیج بہادر نے پوچھا کہ آپ بتلائیے کہ کیا رویہ ہوگا؟ مولانا حسرت فرماتے تھے کہ میں نے کہا بات کو چھپا کر کہنے سے کیا حاصل، دنیا جانتی ہے کہ افغانستان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر سکے۔ آپ اس کو سوچیے کہ اگر روس حملہ کرے تو ہمارا رویہ کیا ہوگا؟ سرتیج بہادر نے پوچھا کہ آپ بتلائیے کہ کیا رویہ ہوگا؟ مولانا حسرت نے کہا کہ ہم قصائد لکھ کر ان کا خیر مقدم کریں گے۔ سپرد صاحب نے کہا کہ کیا وہ ہم کو غلام نہیں بنائیں گے؟ تو حسرت صاحب نے جواب دیا کہ تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ ان کی پالیسی استعمار پسند نہیں ہے وہ صرف غلام قوموں کو آزاد کراتے ہیں۔ سپرد صاحب نے کہا کہ مولانا وہ آپ کا گھر لوٹ لیں گے۔ مولانا نے کہا کہ بلا سے لوٹ لیں، لیکن ملک تو آزاد ہو جائے گا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہو گیا کہ ۱۹۱۹ء مسلمانوں کے سخت دماغی خلجان کا زمانہ تھا اور یہ تھا کہ انگریز نے لڑائی تو جیت لی تھی، لیکن ہر جگہ آزادی کے لیے آگ پھیل گئی تھی۔ (تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۹۳-۹۲)

معاہدۂ سیورے:

۱۰ راگست ۱۹۱۹ء: ترکی اور دول متحدہ کے مابین سیورے (sevray) کے مقام پر ایک صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔ اس صلح نامے کے بارے میں مصنف ''تاریخ اقوام عالم'' کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۰ راگست ۱۹۱۹ء کو سیورے کے مقام پر ایک صلح نامے، پر ترکی سے دستخط کرا لیے گئے۔ صلح نامے کی شرائط اس درجہ ذلت آمیز تھیں کہ اس سے ترکی کی ہستی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کے سوا کوئی دوسرا مقصد معلوم نہ ہوتا تھا۔ معاہدہ طے کرتے وقت امریکہ کے صدر ولسن کے چودہ نکات کو جن کا اعلان انھوں نے ۸ رجنوری ۱۹۱۸ء کو کیا تھا، گلدستۂ طاق نسیاں بنا دیا گیا۔ صدر ولسن اور امریکی نمایندے صلح کی کانفرنس میں شرکت کے لیے یورپ آئے تو انھیں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور یورپ کے جن مدبروں سے پالا پڑا وہ صرف فتح کے غیر محدود و بے قید ثمرات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے صدر ولسن اور ان کے چودہ نکات کا مذاق اڑایا۔ فرانس کے صدر موسیو کلیمنشو نے

صلح کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''ولسن تو یسوع مسیح کی باتیں کر رہا ہے۔ بلکہ وہ قادر مطلق خدا سے بھی بازی لے گیا ہے، جس نے موسیٰ علیہ السلام کو صرف دس احکام دیے تھے اور ولسن چودہ نکات لے کر آیا ہے۔''

وزیر اعظم برطانیہ لارڈ جارج اور صدر فرانس موسیو کلیمنشو نے صدر امریکہ کو ایسا متاثر کیا کہ انھوں نے بھی اپنے چودہ نکات کو فراموش کر دیا۔ فاتح اقوام کے نمایندوں نے جو معاہدہ تیار کیا تھا ترکی کے نمایندے کو بلا کر بزور شمشیر اس پر دستخط حاصل کر لیے۔ اس عہد نامے کی رو سے ترکی پر بھاری تاوان جنگ ڈالا گیا تھا اور اس کی وصولی کے لیے ترکی کے ذرائع آمدنی کو اپنے قبضے میں لینا طے کر لیا گیا تھا اور ترکی کے علاقوں پر اس طرح قبضہ طے کیا گیا کہ عراق، فلسطین اور شرق اردن برطانیہ کی عمل داری میں چلے گئے، شام و لبنان پر فرانس کا قبضہ مان لیا گیا، شریف مکہ حسین کو جس نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے اتحادیوں کی مدد کی تھی، یہ انعام دیا گیا کہ اسے حجاز کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا، اس کے بیٹے امیر فیصل کو عراق کا کٹھ پتلی حکمران بنا دیا گیا۔ ترکی سے تاوان جنگ وصول کرنے کے لیے برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی فوجوں نے قسطنطنیہ پر اپنا قبضہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔'' (تاریخ اقوام عالم: مرتضیٰ احمد خاں، لاہور۔۱۹۶۳ء)

یہ تمام باتیں ترکوں کے لیے نہایت توہین آمیز اور تباہ کن تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدا میں خود سلطان نے بھی انھیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں مجبوراً اتفاق ظاہر کرنا پڑا اور صلح نامے پر دستخط کر دیے''۔ (ترکی: اکمل ایوبی، علی گڑھ، ۱۹۶۳ء)

اس صلح نامہ سیورے کے بارے میں مولانا محمد علی فرماتے ہیں:

''اس کی مالی دفعات کو دیکھیے، ہندوستان میں کسی چھوٹی سے چھوٹی ریاست کو بھی اپنے مالیے پر اتنی بے اختیاری نہ ہوگی جیسی اس عہد نامے نے ترکوں کے لیے تجویز کی ہے۔ جہاں پہلے ترکی میں سات لاکھ فوج رہتی تھی وہاں اب صرف ۱۵ ہزار باقاعدہ اور ۳۵ ہزار امدادی فوج کی اجازت دی گئی ہے اور اس کے افسر و تربیت دہندہ بھی سب باہر کے لوگ ہوں گے۔ ترکی کی بحری قوت کو بالکل ہی معدوم کر دیا گیا ہے۔ صرف چند چھوٹے چھوٹے جہاز اور کشتیوں کی اجازت دی گئی ہے اور ہوائی جہاز تو ترکی تجارتی اغراض کے لیے بھی نہیں بنا سکتا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اتحادیوں، بلکہ یونان کے ہوائی جہاز بھی ترکی میں جہاں چاہیں گشت لگائیں اور ترکی پر یہ پابندی ہے کہ وہ ان کے لیے پٹرول و رسد وغیرہ مہیا کرے۔ ایسے حالات میں یہ ذرا بھی تعجب انگیز نہیں کہ مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے رفقا کہتے ہیں کہ ہم

اس عہد نامہ کو مطلق تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس پر غداروں اور عیاروں نے دستخط کر دیے ہیں۔'' (خطبۂ صدارت مولانا محمد علی اودھ خلافت کانفرنس، لکھنو، ۲۵رفروری ۱۹۲۱ء، ص ۳۸)

آل انڈیا مسلم کانفرنس

۱۸رستمبر ۱۹۱۹ء: تحریک خلافت کے سلسلے میں جیسا کہ پہلے کہا گیا تھا ہندوستان میں احتجاجی جلسے ہو رہے تھے اور مطالبہ ہو رہا تھا کہ مطابق پیمان وعہد خلافت مرکزیہ اسلامیہ ترکی کو بحال رکھا جائے اور اماکن مقدسۂ جزیرۃ العرب، بیت المقدس، فلسطین، بغداد، نجف اشرف وغیرہ کو خلیفہ کے زیر نگیں رکھا جائے۔ خواہ ان کو مکمل آزادی دے دی جائے۔ لیکن ابھی ترکی کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اور عوام وخواص سب کا فیصلہ یہ تھا کہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کے سربراہوں کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا جائے تا کہ لندن میں جو صلح کانفرنس کمیٹی تین بڑے ممالک امریکہ، برطانیہ اور فرانس پر مشتمل کام کر رہی ہے اس پر اثر پڑے اور فیصلہ وہ ہو جو ہمارے جذبات سے ہم آہنگ ہو۔ اسی لیے ملک بھر میں جلسے ہو رہے تھے۔ جن میں تجویزیں پاس ہو رہی تھی۔ چناں چہ اسی سلسلے کا ایک عظیم الشان جلسہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے ۱۸رستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنو میں طلب کیا گیا۔ جس میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہر طبقہ خیال کے علماء وزعماء شریک ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ مجمع بہت زیادہ تھا اور کوئی طبقہ خیال ایسا نہیں تھا جس کے نمایندے شریک نہ ہوئے ہوں''۔

اس مقام پر قاضی عدیل احمد عباسی نے ایک حاشیہ لکھا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''چودھری خلیق الزماں نے دعویٰ کیا کہ یہ کانفرنس ان کے ذہن کی پیداوار تھی (پاتھ وے ٹو پاکستان) لیکن ان کے اس دعوے کی تائید کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی۔ یہ امر قرین قیاس بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اسی وقت خلیق الزماں ایل ایل بی کے طالب علم اور اتنی بڑی کانفرنس کا طلب کرنا کسی طالب علم کے بس کی بات نہیں تھی اور پھر اس کانفرنس کے داعیوں کی فہرست بھی ان کے نام سے خالی ہے''۔

اس کانفرنس کے داعیان حسب ذیل ہیں:

آنریبل نواب ذوالفقار خان	لاہور	آنریبل محمد عبدالقدوس	مدراس

مسٹر آغا محمد صفدر	سیالکوٹ	آنریبل مولوی فضل الحق	کلکتہ
مولوی غلام محی الدین	قصور	آنریبل مولوی ابوالقاسم	بردوان
مولانا ابوالوفا محمد ثناء اللہ۔	امرتسر	مولوی مجیب الرحمٰن	کلکتہ
آنریبل نواب سرفراز حسین خان۔ پٹنہ		ڈاکٹر مختار احمد انصاری	دلی
آنریبل خواجہ محمد نور	گیا	آنریبل سید رضا علی	الٰہ آباد
آنریبل سید نورالحسن	بانکی پور	حکیم محمد اجمل خان	دلی
آنریبل سر فضل بھائی کریم بھائی۔	بمبئی	شیخ ظہور احمد بیرسٹر	الٰہ آباد
حاجی جان محمد چھوٹانی	بمبئی	مولوی محمد فائق	مرادآباد
آنریبل سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر۔	پونہ	مولوی محمد یعقوب	مرباد
سیٹھ عبداللہ ہارون	کراچی	آنریبل سید آل نبی	آگرہ
آنریبل سر اسد علی خان	مدراس	تصدق احمد شیروانی بیرسٹر	علی گڑھ
شیخ عبداللہ وکیل	علی گڑھ	مولوی سید نبی اللہ بیرسٹر	لکھنو
حافظ محمد حلیم	کان پور	مفتی محمد نسیم ایڈوکیٹ	لکھنو
حافظ ہدایت حسین	کان پور	منشی احتشام علی رئیس کاکوری	لکھنو
مولوی فضل الرحمٰن وکیل	کان پور	چودھری نعمت اللہ وکیل	لکھنو
شیخ شاہد حسین تعلقہ دار گدیہ	بارہ بنکی	ڈاکٹر محمد نعیم انصاری	لکھنو
مفتی نواب علی وکیل	بارہ بنکی	شیخ محمد علی حیدر خان	لکھنو
سید ظہور احمد وکیل	لکھنو		

یہ بھی طے ہوا تھا کہ جملہ خط و کتابت سید ظہور احمد آنریری سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ہونی چاہیے یہ نام بذات خود بتلائیں گے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی نوعیت کیا تھی۔ اس کے اشتہار کی سرخی تھی ''مسلمانوں کی موت وحیات کا مسئلہ'' اور اشتہار میں درج تھا:

''یہ امر محتاج بیان نہیں کہ سلطنت ترکیہ اور خود ترکی و قسطنطنیہ کا مستقبل بحالت موجودہ کس قدر بیم و رجا کی حالت میں ہے۔ صرف اسی تجویز پر قناعت نہیں ہے کہ ان مقبوضات کو جو دوران

جنگ حاصل کیے گئے ہیں ہمارے خلیفہ اور سلطان سے لے کر شیرازۂ سلطنت منتشر کر دیا جائے بلکہ دیگر صوبہ جات اور تمام یورپین ترکی بلکہ خود قسطنطنیہ تک کے واسطے یہی تجویز ہے۔ یہ بھی زیر غور ہے کہ جو حصص اس طرح حاصل کیے جائیں وہ یورپ کی مسیحی طاقتوں میں سے کسی کے زیر انتظام کر دیے جائیں۔ جہاں تک اس حصۂ ملک کا تعلق ہے جس کو سلطان کے قبضے میں چھوڑ دینا قرار پایا اس میں بھی ان کے اختیارات شاہانہ محدود کر دینے کا خیال معلوم ہوتا ہے۔ ان تجاویز کو مجلس صلح نے جو لندن میں اپنے اجلاس کر رہی ہے، ابھی حتمی طور پر منظور نہیں کیا ہے، لیکن یہ خبریں ملی ہیں اور اس امر کا اندیشہ ہے کہ برطانیہ اعظم بھی اگر سب نہیں تو ان میں سے بعض تجاویز کا ضرور مؤید ہے۔ کافی پرزور معروضات اور شکایات اس مسئلے کے متعلق حکومت برطانیہ کے ساتھ اور چند نائبین برطانیہ کی معرفت مجلس صلح کے سامنے بھی پیش کیے جا چکے ہیں مگر بظاہر اب تک ان کا حسب دل خواہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تازہ ترین اخبار دنیائے اسلام کے لیے دل شکن ہیں۔''

''اکثر لوگ جو اس تجویز کے حامی ہیں اس امر کو نظر انداز کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کے جذبات پر اس مسئلے کا کس قدر گہرا اثر پڑے گا۔

''آل انڈیا مسلم لیگ اور چند دیگر جماعتیں اپنا فرض انجام دے رہی ہیں۔ روپیہ کی امداد طلب کی گئی ہے اور مختلف مقامات پر جلسے منعقد ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں کہ مسلمانان ہند کے جو جذبات اس بارے میں ہیں ان کا اظہار کریں۔'' لہٰذا اس غرض کے لیے ہم ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ ۲۱ر ستمبر ۱۹۱۹ء دعوت دینے کی جرأت کرتے ہیں اور مستدعی ہیں کہ تمام ممبران مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتیں و نیز تمام مسلمان خواہ ان کا مسلک سیاسی ہو یا نہ ہو، اس خاص اجلاس میں شرکت کی کوشش کریں اور جو مسائل پیش ہوں ان میں حصہ لے کر مسلمانوں کے جذبات حقیقی کا جو انھیں سلطان ترکی اور ان کی سلطنت کے ساتھ ہے، اظہار کریں۔''

اس کانفرنس کے منتخب صدر مسٹر ہارون ابراہیم جعفر تھے۔ وہ بروقت نہ آسکے تھے اس لیے مولانا عبدالباری کا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا جو اتفاق رائے سے منظور ہوا۔

بعد ظہر مسٹر ابراہیم ہارون جعفر نے صدارت فرمائی اور اپنے خطبۂ صدارت کا ایک حصہ پڑھا اور مطبوعہ خطبہ بانٹ دیا گیا۔

کانفرنس کا پہلا ریزولیشن خلافت عظمیٰ کے اقتدار کو برقرار رکھنے کی بابت مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی نے پیش کیا اور مولوی سید حسین صاحب آرزو نے اس کی تائید کی۔ دوسرا ریزولیشن

جس میں ترکی کے بڑے علاقوں عرب، فلسطین، شام، آرمینیا وغیرہ کو ترکی کی سلطنت سے علاحدہ کر کے غیر مسلم حکمراں طاقتوں کے ماتحت رکھنے پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا تھا اور جزیرۃ العرب کو غیر اسلامی اثرات سے پاک رکھنے پر زور دیا گیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری ایڈیٹر "اہلحدیث" نے پیش کیا اور شیخ عبداللہ صاحب وکیل علی گڑھ نے اس کی تائید کی۔

تیسرا ریزولیوشن تھریس ایشیائے کوچک کو حتمی وعدے کے موافق ترکی بادشاہت میں برقرار رکھنے اور قسطنطنیہ میں دارالخلافہ قائم رکھنے کی بابت مسٹر عباس طیب جی بیرسٹر و چیف جسٹس ریاست بڑودہ نے ایک پرزور انگریزی میں تقریر کے ساتھ پیش کیا اور سید جالب ایڈیٹر "ہمدم" نے اردو میں تائید کرتے ہوئے اس کا مفہوم بتلایا۔

چوتھا ریزولیوشن سمرنا سے یونانیوں کو نکالنے اور ان کے مظالم پر مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک دردناک ورقت انگیز تقریر میں پیش کیا جس نے مسلمانوں کی گذشتہ عظمت یاد دلا کر جلسہ کو تھوڑی دیر کے لیے مجلس ماتم بنا دیا۔

پانچویں ریزولیوشن میں کہا گیا تھا کہ اوپر کے چاروں ریزولیوشن بہ ایں استدعا ہزایکسیلنسی وائسرائے کو بھیجے جائیں گے کہ وہ اپنی سفارش کے ساتھ ان کو ایمپریل گورنمنٹ مین ارسال فرمادیں۔

چھٹے ریزولیوشن کے ذریعے ۱۷ اکتوبر کا دن ہندوستان میں فقط ترکی کے لیے دعائیں مانگنے اور جلسے کرنے کی غرض سے معین کیا گیا۔

ساتویں ریزولیوشن میں بمبئی کی خلافت کمیٹی کے کام پر اظہار پسندیدگی کیا گیا اور اس کی شاخیں صوبوں اور مختلف مقامات پر قائم کرنے کی ضرورت جتائی گئی۔ آخر میں مولانا عبدالباری نے جناب صدر اور بیرونی ڈیلیگیٹوں کا ان کے وقت صرف کرنے پر شکریہ ادا کیا اور جناب صدر نے چند اختتامی الفاظ میں اہل لکھنو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کی کامیابی پر اظہار مسرت کیا اور کامیابی مقصد کی دعا مانگی۔

اس آل انڈیا مسلم کانفرنس کی کارروائی کو تفصیل سے درج کرنے کا منشا یہ ہے کہ حسب ذیل باتیں واضح ہو جائیں، یعنی:

(۱) تمام ہندوستان کے مسلمان خواہ ہزایکسیلنسی کی کونسل یا ہزآنر کی کونسل کے ممبر ہوں، خان بہادر یا خطاب یافتہ امیر الامراء ہوں یا غریب ہوں، عالم ہوں یا کالج کے تعلیم یافتہ ہو

ں کسی گروہ یا طبقۂ خیال کے ہوں یکساں طور پر مضطرب تھے اور سب نے متحد اور منظم ہو کر اپنی آواز بلند کی جو ہندوستان کے کل مسلمانوں کی آواز تھی۔

(۲) کوئی راہ عمل سامنے نہ تھی اس لیے حکومت برطانیہ کی خوشامد اور عرضداشتوں اور وفود یا تقریروں اور جلسوں پر اکتفا کیا جا رہا تھا۔ صلح کانفرنس کے فیصلے کا بھی انتظار تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ کوئی راہ عمل سامنے نہ تھی اس لیے صرف فریاد و فغاں سے کام لیا جا رہا تھا مگر اسی فریاد و فغاں سے آیندہ راہ عمل پیدا ہونے والی تھی۔

(تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۹۸۔۹۴)

یہ جلسہ جسے قاضی صاحب نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کا نام دیا ہے یہ اس کی خصوصیت ہے۔ نام یا عنوان نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''شاہراہ پاکستان'': چودھری خلیق الزماں، کراچی، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۰۔۳۴۳)

جلسۂ خلافت دہلی:

۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء: حکومت نے لڑائی جیتنے کے بعد جا بجا جشن منانے کا فیصلہ کیا تھا اور آستاں بوسان سرکار عالیۂ برطانیہ قصائد مرتب کرنے میں مشغول تھے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو جو یوم دعا و جلسہ تجویز کیا گیا تھا اسی میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ مسلمان جشن فتح یا صلح ''جو بھی کہیے'' اس میں شریک نہیں ہوں گے اور اس کا بائیکاٹ کریں گے۔ اس فیصلے کو خلافت کانفرنسوں اور جلسوں میں دہرایا گیا۔ مولانا حسرت موہانی جیسا عظیم انسان و بے لوث لیڈر بار بار اس پر زور دیتا تھا۔ مہاتما گاندھی جی نے بھی اس کی تائید کی۔ ہر وہ موقع جہاں قوم کو ابھار کر حکومت کے خلاف دلیری سے کھڑا کرنے کا آیا اسے گاندھی نے استعمال کیا۔ اس طرح وہ اوہام غلامی سے گھرے ہوئے دماغوں کو وہ آزادی کی فضا میں لانے اور دل کی اجاڑ اور ویران بستیوں کو حب وطن سے معمور کرنے کا نہایت مدبرانہ و مخلصانہ عمل کر رہے تھے۔ اس طرح قوم اپنے کو پہچاننے لگی تھی۔ اس کے اندر خود شناسی کا شعور پیدا ہو رہا تھا اور جتنا قوم اپنے کو پہچانتی جا رہی تھی وہ اپنے قائد کو بھی پہچان رہی تھی۔ اب اس کا وہ حال نہ تھا:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہبر کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دوسری خلافت کانفرنس (دلی) زیر صدارت مولانا فضل الحق کے سلسلے میں ۲۴ر نومبر ۱۹۱۹ء کے متحدہ اجلاس کا حال اخبارات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ''خلافت کانفرنس کا یہ اجلاس اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم ترین تھا کیوں کہ اس میں خلافت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے مادر وطن کی دونوں قوموں کے قائم مقام جمع تھے۔ گاندھی جی، سوامی شردھانند، پنڈت کرشن کانت مالوی، ڈاکٹر ساورکر، مسٹر شنکر لال، مسٹر موہن جی وغیرہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

وقت مقررہ پر گاندھی جی ہال میں داخل ہوئے۔ سب لوگوں نے جے کارے لگائے اور سروقد کھڑے ہوگئے۔ گاندھی جی کا استقبال کیا گیا۔ خواجہ حسن نظامی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرت سری، ڈاکٹر انصاری، سیٹھ عبداللہ ہارون، جان محمد چھوٹانی، ڈاکٹر ساورکر، خان بہادر شاد ولایت حسین اور مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی نے استقبال کیا۔ اس کے بعد گاندھی جی کرسی صدارت پر تشریف لائے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ گاندھی جی پر اس قدر پھول پھینکے گئے کہ ان کے گرد پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ جناب دانا اور خلیق کی نظمیں پڑھی گئیں۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تقریر فرمائی جس میں آپ نے خلافت کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ہندو اور مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں کے دل رنجیدہ ہیں تو ہندوان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس کے بعد حکیم اجمل خان نے ایک تجویز پیش کی کہ جب تک خلافت کا مسئلہ حل نہ ہو مسلمانوں کے لیے جشن صلح میں شریک ہونا ناممکن ہے۔ سوامی شردھانند نے نہایت پر زور تقریر میں اس کی تائید کی۔ سید حسین، کرشن کانت مالوی اور مسٹر موہن جی وغیرہ نے بھی پر جوش تائیدی تقریریں کیں اور تجویز پاس ہوئی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تقریر کی۔ جس میں آپ نے کہا کہ کسی آدمی کو کسی طرح صلح کی خوشی میں شریک نہ ہونا چاہیے، نہ آتش بازی دیکھنا چاہیے۔ صلح کے جشن میں شریک ہونے سے باز رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کے لیے چندہ کی اپیل کی اور بذات خود ایک پیسہ تبرکاً عنایت کیا۔ بس کیا تھا۔ پیسہ نیلام ہوا اور اسے ۵۰۰ روپیہ میں سیٹھ چھوٹانی نے خریدا۔ ایک ہزار نقد چندہ وصول ہوا اور ڈیڑھ ہزار کا وعدہ ہوا۔

اس کے بعد ایک دوسرے جلسے میں عوام کا مطالبہ درشن کا تھا۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ میرا درشن کیا جائے۔ یہ کام کا وقت ہے۔ عورتوں سے کہا کہ تم چرخہ چلاؤ تو میں خود آکر تمھارے درشن کروں گا اور تمھارے پاؤں چھوؤں گا۔'' (تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل احمد عباسی، ص ۵۵۔۱۵۴)

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس (دہلی):

۲۳ رنومبر ۱۹۱۹ء: ۲۳ رنومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس دلی میں ہوا تھا۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس لکھنو کے بعد وزیراعظم برطانیہ لائڈ جارج نے لارڈ میر کی دعوت میں ایک دل خراش تقریر کی، جس سے یہ اندازہ ہوا کہ وزیراعظم سلطنت برطانیہ اب اپنے اور حکومت برطانیہ کے وعدوں سے انحراف کرنے والے ہیں۔ اس تقریر نے مسلمانوں میں بہت جوش بھر دیا اور فوراً ۲۳ رنومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس کا ایک جلسہ دلی میں بڑی دھوم دھام سے مسٹر فضل الحق (بنگال) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہاتما گاندھی بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان کے خیر مقدم کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اور اتنا ہجوم خلائق تھا کہ چاندنی چوک اور جامع مسجد کی راہ دو گھنٹے میں طے ہوئی۔ اس اجلاس میں صرف خلافت کمیٹی کے قائم مقام شریک کیے گئے جو تمام صوبوں سے آئے تھے۔ البتہ مہاتما گاندھی کو ان کی عظمت کی وجہ سے شریک جلسہ کیا گیا اور کچھ ان ہندو بزرگوں نے بھی شرکت کی تھی جن کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ سندھ، رنگون، بنگال، بہار، صوبۂ متحدہ وغیرہ سے جو ہندو آئے تھے ان کو مسلمانوں نے خلافت کمیٹیوں کی طرف سے بھیجا تھا۔ شیعہ حضرات بھی اس میں شریک تھے۔ (تحریک خلافت،: قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۱۰۲)

جماعت ''جمعیۃ العلماء ہند'':

۲۴ رنومبر ۱۹۱۹ء: برصغیر ہند پاکستان میں مسلمانوں کی واحد مذہبی، سیاسی، حریت پسند، انقلابی جماعت ''جمعیۃ العلماء ہند کا سنگ بنیاد نومبر ۱۹۱۹ء میں بمقام دہلی علمائے کرام کی ایک مجلس میں رکھا گیا۔ اس میں حنفی اور اہل حدیث اور دیوبندی اور فرنگی محل مکاتب فکر کے علماء کے علاوہ الہ آباد، بدایوں وغیرہ کے علمی خانوادوں کے بزرگ بھی شامل تھے۔

یہ اجتماع خلافت کانفرنس کے موقع پر اس کے پہلے اجلاس مورخہ ۲۳ رنومبر ۱۹۱۹ء سے فارغ ہونے کے بعد ہوا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تحریک اور مولانا منیر الزماں اسلام آبادی (چاٹ گائں) کی تائید سے اجتماع کے صدر مولانا عبد الباری فرنگی محل قرار پائے۔ اولاً جمعیت کے قیام کی ضرورت پر بحث کی گئی۔ اتفاق کے بعد جمعیت علمائے ہند نام قرار پایا۔ جمعیت کے آئین کا مسودہ مرتب کرنے کے لیے مولانا محمد اکرم (بنگال) اور مولانا محمد کفایت اللہ (دہلی) کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے عارضی صدر اور ناظم کے لیے مولانا کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کا نام پیش کیا جو متفقہ طور پر منظور ہو گیا۔ آیندہ جلسۂ امرتسر کے لیے مولانا ثناء اللہ اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے اراکین جمعیت کو دعوت دی تھی جو قبول کر لی گئی تھی۔

اس جلسے میں رسالہ ''مختصر حالات انعقاد جمعیت علماے ہند'' کے مطابق ۲۶ حضرات نے شرکت کی تھی۔ جن کا تعلق سندھ، پنجاب، دہلی، یوپی، بہار، بنگال سے تھا اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔

جذبۂ ایمانی، ذوق دینی، حریت پسندی اور شوق خدمت وطن میں کوئی کسی سے کم نہ تھا۔ لیکن سیاسی بصیرت، اصابت راے اور تربیت امورِ سیاسیہ، سلیقۂ عمل میں علماے دیوبند کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ جمعیت علماے ہند کا قیام نومبر ۱۹۱۹ء کی ایک تاریخ کو عمل میں آیا تھا لیکن علماے دیوبند گذشتہ نصف صدی سے سعی و عمل کے میدان میں سرگرم کار تھے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ضلع سہارن پور کا ایک قصبہ دیوبند تھا۔ لیکن اس مرکز کے تحت اعمال سیاسیہ نہ صرف پورے برصغیر میں بلکہ افغانستان، ترکی، حجاز اور الجزائر تک انجام دیے جا رہے تھے۔ بعض دیگر علماء نے جب جمعیت کے مدرسۂ فکر میں تعلیم و تربیت سیاسی کا پہلا سبق لیا تھا۔ اس وقت تک دیوبند کے ارکان تعلیم و تربیت کے کئی ادوار سے گزر چکے تھے۔ دارالعلوم کے قیام کے مقاصد میں آزادی کا حصول اور ملت اسلامیہ کا قیام شامل تھا، دارالعلوم میں ''ثمرۃ التربیت'' کا قیام، اس کے مقاصد سیاسیہ کے حصول کی تربیت کا ایک مختصر اور محدود حلقہ تھا۔ اس کے دوسرے دور میں سیاسی تربیت کے بڑے حلقے کا نام جمعیت الانصار تھا۔ جمعیت الانصار کے قیام اور اس کی سرگرمیوں نے مقاصد سیاسیہ کا پردہ چاک کر دیا تھا۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کا قیام اسی سلسلۂ مقاصد کی ایک کڑی تھی، مولانا سندھی اور ان کے رفقاء کی ہجرت کابل اور حضرت شیخ الہند کا سفر حجاز اور اسارت مالٹا، سیاسی سعی و عمل کے مختلف مراحل تھے۔ یہ سب مراحل نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماے ہند کے قیام سے پہلے گزر چکے تھے۔ مسئلہ خلافت ترکیہ ان کے سامنے پچھلی صدی کے اواخر سے تھا۔ مسئلۂ حجاز اپنے پورے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ ان کے سامنے اس صدی کی دوسری دہائی میں آ چکا تھا۔ وہ ملک اور بیرون ملک کی سیاست کے صرف مبصر ہی نہیں، اس میں شریک اور رہنمایانہ حیثیت کے مالک تھے۔

جمعیت علماے ہند کے آغاز میں مختلف مکاتب فکر کے نمایندے شامل تھے۔ لیکن علماے

دیوبند کے افکار و عزائم میں ان کا کوئی ساتھ نہ دے سکا۔ ان کی سیاسی بصیرت کا پیمانہ سب سے بلند تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے ایک بزرگ نے شکایت کی کہ جمعیت علمائے ہند تو جمعیت علمائے دیوبند بن گئی۔ مولانا نے فرمایا، یہ تو ہونا ہی تھا۔ دیوبند نے علماء ہی نہیں اصحاب عمل اور اہل ہمت پیدا کیے ہیں''، وہ سیاسی میدان میں سب سے پہلے آئے، انھوں نے ایک سیاسی نظام پیدا کیا، ان میں سیاسی شعور ہے، وہ سیاسی تربیت کے عمل سے گزرے ہیں، ان کے سیاسی جہد و سعی کی ایک تاریخ ہے۔ وہ جمعیت علماء کے قیام سے پہلے ہی اپنا ایک امتیاز پیدا کر چکے تھے۔ ان میں دور جدید میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی تھے۔ پھر ان کے تربیت یافتگان تھے جنھوں نے اس عہد میں علم و عمل کے تمام میدانوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ ان میں مولانا عبیداللہ سندھی تھے اور ان میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی تھے۔ مولانا آزاد کی زبان سے جو الفاظ نکلے تھے وہ چند لفظوں سے زیادہ نہ تھے۔ دیگر تمام اوصاف و خصائص اس ڈائری کے مرتب کے قلم سے ہیں۔

دہلی میں خلافت کانفرنس کا جو جلسہ ہوا۔ اس میں جشن صلح سے اختلاف کے اظہار کے لیے علمائے ہند کا ایک فتویٰ بھی مرتب کیا گیا جو ''انجمن اشاعت اختلاف جشن صلح دہلی'' کی طرف سے طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔

۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء: بعد نماز عصر امرتسر کے اسلامیہ ہائی اسکول کے وسیع کمرے میں جمعیت علمائے ہند کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ مختلف مکاتب فکر اور علاقہ جات کے باون علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔ اس نشست کے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی قرار پائے۔ اس اجلاس میں جمعیت کے قیام کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔ اس سلسلے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوتراب محمد عبدالحق، مولانا عبدالرزاق، سید جالب ایڈیٹر ہمدم (لکھنو)، مولانا کفایت اللہ، غازی محمود، مولوی منیرالزماں، حکیم محمد اجمل خان وغیرہ نے اظہار خیال فرمایا۔

اس نشست میں قواعد و ضوابط کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا اور مستقل سیاسی اصول و ضوابط اور نظام عمل کی تالیف کے لیے مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالوفا، مولانا محمد اکرم خان اور مولوی منیرالزماں خان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ مولانا عبدالباری کی تحریک پر حکیم محمد اجمل خان کا نام بھی کمیٹی میں اضافہ کیا گیا۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء: جمعیت کے اجلاس کی دوسری نشست ۳۱ر دسمبر کو منعقد ہوئی۔ اس نشست

کے صدر مفتی کفایت اللہ قرار پائے۔ اس اجلاس میں سلطان عبدالوحید خان کے نام کا خطبہ پڑھنے اور صلح کانفرنس میں ہندوستان کے مسلمانوں کے وفد بھیجنے کے بارے میں تجاویز پاس کی گئیں۔

۲۶ ردسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس بڑے زور وشور سے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا اور ۷۰۳۱ نمایندوں نے شرکت کی رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی آنکھوں سے وہ نظارہ دیکھ رہا ہوں جو اپنی عمر میں آج تک نہیں دیکھا تھا میں کانگریس کے اس اجلاس کو ایک زبردست اسمبلی نہیں بلکہ مانس مٹنگ کہوں گا۔ یہ اجتماع جلیانوالہ باغ کے بیدردانہ قتل وخونریزی کا حاصل ہے جس نے ایک ایسی نئی آگ بھڑکا دی تھی جس کی نتیجے میں ہندو اور مسلمانوں کی ایک نئی قوم پیدا ہوئی ہے اور یہ نئی قوم انشاء اللہ تعالیٰ دنیا کی کسی بھی طاقت سے مرعوب نہیں ہوگی۔ اور مجھے کتنی ہی بار جیل جانا پڑے اور مسٹر تلک کو اس بڑھاپے میں کتنی ہی قید کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور ضرورت پڑے تو حکومت ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ کو پھر گرفتار کرے، اتنا ہی نہیں بلکہ ضروری ہو تو انھیں کے بالوں کا پھندا بنا کر انھیں پھانسی بھی دے دے۔ یہ سب کچھ گوارا ہے لیکن ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیے۔ اس طرح ہندوستان کو آزاد ہونے دو تاکہ دنیا یہ نہ کہے کہ ہندوستانی پیدائشی غلام ہیں۔ یہاں جو ریزولیوشن پاس ہوگا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہر مرد، ہر عورت ہر بچہ جو تجویز کے حق میں ہوگا اپنے دل میں یہ ٹھان لے گا کہ تاوقتیکہ ہمیں آزادی نہ مل جائے ہم قطعاً آرام سے نہ بیٹھیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ میرا سب سے اعلیٰ بادشاہ خدا ہے اور خدا نے مجھ کو ایسا ہی آزاد پیدا کیا ہے جیسے جارج پنجم کو اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیے......

اجلاس میں نہرو رپورٹ کے نام سے اعلان حقوق کی تجویز پیش ہوئی اور بالاتفاق منظور ہوئی اس اجلاس میں مولانا حسرت موہانی بھی شریک تھے۔ مہاتما گاندھی کے مشورے سے مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے ہند سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لیے مقرر ہوا۔

اس اجلاس سے پہلے یہیں پر مسلم لیگ کا بھی اجلاس ہوا۔ اس میں بھی مولانا حسرت نے شرکت کی تھی مسلم لیگ کی پیش کردہ ایک تجویز جو جزیرۃ العرب کے بارے میں تھی وہ حکومت برطانیہ کی دل آزار پالیسی کے خلاف تھی۔ کہا گیا تھا کہ اس کے تدارک کے لیے مسلمانان ہند آئینی ایجی ٹیشن کے جملہ ذرائع اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ مولانا حسرت نے اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی تھی کہ ان ذرائع میں ہندوستانی افواج کا بائیکاٹ بھی کیا جائے۔ یہ تجویز

کافی اہمیت کی حامل تھی۔ بالآخر علی برادران نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء: حکومت ہند نے بذریعہ تار صوبائی حکومت کو ہدایت دی کہ وہ مولانا آزاد کو نظر بندی سے رہا کردے۔

۳۱ر دسمبر: حکومت بہار واڑلیہ نے مولانا آزاد کو نظر بندی سے رہائی کا حکم جاری کیا۔(مولانا آزاد کا قیام رانچی: جمشید قمر،ص ۸۴)

۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹: ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے موتی لال نہرو نے کہا تھا۔'' یہ دن (۶ ر اپریل ۱۹۱۹ء) ہندوستان کے لیے ہمیشہ ایک یادگار دن رہے گا اس دن ایک عظیم الشان اور پرامن مظاہرے کے ذریعے ستیہ گرہ کا بڑا پر اثر مظاہرہ کیا گیا تھا۔ پنجاب کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا۔ مگر اس سال کے واقعات ہمیں اور انگریزوں کو جو سبق سکھاتے ہیں، وہ صاف ہیں، ہمیں وہ پیہم عمل، قربانی اور تحمل کا راستہ دکھاتے ہیں کیوں کہ انھی کے ذریعے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، انگریزوں کو وہ بار بار دہرایا ہوا یہ سبق سکھاتے ہیں کہ ظلم سے ظالم کے ساتھ ساتھ مظلوم میں بھی گراوٹ آجاتی ہے۔ اگر ہماری عزت اور زندگیاں عاملہ اور فوج کے غیر ذمہ دار افسروں کے رحم و کرم پر ہوں گی، اگر انسانوں کے معمولی حقوق سے ہمیں محروم رکھا جائے گا تو اصلاحات کی تمام باتیں محض ایک مذاق ہیں۔ عمدہ کپڑوں میں لپٹی ہوئی لاش سے یہ کہیں بہتر ہے کہ چیتھڑوں میں رہ کر زندہ رہا جائے۔''

اس طرح ۱۹۱۹ء میں ہندوستانیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں ایک لمبی جدو جہد میں حصہ لینا ہے جیسا کہ نہرو نے لکھا ہے کہ اس جدو جہد کا جو شروع ہونے والی تھی لمبا سایہ ہندوستان پر پڑنے لگا تھا۔

اس جدو جہد کا مقصد کیا ہوگا جلد ہی اس کا فیصلہ کلکتہ میں کرلیا گیا، جہاں کانگریس نے یہ کہا کہ قومی عزت وافتخار کی خاطر سوراج کے قیام کے لیے موثر ذرائع اختیار کیے جائیں۔ یہاں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کے عوام کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا کہ وہ بتدریج عدم تعاون کی پالیسی اپنائیں۔ جب تک کہ سوراج نہ مل جائے۔ فیصلہ کیا گیا کہ لوگ اپنے خطابات اور اعزازی عہدوں سے دست بردار ہوجائیں، میونسپلٹیوں وغیرہ میں نامزد جگہوں سے استعفاد ے دیں، ولیی مال کا بائیکاٹ کریں۔ سرکاری تقریبوں میں شامل نہ ہوں۔ قانونی عدالتوں کا

مناطعہ کریں، میسوپوٹامیا میں خدمات انجام دینے سے انکار کریں۔ اصلاحات کے تحت قائم کردہ کونسلوں کے انتخابات میں حصہ نہ لیں، سودیشی چیزوں کو استعمال کریں، کھادی کے استعمال کا پرچار کریں اور سرکاری تعلیمی اداروں سے طلبہ کو ہٹالیں۔

۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء: امرتسر میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں بھی ہندو اور مسلمان زعما نے جو کانگریس اور جمعیت علماے ہند کے اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر آئے ہوئے تھے، شرکت کی اور مقامات مقدسہ کی حفاظت، ترکی خلافت کے خلاف برٹش استعمار کی ریشہ دوانیوں کے خلاف غم وغصہ کے اظہار، فرقہ وارانہ اتحاد کے قیام اور ہندوستان کی آزادی کے لیے تحریک کے حق میں تقاریر کیں۔

اس اجلاس میں ہندو مسلم زعماء نے مدلل تقریریں کیں جن میں مولانا ثناء اللہ، مولانا داؤد غزنوی بھی تھے۔ انھوں نے کاروانِ آزادیِ وطن کو آگے کوچ کرنے کی ہدایت کی اور اجلاس برخواست ہوا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

دسمبر ۱۹۱۹ء: دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بتیول جیل سے رہا ہو کر امرتسر پہنچے تھے۔ دونوں بھائیوں کو کانگریس کی طرف سے دعوت دی گئی اور دونوں بھائی براہ راست جلسہ گاہ میں پہنچے۔ مولانا محمد علی نے ایک طویل تقریر کی جو بے حد جذباتی اور پر اثر تھی۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کی شرکت گویا تمام مسلمانان ہند کی شرکت تھی کیوں کہ وہ اپنے علم وفضیلت، اسلام نوازی، جرأت حق گوئی و بے باکی، عظیم ایثار وقربانی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے۔ بتیول جیل سے رہائی کے بعد وہ جن جن اسٹیشنوں سے گزرے وہاں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ امرت سر سے ان کا بلاوا دلی کا ہوا اور وہ دلی گئے تو پبلک امڈ کے آگئی۔ اس طرح کے عظیم الشان مجمعے اور جلسے اس امر کی نشان دہی کرتے تھے کہ مسلمان سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اب مسلمانوں کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ خلافت مرکزیۂ اسلامیہ کی بربادی، جزیرۃ العرب کی شکست وریخت اور پوری دنیاے اسلام کی تباہی کی ذمہ داری برطانیہ پر ہے اور مسلمانوں کو اپنے ہندو بھائیوں سے مل کر ایک متحدہ قومی جمہوریہ برطانیہ کے اثر سے آزاد بنانی چاہیے۔ اسی سے برطانیہ کے غرور اور اس کی طاقت کا توڑ ہوسکتا ہے۔ (تحریک خلافت: قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۱۰۲)

۱۹۱۹ء

تبصرہ:

مسٹر مان ٹیگو نے ۱۹۱۹ء میں ہاؤس آف کامنس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا:

''ایک ہندستانی سپاہی پر سالانہ چار سو گیارہ (۴۱۱) روپیہ خرچ ہوتا ہے اور ایک برطانوی سپاہی پر ایک ہزار نوسو اکہتر (۱۹۷۱) روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ڈیفنس کے لیے کم از کم پچاس ساٹھ ہزار سپاہی انگلینڈ کے باشندے یعنی گورے لازم قرر دیے گئے۔ الغرض اس طریقے سے سول اور فوجی ملازمین کی پنشنوں میں بقول اے، جی ولسن آف انویسٹوری ریویو تین کروڑ پونڈ سالانہ ہندوستان سے وصول ہو کر انگلستان جاتا رہا۔ نیز ہندوستان میں انگریز ملازمین کی تنخواہوں کا پس انداز بقول ایگنس ا۔مڈ۔لے (ماڈرن ریویو) تین کروڑ پونڈ سالانہ یعنی پینتالیس کروڑ روپیہ سالانہ جاتا رہا۔ اسی طرح انڈیا آفس لندن کے مصارف، ہندوستان پر قومی قرضہ کا سود۔ ریلوں، نہروں، معدنوں جہازوں، کارخانوں وغیرہ میں جو روپیہ انگریزوں کا لگا ہوا ہے اور جس کی مقدار ۱۹۱۳ء تک (۳۵) ارب پونڈ تھی، اس کا سالانہ منافع پینتیس کروڑ پونڈ تھا۔ یہ اور اس قسم کے دیگر طریقے دولت کھینچنے کے وہ غیر معمولی سیلاب دولت ہیں جن کی نظیر تمام دنیا میں نہیں ملتی۔ اسی بنا پر منٹگمری مارٹن ۱۸۳۸ء میں لکھتا ہے:

''اگر دولت کا ایسا مسلسل اور روز افزوں سیلان انگلستان سے ہونے لگے تو ایک دن وہ بھی محتاج ہو جائے۔ پھر خیال فرمائیے کہ ہندوستان پر اس کا کیا اثر پڑے گا جہاں معمولی مزدور کو دو یا تین پنس روزانہ اجرت ملتی ہے۔''

ڈبلیو ایس بلنٹ کہتا ہے:

''میں ہندوستان کے مالیہ کے اسرار بہترین استادوں سے حاصل کر رہا ہوں اور یہ استاد گورنمنٹ کے سکریٹری اور کمشنر وغیرہ ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم اسی طرح ہندوستان کو ترقی دیتے رہے تو ایک دن وہ آئے گا جب کہ ہندوستانی آپس میں ایک دوسرے کو کھانے لگیں گے کیوں کہ ان کے پاس کھانے کے لیے سوائے اپنے ابنائے جنس کے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔'' (پاکستان کیا ہے؟ از مولانا حسین احمد مدنی، صفحہ ۶۔۷)

۱۳راپریل ۱۹۱۹ء: کوجلیانوالہ باغ میں احتجاجی جلسہ ہوا اس کی صدارت ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی تصویر نے کی۔ جنرل ڈائر نے بلا اطلاع نہتے عوام پر زبردست فائرنگ کر کے سیکڑوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا ان گنت بے گناہ زخمی طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ شہر میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ جلیانوالہ باغ کا خونچکاں واقعہ حکومت کے جبر و تشدد اور عوام کے جوش و خروش کی خون سے رنگیں داستان ہے۔ جنرل ڈائر کی سفاکی اور بربریت پر اس کی قوم نے بھی مطعون کیا تھا۔ امرتسر کے علاوہ گوجرانوالہ، لاہور، قصور، لائل پور، شیخوپورہ، گجرات اور کئی دیہات میں بھی تشدد آمیز واقعات رونما ہوئے اور کئی شہروں میں مارشل لا لگا دیا گیا۔

تحریک ریشمی رومال کے افشا سے حکومت چوکنا ہوگئی تھی۔ اس کا مقصد حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔ ریشمی رومال دین پور پہنچ گیا تھا وہاں کے سجادہ نشین خواجہ غلام محمد نے پروگرام کے مطابق اسے سندھ روانہ کر دیا تھا لیکن چند کمزور اور کم ہمت محرمان راز نے تمام منصوبہ فاش کر دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ شمال مغربی سرحد سے حملہ ہو، ہندوستان کے مسلمان بغاوت کر دیں اور سلطنت برطانیہ کا تخت الٹ کر ملک پر قبضہ کر لیا جائے۔ راجہ مہندر پرتاپ کو ملک کا صدر اور مولوی برکت اللہ کو وزیراعظم بنانے کا پروگرام تھا۔ مولانا آزاد اگرچہ اس زمانے میں رانچی میں نظر بند تھے لیکن انڈیا آفس لائبریری کی دستاویزات کے مطابق جن ۵۹ افراد کے خلاف دفعہ نمبر ۱۲۱ ضابطہ فوجداری کے تحت مقدمہ دائر ہوا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی شامل تھا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے یکم جنوری ۱۹۱۳ء اور یکم جنوری ۱۹۱۷ء کے درمیان برطانوی ہند کے اندر اور باہر سازش کی ہے ملک معظم شہنشاہ کی افواج کے خلاف جنگ کرنے، جنگ کرنے کے لیے کوشش کرنے اور جنگ میں مدد دینے کی کوشش کرنے کی یا اس بات کی کوشش کی ہے کہ ملک معظم شہنشاہ کو برطانوی ہند کے اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دیں۔

اس ساری صورت حال کا صحت مند پہلو یہ نمودار ہوا کہ ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی زبردست لہر اٹھی اور دونوں قومیں فروعی اختلافات مٹا کر شیر و شکر ہوگئیں۔ اتحاد کا مظاہرہ کرنے کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس کا ۳۴واں اجلاس پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں امرتسر میں ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو ان حالات میں منعقد ہوا جب کہ امرتسر کے در و دیوار بے گناہوں کے خون سے رنگیں تھے۔ حکومت کے تشدد اور مظالم کی داستانیں زبان زد عام تھیں۔ حکومت کے جور و ستم کا مقصد عوام کو پست ہمت بنانا تھا۔ لیکن وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہوسکی۔ عوام کی ہمتوں اور ارادوں میں

ذرہ برابر لغزش نہ آئی اور کانگریس کے انعقاد میں بھرپور جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ عوام کے غیظ و غضب کو کم کرنے کے لیے حکومت نے پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر سرمائیکل اڈوائر کو تبدیل کر دیا اس کی جگہ سر میکلیگن کو نیا گورنر مقرر کیا۔ لیکن بیوروکریسی کے رویے میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ وہ کانگریس کے اجلاس کے انعقاد کو ناکام بنانے میں مصروف تھی۔ امرتسر میں گاندھی جی کی آمد سے حالات نے نیا رخ اختیار کیا۔ لوگوں کے جوش وخروش میں اضافہ ہو گیا۔ اجلاس کے انعقاد سے ایک روز قبل قیدیوں کی عام رہائی کے شاہی اعلان سے عوام میں فتح کے احساس کا اضافہ ہوا اور وہ مزید جوان ہو گئے۔ علی برادران جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اسٹیشن پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ جیل سے واپسی ٹکٹ لے کر آئے ہیں۔'' پنڈت موتی لال نہرو کثرت کار کی وجہ سے بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ شدید سردی کے باعث ان کا گلا خراب ہو گیا تھا اور کئی مندوبین سردی لگنے سے علیل ہو گئے۔ حکومت کے خوف و ہراس اور پنجاب کے حالات کے باوجود اجلاس میں چھ ہزار مندوبین نے شرکت کی اور چھتیس ہزار کے قریب افراد بطور وزیٹر شامل ہوئے۔

اس اجلاس کا نہایت اہم پہلو وہ ریزولیشن ہے جسے گاندھی جی نے پیش کیا اور مجلس مضامین نے مسترد کر دیا۔ گاندھی جی رولٹ ایکٹ کی مخالفت اور احتجاج کے دنوں میں مظاہرین کی جانب سے تشدد کی مذمت کی قرارداد منظور کرانا چاہتے تھے لیکن انھیں پہلے مرحلہ پر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ چناں چہ اگلے روز انھوں نے قرارداد کی حمایت میں زبردست تقریر کی۔ اس میں انھوں نے اپنے مقاصد اور آیندہ لائحہ عمل کی خوب اچھی طرح وضاحت کی۔ انھوں نے اراکین سے استفسار کیا کہ ''کیا ہماری طرف سے تشدد واقعات نہیں ہوئے؟'' مستقبل میں کامیابی کا انحصار صداقت کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے عوام کو بہت زیادہ اشتعال دلایا اور وہ ایسا نہ کرتی تو یہ مشکلات اور دشواریاں پیدا نہ ہوتیں۔ لیکن حکومت اس وقت پاگل ہو گئی تھی اور ہم بھی اس کی ساتھ ہی پاگل ہوئے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ پاگل پن کا جواب پاگل پن سے نہ دو، بلکہ اس پاگل پن کا صداقت، عقل مندی اور قربانی سے مقابلہ کرو، میدان تمھارے ہاتھ میں رہے گا۔ چناں چہ یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

پنجاب کے عوام کی حوصلہ افزائی اور ان سے یکجہتی کے اظہار کے لیے مسلم لیگ کا اجلاس بھی امرتسر میں حکیم محمد اجمل خان کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس موقع پر علامہ اقبال بھی موجود تھے۔

انھوں نے جلیانوالہ باغ کے حوالے سے یہ شعر کہے.

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس خیال سے

(مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: فاروق قریشی، لاہور،ص ۷۶-۷۷)

مان ٹیگو اصلاحات نے وزیر ہند کی کونسل کے ممبروں کی تعداد آٹھ سے بارہ کے درمیان مقرر کی اس کے نصف ممبروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ آٹھ دس برس ہندوستان میں رہے ہوں۔ وائسرائے کی کونسل کے ہندوستانی ممبرں کی تعداد تین کر دی گئی۔ کونسل کے دو ایوان سنٹرل اسمبلی اور کونسل کر دیے گئے۔ اسمبلی کے ۱۴۵ ممبروں میں ۱۰۵ منتخب اور ۴۰ نامزد تھے۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری،ص،۸)

جلیان والا باغ کے حادثے پر علامہ اقبال کا قلب جس طرح تڑپ اٹھا انھوں نے اپنے قلب حزیں کے جذبات صادقہ کو صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیا ہے۔ کتنا درد اور غم ان لفظوں میں چھپا ہوا ہے۔ مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار، لاہور نے جلیانوالا باغ کے شہداء کو ان اشعار میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے:

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لا کی
تو قابل دید کے تھی اوڈوائر کی غضب نا کی
جب امرتسر میں ہم پر گولیاں برسیں تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہلِ ہند کے خونِ تمنا کی
خدا کے قہر کی بجلی گرا کرتی ہے ظالم پر
مگر پنجاب میں اس برق کے مظلوم تھے شاکی
ہمارے بازوؤں کی دھجیاں اڑتی تھیں گردوں پر
ہماری ٹانگ کے تسمے خبر لاتے تھے جوزا کی

یہ صورت تھی ہماری خواہ ہندو خواہ مسلم تھے
یہ حالت تھی جناب جارج پنجم کی رعایا کی

مختصر حالاتِ انعقاد جمعیت علمائے ہند کے مطابق اجلاس امرتسر کی دوسری نشست جو مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کی صدارت میں ہوئی تھی، اس میں مندرجہ ذیل اہم حضرات نے شرکت کی تھی:

مولانا محمد عبدالباری فرنگی محلی،	مولانا محمد اکرم خان (کلکتہ)،
مولانا سلطان احمد،	مولانا سلطان محمود،
مولوی محمد کفایت اللہ دہلوی،	مولوی عبداللہ خان،
مولوی عبدالرزاق،	سید کرم علی شاہ،
مولانا حافظ احمد سعید دہلوی،	مولانا محمد سلامت اللہ (لکھنوی)،
مولوی سید تراب علی (لاڑکانہ)،	مولوی محمد مبین،
مولوی عبدالعلیم صدیقی،	مولوی حبیب اللہ،
مولوی محمد عالم،	مولوی نورالدین،
حکیم انظار النبی،	مولوی محمد عبداللہ،
مولوی مظہر الدین (شیرکوٹی)	مولوی لقاء اللہ (پانی پتی)
سید مغیث الدین،	مولوی عبداللہ،
مولوی ابومحمد احمد،	حافظ محمد بخش،
مولوی منیر الزماں اسلام آبادی،	مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی،
سید طاہر حسین،	مولانا معین الدین اجمیری،

مولانا محمد حسن مدرس نعمانیہ (لاہور)

مولانا محمد اکرم خان صاحب کی تحریک اور مولوی منیر الزماں صاحب و مولانا عبدالباری کی تائید سے اور تمام حاضرین کی متفقہ رائے سے مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی اس جلسہ کے صدر قرار پائے اس کے بعد باجازت صدر حسب ذیل تجاویز پیش ہوئیں اور پاس ہوئیں:

تجویز نمبر ۱: جمعیت علمائے ہند کا یہ جلسہ کامل ارادت مندی اور خلوص کے ساتھ اظہار کرتا ہے کہ حضرت سلطان المعظم مسلمانوں کے مسلم خلیفہ اور امیر المومنین ہیں، اس لیے آپ کے نام کا

خطبہ پڑھا جائے۔ محرک مولانا محمد اکرم خان صاحب مؤید مولانا پیر تراب علی صاحب سندھی۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی۔

تجویز نمبر۲: جمعیت علمائے ہند کا یہ جلسہ ملک معظم سے استدعا کرتا ہے کہ خلافت و مسائل متعلقہ ترکی کا تصفیہ کرنے کے لیے مسٹر لائڈ جارج کے ہمراہ صاحب وزیر ہند و اور مسلم نمایندے مسٹر اصفہانی و مسٹر بھرگری و شیر حسین قدوائی لازمی طور پر صلح کانفرنس میں بھیجے جائیں۔ ورنہ ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملات مذکورہ کا فیصلہ مسلمانوں کے متفقہ مذہبی مطالبات کے خلاف ہو جائے۔ اور ملک معظم کی کروڑوں رعایائے ہند کے تحت بے چینی کا باعث ہو۔ محرک مولوی عبدالرزاق مؤید مولوی محمد مبین یہ تجویز بھی باتفاق منظور ہوئی۔

تجویز نمبر۳:۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ یہ تجویز نمبر۲، بذریعۂ تار ملک معظم کی خدمت میں روانہ کی جائے۔ اور جلسے کی کارروائی اخبارات میں بھیجی جائے۔ محرک مولوی محمد منیر الزماں مؤید مولوی احمد سعید۔ بالاتفاق منظور ہوئی۔ اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

(دستخط صدر، محمد کفایت اللہ غفرلہ، بقلم خود)

یکم جنوری ۱۹۲۰ء: اجلاس کی تیسری نشست یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو ہوئی۔ اس کے صدر بھی مولانا مفتی کفایت اللہ تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے جمعیت کے اصول اساسی اور نظام عملی کا مسودہ پیش کیا۔ جسے منظور کر لیا گیا اور اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک تجویز میں حضرت مولانا محمود حسن (اسیر مالٹا) اور مولانا ابوالکلام آزاد (اسیر رانچی) کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ تیسری تجویز جمعیت کی مجلس منتظمہ کے ارکان کے انتخاب سے متعلق تھی۔ اسی وقت جمعیت کی پہلی ورکنگ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں دہلی، یوپی، بنگال، بہار، سندھ، پنجاب اور بمبئی کے تیئیس ارکان شامل تھے۔ اس جلسے میں مندرجۂ ذیل حضرات شریک تھے۔

اسمائے حاضرین:

مولانا محمد عبدالباری صاحب	مولانا سلامت اللہ صاحب
مولانا محمد فاخر صاحب	مولانا احمد سعید صاحب

مولانا محمد مبین صاحب	مولوی حبیب الرحمٰن صاحب
مولوی قاضی حبیب اللہ صاحب	مولوی عبدالرزاق صاحب
مولانا مظہر الدین صاحب	مولانا محمد کفایت اللہ صاحب
مولانا منیر الزمان صاحب	مولانا عبدالحلیم صاحب
مولانا محمد حسن صاحب	مولوی امام الدین صاحب
مولانا غلام محمد صاحب	مولانا عبداللہ صاحب
حکیم ابو یوسف اصفہانی	مولانا احمد اللہ صاحب
مولانا محمد معین الدین صاحب	مولانا نور الدین صاحب
مولانا ثناء اللہ صاحب	مولوی محمد اکرم خاں صاحب
مولانا عبداللہ صاحب	مولانا نور احمد صاحب امرتسری

مولانا محمد اکرم خاں صاحب نے تحریک کی کہ اس جلسہ کے صدر مولانا محمد کفایت اللہ صاحب ہوں اور مولانا عبدالباری صاحب نے تائید کی۔ باتفاق مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کی صدارت منظور ہوئی۔ پھر باجازت صدر حسب ذیل کارروائی شروع ہوئی:

جمعیۃ علماء ہند کے ضوابط وقواعد کا مسودہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نے پیش کیا اور پڑھ کر سنایا گیا۔ صدر نے حسب ذیل تجویز پیش کی۔

تجویز نمبر ۱: ضوابط وقواعد کا مسودہ اسی زیر تجویز حالت میں چھپوالیا جائے اور اراکین جمعیۃ و دیگر علماء کی خدمت میں پیش کیا جائے، اور بعد حصول آرا کے اراکین و علمائے کرام آئندہ مجلس انتظامیہ کے جلسے میں پیش کیا جائے۔ مجلس انتظامیہ اُسے مرتب و مہذب کر کے منظوری کے لیے مجلس عام میں پیش کرے۔ محرک مولانا محمد کفایت اللہ صاحب، مؤید مولوی محمد اکرم صاحب و مولانا عبدالباری صاحب۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی۔

تجویز نمبر ۲: جمعیۃ علماء کا یہ جلسہ باوجود اعلان شاہی شائع ہو جانے کے حضرت مولانا محمود حسن صاحب و مولانا ابوالکلام صاحب و دیگر علماء کی عدم رہائی پر سخت اضطراب و بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ صدر جلسہ کو اختیار دیا جائے کہ وہ بذریعۂ تار اس تجویز کو وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کریں۔ محرک مولوی محمد اکرم خان صاحب ایڈیٹر اخبار محمدی مؤید مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری و مولانا محمد فاخر صاحب الہ آبادی بالاتفاق منظور ہوئی۔

تجویز نمبر ۳: جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس منتظمہ کے ارکان کا انتخاب کرلیا جائے۔ اور جو حضرات کہ اِس انتخاب میں آجائیں۔ اُن سے رکنیت اور اس انتخاب کی منظوری بذریعۂ تحریر حاصل کی جائے۔ محرک مولوی منیر الزمان صاحب مؤید مولوی محمد اکرم خانصاحب۔ بالاتفاق منظور ہوئی۔ اس کے بعد مجلس منتظمہ کے لیے حسب ذیل حضرات منتخب کیے گئے:

دہلی:

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب — مولانا احمد سعید صاحب دہلی

حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب — مولانا عبدالماجد صاحب الہ آبادی

مولانا محمد سلامت صاحب ممالک متحدہ آگرہ اودھ

مولانا حسرت موہانی صاحب — مولانا مظہر الدین صاحب

بنگال:

مولانا محمد اکرم خاں صاحب — مولوی منیر الزمان صاحب

بہار:

مولوی محمد سجاد صاحب — مولانا رکن الدین صاحب دانا

مولوی خدا بخش صاحب

سندھ:

مولوی پیر تراب علی صاحب — مولوی عبداللہ صاحب

مولوی محمد صادق صاحب

پنجاب:

مولانا ثناء اللہ صاحب — مولوی سید داؤد صاحب

مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی

بمبئی:

مولوی عبداللہ صاحب — مولوی عبدالمنعم صاحب

مولوی سیف الدین صاحب — حکیم ابو یوسف صاحب اصفہانی

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

محمد کفایت اللہ غفر لہ بقلم خود یکم جنوری ۱۹۲۶ء

یکم جنوری ۱۹۲۰ء: مولانا ابوالکلام آزاد یکم جنوری ۱۹۲۰ء رانچی سے رہا ہوئے اور خلافت کانفرنس کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ''ذکر آزاد'' میں اسے پہلی خلافت کانفرنس قرار دیتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ پہلی خلافت کانفرنس دلی میں زیر صدرات مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دوسری خلافت کانفرنس ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو بمقام دلی زیر صدارت مولوی فضل الحق ہوئی تھی۔ یہ تیسری خلافت کانفرنس تھی جو فروری ۱۹۲۰ء میں ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوئی۔ البتہ اسے بنگال میں پہلی خلافت کانفرنس کہا جا سکتا ہے اور شاید یہی مولانا ملیح آبادی کا منشا ہو۔ مولانا ابوالکلام نے ایک مبسوط خطبہ خلافت پر دیا جو کتابی شکل میں اسی وقت شائع ہو چکا تھا اور اب جا بجا ملتا ہے۔'' (تحریک خلافت، از قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۱۲۷)

۱۰ر جنوری ۱۹۲۰ء: ۱۰ر جنوری ۱۹۲۰ء آج عہد نامۂ وارسائی کے ماتحت انجمن اقوام متحدہ کی بنیاد پڑی (جو ۱۹۱۸ء پیرس کانفرنس میں منظور ہوئی تھی) اس انجمن اقوام میں دنیا کی بیشتر مملکتوں نے شرکت کی۔ لیکن ترکی، جرمنی، بخارستان، روس اور بلغاریہ نے شرکت نہیں کی۔

(حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۸۶)

۱۹ر جنوری ۱۹۲۰ء: خلافت کانفرنس امرتسر میں طے کیا گیا تھا کہ مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔ اور ایک وفد وائسرائے ہند سے ملاقات کر کے مسلمانوں کے مطالبات میں ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرے (۱)۔ اس فیصلے کے مطابق ایک نمائندہ وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی، ان کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی، لیکن جیسا کہ متوقع تھا وائسرائے نے برطانوی حکومت کے رویے اور اس کی پالیسی کو معقول قرار دیا اور مسلمانوں کی بے چینیوں کو بے بنیاد اور جو کچھ پیش آ چکا تھا، اسے ترکی حکومت کی غلط پالیسی اور رویے کا ناگزیر ردعمل قرار دیا۔ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق وائسرائے نے یادداشت کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اگر مسلمانوں کا کوئی وفد حکومت برطانیہ کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے بھیجا جائے تو حکومت وفد کو لندن جانے کے سلسلے میں ضروری سہولتیں فراہم کر دے گی، لیکن خود انھوں نے کچھ کرنے سے معذوری ظاہر کی (۲) قاضی عدیل عباسی کے بقول یہ پہلا دھکا تھا جو مسلمانوں کو لگا اور جو امیدیں حکومت برطانیہ کی ''وفادار مسلم رعایا'' نے ''ہزایکسی لینسی وائسرائے دام اقبالہٗ'' کی ذات بابرکات'' سے وابستہ کی تھیں، وہ سب خاک میں مل گئیں (۳)۔

(۱) نیم میر، اے سی، خلافت موومنٹ ان انڈیا، ہیگ، ۱۹۷۲ء، ص ۸۴ (۲) آزاد، ابوالکلام، ہماری آزادی (ترجمہ انڈیا ونس فریڈم از محمد مجیب): بمبئی ، اورینٹ لونگ مینس، ۱۹۶۱ء، ص ۸، ۹ (۳) عذیل عباسی، قاضی محمد، تحریک خلافت: دہلی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۸ء ص ۲۰۔۱۱۹)

۱۹ر جنوری ۱۹۲۰ء: کو مسلمانوں کے ایک وفد نے اپنا ایک فارمولا وائسرائے ہند کو پیش کیا اس وفد میں حکیم اجمل خان ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، جناب چھوٹانی سیٹھ، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری وغیرہم شامل تھے۔ گفتگو کے بعد ارکان وفد نے رسم و روایت کے مطابق وائسرائے ہند سے مصافحہ کیا لیکن مولانا حسرت بغیر مصافحہ کیے کترا کر نکل آئے۔

(حسرت موہانی .....ایک سیاسی ڈائری)

۲۵ر فروری ۱۹۲۰ء: جرمنی کے تمام مزدور آہستہ آہستہ ہٹلر کے مشن سے متفق ہوتے چلے گئے۔ آخر ۲۴ر فروری ۱۹۲۰ء کو ہٹلر نے پہلی مرتبہ جرمن عوام اور پارٹی ممبران کے سامنے اپنے موقف کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا۔ اس تقریر کا عوام اور خواص پر خاصہ اثر ہوا اور ۲۵ر فروری ۱۹۲۰ء کو پارٹی کا ایک انقلابی پروگرام مرتب کیا گیا، جس کی بنیاد ہٹلر کے وضع کردہ حسب ذیل اصولوں پر تھی!

(۱) جرمنی کے تمام علاقوں کو اس اصول پر متحد کر دیا جائے کہ ہر قوم اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ نیز عہد نامہ وارسائی کو مسترد کر دیا جائے۔

(۲) لین دین کے معاملہ میں جرمنی کو دوسری اقوام کے مقابلہ میں حقیر نہ سمجھا جائے۔

(۳) جرمنی کی نو آبادیات واپس کی جائیں۔

(۴) صرف جرمنوں کو شہری قرار دیا جائے۔ اس لحاظ سے یہودی شہری حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔

(۵) جس شخص کے پاس شہری حقوق نہ ہوں وہ صرف غیر ملکی مہمان کے طور پر جرمنی میں قیام کر سکتا ہے۔

(۶) حق رائے دہی اور عہدے صرف شہریوں کے لیے وقف ہوں۔

(۷) تجارت کو فروغ دینے اور شہریوں کے روزگار کا بندوبست کرنے کے لیے حکومت تمام

ایسے لوگوں کو رائخ (جرمن پارلیمنٹ) سے علاحدہ کردے جن کے پاس شہری حقوق نہیں ہیں۔

(۸) صرف جرمن (آریہ) ہی جرمن میں آباد ہوں

(۹) تمام شہریوں کو حکومت میں مساوی حقوق دیے جائیں

(۱۰) تمام شہریوں کو اپنے ذاتی مفاد قوم کے مفاد پر قربان کر دینے چاہئیں۔

(۱۱) بغیر کام کے کسی شہری کو آمدنی حاصل نہ کرنے دی جائے۔

(۱۲) جن لوگوں نے جنگ (پہلی جنگ عظیم) سے فائدہ اٹھا کر نفع کمایا ہے ان کی دولت چھین لی جائے۔

(۱۳) ٹرسٹوں (متمول کاروباری کمپنیوں) کی آمدنی کو اجتماعی قرار دیا جائے۔

(۱۴) تھوک فروش کے منافع کو قوم میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۱۵) بوڑھوں کی مالی امداد زیادہ کی جائے۔

(۱۶) چھوٹے اداروں کو خاص مراعات دی جائیں۔

(۱۷) قومی مفاد کے لیے ذاتی زمینیں ضبط کر لی جائیں۔ اور اراضی کی ضمانت پر قرضہ نہ دیا جائے۔

(۱۸) جو لوگ ناجائز سود کھاتے ہیں یا جن کی حرکت مفاد عامہ کے خلاف ہیں ان پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دی جائے۔

(۱۹) جرمنی میں روسی لا کے بجائے جرمن قانون نافذ کیا جائے۔

(۲۰) نوجوانوں کے لیے ورزش لازمی قرار دی جائے اور بچوں سے مزدوری بند کرا دی جائے۔

(۲۱) قومی فوج کو تنخواہ دینے کا رواج اڑا دیا جائے۔

(۲۲) اخبارات کے لیے خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور صرف جرمنوں کو اخبار چلانے کی اجازت دی جائے۔

(۲۳) لوگوں کو مذہبی آزادی صرف اس شرط پر دی جائے کہ وہ جرمن قوم کے اخلاقی تصور کے خلاف نہ ہو۔

(۲۴) مرکز میں ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے۔

(۲۵) پارٹی کے لیڈر مندرجۂ بالا مقاصد کے لیے اپنی جانیں لڑا دیں۔

تقریباً تین سال کی مسلسل محنت کے بعد ہٹلر اور اس کی پارٹی کو عوام میں عروج حاصل ہو گیا۔

ہٹلر کی طوفانی فوج کی دنگا بازی اور مڈ بھیڑ نے عوام کے دلوں پر ایک قسم کی دہشت طاری کر دی۔ یہاں تک کہ حکومت بھی خوف کھانے لگی۔ نازی پارٹی نے اپنا اخبار بھی جاری کر لیا اور پارٹی کا سرمایہ دو لاکھ (جرمنی سکہ) کے قریب جمع ہو گیا۔

حکومت پر ان دنوں فوج کے علاوہ پولیس بھی قابض تھی۔ ہٹلر اپنے طوفانی دستوں کو تشدد کی ترغیب دے کر حکومت کے اکثر محکموں پر قبضہ کر کے انھیں اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر تنگ آ کر حکومت نے ہٹلر کو گرفتار کر کے آٹھ ماہ قید کی سزا دے دی۔ ۲۴ نومبر ۱۹۲۴ء کو رہا ہو کر ہٹلر باہر آیا تو اس کی جماعت پہلے سے زیادہ طاقتور سمجھی جانے لگی تھی۔

اس طرح تیرہ سال کی جدوجہد کے بعد ہٹلر نے مسند اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

اس شکست کے بعد جرمن میں اشتراکی عناصر نے سر اٹھایا اور اپنے مقاصد کی ترغیب میں جرمن کو ہراساں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ لیکن ہٹلر نے برسر اقتدار آتے ہی اشتراکیوں کی تمام سرگرمیاں خلاف قانون قرار دے دیں۔ (کاروان احرار ا جلد ا)

۲۰ جنوری: کو دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کا مشترکہ جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ہوا۔ اس جلسہ میں علی برادران، مولانا عبدالباری، حکیم اجمل خان کے علاوہ ہندو لیڈروں کے ساتھ گاندھی جی نے بھی شرکت کی اور عدم تعاون کے پروگرام پر روشنی ڈالی۔ گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں نے مسئلہ خلافت پر ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کی پرزور تائید کی (اسی جلسہ میں ڈاکٹر انصاری نے اپنے خطبہ کے ذریعے برطانیہ اور اس کے ہواخواہوں کو چیلنج کیا کہ وہ عرب ممالک کو اپنے قبضہ و تصرف سے آزاد کر دیں یہ خطبہ اس قدر باغیانہ تھا کہ یو۔ پی سرکار نے اسے ضبط کر لیا۔ اور ڈاکٹر انصاری کو اس کی پاداش میں سزا بھی بھگتنی پڑی۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

عدم تعاون کی تجویز:

۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ایک جلسہ ہوا۔ گاندھی جی کے علاوہ لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کی، جو مسلمانوں نے خلافت کے مسئلے میں اختیار کیا تھا۔

وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ میں نے عرض داشت پر دستخط تو کر دیے، مگر وفد میں

شریک نہیں ہوا۔ میری رائے تھی کہ اب معاملہ عرض داشتوں اور وفدوں کی منزل سے بہت آگے بڑھ گیا ہے وائسرائے نے اپنے جواب میں کہا کہ اگر برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے کوئی وفد لندن بھیجا جائے، تو وہ اس کے لیے ضروری سہولتیں فراہم کر دیں گے۔ خود اپنے متعلق انھوں کہا کہ وہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے معذور ہیں۔

اب سوال پیدا ہوا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ ایک جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی موجود تھے، گاندھی جی نے اپنا عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اب عرض داشتوں اور وفد کا زمانہ گزر گیا ہے۔ ہمیں حکومت کی تائید کرنے اور تقویت پہنچانے سے ہر طرح پرہیز کرنا چاہیے۔ یہی طریقہ حکومت کو آمادہ کرسکتا ہے۔ کہ وہ ہم سے معاملہ کرے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ تمام سرکاری خطابات واپس کردیے جائیں۔ عدالتوں اور درس گاہوں کا بائی کاٹ کیا جائے۔ ہندوستانی سرکاری ملازمتوں سے استعفادے دیں اور جو نئے قانون ساز ادارے بننے والے ہیں، ان میں ہر طرح سے حصہ لینے سے انکار کریں۔

جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی تجویز بیان کی، مجھے یاد آیا کہ یہ وہی پروگرام ہے، جس کا خاکہ ٹالسٹائی نے بہت سال پہلے پیش کیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ایک انارکسٹ نے اٹلی کے بادشاہ پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ٹالسٹائی نے انارکسٹ جماعت کے نام ایک کھلا خط شائع کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ تشدد کا طریقہ اخلاقی اعتبار سے غلط اور سیاسی نقطۂ نظر سے بے سود ہے۔ اگر ایک شخص قتل کیا گیا، تو ہمیشہ کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے کے لیے مل جائے گا۔ درحقیقت تشدد کا نتیجہ ہمیشہ زیادہ سخت تشدد ہوا کرتا ہے۔ یونانیوں کی ایک داستان میں ہے کہ ہر سپاہی جو مارا جاتا تھا، اس کے خون کے چھینٹوں سے ۹۹۹ سپاہی پیدا ہوتے جاتے تھے۔ دراصل سیاسی مقصد سے قتل کرنا اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔ ٹالسٹائی نے مشورہ دیا کہ اگر کسی جابر حکومت کو بے بس کرنا ہو، تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس دینے سے انکار کردیا جائے، ملازمتوں سے استعفادے دیا جائے اور ان تمام اداروں کا بائی کاٹ کیا جائے، جن سے حکومت کو سہارا مل رہا ہو۔ اسے یقین تھا کہ ایسا پروگرام کسی بھی حکومت کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کردے گا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے بھی ''الہلال'' کے بعض مضامین میں ایسا ہی پروگرام تجویز کیا تھا(۱)۔

گاندھی جی کے اس عدم تعاون کے پروگرام کا دوسروں پر جو اثر ہو، وہ ان کی طبیعت، عادت

اور پچھلے تجربے کے مطابق تھا۔ حکیم اجمل خان نے کہا کہ انھیں تجویز پر غور کرنے کے لیے وقت چاہیے، وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسروں کو پروگرام پر عمل کرنے کا مشورہ دیں۔ اور وہ خود اس پر عمل کرنے کو تیار نہ ہوں۔، مولوی عبدالباری نے کہا کہ گاندھی جی کی تجویز میں بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں اور وہ کوئی جواب نہ دے سکیں گے جب تک کہ وہ استخارہ نہ کرلیں اور خدا کی طرف سے انھیں کوئی اشارہ نہ ملے۔ محمد علی اور شوکت علی نے کہا کہ وہ مولوی عبدالباری کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔ تب گاندھی جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں نے بغیر ایک لمحہ تامل کیے کہہ دیا میں اس پروگرام کو کلی طور پر صحیح سمجھتا ہوں۔ اگر لوگ واقعی چاہتے ہیں کہ ترکی کی مدد کریں تو گاندھی جی کے پیش کیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

چند ہفتے بعد میرٹھ میں ایک خلافت کانفرنس ہوئی۔ یہی کانفرنس تھی، جس میں گاندھی جی نے پہلی بار ایک پبلک پلیٹ فارم سے عدم تعاون کے پروگرام پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ ان کے بعد میں نے تقریر کی، جس میں میں نے ان کی غیر مشروط تائید کی۔ (ابوالکلام آزاد: انڈیا ونس فریڈم)

جنوری ۱۹۲۰ء: ایک جلسہ میں حکیم اجمل خان نے کہا کہ اس حقیقت سے کہ ہم اس خاک سے پیدا ہوئے اور دوسری قوموں کے ساتھ اس ملک پر فخر کرنے والے وارث بنے ہم ان فرائض کو جو ہماری زاد بوم ہم پر عائد کرتی ہے، نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ دلی جوش کے ساتھ ان کے ادا کرنے کے لیے اپنے ہندو، عیسائی، پارسی اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ آمادہ ہیں۔

ہندوستان کے نادیدہ مستقبل میں وہ عظمت اور شان پنہاں ہے کہ اس کے ماضی کا زیادہ سے زیادہ مہتم بالشان زمانہ بھی اس کے مقابلے میں کم اور حقیر نظر آتا ہے۔ آیئے اب ہم اس متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اس مستقبل کے چہرے سے جو ہمارے ذہن مگر اعلیٰ تخیل کے ساتھ وابستہ ہے نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

۲۰؍جنوری ۱۹۲۰ء: رانچی میں نظر بندی کے خاتمہ کی تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شورش کاشمیری کے مطابق مولانا ۳۱۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے جبکہ افضل حق قرشی اور عبداللطیف اعظمی نے رہائی کی تاریخ یکم جنوری ۱۹۲۰ء لکھی ہے۔ مولانا نے جمعیت علماے ہند کے اجلاس لاہور ۱۸؍نومبر ۱۹۲۱ء کے تحریری خطبہ میں جنوری ۱۹۲۰ء لکھا ہے لیکن ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچہ طبع اول میں رہائی کی تاریخ ۲۷؍دسمبر ۱۹۱۹ء لکھی ہے اور یہی درست ہے، کیوں کہ شاہی

فرمان کی رو سے تمام سیاسی اسیروں کو کانگریس کے اجلاس امرتسر سے ایک روز قبل رہا کر دیا گیا تھا۔ چناں چہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیل سے رہا ہو کر بذریعہ ریل گاڑی سیدھے امرتسر پہنچے تھے اور کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ یہ اجلاس ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو شروع ہوا تھا۔

مولانا تقریباً تین سال اور نو ماہ جلاوطن اور نظر بند رہے۔ رہا ہوتے ہی سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں کھو گئے۔ فوراً دہلی پہنچے۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کو حکیم اجمل خاں کے دولت کدہ پر گاندھی جی سے پہلی مرتبہ بالمشافہ ملاقات ہوئی۔

مذہب عمل میں تجدید، صدارت کے لیے آمادگی!

مولانا ابوالکلام آزاد بیان فرماتے ہیں: ''انھیں نظر بندی کے گوشۂ قید وعزلت سے نکلے بمشکل ابھی پورے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔'' اس عرصہ میں انھیں چین لینا نصیب نہ ہوا وہ سیاست کے ہنگاموں میں مصروف تھے بنارس میں انھیں بنگال کی صوبائی مجلس خلافت کے ''سرگرم سیکریٹری'' کا تار ملا اس میں مولانا سے کانفرنس کی صدارت کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔ مولانا نے ''اداے تشکر وامتنان کے بعد'' معذرت کی۔ لیکن جب وہ کلکتہ پہنچے اور منتظمین سے اس بارے میں زبانی گفتگو ہوئی تو کچھ ردوکد کے بعد انہوں نے اسے منظور کرلیا۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ یقیناً اپنے دستورالعمل سے کھلا انحراف تھا کیوں کہ مولانا نے ۱۹۱۱ء میں پبلک زندگی کے ابتدائی عہد میں ''مذہب عمل'' قرار دے لیا تھا کہ وہ زندگی کے ہر حصہ میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارتوں اور انجمنوں کے عہدوں سے یک قلم کنارہ کش رہیں گے۔ ان کے نزدیک یہ رئیسانہ اور رسمی چیزیں تھیں۔ یہ فیصلہ ایک بنیادی اور دینی اعتقاد پر مبنی تھا اور دعوت وتبلیغ کی راہ عمل میں نمود ونمائش کی گنجائش محسوس نہ کرتے تھے۔

مولانا کہتے ہیں کہ انھیں اس انحراف کے لیے جس چیز نے مجبور کیا اس کی حفاظت بھی میرے لیے تمام اصولوں اور قاعدوں سے زیادہ ضروری تھی۔

''اصول مقاصد کے لیے ہیں مقاصد اصول کے لیے نہیں۔''

چناں چہ مولانا اس ارفع مقصد کی خاطر اپنے طریق عمل کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو گئے اور مجلس کی صدارت کرنے کی استدعا منظور کرلی۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے یہ قدم

اٹھایا کہ ''اظہار مطلب'' کے لیے موقع ملتا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے وہ اسے اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے جس کے لیے بارہ سال تگ و دو میں مصروف تھے۔ یہ پہلا اجلاس عام تھا جس کی صدارت مولانا نے فرمائی۔ (مولانا ابوالکلام آزاد اور نیشلسٹ مسلمانوں کی سیاست: محمد فاروق قریشی)

انگلستان اور ہندوستان کی برٹش حکومت نے جنگ کے آغاز سے جب تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے اور اسے اس آگ میں جل کر بھسم ہوجانے کا خطرہ باقی تھا۔ سیکڑوں وعدے کیے تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں نے ان پر اعتماد کیا تھا۔ لیکن یہ وعدے جس طرح پورے کیے گئے مولانا ابوالکلام آزاد نے مسئلہ خلافت کے دوسرے مکمل ترین ایڈیشن کلکتہ میں ان پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

(۱) گورنمنٹ ہند نے عراق پر حملہ کیا۔ جس کا بڑا حصہ جزیرۂ عرب کے مقدس حدود میں داخل ہے۔

(۲) ۲۶ر نومبر ۱۹۱۴ء کو بصرہ پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی بندرگاہ اور زیارت گاہ ہے۔

(۳) ۲۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو عراق کی مشہور زیارت گاہ سلمان پاک پر حملہ کیا گیا جہاں حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار ہے۔

(۴) مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

(۵) ۹ر دسمبر ۱۹۱۷ کو بیت المقدس میں برطانوی فوجیں داخل ہوئیں اور انگریزی قبضہ کا اعلان کیا گیا جو اسلام کی مقدس زیارت گاہ اور تین مقدس مقامات میں سے ایک ہے۔

(۶) ۵ر جون ۱۹۱۹ء کو خاص سرزمین حجاز میں سازش کی گئی اور شریف مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ اس بغاوت کی وجہ سے اس محترم دارالامن میں کشت وخون کا بازار گرم ہوا اور حدودِ حرم میں گولہ باری ہوئی۔

(۷) حسب تصریح نامہ نگار لندن ٹائمس بندرگاہ جدہ پر گولہ باری کی گئی۔

(۸) میجر راس کے ہوائی جہاز نے عین مدینۂ طیبہ کی فضا میں چکر لگائے (جیسا کہ ڈاکٹر باگرتھ نے فروری ۱۹۲۰ء کو ٹاؤن ہال آکسفورڈ کی تقریر میں بیان کیا)

(۹) کوفہ، کربلائے معلی، نجف اشرف پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہیں ہیں۔

(۱۰) ترکی کو تھریس کے کل علاقہ سے مع ایڈریانوپل کے محروم کر دیا گیا۔ جہاں مسلمانوں کی

سب سے زیادہ آبادی ہے۔

(۱۱) صلح نامہ ترکی کی دفعہ ۳۶ کے مطابق ترکی سے اس کے دارالسلطنت کی خودمختارانہ فرمان روائی بھی سلب کر لی گئی اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

(۱۲) سمرنا جو ایشیائے کوچک کا مشہور زرخیز مقام ہے، ترکی سے علاحدہ کر دیا گیا۔ وہاں کی مسلمان آبادی پر یونانیوں نے اس قدر ظلم و ستم کیے کہ بے شمار جانیں ہلاک و تباہ ہو گئیں اور ہو رہی ہیں۔

(۱۳) صلح نامہ کی شرائط نے بقیہ ایشیائے کوچک کے مالی اور ہر طرح کے فوجی اختیارات کی خودمختاری سے بھی ترکی کو محروم کر دیا ہے۔ وہ ایک محدود تعداد سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتی۔ چند چھوٹے جنگی جہازوں کے علاوہ کوئی بحری قوت حاصل نہیں کر سکتی۔ اپنی عیسائی رعایا پر اسے کوئی اختیار نہیں رہا۔ اس کی حیثیت بالکل ایک ماتحت ریاست کی سی ہو گئی ہے جو برائے نام بادشاہت سے ملقب کر دی گئی ہو۔

(۱۴) صلح نامہ کی دفعہ ۳۹ کے بموجب سلطان المعظم کے وہ تمام دینی و اسلامی اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین انھیں حاصل تھے۔ اور جن کے بعد خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے:

''حکومت ترکی اپنے ان تمام اختیارات سے جو حکم برداری کے یا دوسری طرح کے مسلمانوں پر رکھتی بالکل دست بردار ہوتی ہے۔''

''ترکی بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی طرح کے اختیارات ان ممالک پر نہ رکھے گی جو ترکی سے علاحدہ ہو گئے ہیں۔''

حال آں کہ شرعاً منصب خلافت کے معنی ہی یہ ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور تمام دنیا کی اسلامی حکومتوں پر اس کو ایک بالاتر اختیار ہو۔ اور وہ تمام اسلامی دنیا میں ایک مرکزی اسلامی اقتدار کی حیثیت رکھے لیکن اس دفعہ نے ترکی کو ان تمام اختیارات خلافت سے محروم کر دیا اور اسلامی خلافت اپنے کامل معنوں میں پارہ پارہ ہو گئی۔

(۱۵) شام کو ترکی سے الگ کر کے آزادی نہیں دی گئی بلکہ فرانس کی حکم برداری و بالادستی ماننے پر مجبور کیا گیا۔ شام کی تمام آبادی انسانیت و صداقت عہد کے نام پر فریاد کرتی رہی اور فرانس کی فوجوں نے اس پر جبراً قبضہ کر لیا۔

(۱۶) عراق کی آبادی کو خود مختاری و آزادی نہیں دی گئی بلکہ برطانیہ نے اس کی حکم برداری کا دعویٰ کیا اور اس پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ وہاں کی آبادی ایفائے عہد کا مطالبہ کرتے کرتے مایوس ہوگئی۔ اور بزور شمشیر اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب ان کو باغی کہا جارہا ہے۔ حال آں کہ اگر برطانیہ کے اعلانات سچے تھے اور اس کی فوجیں ''رعایا'' بنانے کے لیے نہیں آزاد کرانے کے لیے گئی تھیں، تو وہ ''باغی'' کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ بغاوت کا اطلاق رعایا کی شورش پر ہوتا ہے، نہ کہ کسی آزاد جماعت کی شمشیر زنی پر۔

(۱۷) یہ تمام نتائج صلح نامہ ترکی کے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ترکی اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ صلح کرے، برٹش فوجوں نے دارالخلافت قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا۔ اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت بالکل ایک نظر بندی قیدی کی سی ہوگئی۔ اس قبضہ کی وجہ سے اسلام کے دارالخلافہ میں جو درد انگیز واقعات وحوادت پیش آئے، اور عثمانی خلافت عظمیٰ کی متصل پانچ صدیوں میں پہلی مرتبہ جو توہین ہوئی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ وہ سلوک ہے جو نہ تو جرمنی کے ساتھ کیا گیا، نہ آسٹریا کے ساتھ، اور نہ کسی دوسرے فریق جنگ کے ساتھ۔ (ص ۴۲۔۲۲)

یکم فروری ۱۹۲۰ء: انگلستان کو جانے والا وفد قرارداد کے مطابق یکم فروری ۱۹۲۰ء کو مولانا محمد علی کے زیر سرکردگی روانہ ہوا۔ اس کے ارکان یہ تھے۔

۱۔ **سید حسین:** یہ مولانا محمد علی کے ساتھ اس وفد میں بھی شریک تھے جو نومبر ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے سلسلے میں انگلستان گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ ''انڈی پنڈنٹ'' الہ آباد کے ایڈیٹر تھے۔

۲۔ **مولانا سید سلیمان ندوی:** حسب موقع ومحل مسئلہ خلافت کی مذہبی حیثیت کی وضاحت کے لیے۔

۳۔ **ابوالقاسم:** بردوان کے رہنے والے۔ بنگال کے سیاسی رہنما۔ وفد کے ساتھ روانہ نہ ہو سکے تھے، بعد میں جاکر وفد سے مل گئے۔

۴۔ **حسن محمد حیات:** علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے، پنجاب کے رہنے والے اور مولانا کے خاص آدمی تھے۔ ان دنوں بھوپال میں ملازم تھے۔ وفد کے سیکرٹری کی حیثیت سے شریک سفر تھے۔

(ہسٹریز آف دی نان کوآپریشن اینڈ خلافت موومنٹس: پی۔ سی۔ بام فورڈ۔ دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۴۸)

۲۲ رفروری ۱۹۲۰ء: ۲۲ رفروری کو یہ وفد وینس پہنچا۔ وہیں سے اس نے وزیر ہند اور وزیر اعظم

کو تار بھیجے اور درخواست کی، کہ آخری فیصلے سے پہلے، انھیں اظہار خیال کا موقع دیا جائے۔ لندن پہنچنے کے بعد سب سے پہلے مسٹر فشر سے ملاقات ہوتی۔ مسٹر مان ٹیگوان دنوں بیمار تھے۔ مولانا محمد علی نے پورے جوش، وضاحت اور دلائل کے ساتھ حسب ذیل مطالبات پیش کیے۔

۱۔ خلافت ترکی کو بحال رکھا جائے۔

۲۔ مقامات مقدسہ...... مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور دیگر تمام مقدس مقامات و مزارات خلیفہ کی نگرانی میں ہونے چاہئیں۔ جیسے کہ جنگ سے پہلے تھے۔

۲۶ رفروری ۱۹۲۰ء: وزیر اعظم انگلستان نے جنگ کے خاتمے کے بعد اپنی ۵ رجنوری ۱۹۱۶ء کی تقریر کے بارے میں ہاؤس آف کامنز میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہمارا وہ اعلان بہت وسیع المعنی تھا اور بہت کچھ سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ تمام جماعتوں کی مرضی کے مطابق تھا۔ مزدوروں کی جماعت بھی اس سے متفق تھی۔"

گویا کہ ترکی کے معاملے میں جو بدعہدی کی گئی ہے وہ انگلستان کی متفقہ پالیسی تھی اکابر علمائے دیوبند اور آزاد خیال وحریت پسند رہنماؤں نے اسی زمانے میں اس فریب کی طرف توجہ دلائی تھی، لیکن حکومت کے پرزور پروپگنڈے اور مسلمانوں کی سادہ دلی اور حکومت پر ان کے اندھے اعتماد کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

بنگال خلافت کانفرنس کا خطبۂ صدارت!

مجلس خلافت بنگال کی صوبائی کانفرنس ۲۸ رفروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں منعقد ہوئی، مولانا ابو الکلام آزاد نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جو بڑا جامع، مانع اور مبسوط تھا۔ مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہا۔

مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ "اردو، عربی، فارسی، انگریزی کسی زبان میں اس کی مثال موجود نہیں۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت میں تمام افکار کا سرچشمہ یہی ایک تصنیف تھی۔ اردو، انگریزی میں جتنا لٹریچر بھی اس وقت سامنے آیا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی طرف اس تصنیف میں رہنمائی نہ کی گئی ہو۔ اس کے مطالعہ سے قرآن وحدیث، فقہ اور تاریخ اسلام میں مولانا کے علم ونظر کی گہرائی اور گیرائی کا نقش بھی دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔"

ترک تعاون کی پوری تحریک میں یہی خطبہ راہنمائی کی قندیل بن کر چمکتا رہا۔ اس کے بعد

جتنی تقریریں ہوئیں، جتنے اجلاس ہوئے، جتنی کانفرنسیں آراستہ ہوئیں، اس مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے جتنی مجلسیں سجائی گئیں، اخبارات نے، رسائل نے، جرائد نے تحریک کی حمایت میں جو کچھ لکھا ان سب کا منبع و سرچشمۂ معلومات، اساس و بنیاد مولانا کا یہی خطبۂ صدارت تھا۔ مولانا کے اس خطبہ میں دعوت و ارشاد اور ہدایت و رہنمائی کے ماخذ نئے نہ تھے۔ لیکن انھوں نے کتاب و سنت کے ان مقامات کو عصر جدید کے تقاضوں اور ماحول کی خاص ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے مطالب و معانی کو وقت اور حالات کے مطابق بنا کر پیش کیا، قوم کو صراط مستقیم پر چلنے کی دعوت دی اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور یہ مولانا ہی کا کمال اور نجابات فکر کا کارنامہ تھا۔ ورنہ اس عہد میں ایک سے ایک بڑا عالم، ایک سے ایک بڑا فاضل، ایک سے ایک بڑا عالم دین، ایک سے ایک بڑا قرآن فہمی کا دعوے دار، ایک سے ایک مزاج شناس رسول ہونے کا مدعی موجود تھا۔ لیکن جو ندرت خیال، دل نشین پیرایہ اور فکر انگیز پہلو مولانا کے شہ دماغ کی تخلیق تھے وہ کہیں اور دستیاب نہ تھے۔ یہ مولانا پر قدرت کی خاص عنایت تھی کہ انھیں دین کے حقائق اور معارف کو زمانۂ جدید کے تقاضوں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کا خاص ملکہ عطا ہوا تھا۔ جسے انھوں نے نہایت حسین و جمیل الفاظ میں ملفوف کر کے قوم کے سامنے پیش کیا اور قوم نے ان کے ارشادات کو بگوش ہوش سنا۔ اس پر عمل کیا۔ متہدم سے قدم ملا کر چلی۔ تحریک ترک تعاون میں مسلمانوں کا حصہ اپنی آبادی کے تناسب سے کم نہ تھا ۳۲۰۰۰ لوگ جیلوں میں گئے جن میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔

یہی کانفرنس تھی جس میں پہلی بار ترکِ موالات کا شرعی پروگرام مرتب کیا گیا جسے علمائے کرام نے فتویٰ کی صورت میں جاری کیا تھا یعنی یہ کہ

۱۔ سرکاری کونسلوں میں ممبر ہونا ناجائز ہے۔

۲۔ انگریزی عدالتوں میں وکالت کرنا ناجائز ہے۔

۳۔ سرکاری و نیم سرکاری مدرسوں میں پڑھنا ناجائز ہے۔

۴۔ آنریری مجسٹریٹی اور اعزازی عہدے اور گورنمنٹ کے دیے ہوئے خطابات رکھنا ناجائز ہے۔

۵۔ گورنمنٹ کی تمام نوکریاں جس سے سرکاری مدد ہوتی ہو حرام ہے۔

۶۔ خاص کر پولیس اور فوج کی نوکری کرنا بہت سخت گناہ ہے۔ کیوں کہ ان کو اپنے بھائیوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ

خَالِدًا فِيهَا ۔یعنی جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے گا، اسے جہنم میں ہمیشہ عذاب دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے" من حمل السلاح علینا فلیس منا. جس نے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے وہ مسلمانوں سے خارج ہو گیا۔(حسرت موہانی۔ایک سیاسی ڈائری، ص ۸۷)

۸/مارچ ۱۹۲۰ء: ہنٹر کمیٹی نے ۸/مارچ ۱۹۲۰ء کو اپنی رپورٹ پیش کی جسے گورنر جنرل نے وزیر ہند آنریبل ایڈون مانٹیگ کے ملاحظہ کے لیے ۳/مئی ۱۹۲۰ء کو بھیج دیا۔

رپورٹ کے ساتھ حکومت ہند نے اپنی جو رائے بھیجی تھی اس میں تو وہ ہنٹر کمیٹی کی اس نکتہ چینی سے متفق تھی جو جنرل ڈائر سے متعلق تھی، مگر اس میں سر مائیکل اوڈوائر کی تعریفیں کی گئی تھی۔حکومت ہند کی نظروں میں یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ پنجاب ''اس تجربہ کار اور باہمت'' شخص کے زیر حکومت تھا۔

وزیر ہند نے گورنر جنرل کو اپنے جواب میں بھی جنرل ڈائر کے متعلق کی گئی نکتہ چینی اور سر مائیکل اوڈوائر کی تعریف سے اتفاق کیا۔البتہ جلیانوالہ باغ کے واقعے سے متعلق سر مائیکل نے جنرل ڈائر کے طرز عمل کو جو بالکل حق بجانب ٹھہرایا تھا اس کی توثیق وزیر موصوف نے نہیں کی۔ گورنر جنرل نے جس طرح اپنے فرائض کو پورا کیا تھا۔ برطانوی کابینہ نے اس کی بھی تعریف کی۔ ہنٹر کمیٹی کے تینوں ہندوستانی ممبروں اور گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے واحد ہندوستانی ممبر نے اختلافی نوٹ دیے تھے۔

جنرل ڈائر سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) نے ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور حکومت کے اقدام کی توثیق کی۔لیکن ہاؤس آف لارڈز کا خیال اس کے برعکس تھا اُس نے ۱۹/جولائی ۱۹۲۰ء کو لارڈ فنلے کی پیش کردہ یہ تحریک منظور کی جس میں جنرل ڈائر کے خلاف حکومت نے جو قدم اٹھایا تھا اُس کی مذمت کی گئی تھی بعد میں کچھ لوگوں نے جنرل ڈائر کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا تا کہ جنرل ڈائر نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کے صلے میں ایک ہتھیلی بھینٹ کی جائے'' ہاؤس آف لارڈز کی پاس کردہ تجویز اور چندے کی اس فراہمی سے ہندوستان میں بڑی ناراضگی پھیلی۔'' سر چمن لال سِتلواد لکھتے ہیں:

''برطانوی حکومت کے طرزِ عمل سے ہندوستانی رائے عامہ میں بڑی برہمی پیدا ہوئی۔مسٹر ایڈون مانٹیگ نے جس طرح صرف جنرل ڈائر کی مذمت کی تھی اور وائسرائے لیفٹننٹ

گورنر اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرنے والے افسروں کی پشت پناہی کی تھی، اس سے ہندوستان کے قوم پرستوں نے صاف دیکھ لیا تھا کہ انگریز ہندوستان سے جانے والے نہیں ہیں۔ ہندوستان کے لیے جو اصلاحات نافذ کیے جانے والے تھے اُن کے بارے میں لوگوں نے سمجھ لیا تھا۔ جیسا کہ پہلے گاندھی جی کہہ چکے تھے کہ یہ استعماری حکومت کو باقی رکھنے کے لیے محض دھوکے کی ایک ٹٹی ہے۔

جلیانوالہ باغ میں جو واقعات ہوئے اس کی اہمیت اور شدت کو مہاتما گاندھی کے ان الفاظ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ''موتی لال نہرو کمیٹی کی رپورٹ پڑھنے کے بعد یہ بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی حکومت اور اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے برطانوی حکومت کس حد تک جا سکتی ہے اور کیسے انسانیت سوز اور وحشیانہ قدم اُٹھا سکتی ہے۔''

بنیادی طور پر جنرل ڈائر مشین کا محض ایک پرزہ تھا اصل شخص تو سر مائیکل اوڈوائر تھا جس کی نہ صرف وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ بلکہ وزیر ہند مسٹر ایڈون مانٹیگ نے حمایت، بلکہ تعریف کی تھی۔

کانگریس نے کلکتہ کے اجلاس میں سر مائیکل اوڈوائر کو بری الذمہ قرار دیے جانے کی سخت مذمت کی اور کہا کہ تمام واقعات کی براہ راست ذمہ داری اُن پر آتی ہے۔ کانگریس نے ہاؤس آف لارڈز کے طرزعمل پر بھی احتجاج کیا اور کہا کہ وائسرائے نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے دل میں کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔

اپنے صدارتی خطبے میں لالہ لاجپت رائے نے کہا کہ جو شخص پنجاب کے المیے کا خاص طور پر ذمہ دار ہے اور جس شخص کی پالیسیوں نے وہ فضا پیدا کی جس میں ڈائر، بوسورا سمتھ، او برین، ڈوبٹن، فرینک، جالنس، جیسے چھوٹے لوگوں کو پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ سے پہلے کے پانچ دنوں میں اور ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں جرائم کے ارتکاب کا موقع فراہم کیا وہ سر مائیکل اوڈوائر ہے۔''

اُنھیں بری الذمہ قرار دے کر برطانوی حکومت نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان کی سیاسی امنگوں کو پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

۱۵/مارچ ۱۹۲۰ء: حضرات شیوخ (مولانا محمود حسن دیو بندی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل اور مولانا وحید احمد کو آج مالٹا سے اسکندریہ روانہ کر دیا گیا۔ (مولانا آزاد ......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۱۷)

۱۶/مارچ ۱۹۲۰ء: ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو انگریزوں نے استنبول پر قبضہ کرلیا اور جو بھی ترکان احرار

میں سے ان کو ملا اس کو تہِ تیغ کر دیا۔ انگریز کا منشا ترکی کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا تھا۔

اخبار ہفتہ وار مشرق اپنی اشاعت مورخہ ۱۸ ؍ مارچ ۱۹۲۰ء میں صفحہ ۳ پر لکھتا ہے:

''قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ مسئلہ خلافت کے متعلق ہوا ہے۔ مسجد ایا صوفیہ کے پاس ایک وسیع میدان میں یہ مظاہرہ ہوا تھا۔ اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ موجودہ سیاسی حالت پر بحث کی جائے اور ایک یادداشت دول عظام کے پاس بھیجی جائے۔ بعد نماز جمعہ جلسہ کا آغاز ہوا۔ یہ میدان دس ہزار میٹر کی وسعت رکھتا ہے پورا میدان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مسجد ایا صوفیہ اور مسجد سلطان احمد کے درمیان یہ میدان ہے اور ان دونوں مسجدوں کے تین سو مکبروں نے بعد نماز ظہر پہلے خدائے پاک سے دعا مانگی کہ اسلام کو نجات ہو۔ ایک فرانسیسی خاتون نے ایک پر جوش تقریر میں کہا کہ فرانسیسی قوم ہر اس قرارداد کے خلاف رہے گی جو ترکوں کی مصالح کے خلاف ہو۔ رضا نور وغیرہ کی تقریریں ہوئیں اور ایک یادداشت سلطان المعظم، ایوان مندوبین اور دول یورپ کے پاس بھیجی گئی جو حسب ذیل ہے:

آستانہ خلافت اسلامیہ کا مرکز ہے۔ سمرنا کو اس کے مالکوں کی طرف منتقل ہونا چاہیے کیوں کہ وہ جنوبی منطقوں کی بندرگاہ ہے اور ایک ہزار سال سے زیادہ سے ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایڈریانوپل سلطنت عثمانیہ کے ساتھ رکھا جائے۔ کیوں کہ آستانہ علیہ کے دفاعی خطوط کا وہ آخری خط ہے۔ اناطولیہ کے مشرقی و مغربی حصے ترکی میں شامل ہیں اور ان کے باشندے اکثر مسلمان ہیں:

مگر ان تمام کارروائیوں کا دول متحدہ اور صلح کانفرنس پر نہ تو اثر ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۱۵۱)

وفد خلافت کو وزیر اعظم برطانیہ کا جواب:

۱۷ ؍ مارچ ۱۹۲۰ء: ۱۷ ؍ مارچ کو مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم کی جانب سے انھیں (ہندوستانی وفد خلافت کے ارکان کو) سرکاری طور پر مطلع کر دیا گیا:

۱۔ یہ کہ ترکی کے ساتھ انھی اصولوں کے مطابق معاملہ کیا جائے گا، جن کے مطابق دوسرے ممالک سے معاملہ کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں اُس کے ساتھ کوئی تفریق روا نہیں رکھی جائے گی۔

۲۔ یہ کہ ترکی حکومت کو ترکی علاقوں پر حکومت کرنے کی اجازت ہوگی۔

۳۔ لیکن اسے اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ غیر ترکی علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھے۔ وفد نے مسٹر ایسکویتھ سے بھی ملاقات کی اور لیبر پارٹی کے ان ارکان سے بھی ملا، جنھوں نے اس کی طرف ذرا بھی التفات کیا۔

وفد نے انگلستان کے بعد فرانس اور اٹلی کا دورہ بھی کیا تاکہ دول متحدہ کے دوسرے ارکان کے سامنے بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کرسکیں۔ اور مسئلہ خلافت کی وضاحت کرسکیں۔

(ہسٹریز آف دی نان کوآپریشن اینڈ خلافت موومنٹس، ص ۱۴۸)

یوم خلافت:

۱۹ر مارچ ۱۹۲۰ء: ۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی بمبئی کی ہدایت پر تمام ہندوستان میں یوم دعا منایا گیا تھا۔ اب ۱۹ر مارچ ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی کے مشورے سے خلافت کمیٹی نے تمام بڑے بڑے شہروں، ضلع اور تحصیل کے صدر مقاموں، قصبوں اور دیہاتوں تک میں یہ جلسے بڑے جوش و خروش سے منائے گئے۔ مکمل ہڑتال کی گئی۔ یہ جلسے تمام ہندوستان میں گویا ستیہ گرہ کی ریہرسل تھے۔ پورے امن وامان کے ساتھ ہر جگہ جلسے ہوئے۔ مشرق گورکھپور نے اپنی ۲۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں ضمیمہ ب پر حسب ذیل رپورٹ درج کی ہے:

''دہلی، کلکتہ، لاہور، بمبئی، لکھنؤ، بجنور، امروہہ، مرزاپور، جونپور، بنارس، کانپور، رائے بریلی، آگرہ، سہارنپور غرضیکہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں ہی میں نہیں بلکہ قصبات اور دیہات تک میں ۱۹ر مارچ کو عام ہڑتال ہوئی اور جلسے سکون اور خاموشی سے ہوئے۔ مسٹر گاندھی نے بمبئی کے جلسہ میں فرمایا کہ ابھی ضرورت باقی ہے کہ اور ہڑتالیں ہوں اور ستیہ گرہ کی جائے۔

اسی اخبار میں صفحہ ۷ پر درج ہے کہ:

''بستی شہر اور پکا بازار میں عام ہڑتال ہوئی اور کاروبار بند ہوگئے تھے۔ تمام دن مسلمانوں نے دعاؤں اور عبادت میں گزارا، جمعہ کی نماز عیدگاہ میں بڑی جمعیت کے ساتھ ہوئی۔ مولانا سید فاخر الہٰ آبادی نے نماز پڑھائی۔ اور پردرد دعا میں حاضرین کو زار و قطار رلایا۔ ۲ بجے دن سے ہندو مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ بابو دولت رام صاحب وکیل نے پرجوش تقریر میں یہ ظاہر فرمایا کہ ہندو برادران وطن مسلمانوں کے ساتھ ہر نازک وقت میں شریک حال رہیں گے۔ تمام وکلا و قانون پیشہ ہر طبقہ کے لوگوں کا ایسا عظیم الشان اجتماع بستی میں اس سے پہلے کبھی نہ

ہوا تھا۔ مولانا سید محمد فاخر صاحب نے دو گھنٹہ تقریر کی۔ کلکتہ خلافت کانفرنس کے ریزولیوشن دہرائے گئے اور وائسرائے ہند کی معرفت ملک معظم کو آخری پیغام پہنچایا گیا۔ یہی حال مضافات کا تھا یعنی گنیش پور، پانسی وغیرہ۔ (تحریکِ خلافت، از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۴۴۔۱۴۳)

دیوبند کا عظیم الشان جلسہ!

۱۹ر مارچ ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ کا اعلان اشاعت کے لیے مختلف اخبارات مثلاً آفتاب، ہمدم، پیسہ اخبار، الخلیل میں بھیجا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ متبعین دیوبند جہاں کہیں بھی ہوں اس کام میں اخلاص و تدین اور فہم کے ساتھ حصہ لیں۔ چناں چہ جلسہ میں شہر اور دیہات کے ہزاروں مسلمان شریک ہوئے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم نے اپنی بیماری اور ضعف کے باوجود ایک نہایت پر درد تقریر کی جس میں فرمایا کہ اسلام اور خلافت توأم ہیں۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ اپنی کم طاقتی کا احساس ترک کر دیں کیوں کہ اصل طاقت خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے فرعون جیسے جابر کے مقابلے میں کمزوروں اور نہتوں کی امداد کی تھی، تقریر اتنی پر زور اور دردانگیز تھی کہ سارے مجمع پر رقت طاری ہوگئی۔ حتیٰ کہ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور جب وہ مولانا کے بعد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی آواز رندھ گئی اور وہ کچھ بول نہ سکے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ حسب ذیل تار ہزمیجسٹی کی گورنمنٹ کو روانہ کیا جائے:

"دیوبند کی مذہبی جماعت بھی جمہور اہل اسلام کی طرح تجزیہ ترکی پر جس سے خلافت اسلامیہ پارہ پارہ ہوئی جاتی ہے ہزمیجسٹی کی خدمت میں اپنے نہایت ہی گہرے صدمے اور اضطراب کا اظہار کرتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ ہزمیجسٹی کی گورنمنٹ کے ذمہ دار ارکان ایک ایسی شدید بے چینی پیدا کرنے والی پالیسی کو جلد تر تبدیل کریں جس کے نتائج بہت ہی خوفناک صورت پیدا کر سکتے ہیں اور جس سے برٹش گورنمنٹ کے عہود و مواعید بے اعتبار ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی فرد مسلم اپنی آنکھوں سے اقتدار (اسلامی) کی تباہی کو نہ دیکھ سکا۔

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۱۴۲)

میرٹھ خلافت کانفرنس!

۲۳ر مارچ ۱۹۲۰ء کو میرٹھ میں خلافت کانفرنس بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی

زمین کا گز بنے ہوئے تھے اور بڑی دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ ہر ضروری آدمی سے مل کر بات کرنا، ہر جلسہ میں شریک ہونا، گویا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ میرٹھ کانفرنس میں بھی وہ شریک تھے۔ انھوں نے وہاں دلی کے لیڈروں کا فیصلہ سنایا کہ اگر ترکی کے خلاف فیصلہ ہوا تو ہم کو اتنا اور کرنا ہوگا۔ اس میں عدم تعاون کی پوری اسکیم تھی۔ مہاتما گاندھی نے یہ بھی کہا کہ اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ پوری اسکیم کو مہاتما گاندھی نے اس طرح بیان کیا:۔

۱۔ تمام سرکاری خطابات اور سول عہدوں سے علیٰحدگی۔

۲۔ فوج اور پولیس کی نوکری سے علیحدگی۔

۳۔ ٹیکس اور دوسری سرکاری واجب الادا رقوم کی ادائیگی سے انکار۔

اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ابھی بھرپور ترک تعاون شروع بھی نہیں ہوا تھا، نہ کسی جماعت نے اسے پاس کیا تھا کہ حکیم اجمل خان صاحب نے پہل کی اور انھوں نے ڈپٹی کمشنر کو حسب ذیل چٹھی لکھی۔

جناب!

ہندوستان کے مسلمانوں نے ابتداے جنگ سے وقفۂ جنگ کے زمانے تک جس صبر و سکون کا ثبوت دیا وہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ باوجود انتہائی دلی تکلیفوں کے جن کا سلسلہ سلطنت عثمانیہ کے واقعات (دوران وقفۂ جنگ) سے شروع ہوتا ہے۔ آج تک انھوں نے کسی جگہ ایک ادنیٰ دست درازی کی مثال بھی ہندوستان کے کسی حصہ میں پیش نہیں کی۔ بلکہ وہ جنگ میں برٹش فوجوں کے ساتھ درہ دانیال، شام، عراق، عرب اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں بھی شریک کار رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مقامات مقدسہ محفوظ رہیں گے جیسا کہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن ان میں سے صحیح معنوں میں ایک بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مکۂ شریف جو مقامات مقدسہ میں سب سے زیادہ مقدس مقام مدینہ پاک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن ہے، اس وقت واقعی طور پر شریف حسین کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بیت المقدس اسلامی ہاتھوں سے لے کر یہودیوں کو دیا جا رہا ہے۔ اور عراق و عرب کے تمام مقدس مقامات اس وقت براہ راست ہماری گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس طرح جزیرۃ العرب کا باقی حصہ بھی بڑی حد تک برٹش اقتدار میں ہے۔ قسطنطنیہ اور تھریس کے متعلق جو وعدے کیے گئے تھے ان کے ایفا کرنے کے عوض میں خود قسطنطنیہ میں فوج اتار دی گئی ہے اور یہ تجویز کر لی گئی ہے کہ خلافت ہمیشہ کے لیے درۂ دانیال کی انٹرنیشنل توپوں کی زد

میں رہے۔

مسلمانوں نے اب تک وہ تمام جائز ذرائع برٹش گورنمنٹ کی توجہ کو اپنے مطالبات کی طرف مبذول کرنے کے لیے استعمال کیے جوان کے خیال میں آسکتے تھے لیکن ان کے حقوق اور ان کی درخواستوں کے کسی کم سے کم حصہ کی طرف بھی التفات نہیں کیا گیا۔ ایسی حالت میں بحیثیت ایک حقیر مسلمان کے ان عزتوں سے (سلطنت عثمانیہ کے خلاف برٹش گورنمنٹ کے طریقۂ عمل کو قابل اعتراض سمجھتے ہوئے،) دست کش ہوتا ہوں جو مجھے گورنمنٹ کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ میں قیصر ہند کو گولڈ مڈل اور دو انگلستان اور ہندوستان کی تاج پوشی کے درباروں کے تمغوں کے ساتھ جنھیں میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، آج کی تاریخ سے حاذق الملک کے خطاب سے بھی اپنے آپ کو سبکدوش سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ میرا نام درباریوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ امید ہے کہ آپ براہ مہربانی میری اس چھٹی کو لوکل گورنمنٹ کی خدمت میں ان تمغوں کے ساتھ بھیج کر مجھے شکر گزار فرمائیں۔ چوں کہ یہ مسئلہ پبلک سے تعلق رکھتا ہے اس لیے میں اس چٹھی کی نقل پریس کو بھی بھیج رہا ہوں۔

(مشرق' مورخہ ۱۸ر اپریل ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵ بحوالہ تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۱۴۰-۴۱)

عدم تعاون کی تبلیغ عام!

۲۳ ر مارچ ۱۹۲۰ء کو میرٹھ میں خلافت کانفرنس بڑی شان و شوکت، آن بان اور دھوم دھام سے منعقد ہوئی۔ اس میں گاندھی جی نے پہلی مرتبہ پبلک پلیٹ فارم سے عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا اور اس پر عمل کرنے کی تلقین کی پوری اسکیم کا منشا یہ تھا:

۱۔ تمام سرکاری خطابات اور سول عہدوں سے علیحدگی

۲۔ فوج اور پولیس کی نوکری سے علیحدگی۔

۳۔ ٹیکس اور دوسرے سرکاری واجبات کی ادائیگی سے انکار۔

گاندھی جی کے بعد مولانا آزاد نے زبردست تقریر کی گاندھی جی کی تجویز کی بھرپور تائید کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکیم محمد اجمل خاں نے حکومت کی جانب پہلا پتھر پھینکا۔ انہوں نے تمام تمغات اور خطاب واپس لوٹا دیے۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو خط لکھا (یہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے)

۲۵ر مارچ ۱۹۲۰ء: پنجاب کے واقعات نے سارے ہندوستان کے عوام میں ہلچل پیدا کر دی۔ گاندھی جی اس صوبے میں مصیبت زدہ لوگوں کے پاس جانے کے لیے بے تاب تھے۔ اُنھوں نے وائسرائے سے کئی باراس کے بارے میں کہالیکن شنوائی نہ ہوئی۔ سال کے بعد بہت آخر میں انھیں پنجاب جانے کا موقع ملا۔

وہ اکتوبر کے مہینے پنجاب گئے جب وہ لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی پڑتا تھا۔ پوری آبادی گھروں سے باہر نکل آئی تھی جیسے کوئی مدتوں کی جدائی کے بعد اپنے کسی عزیز سے ملا ہواور خوشی سے پھولا نہ سماتا ہو۔

پنجاب کے واقعات سے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے گاندھی جی کو موتی لال نہرو کی صدارت میں قائم کی گئی کمیٹی میں کام کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس کمیٹی کے دیگر ممبر تھے۔ چترنجن داس، عباس طیب جی اور ایم آر جیکار کام کی تنظیم کی زیادہ تر ذمہ داری گاندھی جی پر ڈالی گئی۔ انھوں نے پنجاب کے دُوردراز علاقوں کا دورہ کیا۔

امرتسر کا علاقہ چترنجن داس کے سپرد کیا گیااور جواہر لال نہرو کواُن کی امداد کرنے اوراُن کے ساتھ رہنے کے لیے مقرر کیا گیا۔

کمیٹی کی رپورٹ ۲۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کو شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کے بارے میں گاندھی جی نے لکھا تھا۔ ’’میں سفارش کرتا ہوں کہ جو کوئی پنجاب کے عوام پر کیے گئے مظالم کے بارے میں جاننا چاہے وہ اس رپورٹ کا مطالعہ کرے۔ اس میں کسی جگہ بھی کسی واقعے کے بارے میں مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا گیا۔ کمیٹی کو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ہر موقع پر سر مائیکل اوڈوائر کی حکومت کی طرف سے اشتعال انگیزی کی گئی۔ اس کمیٹی نے رولٹ ایکٹ کی منسوخی، سر مائیکل اوڈوائر، جنرل ڈائر اور متعلقہ افسروں کی ہر ذمہ دار عہدوں سے سبک دوشی اور وائسرائے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی کے ساتھ ساتھ سرکاری طور پر ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کے صدر اسکاٹ لینڈ کے سابق سالیسٹر جنرل لارڈ ہنٹر تھے۔ یہ کمیٹی اکتوبر ۱۹۱۹ء میں مقرر کی گئی تھی اور سات دیگر ممبروں میں تین ہندوستانی بشمول سر چمن لال سِتلواد تھے۔

کانگریس نے مطالبہ کیا کہ پنجاب کے اہم سیاسی لیڈروں کو جو جیل میں ہیں کم از کم عارضی طور پر رہا کردیا جائے تاکہ یہ تحقیقات زیادہ اچھی طرح سے ہو سکے مگر حکومت نے اس مطالبے کو نامنظور

کر دیا اسی وجہ سے کانگرس نے ہنٹر کمیٹی کا بائیکاٹ کیا۔

۲۸ر مارچ ۱۹۲۰ء کو لاہور میں میلہ چراغاں کے موقع پر ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا۔ انہوں نے تحریک عدم تعاون کے حق میں زبردست تقریر کی۔ انھوں نے حکومت کے وسائل کا تفصیلی ذکر کیا اور عوام کو بتایا کہ اس کا مقابلہ تشدد سے نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کے پاس حکومت جتنے وسائل نہیں ہیں۔ حکومت موقع تلاش کر کے جلیانوالہ باغ کی یاد تازہ کر سکتی ہے۔ ان حالات میں عوام کے پاس ایک ہی راستہ ہے جس کے ذریعے ایک ماہ کے اندر حکومت کو ناکوں چنے چبوائے جا سکتے ہیں۔

(۱) تمام خطابات حکومت کو واپس کر دیے جائیں۔

(۲) فوج اور پولیس کی ملازمت ترک کر دیں۔

(۳) ٹیکس، مالیہ اور محصولات وغیرہ کی ادائیگی سے انکار کر دیا جائے۔

اپریل کے پہلے ہفتے میں یو۔ پی کے مختلف مکاتب فکر کے علماء کا ایک اجلاس ہوا تا کہ عوام کو مسئلہ، خلافت اور عدم تعاون کے لیے تیار کیا جائے چناں چہ اجلاس میں علماء نے عوام کو متحرک بنانے کی ذمہ داری قبول لی اور............اعزاز واپس کرنے پر زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور مسیح الملک و رئیس الحکماء کا خطاب ہندستانیوں کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جلسہ میں علماء کو بھی اپنے خطابات واپس کرنے کا فیصلہ ہوا۔

تحریک خلاف کے باعث مسلمانوں کے تمام مسالک اور عقائد کے علماء حضرات میں بھی اتحاد و اتفاق کی بنیادیں پڑ چکی تھیں اور وہ فقہی اختلافات بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر اکھٹے ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے نوسو جید اور اہل رائے علماء نے ترک تعاون کے حق میں فتویٰ دیا۔ ان میں تمام طبقۂ خیال کے علماء شامل تھے۔ مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کا تعلق دیوبندی، مکتب فکر سے تھا، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا عبدالحکیم گیاوی اہل حدیث مکتب فکر کے علماء تھے جبکہ علماء طبقہ بریلوی میں مولانا سید محمد فاخر بیخود الہ آبادی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل، مولانا عبدالماجد بدایونی، شمالی ہندوستان کے قدیم مرکز اسلام کے اعتدال پسند علماء میں مولانا عبدالباری اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی مسلک کے علماء حضرات اس مسئلہ میں پیچھے نہ تھے۔ اگرچہ کئی علماء نے انفرادی طور پر مخالفت کی۔ مولانا احمد رضا خان نے بڑی سر

گرمی دکھائی۔ تحریک کی مخالفت میں زبردست مہم چلائی اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر استخلاص وطن کی جدوجہد میں حصہ لینا ازروے اسلام حرام قرار دیا۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں انگریزی راج کے قیام سے امن وامان کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کو ارکان دین ادا کرنے کی آزادی تھی، اس بنا پر ہندوستان دارالحرب نہیں رہا تھا بلکہ دارالاسلام ہو گیا تھا اس لیے مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت وفرماں برداری کرنی چاہیے۔ ان کے خلاف جدوجہد کرنا، جہاد وقتال کے ضمن میں آتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں پر ازروے اسلام جہاد فرض نہیں ہے۔ مسٹر فرانسس روبنسن ''سیپیریٹزم امنگ انڈین مسلمز'' میں لکھتے ہیں۔

''۱۹۲۱ء میں بریلی میں ترک موالات کے مخالف علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی ان کا عوام پر خاطر خواہ اثر تھا لیکن پڑھے لکھے طبقے کی حمایت حاصل نہ تھی۔''

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۸۹۔۸۸)

لاہور میں ڈاکٹر کچلو کی معرکتہ الآرا تقریر:

۲۸ / مارچ ۱۹۲۰ء: لاہور میں میلۂ چراغاں کے موقع پر مسلمانوں نے ایک عظیم الشان جلسہ ۲۸ / مارچ ۱۹۲۰ء کو کیا جس کی صدارت ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے فرمائی۔ یہ جلسہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ڈاکٹر کچلو نے تحریک عدم تعاون کی پرزور تائید دلائل قطعی سے کی۔ آپ نے فرمایا:

''جہاد ہر وقت فرض ہے اور ہر اس وقت جب اسلام پر کوئی طاقت حملہ آور ہو اور مذہبی جنگ ہو۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ جہاد کے لیے تیار رہیں لیکن جہاد کے مختلف طریقے ہیں اگر آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے تو یہ جہاد بالسیف ہے۔ اگر آپ کے پاس تلوار نہیں توپ بندوق جنگی جہاز اور پورا پورا سامان نہیں ہے تو اس حالت میں ہمارا مذہبی فرض کیا ہے؟ ایسی حالت میں اگر اعلان کر دیا جائے کہ مسلمانو! اٹھو اور انگریزوں کو مار ڈالو! آپ نے اگر ایک دو درجن انگریز مار ڈالے تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا ایک ہوائی جہاز آپ کے لیے کافی ہے جلیانوالہ باغ کا قتل عام آپ کو معلوم ہے۔ ایسی حالت میں مذہب آپ کو تلوار سے جہاد کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

ہجرت کا سوال!

اپنے بال بچوں سمیت تن تنہا یا سامان سمیت کسی دوسرے ملک کو چلے جائیں۔ ہمارے پاس جہاز اور وسائل نہیں۔ سات آٹھ کروڑ کی آبادی کہاں جا سکتی ہے یہ بھی ناممکن العمل ہے۔ پھر باقی

کیا رہ گیا۔ دونوں سے زبردست طاقت جس کے ذریعہ سے آپ ایک ماہ کے اندر ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔

(۱) تمام خطابات گورنمنٹ کو واپس کر دیے جائیں۔

(۲) فوج اور پولیس کی ملازمت کو ترک کر دیں۔

(۳) ٹیکس، مالیہ، محصول وغیرہ کی ادائیگی سے انکار۔

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۱۴۵)

۲/اپریل ۱۹۲۰ء: ۱۳/رجب ۱۳۳۸ء مطابق ۲/اپریل ۱۹۲۰ء کو برٹش سرکار نے اسیران مالٹا حضرات شیوخ کو اسکندریہ سے سوئز روانہ کر دیا۔

(مولانا آزاد......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۱۷)

۷/اپریل ۱۹۲۰ء: حیدرآباد کے نظام نے اپنے دستخطوں سے ایک فرمان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

۱۔ ایسے جلسوں میں جو تحریکات پیش کرنی مقصود ہوں قبل ازیں ان کے نقول بغرض صدور حکم سرکار گزارے جائیں۔

۲۔ جلسہ کے مقام اور تاریخ کی اطلاع کم از کم ایک ہفتہ قبل ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کو (جیسی کہ صورت ہو) بذریعہ تحریر دی جائے۔

۳۔ ہر جلسہ کی صحیح روئیداد بلا تعویق ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کے پاس (جیسی کہ صورت ہو) بغرض اطلاع سرکار کو بھیج دی جائے۔

۴۔ ان ہدایات کی خلاف ورزی سخت باز پرس کے قابل ہوگی۔

تحریک خلافت پر یہ پہلا وار تھا جو ایک مسلمان ریاست کے مسلمان فرماں روا نے، اس پر کیا لیکن پر جوش اور صاحب ایمان مسلمان عوام نے نظام کے اس فرمان کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں اور ان پابندیوں کی ذرہ برابر پروانہ کی۔ چناں چہ حکم عدولی کرنے والوں کے خلاف کارروائی کی گئی، نظر بندیوں اور گیر ودار کا سلسلہ شروع ہوا۔

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمان کی سیاست از محمد فاروق قریشی، ص ۱۰۰۔۹۹)

اسیرانِ مالٹا کی واپسی کا سفر:

۲/جمادی الثانی ۱۳۳۸ء (۲۱/فروری ۱۹۲۰ء) کو تقریباً ۳ برس دو مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم

مالٹا سے روانہ ہوئے روانگی کے وقت رخصت کرنے کے لیے تمام ترکی آفیسر (جو کہ اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے) صدر اعظم ترکی سے لے کر نیچے کے عہدوں تک، سب کے سب خود جمع ہو گئے اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور سے ہاتھ اُٹھا کر آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور تمام آفیسروں نے ان کی موفقت کی، آمین آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔ یہ مجمع اور سماں نہایت عجیب وغریب تھا۔ بہت سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹا سے اس سے پہلے روانہ ہوئے مگر ایسا بڑا مجمع اور اتنے بڑے رتبہ والوں کا اجتماع اور اتنی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ اور اس ہیت دعائیہ اور آمین کا اظہار کسی کے لیے نہیں ہوا تھا۔ انگریزی آفیسر بہت سے وہاں موجود تھے اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کرتے تھے، مگر یہ عزت حقانی تھی جس میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ شخص جس نے قول وعمل میں کبھی اپنی بڑائی کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ جس کو اہل دولت اور اصحاب مناصب کے اختلاط سے وحشت ہو، جس کو تکلف سوری اور طلب وجاہت دنیاوی سے نفرت ہو جس کی چال ڈھال، بیٹھنا اُٹھنا، رفتار وگفتار وغیرہ سب سے مسکنت اور تواضع ٹپکتی ہو، اس کی یہ عزت اور تمکنت خلق خداوندی میں عام قبولیت اس کے انتہائی تقویٰ اور للٰہیت اور بارگاہ خداوندی میں بلند پائیگی کا اثر نہ تھا تو کس چیز کا تھا۔ قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست
گر نہ بخشد خداءِ بخشندہ

رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ وامدتا با مدادہ فی الدنیا والآخر ہ آمین!

۲۵ ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ ر مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہنچا اور ۲۶ ر جمادی الثانی کو سیدی بشر مین جو کہ قرارگاہ اسراء، مصر میں تھا داخل کر دیے گئے تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳ ر رجب ۱۳۳۸ھ کو مطابق ۲ ر اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کیے گئے۔ سویس میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کیے گئے۔ یہاں پونے دو مہینہ کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۵ ر رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ ر مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہنچایا گیا۔ بارہ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا۔ چوں کہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیو بند میں، دوسرا ڈاکٹر

انصاری کو دہلی میں، تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا، جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی۔ تار کے الفاظ حسب ذیل تھے ''ہم لوگ ۸؍جون تک بمبئی پہنچیں گے۔'' مختصر یہ کہ ۲۰؍رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸؍جون ۱۹۲۰ء کو ۳ برس ۷ مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔ (نقش حیات (حصہ دوم): ص ۳۹۔۲۳۸)

بمبئی میں حضرت کا پر جوش استقبال:

۸؍جون ۱۹۲۰ء: بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کا افسر انگریز مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا اور حضرت شیخ الہند سے کہا میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرے میں چلے گئے۔ اس نے کہا: ''مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں، آپ بغیر ان کے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا ہم کو جہاز پر ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں۔ ہم نے مولوی رحیم بخش صاحب کا بہت انتظار کیا۔ جب وہ پہنچے تو میں اور مولانا عزیر گل صاحب اسباب لے کر کنارہ پر چلے گئے بعد کو مولوی رحیم بخش صاحب آئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور کہا کہ ''آپ کے لیے اسپیشل ڈبہ ریل میں میں رزرو کرا دوں گا۔ آپ ابھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں''۔ حضرت نے فرمایا کہ ''آپ کا انتظار کر کے حسین احمد اور مولوی عزیر گل کنارے پر چلے گئے ہیں وہ آجائیں گے تو روانگی ہو سکے گی''۔ چوں کہ ہمارے کنارے پہنچنے پر زور کی بارش ہو گئی اور دریا میں طوفان آ گیا جہاز دریا میں کنارے سے دور لنگر انداز ہوا تھا اس لیے اس روز کوئی ہوڑی حضرت شیخ الہند کو جہاز سے لانے کے لیے نہ مل سکی اگلے روز ۲۱؍رمضان کو حضرت اتر سکے مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں۔ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں، اسی لیے وہ اگلے دن اتارنے کے لیے اسٹیمر پر پہنچے۔ مگر جب لانچ کنارے پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کمیٹی نے زوردار استقبال کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا کو گونجا دیا اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کار میں سوار کر کے اپنے قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تھے لے گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب ہجوم کی شدت کی وجہ سے حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چوں کہ خلافت کی تحریک اور اس کے جملہ کارکن حضرت کے مذاق آزادی ہند اور

انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ہم نوا تھے اس لیے بالطبع ان سے رل مل گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

جلسۂ عام اور سپاسنامہ!

مسلمانان بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام کھتری مسجد میں جلسہ عام کیا گیا۔ اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں ''ایڈریس'' پیش کیا گیا۔

دہلی، لکھنؤ دیوبند وغیرہ سے استقبال کے لیے آنے والے!

ان حضرات کی فہرست جنھوں نے دور دراز سے بمبئی پہنچ کر پورٹ پر حضرت کا استقبال کیا۔ بہت طویل ہے، خاص خاص اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند معہ صاحبزادگان، مولانا مرتضٰی حسن صاحب چاند پوری (مرحوم)، جناب حکیم محمد حسن صاحب (مرحوم برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ)، مولانا محمد حنیف صاحب (مرحوم خواہر زادہ و داماد حضرت شیخ الہندؒ)، حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر کلاں ڈاکٹر انصاری (مرحوم)، نواب محی الدین خاں صاحب مرادآبادی قاضی بھوپال (مرحوم)، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (مرحوم) مہتمم و صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی، ڈاکٹر مختار احمد صاحب عرف ڈاکٹر انصاری (مرحوم)، حاجی احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی (مرحوم)، مولانا عبدالباری صاحب (مرحوم) فرنگی محلی اور مہاتما گاندھی

بمبئی کے دوروزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اسی اثنا میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت سے گفتگو کی۔

دہلی کو روانگی!

بمبئی میں دوروزہ قیام فرما کر ۲۳ر اور ۲۴ر رمضان المبارک کی درمیانی شب میں ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے ۲۵ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۱۳ر جون ۱۹۲۰ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶ر رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچ گئے۔ فللہ الحمدو المنتہ .

حضرت شیخ الہندؒ کا اسٹیشنوں پر استقبال!:

ایک وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف اجانب بلکہ تلامذہ، مریدین اور عزیز واقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ اوران کے رفقاء کو پھانسی دی جائے گی۔ ورنہ کم از کم حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا پائیں گے۔ اس لیے مریدوں اور شاگردوں تک نے نہ صرف تعلق ارادت اور شاگردی سے انکار کردیا تھا، بلکہ تعارف سے بھی منکر ہو گئے تھے۔ خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوئے گھبراتے تھے بلکہ اس محلے اور کوچے سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا اور حضرت کے لیے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بعض مدعیان اخلاص تو جان و عزت کے خطرہ سے انگریزوں کے سی آئی ڈی اور مخبر بن گئے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آ گیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت شیخ پہنچتے لوگ سروں پر بٹھاتے، ہر ایک اسٹیشن پر عقیدت مند مخلصین کا ہجوم پروانوں کی طرح ٹوٹا پڑتا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچنا اور آپ سے مصافحہ کرنا، جوئے شیر سے کم دشوار نہ تھا۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، مظفر نگر، دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا عوام کو زیارت کرانے کے لیے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے اور انگشت بدنداں تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم (سورۃ الحدید، آیت ۲۱، سورہ الجمعہ، آیت ۴)

(نقش حیات، (حصہ دوم) ص ۲۳۱۔۲۳۹)

حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا سے رہائی اور مراجعت وطن!

مولانا محمود حسن ۲۱ رفروری ۱۹۲۰ء مالٹا سے روانہ ہوئے تو ابھی وہ حراست ہی میں تھے "سیدی بشر" میں ۱۸ دن اور "سویس" میں پونے دو ماہ سرکاری حفاظت میں قیام کرنے کے بعد بمبئی وارد ہو کر یہاں ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو رہا کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ حکومت کے سی آئی ڈی کے لوگ ہمیشہ لگے رہے۔ مالٹا میں ناصحانِ مشفق، جبہ و دستار و تسبیح و سجادہ کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے رہتے تھے۔ بمبئی میں بھی ایک مولانا رحیم بخش تشریف لائے اور مولانا کو بقیہ زندگی یاد الٰہی میں صرف کرنے کا مشورہ بڑی خیر خواہی سے دیا اور یہ بھی کہا کہ مولانا خلافت کمیٹی کے دفتر تشریف نہ لے جائیں اور براہ راست دیوبند روانہ ہو جائیں۔ سفر کا براہ راست اہتمام بھی موجود تھا۔

آپ نے جہاز سے باہر قدم رکھا تو تمام ہندوستان کے قائدین استقبال کے لیے موجود تھے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ بڑے تزک واحتشام سے جلوس نکلا اور آپ براہ راست خلافت کمیٹی کے دفتر تشریف لے گئے جہاں آپ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا اور یہیں آپ کو زعماے ہند نے ''شیخ الہند'' کا خطاب دیا جو آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا ہے۔

آپ کو خلافت کمیٹی بمبئی نے سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ دو دن بمبئی میں قیام کرنے کے بعد مولانا دلی تشریف لے گئے اور ڈاکٹر انصاری کے مکان پر قیام فرمایا۔ وہاں سے دوسرے دن دیو بند کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں اہل میرٹھ نے ایک ایڈریس پیش کیا۔ مولانا سید محمد میاں علمائے حق حصہ اول میں تحریر فرماتے ہیں:

''راستہ کے اسٹیشنوں پر زائرین کا ہجوم تھا۔ دیو بند کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہجوم کی انتہا نہ رہی۔ شہر اور دیہات کے لوگ زیارت کو آئے تھے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے قلوب کسی اطمینان کے طالب تھے۔ حضرت شیخ کی تشریف آوری نے یہ طلب پوری کر دی۔ اب مسلمانوں کا قدم سب سے تیز تھا۔ ہر شخص تحریک کا متوالا، جان و مال قربان کرنے پر آمادہ......'' ایک تھوڑی تعداد جو مخالف تھی اس کی حالت یہ تھی کہ دلی میں جب اس گروہ کے ایک بڑے آدمی کا انتقال ہوا تو باوجود یہ کہ وہ پہلے علماء و نیز عام مسلمانوں میں بہت زیادہ رسوخ و مقبولیت رکھتا تھا، لیکن اس وقت حالت یہ تھی کہ تجہیز و تکفین کے لیے مسلمان تیار نہ تھے گھر کے مخصوص آدمیوں کے سوا کوئی شریک جنازہ نہیں ہوا۔ مجبوراً جنازہ کو موٹر میں قبرستان پہنچایا گیا۔ (معاذ اللہ)

یہ تھی اس وقت مسلمانوں کے جوش وخروش کی حالت۔ یہ اسباب تھے کہ جامع مسجد کے پیش امام کو شمس العلما کا خطاب واپس کرنا پڑا تھا۔

شیخ الہند مالٹا ہی سے وجع المفاصل کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حالات اسیری کی تکلیف دہ حالات ایک ایسے صاحب عزیمت کے قلب و دماغ کو متاثر کرنے سے ضرور عاجز تھے لیکن جسم پر تو اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ جب آپ دیو بند پہنچے ہیں تو چلنا پھرنا تو درکنار اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن نہ تھا۔ لیکن اسی حالت میں تحریک کی قیادت کرتے، سفر کی صعوبتیں اٹھاتے اور اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔

حضرت شیخ نہ صرف فہم وبصیرت اور علم وفضل کے امام تھے بلکہ زہد وورع وتقویٰ وطہارت و عبادت وریاضت میں بھی ممتاز تھے۔ یہ خرقہ وسجادہ وشمشیر وسنان کا امتزاج قرن اولیٰ کی یاد تازہ کرتا تھا۔

یکم اپریل ۱۹۲۰ء: اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں سرکار پرست ہفتہ وار اخبار مشرق نے ''اعلیٰ حضرت محی الملت والدین حامی العلوم نواب میر عثمان علی خاں فرماں روائے مملکت آصفیہ'' کے لیے ان کے جشن سالگرہ پر درازی حیات کی دعا کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ''اعلیٰ حضرت محی الملت والدین'' کو ''شیخ الاسلام'' کا منصب دیا جائے اور ہر صوبہ میں شیخ الاسلام کے نائب اور ہر شہر میں اس کے نقیب ہوں۔ اس طرح ایک طرف تو عوام کے خیالات پر قابو حاصل ہو جائے گا۔ دوسرے ہماری آواز زیادہ ذمہ دارانہ اور موثر طریقے سے حکومت تک پہنچ سکے گی۔ اس مضحکہ خیز تجویز کا دندان شکن جواب وکیل امرت سر نے اپنی ۲۴ را کتوبر ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں دیا اس سے معلوم ہوگا کہ وفاداران ازلی کس کس قسم کے ذہنی الجھاوے عوام میں پیدا کرنے کے لیے بے شرمی وبے حیائی کے ساتھ فکر کر رہے تھے۔ لیکن ایک فرنچ جنرل کے قول کے مطابق عوام کا جوش دریاؤں کی طغیانی کی طرح اٹھتا ہے جسے بجز خدا کے کوئی اور نہیں روک سکتا کہ بس! (تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل، ص ۱۳۱)

علمائے صوبہ متحدہ کا عظیم الشان جلسہ!

۱۵ راپریل ۱۹۲۰ء: ۵، ۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو علمائے صوبہ متحدہ کا ایک عظیم الشان جلسہ تمام علماء کو مسئلہ خلافت پر مجتمع کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ کثیر تعداد میں علماء عوام شریک ہوئے اس جلسہ میں جوش وخروش کی تقریروں کے ساتھ حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔

(۱) علماء فوراً مسئلہ خلافت میں رائے عامہ کی تیاری کا کام اپنے ذمہ لیں۔

(۲) مخالف ومنافق علماء کا مقاطعہ کیا جائے۔

(۳) خلافت کانفرنس کلکتہ کے تمام ریزولیشن اور مولانا عبدالباری کی اس تقریر کی جو ممدوح نے اس موقع پر کی تصدیق وتائید کی جائے۔

(۴) مولانا عبدالباری کا فتویٰ شائع کر دیا جائے۔ خلافت کے فیصلہ پر اس پر عملدرآمد کیا جائے۔

(۵) حکیم اجمل خان کو سرکاری خطاب واعزاز کی واپسی پر مبارک باد دی جائے اور انہیں

قومی خطاب مسیح الملک ورئیس الحکماء کا بطور نشان قدردانی عطا کیا جائے۔

(۶) یہ جلسہ تمام خطاب یافتگان علماء پر زور دیتا ہے کہ اپنے خطابات واپس کر دیں۔

(۷) علماء جان و مال، تقریر و تحریر سے مسئلہ خلافت کی تائید کرنے کا حلف اپنے مریدوں اور تمام مسلمانوں سے لیں۔

(۸) سپاہ کی بھرتی روکی جائے۔

(۹) مسلمان آئینی اصلاحات کے ماتحت ہونے والے انتخاب سے اپنے کو الگ رکھیں۔

(۱۰) صلح کانفرنس میں مسئلہ خلافت احکام شرع اسلام کے مخالف فیصل ہونے کا دن برطانوی حکومت سے کام آزادی کا بھی دن ہو۔

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۱۴۶)

نظام حیدرآباد اور تحریک خلافت:

۷/اپریل ۱۹۲۰ء: اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی حضور نظام مدظلہٗ العالی نے اپنے دستخط سے ایک فرمان جاری کیا جس میں تمہیدی الفاظ کے بعد حسب ذیل حکم تھا:

''میں اپنی عزیز رعایا کو محفوظ رکھنے کی غرض سے حکم دیتا ہوں کہ مسئلہ خلافت کے تعلق سے جو جلسے منعقد ہوں ان کے منتظمین پر شرائط ذیل کی پابندی عائد کی جائے۔

(۱) ایسے جلسوں میں جو تحریکات پیش کرنی مقصود ہوں قبل از ان کے نقول بغرض صدور حکم سرکار گزارے جائیں۔

(۲) جلسہ کے مقام اور تاریخ کی اطلاع کم از کم ایک ہفتہ قبل ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کو (جیسی کہ صورت ہو) بذریعہ تحریر دی جائے۔

(۳) ہر جلسہ کی صحیح روئداد بلاتعویق ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کے پاس (جیسی کہ صورت ہو) بغرض اطلاع سرکار کو بھیج دی جائے۔

(۴) ان ہدایات کی خلاف ورزی سخت بازپرس کے قابل ہوگی۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی'' کے حکم پر گردن جھکانے کے دن گزر چکے تھے چناں چہ حکم عدولی ہوئی۔ گرفتاریاں اور نظر بندیاں ہوئیں لیکن قافلہ رواں دواں رہا۔

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۱۴۷)

ٹیگور کا خط وائسرائے کے نام...... خطاب واپس کر دیا:

فوراً بعد سارے ہندوستان کے مرد عورتوں میں جو ردِ عمل ہوا وہ دیش کی ایکتا کا مظہر تھا۔ اس جذبے کا مظہر وہ خط بھی تھا جو گورودیو رابندر ناتھ ٹیگور نے وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ کو لکھا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

''چند مقامی ہنگاموں کو فرد کرنے کے لیے حکومت پنجاب نے جتنے بڑے پیمانے پر اقدامات کیے اس سے ہمیں بڑا دھکا لگا اور ہمارے ذہن میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ہندوستان میں برطانوی رعایا کی حیثیت سے ہم کتنے بے بس ہیں ان بدقسمت لوگوں کو جس سختی اور شدت کے ساتھ سزا دی گئی ہے اور جس طریقے سے دی گئی ہے ہم سبھوں کو یقین ہے کہ مہذب حکومتوں میں اس کی کوئی مثال نہیں ملے گی۔ یہ سلوک ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو بالکل نہتے تھے۔ اور اپنی مدافعت کسی طرح نہیں کر سکتے تھے اور اس طاقت نے اس کا استعمال کیا جو ان کی زندگیوں کو تباہ کرنے کے بڑے خطرناک ہتھیاروں سے لیس تھی۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ہم بڑی سختی کے ساتھ مدعی ہیں کہ اس کا کوئی سیاسی جواز نہیں تھا۔ اخلاقی جواز کی بات تو الگ رہی، پنجاب میں ہمارے بھائیوں کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اور اُن کی جو تحقیر کی گئی ہے اس کی کہانیاں زباں بندی کے باوجود ہندوستان کے ہر کونے میں پہنچ گئی ہیں اور اس کی وجہ سے غم و غصہ کی لہریں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئی ہیں اسے ہمارے حاکموں نے نظرانداز کر دیا ہے۔ غالباً انھوں نے جو سبق سکھایا ہے اس کے لیے خود کو شاباشی دے رہے ہیں...... اس سلسلے میں میں اپنے ملک کے لیے کم سے کم یہ کر سکتا ہوں کہ ان لاکھوں ہم وطنوں کی طرف سے جن کی خوف و دہشت کی وجہ سے زبانیں بند ہیں پُر زور احتجاج کروں اور اس کے نتائج و عواقب برداشت کرنے کو تیار رہوں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے جب اعزازات و امتیازات کے تمغے ہمارے لیے باعث شرم بن گئے ہیں۔ میں تمام اعزازات و امتیازات کو خیر باد کہہ کر اپنے اُن ہم وطنوں کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ جو اپنی نام نہاد کمتری کی وجہ سے ایسے ذلت آمیز سلوک کے قابل سمجھے گئے ہیں جو کسی بھی انسان کے لیے مناسب نہیں ہے ان وجوہ ہی کی بنا پر میں جناب والا سے بڑے دُکھ کے ساتھ یہ گزارش کرتا ہوں کہ مجھے شہنشاہ انگلستان نے ''سر'' کا جو خطاب دیا تھا اور جسے میں نے آپ کے پیش رو کے ہاتھوں قبول کیا تھا، وہ واپس لے لیا جائے۔''

۱۳؍اپریل، جلیانوالہ باغ کا یادگار دن:

جلیانوالہ باغ ہندوستان کی ایک متبرک زیارت گاہ بنتا گیا۔ امرتسر کانگریس کے موقع پر ہزار افراد نے ان شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا جنھوں نے مادرِ وطن پر اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ کانگریس نے اس جگہ کو ایک قومی یادگار بنانے کے خیال سے خریدنا چاہا تو ملک کے ہر حصے سے اس کام کے لیے چندہ وصول ہوا ہر سال ۱۳؍اپریل کو جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کی یاد تازہ کی جاتی رہی اور کی جاتی رہے گی۔

تاریخ آزادی کا ایک یادگار دن:

اس خوں ریز واقعے کے بعد سے ہی دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے اور انسان کے خلاف خود انسان کے مظالم کا کفارہ ادا کرنے آنے لگے تھے۔ جلیان والہ باغ کی یاد ابھی تازہ و تابندہ ہے اور اس کی تابندگی میں اس خیال سے مزید اضافہ ہوتا ہے کہ اس بربریت کی مذمت کرنے والوں میں خود انگریز بھی شامل ہیں جنھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے جلیانوالہ باغ میں رکھی ہوئی وزیٹرس بک میں ایسے کتنے ہی تاثرات درج ہیں۔ مثلاً

''تہذیب کے نام پر اس قتل کے بارے میں جب میں نے سنا تو مجھے اپنے یوروپین ہونے پر شرم محسوس ہونے لگی۔ میں اپنے آپ کو مہذب کہلانے کے مقابلے میں غیر مہذب کہلانے میں زیادہ فخر محسوس کروں گا۔

ایل۔ کیریاری

ہالینڈ۔ ۱۹۲۵ء۔۳۔۸

''ظلم شقاوت کے اس مظاہرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر میرا دل شرم سے بھر گیا۔ میرے لاکھوں ہم وطنوں کے لیے لفظ ''امرتسر'' کا صرف ایک ہی مطلب ہے، شرم و ندامت ۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء کا واقعہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ سامراجیت ایک برائی ہے جو حکمراں طبقے کو گھٹیا بنانے کے ساتھ ساتھ محکوموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھاتی ہے جو جسمانی اذیتیں یہاں برداشت کی گئی ہیں، وہ بڑی بھیانک ہیں۔ مگر اس واقعے سے جو ذہنی اور روحانی کرب ہوا ہوگا وہ اس سے بھی بدتر ہوگا۔
یہاں ایک گھنٹہ گزارنا گویا کفارہ ادا کرنا ہے۔

میوریل لسٹر۔ کنگسلے ہال

بو، لندن۔۱۹۳۲ء۔۱۔۲۱

"جو کچھ ہمارے نام پر کیا گیا ہے ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔آپ کی فراخدلی ہمارے لیے تحریک کا سرچشمہ ہے آپ نے پھول چڑھا کر ہمارے گناہوں کو چھپانے کی جو کوشش کی ہے اس کے لیے ہم شکر گذار ہیں۔

ڈورتھی یوگ

۲۴ جنوری ۱۹۲۹ء

"اس جگہ آکر میرے دل میں اپنی نسل کے لیے بڑی شرم اور ندامت محسوس ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سڑکوں پر چلنے والا ہر ہندوستانی مجھے دیکھ کر اپنے دل میں "قاتلوں کی نسل کا ایک فرد" کہتا ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ یہ ہولناک قربانی سامراجیت جیسی نفرت انگیز شے کو جلد ختم کرانے میں معاون ہوگی۔

ڈونلڈ جی کننگھم

انگلینڈ، ۳۸۔۱۱۔۲۲

مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام!

یہی سرزمین ہے جہاں موت کے سکون نے ہماری قومی جدوجہد کا ہنگامہ بیدار کیا تھا۔ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں کا خون ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں بہا اور اسی وقت کے خون سے ہم نے اپنے لیے زندگی کا خون بہم پہنچایا۔ بیس سال گزر گئے، ہر سال ہم ۱۳ اپریل کو اس کی یاد میں جمع ہوتے ہیں اور آج بھی اسی تاریخ نے ہمیں یہاں جمع کر دیا ہے۔ میں آج اس سرزمین پر اسی مہینے اور اسی تاریخ میں ہر ہندو، مسلمان اور سکھ سے درخواست کروں گا کہ وہ اس واقعے کی یاد کو اپنے دل کے ایک ایک ریشے کے اندر تازہ کرلے اور پھر اپنے اعتقاد اور عمل کا احتساب کر کے دیکھے کہ اسی واقعے نے زندگی اور حرکت کا جو پیغام ہمیں دیا تھا وہ ہمارے دل و دماغ پر ثبت ہے۔ یا محو ہو چکا ہے۔

ابوالکلام آزاد

۱۳ اپریل

ورکرز کانفرنس دہلی:

۱۸/اپریل ۱۹۲۰ء: ۱۸/اپریل ۱۹۲۰ء کو ۱۱ بجے دن کے وقت ورکرز کانفرنس رائل تھیٹر دلی میں زیر صدارت مولانا حسرت موہانی منعقد ہوئی جس میں مولانا احمد سعید نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ خلافت کمیٹی نہ مسلمانوں سے ہجرت کو کہتی ہے نہ جہاد کو! وہ چاہتی ہے کہ گورنمنٹ کے ساتھ عدم اشتراک عمل کے اصول کام میں لائے جائیں اور سودیشی تحریک کی ترقی کی کوشش کی جائے۔

صدر صاحب نے فرمایا کہ اس کانفرنس کا مقصد کسی نئی پالیسی کا ایجاد کرنا نہیں ہے بلکہ جو تجاویز خلافت کانفرنس یا جمعیت علماء ہند پاس کریں ان کو عمل میں لانا ہے۔ ہندوستان کے تمام لیڈر اور خلافت کانفرنس سودیشی اور عدم اشتراک عمل کی تجاویز پاس کر چکے ہیں۔ ان کو عملی جامہ پہنانا اس کانفرنس کا فرض اولین ہے۔ (تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۴۵_۱۴۴)

ٹھوس کام کیجیے...... مولانا فرنگی محلی کی نصیحت:

۲۲/اپریل ۱۹۲۰ء: ۲۲/اپریل ۱۹۲۰ء کو فیض آباد میں اودھ کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان ہوا اور مختلف جگہوں پر جلسے منعقد ہوئے لیکن رہنمایان قوم نے اب ٹھوس کام کرنے کا فیصلہ کر لیا چناں چہ اپریل ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں مولانا عبدالباری کا حسب ذیل خط ہمدم لکھنؤ میں شائع ہوا۔

"خلافت کانفرنسیں بقدر ضرورت ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں جہاں مسلمان ضرورت سمجھا کریں لیکن بلا ضرورت محض دیکھا دیکھی ایسے کانفرنسوں کے انعقاد کی اب ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میری رائے یہ ہے کہ مسلمان اس سلسلہ کو موقوف کریں۔ خصوصاً بغیر اجازت سنٹرل کمیٹی بمبئی کے انعقاد کسی کانفرنس کا خلافت کے متعلق ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اور شرکت اس قسم کے جلسہ کی اصولاً لازم نہیں ہے۔ وقت کام کرنے کا ہے۔ دوسروں پر اپنا بار نہ ڈالیے۔ اگر ملک کے کسی حصہ میں ضرورت انعقاد کانفرنس کی ہو تو مقامی حضرات اس میں شرکت فرمائیں ایک دو مقرر و علما باہر سے بھی بلا لیے جائیں مگر تمام مشاہیر کی دعوت بلا ضرورت قابل ترک ہے۔ میں نے اپنے متعلق فیصلہ کر لیا ہے کہ سوائے اس صورت کے میری شرکت سے معتدبہ فائدہ مقصود ہو۔ محض نمائش کے لیے بار بار و رعایت جلسوں کی شرکت سے انکار کردوں گا...... مجھ سے میرے احباب خواہش کرتے ہیں کہ میں سربرآوردہ حضرات کو ان کی مرضی کے موافق تکلیف دوں اب تک اس خدمت کو انجام

دیا۔اب اس قدر زاید یہ خدمت لی جانے لگی ہے کہ اس کے انجام دینے سے قاصر ہوں۔
(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۱۴۴)

تحریک نظم جماعت:

۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء: مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریک نظم جماعت کی ایک تحریک شروع کی ہے اس کے لیے وہ مسلمانوں سے بیعت لیتے ہیں۔مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو انھوں نے اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے ان کا مستقر لکھنو اور دائرۂ کار یوپی ہے۔خلافت نامہ اور بیعت کا مسودہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

اخویم مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشادِ سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون ومجاز ہیں جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے انھوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔والعاقبۃ للمتقین!

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ۔۴ر شعبان ۱۳۳۸ھ

ملیح آبادی پھر لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے الفاظ بیعت کا مسودہ بھی لکھ دیا وہ نیچے نقل کرتا ہوں

"امنت باللہ و بماجاء من عنداللہ وامنت برسول اللہ و بما جاء من عند رسول اللہ واسلمت واقول ان صلوتی و نسکی و محیایٰ و مماتی للہ ربّ العالمین. لاشریک لہ و بذالک امرت و انا اوّل المسلمین.

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد ﷺ سے بواسطہ خلفاء ونائبین کے اس بات پر کہ:۔

۱۔اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد و عمل پر قائم رہوں گا اگر استطاعت پائی۔

۲۔پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا اگر استطاعت پائی۔

۳۔ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا، برائی کو روکوں گا، صبر کی وصیت کروں گا۔

۴۔میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں، دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵۔اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے اپنے مال سے، اپنے اہل وعیال سے دنیا کی ہر نعمت اور ہر لذت سے زیادہ اللہ کو اس کے رسول کو اس کی شریعت کو اس کی امت کو محبوب رکھوں گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے

مطابق دیا جائے گا۔ السمع والطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۲۹۔۱۲۸)

خلافت کمیٹی کی ایک میٹنگ:

۱۲ رمئی ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی کی ایک میٹنگ بمبئی میں ہوئی جس میں جہاد کرنے یا ہجرت کر جانے یا ترک موالات کی حکمت عملی اختیار کرنے کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس میٹنگ میں ایک ذیلی مجلس کا قیام عمل میں آیا جس کے ممبران میں سیٹھ محمد جان محمد چھونانی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، احمد حاجی صدیق کھتری اور محمد علی آف دھاریر (DHARAIR) شامل تھے۔ اس سب کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ وہ ترک موالات کی حکمت عملی کے آغاز کے بارے میں اسکیم تیار کرے۔

انہی دنوں میں کالندھار (KALANDHAR) میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ تجویز پاس کی گئی کہ حکومت سے انقطاع کے بارے میں ایک فتویٰ مرتب کیا جائے۔ (بام فورڈ، ص ۱۵۲)

اسیرانِ مالٹا کی واپسی:

۱۲ رمئی ۱۹۲۰ء: جب ۱۲ رمئی ۱۹۲۰ء کو حضرات شیوخ سویز سے عدن روانہ کیے گئے تو ۱۲ رمضان کو عدن پہنچ کر جہاز نے وقفہ کیا، تب مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تار حضرت حکیم محمد حسن کو دیو بند، دوسرا تار ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو دہلی، تیسرا تار حکیم (مولانا معین الدین) اجمیری کو بمبئی روانہ کیا۔

تار کا مضمون تھا "ہم لوگ ۸ رجون تک بمبئی پہنچ رہے ہیں"۔ (نقش حیات، ص ۲۳۹)

۲۲ رمئی ۱۹۲۰ء: ۷ را پریل کو نظام حیدر آباد نے جو فرمان جاری کیا تھا جس کے ذریعے ریاست کے باشندوں کو مسئلہ خلافت کے سلسلے میں اجتماعات اور جلسوں میں شریک ہونے پر پابندی لگادی گئی تھی اور جلسوں اور جلوسوں کے لیے قبل از وقت انتظامیہ سے منظوری حاصل کرنے کی شرط عائد کردی گئی تھی نیز خلاف ورزی کی صورت میں سخت باز پرس کی وعید سنائی گئی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے ان احکام کی مطلق پروانہ کی۔ اس لیے اب ۲۲ رمئی کے فرمان کے ذریعے خلافت تحریک کو ریاست میں خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ اور تحریک کے لیے رضا کار بھرتی کرنا

قابل تعزیر جرم بن گیا ہے۔ نظام کے نزدیک یہ تحریک مسلمانوں کے مفاد کے منافی ہے۔
(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست از محمد فاروق قریشی، ص، ۹۹، ۱۰۰)

۳۰ رمئی و یکم جون ۱۹۲۰ء: آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ بنارس میں ہوا، لوکمانیہ تلک اسی دن بنارس سے گزرے لیکن کسی وجہ سے انھوں نے جلسہ میں شرکت نہیں کی۔ اس جلسہ میں یہ طے ہوا کہ معاہدہ سیورے میں ترمیم کا مطالبہ کیا جائے۔ اسی دن خلافت کمیٹی کا بھی جلسہ ہوا۔ خلافت کمیٹی نے ایک سب کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لیے بنائی کہ آئندہ کیا قدم اٹھایا جائے؟ اس کمیٹی کے ممبران مہاتما گاندھی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ اس کمیٹی نے اتفاق رائے سے طے کیا کہ کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے صلح کانفرنس کے فیصلے کا انتظار کر لیا جائے۔

مہاتما گاندھی نے اس دوران ایک ہندو مسلم کانفرنس یکم جون ۱۹۲۰ء کو بلائی۔ یہ جلسہ بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ تقریباً تین سو ڈیلی گیٹ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے اور مجمع قریب بیس ہزار تھا اس جلسہ میں مسز بسنت، پنڈت مدن موہن مالویہ، سرتیج بہادر سپرد، پنڈت موتی لال نہرو مسٹر چنتامنی ایڈیٹر لیڈر وغیرہ بھی تھے۔ سرتیج بہادر نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ تحریک ترک موالات یا ستیہ گرہ میں حصہ نہ لیں۔ مگر رائے عامہ بالکل اس کے خلاف تھی، چوں کہ معتدلین بھی اس جلسہ میں موجود تھے کسی انتہا پسندانہ تحریک کا پاس ہونا تو مشکل ہی تھا البتہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر زوردار تقریریں ہوئیں۔

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص، ۱۵۵)

معاہدہ سیورے (ترکی کے ساتھ شرائط صلح):

مئی ۱۹۲۰ء: آخر کار مستقل صلح مختصر قتل ترکی بن کر بھی آگیا اور دول متحدہ نے مئی ۱۹۲۰ء میں ترکی کے ساتھ صلح کے شرائط مشتہر کر دیے جو معاہدہ سیورے کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کی حسب ذیل شرطیں تھیں:

(۱) درہ دانیال اور تمام دیگر درے بین الاقوامی کنٹرول کے حوالے کر دیئے گئے۔

(۲) سلطان بحیثیت سردار مسلمانان درّہ دانیال کے پھاٹک (GOLDEN HORN) پر سمندر کے کنارے انگریزوں کی آنکھ کے نیچے رہے گا۔

(۳) جنوبی اناطولیہ کلیلیا اور اس کا دارالسلطنت ادرنہ فرانس کو ملے گا۔

(۴) اٹلی کو اڈیسہ کی ریاست دی گئی۔
(۵) سمرنا یونان کے حوالے ہوا۔
(۶) سمندر کے ہر راستوں سے منقطع ہو کر ترکی کو وسطی اناطولیہ دیا گیا۔
(۷) عرب صوبے انگلستان اور فرانس کی حکم برداری میں دیے گئے۔
(۸) آرمینیا کے لیے جدید ری پبلک وجود میں لائی گئی جو شرقی صوبوں پر بحر اسود کے کنارے واقع ہوگی۔
(۹) ۲ رنومبر ۱۹۱۷ء کو یہودیوں کی انجمن سے فلسطین میں وطن دینے کا جو وعدہ انگریزوں نے کیا تھا اس کے مطابق طے ہوا کہ یہودیوں کو فلسطین میں وطن دیا جائے (مسلمانوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا اسے قطعی فراموش کر دیا گیا)۔
(۱۰) ترکی کی سرحد اسی طرح رہے گی جس طرح کہ اس وقت حد بندی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ کمیشن جو حد بندی کے لیے مقرر کیا جانے والا ہے وہ حسب ضرورت اس میں ترمیم کر سکتا ہے۔ اس کے مطابق ترکی میں تھریس کا حلقہ، قسطنطنیہ کا علاقہ اور ایشیائے کوچک کے وہ تمام علاقہ جات شامل ہوں گے جن میں ترکی کی آبادی کی اکثریت ہو۔
(۱۱) قسطنطنیہ میں ترکی حقوق و اختیار میں کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر ترکوں نے اس عہد نامہ کے شرائط کو ایمانداری سے پورا نہ کیا تو اتحادیوں کو ان شرائط میں ترمیم کرنے کا اختیار رہے گا۔
(۱۲) ذیل کے سمندری علاقے اسٹریٹ (آبنائے) کے کمیشن کے زیر اقتدار رہیں گے۔ یعنی وہ تمام سمندری علاقے جو بحیرۂ روم کے درہ دانیال کے دہانہ اور بحیرۂ اسود کے باسفورس سے جنوبی علاقہ کے درمیان ہے۔ اور ان حدوں سے ترکی بے تعلق رہے گا۔
اس اعلان صلح نے دنیائے اسلام میں ہلچل مچا دی تھی کہ یورپین مورخ ہیمس پر واہم جن اپنی کتاب ''اتاترک'' میں لکھتا ہے کہ اس کو دیکھ کر سلطان وحید الدین خاں کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔ (تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۵۲-۱۵۱)

مظالم پنجاب پر تحقیقاتی رپورٹ کی اشاعت:

مئی ر۱۹۲۰ء: مظالم پنجاب کی تحقیق اور رپورٹ پیش کرنے کے لیے کانگریس نے نومبر ۱۹۱۹ء میں جو سب کمیٹی مقرر کی تھی، اس کی رپورٹ مئی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوگئی۔ کمیٹی نے ایک ہزار

سات سو واقعات کی تحقیق کے لیے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کی تھیں اور حالات جمع کیے تھے۔ ان میں چھ سو پچاس بیانات کو رپورٹ میں شامل کیا گیا۔ رپورٹ پر گاندھی جی کے علاوہ سی آر داس، عباس طیب جی اور جیاکار کے دستخط ہیں۔

(سکسٹی ائیرس آف کانگریس: ص ۲۴۵)

اسیرانِ مالٹا بمبئی پہنچ گئے:

۸ر جون ۱۹۲۰ء: اسیران مالٹا مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ساتھی دوپہر کو وارد روس البلاد بمبئی ہوئے۔ گودی پر ہزاروں مسلم اور غیر مسلم عقیدت مندوں نے شیوخ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا گونج اٹھی، یہ حضرات کچھ دور جلوس کے ساتھ چل کر بہ ذریعۂ کار دفتر خلافت آئے۔ دوسرے روز مسجد کھتری کے جلسہ عام میں اہالیان بمبئی نے نذرانہ خلوص پیش کیا۔

قیام بمبئی میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور گاندھی جی نے بھی ملاقات کی۔ ازاں بعد ۱۲ر جون کو حضرات شیوخ بمبئی سے روانہ ہو کر ۱۳ر جون کو دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مہمان ہوئے۔ (مولانا آزاد...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۱۸)

گورنمنٹ کو الٹی میٹم:

۹ر جون ۱۹۲۰ء: الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا کہ وائسرائے کو ایک ماہ کا نوٹس دیا جائے کہ وہ خلافت کے مسئلہ کو جو ایک مذہبی مسئلہ ہے طے کرا دیں۔ ورنہ ترک موالات پر ہم لوگ مجبور ہوں گے۔ یہ انتباہ ستیہ گرہ کے اصول کے بالکل مطابق تھا کھلم کھلا کام کرنا، سچائی پر اڑنا، مخالف کو موقع دینا اور اطلاع دے کر سول نافرمانی کرنا اس کے بنیادی اصول تھے۔ ممکن ہے کہ لوگ اس وقت نہ سمجھے ہوں لیکن گاندھی جی عزم راسخ کر چکے تھے۔ اس کے بعد ہی خلافت کمیٹی کا ایک وفد مرتب کیا گیا جو حسب ذیل اشخاص پر مشتمل تھا۔

(۱) مظہر الحق

(۲) یعقوب حسن

(۳) مولانا شوکت علی

(۴) مولانا ابوالکلام آزاد

اور وائسرائے ہند سے آخر جون ۱۹۲۰ء میں ملا اور اس نے وائسرائے سے کہا کہ خلافت کا مسئلہ ہم مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی مسئلہ ہے اس لیے آپ ہوم گورنمنٹ پر دباؤ ڈالیں کہ وہ معاہدۂ صلح ترکی میں مناسب ترمیمات ہمارے مطالبات کے مطابق کر دے ورنہ ہم مجبور ہوں گے کہ یکم اگست ۱۹۲۰ سے ترک موالات کی تحریک جاری کر دیں۔

یہ تھا پہلا الٹی میٹم جو حکومت عالیہ برطانیہ کی ''وفادار رعایا'' نے اوّل بار اپنے آقاؤں کو دیا۔ گویا طوق غلامی اتار پھینکا اور آزاد انسانوں کی حیثیت سے بالمقابل کھڑے ہو کر چیلنج دے دیا۔ اب صرف طبل جنگ بجنے کی دیر تھی۔ (تحریک خلافت، ص ۱۵۶)

جون ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی نے ''ینگ انڈیا'' میں لکھا تھا ''کوئی ملک قربانی کی آگ میں جلے بغیر اُوپر نہیں اُٹھا ہے۔ انگلستان اور فرانس کی تاریخیں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں، جس میں لوگ بے انتہا دُکھ اور تکالیف جھیلنے کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹے رہے ہیں۔ ہم یہ کیوں سوچیں کہ ہماری تاریخ اس سے مختلف ہوگی۔ امرتسر میں جو دہشت انگیز واقعہ ہوا ہے۔ اس نے لاہور میں ہونے والی دہشت انگیزی کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹا دی ہے۔ جہاں لوگوں کو بُزدل اور ڈرپوک بنانے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم بُلند ہوں اور اُوپر اٹھیں ہمیں ایسے مراحل سے کئی بار گزرنا ہوگا تاکہ ہم دکھ اور مصیبت کو خوشی خوشی جھیلنا سیکھ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ لاہور والے اس اہانت آمیز سلوک کے سزاوار کبھی نہ تھے جو اُن کے ساتھ کیا گیا۔ ایک جابر حکمراں لوگوں کو جو اُس کی غلامی کے جوے سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے، کچلنے کے درپے تھا اگر مجھے کہا جائے کہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ میں نے ستیہ گرہ کا پرچار کیا ہے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ میں اس سے زیادہ شد و مد کے ساتھ اُس وقت تک ستیہ گرہ کا پرچار کرتا رہوں گا جب تک کہ میں زندہ ہوں اور میں لوگوں سے کہوں گا کہ وہ اوڈائر کی رعونت کا جواب اپنے مالوں کی جبری فروخت کی دھمکی اور ڈر میں آ کر اپنی دکانیں کھول کر نہ دیں۔ بلکہ ظالم کو زیادہ سے زیادہ ظلم کرنے کا موقع دے کر دیں۔ انھیں وہ اپنا سب کچھ بیچ ڈالنے دیں لیکن اپنی ناقابل تسخیر روحوں کو نہ بکنے دیں۔

۲۲؍ جون ۱۹۲۰ء: مہاتما گاندھی نے بھی وائسرائے ہند سے اپیل کی جس میں لکھا کہ ''میں نے لندن میں انڈین والنٹیر ایمبولیس کور وغیرہ میں محنت و جانفشانی سے بھرتی کرائی اور ہمیشہ برطانیہ کا وفادار رہا۔ میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے

مطابق کرادیجیے۔اب بھی وقت باقی ہے ورنہ مجبوراً میں پہلا شخص ہوں گا۔جوعلم بغاوت بلند کرے گا میری رائے میں مسلمانوں کے لیے موجودہ حالات میں صرف تین راستے باقی ہیں:

(۱) جہاد بالسیف

(۲) ہجرت

(۳) عدم تعاون

مسلمانوں کو میں نے عدم تعاون کا مشورہ دیا ہے۔(تحریک خلافت،ص ۱۵۶)

۱۲؍جولائی ۱۹۲۰ء: ۱۲ جولائی کو پشاور انجمن مہاجرین کے نام سے ہندوستان سے افغانستان ہجرت کرنے والوں کی مدد کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی ہے۔مولانا جان محمد اس کے صدر تھے اور مولانا عبدالصمد، مرزا محمد سلیم خاں ، علی گل خاں، آغا سید مقبول شاہ ،آغا لعل بادشاہ، مولانا عبدالکریم، حکیم قطب شاہ، حکیم عبدالجلیل، مولانا عبدالغفور، عبدالرب اور یوسف علی خاں اس کے دیگر عہدیدار تھے۔اسی طرح مردان میں منی میں اور بنوں میں ''انجمن مہاجرین'' کی تشکیل عمل میں آئی۔مہاجروں کو سہولتیں پہنچانے کے لیے رضا کاروں کے جتھے بھی تیار کیے گئے۔(تحریک ہجرت، ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۲۱۳ (مقالہ) مشہور تحریکات ملی (خصوصی شمارہ مجلہ علم و آگہی)، نیشنل کالج کراچی، ۸۳۔۱۹۸۲ء)

۱۹۲۰ء (نصف الثانی)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدت مدید کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبۂ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی، بلکہ ہندوستانی مارشل لا، رولٹ ایکٹ کے نفاذ جلیانوالہ باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدۂ سیورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔بمبئی میں اُترتے ہی مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی لکھنو سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہندؒ کے استقبال کے لیے تشریف لائے۔نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں باتیں ہوئیں تو آپ نے بھی عدم تشدد (نان وائلنس) کا پروگرام ہندوستان کے آزاد کرانے کے لیے ضروری قرار دیا اور

پھر اسی طریقہ پر خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی۔ دیو بند پہنچ کر چند دنوں قیام فرما کر ضروری سمجھا کہ کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور ہسوہ میں تشریف لے جائیں اور حکیم نصرت حسین مرحوم کی والدہ محترمہ اور ان کے بچے کی تعزیت کریں کیوں کہ حکیم صاحب مرحوم حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مخلص خادم تھے اگر چہ وہ مشن آزادی کے ممبر نہ تھے اور نہ وہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے بلکہ اگلے سال وہ اور سید ہاشم صاحب سوڈان اور مکہ ہوتے ہوئے آئے تھے جب حضرت شیخ الہند مدینۂ منورہ سے واپس آئے تو اُن سے مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی مگر مکہ معظمہ میں بایں ارادہ ساتھ ہو گئے تھے کہ مدینۂ منورہ ساتھ جائیں گے۔ برطانیہ کی غلط کاری سے ان کو بھی رفقاء میں سے شمار کر دیا گیا اور گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا قاہرہ مصر میں بیان لینے والے انگریز نے خود کہا کہ ان کاغذات (ڈائیری اور سی، آئی، ڈی کی رپورٹوں) میں آپ کا کہیں تذکرہ نہیں پاتا ہوں تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جن کو سی آئی ڈی نے ان کاغذات میں ذکر کیا ہے۔ مجھ کو گرفتار کرنا بالکل دھاندلی ہے (صفحہ ۵٦ سفر نامہ اسیر مالٹا) میں ان کے جوابات کی تفصیل درج ہے) مگر اندھیر نگری چوپٹ راج میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ ہمارے ہی ساتھ مالٹا میں نہایت اطمینان اور استقلال سے رہے اور پھر بیمار ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند کو ان کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا تھا ان کی ضعیف العمر والدہ اور دیگر متعلقین سے حضرت کو بہت زیادہ ہمدردی تھی۔ اس لیے یہ سفر ضروری خیال کیا گیا الٰہ آباد والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے وہاں اترنے کا اصرار کیا، وہاں اچھا خاصا اجتماع قاری عبد الرحمٰن صاحب مرحوم کے مدرسہ میں ہو گیا تو حضرت نے مولانا شبیر احمد (عثمانی) کو تقریر کے لیے فرمایا اس تقریر میں خلافت کمیٹی کی حمایت اور تائید پر زور طریقہ پر کی گئی تھی پھر غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ کو تشریف لے جانا ہوا۔ لکھنؤ میں فرنگی محل میں مولانا عبد الباری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے حسب ارشاد حضرت شیخ الہند لکھنؤ میں تقریر فرمائی اس کے بعد مراد آباد ہوتے ہوئے واپس ہو گئے۔

شیخ الہند کا خطاب اور قدوم مبارک کی برکات:

حضرت کی تشریف آوری اور خلافت کمیٹی کی شرکت اور تائید اور آزادی ملک کی تڑپ اور اس راستہ میں جانبازی اور استقلال و اخلاص۔ یہ امور ایسے نہ تھے کہ قلوب کو مسخر نہ کریں چناں چہ عام مسلمانوں کے قلوب آپ کی طرف نہایت اخلاص کے ساتھ جھک گئے اور عموماً لوگوں میں انتہائی

محبت اور قبولیت جاگزیں ہوگئی۔ چناں چہ خلافت کمیٹی کے زعماء نے آپ کے لیے "شیخ الہند" کا لقب تجویز کیا جو کہ ہر طرف جماعت میں مقبول ہوگیا اور بہ منزلہ جزءِ اسمی بن گیا اور باوجودیکہ حضرت رحمہ اللہ تقریر کے عادی نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مقبولیت نے خلقت میں ایسی قبولیت پیدا کردی کہ لوگ عموماً آپ پر پروانہ وار فدا ہونے لگے اور تحریک خلافت اور آزادی برقی طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دل اور دماغ پر چھاگئی۔

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری:

حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ اس سفر حجاز سے پہلے گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے۔ سردیوں میں یہ مرض ترقی کر جاتا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنا اُترنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے بواسیر، کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایات رہتی تھیں مگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اس سفر میں اس طرح شامل حال ہوا کہ تمام زمانۂ اسارت میں یہ تکالیف بہت کم اور تقریباً معدوم ہوگئی تھیں۔ مالٹا نہایت سرد جگہ ہے ہم کو ابتدا میں خیموں میں رکھا گیا تھا۔ سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی ہی تھی، مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجودے کہ لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدا اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے پھر بھی...... آدھی رات کے بعد سردی کی شدت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت رحمتہ اللہ علیہ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اُٹھتے۔ پیشاب وغیرہ سے فارغ ہوکر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور چوں کہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی ایک شب میں کئی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی تاہم بلا تکلف بار بار وضو کرتے تھے۔ اگرچہ بعد میں ہم گرم پانی اور آگ کے مہیا کرنے کا انتظام بھی کر سکے، تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہوسکا تھا تب بھی بلا تکلف حضرت رحمتہ اللہ اپنے اعمال بجالاتے رہے اور اس قدر بیماریوں کی شکایتیں تمام سفر میں نمودار نہیں ہوئیں جو پہلے تھیں البتہ ہندوستان پہنچ جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں شکایات لوٹ آئیں۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا وہ جذبہ آزادی ہند اور انگریزوں کے یہاں سے نکالنے کا نہ صرف قائم رہا بلکہ قوی اور ترقی پذیر ہوگیا۔ ان مصائب مالٹا وغیرہ سے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں پختہ ارادہ کیے ہوئے ہوں کہ اس بیماری سے اچھے ہوتے ہی تمام ہندوستان میں دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل جدوجہد کے لیے آمادہ کروں گا اور یقیناً اگر عمر وفا کرتی تو ضرور وہ ایسا ہی کرتے مگر قدرت کو یہ

منظور نہ تھا گوناگوں امراض ترقی کرتے رہے باوجودے کہ یونانی اور ڈاکٹری معالجوں کی فراوانی تھی اور ہر ایک نہایت فدائیت کا دم بھرتا تھا اور خلوص دل سے کوشاں تھا مگر تقدیر کے سامنے تدبیر کیا کر سکتی ہے۔

میرا ایام بیماری میں غیر حاضر ہونا:

چوں کہ ۱۳۲۶ھ و ۱۳۲۷ھ و ۱۳۲۸ھ مدینۂ منورہ سے ہندوستان بحکم والد صاحب مرحوم بوجہ وفات اہلیہ اولیٰ برائے عقد ثانی آیا تھا اور فرصت کو غنیمت جان کر دورۂ حدیث شریف کی پرانی تمنا کو حاصل کر سکا تھا۔ چوں کہ اور رشتہ دار کنبہ والوں نے نکاح کرنے سے بخوف سفر حجاز انکار کر دیا تھا اس لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ زاہد حسن امروہی کی توجہ اور عنایت سے عقد ثانی قصبہ بچھراؤں ضلع مراد آباد میں سید حکیم غلام احمد صاحب مرحوم کے یہاں ہو گیا تھا اگرچہ حکیم صاحب نے بشرط واپسی بہ یک سال اہلیہ مرحوم کو مدینۂ منورہ لے جانے کی اجازت دے دی تھی مگر مختلف ایسے موانع پیش آتے رہے کہ مجھ کو دیوبند میں تقریباً تین سال ٹھہرنا پڑ گیا پہلے سال میں بخاری شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس مرتبہ پڑھانے میں خصوصی مراعات فرماتے تھے جو کہ عام طلبہ کو حاصل نہیں ہوتی تھی۔ وجہ یہ بھی تھی کہ اس چھ برس کے عرصۂ قیام مدینۂ منورہ میں یعنی ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک کتب درسیہ اور غیر درسیہ عموماً میں نے نہایت محنت سے پڑھائی تھیں۔ تقریباً چودہ پندرہ اسباق مختلف علوم درسیہ کے روزانہ پڑھاتا تھا۔ طلبہ کا ہجوم تھا۔ اکثر مضامین غامضہ پر حاوی ہو چکا تھا اس لیے مباحث علیہ کی مشکلات زیر نظر ہو گئی تھیں اور ان کی گتھیوں کا سلجھانا، بجز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ بھی استحضار مسائل دیکھ کر نہایت کشادہ پیشانی سے بحث فرماتے تھے اور مشکلات کو بہت توجہ سے حل فرما کر بہت سے ایسے مضامین ذکر فرماتے تھے کہ عام مستفیدین کو ان کے سننے کی نوبت بھی نہیں آ سکتی تھی۔ علاوہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تمام اساتذہ اور ارباب اہتمام انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے اگلے سال مجھ کو معقول تنخواہ پر خدمت تدریس پر مقرر کر دیا اور ارباب شوریٰ سے یہ تجویز پاس کرا دی کہ حسین احمد جب بھی ہندوستان میں آئے بلا تجدید تقرر خدمات تدریسیہ انجام دیا کرے اور کتب درسیہ میں اونچے درجہ کی کتابیں حدیث و فقہ و تفسیر وغیرہ کی پڑھانے کے لیے دی گئیں۔ اسی عرصہ میں جلسۂ دستار بندی بھی منعقد

ہوا اور اس کی خدمات بھی حسب استطاعت انجام دینی پڑیں۔ چوں کہ میں اپنی خواہش سے
حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے اور پھر جدہ سے ہوا تھا تاکہ سفر میں حضرت کی
خدمات انجام دوں اور حتی الوسع تکالیف کو کم کروں اس لیے واپسی پر قصد مصمم تھا کہ بمبئی پہنچ کر
حجاز کو واپس ہو جاؤں گا۔ بمبئی سے حضرت رحمتہ اللہ کے خدام کا بہت بڑا گروہ مل جائے گا۔
میرے خدمت میں حاضر رہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ اور نہ ضرورت ہے مگر اس خیال کو
جب میں نے ایک روز سویز میں ظاہر کیا تو فرمایا کہ میں تراجم ابواب بخاری شریف کی شرح لکھنا
چاہتا ہوں مگر یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا میں سمجھ گیا کیوں کہ ایام اقامت دیوبند میں بھی ۱۳۲۷ھ
میں یہ کام شروع کیا گیا تھا اور حضرت نے میری اس وقت کی خدمات کو پسند فرمایا تھا۔ میں نے
عرض کیا کہ ایک شرط پر میں تا اختتام شرح تراجم دیوبند میں ٹھہرنے اور امور متعلقہ انجام دینے کے
لیے تیار ہوں، تو فرمایا کہ وہ کیا شرط ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جو وقت آپ اس کے لیے عطا
فرمائیں اس وقت میں چاہے کیسا بھی بلند مرتبہ شخص آئے اس کے لیے صرف نہ فرمائیں۔ فرمایا کہ
قبول ہے مگر ہماری بھی ایک شرط ہے میں نے عرض کیا کہ وہ کیا ہے تو فرمایا کہ پھر کہیں گے اس لیے
یہ ارادہ کر لیا تھا کہ دیوبند میں حضرات کی خدمت میں تا اختتام تراجم ابواب رہوں گا۔ مگر جب بمبئی
پہنچا اور تحریک خلافت کا زور وشور دیکھا اور دیکھا کہ حضرت کا طبعی رجحان تحریک آزادی کی جدوجہد
کی طرف قوی تر ہو گیا ہے اور وہی لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں تو یقین ہو گیا کہ کسی
قریبی زمانہ میں تراجم ابواب کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اب
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں مدینہ منورہ چلا جاؤں اور یہاں سے ہی انتظام سفر شروع کر دوں تو
فرمایا کہ تیرا جانا تو اس زمانہ شریفی میں مناسب نہیں، بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں مولوی
سید احمد مرحوم اور محمود احمد کو بھی لکھ دے۔ کہ وہ یہاں ہی آجائیں تو پھر میں نے عرض کیا کہ اچھا تو
اتنی اجازت عطا فرمائیں کہ میں بمبئی میں تین چار دن ٹھہر کر آپ کے بعد دیوبند پہنچوں۔ میرے
چند احباب یہاں ہیں ان سے ملنے کی نوبت نہیں آتی ہے تو اس کی بھی اجازت نہیں دی اور اسی پر
اصرار فرمایا کہ ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ چناں چہ ساتھ ساتھ ہی دیوبند پہنچنا ہوا۔ حافظ زاہد حسن صاحب
امروہوی میرے خصوصی محسن ان سے ہمیشہ سے بہت گہرے تعلقات چلے آتے ہیں۔ وہ بھی بمبئی
تشریف لائے تھے چوں کہ وہ مدرسہ امروہہ جامع مسجد کے مہتمم تھے اور صدر مدرس مدرسہ مذکورہ
حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کسی وجہ سے مدرسہ امروہہ سے برداشتہ خاطر ہو کر مینڈھو یا

چھتاری کے مدرسہ میں چلے گئے تھے اس لیے حافظ صاحب موصوف نے مجھ پر زور دیا کہ وہاں کی ملازمت قبول کر لے۔ بمقتضا ضروریات وقتیہ میں نے اس کو قبول کر کے عرض کیا کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے لیں۔ انھوں نے دیوبند پہنچ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو راضی کر لیا۔ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے دیوبند کے لیے فرمایا کہ اس کی مدرسی یہاں کی پہلے سے منظور شدہ ہے۔ بحث وتمحیص کے بعد وہ بھی راضی ہو گئے چناں چہ میں پورب کے سفر کو (جہاں آباد، الہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنو، مراد آباد) سے واپس ہو کر امروہہ چلا گیا اور کتب تدریسیہ متعلقہ مدرس اول کی تدریس میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حضرت کا حکم محرم (اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں ملا کہ تجھ کو یہاں دیوبند میں میرے پاس رہنا چاہیے اس زمانے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بیماریوں کی شکایت شروع ہو گئی تھیں۔ مہمانوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں دورہ کی تیاری فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشاد اور حکم سے میں امروہہ گیا ہوں اور وہ بھی آپ ہی کا مدرسہ ہے۔ اس کا قائم رکھنا ضروری ہے تو فرمایا کہ مجھ کو تیری یہاں ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں تو خدمات انجام دینے والے بکثرت اور خصوصاً فلاں فلاں حضرات موجود رہتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ تو اپنی نگہداشت بھی نہیں کر سکتے، میری نگہداشت کیا کریں گے۔ اس کو سن کر میں چپ ہو گیا۔ اور عرض کیا کہ میں حسب ارشاد حافظ زاہد حسن صاحب کو لکھتا ہوں۔ چناں چہ حافظ صاحب موصوف کو اطلاع دی۔ وہ فوراً آئے اور عرض ومعروض کے بعد اس پر راضی کر لیا کہ ایک مہینہ کے لیے حسین احمد کو امروہہ کی اجازت دے دی جائے تاکہ اس مدت میں ہم دوسرے مدرس کا انتظام کر لیں۔ حضرت اس پر راضی ہوئے اور میں امروہہ جا کر تدریس میں مشغول ہو گیا۔ میرے جانے پر مرض میں زیادتی ہو گئی۔ کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ حضرت کا تار پہنچا کہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں تو مجھ سے علی گڑھ میں مل۔ (نقش حیات، حصہ دوم، ص ۲۴۹-۵۴)

تحریک ہجرت:

۱۷ر جولائی ۱۹۲۰ء: تحریک خلافت کے دور کی دوسری بڑی تحریک ہندوستان سے افغانستان ہجرت کی تحریک تھی۔ یہ تحریک عزیز ہندی نامی ایک نوجوان کے بعض جذباتی بیانات اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تائید سے شروع ہوئی۔ مولانا آزاد ہجرت کے عمل کو قوموں کی ترقی

اور عروج کے لیے نہایت عظیم الشان عمل قرار دیتے تھے لیکن ہجرت کے عمل کو انھوں نے اجتماعی فیصلے کا پابند اور بیعت ہجرت سے مشروط قرار دیا تھا اور اس کے لیے یو پی، پنجاب اور سندھ میں اپنے خلفا، مقرر کر دیے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے ہندوستان اور افغانستان کے حالات کے کامل مطالعے اور تمام نشیب و فراز پر گہری نظر و بصیرت اور پھر کوئی فیصلہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔۔ دونوں بزرگوں کا خیال تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان ہجرت نہیں کر سکتے۔ البتہ کچھ مسلمانوں کو متعین اور واضح مقاصد کے ساتھ ہجرت کرنی چاہیے تاکہ خلافت اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ملک کے اندر اور باہر کام کیا جا سکے۔ لیکن مسلمانوں میں ہجرت کا ایسا جوش پیدا ہو گیا تھا کہ انھوں نے نہ تو مولانا آزاد کے مشورے کی پروا کی نہ حضرت شیخ الہند کی دعوت فکر و بصیرت پر توجہ کی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ "تحریک ہجرت...... ۱۹۲۰ء میں مسلمانان برعظیم پاک و ہند کی ہجرت افغانستان۔۔۔۔ تاریخ، افکار اور دستاویزات"، کراچی، ۱۹۸۶ء مشتمل بر تحقیقات: ڈاکٹر معین الدین عقیل اور خیالات و تبصرہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری، مرتبہ شاہد حسین خاں۔

تحریک ہجرت وضاحت مزید۔

تحریک ہجرت کے سلسلے میں بعض امور کی وضاحت کے لیے مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمت میں چند خطوط لکھے تھے۔ جس زمانے میں یہ خطوط لکھے گئے تھے مولانا ندوی صاحب شدید علیل تھے۔ اس لیے جواب نہ دے سکے تھے۔ لیکن اگست کے مہینے میں سفر لاہور کے موقع پر جب مولانا سعید الرحمن علوی صاحب کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے علوی صاحب کو اپنا جواب املا کرا دیا تھا جو درج ذیل ہے:

"۱۹۲۰ء میں جب ہجرت کی تحریک کا آغاز ہوا، تو کابل چلو، کابل چلو کی ہر سو صدائیں بلند ہونے لگیں۔ خود میرے گھر میں بھی اس مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے غور ہونے لگا کہ وقت کی اس آواز پر لبیک کہنا چاہیے، میرے والد مرحوم نے بھی پختہ عزم کر لیا کہ اُن دیار کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا جائے جہاں انگریز کی حکمرانی ہے اور ان دیار میں ہجرت کر کے سکونت اختیار کی جائے جو دارالاسلام کے حکم میں ہیں۔ چناں چہ جانے کے لیے گھر کے اثاثے کا جائزہ لیا جانے لگا والد صاحب بالکل پابہ رکاب تھے کہ اتنے میں یہ سننے میں آیا کہ حضرت مولانا ابوالکلام خاص اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کے لیے لاہور آ رہے ہیں۔ والد صاحب نے موقع کو غنیمت جانا اور میری معیت میں لاہور روانہ ہوئے۔

یہاں موچی دروازہ کے باہر ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مولانا نے خطاب فرمایا۔ میں اس وقت بہت کم عمر تھا۔ اس لیے تقریر کے مشمولات کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن اس پون گھنٹے کی اس تقریر سے میں نے یہ ضرور سمجھا کہ پانسہ پلٹ چکا ہے۔ اور اب تک لوگ اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ بعض دینی و شرعی شرائط کو پورا کیے بغیر ہندوستان کی سکونت ترک کر کے کسی اور ملک میں جا بسنا عقل و دین کے تقاضوں کے منافی ہے۔ فضا میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ اور وہ پہلا سا جوش و خروش باقی نہ رہا۔ بلکہ اس مسئلہ نے واقعی ایک تمام تر اعتنا، اور غور و فکر پر مبنی ایک اتفاق کی صورت اختیار کر لی۔

(دستخط) محمد حنیف ندوی

۲/ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ، ۱۰/اگست ۱۹۸۶ء

(تحریک ہجرت...... مرتبہ شاہد حسین خاں، صفحہ ۲۸۔۲۳ل)

تحریک ہجرت ۱۹۲۰ء کی شرعی حیثیت اور اس کے نظام اور ہجرت کے طریق عمل کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک اہم رسالہ "اعلان" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جو یکم ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ (۱۷/جولائی ۱۹۲۰) کو مولانا نے تحریر کیا تھا اور کتابچے کی شکل میں شائع ہونے کے علاوہ ہمدم، لکھنو (مورخہ ۳/اگست) میں شائع ہوا تھا۔ اسی کا کچھ حصہ اخبار "اہل حدیث" امرتسر میں نقل ہوا تھا۔ مکمل رسالے کے لیے دیکھیے "تحریک ہجرت...... مرتبہ شاہد حسین خاں، صفحہ ۲۲۔۱۱۳"

۱۳/اگست ۱۹۲۰ء: تحریک ہجرت کے سلسلے حضرت شیخ الہند کے دو تاریخی خط نہایت اہم ہیں جن سے حضرت کی صائب رائے کا اظہار ہوتا ہے تحریک ہجرت کے سلسلے میں یہی نقطۂ نظر علمائے دیوبند کا تھا۔ اور جمعیت علمائے ہند کی بھی یہی پالیسی تھی۔ ضروری تمہید کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے خطوط یہ ہیں:

"ایک مستفتی نے حضرت شیخ الہندؒ سے مندرجہ ذیل استفسار کیا جس کا جواب حضرت شیخ الہندؒ نے عطا فرمایا۔ سوال و جواب دونوں درج ذیل ہیں؟

سوال: میں سرکاری نوکری سے مستعفی ہو چکا ہوں، اور خلافت کے اس نازک معاملے کو مد نظر رکھتے ہوئے جو اظہر من الشمس ہے۔ برائے خدمت گزاری اسلام ہجرت کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ذاتی معاملات کی صورت یہ ہے کہ والدین اس معاملہ میں از حد مانع ہیں۔ میرے اور بھائی بفضلہ تعالیٰ جوان ہیں۔ والدین صاحب برسر روزگار ہیں۔ اور یہی حالت میری اہلیہ کے والدین کی ہے۔ میری دو لڑکیاں ہیں جن کی عمر تین سال کے اندر اندر ہے۔ چوں کہ میں اپنے آپ کو

یہاں کسی طرح مطمئن نہیں کر سکتا اور ایک عظیم ولولہ دل میں ہجرت کا پیدا ہو چکا ہے۔ اس لیے شرعی فتوے کی ضرورت تھی کہ مندرجہ بالا حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ (ن س از ملتان)

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ کاشف حالات ہوا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ حالات موجودہ میں ہجرت کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں، اور آپ جب اس امر کی اہمیت اور نزاکت کو کما حقہ سمجھ چکے ہیں تو آپ پر اس بارے میں جد وجہد فرض ہے اگر کوئی جاہل وغافل بعد از جہل کا قابل معافی سمجھا جائے تو ممکن ہے مگر جن کو حقیقت الامر منکشف ہو چکی ہے وہ کسی قسم کی معافی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ لہذا بندہ کے نزدیک آپ جیسے باخبر اور قوی الہمت کے لیے اس امر میں ہرگز ہرگز کوتاہی جائز نہیں معلوم ہوتی۔

جس قدر امور اپنے متعلق آپ نے تحریر فرمائے ہیں اس میں قابل لحاظ والدین کی اطاعت اور زوجہ کی معیشت ہے۔ اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ آپ زوجہ اور صغیر اولاد کے گزران کی کافی صورت فرما دیں۔ اور والد کے حصول اجازت میں کوشش بلیغ سے کام لیں۔ اگر والدین کسی طرح رو براہ نہ ہوں تو پھر مناسب ہے کہ آپ ہجرت کا ارادہ نہ فرمائیں بلکہ بطور خدمت گزاری اسلام اور بطور ملازمت ارادہ وہاں جانے کا فرمائیں۔ اور ان کی عدم اجازت کی پروا نہ کریں۔ ہاں ارادہ یہ ضرور رکھیں کہ خدمت ضروری ہے جب فارغ ہوں گا والدین کی خدمت میں چلا آؤں گا، اور آپ وہاں پہنچ کر جس تدبیر اور رائے سے مشورہ متعلقین کر کے اسلام کو نفع پہنچا سکیں، اس میں کوشاں اور ساعی رہیں

بندہ محمود بقلم محمد مبین

۲۸ رذی قعدہ ۳۸ھ (۱۳ راگست ۱۹۲۰ء)

ڈیرہ اسماعیل خاں سے ایک استفسار کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:

مخدوم ومکرم بندہ جناب خلیفہ صاحب مد فیوضکم!

احقر محمود تسلیم مسنون کے بعد عرض رسا ہے، جناب کا والا نامہ ایسے وقت پہنچا کہ بندہ سہارن پور، گنگوہ وغیرہ گیا تھا، وہاں سے کل واپس آیا تو جناب کا گرامی نامہ بندہ کو ملا۔ سب جانتے ہیں کہ ہجرت کی فضیلت اور خوبی ہر وقت مسلمہ ہے کہ اس کے استحباب اور استحسان میں ہر طرف سے

تاکید وجوب محسوس ہوتا ہے جو اہل ہمت کے عمل کرنے کے لیے بالکل کافی ہے، اب اس میں خواہ مخواہ فرضیت اور عدم فرضیت کا مباحثہ اور منازعت کرنا ان ہی لوگوں کا کام ہے جو حیلہ جو طبائع رکھتے ہیں اور ایک حق کو رلانا چاہتے ہیں، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اہل تحقیق کو چند جوانب ملحوظ رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ دارالحرب کہ جس سے ہجرت کریں اس کو غور سے ملاحظہ کرنا۔

۲۔ جس دارالاسلام میں جانا چاہتے ہیں اس کے احوال پر نظر کرنا۔

۳۔ جو ہجرت کریں ان کے حالات کو پیش نظر رکھنا کیوں کہ حالات بے حد مختلف ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ وقت پریشانی کا ہے، اور اہل اسلام کی آزمائش کا ہے۔ پس اہل اسلام اس سے جان نہ چرائیں۔ اللہ کے واسطے ہجرت کریں۔ اس ضروری وقت کو بحث و مباحثہ میں صرف نہ کریں۔

ہجرت ضروری ہے تو ایسی ضروری نہیں کہ نہ والدین کی اجازت کی حاجت ہو اور نہ اہل و عیال کی کفالت، اور جملہ اہل اسلام کو علی الفور ہجرت لازم کر دی جائے اور مستحب ہے تو ایسی مستحب بھی نہیں کہ تمام اہل ہند بے حس و حرکت ہو کر آرام و اطمینان سے اس دارالکفر میں لمبے پیر پسار کر سوتے رہیں بلکہ فرض ہے کہ ہر شخص اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق تائید دین کے لیے مال اور جان سے کوشش کرے، خواہ یہاں رہے یا کہیں باہر جائے۔ لہٰذا موافق اکابر اور عمائد اسلام پر علی الخصوص واجب ہے کہ خود ہمت کریں اور عوام کو ہمت بندھائیں، اور جو شخص جس کام کے لائق ہو اس کو اس کام میں لگائیں بحث و اختلافات جس کا منشا نفسانیت ہے، اس سے بچیں اور دوسروں کو بچائیں اور العلم حجاب الاکبر کے مصداق نہ بنیں۔ احقر نے حالات موجودہ پر نظر کر کے جو مناسب حق سمجھا جناب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ باقی عبارات کتب جن کو ہمارے علما نے اپنے قول کی موید سمجھ کر اپنے استدلالات پیش فرمائے ہیں، ان کا مطلب اہل علم جو سمجھ رہے ہیں اس میں مجھ کو کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ میں نے فقط یہ عرض کیا ہے کہ ہجرت فرض ہے یا مستحب قابل غور یہ ہے کہ ہم کو اس حالت میں کیا کرنا چاہیے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

احقر اس خاص وقت میں ایسی منازعت کو نہایت منحوس اور مضر سمجھتا ہے۔ فقط والسلام

بندہ محمود عفی عنہ

۳؍ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ (۱۸؍ اگست ۱۹۲۰ء)

(شیخ الہند مولانا محمود حسن۔۔۔ایک سیاسی مطالعہ: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری، کراچی۔۱۹۹۴ء، بحوالہ مدینہ، بجنور، ۱۳راکتوبر ۱۹۲۰ء)

۳۰رجولائی ۱۹۲۰ء: مولانا آزاد کا یہ فتویٰ اخبار اہل حدیث امرتسر کی اشاعت مورخہ ۳۰رجولائی کو شائع ہوا تھا۔جیسا کہ اس فتوے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ہجرت کا مطلقاً فتویٰ نہیں دیا تھا، مشروط بہ شرط بیعت تھا، ہر شخص کے لیے نہیں تھا صرف ان کے لیے تھا جو باہر جا کر ملک وقوم کی کوئی خدمت بھی بجا لاسکیں۔لیکن اس جانب ہجرت کرنے والوں نے بہت کم توجہ دی۔ ہر شخص نے اپنے طور پر فیصلہ کیا یا کسی کے زیر اثر نکل کھڑا ہوں۔مولانا آزاد یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہر شخص اپنے طور پر فیصلہ کرے اور کسی نظم اور بیعت کے بغیر ملک چھوڑے۔مولانا غلام (مرحوم) نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ

''یہ فتویٰ ترک موالات کے پروگرام کے نفاذ سے پیشتر دیا گیا تھا جب ترک موالات کا پروگرام منظور ہو گیا اور جمعیت مرکزیہ خلافت و جمعیت علماے ہند کے علاوہ کانگریس نے بھی اسے منظور کر لیا تو پھر بہیں وسیع پیانے پر کام شروع ہو گیا اور باہر جانے کی ضرورت نہ رہی۔''

مولانا آزاد کی ایک اور تحریر 'اعلان'' کے عنوان سے بھی شائع ہوتی تھی۔اس میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس فیصلے پر اظہار خیال کیا ہے۔اہل حدیث اخبار سے ماخوذ مولانا کی تحریر یہ ہے۔

''تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح مہمۂ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد میں پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لیے بجز ہجرت کے اور کوئی چارۂ شرعی نہیں اُن تمام مسلمانوں کے لیے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں، ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں اور جو لوگ یکایک ہجرت نہیں کر سکتے وہ مستعد مہاجرین کی خدمت و اعانت اس طرح انجام دیں گویا وہ خود ہجرت کر رہے ہیں، یعنی اصل عمل جواب شرعاً درپیش ہے، ہجرت ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔ ہندوستان سے ہجرت قبل از جنگ مستحسن تھی، اب یہ استحسان شرائط شرعیہ کے ماتحت وجوب تک پہنچتا ہے۔البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جدوجہد اور کلمۂ حق کے اعلان وتذکیر کے لیے ان کا قیام ہندوستان میں بہ مقابلۂ ہجرت کے زیادہ ضروری ہے یا جو لوگ دیگر عذرات مقبولہ شرعی کی بنا پر ہجرت نہ کر سکیں یا ایک اتنی بڑی وسیع آبادی کی نقل وحرکت میں قدرتی طور پر

جو تاخیر ہونی چاہیے اس کی وجہ سے تاخیر ہو، سو بالاشبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ان کو اپنی تمام تو تیں اتباع شرعی کے لیے وقف کر دینی چاہئیں ایک منظم جماعت کی شرعی ہیئت پیدا کر کے زندگی بسر کرنی چاہیے اور جہاں تک عزم و نیت کا تعلق ہے ہجرت کے ولولہ و تہیہ سے خالی نہیں رہنا چاہیے۔ ہندوستان کی ایک ایسی جماعت کا قائم ہو جانا موجودہ حالات کی بنا پر اصلی کام ہوگا۔

البتہ واضح رہے کہ ہجرت کی جو صورت اس وقت ہندوستان میں درپیش ہے شرعاً اس کی یہ صورت نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص بہ طور خود ارادہ کر لے اور نکل کھڑا ہو۔ ہجرت کے تمام اعمال تنظیم و جماعت کے ساتھ انجام پانے چاہئیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا صاحب جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہیے اور کس شخص کی استعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اندرونی خدمات کے لیے مطلوب و مفید ہے نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات کے ساتھ کہ موجب ثمرات و برکات ہو؟ ہر شخص بہ طور خود ان امور کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

جب ایک طالب عمل کو ہجرت کا حکم دے دیا گیا تو اس کے لیے ہجرت کرنا واجب ہو جائے گا۔ اعمال ہجرت کا جو نمونہ اسوۂ حسنۂ نبوت نے ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے۔ بغیر بیعت کے ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔ پس ضروری ہے جو لوگ ہجرت کریں، پہلے ہجرت پر بیعت کر لیں۔

مختلف اسباب کی بنا پر (جن کی تشریح رسالۂ ہجرت میں ملے گی) یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ہندوستان سے بہ یک وقت تمام لوگ ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ شرعاً مطلوب!۔ ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہندوستان میں بھی اسلامی آبادی باقی رہے گی۔ پس جو لوگ ہندوستان میں ہیں، وہ جب تک ہندوستان میں رہیں، شرعاً ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسلام کے فریق محارب سے کسی طرح کا علاقہ محبت و الفت یا اعانت و خدمت کا رکھیں۔ جو شخص رکھے گا، وہ حسب نص قرآنی اسلام کے دشمن میں محسوب ہوگا۔ و من یتولھم منکم فانہ منھم.

"علاقۂ محبت و خدمت، میں نے 'موالات'' کا ترجمہ کیا ہے جو قرآن میں وارد ہے موالات میں وہ تمام باتیں داخل ہیں، جن سے خلافت کمیٹی' نان کوآپریشن'' کے نام سے روک رہی ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ اعلان جنگ ترکی کے وقت سے مسلمانوں کے لیے وہ تمام باتیں از روئے شرعی ممنوع ہو چکی ہیں۔ گذشتہ فروری کے جلسہ دہلی سے لے کر (۱۱ر اپریل) کے جلسۂ خلافت کمیٹی بمبئی تک میں نے نان کوآپریشن کو منظور و مقبول کرانے کی جس قدر کوشش کی حتیٰ کہ وہ منظور کر لیا

گیا، اس کی بنا یہی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اسلامی مطالبات کے عدم منظوری کے بعد بطور ایک نائی عمل کے اس تجویز پر عمل کیا جائے گا، کیوں کہ شرعاً تو یہ دفاع و جہاد ہے۔ نہ کوئی مستقل عمل، زیادہ سے زیادہ یہ کہ دفاع کے مقدمات میں داخل ہے۔ مسلمانوں کو ترک موالات اول روز ہی سے کرنا تھا۔ نہ کیا تو یہ اشد شدید معصیت اور نفاق قطعی۔ اب جب بھی کریں اور جس قدر بھی کریں عین مطلوب و مقصود! چناں چہ دہلی کی سب سے پہلی نان کوآپریشن سب کمیٹی کے بعد ہی میں نے میرٹھ خلافت کانفرنس میں یہ تفصیل واضح کر دیا تھا کہ ہمارا مقصود اس سے کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ کام کیوں اور کس شکل میں انجام دینا چاہیے۔

یہ میری رائے ہے، میری بصیرت ہے، میرا یقین و ایمان ہے، نہ کوئی قیاس، رائے اور پولیٹکل حکمت عملی۔ تمام یورپ اسلامی حکومت سے نکل چکا، بغداد و شام جا چکے، لیکن ایمان باقی ہے۔ اب ہم کو قسطنطنیہ کا بچاؤ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ درپیش ہے اور مقصود بقائے ملک نہیں ہے بلکہ صرف بقائے ایمان۔

اگر قسطنطنیہ و بغداد کو نہیں بچا سکتے تو کم از کم اپنا ایمان تو بچا لے جائیں۔ میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے اور پورے اطمینان و انشراح قلب کے ساتھ اس مسلک پر مستقیم ہوں جس طالب حق کو مجھ پر اعتماد ہو، اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے فَبَشِّرْ عِبَادِ ٥ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُو الْاَلْبَابِ۔ باقی طریق عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عمل دے وہ فوراً مجھے اپنے عزم سے مطلع کریں یا حسب ذیل اصحاب سے مل کر تفصیلی ہدایات حاصل کرلیں۔

۱۔ مولوی عبدالقادر صاحب وکیل، قصور (ضلع لاہور)
۲۔ مولوی محی الدین احمد صاحب بی۔اے، قصور (ضلع لاہور)
۳۔ مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی (امرتسر)
۴۔ مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی (ایڈیٹر البیان لکھنو)

رسالہ ہجرت زیر تحریر ہے عنقریب شائع ہوگا جن حضرات کو دلائل شرعیہ کی نسبت تامل ہو، وہ اس کا انتظار کریں (۱)

(تبرکات آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۲۰۳۔۲۰۶)

(۱) چوں کہ مجلس خلافت، جمعیت علمائے ہند اور کانگریس نے ترک موالات کا پروگرام منظور کر لیا تھا اس لیے حالات کے یک سر بدل جانے سے ہجرت کی ضرورت باقی نہ رہی تھی بایں وجہ حضرت مولانا آزاد نے زیر تحریر رسالہ ہجرت کی تکمیل کر بھی لی ہو تو شائع کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی (ابوسلمان)

۱۹۲۰ء

اپریل اور جولائی ۱۹۲۰ء میں افغانستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے وفود کے درمیان مسوری میں مختلف اجلاس میں ایک معاہدہ طے پایا گیا۔ جس کے مطابق آئندہ افغانستان کے حدود میں ہندوستانی قوم پرست اپنی سیاسی انقلابی سرگرمیوں کو جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ معاہدے میں کہا گیا ہے:

۳۔ برطانوی حکومت توقع رکھتی ہے کہ افغان حکومت بھی اسی طرح سے افغانستان کے حدود کے اندران تمام سرگرمیوں کی روک تھام کی کوشش کرے گی جو ہندوستان کے حدود میں شورش کا باعث بن سکیں۔ خواہ اس میں اس کی اپنی رعایا شامل ہو یا برطانوی جو کہ اب یا مستقبل میں برٹش ڈومینین سے (مستقل یا عارضی) ترکِ وطن کر کے وہاں رہائش کے لیے جائیں، یا ان کا تعلق (ہندوستان یا افغانستان کے علاوہ) دوسری اقوام سے ہو۔ برطانوی حکومت یہ بھی توقع رکھتی ہے کہ افغان حکومت اپنے سرکاری اہل کاروں کو خصوصاً ایسے اقدامات سے روکے گی جو برطانوی حدود کے اندر سرحدی قبائلیوں کو برطانیہ کے خلاف ابھارنے، ورغلانے سے گریز کریں گے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے افغان علاقے سے برطانوی سرحدی علاقے کی طرف ہتھیار گولا بارود اور ایسے افراد کی روک تھام کریں گے جو برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج و بغاوت پھیلانا چاہتے ہیں۔ اور افغان علاقے میں ایسی کارروائیوں کی روک تھام کرے گی جو کہ برطانوی حدود کے اندر چھاپے مارنے کا موجب بنیں۔ اور ایسے لوگوں کو سزا دی جائے جو کہ ایسے چھاپوں کا ارتکاب کریں اور انھیں سرحد کے برطانوی علاقے میں قبائل اور افراد کے معاملات میں سے اور ہر قسم کے سیاسی پروپیگنڈے سے روکا جائے۔"

(اے ہسٹری آف افغانستان از سر پی سائیکس، ضمیمہ جی)

۶ ستمبر ۱۹۲۰ء: ۶ ستمبر ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ علماء کا ایک اجلاس کلکتہ میں زیر صدارت مولانا تاج محمود صاحب سندھی (امروٹی) منعقد ہوا اور ۸ ستمبر ۱۹۲۰ء کو پانچ سو علماء کے دستخط سے ترک موالات کا فتویٰ شائع ہوا یہ فتویٰ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار نے تحریر فرمایا تھا۔ (تحریک خلافت، ص ۱۶۱)

تحریک ہجرت:

۱۹۲۰ء کے شروع میں ہندوستان میں دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث زور شور کے ساتھ شروع ہوگئی۔ اس بحث کا ایک حصہ ہجرت سے متعلق تھا اس میں وقت کے تقریباً تمام علماء نے حصہ لیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حضرت شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے خاص طور پر حصہ لیا۔ امرتسر کے ایک پرجوش نوجوان غلام محمد نے خاص سرگرمی دکھائی۔ ان کے ایک استفسار کے جواب میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ہندوستان سے ہجرت کی اجازت دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ہجرت کے متعلق میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے (قلب یا ایمان) کو مطمئن نہیں کر سکتے، وہ اب اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوں اور اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں، جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین (شرع شریف) کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق پر ممکن ہو۔''

(مجموعۂ رسالہ ہجرت و رسالہ قربانی گاؤ، مرتبہ شیخ شاہد، لکھنو ۱۹۲۰ء)

''تحریک ہجرت'' کے عنوان سے شاہد حسین خاں (کراچی) نے ایک مفید کتاب جس میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کی تحقیقات، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے رسائل کا مجموعہ، مولانا ابوالکلام آزاد کا رسالہ ''اعلان'' (متعلق ہجرت) حضرت شیخ الہند کے افادات (فتاویٰ) دیگر کئی مفید تحریریں اور اسی مسئلے پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کا تبصرہ و خیالات ہیں، ۱۹۸۶ء میں کراچی سے شائع کر دی ہے۔ ''تحریک ہجرت'' ہی کے عنوان سے ایک کتاب راجہ رشید محمود نے لاہور (۱۹۸۶ء) سے شائع کی ہے اور ایک اور کتاب اسی نام سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے (لاہور، ۱۹۹۷ء) شائع ہوئی ہے۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء: یکم اگست کا دن قریب آ رہا ہے۔ خلافت کمیٹی نے تمام ہندوستان کے لوگوں سے زوردار اپیل کی ہے کہ یکم اگست کے دن کو کامیاب بنایا جائے۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی نے تمام ابنائے ملک کو آواز دی اور یکم اگست ۱۹۲۰ء سے ترک موالات شروع کرنے کے لیے پکارا۔ گاندھی جی نے کہا کہ ''جب تک رولیٹ ایکٹ منسوخ اور معاہدۂ سیورے میں ترمیم نہ ہو ہماری مہم جاری رہے گی''۔

”یکم اگست ۱۹۲۰ء زیرو آور“

زیرو آور آرہا ہے۔ تمام ملک میں زبردست تناؤ تھا۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء سے تمام ہندوستان میں عدم تعاون کے عمل سے آغاز جنگ ہونے والا تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگنے والی تھی اور گاندھی پکارنے والا تھا:

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

وفاداری کا اظہار، برطانوی رعایا ہونے کا تخیل، عرضداشتوں، وفود اور کاسہ گدائی کا زمانہ ”نقش و نگار طاق نسیاں“ اور ہندوستان معرکۂ کارزار بننے والا تھا۔ مسلمان ادنیٰ اور اعلیٰ حکومت برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے صف اول کے سپاہی بننے والے تھے۔ یہ وہی مسلمان تھے جو کل تک خاک بوسانِ حکومت میں شمار ہوتے تھے۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کا دن آیا اور بڑے دھوم سے اس کا استقبال ہوا۔ تمام ہندوستان جاگ گیا، حلف لیے گئے، بے شمار جلسے ہوئے، مادر ہند پر جان تک کی قربانی دینے کا عہد کیا گیا۔ خلافت عثمانی پر فدا ہو جانے کا جذبہ عروج پر تھا۔

اس دن کا آغاز خود مہاتما گاندھی نے اپنے امتیازات خصوصی تمغہ جات اور خطابات کی واپسی سے کیا۔ انھوں نے وائسرائے کو لکھا ”میں قیصر ہند گولڈ میڈل جو مجھے افریقہ میں خدمتِ انسانیت کے اعزاز میں عطا کیا گیا تھا اور زولو وار میڈل جو ۱۹۰۶ء میں بحیثیت افسر انچارج انڈین ایمبولینس کور مجھے عطا ہوا تھا اور بوئر وار میڈل جو مجھے بحیثیت سپرنٹنڈنٹ انڈین اسٹریچر بیرر کور ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء میں ملا تھا وہ سب واپس کر رہا ہوں۔ ان تمغات کو میں کیسے استعمال کر سکتا ہوں جب ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی اس ظلم کے نیچے کراہ رہے ہیں جو ان کے مذہبی جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے“۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ”پنجاب میں جبر و استبداد کا جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا وہ ایک مزید وجہ میرے اس طریقۂ عمل کی ہے“۔ گاندھی جی نے اس خط میں بھی حکومت برطانیہ سے اپنی سابقہ وفادارانہ خدمات کا تفصیل سے تذکرہ کرنے کے بعد لکھا کہ ”اب میں وفادار نہیں رہ سکتا“۔

۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کا دن آیا اور صلح نامہ کے مسودہ پر بلا ترمیم دستخط کا مطالبہ ہوا اور ترکوں کی جانب سے توفیق پاشا نے اسی طرح لرزتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے پہلے صلح کا مسودہ لیا تھا۔ صلح نامہ مکمل ہو گیا اور معاہدۂ سیورے میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ دانشورانِ فرنگ کے مضامین خصوصی، ہندوستان کا احتجاج، مصر اور افغانستان کی

مخالفت اور تمام دنیائے اسلام کی آواز سب بے اثر ثابت ہوئی کیا خوب فرمایا شاعر مشرق نے:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

(تحریک خلافت از قاضی عدیل عباسی، ص،۵۸۔۱۵۷)

آزادیٔ وطن کے عظیم رہنما تلک کا انتقال:

یکم اگست ۱۹۲۰ء: یکم اگست کو رات کے بارہ بج کر چالیس منٹ پر ہندوستان کے عظیم سپوت کا انتقال ہوگیا۔ ہندوستان میں ان کی وفات کا عظیم الشان سوگ منایا گیا۔ گاندھی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر کچلو وغیرہ نے بھی ان کے جنازے کے جلوس میں شرکت کی۔ مولانا حسرت موہانی نے ان کی تعزیت میں ایک زبردست نظم لکھی۔ جو جنازے کے جلوس میں الہ آباد میں دریائے گنگا کے کنارے پڑھی۔ جس کا مطلع یہ ہے!

ماتم نہ کیوں بھارت میں بپا، دنیا سے سدھارے آج تلک

بلونت تلک، مہراج تلک، آزادی کے سرتاج تلک

(تحریک خلافت: ص،۶۲۔۱۶۱)

یکم اگست ۱۹۲۰ء: مئی ۱۹۲۰ء میں ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تحقیقاتی کمیٹی کی اس رپورٹ کے اجرا سے پہلے حکومت نے جلدی جلدی ایک قانون پاس کیا تاکہ اس میں ملوث افسروں کا تحفظ کیا جاسکے۔ اس سے گاندھی جی کو بڑا صدمہ پہنچا۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو انھوں نے اپنے مشہور خط میں اپنی جدوجہد شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کردیا۔ ''ایسی حکومت کے لیے میرے دل میں نہ کوئی عزت ہے اور نہ پاس جو اپنی غیر اخلاقی حرکتوں کو چھپانے کے لیے غلط در غلط کام کرتی جارہی ہے۔''

آزادی کی لڑائی چھڑ چکی تھی۔ عدم تعاون کی تحریک نے جلد ہی زور پکڑ لیا گاندھی جی نے لکھا ''اب اس بات میں شبھے کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر مکمل طور پر نہ سہی لیکن بڑے پیمانے پر کونسلوں کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ ملک میں بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔ موتی لال نہرو نے اپنی زبردست پریکٹس کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ یہی بات بذات خود کامیابی کی دلیل ہے۔''

ہندوستان کے مشہور ماہر قانون اور ہنٹر کمیٹی کے ممبر سر چمن لال سٹلواد نے ۱۹۱۹ء کے واقعات کے بارے میں لکھا ہے ''مارشل لا کے زمانے میں کی گئی زیادتیوں کے جو واقعات سامنے آئے

ہیں۔اس نے عوام کو مشتعل کر دیا۔اور مسٹر گاندھی اور کانگریس نے نئے دستور کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔''

''ظاہر ہے کہ اگر یہ واقعات نہ ہوتے تو کانگرس ۱۹۱۹ء کے دستور کو بروئے کار لانے میں شامل ہوتی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ۱۹۱۹ء میں ہندو اور مسلمانوں میں کوئی تفرقہ نہ تھا۔ بہت سے ممتاز مسلمان بشمول مسٹر جناح کانگریس میں شامل تھے اس وقت کانگریس بڑے زور شور سے خلافت تحریک کی حمایت کر رہی تھی۔ ان حالات میں اگر کانگریس نے نئی اصلاحات کے تحت حکومت کے ساتھ شرکت کی ہوتی تو ہندوستان کی سیاسی تاریخ اس وقت کی تاریخ سے قطعی مختلف ہوتی۔''

اگست ۱۹۲۰ء: آخر اگست میں گاندھی جی کی رہنمائی میں گجرات پولیٹکل کانفرنس صرف مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی۔ اس میں عدم تعاون کی مخالفت ہوئی، لیکن عدم تعاون کی قرارداد ۱۸۵۵ آرا کی موافقت اور ۸۲۳ کی مخالفت سے پاس ہو گئی۔ مسلمانوں نے بالاتفاق موافقت میں ووٹ دیے۔ محمد علی جناح نے مخالفت کی اور ووٹ بھی خلاف دیا۔

(تحریک خلافت، ص ۱۶۳)

اگست ۱۹۲۰ء: ہندوستان میں ہجرت افغانستان کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کے تحت ہجرت کرنے والوں کے کچھ اعداد و شمار ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے مقالے میں دیے ہیں۔ اس کے مطابق مئی ۱۹۲۰ء کے آغاز تک ۱۳۳۸ ہندوستانی ہجرت افغانستان کے لیے تیار ہو چکے تھے لیکن جون کے آخر میں ۱۳۲ حضرات نے ہجرت کی تھی۔ سندھ میں اس تحریک کا اثر خاص طور پر تھا۔ ہجرت کمیٹی کے تحت جس کے صدر سید تراب علی شاہ راشدی اور سیکریٹری خان جان محمد جونیجو تھے، کام زیادہ منظم طریقے پر ہو رہا تھا۔ جان محمد جونیجو بہت سرگرم تھے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعے ۷۵۰ مہاجرین کے ایک قافلے کو لے کر جولائی اور لاڑکانہ سے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر عقیل کی تحقیق کے مطابق ۳/ اگست تک ۱۳۰۰۰ افراد ہجرت کر چکے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر یہ تعداد ۲۰،۰۰۰ اور اسی ماہ کے آخر تک مہاجرین کی تعداد ۴۰،۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر عقیل لکھتے ہیں:

''یہ تعداد مکمل نہیں ہے۔ متعدد مہاجرین نے مہاجرین کی انجمنوں کی مدد کے بغیر بھی ہجرت کی اور بہت سے مہاجرین نے کابل میں اپنا نام درج کرانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اس کے علاوہ مہاجرین کی ایک خاص تعداد نے درۂ خیبر کے بجائے دوسرے راستے بھی اختیار کیے۔ یہ

راستے مہمند علاقے کے غلی کنڈی اور گنداب سے ہوکر گزرتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہجرت بدستور جاری رہی اور مہاجرین فی ہفتہ سات سے آٹھ ہزار کی تعداد میں افغانستان میں داخل ہوتے رہے۔" (تحریک ہجرت، ص ۲۱۷ تا ۲۲۱)

اسی مقالے کے صفحہ ۲۲۶ پر حاشیہ نمبر ۱۳۴ میں ڈاکٹر معین الدین عقیل (مقالہ نگار) لکھتے ہیں۔

"مہاجرین کی تعداد کے مختلف اندازے لگائے گئے تھے۔ ان اندازوں کے مطابق اٹھارہ ہزار سے لے کر بیس لاکھ افراد تک نے ہجرت کی۔ پنجاب خلافت کمیٹی نے ایک لاکھ بیس ہزار کا اندازہ لگایا تھا ملک لعل خان کا خیال تھا کہ دو لاکھ ۳۵ ہزار افراد نے ہجرت کی تھی ایک مہاجر کے مطابق ایک وقت میں صرف کابل میں مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جب کہ مزید مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک دوسرے مہاجر نے یہ تعداد تینتیس (۳۳) ہزار بتائی۔ ایک تیسرے مہاجر کا اندازہ تھا کہ یہ تعداد چھتیس (۳۶) ہزار تک تھی۔ حکومت ہند کے اندازہ کے مطابق مہاجرین کی تعداد زیادہ سے زیادہ تیس (۳۰) ہزار تھی۔

۹ر اگست ۱۹۲۰ء: امیر افغانستان سردار (امان اللہ خاں نے ایک فرمان جاری کیا، جس میں کہا گیا کہ صرف ان مہاجرین کو افغانستان میں قبول کیا جائے گا جو اب تک آچکے ہیں مزید مہاجرین کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی (تحریک ہجرت از ڈاکٹر عقیل ص ۲۲۔۲۲۱) افغانستان میں مہاجرین کی آمد نے حکومت افغانستان کے لیے سخت مشکلیں پیدا کر دی تھیں۔ بالآخر ۱۳ر اگست کو اس نے اپنی سرحد مہاجرین کے لیے بند کر دی۔ (ایضاً ص ۲۲۳)

اس کے باوجود کہ ۱۳ر اگست کو سرحد بند کر دی گئی تھی لیکن مہاجرین کے آتے ہوئے سیلاب کو روک دینا افغانستان حکومت کے بس کی بات نہ تھی۔ ہزاروں مہاجر اس کے بعد بھی افغانستان میں داخل ہو گئے۔ اس سلسلے میں نیز تحریک کے انجام کے بارے میں یہی فاضل محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

"ان چالیس ہزار مہاجرین کے علاوہ جن کی تعداد کا اندازہ افغان حکومت نے لگایا تھا۔ تقریباً سات ہزار مہاجرین نے امیر افغانستان کے مذکورہ فرمان کے اجرا کے بعد بھی سرحد عبور کر لی تھی۔ درۂ خیبر کے بجائے دوسرے راستوں سے جانے والے مہاجروں کی صحیح تعداد کا کوئی اندازہ نہیں۔ ستمبر تک بھی مہاجروں کی مختلف ٹولیاں ہندوستانی سرحد عبور کرتی رہیں۔ محتاط اندازے کے

مطابق ساٹھ ہزار سے زائد افراد نے ہجرت کی تھی۔ بہرحال ان مہاجرین میں سے تقریباً ۷۵ فیصد ہندوستان واپس آگئے۔ باقی یا تو وہیں رک گئے اور افغانوں میں مدغم ہو گئے یا روس اور ترکی منتقل ہو گئے ان میں سے ایک خاصی تعداد راستہ ہی میں مختلف امراض اور دیگر وجوہات کے نتیجہ میں جاں بحق بھی ہوئی۔ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں جو افغانستان میں یا روس اور ترکی کے راستوں میں فوت ہوئے۔ جو ہندوستان واپس آئے انہیں بحال ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔

(تحریک ہجرت، ص ۲۶، ۲۲۵)

جولائی اگست ۱۹۲۰ء: ایک اندھے جوش میں جولائی اور اگست میں تقریباً ۱۸ ہزار آدمی ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ ہجرت کا فتویٰ صحیح تھا یا غلط اسے علماء جانیں۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے گہرے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اپنے وطن اور مال واملاک کو چھوڑ کر جلاوطن ہو جانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

(تحریک خلافت، ص ۱۵۷)

کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس:

ستمبر ۱۹۲۰ء: ۴ر سے ۹ر ستمبر ۱۹۲۰ء تک کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ لالہ لاجپت رائے جو ابھی امریکہ سے آئے تھے، اس اجلاس کے صدر مقرر ہوئے۔ یہ جلسہ خصوصیت سے اس لیے منعقد ہوا تھا کہ مسئلہ خلافت پر بحث وگفتگو کی جائے اور کانگریس اپنی رواجی راہ عمل کو ترک کر کے اب راست اقدام اور ترک موالات کے میدان میں قدم رکھے۔ اس اجلاس سے پہلے گاندھی جی اور مولانا شوکت علی نے ہندوستان میں کافی دورے کر کے ملک کو ترک موالات کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس اجلاس کے لیے عوام میں بڑا جوش وخروش تھا۔ اور اس میں شرکت کے لیے تمام اقطاع ہند سے پانچ ہزار ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ اور تقریباً ایک لاکھ سے زائد آدمیوں کا مجمع تھا۔ مولانا شوکت علی نے راستہ میں ٹرین کے اندر ہی گاندھی جی سے ترک موالات کی تجویز کا مسودہ تیار کرا لیا تھا۔ اس تجویز کا منشا یہ تھا کہ حکومت برطانیہ سے ہر قسم کا عدم تعاون کیا جائے۔ بالخصوص

۱) گورنمنٹ کے درباروں اور کل سرکاری جلسوں کا مکمل مقاطعہ کیا جائے۔

۲) بچوں کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے اور ان اسکولوں اور کالجوں سے جو سرکاری امداد

پاتے ہیں باہر نکال لیا جائے اور ان کے لیے آزاد، خود کفیل ادارے قائم کیے جائیں۔

۳) فوج، کلریکل اسٹاف اور مزدور جماعت کے لوگ میسوپوٹامیہ میں جاکر کام کرنے سے قطعی انکار کردیں۔

۴) تمام ممبران کونسلوں سے استعفیٰ دے دیں۔

۵) بدیشی کپڑوں کا مکمل مقاطعہ کیا جائے۔

اس وقت ۷؍ستمبر کو مسلم لیگ کا بھی جلسہ ہوا۔ مسلم لیگ نے بھی ترک تعاون کی تجویز کی تائید کی...... خلافت کانفرنس کا بھی اجلاس زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد انہیں ایام میں منعقد ہوا۔ مولانا آزاد نے اپنے اسی خطبہ صدارت کو خلافت کے مسئلہ پر عوام و خواص کی آگاہی کے لیے ایک مبسوط کتاب کی شکل دے دی۔

کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس میں ترک موالات کی تجویز جوش کے ساتھ منظور ہوئی البتہ کانگریس کے اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح نے تنہا اس کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ بہر کیف کانگریس کے اسپیشل سیشن نے خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے لیے اب ہری جھنڈی دکھلادی ابھی تک اسے مہاتما گاندھی اپنے عظیم انفرادی اثرات اور خلافت کمیٹی کی پشت پناہی سے چلاتے رہے تھے۔ اب مہاتما گاندھی نے اپنا پورا پروگرام قوم کے اندر جھونک دیا۔

حکومت عوام و خواص کے اس جوش و خروش اور ان بے شمار جلسوں، جلوسوں اور گاندھی جی کی مسلمہ قیادت سے گھبرا گئی اور اس نے انتباہ جاری کیا اور کہا کہ لوگ اس میں حصہ لینے سے گریز کریں ورنہ طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ حکومت نے یہ بھی اعلان کیا کہ گاندھی جی کے ساتھ جو رعایت رولیٹ بل کے خلاف احتجاج کے سلسلہ میں روا رکھی گئی تھی وہ اب روا نہ رکھی جائے گی۔ اس کا جواب گاندھی جی نے دیا کہ اپنے پورے پروگرام کی مختلف طریقوں سے اشاعت کرتے ہوئے قوم کو بڑھتے چلنے کی دعوت دی۔

(تحریک خلافت، ص ۶۳۔۱۶۲)

۶؍ستمبر ۱۹۲۰ء: جمعیت علماے ہند کا ایک خصوصی اجلاس ۶؍ستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس میں من جملہ دیگر تجاویز کے ایک تجویز (نمبر ۶) یہ تھی:

''جمعیت علماے ہند کا ایک یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ جمعیت کا آیندہ اجلاس دہلی میں منعقد کیا جائے اور اس کی صدارت کے لیے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ سے درخواست کی

جائے کہ وہ صدارت منظور فرمائیں۔''

۲۱ ستمبر ۱۹۲۰ء: تحریک ترک موالات کے سلسلے میں سرکاری مدارس کے طلبہ میں جو سرگرمی پیدا ہوئی ہے اس نے آزاد قومی مدارس کے قیام کی ضرورت اور اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اساتذہ اور وسائل کی قلت کے مسائل بھی پیدا ہو گئے تھے۔ مولانا آزاد کے ایک خط بنام مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے بعض مسائل اور ضروریات پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

حبی فی اللہ!

السلام علیکم۔ ادھر عرصہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ مولوی عثمان صاحب بھی رانچی کے لیے نہیں آئے۔ بالفعل مدارس کا معاملہ ایک نئی فوری شکل اختیار کر رہا ہے، ترک موالات کے سلسلے میں سرکاری مدارس سے علاحدگی علے الخصوص عربی سرکاری مدارس سے نہایت ضروری ہے۔ بنگال میں اس کا مواد بالکل مہیا ہے۔ لیکن ضرورت نئی تعلیم گاہوں کے انتظام کی ہے۔ بالفعل ارادہ ہے کہ مدرسہ جامع مسجد کلکتہ جلد سے جلد کھول دیا جائے۔ روپے کا انتظام ہو چکا ہے ۲۰۰ دو سو طلبا تیار ہیں۔ صرف ضرورت اساتذہ اور معلمین کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس بارے میں سعی کیجیے اور تمام کاموں پر اس کو مقدم رکھیے۔ بالفعل (۲) جگہوں کے لیے مدرسین کا پورا اسٹاف مطلوب ہے۔ کلکتہ کے لیے اور رانچی کے لیے۔ آٹھ مدرسین یہاں ہوں گے۔ اور اتنے ہی رانچی ہیں۔

عربی ادب کی ابتدائی کتابوں سے لے کر درجۂ تکمیل کے علوم تک کے لیے مدرسین مطلوب ہیں۔ ابتدائی درجوں کے لیے چنداں فکر نہیں۔ لیکن کم از کم دو بہترین مدرس کلکتہ کے لیے اور دو رانچی کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سے دو شخص پرنسپل ہونے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں۔

وقت و ضرورت اور کام کا مقتضا تو یہ تھا کہ علماء ہندوستان کی پوری تاریخ میں کم از کم ایک نمونہ تو ایثار نفسی کا دکھاتے اور اس کام کو ایک عظیم و جلیل خدمت دینی سمجھ کر بلا معاوضہ وقت دینے کے لیے تیار ہو جاتے۔ لیکن اس اُمید کو تو وہم و گمان میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ کاش اتنا ہی ہو جائے کہ مناسب تنخواہیں دی جائیں۔ بڑی مُصیبت تو یہ ہے کہ علماء کی جستجو کی جاتی ہے تو ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔ آپ لکھیے کہ لکھنو میں کتنے آدمی مل سکتے ہیں؟ اور مقامات میں کون کون؟ علماء میں جن لوگوں کو وقت کی خدمات کا ذوق ہو، ان کے لیے بہترین موقع ہے۔ قیام وغیرہ کے تمام انتظامات بہ احسن وجوہ کر دیے جائیں گے تقرر عارضی نہ ہوگا، ان شاء اللہ ہر طرح قابل اطمینان! میں کسی

ایسے معاملے میں تو ہاتھ نہیں ڈالتا جو عارضی ہو۔ ضرورت ہو تو آپ لکھنو سے باہر بھی چلے جائیں اور زبانی گفتگو کر کے انتظام کریں۔ روپیہ کی ضرورت ہو تو تار دے کر مجھ سے منگوالیں۔ دارالعلوم ندوہ سے کچھ لوگ مل سکیں تو کوشش کیجیے۔ ضرورت ہوئی تو عارضی طور پر آپ کو بھی آجانا پڑے گا۔ بالفعل خیال یہ ہے کہ یہاں کے تمام طلبہ میں آمادگی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کو فوراً کام میں لایا جائے۔ بنگال میں نہایت کثرت سے عربی مدارس ہیں اور سب سرکاری ہیں بنگال کے علاوہ اور کہیں عربی تعلیم گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہیں ہے، کم از کم دو ہزار طلبہ مشغول تعلیم ہیں، اتنی بڑی جماعت نے اگر عملاً اقدام کیا، تو تمام ملک پر اس کا بہت بڑا اثر پڑے گا، علاوہ بریں وہ مدت کی تمنائیں بر آئیں گی جو اصلاح تعلیم کے بارے میں آج تک ناکام رہی ہیں۔

ابوالکلام

۳۰ ستمبر ۱۹۲۰ء: کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں سے ترک موالات کی تحریک جو پروان چڑھی تھی اس سلسلے میں اساتذہ کی فراہمی ایک اہم مسئلہ تھا۔ مولانا کی کوشش تھی دیوبند سے حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں سے کچھ حضرات میسر آجائیں۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام مولانا آزاد کے بعض خطوط یادگار ہیں ۳۰ ستمبر کے خط میں لکھتے ہیں:

حبی فی اللہ!

السلام علیکم۔ خط پہنچا۔ مولوی سید علی صاحب کو ضرور آمادہ کیجیے۔ جو رقم وہاں مل رہی ہے، اس سے اس قدر زیادہ کا انتظام ہو جائے گا کہ کلکتہ و لکھنو کے مخارج کا فرق پورا ہو جائے۔

مولوی ناظر حسن چھتاری کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ مولوی انور شاہ صاحب دیوبند سے آنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اگر معقول مشاہرہ ہو۔ پس بہتر ہے کہ آپ فوراً دیوبند چلے جائیں اور مولانا محمود حسن صاحب سے بھی زور ڈالوائیں اور مدرسہ جامع مسجد کلکتہ کی صدارت کے لیے انھیں آمادہ کریں۔ اگر یہ آجائیں تو کلکتہ میں رہیں۔ مولوی سید علی رانچی کے صدر مدرس کر دیے جائیں اگرچہ مولوی سید علی کے مذاق علمی کا حال معلوم نہیں۔ ادب سے تو انھیں ذوق ہے۔

خط میں قیام کی نسبت جو لکھا تھا، اس سے مقصود یہ تھا کہ اگر تمام مدرسین آگئے تو ان کے قیام وغیرہ کے لیے مکان کا انتظام ہم خود کر دیں گے۔ ایک دو شخصوں کے لیے دقت ہوتی ہے، جماعت ہو تو آسانی ہے۔ بہر حال قیام کی نسبت آپ وعدہ کرلیں، جو تنخواہیں مل رہی ہیں ان سے زیادہ رقوم منظور کر لیجیے، دیوبند آپ فوراً جائیں اور مولانا محمود حسن صاحب سے طالب اعانت ہوں۔

ان سے مشورہ لیجیے اور خطوط، متعدد آدمی دیو بندی حلقے کے ہاتھ آجائیں گے۔ مقصود تعجیل ہے،
زیادہ تاخیر میں اتلاف کار کا خوف ہے۔ ممکن ہے طلبہ کی مستعدی ضعیف پڑ جائے۔ ابوالکلام

ستمبر ۱۹۲۰ء: کانگریس کا خصوصی اجلاس ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں زیر صدارت لالہ لاجپت
رائے منعقد ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر مسٹر بی۔ چکرورتی تھے۔ اس اجلاس کا اہم ترین ریزولیوشن
گاندھی جی نے پیش کیا انھوں نے کہا اگر ہم سوراج حاصل کرنا اور خلافت کے مسئلہ کو اطمینان بخش
طریقے سے حل کرنا چاہتے ہیں تو عدم تعاون کا پروگرام ضروری ہے۔ اس تجویز سے صدر جلسہ لالہ
لاجپت رائے اور مسٹر سی۔ آر داس متفق نہ تھے ان کا منشا تھا کہ کانگریس اپنے روایتی طرز عمل کو ترک
کر کے احتجاج و ایجی ٹیشن کی سیاست میں عملی قدم نہ رکھے۔ گاندھی جی کا موقف تھا کہ حکومت
ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اپنے فرائض سرانجام دینے میں ناکام رہی ہے، وزیراعظم برطانیہ
اپنے وعدہ سے مکر گئے ہیں۔ ان حالات میں غیر مسلم ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مسلم
بھائیوں کی مدد کریں۔ علاوہ ازیں پنجاب کے حالات بھی جوں کے توں ہیں۔ حکومت ظالم
افسروں کو سزا دینے میں ناکام رہی ہے جو پنجاب کے بے پناہ مظالم کے ذمہ دار ہیں ان حالات
میں ہندوستان میں قیام امن کے امکانات ناممکن ہیں اس کا واحد حل صرف سوراجیہ کا قیام ہے۔

گاندھی جی کے پیش کردہ ریزولیوشن پر کئی گھنٹے مسلسل بحث مباحثہ اور تقاریر ہوئیں آخر کار
بھاری اکثریت سے منظور کر لیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا:

۱) حکومت کے درباروں اور سرکاری تقریبات کا مکمل مقاطعہ کیا جائے۔

۲) بچوں کو سرکاری درس گاہوں سے (جو سرکاری امداد حاصل کرتی ہیں) نکال لیا جائے اور
آزاد خود کفیل درس گاہیں قائم کی جائیں۔

۳) وکلا عدالتوں کا مقاطعہ کر دیں۔

۴) خطابات اور اعزازی عہدے واپس کر دیے جائیں۔

۵) فوجی، نیم فوجی، دفتری اور مزدوروں کی عرب ممالک کے لیے بھرتی سے انکار کر دیا
جائے۔

۶) قانون ساز اداروں کا مقاطعہ کیا جائے۔

۷) غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے۔

کانگریس نے ملکی اشیاء کے استعمال پر زور دیا۔ ہندوستان کے کپڑا تیار کرنے کے کارخانے

پورے ملک کی ضرورت پوری کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس لیے چرخوں پر دھاگا کاتنے کا مشورہ دیا گیا اور اس دھاگے سے کپڑا تیار کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس سے ایک طرف جہاں کپڑا وافر مقدار میں ملکی سطح پر دستیاب ہونے کے امکانات روشن ہوتے اور ساتھ ہی روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوئے اور اس صنعت میں ان گنت نئے اور پرانے افراد کو روزگار ملا۔

مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح کلکتہ میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تجاویز پر مسٹر جناح کا رویہ انتہائی محتاط تھا۔ انھوں نے خطبہ صدارت میں ان تجاویز کی طرف توجہ مبذول کرائی لیکن ان کی تائید نہ کی صرف اس قدر کہا کہ ان تجاویز پر ہر شخص کو اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔ دراصل وہ ترک تعاون کے حق میں نہ تھے جس کا عملی مظاہرہ انھوں نے صرف تین ماہ بعد کانگریس کے ناگپور سیشن میں کیا۔

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست ص ۲۔۱۰۱)

۶/اکتوبر ۱۹۲۰ء: وفد خلافت پورے آٹھ ماہ تک یورپ کے مختلف ممالک میں تگ و دو کرتا رہا اس دوران میں اس نے حکومت کے ارکان، حزب اختلاف کے اکابر، عوام، اخبارات غرضیکہ ہر طبقہ تک اپنی آواز کو پہنچایا اور اپنے مقاصد کا پروپیگنڈا کیا۔ لیکن ان کی کوششوں کا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔ ناچار وفد واپس آ گیا۔ وفد اکتوبر ۱۹۲۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں بمبئی کے ساحل پر اترا۔ مولانا محمد علی نے اپنی مختلف تقاریر میں وفد کی ناکامیوں کی روداد سنائی ہے اور اس سلسلے میں اپنے تاثرات بیان کیے واپسی کے بعد جو پہلی تقریر انھوں نے ۶/اکتوبر کو بمبئی میں کی تھی۔ اس میں فرماتے ہیں:

"حضرات آپ نے وفد کے متعلق جو کام تجویز فرمایا تھا۔ اسے ہم نے ہر ایک جائز طریقے سے انجام دیا۔ متحدہ ہندوستان نے سلطنت آل عثمان کا جو مسئلہ، جو پیام دول یورپ تک پہنچانے کا فرض ہمارے سپرد کیا تھا، ہم نے اسے آپ کی خواہش کے لیے بموجب ان تک پہنچا دیا۔ ہمارے اختیار میں یہ بات تو نہ تھی، کہ صلح کی کانفرنس کے فرامین کو ہم درہم برہم کر دیتے یا بہ جبر اپنی بات منوا لیتے۔ لیکن وفد کے سپرد جو خدمت کی گئی تھی اُسے ہم نے نہایت ایمان داری اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔

غرض یادداشتیں تحریر میں بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس طریق سے ہم یورپ کے جمہور تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ افسوس ہے کہ انگریزی اخبارات اس معاملے میں غیر جانب دار نہیں۔ وہ اپنے ملکی امور

کے متعلق تو بڑے بڑے مقالے سپرد قلم کرتے ہیں مگر ہندوستان کے حق میں کچھ بھی نہیں لکھتے اور اگر لکھتے ہیں تو ان کے اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے انگلستان کے جمہور کو ہندوستان کے جذبات کے بارے میں جو "تحریک خلافت" سے متعلق پیدا ہوتے ہیں، بالکل تاریکی میں رکھا جاتا ہے۔ میں نہایت افسوس سے اعتراف کرتا ہوں کہ خلافت کے بارے میں دنیائے اسلام پر جو ظلم توڑا گیا ہے اس کے ذمہ دار محض مسٹر لائڈ جارج ہیں۔ فرانس اور اطالیہ جن پر مسلمانان ہند کو کوئی دعویٰ نہیں، ترکی کے حق میں مائل تھے۔ مگر ساتھ ہی اس قدر کمزور تھے کہ مسٹر لائڈ جارج کی مخالفت کرنے مسلمانان ہند کے جذبات برطانوی مدبروں کے سامنے پیش نہ کر سکتے تھے۔"

(اوراق گم گشتہ مرتبہ رئیس احمد جعفری، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۵۵)

۲۰ را کتوبر ۱۹۲۰ء: ۲۰ را کتوبر ۱۹۲۰ء کو لاہور کے عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"جو وفد خلافت آپ نے امرتسر سے مرتب کر کے انگلستان بھیجا تھا اس کے حالات مختصراً عرض کروں گا۔ جو پیغام آپ نے انگلستان کی قوم اور حکومت کو اور ان کی شریک حکومتوں کو بھیجا تھا، وہ ہم نے بالکم وکاست پہنچادیا۔ ہمارا فرض یہ تھا کہ ہم ان لوگوں کو بتادیں کہ مسلمانوں کی مذہبی پابندیاں کیا ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مسئلہ خلافت کے متعلق کیا ہیں اور ہندوستان کا مطالبہ خلافت اور جزیرۃ العرب کی نسبت کیا ہے؟ میرا یہ فرض تھا کہ میں انگلستان والوں کو بتادوں کہ اگر ہمارے مذہبی فرائض کا خیال نہ کیا گیا، تو اس کے نتائج کتنے برے ہوں گے۔ ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ اس میں کامیابی نہ ہوگی مہاتما گاندھی جی ابھی آپ کو بتادیں گے کہ یہ گورنمنٹ کس قدر دغاباز، مکار اور فریبی ہے۔ یہ ہمیں سب کچھ معلوم تھا لیکن صرف اتمام حجت باقی تھا۔

(اوراق گم گشتہ، ص ۵۷)

۲۷ را کتوبر ۱۹۲۰ء: ۲۷ را کتوبر ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی نے ایک خط ہندوستان میں مقیم تمام انگریزوں کے نام شائع کیا۔ خط میں انھوں نے اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ اقدام کو مبنی برحق وصداقت ٹھہرایا اور انگریزوں سے اپیل کی کہ وہ حالات کو سمجھیں اور گورنمنٹ کو صحیح مشورہ دیں۔

(تحریک خلافت، ص ۱۶۳)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سفر علی گڑھ اور بنیاد جامعہ ملیہ!

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء: تحریک خلافت کا زور تھا۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترک موالات کا جوش تھا۔ اس لیے چاہتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کر لے مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیان یونیورسٹی کب اس کو گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے سخت مخالفت کی جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی معتدبہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہوگئی اور آزاد درسگاہ قائم کرنے کے لیے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو تیاری کرنے لگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اس میں نان کوآپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آگئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے مہاتما گاندھی کی رائے مقبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلباء مسلم یونیورسٹی کو زوردار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علاحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی فتویٰ کی وجہ سے گورنمنٹ نے سر رحیم بخش صاحب کو خصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتویٰ کو واپس لینے کے لیے بھیجا تھا، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔ جیسا کہ طلبا مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا اسی طرح خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا فتویٰ مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ قال اللہ تعالی ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ریحکم و اصبروا ان اللہ مع الصابرین○

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور

تمھاری ہوا بگڑ جائے تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

و تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی معاونت کرنی چاہیے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو

و من یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین

کفار کی موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے کہ ''جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی وہ شخص بھی ان ہی میں سے شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا''۔

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو!

امابعد! آج جب کہ شرق و غرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جب کہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امنڈتے ہوئے طوفان کی موجوں سے ٹکرا کر (خدانکردہ) پاش پاش ہو جائے، جب کہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرے کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علمائے ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی، قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا۔ پس میں ایک لحہ کے لیے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علاحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز و فلاح سے ہو یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔ مالٹا سے واپس آکر مجھ کو معلوم ہوا کہ

ہندوستان کے ارباب بست وکشاد نے آخری طریق کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوۂ حسنہ کو مضبوط تھام لیں اور نفع وضرر قومی کا موازنہ اور عواقب...... کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف وخطر انجام تک پہنچائیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون وموالات کو اعتقاداً اور عملاً ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ وہ

(۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے،

(۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے۔

(۳) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے،

(۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں، ان پر عمل کرے بشرطیکہ

(الف) اتباع شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔

(ب) نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقص امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال مدنظر رہے،

(ج) ارشاد عثمان "اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤا فاجتنب اساء تھم" 'جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب کہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو' کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق و المعین۔

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۳؍ ذیعقدہ ۱۳۳۸ھ (۱۹؍اگست ۱۹۲۰ء)

اس کے بعد یہی فتوے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا(۱)۔

حاشیہ: (۱) اس مقام پر حضرت شیخ الاسلام نے ایک حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا حافظ احمد صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مہتمم دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب سر جیمس مسٹن گورنر یوپی نے دلوایا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس کروایا اور ایسی موثر تقریر مجمع خصوصی میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر بہ یک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔"

الغرض اسی تحریک اور سہی فتوی اور اسی تحریر کی بناء پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو کہ بعد میں جامعۂ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اگر زعماء مسلم یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا۔ بہر حال گورنمنٹ پرستوں نے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ جوشیلی روحیں کب اس کو گوارا کرسکتی تھیں۔ انھوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوئی تو مجبورا آزاد نیشنل یونیورسٹی کے لیے جلسہ کرنا چاہا اور اہل الرائے کو دعوت دی اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔

خدام نے اس سفر کو خطرناک اور نہایت تکلیف دہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا جواب حسب ذیل تھا۔

''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔''

چناں چہ ۱٦ر صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس کی تاریخ مقرر ہوگئی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد صاحب کو بتلا کر تحریر کا حکم دے دیا اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے تو اس کو سن کر حسب منشا ترمیم فرما کر چھپنے کا حکم دیا گیا۔

اس مدت میں مرض اور ترقی کرتا گیا ہر قسم کا علاج جاری تھا۔ مگر بجائے فائدہ زیادتی تھی۔ بخار لازمی صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ ضعف اور نقاہت ترقی پذیر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تقاضا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی لے جایا جائے تاکہ میں پوری توجہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل رائے سے بھی مشورہ کرسکوں مگر چوں کہ علی گڑھ کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں اس لیے قرار پایا کہ علی گڑھ کے جلسہ سے فارغ ہو کر براہ راست دہلی روانہ ہو جائیں گے اور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمائیں گے۔

میرا علی گڑھ اور پھر دہلی پہنچنا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اجلاس کی صدارت فرمانا!

دیو بند سے تار آیا کہ میں علی گڑھ فلاں گاڑی سے جا رہا ہوں تو مجھ سے وہاں مل! حسب الحکم میں وہاں پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ جناب عبدالمجید صاحب خواجہ کی کوٹھی پر قیام تھا۔ وہیں میں بھی قیام پذیر ہوا۔ اگلے روز جلسے میں حضرت رحمۃ اللہ نے شرکت کی اور صدارت فرمائی۔ ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے۔ دو شخصوں کے کندھوں پر

ٹیک کر چلنا ہوتا تھا۔ خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا۔ جو کہ مطبوع ہے اس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل یادگار ہیں۔

(۱) ''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف وہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب وضرب کا۔''

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

(۲) ''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جن میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں)، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔''

(۳) ''آپ میں جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں! یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے۔''

(۴) ''ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں قوم وملت کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علاحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔''

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہند نے فرمایا ہے، منصف انگریز بھی یہی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں، چناں چہ ڈبلو ڈبلو، ہنٹر صفحہ ۲۰۲ پر ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے۔

''مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خود دار ہوں۔ دنیادار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے اینگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں، اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پروا نہیں کرتے''۔ (نقش حیات: ص ۶۰-۲۵۶)

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء: ترک موالات کے پروگرام کے تحت ملک کے ہزاروں طلبہ نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا ہے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے طلبہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یونی ورسٹی کے ارباب بست وکشاد کی انتہائی کوشش کی رکاوٹ اور دھمکیوں کے باوجود سیکڑوں طلبہ نے یونیورسٹی سے قطع تعلق کرلیا۔ تحریک کے رہنماؤں نے اُن کی تعلیم کے اجرا کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ ہی میں قائم کردی۔

۲۹/اکتوبر کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اس کا افتتاح فرمایا۔ حضرت اس زمانے میں شدید بیمار تھے اس کے باوجود علی گڑھ کا سفر اختیار فرمایا۔ اس موقع کے لیے جو خطبہ تحریر فرمایا تھا اسے مولانا شبیر احمد عثمانی نے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔ حضرت کا یہ خطبہ برٹش حکومت کے مذموم عزائم کا آئینہ دار اور مسلمانوں کے فرائض شرعیہ وملیہ کے بیان سے اس کا ایک ایک جملہ درد واثر ملی وقومی میں ڈوبا ہوا ہے۔ حضرت نے فرمایا:

''مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں رہی، کیوں کہ زمانے نے خوب بتادیا ہے کہ تعلیم ہی سے بلند خیالی اور تدابیر اور ہوش مندی کے پودے نشو ونما پاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح کے راستے پر چل سکتا ہے۔ ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے بالکل آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد وخیالات

کے اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔

ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہییں۔ بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد ایک اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی ہے تو اُس دن علما نے جمع ہوکر علم کا ماتم کیا تھا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں جس کی امداد اور نظام میں بڑاز بردست ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو؟''

اکتوبر ۱۹۲۰ء: ۱۹۲۰ء میں پیروونشیل کمیٹی صوبۂ آگرہ کے شعبۂ تبلیغ کے صدر مولانا عبدالماجد قادری بدایونی نے سید المطالع۔ میرٹھ سے ترکِ موالات کے عنوان سے ایک مختصر مجموعۂ فتاویٰ شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں فرنگی محل لکھنو، سہارن پور، بدایوں، کان پور کے متعدد علما کے علاوہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے فتاویٰ بھی شامل تھے۔ یہاں مستفتی مولانا بدایونی کا استفتا اور مذکورۃ الصدر تینوں بزرگوں کے فتوے درج کیے جاتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استفتاء:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مذہب

۱) حالات حاضرہ میں ترک موالات عن النصاریٰ شرعاً ضروری ہے یا نہیں؟

۲) صورت موجودہ میں ملک کے ہنود کی ہمدردی مسلمانوں کے ساتھ اور اُن کا مرکزی مجلس خلافت کی تجویز، ترک موالات کو مفید اور کامیاب بنانے میں مدد دینا اور مسلمانوں کا اُن کی ہمدردی و مدد سے مستفید ہونا عندالشرع کیا حکم رکھتا ہے؟

۳) ترک موالات کی تجویز عام کی دفعہ خصوصی مالی لین دین بند کردینا اور اسی ضمن میں:

(الف) مدارس قومیہ سے اس کا اجرا و نفاذ ضروری ہے یا نہیں؟

(ب) طلباء مدارس قومیہ کا اراکین مدارس سے ایسا مطالبہ کہ وہ ہر ایسی مد، جو تجویز ترک موالات کے خلاف ہے فوراً حاصل کرنا بند کر دیں، صحیح ہے یا نہیں؟

(ج) ایسا کرنے میں عاقل، بالغ طلبہ اپنے والدین کی اجازت کے محتاج ہیں یا نہیں؟

المستفتی فقیر عبدالماجد القادری
صدر شعبۂ تبلیغ مجلس خلافت صوبۂ آگرہ

۱۔ فتویٰ جناب مولانا محمود حسن صاحب:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده و به نستعین

الجواب:

نمبر ۱۔ ترک موالات عن النصاریٰ کے متعلق جو استفتاء اس ضعیف اور درماندہ سے کیا گیا ہے ہر چند اپنے ضعف اور ناتوانی کے باعث مجبور ہوں اور نہ اپنی تحریر سے کوئی خاص نفع خیال میں آتا ہے، مگر اس حالت میں سکوت اور انکار کو بھی ناجائز سمجھتا ہوں۔ اس لیے بالاجمال اور بقدر ضرورت و کفایت عرض ہے کہ موالات کفار کی ممانعت اور حرمت قرآن و حدیث میں مصرح ہے اور متعدد مواقع میں موجود ہے۔ بالخصوص ان کے ساتھ جو تخریب اسلام میں ساعی ہو کر جگہ جگہ اسلام و مسلمین کی ہر قسم کی ایذا رسانی کا ثبوت بین دے رہے ہیں۔ اور استقبال میں اس سے زائد اندیشے ہیں۔ ایسے وقت میں ترک موالات کی فرضیت میں تامل کرنا کسی طرح جائز نہیں معلوم ہوتا۔ اور جو خطرات پیش نظر ہیں، ہر چند وہ بھی قابل انکار نہیں۔ مگر ان کے اندیشہ سے سب موجودہ اور آئندہ بلاؤں پر صبر و سکوت کر لینا ہرگز جائز نہیں۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے حقوق و منافع ضروریہ کو متفق ہو کر حکام سے حاصل کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ یہ مسلمانوں کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے، جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ اب آخر تا کے؟

نمبر ۲۔ مصائب حاضرہ میں ہندوؤں کی ہمدردی سے فائدہ اٹھانا یا ان کے ساتھ مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کرنا، اور جو ہنود اس درد میں ہماری غمخواری کریں ان سے مبرۃ اور اقساط (حسن سلوک) سے پیش آنا شرعاً درست اور جائز ہے۔ ہاں یہ فرض ہے کہ اس کی امداد میں بھی حکم

شرعی میں ادنیٰ خلل اور نقصان نہ آنے۔ نیز جو صاحب یہ کام کریں ایسے مصالح اور مقاصد پر پوری نظر اور احتیاط رکھیں۔ اس جواب اور نمبرا کے جواب کا ثبوت اس آیت سے واضح ہے (آیت) لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم ان تبرو ھم و تقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین. انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلو کم فی الدین و اخرجو کم من دیار کم و ظاھر و اعلی اخراجکم ان تولو ھم و من یتولھم فاولٰئک ھم الظٰلمون . (ممتحنہ: ۹۔۸۔)

(اس) آیت کا شان نزول تفاسیر سلف میں دیکھ لیا جانے نیز صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا کفار مکہ کی سختیوں سے تنگ آ کر ملک حبشہ کی (جو اس وقت کافر تھا) زیر حمایت رہنے کو اہون سمجھنا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ابن الدغنہ کی امان کو قبول کرنا اور خود آنحضرت ﷺ کا ابو طالب کی وفات پر تاسف انگیز کلمات فرما کر ان کی تائید اور اعانت کو یاد فرمانا۔ نیز بنوخزاعہ اور بعض دوسرے قبائل کا فتح مکہ کے وقت آپ ﷺ کے ساتھ ہونا یہ اور اس قسم کی نظائر کثیرہ بھی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

نمبر۳۔ ترک موالات کے متعلق بہت سی جزئیات ہیں جو امر مسلمانوں کو نافع نظر آنے اُس کا کرنا ضروری ہے۔ ہاں! یہ امر ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مدارس اور اپنے لڑکوں کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی دینی حسیات اور قومی خصائل پر اس کا نظام قائم کیا جائے۔

علی گڑھ کی ابتدائی حالت میں علماء معتدینین نے بالعموم اس قسم کی تعلیم سے (جواز سرتاپا) گورنمنٹ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیمگر بدقسمتی کہ وہ ترک نہ کی۔ اب جب کہ اس کے ثمرات و نتائج آنکھوں سے دیکھ لیے تو قوم کو اس سے بچانا یا بدابستہ ایک ضروری امر ہے طلبہ کے والدین دیکھ بھال کر اور سمجھانے پر بھی اُسی تعلیم پر زور دیں اور مذہبی تعلیم سے مانع ہوں تو طلبہ کو ضروری ہے کہ لعبہ اللہ تعلیم مذہبی اور اسلام کی خدمت گزاری کے لیے سعی کریں۔

الملتمس

بندہ محمود حسن عفی عنہ،

۲۔ فتویٰ جناب مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی:

ترک موالات ایک شرعی فریضہ ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں نہایت صاف و صریح احکام موجود ہیں۔ دو پہر کے وقت آفتاب کے وجود سے انکار ممکن، مگر دشمنان خدا کے ساتھ ترک

موالات کی فرضیت سے انکار ممکن نہیں۔ قرآن پاک میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بہت سے مواقع میں نہایت تاکید کے ساتھ ترک موالات کے احکام مذکور ہیں اور دشمنان خدا کے ساتھ موالات کرنے والوں کے حق میں سخت سے سخت وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

سورہ ممتحنہ میں ارشاد ہوتا ہے: انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلو کم فی الدین واخرجو کم من دیار کم و ظاھر وا علیٰ اخراجکم ان تولوھم و من یتولھم فاؤلٰئک ھم الظٰلمون .

خلاصہ ترجمہ: حضرت حق تم کو ایسے لوگوں سے جنھوں نے تم سے دین میں مقاتلہ کیا اور تم کو تمھارے گھروں اور شہروں سے نکال کر خانہ ویران کیا اور تمھیں نکالنے میں دوسرے لوگوں (یعنی تمھارے دشمنوں) کی مدد کی موالات کرنے سے منع فرماتے ہیں اور جو مسلمان ان لوگوں سے موالات کریں گے وہ ظالم ہیں۔

اس آیت میں حضرت حق نے جن کفار کی موالات سے منع فرمایا اور موالات کرنے والوں کو ظالم قرار دیا ہے ان کی تین حالتیں بیان کی ہیں۔ اول یہ کہ ان کے اور تمھارے درمیان مذہبی لڑائی ہوئی ہو، دوم یہ کہ انھوں نے تم کو تمھارے گھروں اور شہروں سے نکال کر خانہ ویران کیا ہو تیسرے یہ کہ اور نکالنے والوں کی مدد کی ہو۔

جن کفار میں یہ تینوں باتیں موجود ہوں ان کی موالات اس آیت سے صاف طور پر حرام ثابت ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ کے ایک بڑے ذمہ دار شخص نے جنرل ایلنبائی کو فتح یروشلم پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو اس صلیبی جنگ کے فاتح ہونے کی حیثیت سے میں مبارک باد دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان ذمہ داران حکومت کے دلوں میں وہی بات ہوتی جو زبان سے کہتے تھے کہ یہ جنگ مذہبی جنگ نہیں، تو فتح بیت المقدس کو صلیب کی فتح کیوں کہا گیا اور ایلنبائی کو صلیبی جنگ کا فاتح کس وجہ سے قرار دیا۔ صرف اس واقعہ نے ہی ان کے زبانی ادعا کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور ارشاد خداوندی سچا ہو گیا۔ یرضونکم بافواھھم و تابیٰ قلوبھم (۸:۹) کہ وہ صرف اپنے منہ سے (ملکی جنگ بتا کر) تم کو راضی کر دیتے ہیں اور ان کے دل اس سے انکار کرتے ہیں۔ یعنی اس جنگ کو ملکی جنگ بتانا صرف اس لیے تھا کہ مسلمانوں کی جانی و مالی قربانیاں حاصل کی جائیں۔ عربوں اور ہندوستانی مسلمانوں کو خلیفۃ المسلمین کی فوج سے لڑایا جائے اور خود ان کے ہاتھوں اسلامی ممالک فتح کر کے مسیحی طاقتوں کے حوالے کیے

جائیں یا ان کے زیر اقتدار کر کے غلامی کا طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جائے۔ اس کے علاوہ صلح نامہ ترکی کی شرائط نے تمام اسلامی دنیا کو یقین دلا دیا کہ دول متحدہ نے صرف مسیحیت کے تقاضے اور اسلام کے ساتھ عداوت کی وجہ سے ایسی شرائط پر ترکی کو مجبور کیا۔ جو قانون مساوات، آئین عدل وانصاف سے قطعاً کوسوں دور ہیں۔ مثلاً ترکی کے وہ مقامات جن پر جنگ کا کوئی اثر بھی نہیں پہنچا تھا، نہ ان کو دوران جنگ میں کسی نے فتح کیا، ترکی کے قبضے سے نکالنا سمرنا یونانیوں کو دلوانا، یا قبضہ کر لینے دینا، دارالسلطنت اور مرکز خلافت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا، مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لینا اور انگریزی تسلط جما کر اپنے صریح وعدے کے خلاف ورزی کرنا، ولی عہد سلطنت کو بغیر کسی جرم کے قید یا نظر بند کر دینا، تھریس یونان کو دلا دینا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام واقعات اور حالات ہیں جن پر نظر کرتے ہوئے کسی ادنیٰ سمجھدار کو بھی اس میں شک نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے ساتھ مذہبی تعصب برتا گیا ہے اور صرف اس جرم پر کہ یہ خدائے قدوس کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ صریح ظلم کیا گیا ہے، تو اس جنگ کے نتائج نے روز روشن کی طرح اس کا مذہبی جنگ ہونا ثابت کر دیا۔

(۲) گھروں اور وطن سے نکالنا۔ جن مقامات پر کہ مسیحی طاقتوں نے قبضہ کیا ہے۔ وہاں سے ہزاروں مسلمانوں کا گھربار چھوڑ کر نکل جانا بالخصوص مرکز خلافت قسطنطنیہ سے بے شمار محبان وطن کا ہجرت کر جانا۔ عمائد سلطنت اور شیخ الاسلام اور علمائے کرام کو مالٹا میں جلا وطن کر دینا۔ اخراج عن الدیار، اخراج عن الوطن نہیں تو اور کیا ہے؟

(۳) نکالنے والوں کی مدد کرنا۔ سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ دلانا یا قبضہ کر لینے دینا۔ تھریس پر یونانیوں کا قبضہ کرا دینا اور ہزاروں مسلمانوں کا جلا وطن ہو جانا، جماعت احرار ومحبان وطن پر ایسی سختیاں کرنا جس سے وہ ترک وطن پر مجبور ہوں کھلی ہوئی معاونت علی الاخراج ہے۔

اور تینوں باتوں میں اگرچہ تمام دول متحدہ شریک ہیں لیکن جیسا کہ واقعات اور اخبارات سے معلوم ہو چکا ہے ان سب میں برطانیہ کی طاقت ہی کا ہاتھ زبردست تھا۔ اور ترکی کے ساتھ ناانصافی اور سختی کی تمام تر یا زیادہ تر ذمہ داری برطانیہ ہی پر عائد ہوتی ہے پس جب کہ حکومت برطانیہ میں یہ تینوں باتیں جن کا اس مقدس آیت میں ذکر کیا تھا علی وجہ الکمال پائی گئیں۔ تو خدا تعالیٰ کے اس صاف وصریح حکم کے بموجب حکومت برطانیہ کے ساتھ ترک موالات فرض اور موالات حرام ہے حضرت حق کا یہ ارشاد کہ جو ایسے لوگوں سے موالات کرے وہ ظالم ہے۔ اس

بات کی دلیل ہے کہ نہی تحریمی ہے۔ کیوں کہ ظلم کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہے (الا لعنۃ اللہ علی الظالمین) یعنی خبردار ہو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

جواب نمبر۲:

ایسے دشمن جن کی عداوت کے اثر سے اسلامی شوکت اور مذہبی ناموس برباد ہوتا ہو۔ اسلامی سلطنت تباہ ہوتی ہو مقامات مقدسہ اور جزیرۃ العرب پر غیر مسلم اقتدار قائم ہوتا ہو یقیناً لاتتخذ واعدوی و عدوکم اولیاء میں داخل ہیں۔ اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ اسلام کے ناموس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں۔ اس جدوجہد میں اگر برادران وطن کے ساتھ اتفاق و اتحاد مفید ہو (جو یقیناً مفید ہے) تو حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اس پر عمل کرنا بھی اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنا بھی یقیناً مقدمات فرض میں داخل ہے اور جب کہ برادران وطن کا ہمارے ساتھ مقاتلہ فی الدین اور اخراج عن الوطن یا مظاہرت علی الاخراج نہیں تو ان کے ساتھ احسان وانصاف اور اتفاق المعاشرۃ سے کوئی چیز مانع نہیں۔ خود حضرت حق تعالیٰ کا ارشاد ہے (لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم) .... یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ایسے غیر مسلموں کے ساتھ احسان وانصاف کا معاملہ کرنے سے منع نہیں کرتا جن کی تمھارے ساتھ مذہبی جنگ نہیں اور نہ انھوں نے تمھیں خانہ ویران کیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب احسان کرنے سے ممانعت نہیں تو معاشرتی اتفاق سے بدرجۂ اولیٰ ممانعت نہ ہوگی، پھر جب کہ برسر جنگ دشمنوں سے صلح کرنا جائز ہے تو غیر محاربین سے صلح بہ درجۂ اولیٰ جائز ہے۔ حضرت حق کا ارشاد ہے "وان جنحوا للسلم فاجنح لھا و توکل علی اللہ" کہ اگر مشرکین صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ اور خدا پر بھروسا کرو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اتفاق اور صلح حدود شرعیہ کے اندر رہے تو پھر عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔

جواب نمبر۳:

الف: ترک موالات میں تمام وہ تعلقات شامل ہیں، جن میں میل جول، محبت اور اعانت و نصرت پائی جاتی ہو، اور اسلام سے دشمنی رکھنے والی طاقت کو قوت پہنچتی ہو۔ مالی لین دین ہو یا حکومت کی ملازمتیں ہوں۔ تعلیم ہو یا کونسلیں۔ کسی خاص قسم کی موالات کو حضرت حق نے منع نہیں کیا بلکہ عام حکم دے کر ہر قسم کی موالات کو حرام فرمادیا ہے۔

ب: تعلیم کے لیے گورنمنٹ سے روپیہ لینا اور اس کی وجہ سے ان شرائط کا پابند بننا جو تعلیم کو نکمی

بلکہ زہریلی کر دیتی ہیں۔ یقیناً ناجائز ہے۔ مذہبی طبقہ تو ہمیشہ سے اس کی نکمی، زہریلی اور الحاد و دہریت بھری ہوئی تعلیم سے روکتا رہا ہے۔ آج اس پر واقعات حاضرہ نے ترک موالات کا فریضہ اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

رہی صرف زبان کی تعلیم یا علوم معاشیہ کی تعلیم وہ بے شک جائز ہے، لیکن اس کے لیے نہ کسی ڈگری کی ضرورت ہے، نہ یونیورسٹیوں سے تعلق قائم رکھنے کی نہ گورنمنٹ سے گرانٹ لینے کی، ڈگریوں کی ضرورت صرف گورنمنٹ کی ملازمتوں میں ہوتی ہے اور گورنمنٹ کی ملازمتیں کرنا یقیناً اس کے ساتھ موالات ہے۔ پس ترک موالات کے دوسرے مدارج کی کامیابی کا پہلا زینہ یہی ہے کہ تعلیمی ڈگریاں ہی حاصل نہ کی جائیں۔

ج: تمام مسلمان عاقل بالغ طلبہ پر خواہ وہ قومی مدرسوں کے طالب علم ہوں یا سرکاری مدرسوں کے، فرض ہے کہ وہ ایسے مدارس سے جن کا تعلق گورنمنٹ کے ساتھ ہے علیحدہ ہو جائیں اور اس علیحدگی میں ان کو اپنے والدین کی اجازت لینی ضروری نہیں۔ بلکہ والدین کی ممانعت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ ''لا طاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق'' سرور عالم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ہاں والدین کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ان کی خدمت میں نہایت اخلاص اور ادب کے ساتھ یہ عرض کر دیں کہ چونکہ ان مدارس میں پڑھنے سے خدا اور رسول ﷺ کے احکام ہمیں منع کرتے ہیں اس لیے آپ ہمیں معذور سمجھیں اور اس حکم عدولی کو خوش دلی سے معاف فرمائیں۔

کتبہ خاکسار محمد کفایت اللہ غفر لہ،

دہلی۔ ۹ رصفر ۱۳۳۹ھ (۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ء)

جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد، دہلی واپسی اور اجلاس جمعیۃ العلما:

اجلاس (علی گڑھ) مذکورہ سے فارغ ہو کر حضرت دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے علاج فرمایا۔ چوں کہ اس سے پہلے امرتسر میں جمعیۃ العلماء کا انعقاد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ اور مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اور دیگر حضرات کی جدوجہد سے ہو چکا تھا۔ اور پہلا جلسہ بھی وہاں ہو چکا تھا۔ اس لیے اہل الرائے حضرات نے ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس دہلی میں بڑے پیمانہ پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں

منعقد کیا جائے تا کہ احوال حاضرہ میں علماء اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتفاق ہو سکے۔ کیوں کہ حضرت کو عام مقبولیت حاصل ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ اور آپ کے ساتھ حسن اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے اس کی استدعا کی گئی تو آپ نے قبول فرمایا اور ۷، ۸، ۹ ربیع الاول (۱۳۳۹ھ) اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کو تحریر خطبۂ صدارت پر مامور فرمایا اور مضامین ضرور یہ ذکر فرما دیے۔ چناں چہ مفتی صاحب مرحوم نے مسودہ تحریر کر کے پیش فرمایا اور حضرت کو سنایا بعد ضروری اصلاحات اور ترمیم کے حضرت نے چھپوانے کا ارشاد صادر کر دیا۔ خود حضرت اس قدر بیمار اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں باوجود یہ کہ وہ دہلی میں تھا، نہیں جا سکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے پڑھا۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب علماء حق کے صفحہ ۲۱۵ میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز اگر چہ حیاتِ مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے مگر علماء ملت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ علماء حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے ایسے بنیادی اصول معلوم کر لے جس پر کار بند ہو کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔''

حضرت شیخ کا خطبۂ صدارت اگر چہ نہایت مختصر تھا مگر علماے ملت اور ملی سیاست کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لیے مکمل اور کافی تھا۔

۱۔ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔

۲۔ تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

۳۔ استخلاص وطن کے لیے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

۴۔ اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعدا کے لیے جائز ہو سکتا ہے باوجود یہ کہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی تامل نہ ہوگا۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے

ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

(صفحہ ۱۶ خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیو بند)

میرا کلکتہ کا سفر اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے جدائی:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے قیام دہلی کے زمانے میں مولانا عبداللہ مصری جو کہ دراصل الہ آباد کے اصل باشندے ہیں اور مصر میں عرصہ ایام طالب علمی میں اقامت کرنے کی وجہ سے مصری مشہور ہو گئے ہیں۔ جناب مولانا ابوالکلام صاحب کے بھیجے ہوئے کلکتہ سے تشریف لائے اور مولانا موصوف کا خط لائے جس میں یہ مطالبہ تھا کہ چوں کہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے طلبہ نے ترک موالات کی تحریک پر مدرسۂ عالیہ سے علاحدگی کر لی ہے اور چاہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک اور نیشنل مدرسۂ عالیہ قائم کر دیا جائے۔ خلافت کمیٹی کے اراکین اس کی سرپرستی کریں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا مدرس جو کہ علم حدیث کی کتابیں پڑھا سکے جلد بھیج دیا جائے تاکہ وہ اوپر کے طلبہ کو پڑھا سکے اور مشہور و معروف ہو۔ خلافت کمیٹی اس کی کفالت کرے گی۔ ضرورت ہے کہ مولانا انور شاہ صاحب کو یہاں بھیج دیجیے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ شاہ صاحب مرحوم تو دارالعلوم دیو بند چھوڑ نہیں سکتے، مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو کہ تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور اس کو تجربہ اور شہرت حاصل ہو، مگر چوں کہ جمعیۃ کا اجلاس عام منعقد ہونے والا ہے اس لیے اس کے منعقد ہونے تک توقف کرنا ہوگا۔

مولانا ابوالکلام صاحب کلکتہ میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے اور ان کی تحریک اور زور دار تقریر سے ترک موالات پر طلبا مدرسۂ عالیہ متاثر ہو کر مدرسۂ عالیہ سے جدا ہوئے تھے اس لیے اس آزاد نیشنل مدرسۂ عالیہ کی تمام تر ذمہ داری مولانا موصوف اور اراکین خلافت کمیٹی ہی پر تھی۔ فرنگی محل اور امروہہ وغیرہ سے بھی مدرسین منگائے گئے تھے۔ اگر سابق مدرسین مدرسۂ عالیہ ترک موالات کر دیتے تو اس کی ضرورت نہ پڑتی مگر وہ تو بڑی بڑی تنخواہوں کے لالچ اور انگریز پرستی میں مبتلا تھے۔ بہر حال ایک آزاد مدرسۂ عالیہ ناخدا مسجد میں قائم ہو گیا تھا۔ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی اس کے ناظم بنا دیے گئے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ مولانا شبیر احمد صاحب یا مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وہاں چلے جائیں اور اس تحریک پر جو انقلاب ہوا ہے اس کو سنبھال لیں۔ حضرت نے

دونوں صاحبوں سے تذکرہ کیا دونوں نے علاحدہ علاحدہ اپنی ماؤں سے اجازت طلبی کا عذر کیا۔ اس لیے اپنے اپنے مکانوں پر واپس ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد بذریعہ خطوط اطلاع دے دی کہ ہماری والدہ اجازت نہیں دیتیں۔ چوں کہ جلسۂ جمعیۃ کی تاریخیں بالکل سر پر آگئی تھیں حضرت نے دونوں کو بلایا اور یہ فرمایا کہ کلکتہ جانے کا مسئلہ مستقل ہے مگر یہاں حاضر تو ہو جاؤ اور آکر اجلاس کی ضروریات میں ہاتھ بٹاؤ۔ اس وقت تک فقط مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا سعید احمد صاحب ہی تمام امور اجلاس انجام دے رہے تھے۔ بالآخر ہر دو حضرات تشریف لائے تا ایں کہ بفضل تعالیٰ بخیر و خوبی علی احسن الوجوہ جلسہ ختم ہو گیا۔ چوں کہ مولانا عبداللہ مصری صاحب کو اس انتظار میں بہت مدت گزر گئی تھی اوطان کے ضروری کاروبار میں تعطل زیادہ ہو گیا تھا جس کی بنا پر ان کا تقاضا سخت تھا اس لیے فراغت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا مرتضیٰ حسن اور مولانا شبیر احمد صاحب اور مجھ کو تنہائی میں طلب فرمایا۔ چوں کہ معالجہ میں کونین زیادہ استعمال کرائی گئی تھی۔ اس لیے سماعت میں بہت فرق آگیا تھا۔ حضرت نے کلکتہ کی ضرورت ظاہر فرما کر حکم کیا کہ جو رائے اور عذر ہو ہر ایک لکھ کر دے دے۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب نے لکھا ہے ہماری مائیں کلکتہ جیسی دور دراز جگہ پر جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ میں نے لکھا کہ میں امروہہ میں حضرت ہی کے حکم سے گیا تھا اور حضرت ہی کے حکم سے خدمت میں حاضر رہنے کی غرض سے ملازمت تدریس چھوڑ کر حاضر ہوا ہوں۔ کلکتہ جانے میں یہ مقصد عظیم فوت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں نہ میں تقریر کا ماہر اور عادی ہوں نہ تحریر کا، نہ مجھ میں ذکاوت ہے نہ حافظہ۔ آئندہ آپ کا جو حکم ہو اس کے امتثال کے لیے حاضر ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ایک کی تحریر پر غور کیا۔ اور تھوڑی دیر سکوت کر کے فرمایا کہ "اپنے ہی کی طرف جھکنا پڑتا ہے تم چلے جاؤ" (میری طرف خطاب کر کے) میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا میں حاضر ہوں۔ مگر چوں کہ مدینۂ منورہ سے کھجوریں بھائی سید احمد صاحب کی بھیجی ہوئی آئی ہوئی ہیں، مجھے اتنی اجازت دے دی جائے کہ میں سہارن پور اور دیوبند جا کر ان کو جہاں جہاں پہنچانی ہیں پہنچا آؤں۔ دو تین دن میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر کلکتہ کو روانہ ہو جاؤں گا۔ حضرت اس پر راضی ہو گئے اور مولوی عبداللہ صاحب مصری کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ میں نے حسین احمد کو کلکتہ بھیجنے کے لیے مقرر کر دیا ہے وہ دو تین دن میں یہاں کی ضرورتیں پوری کر کے روانہ ہو جائے گا۔ آپ خرچۂ سفر فلاں کو دے دیں اور روانہ ہو جائیں۔ میں اسی روز سہارن پور اور دیوبند روانہ ہو گیا

اور تیسرے یا چوتھے دن سہارن پور و دیو بند وغیرہ سے ضروریات پوری کر کے واپس آ گیا واپسی پر معلوم ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا احمد صاحب سے فرمایا کہ کہیں حسین احمد کو مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کلکتہ جانے سے روک نہ دیں۔ میں جب خدمت میں حاضر ہوا تو پوچھا کہ مولانا خلیل احمد صاحب نے کلکتہ جانے کے متعلق کچھ کہا تو میں نے عرض کیا کہ کچھ نہیں فرمایا اور حقیقت یہی تھی مگر آپ کے حکم کے بعد وہ یا اور کوئی صاحب کچھ بھی فرماتے میں کسی کی بھی ماننے والا نہیں تھا۔ چناں چہ اسی روز میں روانگی کے لیے گاڑی کے وقت پر تیار ہو گیا۔ رخصتی کے وقت حاضر ہوا تو میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور خوشی سے رخصت فرمایا۔ یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ رخصتی ہمیشہ کے لیے ہے مگر تقدیراتِ الٰہیہ کون جانتا ہے۔

میرا دہلی سے رخصت ہو کر بچھراؤں اور امروہہ پہنچنا:

چون کہ مالٹا کی اسارت ہی کے زمانہ میں پہلے والد صاحب مرحوم کا اڈریانوپل میں انتقال ہو گیا تھا (جب کہ دونوں بھائیوں مولانا سید احمد صاحب اور عزیزم محمود احمد سلمہ اور والد صاحب مرحوم کو ترکی حکومت نے شریف حسین کی بغاوت پر نظر بند کر کے مثل دیگر ہندوستانیوں اور عربوں کے ترکی ممالک میں متفرق کر دیا تھا) اس کے بعد صرف بچے اور عورتیں مدینۂ منورہ میں باقی رہ گئی تھیں اور ان میں مولانا عبدالحق صاحب مدنی کی ہمشیرہ بھی تھیں جو کہ بھائی سید احمد صاحب سے منسوب تھیں اس لیے۔ سب کی خبر گیری وہی حسب استطاعت کرتے تھے۔ اسی زمانے میں میرے بچے اشفاق احمد اور اس کی والدہ مرحومہ کا مدینۂ منورہ ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے مالٹا سے واپسی پر جناب حکیم غلام احمد صاحب مرحوم سے پہلی اہلیہ کی چھوٹی بہن کے متعلق گفتگو کی گئی اور بعد جد و جہد قبول فرما کر انھوں نے اس سے عقد کر دیا تھا۔ وہ کلکتہ جانے کے وقت بچھراؤں ہی میں تھی اس لیے دہلی سے میں براہ مراد آباد روانہ ہوا اور ایک شب کے لیے وہاں قیام کر کے کلکتہ کا ٹکٹ لے کر سوار ہو گیا۔ راستہ میں امروہہ پڑتا تھا۔ امروہہ کے اسٹیشن پر بہت سے احباب نے آ کر گھیر لیا اور اترنے پر مجبور کیا میں نے ہر چند اپنے اعذار پیش کیے مگر ایک نہ سنی اور کہا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں، ان کا حکم ہے کہ حسین احمد کو اُتار لو اور یہاں لے آؤ، چناں چہ اترنا پڑا۔ انھوں نے ٹکٹ کو کینسل کرایا۔

امروہہ اُترنے کا سبب:

اترنے کا سبب بعد کو معلوم ہوا کہ شیعوں اور سنیوں میں مناظرے کی قرارداد پہلے سے ہو چکی

تھی اور اسی بنا پر اہل امروہہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو تکلیف دی تھی کیوں کہ مولانا موصوف کو شیعوں کے مذہب سے بہت زیادہ واقفیت تھی اور ان سے مناظرے کی بھی بہت کامل مہارت تھی۔ مولانا مرحوم نے متعدد کتابیں شیعوں کے رد میں لکھی تھیں۔ اور مختلف مقامات میں کامیاب مناظرے بھی کیے تھے مگر چوں کہ خلافت کی تحریک اس وقت بہت زوروں پر تھی اور عام فضا مسلمانوں میں خصوصاً اور تمام ہندوستانیوں میں عموماً اتفاق اور اتحاد قائم کرنے کی متقاضی تھی اس لیے عام اہل شہر مناظرہ کے خلاف تھے اور مناظرہ کے بانیوں وغیرہ پر سخت سے سخت اعتراض کرتے تھے اس لیے سنجیدہ حضرات چاہتے تھے کہ مناظرہ نہ ہو مگر کوئی کھل کر رد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا ورنہ اس کی جماعت کی بدنامی ہوگی اس لیے چاہتے تھے کوئی قومی یا تحریک کا حامی شخص بیچ میں پڑ کر مناظرہ رکوائے۔ میں امروہہ میں اس سے پہلے کئی مہینہ رہ چکا تھا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا مخلص خادم اور مرید بھی تھا۔ اس لیے حضرت موصوف اور دیگر احباب نے ضروری سمجھا کہ اسی کو اتار لیا جائے اور اسی کو درمیان میں ڈالا جائے تاکہ پھر کسی کو حرف گیری اور اعتراض کا موقع ہاتھ نہ آئے۔ بالآخر مجھ کو مجبور کیا گیا اور میں نے حاضر ہو کر وہاں تقریر بڑے مجمع میں کی جس کی وجہ سے اشتعال ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ہر دو فریق سنیوں اور شیعوں کو سمجھایا اور وقت کی نزاکتوں کو دکھلا کر زوردار اپیل کی کہ کوئی اس قسم کی کارروائی اس زمانہ میں مناسب نہیں ہے جس سے افتراق کی خلیج میں وسعت ہو۔ ضروری ہے کہ اتفاق اور اتحاد کو مضبوط کیا جائے۔ میں نے کربلا شریف، بغداد اور عراق کے انگریزی مظالم دکھلائے اور شیعوں اور سنیوں دونوں کو ملامت کی۔ بہرحال اس طویل تقریر کا فریقین اور عوام پر اچھا اثر ہوا۔ فریقین سمجھ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس کے بعد میں روانگی کا انتظام کر ہی رہا تھا کہ دہلی سے ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تار آگیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری اور وصال

۳۰ رنومبر ۱۹۲۰ء:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال کی تفصیل تو جناب مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ ''حیات شیخ الہند'' میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ جس کو نقل کرنے میں بہت تطویل

ہے۔ بنا بریں ہم اس کا اختصار ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۲۰؍رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸؍جون ۱۹۲۰ء ایک بجے دن کو مالٹا سے بمبئی پورٹ پر تشریف فرما ہوئے بمبئی میں دو دن قیام فرما کر ۲۲؍رمضان شب جمعہ مطابق ۱۰۔جون بعد از مغرب روانہ وطن ہوئے ۲۴؍رمضان المبارک مطابق ۱۲؍جون ۱۹۲۰ء بوقت صبح دہلی پہنچے۔ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا ایک روز قیام فرما کر ۲۵؍رمضان مطابق ۱۳؍جون ۲۰ء بروز یک شنبہ بوقت صبح دہلی سے روانہ ہوئے اور اسی روز ۹۔بجے دیو بند پہنچے۔استقبال کرنے والوں کا ہر اسٹیشن پر جس طرح نہایت زیادہ ہجوم تھا، یہاں پر بھی بہت زیادہ ہجوم تھا۔اسٹیشن سے سیدھے دارالعلوم تشریف لے گئے۔مہمانوں کی اطراف و جوانب سے نہایت زیادہ آمد تھی۔بنا بریں ۱۰ شوال تک دیو بند ہی میں قیام فرمانا پڑا ورنہ پختہ ارادہ تھا کہ جلد از جلد مولانا حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کے مکان پر کوڑہ جہاں آباد ضلع فتح پور مرحوم کی تعزیت کے لیے پہنچیں۔ان کی والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین موجود تھے۔وہاں سے الہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ، مراد آباد ہوتے ہوئے ۲۵؍شوال کو دیو بند واپس ہوئے چوں کہ اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں اس لیے درمیانی مقامات پر نہ جا سکے۔(اگر چہ عقیدت مندوں کے بہت تقاضے تھے) ۱۷؍ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو اہلیہ محترمہ مرحومہ نے داغ مفارقت دیا جس کا اثر طبع مبارک پر ہونا طبعی امر تھا۔ماہ ذی الحجہ میں دیو بند میں موسمی بخار اور تپ و لرزہ کا بہت زیادہ شیوع ہوا۔چناں چہ عشرۂ محرم کے بعد خود حضرت بھی مبتلا ئے، تپ و لرزہ ہو گئے۔ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ وجع مفاصل اور بواسیر کی تکلیف سابق ہندوستان پہنچنے کے بعد ہی عود کر آئی تھی مگر تاہم اس کا تحمل فرماتے تھے اور نشست و برخاست آمد و رفت پر زیادہ اثر نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے مگر اس تپ و لرزہ نے یک بارگی اتنا ضعیف کر دیا کہ نشست و برخاست اور آمد و رفت کی طاقت جاتی رہی معالجہ یونانی اور ڈاکٹری جاری تھا۔بعد انتہائی کمزوری اور غلبۂ مرض کے اواخر محرم سے افاقہ تدریجی طور پر شروع ہوا۔مگر افاقہ کی رفتار بہت سست تھی ۲؍صفر کو بتقریب صحت احباب اور طلباء دارالعلوم کی دعوت کی گئی جس کا اہتمام مخلصین نے از خود کیا تھا۔مگر افسوس کہ قدرت کو یہ خوشی باقی رکھنی منظور نہ تھی۔۶؍صفر کو پھر بخار آیا اور پیچش بھی ہو گئی اور ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا تا آنکہ اطباء نے ورم جگر تجویز کیا اسی زمانے میں سفر علی گڑھ کی تحریک ہوئی جس کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں چناں چہ ۱۶؍صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ علی گڑھ میں جلسہ ہوا۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ پڑھ کر صدارت فرمائی۔کمزوری اس قدر تھی کہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے مولانا شبیر احمد مرحوم نے خطبہ پڑھا۔اگلے روز علی گڑھ سے واپس ہو گئے۔ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے۔معالجہ

نہایت توجہ سے ہوا جس سے تخفیف کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۴؍ربیع الاول تک اطمینانی حالت رہی مگر ۱۵؍ربیع یوم شنبہ کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہوگئی۔ بخار بہت تیز ہوگیا۔ حالت اگرچہ تشویش ناک تھی تاہم ہوش وحواس بجا تھے آدمی کو پہچانتے تھے۔ بہت ضعیف آواز سے کچھ بات بھی فرماتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم سوانح صفحہ ۱۴۱ میں لکھتے ہیں: (۱۸؍ربیع الاول کی شب) رات بھر یہی حالت رہی، سینہ پر بلغم تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفع نہیں کر سکتے تھے۔ صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف اُمید حلق میں اتر گیا۔ ۶ بجے کچھ اجابت ہوئی اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بلحظہ بڑھتا جاتا تھا اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی حالت طاری تھی۔ مخصوص لوگ چار پائی کے گرد موجود تھے۔ دل دھڑک رہے تھے۔ طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ سات بجے کے بعد (۱۸؍ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۱؍نومبر کو بہت تغیر ہوگیا اور حضرت دنیا سے بالکل غافل ہوگئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہوگیا اور انقطاع عن الدنیا وتوجہ علی الرفیق اعلیٰ کا گمان غالب ہونے لگا۔ چار پائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا تھا یعنی بلند آواز سے تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا۔ آہ!

مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کا بیان ہے (جس کو مولانا محمد جلیل صاحب نے نقل فرمایا) کہ حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔'' مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے سورۃ یٰسین شروع کی مگر وہ جوش گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے اس لیے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کر لیا، ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کر لیں اور آٹھ بجے جب کہ مولوی صاحب بالکل اخیر سورت پر پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کے لیے زبان کو حرکت دی اور خاص ''الیہ ترجعون'' کی آواز پر قبلہ رخ ہو کر ہمیشہ کے لیے آنکھ بند کر لی یسر اور سہولت سے سانس منقطع ہوگیا اور روح مقدس روح وریحان وجنۃ نعیمہ کی بہار دیکھنے کے لیے تمام اہل اسلام کو یتیم وبیکس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

''وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے۔'' (سوانح شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ، صفحہ ۱۴۷)

غمزدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق و بیقراری کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ کچھ دیر تو وہ حالت رہی کہ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔ کسی کی آہ نکلی کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسے جانکاہ حادثات پر آہ و نالہ اور چیخ و پکار ایک معمولی بات ہے۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا فیضِ صحبت کام آیا اور رضا بالقضاء کا مضمون غالب ہوا۔

نصف گھنٹہ کے بعد منزل اوّل (قبر) کا فکر ہوا ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی صاحب (حکیم محمد حسن صاحب) اور خدام سے استفسار فرمایا کہ اگر دہلی میں دفن کرنا آپ مناسب سمجھیں تو محدثین (حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے احفاد کرام رحمہم اللہ تعالیٰ) کے مزارات میں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے۔ جواباً کہا گیا کہ حضرت کی آرزو تھی کہ اپنے مخدوم استاد کے جوار باکرامت میں جگہ ملے اور یہی آرزو اور کشش دوسری دنیا (مالٹا) سے کھینچ کر یہاں لائی تھی۔ نیز صاحبزادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہنچی تھیں اس لیے یہی رائے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا چاہیے۔

دیوبند کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی جنازہ شام کو دیوبند پہنچے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم اطلاع دینے اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظام میں مصروف ہوئے ادھر خدام نے غسل دیا اور کفن پہنا کر تابوت میں رکھا (جو کہ نہایت اہتمام سے جلد تیار کرایا گیا تھا) اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹر سرٹیفکٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہو گئے جن کی تکمیل میں دوسروں کو بہت دقت اور تاخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب ہی کا تار امروہہ میرے پاس وفات اور جنازہ کے دیوبند لے جانے کا اسی روز شام کو پہنچ گیا تھا۔ حال آں کہ میں نے امروہہ پہنچنے کی ان کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ غالباً سی۔ آئی ڈی نے ان کو اطلاع دی ہوگی۔ دہلی میں آناً فاناً وفات کی خبر مشہور ہوگئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی دوکانیں فوراً بند کر دیں۔ ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ تیار ہوتے ہی نماز جنازہ کے متقاضی ہوئے حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی خواہش اور اصرار ہے تو تم نماز جنازہ پڑھ لو اور میں شریک نہ ہوں گا تاکہ مجھ کو نماز کے دہرانے کا اختیار رہے اور میں دیوبند میں پھر نماز اعزا و اقارب کے ساتھ پڑھ سکوں۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ایک مرتبہ بہت بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا کی گئی اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ لوگ بڑھتے جاتے تھے۔ اندازہ کیا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ وہاں پھر دوسری دفعہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا۔ چوں کہ قبر پہلے

سے تیار ہو چکی تھی اس لیے بہت سے لوگوں کی رائے ہوئی کہ ابھی رات ہی میں دفن کر دیا جائے مگر چوں کہ صاحبزادیاں اور داماد جو کہ تار ملنے کے بعد دیو بند سے دہلی کو روانہ ہو چکے تھے اور ابھی راستہ ہی میں تھے کہ جنازہ غازی آباد آ گیا اس لیے وہ غازی آباد میں اتر گئیں مگر ہجوم کی زیادتی اور ٹرین کی جلدی سے روانگی اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ساتھ نہ ہو سکی تھیں اس لیے ترجیح اس کو دی گئی کہ صبح تک جنازہ دفن نہ کیا جائے، چناں چہ وہ اگلی ٹرین سے رات میں آ گئیں۔ بہت سے عقیدت مند اور مخلصین کا بے شمار اجتماع سہارن پور مظفر نگر وغیرہ اطراف و جوانب سے ہو گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے گا۔ صبح تک یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہو گیا۔ جنازہ نماز صبح کے بعد دارالعلوم میں پہنچایا گیا۔ نو درہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا بمشکل تمام صف بندی ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب جنھوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی با قلب مضطر و چشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک کیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہدہ ہو رہی تھی۔ خواہ اس کو جذبات حسرت سمجھیے یا واقعیت و حقیقت کہیے (سوانح ص ۱۵۲)

دیو بند میں اس وقت تک بڑے بوڑھوں نے کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازے سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا۔ جنازہ مقبرہ میں پہنچا یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لیے یہ شاگرد رشید فخر استاد اپنے مقدس مرشد و استاد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ قبر تیار تھی جنازہ قریب لا کر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے چاشت کا وقت تھا نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین، امام المحدثین والعارفین، قطب عالم جامع علوم و کمالات، بطل حریت، آزاد کنندہ ہندوستان، خاتم دوران، بخاری زماں، کوہ وقار و علم، آفتاب معرفت و علوم، گنجینۂ حکمت الٰہیہ، خزینۂ احادیث و سنن نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو لحد میں اتار دیا گیا اور شریعت و طریقت کے آفتاب عالم تاب کو ہمیشہ کے لیے نظروں سے چھپا دیا گیا۔ ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا:

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے یہ گنج زر نہیں!

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضی اللہ وارضاہ آمین۔

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو — چھپا چاہ لحد میں وائے قسمت ماہِ کنعانی
جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہے ہے — پھریں ہیں ڈھونڈتے سرگشتگاں تیہ حیرانی
زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی فرقت کا — کہ تھا داغ غلامی جس کا تمغائے مسلمانی

نہیں ہے سینۂ مجروح کم گنج شہیداں سے — تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہے سب کی قربانی
فضائل ہائے شتیٰ میں سے کوئی ایک دکھلا دے — کیے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی
فقط ایک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ — بخاری و غزالی، بصری و شبلی و نُعمانی
جنہیں چھوڑا تھا تم پر حضرت امداد و قاسم نے — کریگا کون ان سب بے کسوں کی ہائے چوپانی

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

میرا دیو بند پہنچنا:

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کلکتہ بھیجنے کے تیسرے روز میں امروہہ پہنچا اور اسی روز جلسہ اور تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تار پہنچا کہ حضرت کا وصال ہو گیا اور جنازہ دیو بند جا رہا ہے۔ میں نے دیو بند جانے کا ارادہ کر لیا، لوگوں نے منع بھی کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شام کی گاڑی نکل چکی تھی اس لیے رات کی گاڑی ملی اور میں صبح کو تقریباً نو بجے دیو بند پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر جب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس آرہے ہیں۔ اپنی بدقسمتی اور بے چارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کر سکا۔ افسوس!

قسمت کی بد نصیبی کو صیاد کیا کرے
سر پر گرے پہاڑ تو فریاد کیا کرے

کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ دو چار روز رہ کر کلکتہ کا عزم کیا تو حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم مانع ہوئے اور دیو بند ہی کے قیام کا حکم فرمایا مگر میری سمجھ میں نہ آیا میں نے عرض کیا کہ حضرت نے اپنی شدید بیماری کے دوران میں جب کہ خود حضرت میری حاضری کی ضرورت محسوس فرماتے تھے اس کے علاوہ اور بھی چند اہم ضرورتیں درپیش تھیں۔ ان سب کو نظر انداز فرما کر کلکتہ روانگی کا حکم فرمایا اور کلکتہ کے کام کو سب پر ترجیح دی۔ اب وفات کے بعد کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت کا حکم پس پشت ڈال دیا جائے اور تن آسانی اختیار کی جائے۔ خصوصاً جب کہ یہاں دارالعلوم میں بہتر سے بہتر کارکن حضرات موجود ہیں، میرا یہاں قیام کس طرح درست سمجھا جا سکتا ہے؟ الغرض میں نے کلکتہ کی روانگی پر اصرار کر کے حضرت مہتمم صاحب مرحوم کو راضی کر لیا اور کلکتہ پہنچ کر اسباق حدیث شریف سنبھال لیے مگر چوں کہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی اطراف و جوانب کلکتہ میں بکثرت جلسے ہو رہے تھے ان میں بار بار حاضر ہونا

پڑتا تھا۔اس زمانے میں اندرون بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا جن میں سے مولوی بازار کے مشہور جلسۂ کانگریس وخلافت میں بھی جانے پر مجبور کیا گیا۔اجلاس کانگریس کے صدر مسٹر سی۔آر۔داس آنجہانی تھے اور جلسۂ خلافت اور جمعیۃ کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔اور دوسرا جلسہ ضلع رنگ پور میں بڑے پیمانہ پر ہوا تھا۔دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اس طرح دو مرتبہ ہندوستان یو۔پی میں آنا پڑا۔ایک جلسہ سیوہارہ ضلع بجنور کا تھا اور اس جلسۂ میں جمعیۃ کی صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم دارالعلوم نے فرمائی تھی اور جلسہ خلافت کی خدمت صدارت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔اس موقع پر بھی کانگریس کا اجلاس مشترکہ طور پر ہوا تھا اس کے صدر دہرہ دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا تھا۔ان جلسوں کے خطبوں کے ضروری اقتباسات حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند نے اپنے رسالہ میں نقل کر دیئے ہیں۔اسی طرح سہارن پور کے مدرسہ مُظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا۔جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور دو سال قید بامشقت کی عزت مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہوگئی۔

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو یہاں ختم کر دیں کیوں کہ یہ احوال اکثر تحریروں میں آگئے ہیں۔خصوصاً مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے رسالوں میں ذکر فرما دیے ہیں اور لوگوں کو معلوم بھی ہیں۔نیز خطبات اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں اس لیے مزید تحریر غیر ضروری سمجھ کر قلم فرسائی بند کرتے ہیں۔ (نقش حیات: حصہ دوم ص ۲۷۳۔۲۵۵)

نوٹ:

۲۹/اکتوبر کو جامعۂ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ) کے افتتاح کیتذکرے کے بعد حضرت شیخ الہند کی صحت کی کمزوری، دہلی کے سفر، حضرت شیخ الاسلام کے بچھڑاؤں، امروہہ وغیرہ کے اسفار کی تفصیلات اور پھر حضرت شیخ الہند کی بیماری کی شدت، پھر وصال اور دیوبند میں میت کی تدفین کے بیان کی تفصیل وتسلسل میں بعض حوالہ جات کا ان کے محل میں اندراج اور جمعیت علمائے ہند کے اجلاس کے حوالے سے بعض ضروری تفصیلات کا تذکرہ رہ گیا تھا۔

ان مقام پر یکم نومبر اور ۲۹/نومبر کے درمیان کے بعد چھوٹے ہوئے حوالے اور ضروری تفصیلات ومعلومات درج کیے جاتے ہیں۔(ا۔س۔ش)

یکم نومبر ۱۹۲۰ء: سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم اور سرکاری امداد کے عدمِ جواز کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے جسے اخبار خلافت بمبئی یکم نومبر ۱۹۲۰ء کے حوالے سے مولانا عبدالماجد قادری نے اپنے مجموعۂ فتاویٰ ترک موالات میں شامل کیا ہے۔ مولانا آزاد کا فتویٰ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ! احکام شرعیہ کی رو سے کسی مسلمان طالب علم کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی سرکاری یا ایسے کالج میں تعلیم حاصل کرے جو سرکار سے امداد قبول کرتا ہو اور سرکاری یونی ورسٹی سے ملحق ہو۔

فقیر ابوالکلام

(ترک موالات۔ ناشر پراونشل خلافت کمیٹی، شعبۂ تبلیغ۔ میرٹھ، طابع: سید المطابع کٹرا ادینہ بیگ خان، صفحہ ۱۰)

۱۹ر نومبر ۱۹۲۰ء: جمعیت علماے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تقریباً پانچ سو صرف علماے دین نے شرکت فرمائی۔ ان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد بدایوانی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالکافی الہ آبادی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا خلیل الرحمٰن سہارن پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا مرتضیٰ حسن مراد آبادی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا فضل اللہ راسی، وغیرہم کے علاوہ بنگال، بہار، یو پی، سی پی، پنجاب، سرحد، سندھ کے نامور علماے دین شامل تھے۔

حضرت شیخ الہند کا خطبۂ صدارت وقت کے اہم مسائل پر مشتمل اور دلائل شرعیہ سے مبرہن تھا۔ حضرت نے اس اجلاس میں کثیر تعداد میں علماۓ دین کی شرکت، تمام دنیا کے مسلمانوں کے مابین رشتۂ اخوت، ترکی کے معاملات میں برطانوی طرز عمل اور عالم اسلامی میں اس سے پیدا ہونے والے اضطراب، شریف مکہ کے رویے، ہندوستان کے مسلمانوں کے فرائض اسلامیہ، ترک موالات کے پروگرام اور اس کے شرعی جواز، ہندوستان میں فرائض اسلامی وسیاسی کی بجا آوری اور مسئلہ خلافت میں ترکی کی مدد کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر خطبۂ صدارت میں روشنی ڈالی۔

حضرت شیخ الہند چونکہ شدید علیل اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے زیر علاج تھے اس لیے اجلاس میں شریک نہ ہوسکے۔ حضرت مولانا مدنی کے بیان کے مطابق حضرت نے مولانا مفتی کفایت اللہ کو خطبے کے مطالب بتادیے تھے۔ انھوں نے اسے تحریر کیا تھا۔ اور حضرت نے اس پر نظر فرمائی تھی!

۱۹ / نومبر ۱۹۲۰ء: جمعیت علماے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۹ تا ۲۱۔ نومبر کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی صدارت میں دہلی میں ہوا۔ حضرت نے اس میں نہایت اہم اصول و مباحث پر مشتمل خطبۂ صدارت پیش کیا۔ اس زمانے حضرت کی صحت بہت خراب تھی اور نشست و برخواست میں دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے باوجود کہ حضرت دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر موجود تھے، جلسے میں بہ ذاتِ خود تشریف نہیں لاسکے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے حضرت کا خطبہ پڑھ کر سنایا۔ حضرت نے اپنے خطبے میں جس صراط مستقیم اور اصول کی طرف رہنمائی فرمائی تھی۔ جمعیت کے بزرگوں نے ہمیشہ انھیں اپنے سامنے رکھا اور اس صراط مستقیم سے انحراف نہیں کیا۔ سب سے پہلے حضرت نے اس جمعیت کے اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''محترم حاضرین! آج جس اجلاس میں آپ تشریف فرما ہیں اور طویل و عریض سفر برداشت کر کے شریک ہوئے ہیں یہ وہ مقدس اجتماع ہے جس کا سنگ بنیاد بحکم

۱۔	و شاورھم فی الامر	اور ان سے کام میں مشورہ لیجیے
۲۔	وامرھم شوریٰ بینھم	اور ان کا معاملہ آپس میں مشورے کا ہے۔
۳۔	و تناجوا بالبر و التقویٰ	اور وہ نیکی وتقوے کے کاموں میں مشورہ کرتے ہیں

رکھی گئی ہے یعنی حضرت حق جل شانہ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو بھی حکم فرمایا کہ آپ اپنے اصحاب کرام سے مشورہ فرمایا کریں اور پھر مسلمانوں کی شان بھی یہی بیان فرمائی کہ وہ اپنے امور کا آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کرتے ہیں، جس سے صاف طور سے ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں کے تمام کام بالخصوص ایسے کام جن کا مسلمانوں کی تمام جماعت سے تعلق ہے آپس کے مشورے سے ہونا چاہیے۔ یہ حکم تو ایسے جلسوں اور اجتماعوں کی بنیاد ڈالتا ہے جو بغرض مشورہ منعقد کیے جائیں اور ارشاد:

تناجوا بالبر و التقویٰ — نیکی اور تقوے میں مشورہ کرو۔

ان جماعتوں کی نوعیت کی تائید کرتا ہے یعنی مجلس مشاورت کا نیکی اور خوف خدا پر مبنی ہونا لازم

ہے۔ پس ایسے تمام جلسے جن کا مقصد دین مقدس کی حمایت و حفاظت ہو اور جن میں نیکی اور بھلائی کے طریقوں پر غور کیا جائے اور جن میں خدائے تعالیٰ قدوس کا خوف شامل حال رہے منعقد کرنا اور ان میں شریک ہونا حکم خداوندی کی تعمیل اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا ہے۔"

ان اصول کے بعد حضرت نے ان حالات اور خطرات کی طرف اشارہ فرمایا جو جنگ عظیم کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے اور ترکی خلافت کے لیے موت وزندگی کا مسئلہ بن گئے تھے۔ حضرت نے فرمایا:

"چوں کہ دور حاضر میں دشمنان اسلام نے مقامات مقدسہ کو غصب کر کے اور اقتدار خلافت کو پامال کر کے مسلمانوں کے واجب الاحترام جان و مال سے زیادہ عزیز مذہب کی توہین کی اور ان کے دینی بھائیوں کی جان و مال، عزت و آبرو کو برباد کیا اس لیے تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر فرض ہو گیا کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی نصرت و اعانت کریں اور اپنے پاک و مقدس مذہب کی حفاظت اور اعدائے اسلام کی مدافعت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس فرض میں چین، جاوا، ہندوستان، افغانستان، ترکستان، بخارا وغیرہ کے مسلمان برابر ہیں۔ کسی کی تخصیص نہیں۔ جن مقامات میں لڑائی ہوئی ہے جس طرح وہاں کے مسلمانوں پر فرض تھا کہ اپنے بھائیوں کی مدد اور دشمن کی مدافعت کریں اس طرح روئے زمین کے مسلمانوں پر ایشیائی اور یورپین مظلوم مسلمانوں کی امداد و اعانت اور دشمن کی مدافعت کرنا فرض ہے۔ اگرچہ امداد و اعانت کی صورت مختلف اور مدافعت کی نوعیت جداگانہ ہوگی۔

جمعیت علمائے ہند کے سامنے جہاں اور مذہبی اور علمی فرائض ہیں اس وقت یہ فریضہ بھی اس کے پیش نظر ہے بلکہ تمام دیگر فرائض سے مقدم اور اہم۔"

اس کے بعد حضرت شیخ الہند نے مسلمانان عالم میں رشتۂ اخوت کی وضاحت فرمائی اور اس رشتۂ اخوت کی بناء پر مسلمانان ہند پر جو ذمہ داریاں ترکی خلافت کی بقا اور استحکام کے سلسلے میں آپڑی تھی، ان پر روشنی ڈالی اور وہ نسخۂ شفا تجویز فرمایا جو ترکی خلافت اور دیگر ممالک اسلامیہ و مقامات مقدسہ کے تحفظ اور دشمنان اسلام کے مقابلے کے لیے تجویز فرمایا۔ حضرت کے خیال میں یہ نسخۂ شفا اس وقت کے حالات میں ترک موالات کا عمل تھا۔ حضرت نے فرمایا۔

"اب سوال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان فرائض کے ادا کرنے کی کیا سبیل ہے؟ میں پہلے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ

اقصائے عالم میں کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو ان فرائض کی واقفیت سے منکر ہو بلکہ اس میں تر دد اور شبہ رکھنے والا بھی غالباً کوئی متنفس نہ نکلے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک تلاطم برپا ہے۔ ہر شخص بے چین اور مضطرب ہے خلافت کمیٹیوں کی کثرت اور عام قومی مظاہروں اور جلسوں کی نوعیت اس کی بین دلیل ہے، مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی خوف کی وجہ سے جو ان کے دلوں پر مسلط ہو گیا ہے۔ اس فریضہ کے عائد ہونے میں طرح طرح کے شبہات نکالتے ہیں یا کسی دنیوی طمع اور لالچ اور اپنی سنہری روپہلی مصلحتوں کے باعث حیلے حوالے تراشتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ علمائے ہند کی ایک کثیر جماعت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ چوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس مدافعت اعدا کے مادّی اسباب نہیں ہیں۔ توپیں، ہوائی جہاز، بندوقیں ان کے ہاتھ میں نہیں۔ اس لیے مادی جنگ نہیں کر سکتے، لیکن انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک برطانیہ کے وزرا اسلامی مطالبات تسلیم نہ کریں، اس وقت تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ان کے ساتھ معاشرتی اور اخلاقی جنگ کی حالت ہے۔ یعنی مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم رکھیں جن سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ طاقت کو مدد پہنچے اور ان کے نشۂ غرور و تکبر کو تیز کرے۔ مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے کہ وہ دشمن اسلام کو دشمن کے مرتبے میں رکھیں اور ایسے تعلقات کو جو میل جول اور دوستی اور محبت پیدا کرنے والے ہیں، ایک دم چھوڑ دیں۔ اس اخلاقی جنگ کا نام ''ترک موالات'' ہے''۔

اس کے بعد حضرت نے ترک موالات کے جواز اور اس کے شرائط پر نہایت مدلل بحث فرمائی ہے۔

اس زمانے میں ترک موالات کی مخالفت میں بریلی اور تھانہ بھون کے دو بزرگ بہت مشہور ہوئے ان کے جواب میں مولانا معین الدینؒ اجمیری، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی کے رسائل اپنے مقصد میں لاجواب ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے خطبۂ مسئلہ خلافت کا تو کیا بہ لحاظ دلائل و براہین قاطعہ، کیا بہ لحاظ شرح و تفصیل اور کیا بہ لحاظ حسن اسلوب و انشا خلافت اور ترک موالات کے لٹریچر میں کوئی جواب ہی نہیں لیکن حضرت شیخ الہندؒ نے مانعین ترک موالات کے رد اور استدلالات کے جواب میں اس خطبے میں جو ضمنی بحث فرمائی ہے اس کے دلائل کی پختگی، براہین کی محکمی، اختصار کے کمال، انشا کے حسن اور معجز بیانی و اثر آفرینی میں اور جس طرح مطالب

کی جامعیت کے ساتھ مذکورۃ الصدر دونوں بزرگوں کا نام لیے بغیر ان کے اعتراضات وخدشات کا رد اس میں آگیا ہے، اس کی بھی کوئی نظیر موجود نہیں۔ اور جب یہ خیال فرمایئے کہ مرض الموت کے کس عالم میں اس کے مطالب ہدایت فرمائے تھے اور تحریر پر نظر ثانی فرمائی گئی تھی تو یہ ایک کرامت کا ظہور معلوم ہوتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء.

بعدہٗ حضرت نے اس میدان عمل کی طرف اشارہ کیا ہے جو وقت کے سیاسی بین الاقوامی حالات نے مسلمانانِ ہند کے سامنے نمایاں کر دیا ہے اور انہیں دعوت عمل دی ہے۔ حضرت نے فرمایا:

"دشمنان خدا ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن خدائے تعالیٰ کی نصرت اور توفیق سے مومنین کی قوت ایمانی اور استقامت ہمیشہ ان کی کوششوں کے سامنے سد سکندری ثابت ہوئی ہے اسلام خدا کا نور ہے جو ان کور چشموں کی معاندانہ پھونکوں سے کبھی نہیں بجھ سکتا۔

فرزندان توحید! آج تمھارے ایمان و اخلاص کا امتحان ہے۔ خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ کون اس کے جلال و جبروت کے سامنے سر جھکاتا ہے اور کون جو دنیا کی ناپائیدار ہستیوں کے خوف سے خدا کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔

اگر تم کو میدان محشر میں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اگر تم کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی آرزو ہے تو اُس کے پاک دین کی حفاظت کرو، اس کے مقدس احکامات کی اطاعت کرو، اس کی امانت توحید کو برباد نہ ہونے دو اور اس کی دی ہوئی عزت کو حقیقی عزت سمجھو۔

اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اخلاقی، سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل اور مکمل نظام رکھتا ہے جو لوگ کہ زمانۂ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھے رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں وہ اسلام کے پاک وصاف دامن پر ایک دھبا لگاتے ہیں!

ان کے فرائض صرف نماز، روزہ میں منحصر نہیں بلکہ اس کے ساتھ اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ان پر ہے وفقنی اللہ وایاکم لما یحبّ ویرضیٰ۔"

آخر میں حضرت نے ہندوستان کے میدان عمل کے اہم ترین مسئلے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت واہمیت اور جمعیت علمائے ہند کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلائی ہے۔ حضرت نے فرمایا:

''برادران وطن نے تمھاری اس مصیبت میں جس قدر تمھارے ساتھ ہمدردی کی ہے اور کر رہے ہیں وہ اخلاقی مروت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے۔ اسلام احسان کا بدلہ احسان قرار دیتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دے دیں، کسی دوسرے کی اٹھا کر دینے کو احسان نہیں کہتے۔ پس آپ برادرانِ وطن کے احسان کے بدلے میں وہی کام کر سکتے ہیں جو شریفانہ طور سے اپنے اختیارات سے کر سکتے ہیں۔ مذہبی احکام خدا کی امانت ہیں ان پر تمھارا اختیار نہیں اس لیے لازم ہے کہ حدود مذہب کے اندر رہ کر تم احسان کے بدلے میں احسان کرو اور دونوں قومیں مل کر ایک ایسے زبردست دشمن کے مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاؤ جو تمھارے ملک میں تمھاری آزادی کو پامال کر رہا ہے۔

جماعت علما جو حقیقتہً مسلمان کے مذہبی قائد ہیں، ان کا فرض ہے کہ اس وقت موقعے کی نزاکت اور اہمیت کو نظر انداز نہ کریں۔ آپس کے نزاع اور اختلاف میں پڑ کر اصل مقصد کو خراب نہ کریں ورنہ مسلمانوں کی خرابی اور بربادی کی تمام ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوگی علمی تدقیقات کے لیے آپ کے واسطے بہت سے میدان کھلے ہوئے ہیں عبادت اور ریاضت کے لیے بہت سی راتیں بلا شرکت غیرے آپ کو حاصل ہیں مگر جو کام کہ جبل احد اور میدان بدر میں ہوا وہ مسجد نبوی جیسی مقدس جگہ مناسب نہ تھا۔

آج احتجاج اور مطالبۂ حقوق کے میدان صرف مظاہروں کے پلیٹ فارم ہیں، خلوتیں اور تنہائی کی راتیں اس کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اگر موجودہ زمانے میں توپ اور بندوق اور ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعدا کے لیے جہاد ہو سکتا ہے باوجود یہ کہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں کبھی تامل نہ ہوگا۔ کیوں کہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ اور بندوق اور ہوائی جہاز نہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں''۔

''معزز حاضرین! برطانیہ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کسی کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرتی۔ آپ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہبی امور میں آزادی کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں؟ کیا سلطنت کا زبردست پنجہ ان کا گلا گھونٹنے کے لیے ہر وقت تیار نہیں؟ آج مولوی ظفر علی خاں اور مولوی ثناء اللہ، صوفی اقبال احمد، مولوی محمد فاخر اور اسی طرح دوسرے فرزندان ہند کس جرم میں قید خانوں میں بند ہیں؟ کیا انھوں نے مذہبی احکام کی تبلیغ

کے سوا اور کوئی گناہ کیا تھا؟ کیا مسلمانوں کے مذہبی احکام کے فتوے ضبط نہیں ہوئے کیا مسلمانوں کی ہزاروں خواتین اپنے نکاح وطلاق کے مقدمات میں غیر مسلم عدالتوں کے سامنے جا کر اسلامی احکام کے خلاف فیصلہ کرانے پر مجبور نہیں۔ کیا شفعہ و قبضہ مخالفانہ وغیرہ کے قوانین شریعت اسلامیہ کے موافق ہیں؟ یہ تمام چیزیں ہیں جن کی پوری نگہداشت جمعیت علما کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اسی طرح اسلامی مذہبی تعلیم کے لیے مفید نظام قائم کرنا اور تمام اسلامی درسگاہوں کو ایک سلسلے میں منسلک کرنا بھی علما کے ضروری فرائض میں داخل ہے۔ اسلامی اوقاف کا وسیع وعریض سلسلہ بھی ایک خاص نظم کا محتاج ہے۔ غرض کہ بہت سی اسلامی ضروریات ہیں جو علما کے ایک مرکز پر جمع نہ ہونے کی وجہ سے منتشر حالت میں ہیں۔ خدا تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے ان کو جمع کر دیا اس اجتماع کی بدولت امید ہے کہ تمام پراگندہ اور منتشر امور کا نظام درست ہو جائے گا۔''

(حضرت شیخ الہند کے مکمل بیان اور اس کے صحیح ترین متن کے لیے دیکھیے: شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی......ایک سیاسی مطالعہ'' از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری (کراچی) ص ۶۰۔۱۴۱)

۹ رتا ۲۱ رنومبر ۱۹۲۰ء: جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب ۲۸ ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرت سر میں منعقد ہوا تھا، وہیں کانگریس کا اجلاس زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو، خلافت کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت مولانا شوکت علی اور مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت حکیم اجمل خاں صاحب ہوا تھا اور ہر جگہ خلافت کے مطالبات ہو رہے تھے۔ جمعیت علماء کا دوسرا اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ رنومبر ۱۹۲۰ء کو بمقام دلی ہوا۔ اس کی صدارت شیخ الہند نے تمام علماے اُمت کی خواہش کے احترام میں نیز اپنا پیام ساری ملت و ملک کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے قبول فرمائی، اگرچہ آپ کی صحت اس وقت بہت کمزور تھی۔ ان کا خطبۂ صدارت ایک مجموعۂ حقائق تھا، جس کی بنیادی باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱)۔ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔

۲)۔ تحفظ ملت اور تحفظ خلافت خالص اسلامی مطالبے ہیں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

۳)۔ اگر موجودہ زمانے میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعدا کے لیے جائز ہو سکتا ہے اور باوجود یہ کہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور

متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا کیونکہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں ہے۔ یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔"

ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں آپ کی تقریر کے زریں الفاظ حسب ذیل تھے:

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ، نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنادیا ہے اور میں ان دونوں فرقوں کے اتحاد و اتفاق کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہیں اور کر رہے ہیں اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر صورت حال اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنادے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔"

آپ نے اس کے بعد علمائے ملت کو وصیت فرمائی کہ جو صراط مستقیم آپ نے معلوم کر لی ہے قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیں۔ جو لوگ آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور مواعظ حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجیے اور اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو "بالتی ھی احسن" ہونی چاہیے۔"

(تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۶۹-۱۶۷)

۱۹ر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء: امرتسر کے اجلاس کے تیسری نشست مورخہ یک جنوری ۱۹۲۰ء کی تجویز نمبر (۱) کے مطابق جمعیت کے سیاسی اصول اور قواعد ضوابط کا مسودہ اجلاس امرتسر کی روداد کے ساتھ جمعیت کے ناظم (عارضی) مولانا احمد سعید دہلوی نے شائع کر دیا تھا۔ اور آرا کے حصول اور غور و فکر کے بعد جمعیت کے دوسرے اجلاس دہلی منعقدہ نومبر ۱۹۲۰ء میں منظوری کے بعد جمعیت کی جانب سے شائع کر دیا گیا تھا۔

اجلاس دہلی کی منظوری کے بعد جمعیت کے مستقل عہدے دار مندرجۂ ذیل حضرات قرار پائے تھے؟

۱۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی — صدر

۲۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی: — نائب صدر

۳۔ مولانا حافظ احمد سعید دہلوی : ناظم
۴۔ ہر صوبے کی جمعیت کے صدر : اعزازی نائب صدر
۵۔ مولانا عمر دراز بیگ مرادآبادی و مولانا عقیل الرحمن ندوی سہارن پوری: معین ناظم
۶۔ شیخ فضل الرحمن سوداگر دہلی : امین (خزانچی)

(جمعیت علماے ہند کے اساسی اصول وآئین وضوابط)

سیاسی اصول وآئین پر مشتمل یہ آٹھ صفحے کا کتابچہ ہے۔ یہ اصول ۱۹/ تا ۲۱/ نومبر ۱۹۲۰ء کے عظیم الشان اجلاس میں منظور کیا گیا تھا اور ناظم جمعیت کی فرمائش پر منشی عبدالقدیر، والاخوان تاجران کتب شہر دہلی کے زیر نگرانی غنی المطابع چھتہ لال میاں، دہلی میں چھپ کر شائع ہونے تھے، غنی المطابع مولوی محمد الدین (والد گرامی منشی عبدالقدیر) کا پریس تھا۔ مولوی صاحب اپنے وقت کے بہترین خوش نویس تھے۔ مولانا محمد علی کے اخبار ''ہمدرد'' کی لوح اور اس کے مستقل عنوانات مباحث کی سرخیاں انھیں کے فن کی یادگار ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القران جلد اول کی پہلی اشاعت کی کتابت انھیں مرحوم نے کی تھی۔

۱۹ تا ۲۱/ نومبر ۱۹۲۰ء: جمعیت علماے ہند کا دوسرا سالانہ جلسہ دہلی میں شیخ الہند حضرت محمود حسن کی صدارت میں ہوا۔ حضرت کا خطبۂ صدارت نہایت فکر انگیز، ایمان پرور، مدبرانہ اور سیاسی بصیرت کا شاہکار ہے۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر مقیم تھے۔ جلسے تک آنے کی طاقت نہ تھی۔ حضرت کا خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا تھا۔

یہ جلسہ اپنے حسن انتظام اور تعداد شرکا کے لحاظ سے دہلی کے یادگار جلسوں میں سے تھا ملک کے مختلف اطراف واکناف سے تقریباً پانچ سو علما نے شرکت کی تھی۔ دہلی اور باہر کے تمام شرکا اور سامعین کا شمار حد سے باہر تھا جلسہ ۸۔ ۹ نشستوں میں تقسیم تھا جو تین دن تک جاری رہا۔ بہت سے علماے کرام نے تقاریر کیں۔ حضرت شیخ الہند کے خطبۂ صدارت کے علاوہ اختتامی اجلاس میں تقریر بھی تھی اس اجلاس میں گیارہ تجاویز پاس کی گئیں جو ملک کی سیاسی اور مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی، تعلیمی زندگی اور ان کے مختلف گوشوں کو محیط تھیں۔ مکمل تجاویز یہ ہیں:

تجویز نمبر ۱: جمعیت علماے ہند کا یہ جلسہ مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کا پورے طور سے احترام اور عمل کرنے کی دل سے سعی کیا کریں۔ وضع، لباس، اخلاق، برتاؤ، بالخصوص

فرائض میں اس کا التزام نہایت ضروری سمجھیں۔

محرک: مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب

مؤید: مولوی مرتضےٰ حسن صاحب۔ مؤید مزید۔ مولوی محمد صاحب جونا گڑھی۔

تجویز نمبر۲: جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس کامل غور کے بعد مذہبی احکام کے مطابق اعلان کرتا ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ موالات اور نصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنے حرام ہیں جس کے ماتحت حسب ذیل امور بھی واجب العمل ہیں؟

(۱) خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑ دینا

(۲) کونسلوں کی ممبری سے علاحدگی اور امیدواروں کے لیے راے نہ دینا

(۳) دشمنان دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانا

(۴) کالجوں، اسکولوں میں سرکاری امداد قبول نہ کرنا اور سرکاری یونیورسٹیوں سے تعلق قائم نہ رکھنا۔

(۵) دشمنان دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہنچانا۔

(۶) عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانا اور وکیلوں کے لیے اُن مقدمات کی پیروی نہ کرنا

محرک: مولوی حافظ احمد سعید صاحب

مؤید: مولوی مرتضےٰ حسن صاحب، مولوی داؤد صاحب غزنوی، مولوی محمد داؤد صاحب توحید۔ مولوی ابوالوفا ثناء اللہ صاحب۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ مولانا عبدالماجد صاحب۔ مولوی نثار احمد صاحب۔ مولوی عبدالحلیم صاحب صدیقی۔ مولوی آزاد سبحانی صاحب۔

تجویز نمبر۳: جمعیت علماے ہند کا یہ جلسہ ترک موالات کے سلسلے میں طلبہ کے اُن اسکولوں اور کالجوں کے چھوڑنے کو جو گورنمنٹ سے امداد حاصل کرتے اور سرکاری یونیورسٹی سے الحاق رکھتے ہیں۔ شرعی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہے۔ اور جن طلبہ نے ایسے کالجوں اور اسکولوں کو چھوڑ دیا ہے ان کے اس فعل کو اسلامی احکام کی تعمیل سمجھتا ہے۔

محرک: مولوی ابوالقاسم صاحب بناری

مؤید: ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری

تجویز نمبر۴: جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس اپنے ملکی بھائیوں کی خلافت کے مسئلے میں شرکت عمل کو بنظر امتنان دیکھتا ہے۔ اور مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے ہموطن بھائیوں سے

حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اور زیادہ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔

محرک: مولوی حافظ احمد سعید صاحب

مؤید: مولوی مرتضیٰ حسن صاحب۔ مولوی حکیم محمد ابو یوسف صاحب اصفہانی

تجویز نمبر ۵: جمعیت علمائے ہند کا یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ خلافت اسلامیہ کی حمایت اور دوسری قومی وملی ضروریات کی کثرت پر لحاظ کرتے ہوئے ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کا ایک قومی بیت المال قائم کیا جائے۔ اور سردست اس کا نظام مرتب کرنے کے لیے ایک خصوصی جماعت معین کر دی جائے جو اپنی رپورٹ تین ماہ کے اندر جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں ارسال کر دے۔

خصوصی جماعت کے ارکان یہ ہوں گے

مولانا عبدالباری صاحب

مولانا آزاد سبحانی صاحب

مولانا محمد عبدالماجد صاحب

حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب

مولانا سلامات اللہ صاحب فرنگی محل

مولوی مرتضیٰ حسن صاحب

محرک: مولانا آزاد سبحانی

مؤید: مولانا عبدالماجد صاحب

تجویز نمبر ۶: جمعیت علمائے ہند کا یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ ترک موالات کے سلسلے میں تبلیغ کا شعبہ خاص اہتمام سے جاری کیا جائے اور تمام اطراف میں وفود بھیجے جائیں۔ اور مجلس منتظمہ مبلغین و دعاۃ کا جلد سے جلد انتخاب عمل میں لائے۔

محرک: مولوی محمد صاحب جونا گڑھی

مؤید: مولوی حافظ احمد سعید صاحب

تجویز نمبر ۷: جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس علی گڑھ کالج کی ذمہ دار جماعت کے اس فعل کو کہ مسجد میں قومی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے نماز پڑھنے سے تعرض کرتے ہیں اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی اور مسجد کی حرمت کو زائل کرنے والا سمجھتا ہے۔

محرک: مولوی مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی

مؤید: مولوی ریاست حسین صاحب۔ مولوی مرتضےٰ حسن صاحب

تجویز نمبر ۸: جمعیت علمائے ہند کا یہ جلسہ حکام کی اس جابرانہ کارروائی پر جو اس نے علمائے کرام اور خدام خلافت کے ساتھ روا رکھی ہے۔ حقارت و نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ نیز جو تکلیفیں کہ

اُن بے گناہوں کو جیل خانہ میں دی جاتی ہیں اُن کو انسانی اور اخلاقی شرافت کے خلاف سمجھتا ہے اور ان مظلوموں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ ان مصائب کا پورے استقلال اور استقامت سے مقابلہ کریں گے۔

محرک: مولوی ابوالعلی صاحب غازی پوری

مؤید: مولوی عبدالقیوم صاحب۔ شیخ محمد تقی صاحب وکیل

تجویز نمبر ۹: جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس نہایت افسوس اور درد کے ساتھ بعض علمائے زمانہ کے اس طرزِ عمل سے مخالفت اور بریت کا اظہار کرتا ہے جنھوں نے ترک موالات جیسے صریح اور واضح حکم شرعی کے وجوب اور نفاذ سے انکار کیا ہے یا اس بارے میں شکوک وشبہات عارض کیے ہیں۔ نیز اعلان کرتا ہے کہ علمائے ہند ان کے اس فعل کے ذمہ دار نہیں ہیں اور عام مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ ان افراد کے قول وفعل کو عام علماء کا حکم تصور نہ کریں۔

محرک: مولوی مظہر الدین احمد صاحب شیرکوٹی

مؤید: مولوی فضل اللہ صاحب مدراسی

تجویز نمبر ۱۰: جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اُن تمام قومی درسگاہوں کے منتظمین اور ارکان کی نسبت جنھوں نے سرکاری اعانت اور سرکاری یونیورسٹیوں کے ساتھ الحاق کے ترک کرنے اور اس بارہ میں احکام شرعیہ کی سماعت واطاعت سے انکار کر دیا ہے یہ اعلان کرتا ہے کہ انھوں نے اہل اسلام کو چھوڑ کر اعداء اسلام کا ساتھ دیا ہے۔ پس جب تک وہ اپنے اس فعل سے رجوع نہ کریں تمام مسلمانوں کو ان کی اعانت وامداد سے دست بردار ہو جانا چاہیے نیز طلبہ اور اُن کے سرپرست اور اساتذہ کو ان کالجوں اسکولوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھنا چاہیے۔

محرک: مولوی داؤد صاحب غزنوی

مؤید: مولوی نثار احمد صاحب کانپوری

تجویز نمبر ۱۱: جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس ارکان ندوۃ العلماء کے اس کمال جذبۂ حق وصداقت کو جس کی وجہ سے سرکاری امداد لینے سے انھوں نے انکار کر دیا ہے نہایت استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے قومی دلی ایثار کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

محرک: مولانا سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی

مؤید: مولوی ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب ناظم جمعیۃ علمائے صوبہ بہار

یہ تمام تجویز علما کے اجلاس میں باتفاق راے منظور کی گئیں۔

جمعیت علماے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تھا اس اجلاس کے آخری جلسہ میں حضرت شیخ الہند موالا نا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جو پیغام پڑھا گیا تھا اس اہم اور غیر معمولی پیغام کے چند جملے یہ تھے:

علماءقوم کے جسم میں روح کے مانند ہیں۔انھوں نے سیاسی میدان میں پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ہم سب کو مل کر ان تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا چاہیے جن کی وجہ سے ہمارے کعبہ ہماری عزت وآبرو، ہمارے مقامات مقدسہ اور ہمارے وطنی اور قومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔میں دونوں قوموں (ہندو مسلمانوں) کے اتفاق واجتماع کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں کیوں کہ اگر صورت حال اس کے خلاف ہوگی تو وہ آیندہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی (کارروائی اجلاس دوم، جمعیۃ علماے ہند ۱۹۲۰ء بہ حوالہ مدینہ، بجنور۔۵رفروری ۱۹۴۶ء)

۲۱رنومبر ۱۹۲۰ء: اختتامی اجلاس سے رکی خطاب کے لیے حضرت شیخ الہند نے اپنا بیان قلم بند کرا دیا تھا۔مولانا شبیر احمد عثمانی نے اجلاس عام میں اسے پڑھ کر سنایا۔اس میں حضرت نے علماے کرام میں بیداری اور حرکت وعمل سے ملک وقوم کی رہنمائی کی توقع وابستہ کی۔بہت اہم اور مفید تجاویز پاس کرنے پر تحسین کی مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے پر زور دیا اور حدود شرعیہ کے اندر ہندو مسلم اتحاد کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور ایک دوسرے کے دل آزاری اور ایذا رسانی سے اعراض کرنے کی تلقین فرمائی۔

اختتامی اجلاس سے بھی متعدد اکابر علماے کرام نے خطاب کیا۔جمعیت کا یہ تین روزہ دوسرا اجلاس نہایت شان اور کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

حضرت کا یہ بیان نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے اور اس لائق ہے کہ ہر مسلمان سیاسی کارکن اسے اپنے سامنے خصوصاً ہندوستان میں سیاسی کام کرنے والوں کے لیے یہ بیان چراغ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے اس بیان کی اہمیت کے پیش نظر اس کا مکمل متن یہاں پیش کیا جاتا ہے۔یہ جمعیت کے اجلاس ہی کا آخری بیان نہیں بلکہ حضرت کی زندگی کا بھی آخری بیان ثابت ہوا۔اس بیان کے پورے آٹھ دن کے بعد ۳۰رنومبر کو حضرت نے اس جہان فانی سے انتقال فرمایا۔حضرت کا بیان یہ ہے:

"الحمد لله و سلام علیٰ عبادہِ الذینَ اصْطفے۔ امابعد!

حضرات علماء کرام، حضار جلسہ! میں اولاً جمعیت کی تمام کارروائیوں کے باحسن اسلوب انجام پانے پر خدائے قادر وتوانا کا شکرادا کرتا ہوں۔ اور ثانیاً یہ عرض ہے اگرچہ میں ناقابل انکار عذر کی وجہ سے آپ کے جلسوں کی شرکت سے بظاہر محروم رہا لیکن آپ یقین کیجیے کہ میرا دل آپ کے مجمع سے بہت کم غائب ہوا ہے اور مجھے یہ معلوم ہوکر نہایت مسرت ہوئی کہ جسم قوم کی روح (جماعت علما) نے بعض ان شعب سیاسیہ میں پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے، جن میں وہ بالکل مردہ سمجھی جاتی تھی۔ اور جن میں اگر وہ مردہ ثابت رہتی تو اسلامی عزت ووقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم وتدین اگر اب بھی عالم اسلامی کے خوفناک مصائب سے آنکھ بند رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرت ایمانی اور شرافت انسانی دونوں کے بیک وقت دفن کیے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔

اور اب بھی اگر ہم تجاویز پاس کر کے اور صرف چند ساعت کی گرمی محفل کو اپنی تمام تقریروں اور خطبوں کا ماحصل سمجھ کر منتشر ہو گئے تو ہماری مثال ٹھیک اس مریض کی سی ہوگی جو اکسیر شفا کی تکرار زبان سے بار بار کرتا ہے لیکن اس کا استعمال ایک دفعہ بھی نہ کرے۔

میں اس وقت آپ سے رخصت ہو رہا ہوں اور جو کچھ مجھے کہنا تھا خطبۂ صدارت میں کہہ چکا ہوں اور مبسوط۔ مولوی شبیر احمد عثمانی نے آپ کو آج ہی کے اجلاس میں سنایا ہے۔ اس کے ضمن میں بھی میرے مقاصد اور محسوسات نہایت خوبی سے ادا ہو گئے ہیں اور حضرت علمائے امت دینین نے بحث وتمحیص کے بعد جو امور طے کیے ہیں ان سے یہ بندہ ضعیف عملاً علیحدہ نہیں ہے۔ اس لیے اب مجھ کو اس سے زائد کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم سب مل کر متوکلاً علی اللہ ان طے شدہ تجاویز پر عمل کرنا اور عمل کرانا شروع کردیں جن سے ہمارے ایمان ہمارے کعبہ، ہماری خلافت، ہماری عزت وآبرو اور ہمارے مقامات مقدسہ اور ہمارے وطنی اور قومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت بھی ہم نے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عاقبت حاصل کرنے کا یہ آخری موقع ہوگا جس کو جان بوجھ کر ہم ہاتھ سے کھوئیں گے۔ جو صراط مستقیم آپ نے معلوم کرلیا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیے اور یمین وشمال کی طرف مطلق التفات نہ کیجیے

ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ	میرے اس سیدھے راستے کی اتباع کرو
و لا تتبعوا السبیل فتفرّق بکم	اور راستہ سے نہ ہٹو تا کہ تم سیدھی راہ سے

عن سبیله.(الانعام : ۱۵۴)　　　　بھٹک نہ جاؤ

جولوگ اس وقت آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور موعظت حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجیے اگراس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو ''بالتی ہی احسن'' ہونا چاہیے کچھ شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنادیا ہے اور میں ان دونوں کے اتفاق واجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج (نتیجہ خیز) سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں۔اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگراس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ناممکن بنادے گی اور دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر اگر صلح وآشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہوان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست کر سکے گی۔

ہاں! میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت وآشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کر لیجیے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی حدود میں اس سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح وآشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی ایک فریق کی ایذارسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہورہا ہے۔مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذارسانی کے درپے رہتے ہیں۔

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کررہا ہوں بلکہ یہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعما،لیڈروں سے ہے کہ ان کے جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیے یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات

اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے مہلک نہیں البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورے کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

اب آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ، ہم کو اور آپ کو نیکی اور سمجھ دے اور ہمارے دلوں کو سیدھا کرنے کے بعد کج نہ کرے اور ہماری وجہ سے ہمارے مذہب پر دوسروں کو تضحیک کا موقع نہ دے اور ہم کو ہر ایک آسان اور کٹھن منزل میں صبر و استقلال کے ساتھ ثابت قدم رکھے اور اس وقت کے حالات سے بہتر حالات میں پھر ہم کو جمع کرے آمین یارب العٰلمین''!

(حضرت شیخ الہند کے بیان کے صحیح ترین متن کے لیے دیکھیے: ''شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی......ایک سیاسی مطالعہ'' ص ۶۳۔۱۶۱)

۲۹ر نومبر ۱۹۲۰ء: مذکورہ تاریخ کو مولانا آزاد نے مولانا ملیح آبادی کے نام جو خط لکھا ہے اس کا خاص حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں ہے۔ اس خط سے بعض شخصیات کی نفسیات اور معاملات کے بعض خفی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کا مطالعہ قارئین کے لیے خاص دل چسپی کا باعث ہوگا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''اخ العزیز!

السلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ باطمینان مشغول کار ہوں گے۔ دہلی میں مولانا محمود حسن صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ مولوی شبیر احمد اور مولوی حسین احمد دونوں کو اجازت دے چکے ہیں۔ مولوی شبیر احمد بالکل تیار ہو گئے تھے۔ لیکن بعد کو انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں سے علیحدگی ان کے بعض خاص مقاصد کے لیے مضر ہے۔ مولانا کے ساتھ ایک پوری جماعت اصحاب اغراض کی لگی ہوئی ہے۔ غرض ایک ہے اور غرض مند متعدد، اس لیے رقیبانہ کشمکش ہو رہی ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہی تنہا رہے اور دوسرا الگ ہو جائے۔ اور اس طرح ذاتی اغراض و مفاد بلا زحمت حاصل ہوں۔ اس کشمکش میں ایک فریق مولوی شبیر احمد ہیں۔ پہلے اُنھوں نے خیال کیا تھا کہ مدرسہ کی ریاست ان کے قبضے میں آتی ہے، اس لیے بلا تامل آمادہ ہو گئے۔ اب سوچتے ہیں کہ یہ

علاحدگی مولانا حسین احمد کے حلقے کے منافع و مفاد سے انھیں کہیں الگ نہ کر دے اور دوسرے اس پر قابض نہ ہو جائیں۔ اس لیے متردد ہو رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی حسین احمد صاحب لے لیے جائیں۔ مولوی شبیر سے زیادہ متین و سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں اور درس و تدریس میں بھی کم نہ ہوں گے۔ وہ بخوشی تیار ہو گئے ہیں صرف ایک ہفتہ کی مہلت چاہی ہے۔ مولوی عبداللہ مصری کو کہہ آیا تھا کہ انتظار کریں اور پھر اپنے ساتھ کلکتہ لے جائیں۔ غالباً اب وہ روانہ ہو گئے ہوں گے یا روانگی کے لیے آمادہ ہوں گے۔ آپ طلبہ میں اعلان کر دیں کہ جمعیۃ العلماء کے جلسے اور مولوی محمود حسن صاحب کی علالت کی وجہ سے تاخیر ہو گئی، اب مولوی حسین احمد آ رہے ہیں، جو پندرہ سال تک مدینہ منورہ میں درس حدیث دیتے رہے ہیں۔ تمام حلقۂ دیو بند میں مولانا کے بعد ہر طرح بہتر و افضل ہیں۔

جیسا کہ پہلے سے خیال جمعیۃ العلماء سے بجز اس کے کوئی فائدہ نہ ہوا کہ تحریک موالات پر ایک فتویٰ تیار ہو گیا، اور یہ بہر حال ایک مفید اور ضروری کام ہوا۔

اُمید ہے آپ مطمئن اور خوش حال ہوں گے۔ اگر مولوی حسین احمد صاحب اب تک نہ آئے ہوں تو ایک تار مولانا محمود حسن احمد صاحب بذریعہ ڈاکٹر انصاری دریا گنج، دہلی کے نام بھیج دیجیے کہ مولوی حسین صاحب جلد آئیں۔ میں ان شاء اللہ ہفتہ عشرہ میں کلکتہ پہنچتا ہوں۔ خط کا جواب آپ بانکی پور کے پتے سے بذریعہ مسٹر مظہر الحق صاحب روانہ کریں۔ ابوالکلام

اکالی دل:

''اکالی'' کے لفظی معنی 'اکال' یعنی واحد خدا کی پرستش کرنے والے کے ہیں۔ اکالیوں کا فرقہ دراصل سکھوں کے درمیان ایک اصلاحی اور خالص مذہبی فرقہ ہے۔ یہ فرقہ خالص سکھ مت اور اپنے زہد و اتقاء کے لیے مشہور ہے۔ بطور ایک سماجی اور سیاسی تحریک کے اکالی تحریک اس صدی کی دوسری دہائی میں پنجاب میں گرودواروں اور مقدس مقامات کے بہتر انتظام کے لیے چلائی گئی۔ پنجاب میں بیشتر گرودوارے سکھوں کے ''اداسا'' فرقہ کے مہنتوں کے ہاتھ میں تھے جو ان کی آمدنی کو اپنے ذاتی تصرف میں لاتے تھے۔ اداسا فرقہ نیم ہندو اور نیم سکھ ہے۔ اکالیوں نے ان گرودواروں کو سکھ قوم کے اجتماعی انتظام میں چلانے کی تحریک چلائی اور نومبر ۱۹۲۰ء میں امرتسر میں اکال تخت سے ''شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی'' (مرکزی گرودوارہ انتظامی کمیٹی) کے قیام

کا اعلان کیا۔ اس کمیٹی کی تحریک پر اکالیوں نے پنجاب کے گرودواروں کو بزور طاقت اداسا مہنتوں سے چھیننے کی کوشش کی۔ ''اکالی دل'' اسی تحریک کی پیداوار ہے۔ اکالی دل شروع میں ایک نیم فوجی تنظیم تھی جس کا مقصد گرودواروں کو شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی کے انتظام میں لانا تھا۔ اکالی دل کو سیاسی پارٹی میں تبدیل کرنے اور سکھستان یا آزاد پنجاب کا مقصد اپنانے کا سہرا دل کے شروع کے دو اہم رہنماؤں ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ کے سر بندھا۔ ۱۹۲۵ء میں اکالی دل کے ایجی ٹیشن کے طفیل مرکزی حکومت نے سکھ زیارت گاہوں اور گرودواروں کا ایکٹ ۱۹۲۵ء میں بنایا جس کے تحت شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی کو سرکاری اور قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اکالی دل نے پنجاب کی سیاست میں موثر رول اس وقت سے ادا کرنا شروع کیا جب ماسٹر تارا سنگھ اکالی دل اور شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی دونوں کے صدر چنے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں تارا سنگھ نے دل کی جانب سے نہرو کمیٹی کی رپورٹ کی مخالفت کی کیوں کہ ان کی نظر میں اس کی دفعات سکھ اقلیت کے مفادات کا تحفظ نہیں کرتی تھیں، ان کی رہنمائی میں شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی نے سکھ پارلیمان کی اور اکالی دل نے اس کی فوج کی حیثیت اختیار کی۔ پنجاب کی انتخابی سیاست میں دل سے پہلے ۱۹۳۶ء کے صوبائی چناؤ میں حصہ لے کر داخل ہوا۔ اور تب سے ہندوستان کی آزادی اور تقسیم تک آزاد سکھستان کے مطالبہ پر قائم رہا۔ آزادی کے بعد سے دل کا مقصد سکھوں کے حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا اور ریاستوں کے لیے مزید خود مختاری حاصل کرنا ہے۔ آزاد پنجاب کا مطالبہ ناکام ہونے کے بعد اور ۱۹۵۶ء میں لسانی ریاستوں کی تشکیل کے بعد اکالی دل نے ''پنجابی صوبہ'' کا مطالبہ پیش کیا جسے بالآخر اس نے اپنے دوسرے رہنما سنت فتح سنگھ کی قیادت میں ۱۹۶۸ء میں حکومت ہند سے منوایا اور جس کے نتیجہ میں مشرقی پنجاب کو پنجابی ریاست اور ہریانہ ریاست میں تقسیم کر دیا گیا جون ۱۹۷۷ء کے چناؤ میں اکالی دل نے صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر کے پہلی بار اپنی حکومت بنائی جس کے وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل تھے۔

(فرہنگ سیاسیات، مرتبین: محمد محمود فیض و حسن علی جعفری، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء ص ۶۷۔۶۶)

۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء: ترک موالات کے سلسلے میں جو مدارس پورے ملک میں قائم ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مدرسہ مدرسۂ اسلامیہ کے نام سے مسجد ناخدا کلکتہ میں قائم ہوا۔ اس میں طلبہ کی زیادہ تعداد وہ ہے جو مدرسۂ عالیہ کلکتہ کو چھوڑ کر آئے تھے۔ مدرسہ کا آغاز تو کر دیا گیا تھا لیکن اس کا باقاعدہ افتتاح ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی سے کرایا گیا۔ اس موقع پر گاندھی جی نے ایک

تقریر بھی کی۔ مولانا آزادؔ مدرسہ کے نگراں، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مہتمم اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس تھے۔ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) اخراجات اور مدرسین کی تنخواہوں وغیرہ کا دارومدار اس وقف پر تھا جو جامع مسجد کے مدرسہ کے لیے مخصوص تھا اگرچہ فنڈ میں روپیہ کی کمی نہ تھی لیکن متولیوں کو نہ تعلیم سے دلچسپی تھی، نہ قومی زندگی میں اس قسم کے مدارس کی اہمیت کا احساس تھا۔ انھوں نے نہ تو مدرسہ کے اجرا و قیام کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا، نہ اس کے مالی معاملات میں اپنی ذمہ داری محسوس کی اس لیے جن مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ مولانا آزاد کے ان رُقعات سے ہوتا ہے جو انھوں نے اس سلسلے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؔ کو لکھے ہیں۔

(مکاتیب ابوالکلام آزاد (مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری): صفحہ ۱۱۱۔۱۱۰)

۲۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء: آل انڈیا کانگریس کا پینتیسواں سالانہ اجلاس ناگپور میں شری سی وجے راگھوا چاریہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ۱۴۵۸۲ مندوبین شریک ہوئے، جن میں ۱۰۵۰ مسلمان تھے۔ ترک موالات کی تجویز بالاتفاق منظور ہوئی

(حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۹۵۔۹۴)

مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت محمد علی جناح کلکتہ میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تجاویز پر جناح کا رویہ انتہائی محتاط تھا انھوں نے خطبۂ صدارت میں ان تجاویز کی طرف توجہ مبذول کرائی لیکن ان کی تائید نہ کی صرف اس قدر کہا کہ ان تجاویز پر ہر شخص کو اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔ دراصل وہ ترک تعاون کے حق میں نہ تھے جس کا عملی مظاہرہ انھوں نے صرف تین ماہ بعد کانگریس کے ناگپور سیشن میں کیا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۹۲۔۹۱)

کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگ پور:

یہ نہایت اہم اجلاس بڑا ہی کامیاب رہا۔ دراصل اس میں عدم تعاون کے کلکتہ کے پروگرام کی توثیق کرنا مقصود تھا اس کے لیے بڑی زور آزمائی ہوئی۔ عدم تعاون کے مخالفین نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اسے ناکام بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس مخالفت میں پیش پیش تھے وہ بنگال اور آسام سے دوسو پچاس مندوبین لائے تھے ڈاکٹر بی پٹا بھائی

سیتہ رامیہ تاریخ کانگریس کے مصنف کے مطابق انھوں نے مندوبین کے اخراجات اندازاً چھتیس ہزار روپے اپنی جیب سے ادا کیے مہاراشٹر بھی مخالفین میں شامل تھا۔ لالہ لاجپت رائے کو جنگ کے زمانے میں حکومت نے شک کی بنا پر ملک سے نکال دیا تھا وہ امریکہ سے واپس پہنچے ہی تھے کہ عزت افزائی کی خاطر کلکتہ کے اجلاس کی صدارت انھیں پیش کی گئی وہ حکومت سے تعلقات منقطع کرنے کی پالیسی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ناگپور کانگریس کے صدر بھی عدم تعاون کے مخالفوں میں شامل تھے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ عدم تعاون کا مقصد سوراجیہ ہونا چاہیے نہ کہ صرف خلافت اور پنجاب کے حادثات، گاندھی جی نے اس سے اتفاق کیا۔ تو انھوں نے مخالفت ترک کر دی۔ اس اجلاس میں گاندھی جی کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی وہ عدم تعاون کی قرارداد سی۔ آر۔ داس سے پیش کرانے میں کامیاب ہو گئے، جبکہ لالہ لاجپت رائے نے تائید کی۔ عدم تعاون کی تجویز کی مخالفت کرنے والے صرف مسٹر جناح تھے انھوں نے مخالفت میں تقریر بھی کی ''تحریک خلافت'' کے مصنف قاضی محمد عدیل عباسی کے مطابق ''مسٹر جناح کو کوئی تائید کرنے والا بھی نہ ملا اور تجویز منظور ہو گئی'' مولانا آزاد رقمطراز ہیں۔

''اسی سیشن سے مسٹر جناح کانگریس سے قطعی طور سے الگ ہو گئے۔''

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۱۰۳)

۲۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء: آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو ناگپور میں منعقد ہوا۔ اس کے صدر سی۔ وجے راگھوچاریہ تھے۔ حکومت برطانیہ نے اسی زمانہ میں پرنس رف ڈیوک آف کناٹ کے ہندوستان کے دورہ کرنے کا پروگرام تیار کیا۔ وہ نیے جس لیٹو کونسل کا افتتاح کرنے اور ہندوستان کو یہ فریب دینے آرہے تھے کہ برطانیہ نے ہندوستان سے جو وعدہ کیا تھا وہ ایفا کر دیا اور اسے نیابتی حکومت کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ گاندھی جی نے تجویز کی کہ ڈیوک کا بائیکاٹ کیا جائے اور تجویز پاس ہونے کے بعد ڈیوک آف کناٹ کو ایک خط بھی لکھا، جس میں یہ دلائل ثابت کیا کہ وہ کیوں بائیکاٹ پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ڈیوک موصوف کی کوئی اہانت منظور نہیں ہے، بلکہ اس نظام حکومت سے احتراز منظور ہے، جس کا بدلنا حق و انصاف کے لیے ضروری ہے اور جو ڈیوک صاحب موصوف کے اختیار سے باہر ہے۔

گاندھی جی ہمیشہ یہ کہتے تھے اور یہی سبق دیتے تھے کہ ہماری لڑائی انگریز سے نہیں ہے بلکہ اس طریقۂ حکومت سے ہے اور اس نظام سے ہے جو عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہے۔

ناگپور کانگریس کے اجلاس کے لیے گاندھی جی نے ترک تعاون کی تجویز انگریزی میں لکھی تھی۔ اس کے ابتدائی الفاظ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''چونکہ کانگریس کی راے میں حکومت ہند ملک کے اعتماد سے کلیتاً محروم ہوگئی ہے اس لیے باشندگان ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان میں سوراج قائم کیا جائے۔''

کانگریس کے اس اجلاس میں اس تجویز کا ترجمہ مولانا محمد علی نے پڑھ کر سنایا۔ یہاں بھی مسٹر جناح ترک تعاون کی تجویز کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ لیکن دیہاتی میں مثال ہے کہ آندھی میں ہاتھ کے پنکھے کی کیا قیمت ہوتی ہے، مسٹر جناح کو کوئی تائید کرنے والا بھی نہ ملا اور تجویز منظور ہوگئی۔

(تحریک خلافت، ص ۶۴ ـ ۱۶۳)

دسمبر ۱۹۲۰ء: ۲۰ ـ ۱۹۱۹ء میں جب کہ برٹش حکومت نے ہندوستان میں اور خاص طور پر پنجاب میں اہل وطن کے خلاف اور عالم اسلام میں ترکی خلافت اور اہل اسلام کے ظلم وتشدد اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور اہل ملک نے ترکی خلافت اور مقامات مقدسہ کے تحفظ، عوام پر مظالم کے انسداد، ظالمانہ قوانین کی اور وطن کی آزادی کے لیے ترک موالات کا پروگرام پیش کیا تھا تو کچھ نامور علماء ومشائخ نہ صرف خاموش رہے بلکہ انھوں نے گائے کی قربانی و ہندوؤں سے عدم موالات، ترکی عثمانی خلافت کے عدم جواز، ترکی زعماء کی غیر اسلامی زندگی، شریف مکہ کی بغاوت کے وجوب وغیرہ مسائل کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ نہ صرف برادران وطن کے خلاف نفرت پھیلا رہے تھے جس سے برٹش استعمار کے مقاصد کی تکمیل ہو رہی تھی۔ خواجہ حسن نظامی اور بریلی وتھانہ بھون کے بزرگ حکومت مستعمرہ کے خاص آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف غلط مسائل کو چھیڑا بلکہ غلط وقت پر بھی چھیڑا۔ اس کے لیے غلط اور اشتعال انگیز زبان استعمال کی بلکہ غلط انداز بحث و نظر، غلط اسلوب بیان بھی اختیار کیا۔ ان کی خاموشی سے استعمار کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور تحریر وگویائی نے فضا میں نفرت کا زہر پھیلایا اور تعصب کا الاؤ روشن کیا۔ ان سے فائدہ صرف انگریزی حکومت کو اور نقصان ملک کے عوام کو، آزادی وطن کی تحریک کو، مقامات مقدسہ کی حرمت کو، ترکی خلافت کے وجود، حکومت کے استحکام کو اور مملکت اسلامیہ ترکیہ کی بقاء کو اور سب سے بڑھ کر اسلام کی عزت کو پہنچا۔ افسوس انھیں ایک عالم دین اور شیخ طریقت حضرت تھانوی کے خلاف ایک جملے کی تلخی گوارا نہ ہوئی اور چیخ اٹھے لیکن کعبۃ اللہ کی حرمت، اسلامی خلافت کی شان وشوکت اور مسلمانوں کی حکومت واقتدار کے زوال پہ نہ ان کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور نہ ان کے قلم سے

دشمنان اسلام و مسلمین اور ہادمین خلافت اسلامیہ کے خلاف ایک جملہ نکالا۔ یہ داستان بہت طویل اور بڑی دردناک ہے اس کا کچھ اندازہ حضرت مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم دہلوی اور بعض علماء کی اس مراسلت سے بھی ہو جاتا ہے جو یہاں درج کی جاتی ہے۔ ''رسالہ ترک قربانی گاؤ خواجہ حسن نظامی (دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۲۰ء، خواجہ بک ڈپو، دہلی صفحات ۲۴) کا اور تحذیر المومنین مولانا ظفر احمد عثمانی یکے از خلفائے خانقاہ تھانہ بھون کا تھا۔ ان کی زبان اور طرز تحریر کا اندازہ حضرت مفتی صاحب کے ان خطوط کے مطالعے ہی سے ہو جاتا ہے۔

خط از مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب بنام......

مولانا المحترم دامت الطافکم۔ نوازش پہنچا۔ رسالہ ترک قربانی گاؤ کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ دیکھا۔ مجھے بھی اس رسالے کے مضامین متعلقہ حضرت مولانا تھانوی کے پڑھنے سے سخت رنج اور قلق ہوا ہے۔ کیونکہ مضمون مذکور میں بہت سی باتیں خلاف واقع اور بہت سی خلاف شان اہل اللہ اور بہت سی دھوکا دینے والی ہیں۔ اور مجموعی طرز کلام توہین آمیز ہے۔ نہ صرف مجھے بلکہ ساری جماعت کو اس کا رنج ہے۔ اسی رنج کے ساتھ مجھے اس کا بھی بیحد قلق ہے کہ اس تمام کشمکش کی ابتدا رسالہ تحذیر المومنین سے ہوئی اور اس میں بلاوجہ مولانا عبدالباری اور خواجہ حسن نظامی کا نام لے کر ان کے متعلق لکھا گیا جو لکھا گیا۔ (اس میں) اظہار حق کا مضائقہ نہ تھا لیکن نام لینے اور لکھنے کی اور ذاتیات سے تعرض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اور مزید براں وہ رسالہ خانقاہ امداد یہ سے شائع ہوا جس کے متعلق لوگوں کو یہ علم ہے کہ یہاں کی تمام مطبوعات مولانا کی نظر سے گزرنے اور اجازت کے بعد شائع ہوتی ہیں۔ اسی طرح مجھے اس کا بے حد قلق ہے کہ اسلام کی موجودہ مصیبت ایسی عظیم الشان مصیبت ہے کہ کسی شخص کو خدا کے سامنے خاموشی کا کوئی عذر نہ ہوگا۔ بالخصوص اس حد تک کہ وہ زبان سے تغییر منکر پر قادر ہو پھر بھی جو علما اس وقت تک ساکت ہیں اور ان کی خاموشی اعدائے اسلام کو فائدہ پہنچا رہی ہے اس کا بھی بے حد قلق ہے۔

جناب کا یہ فرمانا کہ دہلی میں کسی نے خواجہ حسن نظامی کی تحریر کا رد لکھا یا نہیں؟ نہ لکھا گیا ہو تو میں جواب شائع کردوں۔ اس کے متعلق گذارش ہے کہ تھانہ بھون سے انھیں مولوی ظفر احمد نے مختصر سا رد تو رسالہ الامداد بابت ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں لکھ دیا ہے اور آئندہ مفصل رد لکھنے اور شائع کرنے

کا اسی رسالہ میں وعدہ کیا ہے۔ رہا یہ کہ میں رد لکھوں تو اس کے جواب میں گذارش ہے کہ میں آج کل اس کام کو دشمنان اسلام کی اعانت سمجھتا ہوں۔ جن کا مقصد یہی ہے کہ کسی طرح ہندوستان کا اتفاق ٹوٹے ہندو مسلمان لڑیں یا مسلمان مسلمان لڑیں۔ ان کی قوت کمزور ہو اور گورنمنٹ کو اپنا الو سیدھا کرنے کا موقع ملے۔ بیشک حضرت حکیم الامتہ کے خلاف شان الفاظ استعمال کیے جانے سے مجھے صدمہ ہے۔ لیکن یہ صدمہ ایک مسلمان کے لیے اس صدمے سے کم ہے کہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے محترم ذرات زمین کی کفار کے ناپاک بوٹوں اور جوتوں سے توہین ہو اور حرم محترم پر گولے گریں اور غلاف کعبہ جل جائے، جدہ کے باب المکۂ پر نصاریٰ گولہ باری کریں اور قسطنطنیہ پر انگریزی قبضہ ہو، سلطان اسلام شاہ شطرنج بنا کر بٹھا دیے جائیں، فوج سے ہتھیار رکھوا لیے جائیں، سمرنا میں ہزاروں مسلمان خواتین کی عصمت دری ہو اور ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوں اور ہم ابھی آپس کے قصوں میں ہی لڑتے جھگڑتے رہیں اور اپنی شخصیات کی مرتفع سر بفلک عمارتوں کو ساتویں آسمان تک پہنچانے کی کوشش جاری رکھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ سینے اور چولی پر آگ لگ جانے کے بعد کون عقلمند عجلت کے ساتھ اس کو بجھانے کے واسطے جھکنے کو اس وجہ سے ناجائز قرار دے گا کہ کہیں جھکنے کی وجہ سے سر کی ٹوپی گر کر عزت نہ جاتی رہے۔ میں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تحذیر المومنین میں مولوی ظفر احمد صاحب نے میرا نام بھی لکھا اور مجھے توجہ دلائی کہ میں معاملات متنازعہ میں کچھ تحریر بازی شروع کردوں لیکن میں نے بالکل سکوت کیا اور کوئی تحریر جس میں باہمی منازعت کی جھلک ہو نہیں لکھی اسی وجہ سے میں باوجود اس کے کہ رسالہ ترک قربانی گاؤ سے مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے اس کے متعلق کوئی تحریر لکھنی اور شائع کرنی اور ذاتیات سے تعرض کو پسند نہیں کرتا۔ خواجہ حسن نظامی کی ''بیہودگی'' سے (جیسا کہ آپ نے یہ لفظ لکھا ہے) ان اعدائے اسلام کی بیہودگی ہزاروں درجہ بڑھی ہوئی ہے، جنھوں نے سیزدہ صد سالہ اسلامی شوکت کو تباہ کر دیا، مسلمانوں کی عزت کو برباد کر دیا، اماکن مقدسہ کا احترام ضائع کر دیا۔ افسوس! صد افسوس!

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں
برزوال ملک اسلام وضیاع مسلمین

بہر حال یہ میری رائے ہے اگر جناب اور احباب کی رائے اس کے خلاف ہو تو باادب امید ہے کہ اس سے مجھے بھی مطلع فرما کر استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

۳ خط دیگر از مولانا مفتی کفایت اللہ بنام......

۴ر دسمبر ۱۹۲۰ء:

مولانا المکرم دامت معالیکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ نوازش نامہ پہنچا جناب نے رسالہ ترک قربانی گاؤ کے مضامین متعلقہ مولانا تھانوی پر جس صدمہ اور رنج کا اظہار فرمایا ہے اس میں یہ خاکسار بھی بوجوہ ذیل شریک ہے۔

۱) رسالہ مذکورہ میں بعض مضامین متعلقہ مولانا تھانوی بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں۔

۲) بعض مضامین علم اور علما کی توہین کرتے ہیں

۳) بعض مضامین شریعت کی کسوٹی پر کھوٹے ہیں۔

۴) مجموعی طرز تحریر توہین آمیز اور زیر بحث امور سے ہٹ کر ذاتیات پر حملے کے قریب ہے۔ اگر چہ مولوی ظفر احمد صاحب نے رسالہ الامداد بابت ماہ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں اس کا جواب دیا ہے اور آئندہ مفصل جواب دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اگر آپ یا کوئی اور صاحب جواب دینا چاہیں تو مضائقہ نہیں۔ لیکن جو صاحب جواب دیں ان کو امور ذیل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) جواب سے غرض محض للّٰہیت ہو عصبیت کو دخل نہ ہو۔

(۲) ذاتیات پر حملہ نہ ہو۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل سے مضامین کا جواب مہذب طریق سے ہو۔ اور ''اذا مروا باللغو مروا کراماً'' سے تجاوز نہ کیا جائے۔

(۳) اس کا لحاظ رکھا جائے کہ اس ناگوار کشمکش کی ابتدا مولوی ظفر احمد صاحب کے رسالے تحذیر المومنین سے ہوئی ہے۔

(۴) زمانہ موجودہ کی اسلامی تباہی اور مسلمانوں کے مصائب اور اعدائے اسلام سے ترک موالات کا پہلو مرئی رہے تا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ کعبۃ اللہ کی بے حرمتی ہوئی، روضۃ الرسول کی توہین کی گئی، خلیفۂ اسلام کی عزت خاک میں ملائی گئی، سلطنت اسلامیہ تباہ کی گئی اور اس کے متعلق ایک لفظ نہ کہا گیا اور نہ لکھا گیا۔ اور ان کے ایک عالم (مولانا تھانوی) کے متعلق ایک شخص نے گستاخانہ الفاظ لکھ دیے ۔ تو اس قدر جوش آ گیا۔ تو گویا ان لوگوں کے نزدیک مولانا کی عزت روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، کعبۃ اللہ، خلیفۂ اسلام، اسلامی سلطنت سے بھی زیادہ ہے؟

(۵) جمعیۃ علمائے ہند نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قبلہ نور اللہ مرقدہ کے

فتوے اور تمام قومی مجلسوں کے فیصلے کے بموجب اعداے اسلام (گورنمنٹ برطانیہ) کے ساتھ ترک موالات کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اور ترک موالات کی کامیابی ہندو مسلم اتحاد پر مبنی ہے۔ حدود شرعیہ کے اندر رہ کر ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اسی طرح مسلمانوں کا باہمی اتفاق نہایت ضروری ہے اور تمام ایسے کام جو اتحاد میں رخنہ ڈالیں گورنمنٹ کی خوشنودی کا باعث ہیں۔ اس لیے جواب لکھنے والے کو اس کا اہتمام ضروری ہے کہ وہ باہمی اتفاق کو توڑنے والا نہ بن جائے اور اپنی تحریر سے تفرقہ پیدا کرنے والا نہ سمجھا جائے۔ ورنہ وہ گورنمنٹ کا آدمی اور اعداے اسلام کا حامی سمجھا جائے گا اور اس کی تحریر بجائے مفید اثر پیدا کرنے کے مضر نتائج پیدا کرے گی۔

بہر حال میں نے نہایت دل سوزی کے ساتھ اور اس صدمے کی وجہ سے جو مجھ کو حالات حاضرہ اور مضامین متعلقہ مولانا تھانوی کی وجہ سے ہے۔ یہ سطریں لکھ دی ہیں۔ اور امید کرتا ہوں کہ اگر جناب کی راے اس کے خلاف ہوگی تو اس سے مجھے مطلع فرما کر ممنون بنائیں۔ مجھے بے حد مشغولی کی وجہ سے بالکل فرصت نہیں ہے کہ جواب لکھنے کا ارادہ کروں۔ اور نہ اس قسم کی غیر مفید مجادلانہ بحث کو میں پسند کرتا ہوں۔ فقط ۔ ۲۲ رربیع الاول ۱۳۳۹ھ

خط حضرت مفتی اعظم بنام مولانا اشرف علی تھانوی

۱۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء: جناب محترم دامت فیوضہم! بعد سلام مسنون عرض ہے کہ عرصے سے حاضری کا ارادہ تھا۔ مگر بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔ اب تصمیم عزم کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ جناب والا سے اجازت حاصل کرلی جائے۔ اس لیے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ اگر اجازت ہو تو حاضر ہوں حاضری سے غرض جمعیۃ علماے ہند اور مسائل حاضرہ کے متعلق کچھ عرض معروض کرنا ہے۔ اس غرض کے لیے میں بلاشرکت غیرے صرف جناب سے عرض کروں گا اگرچہ میرے ساتھ ایک اور صاحب بغرض زیارت حاضر ہوں گے مگر ان کو بھی اس گفتگو میں کوئی مداخلت و شرکت کا موقعہ نہ ہوگا۔ محمد کفایت اللہ

جواب خط از حضرت مولانا تھانوی!

مکرمی سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ، الطاف نامہ نے ممنون فرمایا۔ بسر و چشم تشریف لایئے۔ مگر قبل تشریف آوری اتنا معلوم ہو جائے کہ جن امور میں آپ کچھ فرمانا چاہتے ہیں آیا صرف

میرے سن لینے پر ہی کفایت فرمالیں گے یا میرے ذمہ جواب بھی ہوگا۔ والسلام۔
خاکسار اشرف علی از تھانہ بھون (۱۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء)

جواب الجواب از حضرت مفتی اعظم!

۱۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء۔

مولانا المحترم دامت فیوضہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ میں جناب والا کی خدمت میں جن مسائل کو پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہوں ان میں جناب والا کی رائے اقدس معلوم کرنا مقصود ہے۔ اگر میرے معروضات میں غلطیاں ہوں تو ان کی اصلاح کی توقع ہے اور اگر صحیح ہوں تو تصویب کی تمنا۔ صرف میں سنادوں اور جناب کچھ نہ فرمائیں اس میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں۔ اس لیے براہ کرم اس صورت کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

جواب از حضرت مولانا تھانوی:

مکرمی سلمہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ کا حاصل دو امر ہیں! ایک مسائل پیش کرنے پر احقر کی رائے معلوم ہو جانے کی غایت کا مرتب ہونا۔ دوسرا میرے کچھ عرض نہ کرنے پر کسی غایت کا مرتب نہ ہونا۔ سو امر اول کے متعلق یہ عرض ہے کہ خود یہ غایت محتاج غایت ہے مجھ کو اس رائے معلوم کرنے کی کوئی غایت معلوم نہیں ہوتی نہ رفع تردد نہ عمل (اور استقراء سے معتد بہ غایت یہی ہے) کیونکہ اب تک بلا تردد اپنی رائے پر عمل فرمایا گیا ہے۔ اور محض تخطیہ و تصویب کوئی معتد بہ غایت نہیں۔ علاوہ اس کے تخطیہ کی شق میں اگر میں نے اس پر دلیل قائم نہ کی یا قائم کی مگر آپ کا جواب نہ سنا تو گویا آپ کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا ہوا جو جائز نہیں اور اگر اس کی بھی نوبت آئی تو مناظرہ کا رنگ پیدا ہو جاوے گا جو اس وقت منفر ہے۔

اور امر ثانی کے متعلق یہ عرض ہے کہ میرے کچھ نہ کہنے کی صورت میں کیا یہ فائدہ محتمل نہیں کہ میں سن کر بطور خود اس میں غور کروں اگر شرح صدر ہو جاوے اس پر عمل کروں ورنہ رد و قدح کے سوء ادب سے محفوظ رہوں۔ والسلام محتاج دعا اشرف علی از تھانہ بھون۔ (۷ر ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ)

جواب از حضرت مفتی اعظمؒ!

۱۰ر ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ۔ (۲۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء)

مخدوم محترم دام فیضہم ۔ سلام مسنون نیاز مشحون کے بعد گذارش ہے کہ مکرمت نامہ موصول ہوا۔ میں دو تین روز تک حیران رہا کہ اس کے جواب میں کیا عرض کروں ۔ یعنی میرے عریضہ ''سابق پر جو رد و قدح ہے اس کو تقلید اً تسلیم کرلوں یا اس کا نیاز مندانہ جواب لکھ کر (خدانخواستہ غیر مفید) مناظرہ کا رنگ پیدا کردوں ۔ بالآخر یہی مناسب معلوم ہوا کہ میں تو بنام خدا حاضری کا ارادہ مصمم کراوں ۔ اور اپنی عرض معروض پر جواب دینا نہ دینا بالکل جناب والا کی خوشی پر چھوڑ دوں ۔ اگر رائے عالی میں مجھ جیسے ناکارہ کی تسکین مناسب ہوگی تو خود فرمادیں گے ۔ ورنہ اپنی محرومی پر صبر کروں گا۔ واللہ الموفق (کفایت المفتی ، جلد نہم ، ص ۵۵ ـ ۴۵۰)

۱۹۲۰ء

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جلیانوالہ باغ کے حادثے اور پنجاب میں مارشل کے قیام کی تحقیقات کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی ۔ اس کا اردو ترجمہ '' کانگریس کمیٹی کی رپورٹ '' کے عنوان سے دو حصوں میں پنڈی داس پستک بھنڈار، لاہور سے شائع ہوا ہے ۔ پہلے حصہ میں واقعات کی تفصیل اور دوسرے حصے میں گواہوں کے بیانات (شہادتیں) ہیں

جمعیتِ اقوام:

جمعیت اقوام کی تشکیل پہلی عالمی جنگ میں اتحادی ملکوں کے جنگی مقاصد میں شامل تھی اور جنگ کے خاتمہ پر ایک عالمی تنظیم قائم کرنے کی تجویز صدر ولسن نے بھی اپنے چودہ نکات میں شامل کی تھی جمعیت اقوام اجتماعی تحفظ اور عالمی امن برقرار رکھنے اور جنگ و جارحیت کا سد باب کرنے اور بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینے کے لیے قائم کی گئی اپنی نوعیت کی پہلی عالمی تنظیم تھی ۔ جمعیت اقوام ۱۹۲۰ء میں جنیوا میں قائم ہوئی لیکن اس کے بیالیس ارکان میں ولایات متحدہ امریکہ شامل نہیں تھا کیونکہ امریکی سینٹ نے جمعیت اقوام کے منشور کی توثیق کرنے سے انکار کردیا تھا۔ میثاق کے تحت جمعیت کے ایک رکن پر حملہ کو سب پر حملہ قرار دیا گیا اور سب پر لازم کیا گیا کہ وہ انفرادی طور سے جارح کے خلاف اقتصادی تعزیرات نافذ کریں۔

جمعیت اقوام ان اداروں پر مشتمل تھی ، ایک عام اسمبلی جس میں ہر رکن ملک کو ایک ووٹ حاصل تھا اور جس کا اجلاس سالانہ ہوتا تھا، جمعیت کا دوسرا ادارہ اس کی کونسل تھی جو اختیارات میں

عام اسمبلی کے مساوی تھی۔ یہ کونسل مستقل اور عارضی ارکان سے مرکب ہوتی تھی اور اس کے اجلاس وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے۔ جمعیت کا تیسرا خاص ادارہ اس کی سکریتاریہ (سکریٹریٹ) تھا جو اس تنظیم کی سول سروس تھی۔ بین الاقوامی عدالت انصاف اور بین الاقوامی ادارۂ محنت جمعیت اقوام سے مستقل طور پر وابستہ تھے۔ ان سب کے علاوہ جمعیت نے اقلیتوں کے حقوق، معتدبہ نو آبادیاتی علاقوں وغیرہ کے سلسلہ میں ضرورت پڑنے پر خصوصی کمیشن بھی قائم کیے۔

دوسری عالمی جنگ سے قبل جمعیت مختلف ملکوں کی جارحانہ کارروائیوں کو روکنے میں بری طرح ناکام رہی۔ جنگ کے دوران یہ ایک طرح سے معطل رہی۔ جنگ ختم ہونے پر اپریل ۱۹۴۶ء میں اس کا آخری اجلاس محض اپنے فرائض، اختیارات اور اثاثہ کو اپنی جانشین تنظیم ادارۂ اقوام متحدہ کو منتقل کرنے کے لیے ہوا۔ (فرہنگِ سیاسیات، ص۱۸۴)

ترک موالات کا فتویٰ

۱۹۲۰ء (اواخر):

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی نے ترک موالات سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں فرمایا ہے:

"دشمنان خدا اور رسول اور دشمنان اسلام اور دشمنان مسلمین سے ترک موالات کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں صاف، صریح احکام اور ناقابل تاویل نصوص و تصریحات موجود ہیں۔ دوپہر کے وقت وجود آفتاب سے انکار ممکن، قرآن و حدیث جاننے والے کو فریضہ، "ترک موالات" سے انکار ممکن نہیں ہے۔ قرآن پاک میں نہ صرف ایک دو جگہ بلکے متعدد مواقع میں اس مہتم بالشان فرض کا حکم فرمایا گیا اور اس کے اوپر عمل نہ کرنے والوں کو عذاب اور کبریائی سے ڈرایا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

> لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوآدون من حاد اللہ
> اے پیغمبر تم اس جماعت کو جو خدا تعالیٰ کی مقدس ہستی اور روزِ جزا پر یقین و ایمان رکھتی ہو دشمنان خدا اور رسول سے موالات یعنی دوستی اور نصرت کے تعلقات رکھتے ہوئے نہ پاؤ گے۔ (سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲)

گویا یوں فرمایا گیا ہے کہ حضرت حق اور یوم آخرت پر ایمان اور دشمنان حق اور مکذبین روز

جز اسے موالات ایسی متبائن و متضاد باتیں ہیں کہ ایک دل میں ان کا جمع ہونا ممکن نہیں ۔ دوسری جگہ فرمایا:

یٰٓا یھاالذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوی و عدو کم اولیاء

(سورۂ ممتحنہ، آیت ۱)

اے ایمان والو ہمارے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ

یعنی ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھو۔ تیسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

انما ینھا کم اللہ عن الذین قاتلو کم فی الدین و اخر جو کم من دیار کم و ظاھر وا علیٰ اخراجکم ان تولوھم و من یتولھم فاولئک ھم الظالمون .(ایضاً، آیت ۹)

جو لوگ تم سے مذہبی لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور نکالنے والوں کی مدد و معاونت کریں۔ حضرت حق ایسے لوگوں کی موالات سے تم کو منع کرتے ہیں اور جو ان سے موالات کرے گا وہ ظالم ہے۔

آج کل جن اعداے اسلام کے ساتھ ترک موالات کا مسئلہ زیر بحث ہے ان میں یہ تینوں باتیں پورے طور پر موجود ہیں: قتال فی الدین اور اخراج من الدیار اور مظاہرت علی الاخراج تینوں کام انھوں نے کیے ہیں تو قرآن پاک کے اس صاف وصریح حکم کے بموجب ان اعداے اسلام سے موالات حرام ہے اور موالات کرنے والے ظالم ہیں اور ظالموں کے لیے دوسری جگہ ارشاد ہے:

الالعنۃ اللہ علی الظالمین. (سورۂ ہود، آیت ۱۸) خبردار ہو! ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

اور موالات میں وہ تمام تعلقات شامل ہیں جن سے میل جول اور دوستانہ ربط و اتحاد ظاہر ہوتا ہو یا نصرت و اعانت پائی جاتی ہو۔ پس ایسی گورنمنٹ کے تمام ملازمین اور ہر قسم کے تعلقات نصرت اور گورنمنٹ کو تقویت پہنچانے والے روابط رکھنا حرام ہے۔ محکمۂ تعلیم سرتاپا گورنمنٹ کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات پیدا کرنے کا مرکز ہے۔ اس لیے ترک موالات کے فریضے میں اس کا مقاطعہ نہایت اہم ہے۔ واللہ اعلم

کتبہ محمد کفایت اللہ غفرلہ، مدرس مدرسۂ امینیہ، دہلی

بلا شبہ اعداء دین کی اعانت کرنا حرام ہے۔ محمد شفیع عفی عنہ مدرس مدرسۂ مولوی عبدالرب صاحب، دہلی۔

(تحریک عدم تعاون اور احکام دین مبین، مجلس خلافت پنجاب، لاہور، ۱۹۲۰ء، ص ۱۰۔۹)

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ ترک موالات کی تائید میں مولانا احمد سعید دہلوی نے اپنے فتوے میں فرمایا:

''قرآن شریف میں متعدد جگہ موالات کو حرام فرمایا ہے۔ بعض اصحاب موجودہ زمانے میں موالات کا صرف افعال قلب سے تعلق سمجھتے ہیں اور موالات کے معنی میں اتنا عمل کافی جانتے ہیں کہ دل سے محبت نہ کرے لیکن یہ محض لغو اور کورانہ خیال ہے۔ ایک کلمہ گو مسلمان کافر سے دلی محبت اگر کرے تو وہ مسلمان ہی نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دل سے نفرت کرنے کے علاوہ ترک موالات کا افعال جوارح پر کیا اثر ہونا چاہیے۔ ایک شخص دل سے تو نفرت کرے لیکن ظاہر میں اعداءِ دین کی معاونت کرے۔ جس کا نتیجہ تخریب دین و شوکت اسلام ہو تو کیا ایسا شخص معاون اثم و عدوان نہیں؟ اور کیا ایسا شخص مستحق لعنت نہیں۔ اگر آیتوں کو محض جہال کی تاویل پر حمل کیا جائے۔ تو پھر وہ مسلمان جنھوں نے کافروں کی طرف سے مسلمانوں کو قتل کیا۔ اور مسلمانوں کے حق کا خون کیا۔ یا حرم اور مقامات مقدسہ پر گولہ باری کی، وہ سب مسلمان ہوں گے۔ معاذ اللہ یہ کس قدر کلام ربانی کی تحریف ہے۔ دین کیا ہوا احمق الناس کا مذاق ہو گیا۔ کافروں اور اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مل کر سب کچھ کر لیا اور کہہ دیا میں کافروں سے دلی نفرت کرتا ہوں۔ حالانکہ قرآن کریم کا صاف ارشاد ہے۔ الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم...... الآیہ یعنی ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جو اپنے پختہ وعدوں کو توڑ دیتے ہیں؟ غضب خدا کا یہاں بجائے مقاتلہ کے موالات ہو رہی ہے۔ اسی طرح والمحصنت میں ارشاد ہے: وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء و لولدان...... الآیہ یعنی جو لوگ کافروں کی قید میں ہیں ان کی مدد کیوں نہیں کرتے اور کافروں سے لڑ کر اُن محبوسین کو آزاد کیوں نہیں کراتے؟

یہ کون نہیں جانتا کہ اس وقت معزز ترکی افراد مالٹا میں قید ہیں۔ کون بدنصیب عالم اس سے انکار کرے گا۔ کہ خود ولی عہد خلافت عثمانی نگرانی میں ہیں۔ تو کیا اس وقت صرف ہم پر مذہبی فرائض اسی قدر عائد ہوتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے محبت نہ کریں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔ اگر موالات کے معنی قلبی دوستی کے ہیں۔ تو ان عالم نما جہلا سے پوچھو کہ قلبی دوستی تو تیرہ سو

برس سے حرام ہے قلبی دوستی تو مسلمان کفار حلفاء سے بھی نہیں کر سکتا مسلمان کتنے ہی عروج پر کیوں نہ ہو۔ ہر وقت کافر سے قلبی دوستی حرام ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس تنزل اور تباہی و بربادی کے وقت میں ہم پر کیا فرض زیادہ ہوا۔ موجودہ اعدائے اسلام سے ہمارا برتاؤ کیا ہونا چاہیے؟ خدا کے واسطے آیات قرآنی میں تحریف نہ کرو۔ قرآن کا صاف مطلب یہ ہے کہ اعدائے اسلام سے کوئی تعلق جس میں اعانت وامداد کا شائبہ بھی ہو قطعاً حرام ہے۔

اب رہا تعلیم کو موالات سے مستثنیٰ کرنا یہ سخت ترین حماقت ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی معاونت دشمنان دین کی ملازمت ہے۔ ملازمت سرکار کا اصلی سبب اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم اور یونیورسٹی کی ڈگریاں ہیں پس اگر ملازمت حرام ہے تو یقیناً ذریعۂ ملازمت بھی حرام ہوگا؟ مسلمان سرکاری ملازمت سے جب ہی محفوظ رہ سکتے ہیں کہ ان کو اس تعلیم سے بچالیا جائے۔ کہ جس کی وجہ سے ملازمت کرنے کے قابل ہوں۔ اور یہ مسئلہ بالکل قطع ید کی طرح ہے کہ سارق کا ہاتھ ہی کاٹ دو تا کہ وہ چوری نہ کر سکے۔ جراح اس عضو ہی کو قطع کر دے۔ جو تمام بدن مین زہریلا مادہ نہ سرایت کر سکے بس میری رائے میں مسلمانوں پر ترک موالات فرض ہے اور ان کو اس فریضہ پر عمل کرنے کے لیے فوراً سرکاری تعلیم سے علیحدہ ہونا قطعاً فرض ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم کتاب۔

بندۂ حقیر احمد سعید ناظم جمعیت علمائے ہند

حضرت مولانا ابوالکلام مدظلہ نے مقامی ارکان جنرل کونسل انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں زراعانت حاصل کرنے اور الحاق کر ترک کر دینے کے مسائل کی توضیح فرما دی تھی۔ اور صریح احکام قرآنی پیش کر دیے تھے۔ چنانچہ اس توضیح وتشریح کے بعد حضرت مولانا مدظلہ نے طلبا اسلامیہ کالج واسلامیہ اسکول کو ایک تحریر دی تھی اور فرمایا تھا: ''ہر مسلمان پر فرض ہے کہ ایسے اسکول اور کالج میں تعلیم نہ پائے۔ جو ایسی حکومت سے زراعانت حاصل کرتا اور اس کی یونیورسٹی سے ملحق ہو جو مذہب اسلام کے سراسر خلاف کارروائیاں کرتی رہی ہے۔''

حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے اس مسئلے میں علمائے کبار سے مطلقاً اتفاق ہے۔ مسلمانوں کو اگر وہ دائرہ اسلام میں رہنا چاہتے ہیں تو احکام قرآنی پر کاربند ہونا چاہیے۔ اور اپنے بچوں کو حکومت کے مدارس اور ایسی درسگاہوں سے اٹھالینا چاہیے جو حکومت سے زراعانت حاصل کرتی ہیں اور ان کی یونیورسٹی سے ملحق ہیں۔''

آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ:

آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ نے اس ریزولیوشن کو منظور کر لیا ہے جو نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس کلکتہ مورخہ ۴ تا ۹ ر ستمبر ۱۹۲۰ء میں منظور کیا ہے۔ اس میں یہ ترمیم کی ہے۔ کہ شق ۳۔۴ میں "بتدریج" کی جگہ "فی الفور" منظور کیا ہے

آل انڈیا مسلم لیگ: نے بھی اپنے اجلاس خصوصی منعقدہ کلکتہ میں اس ریزولیوشن کو منظور کر لیا ہے اور اس پر یہ ایزاد کیا ہے کہ جو مسلمان تحریک عدم تعاون پر عمل پیرا نہ ہو۔ اس سے مقاطعہ تنبیہی کیا جائے:

نیشنل کانگریس کا اجلاس کلکتہ:

۴ تا ۹ ر ستمبر ۱۹۲۰ء: اوپر کے اندراج میں جس ریزولیوشن کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ یہ ہے: "اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کہ مسئلہ خلافت میں حکومت ہند اور حکومت برطانیہ اپنے اس فرض کی ادائیگی میں جو مسلمانان ہند کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے قطعی قاصر رہی ہیں۔ اور وزیر اعظم نے اپنے حتمی وعدوں کی نہایت دیدہ دلیری سے خلافت ورزی کی ہے۔ لہٰذا ہر غیر مسلم ہندوستانی کا فرض ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو اس مذہبی ابتلا کے دور کرنے کی کوشش میں جو اسے پیش آئی ہے۔ ہر جائز طریقے سے امداد و اعانت بہم پہنچائے۔ اور اس حقیقت نفس الامری کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ اپریل ۱۹۱۹ء کے حادثات میں ہر دو متذکرہ بالا حکومتوں نے پنجاب کے بیگناہ لوگوں کے تحفظ اور ان افسروں کے جو اہل پنجاب کے ساتھ غیر شجاعانہ اور بربریت آمیز سلوک کے مرتکب ہوئے ہیں کیفر کردار تک پہنچانے میں نہایت تغافل برتا ہے یا قطعاً ناکام رہی ہیں۔ اور سر مائیکل اوڈ وائر کو جو حکام سرکاری کے بیشتر جرائم کا بلا واسطہ یا بالواسطہ ذمہ دار ہے اپنے زیر حکومت رعایا کے مصائب کی طرف سے سنگ دلانہ تغافل کا مرتکب ثابت ہوا ہے معاف کر دیا ہے۔ اور چونکہ دار العوام اور بالخصوص دار الامراء کی بحث تمحیص سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل ہند کے متعلق حکومت کا رویہ افسوسناک طور پر غیر ہمدردانہ ہے۔ اور ارباب حکومت نے اس منظم دہشت آمیز اور خوفناک کارروائیوں کے جواز کی علی الاعلان تائید کی ہے، جن کا پنجاب میں ارتکاب کیا گیا اور جناب وائسرائے کا تازہ ترین اعلان اس امر کا ثبوت ہے کہ خلافت اور واقعات پنجاب کے مسائل پر حکومت کو ذرہ برابر ندامت نہیں ہے۔

لہٰذا اس کانگریس کی یہ رائے ہے کہ تاوقتیکہ ان دو متذکرہ بالا غلط کاریوں کا قرار واقعی تدارک

نہ کیا جائے گا۔ ہندوستان میں امن واطمینان نہیں ہو سکتا اور قومی عزت وحرمت کی برقراری اور آیندہ کے لیے اس قسم کی غلط کاریوں کا انسداد اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو سوراجیہ مل جائے۔ علاوہ بریں اس کانگریس کی یہ رائے ہے کہ اہل ہند کے لیے سوائے اس کے اور کوئی ممکن طریق کار نہیں ہے۔ کہ روز افزوں پُرامن عدم تعاون کی حکمت عملی کو قبول اور اختیار کریں۔ حتی کہ متذکرۂ بالا غلط کاریوں کا سدباب اور سوراج کا قیام وقوام ہو جائے۔

چونکہ ابتدا ان طبقات کی طرف سے ہونی چاہیے۔ جو آج تک رائے عامہ کی تشکیل اور نیابت کرتے رہے ہیں۔ اور چونکہ حکومت عطائے خطابات اور اعزازات اسکولوں اور کالجوں، سرکاری عدالتوں، قانونی کونسلوں کے قیام سے اپنے اقتدار کی بنیادیں استوار کرتی ہے۔ چونکہ بہتر یہ ہے کہ اس تحریک کی تعمیل میں وہ کم سے کم نقصان اور خفیف سے خفیف ایثار جو منزل مقصود تک پہنچنے میں کامگار بنا سکے، پیش کیا جائے۔ لہذا کانگریس نہایت زور سے یہ مشورہ دیتی ہے کہ

(۱) **خطابات**، اعزازی عہدے اور مقامی مجالس کی نامزدہ رکنیتوں سے استعفے دے دیے جائیں۔

(۲) **سرکاری جلسوں**، درباروں اور دیگر مجالس میں جو حکام سرکار کی طرف سے یا ان کے اعزاز میں منعقد کی جائیں شمولیت سے انکار کر دیا جائے۔

(۳) ایسے اسکولوں اور کالجوں سے جو سرکار کی ملکیت یا امداد یا نگرانی میں ہوں اپنے بچوں کو بتدریج اُٹھا لیا جائے اور ان اسکولوں اور کالجوں کے بجائے تمام صوبجات میں قومی اسکول اور کالج کھولے جائیں۔

(۴) وکلا اور طرفین مقدمات سرکاری عدالتوں سے بتدریج مقاطعہ کریں۔ اور وکلا کی امداد سے باہمی قضیوں کے تصفیے کے لیے پنچائتی عدالتیں قائم کی جائیں۔

(۵) سپاہی کلرک اور مزدور پیشہ لوگ بھرتی ہو کر عراق عرب، بصرہ وغیرہ میں جانے سے انکار کر دیں۔

(۶) اصلاح شدہ کونسلوں کی رکنیت کے امیدوار اپنے نام واپس لے لیں۔ اگر کوئی امیدوار کانگریس کے فیصلے کے باوجود اپنے آپ کو انتخاب کے لیے پیش کرے تو رائے دہندگان اس کے حق میں ووٹ دینے سے انکار کر دیں۔

(۷) ممنوعات ممالک غیر سے مقاطعہ۔

چونکہ تحریک عدم تعاون قوم میں ضبط وایثار کی روح پیدا کرنے کے لیے بہترین طریق عمل خیال کی گئی ہے۔ جس کے بغیر کوئی قوم حقیقی ترقی نہیں کرسکتی۔ اور چونکہ یہ اشد ضروری ہے کہ تحریک عدم تعاون کے ابتدائی درجے ہی میں ہر مرد ہر عورت اور ہر بچے کو ایسے ضبط وایثار کے اظہار کا موقع دیا جائے۔ لہذا یہ کانگریس مشورہ دیتی ہے کہ ملبوسات کے معاملہ میں ایک وسیع ترین پیمانہ پر تحریک سودیشی پر عمل کیا جائے۔ چونکہ ہندوستان کے وہ موجودہ کارخانے جو باشندگان ہند نے سرمایہ اور اقتدار کے ماتحت جاری ہیں۔ ابھی تک قومی ضروریات کے مطابق کافی کپڑا تیار نہیں کر سکتے۔ اور شاید ابھی ایک مدت تک کر بھی نہ سکیں۔ لہذا یہ کانگریس مشورہ دیتی ہے کہ ہر ایک گھر میں چرخہ کاتنے کا از سرنو رواج دیا جائے۔ اور ان کروڑوں جولاہوں کو جنھوں نے ناقدری زمانہ سے اپنا قدیم اور معزز پیشہ چھوڑ رکھا ہے۔ پھر کام کرنے پر اُبھارا جائے تاکہ فوراً ایک وسیع پیمانہ پر کپڑا بننا شروع ہوجائے۔''

سکھ لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں عدم تعاون یعنی ''نان ورتن'' منظور کرلیا ہے۔

(تحریک عدم تعاون اور احکام دین مبین: مجلس خلافت پنجاب، لاہور۔ ۱۹۲۰ء ص ۱۵۔۱۰)

۱۹۲۰ء:

تحریکِ ہجرت

(چند خیالات)

ہندوستان سے مسلمانوں کے عرب وحجاز اور دوسرے ممالک کو ہجرت کرنے کے واقعات تاریخ کے ہر دور میں ملتے ہیں۔ ہجرت کا یہ سلسلہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتویٰ دارالحرب سے پہلے بھی جاری تھا اور بعد میں بھی جاری رہا، لیکن یہ ہجرتیں افراد کی یا زیادہ سے زیادہ خاندانوں کی ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے اجتماعی ہجرت کا کوئی واقعہ ۱۹۲۰ء سے پہلے پیش نہیں آیا۔ حال آں کہ مسلمانوں پر ابتلا کے دور اس سے قبل بھی آئے تھے اور بعض اوقات کچھ علاقوں میں ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ لیکن مسلمانوں پر اجتماعی ہجرت کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ خیال آیا بھی تو اصلاح احوال وجہاد کا! البتہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں جب مسلمان

ہندوستان میں سات کروڑ سے زیادہ تھے تو ایک اجتماعی ہجرت کی تحریک پیدا ہوئی۔ یہاں اسی تحریک کے بارے میں چند خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔

دارالحرب اور ہجرت:

سب سے پہلے شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ کسی ملک کے دارالحرب ہو جانے کے بعد وہاں سے ہجرت واجب ہو جاتی ہے، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد اور مخصوص حالات کی بنا پر ہجرت کو انھوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ یہی مسلک ان کے بعد ان تمام علما، کا رہا جو ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا یقین رکھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے دارالحرب ہند کے حالات بدلنے اور انقلاب برپا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

اولاً: طاقت اور قوت کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار اور برٹش حکومت کا تختہ الٹ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور ایک مدت تک اسی فیصلے کے مطابق کوشش کرتے رہے۔

ثانیاً: جب حالت نے بار بار طاقت اور قوت کے ذریعے انقلاب لانے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا اور تجربات نے اس ذریعۂ انقلاب کو ناممکن ثابت کر دیا تو ہندوستان میں بسنے والی دوسری اقوام کے اتحاد سے آزادی کی تحریک شروع کی گئی۔ یہ تحریک جاری رہی تا آں کہ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔

۱۹۲۰ء کی ہجرت افغانستان:

۱۹۲۰ء کی تحریک ہجرت کا تعلق ہندوستان کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے سے بالکل نہ تھا۔ خواہ کسی شخص نے اپنے کسی بیان میں ہجرت کا سبب یہی بتایا ہو۔

۱۹۲۰ء میں مسئلہ یہ نہ تھا کہ چونکہ ہندوستان دارالحرب ہے، اس لیے یہاں سے ہجرت کر جانی چاہیے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسلامی ممالک اور خلافت ترکیہ کے بارے میں برٹش حکومت کے رویے نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اپنے غم وغصہ کے اظہار اور عالمی رائے عامہ کو برطانیہ کے مظالم، اس کی وعدہ خلافیوں اور عہد شکنیوں کے خلاف ہموار کرنے کے لیے کوئی اقدام کریں۔

اس سلسلے میں انھوں نے جو اقدام کیے ان میں وفد خلافت کا سفر یورپ، عالمی رہنماؤں سے

ملاقاتیں، اخبارات میں مضامین کی اشاعت اور اندورن ملک جلسوں جلوسوں کے ذریعے احتجاج، رائے عامہ کی بیداری ،حکومت سے عدم تعاون، غیر ملکی اشیا کا ترک استعمال وغیرہ پروگرام میں شامل تھے۔ چوں کہ ترکی خلافت اور اس کے مقبوضات کا انقطاع وغصب صرف مسلمانوں کے لیے ایک ملی اور اسلامی مسئلہ ہی نہ تھا، بلکہ وقت کا اہم اور خالص سیاسی مسئلہ بھی تھا، جس سے غیر مسلم مدبر بھی صرف نظر نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ برٹش استعمار کے مخالفین خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں تھے، ان کی تمام تر ہمدردیاں ترکی خلافت کے ساتھ تھیں لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ تحریک خلافت میں مسلمانوں کے خالص ملی اور دینی نقطۂ نظر سے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے عملی میدان میں ان کا تعاون حاصل کرنے اور تحریک کو موثر بنانے کے لیے ہندوستان کے لیے سوراج کے حصول کے ایک مقصد کا اضافہ کر کے اور اسے کل ہند قومی تحریک بنا کے تحریک خلافت میں ان کی شمولیت کے لیے جواز پیدا کیا گیا اور اس طرح تحریک خلافت کو ایک عظیم الشان تحریک بنادیا گیا۔ جس نے برٹش استعمار کی جڑیں ہلا دیں۔ ہندوستان کے لیے سوراج کے حصول سے کسی مسلمان کو انکار نہ تھا۔ سوراج کا حصول پہلے ہی سے مسلمانوں کی سیاست کے مقاصد عالیہ میں شامل تھا۔

تحریک ہجرت، خلافت کی تحریک کے دوران اسے موثر بنانے کا ایک مزید حربہ تھا۔ یہ تحریک کسی سنجیدہ، مدبر، عالم دین نے پیش نہیں کی تھی۔ یہ محض ایک پر جوش نوجوان، ناتجربہ کار، علم دین وسیاست سے ناآشنا، تدبر وبصیرت سے محض بے گانہ اور ایک عاقبت نااندیش اور ناپختہ کار شخص کے دماغ کی اختراع اور اس کی زندگی کے حادثۂ گرفتاری وسزایابی کا ردعمل تھا۔ لیکن ایسے اسلوب میں اس کے جواز کا فتویٰ پوچھا گیا تھا کہ کوئی عالم دین بھی دوٹوک الفاظ میں اس کے خلاف رائے نہ دے سکتا تھا اور پھر ایسے حالات میں اور ایسے پرجوش انداز میں اسے شروع کر دیا گیا کہ کوئی عالم دین اس کے خلاف سینہ سپر نہ ہو سکا۔ اس کی رہنمائی کی باگ دوڑ بھی کسی مدبر اور عالم دین کے ہاتھ میں نہ تھی۔

دارالاسلام اور نظریہ متحدہ قومیت:

ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کے عقیدے سے نہ متحدہ قومیت کا تعلق تھا نہ پاکستان کی مخالفت کا دونوں میں کوئی رشتہ تھا۔ عام طور پر اس بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا کہ متحدہ قومیت

کا نظریہ ہے کیا؟ یہ نظریہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف فرق، مذاہب کے تمام لوگ ہندوستانی ہیں اور اسی رشتے سے ہندوستان کی آزادی کی جنگ اور ملک کی تعمیر و ترقی اور استحکام و دفاع کی ذمہ داری میں سب برابر کے شریک ہیں اور حقوق و مراعات میں بھی برابر کے شریک ہوں گے۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا نظریہ کوئی انوکھا نظریہ نہ تھا۔ یہ نظریہ بالکل اسی طرح تھا جس طرح پاکستان میں بسنے والے مذاہب مختلفہ کے لوگ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، عیسائی ہوں یا پارسی، یہودی ہوں یا آغا خانی، اسمٰعیلی ہوں یا قادیانی یا غیر مسلموں کی کوئی اور جماعت یا فرقہ ہو، سب پاکستانی ہیں اور ملک کی تعمیر و ترقی اور حفظ و دفاع کی ذمہ داریوں میں سب یکساں طور پر شریک ہیں۔ بانیِ پاکستان کے رہنما الفاظ ہیں:

"ہمارے ملک میں بہت سے غیر مسلم بھی آباد ہیں۔ جن میں ہندو، عیسائی اور پارسی شامل ہیں، لیکن یہ سب پاکستانی ہیں، اور ان تمام کو وہی حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی، جو اس ملک کے دیگر باشندوں یعنی مسلمانوں کو حاصل ہوں گی اور یہ کہ پاکستان کی حکومت میں ان کو مکمل عمل دخل حاصل ہوگا۔"

یہ "پالیسی کا بڑا اصول" تھا جس کی طرف بانیِ پاکستان نے رہنمائی کی تھی اور تمام پاکستانیوں کے ان حقوق و مراعات کی ضمانت صرف مملکت سے وفاداری اور شہری حقوق کی ادائیگی کی شرط پر انھیں حاصل تھی۔

یہی اصول آج دنیا کے تمام مسلمان اور غیر مسلمان ملکوں میں رائج ہے اور دنیا کے تمام دستوروں اور آئینوں کا متفقہ اصول ہے اور جہاں تک دو قومی نظریے کا تعلق ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں تو پھر دو ہی کیوں؟ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں، جس میں مذہبی طور پر دو چار سے زیادہ قومیں نہ بستی ہوں لیکن انھیں ملکی اور وطنی طور پر ایک اور متحدہ قومیت کے اجزا ہی تصور کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں بھی ہے۔

رہے اختلاف! تو اختلافات تو ایک مذہب کے ماننے اور ایک ملک کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں میں بھی ہوتے ہیں اور ایسے اختلافات کہ انھیں دور نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ آئین اور نظام مملکت میں ان کی گنجائش نکالنی پڑتی ہے۔ یہ اختلافات زمین، زبان، تاریخ، روایات، تہذیب، تمدن، عادات، اطوار اور ذوق و مزاج کے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ علاقوں اور صوبوں کی پیداوار پر ان کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے، اور اگر کسی ایسی پیداوار کو مرکز اپنے انتظام میں لیتا

ہے تو اس صوبے کے حق (رائیلٹی) کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اگر کہیں ان اختلافات کو تسلیم کرنے اور حقوق کی ادائیگی سے انکار یا صرف نظر کر لیا جائے تو اس سے شدید مسائل اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تمام اختلافات پاکستان ہی کے چاروں صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں میں اس درجے اور فطری ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا تھا کہ انھیں تسلیم کیا جائے۔ چناں چہ پاکستان کے تمام آئینوں میں ان کے حدود و خصایص کو نہ صرف تسلیم کیا گیا بلکہ ان کے بقا، فروغ اور ترقی کے لیے ذرائع و وسائل کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس مقصد سے مختلف علمی، ادبی، تاریخ، تہذیبی، کلچرل ادارے، اکیڈمیاں، سوسائٹیاں اور بورڈ بنائے گئے ہیں جو گزشتہ چالیس سال سے اپنے الگ الگ ''امتیازات'' کی بقا، فروغ، ترقی اور اشاعت و تعارف کے کام انجام دے رہے ہیں۔ کیا کسی نے سوچا ہے کہ یہ صوبوں اور علاقوں کے ''امتیازات'' کیا ہیں، جن کے بقا اور فروغ کی ضمانت دستور میں دی گئی ہے، اور جن کے بارے میں حکومت کی امداد سے اب تک صدہا تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ سیکڑوں سمینار، مذاکرے وغیرہ منعقد ہو چکے ہیں اور ان کاموں پر کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں ان ''امتیازات'' کا اگر کوئی عنوان سوچا جائے تو ''قومیت'' کے سوا کچھ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ امتیازات واقعی ہیں، حقیقی ہیں، فطری ہیں اور اتنے فطری کہ سندھ کبھی پنجاب اور پنجاب کبھی پختون خوا نہیں ہو سکتا۔ اور بلوچستان اور پنجاب کے امتیازات جو صدیوں سے ہیں، قیامت تک رہیں گے۔

ایک اصولی بات یہ ہے کہ مقدمہ میں فریقین کے دلائل نظیر نہیں بنتے بلکہ مقدمے کا فیصلہ نظیر بنتا ہے اور اسی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ حوالہ اس بات کا نہ دینا چاہیے کہ مسلمانوں کے مقدمے میں دو قومی نظریے کا نام لیا گیا تھا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وقت اور تاریخ کے منصف کی عدالت سے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو وہاں کی حکومت کا وفادار رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا اور پاکستان کے غیر مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطمئن کیا گیا تھا کہ ''پاکستان کسی حالت میں مذہبی ریاست نہ ہوگا جہاں ملا (علماے دین) خدائی احکام کے نام پر حکومت کریں۔''

تاریخ کے اسی منصف کی یہ آواز بھی فضا میں گونجی تھی، جس میں اس نئی مملکت کی دستور سازی کا اصل اصول موجود تھا:

''آپ آزاد ہیں اور کاملاً آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں۔ آپ کو پوری آزادی ہے کہ اپنی مسجدوں کا رخ کریں یا پاکستان کی ریاست میں جو بھی آپ کی عبادت گاہیں ہیں۔ ان

میں آزادی سے جائیں۔ آپ کا کوئی بھی مذہب، ذات یا مسلک ہو، ریاست کے امور سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

اسی اصول کی بنیاد پر توقع تھی کہ

'' کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ کیونکہ کسی شخص کے ہندو یا مسلمان ہونے کا تعلق تو اس کے نجی عقیدے سے ہے۔''

ان فیصلوں سے جن اصولوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، وہ یہ ہیں!

۱۔ ریاست کا اس کے باشندوں کے مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یعنی عام لفظوں میں وہ ایک جمہوری سیکولر اسٹیٹ ہوگی۔

۲۔ کوئی مذہبی عقیدہ رکھنا ہر شخص کا نجی معاملہ ہوگا اور کسی شخص کا مذہب کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

۳۔ آئین کی نظر میں ریاست کے تمام باشندے یکساں حیثیت کے مالک ہوں گے۔ ان میں مذہبی عقاید کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے گا۔

۴۔ پاکستان کا کوئی شہری خواہ اس کا مذہب کچھ ہو وہ پاکستان کی متحدہ قومیت کا ایک ناقابل تقسیم عنصر ہوگا۔

۵۔ ریاست کے معاملات میں ہر شخص اپنی قومی اور وطنی حیثیت یعنی پاکستانی ہونے کی حیثیت سے یکساں طور پر حصہ لے سکے گا۔ ریاست کے معاملات میں نہ کوئی شخص ہندو ہوگا، نہ عیسائی، نہ پارسی ہوگا اور نہ مسلمان!

اگر پاکستان کے مسلمان اور غیر مسلمان، سب ایک '' متحدہ قومیت'' کے یکساں عنصر بن سکتے ہیں تو یہ عمل ہندوستان میں کیوں انجام نہیں پا سکتا؟

متحدہ قومیت کے داعی اگر ہندوستان کو متحد اور متفق رکھنا چاہتے تھے ملک کے سیاسی اور مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی مفاد میں وہ ایسا چاہتے تھے ان کے نزدیک ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل اتحاد میں تھا تقسیم میں نہیں۔ ان کے پاس اس کے لیے دلائل تھے، جنہیں کبھی فیس (FACE) نہیں کیا گیا۔ اور آج تک ان کی صحت اور اس کے برعکس نظریے کی صداقت پر گفتگو کرنے اور قیام پاکستان کے گزشتہ پچپن سال کے تجربات کی روشنی میں انھیں جانچنے اور پرکھنے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ متحدہ قومیت کے نظریے کا ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کے عقیدے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ متحدہ قومیت کا نظریہ موجودہ جمہوری عہد کا ایک فطری نظریہ ہے، جس کو قبول کرنے سے کسی ملک کو مفر نہیں۔ دارالاسلام کی بحث کا محل دوسرا ہے۔

دارالاسلام کے مؤیدین:

ہندوستان میں دارالحرب کے نظریے پر یقین رکھنے والا صرف دیوبندی مکتبۂ فکر کا ایک گروپ اور اہل حدیث جماعت کا ایک حصہ تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے تمام علماء، تمام مکاتبِ فکر ___ خیر آبادی خانوادۂ علمی، بریلوی مکتبۂ فکر، فرنگی محل کے علماء میں مولانا عبدالحیؒ سے لے کر مولانا عبدالباری تک، سرسید کے نام لیوا سب ہندوستان کے دارالاسلام ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ انھیں برٹش استعمار میں کوئی خرابی نظر نہ آئی تھی، وہ روز وشب برٹش حکومت کے فضائل ومحامد بیان کرتے تھے، انگریزی راج کی برکتوں کو شمار کرتے تھے۔ انگریزی عہد میں انھیں اتنی خوبیاں نظر آتی تھیں اور اسلامی فرائض و واجبات کو بجالانے کی ایسی آزادی میسر تھی اور ایسے حقوق حاصل تھے، جو انھیں مسلمانوں کی کسی حکومت میں بھی حاصل نہ تھے۔ اسی لیے وہ انگریزی حکام کو ''اولوالامر منکم'' میں شمار کرتے تھے اور برٹش استعمار کے قیام واستحکام اور اس کے دوام کے لیے خدا کے حضور گڑگڑا گڑگڑا کے دعائیں کرتے تے۔ بعض حضرات کو تو انگریزی حکومت میں کوئی برائی اور مسلمان حکومت (خلافت ترکیہ) میں کوئی اچھائی نظر نہ آتی تھی۔ ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں قصائد، جارج پنجم کی تخت نشینی کی تہنیت حتیٰ کہ جلیاں والا باغ (امرت سر) کے ہیرو اور سیکڑوں ہندوستانیوں کے قاتل اور متررخونی کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے جاتے تھے۔ ان حضرات اور مکاتب فکر کے لیے تو یہ ہرگز جائز نہ تھا کہ ''دارالاسلام'' کی حیثیت کو نظرانداز کرکے ملک کی آزادی اور قیام پاکستان کی تحریک میں سرگرم عمل ہوتے۔ اگر ہندوستان ہی ''دارالاسلام'' تھا تو پاکستان کے قیام کے لیے تحریک کیا معنی رکھتی تھی؟

دیوبند اور اہل حدیث کا انقلابی عنصر:

رہا معاملہ دیوبند اور اہل حدیث کی انقلابی جماعتوں کا جو ہندوستان کے دارالحرب ہونے پر ایمان رکھتی تھیں، تو ان کے لیے نہ صرف جائز بلکہ ان پر فرض تھا کہ وہ ہندوستان کی اس حیثیت کو

تبدیل کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ بلاشبہ وہ سرگرم عمل ہوئے۔ اس راہ میں انھوں نے اپنی جان کی قربانیاں دیں، مال کا ایثار کیا، جائیدادیں ضبط کرائیں، جیلوں کو آباد کیا، زندگی کے عیش و عشرت سے دستبردار ہوئے، جلاوطنی کی زندگی اختیار کی اور اسی حالت میں وطن سے دور غیر ملکوں میں پیوند زمین ہوگئے، کالے پانی کی سزائیں بھگتیں، جزائر انڈمان کو آباد کیا اور وہیں کی مٹی میں مل کر خاک ہوگئے۔ ان کے سامنے مقاصد یہ تھے:

۱۔ غیر ملکی اقتدار سے ملک کو نجات دلائی جائے۔ اس کے لیے انھوں نے انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جدو جہد کو جاری رکھا۔

۲۔ ابتداء میں ان کے سامنے فرقہ وارانہ مسئلہ نہ تھا۔ صرف ملک کی آزادی ان کا نصب العین تھا۔ بعد میں انھیں اندازہ ہوا کہ ملک کی آزادی میں خود فرقہ وارانہ مسئلہ رکاوٹ ہے اور اسے ہرگز نظر انداز نہ کردینا چاہیے۔

۳۔ یہ احساس صرف مسلمانوں ہی کو نہ ہوا بلکہ غیر مسلم بھی اسی نتیجے پر پہنچے۔ چناں چہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ عیسائی، پارسی، ہندو، قادیانی رہنماؤں نے بھی تقسیم ملک کی تجاویز پیش کیں۔ اصل اور بنیادی تجویز ''ملک کی تقسیم'' سب کی ایک تھی۔ فروع میں اختلاف ہوا کہ یہ عمل کیوں کر اور کس طرح انجام پائے؟

۴۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم ملک کی تجویز کوئی فرقہ وارانہ تجویز نہ تھی۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ مسئلے کا ایک خاص سیاسی حل تھا۔

۵۔ ایک ایسی تجویز جس کے مجوزین میں مسلمانوں کے مقابلے میں دو تہائی سے زیادہ غیر مسلمان مدبر موجود ہوں وہ فرقہ وارانہ یا اسلامی تجویز کیوں کر ہوسکتی ہے۔

۶۔ اس پر اس انداز سے بھی نظر ڈالنی چاہیے کہ جس طرح اس کے مجوزین و مؤیدین میں مسلمان اور غیر مسلمان سب شامل تھے، اسی طرح اس کے مخالفوں اور نکتہ چینیوں میں بھی بلا تفریق مذہب مسلمان اور غیر مسلمان سب شامل تھے۔

۷۔ پس جس طرح کسی مسلمان مجوز اور مؤید کی وجہ سے کسی چیز کو اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا، ٹھیک اسی طرح اس کی مخالفت کو غیر اسلامی فعل اور اسلام کے خلاف عمل کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے اور اس عمل کے لیے کسی مسلمان شخصیت یا جماعت کو کیوں کر مطعون کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ فرض کرلیجیے کہ تقسیم ملک کی تجویز کی مخالفت غیر اسلامی اور قابل مذمت فعل تھا تو یہ بھی

تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہندوؤں، عیسائیوں، پارسیوں، قادیانیوں کی حمایت تقسیم ملک اور تائید قیام پاکستان خالص اسلامی عمل اور شرعی فعل تھا جو اس کے حامی اور مؤید بجالائے تھے اور برٹش استعمار، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ہندو سبھا، سکھ لیگ وغیرہ کا پاکستان تسلیم کر لینا نہایت مستحسن فعل تھا۔ جس کے لیے ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور ان کا نام محسنین پاکستان کی فہرست میں لکھ لینا چاہیے کہ یہی جماعتیں پاکستان کے قیام میں رکاوٹ تھیں اور جب انھوں نے حقیقت اسلامیہ و شرعیہ کے سامنے تسلیم و رضا کا سر جھکا دیا تو رکاوٹ دور ہوگئی اور پاکستان کا قیام ممکن ہوگیا۔

اس گفتگو سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے سے پاکستان کی مخالفت کا کیا تعلق ہے۔ تاریخ کے ایک واقعے کو جو رونما ہو چکا ہے، سیدھے سادے انداز میں صاف لفظوں میں تسلیم کر لینا چاہیے۔ تقسیم ملک یا قیام پاکستان کی تجویز ملک کی تحریک آزادی سے ایک خاص مرحلے میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کے ایک حل کے طور پر سامنے آئی تھی۔ مختلف اسباب و دلائل سے اس کی مخالفت ہوئی مختلف وجوہ سے اسے تسلیم کر لیا گیا۔ ایسا نہ تھا کہ پہلی تحریک تقسیم ملک کی تھی اور دوسری تحریک ہندوستان کی آزادی کی! ترتیب یہ تھی:

۱۔ ہندوستان کی مکمل آزادی..... متحدہ ہندوستان کی شکل میں۔

۲۔ ہندوستان کی مکمل آزادی......لیکن فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے تقسیم ملک کے عمل کے ساتھ۔

دونوں صورتیں ہندوستان کی آزادی اور اس کے تمام مسائل کے حل کے لیے تھیں اور بلاتفریق مذہب و ملت دونوں تحریکوں کے پیچھے ملک اور بیرون ملک کے مدبر اور سیاست داں تھے۔ کفر و اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

فتویٰ دارالحرب اور قیام پاکستان کی تحریک:

اگر دوسری تجویز اور قیام پاکستان کی تحریک خالص مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی تحریک تھی، تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس تحریک کو اختتام تک پہنچانے اور کامیابی سے ہم کنار کرنے میں ہندو مہاسبھا، کانگریس اور انگریزوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے، جتنا مسلم لیگ کا! برصغیر کی آزادی، خواہ وہ آزاد ہندوستان کی شکل میں ہو یا پاکستان کے قیام کی صورت میں، درحقیقت تحریک آزادی کا ثمر شیریں ہے۔ اگر آزادی کی تحریک نہ چلتی تو برصغیر آزاد نہ ہوتا اور پاکستان کا قیام بھی عمل میں نہ

آ تا۔ آزادی کی تحریک کی بنیاد ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا عقیدہ تھا۔ اس لیے ہندی مکتبۂ فکر کی انقلابی جماعت کو بہ شمول اہل حدیث انقلابیوں کے، جو ہندوستان کو دارالحرب مانتے تھے اور اسی لیے برٹش استعمار کو بہ ہر صورت ختم کر دینا اور حکومت کا تختہ الٹ دینا ان کا نصب العین بنا، خواہ انقلابی عمل کے ذریعے سے ہو، خواہ آئین کے دائرے میں جدوجہد کے ذریعے سے ہو، جس کا ثبوت دونوں جماعتوں نے تحریک کے ہر دور میں ہر دو طریق سے دیا تھا، پاکستان کے محسنوں میں شمار کیا جانا چاہیے، نہ کہ ان حضرات کو جو ان انگریزوں کو مسلمانوں کا اولوالامر مانتے تھے، ان کی اطاعت کو مثل اطاعت خدا اور رسول اور امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین کے قرار دیتے تھے، جن کے عقیدے میں ہندوستان برٹش استعمار کے عہد میں بھی حسب عہد حکومت مغلیہ بدستور ''دارالاسلام'' تھا۔ اگر ہندوستان دارالاسلام تھا اور برٹش حکام اولوالامر تھے اور ان کی اطاعت مسلمانوں پر از روئے شریعت فرض تھی، تو اس سے روگردانی اور آزادی اور قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ لینے والے اسلامی باغی اور خروج کرنے والے (خارجی) قرار پائیں اور لائق تعزیر ٹھہریں گے نہ کہ قابل ستائش؟

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تحریک کی حمایت یا اس کی مخالفت کا دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی نے دیا تھا۔ اگر فتویٰ دارالحرب کی مذہبی اصطلاحوں سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا اولین اعلان یا چارٹر تھا۔ یہی اعلان تحریک پاکستان کی بنیاد بننے کے لائق تھا۔ اس لیے کہ اگر ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار غلط تھا، قبضہ غاصبانہ تھا، ہندوستان کی سیاسی حیثیت بدل گئی تھی اور مذہبی اصطلاح میں وہ دارالحرب ہو گیا تھا تو آزادی کی تحریک بھی جائز تھی اور پاکستان کی تحریک کا قانونی جواز بھی تھا۔ اور اگر ہندوستان، انگریزوں کے قبضے کے باوجود ''دارالاسلام'' تھا تو کم از کم ایک مسلمان کے لیے ہرگز جائز نہ تھا کہ برٹش استعمار کے خلاف ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے؟

موجودہ ہندوستان......دارالحرب یا دارالاسلام؟

موجودہ ہندوستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہے۔ لیکن روس کے سیکولر ازم سے، جس کی بنیاد مذہب کی نفی پر ہے، اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہندوستان کے سیکولر ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ مملکت کا

کوئی مذہب نہیں۔ لیکن اسٹیٹ کے آئین میں مذہب کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مذہبی حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے، عقیدے کی آزادی ہے، ہر شخص کو اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے، مذہبی احکام بجالانے، مذہبی روایات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسٹیٹ کے آئین کے تحت مذہب اور عقیدے کی جو آزادی دی گئی ہے، یہ از قسم رعایت نہیں، بلکہ اسٹیٹ کے باشندوں کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر حق اور آزادی میں کسی شخص کا رویہ، حکومت کا کوئی فیصلہ یا کسی قانون کی کوئی شق یا دفعہ رکاوٹ بنے گی تو شخص کا رویہ، حکومت کا فیصلہ اور قانون کی وہ شق تبدیل کی جائے گی، موجودہ ہندوستان میں مذہب اور عقیدے کی آزادی کا یہ ایسا حق ہے، جس کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی وجہ سے کوئی ایسا قانون بن جائے تو وہ ہندوستانی شہری کے عقیدے کی آزادی اور حق اختیار مذہب کے خلاف قرار پائے گا اور اسے تبدیل کرنا پڑے گا۔ حکومت کو کسی شہری کے عقیدے، مذہبی عمل یا مذہبی روایت میں مداخلت کا اختیار نہیں ہے، اور اس بات کا فیصلہ کرنا کہ عقیدہ کیا ہے اور مذہب، مذہبی عمل اور روایت کیا ہے اور کیا نہیں، اس مذہب کے ماننے والے کریں گے نہ کہ حکومت یا اس کا کوئی ادارہ؟

انگریزی عہد میں مذہبی اعمال بجالانے کی ملک کے باشندوں کو جو آزادی تھی، وہ انھیں حق کے طور پر حاصل نہ تھی، بہ طور رعایت کے تھی۔ اختیار اور اقتدار انگریز بہادر کا تھا۔ موجودہ ہندوستان میں اس کے باشندوں کو عقیدے اور مذہب کی آزادی بہ طور رعایت کے نہیں بہ طور حق کے حاصل ہے۔ اب ہندوستان کا ہر شہری، خواہ وہ کسی مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو، اختیار اور اقتدار کا مالک ہے۔ اور آئین کے مطابق سیاسی عمل میں حصہ لے کر وہ حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب تک پہنچ سکتا ہے۔

انگریز کے عہد اقتدار اور آزاد ہندوستان کی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلے تاج برطانیہ کے مفاد اور مرضی کے مطابق ملک کے عوام کے حقوق و مفادات، ان کی خواہشات اور ان کی آزادی کو قربان کر دیا جاتا تھا، اب ملک کے عوام کو حق آزادی اور اختیار و اقتدار کے احترام میں وقت کی بڑی سے بڑی طاقت اور شہنشاہیت کو جھکنا پڑتا ہے۔

برٹش دور حکومت میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا تعلق ان کے اقتدار و اختیار سے تعلق رکھتا تھا۔ انہیں اختیار تھا کہ وہ جو قانون چاہیں بنائیں اور جس طرح چاہیں نافذ کریں، انہیں اختیار حاصل تھا کہ کسی مذہب کے کسی حکم کو اپنے قانون سے معطل کر دیں۔ اس کے اس اختیار کی

سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ ان کے اسی اختیار اور اقتدار کے عمل و نفوذ کی بناء پر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا تھا۔ آزاد ہندوستان کے اختیار کا سرچشمہ مذہب اور عقیدے کے امتیاز کے بغیر اس کے آئین کے مطابق ہندوستان کے عوام ہیں۔ اب ٹھیک جس طرح ایک غیر مسلم ہندوستان کے بارے میں دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہندوستان اس کا ہے، بالکل اسی طرح مسلمان یا کسی اور مذہب کو ماننے والی چھوٹی سے چھوٹی جماعت کا فرد پکار کر کہہ سکتا ہے ہندوستان اس کا ہے۔ اس لیے کہ آئین میں مذہب اور عقیدے کی آزادی کا اصول یہ ہے:

"تمام ملتوں کو جن سے قوم ہند مرکب ہے، کامل مذہبی آزادی یعنی آزادی عقائد، عبادت، تبلیغ، جتماع اور تعلیم حاصل ہوگی اور یہ آزادی ایک ایسا آئینی حق ہوگا جس کی ترمیم، تنسیخ، معطلی یا اس میں کسی نوع کی مداخلت کسی حکومت کے لیے جائز نہ ہوگی۔"

ان یکساں حقوق ہی کی طرح ملک کے دفاع اور آزادی کی حفاظت بھی سب پر ایک ہی طرح سے فرض ہوگی اور ہر ہندوستانی کا، عام اس کے کہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا سکھ یا پارسی یا اور کسی مذہب کا پیرو، یہ مقدس فرض ہوگا کہ وہ بیرونی یا اندرونی حملے کی صورت میں ملک کا دفاع اور سوراج کی حفاظت کرے۔

موجودہ ہندوستان میں مسلمان اور دیگر تمام مذاہب کے ماننے والے ہر طرح کی آزادی کے یکساں حق دار، اختیارات میں برابر کے شریک اور ملک کے دفاع اور آزادی کے تحفظ میں برابر کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر آزاد ہندوستان کی عظمت کے ہیکل میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان کی کسی اقلیت یا اکثریت کا مسلمانوں کے خلاف کچھ بھی رویہ ہو، لیکن ان کی اہمیت اور ان کا اختیار یہ ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف ہندوستان کی عظمت کے ضامن اسی کے آئین میں، ایک جملہ تو کیا، کاما اور فل اسٹاپ کی جگہ بھی نہیں بدلی جا سکتی۔ اگر آج عملی زندگی میں مسلمانوں کو یا کسی دوسری مذہبی اقلیت کو مشکلات کا سامنا ہے یا ان کے جائز حقوق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو یہ آئینی اور قانونی طور پر نہیں ہوتا بلکہ یہ قطعاً غیر آئینی فعل ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ حکومت کے غلط کار عمال یا سوسائٹی کے روایت شکن اور قانون دشمن ہوتے ہیں۔ اس کا تعلق آئین کی خرابی سے نہیں۔

بہ ایں انقلاب حالات اب ہندوستان دارالحرب تو ہرگز نہیں، لیکن اسے دارالاسلام بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، وہ دارالامن بھی نہیں، اس لیے کہ دارالامن دراصل دارالحرب ہی کا ایک درجہ

یا غیر مسلم اقتدار کی ایک خوبی ہے۔ موجودہ ہندوستان کے لیے ہمیں کوئی نئی اصطلاح تلاش یا وضع کرنی چاہیے۔

ہجرت کی حالت:

۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی اور جمعیت علمائے ہند...... دو جماعتیں سیاست میں بہت پیش پیش تھیں لیکن ہجرت کے بارے میں ان کے رہنماؤں سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ جن حضرات نے تحریک شروع کی تھی ان کے سامنے کوئی منصوبہ نہ تھا، مسئلے کے تمام پہلوؤں پر کسی کی نظر نہ تھی، اس کے عواقب ونتائج پر کسی نے غور نہ کیا تاکہ آیا ہندوستان سے تمام مسلمان ہجرت کر جائیں گے یا کچھ لوگ ہجرت کریں گے اور کچھ یہاں رہ کر ملک اور قوم وملت کی خدمات انجام دیں گے۔ تمام لوگ کس طرح ہجرت کریں گے، کچھ لوگ جو ہجرت کریں گے ان کے سامنے کیا مقاصد ہیں؟
ہر طرف ایک ہنگامہ برپا تھا، چاروں طرف سے ہجرت ہجرت کی آوازیں آرہی تھیں اور افغانستان چلو، افغانستان چلو کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کوئی رائی دہائی نہ تھی، ہر شخص دیوانہ بنا ہوا تھا، کوئی نظم وضبط نہ تھا۔ قومی پیمانے پر ایک عظیم الشان عمل انجام پا رہا تھا لیکن فیصلہ ہر شخص اپنے طور پر انفرادی سطح پر کرتا تھا اور ہنگامے میں شریک ہو جاتا تھا۔
ہجرت کے عمل کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہ کی گئی تھی۔ حیدر آباد اور پشاور میں ہجرت کے دفتر قائم کر دیے گئے تھے تاکہ جانے والے وہاں اپنے نام اور پتے لکھوا دیں۔ انھیں کوئی ہدایت نہ دی جاتی تھی کہ وہ افغانستان کن مقاصد کے لیے ہجرت کر رہے ہیں، افغانستان میں کہاں جائیں گے، کیا کریں گے اور خلافت کے مسئلے اور سوراج کے حصول میں کس طرح ممد ومعاون ثابت ہوں گے؟ ان کا ہندوستان سے اور یہاں کے رہنماؤں سے کیا تعلق ہوگا۔ مقاصد کی تعلیم کے لیے کوئی نصاب کسی کے پاس نہ تھا اور نہ ان کی تربیت کے مسئلے پر کسی نے توجہ دی تھی۔ جو لوگ تحریک میں آگے تھے اور جلسوں میں تقریریں کرتے تھے، انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور ہی نہ کیا تھا۔ ان میں سے بعض تو فکر ورائے کے آدمی ہی نہ تھے۔ وہ جذبات کو بھڑکاتے اور عمل کا جوش پیدا کرتے تھے لیکن جوش اور قوت عمل سے کام لینے کی صلاحیت ان میں بالکل نہ تھی۔

تحریک ہجرت اور مولانا آزاد:

تحریکِ ہجرت کے پورے دور اور ہنگامے میں صرف ایک صدائے بصیرت مولانا ابوالکلام

آزاد کی تھی جس میں شریعت کے حکم کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا تھا۔ ہمیں ان کی بصیرت افروز راے اور فتوے کو زیر بحث لاتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ انھوں نے ہجرت کا ایک نظام عمل پیش کیا تھا۔ لیکن یہ نہایت الم ناک بات ہے کہ اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ مولانا نے شریعت کے حکم کے ساتھ اس کے طریقۂ کار کو بھی واضح کیا تھا۔ اس سے اس اصول کی نشان دہی ہوتی ہے کہ انفرادی ہجرت کے سوا جو ہر کسی کے ذاتی حالات و مصالح اور ذاتی فیصلے پر مبنی ہوتی ہے، اجتماعی ہجرت کا ہرگز یہ طریقہ اسلامی نہیں کہ ہر شخص اپنے طور پر فیصلہ کرے اور نکل کھڑا ہو۔ قومی اور اجتماعی ہجرت کا فیصلہ اجتماعی حالات اور مصالح کے پیش نظر کیا جائے گا۔ اس فیصلے کا اختیار بھی جماعت یا جماعت کے اصحاب راے یا ان کی کسی مقرر کردہ کمیٹی کو حاصل ہوگا۔ مولانا نے اپنے فتوے میں اس طرف رہنمائی کی تھی کہ اگر کوئی شخص انفرادی طور پر عازم ہجرت ہے تو وہ اپنے عزم سے جماعت کو مطلع کرے۔ جماعت غور کرے گی کہ اس کا ہجرت کرنا کس حد تک مفید ہو سکتا ہے یا ہجرت کے مقابلے میں ملک کے اندر رہ کر ملک اور قوم کے بارے میں جماعتی کام بجالانا زیادہ مفید ہوگا؟

چوں کہ یہ حقیقت مولانا کے پیش نظر تھی کہ نہ تو تمام مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر جا سکتے ہیں اور نہ سب کا ہجرت کر جانا مقصود ہی ہے۔ ملک کے اندر بھی قومی خدمت کے پروگرام پر عمل کرنا تھا اور ہجرت کرنے کے بیرون ملک ایک محاذ بھی قائم کرنا تھا۔ مولانا نے ہجرت کے فلسفے کی تائید کی۔ یہ قوموں کی ترقی ان کے نشو و ارتقا اور ان کے بقا و استحکام کے لیے ایک عظیم الشان عمل ہے۔ مولانا کا مضمون ''قانون ہجرت اور آثار متمدن'' جو ''افکار آزاد'' میں شامل ہے، در حقیقت فلسفہ و حکمت ہجرت پر ایک بے نظیر مضمون ہے۔ لیکن یہ ایک فلسفیانہ مضمون ہے، نہ سیاسی ہے نہ خالص دینی! ۱۹۲۰ء کی تحریک ہجرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے ہجرت کے بارے میں انھوں نے جو رہنمائی کی تھی، اس کی تفصیل مولانا کے مضمون ''اعلان'' میں موجود ہے۔ اسی مضمون کا وہ ٹکڑا ہے جو فتوے کی حیثیت سے اہل حدیث، امرت سر میں شائع ہوا تھا اور اب ''تبرکات آزاد'' میں شامل ہے، اس مضمون سے ہجرت کے جس طریق عمل کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، یہ ہے:

''۱۔ عازم ہجرت کے حالات اور صلاحیتوں کی روشنی میں مسئلہ خلافت کے حل اور سوراج کے حصول کے مقاصد و منافع کے پیش نظر ہجرت کا فیصلہ جماعت کرے گی۔

۲۔ ہجرت کرنے سے پہلے ہجرت کی بیعت ضروری ہے۔

اگر ہجرت کا عمل اس طریقۂ کار اور ان شرایط کے مطابق انجام پاتا تو نظم و ضبط بھی پیدا ہو جاتا اور فوائد یقینی اور نقصانات کم سے کم ہوتے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہجرت کے جوش اور ہنگامے میں ان اصول و شرایط کی کسی نے پروانہ کی اور ایک الم ناک صورت حال سے قوم کو دوچار ہونا پڑا۔

ایسی صورت میں کہ کوئی اجازت یا فتویٰ مشروط ہو تو شرایط کی تکمیل کے بغیر اس پر عمل کے نتائج کی ذمہ داری، خواہ مثبت ہوں خواہ منفی، یا مفتی یا امام و امیر یا اس کے مجاز و ماذون پر عاید نہیں ہوتی بلکہ فتوے کا شرایط کی تکمیل کے بغیر نفاذ ہی نہیں ہوتا۔ غلط یا صحیح نتائج کی ذمہ داری کا کیا سوال؟

مولانا ابوالکلام آزاد ہجرت کابل ۱۹۲۰ء کے حق میں ہرگز نہ تھے، لیکن انھوں نے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی طرح چناں وچنیں کا رویہ اختیار کرنے کے بجاے دوٹوک انداز میں صحیح شرعی صورت حال بیان کر دی۔ انھوں نے فتویٰ ہجرت کی، جو جاری کیا گیا تھا، مخالفت بھی نہ کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ایک نئی بحث شروع ہو جاتی اور ایک مذہبی مسئلے میں نزاع سے فایدہ کم اور مسلمانوں میں انتشار ذہنی و فکری کا نقصان زیادہ ہوتا۔ مولانا کے فلسفۂ عمل کی یہ خاص بات ہے کہ اپنی کسی راے کے اظہار سے وہ کوئی مذہبی نزاع نہ پیدا کرتے تھے۔ البتہ جب ہجرت کے باب میں قطعی راے کا اظہار ناگزیر ہو گیا تو انھوں نے علی الاعلان اس کا اظہار کیا۔ چناں چہ اس سلسلے میں مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم کا ایک خط اسی سلسلۂ بحث میں ملاحظۂ گرامی میں آئے گا۔ مولانا کا وہ فتویٰ بھی ہجرت کے عمل میں سرگرمی کا نہیں رکاوٹ کا باعث بنا تھا اور بعد کی واضح اور دوٹوک راے نے تو تحریک ہجرت کے عمل میں میخ ٹھوک دی تھی۔

اس بات کو بھی بالکل نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ تحریک انگریزوں کے ایما پر شروع کی گئی تھی۔ اگر ایسا ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ تحریک خلافت کے زمانے کے ہندو مسلم مثالی اتحاد کو توڑنے کے لیے کسی ایسے ہی عمل کی ضرورت تھی جس کی ہندو تائید کریں یا مخالفت...... دونوں صورتوں میں بدگمانیاں یکساں طور پر پیدا ہوں:

تحریک کی بعض شخصیات:

مولانا عبدالباری فرنگی محلی، علماے ہند میں غیر معمولی ذہانت کی شخصیت کا نام ہے۔ ان کا

اخلاص ہر شک وشبہ سے پاک اور ان کا جذبۂ خدمت ملی قطعاً بے میل تھا۔ وہ نہایت مخلص، بے ریا اور لوث وحرص سے پاک قلب کے مالک تھے۔ لیکن طبیعت میں استقلال اور رائے میں اصابت نہ تھی۔ دوسروں کی رائے سے بہت جلد متاثر ہو جاتے اور گومگو کی حالت میں پڑ جانے والے بزرگ تھے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہجرت کے وجوب وعدم وجوب کے مسئلے میں شروع سے آخر تک گومگو کی کیفیت اور چناں وچنیں کی حالت سے نکل نہ سکے۔ ان کے فیصلوں پر خود ان کے مریدین ومخلصین، مثل مولانا شوکت علی ومولانا منیر الزمان اسلام آبادی کو اعتماد نہ تھا۔

فتویٔ ہجرت کے سلسلے میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں اور حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام بھی آیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں آخر الذکر کے سوا کوئی عالم دین ہی نہ تھا۔ ان میں سے کسی نے فتویٰ نویسی کا شغل کبھی اختیار نہیں کیا۔ یہ حقیقت بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ فکر وتدبر ان میں سے کسی کی سیرت کا جوہر تھا ہی نہیں۔ مولانا محمد علی تو اس وقت ہندوستان میں موجود بھی نہ تھے، وہ وفد خلافت کے ساتھ یورپ گئے ہوئے تھے۔ یورپ سے لوٹے تو ہنگامۂ ہجرت سرد پڑ چکا تھا ہوتے بھی تو دونوں بھائی جوش وجذبات کے پروردہ تھے۔ اور تعقل وتدبر کی عینضد۔

مولانا ظفر علی خاں کی ذہانت وفطانت کے باب میں دو رائے نہیں ہوسکتیں، لیکن وہ صرف شاعر تھے۔ ان کی شخصیت کا اصل جوہر اصابت نہ تھا۔ وہ تحریک کے مقصد اور حالات سے محض بے خبر تھے۔

ہجرت کے باب میں ان حضرات کی کسی رائے کا حوالہ ان کے مقام سے محض ناآشنائی کا ثبوت ہے۔

حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری دیوبند کی انقلابی جماعت کے خطیب تھے، ان کے فضائل ومحامد کا دائرہ بہت وسیع تھا لیکن ان کی اصل خصوصیت اور سیرت کا اصل جوہر عزیمت دعوت اور استقامتِ عمل میں تلاش کرنا چاہیے۔

عزیز ہندی ایک جذباتی نوجوان تھے۔ ان میں نہ سیاسی شعور تھا، نہ کسی مدبرانہ صلاحیت کے مالک تھے، نہ عالم دین تھے، نہ دانشور، نہ مدبر وسیاس۔ نہ ان کی تعلیم مکمل تھی نہ انھیں سیاسی ودینی کاموں کا تجربہ تھا۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ ایک نوجوان کے جذبات کا پرجوش انفجار تھا اور جو کچھ لکھا وہ حالات وواقعات کے تجربے اور ہجرت اور ہجرت کے فلسفے اور اس پر حکیمانہ تبصرے کے باب

میں ہرگز لائق اعتنا نہیں، اس کا حوالہ محض بے سود ہے، انھوں نے خود اعتراف کیا تھا:

''ابھی ہجرت کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ میں نے ابھی اس کا اعلان ہی کیا تھا اور نہ میں اس وقت تک جانتا ہی تھا کہ اسے کب اور کیسے شروع کر سکوں گا۔ کچھ بھی ہو میں ملک کے اندر اس وقت کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتا تھا۔ میں ایک معمولی پڑھا لکھا نوجوان تھا، جسے وقت کے سیاسی اور دینی بحرانوں نے سطح پر لا ابھارا تھا۔''

کوئی رہنما انھیں منہ نہ لگاتا تھا اور نہ ان پر کوئی اعتماد کرتا تھا، خود ان کے ذوق و معیار پر بھی کوئی پورا نہ اترتا تھا۔ مولانا آزاد سے بیعت کی تو اطاعت سے انحراف کیا، مولانا ظفر علی خاں، حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا فضل الٰہی وغیرہ کو ''استعمال کرنے'' کے زعم میں مبتلا تھے، ہجرت کے بارے میں کسی فتوے اور رہنمائی کے بغیر تبلیغ اور تحریک شروع کر دی تھی، مولانا فضل الٰہی نے گفتگو میں احتیاط برتی تو ناراض ہو گئے۔ بھلا کہاں مولانا فضل الٰہی کی تبلیغ و تربیت سے جہاد و ہجرت کے لیے تیار ہونے والے چند مردانِ کار اور اصحابِ عزیمت اور کہاں مقاصد وقت سے محض نا آشنا اور ایک غیر شرعی و جاہلی زندگی کے پروردہ اور چند خام کار نوجوان...... ان اصحابِ عزیمت کے سامنے چند سو تو کیا ہزاروں کی بھیڑ کی بھی کیا حقیقت تھی۔ اور کہاں مولانا فضل الٰہی کا مقام عزیمت دعوت اور کہاں ''وقت کے سیاسی ہنگاموں اور دینی بحرانوں کی پیداوار'' چہ نسبت خاک را با عالم پاک! کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص اپنے ذوق جہالت کے پیمانے سے سلطان وقت اور اسکندر عزم حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک اصلاح و جہاد کے نتائج اور اس کے اصحاب عزیمت دعوت کے کارناموں کی پیمائش کر رہا تھا۔

عزیز ہندی جواں سال تھے، جلیاں والا باغ کے واقعات کے سلسلے میں گرفتار ہوئے، بیس سال کی سزا کے حکم نے حواس باختہ کر دیا، ہمت اور برداشت نے جواب دے دیا۔ خدا سے عہد باندھا کہ اگر رہا ہو گئے تو اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دیں گے، لیکن علم، بصیرت، زندگی کے تجربے اور وقت کے کسی عالم دین اور مدبر کی رہنمائی کے بغیر تحریک ہجرت شروع کر دی۔ بعض حالات کا سامنا کرنا پڑا تو فتوے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فتویٰ پوچھا تو اس لیے نہیں کہ دینی تعلیمات اور شریعت مطہرۂ اسلامیہ کی روشنی میں کوئی لائحۂ عمل مرتب کریں، بلکہ اپنے فیصلے اور عمل کی توثیق کے لیے۔

گاندھی جی اور تحریک ہجرت:

جمعیت علمائے ہند کے پس پشت ہندو رہنماؤں اور ہندو صحافت کا کبھی کوئی اثر نہیں رہا۔ ''جمعیت'' علمائے ہند کا ایک مستند ادارہ تھا۔ اس کے فیصلے ہمیشہ اسلامی تعلیمات کی روشنی اور ملک اور مسلمانوں کے مفاد میں ان کی اپنی صواب دید پر ہوئے۔ برٹش استعمار کے خلاف اس نے ملک کی انقلابی قوتوں کا ہمیشہ ساتھ دیا اور بار ہا ان کے فیصلوں سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا۔ مجلس خلافت مرکزیہ کے مقاصد میں مسئلہ خلافت کے تصفیہ کے ساتھ سوراج کی شق کا اضافہ خدا نخواستہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ہرگز نہ ہوا تھا، بلکہ اس وقت کے تمام مسلم اکابر اس بات پر متفق تھے کہ اسلام کی آزادی کے لیے ہندوستان کی آزادی قطعی ضروری ہے۔ بہ قول مولانا محمد علی:

''اگر تمھیں (مسلمانوں کو) ہندوستان سے کچھ سروکار نہیں، صرف حرمین، بیت المقدس اور عرب کی حکومت کافروں (انگریزوں) سے واپس لینی ہے، تو پہلے ہندوستان کو سوراج دلا دو۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی یہی کہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی پر اسلامی ممالک کی آزادی کا دارو مدار ہے۔ گاندھی جی کا بھی یہی کہنا تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد انگریز ایشیا میں کہیں نہ ٹک سکے گا۔

تحریک خلافت کے لیے جو پروگرام بنائے گئے تھے، انھیں خالص سیاسی بنیادوں میں چلا گیا تھا۔ یہ پروگرام خلافت اور سوراج کے رہنماؤں کے مشوروں اور کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیت علمائے ہند کے فیصلوں کی روشنی میں بنائے گئے تھے۔ لیکن اس میں دینی پہلو سے مسئلہ خلافت کی تعبیر و تشریح صرف علمائے ہند کی ذمہ داری تھی اور وہی اس سے عہدہ برآ ہوتے تھے، تحریک کے اس پہلو سے گاندھی جی یا کسی اور غیر مسلم رہنما کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے باوجود گاندھی جی کو دو باتوں کے لیے سب سے زیادہ مطعون کیا گیا ہے۔

ا۔ تحریک ہجرت کی حمایت کرنے میں، ان کے عمل کو مسلمان دشمنی سے تعبیر کیا گیا۔ گویا کہ ہندو ہونے کی حیثیت سے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت توڑنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ لیکن انھیں اس الزام سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ تحریک ہجرت کی مخالفت کرتے تو ایک اسلامی عمل میں رکاوٹ ڈالنے کا مجرم قرار دیا جاتا۔ جب کہ مسلمان علماء اور رہنما بھی تحریک ہج

کے موید ین اور مخالفین کے دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کسی گروہ کی بھی حمایت کرتے، دوسرا گروہ انھیں الزام دینے سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ خصوصاً برطانوی استعمار کے ایجنٹ کسی معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا مشن ہی ہندوؤں اور مسلمانوں میں غلط فہمیوں کا فروغ اور ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکانا تھا۔ ان کی حکومت کی بقا کا انحصار ہی ہندو مسلم اختلاف پر تھا۔

جو حضرات تحریک ہجرت میں گاندھی جی کے رویے کے خلاف تھے وہ تحریک خلافت ہی کے کب مؤید اور حامی تھے؟ ایک مذہبی مکتبۂ فکر کے علماء نے تو عثمانیوں کے حق خلافت ہی کے خلاف بحث چھیڑ دی تھی، اتحاد و ترقی کے ترکی زعما پر کفر و بے دینی کے فتوے صادر کر دیے تھے اور ترکی مقبوضات پر دول متحدہ کے تصرف میں ان کے لیے جواز مہیا کر رہے تھے، ایک فرقے کے رہنما نے ترکوں کو یورپین ترکی چھوڑ دینے اور ایشیائی ترکی پر قناعت کر لینے کا مشورہ دیا تھا جب کہ درۂ دانیال اور قسطنطنیہ پر دول متحدہ کا قبضہ تھا اور خلیفۂ وقت حراست میں تھا۔ یعنی صورت حال یہ تھی کہ یورپین ترکی ترک خوشی سے چھوڑ دیں اور ایشیائی ترکی کے دارالخلافہ قسطنطنیہ پر وہ زبردستی قبضہ کر کے خلیفہ کو حراست میں لے لیں۔ پھر ترکی کہاں رہا، اور مسلمانوں کا ایک سیاسی مکتبۂ فکر اور تعلیمی مرکز تو ترکی کے کسی معاملے میں مداخلت کرنے اور تحریک چلانے ہی کا سرے سے مخالف تھا۔

اگر گاندھی جی بریلوی، آغا خانی یا علی گڑھ کے مذہبی و سیاسی مکاتب فکر کے ہم رائے ہوتے تو کیا ان حضرات کے مطابق ان کا عمل ''اسلامی خدمت'' قرار پاتا۔

۲۔ تحریک خلافت ہی کے باب میں پروگرام کے خاتمے کی ذمہ داری کے حوالے سے بھی گاندھی جی کو بہت مطعون کیا گیا ہے۔ مخالفین کا خیال ہے کہ گاندھی جی نے تحریک کو ختم کر کے خلافت کے مقاصد کو نقصان پہنچایا۔ لیکن جو حضرات اس باب میں گاندھی جی کو الزام دیتے ہیں، وہ خود تحریک خلافت کو مسلمانوں کے مفاد میں کب سمجھتے تھے، اور تحریک خلافت کے مسلمان رہنماؤں کے بارے میں ان کی رائے اس سے مختلف کب تھی؟ مخالفین کی ایک جماعت تو ان مسلمانوں رہنماؤں کو مسلمان ہی نہ سمجھتی تھی۔ ان کے فتوے موجود ہیں۔ اگر گاندھی جی نے تحریک خلافت کا پروگرام ''ترک موالات'' ختم یا معطل کر دیا تھا تو ان کے نقطۂ نظر سے تو گاندھی جی کا عمل اسلامی اور مسلمانوں کی خدمت شمار کیا جانا چاہیے۔

گاندھی جی تحریک ہجرت کے موید تھے تو گویا مولانا عبدالباری، محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، عزیز ہندی وغیرہ کے ساتھ تھے اور اگر وہ تحریک کے مخالف تھے تو محمد علی جناح، اقبال، خلیق الزماں، (سر) محمد شفیع، (سر) فضل حسین وغیرہم کے ہم خیال تھے۔ اگر ان کی موافقت یا مخالفت کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی سے تھا تو آیئے ان سب بزرگوں کی ''اسلام دوستی'' کے بارے میں فیصلہ کرلیں۔

یہ نہ سمجھیے کہ گاندھی جی تحریک کو جاری رکھنے کا مشورہ دیتے، تحریک جاری رہتی اور تحریک کو برٹش ڈپلومیسی نقصان پہنچاتی تو گاندھی جی پر کوئی الزام نہ آتا۔ اس وقت کا الزام یہ ہوتا کہ گاندھی جی نے مسلمانوں کو مروادیا اور تحریک کی لٹیا ڈبودی، اور یہی ان کا مقصد بھی تھا!

اس چیز کو بھی نظر انداز نہ کردینا چاہیے کہ گاندھی جی نے تحریک خلافت کو ختم نہیں کیا تھا۔ اس کے پروگرام ''ترک موالات'' کو واپس لیا تھا۔ اس لیے کہ ترک موالات کو ''عدم تشدد'' کی شرط کے ساتھ چلانا تحریک کے اہم رہنماؤں کی عدم موجودگی میں، ان کے گرفتار ہونے اور جیل چلے جانے کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔

رہے وہ حضرات جو تحریک خلافت کے مؤید اور کسی درجے میں اس کے رہنما تھے، تو بلاشبہ ان میں سے بعض حضرات ''پروگرام'' (نہ کہ تحریک) کے خاتمے کے حق میں نہ تھے، لیکن جب کانگریس کے اجلاس میں گاندھی جی کی تحریک ''پروگرام'' کے تعطل کے بارے میں پاس ہوئی تو،

۱۔ اول تو کانگریس کا فیصلہ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور کئی دوسرے مسلمان مدبرین کے اتفاق سے کیا گیا تھا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ جب تک مرکز یہ خلافت کمیٹی کے اجلاس بمبئی اور جمعیت علمائے ہند کے اجلاس اجمیر میں ''پروگرام کے تعطل'' کی توثیق نہیں کی گئی، اس تجویز پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ پھر اگر تحریک خلافت کے پروگرام کے تعطل کی تجویز اور فیصلے کے مجرم تھے تو گاندھی جی ہی کیوں؟ کانگریس کے تمام مسلمان ارکان، مجلس عاملہ، خلافت کمیٹی کے تمام ارکان جو سب مسلمان تھے اور جمعیت علمائے ہند کے تمام علما جو دیوبند، فرنگی محل، بدایوں، خیرآباد کے خانوادہ ہائے علمی اور اہل حدیث کے مکتبۂ فکر کے نمائندوں پر مشتمل تھے، سب مجرم ٹھہرے!

ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق اور بدگمانیاں پیدا کرنے کے لحاظ سے تو یہ ایک نہایت موثر حربہ تھا لیکن عقل وانصاف کی عدالت میں زیر بحث لانے کے نقطۂ نظر سے یہ ایک نہایت بودا دعویٰ تھا۔

ہجرت کے مختلف واقعات:

ہندوستان سے ہجرت اور عرب وحجاز اور مختلف اسلامی ممالک میں قیام و سکونت کے واقعات مسلمانوں کے عہد حکومت کے مختلف ادوار اور تاریخ کے ہر دور میں ملتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کی سکونت کا ترک اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ یا جزیرۃ العرب کے کسی مقام و شہر میں یا کسی اور ملک میں قیام وسکونت کے واقعات پر ''ہجرت نبویہ کے تتبع'' کا اطلاق کیا جاسکتا ہے اور اسے ہجرت اسلامی کہا جاسکتا ہے؟ صدیوں پر پھیلے ہوئے سیکڑوں واقعات جو ہجرت مقدسہ کے رسم وعنوان ہی سے موسوم ومعنون ہیں، ان کے عازمین کے اخلاص ونیت کے بارے میں بہ یک جنبش قلم کوئی فیصلہ نہیں کردیا جاسکتا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ترک سکونت ہندوستان کا سبب خواہ کچھ ہو اور یہ ترک فرار، اخراج یا کسی اور مصلحت کے ضمن میں کیوں نہ آئے، لیکن قیام وتوطن کے لیے دوسرے مقامات وممالک پر مکہ، مدینہ اور عرب کو ترجیح دینا بھی ذوق دینی کا ثبوت اور ایک خاص شرف و فضیلت کی بات ہے۔ یہاں پر دو باتوں کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ۱۹۲۰ء کی ہجرت افغانستان، نہ اسلامی ہجرت تھی اور نہ حالات کی سنگینی میں مظلومانہ فرار تھا۔ یہ محض ایک حادثہ تھا اور ایک ایسا عمل جس کا عنوان مذہبی اور مقاصد سیاسی تھے۔ ممکن ہے عازمین ہجرت میں ایسے سادہ دل موجود ہوں جو اسے ایک خالص دینی اور اسلامی عمل سمجھتے ہوں بلکہ یقیناً ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاص نیت کے ثواب کو ہرگز ضائع نہ فرمائے گا، لیکن فی الواقع نہ تو یہ اسلامی عمل تھا اور نہ اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کو کوئی فائدہ پہنچا۔ یہ ہندوستان کی قومی وملی زندگی کا ایک حادثہ تھا جو پیش آیا اور اس کے نتائج خواہ کچھ نکلے ہوں، ملی تاریخ میں اس کا ذکر ناگزیر ٹھہرا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ۱۹۲۰ء کی ہجرت کا واقعہ ۱۸۳۰ء میں اصلاح وجہاد کے ناکامی کے بعد سے لے کر ۱۹۱۵ء تک ہندوستان سے ہجرت کے مختلف واقعات سے، اپنے پس منظر، مقصد اور نتائج میں بالکل جدا حیثیت رکھتا ہے۔ اسے کسی اور واقعے سے ملانہ دینا چاہیے حتی کہ ۱۹۱۵ء میں لاہور سے طلبہ کی ہجرت کے واقعے کو بھی اس سے الگ رکھنا چاہیے۔

مولانا عبیداللہ سندھی:

مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ساتھیوں کا سفر افغانستان یا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

کے حجاز جانے کے واقعت کا تعلق ملک کی آزادی کے ایک الگ انقلابی منصوبے سے تھا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ہجرت کے مبادی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ جس طرح مولانا سندھی کا ہندوستان سے افغانستان جانا تحریک ہجرت سے تعلق نہ رکھتا تھا، اسی طرح ان کے افغانستان چھوڑنے کا پس منظر بھی کسی کیمونسٹ نوجوان سے تعلقات نہ تھے۔ مولانا سندھی ہندوستان کی آزادی کا ایک انقلابی منصوبہ لے کر افغانستان گئے تھے، انہوں نے وہاں آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت بنائی تھی، جنود ربانیہ کے نام سے ہندوستان کی نجات دہندہ فوج قائم کی تھی، برٹش انڈیا پر افغانستان کے حملے میں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اہم رول ادا کیا تھا اور افغانستان کی کامیابی اور آزادی میں ان کا حصہ تھا۔ اب جب کہ افغانستان اور برٹش انڈیا میں معاہدہ طے پا گیا تھا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ مولانا کو انگریزوں کے خلاف وہاں بیٹھ کر کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہاں اگر مولانا سندھی اپنی تحریک سے دست بردار ہو جاتے تو ان کے لیے افغانستان میں قیام کی پیش کش موجود تھی، لیکن مولانا اپنے منصوبے کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور انھیں اگلی منزل کے لیے رخت سفر باندھنا پڑا۔ اس لیے بھی کہ پیچھے لوٹنے کی راہ ان پر بند ہو چکی تھی۔

تحریک ہجرت اور اس کے اثرات:

تحریک ہجرت کے سلسلے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اس سے ہماری قومی اور سیاسی زندگی کو فائدہ پہنچا یا نقصان؟ جس طرح سیلاب آتا ہے تو تباہی و بربادی اس کے جلو میں آتی ہے، لیکن اپنے پیچھے زرخیزی چھوڑ جاتا ہے اور بارش جب زمین کے لیے حیات تازہ کا پیغام لے کر آتی ہے تو بعض اوقات کھیتیاں تباہ و برباد بھی ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کسی قوم کی زندگی میں تحریکیں ہوتی ہیں۔ بعض تحریکیں سیلاب کی طرح ہوتی ہیں۔ بعض کی مثال بارش میں ڈھونڈھنی چاہیے۔ ان کے نفع و نقصان کے اندازے کے لیے کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوا، جس سے ناپ کر فیصلہ کر دیا جائے کہ اتنا نفع ہوا اور اتنا نقصان!

تحریک ہجرت کی بدولت قوم کو بہت نقصان اٹھانے پڑے، سیکڑوں خاندان تباہ و برباد ہو گئے لیکن اس واقعے سے ملک کی آزادی اور اسلامی ممالک کی آزادی کی تحریکات اور ان کی سیاست سے برصغیر کے مسلمانوں کی دل چسپی کا اندازہ بھی ہو گیا اور اس سے یہ بھی پتا لگ گیا کہ مسلمان قومی اور ملی زندگی کے قیام و استحکام کے لیے ایثار و قربانی کی راہ میں کتنی دور تک جا سکتے ہیں اور کیا

کچھ کر سکتے ہیں؟

اس تحریک کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے تھے، ان میں برٹش استعمار کے حصے کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ اس تحریک کو در پردہ ناکام بنانے کے لیے اندرون ملک سے بیرون ملک تک برٹش استعمار کے ہزاروں ایجنٹوں نے کام کیا تھا۔ ان ایجنٹوں کی ریشہ دوانیوں نے مہاجروں میں تفریق پیدا کی، ان کے مختلف گروپوں کو ایک دوسرے سے بدظن کیا، ان کے مابین نفرتوں کے بیج بوئے ہندوستان میں مسلمانوں کو ہجرت پر اکسایا اور افغانستان میں مقامی اور غیر مقامی کا مسئلہ پیدا کیا، اختلافات کو ہوا دی، مقامی حضرات کو مہاجروں کے خلاف بھڑکایا، ملک کے لیے ان کے وجود کو مصیبت ٹھہرایا، زمینوں کے دیے جانے، ان کے روزگار فراہم کرنے اور سرکاری دفتری نظام میں ان کی خدمات و مقامی لوگوں کے حقوق پر ڈاکا اور استحصال ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح ہجرت سے سندھ اور سرحد کے مسلمان خاندانوں کو جتنا نقصان پہنچا تھا، اس سے کہیں زیادہ نقصان برٹش حکومت کے ایجنٹوں نے تحریکِ ہجرت اور قومی و ملی زندگی کو پہنچایا۔

انگریزوں نے ملک کی ایک نامور مسلمان اور ذہین شخصیت کو افغانستان میں بہ طور سفیر بھیج کر تحریک کو سبوتاژ کرانے کا پروگرام بنایا تھا۔ آخر انگریز ایسا کیوں چاہتا تھا۔ مسلمانوں کو نقصان سے بچانے کے لیے یا وہ اپنے مفاد میں تحریک کو سبوتاژ کرنا چاہتا تھا؟

ہمیں ہجرت جیسی ملی تحریک کے نفع و نقصان کو صرف سندھ اور سرحد کے میدانوں میں تلاش نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ تحریک ہجرت سے افغانوں کی سیاسی بیداری کا ایک دور شروع ہوا۔ افغانستان کی آزادی کی تحریک میں ہندوستانی انقلابی عنصر کی شمولیت سے قوت پیدا ہوئی اور افغانستان سے برٹش حکومت کی صلح اور ایک باعزت سمجھوتے میں اس پر دباؤ بڑھا، افغانستان کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے خلاف استعمال کیے جانے کا آیندہ کے لیے سدِ باب ہو گیا۔

تحریک ہجرت کو ایک جنون ہی تصور کر لیا جائے، تب بھی یہ سراسر نقصان کا سودا نہ تھا۔ اس کی بدولت مسلمانوں کی تحریک خلافت اور ہندوستان کی تحریک استقلال کا شہنشاہ دنیا کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔

تحریک ہجرت کا ایک اور فائدہ ہوا۔ ایسا فائدہ جو خلافت کے وفد یورپ سے بھی نہ ہوا تھا۔ وہ یہ کہ تحریک ہجرت کی بدولت ہندوستان کے عوام اور مسلمانوں کی بے چینیوں، ہندوستان کے

سیاسی مسئلے اور آزادی کی جدوجہد اور اس کے مقاصد سے ایران، روس اور ترکی کے لوگوں کو قریبی بلکہ براہ راست واقفیت ہوئی۔ تحریک آزادی ہند میں ایک انقلابی عنصر کا اضافہ ہوا۔ اس عنصر کا تعلق بیرون ملک کی ایک انقلابی فکر اور جماعت سے تھا۔ اس کے دو فائدے ہوئے:

۱۔ روس کی انقلابی حکومت کو ہندوستان کی آزادی کے مسئلے سے گہری دلچسپی اس کے بعد ہی ہوئی۔ اور یہ اسی کا اثر تھا کہ

۲۔ حکومت ہند اور برٹش استعمار کو تشدد کی پالیسی پر نظر ثانی کر کے اپنا سختی اور تشدد کا رویہ تبدیل کرنا پڑا۔

بلاشبہ اس بیرونی انقلابی فکر کے اثرات ہندوستانی نوجوان پر بھی پڑے لیکن یہ اثرات گنتی کے نوجوانوں کے ذہنوں تک محدود تھے۔ ملک کی عام زندگی پر نہ اس کا کوئی اثر پڑا تھا، نہ ملک میں کوئی انقلاب رونما ہو گیا تھا۔

پھر اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ جن نوجوانوں نے ان اثرات کو قبول کیا تھا، وہ اپنے ماحول، پس منظر، خیالات، اعمال، اپنی تعلیم اور تربیت کے لحاظ سے پہلے ہی کتنے مسلمان تھے، جن کے انقلاب فکر و حال کا ماتم کیا جائے۔ وہ پہلے ہی ایک غیر اسلامی و جاہلی زندگی گزار رہے تھے، بعد میں بھی ان کی زندگی وہی رہی۔ وہ جتنے اور جیسے مسلمان پہلے تھے، ویسے ہی اس فکر کو اختیار کر لینے کے بعد تھے۔

اگر انگریزوں نے شروع میں تحریک کو ڈھیل دی تھی تو اس لیے کہ مسلمانوں کا جوش نکل جائے۔ مہاجرین کے واپس آنے پر کسی قسم کی رعایت دی یا مدد کی تو اس لیے کہ آئندہ کسی تحریک میں حصہ لینے سے انھیں روکا اور دبایا جا سکے۔

تحریک کے مخالفین اور ان کے درجے:

کسی تحریک میں مختلف اسباب، افکار، عقائد اور مصالح ذاتی و اجتماعی کی بنا پر حمایت یا مخالفت کی جاتی ہے۔ اس لیے کسی مسئلے میں ہر شخص کے عمل و اقدام کو یکساں حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ مسئلۂ خلافت اور تحریکِ ہجرت کے بہت سے مؤید تھے اور بہت سے مخالف، اور ان سب کی حمایت یا مخالفت کے مختلف وجوہ تھے۔ مثلاً:

۱۔ ایک شخص خلافت کا ایک خاص عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق خلافت کے منصب کے حفظ و دفاع کو اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ترکوں کے ساتھ سیاسی طور پر ناانصافیاں ہوئی ہیں اور مسلسل ہو رہی ہیں۔ وہ ان کی تلافی بھی چاہتا ہے۔ وہ یہ

بھی سمجھتا ہے کہ ترکی اور تمام اسلامی ممالک کے مصائب کی علت ہندوستان کی غلامی ہے۔ اس لیے وہ نہایت خلوص کے ساتھ ملک کی آزادی کے لئے جدو جہد بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے عمل میں ایک خاص جوش، جذبہ اور فدائیت ہوگی۔

۲۔ دوسرا شخص خلافت کے عقیدے اور مسلک ہی کو نہیں مانتا۔ اس کے عقیدے کے مطابق ترکی کا عثمانی خاندان کسی اور کے حق خلافت کا غاصب ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تحریک خلافت کو مدد پہنچانے اور تحریک ہجرت میں حصہ لینے سے اس کے عقیدے کے برعکس ترکی خلافت یا منصب خلافت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس شخص کا رویہ اور عمل اول الذکر شخص سے بالکل مختلف ہوگا۔

۳۔ تیسرا شخص نہ عثمانیوں کو خلافت کا حق دار سمجھتا ہے اور نہ انھیں مسلمان خیال کرتا ہے جو اصلاح احوال کے لیے ہندوستان اور ترکی میں کوشاں ہیں۔ وہ نہایت دیانت کے ساتھ اپنے مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر ترکوں پر انگریزوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی مخالفت تحریک خلافت کی اصل بنیاد یہی ہے۔

۴۔ چوتھا شخص نہایت سنجیدگی اور علمی دیانت کے ساتھ خلافت کا حق قریش میں محدود سمجھتا ہے، لیکن چوں کہ عثمانیوں نے خلافت قائم کر لی ہے، اس پر صدیاں گزر چکی ہیں، ان کی ایک عظیم الشان تاریخ ہے، اس لیے ان کی خلافت نہ سہی حکومت کو جائز سمجھتا ہے۔ لیکن جب ایک سیدزادہ (حسین، شریف مکہ) کسی کے ایما و اشارے پر معصیت خروج پر کمربستہ ہوتا ہے اور خلافت سے بغاوت کرتا ہے تو اس کے پس منظر کو جانتے بوجھتے کہ اس کا مقصد اسلامی حکومت یا منصب خلافت کی تنقیص و تقطیع ہے، وہ اس کے خلاف نہ کوئی اقدام کرتا ہے، نہ لب کشائی۔ اس شخص کے رویے کی کسوٹی پہلے شخص کا کیریکٹر نہیں ہوسکتا۔

۵۔ پانچواں شخص اسلام ہی کو نہیں مانتا۔ خلافت کے عقیدے پر ایمان یا اس سے انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ یہ سمجھتا ہے کہ سیاسی طور پر ترکوں کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے۔ وہ صرف سیاسی پہلو سے تحریک خلافت کی تائید کرتا ہے اور مسلمانوں کا ساتھ دیتا ہے۔

کیا ہم کوئی ایسا اصول وضع کر سکتے ہیں کہ تحریک خلافت اور تحریک کے ہر حمایتی اور ہر مخالف کو اس اصول کی کسوٹی پر کس اور گھیر کھ کر اس کے کیریکٹر کے بارے میں فیصلہ کردیں؟

اگر ہم تحریک خلافت، اور ترک موالات کے پروگرام اور ہجرت کے عمل کے حامیوں اور مخالفوں پر نظر ڈالیں تو ان کے عمل کے پس منظر میں افکار و عقائد کا یہ اختلاف و تباین صاف نظر

آ جائے گا۔ اس سے ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ

☆مولانا محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں

☆ ہز ہائی نس سر آغا خان، جسٹس امیر علی، قائد اعظم محمد علی جناح، ☆ بریلی مکتبۂ فکر اور ☆ فرنگی محل لکھنوں کے علمائے کرام اور ☆ مہاتما گاندھی اور غیر مسلموں کو کن خانوں میں رکھا جائے۔

یہی خانے درحقیقت ان حضرات کے کیریکٹر کی کسوٹی ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے خلافت کی راہ میں سب کچھ لٹا دینا ہی اس کے ایمان اور اس کے اسلامی کیریکٹر کا ثبوت ہے۔ لیکن جو شخص خلافت کے منصب کو قریش یا اہل بیت کا غصب شدہ حق سمجھتا ہے، اس کے ایمان کا ثبوت اور کیریکٹر کا معیار یہ قرار پائے گا کہ وہ غصبشدہ منصب خلافت کی روایت کے حفظ و دفاع کے ہر عمل کی مخالفت کرے اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ خلافت کی روایت کے حفظ و دفاع میں فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چوں کہ تحریک ہجرت میں خلافت ہی کا مفاد پوشیدہ تھا۔ اس لیے تحریک ہجرت کی مخالفت کرنا بھی ان کا مذہبی فریضہ تھا۔ اس بارے میں ہمیں ان کا شکوہ سنج ہونے کے بجائے، ان کے کیریکٹر کی خوبی کا اعتراف کرنا چاہیے۔ لیکن ایسے شخص کی رائے کا حوالہ خلافت کی تحریک یا ہجرت کے عمل میں اور اس سے تحریک کے صحیح یا غلط ہونے پر استدلال کرنا، درست نہیں ہوسکتا۔ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری)

۱۹۲۱ء:

مسلمان اور کونسل ممبری:

ایک مسلمان شخص جو بیرسٹر ایٹ لا ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو سرکاری کونسل کی ممبری کے لیے نامزد کیا ہے اور وہ اپنا حلفیہ خیال اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ میں حقوق مسلمانان کی نگہداشت کی غرض سے کونسل کا ممبر بننا چاہتا ہوں۔ لہذا علمائے کرام موجودہ زمانے کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے (یعنی جس کشمکش میں اہل اسلام مبتلا ہیں) جواب عنایت فرمائیں کہ مسلمان کو کونسل کی ممبری جائز ہے یا نہیں؟

حضرت مفتی اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نے اس سوال کا یہ جواب عنایت فرمایا:

''اس وقت مسلمانوں کی مجالس ملیہ وقومیہ نے گورنمنٹ کے ساتھ ترک موالات کی تجویز پاس کر دی ہے۔ یعنی مذہبی جماعت نے مذہبی احکام کے بموجب ایسی گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد عمل اور تعاون کو حرام قرار دیا ہے جس نے اپنے صریح وعدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقامات مقدسہ کو خلیفۃ المسلمین کی سلطنت وسیادت سے نکال کر غیر مسلم اثر واقتدار کے ماتحت کر دیا ہو، جس نے اسلامی سلطنت اور خلیفۃ المسلمین کی طاقت کو پارہ پارہ کر کے اقتدار خلافت کو زائل کیا ہو، جس نے خلیفۃ المسلمین کے غیر مفتوحہ علاقوں پر محض اپنی مادی طاقت کے دباؤ سے خود قبضہ کیا ہو یا کسی غیر مسلم طاقت کو قبضہ دلایا ہو یا اس کے قبضے کو جائز تسلیم کیا ہو، جس نے شرائط صلح میں پریسیڈنٹ امریکہ کے اصول کے خلاف ترکی ممالک اور ترکی کی سلطنت پر غاصبانہ تسلط کر لیا ہو، جس نے مستقر خلافت (قسطنطنیہ) پر فوجی قبضہ کر کے اسلامی شوکت کو تباہ و برباد کیا ہو۔

اسی طرح قومی وسیاسی مجلسوں نے خلافت کی اس دردناک حالت اور پنجاب کی دل ہلا دینے والی مصیبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور کونسلوں میں غیر سرکاری ممبروں کی اکثری خوشامدانہ رفتار کا تجربہ کرتے ہوئے اور حق پرست آزاد خیال ممبروں کی بے دست و پائی اور باایں ہمہ حکومت کے وسیع اختیارات کا لحاظ کرتے ہوئے طے کر لیا ہے کہ ایسی کونسل میں جانا قومی مفاد کے خلاف ہے۔ پس جبکہ قومی و مذہبی جماعتوں نے فیصلہ کر لیا ہے تو اب کسی مسلمان کو کونسل میں جانا جائز نہیں۔ اور جبکہ مسلمان خود ہی اپنے حقوق کی نگہداشت کونسل میں اپنا قائم مقام بھیج کر کرانے پر تیار نہیں یا کونسل میں جانا نگہداشت حقوق کے لیے ان کی رائے میں مفید نہیں تو کسی جانے والے کا یہ عذر کہ میں حفاظت حقوق کے لیے جاتا ہوں اہل مذہب اور افراد قوم کے نزدیک مقبول نہیں ہو سکتا۔ نیز جبکہ کونسل میں اسلامی احکام اور خدا ورسول کی صریح ہدایت کے خلاف قوانین پاس کیے جاتے ہیں تو اس مجلس میں کسی مسلمان کو ان مخالف احکام کے موافق رائے دینا یا سکوت کرنا یا مخالفت کا علم نہ ہو یعنی مذہبی واقفیت پوری حاصل نہ ہو تو شرکت ہی کرنا حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۲۳ر جنوری ۱۹۲۱ء: ۱۸ر ربیع الاول کو حضرت شیخ الہند نے اس جہان فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار فرمایا تھا۔ اس الم ناک واقعے پر ابھی پورے دو ماہ بھی نہ گزرے تھے اور محبین صادقین کے آنسو بھی خشک نہ ہوئے تھے اور ہوش ٹھکانے نہ آئے تھے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے

صرف ماتم سے فارغ ہو گئے بلکہ حضرت شیخ الہند کے حالات میں ''ذکر محمود'' کے نام سے ایک رسالہ بھی تالیف فرما دیا۔ بعض از کار اپنی صفائی میں بھی پیش فرمائے ہیں اور یہی اس رسالے کی تالیف کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔ ان از کار کی کسی اور روایت سے تصدیق نہیں ہوتی۔

(رسالے کی تاریخ تکمیل ۱۳ رجمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۳ رجنوری ۱۹۲۱ء ہے)

برٹش استعمار سے دوستی کا تعلق...... ناممکن ہے!

۲۵ راگست ۱۹۲۱ء: صوبائی مجلس خلافت آگرہ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں مولانا ابو الکلام آزاد نے فرمایا:

''آج بھی میں یہی اعلان کرتا ہوں۔ اس لیے کہ صلح کی خبریں اڑ رہی ہیں۔ ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہو جانا چاہیے کہ جب تک انگریزی حکومت اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے مطالبات شرعی کو پورا نہ کر دے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے،

ایشیائے کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے۔ اس وقت تک انگریزی گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلہ میں فریق محارب ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل میں ایک آخری چنگاری بھی ایمان کی باقی ہے، تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ صلح یا صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ وہ مسلمان اپنے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے وہاں سانپ اور بچھوؤں کے ساتھ صلح کر لے مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا۔

لیکن ہاں! جس آن اور جس لمحہ حالات میں بھی تبدیلی ہو جائے، حالات پلٹ جائیں۔ وہ فریق محارب نہ رہے، بلکہ اس حکم میں آجائے جس کو تم سن چکے ہو یعنی جن لوگوں نے مسلمانوں سے قتال نہیں کیا ہے، ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، ان کو دیس نکالا نہیں کیا ہے اور یہی نہیں کہ خود ظلم نہ کیا ہو، بلکہ دوسروں کو بھی ظلم پر نہ ابھارا ہو۔ جس آن برٹش گورنمنٹ میں یہ حقیقی تبدیلی ہو جائے گی، حقیقی تبدیلی دھوکے کی نہیں جس میں چالیس سال سے ہندوستان الجھا ہوا ہے۔ بمجرد حالات کی تبدیلی کے حکم بدل جائے گا اور مسلمانوں میں سے ہر فرد تیار ہوگا کہ صلح اور اتفاق کا ہاتھ بڑھائے۔ لیکن جب تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، وہ خلافت کے مطالبات پورے نہیں کرتی، جب تک ہندوستان کو سچے اور حقیقی معنوں میں سوراج نہیں دیتی۔ یعنی کوئی نئی اور کسی قدر

ترقی یافتہ ریفارم کی اسکیم نہیں بلکہ سوراج! جس وقت تک انگریزی گورنمنٹ ان تمام امور کو پورا نہیں کرتی، اس وقت تک مسلمانوں کے لیے اس کا وجود، اس کے گورنروں کا وجود، اس کی عدالتوں کا وجود، ظلم وستم کی کارروائیاں ہیں ان کا وجود، لڑنے والوں کا وجود ہے۔ مسلمان کے لیے ممکن ہے کہ وہ بچھوؤں کو ہتھیلی پر لے کر دودھ پلائے مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کرے۔" (خطبات آزاد، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۵۰۔۴۹)

موپلے:

۵ر فروری ۱۹۲۱ء: مالا بار کے علاقہ میں خلافت کمیٹی کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب وہاں جاگیرداروں کے خلاف مزارعوں کی تحریک بہت عروج پر تھی چنانچہ خلافت کو ان کے مطالبات کی بھی حمایت کرنی پڑی۔ یہاں مزارعوں اور خلافت کی تحریکیں ملاپ سے چلنے لگیں اور قائدین کے مابین مکمل اتحاد و اتفاق ہو گیا۔ اس کے اثرات کئی اضلاع تک پھیل گئے۔ کالی کٹ، ارند، کنڈوتی، منجیری، مالا پورم وغیرہ جگہوں پر مشترکہ جلسے ہوئے۔ ۵ فروری ۱۹۲۱ء کو جنوبی مالا بار کے عوام نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کلپا گنجیری میں بیس ہزار مزارعوں نے خلاف ورزی کی۔ پونانی میں پولیس نے بے رحمی سے لوگوں کو زدوکوب کیا۔ لیکن پولیس تشدد کے باوجود عوام نے سر جھکانے سے انکار کر دیا بلکہ انھوں نے دفاعی پوزیشن اختیار کر لی۔

۱۸ر نومبر ۱۹۲۱ء: مالا بار کی دگرگوں حالت کے بارے میں وہاں سے مولانا کے پاس متعدد خطوط آئے۔ مولانا حالت کا جائزہ لینے کے لیے کالی کٹ تشریف لے گئے۔ لوگوں سے ملے اور حالات معلوم کیے اس کا اظہار انھوں نے جمعیت العلماے ہند لاہور کے اجلاس میں ۱۸ر نومبر ۱۹۲۱ء کو تقریری خطبہ میں کیا۔

موپلوں کے مسئلہ پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کی جس میں کہا گیا تھا:

"ورکنگ کمیٹی موپلوں کے تشدد کی مذمت کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار بھی کرنا چاہتی ہے کہ اس کے پاس جو رپورٹ موجود ہے ان کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اشتعال دلایا گیا تھا اور حکومت کی طرف سے شائع شدہ اطلاعات یک طرفہ ہیں حکومت نے نقصانات کا اندازہ بہت کم ظاہر کیا ہے جو اس نے لا اینڈ آرڈر کے نام پر کیے ہیں۔"

"ورکنگ کمیٹی یہ معلوم کر کے بہت افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ موپلوں میں زبردستی تبدیلی مذہب کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ وہ عوام کو متنبہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ حکومت کے بیانات

وغیرہ پر کسی قسم کا یقین نہ کریں۔ کمیٹی کے سامنے جو رپورٹیں آئی ہیں اس میں منجیری کے گرد و نواح میں رہنے والے خاندان ہیں۔ ہندوؤں کو خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے مخالفوں نے جبراً مسلمان بنایا اور ہماری اطلاع میں صرف تین ایسے کیس آئے ہیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۸۔۱۰۶)

مولانا مدنی کی تقریر:

۲۱ر فروری ۱۹۲۱ء: سیوہارہ (ضلع بجنور) میں مجلسِ خلافت کا ایک اجلاس عام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں ہوا۔ حضرت نے اس میں ایک مفصل خطبۂ صدارت پیش فرمایا۔ خطبۂ صدارت کے آغاز میں حضرت نے فرمایا کہ یہ ان کی زندگی کا پہلا موقع ہے کہ ایک عظیم الشان مذہبی اور سیاسی اجتماع کی صدارت سے نوازا گیا ہوں۔ حضرت کے الفاظ یہ ہیں:

''یہ میری زندگی کا پہلا موقع ہے جس میں مجھ کو قوم کی بزرگ ہستیوں اور مقدس نفوس نے ایک مذہبی اور سیاسی عظیم الشان اجتماع کی نہایت بوجھل اور ذمہ دار صحافت کی عزت بخشی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں میری ہیچمدانی اور کم مائیگی مجھ کو کسی طرح اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں اس قسم کے خطرات کو کبھی دل میں جگہ دیتا جیسے کہ میرا زاویہ خمول اور صحرائے ضعف رائی میں گم گشتہ ہونا بزرگان قوم کو بھی کبھی مشورہ نہیں دیتا تھا کہ مجمع کو اس لائق خیال بھی فرمائیں''۔

حضرت شیخ الہند کے سانحۂ ارتحال کو ابھی پورے تین ماہ بھی نہ گزرے یہ زخم ابھی تازہ تھا اور رسماً بھی سب سے پہلے حضرت مدنی نے اس جانکاہ واقعے پر اپنے حزن اور ملال کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد خلافت کے قیام اور خلافت ترکی اور جزیرۃ العرب کے مسائل اور ان کی شرعی حیثیت کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی قدیم ترقی، فارغ البالی اور انگریزوں کے عہد میں اس کے مصائب، ان کے پس منظر کو تاریخ کی روشنی میں بیان کر کے ملک کی آزادی کو تمام مصائب کا حل تجویز فرمایا ہے۔ اور آزادی کے لیے ''ترک موالات کے پروگرام'' پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس خطبۂ صدارت میں حضرت نے ایک بڑی غلط فہمی کو دور فرما دیا ہے کہ انگریز حکومت دعویٰ کرتی ہے اور اس کے حاشیہ بردار جاگیردار، خطاب یافتہ حتیٰ کہ علمائے کرام کا ایک طبقہ بھی شور مچاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں:

''میں نہیں سمجھ سکتا کہ کس طرح کہا جاتا ہے کہ شعائر مذہبیہ میں پوری آزادی دی گئی ہے اس کے ساتھ یہ سوال بھی ہے کہ وہ آزادی جو کہ دینے سے حاصل ہوئی۔ آیا وہ شرعاً آزادی شمار ہوسکتی ہے یا نہیں۔ حال آں کہ آزادی دینے والے کو ہر وقت قوت ومقدرت ہے کہ جب چاہے وہ اس آزادی کو سلب کرلے اور یہی وجہ ہے کہ جس مذہبی آزادی کو وہ اپنی سیاست کے مخالف سمجھتی ہے سلب کرلیتی ہے اور جس وقت میں کوئی آزادی سے مخالف مصلحت معلوم ہوتی ہے بند کردیتی ہے۔ چنانچہ واقعات پنجاب وغیرہ اس کے شواہد ہیں''۔

''جن امور میں وہ آزادی دیتی بھی ہے وہ اسلامی قوت وشوکت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے نزدیک اس کو ھباءً منثوراً سمجھتے ہوئے دیتی ہے۔ دیکھیے کیا خلافت کا مسئلہ مذہبی مسئلہ نہ تھا کیا مسلمانان ترک کی مالی اعانت۔ مجروحین اتراک کی خبر گیری، ضعفاء اور مساکین کی بقانون ہلال احمر فریادرسی، کیا امکنۂ مقدسہ کی حرمت وغیرہ امور نہ تھے۔ کیوں ان میں آزادی نہ دی گئی اور مسٹر مشیر حسین قدوائی نے جب ایک وفد ان مظلومین ترک کی خبر گیری کے لیے مثل جرمن وآسٹریا وغیرہ کے لے جانا چاہا تو منع کردیے گئے اور تینتیس کروڑ ہندوستانیوں کی متفقہ آواز کو مسترد کردیا گیا۔ وفد کی اہانت کی گئی۔ ایک بات بھی نہ مانی گئی۔'' (خطبات صدارت، ص ۶۰۔۵۹)

انھی ایام میں جمعیت علماے صوبہ دہلی کا ایک اجلاس مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کی صدارت میں اور کانگریس کا ایک جلسہ بھی ہوا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نے ان دونوں میں بھی شرکت فرمائی تھی اور تقاریر بھی کی تھیں۔

''فروری ۱۹۲۱ء کا مہینہ ہے برہانپور میں مجلس خلافت کانفرنس مولانا ظفر علی خان کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ حکومت کے ارباب حل وعقد کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے اپنی مسلسل وعدہ شکنی سے اس کے اپنے وقار کو زائل کردیا ہے جو بھی اہل ہند کے دلوں میں ان کی طرف سے گوشہ گیر تھا اور جو آخری سلوک وہ خلافت اسلامیہ کے ساتھ کر رہے ہیں اس نے رہی سہی ارادت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ایک بھی ہندو یا مسلمان اس وقت ہندوستان میں ایسا نہیں جو انگلستان کی موجودہ حکمت عملی پر نفرین نہ کرتا ہو۔ لہٰذا برطانیہ کے مدبرین کا فرض ہے کہ ہمارے مطالبات پر ہمدردانہ غور کریں اور مہلک روش سے باز آجائیں جو انھوں نے اختیار کر رکھی ہے۔ ہماری وفاداری کا یہ آخری فرض تھا جو ہم نے ادا کردیا تحریک خلافت کے سلسلے میں برہانپور کا یہ اجلاس اپنے ہم وطنوں کو پیغام بیداری ہے کہ وہ جاگ اٹھیں اور ایثار و

قربانی کے لیے تیار ہو جائیں مستقبل یقیناً شاندار ہوگا۔"

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

۲۵ر مارچ ۱۹۲۱ء مطابق ۱۴ر رجب المرجب ۱۳۳۹ھ: آج حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے بمقام بھیا گنج (ضلع رنگ پور۔ بنگال) میں انجمن علماء بنگال کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور تقریباً تیس صفحوں پر مشتمل خطبۂ صدارت پیش فرمایا اور اسلامی خلافت کی شرعی اور تاریخی حیثیت، خلافت ترکیہ کے مسئلے، ترکی کے خلاف انگریزوں کی سازش شریف مکہ کی بغاوت، ہندوستان کی قدیم تاریخی اقتصادی حالت، انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ، ہندوستان کی معاشی حالت کی تباہی میں انگلستان کے حصے، ترکی خلافت کی بقاء اور تحفظ، اماکن مقدسہ کی آزادی کے لیے ہندوستان کی آزادی کی اہمیت اور ترک موالات کے پروگرام کی ضرورت پر تاریخ اور مذہب کے بہت سے حوالوں سے بحث فرمائی اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی مسلمانوں کو ترغیب دی ہے۔ خطبے کے آخری صفحات میں حضرت نے فرمایا ہے:

"اے حضرت! وقائع اور معاملات پر نظر ڈالیے، آنکھیں کھولیے، جہان میں گشت کیجیے، کسی دجال کی فریب دہ باتیں آپ کو دھوکے میں نہ ڈالیں۔ آپ اور ہم ڈیڑھ سو برس سے دھوکے میں پڑ کر آج اس دن کو پہنچ گئے، مگر واقعات کی روشنی نے تمام شیطانی چالوں کی قلعی کھول دی۔ اٹھیے اور سوراج کی کوشش کیجیے۔ آیئے دینی، وطنی، اقتصادی، ملکی افکار کے میدان میں قدم بڑھایئے اور آئندہ نسلوں اور دوسری قوموں کو زندہ کیجیے۔ خیر خواہ رہنماؤں اور خوش اندیش عالموں اور پنڈتوں نے پرامن طریقۂ فتح و نصرت (ترک موالات کا پروگرام) آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس پر عمل کیجیے اور دوسروں کو آمادہ کیجیے۔" (خطبات صدارت و نایاب تقاریر، طبع دہلی)

جون ۱۹۲۱ء: جون ۱۹۲۱ء کا مہینہ ہے لالہ لاجپت رائے نے ایک خط گاندھی جی کو لکھا کہ آپ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور علمبردار ہیں۔ آپ دوئی کے رشتے کو کاٹنا چاہتے ہیں اگر ایسا ہے تو کانگریس کے ہوتے ہوئے مجلس خلافت کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ مجلس خلافت سے دلچسپی لیتے ہیں خلافت کانفرنسوں میں شریک ہوتے ہیں اگر یہی ہوتا رہا تو مسلمان قومی دھارے اور ہندوؤں سے الگ ہی رہیں گے جو ان کے لیے مضر ہوگا۔ نہ کہ سود مند۔"

۲۱ر جون کو گاندھی جی نے لالہ لاجپت رائے کے خط کا اقتباس دیتے ہوئے اخبارات کو ایک

بیان دیا کہ میں ہندو مسلم اتحاد کی آڑ میں نہ تو ہندوؤں کو ختم کرنا چاہتا ہوں نہ مسلمانوں کو۔ آج ہندو مسلم اتحاد کے تصور میں ہندو بھی ہے اور مسلمان بھی۔ میں ہندو مسلم اتحاد چاہتا ہوں ہندو اور مسلمان کو ختم کرنا نہیں چاہتا۔

میں مجلس خلافت کی حمایت کیوں کرتا ہوں؟ بات یہ ہے کہ مجلس خلافت کانگریس کی ضد نہیں ہے بلکہ حلیف ہے اور چونکہ میرا نظریہ ہندو اور مسلمان کو مدغم کرنا نہیں بلکہ دونوں میں یک جہتی پیدا کرنا ہے چونکہ مجلس خلافت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یک جہتی پیدا کرتی ہے اس لیے اس کی الگ تنظیم میں مجھے کوئی نقصان دکھائی نہیں دیتا۔ مجلس خلافت اگر مسلمانوں کے ایک مخصوص نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سوراج بھی حاصل کرنا چاہتی ہے تو کانگریس اور مجلس خلافت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بحث صرف اس وقت ہونی چاہیے کہ ہندوستان میں ایسی جماعتیں قائم ہونے لگیں جو آزادی یا سوراج کے متعلق الگ الگ رائے اختیار کرنے لگیں۔ مجلس خلافت چونکہ ایسا نہیں کرتی اس لیے کانگریس اور اس کی راہ مشترک ہے۔ رہا یہ کہ میں خلافت کانفرنسوں میں کیوں شریک ہوتا ہوں؟ وہ اس لیے کہ مسلمانوں کو یقین دلاؤں کہ ہندو اور مسلمانوں کے دل ایک ہیں۔ مسئلہ خلافت پر ہندو بھی اسی طرح سوچتا اور عمل کرتا ہے جو مسلم اتحاد کا سنگ بنیاد ہے۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص، ۱۔۱۰۰)

۲۵، ۲۶ / جون ۱۹۲۱ء: مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیت علماے صوبہ بہار کا اجلاس پٹنہ میں ہوا۔ اس میں صوبائی امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا پھلواری شریف کے مولانا شاہ بدرالدین کو امیر شریعت اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ صوبہ بہار اور اڑیسہ کے علماء کا یہ اقدام کہ امارت شرعیہ کو قائم کر کے اس علاقے کے مسلمانوں کی تنظیم و اصلاح کا کام شروع کریں، نہایت مستحسن اور خوش آیند ہے لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ ہمارا اصل مسئلہ یقین محکم اور مضبوط ارادوں کے ایسے افراد کو پیدا کرنا ہے جو موجودہ صورت حال کو بدل دینے کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔ ایسے افراد کے بغیر ہر منصوبہ، خواہ وہ کتنا ہی مہتم بالشان کیوں نہ ہو۔ آخر میں چل کر ناکامی ہی پر منتج ہوتا ہے۔

کئی لحاظ سے مذکورہ پٹنہ کانفرنس سے متعلق حکومت ہند کی انٹیلی جنس رپورٹ دلچسپ تھی۔ "ہسٹری آف خلافت اینڈ نان کوآپریشن موومنٹس: بیم فورڈ، دہلی، ۱۹۸۵ء کے حوالے سے

اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

''.....کانفرنس میں جو خاص بات طے ہوئی وہ یہ تھی

۱) بہار اور اڑیسہ کے تمام اضلاع میں دار القضا عدالتیں قائم کی جائیں۔

۲) ہر ضلع کا ایک امیر ہو۔

۳) ایک امیر شریعت یا صوبائی لیڈر منتخب کیا جائے۔

''خیال ہے کہ اس پوری اسکیم کے مصنف ابوالکلام آزاد ہیں اور اس بات کی تائید میں شہادتیں ہیں کہ انھیں یہ امید ہے کہ اسی طرح کی تنظیم ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی قائم ہو جائے گی اور پھر انھیں شیخ الہند (امیر الہند) کے ممتاز عہدے کے لیے منتخب کرلیا جائے گا۔

''.....مولانا عبدالباری اور علی برادران اس کے مخالف تھے، اس لیے کہ وہ مولانا آزاد کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے ان سے غالباً رشک وحسد کرتے تھے اور مولانا عبدالباری نے تو پریس کو ایک خط بھی لکھ دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر مولانا اپنی اسکیم پر عمل کرانا چاہتے ہیں تو انھیں ہجرت کرنی اور ہندوستانی شدت پسند متعصبین کی چمرقند پارٹی میں شامل ہو جانا چاہیے۔

''چند مہینے بعد جمعیۃ العلماء کی ایک میٹنگ میں طے کیا گیا کہ امیر افغانستان اور انگورہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ امیر ہند کے عہدے کے لیے ایسے افراد کو نامزد کردیں جن کے ناموں کی منظوری ان سے مل گئی ہو جب کہ ایک دوسری تجویز یہ بھی تھی کہ سر دست صرف صوبائی امیروں کا تقرر ہو اور امیر الہند کا عہدہ خالی رکھا جائے۔

(مولانا ابوالکلام آزاد... فکر ونظر کی چند جہتیں، از ضیاء الحسن فاروقی، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۵۱-۵۰)

۸ر جولائی ۱۹۲۱ء: کراچی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا زبردست اجلاس مولانا محمد علی کی صدارت میں شروع ہوا۔ علمائے کرام اور ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر کچلو، شنکر اچاریہ، مولانا نثار احمد، پیر غلام محمد مجدد، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے تقریریں کیں اور تجویزیں پاس ہوئیں کہ آج سے کسی بھی ایمان دار مسلمان کا برٹش فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے اسے کسی قسم کی مدد پہنچانا حرام ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسلمان فوجی فوج سے باہر نکل آئے۔

ارشاد نبوی ہے ''اخرجوا الیہود و النصاری من جزیرۃ العرب ''یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر کردیا جائے۔ انھیں اس کے حدود میں رہنے بسنے کی اجازت

نہ دی جائے۔اس جدیث کو رہنماؤں کے علاوہ ہندو لیڈروں نے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اس جلسے میں ایک تجویز یہ بھی پاس ہوئی کہ اگر برٹش سرکار انقرہ سرکار سے جنگ چھیڑ دے گی تو ہندوستان کے مسلمان اور عوام سول نافرمانی شروع کر دیں گے اور اپنی کامل آزادی کا پرچم احمد آباد میں لہرادیں گے۔صدر کانفرنس کی باغیانہ تقریر کچھ اس قدر مقبول و مشہور ہوئی کہ یہ کراچی اسپیچ کے نام سے مشہور ہوگئی۔(مولانا آزاد......ایک سیاسی ڈائری۔ص ۱۳۰)

۸رجولائی ۱۹۲۱ء: آج کراچی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا سالانہ اجلاس مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں مولوی مسافر خانہ کے میدان میں شروع ہوا۔اور مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس اجلاس میں شرکت فرمائی۔یہ اجلاس سہ پہر کو شروع ہوا تھا۔خطبۂ استقبالیہ کے بعد صدر اجلاس کا خطبۂ صدارت شروع ہوا جو نماز مغرب بعد تک جاری رہا۔

۹رجولائی ۱۹۲۱ء: آج شام کے اجلاس میں جو ریزولیوشن پیش ہو کر پاس ہوئے۔اس میں چھٹا ریزولیوشن مولانا سید حسین احمد مدنی نے پیش فرمایا۔پہلے مولانا محمد علی نے ان الفاظ میں ریزولیوشن پیش کرنے کی تحریک کی:

''اس ریزولیوشن کو مولانا حسین احمد صاحب جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کے محب صادق ہیں اور جو مصر میں اور مالٹا میں قید تھے،پیش کریں گے۔''

ریزولیوشن:

''آل انڈیا خلافت کانفرنس کا یہ جلسہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور حکومت انگورہ کو تہہ دل سے ان کی شاندار فتوحات اور بقائے حکومت اسلامیہ کے لیے سرفروشانہ کوششوں کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہے۔اور رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے کہ وہ جلد سے جلد غیر حکومتوں کی تمام افواج کو سلطنت ترکی کے ہر گوشہ سے خارج کر دینے میں کامیاب ہوں (آمین) اس کے ساتھ یہ جلسہ اس امر کا صاف اعلان کرتا ہے کہ ہر مسلمان پر انگریزی فوج میں اس وقت نوکر رہنا،بھرتی ہونا یا اس میں دوسروں کو بھرتی کرانا شرعاً قطعی حرام ہے اور مسلمانوں کا بالعموم اور علماء کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ اس باب میں شریعت کے احکام فوج کے مسلمانوں تک پہنچادیں۔علاوہ ازیں یہ جلسہ اس امر کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اگر انگریزی حکومت حکومت انگورا کے خلاف بالواسطہ علانیہ یا خفیہ طور پر کوئی جنگی کارروائی کرے گی تو مسلمانان ہندوستان مجبور ہوں گے کہ کانگریس کو اپنی معیت میں

لے کر قانون شکنی شروع کر دیں اور آیندہ کانگریس کے سالانہ جلسہ میں جو احمد آباد میں منعقد ہونا قرار پایا ہے۔ ہندوستان میں ہندوستان کی کامل آزادی اور ہندوستان میں جمہوری حکومت کا اعلان کر دیں۔"

ریزولیوشن پیش فرمانے کے بعد حضرت مولانا نے اس کی تائید میں مفصل تقریر فرمائی۔ جس میں مولانا نے مسلمانوں کے تعلق اخوت، فرائض اخوت، مسلمانوں کی مدد، ان کے دفاع میں دور نزدیک کے مسلمانوں کے درجہ بہ درجہ فرائض بیان فرمانے کے بعد ترکی خلافت کے خلاف انگریزوں کے اقدام، اس کے مقبوضات پر تصرف کے حوالے سے مسلمانان ہند کے فرائض شرعیہ کی وضاحت فرمائی ہے اور ترکی حکومت کے خلاف برطانیہ کے مخالفانہ ومعاندانہ عزائم بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو ان کے فرائض شرعیہ کا احساس دلاتے ہوئے انھیں سول نافرمانی، حکومت سے عدم تعاون اور فوج میں خود بھرتی نہ ہونے اور کسی کو بھرتی نہ کرانے کی ترغیب دی ہے۔

آخر میں حضرت مولانا مدنی نے فرمایا:

"پھر کیا اس صورت میں مسلمانوں کا فرض یہی ہوگا کہ جیسا پہلے سے معاملہ کرتے چلے آئے اسی طرح سے معاملہ کرتے رہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ قرآن کے حکم کے موافق تو لازم تھا کہ وہ پورے طور سے جنگ کرتے مگر جب کہ ان کے اندر قوت نہیں ہے اس واسطہ اس درجہ میں ایسا کرنا لازم ہوگا مگر وہ امن اور شائستگی کے ساتھ امن کو نہ توڑیں مگر یہ لازم ہے کہ جس طرح سے اب تک قانون کی پابندی کی گئی ہے اسی طرح پابندی نہ کی جاوے بلکہ قانون شکنی کے جو قواعد ہیں اُس کے مطابق مقابلہ کیا جاوے اور یہ جنگ بھی اسی طرح پر امن اور شائستگی کے ساتھ میں رہے گی۔ فقط اسی معاملہ میں مقابلہ میں زیادتی کی جائے کہ وہ قانون کی حد میں نہ رہیں بلکہ حد سے بھی باہر ہو جاویں اس لیے میں ان آیات اور ان احادیث کے موافق جو کہ اس باب میں وارد ہوئی ہیں۔ میں اس مضمون کی جو ابھی پڑھا گیا ہے تحریک کرتا ہوں کہ ضروری ہے مسلمانوں پر کہ تمام فوجوں کو اور تمام لوگوں کو اس بات سے روکیں کہ وہ اتحادیوں کی کسی قسم کی مدد نہ کریں اور اگر انگورہ گورنمنٹ پر برطانی فوجیں حملہ کریں تو وہ قانون شکنی کے ساتھ نہایت امن اور شائستگی کے ساتھ مقابلہ کریں اور جس قدر قوت صرف ہو سکے اس کو صرف کرے۔"

حضرت مولانا مدنی کا یہ بیان لخت حسین انسپکٹر، سی، آئی، ڈی صوبہ یوپی نے مرتب کیا تھا۔ اور استغاثے کے ساتھ "دستاویز ثبوت نمبر۱۴" کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔

(کراچی کا تاریخی مقدمہ: مرتبہ مرزا عبدالقادر بیگ، ص ۱۸ و ۵۹ تا ۷۰)

۲۸ر جولائی ۱۹۲۱ء: ۲۸ر جولائی ۱۹۲۱ء کو بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تین روز تک چلتا رہا۔ اجلاس نے کرگھے کے بنے ہوئے کپڑوں اور گاڑھے کو تقویت پہنچانے کے لیے عوام پر زور دیا اور تمام کانگریسیوں کو یکم اگست ۱۹۲۱ء سے کھادی پہننے کے لیے خصوصی تجویز پاس کر کے ہدایت کی۔ ساتھ ہی بمبئی اور احمد آباد کے مل مالکوں کو تنبیہ کی کہ وہ سوتی کپڑوں کی قیمتوں میں اضافہ نہ کریں اور غریب عوام کے استعمال کے لیے اُن کی قیمتیں کم سے کم رکھیں اور بیوپاریوں سے کہا گیا کہ بدیشی کپڑوں کی طرح وہ اپنے بھارتی مال کو بھی غیر ملکوں میں کھپانے کی کوشش کریں اور ہندوستانی عوام سے خصوصاً اپیل کی گئی۔ وہ نشیلی چیزوں اور شراب نوشی سے باز آجائیں بلکہ شراب بندی کے لیے کوشاں رہیں اور شراب کے ٹھیکداروں سے التماس کی گئی کہ وہ شراب فروخت کرنا بند کر دیں اس طرح بیجواڑہ اجلاس کی دیگر تجاویز پر دوبارہ مہر منظوری لگا دی گئی اور اسی اجلاس میں تلک سوراج فنڈ کا ایک کروڑ روپیہ جمع کیا گیا۔ اور بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کو تیس ستمبر ۱۹۲۱ء تک پورا کرنے کا فیصلہ دیا اسی کے ساتھ گاندھی جی نے صبر وضبط کی تلقین کی۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۰۱)

۸ر اگست ۱۹۲۱ء: ۸ر اگست کو پولیس نے جمعیت علمائے صوبہ دہلی کے دفتر میں چھاپا مارا اور ترک موالات کا فتوئ جو پانچ سو علمائے دین کے دستخطوں سے شائع کیا گیا تھا، ضبط کر لیا۔ جانشین شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے خطبۂ صدارت جلسۂ دہلی میں حکومت کی جانب سے مذہبی آزادی کے دعوے کے بطلان میں اسے تازہ ترین مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

۱۸ر اگست ۱۹۲۱ء کو ہالیڈے پارک میں گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے جلسۂ عام منعقد کرنے کی ہدایت کی اس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا:

"جس ریزولیوشن کی بنا پر علی برادران کو گرفتار کیا ہے، وہ اسلام کا ایک مانا ہوا اور مشہور و معروف مسئلہ ہے، اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ ریزولیوشن دراصل میرا ہی تیار کیا ہوا ہے اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منظور ہوا ہے۔ میں اس سے بھی زیادہ صفائی اور تفصیل کے ساتھ اس کے مضمون کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے رپورٹر بیٹھے ہیں۔ میں انھیں کہتا ہوں کہ حرف بحرف قلم بند کر لیں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا"۔

مولانا نے دہلی میں مرکزی جمعیت العلماے ہند.. خلافت کمیٹی کے اجلاسوں میں دونوں جگہوں پر کراچی ریزولیوشن کو زیادہ واضح اور صاف الفاظ میں پیش کیا انھوں نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ چونکہ گورنمنٹ نے اس اسلامی حکم کی تبلیغ کو جرم قرار دیا ہے اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اب اس کے اعلان میں اپنی جان لڑادے اور ہر مقام پر اس غرض کے لیے جلسے منعقد کیے جائیں۔اس پر ملک بھر میں جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہو گیا جن میں کراچی ریزولیوشن کو دہرایا جاتا اور تائید کی جاتی ۔ اس سے حکومت کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا نے بمبئی، آگرہ اور لاہور کی کانفرنسوں کی صدارت کی اور یہاں بھی انھوں نے کراچی ریزولیوشن کا اعادہ کیا۔

کراچی ریزولیوشن پر حکومت درماندہ تھی ہر جگہ اسے دہرایا جارہا تھا حکومت کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اس کا وقار خاک میں مل رہا تھا۔حکومت نے ابتداء میں مقدمہ کو کراچی ریزولیوشن تک محدود رکھا لیکن جب مولانا آزاد نے بار بار اعلان کیا کہ انھوں نے ۲۸۔فروری ۱۹۲۰ء کو سب سے پہلے کلکتہ خلافت کانفرنس میں یہی اعلان کیا تھا تو سرکاری وکیل نے دعویٰ میں ترمیم کرتے ہوئے کلکتہ ریزولیوشن کو بھی شامل کر دیا۔اس پر مولانا نے جرأت مندانہ اخباری بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا:۔

''سب سے پہلے کلکتہ کانفرنس کے لیے یہ ریزولیوشن میں نے تیار کیا، خود اپنے قلم سے لکھا اور میری ہی صدارت میں منظور ہوا۔اس کے بعد دہلی میں جمعیت علماے ہند کا جلسہ ہوا اور میں نے اس ریزولیوشن پر بصورت فتویٰ کے دستخط کیے۔ پھر بریلی میں جمعیت العلماء کا جلسہ ہوا اس کا بھی میں ہی صدر تھا اور صدارت کی طرف سے ریزولیوشن کو پیش کر کے منظور کرایا تھا۔علاوہ بریں رسالہ خلافت میں ایک خاص باب اس موضوع پر لکھ چکا ہوں اور اس کی بے شمار کاپیاں تقسیم ہو چکی ہیں۔کلکتہ، دہلی، کراچی، بمبئی، وغیرہ میں بھی میں نے ایسا ہی بیان کیا ہے۔ میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ یہ میرا صاف زبانی اظہار ہی نہ تھا بلکہ میں نے اس پر عمل بھی کیا ہے اور ہمیشہ لوگوں کو کہتا رہا ہوں کہ اس کی تبلیغ کرتے رہیں۔اگر یہ ''سازش'' اور ''اغوا'' ہے تو مجھے اس کے ارتکاب کا ہزار مرتبہ اقرار ہے۔گورنمنٹ کو چاہیے تھا کہ علی برادران سے پہلے مجھ پر مقدمہ چلاتی''۔

قائدین کی شجاعتوں، جرأت مندیوں، دلیریوں اور بے باکیوں کو دیکھ دیکھ کر عوام کی ہمتوں

میں اضافہ ہوتا تھا انھیں حوصلہ ملتا تھا، جذبات واحساسات جوان ہوتے تھے، ہر کوئی دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے بے قرار تھا۔ عوام کی چمڑی سے خوف رخصت ہو چکا تھا۔ وہ ابتلاء و آزمائش کو دعوت دیتے تھے۔ وہ گلی گلی کوچہ کوچہ صدائیں بلند کرتے تھے۔

باندھ لو بستر فرنگی راج اب جانے کو ہے

۱۸ راگست ۱۹۲۱ء: ۱۸ راگست ۱۹۲۱ء کو مزارعوں کے مقبول رہنماؤں نارائن میمن۔ محمد موسلے، کے۔ عبداللہ، حاجی آف پوکوٹور اور دیگر کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے ان میں مزارعوں کا محبوب رہنما علی موسلیار بھی شامل تھا۔ پولیس نے جب اس کی گرفتاری کے لیے اس کے ہیڈ کوارٹر پر چھاپا مارا جو کہ ایک مسجد میں تھا تو وہ وہاں ندارد تھے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی اور آنکھ جھپکتے ہی تیس ہزار موپلے لاٹھیاں وغیرہ اٹھا کر سڑکوں پر نکل آئے۔ پولیس کی فائرنگ سے نو آدمی شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔

مشتعل ہجوم سے پولیس نے جان بچانے کے لیے کورٹ بلڈنگ میں پناہ لی۔ کئی افسر مارے گئے جن میں آسٹن کلکٹر، روولے اے ایس پی، ایک فوجی افسر اور دو سپاہی شامل تھے۔ مالا بار خلافت کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر افتخار خاں کو بڑی مشکل سے گرفتار کیا اور پھانسی پر لٹکا دیا۔

اس اثنا میں راجہ نیلم بار کی رہائش گاہ پر حملہ ہوا اور اسے نقصان پہنچا۔ موقع پرستوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ اتفاق سے مسلمان مزارعوں کے ہاتھوں چند ہندو مارے گئے لیکن اس کی وجہ ان کا ہندو ہونا نہ تھا بلکہ وہ یا تو بڑے جاگیردار تھے یا پھر حکومت کے مخبر اور طرفدار۔

نارائن میمن مالا بار تحریک خلافت کے صف اول کے رہنما تھے وہ بڑے مشہور گاندھی وادی اور رہنما بھگت تھے۔ انھوں نے برملا کہا کہ موپلوں نے ہندوؤں پر حملے نہیں کیے، نہ ہی ان کے گھروں کو ہندو ہونے کی بنا پر لوٹا ہے۔ لوٹ کے بعض واقعات جب قائدین کے نوٹس میں آئے تو اس کے مرتکب افراد کو سزائیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیے گئے اور لوٹا ہوا سامان واپس لوٹا دیا گیا۔ متعدد مقامات پر ہندو مزارعوں نے موپلوں کا ساتھ دیا۔ اور مدراس کے روزنامہ اخبار ''ہندو'' میں حاجی کنبا احمد موپلوں کے مشہور رہنما کا ایک بیان شائع ہوا انھوں نے حکومت پر الزام لگایا کہ وہ موپلوں کو بدنام کرنے کے لیے ہندوؤں کی رہائش گاہوں اور مندروں پر حملے کرا رہی ہے۔ مالا بار کے برہمنوں کے ترجمان ''یوگا گ شیمان'' نے

۶؍جنوری ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں مقالہ افتتاحیہ لکھا۔ کہ موپلوں کے ہاتھوں کسی غریب کو گزند نہیں پہنچی۔ البتہ بڑے بڑے مگرمچھ متاثر ہوئے ہیں۔ (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: محمد فاروق قریشی، ص ۲۰۔ ۱۱۹)

۲۱؍اگست ۱۹۲۱ء جنوبی ہند مالا بار کے (جو فی الحال کیرالا کہلاتا ہے) موپلے مسلمانوں نے تحریک خلافت کی حمایت اور فتویٰ کی تبلیغ میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور انگریزوں کی مسلسل زیادتیوں اور اہانتوں کا ترکی جواب دینا شروع کر دیا اور سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا ان موپلوں نے سرکاری عمارتوں، ریلوں اور کچہریوں کی توڑ پھوڑ بھی جاری رکھی تھی۔ مولانا محمد علی مالا بار جانے کے لیے نکلے۔ مگر حکومت نے انھیں والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لیا۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری۔ ص ۱۰۲)

۲۱؍اگست ۱۹۲۱ء: ۲۱؍اگست ۱۹۲۱ء کو مالا بار میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ پوکونور کے مقام پر دس ہزار موپلے جمع تھے۔ ان میں سے پانچ صد پولیس فائرنگ سے جان بحق ہوئے۔ ۴؍نومبر ۱۹۲۱ء کو موپلوں کے محبوب رہنما علی موسلیار کو ۳۰ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر مقدمات قائم ہوئے تیرہ کو پھانسی کی سزا ہوئی اور اٹھارہ کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ ۲۸؍نومبر کو ۱۲۷ موپلوں کو ریل گاڑی کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا انھیں مال گاڑی کے ڈبے میں سوار کر کے دروازہ بند کر دیا جب گاڑی بیلاری پہنچی تو ۵۶ موپلے جان ہار چکے تھے۔ مارشل لا کی سرسری سماعت کی کورٹ میں ۲۸۳۰ موپلوں کے خلاف مقدمات چلائے گئے کوئمبٹور جیل میں ۲۰۰ کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ موپلوں کی خواتین کے بے حرمتی کی گئی، ان کے گھروں کو لوٹا اور جلایا گیا۔ بیگار کیمپ قائم کیے جہاں موپلہ عورتوں کو یرغمال بنا کر رکھا، حکومت نے غلط فہمیاں پھیلانے کے لیے اسے فرقہ وارانہ فسادات کی شکل دینے کی بہت کوشش کی جیسا کہ گاندھی جی کو بدظن کرنے کے لیے مولانا محمد علی جوہر کی تقاریر کو متشددانہ رنگ دے کر پیش کیا گیا تھا۔ لیکن حکومت کو یہاں بھی اپنے مذموم عزائم میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مالا بار کے ایک رہنما یعقوب حسن نے حکومت کے ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا۔ موپلوں نے اپنے مفادات اور حفاظت کے لیے وہی اقدامات کیے جو ان حالات میں کوئی ہندو، مسلمان یا عیسائی کرتا۔

۲۳؍اگست ۱۹۲۱ء: دہلی میں جمعیت علمائے صوبہ دہلی کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے زیر صدارت پٹودی ہاؤس میں ایک جلسہ ہوا۔ حضرت مدنی نے ایک مفصل خطبہ

صدارت پیش فرمایا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں حضرت نے اسلامی ممالک پر برطانیہ کے مظالم ان کی عہد شکنیوں اور وعدہ خلافیوں اور خلافت اسلامیۂ ترکیہ کے خلاف ریشہ دوانیوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ حضرت کا یہ خطبۂ صدارت محمد الدین کے مطبع غنی المطابع، دہلی سے ستمبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہو گیا تھا۔

۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء: آج سٹی مجسٹریٹ کراچی میں استغاثہ پیش کیا گیا۔ یہ استغاثہ زمان شاہ ولد محبوب شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کراچی کی جانب سے بہ حکم گورنمنٹ بمبئی اور بہ حکم سپرنٹنڈنٹ پولیس کراچی دائر کیا گیا تھا۔ استغاثہ دائر کرنے کے لیے مستغیث کو ۳۱ر اگست ۱۹۲۱ء کو استغاثہ دائر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مندرجۂ ذیل سات افراد اسی ترتیب سے مستغیث علیہم تھے:

۱) محمد علی رام پوری ۲) مولوی حسین احمد دیوبندی

۳) ڈاکٹر سیف الدین کچلو امرتسری، ۴) پیر غلام مجدد مٹیاروی

۵) مولوی نثار احمد کان پوری ۶) بھارتی کرشنا تیرتھ جی عرف ونکٹ رام یعنی جگت گرو شنکر آچاریا جی اور

۷) شوکت علی رام پوری

مقدمے کی کارروائی میں ان کے یہی نمبر ہیں۔ مثلاً: حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو عام طور پر ''ملزم نمبر ۲'' کہا گیا تھا

استغاثے کی دفعہ نو میں تعزیرات ہند کی ان دفعات کی صراحت کی گئی ہے جن کے تحت ان ملزمان کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ استغاثے کی دفعہ نو یہ ہے:

''ملزمان جرائم زیر دفعہ ۱۲۰ اب مع دفعہ ۱۳۱ تعزیرات ہند کے مرتکب ہوئے ہیں اور وہ جرائم زیر دفعہ ۵۰۵ وزیر دفعات ۵۰۵ مع ۱۱۴ و ۵۰۵ مع ۱۱۷ تعزیرات ہند کے بھی مرتکب ہوئے ہیں۔'' (کراچی کا تاریخی مقدمہ، ص ۱۷ تا ۱۵)

۱۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء: محمد علی کو ۱۴ر ستمبر کو جنوبی ہندوستان کے شہر والٹیر سے گرفتار کر لیا گیا جب وہ گاندھی جی کے ساتھ مالا بار جا رہے تھے جہاں وہ موپلوں سے بغاوت کے سلسلے میں ملنا چاہتے تھے۔ شوکت علی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ گاندھی جی نے والٹیر کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

''والٹیر کے مقام پر ٹرین پچیس منٹ تک رکی رہی۔ میں اور مولانا محمد علی اسٹیشن سے باہر جلسہ سے خطاب کے لیے جا رہے تھے۔ ہم اسٹیشن سے بمشکل چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ میں نے مولانا کی آواز سنی جو اونچی آواز میں مجھے بلا رہے تھے وہ ایک نوٹس پڑھ رہے تھے جو انھیں دیا گیا

تھا۔ میں ان سے چند قدم آگے تھا دو انگریز اور آدھ درجن پولیس کے ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل پارٹی گرفتار کرنے کے لیے آئی تھی۔ مولانا نے ابھی پورا نوٹس بھی نہ پڑھا تھا کہ آفیسر انچارج نے مولانا کو بازو سے پکڑا اور ساتھ لے گیا۔ مولانا اس پر مسکرا دیے اور مجھے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ مجھے اب پرچم کو بلند رکھنا تھا۔"

اس کے بعد گاندھی جی لکھتے ہیں:

"علی برادران پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے سپاہیوں کی وفاداری بدلنے کی تلقین کی۔ اس طرح بغاوت کے مرتکب ہوئے۔ لیکن بغاوت تو کانگریس کا مسلک بن چکا تھا۔ عدم تعاون...... کرنے والا ہر شخص حکومت کے خلاف نفرت کے اظہار کا حلف اٹھاتا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ لارڈ چیمسفورڈ کو اس کا علم تھا، لارڈ ریڈنگ بھی اسے جانتے تھے ہمیں کسی طرف سے کوئی امید نہ تھی۔ حکومت سے بھی کوئی توقع نہیں تھی۔ ہم کھلے طور پر اظہار نفرت کریں گے اور اس تحریک کو منظم طریقے سے چلائیں گے حتیٰ کہ حکومت ہمیں گرفتار کرلے"۔ (مسلم افکار، صفحہ ۱۶۹)

۱۸ ر ستمبر ۱۹۲۱ء: حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی گرفتاری کے موقع پر دیوبند میں جو حالات پیدا ہوگئے تھے۔ اس کی تفصیل مولوی راشد حسن صاحب "تذکرہ شیخ مدنی" نے بیان فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۰ ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو صبح سے دیوبند میں گرفتاری کی افواہ شروع ہوئی اور لوگوں میں ایسا ہیجان پھیلا کہ ہر ایک کی زبان پر یہ تھا کہ ہم حضرت کو گرفتار نہ ہونے دیں گے۔ اس اطلاع پر بعض لوگ متعجب تھے کہ یہ اطلاع کیوں اور کیسے پھیلی۔ مقامی حکام نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں، مگر دوپہر کے بعد ایک انگریز افسر کچھ مسلح پولیس لے کر دیوبند پہنچا اور دیوبند کے تھانے میں قیام کیا اس وقت سب کو یہ خیال ہوا کہ ضرور کوئی بات ہے اس سے شہر میں اور شور ہوگیا۔

چنانچہ ۱۸ ر ستمبر ۱۹۲۱ء بروز یکشنبہ یعنی اتوار کی شام کو چار بجے انگریز افسر اپنے ساتھ حاکم پرگنہ اور تھانیدار صاحب کو لے کر تھانے سے نکلا اور تمام مسلح پولیس پیچھے پیچھے آئی یہ سب لوگ حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کرنے کے لیے آستانہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر پہنچے مگر شہر میں یہ افواہیں پہلے سے تھیں لوگ پہلے سے کچھ جمع تھے اور یہ اطلاع پاکر کہ پولس حضرت شیخ الہند کے جانشین کو گرفتار کرنے کے لیے حضرت شیخ الہند کے دولت کدہ کی طرف جارہی ہے فوراً تمام بازار بند ہوگیا لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر ہندو مسلمان سب ہی حضرت کے گھر پر پہنچ گئے یہ واقعہ میری موجودگی میں

ہوا میں خود موجود تھا لوگوں میں اس انگریز افسر کے خلاف اتنا جذبہ تھا کہ اس کو جان سے مارنے پر تیار تھے الغرض انگریز افسر حاکم پرگنہ سب انسپکٹر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عبدالعزیز انسپکٹر سی آئی ڈی نے دفعہ (۵۰۵) کا وارنٹ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دکھا کر کہا کہ آپ اپنے آپ کو گرفتار سمجھیں یہ فقرے سننے کے بعد وہیں کسی صاحب نے فرمایا کہ آپ کو وارنٹ دکھانے کا حق ہے یا گرفتار کرنے کا ابھی انسپکٹر صاحب نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ لوگوں نے ہاتھ چھوڑ دیا دو چار کے تھپڑ لگے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ذمہ دار حضرات نے ان تمام افسران کو بڑی مشکل سے بچایا اور اندر بند کر کے تالہ لگا دیا گیا پولیس باہر تھی پولیس کو حکم دینے والے اندر بند تھے تمام مجمع اس قدر جوش میں تھا کہ ان افسران کو بند کرنے پر ذمہ داران کو برا کہہ رہا تھا اور مطالبہ تھا کہ ان کو ہمارے حوالے کر دو ہم ان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جانشین شیخ الہندؒ نے عصر کے بعد تقریر شروع کی مغرب کی نماز پر ختم کی، مگر لوگ نہیں مانے بعد مغرب پھر شروع کی عشاء ہوگئی، مجمع کسی طرح نہیں مانتا تھا مجبور ہوگئے، ہر طرح سمجھانے پر بھی لوگ نہیں مانتے تھے اب خوشامد فرمانے لگے خدا اور رسول کا واسطہ دینے لگے آخر میں اپنی پگڑی اتار دی اور کہا کہ میری پگڑی کی لاج رکھ لو لوگوں پر رقت طاری ہوگئی اور اس شرط پر راضی ہوئے کہ گورنمنٹ رات کو آپ کو نہیں لیجائے گی صبح کو ہم خوشی خوشی اپنے محبوب حسین احمد کو جلوس کی ساتھ اسٹیشن پہنچائیں گے ریل میں بٹھائیں گے، کوئی انگریز کا بچہ پولیس کا بچہ ہمارے شیخ کو گرفتار کرنے نہیں آئے گا۔ ڈپٹی کلکٹر اور انگریز افسر نے یہ شرطیں مان لیں، تب لوگ بڑی مشکل سے گیارہ بجے رات تک منتشر ہوئے اس وقت ان افسران کو اسی مکان کے تہہ خانے سے دوسری جانب نکال کر تھانہ تک پہنچایا گیا۔ لیکن انگریز افسر نے سہارنپور اطلاع بھیجی اور صاف صاف لکھا کہ دن میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو گرفتار کرنا ناممکن ہے فوراً گورا یا گورکھا فوج بھیج دو تاکہ رات ہی رات میں حضرت کو گرفتار کر کے دیوبند سے لے جایا جا سکے ورنہ دیوبند میں اتنا بڑا ہنگامہ ہوگا کہ جس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔ چنانچہ سہارنپور سے رات ہی میں اسپیشل ۲ بجے کے قریب گورا فوج لے کر ایک فوجی انگریز کی سرکردگی میں دیوبند پہنچا۔ میں ابھی اس وقت جاگ رہا تھا سب لوگوں کو یہ گمان تھا کہ رات میں بڑی سے بڑی فوج آئے گی کچھ لوگ پہرہ دے رہے تھے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں ایک صاحب نے کہا کہ فوج نے تمام شہر کے اہم اہم مقامات اور اہم اہم راستے روک لیے ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فوجی جوتوں کی آواز آنی شروع ہوئی

تھوڑی ہی دیر میں حضرت شیخ الہند کے مکان کا پورا پورا محاصرہ کرنے کے بعد انگریزی فوج کا افسر آگے بڑھا اور دروازہ پر پہنچ کر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم کیا۔ ہم لوگ انگریز افسر سے سخت سخت باتیں کر رہے تھے کہ حضرت شیخ مدنی، حضرت مولانا عزیر گل صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے اور ہمیں ڈانٹ کر الگ کر کے کچھ لوگوں کو ساتھ چلنے کی اجازت لی افسر نے اجازت دے دی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے اور ہم روتے رہ گئے، کچھ نہ کر سکے، افسوس ابھی چند دن کی بات ہے کہ مالٹا سے رہا ہوئے تھے اب پھر گرفتار ہو کر چلے گئے دیوبند اور معتقدین، مریدین، شاگرد اور خاندان شیخ الہند کا برا حال تھا مگر اللہ کا پیارا حسین احمد اللہ کی رضا پر راضی تھا خوشی خوشی شیر ببر کی طرح دندناتا ہوا مسکراتا ہوا بزرگانہ اور لیڈرانہ انداز سے مجاہدانہ دلیری کے ساتھ اسٹیشن پہنچ کر ریل میں سوار ہو گیا رفیقوں کو رخصت فرمایا اور آج پھر قیدی ہو کر کراچی جیل کی طرف سفر کیا۔ دیوبند میں تمام دن ہڑتال رہی۔ اللہ، اللہ میرے شیخ کی زندگی کیسے کیسے مصائب سے گزری! الحاصل کراچی پہنچے۔" (تذکرہ شیخ مدنی، ص ۱۲۴۔۱۲۱)

۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء: حضرت مولانا مدنی کی گرفتاری پر لوگوں میں بہت جوش ہے۔ آج دیوبند میں تمام دن ہڑتال رہی۔

۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء: ۱۷ نومبر کو پرنس آف ویلز ہندوستان آئے۔ اس روز ہندوستان بھر میں ہڑتال ہوئی لیکن بمبئی میں تشدد نے کام بگاڑ دیا۔ بہت سے فسادیوں نے پرنس آف ویلز کے استقبال کے لیے کھڑے لوگوں پر حملہ کر دیا۔ ان ہنگاموں میں ۵۸ افراد مارے گئے یہ جان کر گاندھی جی نے کہا: اس سوراج سے مجھے گندگی کی بو آتی ہے۔ انھوں نے باردولی تحریک کا منصوبہ ترک کر دیا۔ حکومت نے اخبارات پر پابندی لگا دی اور سیاسی جلسے ممنوع قرار دے دیے۔ ہزاروں لوگوں نے پابندی کی خلاف ورزی کی اور جیلیں بھر دیں۔ جنوری ۱۹۲۲ء کے اختتام تک ۳۰،۰۰۰ افراد نے رضا کارانہ گرفتاری پیش کی۔ جیل کا خوف لوگوں کے ذہنوں سے ختم ہو چکا تھا......

۳۰،۰۰۰ گرفتار شدگان میں کئی لوگ خوشحال تھے، بیرسٹر تھے، ڈاکٹر تھے اور پروفیسر بھی، علی برادران کے علاوہ پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سی آر داس، ولبھ بھائی پٹیل، راج گوپال اچاریہ اور ابوالکلام آزاد خلافت کی تحریک کے نظریاتی مفسر بھی جیل گئے۔

(مسلم افکار، صفحہ ۱۷۰)

پرنس آف ویلز کی آمد:

۱۷ رنومبر ۱۹۲۱ء: اہل بمبئی کو گاندھی جی نے پیغام دیتے ہوئے کہا کہ میں عنقریب بردولی میں سول نافرمانی کا آغاز کرنے جارہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں فوج بلائی گئی ہے، گولیاں برسائی جائیں گی لیکن ہرچہ بادا باد میں بردولی جارہا ہوں۔ بمبئی کے لوگوں سے میں صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ بردولی میں جو کچھ بھی ہو وہ پرامن اور خاموش رہیں۔

۱۷ رنومبر ۱۹۲۱ء کو تاج برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ پرنس آف ویلز بمبئی کے ساحل پر جہاز سے اترنے والے تھے۔ حکومت نے معزز مہمان کے استقبال کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ مگر کانگریس، خلافت کمیٹی اور گاندھی جی نے پرنس کے استقبال کے بائیکاٹ کا پیغام دیا۔ گاندھی جی اس دن احمد آباد سے بمبئی آگئے تھے اور انھوں نے چوپاٹی کے میدان میں ایک عام جلسہ کا اعلان کیا اور تمام قوم کو پکارا کہ کوئی بھی پرنس کے استقبال کے لیے نہ جائے، بلکہ ہمارے جلسہ میں لوگ آئیں۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ پرنس جب جہاز سے اترے تو مکمل سناٹا تھا اور پورے شہر بمبئی میں مکمل ہڑتال تھی۔ اس سے بہتر مظاہرہ عوام کی بے اطمینانی اور بغاوت کا اور کیا پیش کیا جاسکتا تھا؟ مہاتما گاندھی کے جلسہ میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔ لیکن عدم تشدد پر قوم عمل پیرا نہ رہ سکی اور بمبئی اور مضافات میں بلوہ ہوگیا۔ گاندھی جی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انھی کی جے بول کر پارسیوں اور سرکاری افسران کی موٹریں جلادی گئیں، سرکاری ٹرامیں توڑ ڈالی گئیں، پارسی عورتوں کی ساڑیاں کھول کر ننگا کردیا گیا اور ان ساڑیوں کی ہولی منائی گئی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ان واقعات پر پردہ ڈال دیتا لیکن گاندھی جی نے جن کا بنیادی اصول ہی سچائی تھا سب باتیں من وعن تسلیم کرلیں اور اپنے بیان میں انتہائی رنج وغم کا اظہار کیا۔ انتہائی یاس کی حالت میں وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کن امیدوں سے وہ چلے تھے اور اب کیا ہوگیا۔ گاندھی جی کو یہ یقین ہوگیا کہ اس کے پیچھے کوئی خاص دماغ کام کررہا ہے اور سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ماہرانہ انداز میں یہ بلوے کرائے گئے ہیں تاکہ تحریک کے بادبان سے ہوا نکل جائے۔ یہ انقلاب فرانس کے وقت سے انگریز کی آزمودہ تکنک تھی۔ گاندھی جی کا شبہہ بے جا نہ تھا۔

وہ ایک بجے رات تک اسی غم والم میں جاگتے رہے اور رات ہی میں انھوں نے سورت اور بردولی جانے کا پروگرام ملتوی کردیا۔ دوسرے دن پارسی اینگلو انڈین اور یہودی کافی مسلح ہوکر

مجنونانہ جوش میں نکلے۔ وہ انتقام کے لیے بے چین تھے۔ کانگریس کے لیڈر لوگوں کو امن وسکون پر آمادہ کرنے کی شہر میں مسلسل کوشش میں لگے تھے لیکن حملہ اور جوابی حملہ، پتا نہیں تھا کہ معاملہ کہاں جاکر ختم ہوتا۔

گاندھی جی سوچتے تھے کہ میں کیا کروں؟ مظلومین کو میں گورنمنٹ کی امداد لینے کے لیے کہہ نہیں سکتا اور اگر میں اپنے آپ کو پارسیوں کے سامنے ٹکڑے کیے جانے کے لیے پیش کردوں تو اور بھی خونریزی ہوگی بہت کچھ غم انگیز سوچ بچار کے بعد ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ برت رکھیں۔ اس طرح گاندھی جی نے ایک طویل بیان سے اپنے برت کا اعلان کیا۔ جس میں انھوں نے ظاہر کیا کہ خدا سچائی اور محبت کا خدا ہے۔ میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ میں انگریزوں سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ میں تو اس نظام حکومت کے خلاف اٹھا ہوں جو ناجائز ہے۔ ہندو مسلم اتحاد میرا ایمان ہے اور جب تک ہندو اور مسلمان پارسیوں سے حقیقی معذرت نہ کریں میں ان کی آنکھ سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ آخر میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کیا:

''میں اپنے مسلمان بھائیوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں خلافت کی تحریک میں اسے ایک مقدس معاملہ سمجھ کر شریک ہوا ہوں۔ میں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدو جہد کی، کیونکہ ہندوستان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر ہم ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں تو خدا سے انکار ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو علی برادران کی گود میں ڈال دیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ سچے اور خدا ترس لوگ ہیں۔ میرا یقین ہے کہ گزشتہ دو دن کے بلووں میں مسلمانوں نے بیش از بیش حصہ لیا ہے۔ اس سے مجھ کو سخت صدمہ ہوا ہے میں ہر مسلمان کارکن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی پوری طاقت سے کھڑا ہو اور اس کے مذہب نے جو فرض اس پر عائد کیا ہے اس کا احساس کرے اور محنت کر کے اس فساد کو ختم کرے۔'' (تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۳۰-۲۲۸)

جمعیۃ علماے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس لاہور:

۱۸ر نومبر ۱۹۲۱ء: علماء کرام کی متحدہ جمعیۃ کا تیسرا سالانہ اجلاس گزشتہ ہفتہ لاہور میں منعقد ہوا ہندوستان کے تقریباً تمام سربرآوردہ علماء نے شرکت کی، کلکتہ سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب مدظلہ تشریف لے گئے اور ایڈیٹر ''پیغام'' بھی ہم رکاب تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر باوجود نماز جمعہ کے قریب ہونے اور پہلے سے منع کردینے کے اہل لاہور نے حضرت مولانا کا نہایت پر

جوش خیر مقدم کیا، اور آپ کو شاہی مسجد لے گئے، جہاں خطبۂ جمعہ میں حضرت نے مسلمانوں کی پر معصیت زندگی کا نقشہ کھینچا اور بتایا کہ گزشتہ جنگ میں مسلمانوں نے برطانیہ کی مدد کر کے اور خلیفہ پر ہتھیار اٹھا کر کتنا سخت گناہ کیا ہے، خصوصاً اہل پنجاب اس کے سب سے زیادہ مرتکب ہوئے ہیں اور اس طرح ایک ایسی شدید معصیت سے آلودہ ہوئے ہیں کہ جو شرک کے بعد سب سے زیادہ اشد و اقبح ہے اور کفر صریح تک پہنچ جاتی ہے۔ خطبہ تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا، اور سامعین پر اس کا وہی اثر ہوا، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت کی زبان میں ودیعت فرما دیا ہے!

جمعہ کے بعد جمعیۃ کے پہلے اجلاس کی نشست شروع ہوئی۔ سب سے پہلے پنجاب کے مشہور بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا مطلوبہ خطبہ پڑھا جو لاہور کے روزانہ اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، اس کے بعد مولانا کفایت اللہ صاحب نے حضرت مولانا ابوالکلام صاحب کی صدارت کی تحریک کی، اور مولانا شبیر احمد صاحب دیوبند، ڈاکٹر محمد عالم صاحب اور مولانا ثناء اللہ صاحب نے تائید کی۔ مولانا شبیر احمد صاحب کی تقریر خاص طور پر دلچسپی سے سنی گئی۔ آپ نے فرمایا۔ مولانا کی صدارت کی تائید کرنے کے لیے میں کھڑا ہوا ہوں، لیکن کن الفاظ میں اس فرض کو ادا کروں؟ میں وہی جملہ دہراتا ہوں جو میرے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم نے مولانا کی نسبت فرمایا تھا کہ ابوالکلام نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے، پس ایک ایسی شہادت کے بعد مولانا کی صدارت میں کیسے تامل ہو سکتا ہے؟ صرف اس موتمر مجلس کی صدارت ہی نہیں بلکہ میں پہلا شخص ہوں گا جو مولانا کی ہاتھ پر بیعت کرے گا اور آپ کے "امیر الہند" ہونے کا اعلان کرے گا۔

اس کارروائی کے بعد نماز عصر کے لیے جلسہ برخواست ہوا، شب میں پہلے حضرت مولانا کا تحریری خطبہ پڑھایا گیا۔ (پیغام۔ کلکتہ، ۲۵۔ نومبر ۱۹۲۱ء، ص ۴)

مولانا آزاد کی تقریر کا خلاصہ:

۱۸ر نومبر ۱۹۲۱ء: جمعیت علمائے ہند کے تیسرے سالانہ جلسے کا خطبہ صدارت بہت طویل ہے۔ اس کی تلخیص پیغام میں چھپی تھی۔ یہاں پیش کی جاتی ہے۔ اس میں تمام اہم مطالب و مباحث کی طرف ارشادات موجود ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا:

جزیرۃ العرب کا کامل تخلیہ:

فرمایا: حضرات! سب سے پہلے میں اس مبحث پر گفتگو کروں گا جس نے تمام ہندوستان کو

مشغول کر رکھا ہے، یعنی مسئلہ خلافت پر کہ جس کا اب ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے، دنیا جانتی ہے، کہ اس بارے میں ہمارے مطالبات کیا ہیں؟ ہم بار بار ان کا اعادہ واعلان کر چکے ہیں اور ان میں ایک ذرہ بھی کمی نہیں کر سکتے، کیونکہ بیشی کا حق انسان کو اپنی چیزوں میں ہوتا ہے، اللہ کی شریعہ اس سے بالاتر ہے اور اس میں کسی قسم کی ترمیم ناممکن ہے۔ ہمارے سارے مطالبات یہ ہیں کہ خلیفہ اپنے دارالخلافۃ میں بالکل آزاد وخود مختار ہو، اور جزیرۃ العرب پر کسی قسم کا اجنبی تسلط واقتدار نہ ہو، شریعۃ کے صاف صریح واحکام موجود ہیں، قدیم جغرافیہ ہمارے سامنے ہے، اور ہماری زبانیں ابتداء سے یہی اعلان کر رہی ہیں، کہ جزیرۃ العرب میں عراق، شام اور فلسطین بھی داخل ہیں، اور ان ممالک کی اجنبی اقتدار سے آزادی، شریعت کی رو سے ویسی ہی ضروری ہے، جیسی خود حجاز و حرمین کی، اور جب تک ان ملکوں کے کسی ایک انچ پر بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ برطانوی حکومت باقی ہے، اس وقت تک مسلمانوں کے لیے برطانیہ سے مصالحت کرنا حرام ہے، ہم بچھوؤں سے دوستی کر سکتے ہیں، سانپوں کو پیار کر سکتے ہیں اور جنگل کے خونخوار درندوں کو محبت کے ساتھ اپنی گود میں لے سکتے ہیں مگر اس برطانوی حکومت کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتے جو مقدس جزیرۃ العرب پر قابض ہے۔ سمرنا وتھریس کا فیصلہ تو حضرت غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی تلوار نے کر دیا، اور اسی کو اس کا حق بھی تھا، سمرنا وتھریس کی حیثیت تو ہمارے مطالبات میں ضمنی تھی اور اس لیے اب اگر یہ دونوں علاقے ترکی کو واپس دیے جا رہے ہیں تو ہمارے بنیادی مطالبات پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، پورے جزیرۃ العرب کا کامل تخلیہ وآزادی ضروری ہے، اور جب تک یہ نہ ہو گورنمنٹ کی سمجھوتے کے لیے ہر قسم کی سلسلہ جنبانی بے سود ہے اور اس سے ہرگز صلح نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان کی آزادی:

پھر آپ نے ہندوستان کی آزادی پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ

''یہ ہمارا اسلامی فرض ہے، اگر مسئلہ خلافت رونما نہ ہوتا تو بھی مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو آج کر رہے ہیں، اور مسلمان اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک ہندوستان کو ظلم واستبداد سے پاک نہ کر دیں گے۔

مالابار کے حالات پر ایک نظر:

موپلوں کے متعلق فرمایا ''اب تک مالابار کے حالات تاریکی میں ہیں اور متضاد باتیں بیان

کی جا رہی ہیں، لیکن اگر یہ سچ ہے کہ انھوں نے مطالبات خلافت کے نام پر تلوار اٹھائی ہے تو ہم انھیں ملامت و سرزنش کر سکتے ہیں، کیونکہ اپنے اس فعل سے جماعت کے متفقہ فیصلے اور اہل الحل والعقد کے حکم سے انھوں نے سرکشی کی ہے، جسے شریعت نے ناروا قرار دی ہے، شریعت کا حکم ہے کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی قرار دی ہوئی راہ سے کٹ کر دوسری راہ اختیار کرے، موجودہ حالات میں مسلمانان ہند اور ان کے اہل عمل والعقد نے ایک راہ اختیار کی ہے اور اسی پر سب چل رہے ہیں، موپلوں کے لیے جائز نہ تھا کہ وہ اپنے لیے دوسرا راستہ تجویز کرتے، جس راہ پر اس وقت ہم چل رہے ہیں وہ بھی شرعی راہ ہے اور احکام شرعی کی رو سے اختیار کی گئی ہے، بلاشبہ قتال و جنگ بھی فرض ہے، لیکن اس کے لیے شریعت نے کچھ شرائط رکھے ہیں اور اہل نظر کو حق دیا ہے کہ وہ مصالح امت کو دیکھ کر مناسب حال کارروائیاں کریں، چنانچہ ہندوستان میں علماء نے پرامن جدوجہد کی شاہراہ کھولی ہے اور کسی مسلمان کو حق نہیں ہے کہ وہ اس سے کٹ کر اور طریقے اختیار کرے۔ پس اگر موپلوں نے خلافت و اسلام کے لیے جنگ کی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے جماعت مسلمین کے خلاف کیا ہے اور انھیں ایسا نہ کرنا چاہیے تھا''۔

جبراً مسلمان بنانے کا پروپیگنڈا:

اس کے بعد حضرت نے ان افواہوں کے متعلق فرمایا جو ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنانے کی نسبت مشہور ہوئی ہیں، اور کہا کہ

''اگر وہ صحیح ہیں تو جماعت علماء اپنی برأت کا اعلان کرتی ہے، اسلام نے کسی کو جبراً مسلمان بنانا قطعاً ناجائز قرار دیا ہے''

اسلام اور تشدد:

ساتھ ہی آپ نے ''تشدد'' کے لفظ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ لوگ اس لفظ کو غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں، اگر ''تشدد'' سے مراد سختی و زیادتی، قتل و غارت اور لوٹ مار ہے تو اسلام نے اس کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں دی ہے۔ البتہ اسلام نے جنگ اور لڑائی کو جائز رکھا ہے، جو سختی پر مبنی نہیں ہے بلکہ عین عدل و اعتدال پر اور وہ کہتا ہے کہ عدل قائم نہیں ہو سکتا جب تک قیام عدل کے لیے ظالموں کا مقابلہ نہ کیا جائے۔

اس کی مثال آپ نے یوں دی کہ جج بھی قتل کرتا ہے اور پھانسی کے تختہ پر انسان کی جان لیتا

ہے اور ایک قزاق بھی قتل کرتا ہے اور انسان کو اس کے بستر یا راہ پر ذبح کر ڈالتا ہے، دنیا جج کی تعریف کرتی ہے اور کہتی ہے کہ "اس نے عدل وانصاف کو قائم کیا" لیکن اس قزاق پر سب نفریں کرتے ہیں، حال آنکہ قتل کا فعل دونوں سے سرزد ہوا تھا، اسی طرح اسلام بھی اس خونریزی کو جائز سمجھتا ہے جو جنگ کی صورت میں قیام عدل کے لیے ہو، نہ اس خونریزی کو جو قزاق کیا کرتے ہیں"۔

ترک موالات کی اختیار کردہ راہ:

لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ "موجودہ حالت میں ہم نے جنگ وقتال کی راہ اختیار نہیں کی ہے اور ایسا کرنا بھی احکام شرع کے مطابق ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہیں، اور خواہ کتنی ہی مجبوریاں پیش آجائیں، لیکن بے صبری و بے ضبطی سے بے قابو نہ ہو جائیں۔ موجودہ عمل کی کامیابی کے لیے اس شرط کی پابندی سب سے زیادہ ضروری و مقدم ہے۔

مقدمۂ کراچی:

مقدمۂ کراچی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"یہ مقدمہ حکومت کی بدحواسی واختلال دماغ کا بہترین ثبوت ہے، اور مورخ جب اس زوال پذیر گورنمنٹ کی تاریخ بربادی لکھنے بیٹھیں گے تو اس کے بنیادی اسباب وعلل میں ایک یہ مقدمہ بھی ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر فوجی نوکری کو حرام بتانا جرم ہے تو اس وقت ہندوستان میں کون ہے جو اس کا مرتکب نہیں ہوا ہے، میں ایک تمھارے سامنے موجود ہوں جو شروع سے ان باتوں کا اعلان کر رہا ہوں، جو کراچی کے مقدمہ میں جرم قرار دی گئی ہیں، آپ نے فرمایا نظر بندی کے بعد ہی میں سندھ خلافت کانفرنس میں شریک ہوا تھا، اس میں فوجی نوکری کے حرام ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، اور وہ پہلا موقعہ تھا کہ جلسۂ عام میں اعلان کی صورت میں یہ بات کہی گئی، اگر یہ جرم تھا تو مجھے گورنمنٹ نے کیوں نہیں گرفتار کیا، اور اس کے بعد ہی میں ہر صبح وشام، دن کی روشنی میں اور رات کی تاریکی میں برابر اس کو کہتا اور سپاہیوں تک پہنچا تا رہا ہوں اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ مجھے بھی گرفتار کرے، اور پھر تمام ہندوستان کے رہنے والوں کو گرفتار کرے جن سب کی زبانوں سے یہی صدا نکل رہی ہے اور ہمیشہ نکلتی رہے گی۔

حضرت مولانا کی تقریر کامل چار گھنٹہ تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ دو بج گئے اور جب آپ

ختم کرنے لگے تو مجمع نے نہایت مستعدی کے ساتھ اصرار کیا کہ ہم رات بھر بیٹھے رہیں گے، تقریر جاری رہے" چنانچہ کچھ عرصہ اور تقریر کرنے کے بعد آپ نے جلسہ کو برخواست کیا۔

(پیغام کلکتہ، ۲۵ر نومبر ۱۹۲۱ء، ص ۴، ۵)

فقیہ الملۃ والدین:

جمعیت علماے ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس لاہور کے خطبۂ صدارت میں مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت شیخ الہند کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے کہا:

حضرات! اس تمہید بیان کی بعد میں بالکل آمادہ تھا کہ مقاصد و مطالب کا سفر شروع کر دوں لیکن اچانک ایک غمگین حادثے کی یاد نے میرے قدم روک دیے۔ آپ کی اس جمعیت کا گزشتہ اجلاس مجمع علماے ہند کے جس بزرگ و محترم وجود کی رہنمائی و صدارت میں منعقد ہوا تھا، آج وہ ہم میں نظر نہیں آتا اور اس کی موجودگی کی برکتوں سے محروم ہو گئے ہیں، میرا اشارہ حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کی ذات گرامی کی جانب ہے، اور میں یقین کرتا ہوں کہ آج آپ میں سے ہر فرد کو ان کی یاد دعوت غم دے رہی ہوگی۔ ان کی وفات بلاشبہ ایک قومی ماتم ہے اور ہم سب کو ان کی یاد کی عزت میں چند لمحوں کے لیے رک جانا چاہیے۔

حضرات! مولانا مرحوم ہندوستان کے گزشتہ دور علماء کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہدِ حرمان و فقدان میں علماے حق کے اوصاف و خصائل کا بہترین نمونہ تھی، ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا وہ علماے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا، عین جوار حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت صرف اس لیے برداشت کرنا پڑی کہ اسلام و ملت اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا، اور انھوں نے اعداے حق کی مرضات و ہوا کی تسلیم واطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا۔ فی الحقیقت انھوں نے علماے حق و سلف کی سنت زندہ کر دی اور علماے ہند کے لیے اپنی سنت حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی روح عمل موجود ہے، اور اس کے لیے جسم کی طرح موت نہیں:

وما دام ذکر العبد بالفضل باقیاً
فذلک حی وھو فی التراب ھالک

(پیغام۔ کلکتہ، ۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۸)

جلسے کی پہلی نشست کی کارروائی:

۲۵ر نومبر کے شمارۂ پیغام میں اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے قلم سے جمعیت علماے ہند کے سالانہ اجلاس کی پہلی نشست کی مختصر روداد شائع ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علماے کرام کی متحدہ جمعیۃ (جمعیت علماے ہند) کا تیسرا سالانہ اجلاس گزشتہ ہفتے لاہور میں منعقد ہوا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام سربرآوردہ علما نے شرکت کی۔ کلکتہ سے حضرت مولانا ابو الکلام صاحب مدظلہ تشریف لے گئے تھے اور ایڈیٹر پیغام بھی ہم رکاب تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر باوجود نماز جمعہ کے قریب ہونے اور پہلے سے منع کر دینے کے، اہل لاہور نے حضرت مولانا کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا۔ اور آپ کو شاہی مسجد لے گئے۔ جہاں خطبۂ جمعہ میں حضرت نے مسلمانوں کی پرمعصیت زندگی کا نقشہ کھینچا اور بتایا کہ گزشتہ جنگ میں مسلمانوں نے برطانیہ کی مدد کر کے اور خلیفہ پر ہتھیار اٹھا کر کتنا سخت گناہ کیا ہے! خصوصاً اہل پنجاب اس کے سب سے زیادہ مرتکب ہوئے ہیں اور اس طرح ایک ایسی شدید معصیت سے آلودہ ہو گئے ہیں کہ جو شرک کے بعد سب سے زیادہ اشد و اقبح ہے اور کفر صریح تک پہنچ جاتی ہے۔

خطبہ تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا اور سامعین پر اس کا وہی اثر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کی زبان میں ودیعت فرما دیا ہے۔

مولانا آزاد کی صدارت کی تائید:

جمعہ کے بعد جمعیت کے اجلاس کی پہلی نشست شروع ہوئی۔ سب سے پہلے پنجاب کے مشہور بزرگ مولانا عبدالقادر صاب صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا مطبوعہ خطبہ پڑھا جو لاہور کے روزانہ اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مولانا کفایت اللہ صاحب نے حضرت مولانا ابوالکلام صاحب کی صدارت کی تحریک کی اور مولانا شبیر احمد دیوبندی، ڈاکٹر محمد عالم صاحب اور مولانا ثناراللہ صاحب نے تائید کی۔ مولانا شبیر احمد صاحب کی تقریر خاص طور پر دلچسپی سے سنی گئی۔ آپ نے فرمایا:

''مولانا کی صدارت کی تائید کرنے کے لیے میں کھڑا ہوا ہوں۔ لیکن کن الفاظ میں اس فرض کو ادا کروں؟ میں وہی جملہ دہراتا ہوں جو میرے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم نے مولانا کی نسبت فرمایا تھا کہ ''ابوالکلام نے مسلمانوں کو ان

کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!'' پس ایک ایسی شہادت کے بعد مولانا کی صدارت میں کسے تامل ہوسکتا ہے؟

صرف اس موقر مجلس کی صدارت ہی نہیں، بلکہ میں پہلا شخص ہوں گا جو مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرے گا اور آپ کے ''امیر الہند'' ہونے اعلان کرے گا۔''

اس کارروائی کے بعد نماز عصر کے لیے جلسہ برخواست ہوا۔ شب میں پہلے حضرت مولانا کا تحریری خطبہ پڑھا گیا، جو آج سے بجنسہٖ پیغام میں شائع ہوگا۔ اور یہ پہلا موقع ہے کہ حضرت کی تقریر بعینہٖ پبلک تک پہنچے گی، جس پر پیغام کو ناز ہے۔ افسوس کہ قلت وقت کی وجہ سے خطبے میں تمام مطالب ضبط تحریر میں نہ آسکے تھے اور اس بنا پر مولانا کو بعد میں زبانی تقریر کرنی پڑی جو پنجاب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔ افسوس کہ وہ قلم بند نہ ہوسکی۔ اس لیے ذیل میں ہم اس کا خلاصہ اپنی یادداشت سے درج کرتے ہیں۔'' (ہفت روزہ پیغام، کلکتہ، ۲۵ر نومبر ۱۹۲۱ء ص ۴)

جمعیۃ علماء کے متفقہ واجب التعمیل اعلانات

۱۹ر نومبر ۱۹۲۱ء: جمعیت علمائے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس جو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ۱۸/۱۹ر نومبر کو لاہور میں ہوا اس کے اعلانات اور فیصلے یہ ہیں:

ذیل میں ہم ان تمام اعلانات کو درج کرتے ہیں جو علمائے کرام نے متفقہ طور پر کیے ہیں اور شرعی فتاویٰ کی حیثیت رکھتے ہیں:

فتویٰ کی ضبطی کے متعلق سرکاری احکام نہ مانے جائیں:

(۱) جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس فیصلے کی تصدیق کرتا ہے، جو اس کی مجلس منتظمہ نے اپنے اجلاس منعقدہ دہلی میں ۲۱ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو متفقہ فتویٰ کی ضبطی کے بارے میں کیا تھا۔ اور جس کے الفاظ یہ ہیں ''جمعیۃ علماء کی مجلس منتظمہ کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ جمعیت کے جس فتویٰ کو چیف کمشنر دہلی کے اعلان مورخہ ۱۲ر جولائی ۲۱ء کی بنا پر دہلی نیز بعض دیگر صوبوں میں ضبط کیا گیا ہے، وہ تمام تر شریعت اسلامیہ کے ان احکام پر مشتمل ہے جو تیرہ سو برس سے اپنی یکساں اور غیر مبدل قطعیت کے ساتھ موجود ہیں، اور جس کا اعتقاد و عمل اور اعلان ہر مسلمان پر شرعاً فرض اور ضروری ہے، بنابریں علمائے اسلام کسی حالت میں بھی کسی ایسی صورت کو برداشت نہیں کرسکتے جس سے

کوئی رکاوٹ ان احکام کی تبلیغ واعلان میں پیدا کی جائے۔ علمائے اسلام، احکام شرعیہ کی بنا پر مسلمانوں کا فرض قرار دیتے ہیں کہ ضبطی کی مداخلت سے بے پرواہ کر بدستور اس فتویٰ کی طباعت واشاعت اور تبلیغ ودعوت میں وہ مشغول رہیں، اور اراکین انتظامیہ، جمعیت علماء کی جانب سے بھی برابر اس کی تبلیغ واشاعت جاری رکھی جائے۔

فوج و پولیس تک احکام شرع پہنچا دیے جائیں:

(۲) جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مجلس منتظمہ کے اس فیصلے کی تصدیق کرتا ہے کہ گورنمنٹ نے مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد، پیر غلام مجدد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا نثار احمد کو خلافت کانفرنس کراچی منعقدہ ۸۔۹۔۱۰ر جولائی کی تجویز کے جس حصے کی بنا پر گرفتار کیا ہے، وہ اسلام کے ان قطعی ومسلم احکام میں ہے، جو تیرہ سو برس سے موجود ہیں اور ہندوستان میں بھی جن کا ہمیشہ اعلان ہوتا رہا ہے۔ مسلمان کسی حال میں بھی اس کے اعلان ودعوۃ سے باز نہیں رہ سکتے اور جب تک اسلام باقی ہے اس کے احکام کا اعلان بھی باقی رہے گا، جمعیۃ علماء تمام مسلمانوں کو دعوۃ دیتی ہے کہ اس امتحان طلب موقع پر ادائے فرض کے لیے مستعد ہو جائیں، اور جہاں تک بھی ممکن ہو، ہر صورت وعنوان سے اس حکم شرعی کا نشر واعلان کر کے اعلاء کلمۃ الحق میں ساعی ہوں۔

فوجی نوکری کے حرام ہونے کی وجہ:

(۳) جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس مسئلہ عدم جواز ملازمت فوجی کی نسبت اعلان کرتا ہے کہ:

"(الف) انگریزی گورنمنٹ کی فوج اور پولیس کی ملازمت کا حرام ہونا صرف ایسی حالت ہی میں نہیں ہے کہ مثلاً مسلمانوں کا قتل بھی اس وقت درپیش ہے، بلکہ شرعاً اس کے لیے اس قدر کافی ہے کہ انگریزی فوج مسلمان حکومتوں اور آبادیوں کے قتل کے لیے، ظلم وفساد کی تقویت کے لیے، پامالی حقوق انسانیت وعدالت کے لیے کام میں لائی جاتی ہو یا لائی جا سکتی ہے۔

(ب) مسلمانوں کا کسی غیر مسلم کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے جنگ کرنا جس سے کفر کی شوکت اور اسلامی قوت کو صدمہ پہنچتا ہے، قطعاً حرام ہے اور اس صورت کی حرمت متفق علیہ ہے۔ اس کے جواز کے لیے حیلے ڈھونڈنا اور مسلمانوں کی باہمی جنگوں سے استدلال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا ہے"۔

ہندوستان کو آزاد کرانا مسلمانوں کا شرعی فرض ہے:

(۴) جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ ہندوستان کو موجودہ حکومت کے تسلط واستبداد سے آزاد کرانے کی سعی مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں داخل ہے اور اس کے حصول کے لیے "تمام صحیح ومناسب حال وسائل" کو عمل میں لانا اور آخر تک جدوجہد کو جاری رکھنا ہمارا مذہبی نصب العین ہے۔ جمعیۃ اس امر کا بھی اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا جو نصب العین ہمارے سامنے ہے اس کے لیے اسلامی احکام کی رو سے ضروری ہے کہ

(الف) مسلمان اپنی مذہبی وشرعی زندگی میں بالکل خود مختار اور آزاد ہوں۔

(ب) مسلمانوں کے لیے احکام وحدود وتعزیرات اسلامیہ کے اجرا وتنفیذ میں کوئی قوت مانع ومزاحم نہ ہو۔ جمعیت تسلیم کرتی ہے کہ ہندوستان کی اقوام کے ساتھ متفق ہو کر تحفظِ حدودِ شرعیہ ایسی آزادی ہم حاصل کر سکتے ہیں اور کریں گے۔

جمعیۃ کے وفد دورہ کریں گے:

(۵) جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ تبلیغ واشاعت کے لیے وفد مرتب کیے جائیں جو تمام ملک میں خلافتِ اسلامیہ، اعانتِ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اور اجراء دار القضاء وغیرہ ملی اغراض ومقاصد کا نشر وتبلیغ کریں، اور صدر وناظمِ جمعیۃ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ان وفود کو مرتب کر کے روانہ کر دیں۔

افضل ترین جہاد وعبادات:

(۶) یہ اجلاس غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی خدمات اسلامی کا صدق دل سے اعتراف کرتے ہوئے ان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت ومبارک باد پیش کرتا ہے، اور مسلمانانِ ہند کو ان کے اسلامی فرض سے آگاہ کرتا ہے کہ اس وقت غازی اسلام کی امداد واعانت افضل ترین عبادت اور جہاد مالی ہے۔

ولایتی مال خریدنے والے شرعاً مجرم ہیں!

(۷) یہ اجلاس مسلمانوں کو وہ حکم شرعی یاد دلاتا ہے، جو سال گزشتہ جمعیت کے اجلاس میں

بیان کیا جاچکا ہے کہ ولایتی مال اور خصوصاً ولایتی کپڑے کا استعمال وہ قطعاً چھوڑ دیں، اس وقت ولایتی مال خریدنے والے، دشمنان اسلام کی اعانت کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جن کے پاس ولایتی کپڑے موجود ہیں، ان کو جمعیت دعوت دیتی ہے کہ سمرنا فنڈ میں دے دیں، کیونکہ ان کا استعمال قابل مواخذہ ہے۔

ہندستان بھر کے لیے امیر شریعت:

(۸) جمعیۃ کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی و تنظیم جماعت کے لیے امیر شریعت کا نصب ضروری ہے، اور اس لیے امیر شریعت کے اختیارات و فرائض کی تعیین کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی جائے۔ جو اس کے متعلق یادداشت تیار کر کے جمعیت کے اجلاس بدایوں میں پیش کردے۔ (سب کمیٹی کا انتخاب کرلیا گیا)

موپلوں کے متعلق:

(۹) یہ اجلاس موپلوں کے متعلق گوناگوں افواہوں کی تصدیق کرنے سے احتراز کرتا ہے یہاں تک کہ قابل وثوق ذرائع سے ان کی صحت ثابت نہ ہوجائے کہ انھوں نے ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ اگر یہ افواہیں صحیح ثابت ہوجائیں تو موپلوں کا یہ فعل خلاف تعلیم اسلامی اور قابل ملامت ہے۔

جمعیۃ کو اعوان وانصار کی ضرورت ہے:

(۱۰) یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ جمعیۃ کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے بکثرت اعوان و انصار بہم پہنچائے جائیں، جو ایک روپیہ سالانہ چندہ دے کر جمعیۃ کے اس معاہدہ پر دستخط کریں گے جس میں احکام جمعیۃ کی تعمیل کا اقرار ہوگا۔

مبارک باد اور گورنمنٹ کے چیلنج کا جواب:

(۱۱) جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس اس امر کو کہ مولانا حافظ احمد سعید ناظم جمعیۃ علماء اور مولوی عبدالعزیز انصاری کو حکومت دہلی نے اور مقتدایانِ قوم مولانا حسین احمد، شوکت علی، محمد علی، نثار احمد، غلام محمد دسندھی اور ڈاکٹر کچلو کو حکومت کراچی نے مذہبی احکام کے نشر و تبلیغ کے سلسلے میں گرفتار کر

کے جیل بھیج دیا ہے، اور اس لیے یہ جلسہ اس کارروائی کو مسلمانوں کے لیے ان کی مذہبی آزادی کے خلاف اعلان جنگ سمجھتا ہے۔ اور اعلان کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنا مذہب اپنی جان و مال سے زیادہ عزیز ہے، اور کسی عزیز سے عزیز اور محترم سے محترم پیشوا کی گرفتاری وقید سے وہ مرعوب اور مذہبی احکام کے نشر واشاعت سے باز نہیں رہ سکتے۔

جمعیۃ علماء کا یہ جلسہ ان گرفتارانِ بلا کو ان کی ایمانی جرأت پر مبارک باد دیتا ہے اور ان کی اسلامی خدمات کا اعتراف کرتا ہے، اسی سلسلہ میں صوبہ سرحد کے حکام کے جابرانہ طرز عمل پر اظہار نفرت کرتا ہے اور ان دین فروش مولویوں کے قول کو سخت مذموم و خلافِ شریعت سمجھتا ہے جو گورنمنٹ کی موالات کا فتویٰ دے کر مخلوق خدا کو گمراہ کر رہے ہیں۔

پیغام کے ۲۵ر نومبر کے شمارے کے ساتھ ٹائپ میں آٹھ صفحے کا ایک ضمیمہ بھی ہے۔ اس میں ایڈیٹر پیغام مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے قلم سے ''شذرات'' ہیں جن میں انھوں نے ملک کے سیاسی حالات اور پیش آنے والے مختلف واقعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں جمعیت علماے ہند کے اجلاس لاہور پر بہ طور خاص نظر ڈالی ہے اور ''مسئلہ امارت'' کے باب میں علماے کرام کی دانش مندی اور ایثار نفسی پر تبریک پیش کی ہے۔ چوں کہ یہ مسئلہ جمعیت علماے ہند کے مقاصد کے سفر میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ ''شذرات'' کا یہ حصہ یہاں نقل کر دیا جائے۔ مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:

جمعیت علماے ہند کے اجلاس پر ایک نظر:

''گزشتہ ہفتہ بمبئی کی فسادات اور گورنمنٹ کی بے ضابطیوں نے ملک کی توجہ اپنی طرف کر رکھی تھی۔ اور اس لیے جمعیت علماء کے تیسرے سالانہ اجلاس لاہور کی اہمیت پر لوگوں کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔ حال آں کہ یہ اجلاس غایت درجہ اہم تھے اور عجب نہیں کہ ملک میں ایک ایسا دور پیدا کر دیں جس کی مثال اب تک اس نے نہیں دیکھی ہے۔

مسئلہ امارت یا امامت ہند:

جمعیت کے اجلاس میں سب سے زیادہ اہم' سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ مفید مسئلہ جو طے ہو گیا۔ وہ 'امارت یا امامت'' کا مسئلہ تھا۔ جس کی غرض یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے لیے ایک شرعی قائد، امیر یا امام ہو جو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرے، شرعی زندگی میں داخل کرے اور

ان کے اجتماعی وملی مہمات میں رہبر و ذمہ دار ہو۔ مسلمان اس کی اطاعت فی المعروف کا عہد کریں اور احکام شرع کی پیروی میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے اشاروں پر چلیں۔

یہ مسئلہ ایک عرصے سے علمائے امت کے پیش نظر تھا اور وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ گزشتہ ہفتے ان کی متحدہ جمعیت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور ہندوستان میں "امارت شرعیہ" کے قیام کو ضروری ٹھہرایا۔ مقام مسرت ہے کہ جملہ علماء بالکل متحد الخیال تھے اور ان میں سے کسی ایک نے بھی ادنیٰ اختلاف نہ کیا۔

انتخاب امام، امارت شرعیہ کے مسئلے سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جماعت علماء کسی طرح بھی اس میں متامل نہ ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ اس بارے میں شریعت کے صاف وصریح احکام موجود ہیں اور ہرگز نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن جس بات میں شدید تصادم وتخالف اور سخت نزاع ومنافست کا لوگوں کو یقین تھا، وہ تعین شخصیت وانتخاب امام کا سوال تھا۔

علماء کی باہمی منافست عرصۂ دراز سے ضرب المثل ہو چکی ہے اور لوگ اسے مسلم قضیہ تسلیم کر کے، کہا کرتے تھے کہ علماء ہرگز مسئلہ انتخاب امیر میں متفق الخیال نہ ہو سکیں گے اور ضرور ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے زعیمانہ دعوے باہم ٹکرائیں اور جمعیت کو پاش پاش کر ڈالیں۔ لیکن اس کارساز حقیقی کی ثنا وحمد کس زبان سے کی جائے کہ جس نے علمائے امت کے بکھرے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا اور سب میں ایثار وہضم نفس کی روح پھونک دی جس سے وہ باہم متحد ومتفق ہو گئے اور امیر وحاکم بننے کے بجائے ہر ایک خدمت امت میں مامور ومحکوم بننے کے لیے پیش قدمی کرنے لگا۔

جمعیت علماء کی سبجیکٹ کمیٹی اور اجلاس عام دونوں میں ہم شریک تھے اور ہم انتہائی فخر ومباہات کی ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ اس مسئلے میں ادنا منافست ومسابقت بھی کسی سے ظاہر نہ ہوئی۔ بلکہ سب پوری دل جمعی اخلاص کے ساتھ ایک مرکز پر مجتمع ہو گئے۔ اگر چہ انتخاب امام کی کارروائی اس اجلاس میں باضابطہ نہیں ہوئی ہے اور بدایوں کے اجتماع پر ملتوی کر دی گئی ہے۔ تاہم باہمی طور پر انتخاب ہو گیا ہے اور محترم علماء نے انتہائی دانش مندی اور کامل ایثار نفسی کے ساتھ اپنے میں سے ایک ایسی شخصیت کو اس اہم خدمت کے لیے چن لیا ہے جو ہر طرح اس کے لیے موزوں ہے۔

ہم جمعیۃ العلماء کو اس کی اس کارروائی پر پورے جوش سے مبارک باد دیتے ہیں اور امت

مسلمہ کو بشارت پہنچاتے ہیں کہ انشاء اللہ اب اس کا بیڑا ساحل مقصود پر پہنچا ہوا ہے۔ کیوں کہ اس کے رہبروں نے جس ''ناخدا'' کو مقرر کیا ہے وہ ان شاء اللہ من کل الوجوہ اہل ہے۔ ہم ابھی اس سے زیادہ کوئی تصریح نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ موقر جمعیت خود ہی اس کا اعلان نہ کر دے۔''

(پیغام، کلکتہ۔ ۲۵؍نومبر ۱۹۲۱ء ص ۲۴، ۲۳)

حکومت کا رویہ:

۱۹؍نومبر ۱۹۲۱ء: بمبئی میں شہزادہ ویلز کے مکمل بائیکاٹ اور ہڑتال نے حکومت کے اراکین میں سخت غصہ پیدا کر دیا مختلف جبری احکام پورے ہندوستان میں جاری کیے گئے۔ ۱۹؍نومبر ۱۹۲۱ء کو بنگال کی گورنمنٹ نے کانگریس اور خلافت کی تمام والنٹیر تنظیموں کو خلاف قانون قرار دیا اور سیاسی جلسوں کو دبانے کا حکم صادر کر دیا۔ پنجاب، صوبہ متحدہ، بہار اور آسام نے تقلید کی اور اس طرح کے احکام جاری کیے۔ اس چیلنج کا دل کھول کر مقابلہ کیا گیا اور ان احکام کی مکمل خلاف ورزی بلا کسی تامل و تردد کے اور بغیر کسی پریشانی کے کی گئی۔ یو، پی جبر و تشدد میں سب سے آگے نکل گیا۔ الہ آباد میں صوبائی کانگریس کمیٹی کے ۵۵ ممبران کو جو ایک ہنگامی جلسہ میں والنٹیروں کے بارے میں ایک تجویز پر بحث کر رہے تھے، بیک وقت گرفتار کر لیا۔ مسٹر سی آر داس جو کانگریس سیشن احمد آباد کے صدر منتخب ہوئے تھے دسمبر میں گرفتار ہوئے۔ ممتاز لیڈران مثلاً لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو تمام ملک میں گرفتار کیے گئے۔

تحریک میں نیا خون:

ہزاروں والنٹیر بھی گرفتار ہوئے لیکن ان کی جگہ لینے کے لیے ہزاروں دوسرے لوگ رضا کارانہ بھرتی ہو گئے۔ دھارا پلٹ گیا اور تحریک میں پھر قوت پیدا ہو گئی اور جو معمولی اضمحلال بمبئی میں آیا تھا وہ دور ہو گیا۔ جہاں جہاں پرنس آف ویلز گئے مکمل ہڑتال نے ان کا استقبال کیا۔ جبریہ قوانین کا ایک خاص منشا یہ تھا کہ پرنس آف ویلز کا دورہ امن و سکون سے ختم ہو مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

گورنمنٹ عدم تشدد کا جواب جبر و تشدد سے دے رہی تھی حتیٰ کہ کھدر کا لباس اور گاندھی ٹوپی حکام کے لیے سخت کوفت کا باعث تھی اور جو استعمال کرتا تھا اس کی توہین و تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا اور جھوٹے مقدمات چلائے جاتے تھے۔ پولیس والنٹیروں کے کپڑے اتروا لیتی

تھی۔کبھی ان کو تالاب میں ڈبوتی نکالتی تھی۔اس کے علاوہ قومی تعلیم گاہوں کے ریکارڈ جلا دیے جاتے تھے، مکانات پھونکے گئے۔کانگریس اور خلافت کے دفتروں کے سامان برباد کر ڈالے گئے۔فصلیں جلائی گئیں۔مال واسباب لوٹا گیا حتیٰ کہ ایسے واقعات کی بھی اطلاع ملی کہ عورتوں کے زیورات چھین لیے گئے اور ان پر مجرمانہ حملہ کیا گیا۔

صلح کی بات چیت:

پنڈت مدن موہن مالویہ پر ان جابرانہ حرکات کا بہت اثر ہوا اور وہ وائسرائے سے ملے۔وہ چاہتے تھے کہ گاندھی اور وائسرائے میں صلح ہو جائے۔چونکہ وائسرائے کی یہ بڑی خواہش تھی کہ جب پرنس آف ویلز کلکتہ آئیں تو امن وسکون سے ان کا استقبال کیا جائے اس لیے وہ گاندھی جی سے صلح کی بات کرنے پر راضی ہو گئے۔لیکن ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی نے پنڈت مالویہ کو حسب ذیل بہادرانہ اور ولولہ انگیز تار دیا:

> ''آپ گورنمنٹ کی سختیوں کی قطعی کوئی پروا نہ کریں، اس وقت تک وائسرائے سے کانفرنس بیکار ہوگی جب تک کہ گورنمنٹ اپنے افعال پر ندامت کا اظہار نہ کرے اور تین چیزوں کو طے کرنے پر تیار نہ ہو۔یعنی پنجاب، خلافت اور سوراج۔''

مالویہ جی اس کے بعد سی آر داس اور مولانا آزاد سے پریسیڈنسی جیل کلکتہ میں ملے۔ان کا خیال تھا کہ اگر داس اور آزاد کو چند شرائط پر ہڑتال روکنے کے لیے راضی کر لیا جائے تو گاندھی جی کو بھی موافق کیا جا سکے گا لیکن گاندھی جی نے مالویہ جی کو ان کے تار کے جواب میں دوسرا تار دیا کہ شرائط پہلے طے ہونی چاہئیں۔اور اول ضروری چیز یہ ہے کہ تمام قیدی جن میں کراچی کے قیدی بھی شامل ہیں رہا کر دیے جائیں اور کانفرنس کی تاریخ پہلے سے طے کی جائے۔اگر یہ دونوں باتیں منظور ہوں تو ہڑتال کو روکا جا سکتا ہے۔جب مالوی جی نے گاندھی جی کا تار وائسرائے کو دکھایا تو وہ بہت چراغ پا ہوئے لیکن پھر بھی بات چیت جاری رہی۔لیکن لارڈ ایڈنگ جو کھیل کھیل رہے تھے اسے گاندھی جی نے سمجھ لیا تھا اور آخر میں حسب ذیل تار دیا:

> ''نہایت افسوس ہے کہ جو عہد آپ کرانا چاہتے ہیں اس سے میں معذور ہوں۔ترک موالات کی تحریک اسی وقت روکی جا سکتی ہے جب کانفرنس کا کوئی کامیاب نتیجہ نکلے اور میں کسی حالت میں کانگریس کا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔''

اب انگریز کو معلوم ہوا ہوگا کہ کس دل وجگر اور کس دماغ کے آدمی سے ان کا مقابلہ ہے۔اس طرح مالویہ جی اور وائسرائے کی گفت وشنید ناکام ہوگئی۔" (تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۳۳۔۳۲)

۱۹ر نومبر ۱۹۲۱ء: موپلوں کی تحریک بہت زور پکڑ گئی۔یہ تحریک مسلسل تین ماہ چل کر حکومت کا ناطقہ بند کر رہی تھی۔لیکن اب حکومت کے جنگی جہاز ان کی سرکوبی کے لیے حرکت میں آ گئے۔ اور ہزاروں موپلاؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ان میں سو (۱۰۰) موپلا مسلمانوں کو ریل گاڑی کے ایک ڈبے میں جانوروں کی طرح ٹھونس کر روانہ کر دیا گیا۔اس بند ڈبے کے ستر موپلے پانی پانی چلاتے رہے اور جام شہادت نوش کرتے ہوئے موت کے منہ میں چلے گئے۔رکن کونسل اور شعلہ بیان مقرر جناب یعقوب حسن سیٹھ صاحب اس تحریک میں پیش پیش تھے ان کو گرفتار کر لیا گیا اور سیکڑوں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

آگے چل کر انگریزوں کی مکاری اور فریب وچالاکی سے موپلوں کی یہ تحریک فرقہ وارانہ فساد کا رنگ اختیار کر گئی جس کا نتیجہ بہت بھیانک ہوا اور مقتول موپلا مسلمانوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی۔حکیم اجمل خان بیتاب ہو کر فوراً مدراس پہنچے اور حسب مقدور ان کی امداد واعانت کا انتظام بھی کیا۔گاندھی جی بھی یہاں آ رہے تھے لیکن حکومت نے جانے سے روک دیا۔

دسمبر تک موپلا مسلمانوں کی تحریک کو دبانے کے لیے حکومت نے تمام جتن کر ڈالے۔اور تقریباً ۱۵ لاکھ روپے ان ہنگاموں کو فرو کرنے میں صرف ہوئے۔

مالابار کی سرکاری کمیٹی نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا کہ کم از کم ۳۵ ہزار موپلا عورتیں اور بچے ایسے ہیں جن کی حالت بے حد ناگفتہ بہ ہے، اگر فوری کوئی امداد نہ پہنچائی گئی تو ان میں کے اکثر فاقہ کشی اور بیماری سے مر جائیں گے۔(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۰۲)

۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء: ۱۹۲۱ء کے وسط میں شہزادہ برطانیہ وارد بمبئی ہوئے۔گورنمنٹ ہند نے استقبال کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔بمبئی کے ہندو مسلم عوام نے اس کی پرزور مخالفت کی مگر پارسیوں نے حکومت کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں کچھ جذباتی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور زبردست فساد پھوٹ پڑا۔کیونکہ عیسائیوں اور پارسیوں نے اسے کافی طول دے دیا۔گاندھی جی اس وقت بمبئی میں موجود تھے۔انھوں نے پہلے شریمتی سروجنی نائیڈو کو جھگڑا فرو کرنے کے لیے بھیجا۔بعد میں سیٹھ عمر سبحانی اور سیٹھ چھوٹانی اور شنکر لال بینکر وغیرہ کو بھی بھیجا اور بدقت تمام فساد کی آگ ٹھنڈی ہوئی۔

تقریباً پچاس آدمی جان سے مارے گئے اور تین سو کے قریب زخمی ہوئے۔ مرنے والوں اور زخمیوں میں تین چوتھائی سے زیادہ کانگریسی تھے۔

اسی بناء پر غیر گرفتار شدہ کانگریسیوں نے ورکنگ کمیٹی کا جلسہ بمبئی میں کیا۔ اس میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ ایسی صورت میں حالات کے پیش نظر ستیہ گرہ کو روک دینا نامناسب نہ ہوگا اور اس لیے کہ ابھی عوام میں بہت لوگ عدم تشدد کے عنصر سے ناواقف ہیں۔

ملک بھر میں حکومت نے حریت پسند والنٹیر کورس کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ کثرت سے گرفتاریاں ہورہی تھیں۔ پنجاب، دہلی، بنگال، یوپی، بہار، بمبئی میں اب خلافت اور کانگریس کے جلسے بند ہوگئے تھے۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۵-۱۰۴)

۲۲ رنومبر ۱۹۲۱ء: ۲۲ رنومبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کا برت رنگ لایا۔ اراکین و ہمدردان ترک موالات اور اس کے مخالفین ہندو، مسلمان، پارسی سب متحد و متفق ہو کر جمع ہوئے اور اتحاد اور اتفاق قائم ہوا۔ تب گاندھی جی نے برت توڑا۔

۲۳ رنومبر ۱۹۲۱ء: بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور گاندھی جی کی تحریک پر بردولی کی سول نافرمانی غیر معین مدت کے لیے ملتوی ہوگئی۔ (تحریک خلافت، ص ۲۳۰)

تمام کارکنانِ خلافت کے نام:

۲۵ رنومبر ۱۹۲۱ء: مولانا ابوالکلام آزاد نے ''تمام کارکنانِ خلافت کے نام'' بمبئی سے ایک پیغام بھیجا ہے، جس میں مولانا نے کہا ہے:

مقدمہ کراچی کی گرفتاریوں کے بعد حیرانی و درماندگی کی جو خاموشی چھائی ہوئی تھی، اب اس کا پردہ چاک ہوا اور گورنمنٹ ملکی تحریک کے مقابلے میں ایک نئی ہمت اور طاقت کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔ سب سے پہلے بنگال میں والنٹیر کورز کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور اب پنجاب، دہلی، یوپی میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔ پنجاب، دہلی اور میرٹھ میں سڈیشن ایکٹ بھی نافذ کردیا گیا ہے۔ میں ۱۶ رنومبر سے سفر میں ہوں۔ میری عدم موجودگی میں کلکتہ میں میرے مکان اور پریس کی تلاشی لی گئی اور تمام غیر متعلق کاغذات اور میری تصنیفات اور یادداشتوں کے مسودات پولیس نے اپنے قبضہ میں کر لیے۔ مقدمہ کراچی کی یادگار عقلمندی کے بعد یہ دوسری عقلمندی ہے اور جیسا کہ قاعدہ ہے پچھلی عقلمندی کو پہلے سے زیادہ عمدہ ہونا چاہیے۔ والنٹیر زکور کو توڑ کر گویا خود گورنمنٹ نے ہماری

رہنمائی کردی اور بتلا دیا کہ سول ڈس اوبیڈینس کی سب سے زیادہ سہل اور کامیاب راہ کون سی ہو سکتی ہے۔ میں اس موقع پر تمام خلافت ورکرز کو خاص طور پر توجہ دلاتا ہوں کہ فرض اور ہمت کی روح سے معمور ہو جائیں اور اپنے نظام کو ہر طرح کی خیال وعمل کی کمزوریوں سے پاک کردیں۔ سب سے پہلی چیز کامل اور مضبوط اور غیر مسخر امن ہے، جس کو سخت سے سخت اشتعال بھی نہ ہلا سکے۔ ہم سے بڑھ کر ہمارا کوئی دشمن نہ ہوگا اگر ہم امن اور نظم کے قائم رکھنے میں ذرا سی بھی کوتاہی کریں گے، بمبئی کے حادثہ نے بتلا دیا ہے کہ وقت پر تھوڑی سی غفلت بھی کیسی خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے، اور مخالفوں کے ظاہری ہتھیاروں سے زیادہ خطرناک ان کے پوشیدہ اور غیر مرئی ہتھیار ہیں۔ بمبئی کے حادثے نے ایک نئی حقیقت بھی منکشف کردی ہے۔ ملکی تحریک کو کچلنے کے لیے اب ضرورت نہیں ہے کہ فوج اور مشین گنوں کو حرکت میں لایا جائے۔ یہ کافی ہے کہ شہر کے بعض عناصر کو مسلح کر دیا جائے اور ان کے بے روک اسلحہ کی ہلاکت باری کا پولیس اور فوج تماشا دیکھے۔ کلکتہ کی نسبت ہم ابھی سن چکے ہیں کہ کس طرح شہر کی بعض آبادیوں کو مسلح کیا جارہا ہے، اس کے مقابلہ میں ہمیں چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص قربانی اور برداشت کے اسلحہ سے مسلح ہو جائے اور ہمارا قومی نظام اپنی قوت نظم وامن کی ایک مثال تاریخ کے لیے چھوڑ جائے۔'' (پیغام کلکتہ، ۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۶۱)

۲۵ر نومبر ۱۹۲۱ء ہفت روزہ پیغام کلکتہ کی اشاعت ۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء کے بیان سے معلوم ہوا کہ بنگال میں والنٹیر کورز کو خلاف قانون قرار دیا گیا تھا۔ اب پنجاب، دہلی اور یوپی میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔ پنجاب، دہلی اور میرٹھ میں سڈیشن ایکٹ بھی نافذ کر دیا گیا ہے۔ **(کارکنان خلافت کے نام مولانا آزاد کا برقی پیغام)**

جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور نے تجویز کیا تھا کہ تنظیم جماعت مسلمین کے لیے امیر الہند کا انتخاب کرلیا جائے اور ایک سب کمیٹی بنادی جائے جو امیر الہند یا امیر شریعت کے اختیارات وفرائض کا مسودہ تیار کرلے اور جمعیت علماء کے اجلاس مجوزہ دسمبر میں بہ مقام بدایوں پیش کرے۔ سب کمیٹی کے ارکان یہ تھے:

مولانا خلیل احمد (سہارن پوری)، مولانا حبیب الرحمٰن (عثمانی دیوبندی)، مولانا شبیر احمد عثمانی (دیوبندی)، مولانا عبدالماجد (قادری بدایونی)، مولانا (ابوالمحاسن) محمد سجاد (بہاری)، مولانا محمد ابراہیم (سیالکوٹی)، مولانا محمد فاخر (الہ آبادی)، مولانا انور شاہ (کشمیری)، مولانا محمد

کفایت اللہ (دہلوی) صدر جمعیت علماے ہند، مولانا مرتضیٰ حسن (مرادآبادی)، مولانا عبدالباری (فرنگی محلی۔ لکھنو)، مولانا ثناء اللہ (امرتسری)، مولانا سبحان اللہ، مولانا حمد اللہ (پانی پتی)، مولانا محمد داؤد (غزنوی امرتسری)، سب کمیٹی کے کنوینر مولانا عبدالحلیم صدیقی نائب ناظم جمعیت علماے ہند تھے۔

اجلاس لاہور کی ایک دوسری قرارداد کے مطابق بدایوں میں جمعیت علماء مرکز یہ کا ایک اجلاس عام ہونا بھی طے پایا تھا جس میں سب کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنا اور انتخاب امیر کی کارروائی عمل میں لانی تھی۔

۱۲، ۱۳/ دسمبر ۱۹۲۱ء: جمعیت علماے ہند کے اجلاس لاہور کے مطابق ۱۲، ۱۳/ دسمبر ۱۹۱۲۱ء کو بدایوں میں مرکز یہ جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں سب کمیٹی کو مسودہ پیش کرنا تھا۔ لیکن اس اجلاس کے بارے میں اخبارات کے ذریعے ایسا تاثر دیا گیا اور غلط فہمی پیدا کردی گئی کہ اجلاس ملتوی ہوگیا ہے۔ نتیجتاً بہت سے ارکان بدایوں نہ پہنچے اور اجلاس کا کورم پورا نہ ہوا۔ اس لیے اجلاس ہوا نہ مسودہ منظور ہوا اور اسی لیے ''انتخاب امیر'' کا مرحلہ بھی پیش نہ آیا۔

انھی تاریخوں میں جمعیت علماء صوبہ یوپی کا اجلاس بھی رکھا گیا تھا۔ وہ شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا اور اہل بدایوں اور دیگر مشتاقان آزادی نے علماے کرام کی پرمغز تقریروں سے فائدہ اٹھایا۔

نومبر ۱۹۲۰ء: گاندھی جی نے نومبر ۱۹۲۰ء میں آزاد گجرات یونیورسٹی (گجرات ودیاپیٹھ) کی بنیاد رکھی۔ (تحریک خلافت، ص ۱۶۳)

۲/ دسمبر ۱۹۲۱ء: ایڈیٹر پیغام مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی گرفتاری پر مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ تحریر پیغام میں اشاعت کے لیے عنایت کی ہے:

''کل چار بجے جب میں بمبئی میل سے کلکتہ پہنچا اور متوقع تھا کہ حسب معمول اسٹیشن پر مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات ہوگی تو ان کی جگہ ان کی گرفتاری کی خبر نے میرا استقبال کیا۔ وہ اگر اسٹیشن پر ملتے تو میرے دل میں ان کی محبت بڑھتی جو گزشتہ دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے، مگر وہ نہ ملے اور جیل خانے چلے گئے۔ اس طرح انھوں نے صرف اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزت کے لیے بھی میرے دل سے تقاضا کیا۔ اب میں ان سے صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی عزت بھی کرتا ہوں۔

ان کی گرفتاری کے لیے کوئی وارنٹ نہیں جاری کیا گیا، ان سے کہا گیا کہ پولیس کمشنر نے بلایا ہے۔ جب وہاں گئے تو گرفتار کرلیا گیا، اور دو گھنٹہ کے بعد میرے مکان پر ٹیلیفون سے اطلاع دی گئی کہ ان کے لیے کھانا بھیج دیا جائے۔ گرفتاری کی کوئی معین بنا ابھی ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پچھلے دنوں کلکتہ میں کوئی تقریر کی تھی اور اسی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ ۶/ دسمبر کو مقدمہ پیش ہوگا۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کا وطن ملیح آباد (لکھنو) ہے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم ندوہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد قاہرہ (مصر) چلے گئے اور مدرسہ دعوۃ وارشاد میں داخل ہوگئے۔ جسے شیخ سید رشید صاحب ایڈیٹر المنار نے جاری کیا تھا۔ تقریباً تین سال تک وہاں علوم ادبیہ اور تفسیر قرآن وغیرہ کی تحصیل کرتے رہے اور خود وہاں کے مصری طلبا پر اپنی ذوق علم اور طلب صادق سے بدرجہا فوقیت لے گئے۔ مصر سے قسطنطنیہ گئے اور وہاں بھی متحرک رہے۔ پھر ۱۹۱۸ء میں ہندوستان واپس آئے اور اسی وقت سے وہ برابر علمی وقومی خدمات میں مشغول رہے۔ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے جوش ایمانی اور حب اسلامی کے اعتبار سے اخلاص وعمل کا ایک قابل عزت گھرانا ہے، ان کے والد اور تینوں بھائی ہمیشہ راہ حق وعمل میں سرگرم رہتے ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ ان کے بڑے بھائی ملیح آباد میں اس لیے گرفتار کرلیے گئے تھے کہ انھوں نے مقاصد خلافت کی تبلیغ کے لیے ایک اعلان شائع کیا تھا، اور اصل سبب یہ تھا کہ وہ کسان سبھا اور خلافت کمیٹی کے قیام کے لیے بے باکانہ کوششیں کرتے تھے۔ وہ عرصہ تک قید خانے کی سخت مشقیں برداشت کرتے رہے اور حال میں رہا ہوئے ہیں۔

دو سال ہوئے جب یہ مجھ سے ملے اور میں نے ان میں بہترین قابلیتِ علم وعمل نمایاں پائی۔ یہ ملک کے ان مخصوص اہل علم نوجوانوں میں ہیں جن کی غیر معمولی قابلیت سے بہترین امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے خدمت حق ودعوت کی راہ میں مجھ سے جو رشتہ رفاقت واخوت جوڑا تھا، وہ روز بروز قوی ہوتا گیا۔ اور ایک سچے رفیق اور بھائی کی طرح ان کی صداقت میرے دل کو جذب کرتی رہی۔ پچھلے دنوں جب مدرسہ جامع مسجد عربی کا افتتاح ہوا تو میں نے کلکتہ بلایا اور ان ہی کی محنت وسعی سے مدرسہ قائم ہوا۔ یہ مشغولیت ان کے لیے کم نہ تھی لیکن ان کا ولولۂ خدمت زیادہ وسیع میدان ڈھونڈتا تھا۔ بالآخر پیغام جاری ہوا اور اس کی ترتیب واشاعت کا تمام بار انھوں نے اپنے سر لے لیا۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس بار کے وہ اہل تھے، اور نہایت مستعدی و

قابلیت سے تن تنہا اس کی ایڈیٹری کرتے رہے۔ قارئین پیغام میں کوئی شخص نہ ہوگا جو ان کی تحریروں کو دلچسپی وشوق کے ساتھ نہ پڑھتا ہوگا۔

اب وہ گرفتار ہوگئے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے ان کی حسن نیت اور حسن عمل کو قبول کرلیا۔ اس بارے میں انسانی قلب کی درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ میں اگر کہوں کہ میرے دل پر کوئی صدمہ نہیں، تو یقیناً میں اپنے قدرتی جذبات کے لیے پردہ پوش ہوں گا۔ میں اپنے دل کو راز بنانا پسند نہیں کرتا۔ میرے دل کو ایسے موقعوں پر غم ہوا ہے۔ میں نے برادر عزیز محمد علی و شوکت علی کی گرفتاری کی جب خبر سنی اور جب کراچی میں ان سے ملا تو اس وقت بھی میرا دل غم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ دل کے جذبہ پر دماغ کا ایمانی یقین واعتقاد غالب ہے، اور گو کشمکش ہوتی ہے لیکن بالآخر غلبہ اعتقاد ہی کو ملتا ہے۔ جذبات نابود نہیں ہوسکتے، مگر مغلوب ہو سکتے ہیں۔ میں خوش ہوں اور سچے دل سے اپنے عزیز ورفیق کو مبارک باد دیتا ہوں۔ وہ بے گناہ ہیں، اور ان کی گرفتاری ان کے لیے ایک پاک عبادت ہے۔ انھوں نے جس سچی و بے تکلف ہمت و بشاشت کے ساتھ اپنی گرفتاری کا استقبال کیا، اور جس اطمینان واستقامت کے ساتھ اس وقت قید خانے میں ہیں، خدا تعالیٰ وہ جوہر ہر مسلمان کو عطا کرے!

البتہ میں اپنے دل کی اس خلش کو دور نہیں کرسکتا کہ رفیقان راہ ایک ایک کرکے قید ہورہے ہیں اور میں اب تک چھوڑ دیا گیا ہوں۔ عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعا۔ انہ ھو العلیم الحکیم۔ ابوالکلام۔ ۲دسمبر۔ کلکتہ۔

(پیغام۔ کلکتہ، ۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۱۵)

زہریلی گیس:

۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء ہفت روزہ پیغام، کلکتہ نے موپلا قیدیوں کی ہلاکت پر "زہریلی گیس" کے عنوان سے ذیل کا شذرہ لکھا ہے:

گورنمنٹ مدراس نے اعلان کیا ہے کہ "پترور جیل میں ۶۴ موپلا قیدی دم گھٹنے والی گیس سے ہلاک ہوگئے۔ اس خبر نے تمام ملک پر گہرا اثر کیا ہے اور ہر جگہ غم وغصہ کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں، ہندوستانی اخبارات نے بھی بہت کچھ ماتم کیا ہے اور اس واقعہ کو کلکتہ کے "بلیک ہول" کے فرضی واقعہ سے تشبیہ دی ہے، ہم اس وحشیانہ حرکت پر اپنے حزن وملال کا کن الفاظ میں اظہار

کریں؟ گورنمنٹ کا موجودہ سسٹم اس سے بھی بڑھ کر خلاف انسانیت کام کرسکتا ہے اور برابر کرتا رہا ہے۔ آج اگر ۶۴ موپلے زہریلی گیس سے ہلاک کردیے گئے ہیں تو اس سے پہلے بارہا انگریزوں کے بوٹ اور گھونسوں سے ہندوستانی مرتے رہے ہیں، اور جلیانوالہ باغ اور چاندپور کے خونیں واقعات اب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور کون جانتا ہے کہ انگریزی فوجیں مالابار میں کیا کچھ نہ کررہی ہوں گی۔ (پیغام کلکتہ،۲ردسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۶)

۲ردسمبر ۱۹۲۱ء: (یکم دسمبر) مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر پیغام کلکتہ کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ ان کی گرفتاری کے لیے کوئی وارنٹ نہیں جاری کیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ پولیس کمشنر نے بلایا ہے۔ جب وہاں گئے تو گرفتار کرلیا گیا...... گرفتاری کی کوئی معین بنا ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پچھلے دنوں کلکتہ میں کوئی تقریر کی تھی اس بناء پر گرفتار کیا گیا ہے۔ ۶ردسمبر کو مقدمہ پیش ہوگا۔ (پیغام۔کلکتہ،۲۔دسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۱۵)

شورشِ بمبئی:

بمبئی کی شورش کی نسبت مولانا ابوالکلام آزاد کا حسب ذیل بیان بمبئی کے اخبارات میں شائع ہوا ہے:

> ''جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس لاہور میں شریک ہونے کے لیے میں ۱۶رنومبر کو کلکتہ سے روانہ ہوا، اور ۱۷رکی تاریخ میں نے ریل میں گزاری۔ ۱۸رکی دوپہر میں لاہور پہنچا اور ۱۹رکو مجھے مہاتما گاندھی جی کا تار ملا۔ نیز ایسوسی ایٹڈ پریس کے مجمل تاروں سے شورش بمبئی کے حالات معلوم ہوئے۔ میں نے ہرچند کوشش کی کہ ۱۹رکو جمعیۃ کی سبجیکٹ کمیٹی کا کام پورا ہوجائے، لیکن مسائل کی اہمیت اور وسعت نظر و بحث کی وجہ سے نہ ہوسکا۔ ۲۰رکو سبجیکٹ کی کمیٹی کا آخری اجلاس منعقد ہوا اور اس سے فارغ ہوکر میں بمبئی روانہ ہوگیا۔ ۲۲رکی دوپہر کو جب بمبئی پہنچا تو شہر کا امن وانتظام چاردن کے کامل اختلال کے بعد واپس آچکا تھا اور ہرگوشے سے امن وعافیت کی خبریں آرہی تھیں۔

میں نے تین دن تک شورش کے تمام مبادیات واسباب کی تفتیش کی۔ ہرفریق اور ہرجماعت کے معتبر اشخاص سے چشم دید حالات دریافت کیے۔ میں طیار ہوں کہ وثوق کی ساتھ اس بارے

میں اظہار رائے کر سکوں۔

شورش کی ابتدا نہایت معمولی اور چھوٹی شرارتوں سے ہوئی، جن کے ساتھ نہ تو کوئی غیر معمولی منصوبہ تھا۔ نہ کوئی جماعتی سازش۔ یہ چھوٹی چھوٹی شرارتیں اگرچہ ہر حال میں ناپسندیدہ اور قابل انسداد ہیں، لیکن ان کا ظہور ایسے حالات و مواقع میں ایک حد تک جماعت کے نیچر میں داخل ہے۔ شرارتیں اور نادانیاں ہمیشہ ہوئی ہیں اور ہوں گی، وہ نابود نہیں کر دی جا سکتیں، لیکن وقت پر روک دی جا سکتی ہیں۔ بدقسمتی سے ۱۷ر نومبر کو مقامی کانگریس کمیٹی نے شہر کے انتظام کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ الفنسٹن مل کے میدان میں جو شہر کے آخری کنارہ سے بھی دور واقع ہے، جلسہ تھا اور تمام منتظمین اور والنٹیرز شہر کو خالی چھوڑ کر جلسہ گاہ میں چلے گئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شرارت کی چنگاری سلگی، اور چنگاری ابتدا میں کتنی ہی جلد بجھ جانے والی ہو، لیکن اگر بجھائی نہ جائے تو فوراً شعلوں کی صورت اختیار کر لے گی۔ شرارت کی چنگاریاں بے روک سلگتی رہیں اور موافق فضا کی بادزنی سے اس کے شعلے اچھی طرح بھڑک اٹھے۔ جلسہ گاہ سے جب عوام کی ٹولیاں واپس ہوئیں تو شہر کی بدنظمی نے ان کا استقبال کیا اور پھر اچانک دماغی اختلال کی رو ہر طرف دوڑ گئی، جب قومی کارکن انسداد کے لیے طیار ہوئے تو شورش کا سیلاب پوری قوت سے امنڈ چکا تھا۔ اب اس کے روکنے کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ کہہ دیا جائے "تھم جاؤ" ضرورت تھی کہ جس طاقت کے ساتھ سیلاب امنڈا تھا، اس سے دوگنی طاقت کا نظام اس کا مقابلہ کرتا۔ بدقسمتی سے شہر میں کوئی ایسا طاقتور نظام موجود نہ تھا، اس لیے کوئی بروقت تدبیر سودمند نہ ہوئی۔ یقین ہے کہ اگر اس وقت گاندھی جی کی اعانت کے لیے کاردان، طاقتور، صاحب رسوخ و نفوذ کارکن موجود ہوتے تو فوراً یہ سیلاب تھم جاتا۔ کم از کم مسلمانوں کی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ سخت سے سخت جوش و جنوں کی حالت میں بھی روک دیا جا سکتا تھا، اگر کوئی ایک مسلمان شخص بھی ایسا موجود ہوتا۔ یہ ایک تفاقی بدقسمتی ہے کہ اس وقت کارکنان خلافت میں سے کوئی سربرآوردہ مسلمان شہر میں موجود نہ تھا، خلافت کمیٹی کے لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ جب مولانا آزاد سبحانی بھنڈی بازار میں سمجھانے کے لیے گئے تو مسلمانوں نے ہندو سمجھا اور اس لیے باز آنے کی جگہ اور زیادہ بھڑک اٹھے، پھر بھی مرکزی خلافت کمیٹی کے کارکنوں ہی کے اثر کا یہ نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے مسلمان محلے بالکل پرامن رہے، اور عیسائیوں اور پارسیوں کی سخت انتقامی کارروائیوں پر بھی مشتعل نہ ہوئے۔ ۲۰ر کو جب سیٹھ چھوٹانی صاحب بمبئی پہنچے تو اچانک مایوسی امید سے بدل گئی اور انھوں نے اپنے اولین دورہ ہی

میں حالات پر قابو پالیا۔

ایسا بار ہا ہوا ہے کہ نادان لوگوں نے جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کے موقعوں پر چند نادانیاں کی ہیں۔ لوگوں پر بدیسی کپڑا اتار دینے کے لیے اصرار کیا، لوگوں کے سروں سے ٹوپیاں اتار لی ہیں۔ آوارہ لڑکوں نے سڑکوں پر شرارتیں شروع کردی ہیں، ہم جماعت میں اصلاح اور انتظام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جماعتی فطرت کو بدل ڈالنے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ پس ایسا ہونا ضرور افسوس ناک ہے، مگر تعجب انگیز نہیں ہے۔ بمبئی میں بھی شورش کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ بدمعاشوں اور لڑکوں نے سڑکوں پر روک ٹوک شروع کی اور اس کی ٹولیاں رفتہ رفتہ بے باک ہوتی گئیں۔ ضرورت تھی کہ ان شرارتوں کو بروقت روک دیا جاتا جیسا کہ ہمیشہ روکا جاتا ہے اور جیسا کہ ہمیشہ روکنا پڑے گا، لیکن مقامی آرگنائزیشن کی کمزوری و غفلت کی وجہ سے اس کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا۔ شہر بالکل خالی اور انسانی فطرت کے رحم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ انسانی فطرت قابل اعتماد ہے۔ مگر ساتھ ہی زود اثر بھی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ محض معمولی عامۃ الوقوع واقعات نے ایک غیر معمولی فتنہ کی صورت اختیار کر لی اور ایسے دردانگیز نتائج رونما ہوئے جن پر کوئی حق پسند قلب بھی بغیر ماتم و حسرت کے آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔

یہ بات کہ ابتدا کن لوگوں سے ہوئی؟ مسلمانوں سے؟ ہندوؤں سے؟ کوآپریٹرز سے یا نان کوآپریٹرز سے؟ تو میں جس قدر اس کے تصفیہ کو اب غیر ضروری سمجھتا ہوں، اس سے کہیں زیادہ مجہول اور ناقابل تحقیق پاتا ہوں۔ ان حالات میں ہمیشہ ہر جماعت ابتدائی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بچاتی ہے اور یقیناً قومی طرفداری کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سوال بالکل بیکار ہے کہ شروع کس نے کیا؟ مگر یہ یقینی ہے کہ حصہ سب نے لیا۔ اور سب اپنے خدا اور اپنے ملک کے سامنے بدترین جوابدہی کی ذمہ داری سے آلودہ ہیں۔ مسلمانان شہر کا بیان ہے کہ مسلمانوں کا کوئی نمایاں حصہ شورش میں نہ تھا، اور نہ یہ سچ ہے کہ انھوں نے ابتدا کی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر نمایاں اور زیادہ حصہ نہ تھا مساوی ہوگا؟ اگر مساوی نہ ہوگا تو کمتر ہوگا؟ لیکن میرے غم و حسرت میں ڈوب جانے کے لیے تو صرف اتنا ہی بس کرتا ہے کہ ایک مسلمان وجود نے بھی اس کام میں حصہ لیا ہو۔ اسلامی احکام کی رو سے یہ شورش کیا تھی؟ ظلم تھا، فتنہ تھا، معصیت و عدوان تھا۔ بے گناہ بندگان خلق کا قتل تھا، مقصد خلافت کی پامالی تھی، آزادی ہند کے بہترین کام کو خود اپنے ہاتھوں غارت کرنا تھا۔ پھر کیا مسلمانوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اگر انھوں نے اس منحوس کام میں حصہ لیا ہو مگر کم لیا ہو؟

کم اور زیادہ کا تصفیہ برائی کے ماتم کے لیے بے سود ہے۔ جن لوگوں کو حفظ اسلام و خلافت کی اس نازک گھڑی میں وقف خدمت ہو جانا چاہیے۔ اگر انھوں نے اس کی پامالی کے کام میں تھوڑا سا بھی حصہ لیا ہو، تو یہ ان کے لیے کافی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ماتم کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ شرم و غیرت میں ہر دل ڈوب جائے!

گورنمنٹ اور پولیس:

گورنمنٹ اور پولیس کا اس زمانے میں جو عریاں رویہ رہا، اس کا ذکر بے فائدہ ہے۔ ذکر اس بات کا کرنا چاہیے جو نئی ہو اور خلاف توقع۔ لیکن اب نہ تو گورنمنٹ کے طرز عمل کے لیے کوئی نئی زیادتی باقی رہ گئی ہے، نہ ایک لمحہ کے لیے کسی دماغ میں توقع و امید ہے۔ اس کی جانب سے انصاف اور راستی کا ہونا تعجب انگیز ہوگا، نہ کہ ہر وہ بات جو اس کے خلاف ہو۔ یہ مان لیا جائے کہ شورش کی ابتدا ہندو مسلمانوں ہی کے بدمعاش اور آوارہ لوگوں کی جانب سے ہوئی، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے پارسی اور عیسائی بھائیوں کو بے دریغ اسلحہ دے کر پوری طرح سول وار کا سامان کر دیا گیا ہے، اور انھوں نے پتھروں کا انتقام خونریز آلات جنگ سے لیا؟ کیا یہ اس لیے تھا کہ شہر کے مختلف عناصر باہم ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں اور اس طرح خود بخود وہ کام پورا ہو جائے جس کے لیے پنجاب میں مشین گنوں کی اور ابھی ابھی مدراس میں ایک سو چھ موپلوں کو ریلوے ویگن کے "بلیک ہول" میں بند کر دینے کی ضرورت ہوئی تھی؟ گورنمنٹ بمبئی اب اعلان کرتی ہے کہ گو آپریٹرز کو اسلحہ نہیں دیے گئے تھے، لیکن ان اعلانوں کی حقیقت ملک کو معلوم ہو چکی ہے، اور ان بے شمار واقعات اور شہادتوں کو نابود نہیں کر دیا جا سکتا ہے، جو اب تک بمبئی کے بچے بچے کے علم میں تازہ ہیں۔

شہر کے جنگ آزما مسلمان:

یہ حقیقت بھی ناقابل شبہ ہے کہ شہر کے وہ مسلمان محلے جس کی شورش پسندی کی روایات قدیم سے مشہور ہیں، اور جو بمبئی کا سب سے زیادہ جنگ آزما حلقہ تصور کیا جاتا ہے، اول سے آخر تک کامل امن و نظم کے ساتھ رہے اور انھوں نے سخت اشتعال انگیز مظالم سہہ کر بھی صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مدن پور کے مسلمانوں نے فسادات میں بالکل حصہ نہ لیا، باوجودیکہ ان کے

قریب ہی عیسائی آبادی بے دریغ اسلحہ سے کام لے رہی تھی، اور مسجد مدن پورہ پر حملہ آور ہونے کی افواہیں شب و روز اڑائی جا رہی تھیں۔ باندرہ میں کئی ہزار مسلمان قصائی رہتے ہیں اور وہ شہر کے انتقامی کارروائیوں کا حال سن کر سخت مشتعل ہو گئے تھے، ان کا سیلاب اگر شہر کی طرف بڑھتا تو حالت نہایت نازک ہو جاتی، لیکن جب روکا گیا تو فوراً رک گئے اور چار دن تک وہاں کا ایک مسلمان بھی شہر میں نہیں آیا۔ ۲۰ کو جب سیٹھ چھوٹانی صاحب صدر خلافت کمیٹی بمبئی پہنچے تو مسلمانوں کے مختلف حلقے مخالف فریق کے قتل و غارت کی وجہ سے مشتعل و بے صبر ہو رہے تھے، اس وقت تک بجز بدمعاشوں اور راہ گرد ٹولیوں، اور کارخانوں کے مزدوروں کے سوا اور کسی جماعت نے حصہ نہ لیا تھا، لیکن اب طیار تھے کہ مسلمان مقتولین کا انتقام لیں، لیکن جب وہ مسلمان حلقوں میں گئے اور صبر و تحمل کی نصیحت کی تو فوراً لوگ مان گئے اور اپنی آمادگیوں سے باز آ گئے، یہ تمام حالات اس حقیقت کا قطعی ثبوت ہیں کہ اگر ''نوان وایلنس'' کی پکار نے دلوں پر قبضہ نہ کیا ہوتا اور ملک کا تمام کارکن طبقہ اس پر متفق نہ ہو گیا ہوتا، تو ایسے نازک حالات میں ہزاروں مشتعل انسانوں کے جذبات کا اچانک تھم جانا بالکل ناممکن ہوتا، اور کسی طرح بھی اس قدر جلد حالات قابو میں نہ آ جاتے!

جو ہوا اور جو ہوتا:

جو ہوا اس سے ہمارے دل غمگین ہو رہے ہیں، لیکن چاہیے کہ جو ہوتا اور نہ ہوا، اس کو بھی یاد کر لیں، سالہا سال سے لاکھوں کروڑوں دل زخمی ہو رہے ہیں اور مرہم کی جگہ نوک نشتر کی دائمی خلش ان کے حصہ میں آئی ہے، خلافت اور پنجاب ناقابل فراموش ہے اور اس کے لیے کوئی تلافی موجود نہیں۔ اسلامی مصائب روز افزوں ترقی پر رہے اور سرکاری تشدد و مبدم بے پناہ ہوتا گیا، مذہبی احکام میں مداخلت اور ان کا تمسخر روز بروز بڑھتا جاتا ہے، اور ملک کے ہر دلعزیز اور محبوب لیڈر اور محترم علماء جیل خانوں کے اندر مقید ہیں، ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک بہت بڑا حاکمانہ اقتدار اور نظام اشتعال کا پورا پورا سامان فراہم کرتا رہا ہے، اور ملک کے تمام غم و ماتم کے عہد میں پرنس آف ویلز کو دعوت دے کر کروڑوں انسانوں کے جذبات کو حقارت و نفرت کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ ان تمام حالات میں ہندوستان کے اندر جو یقیناً فرشتوں کی بستی نہیں ہے، کیا کچھ ہو جاتا اور کیا کچھ ہو سکتا تھا، اگر تحریک خلافت کی نوان وایلنس دعوت فتح مند نہ ہوئی ہوتی؟ وہ یقیناً فتح مند

ہوئی اور ہمارے دل اگرچہ ان واقعات کے لیے غمگین ہیں، لیکن تحریک کی کامیابی کی طرف سے متفکر نہیں ہیں۔ امید ہے کہ آیندہ ایسے غمناک اور منحوس واقعات پیش نہ آئیں گے اور تمام خدام خلافت و کانگریس اچھی طرح ہوشیار ہو جائیں گے کہ انتظام کی ذرا سی غفلت کیسے ہولناک نتائج کا باعث ہو جاتی ہے اور اس سے ہمارے مقاصد کو کس قدر افسوسناک صدمہ پہنچتا ہے اور پہنچ سکتا ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے ۲۲ر نومبر کے اجلاس میں ملک کو جو مشورے دیے ہیں، وہ نہایت اہم ہیں، اور ہمارے آیندہ کاموں کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پوری استقامت کے ساتھ ان پر کاربند ہوں۔

گاندھی جی کے دل پر اس منحوس واقعہ سے جو صدمات گزرے اور جس طرح متصل تین دن تک فاقہ کر کے ان کے محبت پرست دل نے اپنا نے ملک کی نادانیوں اور گمراہیوں پر ماتم کیا، وہ ایک ایسا موثر واقعہ ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اور اس کی سچی عزت و احسان مندی یہی ہے کہ آیندہ کے لیے ایسے غم انگیز واقعات کا پوری طرح انسداد ہو جائے۔

آخر میں، میں ہر اس شخص سے جو خلافت اور سوراج کے مقصد کو عزیز رکھتا ہے التجا کروں گا کہ وہ اپنی انتہائی قوت امن و نظم کے قیام میں خرچ کر ڈالے اور یقین کرے کہ ہمارے اعلیٰ ترین مقصد کے لیے کوئی بات بھی اس درجہ مہلک نہیں جس قدر بلوے اور فسادات ہیں۔ میں ہر مسلمان سے التجا کروں گا کہ وہ اسلام اور خلافت کے مقاصد کا مبلغ بن جائے اور ہر مسلمان کے کانوں تک یہ حقیقت پہنچا دے کہ اگر اس کو اسلام اور اسلامی خلافت عزیز ہے تو آج اس کی خدمت کے لیے اس سے زیادہ کسی بات کی ضرورت نہیں کہ ہر طرح کے بلووں اور فسادوں کو روکا جائے اور مخالفوں کو تحریک خلافت کی پامالی کا موقع نہ دیا جائے۔ (پیغام۔ کلکتہ، ۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۳۔۲)

وقفۂ آزادی کی ایک یادگار تحریر

۸ر دسمبر ۱۹۲۱ء: جنوری ۱۹۲۰ء کے آغاز میں چار سال کی نظر بندی کے بعد مولانا آزاد رانچی کے گوشۂ عزلت سے نکلے تھے۔ دو سال کی مدت پوری ہونے میں ابھی دو عشرے باقی تھے کہ وہ بارہ گرفتار کر لیے گئے۔ یہ مضمون دور رہائی و آزادی کا آخری مضمون ہے۔ ۸ر دسمبر کی صبح کو یہ مضمون لکھا تھا اور ۱۰ر کی شام کو ان کی گرفتاری عمل میں آگئی۔ مضمون یہ ہے:

مباش غمزدہ عرفی کہ زلف و قامت یار
جزاء ہمت عالی و دست کوتہ ماست

آج ۸ر دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کی صبح ہے، کل شام کو مجھے قابل وثوق ذرائع سے اطلاع ملی کہ گورنمنٹ بنگال نے وائسرائے کے مشورے کے بعد میری اور مسٹر سی آر داس کی گرفتاری کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میری نسبت گورنمنٹ بنگال کا ارادہ یہ ہے کہ میں گیارہ تک کلکتہ سے باہر نہ گیا تو مجھے گرفتار کرلے گی، لیکن اگر میں بدایوں کے جلسۂ جمعیۃ العلماء کے لیے چلا گیا تو پھر اس کے سر سے بلا ٹل جائے گی اور صرف مسٹر داس گرفتار کرلیے جائیں گے۔

میرا وقت تمام تر بنگال سے باہر ہندوستان کے کاموں میں خرچ ہوتا رہا ہے۔ اس وقت بھی میں تحریک کے نہایت اہم کاموں میں مشغول تھا اور ۲۵ر دسمبر تک کا پروگرام میرے سامنے تھا۔ لیکن اچانک بنگال میں گورنمنٹ کی نئی سرگرمی شروع ہوگئی، اور اس کے بعد دوسرے صوبوں میں بھی اس کی تقلید کی گئی۔ میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے جلسے کی وجہ سے بمبئی میں تھا۔ مہاتما گاندھی جی سے میں نے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا "چند دنوں کے لیے کلکتہ چلا جانا ضروری ہے" یکم دسمبر کو میں کلکتہ پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ گورنمنٹ نے آخری حد تک تشدد کا ارادہ کرلیا ہے اور کوئی ناجائز طریقہ ایسا نہیں ہے جو ۲۲ر کی ہڑتال روکنے کے لیے عمل میں نہ آرہا ہو۔ تاہم لوگ پوری استقامت کے ساتھ صبر و سکون پر قائم ہیں اور آخر تک قائم رہیں گے۔

میرا پہلا کام یہ تھا کہ لوگوں کے ایمان اور استقامت دونوں کی نسبت اطمینان حاصل کراوں، یہ اطمینان مجھے ۵ر تک حاصل ہوگیا، اب میں نے سوچا کہ کلکتہ سے باہر جاؤں یا نہ جاؤں؟ بدایوں کے جلسۂ جمعیۃ میں جانا بھی نہایت ضروری تھا۔ ۶ر تک میں مذبذب رہا۔ میں نے مہاتما گاندھی جی کو لکھ دیا ہے کہ بقیہ کاموں کے لیے مسٹر سی آر داس کافی ہوں گے۔ میں بدایوں ہوکر بمبئی آتا ہوں۔ لیکن ۶ر کی شام کو یکایک حالات نے دوسری شکل اختیار کی، میں نے محسوس کیا کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آئی ہے اور مقابلہ کا فیصلہ کن میدان یہیں پیدا ہوگیا ہے، پس میرے لیے ضروری ہوگیا کہ تمام کاموں کو ترک کرکے کلکتہ کے لیے وقف ہو جاؤں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب میں یہیں رہوں گا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ گورنمنٹ نے خلافت اور کانگریس کمیٹیوں کو بالکل توڑ دینے اور معطل کردینے کا ارادہ کرلیا ہے۔ ایک ایک کرکے تمام کارکن گرفتار کیے جارہے ہیں۔ قومی اخبارات

بھی عنقریب بند کر دیے جائیں گے۔ مسٹر داس بالکل تنہا رہ گئے ہیں، ایسی حالت میں میرے لیے کلکتہ چھوڑنا ناممکن تھا۔

یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ بنگال مجھے گرفتار کرنے سے بچنا چاہتی ہے، اور منتظر ہے کہ میں کلکتہ سے باہر چلا جاؤں۔ گورنمنٹ کے ایک بھیجے ہوئے دوست نے مجھے اس سے مطلع بھی کر دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ گورنمنٹ کی تمام خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی میری خواہش سے متضاد ہے، اور میرا موجودہ فرض تعمیل نہیں ہے بلکہ خلاف ورزی۔

میں نے پوری طرح غور کر کے یہ فیصلہ کیا ہے، بلاشبہ بہت سے کاموں کے لیے میں اپنی موجودگی ضروری دیکھتا ہوں۔ اور کام اور ضرورت کا یہ حال ہے کہ جس قدر بھی مہلت مل جائے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اللہ کے فضل نے کلکتہ میں جو میدان عمل پیدا کر دیا ہے وہ ہر اعتبار سے قیمتی اور اہم معلوم ہوتا ہے اور میں یقین رکھتا ہوں کہ میرا انتخاب غلط نہ ہوگا۔

گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بہت بڑے بوجھ سے نجات دے دی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں کیا معلوم کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ محمد علی، شوکت علی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال، سب کا سفر پورا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا، اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک آخری مگر فتح مند میدان اپنے پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں نے کلکتہ کے موجودہ میدان عمل کو "آخری اور فتح مند میدان" کہا۔ یہ میرا یقین ہے اور عنقریب تمام ملک دیکھ لے گا کہ جو کام تین سال کے اندر تمام ملک میں انجام نہ پا سکا، وہ ان چند دنوں کے اندر کلکتہ میں انجام پا جائے گا۔ ولتعلمن نباہ بعد حین۔

البتہ اس آخری کام کی تکمیل اور مضبوطی کے لیے ایک آخری مرحلہ باقی ہے۔ اور میں بے فکر ہو گیا ہوں کہ گورنمنٹ بنگال کے ہاتھوں وہ کام پورا ہو جائے گا۔ اگر دو تین دن کے اندر مجھے اور مسٹر سی آر داس کو گرفتار کر لیا گیا تو یہ نہ صرف کلکتہ بلکہ تمام بنگال کو ایک نئی بیداری اور زندگی سے معمور کر دے گا۔ بنگال کو ہم تین سال تک آزاد رہ کر بیدار نہ کر سکے لیکن ہماری گرفتاری ایک منٹ کے اندر بیدار کر دے گی۔

میں اپنی گرفتاری میں تمام مسلمانان ہند کی ایک نئی کروٹ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے خاص طور پر پنجاب، صوبہ سرحد اور بہار پر اعتماد ہے۔ ان تین صوبوں کے مسلمانوں نے ہمیشہ میری صداؤں کو

محبت، اعتماد اور قبولیت کے ساتھ سنا ہے۔ وہ گزشتہ دس سال سے میری تمام امیدوں کا مرکز ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ میری گرفتاری ان کے لیے آخری دعوت عمل ہوگی جو حقیقت تین سال کی تقریروں اور تحریروں میں نہیں سمجھا سکا تھا، وہ میری گرفتاری کی خاموشی سمجھا دے گی۔

اس طرح گورنمنٹ بنگال صرف بنگال ہی کے لیے نہیں، بلکہ تمام ملک کے لیے ایک بہترین خدمت انجام دے رہی ہے۔

اولین مبارک باد:

اگر میں گرفتار ہوگیا تو مہاتما گاندھی جی کو میرا یہ پیغام پہنچا دیا جائے:

''میں آپ کو آپ کی فتح یابی پر سب سے پہلے مبارکباد دیتا ہوں، اس مبارکباد کے لیے آپ مجھے جلد باز نہ سمجھیں۔ میں اس اٹل وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ اس کی مبارکباد دینے میں کوئی دوسرا مجھ سے بازی نہ لے جائے۔ آپ کے ساتھ انسانی رفاقت روز بروز گھٹ رہی ہے، مگر خدا کی مدد بڑھتی جا رہی ہے۔ بمبئی کے حادثے نے آپ کے دل کو بہت صدمہ پہنچایا۔ میں آپ کو افسردہ اور غمگین دیکھ کر نہایت دردمند ہوا تھا، لیکن اب کلکتہ اٹھا ہے، تاکہ غمگینی کی جگہ خوشی اور کامیابی کا تحفہ آپ کے سامنے پیش کرے۔ آپ نے ۲۵ رنومبر کی شام کو جب مجھ سے کلکتہ کے بارے میں گفتگو کی تو میں نے آپ کو اطمینان دلایا تھا، میں خوش ہوں کہ میرا اطمینان بالکل صحیح نکلا۔ کلکتہ میں میں پندرہ سال سے کام کر رہا ہوں۔ نصف صدی کی خاندانی زندگی رکھتا ہوں، اس لیے میرا اطمینان علم و یقین پر مبنی تھا۔ گزشتہ تین سال کے اندر تحریک خلافت کے سب سے اہم کام کلکتہ ہی کے مسلمانوں نے انجام دیے ہیں۔ اب آخری منزل میں بھی پہلا قدم وہی اٹھائے گا۔ اس نے باامن قربانی کا راز پالیا ہے۔ وہ نہ تو بھڑکے گا نہ بجھے گا، مگر اس کی آگ برابر سلگتی رہے گی۔ باامن سول ڈس اوبیڈینس کی منزل طے کرنا اسی کے حصہ میں آیا ہے، وہ اس کا حقدار تھا''۔

آخری پیغام:

میرا آخری پیغام وہی ہے جواب سے دس برس پہلے پہلا پیغام تھا، لاتھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین. نہ تو ہراساں ہو اور نہ غمگین ہو تم ہی سب پر غالب رہوگے، اگر سچا ایمان اپنے اندر پیدا کرلوگے۔

ہماری تمام فتح مندیوں کی بنیاد چار سچائیوں پر ہے، اور میں اس وقت بھی ملک کے ہر باشندے کو انھی کی دعوت دیتا ہوں۔

(۱) ہندو مسلمانوں کا کامل اتفاق،

(۲) امن،

(۳) نظم،

(۴) قربانی اور اس کی استقامت۔

مسلمانوں سے میں خاص طور پر التجا کروں گا کہ اپنے اسلامی شرف کو یاد رکھیں اور آزمائش کی اس فیصلہ کن گھڑی میں اپنے تمام ہندوستانی بھائیوں سے آگے نکل جائیں۔ اگر وہ پیچھے رہے، تو ان کا وجود چالیس کروڑ مسلمانانِ عالم کے لیے شرم و ذلت کا ایک دائمی دھبا ہوگا۔

میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں اور بھی کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں، اور اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی نادانی کی بات بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں اور اپنی جانب سے کبھی کوئی بات ایسی نہ کریں، جس سے اس مبارک اتفاق کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی جی پر پوری طرح اعتماد رکھیں، اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں (اور وہ کبھی نہ چاہیں گے) جو اسلام کے خلاف ہو، اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔

مرکزی خلافت کمیٹی:

مرکزی خلافت کمیٹی کے کاموں کی طرف سے میں مطمئن ہوں۔ اس کے باہمت اور سرگرم صدر چھوٹانی صاحب کی موجودگی ہر طرح کفایت کرتی ہے۔ میرے عزیز ڈاکٹر سید محمود سکریٹری منتخب ہو چکے ہیں اور نہایت سرگرمی سے کام کر رہے ہیں، ان کی اعانت کے لیے مسٹر احمد صدیق کھتری پیشتر سے موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ دفتر کے تمام افسران و کارکنان ان باتوں کو فراموش نہ کردیں گے جو گزشتہ قیام بمبئی کے موقع پر میں نے ان سے کہی تھیں، اور ان کی متحدہ زندگی اور سعی ہماری عدم موجودگی کی پوری طرح تلافی کردے گی۔

حکیم محمد اجمل خان صاحب:

اور ڈاکٹر انصاری کو میرا پیغام پہنچا دیا جائے کہ اب آپ کے دوش ہمت پر صرف آپ ہی

کے فرائض کا نہیں بلکہ ہم سب کا بوجھ آ پڑا ہے۔ حکمت الٰہی کا منشا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باہر کے تمام کام آخر تک آپ ہی انجام دیں۔ بہتر یہ ہے کہ اب آپ بمبئی تشریف لے جائیں اور دہلی کی فکر چھوڑ دیں۔

انگورہ فنڈ:

افسوس ہے کہ انگورہ فنڈ کی مزید تکمیل کا مجھے موقع نہیں ملا۔ غالباً اس وقت تک دس لاکھ روپیہ فراہم ہوگیا ہے۔ پہلے آخر دسمبر تک کا زمانہ قرار پایا تھا، اب بہتر ہوگا کہ ایک ماہ کی مدت اور بڑھا دی جائے اور جنوری کے آخر تک فراہمی کا سلسلہ جاری رہے۔

میرا ارادہ تھا کہ دسمبر کے وسط میں ایک خاص تاریخ عام وصولی کے لیے قرار دی جائے۔ اور جس طرح مردم شماری کے وقت انتظام ہوتا ہے، اسی طرح ہر جگہ انتظام کیا جائے۔ پہلے سے اعلان کردیا جائے کہ فلاں وقت چندہ کرنے والے نکلیں گے۔ ہر شخص حتی الامکان اپنے مکان میں رہے۔ پھر وصول کرنے والے تمام شہر میں پھیل جائیں اور ہر مسلمان کے آگے دست سوال دراز کریں۔ کم از کم ایک مرتبہ تو ایسا ہوجانا چاہیے کہ ہندوستان کا ہر مسلمان حفاظت اسلام وخلافت کے لیے کچھ نہ کچھ مالی قربانی کردے۔

لیکن کلکتہ پہنچ کر جب ملک کی حالت پر نظر ڈالی تو یہ وقت اس کے لیے موزوں معلوم نہ ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ احمد آباد خلافت کانفرنس میں اس کا اعلان ہوجائے، اور جنوری کے پہلے ہفتہ کی کوئی تاریخ مقرر کردی جائے۔

جمعیۃ العلماء:

جمعیۃ العلماء کا وجود اس وقت سب سے اہم اور سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ وہ علماء کا مجمع ہے اور علماء کے سوا کوئی نہیں جسے مسلمانوں کی دینی ودنیوی رہنمائی وپیشوائی کا منصب حاصل ہو۔ جمعیۃ کے سامنے اس وقت ایک نہایت اہم اسلامی مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام ارکان جمعیۃ کو توفیق دے کہ اجتماع بدایوں میں کامل اتفاق واجماع کے ساتھ کسی بہتر فیصلہ پر پہنچیں۔ سردست میں ارکان جمعیۃ سے بہ ادب عرض کروں گا کہ:

(۱) آپ سب کا باہمی اتحاد ہر حال میں ضروری اور تمام مقاصد کے لیے بنیاد کار ہے۔

(۲) ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی ضرورت واہمیت اور شرعی استحسان آپ کی نظر سے پوشیدہ

نہیں۔اس کی پوری طرح حفاظت کرنی چاہیے اور اس کی حفاظت آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

(۳) احمد آباد کانگریس میں تمام علماء اسلام کو اور خاصۃ ارکان جمعیۃ کو ضرور شریک ہونا چاہیے اور جمعیۃ العلماء کی جانب سے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

(۴) لاہور میں ارکان عامہ کی جو تجویز منظور ہوئی ہے، اس پر فوراً عمل درآمد شروع ہو جائے اور جہاں تک جلد ممکن ہو مجوزہ تعداد ممبروں کی بہم پہنچائی جائے۔

گورنمنٹ بنگال:

آخر میں مجھے سر ہنری ویلر اور مسٹر کلارک پولیس کمشنر کلکتہ کے لیے بھی ایک پیغام لکھنا ہے! وہ یہ ہے کہ ۲۲ر کی ہڑتال ضرور ہوگی اور خلافت اور کانگریس رضا کاروں کا سلسلہ ہماری گرفتاری کے بعد دوگنی طاقت کے ساتھ جاری رہے گا۔

عزیزان ملک وملت! میں چار سال نظر بند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوا اور دو سال کے بعد اب پھر جیل خانہ جا رہا ہوں۔ اللہ آپ سب کا مددگار ہو، اور راہ خدمت حق میں مستقیم رکھے۔(وافوض امری الی اللہ، ان اللہ بصیر بالعباد)

ابوالکلام

(پیغام۔کلکتہ،۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۴،۵+۸)

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء: مولانا ابوالکلام آزاد کی گرفتاری پر ''افکار وحوادث'' کے کالم میں ایک نوٹ شائع ہوا ہے۔مولانا ملیح آبادی (ایڈیٹر) کی گرفتاری کے بعد مولانا عبدالرحمن ندوی نگرامی پیغام کے انچارج اور اس میں لکھنے والوں میں سب سے اہم شخصیت تھے، اس لیے یقین ہے کہ یہ نوٹ مولانا نگرامی ہی کے قلم کی یادگار ہے۔نوٹ یہ ہے:

۱۰ر دسمبر کی شام بھی کیسی مبارک ومسعود تھی کہ اس وقت ہمارے لیے حضرت مولانا آزاد کی گرفتاری نے منزل کے قریب تر ہو جانے کا اعلان کیا گیا۔

۱۷ر نومبر کی کامیاب اور مکمل ہڑتال کے بعد یکا یک گورنمنٹ بنگال کی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہندوستانیوں کے قدیم مہربان انگلو انڈین اخبارات نے اپنی جبلی شفقت اور محبت سے مختلف تجویزیں حکومت کے سامنے پیش کر رکھی تھیں اور توقع تھی کہ جلد سے جلد شرف قبولیت بخشا جائے۔ادھر دو تین دن تنظیم وتنسیق کے افکار میں خلافت اور کانگریس کے کاموں میں رخنہ پڑا، اور

ادھر یاران زود فہم نے مشہور کر دیا کہ اب تحریک سرد پڑ گئی۔ مسز بی یت سی آر داس اور حضرت مولانا ان دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت کلکتہ میں موجود نہ تھا۔ باہر سے واپسی کے بعد دونوں حضرات نے باہمی مشورے سے کام کو اور زیادہ پر جوش طریقے پر شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

۲۲ر دسمبر کی ہڑتال کو روکنے کے لیے حکومت کی طرف سے طرح طرح کے تربے، لالچ اور دھمکی استعمال کیے جا رہے تھے، اس لیے شہر کے مختلف حصوں میں رضا کاروں نے خاموشی کے ساتھ پروپیگنڈا کا کام شروع کر دیا۔ حکومت کے اعلان پے در پے شائع ہو رہے تھے لیکن کسی ایک گوشہ سے بھی اطاعت وتسلیم کی آواز نہ سن کر ایک نیا انداز یہ اختیار کیا گیا کہ شہر کے ایک حصہ کو محاذ جنگ بنا دیا گیا۔ یورپین سولجر، مشین گنیں اور توپیں مختلف موقعوں پر نصب کر دی گئیں۔ رضا کار اپنا کام انھی توپوں کے سایہ اور سولجروں کے پہلو میں باطمینان کر رہے تھے۔ یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو شنبہ کے دن پونے چار بجے حضرت مولانا اور مسز بی یت سی آر داس کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ ہم لوگ عمارت کے نیچے کے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا اس وقت ایک ضروری مشورے سے فارغ ہو کر باہر سے تشریف لائے تھے کہ ڈپٹی کمشنر پولیس مع دو اور افسروں کے عمارت کے اندر داخل ہوا۔ مولانا کو دریافت کیا اور ملاقات کے بعد محض زبانی حکم پر حضرت کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ حضرت اپنے قیام کے کمرہ سے ہنستے ہوئے نیچے تشریف لائے اور بڑی مسرت کے ساتھ ہم لوگوں کو منزل کے سر پر آ جانے اور آیندہ استقامت کے ساتھ مصروف عمل رہنے کی ہدایت دے کر روانہ ہو گئے۔

یہ دونوں گرفتاریاں غیر متوقع نہ تھیں۔ دو تین روز پہلے جب مصالحت کے نامہ و پیام بے نتیجہ ختم ہو گئے تھے تو یہی امید کی جاتی تھی کہ حکومت اپنی آخری تدبیریں جلد ہی ختم کر دے گی۔ بے شبہ ہمارے دل ان گرفتاریوں پر ملول و محزون ہیں، لیکن ہماری بصیرت خوش اور ہمارا ایمان مسرور ہے، یہ تمام اہم گرفتاریاں سوراج کا پیش خیمہ ہے۔ ہم مولانا کے تمام مریدین و معتقدین سے جو سارے ہندوستان کے طول وعرض میں اور خصوصاً پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں موجود ہیں، درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس عطیۂ الٰہی کو ایمان کی شادمانی اور کامیابی کی مسرت سے قبول کریں۔ فرصت کو غنیمت جانیں اور پوری مستعدی کے ساتھ کام میں مصروف ہو جائیں۔ ہم حضرت مولانا کی ایک تحریر اسی نمبر میں شائع کرتے ہیں، جو گرفتاری سے دو دن پہلے انھوں نے لکھی تھی اور گرفتاری کے بعد ان کے کاغذات میں ملی ہے۔ (پیغام۔ کلکتہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱، ص ۱۱)

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء: ۹ر دسمبر پیغام اشاعت کے لیے تیار ہو چکا تھا کہ مولانا آزاد کو گرفتار کر لیا گیا۔ صفحہ ۴ پر رپورٹ میں یہ سطر درج کر دی گئی تھی:

''حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ۱۰ر دسمبر کی شام کو اپنے دولت کدے پر گرفتار ہو گئے۔''

۱۶ر دسمبر کی اشاعت میں ''افکار و حوادث'' کے زیر عنوان گرفتاری کے واقعے پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ صاحب تحریر لکھتے ہیں:

''شنبہ کے دن پونے چار بجے حضرت مولانا اور اسی وقت سری یت سی آر داس کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ ہم لوگ عمارت کے نیچے کے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا اسی وقت ایک ضروری مشورے سے فارغ ہو کر باہر سے تشریف لائے تھے کہ ڈپٹی کمشنر پولیس مع دو اور افسروں کے عمارت کے اندر داخل ہوا۔ مولانا کو دریافت کیا اور ملاقات کے بعد محض زبانی حکم پر حضرت کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ حضرت اپنے قیام کے کمرے سے ہنستے ہوئے نیچے تشریف لائے اور بڑی مسرت کے ساتھ منزل کے سر پر آ جانے اور آئندہ استقامت کے ساتھ مصروف عمل رہنے کی ہدایت دے کر روانہ ہو گئے۔'' (ص ۱۱)

۱۴ر دسمبر ۱۹۲۱ء: ۱۴ر دسمبر کو مولوی عبدالرزاق صاحب ایڈیٹر پیغام کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا اور دو سال کی قید بامشقت کا حکم ہو گیا۔ مقدمہ کی کارروائی ابتدا سے بند کمرے کے اندر ہوئی۔ اس لیے زیادہ تفصیلی حالات نہیں معلوم ہوئے۔ بالاجمال اتنا معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے اصول کے مطابق کسی قسم کی مدافعت پیش کرنے سے انکار کیا، لیکن یہ ثابت کرنے کے لیے کہ گورنمنٹ بنگال سی آئی ڈی کے جن ملازمین پر اعتماد کرتی ہے وہ اردو زبان سے کس درجہ ناآشنا ہیں، انھوں نے ثبوت کے گواہوں سے جرح کی۔ جرح میں سی آئی ڈی نے اور گورنمنٹ کے مترجم نے تسلیم کیا کہ وہ مولانا کی تقریر سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بہرحال حکم سزا سننے کے بعد موصوف نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ مجسٹریٹ کا شکریہ ادا کیا، جس پر مجسٹریٹ نے شرمندگی کے ساتھ اپنی مجبوری بیان کی اور اظہار افسوس بھی کیا۔ (پیغام۔ کلکتہ، ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۱۱)

۲۵ر دسمبر ۱۹۲۱ء: پرنس آف ویلز ۲۵ر دسمبر کو کلکتہ آ رہے تھے اور بنگال گورنمنٹ نے قانون ترمیم ضابطہ فوجداری کے ماتحت والنٹیروں کی بھرتی خلاف قانون قرار دے دی۔ مسٹر سی آر داس اور ان کے بیٹے کے علاوہ سیکڑوں اور آدمی گرفتار کر لیے گئے۔ پنجاب اور یوپی میں بھی

گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سی آر داس اور ان کی فیملی سب جیل میں تھے۔ اس زمانے میں دفعہ ۱۴۴ و ۱۰۸ ضابطہ فوجداری کا استعمال عام شروع ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان دفعات کا سیاسی کارکنوں اور لیڈروں کے خلاف استعمال کی تجویز سر تیج بہادر سپرو نے پیش کی تھی جو اگست ۱۹۲۰ء میں حکومت ہند کے لا ممبر بنائے گئے تھے۔ (تواریخ کانگریس، ص ۵۱۔۳۵۰)

مارچ ۱۹۲۲ء: مارچ ۱۹۲۲ء میں دہلی میں ایک گول میز کانفرنس اصلاحات کی اسکیم پر غور کرنے کے لیے منعقد کی جائے۔ اس کانفرنس میں کانگریس کے ۲۲ نمائندے ہوں، لیکن داس کا مطالبہ تھا کہ قانون ترمیم ضابطہ فوجداری کے ماتحت جس قدر بھی گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں سب کور با کیا جائے۔ مہاتما گاندھی کے فیصلے اور سمجھوتے سے لالہ لاجپت رائے، مولانا محمد علی و شوکت علی اور ڈاکٹر کچلو جیسے رہنما جیل میں بدستور پڑے رہتے تھے۔ اس طرح خلافت کانفرنس میں حصہ لینے کے الزام میں جن کارکنوں کو سزائیں ہوئی تھیں ان کی رہائی کا کوئی موقع پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایسے دوست اور رفقاء کے خیال سے متفق ہو کر مہاتما جی نے کراچی کے قیدیوں کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا۔ حکومت نے اسے بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن پکٹنگ کے حق اور فتوے کے قیدیوں کی رہائی کو ماننے سے وائسرائے نے انکار کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے مہاتما گاندھی کا جواب آنے سے پیشتر ان کے رفقاء ۲۳؍ دسمبر کو کلکتہ سے روانہ ہو گئے اور گفت و شنید فیل ہو گئی۔ (تواریخ کانگریس، ص ۵۲۔۳۵۱)

۲۷؍ دسمبر ۱۹۲۱ء: ۲۷؍ دسمبر ۱۹۲۱ء احمد آباد میں آل انڈیا کانگریس کا چھتیسواں سالانہ اجلاس سی آر داس کی صدارت میں ہونے والا تھا۔ لیکن ان کی گرفتاری کا واقعہ پیش آ جانے کی وجہ سے حکیم اجمل خان صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں ۴۷۲۶ نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ ہزاروں دیگر افراد اس اجلاس کی زینت بنے جو ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے تھے۔ اس عظیم الشان تاریخی اجلاس میں سوراج لینے کی آخری تاریخ کا ریزولیوشن ہوا۔ گاندھی جی اجلاس پر چھائے ہوئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی بھی اجلاس میں شریک تھے۔ آپ نے سبجیکٹ کمیٹی میں استقلال کی تجویز پیش کی۔ یعنی "اعلان تشدد اور گوریلا اعلان جنگ" جو کافی بحث و مباحثہ کے بعد کثرت رائے سے نامنظور ہو گئی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۰۷)

۲۱۔ ۱۹۲۰ء: تحریک خلافت کا دور عروج:.....ایک سرسری تبصرہ ...واقعات کی روشنی میں:

۱۹۲۰ء کے شروع میں ترک موالات کے پروگرام کا آغاز ہوا تھا۔ سال کے ختم ہوتے ہوتے پورے ہندوستان میں ترک موالات کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ۱۹۲۱ء تحریک کے عروج کا سال تھا۔ بچے بچے کی زبان پر ہندوستان کی آزادی کے نعرے، خلافت کے ترانے اور سینے قوم و ملک کی خدمت اور آزادی و خلافت کی راہ میں ایثار اور قربانی کے جذبے سے معمور تھے۔ ہندو مسلم اختلافات اور مذہبی تعصبات قصہ ہائے پارینہ بن چکے تھے۔ اتحاد و اتفاق اور بھائی چارے کے حیرت انگیز مناظر ذوق نظارہ کی تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ بڑے بڑے سیاسی گھاگ اور ترک موالات کے مخالفین میں ہمت نہ تھی کہ وہ بر سر عام مخالفت کریں۔ سیاسی فضا بالکل بدل چکی تھی۔ ایک نیا ہندوستان برٹش استعمار کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔

بعض اہل قلم نے تعلیمی اور معاشی نقصانات سے قومی زندگی پر تحریک خلافت کے مضر اثرات کا اندازہ لگانے کی سعی کی ہے۔ لیکن ملک کی سیاسی و سماجی زندگی پر اس کے جو دوررس اثرات پڑے اور برٹش استعمار کا خوف جس طرح عوام کے دلوں سے اٹھ گیا تھا اور تکلیفیں اٹھانا اور قید و بند کے مصائب جھیلنا عوام کے لیے جس طرح بازیچۂ اطفال بن گیا تھا اور اس کے نتیجے میں ۱۹۳۰ء کی ''سول نافرمانی''، ۱۹۴۲ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریکات، نیز ۱۹۴۵ء کی بحری جہازوں کے ہندوستانی عملے کی بغاوت اور انڈین آرمی کے مقدمے کو قوت نصیب ہوئی اور آزادی کی منزل ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء تک سمٹ آئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا:

> ''تحریک خلافت کی اس کامیابی میں خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقت ور ہنگامے کے ساتھ کل ہندوستان کے مسئلے کو زندہ کر دیا جو چالیس سال کی کوششوں سے ہندوستان کو نہیں ملا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک خلافت کے ساتھ ہندوستان کا مسئلہ پوری قوت سے زندہ ہو گیا ہے۔''

اور گاندھی جی کے بقول:

> ''خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی۔ اب میں اسے سونے نہ دوں گا۔''

اور یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے اس کے بعد قوم کو سونے نہیں دیا۔

البتہ تحریک کے ان فوائد کو اس کے نکتہ چینیوں نے نظر انداز کر دیا۔ قاضی عدیل احمد عباسی نے تحریک کے عروج کی داستان تحریر کی ہے اور نئے ہندوستان کے سیاسی ماحول کے مختلف مناظر پیش کیے ہیں۔ اس آئینے میں ہم اپنے شاندار ماضی کی جھلکیاں صاف دیکھ سکتے ہیں۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''جنوری ۱۹۲۱ء آزادی کے نشہ سے سرشار اور گاندھی جی کی قیادت میں آزادی کامل کی منزل کی جانب دارورسن کی دعوت دینے کے لیے سربکف نئے ہندوستان پر طلوع ہوا۔ دیش بندھو سی آر داس کی اپیل پر تین ہزار لڑکوں نے کالج سے اسٹرائک کر دیا۔ ہزاروں نے کالج چھوڑ دیا۔ ۴ر جنوری ۱۹۲۱ء کو کلکتہ میں نیشنل کالج قائم ہوا۔ بہار میں ودیا پیٹھ کی بنیاد پڑی۔ پٹنہ، احمد آباد، بمبئی، بنارس اور دلی میں نیشنل کالج کھل گئے۔ بنگال، گجرات، بہار میں نیشنل یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پانچ سو روپے ماہوار کی سرکاری امداد بند کر دی۔ اس وقت اگرچہ سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء کے ناظم تھے لیکن حبیب الرحمن خان شروانی ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک اہم رکن تحریک ترک موالات کے سخت مخالف تھے۔ اس وقت ندوۃ العلماء کا خرچ ایک ہزار روپیہ ماہوار تھا۔ جس میں سے اب صرف ۴۵۰ روپیہ ماہوار نواب بھوپال کا رہ جاتا تھا۔ ان حالات میں بھی امداد بند کرنے کی تجویز کا پاس ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ جو لوگ بھی اب تحریک ترک موالات کے ہم نوا نہ تھے وہ اپنی پوزیشن اور اپنا اثر کھو چکے تھے۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تحت الیکشن ہوئے۔ کانگریس نے اس کا مکمل بائیکاٹ کیا اور اگرچہ گورنمنٹ کے کرائے کے ٹٹو امیدواری کے لیے دوڑے لیکن عوام میں سے بہت کم نے ووٹ دیا۔ اندازہ ہے کہ ۴۵ فیصد سے زیادہ نے ووٹ نہیں دیا اور کالجوں اور اسکولوں کے بائیکاٹ اور قومی درس گاہوں کے قیام کی مہم جاری رکھی۔ چنانچہ راجندر بابو کی کوششوں سے پٹنہ گیا روڈ پر ایک کالج قائم ہو گیا اور وہ خود اس کے پرنسپل قرار پائے اور بہت سے اعلیٰ لیاقت کے پروفیسر استعفیٰ دے کر اس کالج میں چلے آئے۔ کورس وہی رکھا گیا جو کالجوں کا کورس تھا اور سرمایہ کی کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اسی طرح پٹنہ انجینئرنگ اسکول کے ۲۵۰ لڑکوں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہا اور وہ مسٹر مظہر الحق

بیرسٹر کے پاس گئے اور کہا کہ ہم کو کچھ جگہ رہنے کی دیجیے۔ مظہر الحق چوٹی کے بیرسٹروں میں تھے۔ نہایت آرام وعیش کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کے رہنے کا مکان بہت شاندار تھا اور اسی کے ساتھ وہ دوسری عالیشان کوٹھی بھی بنا رہے تھے۔ مگر اب تو سب کا حال یہ تھا کہ:

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر

باز ایں نگر کہ شعلۂ درگیرم آرزوست

جب موتی لال، سی آر داس، راج گوپال آچاریہ، وٹھل بھائی پٹیل، محمد علی، شوکت علی اپنے آرام کے بستروں کو چھوڑ کر اپنا سب کچھ قربان کر کے میدان عمل میں آ چکے تھے تو مظہر الحق کیسے پیچھے رہتے۔ وہ فوراً سب عیش و آرام، کوٹھی اور سامان آرائش چھوڑ کر ان لڑکوں کو لے کر دانا پور سڑک (پٹنہ) پر ایک باغیچہ میں چلے گئے۔ وہاں ان کے ایک دوست کا چھوٹا سا مکان تھا۔ اسی میں رہنے لگے۔ آہستہ آہستہ وہاں تاڑ کی چٹائیوں کے کچھ جھونپڑے بھی بن گئے۔ لڑکوں میں بے پناہ جذبہ تھا۔ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر یہیں رہنے لگے۔ وہاں چرخوں کا ایک کارخانہ بھی کھول دیا گیا۔ گائیں پالی گئیں۔ مظہر الحق انھی لڑکوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کو پڑھاتے بھی تھے۔ موٹا کھانا جو لڑکے کھاتے تھے وہ بھی وہی کھاتے تھے۔ کبھی صرف چنے چبا کر رہنا پڑتا تھا۔ لڑکے زیادہ تر ہندو تھے مگر اب ہندو مسلمان کا امتیاز کافور ہو چکا تھا۔ لڑکے بھی ان کو باپ کی طرح مانتے تھے۔ اسی جگہ کا نام ''صداقت آشرم'' رکھا گیا جس نے تمام ہندوستان میں بڑی شہرت حاصل کی اور لوگ آج بھی اس کی زیارت کے لیے جایا کرتے ہیں۔ اللہ اللہ کیسا حسین منظر ہے۔ جامعۂ ملیہ اسلامیہ، دویا پیٹھ، صداقت آشرم، مدرسۂ کلکتہ اور ان میں مدرس کون ہیں مولانا محمد علی، بابو راجندر پرشاد، مسٹر مظہر الحق، چٹائی کا بستر ہے، فاقے ہیں یا موٹا اناج۔

اسی کے ساتھ شراب کی دوکانوں پر پہرے لگ گئے۔ اب لوگ شراب کا ٹھیکہ لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ شرماتے بھی ہیں۔ بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ ہو گیا بلکہ جلا دیے گئے۔ موٹا کھدر سب کے جسموں پر آ گیا۔ چرخہ چلنے لگا۔ سادگی، بے نفسی، باہمی محبت، یکجہتی، سچائی اور آزادی وطن کا عزم راسخ بعد بعدم تشدد یہ پیروانِ گاندھی کی شمشیریں تھیں۔

اپریل گزرتے گزرتے پنڈت موتی لال نہرو، راجندر پرشاد، وٹھل بھائی پٹیل اور راج گوپال آچاریہ نے وکالت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ یہ لوگ اپنے پیشہ میں ہندوستان بھر میں شہرت رکھتے تھے اور پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار تک ان کی آمدنی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا عجیب دل خوش کن نظارہ تھا۔ تمام ہندو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ علماء اسلام سرفروشی کی تمنا دلوں میں لیے لبوں سے آگ اگلتے، انگریز کے خلاف ترک موالات کو جہاد قرار دے رہے تھے۔ اور نہ صرف فتویٰ دیتے تھے بلکہ خود اپنے لیے دار ورسن کو بھی دعوت دے رہے تھے۔ (تحریک خلافت: ص ۱۷۴-۱۷۶)

علی گڑھ پر دھاوا:

بڑے اطمینان اور عزم سے علی برادران نے علی گڑھ پر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں دھاوا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم گئے اور سارے طلبہ ہمارے پیچھے ہوں گے مگر انھوں نے انگریز کی سیاست اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی ریشہ دوانیوں کا غلط اندازہ کیا تھا۔ جب محمد علی کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی جس کی کہانی یہ ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے اپنے پٹھوں کو لگا دیا اور انھوں نے محمد علی پر یونین ہال میں ہوٹنگ کی۔ علی گڑھ کا قاعدہ ہے کہ اپنے آدمیوں پر ہوٹنگ ہو سکتی ہے۔ باہری آدمی آدے تو سناٹا رہے گا۔ لیکن یہاں معاملہ تفریحی تقریر کا نہ تھا بلکہ ایک فیصلے کا تھا مولانا محمد علی دلگیر ہو کر چلے گئے۔ لیکن طلبہ کی ایک بڑی جماعت تحریک کی حامی تھی۔ خواہ سب عمل کرنے کے لیے تیار نہ رہے ہوں اس لیے بعدہ خود طلبہ میں تحریک پیدا ہوئی اور دوبارہ جلسہ ہوا اور مولانا محمد علی کو مدعو کیا گیا۔ مولانا محمد علی آئے لیکن وہ رنجیدہ تھے اور صرف پانچ منٹ تقریر کی۔ انھوں نے کہا میں علی گڑھ کو اپنا سمجھ کر آیا تھا، اب یہاں سے نکالا جا رہا ہوں۔ اس کا مجمع پر بڑا اثر پڑا اور طلبہ نے خود عزم و ہمت دکھا کر عدم تعاون کی پیشکش کی۔ جن میں ایک ذاکر حسین صاحب بھی تھے۔ (بعدہ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند) جو اسسٹنٹ لیکچرر ابھی حال میں مقرر ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور ایک فضا بن گئی جو پہلے سے موجود تھی لیکن نمایاں نہ ہو سکی تھی اور مولانا محمد علی نے جو طلباء ان کے ساتھ آ سکتے تھے ان کو آواز دی اور اپنے ساتھ لے کر اولڈ بوائز لاج میں جا کر مقیم ہوئے۔ اولڈ بوائز لاج کالج کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ اولڈ بوائز کی ملکیت ہے لیکن ان کو وہاں سے بھی نکلنے کا حکم دے دیا گیا اور ڈیڑھ سو طلبہ اپنے سامانوں کو اپنے سروں پر اٹھائے محمد علی کی قیادت میں اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ درس گاہ سے باہر نکل گئے اور ایک نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعۂ ملیہ اسلامیہ) کے نام سے علی گڑھ میں قائم کر دی گئی اور وہیں مولانا محمد علی نے اقامت اختیار کر لی۔ پہلے مولانا محمد علی خود پرنسپل تھے اور حسب عادت صبح سے شام تک تقریریں کیا کرتے تھے۔ بعدہٗ خواجہ عبدالمجید

صاحب شیخ الجامعہ قرار دیے گئے۔ اس طرح محمد علی کی ہمت سے ایک آزاد یونیورسٹی وجود میں آئی جو اس وقت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ علی گڑھ میں اس انقلاب کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد ہر جگہ نیشنل کالج اور اسکول کھلنے لگے۔ شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہوگا جہاں کوئی نہ کوئی اسکول نہ کھل گیا ہو۔ ترک موالات یا ترک تعاون کا منشا ہی یہ تھا۔ چنانچہ جو جو ادارے سرکاری امداد لیتے تھے ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔

مدرسۂ عالیہ کلکتہ پر مولانا آزاد کا دھاوا:

یہ تحریک جس طرح انگریزی تعلیم کے اسکولوں اور کالجوں کے بارے میں ہوئی اسی طرح ان مدارس کے بارے میں بھی ہوئی جو سرکاری امداد پر چلتے تھے۔ ان میں ایک نہایت عالیشان اور مشہور خاص و عام مدرسہ، مدرسۂ عالیہ کلکتہ تھا جو سرکاری امداد سے چلتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد جب رانچی میں نظر بند تھے تو انھوں نے وہاں ایک قومی درسگاہ قائم کی تھی۔ اب انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ کو جس کا بنگال اور کل ہندوستان کے مسلمانوں پر بڑا اثر تھا توڑ کر اس کی جگہ ایک قومی مدرسہ قائم کیا جائے۔ مولانا کی شخصیت کے اثر سے ڈھائی سو طلبہ تیار ہو گئے اور روپیہ کا بھی انتظام ہو گیا۔ اب مولانا کو اچھے اساتذہ کی فکر ہوئی اور آخرکار حضرت مولانا حسین احمد مدنی چارج لینے پر تیار ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قومی مدرسہ کی رفعت و شان کیا تھی۔ مولانا آزاد جو بھی کام کرتے تھے اس میں اسی طرح کی عظمت ہوتی تھی۔ مولانا آزاد کی ایک شعلہ بار تقریر سے جو ڈھائی سو لڑکے مدرسۂ عالیہ سے نکل آئے تھے، عارضی طور پر ان کے لیے کلکتہ کی مشہور عظیم الشان جامع مسجد (مسجد ناخدا) میں مدرسہ کھول دیا گیا۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی نے اس قومی عربی مدرسہ کا افتتاح کیا۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر جو تقریر کی وہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ تقریر ایک عربی دینی مدرسہ کے افتتاح کے لیے کی گئی تھی۔ اول تو اس کی تاسیس گاندھی جی کے ہاتھ سے کرانا، دوسرے یہ تقریر اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ اس وقت کی فضا کیا تھی اور مسلمانوں میں گاندھی جی کی محبوبیت و مقبولیت کا کیا عالم تھا۔ اس تقریر کے چند فقرے حسب ذیل ہیں:

”مہاتما جی!

اس وقت طلبہ کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جس کی آنکھیں پر گڑھی ہوئی ہیں

یہ وہ جماعت ہے جس نے مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی شاندار عمارت اور اس کے عالیشان ہوسٹل کو جس میں بہترین سامان آرائش و زیبائش مہیا تھا محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا ہے...... یہ وہ جماعت ہے جس نے ترک موالات کی راہ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کی ہیں۔ بھوک پیاس کی سختی جھیلی ہیں۔''

اس کے بعد مولانا نے اس کا ذکر کیا جہاں ایک طبقہ سرکاری تعلیم کے ذریعہ رزق تلاش کر رہا ہے۔ عربی مدارس کا ایک سلسلہ ہے جو صرف سچی علم پرستی کا چراغ روشن کیے ہوئے ہے''۔ آخر میں کہا کہ

''میں نے اس چیز کی جانب آپ کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جوہر شناس صرف جوہری ہی ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ اخلاص اور ایثار کے جوہر شناس ہیں''۔

(خطبات آزاد، مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی، صفحہ ۳۸۔۳۷)

اس کے جواب میں گاندھی جی نے جو تقریر کی وہ انتہائی اہم ہے۔ اس سے گاندھی جی کے اخلاص کا اندازہ ہوگا جو خلافت الٰہیہ سے تھا۔ گاندھی جی نے طالب علموں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''میں آپ لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ آپ اپنے ارادوں میں مستقل رہیے۔ جو پاؤں آگے اٹھ چکا ہے، پیچھے نہ ہٹائیے۔ اس وقت اسلام خطرے میں ہے۔ خلافت تباہ کر دی گئی ہے۔ مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی خودداری کو پنجاب میں شکست دے دی گئی ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمربستہ ہوں اور جو فرائض آپ کے ذمہ اسلام اور ہندوستان کے ہیں انھیں ادا کریں۔''

اساتذہ سے گاندھی جی نے کہا کہ '' وہ دینی تعلیم دیں جو طلبہ کو سچا مسلمان اور سچا ہندوستانی بنا دے۔ قومی مدرسوں کے جاری کرنے کا یہی مقصد ہے کہ ان میں سے ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو غلامی سے گریز کریں اور آزادی پر جان دیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام بنی نوع انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ بس اس مدرسہ کے اساتذہ و طلبہ میں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ پیدا کریں کہ جس پر مسئلہ خلافت اور سوراج کا دارومدار ہے۔ اور میں ایک چست ہندو ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ اسلام کی سلامتی بھی میرے پیش نظر اتنی ہی ہے جتنی ہندوازم کی ہے۔''

گاندھی جی کی اس مختصر تقریر سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

(۱) گاندھی جی بھی خلافت کے مسئلہ کو اولیت دیتے تھے۔ یہ چیز ان کے ہر بیان اور ہر تقریر میں نمایاں ہے۔

(۲) خلافت اور سوراج کے دو مقصد قرار پا چکے تھے اور دونوں کو ایک سلسلے میں جوڑ دیا گیا تھا۔ یعنی ممالک اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب انگریز کی نو آبادی کی طاقت اور غلامی ہند کی زنجیروں کو توڑا جائے۔

(۳) ہندوستان آزادی کامل کی جانب آہستہ آہستہ لیکن مضبوط قدم اٹھا رہا ہے۔

(۴) ہندو مسلم اتحاد کو ضروری قرار دے کر اس کے حصول کی عملی اور پر جوش جدوجہد شروع کر دی گئی۔ اس اتحاد کا اصول یہ تھا کہ مذہبی امور میں دونوں الگ الگ اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے ملکی معاملات میں سر جوڑ کر کام کریں۔ ضلع ضلع جس طرح ترک موالات کی تحریک پھیل گئی تھی ان کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی نے ''حیات سلیمان'' کے صفحہ ۲۲۱ پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو ہر ضلع پر قیاس کر لینا چاہیے۔

قومی مدرسہ اعظم گڑھ:

شاہ صاحب لکھتے ہیں:

ناگپور کانگریس کے بعد پورا ہندوستان ترک موالات کی تحریک سے گونج اٹھا اور یوپی میں اعظم گڑھ اس کا بڑا مرکز بن گیا۔ پورے ضلع میں خلافت کمیٹی کی شاخیں اور پنچایتیں قائم ہو گئیں۔ عدالتوں سے مقدمات قریب قریب ختم ہو گئے۔ شراب نوشی ختم اور شراب کی دوکانیں بالکل بند ہو گئیں۔ اس کا ٹھیکہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ ایک نیشنل اسکول بھی قائم ہو گیا تھا۔ اس میں دو سو طلبہ تھے۔ دارالمصنفین ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈروں کا مرجع بن گیا تھا۔ اعظم گڑھ کی تنظیم کا سہرا مولانا مسعود (علی ندوی) اور سید صاحب (یعنی سید سلیمان ندوی) کے سر تھا۔ سید صاحب زیادہ تر صوبہ اور آل انڈیا کے کاموں میں حصہ لیتے تھے اور خلافت اور کانگریس کے اہم اجلاسوں میں عموماً شرکت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں جتنے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے سب دارالمصنفین میں ٹھہرتے تھے۔ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، سب کی میزبانی کا شرف دارالمصنفین کو حاصل ہو چکا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تو دارالمصنفین مستقل مہمان خانہ تھا۔ جب یہ دونوں کانگریس

کے کاموں کے سلسلہ میں یو پی کے مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو دارالمصنفین ہی کو مرکز بناتے تھے اور کئی کئی دن یہاں ٹھہرتے تھے۔''

ایک کروڑ روپے کی فراہمی کی کہانی:

۳۱ / مارچ ۱۹۲۱ء کو بیزداڑہ ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی نے ایک وقت مقررہ کے اندر ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ گاندھی جی جیسا نبض شناس قوم اس ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اول یہ کہ کانگریس کے بڑھتے ہوئے کاموں کے لیے ایک معقول رقم اکٹھا ہو جائے اور دوسرے یہ کہ حکومت پر نفسیاتی اثر پڑے۔ گاندھی جی کا کتنا بڑا اثر قوم پر ہے اور کس طرح وہ کل ابنائے ملک کا اعتماد حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ اس میں اور زور پیدا کرنے کے لیے گاندھی جی نے پبلک کے بے انتہا جوش کے پیش نظر ایک کروڑ روپیہ کی فراہمی کے لیے ۳۱ / دسمبر ۱۹۲۱ء کا وقت بھی مقرر کر دیا تھا۔ لیکن گاندھی جی کی پکار کے بعد اس میں کیا دقت ہو سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ بڑے بڑے مہاجن گاندھی جی کو ''بلینک چیک'' دستخط کر کے دے رہے تھے اور ۳۱ / دسمبر ۱۹۲۱ء تک پورا ایک کروڑ روپیہ جمع ہو گیا۔

اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگریز نے اس کا سخت مقابلہ کیا اور پوری کوشش کی کہ ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو سکے۔ گاندھی جی کے اندر جو عظیم خود اعتمادی تھی اس کی بنا پر وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئے۔ لیکن بعض محبان آزادی کے حلقوں میں اضطراب نمایاں ہو گیا۔ اس سلسلے میں ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی، جلد اول کے صفحہ ۲۲۴ کا حسب ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

''اخبارات سے جو خبریں ہمیں ملتی تھیں اس سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کا اس میں کامیاب ہونا محال ہے۔ کانگریس کے دسمبر ۱۹۲۱ء کے سالانہ جلسہ میں کوئی ہفتہ باقی تھا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک کروڑ روپیہ ہونے کے لیے ابھی چند ایک لاکھ کی اور ضرورت ہے۔ ظاہراً یہ معلوم ہو رہا تھا کہ مقررہ تاریخ تک ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو سکے گا۔ اس لیے قبلہ مولانا صاحب (مولانا عبیداللہ سندھی) نے فیصلہ کیا کہ روسیوں سے مالی امداد مانگی جائے۔ مولانا نے روسی سفیر سے کانگریس کمیٹی کابل کے نام سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنی گورنمنٹ سے مالی مدد دے کر دسمبر ۱۹۲۱ء کے آخری ہفتہ سے پہلے جواب دے۔ روس نے باقی ماندہ چندہ ایک لاکھ روپیہ کانگریس کمیٹی

کابل کے ذریعہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کو دینا منظور کرلیا۔ جس کی مولانا نے کانگریس کو خبر دی مگر مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ایک کروڑ روپیہ پورا ہونے کی خبر پہنچ گئی۔ مولانا نے روسی سفیر کو خبر بھیج دی۔ اب روپے کی ضرورت نہیں رہی اور کانگریس کمیٹی کابل اس امداد کا شکریہ ادا کرتی ہے۔''

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل میں ہندوستان کی ایک عارضی حکومت اور انڈین نیشنل کانگریس کی ایک شاخ بھی بنالی تھی۔ اور اس عارضی حکومت کی طرف سے ہندوستان کی تمام انقلابی جماعتوں کو خبر دے دی تھی کہ جب ہندوستان پر حملہ ہو تو ابنائے ہند اس کا مقابلہ نہ کریں۔ انگریزوں کو ہر طرح سے قتل کریں انھیں۔ آدمی اور روپیہ سے مدد نہ دیں۔ ریل تار خراب کرتے رہیں۔ ہندوستان کی خبریں مشتہر کرنے کے لیے جمال پاشا نے وہاں کے اخبار کا فارسی ترجمہ کرا کے اشاعت کا انتظام کیا تھا۔

کھدر کی اسکیم اور پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ:

۱۸ر جولائی ۱۹۲۱ء کی ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی نے کھدر کی اسکیم پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ صرف مولانا حسرت موہانی مخالف تھے۔ انھوں نے کھدر کی بجائے سودیشی کی تحریک جاری کی...... انھوں نے کانپور میں اپنی سودیشی کپڑوں کی دوکان بھی کھولی تھی۔ اور وہاں شب و روز ہر آئندورند سے کھدر کی مخالفت اور سودیشی کی تائید میں اعداد وشمار کے حوالے سے تقریر فرماتے تھے۔ حسرت موہانی کی کانگریس اور عوام وخواص میں ان کی بوریہ نشینی، بے مثال جرات، حق گوئی، نشۂ آزادی وطن، صاف دماغی اور دیگر اخلاقی وروحانی خصائص کی وجہ سے بڑی عزت تھی۔ لوگ سنتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔ مگر یہ سب سعی لاحاصل نکلا۔

۳۱ر جولائی ۱۹۲۱ء کو اول بار عمر سوبانی کے میدان واقع محلہ پریل بمبئی میں بدیسی کپڑوں کی ہولی منائی گئی۔ لوگ ذوق وشوق سے بدیسی کپڑے لاتے اور آگ میں ڈالتے تھے۔ شعلے بلند ہو کر اپنی زبان سے پکار رہے تھے کہ غلامی کے تمام لوازمات نذر آتش کیے جارہے ہیں۔ اس کے بعد بدیسی کپڑوں کی ہولی منانا ایک عام طریقہ ہو گیا۔ کوئی شہر اور کوئی قریہ ایسا نہ تھا جہاں یہ کام نہ کیا گیا ہو۔

مہاتما گاندھی کا ملک گیر دورہ:

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مہاتما گاندھی کے ساتھ مسلسل دورے کر رہے تھے اور ہر جگہ

عظیم الشان جلسے ہوتے تھے۔ آدمیوں کی کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مولانا محمد علی کی تقریروں سے بڑا جوش وخروش پیدا ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی عظمت آسمان کو چھو رہی تھی۔ شہروں میں تقریباً روزمرہ جلسے ہوتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے۔ جن میں مقامی لیڈر تقریریں کرتے تھے اور عوام وخواص ہر ممکن قربانی کے لیے تیار تھے۔ پورا ملک بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ اس منظر کو جس نے دیکھا وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ اب خلافت اور سوراجیہ کی تحریک ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء ہند کے بھی جلسے ہوتے تھے اور ان میں تو گرمی ہی گرمی تھی۔ لیکن اب خلافت کے حصول کا ذریعہ بھی سوراجیہ قرار دیا گیا تھا اور کل ملک کی نگاہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے پر لگی ہوئی تھی۔ کانگریس کی اہمیت روز بروز ترقی کرتی جا رہی تھی۔ دوسری جماعتیں بھی اگرچہ بہت پرجوش تھیں اور انہیں کی بدولت یہ فضا پیدا ہوئی تھی۔ تاہم وہ معین ومددگار کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں سر سید احمد خاں نے اس لحاظ سے کہ مسلمانوں کا افلاس انگریزی حکومت کے مراحم خسروانہ سے ہی دور ہو سکتا ہے...... دو قومی نظریہ پیش کیا اور یہ اسکیم تیار کی کہ جہاں تک ہو سکے انگریز کو ہندوستان کا حکمراں رکھا جائے ورنہ اگر انگریز چلا گیا تو ہندو...... مسلم اقلیت پر غالب آ کر مسلمانوں کا مستقبل تباہ وبرباد کر دیں گے۔ اسی کا نام علی گڑھ تحریک تھا۔ یہ بھی میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تحریک خلافت ایک بجلی تھی جو علی گڑھ کے خرمن پر گری۔ مولانا محمد علی مذہبیت، دینداری، علم وفضل، انگریزی اور اردو کی بے مثال انشا پردازی، فن شعر گوئی کی مہارت، خطابت کے زور، اپنے خلوص ودیانتداری اور ایثار وقربانی جیسے محاسن اعلیٰ سے مزین تھے۔ اور وہ نظر بندی سے نکلنے کے بعد ہی ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن گئے تھے۔ جب وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستان کا طوفانی دورہ کرتے تھے تو ہر جگہ مہاتما گاندھی کی جے کے ساتھ مولانا محمد علی زندہ باد کے بھی نعرے لگتے تھے اور اللہ اکبر ہندو مسلمان دونوں پکارتے تھے۔

ایک دن کچھ گریجویٹ جیل بھیجے کلکٹر نے چیلنج کے لہجہ میں کہا۔ بہت خوب لے جاؤ ان کو انگلش کوارٹر میں۔ انگلش کوارٹر جیل کا سب سے آرام دہ مقام تھا۔ جہاں عمدہ غذا بھی ملتی تھی کیونکہ اس میں گورے رکھے جاتے تھے۔ دوسرے دن لالہ جی نے پھر پچاس گریجویٹ بھیجے۔ پھر کلکٹر نے وہی حکم دیا۔ اندازہ یہ تھا کہ دیکھیں ظرف ہندوستان کا؟ تیسرے دن بھی پچاس گریجویٹ۔ اب تو کلکٹر کے چہرے پر حیرانی اور خوف کے آثار نمایاں ہوئے۔ مگر پھر وہی حکم لے جاؤ انگلش

کوارٹر۔ چوتھے دن پھر پچاس گریجویٹ۔ اب کلکٹر ہمت ہار گیا اور کہنے لگا:

INDIA IS MAKING A SACRIFICE AND IF INDIA GOES ON MAKING THIS SACRIFICE WE SHALL HAVE NO OBJECTION IN LEAVING INDAI.

''ہندوستان قربانی دے رہا ہے اور اگر ہندوستان اسی طرح قربانی دیتا رہا تو ہم کو ہندوستان سے چل دینے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

ہتھکڑیاں بھی لگائی جاتی تھیں۔ اسی لیے مولانا سید محمد فاخر بیخود الہ آبادی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل جب گرفتار ہوئے تو ایک نظم کہی اس کا ایک شعر ہے:

بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلت نہیں
باپ دادا کا طریقہ سنت سجاد ہے

خواتین:

شروع تحریک سے خواتین بھی میدان میں آ گئی تھیں۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے قدم اٹھانے والی بی اماں تھیں۔ بی اماں کی گود میں علی برادران جیسے دلاور جانبازان اسلام نے پرورش پائی تھی۔ بی اماں بڑی ہی دیندار اور خدا پرست بی بی تھیں۔ یہ لوگ چھوٹے ہی تھے کہ بی اماں بیوہ ہو گئیں۔ یہ انھیں کا دل گردہ تھا کہ اس عالم میں ایسی تعلیم دلائی اور ایسی اسلامی تربیت دی کہ انگلستان جا کر اور انگریزی کے بہتری انشاء پرداز اور مقرر ہونے کے باوجود اسلامی معتقدات پر مضبوطی سے جمے رہے۔ بی اماں بوڑھی تھیں اور ان کو مالویہ جی وغیرہ بھی ماتا ہی کہتے تھے۔ وہ جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور کراچی کے مقدمہ کی سزایابی کے بعد تو وہ مکمل کام کرنے لگی تھیں۔ بیگم محمد علی برقعہ اوڑھتی تھیں اور اسی طرح انھوں نے مقدمہ کراچی کے بعد کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ تمام جلسوں میں جاتی تھیں اور تقریریں بھی کرتی تھیں۔ مولانا حسرت موہانی کے صرف ایک لڑکی تھی۔ مولانا حسرت موہانی برقع کے قائل نہیں تھے وہ صرف ایسا لباس پہننے کے قائل تھے جس میں سارا بدن چھپا رہے۔ بیگم حسرت مولانا اور ان کی صاحبزادی برابر جلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو لمبی چادریں اوڑھے دیکھا۔ اگرچہ برقع نہ ہوتا تھا مگر چہرہ یا جسم کا کوئی حصہ کبھی نظر نہیں آیا۔ ان کی تقلید میں بہت سی عورتیں پردہ سے باہر نکل پڑی تھیں۔ جلوس نکالتیں اور۔

دل پر چوٹ مارنے والے نعرے لگاتی تھیں۔

جہاں تک ہندو عورتوں کا تعلق ہے، گاندھی جی کا ایک خاص مشن پردے سے باہر نکالنا اور ملکی کاموں میں لگا دینا تھا۔ چنانچہ اس کا گہرا اثر ہوا۔ ہر عمر کی عورتیں نکل پڑیں اور جیل بھی کثرت سے گئیں۔ میں نے لاہور میں عورتوں کے جلوس کے دو گانے سنے جو بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئے۔ ایک کا مطلب یہ تھا کہ ''آگ لگے چولھے اور گھر کو، چل لکچر سننے''۔ دوسرے میں ڈاکیہ کو مخاطب کر کے بار بار کہا گیا تھا کہ خط آیا ہے کس کا ان لوگوں کا جو ملک پر قربان ہو کر جیل گئے تھے۔ مثلاً:

اے ڈاکیے اے ڈاکیے سننا، بتانا کیا آغا صفدر کا کوئی خط آیا ہے؟

اسی طرح خصوصی قیدیوں کے نام لیے جاتے تھے۔ یہ ہندو مسلم اتحاد اور دلوں کی صفائی کا بھی ایک مخصوص اور دلربا منظر تھا۔

الغرض یہ تھے حالات اور کاروان آزادی گاندھی جی کی قیادت میں ہر مشکل اور ہر مصیبت سے لاپرواہ منزل کی جانب چلا جا رہا تھا اور سارے ہندوستان کے علماء اور مسلم لیڈر گاندھی جی سے مل کر معاہدۂ سیورے کی ترمیم اور خلافت عظمٰی کی بحالی اور حصول سوراج کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

چند مثالیں:

ہندوستان کی جرأت و مردانگی و استقامت اور حکومت کی جابرانہ حرکات کا اندازہ اخبار زمیندار میں طبع ہونے والے چند واقعات سے ہوگا۔ مشتے نمونہ از خروارے پیش کیا جا رہا ہے:

۱۵ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مدیر ''پیغام'' کلکتہ کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں منظر علی سوختہ گرفتار کیے گئے اور اسی دن مولوی عبدالرحمٰن سیکریٹری مجلس خلافت کلکتہ میں گرفتار ہوئے۔ ایک کثیر مجمع نے حلف لیا کہ وہ کھدر پہنیں گے اور خلافت فنڈ میں ہر ماہ چندہ دیں گے۔

اسی دن کی خبر ہے کہ پنڈت ہنومان پرشاد سپاہی پلٹن ۷ نے بیان کیا کہ ان کی پلٹن کو جب وہ بصرہ میں مقیم تھی اخبارات کے ذریعہ کانگریس کے احکام موصول ہوئے اور بہت سے اشخاص ترک ملازمت کے لیے تیار ہو گئے۔ پلٹن کراچی واپس لائی گئی جہاں ان سب لوگوں نے استعفٰی

دے دیا۔

لاہور میں آٹھ آٹھ سال کے بچے ڈبی بازار میں گشت کر کے کہہ رہے تھے کہ فوج کی ملازمت حرام ہے۔ ان کو پولیس نے ڈنڈوں سے پیٹا۔

۲۰ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو روز نامہ انڈی پینڈنٹ الہ آباد کی دو ہزار روپیہ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اسی دن پنڈت مدن موہن مالوی کے بھانجے شری کرشن کانت مالوی گرفتار ہوئے۔

۲۲ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو پانچ سو رضا کار کلکتہ میں نکلے۔ ۲۵۳ گرفتار ہوئے۔

۲۵ ردسمبر کو مرتضیٰ احمد خاں نے ترکی خاتون فاطمہ خانم پر ایک نظم لکھی جس کے مجاہدانہ کارناموں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کا آخری شعر یہ ہے:

اے ننگ قوم مرد ہے غیرت کا یہ مقام
جنس لطیف عازم میدان جنگ ہے

۲۲ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو لالہ لاجپت رائے، کے سنتانم، ملک لال خان، ڈاکٹر گوپی چند کا مقدمہ سینٹرل جیل لاہور میں پیش ہوا۔ گورنمنٹ کے وکیل مسٹر ہربرٹ نے جب کہا کہ عدالت ان چاروں میں کسی پر بھی رحم نہ کرے اور جس قدر سزا کا اختیار ہے وہ کل سزا ان کو دے تو کے سنتانم نے کہا ''آمین'' مسٹر ہربرٹ نے کہا کہ لالہ لاجپت رائے نے اپنے پیغام میں جو ۳ ردسمبر کو صبح ۵ بجے کے وقت لکھا گیا تھا اور جس پر لالہ جی کے دستخط ہیں لکھا ہے کہ ہم جانتے تھے کہ اس جلسے کے انعقاد کی ممانعت کی جائے گی اور ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔ پھر یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ علم نہیں تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے فرمایا ''لیکن کہتا ہی کون ہے،' سنتانم نے کہا ''ہم جانتے تھے کہ ایک پاگل کتا موجود ہے ممکن تھا کہ وہ ہمیں کاٹتا۔''

۲۲ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو لالہ روپ لال سیکریٹری کانگریس کمیٹی شہر امرت سر کو چھ ماہ قید سخت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی اور سید برجیس سیکریٹری کانگریس فیروز پور کے مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ لالہ لاجپت رائے جالندھر کو صرف ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور بیس رضا کاران لاہور نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس کا جواب پبلک نے یہ دیا کہ دو گھنٹے تک اسی ممنوعہ راستہ سے گزرتے اور نعرے لگاتے رہے۔ اسی ۲۲ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو لالہ بدری ناتھ ایڈیٹر روز نامہ سوراج، لاہور پر حسب دفعہ ۱۲۴ تعزیرات ہند سزا سناتے ہوئے مجسٹریٹ نے کہا ''میں بدری ناتھ پر دفعہ ۱۲۴ تعزیرات ہند فرد جرم لگا رہا ہوں۔ عدالت میں اس کے رویہ کو دیکھ کر

میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ دیوانے کتے کے مانند ہے۔ جس کو زہر پھیلانے سے قید کے سوا کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میں اس کو تین سال قید با مشقت کی سزا دیتا ہوں۔

۲۰ ردسمبر کو مولانا محمد شفیق، محمد عبدالودود، بابو جھنک دھاری پرشاد، بابو وندھیاوری پرشاد ورما کا مقدمہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ صرف نو وکلاء کو اجازت دی گئی تھی کہ ایک بجے اذان ہوئی۔ عدالت نے نماز ادا کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مولوی محمد شفیق اور محمد عبدالودود نے وہیں کمرۂ عدالت میں نماز ادا کی اور کہا کہ پانچ سو رضا کار شہر میں گشت کرتے پھرے اور گھنٹہ بجا بجا کر اعلان کیا کہ لوگ کچہری کے احاطہ میں جمع ہوں۔ بابو تارکیسری پرشاد سیکریٹری گرفتار کر لیے گئے۔

۲۵ ردسمبر کو ہیڈ کانسٹیبل محمد اکبر جس نے تین دن ہوئے استغاثہ کی طرف سے گواہی دی تھی درخواست دی کہ میں نے جو بیان دیا ہے دباؤ اور ناجائز دباؤ سے دیا ہے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں استعفیٰ پیش کر دیا اور کہا کہ میرا ضمیر انگریزی حکومت کی ملازمت کی لعنت کو ایک منٹ بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اسے دفعہ ۲۹ پولیس ایکٹ کے ماتحت تین ماہ قید کی سزا دی گئی۔

دو لڑکوں محمد اعظم اور عبدالعزیز جو ۱۸، ۱۹ سال کے تھے، ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ کھدر کا پرچار کر رہے ہیں اور ایک ایک سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔

۲۶ ردسمبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار کے مقالۂ افتتاحیہ میں حسب ذیل عبارت ہے:

"پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کے دن سے تحریک کو بیش از بیش تقویت حاصل ہوئی ہے مقامی کانگریس کے دفتر میں عرضیوں پر عرضیاں چلی آ رہی ہیں۔ اور شہر کے باشندے رضا کاروں میں بھرتی ہونے کے لیے جوق در جوق آ رہے ہیں۔ شہزادہ ویلز کی تشریف آوری کے دن بغیر کہے ایسی مکمل ہڑتال ہوئی کہ الہٰ باد کے آسمان نے آج تک نہ دیکھی تھی۔

پریسیڈنسی کالج کلکتہ کے طالب علموں نے حکومت کے جبر و تشدد کے خلاف ۱۵ ردسمبر سے ۲۱ ردسمبر ۱۹۲۱ء تک مکمل ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ آنریبل سر دنو دمسٹر جسٹس سی، ای گھوش، ڈاکٹر سارت پاسک اور برائے بہادر جونی بی بہادر کے بیٹوں نے اس قرارداد کے حق میں رائے دی۔

زمیندار تبصرہ کرتا ہے:

"پنڈت مدن موہن مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو کے بیٹے تو عملی حصہ لے چکے ہیں، اب ان

حامیان موالات فرزندوں کا طرز عمل ملاحظہ ہو۔ یہ تو پڑاوے کا پڑا وخراب ہو چلا۔

۲۲ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو احمق پھپھوندوی مشہور مزاحیہ شاعر گرفتار ہوئے۔ کلکتہ کے دس ہزار قلیوں نے کام بند کر دیا۔

۲۴ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو شہزادہ ویلز کی آمد کلکتہ میں تھی۔ مکمل بائیکاٹ کا اشتہار دیا گیا اور ہو کا عالم پیدا ہو گیا۔

۲۶ ردسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۸ بجے اپنے مکان پر گرفتار ہوئے۔ مولانا کے اعزاز اور اتنے عظیم لیڈر کی گرفتاری کے ردعمل سے خوفزدہ ہو کر ایک کثیر تعداد میں پولیس کو لے کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خود معہ موٹر آیا تھا۔ مگر مولانا نے موٹر میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معمولی رضا کار کی طرح ہتھکڑی ڈال کر لے چلو۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے خود مولانا کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی اور لے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی گرفتاری کے بعد حسب ذیل پیغام دیا تھا۔

مولانا آزاد کا پیغام:

انتظار کی رات بڑی تاریک تھی لیکن امید کی صبح بھی کیسی دلفریب اور جانفزا ہے۔ افسوس ان پر جو اب بھی کروٹ نہ لیں۔ آؤ غفلت کا بستر ہمیشہ کے لیے تہہ کر دیں۔ خدا کا پاک نام لیں اور راہ مقصد میں آخری کوچ کریں۔ راستہ صاف اور منزل سامنے آرہی ہے۔ ہمت، صبر، قربانی، استقامت کے چند ایام میں صدیوں کا سفر طے ہو جائے گا۔

زہر و تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے

اَصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

(فقیر ابوالکلام، ۱۵۔ دسمبر ۱۹۲۱ء)

(پیغام۔ کلکتہ، ۱۰ ردسمبر ۱۹۲۱ء)

باپ کا خط بیٹے کے نام:

اللہ اکبر!

برخوردار سن اطیع اللہ خاں زاداللہ عمرہ وقدرہ

بعد دعائے ترقی عمرو درجات کے واضح ہو کہ شاباش فی الحقیقت مجھے مسرت ہوئی کہ خداوند

تعالیٰ نے تم جیسا بیٹا دیا۔ اپنی بات اور مذہب پر قائم رہنا۔ پائے ثبات لغزش نہ کھا جائے۔ کامیابی ضروری ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اپنے دوستوں کو جو جیل میں ہیں میری مبارکباد اور دعا پہنچا دینا کیونکہ وہ بھی میرے بچے اور بھائی ہیں اور اللہ تمھاری اور سب کارکنان خلافت کی مدد کرے۔ آمین، ثم آمین۔

راقم چودھری حبیب اللہ خاں

(تحریک خلافت: ص ۹۶۔۱۹۱)

رئیس قصبہ سہاور، ضلع ایٹہ، ۲۵ر دسمبر ۱۹۲۱ء

تحریک خلافت پر تبصرہ ۱۹۲۲ء

جگراؤں میں چند رضا کار گرفتار ہوئے تو دس ہزار کے مجمع نے ان کا استقبال کیا۔ ۳ر جنوری ۱۹۲۲ء کو کرشن کانت مالوی اور گووند مالوی اپنے رفقاء سمیت پھر گرفتار ہوئے۔ ۸ر جنوری ۱۹۲۲ء کو ولنگٹن اسکوائر کلکتہ میں رضا کاروں کی بھرتی روکنے کے لیے ایک یورپین کمشنر، ایک ہندوستانی ماتحت افسر اور سارجنٹ نے دھاوا بول دیا۔ جس پر ہزاروں آدمی رضا کار بنے اور دوسرے چار سو رضا کاروں نے گشت کیا۔ جس میں ۱۶۹ گرفتار ہوئے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۲۲ء کو علی گڑھ میں سب انسپکٹر نے رضا کاروں سے منتشر ہونے کو کہا۔ رضا کاروں کے لیڈر عبدالحمید خاں نے جواب دیا کہ تم اگر اس ریاکار حکومت کے اتنے دلدادہ ہو تو کیا ہم امور مذہبی اور احکام الٰہی سے سرمو سرتابی کر سکتے ہیں۔ اس پر پولیس والوں نے بندوق کے کندوں، بوٹ کے ٹھوکروں اور ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا اور عبدالحمید خاں نے کہہ دیا کہ بیٹھ جاؤ اور یہ شعر پڑھا:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور قومی نعرہ لگا کر سب بیٹھ گئے۔ سب انسپکٹر نے قریب ایک فرلانگ پیٹ اور ہتھیلیوں کے بل گھسیٹا لیکن ان کے ابرو پر بل نہ آیا۔ حتیٰ کہ ایک رضا کار صادق علی کو ایک دکاندار کے جلتے ہوئے تیل کی کڑھائی میں دھکیل دیا۔ جس سے اس کا جسم جل گیا۔ جو رضا کار مار سے بے ہوش ہو جاتا اس کو اٹھا کر دفتر بھیج دیا جاتا تھا۔ مگر نہ کوئی بھاگا اور نہ کوئی ہاتھ اٹھا۔ (ایسے واقعات عام

تھے)

۶ر جنوری ۱۹۲۲ء کو ۲۴ رضا کاروں کا دستہ پنڈت پریم پرکاش اور ماسٹر دیارام کی سرکردگی میں نعرے لگاتا ہوا امرتسر میں نکلا۔ پولیس اور گورکھا فوج کا ایک زبردست دستہ لاٹھیوں اور بندوقوں سے مسلح وہاں پہنچا اور نہایت بے دردی سے بید اور لاٹھیوں سے مضروب کیا۔ پنڈت پریم پرکاش کو سخت ضرر آئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ مگر رضا کاروں کے دوسرے دستوں نے برابر گشت جاری رکھا۔

۱۸ر جنوری ۱۹۲۲ء کو مولوی منظور احمد صاحب مبلغ جامعۂ اسلامیہ کو رہا کرتے ہوئے مجسٹریٹ نے مسکرا کر کہا کہ ہمارے پاس ڈپٹی کمشنر کا حکم آیا ہے کہ آپ ساڑھے تین ہفتے جیل گزار چکے ہیں۔ ہم آپ کو زیادہ دیر جیل میں رکھنا نہیں چاہتے۔ مولوی منظور احمد نے جواب دیا۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ مجھے آپ روکتے ہیں کہ چھوڑتے ہیں۔ میں تو ایک دو سال جیل میں گزارنے کی امید رکھتا ہوں۔

شراب کی دکانوں پر خریدار اب نہیں ملتے تھے۔ شراب کی دکانوں پر مسلسل پہرے کا یہ اثر تھا جو کانگریسی والنٹیر جاری رکھے ہوئے تھے ۲۳ر جنوری ۱۹۲۲ء کو اکالی پریس اور سیاست پریس کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

۱۹ر جنوری ۱۹۲۲ء: مولانا ابوالکلام آزاد کی گرفتاری پر ظفر علی خاں نے منٹگمری (حال ساہی وال) جیل سے حسب ذیل نظم بھیجی جو مسلم کے فرضی نام سے ۱۹۔ فروری ۱۹۲۲ء کو زمیندار میں طبع ہوئی۔

توبہ کو میں بھی توڑ دوں بادہ جو خانہ ساز ہو
اس میں ملی ہوئی مگر چاشنی حجاز ہو
لا وہ دو آتشہ شراب جس سے ہو گرم خوں مرا
ساقی انجمن نواز عمر تری دراز ہو
بزم میں روشنی ہوئی شمع جہاں پگھل گئی
کیوں نہ دعا میں ہو اثر دل میں اگر گداز ہو
کفر کی شوخیوں کو دیکھ تا کہ ہو خوں ترا جگر
خون جگر سے کر وضو تا کہ تری نماز ہو

آئے ابوالکلام بھی ہو کے اسیر جیل میں
تاکہ دراز رشتہ خلوتیانِ راز ہو
(تحریک خلافت از قاضی عدیل عباسی)

کیرالا میں ترک موالات کی تحریک:

حکومت کی شروع ہی سے خواہش تھی کہ اس علاقہ پر عدم تعاون اور قومی تحریک کا اثر نہ ہونے پائے۔ لیکن باوجود حکومت کی ان کوششوں کے کیرالہ میں یہ تحریک جا پہنچی اور وہاں کے لوگوں نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ فروری کے مہینے میں شری یت سی، راجگوپال آچاریہ اور مولانا یعقوب حسن ایسے مشہور لیڈروں نے اس علاقہ کا دورہ کیا۔ انھوں نے جابجا عدم تعاون اور عدم تشدد کی تحریک اور تعلیم کا پرچار کیا۔ اس پرچار کے سلسلہ میں مولانا یعقوب حسن مادھون نائر، گوپا مینن وغیرہ اصحاب گرفتار کر لیے گئے۔ یہ گرفتاریاں عدم تعاون کی تحریک کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ اوناپلیم اور دیگر کئی قصبات میں جلسے کیے گئے اور لوگوں نے کمال ہمت کا ثبوت دیا۔ ان جلوسوں وغیرہ میں عدم تشدد کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس نے قومی کارکنوں کے حوصلے بڑھا دیے۔ اسی سال اگست کے مہینے میں حکومت نے اس علاقہ میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر کے عوام کو مشتعل کر دیا۔ وہ مسجدوں کے اماموں کی ہتک سے غصہ میں آکر تشدد پر اتر آئے اور بڑھتے بڑھتے یہ شورش انتہا کو پہنچ گئی۔

چنانچہ اکتوبر کے وسط میں سخت قسم کا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

اس علاقہ کے تمام انگریزوں کی زندگیاں خطرہ میں تھیں۔ اس وقت مسٹر ایم پی نرائن مینن جنھوں نے اس علاقہ میں کانگریس کی تنظیم کی تھی اور جنھیں موپلوں میں غیر معمولی رسوخ حاصل تھا موقع پر آئے۔ موپلوں کو پرامن رہنے کی تلقین کر کے متعدد انگریزوں کی زندگیاں بچائیں۔ سیاسی ورکرز کو پہلے تو شاہی قیدی کی حیثیت میں گرفتار کیا گیا۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ (تواریخ کانگریس از ڈاکٹر بی۔ پٹابھائی سیتارامیہ، لاہور، (۱۹۳۶ء) ص ۴۹۔۳۴۸)

حکومت نے شیخ الاسلام کو مرادآباد اور کراچی کی تقریروں کا حوالہ دیتے ہوئے (ستمبر ۱۹۲۱ء میں) گرفتار کر لیا اور خالق دینا ہال میں مقدمہ کی سماعت شروع کر دی۔ ہال کے چاروں طرف

خاردار تار لگادیے گئے اور ڈیڑھ سو پولیس کا پہرہ لگادینے کے بعد باہر سڑک پر پولیس اور فوج کھڑی کردی گئی۔ تاکہ عوام قریب جانے سے خوف کھائیں۔ ٹھیک گیارہ بجے شیخ الاسلام کو پولیس لاری میں لاکر اس عدالت میں پیش کیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ الزام یہ لگایا کہ مولانا نے اپنی تقریروں میں فرمایا ہے کہ ملک معظم کی فوج میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے۔ ایسے فتویٰ سے پوری فوج میں بغاوت پھیل سکتی ہے۔

عدالت میں مولانا مدنی نے صاف صاف بیان دیا کہ برطانیہ کی فوج میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے کیونکہ لارڈ جارج نے اور مسٹر چرچل نے اس سے پہلے یہ اعلان کردیا تھا کہ یہ جنگ اسلام اور برطانیہ کی جنگ ہے۔

شیخ الاسلام مولانا مدنی نے فل اسکیپ کے ۲۵ صفحات پر مشتمل اپنا بیان قلمبند فرمایا۔ بیان کے کچھ حصے آپ کے سیاسی مذاق کے نشو ونما اور سیاسی خیالات ورجحانات سے متعلق ہیں۔ کچھ حصوں میں انگریزوں کے اقوال ہیں۔ جن کو بطور شواہد پیش فرمایا ہے۔

مجسٹریٹ نے کہا کہ آپ نے تقریر کے شروع کے حصے میں ایسے بھی جملے استعمال کیے ہیں جس سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی سرکار ہندو مسلمانوں کو لڑانے کا باعث ہے اور آپ کی کل تقریر سے انگریزی سرکار کی طرف سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

شیخ مدنی صاحب نے کہا کہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خود غرضی اور نفاق پھیلانے والے کہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑائی بھڑائی ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ مذہب کا یہی تقاضا ہے کہ سچائی کو پس پشت نہ ڈالا جائے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب مرحوم بہت متعصب بادشاہ تھا۔ ہندوؤں اور غیر مسلموں پر اس نے مذہب کے تعصب کی بناء پر بہت ظلم کیے ہیں اور ان دونوں فرقوں میں کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب اعتراضوں کو دور کرنے اور غلط ثابت کرنے کے لیے ایک مشہور انگریز کپتان سیاح الیگزینڈر ہمرٹن کا قول پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ شخص شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور یہاں ۵۵ برس مقیم رہ کر واپس چلا گیا۔ اس نے اپنا سفر نامہ دو جلدوں میں لکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ عدالت میں ایسا بیان دینے کے بعد مولانا کا بے قصور ثابت ہوکر بچ نکلنا ناممکن تھا۔ چنانچہ عدلیہ نے مولانا کو دو سال کی سزا تجویز کی اور جیل بھیج دیا گیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

آل پارٹیز کانفرنس:

۱۴؍جنوری ۱۹۲۲ء: گورنمنٹ کا جبر وتشدد ان لوگوں کے لیے بھی نا قابل برداشت ہو گیا جو حکومت کے مخالف نہ تھے۔ یعنی تحریک موالات کے حامی نہ تھے۔ چنانچہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح نے ایک آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں ۱۴؍جنوری ۱۹۲۲ء کو منعقد کی جس میں تین سو ڈیلیگیٹ آئے۔ حامیان ترک موالات کو بطور مدعو دین خصوصی مدعو کیا گیا۔ سر سنکرا نائر اس کانفرنس کے چیرمین قرار دیے گئے۔ این سی کیلکر کی تجویز پر مہاتما گاندھی سب تارکان موالات کی طرف سے واحد مقرر رہے۔ بانیان کانفرنس نے ایک مسودہ گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان صلح کا مرتب کیا تھا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں پنجاب، خلافت اور سوراج کا مسئلہ زیر بحث آ کر طے کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے کہا کہ کوئی گفتگو اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کل قیدی رہا نہ کر دیے جائیں۔ اس مسودے میں علی برادران اور دوسرے قیدیوں کی رہائی کا ذکر نہیں ہے۔ اسے ہونا چاہیے۔ اور گورنمنٹ کے جبر و تشدد کی مذمت ہونی چاہیے۔ کانفرنس کا رخ دیکھ کر چیرمین صاحب کرسی چھوڑ کر بھاگ گئے اور ان کی جگہ سر وسیواں سرن چیئرمین بنائے گئے۔ ۱۷؍جنوری ۱۹۲۲ء کو آخری فیصلہ ہوا۔ مسودہ میں جبر کی مذمت اور قیدیوں کی رہائی بطور شرط اولین شامل کر دی گئی۔ اس پر گاندھی جی نے عارضی طور پر تحریک ترک موالات کو ملتوی کر دیا۔ ۱۶؍جنوری ۱۹۲۲ء سے جناح صاحب اور مالوی جی تار پر تار وائسرائے کو دیتے رہے مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر کار ۳۰؍جنوری ۱۹۲۲ء کو ایک خط ملا جس میں وائسرائے نے ان شرائط کو ماننے سے مجبوری ظاہر کی تھی۔ اب تحریک پھر جاری ہو گئی اور یہ سب کوششیں بے سود رہیں۔

یکم فروری ۱۹۲۲ء: ۲۹؍جنوری کو بار دولی کے چار ہزار کھدر پوش باشندوں نے حلف اٹھایا کہ وہ ٹیکس ادا نہ کرنے کو تیار ہیں اور قید و بند یہاں تک کہ موت بھی بلا خوف و خطر قبول کر لیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگ گاندھی جی کے ساتھ جنوبی افریقہ کی جدوجہد میں شریک رہ چکے تھے۔ گاندھی جی کے اشارۂ ابرو پر اب یہ تحریک شروع ہو سکتی تھی۔ یکم فروری کو مہاتما گاندھی نے لارڈ ریڈنگ کو الٹی میٹم دیا: ''اگر سات روز کے اندر اندر قیدیوں کو رہا نہ کیا گیا اور اخبارات کو آزادی نہ دی گئی تو ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع ہو جائے گی۔'' ریڈنگ نے جواب دیا کہ حکومت اپنے موقف پر

ثابت قدم رہے گی۔ گاندھی جی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہندوستان میں پہلے ہی اس کا اشتیاق پایا جاتا ہے۔'' (مسلم افکار۔۱۷۔۱۷۰)

بردولی میں پھر سول نافرمانی:

۲۹ر جنوری ۱۹۲۲ء کو ولبھ بھائی پٹیل نے بردولی میں سول نافرمانی کے آغاز کرنے کی اجازت طلب کی۔ چار ہزار نمائندوں کے سامنے جن میں پانچ سو عورتیں بھی تھیں پٹیل صاحب نے ایک سنجیدہ اور ٹھوس تقریر کی اور سب سے عدم تشدد کا حلف لیا۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۲۲ء کو ورکنگ کمیٹی نے بردولی میں عام سول نافرمانی کرنے کی اجازت دے دی۔ بردولی کی آبادی ۸۷ ہزار تھی۔ مہاتما گاندھی نے یکم فروری ۱۹۲۲ء کو وائسرائے کو الٹی میٹم دیا کہ پنجاب خلافت اور سوراج کا مسئلہ حل کیا جائے ورنہ بردولی میں عام سول نافرمانی شروع کی جائے گی۔ ۶ر فروری ۱۹۲۲ء کو وائسرائے نے ایک کمیونک شائع کیا جس میں گاندھی جی کے مطالبات کو بدلائل ماننے سے انکار کر دیا۔ ۷ر فروری ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی نے اس کا جواب دیا اور گورنمنٹ جو جبر و تشدد کر رہی ہے اور وائسرائے نے جس سے انکار کیا تھا اس کی مثالیں پیش کیں جو حسب ذیل تھیں؛

(۱) کلکتہ میں نہتوں پر گولی چلائی گئی۔

(۲) سول گارڈز نے وحشیانہ سلوک پبلک کے ساتھ کیا۔

(۳) ڈھاکہ اور علی گڑھ میں تمام پرامن جلسے زبردستی منتشر کیے گئے۔

(۴) بہار کے بہت سے گاؤں لوٹ لیے گئے۔

(۵) کانگریس اور خلافت کے والنٹیروں کو بہت جگہ شدت سے زد و کوب کیا گیا۔

(۶) سون پور میں کھدر اور کانگریس اور خلافت کے دفتروں کے کاغذات جلا دیے گئے۔

(۷) آدھی رات کو کانگریس اور خلافت کے دفتروں کی تلاشی لی گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب خط کتابت گاندھی جی بردولی سے کر رہے تھے۔ جہاں وہ خود عام سول نافرمانی کی قیادت کے لیے موجود تھے۔ اب کل مسالہ تیار تھا صرف سگنل دینا تھا کہ ایک خطرناک رکاوٹ آ گئی۔ (تحریک خلافت، ص ۲۴۳۔۲۴۱)

حکیم محمد اجمل خان نے اپریل ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتہ میں ہی خطاب اور تمغات کی گراں باری کو اتار پھینکا تھا۔ گاندھی جی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو ان سے نجات حاصل کی۔ قیصر ہند گولڈ میڈل،

افریقہ میں خدمت انسانیت سرانجام دینے کے سلسلہ میں ملا تھا۔ زولو وار میں وہ انڈین ایمبولینس کور کے افسر انچارج تھے۔ انھیں تمغہ ملا اور بوئر وار (۱۹۰۰۔۱۸۹۹ء) میں سپرنٹنڈنٹ انڈین اسٹریچر بیرر کور تھے تو تمغہ ملا۔ انھوں نے وائسرائے کو لکھا کہ ان تمغات کو میں کیسے استعمال کر سکتا ہوں جب ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی اس ظلم کے نیچے کراہ رہے ہیں جو ان کے مذہبی جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ پنجاب میں جبر و استبداد کا جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا وہ ایک مزید وجہ اس طریقۂ عمل کی ہے۔ انھوں نے خط میں حکومت برطانیہ سے اپنی وفادارانہ خدمات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ اب وفادار نہیں رہ سکتا اس لیے وہ سب تمغات واپس کر رہا ہوں۔

جنوری ۱۹۲۱ء میں سیٹھ جمنا لال بجاج نے رائے بہادر کا خطاب واپس کر دیا۔ وہ ناگپور کانگریس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ انھوں نے عدالتوں کا مقاطعہ کرنے والے وکلا کی امداد کے لیے ایک لاکھ روپیہ چندہ قومی فنڈ میں دیا۔ سوراجیہ فنڈ اسی مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس سے عدم تعاونیوں کی امداد کی جاتی تھی۔ مستحق قومی سیواداروں کو ایک سو روپے ماہوار تک گھریلو اخراجات کے لیے دیے جاتے تھے۔

ہندوستانی فوج کی پلٹن نمبر ۱۷ ان دنوں بصرہ میں تعینات تھی۔ پنڈت ہنومان پرشاد کا تعلق اس پلٹن سے تھا۔ اس نے بتایا کہ جب کانگریس کے فیصلے کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ بصرہ پہنچی تو بہت سے اشخاص ملازمت ترک کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ صورت حال حکومت کے لیے سخت تشویشناک تھی۔ فوج میں نقب لگنا معمولی واقعہ تو نہیں تھا۔ پلٹن کو کراچی پہنچا دیا گیا۔ یہاں سب مستعفی ہو گئے۔ (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۱۰۹)

۲ر فروری ۱۹۲۲ء: حسن امام نے تحریک خلافت میں حصہ لینے اور ترک موالات کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے اپنی پریکٹس چھوڑ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس سلسلے میں گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ مولانا ظفر علی خان جو ان دنوں منٹگمری (موجودہ ساہیوال) جیل میں قید تھے، اس سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور حسن امام کے بارے میں ایک نظم لکھی جو ۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو روزنامہ زمیندار، لاہور میں ''امام تسبیح'' کے عنوان سے شائع ہوئی:

وہ صبح صبح نہیں ہے وہ شام شام نہیں
بلائے تازہ کا جو لا رہی پیام نہیں
کھنچی ہوئی ہے ملیبار میں مہینوں سے

وہ تیغ اب بھی جو شرمندۂ نیام نہیں
کسی کو دار پر کھینچا، کسی کو ذبح کیا
یہ اور کیا ہے ہمارا جو قتل عام نہیں
بہ وقت ذبح وہ بسمل سے کہتے جاتے ہیں
یہ انتظام حکومت ہے، انتقام نہیں
گریز ابھی سے کہاں ہو ابھی تو ہے تشبیب
قصیدہ ان کی جفا کا ہوا تمام نہیں
وہ کون ہے جو نہیں آج کل اسیر فرنگ
سی آر داس نہیں یا ابوالکلام نہیں
تمام ملک ہے جکڑا ہوا شکنجے میں
پھراس پہ کہتے ہیں ہندوستاں غلام نہیں
بہ حسرت اس پر کہا ایک دوست نے مجھ سے
کہ اس گروہ میں شامل حسن امام نہیں
کسی سے جبکہ وہ رندی میں کم نہیں ہیں تو کیوں؟
شکست توبہ میں سرگرم اہتمام نہیں؟
وکیل بھی ہیں تو ننکانہ کے مہنت کے ہیں
یہ اُن کے واسطے کیا شرم کا مقام نہیں
اگر حرام موالات مجھ غریب پہ ہے
تو ایسے چوٹی کے لیڈر پہ کیوں حرام نہیں؟
کہا یہ دوست سے میں نے وہ مرغ دانا ہیں
حریصِ دانا ہیں لیکن حریصِ دام نہیں
نہیں ہے قائد قوم اپنی قید کا قائل
"شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں"

(یہ نظم مولانا ظفر علی خان کے مجموعہ کلام "حبسیات" میں شامل ہے۔ص ۶۱)

۵ر فروری ۱۹۲۲ء: ۵ر فروری ۱۹۲۲ء کو چوراچوری (ضلع گورکھپور۔ یوپی) میں تقریباً دو ہزار دیہاتیوں نے جن کی رہنمائی رضا کار کر رہے تھے ایک تھانے پر حملہ کر دیا اور تھانے کو آگ

لگادی۔ جس میں ۲ سب انسپکٹر، ۱۸ کانسٹیبل اور ۲ چوکیدار اپنی جانوں کو گنوا بیٹھے۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے ۱۱۔۱۲ر فروری کو باردولی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ بلائی اور صورت حال کے پیش نظر سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دینے کا فیصلہ کیا، جس کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس دہلی مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۲۲ء میں توثیق کر دی گئی۔ (۱) ۲۶ر فروری کو خلافت کمیٹی نے اپنے جلسۂ دہلی میں، ۵ر مارچ کو جمعیۃ کے جلسۂ اجمیر میں اور پھر ۲۶۔۲۷ر مارچ کو مجلس خلافت کی ورکنگ کمیٹی نے باردولی رزولیشن کی توثیق کر دی۔ (۱)

باردولی اور دہلی کانگریس کی تجاویز کو جمعیت علماء کے اجلاس اجمیر میں ۵۔ مارچ ۱۹۲۲ء کو منظور کیا گیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محل نے اس اجلاس میں بہت سچے جذبات اسلامی کا اظہار کیا اور پر جوش تقریر کی۔ لیکن جمعیت کو حالات کی روشنی میں باردولی اور دہلی کانگریس کی تجاویز کی توثیق کرنی پڑی اور مولانا عبدالباری کو بھی آئندہ اپنے رویے کے بارے میں یقین دلانا پڑا کہ وہ ان تجاویز کے مفہوم کی پوری پابندی کریں گے۔ (۲)

نئے حالات کے مطابق اگر چہ تحریک کی سرگرمی ختم ہو گئی تھی لیکن عوام کو بددلی سے بچانے اور تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے اپنا منشور شائع کیا۔ جسے خلافت کمیٹی نے بھی منظور کر لیا۔

چوری چورا کا واقعہ:

۵ر فروری ۱۹۲۲ء: ۸ر فروری ۱۹۲۲ء کے صبح کے اخبار میں گاندھی جی نے چوری چورا کے واقعہ کی تفصیل پڑھی، جو ۵ر فروری کو پیش آیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ چوری چورا میں ایک پر امن جلوس نکلا اور ختم ہو گیا۔ بعد کو کچھ لوگوں سے اور کانسٹیبلوں سے گرم گرم بات چیت ہو گئی۔ کانسٹیبلوں نے بندوق سنبھالی اور فائر کرنا شروع کر دیا اور جب تک ایک کارتوس بھی باقی تھا گولی چلاتے رہے۔ جب گولی ختم ہو گئی تب بھاگ کر تھانہ میں پناہ لی۔ مجمع اس پر سخت مشتعل ہو گیا اور اس نے تھانہ کو گھیر لیا اور تھانہ کو آگ لگادی۔ آگ لگانے پر کانسٹبلان باہر نکلے تو ۲۲ کانسٹیبلوں کو ٹکڑے ٹکڑے

---

(۱) بام فورڈ، پی سی، ہسٹریز آف دی نان کوآپریشن اینڈ خلافت موومنٹس، دہلی، دیپ پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء، ص ۶۹۔۷۰۔۱۹۰۔۱۹۱

(۲) ایضاً ص ۷۴ (۳) ایضاً ص ۱۹۲

کر ڈالا اور ان کے جسم کے ٹکڑے آگ میں پھینک دیے اور وہ جل کر خاک ہو گئے۔

گاندھی جی اس خبر کو پڑھ کر نڈھال ہو گئے۔ تحریک ان کی عزت کا معاملہ تھی۔ اس کو روکنا اور ایسی حالت میں جب کہ وہ وائسرائے کو چیلنج دے چکے تھے بہت ہی تکلیف دہ بات تھی۔ وہ سوچتے رہے اور آخرکار انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ شیطان کی آواز ہے، وہ مجھے غرور کی تعلیم دے رہا ہے۔

گاندھی جی نے اعلان کیا کہ بردولی کی سول نافرمانی ملتوی کی جاتی ہے۔ ۱۶ر فروری کے ینگ انڈیا میں انھوں نے لکھا کہ خدا نے مجھے تین مرتبہ متنبہ کیا۔ اول بار جب رولٹ بل ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں احمد آباد، ورگھام، امرتسر اور قصور نے تشدد پر عمل کر کے غلطیاں کیں اور میں خدا کے سامنے ذلیل ہوا۔ میں نے تسلیم کیا کہ مجھ سے ہمالیہ پہاڑ جیسی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دوبارہ بمبئی میں اور اب چوری چورا میں یہ حادثے پیش آئے۔ چنانچہ انھوں نے بطور تزکیہ نفس و سزا پانچ دن کے برت کا اعلان کیا۔

بردولی میں سول نافرمانی روکنے کا ساتھیوں اور پیروؤں پر بہت اثر پڑا۔ ہر شخص تلملا رہا تھا۔ جواہر لال نہرو نے جیل سے گاندھی جی کو احتجاج کے خطوط لکھے۔ سارے ملک میں مایوسی چھا گئی۔ چھوٹے بڑے اپنے پیرائے میں مضطرب تھے۔ مگر گاندھی جی اپنی جگہ مطمئن تھے۔ وہ سب کو جواب دیتے تھے کہ تحریک عدم تشدد کے ساتھ ہی چل سکتی ہے اور قوم میں ابھی عدم تشدد پیدا نہیں ہوا۔ لوگ کہتے تھے کہ بردولی چوری چورا سے بہت دور ہے۔ بردولی نے کیا کیا تھا۔ گاندھی جی کا جواب تھا کہ صرف بردولی ہندوستان نہیں ہے۔ بردولی سے شروع کر کے پورے ملک میں یہی کام کرنا ہے۔ جب تک پورا ہندوستان تیار نہ ہو ایک جگہ عام سول نافرمانی کیا کر سکے گی۔ (تحریک خلافت، ص ۴۴ـ ۲۴۳)

۹ر فروری ۱۹۲۲ء: جمعیۃ علماء کی پہلی مجلس عاملہ پہلی مرتبہ ۹ـ ۱۰ر فروری ۱۹۲۲ء بمقام دہلی بنائی گئی اس کے ارکان حسب ذیل تھے:

(۱) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب
(۲) مولانا عبدالحلیم صدیقی صاحب
(۳) مسیح الملک حکیم اجمل خاں
(۴) مولانا شبیر احمد عثمانی
(۵) مولانا عبدالماجد بدایونی
(۶) مولانا مظہر الدین از برالامان
(۷) مولانا عبدالقادر قصوری
(۸) مولانا حسرت موہانی
(۹) مولانا احمد اللہ پانی پتی
(۱۰) مولانا آزاد سبحانی

(۱۱) مولانا عبدالقدیر بدایونی (۱۲) مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی

(تحریک خلافت، ص ۱۶۱)

گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی:

عدم تعاون کی تحریک کو عدم تشدد کی بنیاد پر استوار کرنے کا کام جاری تھا اور یہ کوششیں ہو رہی تھیں کہ عوام کو ہر حال میں عدم تشدد پر کاربند رہنے کا پابند بنایا جائے۔ ۵ر فروری ۱۹۲۲ء کو چوری چورا کے مقام پر کانگریس کا ایک جلوس نکلا۔ پولیس اس سے بھڑ گئی۔ مظاہرین اشتعال میں آ گئے۔ انھوں نے اکیس سپاہیوں اور ایک انسپکٹر کو دھکیل کر تھانے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور تھانہ کی عمارت نذر آتش کر دی۔ اس سے تمام پولیس والے جل کر بھسم ہو گئے۔ قبل ازیں بمبئی اور مدراس میں بھی تشدد آمیز واقعات رونما ہو چکے تھے۔ ان واقعات نے گاندھی جی کو سول نافرمانی واپس لینے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ۱۲ر فروری کو باردولی کی ورکنگ کمیٹی میں سول نافرمانی کو معطل کرنے کے محرکات یہی تھے۔ ۲۱۔ ۲۵ر فروری کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو سول نافرمانی کی اجازت دینے کا ریزولیشن پاس نہ ہو سکا۔ چنانچہ سول نافرمانی کی طرف سے توجہ ہٹا کر عدم تشدد کی تسلی بخش فضا پیدا کرنے پر زور دیا گیا۔

کانگریس کی اعلیٰ قیادت جیلوں میں پڑی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں عدم تعاون اور خلافت کے کارکن بھی قید تھے۔ وہ سول نافرمانی کے واپس لینے کے فیصلہ سے سخت برہم ہوئے۔ لالہ لاجپت رائے اور پنڈت موتی لال نہرو نے جیل سے تفصیلی خطوط گاندھی جی کو لکھے۔ جن میں ان کے فیصلہ سے شدید اختلاف کیا گیا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے اس فیصلہ پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر کیپ کماری کے نزدیک کوئی گاؤں عدم تشدد کے عقیدہ پر کاربند نہیں رہا تو اس کی سزا ہمالیہ کی ترائی میں آباد گاؤں کو کیوں دی جائے؟'' ان کی رائے تھی کہ چوری چورا کو علیحدہ کر دیں لیکن سول نافرمانی بند نہ کریں اور تحریک کو بدستور جاری رکھیں۔

۲۲ر فروری ۱۹۲۲ء، دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے چند ممبران جمع ہوئے۔ ان کی موجودگی میں یہ چٹھی پڑھی گئی۔ گاندھی جی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جو لوگ جیلوں میں ہیں وہ مر چکے ہیں۔ ان کو مشورے اسمگل کرنے کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔''

اب بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ حکومت نے انتشار سے فائدہ اٹھایا اور ۱۳؍مارچ کو گاندھی جی کو گرفتار کرلیا۔ گاندھی جی نے بمبئی، مدراس اور چوری چورا کے تشدد کے واقعات کی ذمہ داری قبول کی اور کہا "میں جانتا ہوں کہ میں آگ سے کھیل رہا ہوں اور میں اس خطرہ میں گھر گیا ہوں، اگر میں رہا کر دیا گیا تو پھر وہی کروں گا جو پہلے کرتا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو اپنے فرض سے کوتاہی برتوں گا۔ یہ میرے عقیدہ کی آخری چیز ہے۔"

گاندھی جی کو چھ سال کی سزا ہوئی۔ حال آں کہ انھوں نے ۹؍مارچ کو "ینگ انڈیا" "میں اگر میں گرفتار ہو گیا؟" کے زیرعنوان مضمون میں لکھا تھا کہ "موجودہ پُرتشدد حالات سول نافرمانی "سول" نہیں بلکہ فوجداری نافرمانی ہوگی۔" (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۱۱۰۔۱۱۱)

تحریک عدم تعاون کا التوا:

مہاتما جی کی اس منظوری کو مکمل نہ سمجھا گیا، لیکن ایک سب کمیٹی تمام حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے لیے مقرر کی گئی۔ انھی ایام میں ایک گاؤں میں جہاں یہ مہم شروع تھی ایک سب انسپکٹر پولیس مویشیوں پر قبضہ کرنے کے لیے گیا اور ایک بچھڑے کو گائے سے علیحدہ کرنے پر دیہاتیوں کی طرف سے زبردست پروٹسٹ ہوا۔ فرعون مزاج سب انسپکٹر اس قدر غصہ میں آیا کہ اس نے ایک سرکردہ اور معزز دیہاتی کو گولی سے اڑا دیا۔ فوجی دستے گنٹور میں آ خیمہ زن ہوئے اور گورنر کی باڈی گارڈ بھی گاؤں بہ گاؤں اور دیہہ بہ دیہہ چکر لگانے لگی۔ دھمکیوں سے مالیہ اور ٹیکس وصول کرنے کی بے سود کوششیں کی گئیں۔ اس قسم کی صورت حالات بیان کرنے کی بجائے آسانی سے تصور میں آسکتی ہے۔

۳۱؍جنوری کو ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں باردولی میں اجتماعی سول نافرمانی کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو ان کی قربانیوں اور تیاگ کے لیے مبارکباد دی گئی۔ ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان بھر کو باردولی تعلقہ سے اس عظیم مہم میں تعاون کرنے کا مشورہ دیا گیا اور درخواست کی گئی کہ وہ کسی قسم کی انفرادی یا اجتماعی سول نافرمانی مہاتما جی کی اجازت کے بغیر شروع نہ کریں اور ان علاقوں کے سوا جہاں مہاتما جی نے لگان اور ٹیکس روک لینے کا مشورہ دیا ہے باقی تمام علاقوں میں ٹیکس فی الفور ادا ہو جانے چاہییں۔

گاندھی جی کا خط......وائسرائے کے نام:

اس وقت ہمیں ہندوستان کے مختلف صوبہ جات کی صورت حال پر نظر ڈالنی چاہیے۔ مہاتما گاندھی نے گجرات میں عدم ادائیگی لگان کی مہم شروع کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ وہ مہم جو انھوں نے آل پارٹیز کانفرنس کے بعد ۳۱ جنوری تک ملتوی کردی تھی۔ چنانچہ انھوں نے یکم فروری ۱۹۲۲ء کو وائسرائے کو ایک چٹھی لکھی جس میں انھوں نے واضح کردیا کہ کس طرح بمبئی کے فسادات کے باعث باردولی کی مہم کو ملتوی کرنا پڑا۔ انھوں نے لوٹ مار، معصوم اور بے گناہ لوگوں پر قاتلانہ حملوں اور جیل میں قیدیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کا جس میں کوڑوں کی سزا بھی تھی اچھی طرح ذکر کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ ان کا مقصد تقریر اور تحریر کی چھنی ہوئی آزادی کو ازسرنو حاصل کرنا ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے اجتماعی سول نافرمانی صرف چند ایک علاقوں تک محدود رکھی ہے اور ان علاقوں کے انتخاب کے اختیارات بھی مجھے دیے گئے ہیں اور اس وقت یہ صرف باردو لی ہی میں شروع کی جائے گی۔ میں نے انھیں اختیارات کے ماتحت ''مدراس کے ضلع گنٹور کے ایک سو دیہات میں یہ مہم شروع کرنے کی ابھی اجازت دی ہے۔ بشرطیکہ وہ عدم تشدد، باہمی اتحاد، کھدر کے استعمال اور اچھوت پن کی لعنت کو دور کرنے کی شرائط کو بخوبی تسلیم کرلیں۔ مہاتما جی نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے لارڈ ریڈنگ کو سات دن کی مہلت دی۔ ذیل میں گاندھی جی کی چٹھی مفصل طور پر درج کی جاتی ہے۔

باردولی

یکم فروری ۱۹۲۲ء

جناب عالی!

باردولی ضلع سورت میں ایک چھوٹی سی تحصیل ہے۔ جس کی آبادی ۸۷۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے۔

گزشتہ ماہ کی ۲۹ رتاریخ کو مسٹر وٹھل بھائی جے پٹیل کی صدارت میں اجتماعی سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس ریزولیوشن کے مطابق جو اس نے اپنے دہلی کے اجلاس میں گزشتہ نومبر کے پہلے ہفتہ میں پاس کیا تھا۔ باردولی کو مکمل دیکھ کر میں اس علاقہ میں سول نافرمانی شروع کرنے کا ذمہ دار ہوں اور ان حالات کو جن کے زیر اثر

میں نے یہ فیصلہ کیا ہے آپ اور پبلک پر واضح کرنا میرا فرض ہے۔

باردولی میں سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی منظوری حاصل کر چکا ہے اور یہ فیصلہ گورنمنٹ کی اس مجرمانہ غفلت کے باعث کیا گیا ہے جس کا وہ سوراجیہ، پنجاب اور خلافت کے مسائل کے متعلق اظہار کر رہی ہے۔

۱۷ رنومبر کو بمبئی کے فسادات رونما ہوئے۔ انھیں کے باعث اس مہم کو ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن اس التوا کے دوران میں بھی حکومت کی سخت گیرانہ پالیسی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بنگال، آسام، صوبہ جات متحدہ، پنجاب، دہلی اور بہار واڑیسہ، غرضیکہ ہر جگہ سختی کا چکر اپنے انتہائی عروج پر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ''سختی کی پالیسی'' کے الفاظ پر اعتراض کیا ہے۔ لیکن میں ان الفاظ کو استعمال کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب تصور کرتا ہوں۔ کیونکہ ضرورت سے زیادہ سختی کا استعمال کرنا الفاظ سے موسوم اور تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں کے مال کی لوٹ، غریب اور معصوم بندگان خدا پر بے رحمانہ حملے اور جیل میں قیدیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک۔ کوڑوں کی سزا کے افعال کسی صورت میں بھی قانون کے مطابق نہیں کہے جاسکتے۔ حکومت کی اس غیر آئینی پالیسی کے لیے ان الفاظ کے سوا اور کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ عدم تعاونی یا ان کے ہمدردوں کی طرف سے ہڑتالوں کے سلسلے میں کسی قسم کی دھمکی کا اظہار کیا گیا ہو۔ مگر اس کے باعث تمام پبلک میٹنگوں پر پابندیاں عائد کرنا، پرامن والنٹیر وں کی بھرتی کو روکنا اور غیر معمولی سختی سے دبانا تو کسی طور پر بھی حق بجانب اور درست قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس چیز کا کوئی تعلق پریس وغیرہ سے ہے۔ یا اس سختی سے جس کا اظہار ملک کے کونے کونے میں عوام کی ہر قسم کی آزادی کو چھین کر کیا جا رہا ہے، اس لیے ملک کے سامنے سب سے پہلا کام تقریر اور تحریر کی چھینی ہوئی آزادی کو حاصل کرنا ہے۔

ملک کے موجودہ رویہ اور طرز عمل اور ملک کی اس حالت کے مدنظر جس میں وہ ابھی تشدد پر پورا پورا کنٹرول نہیں رکھ سکتا عدم تعاونی مالویہ جی کی کانفرنس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے۔ جس کا مقصد یور ایکسلینسی کو ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کرنے کی درخواست کرنا تھا۔ لیکن چونکہ میں تکالیف کو دور کرنے کے تمام امکانات پر غور کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے بلا حیل وحجت کانفرنس کا ریزولیشن ورکنگ کمیٹی کو فارورڈ کر دیا۔

حال آں کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ شرائط بالکل عین آپ کی مرضی کے مطابق تھیں۔ جیسا کہ

آپ کی کلکتہ کی تقریر سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن باوجود اس حقیقت کے آپ نے مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔

ان حالات میں ملک کے سامنے اپنے جائز حقوق کو پیش کرنے اور تقریر و تحریر کی آزادی کے مطالبہ کو تسلیم کرانے کے لیے سوائے عدم تشدد کے ذرائع کے اور کوئی علاج نہیں۔ میری ناقص رائے میں موجود حالات اس شریفانہ اور مہذب پالیسی کا خاتمہ سمجھنا چاہیے جو آپ نے علی برادران کی فراخدلانہ غیر مشروط معذرت پر جاری کی تھی۔ یعنی کہ گورنمنٹ اس وقت تک عدم تعاون کی تحریک میں مداخلت نہیں کرے گی جب تک کہ لوگ فعل و قول میں عدم تشدد کے اصول پر کاربند رہیں گے۔ کیا گورنمنٹ اپنی پالیسی میں غیر جانبدارانہ رہی ہے۔ اور کیا اس نے پبلک کو آزادانہ رائے ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سول نافرمانی اس وقت تک ملتوی کی جا سکے جب تک ہندوستانی لوگ بخوبی عدم تشدد کی فلاسفی اور تعلیم کو سمجھ نہیں جاتے۔ لیکن حکومت کی غیر آئینی اور غیر منصفانہ سختی نے (جو کہ بد قسمت ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے) اجتماعی سول نافرمانی کو شروع کرنا ضروری بنا دیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس اجتماعی سول نافرمانی کو چند ایک علاقوں پر محدود کر دیا ہے۔ جن کے انتخاب کے اختیارات مجھے دیے گئے ہیں اور اس وقت میں نے اس تحریک کو باردولی تک محدود رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن انھی اختیارات کے مطابق میں احاطۂ مدراس کے ضلع گنٹور کے ایک سو دیہات میں بھی یہی مہم شروع کرنے کی اجازت دے دوں بشرطیکہ وہ لوگ عدم تشدد کے عقیدہ پر سختی سے کاربند رہ سکیں اور مختلف اقوام اور فرقوں میں باہمی اتحاد، کھدر کے استعمال اور اچھوت پن کی لعنت کو دور کرنے میں یقین رکھیں۔

لیکن پیشتر اس کے کہ باردولی کے لوگ باقاعدہ طور پر اجتماعی سول نافرمانی کی تحریک شروع کریں، میں آپ کو حکومت ہند کا ہیڈ سمجھ کر درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی پالیسی میں اصلاح کریں اور سول نافرمانی اور عدم تعاون کے تمام قیدیوں کو رہا کر کے اعلان کریں کہ

☆ جب تک لوگ عدم تشدد کے عقیدہ پر قول و فعل میں کاربند رہیں گے ان کی سرگرمیوں میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ خواہ وہ سرگرمیاں پنجاب کی شکایات، خلافت کے مسئلہ یا سوراجیہ کے مطالبہ سے تعلق رکھتی ہوں۔

☆ میں آپ سے پریس کو تمام ایڈمنسٹریٹر کنٹرول سے آزاد کرنے اور ان سے وصول کردہ جرمانوں کو واپس کر دینے کی بھی درخواست کروں گا۔ میں ان مطالبات کے ذریعہ آپ سے وہی

کچھ کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں جو کہ آج کل دنیا کے ہر مہذب ملک میں مہذب گورنمنٹ کر رہی ہے۔

☆ آپ سات روز کے اندر اندر کسی قسم کا اعلان اس سلسلے میں کر سکتے ہیں اور میں سول نافرمانی کے قیدیوں کی رہائی تک اجتماعی سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا مشورہ دوں گا۔ اور اگر حکومت نے ان سات روز کے اندر اندر حسب خواہش اعلان کر دیا تو میں سمجھوں گا کہ حکومت رائے عامہ کو وقعت دینے کی خواہش مند ہے اور ملک کو رائے عامہ کو سانچے میں ڈھالنے کا مشورہ دوں گا۔

☆ سخت سول نافرمانی صرف اسی وقت شروع کی جائے گی جب حکومت اپنے وعدوں سے پھر جائے گی اور رائے عامہ کو ٹھکرا دینے کا موجب ہوگی۔

میں ہوں آپ کا وفادار خادم اور دوست

دستخط: (ایم۔ کے۔ گاندھی)

گورنمنٹ نے مہاتما گاندھی کی چٹھی کا جواب جلد ہی شائع کر دیا جس میں انھوں نے بمبئی کے فسادات، ہندوستان کے مختلف صوبہ جات میں تشدد کے واقعات اور والنٹیر وں کی چند کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کی پالیسی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے لکھا کہ حکومت کی پالیسی بدستور وہی ہے جو علی برادران کی غیر مشروط معذرت کے وقت شروع کی گئی تھی۔ اس میں ذرہ بھر بھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ اس میں صاف طور پر واضح کیا گیا تھا کہ ''حکومت ان جرائم میں جو حکومت کے خلاف ہوں جس وقت بھی وہ ضروری خیال کرے ایکشن لے سکتی ہے۔'' حکومت ہند نے کانفرنس کی شرائط اور تجاویز کو بالکل مسترد نہیں کیا۔ ان تجاویز میں خلاف قانون سرگرمیوں کو بند کرنے کے متعلق کوئی شرط نہ تھی۔

گاندھی جی نے یکایک تحریک واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ مشرقی یوپی میں چوری چورا کے مقام پر پولیس کے بائیس سپاہیوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ یہ کیا دھرا ان لوگوں کا تھا جو خود کو 'عدم تعاونی والے'' کہتے تھے۔ اس خبر نے گاندھی جی کو ہلا کر رکھ دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ احتجاج کو بند کر دینا ہی ممکنہ حل ہے۔ تحریک کی معطلی کا اعلان کرنے کے بعد گاندھی جی نے لکھا کہ ''ایک آواز ان کی پیش قدمی اور جدوجہد کو جاری رکھنے پر اکسا رہی تھی۔ یقیناً یہ آواز شیطان کی تھی۔ شیطان کہہ رہا تھا کہ یہ تو بزدلی ہے کہ بڑی دلیری سے حکومت کو للکارنے کے بعد دوسرے روز ہی پسپائی اختیار کر لی جائے۔ مجھے انتہائی شرمندگی کا کڑوا گھونٹ پینا پڑا تھا۔ شیطان مجھے حقائق پر پردہ پوشی

کے لیے ورغلا رہا تھا۔"

حکومت کو خطرہ تھا کہ گاندھی جی کو گرفتار کرنے کی صورت میں بے چینی میں اضافہ ہوگا اس لیے حکومت نے اب تک گاندھی جی پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ یکایک اعلان نے خلافت اور کانگریس کی تحریکوں کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ بعض نے تحریک عدم تعاون پر شک وشبہ ظاہر کیا۔ بعض نے گاندھی جی سے وفاداری ترک کر دی اور انگریزوں کے حامی ہو گئے۔ قومی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مارچ میں حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کر لیا۔ اقرار جرم کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ عوام کو بغاوت پر آمادہ کرنا ان کا مسلک اور فرض ہے۔ ان کو چھ سال کی قید ہوئی۔ اپنی گرفتاری سے کچھ دیر پہلے انھوں نے کانگریسیوں سے کہا "سول نافرمانی کی تحریک چلانے میں جلدی نہ کرنا، بلکہ خاموشی سے کوئی تعمیری کام شروع کر دینا۔" "چوری چورا" کے واقعے سے گاندھی جی کو یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستان کی آزادی یا اسلام کے وقار کے لیے سول نافرمانی کی تحریک چلانے سے پہلے اہل ہند کو کافی تربیت کی ضرورت ہے۔

بمبئی کے گورنر لارڈ لائڈ نے کہا: "اس نے ہمیں ڈرا ہی دیا تھا، گاندھی جی کا یہ عظیم منصوبہ اپنی تکمیل سے فقط ایک انچ دور رہ گیا تھا۔" افضل اقبال نے لکھا ہے "یہ تحریک ناکام ہو گئی اور ایسے حالات پھر کبھی پیدا نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود جدید ہندوستان کی بنیادیں استوار کرنے میں نفسیاتی فضا تیار ہو گئی اور غلامانہ ذہنیت سے نجات ملی۔"

۳، ۴، ۵/ مارچ ۱۹۲۲ء: جمعیت علماے ہند کا ایک خاص اجلاس اجمیر میں زیر صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے استقبالیہ صدر محمد یونس تھے۔ اس اجلاس میں ایک تجویز پاس ہوئی جس میں کہا گیا تھا:

> "جمعیت علماے ہند کے اجلاس لاہور نے طے کر دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تنظیم و اقامت محاکم شریعت و بیت المال کے لیے امیر الہند کا انتخاب کیا جائے۔ چوں کہ امیر الہند کا انتخاب بظاہر اس وقت تک مشکل ہے، جب تک صوبہ دار امرا منتخب نہ ہو جائیں، لہٰذا جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ جلد امراے صوبہ کا انتخاب عمل میں آئے اور ہر صوبے کی جمعیت کو توجہ دلاتا ہے کہ جلد از جلد اس غرض کے لیے جمعیت صوبہ کے عام اجلاس کر کے اپنے صوبے کے واسطے امیر شریعت کا انتخاب کرے۔ انتخاب امیر سے قبل اس کے فرائض و اختیارات و قواعد مرتب کر کے جمعیت

علمائے ہند سے منظور کرالیے جائیں۔'' (جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۵۰)

اس اجلاس کی ایک تجویز کے مطابق مولانا عبدالحلیم صدیقی نے امیر شریعت کے اختیارات و فرائض کے متعلق سب کمیٹی اجلاس بدایوں کا مرتب کردہ مسودہ پیش کیا۔ مگر یہ مسودہ مولانا عبدالقدیر بدایونی کی تحریک و مولانا شاہ سلیمان کی تائید سے آیندہ اجلاس کے لیے ملتوی کردیا گیا۔ (ایضاً ص ۵۲)

گاندھی جی کی گرفتاری:

۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء: تحریک میں اتنی تیزی آگئی کہ انگریز بدحواس ہوگیا اور اس نے اور سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر ماٹیگو وزیر ہند نے ایک دلخراش تقریر میں ہندوستان کو دھمکی دی کہ ابھی گورنمنٹ کے پاس کچلنے کا سارا سامان موجود ہے اور متنبہ کیا کہ لوگ وفاداری کی طرف لوٹ آئیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی نے اس کا دندان شکن جواب دیا اور ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو وہ گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے بعد گاندھی جی نے ایک بھجن سنا اور مولانا حسرت موہانی سے جو اتفاقاً آگئے تھے معانقہ کیا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ کر سبراستی جیل روانہ ہوگئے۔ یہ عجیب اتفاق بھی حسرت کے لائحہ عمل پر لائق وجد ہے وہ عمر بھر گاندھی جی کی مخالفت کرتے رہے لیکن گاندھی جی کی ہر تحریک میں جیل گئے اور آج جب گاندھی جی کے بارے میں گورنمنٹ کی پالیسی بدلی اور وہ گرفتار کیے گئے تو حسرت صاحب وہاں موجود تھے اور گاندھی جی نے جیل جانے سے قبل ان سے معانقہ کیا۔ یہ معانقہ اس بات کی دلیل تھی کہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ دونوں کے دلوں میں آگ سلگ رہی ہے۔ گاندھی جی کے ساتھ بنکر بھی تھے جنھیں گاندھی جی بہت مانتے تھے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو سبراستی جیل سے گاندھی جی پرودا جیل بھیجے گئے اور وہاں بنکر کو گاندھی جی سے جدا کر دیا گیا۔

لندن کی ''بنچز آف ان'' نے گاندھی جی کی بیرسٹری کی سند چھین لی۔ جیل میں گاندھی جی کو اذیت دی جاتی تھی۔ روزانہ ان کی تلاشی لی جاتی تھی۔ اگرچہ وہ صرف ایک لنگوٹی پہنتے تھے، کمبل جھاڑ کر دیکھا جاتا تھا۔ ان کا برتن جیلر نے جوتے سے چھوا۔ سال میں ان کو صرف چار خط لکھنے کی اجازت ملی۔ انگریز اب اپنی شرافت ترک کر کے بزدلانہ انتقام پر اتر آیا تھا۔ گاندھی جی نے بحیثیت ستیہ گرہی سب کچھ برداشت کیا اور آخرکار حکام جیل نے معافی مانگی۔ ان کا چرخہ بھی دے

دیا اور ان کا اعزاز و اکرام کرنے لگے۔ یعنی ظلم کی تلوار سچائی اور اہنسا کے روحانی ضرب سے ٹوٹ گئی۔ (تحریک خلافت، ص ۲۴۴)

مہاتما گاندھی کی گرفتاری:

۱۳/ مارچ ۱۹۲۲ء: ملک نے مہاتما گاندھی کی مخالفت کر لی۔ اب حکومت کی باری آئی۔ کیونکہ کوئی حکومت بھی ہر دلعزیزی کے زمانے میں کسی لیڈر پر ہاتھ اٹھانے کی جرات نہیں کرتی۔ بلکہ نہایت صبر و تحمل سے انتظار میں وقت ٹالنے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب فوج پسپا ہو جاتی ہے تو فاتح اپنی پوری طاقت سے اس پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے جس طرح کہ بھیڑیا بھیڑوں کے گلّے پر۔ ۱۳/ مارچ کو مہاتما گاندھی گرفتار کر لیے گئے۔ حال آں کہ ان کی گرفتاری کا فیصلہ فروری کے دوسرے ہفتہ ہی میں کر لیا گیا تھا۔ ۱۸/ مارچ کو اس عظیم شخصیت کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ سروجنی دیوی اس مقدمہ اور واقعہ کے متعلق لکھتی ہیں:

''قانون کی نگاہوں میں ایک مجرم...... لیکن جب وہی مجرم جو کھدر کی چادر میں ملبوس تھا کٹہرے میں داخل ہوا تو تمام عدالت اس کی تعظیم کے لیے کھڑی ہو گئی۔''

۷/ جون ۱۹۲۲ء: ۷/ جون ۱۹۲۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کے سکریٹری راج گوپال آچاریہ تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو رہا ہو چکے تھے۔ وہ بھی شریک تھے۔ حکیم اجمل خاں، موتی لال نہرو، راج گوپال آچاریہ، ڈاکٹر انصاری، ولبھ بھائی پٹیل اور کستوری رنگا آئنگر کی ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی کہ وہ ۳۰/ ستمبر تک یہ رپورٹ دے کہ سول نافرمانی کو پھر کس طرح چلایا جائے۔ اوپر کے ناموں سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ہندوستان قیادت کے معاملے میں تہی دست نہ تھا۔

اگست ۱۹۲۲ء میں گورو کے باغ کا واقعہ پیش آیا۔ اکالی دل سکھوں کا اصلاح یافتہ طبقہ تھا۔ یہ کل مٹھ پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ ایک جگہ کے مٹھ راضی نہ تھے۔ گورنمنٹ ان کے ساتھ تھی۔ جتھا جاتا تھا اور اسے ڈنڈوں سے خوب مارا جاتا تھا اور صرف ''واہ گرو کی جے، واہ گرو وہ کی جے'' کے نعرے لگاتے تھے۔ عدم تشدد کی اس شاندار مثال نے گاندھی جی کے فلسفے کو بڑی طاقت دی اور بیرونی ممالک کے اخباری رپورٹر فوٹو لینے اور واقعات کا صحیح مرقع کھینچنے کے لیے دوڑ پڑے۔

۳۰/ ستمبر ۱۹۲۲ء کو کانگریس کی مقرر کردہ کمیٹی کی رپورٹ تیار ہوئی اور سی آر داس کو جو کانگریس

کے صدر تھے، دی گئی۔ رپورٹ کا منشا یہ تھا کہ سول نافرمانی ناقابل عمل ہے۔

۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ صوبائی کمیٹیاں اپنی ذمہ داری پر انفرادی سول نافرمانی کی اجازت دے سکتی ہیں۔ عام سول نافرمانی منظور نہیں ہوئی۔ دراصل گاندھی جی کے سوا اور کون اسے جاری کر سکتا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۲ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ سیشن گیا میں ہوا۔ وہاں یہ تجویز پیش ہوئی کہ کونسلوں میں داخل ہو کر اندر سے اسے توڑا جائے۔ سی آر داس نے اس کی تائید کی مگر یہ کہا کہ اگر خلافت کانفرنس اختلاف کرے گی تو کونسل کے داخلے کو منظور نہیں کیا جائے گا۔ راج گوپال آچاریہ نے تجویز پیش کی کہ مکمل ترک موالات قائم رکھا جائے اور خلافت کانفرنس نے مکمل ترک تعاون ہی کی تجویز منظور کی۔ راج گوپال آچاریہ کی تجویز ۱۷۴۰ ووٹوں کی حمایت اور ۸۹۰ ووٹوں کی مخالفت سے پاس ہو گئی۔ کانگریس نے یہ بھی طے کیا کہ ۲۵ لاکھ روپیہ جمع کیا جاوے اور پچاس ہزار والنٹیر بنائے جائیں۔ (تحریک خلافت، ص ۲۴۵)

۲۰ر جولائی ۱۹۲۲ء: تحریک خلافت میں شرکت اور اس راہ میں موت کے حکم کے بارے میں کسی صاحب نے فتویٰ پوچھا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب دیا:

(۱) اس وقت خلافت کی تحریک میں شرکت اور اس کے لیے جدوجہد کرنی تمام مسلمانوں کے ذمہ لازم ہے۔ کیونکہ دشمنان دین کے ساتھ مقابلہ ہے۔ جو اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۲) موجودہ تحریک میں جو مذہب اور وطن کی آزادی کے لیے ہے جو شخص قید ہو جائے اور حکام جیل کی سختیوں کی وجہ سے مر جائے وہ شہید ہے۔ (محمد کفایت اللہ غفرلہ، مدرس مدرسۂ امینیہ دہلی۔ احقر مظہر الدین غفرلہ)

(کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

۲۱ر ستمبر ۱۹۲۲ء: لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے وزیر ہند کو ۲۱ر ستمبر کو ایک مراسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی حکومت کی کوششوں میں کامیابی کی خوش خبری سنائی ہے اور اس سلسلے میں سر محمد شفیع کی اعانت کی تعریف کی ہے۔ وائسرائے ہند نے اپنے مراسلے میں لکھا ہے:

”میں نے حال ہی میں آپ کو ایک تار ارسال کیا ہے۔ جس سے آپ پر منکشف ہو گا

کہ ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مکمل تفرقہ ڈالنے میں قریب قریب کامیاب ہوئے ہیں۔ میری تمام تر توجہ اس امکان کی جانب ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے میں میری کونسل کے رکن ''شفیع'' کی بہت زیادہ اعانت مجھے حاصل ہے جو کہ باوقار مسلمان ہیں۔'' (فاروق قریشی بہ حوالہ حقائق حقائق ہیں، از خاں عبدالولی خان، ص ۱۸)

یکم نومبر ۱۹۲۲ء: مصطفیٰ کمال نے سلطان وحید الدین خان کو معزول کر کے سلطان عبدالمجید خاں کو خلیفہ مقرر کیا اور ترکی کو ایک یورپین طرز کی جمہوریہ قرار دے کر سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ (تحریک خلافت، ص ۴۵۴)

۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء: گیا میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سینتیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں ۳۲۴۸ ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو اپنا آئین بنانے کے لیے دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن گرفتار ہو جانے کی وجہ سے وہ خود اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ اس اجلاس میں ارکان میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ کانگریس دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور سی آر داس، موتی لال نہرو، حکیم اجمل خان وغیرہ نے سوراج پارٹی از سرِ نو بنالی۔

(حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۷۷، سکسٹی ایئرس آف کانگریس، ص ۲۷۹-۸۰)

سوراج پارٹی کا قیام:

یکم جنوری ۱۹۲۳ء: سی آر داس اور موتی لال نہرو نے یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی اور یہ کہہ کر رکھی کہ یہ کانگریس کے اندر ایک پارٹی ہو گی۔ اس کا مقصد یہ ہو گا کہ کونسلوں کو اندر سے توڑا جائے اور جب کانگریس میں اس پارٹی کی اکثریت ہو جائے گی تو وہ پھر کام کرے گی۔ مولانا حسرت موہانی نے کلکتہ جا کر داس اور نہرو سے میل کر لیا اور اخبارات نے صفحہ اول پر اسے موٹی موٹی سرخیوں سے درج کیا۔

یکم مئی ۱۹۲۳ء کو مولانا آزاد کانگریس کے صدر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا اسپیشل سیشن دلی میں ہوا۔ اس وقت مولانا محمد علی رہا ہو چکے تھے اور اس جلسہ میں شریک تھے۔ اس اجلاس میں کونسلوں کا داخلہ منظور ہو گیا۔

سی آر داس اور موتی لال کا اتحاد کامیاب رہا۔ سوراج پارٹی الیکشن لڑی، کئی صوبوں میں اس

نے اکثریت حاصل کرلی اور سینٹر میں آدھی سیٹیں جیت لیں۔(تحریک خلافت، ص ۲۴۷)

۵، ۱۰؍فروری ۱۹۲۳ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس منتظمہ کا ایک اجلاس ۹۔۱۰؍فروری کو باڑہ ہندوراؤ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ امارت شرعیہ کا مسودہ جو سب کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بدایوں نے مرتب کیا ہے، طبع کرا کے ممبران منتظمہ کے پاس بھیجا جائے تا کہ جمعیت منتظمہ کے آیندہ اجلاس میں اس پر غور کیا جاسکے۔(جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۵۷)

جمعیت علماے ہند کے اجلاس لاہور کی منعقدہ سب کمیٹی نے ۸؍ربیع الثانی ۱۳۴۰ء کو جمعے کے روز بعد نماز جمعہ اپنی میٹنگ میں جو مسودہ امیر شریعت کے شرائط اور اختیارات کے متعلق مرتب کیا تھا اور جس کی اشاعت کے بارے میں جمعیت کی مجلس منتظمہ نے ۹۔۱۰؍فروری کو دہلی میں فیصلہ کیا تھا اسے مولانا عبدالحلیم صدیقی نائب ناظم جمعیت علماے ہند وکنویز سب کمیٹی نے جمیدیہ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کر دیا تھا۔ چوں کہ یہ اشاعت ارکان مجلس منتظمہ کے مطالعے کی غرض سے تھی تا کہ اس کے بارے میں ان حضرات کی موقر آرا حاصل کی جاسکیں۔ لیکن یہ امر بہ وجوہ مؤخر ہوتا چلا گیا۔ چونکہ قیام نظام شریعت کی یہ تحریک جمعیت علماے ہند کی تاریخ خدمت میں خاص اہمیت رکھتی تھی اور اس کے روبہ عمل نہ آنے کی وجہ سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو رہی تھیں اس لیے مولانا محمد میاں نے جب ''جمعیۃ العلماء کیا ہے؟'' مرتب کی تو اس میں اس نادر تاریخی دستاویز کو شامل کرلیا۔

سب کمیٹی کے ممبران میں سے مندرجۂ ذیل حضرات نے مسودہ کی تیاری میں شرکت کی تھی:

(۱) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صدر جمعیۃ العلماء ہند (۲) مولانا سبحان اللہ

(۳) مولانا سید مرتضیٰ حسن (۴) مولانا محمد فاخر

(۵) مولانا عبدالماجد (بدایونی) (۶) مولانا محمد سجاد

(۷) مولانا عبدالحلیم صدیقی نائب ناظم جمعیۃ العلماء ہند

سب کمیٹی کے ان ممبران کے علاوہ مندرجۂ ذیل حضرات ارکان جمعیت نے بھی شرکت فرمائی تھی:

(۱) حکیم محمد اجمل خاں، (۲) مولانا سید سلیمان ندوی، (۳) سید ظہور احمد (سیکریٹری مسلم لیگ)، (۴) مولانا غلام محمد شملوی، (۵) مولانا احمد مختار صدیقی، (۶) مولانا نذیر احمد خجندی، (۷) مولانا یعقوب بخش بدایونی، (۸) مولانا اعجاز احمد، (۹) مولانا سراج احمد، (۱۰)

مولانا عبدالوہاب، (۱۱) مولانا عبدالودود، (۱۲) مولانا نورالحسن اور (۱۳) مولانا فرخندہ علی۔

امیر شریعت کے اختیارات وفرائض، اوصاف لازمہ اور امارت شرعیہ کے نظام نامہ کا مسودہ جو کہ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے اور عام طور پر لوگ اس سے ناواقف ہیں اس لیے اس کی اہمیت کے پیش نظر مقالات سیاسیہ (حصہ دوم) میں مرتب کر دیا گیا ہے۔

کانگریس میں اختلاف:

گاندھی جی کو گرفتار کرلیا گیا۔ چھ برس قید کی سزا دی گئی اور عدم تعاون کی تحریک دم توڑ کر ختم ہوگئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد بیان فرماتے ہیں:

مسٹر داس تقریباً روزانہ مجھ سے صورت حال پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ یقین تھا کہ تحریک بند کرنے میں گاندھی نے ایسی غلطی کی ہے، جس سے شدید نقصان ہوگا۔ اس نے سیاسی کام کرنے والوں کی ہمتیں اتنی پست کردی ہیں کہ اب پبلک میں برسوں تک جوش دوبارہ پیدا نہ کیا جاسکے گا۔ اس کے علاوہ مسٹر داس کی رائے تھی کہ مقصد کو براہ راست حاصل کرنے کی کوشش جو گاندھی جی نے کی تھی، صحیح طریقہ نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب ہمیں پبلک کی ہمت اور جوش کو بحال کرنے کے لیے نئی تدبیریں کرنی چاہییں۔ وہ ایسی پالیسی کی موافقت میں نہیں تھے کہ بیٹھ کر انتظار کیا جائے اور دیکھا جائے کہ حالات کب بہتر ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ پرانے پروگرام کے بجائے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور اس وقت جو صورت حال تھی اس کے پیش نظر عملی احتجاج کے طریقے کو چھوڑ کر مجالس قانون ساز کو سیاسی جنگ کا میدان بنانا چاہیے۔ گاندھی جی کے کہنے سے کانگریس نے سنہ ۱۹۲۱ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ مسٹر داس نے یہ رائے ظاہر کی کہ کانگریس کو سنہ ۱۹۲۴ء میں مجالس قانون ساز پر قبضہ کرنے کی تیاری کرنا چاہیے اور ملک کے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہیے۔

مسٹر داس کو امید تھی کہ کانگریس کے تمام مستعد لیڈران کی تشخیص اور علاج کو تسلیم کرلیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ حد سے زیادہ خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں، مگر اس بات سے مجھے اتفاق تھا کہ جب وہ قید سے چھوٹیں گے تو دوستوں سے مشورہ کرکے ملک کے لیے ایک نیا پروگرام بنائیں گے۔

مسٹر داس اس وقت رہا ہوئے، جب گیا کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ ریسپشن کمیٹی نے ان کو اپنا صدر منتخب کیا اور محسوس ہوا کہ وہ ملک کو اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ کرلیں گے۔ ان کی ہمت اور بڑھ گئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حکیم اجمل خان، پنڈت موتی لال نہرو اور

وٹھل بھائی پٹیل ان کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں تو اپنے خطبۂ صدارت میں مسٹر داس نے تجویز کیا کہ کانگریس کونسلوں میں داخل ہونے کے پروگرام کو منظور کر لے اور سیاسی جنگ قانون ساز مجلسوں کے اندر جاری کرے۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ کانگریس کے ایک حصہ نے شری راج گوپال اچاری کی سرکردگی میں مسٹر داس کی مخالفت کی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ عملی احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیا گیا اور مسٹر داس کا پروگرام اختیار کیا گیا تو حکومت اس سے یہ نتیجہ نکالے گی کہ گاندھی جی کی قیادت سے انحراف کیا گیا ہے۔

میرے خیال میں شری راج گوپال اچاری کا استدلال صحیح نہیں تھا۔ مسٹر داس حکومت سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پیش نظر صرف یہ تھا کہ سیاسی جدوجہد کو کسی دوسرے میدان میں جاری کیا جائے۔ انھوں نے یہ بات وضاحت اور تفصیل سے سمجھائی، مگر کانگریس کے عام ممبروں کو قائل نہ کر سکے۔ شری راج گوپال اچاری، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے لوگوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کی تجویز کو نامنظور کرا دیا گیا۔ کانگریس دو مخالف حصوں میں تقسیم ہو گئی اور مسٹر داس نے استعفیٰ دے دیا۔ اب کانگریس کی ساری مخالفت دو فریقوں کی باہمی جنگ میں صرف ہونے لگی، جن میں سے ایک ''نو چینجرس'' اور دوسرا ''پرو چینجرس'' کہلاتا تھا۔

۱۵ ر ستمبر ۱۹۲۳ء: کوئی چھ مہینے بعد میں بھی قید سے چھوٹا۔ میں نے دیکھا کہ کانگریس کے لیے بہت سخت خطرہ درپیش ہے اور تمام کانگریسیوں کی قوت انگریزوں کے خلاف لڑنے کے بجائے خانہ جنگی میں صرف ہو رہی ہے۔ مسٹر داس، پنڈت موتی لال اور حکیم اجمل خاں ''پرو چینجر'' جماعت کی وکالت کر رہے تھے۔ دونوں نے مجھے اپنی طرف لانے کی کوشش کی مگر میں قطعی طور پر کسی فریق کی طرف ہو جانے سے انکار کروں گا۔ مجھے یہ اندرونی اختلافات بہت خطرناک معلوم ہو رہے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ اگر انھیں بروقت دور نہ کیا گیا تو کانگریس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اس لیے میں نے طے کیا کہ دونوں مخالف فریقوں سے الگ رہوں گا اور ملک کو سیاسی جدوجہد کی طرف پوری طرح متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے خوشی ہے میری کوششیں بار آور ہوئیں۔ دہلی میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس ہوا اور دونوں فریقوں کی رضامندی سے میں اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

میں نے خطبۂ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ ہمارا اصل مقصد ملک کو آزاد کرانا ہے۔ ۱۹۱۹ء سے ہم عملی احتجاج کے پروگرام پر عمل کرتے رہے تھے اور اس سے ہمیں بہت کچھ

حاصل ہوا۔اب اگر ہم میں سے بعض کو یہ محسوس ہوا تھا کہ قانون ساز اسمبلی کو جدوجہد کا میدان بنانا چاہیے، تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہم سختی کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم رہیں۔ جب تک اس کا اطمینان رہے کہ سب کا مقصد اور نصب العین ایک ہی ہے، تب تک ہر گروپ کو اختیار ہونا چاہیے کہ جس پروگرام کو وہ سب سے زیادہ مفید اور موثر سمجھتا ہو اس پر عمل کرے۔

دہلی کانگریس کا فیصلہ میری توقعات کے مطابق ہوا اور یہ طے ہو گیا کہ ''پرو چینجر'' اور ''نو چینجر'' دونوں آزادی کے ساتھ اپنے اپنے پروگرام پر عمل کر سکیں گے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، شری راج گوپال اچاری اور ان کے ساتھیوں نے اپنے تعمیری پروگرام کو اٹھایا۔ مسٹر سی۔آر۔داس، پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خان نے سوراج پارٹی قائم کی اور انتخابات میں مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ان کی اس تحریک نے پورے ملک میں بہت جوش پیدا کیا اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں بہت سے لوگ سوراج پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔(انڈیا ونس فریڈم،ص ۹۷۔۹۶)

کانگریس کا خصوصی اجلاس:

ستمبر ۱۹۲۳ء: مولانا آزاد جنوری ۱۹۲۳ء میں رہا ہوئے تو ان کی عدم موجودگی میں سیاسی فضا تبدیل ہو چکی تھی۔سول نافرمانی کی تحریک واپس لی جا چکی تھی، گاندھی جی چھ برس کے لیے جیل بھیج دیے گئے تھے۔تحریک دم توڑ چکی تھی، مسلمانوں کا جوش و خروش سرد پڑ چکا تھا۔سیاسی فضا مایوسی کی اسیر تھی۔ ہندو مسلمان اتحاد جسے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد استوار کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، جس سے برطانوی استعمار لرزہ براندام تھا نہ صرف ختم ہو چکا تھا بلکہ اس کی جگہ ہندو مسلمان فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے۔ پنجاب اور بنگال میں محرم کے موقع پر زبردست خوفناک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔

کانگریس کا یہ اجلاس ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں دہلی میں منعقد ہوا۔اس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے قوم پرور طبقہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔آپ کو بنگال اور دہلی میں خاص ہر دلعزیزی حاصل ہے۔آپ کی اعلیٰ قابلیت، آپ کی صداقت پسندی کے باعث ہر دو پارٹیوں میں آپ کی رائے کو خاص وقعت دی جاتی تھی اور ہر دو پارٹیوں کا وشواس آپ کو حاصل تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ داخلۂ کونسل کے حامیوں نے اپنے لیے طاقت پیدا کر لی

تھی۔ ان کو کانگریس کے اس خاص اجلاس میں اپنی فتح کا پورا پورا بھروسا اور یقین تھا۔ چنانچہ وہ کانگریس سے یہ ریزولیوشن پاس کرانے میں کامیاب ہو گئے:

''وہ کانگریسی اصحاب جنھیں مذہبی طور پر داخلہ کونسل پر کسی قسم کا اعتراض نہیں انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں اور اپنے ووٹ دینے کے حقوق کو استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ یہ کانگریس کونسل بائیکاٹ کے خلاف تمام پروپیگنڈا کو معطل کرتی ہے۔''

اس کانفرنس میں چودھری رام بھجدت، زلزلۂ جاپان، مہاراجہ نابھہ کی جبراً علیحدگی، بہار، برما اور کنارا کے سیلاب وغیرہ کے واقعات بحث کا موضوع رہے اور سب کے متعلق ریزولیوشن پاس کیے گئے۔ ایک طبقہ ایسے کانگریسیوں کا بھی تھا جو مہاتما گاندھی کی مہم کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سول نافرمانی کی کامیاب مہم آرگنائز کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ ایک اور کمیٹی کانگریس کانسٹی ٹیوشن میں تبدیلیاں کرنے کے لیے مقرر کی گئی۔ موجودہ حالات کے مدنظر ہندو مسلم سکھ اتحاد نہایت ضروری اور اہم چیز تھی۔ ایک کمیٹی نیشنل پیکٹ تیار کرنے کے لیے معرض وجود میں آئی اور پریس کو تنبیہ کی گئی کہ وہ فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق احتیاط اور ذمہ داری سے کام لیا کرے، تاکہ باہم کشیدگی نہ بڑھے۔ اس کانگریس میں ایک دفعہ پھر اکالیوں کو ان کی بہادری پر مبارکباد دی گئی۔ جو انھوں نے سختی اور اشتعال کے باوجود کمال پرامن رہ کر دکھائی۔ ایک فوجی اور بہادر قوم کا اس طرح پرامن رہنا واقعی قابل تعریف تھا۔ عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ کھدر کا استعمال کر کے بدیشی کپڑے کا مکمل بائیکاٹ کر دیں اور ہندوستانی کپڑے کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ لالہ لاجپت رائے اور مولانا محمد علی کو ان کی رہائی پر خوش آمدید کہا گیا۔

کینیا کی صورت حال پر بھی غور کیا گیا۔ اور ترکی بھی زیر بحث رہا۔ اول الذکر کی گورنمنٹ کی پالیسی پر اظہار نفرت کرتے ہوئے ترکی کی ترقی پر اظہار مسرت کیا گیا۔ ہندو مسلم فسادات کے مدنظر ایک کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ وہ ان فسادات کو روکنے کے ذرائع پر غور کرے۔ کانگریس کا یہ خاص اجلاس ہنگامہ خیز کہا جا سکتا ہے کیونکہ چند ایک زیر بحث مسائل نہایت اہم تھے۔ (تواریخ کانگریس، ص ۱۷۔۴۱۶)

معاہدۂ لوزان:

۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء: ترکی، برطانیہ، فرانس، اطالیہ، جاپان، یونان، بلغاریہ اور یوگوسلادیہ

کے درمیان صلح کا معاہدہ جس پر لوزان (سوئٹزرلینڈ) میں ۲۴؍جولائی ۱۹۲۳ء کو دستخط ہوئے اور جس نے بدنام زمانہ معائدہ سیورس کو کالعدم کر دیا۔ جسے پہلی عالمی جنگ کی فاتح اتحادی طاقتوں نے ترکی کی شکست کے بعد اس کے علاقہ کی حصہ بانٹ کے لیے ترکی پر مسلط کیا تھا۔ لیکن دریں اثناء مصطفیٰ کمال کے انقلاب اور قومی طاقت کی بحالی کے بعد اس معاہدے کی توثیق کی نوبت نہیں آئی۔ معائدۂ لوزان کے ذریعہ استنبول، تھریس اور اناطولیہ کے سارے علاقہ پر ترکی کی علمداری بحال کر دی گئی۔ باسفورس اور درۂ دانیال کو اگرچہ غیر مسلح کر دیا گیا لیکن ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا گیا۔ شام کے ساتھ ترکی کی سرحد میں ردوبدل سے ترکی کو فائدہ پہنچا۔ اور ایشیائے کوچک میں فرانس اور اطالیہ کے دائرۂ اثر کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۴۰۰)

۱۹۲۱ء میں یونانی فوجوں سے نبرد آزمائی شروع ہوئی۔ جولائی میں یونانی فوجیں ''اسکی'' شہر تک بڑھ آئیں۔ یہ پیش قدمی ۱۳؍ستمبر کو یونانیوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ اس اثناء میں نئی حکومت ملی نے اتحادیوں کے ساتھ روابط قائم کر لیے اور ۲۰؍نومبر ۱۹۲۱ء کے عہد نامے کے مطابق فرانس نے سیلشیا کا علاقہ ترکوں کو واپس کر دیا۔ چونکہ دیگر گفت وشنید کا کوئی معیّن نتیجہ نہ نکلا، اس لیے حکومت انقرہ نے اگست ۱۹۲۲ء میں یونانی افواج پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دوملوپکار کے مقام پر فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ ۹؍ستمبر کو سمرنا (ازمیر) واپس لے لیا گیا اور کچھ عرصے کے لیے ایسا محسوس ہونے لگا کہ قسطنطنیہ بھی لے لیا جائے گا۔ مدانیہ کی عارضی صلح (۱۰؍اکتوبر) کی رو سے قومی حکومت کو تھریس (تراقیہ) اور قبضہ کر لینے کا حق حاصل ہو گیا۔ چنانچہ بعد کے چند ہفتوں میں انھوں نے قبضہ کر لیا۔ جنگ کا خاتمہ ہوا اور بڑی مشکل اور پیچیدہ گفت وشنید کے بعد ۲۳؍جولائی ۱۹۲۳ء کو لوزان کا عہد نامہ طے پایا، جس کے مطابق ترکیۂ جدید اور اتحادیوں کے درمیان امن وصلح کے روابط قائم ہو گئے اور اس ملک (ترکیہ) کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تسلیم کر لیا گیا''۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۵۵۔۳۵۴)

ترکیۂ جدید کو یہ کامیابی جو حاصل ہوئی تھی، جسے مولانا آزاد نے ''عالم انسانیت کی فتح'' قرار دیا، اس میں چونکہ ہندوستان کا خاص حصہ تھا۔ ہندوستان نے ترکیہ کی ہر طرح مدد کی تھی۔ اس لیے اس کی فتح سے ہندوستان میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ستمبر میں کانگریس کا خصوصی اجلاس دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں عہد نامہ لوزان کا خاص طور پر ذکر کیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"مجھے اجازت دیجیے کہ میں عالم انسانیت کی فتح پر تمام عالم انسانیت کو مبارک باد دوں۔ میں مغرب اور مشرق کے ہر اس انسان کو مبارکباد دوں جو انصاف اور انسانی آزادی کا احترام کرتا ہے۔

لوزان کے صلح نامہ سے وہ تمام مقاصد بہ استثناء آزادی عرب حاصل کر لیے گئے جن کا ترکی اور ہندوستان نے انصاف اور حق کے نام پر مطالبہ کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر ولسن کی ان فراموش شدہ شرطوں اور برطانیہ کے ان مشہور مگر شکستہ وعدوں کا بھی مفاد موجود ہے جو ۱۹۱۸ء میں کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر ولسن کی بارھویں شرط یہ تھی کہ ترکی کی سلطنت محفوظ رکھی جائے گی۔ چنانچہ آج ترکی کی سلطنت محفوظ ہے۔ برطانوی وزیر اعظم نے کہا تھا کہ ترکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کی زرخیز اور شہرۂ آفاق علاقوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اب ترکی ان علاقوں سے محروم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس میں نہ صرف ان "وعدوں" کا مفاد ہی موجود ہے بلکہ وہ باتیں بھی موجود ہیں جو ان میں نہ تھیں۔ ان میں ترکی کی خودمختارانہ عظمت کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن اسے یہ بھی حاصل ہو گئی ہے۔ ان میں اجنبی امتیازات (کیپی چولیشنز) اور غیر ترکی ڈاکخانوں کے اٹھا دینے کے لیے کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی جو قبل از جنگ بھی عثمانی شہنشاہی کی کامل خودمختاری کی نفی کرتے تھے مگر اب وہ بھی اٹھا دیے گئے ہیں۔ ان میں ہم کہیں اس کا اشارہ نہیں پاتے کہ ترکی سے ایک ہارے ہوئے حریف کی طرح نہیں بلکہ ایک مساوی طاقت کی طرح معاملہ کیا جائے گا۔ لیکن اب ترکی کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے ہم ان "وعدوں" میں دردانیال کے بین الاقوامی کر دینے کا ذکر موجود پاتے ہیں۔ لیکن صلحنامہ نے وہاں بھی ترکی کا اقتدار تسلیم کر لیا ہے۔ بلاشبہ یہ جو کچھ ہوا وعدوں کا مفاد ہے اور انصاف کی تعمیل ہے لیکن واقعات کی تکمیل کے لیے مجھے اتنا اضافہ اور کرنے دیجیے کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوا کہ وعدے پورے کیے گئے اور طاقت کے وعدے بزور شمشیر فتح کر لیے جائیں تو وہ وعدوں سے بھی زیادہ دے دینے میں فیاض ہے۔ وہ فاتح کو سب کچھ دے دیتی ہے لیکن انصاف کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

حضرات یہ صلح فی الحقیقت ایک سوال ہے جس کے جواب میں عنقریب تاریخ عبرت کی داستانیں ترتیب دے گی۔ بلاشبہ انصاف پورا ہوا اور حق حقدار کو مل گیا۔ لیکن ان طاقتوں کو کیا ملا جنھوں نے انصاف کی پامالی کے لیے اپنی اٹل اور بے روک سرکشی کی قسمیں کھائی تھیں؟ برطانیہ کو کیا ملا جو کامل چار سال تک اپنے ٹوٹے ہوئے وعدوں کے ٹکڑے روندتی رہی اور ایک ایسے مضبوط ارادے کے ساتھ جو اس نے انصاف کے لیے کبھی نہیں کیا ظلم و جبر کی تکمیل کے لیے وقف ہو گئی؟

اس نے ترکی کو پامال کرنا چاہا مگر وہ اس کے سارے منصوبوں اور فیصلوں کے برخلاف طاقتور ہوگئی۔ اس نے انصاف کے آگے جھکنے سے انکار کیا۔ لیکن وہ تلوار کے آگے سربسجود ہوگئی۔ اس نے بار بار قلم سے فیصلے لکھے لیکن تلوار سے سب پارہ پارہ کردیے گئے۔ اس نے قوموں کے حاکم اور قسمتوں کے مالک کی طرح جب صلحنامے ترتیب دیے تو ہندوستان نے حق وانصاف کے نام پر فریاد کی مگر اس نے حقارت کے ساتھ انکار کردیا۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال نے تلوار کی نوک سے خود اپنا صلحنامہ لکھ دیا تو وہ ایک مفتوح کی طرح جھکی اور اس کے استقبال سے انکار نہ کرسکی۔ ہمیں مورخ کے جواب کا انتظار نہیں ہے کیونکہ دنیا نے جواب دے دیا ہے۔ فی الحقیقت اس نے ترکی کو سب کچھ دے کر خود جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ناکام ناانصافی کا ایک داغ ہے جو پہلے اس کی پشت پر تھا مگر اب اس کی پسند کے مطابق اس کی پیشانی پر نمودار ہوگیا ہے۔ (خطبات ابوالکلام آزاد، لاہور، دبستان، ص ۵۵-۲۵۳)

۳۰-۳۱ راکتوبر ۱۹۲۳ء: جمعیت علماء ہند کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ۲۰-۲۱ رستمبر کو دہلی میں منعقد ہوا۔ اس کی ایک نشست میں آیندہ کوکناڈا میں ہونے والے سالانہ عام اجلاس عام کی صدارت کے لیے مولانا سید حسین احمد مدنی کا نام متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس قرارداد میں استقبالیہ کمیٹی کوکناڈا سے امید کی گئی کہ وہ اس انتخاب کی منظوری سے جلدتر مطلع کرے گی تاکہ اس کا اعلان کردیا جائے۔ (جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۶۵)

۷ رنومبر ۱۹۲۳ء: شعبۂ تبلیغ کو جمعیت علمائے ہند نے شروع ہی سے خاص اہمیت دی تھی اور اس کے دوسرے سالانہ اجلاس دہلی ہی میں اس کے قیام کی ضرورت محسوس کرلی گئی تھی۔ اس کے بعد ہر اجلاس میں اس کی ضرورت اور کاموں کے مختلف پہلو زیر بحث آتے رہے۔ حتیٰ کہ جمعیت علمائے ہند کا ایک خاص شعبہ جمعیۃ تبلیغیہ کے نام سے قائم کردیا گیا۔ اور جمعیت کے سالانہ اجلاسوں نیز جمعیۃ منتظمہ کے جلسوں کے موقع پر جمعیۃ تبلیغیہ کے اجلاس بھی ہوتے تھے۔ جمعیۃ تبلیغیہ کے پیش نظر نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی تبلیغی وفود کا انتظام اور لٹریچر کی اشاعت تھی۔

۷ رنومبر کو جمعیۃ تبلیغیہ کا ایک اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس میں عراق میں عیسائی وقادیانی تبلیغی لٹریچر کی بہ کثرت اشاعت کا مسئلہ زیر بحث آیا اور طے پایا کہ ان کے جواب میں مولانا انور شاہ کشمیری عربی زبان میں دس جوابی کتابچے تحریر فرمائیں گے اور اندرون ملک مقاصد تبلیغ کی

اشاعت کے لیے وفود روانہ کیے جائیں گے اور ان وفود کی ترتیب و تنظیم مولانا سید حسین احمد، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید فرمائیں گے۔ (جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۹۴)

۲۸ر دسمبر ۱۹۲۳ء: ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو کناڈا میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ۶۱۸۸ ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس اجلاس نے قومی اتحاد اور آزادی وطن پر بہت زور دیا۔ (حسرت موہانی:.....ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۲۳)

۲۹ر دسمبر ۱۹۲۳ء: کوکناڈا، جمعیت علماے ہند کے سالانہ اجلاس پنجم مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں ہوا۔ حضرت مولانا نے چھیالیس صفحات پر مشتمل نہایت فکر انگیز اور ایمان پرور خطبۂ صدارت پیش فرمایا۔ جس میں اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف یورپ کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں پر روشنی ڈالی اور مسلمانان ہند کو ان کے فرائض جزیرۃ العرب و مقامات مقدسہ کی حفاظت، ترکی خلافت کی بقا و استحکام اور ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں بتائے اور ہندو مسلم اتحاد، ابتدائی تعلیم کی ضرورت، مسلمانوں کی اصلاح، تبلیغ اسلام کی ضرورت و اہمیت اور کانگریسی رہنماؤں کے فرائض اور ذمہ داریوں پر بھی روشنی ڈالی۔

حضرت مولانا مدنی کا یہ خطبۂ صدارت مولانا احمد سید دہلوی ناظم جمعیت علماے ہند کی فرمائش پر منشی عبدالقدیر کے زیر اہتمام الماس پریس دہلی سے شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۲۴ء:

یکم فروری ۱۹۲۴ء کو باردولی کے ایک جلسۂ عام میں گاندھی جی نے ستیہ گرہ کرنے کا اعلان کیا لیکن ابھی تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد سورت میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ ۱۱،۱۲ر فروری کو مزید باردولی میں جلسۂ ہوا۔ لوگوں نے حالات کے پیش نظر گاندھی جی کو ستیہ گرہ کرنے کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کو کہا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کے فیصلے کو واپس لے لیا۔ یا غیر معین وقت کے لیے اٹھا رکھا۔ لیکن اس کی خبر اخبارات کے ذریعہ جب سارے ملک میں پہنچی اور گرفتار شدہ لیڈروں کو بھی جو جیلوں میں تھے تو وہ بہت جز بز ہوئے۔

ہندوستان کی سیاسی بیداری اور ہندی مزدوروں کی انقلابی تگ و دو کا اثر یہ ہوا کہ انگلستان میں مزدور پارٹی کے ۱۹۱ نمائندے کونسل (ایوان عام) میں کامیاب ہوئے اور شہنشاہ جارج پنجم

نے لیبر رہنما ریمزے میکڈانلڈ کو قلمدان وزارت سونپ دیا۔ اس خبر سے ہندوستان کے مزدوروں نے بڑی خوشیاں منائی تھیں۔ (حسرت موہانی..... ایک سیاسی ڈائری)

گاندھی جی کی رہائی:

۵؍فروری ۱۹۲۴ء: جیل کے اندر گاندھی جی کی آنتوں میں پھوڑا نکل آیا۔ وہ پونا کے سلیون اسپتال منتقل کیے گئے۔ وہاں ان کا آپریشن ہوا۔ صحت کی خرابی کے باعث وہ ۵؍فروری ۱۹۲۴ء کو رہا کر دیے گئے اور ۱۰؍مارچ ۱۹۲۴ء کو وہ جوہو صحت بنانے چلے گئے۔ اپریل کے پہلے ہفتہ میں انھوں نے ینگ انڈیا کا چارج لیا اور ہندو مسلم اتحاد پر مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹؍جون ۱۹۲۴ء کو انھوں نے کانگریس کی تنظیم نو کا پروگرام بھیجا جو ۲۷؍جون ۱۹۲۴ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوا۔ وہاں گاندھی جی نے جو منظر دیکھا اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور ۳۰؍جون ۱۹۲۴ء کے ینگ انڈیا میں انھوں نے لکھا کہ مجھ کو شکست ہو گئی اور میں شرمندہ ہوں کہ انھوں نے اجلاس کے آخر میں بڑی دلگیری کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں تمام لوگوں کا رنگ رخ خوب دیکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں۔ ادھر امیٹھی، سنبھل اور گلبرگہ میں بلوے ہو چکے تھے۔ اب کوہاٹ میں بڑا زبردست ہندو مسلم بلوہ ہوا۔ (تحریک خلافت، ص ۲۵۰)

خلافت کا خاتمہ:

۳؍مارچ ۱۹۲۴ء: ۳؍مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا خاتمہ کر دیا اور ترکی میں دیگر حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح دنیوی حکومت رہ گئی۔ اس واقعہ نے ہندوستان میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑا دی اور وہی مصطفیٰ کمال جو مسلمانوں کا اب تک ہیرو تھا لعن وطعن کا نشانہ بننے لگا۔ کچھ لوگ اس حد تک تجاوز کر گئے کہ اسے اسلام سے منحرف بلکہ اسلام کا دشمن قرار دینے لگے۔ وفاداران حکومت اور انگریز کے پٹھو اخبارات کی خوب بن آئی۔ وہ خوب بغلیں بجاتے اور مضحکہ اڑاتے تھے کہ آخر یہ سب کرنے سے کیا حاصل ہوا۔

گاندھی جی جب جیل سے رہا ہو کر آئے تو ان سے بھی لوگوں نے یہی سوالات کیے۔ گاندھی جی نے اپریل ۱۹۲۴ء کے پہلے ہفتہ میں ینگ انڈیا کا چارج لے لیا تھا اور اولین فرصت میں انھوں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا:

''اگر میں کوئی پیغمبر ہوتا اور مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا

یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہاک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا۔''

گاندھی جی کے یہ زرین الفاظ ان لوگوں کے تمسخر کا کافی وشافی جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کرنے میں ایک بھیانک غلطی کی تھی۔ گاندھی جی جن کا اصول سچائی تھا اور جو کبھی حق گوئی سے انحراف نہیں کرتے تھے، تحریک خلافت کو ہندوستان کی سیاسی بیداری کا سبب قرار دیتے ہیں اور تحریک خلافت کی حمایت میں بس یہ کافی ہے۔

مسلمانوں کا جوش وخروش بدستور قائم تھا۔ خلافت کمیٹیاں کام کررہی تھیں، جلسے ہو رہے تھے اور کوشش کی جارہی تھی کہ مصطفیٰ کمال اپنا فیصلہ بدل دیں۔ اپنے کو تسکین دینے کے لیے علم وذہانت کی پوری طاقت لگ رہی تھی۔ چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس عظیم حادثہ کے بعد ہی ایک مضمون ''النباء العظیم'' کے عنوان سے لکھا جو ''خلافت'' بمبئی اور ''زمیندار'' لاہور میں بالاقساط شائع ہوا۔ یہ مضمون اگر چہ عزل خلافت ہی سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس میں خلافت کے سلسلہ کے بہت سے مسائل پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ (تحریک خلافت، ص ۵۵-۲۵۴)

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ نہایت جامع اور مسئلے کے ہر پہلو پر حاوی اور نایاب مضمون مولانا غلام رسول مہر نے ''تبرکات آزاد'' میں شامل کر کے محفوظ کردیا ہے۔

جولائی ۱۹۲۴ء: روس سے برطانیہ کو ہندوستان میں ابتدا ہی سے خطرہ تھا۔ یہ ذکر آچکا ہے کہ ایک چار رکنی وفد جس میں مولانا محمد حسین آزاد شامل تھے، اس غرض سے وسط ایشیا بھجوایا تھا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن پھر یہ کام قادیانیوں کو سونپا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں ایک قادیانی محمد امین خاں ایران کے راستہ روس میں داخل ہوا اور روسی حکومت نے پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ وہ برطانوی حکومت کی مداخلت سے رہا ہوا۔ واپس آیا، تو میرزا محمود سے ہدایات لے کر دوبارہ ایک دوسرے شخص ظہور حسین کے ہمراہ لوٹ گیا۔ ظہور حسین بھی روسی حکومت کے ہاتھ آگیا اور دو سال ماسکو کے جیل میں رہا۔ بالآخر برطانوی سفیر مقیم ماسکو کی تگ ودو سے رہا ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں افغانستان اور انگریزوں میں جنگ چھڑی تو قادیانی ایک کمپنی کی شکل میں برطانوی خدمات انجام دینے لگ گئے۔ میرزا محمود کا چھوٹا بھائی ٹرانسپورٹ کور میں کام کرتا رہا۔ اس کے سپرد قبائلی علاقے کے حالات کی فراہمی کا مشن تھا۔ ایک شخص نعمت اللہ قادیانی کو افغانستان میں جاسوسی کے لیے مقرر کیا گیا۔ لیکن جولائی ۱۹۲۴ء میں وہ گرفتار ہوگیا اور افغانستان گورنمنٹ

نے سنگسار کر ڈالا۔ پھر فروری ۱۹۲۵ء میں دو اور قادیانی ملا عبدالحلیم اور ملا نور محمد اسی پاداش میں قتل کیے گئے۔ پہلا قادیانی جو افغانستان میں ہلاک کیا گیا، وہ صاحبزادہ عبداللطیف تھا جو میرزا محمود کے بیان کے مطابق (الفضل ۶ راگست ۱۹۳۵ء) جہاد کی مخالفت کے جرم میں قتل کرایا گیا۔ (تحریک خلافت نبوت، از شورش کاشمیری، ص ۲۹۔۲۸)

۲۹ راگست ۱۹۲۴ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس منتظمہ کا ایک اجلاس بہ مقام دہلی دفتر جمعیت علماے ہند میں ۲۹ راگست کو منعقد ہوا۔ اس میں ملک کے سیاسی حالات و مسائل کے بارے میں متعدد اہم تجاویز پاس کی گئیں۔ ایک تجویز میں کہا گیا کہ

''جمعیت منتظمہ کا یہ اجلاس مسودہ فرائض و اختیارات امیر الشریعت فی الہند کے متعلق تجویز کرتا ہے کہ ملک میں مناسب فضا ہونے تک اس کو موٴخر کر دیا جائے''۔

(جمعیۃ العلماے کیا ہے؟ حصہ دوم۔ ص ۹۷)

۱۸ ر ستمبر ۱۹۲۴ء: گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ۱۸ ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو ۲۱ دن کے برت کا اعلان کیا۔

خلافت کانفرنس بلگام:

۲۴ ر دسمبر ۱۹۲۴ء: بلگام میں ۲۴ ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو خلافت کا اجلاس ہوا اور ۲۶ ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو یہیں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ مہاتما گاندھی اس اجلاس کے صدر تھے۔ بڑی مشکل سے ان کو صدارت قبول کرنے پر راضی کیا گیا۔ خلافت کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ ۳۰ ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں مسٹر جناح نے مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کی اسکیم پیش کی تھی۔ مسٹر جناح کا فرقہ پرستی کی جانب یہ پہلا قدم تھا۔ اس سے پہلے وہ مشترکہ انتخاب کی تائید میں فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر مسلمان سیاست میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو وہ صدر دروازے سے آئیں نہ کہ عقبی دروازے، یعنی کھڑکی سے۔''

بلگام میں کانگریس ہی کے پنڈال میں ۲۷ ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو ہندو مہا سبھا کا بھی اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالوی نے کی۔ اس میں کانگریس کے لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ مالوی جی نے دعویٰ کیا کہ ہندو مہا سبھا کوئی فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے۔

بلگام میں آخرکار گاندھی جی نے سپر ڈال دی اور گاندھی، نہرو، داس معاہدہ تیار ہوا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ کونسلوں کا داخلہ منظور کر لیا جائے اور چرخہ کاتا ممبری کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔

گاندھی جی نے ترک موالات کو خیر باد کہا اور اپنے آشرم میں واپس چلے گئے۔

ملاپ کانفرنس:

۲۶؍ستمبر تا ۲؍اکتوبر ۱۹۲۴ء:

برٹش حکومت نے ہندو مسلم اختلافات کے لیے جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ اب اس چنگاری نے شعلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔

نتیجے کے طور پر کئی جگہ قومی فساد ہوئے۔ بھاگلپور، بہار، دلی اور گلبر گہ میں زبردست فساد ہوا۔ سرحد کے شہر کوہاٹ میں بڑا بھاری بلوہ ہوا۔ سیکڑوں افراد مارے گئے، مال و اسباب لوٹا اور جلایا گیا۔ گاندھی جی ان فسادات سے بہت متاثر ہوئے اور دہلی آکر مولانا محمد علی کے یہاں ٹھہرے۔ صلح کے لیے انھوں نے ۲۱ دن کا برت شروع کر دیا۔ ڈاکٹر انصاری گاندھی جی کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ عوام پر اس کا بہت اثر ہوا اور سارے ملک میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ مولانا محمد علی نے تمام فرقوں کی ایک کانفرنس دلی میں بلوائی۔ کلکتہ سے لارڈ بشپ ڈاکٹر ویسٹ کوٹ بھی آئے، کئی دنوں تک برابر اجلاس میں بحث ہوتی رہی۔

اکتوبر ۱۹۲۴ء: اس کے نتیجہ میں ایک ملاپ کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ملک کے تمام ممتاز لیڈر شریک ہوئے۔ کانفرنس کے صدر موتی لال نہرو تھے۔ ایک حصہ بانس سے الگ گھیرا ہوا تھا۔ اس میں تمام لیڈر بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے آرام کرنے کا یا باہمی گفت و شنید تنہائی میں کرنے کا انتظام تھا۔ دوسری جانب تمام پبلک کو آنے اور بیٹھنے کی اجازت تھی۔ میں (قاضی عدیل عباسی) مولانا عبدالحلیم (صدیقی) اور مولانا محمد عرفان کے ساتھ (دونوں میرے رفیق اور جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں تھے) برابر شریک رہا۔ اس کانفرنس میں مختلف مسائل زیر بحث آئے اور سب پر بحث و گفتگو کے بعد اتفاق رائے ہو گیا۔ اس طرح اس وقت گویا تمام ہندو مسلم مسائل طے ہو گئے تھے۔

جس دن گائے کی قربانی پر بحث آنے والی تھی اس کے ایک دن قبل تمام مسلم لیڈر حکیم اجمل خاں کے مکان پر جمع ہوئے اور وہاں یہ طے ہوا کہ سب مسلمان لیڈر چپ بیٹھے رہیں اور جب سب لوگ کہہ لیں تو صرف مفتی کفایت اللہ جواب دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ جیسے ہی جلسہ شروع ہوا مولانا مظہر الدین کھڑے ہو گئے اور انھوں نے ایک مہمل سی تقریر کر دی۔ اس کا تو کسی نے لحاظ نہیں کیا کیونکہ ان کی کل ہند پوزیشن ہی نہ تھی۔ لیکن مولانا محمد علی نے یہ ضابطہ توڑ دیا اور ایک تقریر

کے دوران کہہ دیا کہ "اگر ہندو میری بیوی یا میری ماں کی عصمت دری کریں تب بھی میں ہندوؤں سے نہیں لڑوں گا۔" اس جملہ سے مسلمانوں میں بڑا خلجان پیدا ہوا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد میں تھوڑی دیر ٹھہر گیا۔ دیکھا کہ حکیم اجمل خاں مولانا محمد علی سے کہہ رہے ہیں کہ جب یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی تقریر نہیں کرے گا تو آپ نے کیوں تقریر کی؟ مولانا محمد علی جھلا گئے اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ "میں ایسا ذلیل نہیں ہوں کہ آپ مجھے ڈانٹیں۔" میں یہ جواب سن کر سکتہ میں رہ گیا۔ عصر کی نماز کے لیے مولانا عرفان، مولانا عبدالحلیم، مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے قریب کی مسجد میں گئے۔ وہاں ہو کا عالم تھا۔ مولانا مدنی نے دریافت کیا کہ نماز عصر کا کیا وقت مقرر ہے تو ان دونوں نے (جو ان کے مرید بھی تھے) کہا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ جب لوگ آجاتے ہیں نماز ہو جاتی ہے۔ مولانا مدنی مسکرائے اور کہا کہ صاف کیوں نہیں کہتے کہ نماز با جماعت پڑھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا ہے۔ وہاں مولانا عبدالحلیم نے یہ بھی مولانا مدنی سے کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنی بیوی کی عصمت دری کے بارے میں کہا تو خیر، مگر ماں کے لیے کیوں کہا، کیونکہ وہ تو ہم سب کی بھی ماں ہیں۔ مولانا مدنی پھر مسکرائے اور کہا کہ ان کو بھی تو آپ کہہ دیں گے کہ ہماری بہن ہیں۔ گویا کہ کسی اشتعال میں نہیں آئے اور ٹال گئے۔ یہ ٹال جانا مولانا محمد علی کی زندگی میں ناپید تھا!

کانفرنس نہایت سادگی کے ساتھ منعقد ہوئی۔ کوئی آرائش نہ تھی۔ خطبۂ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت میں بھی وقت نہیں لگایا گیا۔ براہ راست کام کی باتیں شروع ہوئیں۔ پہلی تجویز مندروں کے گرائے جانے پر آئی۔ فوراً کسی صاحب نے یہ ترمیم پیش کر دی "مساجد کا لفظ مندروں کے بعد بڑھا دیا جائے" اس پر گرم بحثیں ہونے لگیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کھڑے ہوئے اور انھوں نے ترمیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ایک حرف "ابھری ہوئی" حقیقتیں ہیں (نمایاں کا سہل ترجمہ "ابھری ہوئی" پہلی مرتبہ ہم لوگوں نے مولانا آزاد کی زبان سے سنا اور تعجب کیا) جن صاحب نے یہ ترمیم پیش کی کہ وہ کسی مسجد کے گرائے جانے کی مثال نہ پیش کر سکے اور ترمیم واپس لے لی۔

بڑا معرکہ اس دن ہوا جب گائے کی قربانی کا مسئلہ پیش ہوا۔ مسلمان سب خاموش رہے۔ پٹیل لنگوٹی پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی ہندو ہوں۔ گائے میرے نزدیک مقدس اور متبرک ہے لیکن مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ گائے کے بارے میں ہم اپنا عقیدہ مسلمان بھائیوں پر زبردستی تھوپیں۔ البتہ اگر وہ خود برضا و رغبت اسے ترک کر دیں تو بہتر ہے۔

اس کے بعد لالہ لاجپت رائے کھڑے ہوئے اور انھوں نے طنزیہ انداز میں تقریر شروع کی اور کہا کہ میں ہندوؤں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آج ان میں ایک کا اضافہ ہوا ہے۔ کل مجھ سے پٹیل جی نے کہا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں اور آج کہہ رہے ہیں کہ میں ہندو ہوں۔ لالہ جی نے مکمل امتناع گاؤ کشی کی تجویز پیش کی۔ پنڈت مدن موہن مالوی جی نے ایسی شستہ اردو میں تقریر کی ہم سب محو حیرت رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ درمیانی راستہ بہتر ہے۔ جہاں کہیں قربانی ہوتی ہے وہاں ہندو کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں اور نہ قانونی جبر ڈالا جائے لیکن جہاں نہیں ہوتی وہاں مسلمان نئے سرے سے گائے کی قربانی نہ کریں۔ کچھ اور تقریروں کے بعد مفتی کفایت اللہ نے بڑی مدلل تقریر کی اور ذبیحۂ گاؤ اور قربانی گاؤ کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ مسلمان گائے کا ذبیحہ بالکل بند کردیں۔ بحث ختم نہیں ہوئی۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ پنڈت مالوی جی مولانا کفایت اللہ صاحب سے کہہ رہے تھے کہ ''مولانا ذرا غور کیجیے۔ اس پر نظر دوڑائیے کہ ہم ہندوؤں کے جذبات گائے کے بارے میں کیا ہیں۔ پھر بھی ہم اس پر راضی ہیں کہ جہاں گائے کی قربانی ہوتی ہے ہو اور اس پر بھی راضی ہیں کہ قانون سے کہیں روکا نہ جائے۔ جب ہم اس حد تک جھک رہے ہیں تو آپ بھی اپنی جگہ سے کچھ ہٹیے۔ آخر اس میں آپ کو کیا قباحت ہے کہ آپ تسلیم کرلیں کہ جہاں نہیں ہوتی ہے نہ ہو۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں آج تک گائے کی قربانی ہوئی نہیں صرف انھیں جگہوں پر آپ برضا و رغبت آئندہ بھی نہ کریں۔'' مفتی صاحب پہلے تو اڑے مگر اڑنے کی گنجائش کہاں تھی۔ آخرکار مان گئے اور پنڈت مالوی کی تجویز پاس ہوگئی۔ افسوس ہے کہ بعد میں کوئی اس پر قائم نہ رہا اور شاید اس عہد کو توڑنے کی پہل مسلمانوں ہی نے کی۔

کانفرنس میں سی آر داس موجود نہ تھے۔ ان کو کلکتہ تار دیا گیا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ آئے۔ سنا کہ پہنچتے ہی پوچھا کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ لوگوں نے کہا گاندھی جی برت رکھ رہے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے راستہ کی رکاوٹیں دور کرنی ہیں۔ داس نے جواب دیا کہ گاندھی اپنے ضمیر کی آواز پر برت رکھ رہے ہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے وہ کسی کے کہنے سے اس کو روک نہیں سکتے۔ رہا ہندو مسلمان کا معاملہ تو میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان، میری کیا ضرورت ہے۔ دوسری ٹرین سے واپس آگئے۔ الغرض اسی طرح بہت سے نزاعی امور پر بحث رہی اور آخرکار کل مسائل اتفاق رائے سے طے ہوگئے مگر اختلاف کی جڑیں زیادہ گہری تھیں۔ صرف مسجد کے سامنے باجہ دنگا فساد گائے کی قربانی وغیرہ فروعی مسائل پر بحث آئی اور بظاہر اتحاد قائم ہوگیا جو دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

(تحریکِ خلافت: ص ۵۲-۲۵۰)

اتحاد کانفرنس دہلی:

یہ رہنما کانفرنس ۲۶ ستمبر تا ۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء دہلی میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر مولانا محمد علی تھے اس میں پاس ہونے والی قراردادیں اسی زمانے میں کتابچے کی صورت میں آئی ایم ایچ پریس دہلی سے شائع ہوگئیں تھیں۔ چوں کہ جمعیت علماے ہند کے صدر مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کے مباحث میں سرگرم حصہ لیا تھا اور بحث ونظر کے ہر مقام اور ہر مرحلے میں اپنے تدبر اور اسلامی غیرت اور سلامت روی کے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ اسی لیے مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے اسے کفایت المفتی (جلد نہم) کا حصہ بنادیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں کے تدبر اور سلامت روی کے یہ یادگار تاریخی نقوش اس ڈائری میں محفوظ ہوجائیں۔ اس لیے اس اتحاد کانفرنس کی تاریخی قراردادیں، اہم دستاویزی مراسلت اور چند دیگر ضروری مباحث مرتب ہوجائیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن واصف تمہید وتعارف میں لکھتے ہیں:

''۱۹۲۲ء میں جب ایک مشہور کانگریس لیڈر سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کی اور ہزاروں ملکانوں کو مرتد کرایا اور اس کی نتیجے میں تمام ہندوستان میں فرقہ وارانہ بلوے شروع ہوگئے تو ۱۷ ستمبر ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اکیس دن کا برت شروع کیا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو سنگم تھیٹر (حال جگت ٹاکیز) مقابل ایڈورڈ پارک دہلی میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک عظیم الشان اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ مولانا محمد علی صدر استقبالیہ تھے۔ اس میں مسلم زعما میں سے حضرت مفتی اعظمؒ کے علاوہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، حکیم محمد اجمل خان، مولانا احمد سعید بھی شریک تھے ہندو لیڈروں نے اپنی تقریروں میں اتحاد کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزا مرتد اور تبلیغ کو نکال ڈالیں تاکہ امن واتحاد قائم ہو۔''

قراردادیں،

اس کانفرنس میں جو قراردادیں پاس ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے:

تحریک ۱: یہ کانفرنس مہاتما جی کے روزے پر اپنی دلی تشویش اور فکر کا اظہار کرتی ہے یہ کانفرنس زور کے ساتھ اس خیال کا اظہار کرتی ہے کہ ضمیر اور مذہب کی پوری پوری آزادی از حد

ضروری ہے۔ یہ کانفرنس عبادت گاہوں کی بے حرمتی کو خواہ وہ کسی مذہب یا ملت کی کیوں نہ ہوں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور کسی شخص کو اس کی تبدیلی مذہب پر سزا دینے یا تکلیف پہنچانے کو برا سمجھتی ہے۔ یہ کانفرنس کسی مذہب کو جبراً تبدیل کرانے کی کوشش یا بغیر دوسروں کے حقوق کا خیال کرتے ہوئے اپنی مذہبی رسموں کو دوسرے کے حقوق کو پامال کرتے ہوئے برتنے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

کانفرنس کے ممبر مہاتما گاندھی کو یقین دلاتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ وہ اصول مذکورہ بالا کو عمل میں لانے کی حتی المقدور ہر کوشش کریں گے اور اشتعال کی حالت میں بھی ان اصولوں سے ہٹنے کو برا سمجھیں گے۔ یہ کانفرنس پریسیڈنٹ کو اختیار دیتی ہے کہ وہ خود جا کر مہاتما جی سے کانفرنس کی یہ مجموعی خواہش ظاہر کریں کہ مہاتما جی اپنا روزہ فوراً ختم کر دیں تا کہ یہ کانفرنس ان کی صلاح، رہنمائی اور امداد سے فائدہ حاصل کر کے ان ذرائع کو طے کر سکے جس سے وہ برائی جو ملک میں تیزی سے بڑھ رہی ہے پورے طریقے پر روکی جا سکے۔

تحریک ۲: یہ کانفرنس ان جھگڑوں اور فسادوں پر جو ہندو اور مسلمانوں میں مختلف جگہوں پر ہندوستان میں ہو رہے ہیں اور جن میں جانیں ضائع ہوئی ہیں، جائداد تباہ کی گئی اور جلائی گئی ہے اور مندروں کی بے حرمتی ہوئی ہے افسوس ظاہر کرتی ہے۔ کانفرنس کے خیال میں یہ حرکتیں وحشیانہ اور مذہب کے خلاف ہیں۔ کانفرنس ان لوگوں سے جن کا ان فسادات میں نقصان ہوا ہے اظہار ہمدردی کرتی ہے۔ اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ انتقام یا سزا کی غرض سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا مذہب اور قانون کے خلاف ہے۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ تمام متنازعہ فیہ امور خواہ کسی قسم کے کیوں نہ ہوں، پنچایت کے سامنے پیش کیے جائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو عدالتوں کے ذریعے سے ان کا فیصلہ کرایا جائے۔

تحریک ۳: یہ کانفرنس ایک مرکزی قومی پنچایت مقرر کرتی ہے، جس کے ممبروں کی تعداد پندرہ آدمیوں سے زیادہ نہ ہوگی تا کہ وہ مختلف جگہوں پر مختلف اقوام کے مقامی نمایندوں کی صلاح سے لوکل پنچایت قائم کر کے تمام جھگڑوں اور اختلافات کا مع ان جھگڑوں کے جو حال میں ہوئے ہیں اور جن کا تصفیہ پنچایت ضروری اور مناسب خیال کرتی ہے۔ تحقیقات کے بعد تصفیہ کر دے اس قومی پنچایت کو اس تحریک پر عمل درآمد کرنے کے لیے قواعد اور قوانین بنانے کا اختیار ہوگا۔

یہ کانفرنس حسب ذیل اصحاب کو مرکزی قومی پنچایت کا ممبر مقرر کرتی ہے۔ اور انھیں اختیار دیتی ہے کہ ۱۵ ممبروں کی تعداد پوری کرنے کے لیے اور ممبر اپنے میں شامل کر لیں۔ یہ ممبران لوکل

نمایندے بھی بطور اڈیشنل ممبروں کے شامل کر سکتے ہیں۔

۱۔مہاتما گاندھی؛ سرپنچ (داعی) ۲۔حکیم اجمل خاں ۳۔لالہ لاجپت رائے ۴۔مسٹر جی۔کے۔ نریمان ۵۔ڈاکٹر ایس۔کے۔دت ۶۔ماسٹر سندر سنگھ لائل پوری۔

تحریک ۴: ہندستان کی مختلف قوموں کے درمیان بہتر تعلقات کو ترقی دینے کے عام اصولوں کو جن کا اعادہ تحریک میں کیا گیا ہے لائحۂ عمل میں لانے کی غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے اور تمام مذاہب اور عقائد و مذہبی رسومات میں باہمی رواداری پیدا کرنے کے لیے یہ کانفرنس اپنی یہ رائے ظاہر کرتی ہے؛

الف۔ ہر ایک فرد و فرقہ کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس عقیدے کو چاہے اختیار کرے اور دوسروں کے احساسات اور حقوق کا مناسب احترام کرتے ہوئے اپنے عقائد کا اظہار اور مذہبی رسوم کا اتباع کرے۔ لیکن کسی حالت میں کوئی فرد یا فرقہ کسی دوسرے مذہب کے بانیوں یا مقدس ہستیوں یا مذہبی اصولوں کو برا کہنے کا مجاز نہ ہوگا۔

ب۔ تمام معابد خواہ وہ کسی مذہب یا عقیدہ سے تعلق رکھتے ہوں متبرک اور ناقابل تخریب تصور کیے جائیں گے اور کسی وجہ سے خواہ وہ اشتعال یا اسی قسم کی مذہبی توہین کا بدلہ کیوں نہ ہو ان پر حملہ یا ان کی توہین نہ کی جاسکے گی۔ ہر ایک شہری کا خواہ وہ کسی مذہب یا عقیدہ سے تعلق رکھتا ہو فرض ہوگا کہ اس قسم کے حملہ یا توہین کو جہاں تک ہوسکے روکے اور جہاں اس قسم کا حملہ کیا جا چکا ہے یا معابد کی توہین ہو چکی ہے تو اس پر بلا تامل اظہار نفرت کرے۔

ج۔ (۱) ہندوؤں کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ باہمی معاہدے کے علاوہ مسلمانوں کو ان کے گاؤکشی کے استعمال سے جبراً یا مقامی بورڈوں کو قرار داد یا جماعت قانون ساز کے قانون یا عدالت کے حکم سے روکا جاسکتا ہے۔ ہندوؤں کو اس کے لیے مسلمانوں کے نیک احساس اور دونوں قوموں میں بہتر تعلقات کے قائم ہو جانے پر بھروسا کرنا چاہیے، جس کی وجہ سے ہندوؤں کے جذبات کا مسلمانوں کے دلوں میں زیادہ احترام پیدا ہوگا۔

(۲) مذکورہ بالا دفعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی مقامی رواج یا دونوں قوموں کے باہمی معاہدے پر جو پہلے ہو چکا ہے، کوئی اثر نہ ڈالے گا اور نہ اس کو مسترد کرے گا اور نہ اس کی وجہ سے کسی ایسی جگہ گاؤکشی کو اجازت ہوگی جہاں پہلے گاؤکشی نہیں ہوئی ہے۔ اس بارے میں واقعات کے متعلق تمام جھگڑے قومی پنچایت جس کا ذکر تحریک نمبر (۳) میں ہو چکا ہے طے کرے گی۔

(۳) ذبیحہ گاؤ اس طرح ہوگا جس سے ہندوؤں کے مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہنچے۔

(۴) اس کانفرنس کی مسلمان ممبران اپنے ہم مذہبوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ گاے کے ذبیحہ کو کم کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں۔

و۔(۱) مسلمانوں کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ باہمی معاہدہ کے علاوہ وہ مسجدوں کے قریب یا ان کے سامنے ہندوؤں کے باجہ بجانے کو جبراً یا عدالت کے حکم سے یا جماعت قانون ساز کے قانون سے یا مقامی بورڈوں کی تحریک سے روک سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کے نیک احساس پر بھروسا کرنا چاہیے کہ وہ ان کے جذبات کا اس معاملہ میں لحاظ رکھیں۔

(۲) مذکورہ بالا دفعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی مقامی رواج یا دونوں قوموں کے باہمی معاہدہ پر جو پہلے ہو چکا ہے کوئی اثر نہ ڈالے گا اور نہ اس کو مسترد کرے گا۔ اور نہ اس کی وجہ سے کسی ایسی مسجد کے سامنے باجہ بجانے کا حق ہوگا۔ جہاں اب تک باجا نہیں بجایا گیا ہے اس موخر الذکر مسئلے۔کے بارے میں اگر کوئی واقعات کے متعلق جھگڑا ہوگا تو اس کا تصفیہ قومی پنچایت کرے گی، جس کا ذکر تحریک (۳) میں گزر چکا ہے۔

(۳) اس کانفرنس کے ہندو ممبران اپنے ہم مذہبوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ مسجدوں کے نزدیک اس طرح سے باجا بجانے سے احتراز کریں جس سے جماعت کی نماز میں خلل واقع ہو۔

ہ۔(۱) مسلمانوں کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ باہمی رضامندی کے علاوہ وہ پوجا کے وقت یا دوسرے موقعوں پر ہندوؤں کو اپنے مکانوں یا مندروں یا دیگر عام جگہوں پر کسی وقت آرتی کرنے یا باجا بجانے سے جس میں سنکھ کا بجانا شامل ہے، جبراً یا عدالت کے حکم یا جماعت قانون ساز کے قانون یا مقامی بورڈوں کی قرارداد کے ذریعے سے روک سکتے ہیں، چاہے ایسا مکان مندر یا عام جگہ کسی مسجد کے نزدیک ہی کیوں نہ ہو بلکہ ان کو ہندوؤں کے نیک احساس پر بھروسا رکھنا چاہیے کہ وہ ان کے اوقات کا لحاظ رکھیں گے۔

(۲) مذکورہ بالا دفعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی مقامی رواج یا دونوں قوموں کے آپس کے معاہدے پر جو پہلے ہو چکا ہے کوئی اثر نہ ڈالے گا اور نہ اس کو مسترد کرے گا۔ اگر اس بارے میں واقعات کے متعلق کسی قسم کا جھگڑا ہو تو اس کا تصفیہ قومی پنچایت متذکرہ دفعہ ۳ کرے گی۔

و۔ مسلمانوں کو آزادی ہے کہ وہ اپنے مکانوں میں یا کسی مسجد میں یا کسی عام جگہ پر جو کہ اور

قوم کے مذہبی رسوم کے واسطے مخصوص نہ کی گئی ہو، اذان دے سکتے ہیں یا نماز ادا کر سکتے ہیں۔

ز۔ (۱) جب کسی جانور کی جان لینے، اور اس کے گوشت فروخت کرنے کی اور (کسی) بنا پر اجازت ہو تو اس کے جان لینے کے طریقے پر خواہ جھٹکا ہو یا بلی ہو، یا ذبح ہو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

(۲) جہاں کہیں کسی محلّے یا جگہ میں کسی قسم کے گوشت کے فروخت کرنے کے بارے میں کوئی جھگڑا ہو تو وہ جھگڑا اس قومی پنچایت کے ذریعے سے طے ہوگا جس کا ذکر تحریک نمبر ۳ میں ہو چکا ہے۔

ح۔ ہر شخص کو اس امر کی آزادی ہے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے اسے ترک کر دے۔ ترک مذہب کی وجہ سے متروک مذہب کے ماننے والوں کو اس کو سزا دینے یا کسی طرح سے تکلیف پہنچانے کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

ط۔ ہر شخص اور ہر گروہ کو آزادی ہے کہ وہ دوسرے کو دلائل یا سمجھانے سے اپنے مذہب میں داخل کرے یا اپنے مذہب سے دوسرے مذہب میں گئے ہوئے لوگوں کو پھر اپنے مذہب میں واپس لے لے، لیکن اس کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ ایسا کرنے یا اس کے روکنے کے لیے دغابازی یا ناجائز ذریعہ مثلاً مادی لالچ سے کام لے۔ لڑکے یا لڑکیوں کو اپنے والدین جائز یا ولی کے ساتھ تبدیل مذہب کرنے کے علاوہ ۱۶ برس سے کم عمر کے لڑکے یا لڑکیوں کا مذہب تبدیل نہ کرایا جائے۔ اگر غیر مذہب کا آدمی کسی ۱۶ برس سے کم عمر کے لڑکے یا لڑکی کو کہیں اپنے والدین یا ولی سے الگ بھٹکتا ہوا پائے تو اسے فوراً اس کے ہم مذہبوں کے حوالے کر دے کسی مذہب کی تبدیلی یا سابق مذہب میں واپس لانے کے سلسلے میں کسی قسم کی خفیہ کارروائی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

ی۔ کوئی قوم دوسری قوم کے کسی فرد کو اپنی زمین پر جو اس کی ملکیت ہے کسی نئی عبادت گاہ کے بنانے سے بجبر نہ روکے گی لیکن یہ عبادت گاہ دوسری قوم کی موجود عبادت گاہ سے مناسب فاصلہ پر ہونی چاہیے۔

تحریک ۵: اس کانفرنس کی رائے میں مبالغہ آمیز واقعات چھاپ کر ایک دوسرے کے مذہب کو برا بھلا کہہ کر اور ہر ایک طریقہ سے تعصب کو بڑھا کر مختلف قوموں میں کشیدگی زیادہ کرنے کی ذمہ داری ایک طبقۂ اخبارات پر ہے جو بالخصوص شمالی ہند میں موجود ہیں۔ یہ کانفرنس ایسی تحریروں پر اظہار نفرت کرتی ہے اور پبلک سے اپیل کرتی ہے کہ ایسے اخباروں اور پمفلٹوں کو مدد نہ دیں۔ یہ کانفرنس مرکزی اور مقامی پنچایتوں کو صلاح دیتی ہے کہ ایسی تحریروں کی نگرانی کریں

اور وقتاً فوقتاً صحیح خبریں بغرض اطلاع عام شائع کیا کریں۔

تحریک ۶: چوں کہ اس کانفرنس کو بتایا گیا ہے کہ اکثر جگہوں پر مسجدوں کے متعلق نا مناسب حرکتیں عمل میں آئی ہیں، اس لیے اس کانفرنس کے ہندو ممبران ایسے افعال کو جہاں کہیں بھی وہ سرزد ہوئے ہوں بہ نظر نفرت دیکھتے ہیں۔

تحریک ۷: اس کانفرنس کے ہندو اور مسلمان ممبران اپنے ہم مذہبوں سے استدعا کرتے ہیں وہ ہندوستان کی دوسری چھوٹی چھوٹی قوموں کے ساتھ پوری رواداری کا برتاؤ کریں اور قومی تعلقات کے ہر ایک سوال میں انصاف اور فیاضی سے کام لیں۔

تحریک ۸: اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ ایک قوم کے لوگوں کی طرف سے دوسری قوم کے لوگوں کا بائیکاٹ کرنا یا ان سے سوشل یا تجارتی تعلقات کا منقطع کر لینا جیسا کہ ملک کے چند حصوں میں ہوا ہے، قابل ملامت ہے۔ اور اس سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں اچھے تعلقات کی ترقی پانے میں زبردست رکاوٹ ہوتی ہے۔ یہ کانفرنس اس لیے تمام قوموں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس قسم کے بائیکاٹ یا منافرت سے اجتناب کریں۔

تحریک ۹: یہ کانفرنس ہندوستان کی تمام قوموں کے مرد اور عورتوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ مہاتما گاندھی کے روزے کے آخری نازک ہفتہ میں روزانہ دعا کریں اور ہر ایک گاؤں اور قصبے میں ۸/اکتوبر ۱۹۲۴ء کو عام جلسہ کر کے قوم کی طرف سے قادر مطلق کا شکریہ ادا کریں اور اس کی جناب میں دعا کریں کہ ہندوستان کی تمام قوموں میں محبت اور اخوت کے جذبات پیدا ہوں اور اتحاد پیدا ہو۔ اور جن مکمل مذہبی آزادی اور باہمی محبت کے اصولوں کا اظہار کانفرنس میں کیا گیا ہے اس پر ہندوستان کی تمام قومیں کاربند ہوں۔

سکریٹریان

جواہر لال نہرو و شعیب قریشی' ایک اہم مراسلت:

قتل مرتد کا مسئلہ اگرچہ غیر مسلموں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے لیکن چوں کہ افغانستان میں نعمت اللہ خاں کو جو قادیانی ہو گیا تھا سنگ کیا جا چکا تھا اس وجہ سے ذہنوں پر پھر مسلط ہو گیا۔ اور منظم تبلیغ اگرچہ شدھی کے جواب میں ارتداد کے سدباب کے طور پر تھی مگر ناگوار ہو رہی تھی۔

جب قرارداد کی پہلی تجویز حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں آئی تو

ان کا دل تڑپ اٹھا اور مولانا نے فوراً پے در پے مندرجہ ذیل مسلم و غیر مسلم زعما کو تار اور خطوط بھیجے۔

(۱) مدیر اخبار شوکت۔ بمبئی، (۲) مہاتما گاندھی، (۳) پنڈت موتی لال نہرو، (۴) مولانا محمد علی، (۵) مولانا کفایت اللہ، (۶) مولانا شوکت علی، (۷) مولانا حسین احمد، (۸) مولانا حفیظ اللہ مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء۔

یہ تمام مفصل خط و کتابت ایک رسالہ کی صورت میں بنام ''سر الاصلاح'' منشی مظفر علی نے مرتب کر کے شائع کر دی تھی۔ یہاں صرف چند خطوط درج کیے جاتے ہیں:

خط از مولانا عبدالباریؒ بنام مولانا حسین احمدؒ (دہلی)

مکرمی دام مجدہ! السلام علیکم

آپ کا تار آیا۔ مجھے تعجب ہے کہ میرا مقصد صاف و واضح غالباً آپ حضرات تک نہیں پہنچا۔ میں ابھی تک یہ نہ سمجھ سکا کہ کس سبب سے مبحث عنہ تحریک مذہب کے خلاف نہیں ہے؟ اگر اس کے الفاظ کا مفہوم غلط ہے تو یہ بات مانی جاسکتی ہے۔ اگر شائع شدہ الفاظ صحیح ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اس کو ہم مذہب کے احکام کے خلاف نہ سمجھیں۔

مولانا! نفس مسئلہ حکم قتل مرتد میں موجودہ حالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کلام نہیں ہے۔ اگر کوئی سزا دے مرتد کو تو اس پر نفرت کی جائے۔ یہ مابہ النزاع ہے۔ اس میں تو تمام افعال و اقوال و احکام اگلے پچھلے اندرون ہند، بیرون ہند سب داخل ہیں۔ اور فرض کیا جائے کہ اندرون ہند اور وہ بھی برٹش انڈیا کے ساتھ تحریک مخصوص ہے تو اس میں بھی ایسی صورت داخل ہے کہ جس میں کسی کا لڑکا مرتد ہو جائے (والعیاذ باللہ) اور وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ اس کو چند دن اپنے گھر میں باندھ رکھے اور فہمائش کرے اس کو گمان غالب ہے کہ اگر ایسا کیا جائے وہ دین میں پھر واپس آجائے گا جیسا کہ خود موتی لال صاحب کی لڑکی کے بارے میں گاندھی صاحب نے کیا تھا۔ اب یہ صورت بھی اس ریزولیوشن میں قابل نفرت و ملامت ہے۔ لیکن اس پر خاک ڈالیے اور اس تاویل سے مان بھی لیجیے تو میں اس پر کد نہ کروں گا۔ اگر قدمائے متقدمین کے افعال کو کسی طرح مستثنیٰ کر دیا جاتا۔ مجھے بھائی محمد علی و شوکت علی صاحبان سے فرد گذاشت پر تعجب نہیں ہے۔ مگر آپ ایسے علمائے متبحرین سے اس فرد گذاشت کو سخت قابل تعجب سمجھتا ہوں پھر اگر مان بھی لیا جائے کہ ہم قتل (مرتد) بلکہ کوئی اور سزا مرتد کو نہیں دے سکتے۔ غور فرمائیے کہ اگر کوئی ادنیٰ سزا دے اور سمجھے کہ اس

سزا کو دینا مرتد کی اصلاح کا باعث ہوگا تو اس پر بھی آپ کی نفرت و ملامت موجود ہے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کسی نصرانی حربی مثل دھوبی کے قاتل پر اگر کسی نے نفرت کی حالانکہ ہندوستان میں اس قسم کے قتل کی فرضیت کا کوئی قائل نہیں اور اصول ترک موالات بلا تشدد مجوزہ گاندھی جی کے بھی خلاف ہے اس پر اظہار نفرت کرنا برا ہوا اور اس قسم کی سزا مرتد کو دینا جس سے اصلاح کی امید ہے ،قابل نفرت سمجھا جائے بلکہ اس پر مجمع میں نفرت کی جائے۔ صاف اور واضح بات کو چھوڑ کر کہ ''ہم ہندوستان میں نہ قبل سوراج نہ بعد سوراج قتل مرتد کا حکم نہیں دیتے'' ایسی لغو اور بے معنی عام تحریک کرنا کیا ضروری تھا۔ اور اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ مانا کہ اس ریزولیشن سے فتنۂ ارتداد رفع ہوتا ہے، گو اس کی امید نہیں، لیکن مقصود اس کا یہی سمجھا جائے تو بھی جملہ مابہ النزاع سے جو مذہبی خرابی اب پیش ہے اس سے تو فتنہ ارتداد بڑھ جاتا ہے۔

شادم کو از رقیباں دامن کشاں گزشتی
گو مشت خاک ماہم برباد رفتہ باشند

ایک فتویٰ جو علماے ہندوۃ نے آج بھیجا ہے اس کی نقل مرسل ہے۔

فقیر محمد عبدالباری ۲ ر ربیع الاول ۱۳۴۳ء

خط از مولانا شوکت علیؒ بنام مولانا عبدالباریؒ:

دہلی۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۴ء

حضور ولا! السلام علیکم

کل ایک تار پنڈت موتی لال نہرو، محمد علی اور مولانا کفایت اللہ صاحب کے نام آیا۔ جب میں لکھنو حاضر ہوا تھا تو عرض کیا تھا کہ اس وقت لکھنو حاضر ہونے کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ موجودہ کانفرنس میں پیش ہونے والے مسائل کے بارے میں شرعی احکام کے متعلق حضور کی یا کم از کم مولوی عنایت اللہ صاحب کی اعانت حاصل کروں۔ ابتداے تحریک سے بار بار اور مسلسل عرض کرتا رہا ہوں کہ میں فقہ سے اور احکام شرعیہ کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں، اس لیے ہمیشہ ہر مسئلے میں حضور کی راے دریافت کرلیا کرتا ہوں۔ یہ ایک نازک موقع تھا جس مین اکثر مذہبی امور پر بحث ہونے والی تھی اس لیے میں نے چاہا تھا کہ مولوی عنایت اللہ صاحب ضرور شریک ہوں، مگر وہ تشریف نہیں لائے۔ اب مجبوراً ہم کو یہاں ان علماء کی راے پر اعتماد کرنا پڑا جو کانفرنس میں تشریف

رکھتے ہیں۔ مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا حسین احمد صاحب، مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ
اس لیے ہم لوگوں پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ جیسا علماء نے یہاں فتویٰ دیا اس پر عمل کر کے تحریک
پیش کی گئی۔ پاس کی گئی۔ جس وقت یہ تحریک پیش کی گئی تو سب سے پہلے علماء کی رائے اس مسئلے
میں دریافت کی گئی۔ مولانا کفایت اللہ صاحب نے بلا کسی شرط یا مشتبہ الفاظ کے صاف اور واضح
طور پر بیان کیا کہ مرتد کی سزا یقیناً ازروے شرع شریف قتل ہے۔ مگر اس سزا کا نفاذ ہندوستان میں
اب یا بعد حصول سوراج نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس کے نفاذ کے لیے سلطان کی موجودگی،
قانون اسلام کا نفاذ اور محکمہ قضاۃ وغیرہ وغیرہ کا موجود ہونا ضروری ہے، جو یہاں نہ اب ہے اور نہ
آیندہ ہوسکتا ہے۔ پھر ان سے سوال کیا گیا کہ کوئی سزا علاوہ قتل کے دی جاسکتی ہے یا نہیں اس کا بھی
انھوں نے یہی جواب دیا۔ اب انھیں کے الفاظ ریزولیوشن میں رکھ دیے گئے۔ جہاں تک میں
سمجھتا ہوں حضور کو شاید یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس پر ریزولیوشن کا کسی طرح کا بھی تعلق اس قانون مرتد
سے ہے جس کا اس وقت نفاذ ریاست بھوپال میں ہے۔ اس کے متعلق شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے
کیوں کہ ریاستوں سے ہم کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے کسی ریزولیوشن کا کوئی اثر ریاست کے
قوانین پر نہ اب پڑ سکتا ہے اور نہ آیندہ کبھی پڑنے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر ریاست نظام میں
اس وقت چور کا ہاتھ کاٹنے یا مرتد کے قتل کا حکم جاری کر دیا جائے تو ہم کو اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔
اسی طرح ریاست جے پور میں گاؤکشی پر پھانسی کی سزا کا حکم ہے مگر ہم کو اس سے کوئی غرض نہیں
ہوتی۔ اس وقت مسئلے کی نوعیت صرف اس قدر ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک سوال قتل مرتد یا
سزاے مرتد کے بارے میں کیا جاتا ہے ہم اس کے جواب میں جو صحیح حکم شریعت ہے اس کو بیان کر
دیتے ہیں۔ نہ ہندوؤں کو اس وقت اس سوال سے زائد کا حق تھا اور نہ ہم کو حق تھا کہ کوئی قانون
بناتے۔ کانفرنس کا کوئی فیصلہ ناطق نہیں ہے۔ سزاے مرتد یا قتل مرتد کے بارے میں اگر کوئی سوال
پیدا بھی ہوسکتا ہے تو بعد سوراج۔ مسلمانوں کو پورا حق ہے کہ جس وقت چاہیں گے پارلیمنٹ میں جو
قانون چاہیں پاس کرائیں اس کانفرنس میں صاف صاف برابر اعلان کیا جاتا رہا ہے کہ اس کا
مقصد سواے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ موجودہ فسادات کے رفع کرنے اور ان کے اسباب کے
دریافت پر غور کیا جائے۔ ہندو مسلمانوں میں کوئی دوامی شرائط صلح نہیں طے کیے جارہے ہیں۔ قتل
مرتد کے بارے میں اس وقت ایک جماعت کو فکر تھی کہ اس کے متعلق مسئلے کو واضح کیا جائے۔ میں
نے عرض کیا تھا کہ لکھنو کی حاضری کا ایک سبب اس مسئلہ کو دریافت کرنا بھی ہے۔ مجھ کو یاد ہے اور

اسی بناپر میں نے یہاں حضور کے مشورہ کا حوالہ دے کر اعلان کیا کہ مسئلہ یوں ہی ہے۔ جس طرح مولانا کفایت اللہ صاحب نے بیان کیا۔

آخر میں نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کروں گا کہ حضور اس وقت تک سکوت فرمائیں جب تک یہاں کے حالات مولانا کفایت اللہ صاحب اور دیگر حاضرین سے سن نہ لیں اور صحیح حالات معلوم نہ کرلیں۔ دو چار روز کی تاخیر میں کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور حضور ہم پر کم سے کم یہ تو بھروسا کر لیں کہ ہم اپنی موجودگی میں شریعت کی تحقیر نہ ہونے دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ حضور کو کس درجہ ہندو مسلمان کے اتحاد کا خیال ہے۔ اس لیے ہم کو تو اس کے خلاف گمان کرنا بھی اب نادانی اور جہالت ہے۔ واقعات صحیح آپ کو سب معلوم ہو جائیں گے۔ اور اس وقت باقی ماندہ شکوک اور دقتیں باہمی حالت رواداری کے ساتھ فیصلہ پا جاویں گی۔ از حد مصروف ہوں اور تھکا ہوا

حضور کا خادم

خادم کعبہ شوکت علی

خط مولانا حسین احمدؒ بنام مولانا عبدالباریؒ:

شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں حائل

کجادانند حال ما سبکساراں ساحلہا

مولانا المحترم زیدت معالیکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ مع تار باعث سرفرازی ہوا۔ مولانا! ایک دو امر ہوں تو ان کو ذکر کیا جائے۔ دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ صنف علما کی خود پسندی، تشتت، خود رائی، حب جاہ و مال، خوف اغیار، کی تاریک گھٹاؤں نے عرصۂ دراز سے جو کچھ نہ دیکھا تھا وہ دکھا ہی رکھا تھا۔ مگر اس زمانۂ پر آشوب میں اس صنف کے استغنا اور غفلت نے تو اساس اسلام کو کھود ڈالنے کی تیاری کر لی ہے۔ اس موتمر اتحاد نے ہر طبقے اور ہر صنف اور ہر فریق کے لوگوں کو دعوت دی۔ قریب اور بعید کے تقریباً چار سو ستر یا زیادہ آدمیوں کو بلایا۔ مگر اول تو مسلمان بہت کم آئے پھر ان میں علماء کی جماعت اقل قلیل تھی۔ علماے دیوبند کو متعدد تار گئے کوئی نہیں آیا۔ علماے بدایوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ اور علیٰ ہذا القیاس دوسرے مقامات سے بھی کوئی نہیں آیا۔ فقط سید سلیمان ندوی تشریف لائے تھے۔ جو فقط دو تین دن ٹھہر کر چلے گئے کوئی معتد بہ دلچسپی انھوں نے بھی نہیں لی۔

مولانا! مجمع اغیار تھا۔ ہندو، سکھ، پارسی، ۔عیسائی مجتمع تھے۔ مسلمانوں میں سے قادیانی، روشن خیالی کے مدعی انگریزی خوان حضرات جو بزعم خود اپنے سامنے ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور شافعی و مالک واحمد حنبل وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ کو نہ صرف طفل مکتب بلکہ مضر الدین والا سلام سمجھتے اور کہتے ہیں، موجود تھے۔ ہر فریق نے اپنے چیدہ چیدہ متکلم اشخاص کو بھیجا اور جمع کیا تھا۔ مگر کیا اسلام کے مذہبی اور علمی طبقے کو اس کی کوئی پرواہوئی تھی۔ اس کا جواب سوائے نفی کے اور کچھ نہیں!

مولانا! اس مجمع میں جو کچھ مشکلات ہم کو پیش آئیں اس کو ہم ہی اندازہ کر سکتے ہیں اور آپ اتنی دور بیٹھے ہوئے اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہر ہر لفظ اور ہر ہر مسئلے پر دشواریوں کے پہاڑ اُڑ جاتے تھے، جن کا اٹھانا بھی دشوار تر ہوتا تھا۔ نہ کوئی صحیح مشورہ دینے والا ہوتا تھا نہ کوئی ہمدردی اور اعانت کرنے والا۔ خود ہمارے معزز لیڈروں کے بات بات پر حملے اور سخت حملے ہوتے رہے۔ اگر مجمع اغیار میں ان کا جواب دیں تو اسلام، مسلمانوں، علماء کی توہین ہوتی ہے۔ اور اگر چپ رہیں تو مداہنت کا دھبا۔ عجب کشمکش کا عالم تھا۔ شیر نری کا دعویٰ کرنے والے اغیار کے سامنے بزا خفش بنے ہوئے نظر آتے تھے آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ مخالف فریق اور مدعیانِ اجتہاد وعلمیت پر جماعت کا جو اثر پڑ سکتا ہے، وہ ایک دو کا نہیں ہو سکتا۔ پھر چند دماغ جو چیز پیدا کر سکتے ہیں ان کے لیے ایک یا دو دماغ کافی نہیں ہو سکے۔ اور جب کہ اپنوں ہی میں سے ایسے حضرات ہوں جو کہ دوسروں کے سیلاب میں اپنے آپ اپنی قوم کو بہا دینے کے لیے تیار ہوں، تو اس کا کیا حشر ہوگا۔

قومی هم، قتلوا امیم اخی

فلئن رمیت یصیبنی سهمی

ولئن عفوت لا عفون جللا

ولئن کسرت لا وهنن عظمی

مولائی المحترم! پہلے ہی دن فریق غیر کی طرف سے مجھ سے کہا گیا کہ یہ صلح کس طرح ہو سکتی ہے، جب کہ تمھارے مذہب میں مرتد کے لیے سزائے قتل ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بے شک یہ حکم مذہب کا ہے مگر ہم ہندوستان کے لیے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بصورت برٹش راج یا سوراج اس مسئلے کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ کہا گیا کہ بصورت سوراج خالص اسلامی ریاستیں ممکن ہے کہ اس پر عمل کریں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ ریاستیں غالباً اس وقت بھی اسی قسم کی خود مختار ہوں گی جیسی کہ اب ہیں یا جمہوریت کے اعضا میں سے ہو کر خالص

اسلامی خود مختار کامل نہ ہوں گی اس لیے وہ بھی ہمارے مسئلے سے خارج ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اجلاس شروع ہوا۔ تمہیدی تقاریر شروع ہوئیں۔ چند انگریزی تقریروں کے بعد پنڈت مالویہ جی نے تقریر کی اور اشتراک مذہب اتحاد عمل کی ضرورت اور فوائد وغیرہ بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کو نکال ڈالیں تاکہ امن و اتحاد قائم ہو۔ یہ تقریر غالباً آدھ گھنٹے ہوئی تھی۔

مجھ کو کہا گیا کہ تو اس کے بعد تقریر کر۔ مگر مولانا کفایت اللہ کے موجود ہوتے ہوئے، ان کی قوت تقریر و تحریر ذکاوت و فطانت علمی بلند پائیگی وغیرہ مجھ کو ہر طرح مجبور کرتی تھی کہ میں اس کی اپیل ان کی خدمت میں کروں۔ چناں چہ مولانائے موصوف کھڑے ہوئے اور نہایت واضح اور روشن طریقے پر ثابت کیا کہ مختلف المذاہب اور متبائن الاعتقاد اقوام و ادیان ایک سرزمین میں کس طرح بسر کر سکتے ہیں اور ان کے لیے طرز عمل کیا کیا اختیار کرنا ضروری ہے۔ آخر میں مولانائے موصوف نے فرمایا کہ بے شک شریعت اسلامیہ میں یہ مسئلہ مسلم ہے کہ مرتد کو سزائے قتل دی جائے۔ مگر اس کا تعلق ہندوستان سے نہیں۔ اس سزا کا اختیار سلطان اسلام کو ہے۔ وہ اپنی قلمرو میں اس کو جاری کر سکتا ہے۔ موجودہ حالت میں اور بعد از سوراج ہندوستان اس سے خارج ہے۔ اس بیان کو وضاحت کے ساتھ مولانا نے روشن فرمایا جس پر تمام حاضرین کی کامل توجہ منعطف تھی۔

اس پر پنڈت رام چندر نے یہ کہا کہ جہاں سلطان اسلام نہ ہو یا حکم نہ دے وہاں کوئی مسلمان فرد یا جماعت خود کسی مرتد کو قتل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ مولانا نے فرمایا نہیں۔ اس نے کہا کہ اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کی کیا سزا ہے۔ مولانا نے کہا کہ یہ امر مفوض الیٰ رای السلطان ہے۔ یہ گفتگو جب ہو رہی تھی اس پر مالویہ جی اور دوسرے لیڈر ہنود بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ اس کی تنقیح کی اب ہم کو ضرورت نہیں۔ جب کہ ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس مسئلے کا تعلق ہندوستان کی موجودہ اور مستقبلہ حالت سے نہیں تو ہم کو کافی ہے۔ مولانا کفایت اللہ نے اس وقت کہا بھی کہ اگر اس مسئلے کے متعلق اور کچھ کسی کو پوچھنا یا کہنا ہو تو پوچھے، میں جواب کے لیے تیار ہوں۔ اس پر ان کے عام لیڈروں نے خصوصاً بڑوں نے کہا کہ نہیں اس قدر ہم کو کافی ہے۔ مسئلہ تبلیغ کے متعلق مولانا نے فرمایا کہ مذہب اسلام ابتدا ہی سے تبلیغی مذہب ہے اور ہمیشہ سے وہ مبلغ کا کام کرتا رہا اور یہی اس کی تعلیم ہے مگر نہایت حکیمانہ اور عادلانہ طریقے پر بلا اکراہ و اجبار وغیرہ۔

غرض کہ اس مفصل تقریر پر سبھوں کو اطمینان ہوا۔ اس میں مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا! یہ

تفصیل کر دیجیے کہ یہ حکم قضاء ہے یا تشریعاً۔ مگر مولانا موصوف کو گزشتہ تقریر پر سب نے کہا کہ اب اس کی کوئی حاجت نہیں۔ مولوی محمد علی صاحب بولے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس کے بعد مفتی محمد صادق صاحب قادیانی کھڑے ہوئے۔ اور انھوں نے اپنی تقریر میں بھی یہ کہا کہ حقیقت میں مسئلہ مرتد ہندوستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہاں کوئی سزا انھیں نہیں دی جا سکتی۔

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کے باہر بھی اس کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اور نہ سلطان اسلام کو اس کا اختیار ہے۔ اس پر میں نے چلا کر کہا کہ یہ محض آپ کی رائے ہے۔ مذہب اسلام میں یہ نہیں ہے۔ سید سلیمان صاحب ندوی نے مجھے روکا اور یہ کہا کہ یہ بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ میں کہتا ہوں۔''

خلاصہ یہ کہ ان مباحث پر جن میں یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ مذہب اسلام میں یہ سزا مقرر ہے مگر یہاں بوجہ مانع اس کا اجرا نہیں ہو سکتا۔ جملہ حضارِ جلسہ کو اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف اشخاص کی تقریریں ہوئیں۔

صدر جلسہ اور دیگر مقررین نے بار بار اپنے الفاظ کہے کہ اس جلسے میں گزشتہ اعمال وافعال کی تحقیق و تفتیش کرنی مطلوب نہیں ہے۔ اور نہ ان کی نسبت کوئی فیصلہ ظاہر کرنا ہے۔ بلکہ آیندہ کے متعلق ایک نظام عمل تیار کرنا ہے تاکہ وہ امور جن کی وجہ سے فضائے ہندوستان مکدر ہو گئی ہے، ظاہر نہ ہوں۔ اسی بنا پر متعدد اوقات میں جب کہ سوامی شردھانند نے اپنی کتاب اور اخبار لے کر جناب کے فتوئ قتل مرتد پر اظہار رائے کرنا اور اسپیچ دینا چاہا، صدر جلسہ نے روک روک دیا۔ ہم سب تیار تھے کہ اگر سوامی جی نے تقریر کی تو انشاء اللہ پوری وضاحت کے ساتھ جواب دیں گے۔ مگر چوں کہ صدر جلسہ نے بھی کہا کہ عنقریب اس کے متعلق خاص طور پر ریزولیوشن آنے والا ہے۔ اس وقت آپ کو جو کچھ فرمانا ہے فیصلہ کے بعد آپ فرمائیں۔ تو ہم نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ اب اس وقت ہم کو الجھنا نہ چاہیے ورنہ ہم بھی روک دیے جائیں گے۔

اور ہم بعد ممانعت صدر گزشتہ امور پر تبصرہ کرنا بھی غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ اسی طرح جب کہ ریزولیوشن نمبر ا میں منادر کے متعلق اظہار افسوس کا جملہ آیا اور اس میں ترمیم زیادت لفظ مساجد یا ابدال لفظ معابد کی احقر نے پیش کی اور بحث جاری ہوئی تو میں نے مساجد بھرت پور کا ذکر کیا۔ اس پر کہا گیا کہ وہ معاملہ اسٹیٹ کا ہے۔ ہم اسٹیٹ کے افعال میں حسب اصول کانگریس کوئی مداخلت نہیں کر سکتے۔

الحاصل اس کانفرنس کے اصول وقواعد میں سے جن کا بار بار تذکرہ آچکا تھا یہ چند امور تھے:۔

(۱) امور استقبالیہ کے متعلق فیصلہ اور غور۔

(۲) جو امور باعث فساد وفتنہ ہیں ان کا تصفیہ۔

(۳) امور متعلقہ برٹش ہند پر اتفاق۔

گزشتہ امور پر نہ تبصرہ وتنقید تھی اور نہ ممالک خارجہ از ہند یا ریاستیں ان میں داخل ہیں۔ اس لیے ذبیحۂ گاؤ ودیگر حیوانات یا آرتھی اور اذان وغیرہ کے متعلق تصفیہ جات ریاستوں سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتے، جہاں پر کہ یہ اعمال جبراً رد کے جا رہے ہیں اور رواں راج وغیرہ میں تبدیل مذہب پر سزائیں مقرر ہیں۔

مولائے محترم! ریزولیوشن نمبر۴ کی تمہید کے ان الفاظ کو بھی مدنظر رکھیں جن کا تعلق خاص ریزولیوشن نمبر۱ سے ہے اور وہ اس پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ ''ریزولیشن نمبر۱ میں ہندوستان کی مختلف قوموں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے جو عام اصول قرار دیے گئے ہیں ان کو مدنظر رکھ کر اور تمام مذاہب، عقائد واعمال مذہبی کے لیے کامل رواداری حاصل کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس اپنی یہ رائے قائم کرتی ہے کہ

مولانا المحترم! جب آں جناب ان الفاظ پر غور فرمائیں گے تو کسی طرح بھی زمانۂ اسلاف کرام رضی اللہ عنہم پر ریزولیوشن نمبر۱ کے الفاظ کو اگرچہ وہ کسی درجہ میں موہم یا صریح بھی ہوں صادق نہ فرماسکیں گے۔ اور نہ بیرون ہند کسی کو اس کا مصداق بنا سکیں گے۔ بلکہ اندرون ہند بھی ریاستیں بالاتفاق اس سے خارج ماننی پڑیں گی۔

مولانا المحترم! ہم نے حتی الوسع جہاں تک بھی ممکن ہوا اپنی پوری سعی اصلاح میں صرف کی ہے اور اس کی پوری رعایت کی ہے کہ اپنے حقوق شرعیہ اور ارکانات مذہبیہ محفوظ رہیں۔ جس میں ہم کو احباب سے بہ نسبت اغیار زیادہ وقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خصوصاً مولانا کفایت اللہ نے اس میں نہایت زیادہ جانفشانی کی (فشکر اللہ مسعاہ) ہم یقیناً کہتے ہیں کہ اگر ان کی ذات اس میں سعی بلیغ نہ کرتی یا موجود نہ ہوتی تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔

مولانا! ضروری ہے کہ علماء کرام ذرا توجہ کریں اور اسلام کے سنبھالنے کی کوشش اور اتحاد صنفی میں پورا اجتہاد صرف کریں۔ ورنہ یہ ایک یا دو باہمت حضرات بھی تھک کر بیٹھ جائیں گے کہاں تک گالیوں اور الزامات لایعنی کا بوجھ اٹھا دیں گے۔ گورنمنٹ کے نمک خوار علیحدہ ان کے بدنام کرنے

کی کوشش عمل میں لا رہے ہیں۔ پبلک کے کج فہم و کج رائے اشخاص علیحدہ ان پر بوچھاڑ کر رہے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات علیحدہ طرح طرح کی لسانی تحریری عملی کارروائیاں پیش کر رہے ہیں۔ پھر بھی ہمارا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ ایک دوسرے کی نہ رواداری کرتا ہے نہ ہمدردی اور خبر گیری کے لیے تیار ہے۔ دشمن ہر طرح نور اسلام کو بجھانے پر تلا ہوا ہے۔ اور ہم اپنے زاویہ میں آرام کر رہے ہیں۔ اگر آپ جیسی قوم کی ہستیاں جنھوں نے جمعیت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی تھی وہ بالکل علیحدہ رہا کیں تو کیوں کر نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اور اس کے قائم رکھنے کی کوشش کرنی نہیں ہے، تو بند کر دیجیے قبل اس کے کہ اغیار و احباب اس کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہباءً منثوراً کر دیں۔ فان کنت ماکولا فکن خیرا کل. والا فادر کنی ولما امزق۔ پھر میں عرض کرتا ہوں کہ ریزولیوشنوں میں اس کا بھی بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور افزونی میں موجودہ کشمکش کا لحاظ رکھتے ہوئے کون سی صورت مفید ہو سکتی ہے۔ اپنے فہم و تجربہ کی مقدار پر کوشش کی گئی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب. وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء. والسلام خیر ختام۔

دستخط حسین احمد

جواب خط مذکور از مولانا عبدالباری بنام مولانا حسین احمد:

مولانا المحترم! السلام علیکم۔ مکرمت نامہ صادر ہوا۔ میں تاسف کرتا ہوں کہ میرے پہلے تار کا جواب مختصر دینے کے بجائے تھوڑی بات طویل کر دی گئی۔ یہی جواب تھا اس کا جو بعد کو موتی لال صاحب نے اور مولانا کفایت اللہ صاحب نے دیا۔ حسب اطلاع جناب کے اس کی وضاحت بعد کے ریزولیوشنوں میں کر دی گئی، لیکن جس وقت صدر کا پیش کردہ ریزولیوشن گاندھی صاحب کی فاقہ شکنی کی استدعا میں شائع ہوا تھا اس وقت کسی قسم کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ اور اس وقت تک وہ مباحث ہی نہیں ہوئے تھے جو بعد کو ہوئے۔ اس وقت تو علماء کی موجودگی بھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس واسطے یہ تو خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ آپ حضرات اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ میں مولانا کفایت اللہ صاحب کی مشکلات کو اچھی طرح احساس کرتا ہوں۔ ان کو جیسا میں بے نظیر سمجھتا ہوں اس کے ظاہر کرنے میں مجھے کبھی کوئی تامل نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے اور ایسا ہی مجھے صبح

اخبارات سے بھی معلوم ہوا کہ مولانا کفایت صاحب نے جو خدمات اسلام کی اس کانفرنس میں انجام دیے وہ ہماری جماعت علماء کے مباہات وافتخار کا باعث ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم عرض کریں کہ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کو ہمیشہ امت محمدی کی اعانت کے لیے زندہ سلامت رکھے۔ انھیں کی ایک ذات جمعیۃ علماء سے مراد ہوسکتی ہے اور کیا کہا جائے۔

مولانا! جلسہ دہلی کی وہ وقعت جو اس کے بانیین نے سمجھی تھی ہمارے ذہنوں میں نہ تھی۔ اس میں ہمارے علمانے اگر شرکت نہیں کی تو الزام کے قابل نہیں ہیں۔ اور جو شریک ہوئے وہ خود اس شرکت سے دشواریوں میں گرفتار ہوئے۔ اور امتحان ہوگیا کہ کون علماء باللہ ہیں۔

بہر حال معاملہ بہت تھوڑا تھا۔ موتی لال صاحب کے تار میں تاخیر ہوئی بڑھ گیا۔ مگر تار آجانے سے اطمینان ہوگیا۔ مولانا کفایت اللہ صاحب نے قتل مرتد کے بارے میں جو کچھ خیال ظاہر فرمایا وہ بالکل صحیح ہے۔ اس میں مجھے کوئی کلام نہیں۔ مجھے اس عام اور بے قید ریزولیشن پر اعتراض تھا اور ان الفاظ کے ساتھ اب بھی میں قابل اعتراض سمجھتا ہوں۔ لیکن وضاحت کے بعد مجھے اطمینان ہوگیا۔ والسلام

فقیر محمد عبدالباری عفاعنہ۔

خط از مولانا کفایت اللہ بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی:

دہلی۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۴۳ء

مولانا المحترم، دامت فیوضکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مجھے سخت ندامت اور افسوس ہے کہ میں مفصل طور پر جناب کے تاروں کا جواب اس سے قبل نہ دے سکا۔ ایک اجمالی تار ارسال خدمت اقدس کردیا تھا۔ جناب کے تاروں سے جناب والا کا تیقظ اور اسلامی غیرت اس پایہ کا ثابت ہوگیا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مولانا! واقعہ یہ ہے کہ پہلے دن کے اجلاس مؤتمر میں خاکسار اگرچہ شریک تھا۔ مگر پہلا ریزولیشن انگریزی میں پڑھا گیا اور اس کا اردو ترجمہ یا حاصل مطلب بیان کیا گیا مگر میں حلفا عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس فقرے کا جو سزائے ارتداد کے متعلق ہے اس وقت بالکل علم اور احساس نہ ہوا۔ واللہ اعلم کہ اردو میں وہ بیان سے رہ گیا یا میں نے نہیں سنا۔ تجویز پاس ہوگئی۔

دوسرے روز جناب کا تار ملا۔ اس سے مجھے فوری خیال ہوا اور میں نے پہلی تجویز کو تلاش کر

کے دیکھا تو اس میں وہ الفاظ موجود تھے، سخت افسوس ہوا۔ اگرچہ معاملہ سب کا سب ہندوستان کے متعلق تھا تاہم الفاظ میں عموم ضرور تھا۔ میں سخت کشمکش میں پڑ گیا۔ بالآخر سوائے اس کے کوئی تدبیر نہ کر سکا کہ ریزولیوشن نمبر ۴ کی تمہید میں میں نے اپنی ترمیم بایں الفاظ پیش کی اور صدر صاحب کو معاملہ سمجھا کر اور ہاؤس اور اپنے بعض مہربانوں سے بحث مباحثہ کر کے یہ الفاظ بڑھوائے کہ ''ریزولیوشن نمبر ۱ میں ہندوستان کی مختلف قوموں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے جو عام اصول قرار دیے گئے ہیں الخ'' اب ریزولیوشن نمبر ۴ بتاتا ہے کہ ریزولیوشن نمبر ۱ کا عموم مطلقاً نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہندوستان کے ساتھ مقید ہے۔ اور ہندوستان سے بھی برٹش انڈیا مراد ہے۔ ہندوستانی ریاستیں بھی اس میں داخل نہیں ہیں۔ نیز جب کہ بعض ہندو مقررین کی طرف سے یہ مضمون بیان کیا گیا کہ جب تک مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مرتد کو واجب القتل سمجھتے رہیں گے اور گویا قتل کرتے رہیں گے اس وقت تک ہندو مسلمانوں میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے بھرے مجمع میں اس کا جواب دیا کہ بے شک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور ارتداد اسلام کے نزدیک ہولناک گناہ اور بدترین جریمہ ہے۔ اور یہ اسلام کا ایک کھلا ہوا روشن اصول ہے اور میں اس کے ظاہر کرنے اور بیان کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ ہندوستان کے فسادات اس عقیدے کے نتائج ہیں اور مسلمان اس لیے ہندوؤں سے لڑتے ہیں کہ ان کو ارتداد یا اشاعت ارتداد کی سزا دیں، غلط ہے۔ اس لیے کہ جیسا یہ اسلام کا مستحکم اصول ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح یہ بھی اسلام کا اصول ہے کہ اس سزا کو جاری کرنے کا اختیار سلطان اسلام کو ہے۔ پس موجودہ حالت میں ہندوستان میں مرتد کی سزا قتل ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح تمام حدود اور قصاص یہاں جاری نہیں اسی طرح مرتد کی سزا بھی جاری نہیں۔ اور نہ مسلمان اس پر قادر ہیں۔

اس پر مولانا ابوالکلام صاحب نے فرمایا کہ مولانا یہ تو فرمائیے کہ بعد سوراج کیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ سوراج کے بعد واضعان قانون کے اختیارات کی جو نوعیت ہو اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اگر سوراج کے بعد اسلامی قانون کی ترویج کا کوئی موقع ہوا تو یقیناً اس کے موافق احکام جاری ہوں گے اور نہ ہوا تو حالت جس کی مقتضی ہوگی وہ ہوگا۔

تبلیغ کے متعلق میں نے صاف کہہ دیا کہ اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے اور اس کے ضمیر میں تبلیغ داخل ہے۔ وہ ایک کھلا ہوا تبلیغی مذہب ہے۔ اس کا دروازہ تمام دنیا کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اور اس

کے دامن کے نیچے تمام بنی آدم آسکتے ہیں۔ اس کو حق تبلیغ سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور ہندوستان کی موجودہ فضا میں مسلمانوں کو بھی یہ موقع نہیں کہ وہ کسی کو تبلیغ مذہب سے روک سکیں۔ ہاں! جس طرح اسلام کی تبلیغ جبر و اکراہ، اطماع، خداع وغیرہ سے پاک ہے اسی طرح دوسرے بھی ان ذمائم سے علیحدہ رہ کر صرف تبلیغ کر سکتے ہیں وہ یہ ذمائم درحقیقت تبلیغ مذہب کے لیے نہیں بلکہ اغراض نفسانی کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔

ان مضامین کو میں نے بھرے مجمع میں پوری بلند آہنگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا حتیٰ کہ سوامی شردھانند اور پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ بڑے بڑے ہندوؤں نے بھی کہہ دیا کہ اب ہمیں کوئی اعتراض نہیں! ہاں پنڈت رام چندر جی نے کہا کہ کیوں صاحب اگر سلطان اسلام کے حکم کے بغیر کوئی مسلمان مرتد کو قتل کر دے تو اس کی کوئی سزا ہے؟ میں نے کہا ہاں وہ افتیات علی السلطان کے جریمہ کا مرتکب ہے اور اس کی سزا بادشاہ کی رائے پر ہے۔

ہاں! مفتی محمد صادق قادیانی نے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے بلکہ اسلام ہر شخص کو ضمیر کی آزادی دیتا ہے تو اس پر مولانا حسین احمد صاحب نے نہایت بلند آہنگی سے اور میں نے بھی کہہ دیا کہ یہ آپ کی رائے ہے اسلامی اصول نہیں ہے۔ اسلام میں بے شک مرتد کی سزا قتل ہے۔

مولانا! ایک ہفتے تک رات دن معاملات کو سلجھانے اور حقوق اسلامیہ وقومیہ کی حفاظت کی غرض سے کام کرنے میں جن دقتوں کا سامنا ہوا اس کا بیان مشکل ہے۔ جن حضرات نے دیکھا ہے وہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ میری شرکت شخصی حیثیت سے تھی۔ اور اس کی تصریح بھی کر دی گئی تھی اور میں نے اپنی عقل فاتر و فہم قاصر اور اپنی بساط کے موافق مذہبی اور قومی حقوق کی حفاظت میں کوئی فرد گزاشت نہیں کی۔ اپنوں سے بھی اور غیروں سے بھی پوری نبرد آزمائی ہوئی۔ ہاؤس میں تقریراً و بحثاً ہر طرح حقوق کی حفاظت کی۔ مطمح نظر صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں آپس کا نفاق اور جنگ و جدل بند ہو۔ اور ہر فریق اپنی جگہ اپنے فرائض مذہبی میں آزاد ہو اور دوسروں کے لیے رکاوٹ نہ ڈالے۔ ہندوستان کی موجودہ حالت میں یہی ہماری پوزیشن ہے۔ اور اسی کو پیش نظر رکھ کر تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔ باوجود اس کے اگر مجھ سے کوئی غلطی یا فرو گزاشت ہوئی ہو تو میں اس کے اعتراف کے لیے تیار ہوں۔ امید کہ جناب والا دعا سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

خاکسار محمد کفایت اللہ غفرلہ،

جواب خط از مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا المحترم! السلام علیکم

گرامی نامہ آیا۔ کاش میرے تار کے جواب میں فوراً کوئی اطمینان بخش جملہ آ جاتا تو مجھے تین چار دن تک بے اطمینانی نہ رہتی۔ اور مزید اصرار کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ جناب نے پوری سعی فرمائی اور اپنے فرائض کو بہت خوبی سے انجام دیا۔ یہ واقعات جو جناب نے تحریر فرمائے مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک کوئی ادنیٰ لغزش جناب سے نہیں ہوئی۔ علام الغیوب اگر کسی غلطی سے واقف ہو تو اس کے رحم کا مقتضا ہے کہ معاف فرمائے۔ مسلمانوں کو تو آپ کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ والسلام۔ دستخط مولانا عبدالباری

(کفایت المفتی، جلد ۹، ص ۶۳۔ ۳۴۳)

سوبھاش بابو کی گرفتاری:

۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۴ء: گرفتاری کے بعد نیتا جی پہلے کلکتہ کے "علی پور سینٹرل جیل" میں رکھے گئے۔ بعد میں انھیں "مریم پور جیل" بھیج دیا گیا۔ یہ انقلابیوں کو نظر بند رکھنے کے لیے مشہور جیل تھا۔ ۲۴ر فروری ۱۹۲۵ء کی آدھی رات کو وہ دوبارہ کلکتہ لائے گئے جہاں سے انھیں برما کے مانڈلے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ (کرنل محبوب احمد، ص ۴۶)

۲۶ر دسمبر ۱۹۲۴ء: ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۴ء بیلگام میں آل انڈیا کانگریس کا انتالیسواں سالانہ اجلاس گاندھی جی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں ۱۸۴۴ ڈیلیگیٹوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں سوراج پارٹی کے ساتھ سمجھوتا منظور ہو گیا۔ گاندھی جی اس پر رضامند ہو گئے کہ جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے ان پر سوراج پارٹی کا ہی غلبہ ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنی من پسند ورکنگ کمیٹی بھی بنالے مگر کھدر کے پرچار اور دیگر تعمیری کاموں میں پوری مدد کرے اور اس کی ذمہ داری گاندھی جی پر چھوڑ دے۔ اس پالیسی کے تحت کانگریس کے آئین میں تبدیلی ہوئی اور چار آنے چندہ کے بدلے اپنے ہاتھ کا کتا ہوا سوت دینا کانگریس کی فیس ممبری قرار پائی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۲۴)

۱۹۲۵ء

مولانا شاہ بدرالدین کی وفات:

۱۱ر جنوری ۱۹۲۵ء: جمعیت علماے ہند کا ایک انتظامی جلسہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری نائب امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ کی صدارت میں بہ مقام مرادآباد منعقد ہوا۔ اس میں ایک قرار داد کے ذریعے مولانا سید محمد بدرالدین امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور ایک دوسری قرار داد میں مولانا شاہ محمد محی الدین کی خدمت میں امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ کے منصب جلیل کے لیے منتخب ہونے پر مبارک باد پیش کی گئی۔ (جمعیت العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۹۹)

اسی جلسے کی ایک قرارداد کے مطابق بدلے ہوئے حالات میں عدم تعاون کے پروگرام کے بارے میں غور کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس میں علاوہ مولانا محمد سجاد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو بھی اس کا رکن مقرر کیا گیا ہے۔ (ایضاً، صفحہ ۱۰۵)

مسودۂ قانون حج پر بحث:

۲۶ر جنوری ۱۹۲۵ء: ۲۶ر جنوری کو حکیم اجمل خاں کے مکان پر دہلی جمعیت علماء کی مجلس عاملہ کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا۔ جس میں مسودہ قانون حج پر بحث کی گئی۔ چوں کہ ۲۸ر جنوری کو حج سے متعلق ایک بل اسمبلی میں پیش کیا جارہا تھا۔ حج کے تمام معاملات کو حکومت کی مداخلت سے محفوظ رکھنا تھا اور قانون سازی کے دوران میں کونسل کے مسلمان ممبران کی رہنمائی اور دیگر ممبران کی اطلاع کے لیے جمعیت علماء کا فیصلہ ضروری تھا۔ اس اجلاس میں ارکان جمعیت کے علاوہ بہت سے اکابر نے بھی شرکت کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں کہا:

> ''اگرچہ بہ ظاہر یہ قانون کسی مذہبی حکم کے خلاف معلوم نہیں ہوتا، لیکن اس کی مخالفت ضرور ہونی چاہیے۔ مسئلہ حج کے ہر چھوٹے اور بڑے گوشے کو حتی الامکان گورنمنٹ کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

مولانا سید حسین احمد مدنی اس اجلاس میں شرکت نہیں فرما سکتے۔ لیکن مسئلے کی اہمیت کے پیش

نظر حضرت نے تار کے ذریعے اپنی رائے سے اجلاس کو مطلع کرنا ضروری خیال فرمایا۔ حضرت نے اپنے تار میں فرمایا کہ یہ بھی امور مذہبی میں صریح مداخلت کی راہ کھولتا ہے اس لیے اس بل کی پرزور مخالفت کرنی چاہیے۔

محمد بن عبدالوہاب (نجدی) کے متعلق سابقہ رائے سے رجوع:

۲۲ رمئی ۱۹۲۵ء: محمد عبدالوہاب کے بارے میں حضرت شیخ الاسلام کی سابق میں جو رائے تھی اور جس کا اظہار حضرت نے الشہاب الثاقب میں فرمایا تھا، اس کے مبنی بر اخلاص و دیانت ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ حضرت کی وہ رائے جن بیانات پر تھی وہ رائے حضرت کا براہِ راست مطالعہ اور ذاتی تحقیق نہ تھی اور اب جب کہ حضرت کو مطالعہ و تحقیق کا موقع ملا تو حضرت نے اسے قرین صواب نہ پاکر اس سے رجوع فرمالیا ہے۔ یہ حضرت کے ذوق علمی اور حق پسندی کے عین مطابق اور کمال تقویٰ کا ثبوت ہے۔ محترم مولوی محمد سلیمان منصور پوری مرتبہ ''فتاویٰ شیخ الا سلام'' (۱۹۹۷ء، دیو بند) لکھتے ہیں:

''اولاً حضرت مدنی کی وہی تحقیق تھی جو مذکورہ تحریر (الشہاب الثاقب) میں ارشاد فرمائی گئی، لیکن بعد میں جب اہل نجد کے صحیح عقائد ان کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے آپ کے سامنے آئے تو آپ نے اپنی سابقہ رائے سے رجوع فرمالیا، اور اس بارے میں ایک مفصل وضاحتی تحریر اخبار خلافت بمبئی میں شائع کرائی جس کے آخری الفاظ بحوالہ ہفت روزہ سچ لکھنو درج ذیل ہیں:

> ''بہت سی باتیں جو اہل نجد کی جانب منسوب کی جاتی ہیں، بالکل بے اصل ہیں اور بعض باتیں کچھ اصل بھی رکھتی ہیں مگر نہ ایسی کہ جن کی وجہ سے ان کو فرقۂ ناجیہ سے نکالنا جائز ہو سکے یا جمہور اہل سنت و جماعت کا مخالف قرار دے کر ان پر تبرا کیا جائے اور عامۂ اہل اسلام کو ان سے بہکایا جائے۔ لہٰذا مجھ کو اس امر کا اعلان کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ میری وہ تحقیق جس کو میں ''رجوم المذنبین'' اور الشہاب الثاقب'' میں لکھ چکا ہوں اس کی بنیاد کسی ان کی تالیف و تصنیف پر نہ تھی بلکہ محض افواہوں یا ان کے مخالفین کے اقوال پر تھی اب ان کی معتبر تالیفات بتا رہی ہیں کہ ان کا خلاف جمہور اہل سنت و جماعت سے اس قدر ہرگز نہیں جیسا کہ ان کی نسبت مشہور کیا گیا ہے۔ بلکہ صرف چند جزوی امور میں صرف اس درجہ تک ہے، جس کی وجہ سے ان

کی تکفیر یا تفسیق یا تضلیل نہیں کی جا سکتی''

(ہفتہ وار سچ لکھنو، ۲۲ر مئی ۱۹۲۵ء، شمارہ ۲۰، ص ۲)

۱۶ر جون ۱۹۲۵ء: ۱۶ر جون ۱۹۲۵ء کو دار جلنگ میں سی آر داس کا انتقال ہو گیا۔ ان کی لاش کلکتہ لائی گئی۔ ہزاروں سوگواروں کے ساتھ مہاتما گاندھی بھی ارتھی کے جلوس میں شریک ہوئے۔ داس کی موت کا صدمہ پورے ملک کو ہوا۔ مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے ان کی بے تعصبی، فراخ قلبی اور قومی خدمات کے تعارف میں مضامین لکھے۔

کاکوری سازش کیس:

۹ر اگست ۱۹۲۵ء: ۹ر اگست کی شام کو دس انقلابی نوجوانوں نے ۸۔ ڈاؤن پسنجر ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ ٹرین کاکوری اسٹیشن کے قریب پہنچی تو زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوائی گئی۔ اس موقع پر ایک آئس وینڈر (برف بیچنے والا) گولی لگنے سے مر گیا۔ حکومت میں تہلکہ مچ گیا۔ خفیہ پولیس کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ کچھ ہی عرصے میں تمام انقلابی گرفتار کر لیے گئے۔ اشفاق اللہ خاں نامی انقلابی عرصے تک فرار رہے۔ کچھ عرصہ شاہجہاں پور میں چھپے رہے، پھر بنارس چلے گئے وہاں سے کاشی وشو ودھیالیہ اور وہاں سے بہار میں گئے ڈالٹن گنج میں کچھ عرصے کے لیے ایک دفتر میں ملازمت کر لی۔ وہاں سے دہلی گئے اور ایک دوست کی مخبری سے انھیں ۸ر ستمبر ۱۹۲۶ء کو گرفتار کر لیے گئے۔

گرفتاری کے بعد انھیں لکھنو لایا گیا، جہاں ان کی دوسرے ساتھیوں پر مقدمہ چل رہا تھا۔ مقدمے میں انھیں بھی شامل کر لیا۔ یہ مقدمہ کاکوری سازش کیس کے نام سے مشہور ہوا۔

جزیرۃ العرب کے متعلق سترہ احادیث:

۲۳ر ستمبر ۱۹۲۵ء: گورنر مکہ حسین کی بغاوت (۱۹۱۶ء) نے جو مخدوش حالات سرزمین حجاز میں پیدا کر دیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے امیر عبدالعزیز آل سعود والی نجد کو کھڑا کر دیا تھا۔ ۱۹۲۵ء تک اس نے باغی گورنر مکہ کو فرار پر مجبور کر کے حجاز کو اس کے فتنے سے محفوظ کر دیا تھا اور حجاز کو بھی اپنے زیر انتظام اور حفاظت میں لے لیا تھا۔ اس زمانے عبدالعزیز آل سعود کے اور سابق شریف مکہ حسین کی موافقت اور مخالفت میں طرح طرح کی بحثیں ہو رہی تھیں۔ حضرت کا ارادہ اس مسئلے کے کسی پہلو پر مضمون لکھنے کا تھا لیکن عدیم الفرصتی مانع تھی اس لیے مضمون تو نہ لکھ

سکے اور البتہ ایک مستفسر کے خط کے جواب میں جزیرۃ العرب کے متعلق احادیث مع اردو ترجمہ ترتیب فرمادیں۔ اس خط میں حضرت مرحوم کے ذوق وفکر کے کئی دوسرے پہلوؤں پر بھی مفید ارشادات ہیں۔ یہ خط ماہنامہ الرشید (لاہور) کے ''مدنی واقبال نمبر'' (۱۹۷۸ء) سے ماخوذ ہے۔ مستفسر کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ حضرت کا مکتوب یہ ہے:

محترم المقام زید عنایتکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج مبارک؟

کل آپ کا دوسرا کارڈ باعث سرفرازی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں پہلے سے اس ارادے میں تھا کہ جن مضامین کا جناب مطالعہ فرمارہے ہیں، ان کی نسبت کچھ لکھوں۔ مگر نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فرصت بالکل نہیں ملتی۔ اس وقت میرے سامنے میز پر تقریباً سو سے زائد خطوط، کارڈ اور لفافے پڑے ہوئے ہیں۔ جن کا جواب دینا ضروری ہے۔ کئی مہینے گزر گئے جواب نہ دے سکا۔ روزانہ پانچ سات خطوط آتے رہتے ہیں۔ مضامین کے لکھنے کے مطالبے علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔ چوں کہ میں بصیغۂ تدریس قومی ملازم ہوں اس لیے تقریباً چار گھنٹہ روزانہ تدریس میں صرف کرنا ضروری ہے۔ پھر عربی اور خصوصاً علم حدیث کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں، دوسرے فنون وعلوم کی طرح نہیں کہ پروفیسر کو مطالعہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں تو کم ازکم ڈیڑھ دو گھنٹہ مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے طلبہ کے بھی خارجی اسباق ہیں۔ لوگ ملاقات کے لیے آکر روزانہ کچھ نہ کچھ وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے شخصی اشغال ضروریہ ہیں جن کی وجہ سے دو چار خطوں کا روزانہ لکھنا بھی دشوار ہوگیا ہے۔

آپ کا پارسل نامعلوم کس وجہ سے بیرنگ ہوگیا تھا۔ ڈاک والوں نے کہا کہ ممالک خارجہ سے آیا ہے اس پر اس قدر ڈیوٹی زائد ہے۔ اس لیے انھوں نے اس پر گیارہ آنے یا اس سے کچھ کم یا زیادہ لیے تھے۔ معنوی حیثیت سے تو وہ بہت بیش قیمت تھا کہ اس میں خاک شفا اور دوسرے تبرکات تھے۔ مگر ظاہری حیثیت سے وہ اتنی قیمت نہ رکھتا تھا جتنی آپ نے ٹکٹوں پر اور میں نے ٹکس پر خرچ کیا۔ میں نے انھیں دنوں ایک عریضہ آپ کی خدمت میں پارسل پہنچنے، اور یہ کہ میں انشاء اللہ بوقت فرصت مضمون لکھنے کا قصد کروں گا۔ اس کی اطلاع کرنے کے لیے لکھا تھا۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ ان لفافوں میں چند لفافہ انگریزی پتہ لکھے ہوئے موجود تھے۔ میں انگریزی نہیں جانتا۔ میں نے سمجھا کہ یہ پتے آپ کے یہاں کے لکھے ہوئے ہیں۔ کسی دوسرے سے پڑھوایا ہی نہیں۔

اس میں سے ایک لفافہ لے کر اس میں خط رکھ کر بھیج دیا۔ اور تین مہینوں کے بعد وہ واپس آیا کہ مکتوب الیہ نہیں ملتا۔ مزید اطمینان کے لیے وہ بھی منسلک ہے۔

میں نے کتابوں سے احادیث متعلقہ ارض عرب کہ "وہاں یہود و نصاریٰ و غیر مسلم اقوام کو رہنے نہ دیا جائے" نکالیں اور ان کا ترجمہ کر کے فقط آپ کے لیے رکھا تھا۔ اور خیال قوی تھا کہ آیات وغیرہ لیتے ہوئے متعلقہ جزیرۃ العرب ایک مفصل مضمون لکھوں گا۔ افسوس اور صد افسوس کہ باوجود کثرت اشتیاق اور حضور مضمون آج تک اتنی فرصت نہ مل سکی کہ اس کو قلم بند کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریر و تقریر کے ساتھ تدریس نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم اگر تدریس نہ کریں تو پھر دفع احتیاج و ضروریات کی کیا صورت ہو۔ اگر تدریس کے لیے قلیل وقت خرچ کیا جائے تو وہ اپنی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ آج میں اس امر سے مایوس ہو کر کہ مجھ کو مضمون لکھنے کی فرصت مل سکے گی۔ آپ کو احادیث متعلقہ جزیرۃ العرب بھیج رہا ہوں۔ اگر زندگی باقی ہوئی۔ اور خدا کو منظور ہوا اور آپ کو ضرورت بھی محسوس ہوئی تو مضمون بھی لکھوں گا۔ ورنہ میری مجبوری ظاہر ہے۔ مجھ کو آپ کے سامنے شرمندگی بھی زیادہ ہے۔ مگر خداوند کریم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ میں بصد ادب آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر آیندہ کسی پارسل وغیرہ کے ارسال کا قصد نہ فرمائیں۔ میں حتیٰ الوسع غیر ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کرتا۔ البتہ جو چیزیں ہندوستان میں تیار نہ ہو سکتی ہوں اور ان کی ضرورت بھی ہو۔ ان کو بحصۂ حاجت استعمال کرتا ہوں۔ میرے پاس سوائے گھڑی، عینک اور فاؤنٹین پین کے اور کوئی چیز غیر وطنی نہیں۔ فاؤنٹین پین بھی سوائے سفر، دوسرے اوقات میں استعمال نہیں کرتا۔

آپ کے مرسل کا غذات وغیرہ غیر وطنی تھی۔ مجھ کو اسلامیت اور وطنیت کا سودا سخت ہے۔ میں زیادہ ضروری سمجھ رہا ہوں کہ مسلمان اور اہل ہند کھدر کا استعمال کریں اور ولایتی چیزوں سے حتی الوسع گریز کریں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی خصوصاً مسلمان اس امر میں نہایت بزدل واقع ہوئے ہیں۔ آپ ایک دور دراز ملک میں ہیں آپ کی اور ہماری حالت میں فرق ہے۔ خداوند کریم جلد وہ دن لائے کہ "وطن آزاد ہو۔ اسلام کا علم چاروں طرف لہراتا ہو اور صلیب سرنگوں ہو۔" خداوند کریم آپ کے اور ہمارے مقاصد بر لائے۔ آمین۔ والسلام!

حسین احمد غفرلہ،

از سلہٹ خلافت آفس دار الحدیث۔ ۵ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

احادیث جزیرۃ العرب عن النبی ﷺ:

۱. لا خرجن الیھود والنصارے من جزیرۃ العرب حتی لا ادع الا مسلم.
(رواہ مسلم و ابو داؤد و ترمذی عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ترجمہ:۔ میں یہودیوں اور نصرانیوں کو ضرور بالضرور جزیرۃ العرب سے نکال دوں گا۔ یہاں تک کہ سوائے مسلمانوں کے یہاں کسی کو نہ چھوڑوں گا۔ (اس کو مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے بواسطہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کیا۔)

۲. لان عشت ان شاء اللہ لا خرجن الیھود و النصارے من جزیرۃ العرب
(رواہ ترمذی والحاکم فی المستدرک عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ.)

ترجمہ: اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ ضرور بالضرور یہودیوں اور نصرانیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دوں گا۔ اس کو ترمذی اور حاکم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ سے روایت کیا ہے۔

۳. اخرجوا الیھود من جزیرۃ العرب (رواہ ابو داؤد والدارمی والحاکم عن ابی عبیدۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والطبرانی فی الکبیر عن ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھا.)

ترجمہ: یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔

۴. اخرجوا یھود نجران من الحجاز رواہ ابو نعیم فی المعرفۃ عن ابی عبیدۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ.

ترجمہ: یہود نجران کو حجاز سے نکال دو۔

۵. اخرجوا یھود الحجاز واھل نجران من جزیرۃ العرب واعلموا ان شر الناس الذین اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد رواہ امام احمد فی مسندہ وابو یعلی والحاکم فی ...... وابو نعیم فی الحلیۃ و ابن عساکر وایضاً المقدسی فی المختار عن ابی عبیدۃ بن جراح قال اخر ما تکلم بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فذکرہ،

ترجمہ: حجاز اور اہل نجران کے یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔ اور جان لو کہ سب سے

برے ہیں جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبریں مسجدیں بنالیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی سب سے آخری بات یہی تھی۔

۶۔ ان عشت لا خرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لا اترك فيها الا مسلم (رواه الامام احمد و مسلم وابو داؤد والترمذي و النسائي وابن الجارود وابو عوانه وابن حبان والحاكم في المستدرك عن عمر رضى الله تعالىٰ عنه.)

ترجمہ: اگر میں زندہ رہا تو جزیرۂ عرب سے ضرور بالضرور یہود ونصاریٰ کو نکال دوں گا۔ تا کہ سوائے مسلمانوں کے اس میں کسی کو نہ چھوڑوں۔

۷۔ لئن بقيت لا ادع بجزيرة العرب دينين. (رواه ابن سعد عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة مرسلا.)

ترجمہ: اگر میں باقی رہا تو جزیرۃ العرب میں دو دین نہ چھوڑوں گا۔

۸۔ ليس على مؤمن جزية ولا يجتمع قبلتان في جزيرة العرب (رواه البيهقي عن ابن عباسؓ رضى الله تعالىٰ عنه).

ترجمہ: مسلمانوں پر جزیہ نہیں ہے اور دو، قبلے جزیرۃ العرب میں جمع نہ ہونے چاہئیں۔

۹۔ قاتل الله اليهود والنصارى اتخذ واقبور انبياء هم مساجد لا يبقيان دينان بارض العرب. (رواه البيهقي عن ابي عبيدة رضى الله تعالىٰ عنه)

ترجمہ: خداوند کریم یہود ونصارے کو قتل کرے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجدیں بناؤ الا۔ عرب میں دو دین باقی نہ رکھے جائیں۔

۱۰۔ لا يبقى في جزيرة العرب دينان. (رواه الامام احمد عن عائشة رضى الله تعالىٰ عنها).

ترجمہ: دو دین جزیرۃ العرب میں باقی نہ رکھے جائیں۔

۱۱۔ لا يجتمع دينان في جزيرة العرب (رواه البيهقي عن ابن عمر رضى الله تعالىٰ عنه)

ترجمہ: دو دین جزیرۃ العرب میں جمع نہ ہوں۔

۱۲۔ يا على ان وليت الا مر بعدى فاخرج اهل نجران من جزيرة العرب،

(رواه الا مام احمد عن عمر رضی الله تعالی عنه)

ترجمہ: اے علی! اگر تم میرے بعد مسلمانوں کے حاکم بنائے گئے تو اہل نجران کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔

۱۳. عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال قال عمر لا تتر کوا الیهود والنصاریٰ بالمدینة فوق ثلاثة قد رما یبیعون سلعة وقال لا یجتمع دینا ن فی جزیرة العرب (ابو داؤد وابن شیبة).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرتؓ نے فرمایا کہ یہود ونصاریٰ کو مدینہ منورہ میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرنے دو۔ یعنی جس مقدار میں کہ وہ اپنی پونجیوں (سامان تجارت) کو فروخت کر سکیں۔ اور فرمایا کہ دو دین جزیرۂ عرب میں جمع نہ ہونے چاہئیں۔

۱۴. عن ابن شهاب قال فحص عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه حتی اتاه الثلج والیقین ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب فاجلیٰ عمر یهود خیبر (رواه مالک والبیهقی).

ترجمہ: ابن شہاب زہری فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بہت تفتیش کی یہاں تک کہ ان کو یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو دین جزیرۃ العرب میں نہ جمع ہونے چاہئیں اس لیے حضرت عمرؓ نے خیبر کے یہودیوں کو خیبر سے شہر بدر کر دیا۔

۱۵. عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنها ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال قبل وفاة لا یبقی فی جزیرة العرب دینان (ابن تجار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے وفات سے پہلے فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ رہنے چاہئیں۔

۱۶. عن علی رضی الله تعالیٰ عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا یترک بارض العرب دینان دین مع الاسلام (رواه ابن جریر فی تهذیب).

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عرب کی زمین میں دو دین نہ چھوڑے جائیں۔ دوسرا کوئی دین اسلام کے ساتھ۔

۱۷. عن ابی عبیدة رضی الله تعالی عنه اخر ماتکلم به النبی صلی الله علیه وسلم قال اخرجوا الیهود اهل الحجاز واهل نجران من جزیرة العرب

واعلموا ان شر الناس الذين اتخذوا قبور انبیاء هم مساجد (رواہ الامام احمد و وابو یعلی).

ترجمہ: حضرت ابوعبیدہؓ نے فرماتے ہیں کہ آخری گفتگو رسول اللہ ﷺ کی یہی تھی کہ یہود اہل حجاز اور اہل نجران کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ اور جان لو کہ سب سے برے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔''

حجاز کانفرنس:

۲۷ر ستمبر ۱۹۲۵ء: ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۵ء لکھنو میں حجاز کانفرنس کے نام سے عظیم الشان اجتماع زیر صدارت مولانا حسرت موہانی منعقد ہوا۔ خطبۂ صدارت کی چھپائی اور سفر خرچ کے لیے انھیں سو روپے قبل از وقت روانہ کیے گئے تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر کانپور واپسی پر مولانا نے مذکورہ سو روپے میں سے ۲۳ روپے کچھ آنے خرچ کے وضع کر لیے اور بقایا رقم واپس کر دی۔ اخراجات میں کانپور سے لکھنو ریل کے تیسرے درجے کے سفر کا کرایہ اور لکھنو اسٹیشن سے جلسہ گاہ تک یکے پر ایک سواری کا پانچ پیسے درج تھا۔ (حسرت موہانی.... ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۴۵)

معاہدہ لوکارنو:

یکم دسمبر ۱۹۲۵ء: اس سے مراد وہ معاہدہ ہے جس پر لوکارنو کے مقام پر یکم دسمبر ۱۹۲۵ء کو جرمنی، برطانیہ، فرانس، اطالیہ اور بلجیم نے دستخط کر کے مغربی یورپ میں امن کی ضمانت دی۔ جرمنی نے جو اس وقت جمعیت اقوام کا رکن نہیں تھا، فرانس، بلجیم، پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کے ساتھ اپنے جھگڑوں کو جنگ کے بجائے ثالثی کے ذریعہ طے کرنے کا عہد کیا۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۴۰۰)۔

چالیسواں اجلاس کانگریس:

۲۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء کانپور میں آل انڈیا کانگریس کا چالیسواں سالانہ اجلاس مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں ہوا اور ۲۶۸۸ مندوبین شریک ہوئے۔ مولانا حسرت اپنی اہلیہ نشاط النساء بیگم کے ساتھ کچھ مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے اجلاس کے پنڈال کی قریب سے گزر رہے تھے۔ کہ پنڈت نہرو نے جو چند کانگریسی رضاکاروں کی سالاری کر رہے تھے۔ مزدوروں کے مذکورہ جلوس پر لاٹھی چارج کرنے کی دھمکی دی اور جلوس کے سامنے دونوں ہاتھ

اونچے کر کے کھڑے ہو گئے اور اسے روکنا چاہا۔ جس سے مشتعل ہو کر بیگم حسرت پنڈت نہرو سے دست درازی کر بیٹھیں (یعنی ایک چانٹا رسید کر دیا) بات بے لطفی تک پہنچ جاتی لیکن پنڈت نہرو نے خود اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اور رضا کاروں کو تشدد سے روکتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ تب مزدوروں کا یہ جلوس مولانا حسرت کے ساتھ اجلاس میں شریک ہو گیا۔

اسی اجلاس میں مولانا حسرت پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ انھوں نے مزدوروں کو پنڈال پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی مگر تحقیق پر یہ الزام بے بنیاد ثابت ہوا غرض کہ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے ڈومینین اسٹیٹس کی تجویز پیش کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کے زیر سایہ آزادی قبول کر لی جائے۔ مولانا حسرت نے اس تجویز کی اس لیے مخالفت کی کہ وہ کامل آزادی چاہتے تھے۔

باوجود یہ کہ مولانا حسرت پرانے کانگریسی تھے لیکن ان کی تلون مزاجی اور عجلت پسندی سے اب کانگریس میں ان کی پہلی سی وقعت نہیں رہ گئی تھی اور نہ ہی ان کی رائے پر اتنا کان دھرا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ مولانا کے سیاسی نظریات بھی اپنے قدیم کانگریسی دوستوں سے مختلف ہو گئے تھے۔ البتہ نوجوانوں کا ایک طبقہ اب بھی حسرت کے ساتھ سیاسی خلوص رکھتا تھا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری نیز سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۸۵-۳۸۳)۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا:

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی۔ اس کے دستور کے مطابق یہ پارٹی ہندوستان کے مزدور طبقہ کی سیاسی پارٹی ہے۔ اس کے مقاصد میں انسانوں کے استحصال کی تمام شکلوں کا خاتمہ اور ہندوستان میں اشتراکی اور بالآخر کمیونسٹ معاشرہ کا قیام ہے۔ اپنے نظریات اور پروگرام میں یہ روس کی حامی ہے۔ خارجہ امور پر اس کا نقطۂ نظر ماسکو کے رویہ سے متعین ہوتا ہے۔ یہ پارٹی ہندوستان کے مغربی بلاک سے قطع تعلق اور روس اور کمیونسٹ بلاک سے وابستگی کی داعی ہے۔ حالیہ برسوں میں اس پارٹی نے حکمراں پارٹی سے اشتراک اور تعاون کی پالیسی اپنائی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ مزید مطالعے کے لیے دیکھیے فرہنگ سیاسیات، ص ۳۲۶-۳۲۷ اور تفصیلی مطالعے کے لیے کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ دیکھیے جو چھپ چکی ہے اور بھی بہت لٹریچر موجود ہے۔

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ:

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کو ۱۹۲۵ء میں ناگ پور میں ڈاکٹر کیشو ہیڈ گیوار نے قایم کیا۔ اس تنظیم کا مقصد ہندو کلچر کا احیا اور ہندو سماج کی نئی تشکیل ہے۔ اس کا کوئی تحریری دستور، پروگرام یا طریق کار نہیں ہے۔ البتہ اس کے نظریات کی ترجمانی اس کے دوسرے سرو سنچالک گرو گول والکر کی تحریروں میں ملتی ہے۔ جنھوں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۴ء میں اپنے انتقال تک اس سنگھ کی قیادت کی۔ سنگھ کی ملک کے طول و عرض میں بے شمار شاخیں (شاکھائیں) ہیں۔ یہ جماعت دو مرتبہ خلاف قانون قرار دی گئی۔ ۱۹۴۸ء میں، ۲۵/جون ۱۹۷۵ء کو قومی ایمرجنسی کے اعلان کے بعد سرکار نے اسے خلاف قانون قرار دیا اور اس کے رہنماؤں کو ایمرجنسی کے خاتمہ تک جیل میں رکھا گیا۔ موجودہ سرو سنچالک بالا صاحب دیورس ہیں۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۲۳۳)

حضرت شیخ الاسلام کا ایک تاریخی خط:

حضرت شیخ الاسلامؒ کا یہ خط مولانا عبدالحق مدنی مہتمم مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد کے نام ہے۔ مولانا عبدالحقؒ عربی کے بہترین ادیب اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا آبائی وطن ہندوستان تھا لیکن ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت مدینہ منورہ میں ہوئی۔ حضرت شیخ الاسلام سے مدینہ منورہ میں حدیث پڑھی تھی۔ وہ حجاز ہی میں تھے کہ امیر عبدالعزیز آل سعود نے باغی شریف مکہ کے فتنے سے سرزمین حجاز کو پاک کر دیا تھا۔ مولانا ابھی مدینہ طیبہ ہی میں تھے کہ حضرت شیخ الاسلام نے حجاز کے حالات کے بارے میں یہ خط لکھا جو حضرت کے حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اور ہندوستان اور حجاز میں واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے۔ اصل خط عربی میں تھا مولانا نجم الدین اصلاحی نے مکتوبات شیخ الاسلام (جلد اول) میں اردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہاں صرف ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

الی الاخ المحترم! زادت معالیہ آمین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسئلہ حجاز اور ابن سعود کے بارے میں جو حالات پیش آگئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ ایک مختصر جماعت یہاں بھی ان کی مخالف ہے، بعض تو اس لیے کہ وہ غالی بدعتی ہیں اور اس کے لیے انھوں نے ان مظالم کو جو طائف میں ہوئے ہیں اور جو قبے وغیرہ ڈھائے گئے ہیں، بہانہ بنالیا ہے، کچھ

لوگ شریف حسین کے حامی ہیں، جو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں پاتے تھے، اب ان کو موقع مل گیا ہے، وہ لوگ نجدیوں کے ان مظالم اور ان کے عقائد کی اشاعت اس لیے کرتے ہیں، تاکہ لوگ شریف حسین کی تائید کریں، ان حضرات میں سے بعض سے خط و کتابت رہی۔ میرا خیال ہے کہ اگر شیخ سنوسی کو وہاں کی ذمہ داری دے دی جائے تو اکثر فتنوں کے دروازے بند ہو جائیں گے، ورنہ پھر ابن سعود کی حکومت میں سیاسی معاملات کے سلجھانے کی صلاحیت تو موجود ہی ہے، اگرچہ آپ لوگ اس رائے کے مخالف ہیں۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ تمام عرب، بدوی، شہری، عالم، ہذیل، حجازی، تہامی، یمنی، نجدی، وغیرہ سب کے سب ابن سعود سے اس طرح ڈرتے ہیں، جیسے بکری بھیڑیے سے ڈرتی ہے، لہٰذا یہ قبائل اب عرب پر ایسی دست درازی نہیں کرسکتے۔ جیسے شریف حسین کے زمانے میں کرتے تھے اور اب مکہ و مدینہ کے جہلا، اشراف اور اراذل بھی کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، اسی طرح اور بھی بہت سی خرابیاں نجدی نظام حکومت میں دور ہو گئیں، مثلاً مدینۂ منورہ میں حکام کی کثرت، قرقوشی قوانین کا نفاذ، ہر حاکم کی بے جا حمایت اور پاسداری ان اشخاص کی، جو ان کی خوشامد اور اطاعت کرتے تھے، بدوؤں اور محلے کے لڑکوں کے لوگوں پر مظالم، تاجروں اور سرمایہ داروں پر محاصل اور ٹیکسوں کی بھرمار، حجاج سے مختلف حیلوں سے رقمیں وصول کرنا۔ کچھ شریف کو دینا کچھ حاکموں کو نذر کرنا، کچھ معلموں اور شیوخ کی جیب بھرنا۔ میرا خیال ہے کہ ابن سعود کی حکومت ان تمام خرابیوں کو بیک وقت دور کردے گی، ہاں مجھے اس بات کا اندیشہ ضرور ہے کہ شرعی مسائل اور احکام میں ان کی حدود سے متجاوز زیادتیاں بہت سی خرابیاں پیدا کریں گی، کیوں کہ نجدیوں میں اعتدال پسندی نہیں ہے، بلکہ ان کا یہ طرز عمل لوگوں کو اسلام سے متنفر کردے گا اور ہوا پرستوں کو اس بات کا موقع دے گا کہ وہ کافروں کو حرمین شریفین پر قبضہ کرنے کی ترغیب دیں، خدا اس فتنے سے بچائے، اگر اغیار کا تسلط حرم پر ہو گیا، تو لوگوں پر مظالم ہوں گے، جیسا کہ اس سے قبل ان کے تسلط سے حجاز پر مصیبت گزر چکی ہے، خلاصہ یہ کہ نجدیوں کی حکومت سے سیاسی بناء پر بہت سے فوائد اور اصلاحات کی توقع کی جاسکتی ہے، لیکن شرعی نقطۂ نظر سے ان کی حکومت میں خوبی بھی ہے اور برائی بھی، اور سختی تو آنحضرت ﷺ کے نزدیک غیر پسندیدہ چیز ہے، جس سے بہت سے مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں، علاوہ ازیں انگریزی حکومت مسلمانوں میں فتنہ و فساد پیدا کرنا چاہتی ہے اس لیے شریف اور ان کے بھائیوں کی طرف سے مجھ کو اطمینان نہیں ہے، جب کہ ان کو اقتدار حاصل ہوگا، جیسا کہ خبروں سے پتہ چلتا ہی۔ والی اللہ المشتکی۔

حسین احمد غفرلہ،

تحریک آزادی کی ایک بنیادی دستاویز:

حضرت شیخ الاسلام کا یہ خط مولانا عبدالحق مدنی کے نام ان کے اس سوال کے جواب میں ہے کہ آیا ہندوستان دارالحرب ہے؟ اس خط کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز اور سیاسی منشور کی ہے۔ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا پہلا فتویٰ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے دیا تھا۔ حضرات علمائے دیوبند کے سامنے یہ فتویٰ ہمیشہ بہ طور اصل اصول کے رہا۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد کا جواز اسی فتوے نے پیدا کیا تھا۔ اگر بعض دوسرے علماء کی طرح ان بزرگوں کے نزدیک بھی ہندوستان دارالاسلام ہی رہتا تو انگریزوں کے استبداد سے ہندوستان کی آزادی کی جدو جہد اور اس راہ میں ایثار جان و مال و وقت اور جیل جانے اور تکلیفیں اٹھانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے نسبت رکھنے والی حنفی اور سلفی انقلابی جماعت کے بزرگ ہمیشہ اس فتوے کو دہراتے رہے۔ علاوہ دارالحرب کے اور بھی کئی اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کا یہ خط دارالحرب کے مسئلے پر نہایت جامع ہے۔ مکتوب الیہ کے عربی ادب کے خاص ذوق کی رعایت سے حضرت نے یہ خط عربی میں تحریر کیا تھا۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ عربی زبان کا ذوق رکھنے والے قارئین کرام کو مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول سے رجوع کرنا چاہیے:

خط کا ترجمہ یہ ہے:

(۱) اس میں شک نہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے مگر حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ العزیز کا خیال تھا۔ کہ باشندگان بلاد اسلامیہ کے لیے جائز ہے کہ وہ ہندوستان میں داخل ہو کر سود اور جوے سے کفار کا مال لے سکتے ہیں، بشرطے کہ اس میں تراضی طرفین ہو اور عہد شکنی نہ ہو، لیکن باشندگان ہند کے لیے جائز نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس معنی میں نص فقہی بھی ہے۔ چناں چہ اس مسئلے پر ان کا ایک رسالہ بھی ہے، البتہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز کا خیال تھا کہ ہندوستان کے رہنے والے مسلمان بھی انگریزوں اور ہندوؤں سے سود لے سکتے ہیں لیکن عوام کی مصلحت کا لحاظ کر کے اس فتویٰ کو شائع نہیں کرتے تھے۔

(۲) ہندوستان میں جو بنک قائم ہیں۔ ان میں سے بعض اہل یورپ کے ہیں، جو اسلام کے مخالف اور دشمن ہیں، یہ لوگ سود کی رقمیں پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ان کے تبلیغی مشن کو

دیتے ہیں، جب کہ سود کی رقموں کا مطالبہ روپیہ جمع کرنے والے نہیں کرتے، اس لیے سود کی رقم نہ لینا ایک بڑے فتنہ وفساد کا سبب ہے، لہذا ارباب فتوے نے فیصلہ کیا ہے کہ سود کی رقمیں ضرور لینا چاہیے، اور بطور خیرات کے مساکین کو تقسیم کر دینی چاہیے، یا اور کہیں دے دینی چاہیے، بلکہ سمندر میں پھینک دینا، بنک میں چھوڑ دینے سے بہتر ہے، البتہ ہندوؤں سے سود لینے میں اب تک علماء کو تذبذب ہے، اس لیے اور بھی کہ اس مسئلے کے رواج سے سودی معاملہ مسلمانوں میں پھیل جائے گا، کیوں کہ ہندوستان کے عام مسلمان غریب ہیں اور وہ سودی روپیہ قرض لینے پر مجبور ہیں۔

ہندو اکثر سرمایہ دار ہیں۔ ان کو سود پر روپیہ لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اور جب جواز سود کے فتوے کی اشاعت ہوگی، تو دنیادار مسلمان غریب مسلمانوں کے مال کو لوٹ لیں گے، کیوں کہ مسلمان جائز سمجھ کر ان کو سود دیں گے، ہم مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ سود کا لین دین اور معاملہ حرام سمجھیں اور ان سے باز آئیں اور اپنے اخراجات کم کریں، تاکہ قرض لینے کی نوبت نہ آئے اور مسلمانوں سے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ تم اپنی رقموں اور سرمایے سے اپنے ہم وطن ہندوؤں دشمنوں وغیرہ کی مدد نہ کرو، اس کے علاوہ سود نہ لینے میں اور بہت سے مصالح ہیں۔ ہندوستان میں ہندو بھی مسلمانوں کی طرح انگریزوں کے غلام ہیں، میرے نزدیک باشندگان ہند کی حیثیت ان قیدیوں کی سی ہے، جو دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہیں اور ہماری حالت محض قیدیوں جیسی ہے، اس بناء پر ان دشمنوں کی ہر چیز ہمارے لیے مباح ہے، سوائے عورتوں کے، جیسا کہ فقہا نے اس کی تشریح فرمائی ہے۔ غور کرنے پر یہ مسئلہ روشن ہو جائے گا، البتہ ہندوؤں کے ساتھ یہ برتاؤ جائز ہے یا نہیں؟ قابل غور ہے۔

آپ کا یہ فرمانا کہ بنک میں رقم جمع کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں دشمنوں کی مدد اور تائید ہوتی ہے، تو یہ بھی درست ہے اور واقعہ ہے کہ دنیا پرست لوگ بنک ہی کی طرف رخ کرتے ہیں اور وہی لوگ بنک میں روپیہ جمع کرتے ہیں، جن کو دین و مذہب کی پابندی کا خیال نہیں ہے اور یہ عذر کرتے ہیں کہ چوروں اور بدمعاشوں سے ہم کو خطرہ ہے۔ نیز جو روپیہ صندوق میں بند رہتا ہے۔ اس سے کوئی نفع نہیں حاصل ہوتا، بخلاف بنک کے کہ اس میں نفع ہے۔

(۳) میں نے تفسیر بیان القرآن کا مطالعہ کیا، اس میں جو عبارت ہے۔ اس سے آپ کا اعتراض دور ہو جاتا ہے، کیوں کہ مصنف کا قول ہے کہ جو رقم کسی معاملے کے ذریعہ، حالت کفر یا دار الحرب میں واجب الادا ہوتی ہے۔ خواہ معاملہ جائز ونا جائز ہو وہ رقم اسلام لانے کے بعد اور دار کے بدل جانے کے بعد بھی واجب الادا ہوتی ہے، یہاں پر ایک دوسرا جواب بھی ہے، لیکن اس

میں چند شکوک ہیں اس لیے اس کا مجھ کو اطمینان نہیں ہے۔ اگر خدا نے چاہا اور مسئلہ کی مزید وضاحت ہوگی، تو جناب کو مطلع کردوں گا، آپ خود مسئلے پر غور کرتے رہیں، شاید کوئی معقول وجہ ذہن میں آجائے۔ اس میں شک نہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کسی جگہ کسی وقت بھی سود لینا جائز نہیں ہے لیکن امام صاحب "فرماتے ہیں کہ مسلم اور حربی میں سود کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں فرماتے کہ سود جائز ہے، بلکہ سود کی اس معاملے میں نفی کرتے ہیں۔ والسلام حسین احمد غفرلہ،

۱۹۲۶ء

سلطان عبدالعزیز آل سعود اور مسئلہ حجاز:

۱۹۲۵ء تک عبدالعزیز کل حجاز کو فتح کرلیا تو قاہرہ کے ایک تار مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۶ء سے اچانک اہالیان ہند کو معلوم ہوا کہ ابن سعود نے ملک النجد والحجاز ہونے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو خلافت کمیٹی کی تجویز کا جواب سلطان ابن سعود یہ دے چکے تھے کہ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے۔ بہرحال پھر بھی سلطان عبدالعزیز نے مصر، بیروت، شام، فلسطین، سوڈان، عسیر، نجد، یمن، روس، ترکی، افغانستان، جاوا اور ہندوستان کو دعوت نامے جاری کیے۔ ہندوستان میں دعوت نامے تین جماعتوں کو بھیجے گئے تھے جمعیۃ علماء ہند، جمعیۃ خلافت اور اہل حدیث کانفرنس۔ چناں چہ جمعیۃ العلماء کا وفد مفتی کفایت اللہ کی قیادت میں تیار ہوا اس کے اراکین مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید اور مولانا عبدالعلیم تھے۔ جمعیۃ خلافت کے وفد کے رئیس علامہ سید سلیمان ندوی اور اراکین مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔

اس وفد کے اراکین مئی ۱۹۲۶ء میں جدہ پہنچے دوسرے دن مدینۂ منورہ روانہ ہوگئے۔ ۲۷ر کو سلطان سے ملاقات ہوئی۔ حسب عادت مولانا محمد علی نے پرزور بے باک اور جذباتی تقریر کی مگر واضح ہوگیا کہ عبدالعزیز سلطان نجد وحجاز بن چکے ہیں اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوگا۔ ۳۰ر مئی کو مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی کفایت اللہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی پھر سلطان سے ملے اور کہا کہ مدینۂ منورہ کے مقابر ومشاہد کے متعلق ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ موتمر اسلامی کے فیصلے کے بغیر ان کے بارے میں کوئی اقدام نہ کیا جائے گا۔ لیکن اس کی خلاف ورزی کی گئی اور دنیائے اسلام کے جذبات کے خلاف اس کے استصواب کے بغیر ان کو منہدم کر دیا گیا۔ سلطان نے جواباً

کہا کہ اگر ہم مزارات کو منہدم نہ کراتے تو ہماری قوم باغی ہو جاتی اور ان کا یہ مطالبہ غیر شرعی بھی نہ تھا۔ سلطان نے یہ بھی کہا ''آپ نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے میں بھی دل سے یہی چاہتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری قوم سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے متعصب قبائل نے دھمکی دی کہ ہم نے جہاد میں اپنا جان و مال قربان کیا تھا کہ مراسم شرک کا استیصال اور قرآن وسنت کو قائم کیا جائے گا۔ اس لیے جلد سے جلد ان عمارتوں کو منہدم کر دیا جائے ورنہ ہم خود ان کو گرا دیں گے۔ اس دھمکی کے بعد ہمارے لیے دو صورتیں تھیں یا ان کو بزور روکتے یا گرانے کی اجازت دے دیتے۔ پہلی صورت میں خانہ جنگی کا اندیشہ تھا دوسری صورت میں فتنہ وفساد کا جس سے اہل مدینہ کو بھی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا اور دوسری جماعتوں کو بھی صدمہ پہنچتا۔ ان کا مطالبہ غیر شرعی بھی نہ تھا بلکہ خدا اور رسول کے حکم اور کتاب وسنت کے مطابق تھا۔ اس لیے میں نے قاضی القضاۃ سے خواہش کی کہ وہ خود مدینہ جا کر اس کام کو انجام دے دیں، جو چیز خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے۔ اس میں اختلاف نہ ہونا چاہیے۔ (تحریک خلافت، ص ۶۳۔۲۶۲)۔

عورتوں کی وراثت سے محرومی:

۲۱ر جنوری ۱۹۲۶ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں من جملہ اور تجاویز کے ایک تجویز میں کہا گیا ہے:

(تجویز نمبر ۱۰/۷) ''جمعیۃ عاملہ کا یہ اجلاس پنجاب و بمبئی کی بعض مسلمان جماعتوں کے اس طرز عمل پر کہ عورتوں کو میراث کا حصہ نہیں دیتے اور اس رواج کو عملاً شریعت اسلامیہ کے قطعی فیصلہ اور قرآن پاک کے صریح حکم پر ترجیح دیتے ہیں، سخت افسوس کرتا ہے اور ان لوگوں کو جن کا یہ عمل ہے بتا دینا چاہتا ہے کہ وہ دنیا کے فانی مال و جائیداد کی حفاظت کے موہوم خیال سے لڑکیوں کو اس حق سے محروم کر دینا جو خدا اور اس کے رسول نے مقرر کیا ہے سخت ترین جرم ہے اور مسلمان کی ایمانی شان سے اس کو کوئی تعلق نہیں اگر یہ عمل اعتقاد تک پہنچ جائے تو صریح کفر ہے کیوں کہ قرآن مجید کے صریح ومنصوص حکم کا انکار ہے۔

جمعیۃ عاملہ کا یہ اجلاس پنجاب اور بمبئی کے تمام علماء اور مسلمانوں کے مقتدر رہنماؤں سے پرزور درخواست کرتا ہے کہ وہ اس عمل کے مٹانے اور احکام شریعت کے موافق فیصلے کرانے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیں''۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا حادثۂ انتقال:

تجویز نمبر۱۲/ ۸ جمعیۃ عاملہ کا یہ اجلاس حضرت مولانا عبدالباری صاحب کے دفعۃً انتقال پر اپنا دلی رنج وافسوس ظاہر کرتا ہے اور ان کے انتقال کو ہندوستان کے علمی طبقے کے لیے نقصان عظیم تصور کرتا ہے۔حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے اعزاء و متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق اور اجر جزیل عطا فرمائے۔

نکاح وطلاق کی رجسٹری، جمعیت کا موقف:

تجویز نمبر۱۳/ ۹ جمعیۃ عاملہ کا یہ اجلاس ڈاکٹر شفاعت احمد خان صاحب کی اس تجویز کو کہ نکاح وطلاق کی رجسٹری لازم کردی جائے۔ مسلمانوں کے لیے سخت مضر اور احکام اسلامی سے متصادم سمجھتا ہے۔ جمعیۃ عاملہ ڈاکٹر صاحب سے کامل امید کے ساتھ خواہش کرتی ہے کہ اس مضر اور مخالف احکام اسلام تجویز کو پیش نہ کریں اور پیش کردی ہو تو واپس لیں۔

نیز دیگر مسلم ممبران کونسل سے پرزور درخواست کرتی ہے کہ بصورت پیش ہوجانے کے وہ اس کی پوری مخالفت کریں اور ہرگز پاس نہ ہونے دیں (بالاتفاق پاس ہوئی) (جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۱۱۳)

حضرت شیخ الاسلام کا ایک تاریخی خط:

۲۸/جنوری ۱۹۲۶ء: محترم القام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج مبارک؟

جناب کا والا نامہ محررہ ۲۱/دسمبر یہاں ۱۱/جنوری کو پہنچا۔ میں ۱۳/دسمبر سے یہاں سے روانہ ہوگیا تھا کیوں کہ بلگام میں خلافت کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا۔ اس میں شرکت کے لیے مرکز ہی سے دعوت آئی تھی۔ اور ضروری قرار دیا گیا تھا۔ راستے میں چند مقامات پر ضروری کاروبار تھے۔ غرض یہ کہ ۲۳/دسمبر کو بمبئی ہوتا ہوا بلگام پہنچا وہاں پر اجلاس ختم ہونے سے پہلے سالانہ اجلاس جمعیت علماء منعقدہ مرادآباد کی شرکت کے لیے مجبور کیا گیا۔ جو کہ ۱۱/جنوری کو شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے پیارم پلیٹ۔ مدراس، بمبئی۔ سوات وغیرہ ہوتا ہوا مرادآباد پہنچا۔ وہاں سے فارغ ہو کر نواکھالی کے جلسوں میں شرکت کرتا ہوا ۲۵/جنوری کو سلہٹ آیا تو جناب کا والا نامہ ملا۔ علاوہ اس کے سوا اس سے زائد اور خطوط تھے جو کہ اس ڈیڑھ ماہ کی مدت میں جمع ہوگئے تھے۔ ان سبھوں

کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ ادھر تعلیمی سلسلہ جس کے لیے یہاں قیام ہے اس کو بھی انجام دینا ضروری ہے۔ بقیہ اوقات میں جواب لکھتا ہوں۔

محترما! اہل سلہٹ تقریباً ڈیڑھ سال سے زور دے رہے تھے کہ ''صوبہ آسام اور بنگال میں باوجود دے کہ مسلمانوں کی مردم شماری تقریباً تین کروڑ ہے۔ مگر تعلیمی حالت مسلمانوں کی بہت گری ہوئی ہے۔ مذہبی تعلیم میں بھی یہاں کے مسلمان بہت کمزور ہیں۔ خصوصاً علم حدیث کا چرچا اور واقفیت تو بے حد کمزور ہے۔ اس لیے تجھ کو لازم ہے کہ تو یہاں آ کر کچھ دنوں قیام کر اور ایک دفعہ صحاح ستہ کی پوری تعلیم دے۔ پھر یہاں حدیث ہم جاری کرلیں گے۔ اگر تیرا آنا ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے ماہر فن کو منتخب کر۔

میں احمد آباد جیل سے باہر آنے پر تحریک کی کمزوری کی بنا پر اس میں مشغول تھا۔ مجھ کو فرصت نہ تھی میں نے اس مدت تک اس کو ٹلایا۔ بہت تلاش کیا مگر کوئی دوسرا شخص بھی نہ ملا۔ آخر کار مجبور ہو کر دو سال کے وعدے پر ماہ اکتوبر سنہ حال کی ۲۰ تاریخ کو یہاں آ گیا۔ خود دیوبند دہلی وغیرہ کو اصرار تھا کہ وہاں قیام کیا جائے مگر اس وقت ضرورت قوی کو اہمیت دینا مناسب جان کر یہاں آیا تھا۔ اور اگر منظورِ الٰہی ہے تو اسی وقت یہاں قیام کروں گا۔ تقریباً پانچ گھنٹہ روزانہ علم حدیث کا درس دیتا ہوں۔ باقی اوقات میں ضروریات ذاتیہ، خطوط، ضروریات دینیہ پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ابھی تک موجودہ خطوط کے جوابات سے فراغت نہیں ہوئی۔ اس لیے جناب کے والا نامہ کا جواب نہ لکھ سکا۔ روزانہ تین چار اور کبھی اس سے زیادہ خطوط آتے رہتے ہیں۔ ان کے جوابات کی وجہ سے نہایت ہی زیادہ عدیم الفرصتی رہتی ہے۔ مختلف خطوط میں مضامین یا فتوے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت رہتی ہے۔ حتیٰ الوسع کوشش کرتا ہوں کہ لوگوں سے نہ ملوں تاکہ ضروری کاروبار کو انجام دے سکوں۔ مگر اگر کوئی بمقتضائے محبت وعنایت آ جاتا ہے تو وقت کا خون ہو جاتا ہے۔ عالی جناب نے جوامر مضمون کی نسبت تحریر فرمایا ہے اس کی اس قدر تفصیل ہے کہ بہت زیادہ وسعت ملنے پر اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ بہر حال میرا پختہ ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ فرصت ملنے پر میں اس کو اپنی طاقت اور قابلیت کے موافق قلم بند کروں گا۔ البتہ بالفعل اس قدر کار کی کثرت ہوگئی ہے کہ تاخیر ہونے میں مجبوری ہے۔

محترما! دوسرے حضرات جن کے نام نامی آپ نے تحریر فرمائے ہیں، ان بزرگوں کی بھی یہی حالت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور کام کرنے والے بہت کم ہیں۔ ملکی

اور مذہبی ضروریات انجام دینا فقط معدودے چند ہستیوں کے ذمہ ہو گیا ہے۔ جن کو آپ انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ حکومت ایسے لوگوں کے ضروریات پر متوجہ نہیں، بلکہ ان کی ضرر رسانی پر تلی ہوئی ہے۔ قوم خود ہی نہایت درجہ افلاس اور کمزوری میں ہے۔ اور پھر اس حالت میں وہ اپنی ہمت سے زیادہ قومی کاروبار کر رہی ہے۔ اس لیے بے چارے اپنے معاشی افکار میں مبتلا رہتے ہیں۔ شکایت کس طرح کی جائے۔ قوم کو بیدار کرنے کے طریقے بھی پوری طرح یقین نہیں کیے سکتے۔

آنجناب کا پارسل تین چار روز ہوئے پہنچا۔ مجھ کو سخت محجوبیت ہے۔ میں خود منع کرنے والا تھا کہ وہ یہاں آدھمکا۔ دیکھیے ایک معمولی قیمت کی چیز پر آپ نے فقط ڈاک خانہ کے محصول میں ۱۲؍ آنے سے زیادہ خرچ کر ڈالا۔ اور ادھر مجھ کو بیرونی پارسل ہونے کی وجہ سے ۱۱ آنے دینا پڑا۔ اشیائے محمولہ اگرچہ معنوی حیثیت سے بہت زیادہ قیمت رکھتی ہیں مگر ظاہری حیثیت تو اس قدر نہیں رکھتیں کہ اس قدر انگریزوں کو نفع پہنچایا جانا۔ بہر حال میں جناب کی اس عنایت کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آیندہ کبھی ایسا خیال نہ فرمائیں۔ خدمات لائقہ سے مشرف فرماتے رہیں۔ میں ذرا سہولت و فرصت ہو جائے تو مضمون لکھنا شروع کروں گا ان شاء اللہ! زیادہ بجز سلام مسنون۔ اور کیا عرض کروں۔ معزز اور محترم مسلمان بھائیوں کی خدمت میں سلام مسنون عرض کر دیں۔ فقط والسلام

حسین احمد غفرلہ،

از سلہٹ خلافت آفس۔ مورخہ ۱۴؍ رجب ۱۳۴۴ھ۔

حضرت کے اس نامۂ گرامی کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ ماہنامہ الرشید (مدنی و اقبال نمبر) سے ماخوذ ہے۔

۱۱؍ تا ۱۴؍ مارچ ۱۹۲۶ء: جمعیت علمائے ہند کا ساتواں عام سالانہ اجلاس علامہ سید سلیمان ندوی کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس میں بہت سی اہم قراردادوں میں جمعیت علمائے ہند کی پالیسی کو واضح کیا گیا اور وقت کے اہم سیاسی قومی و ملی مسائل میں ملک کی رہنمائی کی گئی۔ من جملہ دیگر قراردادوں کے ایک قرارداد میں اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے تحفظ اور فروغ کی ضرورت کو واضح کیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا ہے:

''جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس ہندوستان کی تمام اقوام کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ اردو زبان اور

رسم الخط کو ہندوستان کی متفقہ قومی زبان اور قومی رسم الخط قرار دینے کی پوری سعی کریں۔ کیوں کہ اس زبان اور رسم الخط کو اپنی سہولت اور وسعت کے لحاظ سے ان کا استحقاق ہے اور ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور ہندوستانی قومیت کے دوسرے طبقات اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور یہی وہ زبان اور رسم الخط ہے جس کو کسی مخصوص طبقے کے ساتھ خصوصیت نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستانی زبان اور ہندوستانی رسم خط قرار دیا جا سکتا ہے۔''

(جمعیت العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم۔ ص ۲۳۔۱۲۲)

جمعیت علماء کے اسی اجلاس میں مسلمانوں کے معاشرے میں الحاد وزندقہ ، کے بڑھتے ہوئے اثرات، سود انشورنس کے رواج، خواتین میں بے پردگی و بے حیائی کے فروغ اور بہت سے غیر اسلامی عوائد ورسوم کی اشاعت سے جو حالات ومسائل پیدا ہو رہے ہیں ان پر حالات حاضرہ کی روشنی میں غور کرنے اور تنقیح وتحقیق کر کے کتاب وسنت کی روشنی میں جمہور مسلمین کی رہنمائی کے لیے حلال وحرام اور جائز ونا جائز کی حدود قائم کرنے کے لیے ملک کے پندرہ نامور علماء دین کی کمیٹی بنائی گئی ہے۔ اس میں مولانا انور شاہ کشمیری کے بعد دوسرا اسم گرامی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا ہے۔ (ایضاً ص ۱۴۴۔۱۴۳)

جمعیت علماء ہند کے اسی میں ملک اور بیرون ملک کے مسائل اور حوادث وواقعات کے بارے میں متعدد تجاویز پاس کی گئیں۔ ان میں ایک اہم تجویز حجاز مقدس میں انقلاب حالات کے بارے میں تھی۔ تجویز میں کہا گیا تھا:

حکومت حجاز کے متعلق جمعیۃ علماء ہند کا مطمح نظر یہ ہے کہ چوں کہ حجاز مقدس مرکز اسلام ہے اور اس کے ساتھ تمام عالم اسلامی کا تعلق ہے۔ اور تمام اسلامی طاقتوں کے ذمہ اس مرکز اسلام کی حفاظت مذہبی فریضہ ہے۔ ان وجوہ کے لحاظ سے ضروری ہے کہ

(الف) حجاز کی حکومت اسلامی اصول کے موافق اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر ہو اور ہر قسم کے غیر مسلم اثر ونفوذ سے پاک ہو۔

(ب) حجاز کی حکومت ایسے مستحکم اصول پر قائم ہو جس میں آئندہ کے لیے بھی اس امر کا اطمینان ہو کہ تمام عالم اسلامی کی متحدہ طاقت اس کی حفاظت کی ذمہ دار اور کفیل ہے۔

(ج) ملوکیت حجاز کا تعجب انگیز اعلان خواہ کیسے ہی حالات کے ماتحت ہوا ہوتا ہم جمعیۃ علماء ہند ضمن الف اور ب کے حصول کے لحاظ سے ابن سعود سے متوقع ہے کہ وہ مرکز اسلام اور اسلامی

قومیت کے اعلیٰ مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام عالم اسلامی کے نمائندوں کی موتمر منعقد فرمانے کی سعی فرمائیں گے اور حکومت حجاز کے متعلق موتمر کے فیصلہ کو آخری فیصلہ قرار دیں گے۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس حجازیوں کے لیے حکومت حجاز کے تمام داخلی اختیارات کا استحقاق تسلیم کرتے ہوئے جزیرۃ العرب اور بالخصوص حجاز مقدس میں غیر مسلم مطامع کا بالکلیہ انقطاع کر دینے والا نظام قائم ہونے کی شدید ضرورت سمجھتا ہے اور جمعیۃ کی رائے میں ایسے نظام کا قیام اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ تمام اقوام اسلامیہ اور مسلم طاقتوں کے نمائندوں کی عام موتمر اسلامی حجاز میں منعقد ہو۔ اور یہ موتمر باہمی تبادلۂ آرا اور افکار کے بعد حکومت حجاز کی ایسی ہیئت متشکل کرے جو مقصد مذکورۂ بالا کے پورا کرنے کی ضامن ہو۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس موتمر میں اپنے نمائندے بھیجنے کے لیے تیار ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کی مختصر خود نوشت:

۸؍جون ۱۹۲۶ء: حضرت مرحوم کا یہ ایک نہایت قیمتی مکتوب ہے۔ اس میں حضرت نے اپنے مختصر سوانح حیات مکتوب الیہ نامعلوم کے استفسار پر درج فرما دیے ہیں۔ نیز مسلک و عقائد کے بیان میں بہت عمدہ معلومات ہیں۔ الرشید (مدنی و اقبال نمبر) کے شکریے کے ساتھ ہم یہ مکتوب گرامی یہاں درج کرتے ہیں

محترم المقام زیدت عنایاتکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج شریف؟

آپ کا والا نامہ محررہ ۱۲؍رمضان المبارک، ۲۰؍ذیقعدہ کو جب کہ میں تعطیل سے واپس ہوا، ملا۔ نہایت خوشی ہوئی۔ خوف تھا کہ غالباً آپ تاخیر جوابات کی وجہ سے خفا ہو گئے ہوں گے، اس لیے کوئی والا نامہ نہیں بھیجا۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ مانع نہ تھا۔

محترما! مضامین ضرور یہ بہت ہیں جن کی اشاعت کرنا ضروری ہے۔ نیز ملک میں دورہ کرنا قوم کی تنظیم کرنا، ان کو بیدار کرنا نہایت ضروری ہے۔ مگر کیا کیا جائے قحط الرجال ہے۔ قوم مسلم ہر طرح کی کمزوری، مادی و روحانی، اخلاقی و جسمانی میں مبتلا ہے۔ اگر ملازمت نہ کی جائے تو پیٹ کس طرح پالا جائے۔ اور اگر ملازمت میں وقت صرف کیا جائے تو قومی کام کس طرح ہو۔ غرض یہ کہ عجب مخمصہ ہے۔ خداوند کریم ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ انشاء اللہ حسب

ارشاد ایک جوڑا کھدر کے کپڑوں کا ڈاک میں ارسال کرتا ہوں۔

آپ میری زندگی کی داستان پوچھتے ہیں۔ مہربان من! میں ایک معمولی طالب علم ہوں۔ میری حالت معلوم کرنے سے کیا فائدہ؟ لائف ان لوگوں کی دیکھی جاتی ہے جن کو زمانے نے کوئی خاص وقعت دی ہو۔ ان سے مذہب اور قوم کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہوا ہو۔ ہمارے جیسے ہزاروں آئے اور چلے گئے۔ ع

که بسیار کس چوں تو پرورد و کشت

نہ شگوفہ نہ برگ نہ ثمر نہ سایہ دارم　　　　در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

محض امتثال حکم کی غرض سے کچھ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

جہاں تک مجھ کو والدین سے معلوم ہوا ہے۔ نسبی حیثیت سے ہمارے بزرگوں کا تعلق حضرت امام حسین شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔ ضلع فیض آباد کے پاس موضع الہ داد پور میں ہمارے اسلاف میں سے شاہ نور الحق آباد ہوئے اور کفار کے قلعہ کو جس کے نشانات اب تک موجود ہیں فتح کر کے وہیں بود و باش کی۔ ہمارے اسلاف اس زمانے سے لے کر اب تک اسی قلعے میں مدفون ہوتے رہے۔ یہ قلعہ کوئی بڑی عمارت نہ تھی، بہت چھوٹا قلعہ تھا جس کو گڑھی کہا کرتے تھے۔ ہمارے والد مرحوم سید حبیب اللہ شاہ صاحب تحصیل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور ۱۲۹۶ء ہجری میں بماہ شوال ۲۱ر تاریخ شب سہ شنبہ گیارہ بجے میری پیدائش ہوئی۔ لڑکپن کا وہ زمانہ جس کو میں یاد نہیں رکھتا...... والد محترم تبدیل ہو کر گھر ہی میں آگئے۔ جب مجھ کو ہوش و حواس آیا تو میں نے اپنے آپ کو آبائی وطن مالوف موضع الہ داد پور ضلع فیض آباد ہی میں پایا۔ چار برس کی عمر میں مجھ کو حاطۂ تعلیم میں داخل کر دیا گیا۔ والدہ ماجدہ مرحومہ گھر میں قاعدہ بغدادی اور اس کے بعد پارۂ عم وغیرہ پڑھاتی تھیں۔ اور اسی وقت سے اردو اسکول میں جس میں والد صاحب ہیڈ ماسٹر تھے اردو کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس طرح قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم گھر میں حاصل کرتا تھا اور اردو لکھنا پڑھنا، حساب، مساحت، جغرافیہ، تاریخ، اقلیدس وغیرہ اسکول میں پڑھتا تھا۔

میری عمر کا بارھواں سال جب کہ میں اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہ زمانہ ماہ صفر ۱۳۰۹ھ کا تھا کہ یکا یک والد صاحب مرحوم کو خیال ہوا کہ اس کو عربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند بھیج دینا چاہیے۔ وہاں پر پہلے سے میرے دو بڑے بھائی تعلیم پا رہے تھے۔ الغرض انھوں نے مجھے وہاں بھیج دیا۔ اور میں نے وہاں پر عربی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔ ۱۳۰۹ھ ہجری سے شعبان

۱۳۱۶ھ تک میں وہاں ہی مقیم رہا۔ ایام تعطیل میں سالانہ یا دوسال کے بعد والدین مرحوم کی زیارت کو وطن آجاتا تھا۔ باقی مکمل قیام ''دارالعلوم دیوبند'' ہی میں رہا۔ ساڑھے سات برس کی تعلیم میں عربی علوم کی درسی کتابیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں کہ والد صاحب مرحوم کو شوق زیارت مدینۂ منورہ پیدا ہوا۔ آبائی زمین کو فروخت کر کے مصارف راہ حرمین شریفین مہیا کیا۔ اور ارادہ کرلیا کہ شعبان ۱۳۱۶ھ کے آخری ایام میں روانہ ہو جائیں۔ ہم پانچ بھائی تھے جن میں تین متاہل تھے۔ والدین مرحومین اور ایک بہن اور ایک بھتیجا۔ یہ بارہ آدمیوں کا خاندان یہاں سے روانہ ہوا۔ پلیگ کی وجہ سے بمبئی کی بندرگاہ بند تھی۔ اس لیے فقط چاٹگام روانگی کی اجازت تھی چوں کہ ہم اودھ کے رہنے والے تھے۔

اور ہم کو چاٹ گام میں بانتظار آگبوٹ حاجی ریزرویشن کیمپ میں تقریباً ایک ماہ رہنا پڑا۔ شوال ۱۳۱۶ھ میں جہاز روانہ ہو کر ایک ماہ سے کچھ زائد میں جدہ پہنچا۔

دیوبند سے روانگی سے پہلے حضرت قطب العالم عارف باللہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر طریقۂ چشتیہ نقش بندیہ، قادریہ، سہروردیہ میں بیعت ہوا۔ مگر مولانا نے کچھ تلقین نہ فرمائی۔ بلکہ ارشاد کیا کہ چوں کہ تو مکۂ مکرمہ میں جارہا ہے۔ وہاں حضرت مرشد العالم مولانا الحاج امداد اللہ مہاجر مکی صاحبؒ (جو کہ حضرت مولانا صاحب کے پیر دمرشد تھے) موجود تھے ان سے تعلیم حاصل کر لینا۔ مولانا نے یہی فرمایا کہ ہجرت کی نیت نہ کرنا ۔ تم کو وہاں سے واپس ہونا پڑے تو گنہگاری کی نوبت نہ آئے۔ اور اسی قسم کی تاکید حضرت حاجی صاحب موصوف نے مکۂ معظمہ میں فرمائی تھی۔ چناں چہ ہم لوگوں میں سے سوائے والد صاحب مرحوم کے کسی نے نیت ہجرت نہیں کی۔ آپ اس سے بخوبی معلوم کرسکیں گے کہ جو لوگ میرے نام پر ''مہاجر مدنی'' لکھتے اور پڑھتے ہیں وہ غلط لکھتے ہیں میں نے بارہا اس پر تنبیہ کی مگر لوگ نہیں مانتے۔ مکۂ معظمہ میں ذیقعدہ کے وسط میں پہنچ کر بعد از طواف وسعی حضرت مرشد عالم حاجی صاحبؒ موصوف کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ اور پھر ہمیشہ خدمت اقدس میں حاضری کی نوبت آتی رہی۔ نہایت شفقت اور عنایت سے بندہ نوازی فرماتے رہے اور تعلیم سلوک بھی فرمائی اور آخر ذوالحجہ میں ادائے حج سے فارغ ہو کر مدینۂ منورہ کو روانگی ہوئی۔ اور اوائل ۱۳۱۷ھ میں وہاں پہنچ گئے۔ سال بھر کے لیے مکان کرایہ پر کرلیا گیا اور والد صاحب نے جو کچھ نقد بعد مصارف سفر بچ گیا تھا حسب حصص شریعت ہم سبھوں میں تقسیم کر دیا اور فرمایا کہ میں تو یہاں رہنے اور یہیں

مرنے کی نیت سے آیا ہوں۔

تم لوگوں کو اختیار ہے خواہ یہاں رہو خواہ ہندوستان چلے جاؤ۔ واپسی کے لیے یہ خرچ تمھارے لیے موجود ہے ہم سبھوں نے وہاں کی اقامت کو ترجیح دی وہاں پر ہم نے موجودہ سرمایہ سے دکان کی اور مختلف وجوہ سے ناکام رہے۔ بالآخر میں نے اجرت پر کتابت شروع کی اور درس وتدریس کی بھی بنیاد ڈالی۔ چند ماہ کے بعد مکہ معظمہ میں حضرت مرشد عالم حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا وصال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم کے متعلق سلوک بھی شروع کیا۔ اور عرض داشتیں مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کی خدمت میں ارسال کرتا رہا۔ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ میں حسب ارشاد مولانا رحمۃ اللہ علیہ تکمیل سلوک کی غرض سے بہ ہمراہی بڑے بھائی صاحب ہندوستان روانہ ہوا۔ اور حج سے فارغ ہوکر بادبانی جہازوں کے ذریعے سے مکلا اور مسقط ہوتے ہوئے ماہ ربیع اول ۱۳۱۹ھ میں براہ کراچی گنگوہ شریف پہنچا اور وہاں سلوک طریقت کرتا رہا! حسب اجازت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز کچھ عرصہ قیام کرکے رمضان ۱۳۱۹ھ میں براہ پوربندر ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۹ھ میں مکہ معظمہ پہنچا اور حج سے فارغ ہوکر محرم ۱۳۲۰ھ میں مدینۂ منورہ پہنچا۔ وہاں اولاً سات سال متواتر مقیم رہا۔ علمی مشاغل کے سوا اور کوئی مشغلہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ حرم محترم نبوی ﷺ میں علوم عربیہ (حدیث، تفسیر وغیرہ) کی تدریس دیتا رہا۔ ۱۳۲۶ھ میں میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب مرحوم کی یہ رائے ہوئی کہ چوں کہ ہماری آمدنی بہت کم ہے اور یہاں کی عورتوں کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے تجھ کو ہندوستان جاکر اپنے رشتہ داروں میں نکاح ثانی کرنا چاہیے۔ حسب ارشاد ماہ ذی قعدہ ۱۳۲۶ ہجری کی آخری تاریخوں میں وہاں سے روانہ ہوکر حج کرتا ہوا ۱۳۲۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند پہنچا۔ اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ کے یہاں دوبارہ حدیث شریف پڑھنا شروع کیا جس کی مدتوں سے آرزو تھی۔ اسی سال میری شادی بھی ہوئی اور پھر تین سال دیوبند میں مقیم رہا۔ حدیث شریف کی وہ کتابیں جو کہ مولانا مرحوم کے یہاں ہوتی تھیں ختم کرنے کے بعد مدرسہ میں تدریس حدیث وتفسیر کے لیے ملازم ہوگیا۔ حضرت والد صاحب مرحوم کے تقاضہ کی بنا پر شوال ۱۳۲۹ھ میں مدینۂ منورہ کو براہ پورٹ سعید۔ حیفۂ حجاز ریلوے کے ذریعہ سے روانہ ہوا۔ اور ذی قعدہ سنہ مذکورہ میں وہاں پہنچا۔ اور دو سال یعنی ۱۳۳۰ھ اور ۱۳۳۱ھ وہاں مقیم رہا (چوں کہ یہاں شادی میں شرط یہ تھی کہ دو برس کے بعد اہل وعیال کو ہندوستان ایک مرتبہ لانا ہوگا) ۱۳۳۲ھ۔ ماہ صفر میں براہ حجاز ریلوے حیفہ اور پورٹ سعید ہوتا ہوا،

معہ اہلیہ بمبئی پہنچا اور دیوبند وغیرہ میں چند دن قیام کر کے اسی سال ماہ ذی قعدہ یا شوال میں معہ اہلیہ حجاز روانہ ہو گیا۔ اور ابتداً ۱۳۳۲ء میں مدینۂ منورہ پہنچا۔ رمضان ۱۳۳۲ھ میں جنگ عوامی کا آغاز ہو گیا تھا مگر ترکی ذوالحجہ ۱۳۳۲ء میں شامل ہوا۔ مدینۂ منورہ میں حسب معمول مشاغل تدریسیہ میں شامل رہا۔

حضرت استاذ علامہ مولانا شیخ الہندؒ ۳۳ھ میں بقصد حج وزیارت مکۂ معظمہ تشریف لائے اور وہاں سے فارغ ہو کر مدینۂ منورہ پہنچے اور غریب خانہ پر فروکش ہوئے۔ اور چند ماہ کے بعد ماہ جمادی الاولیٰ یا جمادی الثانیہ سنہ مذکورہ میں مکۂ معظمہ میں اور پھر طائف تشریف فرما ہوئے۔ میرا اس سفر میں مولانا مذکورہ کی خدمت میں حاضر رہنا ضروری تھا اس لیے حاضر رہ کر وظیفہ خدمت گزاری ادا کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس سفر کی حالت اور جو کچھ طائف۔ مکہ معظمہ، جدہ، مصر، مالٹا وغیرہ میں گزرا مفصلاً ''سفرنامۂ اسیر مالٹا'' میں مذکور ہے۔ مالٹا سے واپسی پر تحریکات حاضرہ میں حصہ لیتے ہوئے کچھ دنوں مدرسۂ عربیۂ اسلامیہ امروہہ میں بوظیفہ صدر مدرسی کار تدریس انجام دینا پڑا۔ اور پھر حسب ارشاد حضرت شیخ الہندؒ کلکتہ کے مدرسہ واقعہ ناخدا مسجد میں جو کہ ان دنوں قائم کیا گیا تھا۔ چند دنوں بعہدہ پرنسپل کام کرتا رہا اور حسب شروط ملازمت چند ماہ وہاں کار تدریس سر انجام دے کر پھر تحریک میں سرگرمی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اسی عرصہ میں کراچی کا مقدمہ پیش آیا۔ دو برس کراچی اور سابرمتی جیل میں رہ کر پھر تقریباً ایک سال تحریک حاضرہ میں حصہ لیتا رہا۔ مگر ہندو، مسلم اختلاف کی وجہ سے کامیابی کی کوئی صورت مفید نہ دیکھ کر سلہٹ میں دو سال کے لیے تدریس حدیث کی غرض سے ملازمت اختیار کر لی۔ بظاہر یہاں شعبان تک قیام ضروری ہے۔ آئندہ خدا جانے۔

یہ ہے ایک نا کارۂ نالائق کی مختصری سرگزشت۔ جس سے کوئی فائدہ اور نتیجہ نہیں۔ اب اپنے سوالات کے جوابات سنئے۔

ابن سعود اور اس کی جماعت کا دعوےٰ یہ ہے کہ ہم حنبلی مذہب ہیں۔ مثل شوافع اور احناف کے ہم عقائد میں اسلاف اور ائمہ اہل سنت کے تابع ہیں۔ اور فروع میں امام احمد بن حنبلؒ کے تابع ہیں۔ وہاں کوئی خاص مذہب نہیں ہے۔ میری نظر سے چند رسالے یہاں گزرے ہیں جن میں بہت سی بحثیں میں نے دیکھی ہیں مگر تمام رسالوں کو اور ان کے تمام حصوں کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری طرف جو جو باتیں خلاف عقیدۂ اہل سنت والجماعت نسبت کی جاتی ہیں

وہ سب غلط ہیں۔ ہم جملہ امور میں طریق اہل سنت والجماعت کے پابند ہیں۔ البتہ انھیں معاملات میں ہم مخالفت کرتے ہیں۔ جن کے لیے ہمارے پاس کتاب وسنت اور اقوال فقہاء سے دلیلیں موجود ہیں۔ پوری تفصیل ان کے احوال کی وفد خلافت اور وفد جمعیت علماء کی، واپسی پر معلوم ہوگی۔ اس لیے ہم کو انتظار کرنا ضروری ہے۔ ہمارے علم میں ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں آئی جس کی وجہ سے ابن سعود اور اس کے متبعین کی تکفیر کی جاسکے۔ اور نہ ہم کو کسی طریقہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خاتمیت اور آپ کے نبی آخرالزمان ہونے کے منکر ہیں۔ بلکہ ان کے رسالوں سے اس کا اقرار معلوم ہوتا ہے۔ تکفیر کرنا نہایت سخت امر ہے۔ مذہب اسلام میں لعن اور تکفیر کے برابر کوئی اور گناہ بعد از شرک وقتل نہیں۔ تکفیر اور لعنت کرنے والا خود کافر اور ملعون ہوجاتا ہے اگر وہ شخص مکفر واقع میں مستحق تکفیر ولعن نہ ہو۔ اس لیے اس پر جرأت کرنا نہایت بے عقلی کی بات ہے۔ جب تک ابن سعود خلاف شریعت حکم نہیں کرتا اہل عرب کو اس کی اعانت کرنا ضروری ہے۔ اور اگر خلاف شریعت کوئی حکم کرے تو، ایسے وقت میں کسی کی بھی اطاعت ضروری نہیں۔

ساؤتھ افریقہ گورنمنٹ کی چیرہ دستیاں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ مگر یہ سب ہندوستان کی غلامی کا خمیازہ ہے۔ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہوجائے، ہر جگہ ہندوستانی حقارت اور ذلت ہی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ افسوس کہ ہندو قوم اور اس کے لیڈروں کو ذرا بھی احساس نہیں۔ انھوں نے اپنی دلی تنگی اور بے عقلی سے تحریک آزادی ہند میں وہ رکاوٹیں پیدا کردی ہیں کہ اب عرصہ تک کے لیے آزادی ہند کا مسئلہ متاخر ہوگیا اور اگر یہی لیل ونہار رہے تو تمام ہندوستان روزانہ برباد ہوتا رہے گا۔ اور کوئی صورت خلاصی کی میسر نہیں ہوگی۔ مسلمانوں نے ہندو قوم کی چیرہ دستیوں اور بے انصافانہ کارروائیوں پر برابر تین برس صبر کیا اور اب بھی کررہے ہیں۔ مگر اب مجبور ہیں کہ مدافعت کے لیے قدم اٹھائیں اور ترکی بترکی جواب دیں۔ گورنمنٹ خوشیاں منارہی ہے۔ دونوں فریقوں کو کم وبیش جیل خانہ اور پھانسی پر لٹکارہی ہے۔ مگر یہ ناعاقبت اندیش فرقہ وارانہ اختلاف اور غیر مفید جھگڑوں میں روزانہ قدم بڑھائے جارہے ہیں۔ اور ارادہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے بالکل ناپید کردیا جائے۔ مسلمانوں کا خدا ان کا محافظ ہے۔ دشمن اگر قوی ست مہرباں قوی تراست۔ ہندوستان کے مسلمان اس وقت چکی کے پاٹ میں ہیں۔ ادھر گورنمنٹ ان کو ہر طرح پیس رہی ہے۔ ادھر ابنائے وطن، ہندو قوم ان کی جان وعزت، مال ومذہب سبھی کے دشمن بنے

ہوئے جتھا بندی اور اجتماعی قوت کے ساتھ ہر قسم کی کارروائی کر رہے ہیں۔ اور گوریلا وارز کے طریقے پر قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ عہدوں، مال، قانون کے ذریعے سے کورٹ میں بھی نقصان پہنچا رکھا ہے۔ سنگھٹن اور شدھی کے ذریعے سے ہر قسم کا حملہ ہو رہا ہے۔ دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کی دست گیری فرمائے۔ والسلام۔

واقفین پرسان حال سے سلام مسنونہ عرض کر دیجیے۔

حسین احمد غفرلہ،

از سلہٹ خلافت آفس دار الحدیث

۲۷ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ (۸ جون ۱۹۲۶ء)

اصلاح المسلمین کی اہم ضرورت:

۱۷ اگست ۱۹۲۶: حضرت کا یہ مکتوب گرامی مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کے مدرس مولانا خلیل احمد کے نام ہے۔ اس میں حضرت نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے ایک فعال جماعت کی ضرورت اور اس کے قواعد وضوابط پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا نجم الدین اصلاحی کے قلم سے مکتوب پر ایک مفصل اور مفید تمہید اور تعارف بھی ہے۔ مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الاسلام کا یہ والا نامہ اور دستور اساسی، مسلمانان ہند کے ۳۸ نکاتی پروگرام آج سے تقریباً ۳۲۔۳۳ سال قبل خلافت کی تحریک کے زمانے میں قلم بند ہوئے ہیں۔ اپنے اندر جو معنویت رکھتے ہیں وہ محتاج تشریح نہیں۔ اگر مسلمانوں نے یا کم از کم اس جماعت ہی نے جس کے علمبردار حضرت رحمۃ اللہ علیہ تھے اس پر عمل درآمد کیا ہوتا تو آج مسلمانوں کے اندر نہ وہ بے راہ روی اور انار کی باقی رہتی اور نہ ملک کے حصے بخرے ہوتے یا اگر قضائے مبرم کے اصول پر تقسیم ناگزیر ہو ہی جاتی تو بھی مسلمانوں کی طاقت منظم ہوتی، ان کا مذہب محفوظ ہوتا، ان کی تہذیب کی نارو اقطع و برید نہ ہوتی اور وہ ایک بھاری بھرکم اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی اپنا مقام رکھتے۔ صرف ایک اسی والا نامہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تاثرات مذہبی اور غیرت دینی کا سراغ اچھی طرح مل رہا ہے اور ان کے لیے جو نادانستہ غلطی میں پڑ کر اپنی زبان کو آلودہ کیا ایک تازیانۂ عبرت ہے اور ان دانستہ فلسفی اور انشاء پردازوں کے لیے جن کا مذہب آرام طلبی اور عیش پرستی ہے خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی ہے جہاں عزیمت اور رخصت کا فرق ظاہر ہونے والا اور مجاہدین کے

موقف ومقام کی میدان محشر میں داد ملنے والی ہے۔اس والا نامہ پر بار بار غور فرمایئے اور انصاف سے کام لیجیے کہ آج بھی اس دستور کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جو لٹی ہوئی قوم اور منتشر و پراگندہ جماعت کو طاقت بخشنے والا اور تریاق سے بڑھ کر کار آمد نسخہ موجود ہے اس نسخہ کیمیا سے اب بھی مس سے کندن بنایا جاسکتا ہے آج بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی روح بے چین ہو کر یہ پیغام دے رہی ہے:

بار ہا نالید وگفت اے قوم ما بیدار شو
حصہ خود از حریفاں گیر و گرم کار شو

حضرت مدنی قدس سرہ العزیز صرف مفسر، محدث، فقیہہ، متکلم، صوفی اور صدر مدرس ہی نہیں تھے بلکہ وہ تھے جن کی سمجھ بوجھ اور فراست ایمانی اور طاقت روحانی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ جو ہر صدی میں مجدد دین اسلام کے اندر موہبت عظمیٰ کے روپ میں جلوہ گر ہو کر حکومتوں کے ردو بدل اور اہون البلیتین کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اپنا کام کرتی رہی ہے۔ بہت بڑا مصنف، ادیب، انشاء پرداز اور شاعر و حکیم ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے بلکہ تاریخ ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے ہر دور اور ہر زمانے میں اس کی کثرت رہی ہے مگر جس چیز کی کمی رہی ہے اور بہت کم اسا تاریخ پیش کر سکی وہ ایسے مجاہدین اور اسلامی انقلاب لانے والے بزرگ کہ جن کے خاتم حضرت مدنیؒ تھے اور دور مظلمہ میں دوسرا کوئی اور نہ ہو سکا۔ تصنیفی اور علمی دنیا میں حضرت شاہ ولیؒ اللہ سے بڑھ کر ہندوستان میں کون رہا ہے اور شاہ صاحب کا مقام ہر رنگ میں امامت سے نیچے کا کوئی درجہ نہ تھا مگر جو کام حضرت اسماعیل شہید، حضرت سید احمد شہید اور قاسم نانوتویؒ کے ہاتھوں اور مولانا مدنیؒ کے ہاتھوں اور مولانا مدنیؒ پر اس کی انتہا ہوئی، کس خانقاہ اور درس گاہ میں، ہندوستان اس کی برابری اور ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ آج بھی ہندوستان و پاکستان موجود ہے اور اس کے اندر علماء و مدبرین کی بھی کمی نہیں۔ برطانیہ سے کمتر درجہ کی طاقتیں مسلمانوں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں مگر ہے کوئی ماں کا لال جو حسین احمد بن کر اپنی جوانی کی راتوں اور بڑھاپے تک کو اس کی بھینٹ چڑھا دے اور "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔" کی صدائے حق کو بلند کر کے باطل کی طاقتوں اور کانچ کے محل میں بیٹھ کر اژدہات کے قلعہ پر پتھر مارنے والوں کا جواب دے اور ہوا کے رخ کو موڑ دے کہ تمہیں اگر چلنا ہے تو اس طرح چلو! ھل من مدکر"۔

مولانا نجم الدین اصلاحی کی اس تمہید کے بعد اب آپ حضرت شیخ الاسلام کا مکتوب سامی

ملاحظہ فرمائیں:

محترم المقام زید مجدکم!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

والا نامہ مورخہ ۲۷ رذی الحجہ ۱۳۴۴ھ محرم میں باعث سرفرازی ہوا مگر بوجہ کثرت مشاغل وغلبۂ تکاسل ارسال عرائض سے معذور رہا امیدوار معافی ہوں۔

(الف) قواعد و مقاصد تنظیم مسلمانان

مسلمانوں کی ہر قسم کی کمزوریاں اور انتشار ان کی ترقی سے مانع ہی نہیں ہے بلکہ ان کو ایک ایسے میدان کی طرف دھکیل رہی ہیں جس میں سوائے ہلاکت کوئی دوسری صورت موجود نہیں ہے دوسری قومیں نہایت تیزی سے اپنی جتھابندی کرتی ہوئی گامزن ہیں اور ترقی کے ہر میدان میں ہر طرح بڑھتی جارہی ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی خلاف کوششیں کرتی ہوئی سدراہ ہیں اور ان کی ترقی تو درکناران کی ہستی بھی ناگوار خاطر ہے، آزادی ہند جو مذہبی فریضہ بھی ہے، بغیر ان انتشاروں اور کمزوریوں کے دور ہونے کے ممکن الحصول نہیں اور اگر ممکن بھی ہو اور حصول کی بھی نوبت آجائے تو مفید نہیں۔ اس لیے حسب ذیل دفعات کے ماتحت تنظیم کی نہایت زیادہ اور فوری ضرورت ہے۔

۱۔ محلہ وار یا قوم وار نماز کی تنظیم کی جائے۔

(الف) ہر محلہ یا ہر قوم میں حسب ضرورت تین تین یا چار چار اشخاص افراد کو نمازی بنانے کے ذمہ دار ہوں اور بے نمازیوں کو سمجھا بوجھا کر نمازی بنائیں اور جو لوگ نماز نہیں جانتے ان کو نماز سکھائیں۔

(ب) کوشش بلیغ کی جائے کہ قوم یا محلہ کا کوئی بالغ آدمی خواہ مرد ہو یا عورت بے نمازی نہ رہے۔

(ج) اس امر میں تمام قوم یا تمام اہل محلہ اتفاق سے کام کریں۔

۲۔ مردوں کو جماعت کی پابندی کی طرح حسب ہدایت شرعیہ لایا جائے۔

۳۔ مساجد کی تعمیر اور اصلاح و مرمت کی جائے اور ان کو پوری طرح آباد کیا جائے۔

۴۔ ہر محلہ یا قوم میں ایک نقشہ ترتیب دیا جائے جس میں پوری تفصیل مسلمان گھروں اور

افراد، نمازیوں، بے نمازیوں، خواندہ ناخواندہ، بے کار اور کام کرنے والے اشخاص کا اندراج ہو۔

(ب) انجمن شعبہ والنٹیر ان (مطوعین):

مسلمانوں کی جان اور مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے ہر قوم اور ہر محلہ میں ایسے نوجوانوں کی باقاعدہ منظم جماعت ہونی چاہیے جو کہ ہر طرح حفاظت اور دیگر قومی خدمات کو باقاعدہ انجام دے سکے۔ چوں کہ ہمسایہ قومیں نہایت زیادہ جتھابندی کر رہی ہیں اور مسلمانوں پر چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی حملہ آور ہو رہی ہیں اس لیے مسلمانوں کی یہ تنظیم اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ امن کا قائم رہنا، جان و مال کا محفوظ رکھنا اور دیگر قومی ضرورتوں کو خوش اسلوبی سے انجام دینا ان کا فرض منصبی ہوگا۔ اس لیے حسب دفعات ذیل عمل درآمد کی فوری ضرورت ہے:

۱۔ فنون سپہ گری سے واقف اور قوت والے اشخاص اس جماعت میں بکثرت داخل ہو جائیں جن کا اصل مقصد اسلام کی حفاظت ہو۔

۲۔ یہ سب اشخاص عہد کریں کہ ہم اسلام کے دل سے حامی اور مددگار رہیں گے اور حسب طاقت مسلمانوں کی خدمت اخلاص سے کریں گے۔

۳۔ ان کی جماعتیں محلہ وار یا قوم وار ترتیب دی جائیں۔

۴۔ ہر محلہ یا قوم کی جماعت کا ایک شخص سردار منتخب کیا جائے جس کو جمعدار کا لقب دیا جائے۔

۵۔ ہر والنٹیر عہد کرے کہ میں اپنے سردار کا مطیع اور فرماں بردار رہوں گا۔ جب تک وہ کسی گناہ یا قومی مفاد کے خلاف کسی بات کا حکم نہ دے۔

۶۔ ہر قوم اور ہر محلے کے جمعدار کی اطاعت کرتے ہوئے شہر میں اگر کسی دوسری جگہ ضرورت پڑ جائے تو وہاں بھی ہر قسم کی امداد کریں۔

۷۔ قومی جلوسوں اور جلسوں میں بھی حسب ضرورت حصہ لیں۔

۸۔ اگر کوئی جھگڑا کسی طرف نمودار ہو جائے تو حتی الوسع کوشش کریں کہ جھگڑا دفع ہو جائے اور صلح و آشتی کی نوبت آئے۔

۹۔ اگر کوئی کوشش نفع نہ دے اور دوسری ہمسایہ قوم حملہ کر دے تو پوری طاقت کے ساتھ مدافعت کریں اور کسی طرح کی کوتاہی روا نہ رکھیں۔

۱۰۔ مسلمانوں کو بے جا اشتعال اور ناجائز جوش سے روکیں۔

۱۱۔ خود بھی اور دیگر مسلمانوں کو ہجوم اور ابتدا سے حتیٰ الوسع روکیں۔

۱۲۔ تمام شہر کے جمعداروں کا ایک سمجھ دار شخص سردار ہو جس کا لقب کپتان ہوگا۔ اس کی تمام والنٹیر اطاعت کریں۔

۱۳۔ یہ کپتان حسب ضرورت اور حسب ہدایت ناظم خلافت کمیٹی جملہ کارروائی کرے۔

۱۴۔ شعبہ والنٹیر ان کا باقاعدہ علیحدہ دفتر ہو جس کے مصارف کے لیے چندۂ رکنیت سے کارروائی کی جائے۔

قواعد وقوانین دربارۂ شعبہ اصلاح مصارف:

چوں کہ ہندوستان میں عام طور پر مسلمان شادی اور غمی وغیرہ کی طاقت سے زاید مراسم کی بناء پر روز افزوں افلاس میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں اور اسی بنا پر ان کی جائدادیں روزانہ نکلتی جارہی ہیں اور افلاس وذلت ان پر ہر طرف سے منڈلا رہی ہے۔ قرض کا بار گراں ان پر بڑھتا ہوا سوہانِ روح ہو رہا ہے۔ پنجاب کے مسلمان وہاں کے ہندوؤں کے بہتر کروڑ روپیوں کے قرض دار ہیں۔ بہت زیادہ مرد اور عورت مسلمانوں میں اسی کثرت مصارف کی بنا پر کنوارے پڑے ہوئے ہیں، جن کی کثرت کی بناء پر قومی نسل کی ترقی کما ینبغی نہیں ہوتی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیماریوں، بداخلاقیوں وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۱۲ء کی رپورٹ میں مسلمان عورتوں میں فیصدی ۳۸ کنواری دکھلائی گئی ہیں حالانکہ ہندو عورتیں فیصدی ۳۱ کنواری ہیں۔ بیوہ عورتوں کی تعداد بھی مسلمانوں میں اچھی خاصی مقدار پر ہے۔ یعنی فیصدی ۱۵ عورتیں مسلمانوں میں بیوہ ہیں اگرچہ ہندوؤں میں فیصدی ۱۹ عورتیں بیوہ موجود ہیں۔ مسلمان مرد اور متاہل ہندوؤں سے کم ہیں کیوں کہ ہندو متاہل فیصدی ۴۷ ہیں اور مسلمان فیصدی ۴۳ ہیں اور اسی طرح مسلمان عورتیں متاہل فیصدی ۴۷ ہیں اور ہندو فیصدی ۵۰ ہیں۔

اس کثرت مصارف شادی وغمی نے بہت ہی زیادہ نقصانات مسلمانوں کو ہر قسم کے پہنچائے ہیں اور آیندہ پہنچانے والے ہیں۔ اس لیے خاص طور پر مسلمانوں کو اپنی باقی ماندہ جائداد کے تحفظ کے لیے اور اپنی نسل کو بڑھانے، دیگر خرابیوں کے دور کرنے، اسلامی عزت ووقار کی حفاظت کے لیے اپنی شادی اور غمی کے مصارف کی طرف نہایت قوت اور سرعت کی ساتھ توجہ کرنی ضروری

ہے۔لہذا حسب ذیل دفعات فوری اصلاح کے لیے تجویز کی جاتی ہیں جن کی اصل اصول یہ ہے کہ ہر خاندان میں شادی اور غمی کے مصارف ایسے ہونے چاہییں جن کو خاندان کا ہر غریب بلا قرض پورا کر سکے۔

۱۔لڑکے اور لڑکیوں کو بالغ ہونے پر جلد از جلد نکاح کر دینا چاہیے۔

۲۔شادی اگر شہر میں ہو تو بارات کو کھانا نہ کھلایا جائے۔

۳۔شہر کی بارات پر فقط نکاح کے بعد چھوارے تقسیم کر دیے جائیں۔

۴۔اگر بارات شہر کے باہر سے آئے تو اس میں پندرہ آدمیوں سے زائد ہرگز نہ آئیں۔

۵۔بارات میں ہاتھی ہرگز نہ لایا جائے۔

۶۔بارات میں پالکی بھی نہ لائی جائے اور اگر ضروری ہو تو فقط نوشہ کے لیے ہونا چاہیے۔

۷۔گھوڑے بھی نہ لائے جائیں اگر ضرورت ہو تو فقط نوشہ کے لیے ہو۔

۸۔یکہ، گاڑیاں، موٹر وغیرہ ضرورت سے زیادہ ہرگز نہ ہوں۔

۹۔بارات میں ڈھول، تاشہ وغیرہ باجے کے سامان یک قلم بند کر دیے جائیں۔

۱۰۔خدام، شاگرد پیشہ سات عدد سے زاید نہ ہوں۔

۱۱۔آتش بازی ناچ وغیرہ ناجائز امور سے پرہیز کلی کیا جائے۔

۱۲۔بارات کو کھانا نہایت سادہ اور کم خرچ کھلایا جائے۔فقط گوشت روٹی یا فقط پلاؤ پر اکتفا کیا جائے۔

۱۳۔ایک شب و روز سے زیادہ ہرگز بارات نہ ٹھہرائی جائے۔

۱۴۔برادری کو کھانا دینا اور تمام محلہ اور شہر میں تقسیم کرنا بالکل بند کر دیا جائے۔

۱۵۔وہ خاص اعزہ واحباب جو امور شادی میں اعانت کر رہے ہوں، ان کو گھر پر کھانا کھلا دیا جائے۔

۱۶۔عورتوں کا زیادہ مجمع نہ کیا جائے محض خاص خاص اور زیادہ تر قریبی عورتیں بلائیں جائیں وہ بھی اگر ضرورت خیال میں آئے۔

۱۷۔عورتوں کے لیے بھی نہایت سادہ کھانا تیار کیا جائے۔

۱۸۔رت جگا۔بھتوانی، گلگلوں، بروں وغیرہ کی رسوم یک قلم بند کر دی جائیں۔

۱۹۔ڈومنیوں کا گوانا، عورتوں کا جمع کرنا اور اس کے متعلق کے مصارف ترک کر دیے

جائیں۔

۲۰۔ جوڑے فقط دلہن کے واسطے تیار کیے جائیں۔ دلہن کے دوسرے رشتہ داروں کے جوڑے بالکل بند کردیے جائیں۔

۲۱۔ دلہن کے جوڑے خواہ کتنے ہی ہوں، لیکن ۵۰ روپیہ سے زاید کے ہرگز نہ ہوں۔

۲۲۔ دولہا کا جوڑا ۱۰ روپیہ سے زاید کا ہرگز نہ ہو۔ دولہا کے دوسرے اقارب کے لیے جوڑے ہرگز نہ ہوں۔

۲۳۔ میوہ، بری، شکر وغیرہ بالکل ترک کردیے جائیں۔

۲۴۔ زیور لڑکے والا مبلغ ۳۰ روپیہ سے زاید کا پیش نہ کرے۔

۲۵۔ لڑکی والا بھی تیس روپیہ سے زاید کا زیور نہ دیوے۔

۲۶۔ زیور، جوڑے اور جہیز وغیرہ کا عورتوں اور مردوں میں دکھلانا بالکل بند کردیا جائے۔

۲۷۔ جہیز میں محض ضروری چیزیں دی جائیں۔ جن کی قیمت تیس روپیہ سے زاید نہ ہو۔

۲۸۔ ولیمہ کی دعوت بھی محض خاص اعزہ واحباب کے لیے ہو جن کا شمار تیس سے زاید ہرگز نہ ہو۔

۲۹۔ نیوتہ کی رسم بند کردینی چاہیے۔

۳۰۔ مہر کو حتی الوسع مہر فاطمی رکھا جائے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو جہاں تک ممکن ہو کم کیا جائے۔

۳۱۔ پرجوں (رعایا مثلاً دھوبی بڑھئی وغیرہ) کے حقوق حسب عادت اور موافق شرع دیے جائیں۔

۳۲۔ دیہاتیوں کے حقوق موقوف کردیے جائیں۔

۳۳۔ عیدی، شبراتی، ساونی، جڑاول وغیرہ موقوف کردیے جائیں۔

۳۴۔ گونہ کی رسم کو بند کردیا جائے۔

۳۵۔ چوتھی کھیلنا اور اس کی دیگر خرافات کو موقوف کردیا جائے۔

۳۶۔ منگنا نہایت سادگی کے ساتھ کردیا جائے۔ کسی قسم کے خاص مصارف اس کے لیے نہ کیے جائیں۔

۳۷۔ غیر رسمی طور پر ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس قدر اور جو چاہے اپنی اولاد بیٹی اور داماد کو دے۔

۳۸۔ بجائے ان مصارف زائدہ کے مناسب ہوگا کہ اصحاب استطاعت حضرات اپنی اولاد اور داماد کے لیے کوئی جائداد وغیرہ رسمی طریقہ پر خرید دیا کریں یا کوئی تجارت قائم کرادیں یا ان مصارف کے نقد کو کسی قومی فنڈ یا مدرسہ میں داخل کردیں۔

ختنہ عقیقہ وغیرہ:

۱۔ عقیقہ ساتویں دن موافق سنت کے کرادیا جائے۔ بچے کے بال منڈائے جائیں، بالوں کی مقدار میں چاندی تول کر خیرات کردیں۔ عمدہ اسلامی نام تجویز کیا جائے۔ لڑکی کے لیے ایک بکرا اور لڑکے کے لیے دو بکرے ذبح کیے جائیں بشرطے کہ استطاعت ہو۔ گوشت یا تو تقسیم کردیا جائے اور یا محض سادہ کھانا پکوا کر تقسیم کردیا جاہے۔ اگر دعوت کریں تو محض خاص خاص اعزہ اور احباب کی جن کی تعداد پندرہ سے زاید نہ ہو۔

۲۔ کرتہ ٹوپی کی رسم بند کردی جائی۔

۳۔ نانہال وغیرہ سے جوڑا اور اس کے لوازمات کی رسم بند کردی جائے۔

۴۔ ختنہ نہایت سادہ طریقہ پر شریعت کے موافق عمل میں لایا جائے۔

۵۔ اگر ممکن ہو تو ختنہ بھی عقیقہ کے ساتھ ساتویں دن کردیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جلد از جلد چھوٹی عمر میں ختنہ کرادیا جائے۔

۶۔ ختنہ کے وقت میں کوئی رسم اور اجتماع کی نوبت نہ آئے اور اگر آئے تو نہایت قلیل اعزہ واحباب پر مشتمل ہو جن کا شمار پندرہ سے زائد نہ ہو۔

۷۔ موت میں تمام مصارف تجہیز وتکفین کے حسب شریعت اور مختصر ہوں۔

۸۔ ایصال ثواب کی اگر وصیت ہو تو حسب وصیت اور موافق شریعت فقط تہائی میں سے مصارف عمل میں لائے جائیں۔

۹۔ اگر ایصال ثواب کی وصیتیں تہائی سے زائد کی خواستگار ہوں اور ورثا سب کے سب بالغ ہوں تو ان کی اجازت سے عملدرآمد کیا جائے۔

۱۰۔ اگر ورثاء تہائی سے زائد کی اجازت نہ دیں یا ان میں کوئی وارث نابالغ ہو تو تہائی سے زائد ہرگز صرف نہ کیا جائے۔

۱۱۔ ایصال ثواب میں محض محتاج اور مستحق خیرات اشخاص بلائے جائیں۔ اصحاب ثروت

احباب واقارب کو یہ کھانا ہرگز نہ کھلایا جائے۔

۱۲۔ان مصارف کو جہاں تک ہو سکے خفیہ طریقہ پر عمل میں لائے۔

۱۳۔لوگوں کا بدلہ کرنا۔

قواعد:

۱۔اس انجمن کی انتظامیہ کمیٹی کو اختیار ہوگا کہ اصل اصول کو لحاظ رکھتے ہوئے مذکورۃ الصدر نمبروں میں باتفاق رائے اور حسب مقتضائے قوم وشہر تغیر وتبدل، تنسیخ وغیرہ کیے جائیں۔

۲۔اس شعبہ کے بھی صدر سیکرٹری وغیرہ عہدہ دار منتخب کیے جائیں۔

۳۔ہر ممبر کو مصارف دفتر کے لیے ۴ سال دینا ہوگا۔

عالیجاہا! اس وقت بہت زیادہ بیداری کی ضرورت ہے۔دوسری قومیں اپنی کثرت، اپنے مال، اپنے علم، اپنی زمینداری، اپنی تجارت اور اپنے عہدوں وغیرہ کے گھمنڈ پر تلی ہوئی ہیں کہ جس طرح بھی ہو مسلمانوں کی ہستی پامال کردو ان کو کوئی تفوق تو درکنار ان کی آواز بھی ملک ہند میں باقی نہ رہ جائے۔ادھر مسلمان اپنی نااتفاقی، افلاس، بیکاری، جہالت، بے شعوری اور کم شماری وغیرہ کی وجہ سے دبے جارہے ہیں۔کچھ لوگوں کو سمجھا بوجھا کر اس لیے کھڑا کیا گیا ہے تاکہ اتفاق ہندو مسلم کا جنازہ نکل جائے۔اب وہ مخالفت کے پلیٹ فارم پر آ گئے اور جہالت و بزدلی کی وجہ سے ہندستان کے اصلی دشمن کو بھول گئے اور مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئے۔وہ وہ پروپیگنڈے موجود ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا نہایت مشکل ہے۔اگر مسلمانوں نے اپنی تنظیم نہ کرلی اور مکمل بیداری کو کام میں نہ لائے تو قوم مسلم کے لیے مستقبل نہایت تاریک ہوگا۔اس لیے بہت زیادہ ضروری ہے کہ ہم اپنے اوقات میں سے کچھ حصہ روزانہ اس میں پوری تندہی کے ساتھ صرف کریں، جب کہ یہ جتھا بندی کرکے قوم مسلم کے درپے ہیں۔اگر خدانخواستہ ان کو کامیابی ہوگئی (جس طرح کے آثار مسلمانوں میں موجود ہیں) تو مسلمان شودر قوموں سے بھی زیادہ گر جائیں گے۔اور ان پر وہ وحشیانہ مظالم ہوں گے، جن کی نظیر دنیا میں نہ ملے گی۔شخصی عزت اور مالداری اس وقت کام نہ آئے گی۔قوم کا گرجانا شخصی عزت کو سنبھال نہیں سکتا۔ہمارے معزز اور سربرآوردہ حضرات تو احساس ہی نہیں رکھتے اور نفسی نفسی میں مبتلا ہیں۔ان کو چھوڑ کر ہر ہر خاندان اور افراد قوم کو سنبھالنا اور جگانا چاہیے۔ان میں باقاعدہ کمیٹیاں قائم کرنی چاہییں۔تجارت، تعلیم، سپہ گری وغیرہ قائم کرتے ہوئے

جہالت، نا اتفاقی، فضول خرچی، مقدمہ بازی سے ان کو بچانا چاہیے۔ اور پوری منظم قوت کی کوشش کر کے دینی جذبات اور عملیات کو کمال پر پہنچانا چاہیے۔ یہی عوام اسلام کے لیے ریڑھ کی ہڈیاں ہیں یہ اگر منظم ہو گئے تو کوئی ہم کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ ان کے غیر منظم ہونے کی وجہ سے بے موقع طریقہ پر دشمن نفع اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ خود بھیس بدل کر آتے ہیں اور صرف شورش واشتعال ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات غیر قوموں پر حملے بھی کر دیتے ہیں اور جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو خود چمپت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بہت زیادہ انتظام اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر میں ملازمت کی وجہ سے مجبور نہ ہوتا تو تمام صوبہ میں دورہ کر کے مسلمانوں میں تنظیمی اسکیم کو معمول بہ کراتا۔

میرے محترم! علم سے دو مقصد ہیں ایک اپنی اصلاح، دوئم غیروں کی اصلاح! بحمد اللہ اول آپ کو حاصل ہو گیا۔ دوسرے امر کے لیے خیال تھا کہ آپ اس میں بھی حصہ لیں جس کی وجہ سے آپ کی علمی قوت روز افزوں ہوتی رہے گی اور دوسروں کو بھی نفع پہنچے گا۔ اب جب تک تجارت کے عقبات اس قدر تنگ و تاریک آپ کے سامنے در پیش ہیں کہ آپ کو تمام اپنی طرف کھینچے ہوئے ہیں وہ کسی طرح نفع پہنچانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تو خیر استخارہ کر کے اس میں داخل ہو جایئے اور جہاں تک ہو سکے، اگر پڑھانا نہ ہو سکے تو پڑھنا ہی سہی۔ ترجمۂ قرآن یا کوئی حدیث کا درس دن کی ابتدائی گھڑیوں میں معمول بہ رکھیں کہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ ذکر و شغل کا بھی مشغلہ کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہے۔

شردھانند کی تقریر ہمارے لیے مفید تر ہو سکتی ہے، اگر مسلمان غیرت سے کام لیں اور اپنے جیب کے پیسوں کو بغیر مسلمان کی جیب کے کہیں اور نہ پہنچائیں، مسلمانوں کا روزانہ تقریباً چار کروڑ روپیہ غیروں کی جیب میں جاتا ہے اس کا باقاعدہ انتظام ضروری ہے کہ مسلمان فقط مسلمان ہی سے خریدیں اور مسلمانوں میں ہر قسم کی تجارت ہو اس کا نظام قائم کیا جائے بظاہر کوئی لڑائی جھگڑا قائم نہ کیا جائے اور اپنی پوری مضبوطی کو کام میں لایا جائے۔

محترمی جناب شیخ رفیع الدین صاحب سے بعد سلام مسنون عرض کر دیجیے کہ آپ حضرات ذرا قوم اسلام کی خبر گیری کیجیے۔ ان بڑے بڑوں کے بھروسے پر نہ رہیے چھوٹے ہی ہمیشہ کام کرتے ہیں۔ اور قوم وار اور محلہ وار تنظیمی کارروائی ہو گئی تو پھر تمام شہر کی کارروائی میں یہ لوگ خود ہی حاضر ہوں گے اور اگر نہ ہوئے تو ہم کو کوئی زیادہ ضرورت ان کو اپنے اپنے گھروں سے نکالنے کی نہ

ہوگی مگر آپ چند سرگرم حضرات کو روزانہ اپنا تھوڑا سا وقت اس میں صرف کرنا لازم ہے۔ والسلام۔

ننگ اکابر حسین احمد سلہٹ خلافت آفس

۶ رصفر ۱۳۴۵ھ، ۱۷ راگست ۱۹۲۶ء

ترکِ موالات کی نئی تدبیر:

۲۱ رستمبر ۱۹۲۶ء: ترک موالات کے پروگرام کے متعلق جمعیۃ علماء ہند کی مجلس مرکزیہ کے سامنے عرصہ سے یہ تجویز درپیش تھی کہ موجودہ صورت میں مسلمانوں کے لیے راہِ نجات کیا ہے؟

مرادآباد کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۴ رجنوری ۱۹۲۵ء میں اس امر پر غور کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنادی گئی۔ سب کمیٹی کے ارکان حسب ذیل تھے:

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدرس دارالعلوم دیوبند

مولانا حسین احمد صاحب مدنی جانشین حضرت شیخ الہند قدس سرہ

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر الشریعۃ صوبہ بہار واڑیسہ

مولانا ثناء اللہ صاحب سیکریٹری جمعیۃ اہل حدیث۔

اس سب کمیٹی کا جلسہ ۲۰ راپریل ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوا اور اس نے ایک تجویز کا مسودہ پیش کیا جس کے علاوہ اسی جلسے میں طے ہوا کہ اسے ممبران مرکزیہ کے پاس بغرض استصواب بھیجا جائے۔

چناں چہ مسودۂ مذکور ممبران کے پاس بھیجا گیا اور ۸ رمئی ۱۹۲۶ء کو حاصل شدہ آرا مجلس عاملہ کے جلسہ میں پیش کی گئیں۔ اس وقت تک صرف ۳۲ رائیں آئی تھیں جن میں سے ۳۰ موافق اور صرف ۲ مخالف تھیں مگر مجلس عاملہ نے مزید آراء حاصل کرنے کے لیے اس کی اشاعت کو ملتوی رکھا۔ پھر ۲۲ رستمبر ۱۹۲۶ء کو مجلس عاملہ کے دوسرے جلسہ میں یہ معاملہ پیش ہوا۔ اب حاصل شدہ آراء کی تعداد ۵۳ تک پہنچ چکی تھی اس میں سے صرف ۳ مخالف تھیں۔ دو ترمیمیں تھیں اور باقی ۴۸ موافق تھیں۔ اس لیے مجلس عاملہ نے اسے منظور اور شائع کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ لہٰذا تجویز مذکور شائع کی جاتی ہے۔

تجویز نمبر ۱۔ جمعیت علماء ہند کا یہ اجلاس فتویٰ ترک موالات کے سلسلہ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ (جیسا کہ مطبوعہ متفقہ فتویٰ میں تصریح کر دی گئی تھی) لفظ موالات محاورۂ عرب و اصطلاح

شرع میں بمعنی محبت (دوستی) ومناصرت (باہمی امداد) مستعمل ہوتا ہے اور اعدائے دین سے موالات دونوں معنی کے اعتبار سے حرام ہے۔

کفار محاربین سے ترک موالات کرنے کا حکم قرآن وسنت کا ایک منصوص محکم دائمی، اجماعی، غیر متبدل اور عام حکم ہے۔ اور جو قوم یا افراد مسلمانوں کی جان، مال، آبرو، دین اور شعائر اسلام پر حملے کریں۔ یا اس کے لیے سازشیں کر کے ترغیب اور دعوت دیں اور اسلامی قومیت اور مسلمانوں کے مٹانے یا ضعیف بنانے اور کلمۂ اسلام کو پست کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں یا بلاد اسلامیہ پر قبضہ کر لیں یا قبضہ کی کوشش کریں۔ ایسے غیر مسلموں اور دشمنان دین سے رشتۂ موالات قائم کرنا حرام ہے۔ یہ حکم دائمی ہے لیکن استطاعت کے مدارج اور ماحول کے تفاوت کے لحاظ سے اس کی تاکید وتخفیف میں تفاوت ہونا بھی شرعی حکم ہے اسی طرح دو مصیبتوں میں مبتلا ہو جانے کے وقت اھون البلیقین (کم ضرر رساں مصیبت) کو اختیار کر لینے والا شرعاً معذور ہے۔ متفقہ فتوے کی تنفیذ واشاعت کے وقت اول تو حکومت موجودہ کی مسلمان حکومتوں کے ساتھ بالفعل جنگی حالت قائم تھی۔ اور مسلمانوں کو قتل کرنے، ان کا مال لوٹنے، گھروں سے نکالنے، بلاد اسلامیہ پر قبضہ و تسلط جمانے کی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ دوسرے مسلمانان ہند بھی حکومت جابر کے جبر وتشدد سے خلاصی حاصل کرنے اور اپنے وطن کو (جو صدیوں تک دارالاسلام رہ چکا ہے) آزاد کرانے کے شرعی فریضہ پر عمل کرنے کے لیے متحدہ جذبۂ وطنیت کی فضا پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہمہ تن مستعد ہو گئے تھے اور اس اجتماعی مستعدی نے صورت استطاعت پیدا کر دی تھی۔ اس ماحول کی موافقت اور امکان استطاعت کی وجہ سے خاص خاص مدارج کے متعلق ترک موالات کا تاکیدی حکم متفقہ فتویٰ کی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے آج ہندوستان کی حالت متغیر ہو گئی۔ اور خود ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہب اور جان ومال کو خطرات نے گھیر لیا اور ماحول کی ہیبت ناک حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ مسلمانوں کے بہت سے بیدار مغز موقع شناس اہل الرائے اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ اگر وہ اب بھی اسلامی قومیت کی حفاظت کے لیے سعی نہ کریں اور اسلام اور مسلمانون کو مٹا دینے کی کوششوں کی مدافعت کے وسائل اختیار نہ کریں تو اسلامی قومیت کے استیصال اور مسلمانوں کی تضعیف وتوہین کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہو گی۔

جمعیۃ علمائے ہند کامل غور واحتیاط کے ساتھ تمام جدید حالات کا معائنہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اگر موجودہ تاریک فضا میں اہل الرائے اور مخلص مسلمان اپنے مذہب اور اپنی ہستی کو محفوظ

رکھنے کے لیے کوئی ایسا عمل اختیار کرلیں جو اس مقصد کے لیے ضروری ہو۔ اگرچہ صورۃً موہم موالات ہو۔ لیکن حقیقۃً ومعناً ونیتہً موالات مقصود نہ ہو۔ اور اعدائے دین کی اعانت وامداد نہ ہوتی ہو۔ نیز مذہب اور قوم ووطن کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہوتو اس عمل میں وہ بقاعدہ اختیار ''اہون البلیتین'' معذور ہوں گے۔ اور شرعاً قابل مواخذہ نہ ہوں گے۔

یہ حکم معذوری بھی اسی وقت تک ہے، جب تک فضاء کی تاریکی دور نہ ہو یا کوئی اور زیادہ مہتم بالشان خاص حالت پیدا نہ ہو جائے۔ (جمعیت العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، صفحہ ۳۰۔ ۱۲۷)

اجلاس کانگریس:

۲۶/دسمبر ۱۹۲۶ء: ۲۶/دسمبر ۱۹۲۶ء کو گوہاٹی میں آل انڈیا کانگریس کا اکتالیسواں سالانہ اجلاس اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ۳۰۰۰ مندوبین شریک ہوئے۔ اجلاس کے صدر شری نواس آئنگر منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں بیشتر لیڈروں نے تقریریں کیں۔ ''اتحاد بین القوم'' پر سیر حاصل تبصرے ہوئے اور ایک کمیٹی طے پائی کہ جتنی جلد ہو سکے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کے اسباب حقیقی کی صحیح رپورٹ ۳۱/مارچ ۲۷ء تک پیش کی جائے تاکہ اس کا تدارک کیا جا سکے۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۲۸)۔

۱۹۲۷ء

۲۸/مارچ ۱۹۲۷ء: ۲۸/مارچ ۱۹۲۷ء کو مسلمان رہنماؤں نے دہلی میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ اس اجتماع میں:

۱۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ۲۔ مولانا محمد علی جوہر،
۳۔ راجہ آف محمود آباد، ۴۔ سر عبدالقیوم،
۵۔ سر عبدالستار، ۶۔ سر محمد یعقوب،
۷۔ مسٹر محمد علی جناح،

شامل ہوئے۔ دو دن کی بحث کے بعد مسلمانان ہند کے لیے حسب ذیل شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب کرانے کے لیے منظور کرلیا۔

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے نیا صوبہ بنایا جائے۔

۲۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں اسی طرح قانون رائج کیا جائے جس طرح ہندوستان کے دیگر صوبوں میں ہے۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں نمایندگی کا تناسب آبادی کے لحاظ سے رکھا جائے۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ۳/۱ نمائندگی دی جائے۔ وہ بھی مخلوط انتخاب سے۔"

اس تجویز کو انتہا پسند عناصر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ایسے لوگوں نے بھی قبول کرلیا۔ لیکن سر محمد شفیع، سر عبدالقیوم، سر ذوالفقار علی اور محمد علی جناح ایسے قدامت پسند حضرات نے اس فارمولے کو ماننے سے انکار کر دیا۔

۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے دہلی کے اجلاس میں اول الذکر مسلمانوں کی رائے کو قبول کرلیا۔ (کاروان احرار، ج۱، ص ۷۰)

۲ مئی ۱۹۲۷ء: حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی ۲ مئی کو انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور پہنچے۔ انقلاب لاہور میں "حضرت مولانا حسین احمد کا وعظ" کے عنوان سے مندرجۂ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:

لاہور میں ۲ مئی، آج رات کو ۸ بجے باغ بیرون موچی دروازہ میں علامہ سر محمد اقبال کے زیر صدارت مسلمانوں کا ایک جلسہ عام منعقد ہوگا، جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی مسلمانوں کے موجودہ مصائب پر وعظ فرمائیں گے۔ (انقلاب لاہور، ۳ مئی ۱۹۲۷ء)

۳ مئی ۱۹۲۷ء: انقلاب، لاہور نے "حضرت مولانا حسین احمد لاہور میں" کے عنوان سے ایک شذرہ شائع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل لاہور نے حضرت مولانا کا پرتپاک خیر مقدم کیا، ان کی تشریف آوری کو یمن وسعادت سمجھا گیا۔ ان کے وعظ کو شوق کے ساتھ سنا گیا اور حضرت علامہ اقبال نے نہ صرف جلسۂ وعظ کی صدارت فرمائی بلکہ حضرت مولانا کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام بھی کیا۔ انقلاب کا شذرہ یہ ہے:

"خدام الدین کے سالانہ جلسے کے سلسلے میں مسلمانان لاہور کے لیے مسرت وشادمانی کا شاید سب سے بڑا پیام یہ تھا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی خلیفہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے سرزمین لاہور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ لاہور میں حضرت مولانا کی یہ پہلی تشریف آوری تھی...... ۲ مئی کی شام کو حضرت علامہ اقبال کی صدارت میں ایک عام تقریر فرمائی۔ ۲ مئی کی شام کو حضرت علامہ کے ہاں دعوت طعام تھی۔ ۲۔ مئی کو دس بجے کے

قریب حضرت موصوف، مولانا حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی اور مولانا محمد نعیم صاحب کی معیت میں دفتر "انقلاب" میں تشریف لائے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک ارکان دفتر کو فیض صحبت سے مشرف رکھا...... (انقلاب۔ لاہور، ۴؍مئی ۱۹۲۷ء)

۳؍مئی ۱۹۲۷ء: انقلاب، لاہور نے انجمن خدام الدین کی جلسے میں حضرت مولانا مدنی کی تقریر کی رپورٹ پر جو شذرہ شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان اس طرح ہے:

مسلمانوں کے لیے انتباہِ عمل کا ایک دل نشیں پیغام

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی تقریر

رپورٹ مندرجہ ذیل ہے: حسب اعلان ۲؍مئی کی شام کو موچی دروزاہ کے باہر مسلمانوں کا ایک جلسہ عام ہوا۔ علامہ اقبال صدر تھے۔ جلسہ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا۔ حضرت مولانا حسین احمد نے تقریباً ڈھائی گھنٹے تک ایک نہایت جامع، مفصل، موثر اور لبریز معلومات تقریر فرمائی اور وقت کے تمام ضروری مسائل پر تبصرہ کیا...... حضرت مولانا کی تقریر کم و بیش گیارہ بجے تک جاری رہی۔ علامہ اقبال نے مختصری صدارتی تقریر میں مولانا کا شکریہ ادا کیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس تقریر پر خلوص و سرگرمی کے ساتھ عمل کریں۔ وقت زیادہ ہو چکا تھا اس لیے جلسہ بر خاست کرنا پڑا۔ مولانا ظفر علی خاں نے قرآن حکیم سے "لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق" (۴۸:۲۷) والی آیات پڑھیں اور ان کا ترجمہ سنا کر کہا کہ مسلمانوں کے خصائص کا یہ صحیح مرقع ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جلسہ برخاست ہوا...... (انقلاب، لاہور۔ ۴؍مئی ۱۹۲۷ء)

آج ہی اخبار کی ایک اور خبر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۲؍مئی کی شام کو حضرت علامہ اقبال کے ہاں ایک دعوت طعام بھی تھی جس میں حضرت مولانا مدنی نے شرکت فرمائی۔

لاہور کا فساد:

۱۷؍مئی ۱۹۲۷ء: حضرت مولانا مدنی ۲؍مئی کو انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تھے۔ اسی روز شب میں ساڑھے آٹھ بجے سے ۱۱ بجے تک انھوں نے تقریر فرمائی اور دوسرے روز ۳؍مئی کو خواجہ عبدالحی اور بعض دوسرے حضرات کی معیت میں بٹالہ اور گورداس پور کے لیے روانہ ہوگئے۔ حضرت مولانا کی روانگی کے بعد ۵؍مئی کو حویلی کابلی مل میں سکھ

مسلم فساد ہوگیا۔ جس میں کئی مسلمان ہلاک وزخمی ہوئے تھے لاہور کے اخبار روزنامہ ''بندے ماترم'' نے اس فساد کا تعلق حضرت مولانا مدنی کی ۲ رمئی کی تقریر سے جوڑ دیا۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب نے اس بات کی مدلل انداز اور پرزور الفاظ میں تردید کی۔ مولانا مہر نے اس موقعے پر جو اداریہ لکھا تھا، اسے یہاں پیش کیا جاتا ہے:

چوری اور سینہ زوری:

''بندے ماترم'' نے اپنی ایک اشاعت میں ۳ و ۴ رمئی کی درمیانی شب کے الم انگیز واقعہ کو حضرت مولانا حسین احمد کی تقریر کا نتیجہ قرار دیا تھا اور بڑی دیدہ دلیری سے یہ بھی تحریر کر دیا کہ مولانا حسین احمد کی تقریر ۳ و ۴ رمئی کی واقعہ ہائلہ سے صرف ڈیڑھ گھنٹہ پیشتر ہوئی تھی۔''

''۴ رمئی کے ''انقلاب'' میں جو ۳ رمئی کے دن اور حویلی کابلی مل کے واقعہ سے کم از کم بارہ گھنٹے قبل شائع ہوا ''حضرت مولانا حسین احمد لاہور میں'' کے زیر عنوان مرقوم ہے: ''۲ رمئی کے شام کو حضرت علامہ اقبال کی صدارت میں ایک عام تقریر فرمائی۔ ۳ رمئی کی صبح کو حضرت ممدوح خواجہ عبدالحیٔ صاحب استاذ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور بعض دوسرے اصحاب کی معیت میں بٹالہ اور گورداس پور تشریف لے جارہے ہیں۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ ۳ رمئی کی صبح کو مولانا حسین احمد لاہور سے تشریف لے گئے تھے۔ ہمارے ایک بھائی امرتسر تک ان کے ساتھ گئے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ خود ''بندے ماترم'' نے جو روئداد شائع کی ہے، اس پر بھی ۲ رمئی کی تاریخ ثبت ہے۔ اگر چہ یہ روئداد ''بندے ماترم'' کی ۵ رمئی کی اشاعت میں چھپی اور چوں کہ اس وقت تک ۳ رمئی کا واقعہ ہو چکا تھا، اس لیے سرخی میں اسے مولانا حسین احمد کی تقریر کا نتیجہ قرار دے دیا گیا۔''

> ''یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ۳ و ۴ رمئی کی رات کو آندھی اور بارش تھی اور ساڑھے سات بجے کے وقت موسم کی حالت ایسی نہ تھی کہ باہر جلسہ منعقد ہو سکتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ مولانا حسین احمد کی تقریر سات آٹھ بجے سے شروع ہو کر تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہی اور حضرت علامہ اقبال اس کی صدارت فرماتے رہے، لیکن جس وقت کابلی مل کی حویلی کا واقعہ ہوا ہے، اس رات حضرت علامہ اقبال اطلاع پاتے ہی موقع واردات پر پہنچ گئے تھے اور صبح کے پانچ بجے تک تفتیش کرانے میں مصروف

رہے۔ کیا یہ تمام باتیں بھی ''بندے ماترم'' کو ۲؍مئی کا یقین دلانے کے لیے کافی نہیں؟ اب تک کئی جھوٹوں سے سابقہ پڑا، لیکن ''بندے ماترم'' کی دیدہ دلیری کی مثال آج تک کہیں نظر نہیں آئی۔'' (انقلاب، لاہور۔ ۱۷؍مئی ۱۹۲۷ء)

سعودی عربیہ:

۲۰؍مئی ۱۹۲۷ء: ۲۰؍مئی ۱۹۲۷ء کو معاہدۂ جدہ کی رو سے برطانیہ نے سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمان الفیصل السعود (جو اب صرف سلطان ابن سعود کہلاتے ہیں) کو حجاز اور نجد کا خود مختار اور آزاد فرمانروا تسلیم کرلیا۔ اس سے پہلے سلطان ابن سعود کا خاندان نجد پر حکومت کرتا تھا۔...... اٹھارھویں صدی میں نجد ایک آزاد مملکت تھی۔ اس کے بعد ترکوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اور ۱۹۱۳ء میں سلطان ابن سعود نے ترکوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکا اور اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں جبل الشمر کے رشید یہ قبیلے کی مملکت کو بھی فتح کرلیا۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے حجاز کو فتح کیا۔ ۱۹۲۶ء میں عسیر کا بہت بڑا علاقہ ان کے قبضہ میں آ گیا۔ (بین الاقوامی سیاسی معلومات ''دہلی'' ۱۹۵۱ء ص ۵۸۱)

مئی ۱۹۲۷ء: دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی مشہور تصنیف ہے۔ اس پر حضرت پر حضرت شیخ الاسلام کے قلم سے یادگار تقریظ ہے جو ذیل میں من وعن نقل کی جاتی ہے:

تقریظ

امیر الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ

مہاجر مدنی دامت برکاتہم شیخ الحدیث وصدر المدرسین جامعۂ قاسمیۂ دارالعلوم دیوبند

مذہب اسلام کی صداقت اور اس کے اصول کی حقانیت کچھ ایسی نہ تھی کہ قلوب عالم اور ارواح عامۂ انسانیہ میں مثل غذاے صالحہ خود بخود منجذب ہو کر نہ پہنچتی، اس کی تعلیمات صحیحہ کی چمکتی ہوئی روشنی بھی کچھ ایسی کمزور نہ تھی کہ کفر و بطلان کی آنکھوں کو خیرہ اور چکا چوند نہ کردیتی، ہاں ہاں اس کے سچے اصول اور محکم قواعد نے نہ صرف حکماے زمانہ کے دماغوں کے منور اور درخشندہ کیا بلکہ اقوام عالم کے دور افتادہ اور گوشہ نشین عناصر کے عقول واذہان کو بھی اپنی تیز وتند شعاعوں سے جگمگا دیا اس کی روحانی تربیت اور اخلاقی اصلاحات نے بھی نہ فقط حلقہ بگوشان ادیان سابقہ کو اپنا گرویدہ

بنالیا بلکہ ریگستانوں میں بادیہ پیمائی کرنے والوں اور پہاڑوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرنے والوں کو بھی اپنا غلام کرلیا، یہی وجہ ہے کہ نہایت تھوڑی مدت میں ''بحر اٹلانٹک'' کی سواحل سے لے کر ''بحر پاسفک'' کے کناروں تک اور بحر منجمد شمالی کے برفستان سے لے کر صحرائے کبیر افریقہ کی انتہائی اور گرم حدود تک ہزارہا میل کی مسافت میں لا الہ الا اللہ کا ڈنکا بجنے لگا، تلواروں میں یہ قوت کہاں ہے اور ہتھیاروں میں یہ عالمگیری کس طرح آسکتی ہے؟

کہاں ہیں شپرہ چشم اشخاص، حقیقی روشنی سے بے بہرہ ہونے والے، سچائی اور حقانیت سے بے فیض معاندین اور ہٹ دھرموں سے دھوکا کھانے والے آئیں اور دیدۂ بصیرت کھولیں، تاریخ اسلام کے سنہری اوراق کا مطالعہ کریں، نور اور ظلمت میں تمیز کریں، کھرے وکھوٹے کو پرکھیں اسلام کی دلربائی اور اس کی محبوبیت کا نظارہ کریں اور علم حقیقی اور واقعی روشنی سے اپنے دل ودماغ کو منور کریں، زیادہ توفیق نہ ہو تو حضرت مولانا الاستاذ العلامۃ المحقق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مد اللہ ظلہ العالی کے اس مضمون (دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا) کو جو کہ مولانا دامت برکاتہم کے شریں بحار تحقیق کا ایک قطرہ اور ان کی سچی تاریخی واقفیت کا ایک نقطہ ہے، بغور ملاحظہ کریں تاکہ متعصب پادریوں اور نادان وہٹ دھرم آریوں کی دروغ گوئی وابلہ فریبی کا پول کھلے اور اسلام کی جہانگیر صداقت کا پتا چلے۔ **فجزاھم اللہ تعالیٰ فی الدارین احسن الجزاء آمین ..**

حسین احمد غفرلہ، الفیض آبادی ثم المدنی الدیوبندی۔

۵/جولائی ۱۹۲۷ء: ''دفتر انقلاب پر علم وعرفان کی بارش'' اور ''مقتدر علمائے کرام کی تشریف آوری'' کے دہرے عنوان سے روزنامہ انقلاب لاہور میں ایک خبر شائع ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزنامہ انقلاب کی دعوت میں جو علمائے کرام تشریف لے گئے تھے ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی بھی شامل تھے۔ انقلاب کی پوری خبر یہ ہے:

لاہور ۵/جون، آج شام کے ۵ بجے مفتی اعظم صدر العلماء حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی، مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت علمائے ہند، مولانا عبد الحلیم صدیقی، مولانا ابو المعارف محمد عرفان، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا احمد علی صاحب، مولانا محمد عبد اللہ ناظم جمعیۃ دعوت وتبلیغ، ملک لال خاں صاحب، حضرت علامہ اقبال اور چند اور حضرات نے کارپردازان ''انقلاب'' کی ناچیز دعوت قبول فرمائی اور دفتر انقلاب تشریف لائے۔ ان بزرگان اسلام نے جس بزرگانہ شفقت کا اظہار فرمایا،

اس کے لیے اظہار عقیدت وارادت کے سوائے ہم غریبوں کے پاس کیا رکھا تھا۔ غریبانہ ماکولات ومشروبات پیش کیے گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک دفتر انقلاب کو ان حضرات کے قدوم میمنت لزوم سے مفتخر وممتاز ہونے کا موقع ملا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب جس بزرگانہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے ہمارے بزرگ ہم سے رخصت ہوئے وہ ہمارے دلوں پر ہمیشہ نقش رہے گا۔

۲۸؍جولائی ۱۹۲۷ء: یہ خط حضرت مرحوم نے آستانۂ عالیہ حضرت شیخ الہندؒ، دیوبند سے ۲۸؍محرم ۱۳۱۶ھ کو مکتوب الیہ نامعلوم الاسم کے کئی سوالات کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ سیاسی ڈائری میں اندراج کے قابل ایک سوال کا جواب ہی نظر آیا۔ درج کیا جاتا ہے:

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج شریف۔

آپ کا والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا۔ میں ایک معمولی طالب علم ہوں۔ جو کچھ آپ پوچھیں گے اپنی لیاقت کے مطابق عرض کردوں گا۔ مگر کیا کروں فرصت نہیں ہوتی۔ مشاغل بہت زیادہ ہیں۔ اور پھر طبعی کسل اور اسفار اور بھی زیادہ ترسد راہ ہوتے ہیں۔ آپ کے اجوبہ معہ اسئلہ عرض کرتا ہوں۔

سوال نمبر۱: اگرچہ بعض اخبارات نجدیوں کے مظالم ذکر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی امنِ عام کی خبر بالاتفاق نزد مخالف وموافق مسلّم امر ہے۔ لہٰذا کسی طرح فریضۂ حج سے تقاعد کرنا جائز نہیں۔ جو حضرات سفرِ حجِ مفروض سے منع کرتے ہیں وہ بہت زیادہ خاطا وار ہیں۔ جبکہ امن عامہ حجاج کے لیے نہ ہو۔ یعنی عدمِ سلامتی غالب ہو۔ یا کوئی شخص اپنے مذہب اور قول امام کے موافق ادائے نسک نہ کرسکتا ہو۔ اس وقت میں فریضۂ حج کو ادا کرنے میں تاخیر کرنی چاہیے۔ اس وقت تک کہ امن عامہ قائم ہوجائے۔

۱۹؍ستمبر ۱۹۲۷ء: ۱۹؍ستمبر کو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان کا انتقال ہوگیا۔ وہ تحریک آزادی کے صف اول کے قوم پرور رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ترک موالات کی تحریک کے زمانے میں سرکار کا عطا کردہ خطاب حاذق الملک انھوں نے حکومت کو واپس کردیا تھا۔ قوم نے انھیں ''مسیح الملک'' کے خطاب سے نوازا۔ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کرچکے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر اور نثر نگار اور تہذیبی شخصیت بھی تھے۔ ان کے انتقال کا ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر سوگ منایا گیا۔

اسیران کاکوری کیس کی رہائی:

آزادی وطن کے لیے برصغیر میں پرامن جدوجہد کے ساتھ دہشت پسند تحریکات کو بھی دخل رہا۔ ہندوستان کا یہ انقلابی محاذ شہدائے وطن کی ان گنت لاشوں پر تعمیر ہے۔ پھانسی کے تختے، بندوق کی سنگینیں، جیل خانوں کی تاریک کوٹھڑیاں چشم دید گواہ ہیں، کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرنے والے کتنے نوجوان ہیں، جنھیں انگریز نے محض ان کے جذبۂ حریت کے جرم کو بغاوت سے تعبیر کر کے موت کی نیند سلا دیا۔

چناں چہ دیگر واقعات کی طرح ۹ راگست ۱۹۲۵ء کو سہارنپور سے لکھنو جانے والی ۸۔ ڈاؤن ٹرین جب کاکوری اسٹیشن پر رک کر تھوڑی دور آگے گئی تو اس کی زنجیر کھینچ کر روک لیا گیا۔ دس نوجوان پستول تانے باہر نکل آئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسافر اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ہم انقلابی ہیں اور ریلوے کا سرکاری خزانہ، جو اس گاڑی میں ہے، لوٹنا چاہتے ہیں اور بس!

ریلوے کے گارڈ کو پیٹ کے بل لٹا کر اس پر دو انقلابی پستول لیے کھڑے رہے۔ دو آدمی ریلوے انجن کے پاس رہے۔ باقی خزانہ کی پیٹیاں اتارنے اور انھیں لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ اس گروہ کا لیڈر رام پرشاد بسمل تھا۔ دیگر ممبروں میں اشفاق اللہ نمایاں تھا۔ یہ لوگ اپنا کام مکمل کر کے لکھنو پہنچ گئے۔ دوسرے دن کے اخبارات نے اس واقعہ کو مختلف عنوان اور مختلف نظریوں سے شائع کیا۔ حکومت اور ٹوڑی قسم کے تعلقہ داروں میں اس سیاسی ڈاکے نے خاصا ہیجان پیدا کر دیا۔

۶ رستمبر ۱۹۲۷ء کو صوبہ بھر کے چوالیس آدمیوں کو شبہ کی بناء پر گرفتار کر لیا گیا۔ تحقیق کے بعد ۱۵ آدمی رہا کر دیے گئے۔ باقی افراد پر مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ حقیقی ملزموں میں جو ابھی تک گرفتار نہ ہو سکے تھے، اشفاق اللہ بھی شامل تھا۔

اشفاق اللہ خان، شاہجہان پور کا رہنے والا تھا۔ اس کا والد شفیق اللہ خاں یوپی پولیس میں سب انسپکٹر رہ چکا تھا۔ باقی خاندان بھی سرکاری عہدوں پر فائز تھا۔ اشفاق اللہ خاں تقریباً ایک سال تک اس واردات کے بعد مفرور رہا۔ حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کے لیے دو ہزار روپیہ انعام تھا۔ اس دوران اس کا ارادہ ملک چھوڑ دینے کا ہوا۔ اس غرض سے وہ اپنے عزیزوں کے ہاں دہلی چلا گیا میزبان بڑے تپاک سے ملے۔ دعوت کی اور یہیں سے دوسرے دن سہ پہر کو

انھیں گرفتار کر لیا گیا۔

جیل خانے میں اشفاق اللہ خان کو خاندانی دباؤ کے ساتھ حکومت کی طرف سے لالچ دیا گیا کہ وہ سرکاری گواہ بن کر اپنی جان بچائے۔ اسے پولیس یا فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا جائے گا۔ مگر اشفاق اللہ نے اس کے جواب میں کہا:

''میری غداری سے ملک کی تحریک آزادی کو نقصان پہنچے گا۔ لہذا آپ مجھ سے کسی ایسی بات کی توقع نہ رکھیں، جس کی وجہ سے مسلمان قوم کی رسوائی ہو۔ بلاشبہ اس مقدمے میں سرکاری گواہ بن جانا میرا ذاتی فائدہ ہوگا، لیکن دوستوں میں بحیثیت مسلمان میرا اور مسلمان قوم کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

برٹش حکومت کا آلہ کار بننے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے ملک کی آزادی کے لیے تختہ دار پر چڑھ جانے دیں، تاکہ یہ اعزاز کسی مسلمان کو بھی حاصل ہو سکے۔ کیوں کہ یو پی انقلابی پارٹی میں، میں تنہا مسلمان ہوں۔''

خزانہ لوٹتے وقت احتیاط کے باوجود ایک مسافر گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ مقدمہ کی ابتدائی کارروائی اور استغاثہ کے سرکاری گواہان نے اشفاق اللہ خان اور رام پرشاد بسمل کو تمام واردات کا مجرم ٹھہرایا۔ جس پر انھیں سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا۔ اس پر بھی حکومت اشفاق اللہ کو چند شرائط پر رہا کرنے کو تیار تھی۔ لیکن اس نے نہ صرف ان شرائط کو ٹھکرا دیا، بلکہ کہا:

''حکومت نے رام پرشاد بسمل کو پارٹی لیڈر کی حیثیت سے سزائے موت (سنا) دی ہے، حال آں کہ حقیقت میں پارٹی لیڈر میں ہوں اور یہ سارا کچھ میرے پلان کے تحت ہوا ہے۔''

اس پر حکومت نے رام پرشاد بسمل کو سزائے موت کی بجائے بیس سال قید بہ عبور دریائے شور کی سزا دی۔ نیز دیگر ملزمان کو دس سال اور پندرہ سال قید کی سزا دی۔ اور اشفاق اللہ خاں کو ۱۹۔ ستمبر ۱۹۲۷ء کو فیض آباد جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اور نعش ورثاء کے سپرد کر دی گئی۔ جنھوں نے اشفاق اللہ خان کو شاہجہان پور کے محلہ جلال نگر میں سپرد خاک کر دیا۔

اشفاق اللہ خان اور رام پرشاد بسمل شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ موت سے کچھ دن پہلے دونوں کے اشعار آخری پیغام کے عنوان سے کسی طرح جیل خانے سے باہر پہنچ گئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں دل مگر آزاد رہے
مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ میری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے
(اشفاق اللہ شہید)

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے
راہرو راہ محبت رہ نہ جانا راہ میں
جذبۂ الفت کا حاصل دوری منزل میں ہے
(رام پرشاد بسمل)

اس تاریخی مقدمہ کے قیدی، جن کی سزائیں ہنوز باقی تھیں۔ یوپی کانگریس وزارت نے انھیں ۲۴راگست ۱۹۳۷ء کو یوپی کی مختلف جیلوں سے رہا کردیا۔ (کاروان احرار، ج ۳)

ستمبر ۱۹۲۷ء: سائمن کمیشن کی آمد پر مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک دھڑے کے صدر سر محمد شفیع اور سکریٹری علامہ اقبال ہوئے اور دوسرے دھڑے کے صدر مسٹر محمد علی جناح تھے۔ یکم دسمبر کو شفیع لیگ نے لاہور میں اپنا جلسہ کیا اور اسی ہفتے سر محمد یعقوب کی صدارت میں جناح لیگ کا جلسہ کلکتہ میں ہوا اس میں بہت سے کانگریسی رہنماؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

۲۲رنومبر ۱۹۲۷: ہمدرد، دہلی نے اپنی اشاعت ۲۲رنومبر ۱۹۲۷ء میں ''ہندوستانی جلاوطن'' کے عنوان سے یہ اداریہ شائع کیا ہے:

''ہم کسی دوسرے صفحہ پر مسٹر سلیند رناتھ گھوش کی ایک تحریر شائع کررہے ہیں جو انھوں نے ہمارے پاس نیویارک (امریکہ) سے ارسال کی ہے۔ اس تحریر میں انھوں نے مختلف سوالات کا تذکرہ کیا ہے اور اس امر کی اہمیت ظاہر کی ہے کہ اگر ہندوستان کے لوگ اپنے بھائیوں کی امداد پر آمادہ ہوجائیں، جن کو صرف اس گناہ وقصور کے ارتکاب پر جلاوطن کردیا گیا تھا کہ ان کے دلوں میں ملک وقوم کی محبت وجان نثاری کا جذبہ موجزن تھا اور وہ اپنے وطن عزیز کو کسی غیر کی غلامی میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے، تو یہ فداکاران ہندوستان غیر ممالک میں اب بھی ہندوستان کی کافی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس وقت ہندوستانی جلاوطن دنیا کے تقریباً ہر قابل ذکر ملک میں

موجود ہیں اوران میں سے بعض کے خلوص اور جذبۂ حب الوطنی کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔''
(ہمدرد۔دہلی،۲۲؍نومبر۱۹۲۷ء)

اس اداریے میں سلیندر ناتھ گھوش کی جس تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ اسی شمارے میں ''ہندوستان کے خلاف امریکہ میں پروپیگنڈا۔انڈین نیشنل کانگریس کا فرض'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ تحریر یہ ہے:

ہندوستان کے خلاف امریکہ میں پروپیگنڈا

انڈین نیشنل کانگریس کا فرض!

مسٹر سلیندر ناتھ گھوش نے ''انڈیا نیوز سروس'' انڈیا فریڈم فاؤنڈیشن،۷۹۹ براڈوے، نیویارک سٹی'' سے حسب ذیل تحریر برائے اشاعت ارسال کی ہے:

''امریکہ میں یہ عام طور پر مشہور ہوگیا ہے کہ سر بازل بلیکٹ ممبر مالیات حکومت ہند جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ اپنے عہدہ سے عنقریب جدا ہو جائیں گے، امریکن فیڈرل ریزروسسٹم کے برطانوی مشیر کی حیثیت سے ولایت متحدہ امریکہ آرہے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ برطانوی ملوکیت کا ایک اور بڑا حامی اس غرض سے یہاں آرہا ہے کہ ہندوستان کے حالات کے متعلق اپنے ذاتی تجربات اور ذاتی واقفیت سے امریکہ کے لوگوں کو آگاہ کرے۔گذشتہ سال سر فیڈرک وائٹ اس فرض کو انجام دیتے تھے،اس سال سر بازل بلیکٹ انجام دیں گے۔ہم برطانیہ پر اس بات کا کوئی الزام نہیں لگاتے کہ وہ ہر سال امریکہ میں جدید پروپیگنڈا کرنے والے بھیجتی ہے۔کیوں کہ یہ تو اس کے مفاد کے لیے ضروری ہے۔ برطانوی لوگ اپنے اسی عیارانہ پروپیگنڈے اور پرفن حکمت عملی سے سلطنت برطانیہ جیسی زبردست اور وسیع سلطنت پر قبضہ کرے ہوئے ہیں اور اس وقت تک اپنی اس حکمت عملی اور پروپیگنڈے سے باز نہیں آئیں گے جب تک ان کا بس چلے گا۔اس پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنا دراصل ان کا فرض ہے جو موجودہ حالت کو پسند نہیں کرتے اور اس کا ثبوت عملاً دینا چاہتے ہیں۔انڈین نیشنل کانگریس جس کا مطمح نظر یہ ہے کہ باشندگانِ ہند کے

لیے حکومت خود اختیاری حاصل کرے اور ہندوستان کی موجودہ حکومت کو سوراج سے بدل دے، وہ قومی حکومت کے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتی اور سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہوگی کہ ان ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے جو غیر ممالک میں موجود ہیں۔ اگر ہندوستانیوں کے یہ حقوق دنیا کے کسی حصے میں پامال کیے جائیں تو نیشنل کانگریس اس قسم کی زیادتیوں کو عاجزی اور انکساری کے ساتھ کبھی برداشت نہیں کر سکتی، بشرطے کہ اس کا نصب العین واقعی یہ ہو کہ قومی حکومت اگر ہمارے حقوق اس قابل نہیں کہ ان کی حفاظت کی جائے تو وہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کو حاصل کیا جائے۔ ہر قومی حکومت کا یہ مقدم فرض ہے کہ اپنی رعایا کے حقوق کی نگہداشت اور حفاظت کرے۔ جب امریکہ کی مغربی ساحلی ریاستوں میں ہندوستانیوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ آراضی کی ملکیت حاصل کریں یا مدت معینہ کے لیے زمین خریدیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو "حقوق معاہدہ" سے محروم کیا جاتا ہے۔ جب ہندوستانیوں کو اس کی اجازت نہیں کہ اپنے بیوی بچوں کو امریکہ لائیں کیوں کہ وہ اجنبی ہیں اور ان کو حقوق شہرت حاصل نہیں ہو سکتے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کے حق سے محروم کیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ ہم کو حقیقتاً ہر قسم کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ لیکن ہم اس ظلم کے خلاف لڑنے اور اپنے حقوق منوانے کے لیے تیار ہیں کیا نیشنل کانگریس کا یہ فرض نہیں کہ وہ اس جدوجہد میں ہمارے ساتھ اشتراک عمل کرے۔

مجھے ذاتی طور پر اس کا یقین ہے کہ جس لڑائی کو میں نے شروع کیا ہے وہ ضرور کامیاب ہوگی بشرطے کہ ہندوستان سے ہماری کافی امداد کی جائے۔ اس کے لیے آیندہ دسمبر تک مجھے ۳ لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ یہ روپیہ امریکہ والوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اگر ہندوستان کے لیڈر اس طرف متوجہ ہوں تو اس سے بھی زیادہ وصول ہو سکتا ہے مگر میں خود اس قابل ہوتا کہ اپنے برادران وطن کی خدمت میں حاضر ہو کر خود ان سے اپیل کرتا تو یقیناً وہ نہایت کشادہ دلی سے میری امداد پر آمادہ ہو جاتے لیکن افسوس میں جلا وطن ہوں۔ میں اس نعمت سے محروم کر دیا گیا ہوں۔"

۲ تا ۵ر دسمبر ۱۹۲۷ء: جمعیت علماے ہند کا آٹھواں سالانہ عام اجلاس ۲ تا ۵ر دسمبر ۱۹۲۷ء،

کو پشاور میں مولانا انور شاہ کشمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنا خطبہ فارسی زبان میں پیش کیا۔ جو اہم ترین علمی مسائل خصوصاً ہندوستان کی شرعی حیثیت کی علمی بحث پر مشتمل تھا حضرت مولانا نے الحرب اور دارالاسلام پر نہایت عالمانہ و محققانہ بحث فرمائی اس میں من جملہ بہت سی اہم تجویزوں کے ایک قرارداد میں بااختیار مسلمان شرعی قاضی مقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ چوں کہ قرارداد میں قاضیوں کے تقرر کی ضرورت اور استدلال موجود ہے۔ اس لیے یہ قرارداد نقل کی جاتی ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے:

''چوں کہ مسلمانوں کے بہت سے مذہبی معاملات ایسے ہیں جن میں حاکم مسلم کا فیصلہ ضروری ہے اور غیر مسلم حاکم کا فیصلہ شرعی طور پر نافذ نہیں ہوتا۔ اور حکومت موجودہ نے مسلمانوں کی اس ضرورت کو اب تک پورا نہیں کیا۔ اس بناء پر مسلمان سخت مذہبی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ مثلاً ظالم اور جاہل شوہروں سے ان کی مظلوم اور زندہ درگور عورتوں کی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔ مرتدہ کے نکاح فسخ ہونے میں اس کے شوہر کے حقوق زائل ہو جاتے ہیں۔ خیار بلوغ میں شرعی طور پر حکم فسخ حاصل نہیں ہو سکتا۔ طلاق کے بہت سے مسائل الجھے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ جلسہ گورنمنٹ سے مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی ان مذہبی مشکلات کے حل کے لیے بااختیار شرعی قاضی مقرر کرے۔ جن کے انتخاب کا حق مسلمانوں کو ہو تا کہ ان قضاۃ کی عدالتوں میں اپنے معاملات کا شرعی فیصلہ ہو سکے''۔

جمعیت علماء نے اس قسم کے تمام مسائل کو اور ان کی حد عمل معین کرنے اور گورنمنٹ سے اختیارات کے مطالبے کے لیے دس اکابر علمائے وقت کی جو کمیٹی بنائی تھی ان میں سرفہرست اسم سامی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا تھا۔ کمیٹی کے دیگر ارکان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) مولانا ثناء اللہ امرتسری، (۲) مولانا محمد سجاد، (۳) مولانا انور شاہ کشمیری، (۴) مولانا محمد نعیم (لدھیانوی)، (۵) مولانا قطب الدین (فرنگی محلی لکھنوی)، (۶) مولانا عبدالماجد بدایونی، (۷) مولانا شبیر احمد عثمانی دیو بندی، (۸) مولانا سید سلیمان ندوی اور (۹) مولانا عبدالحکیم پشاوری۔

چند دیگر قراردادیں یہ ہیں:

تجویز نمبر ۷: جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عربی مدارس کے بااختیار کارکنوں سے درخواست کرتا

ہے کہ طلباء کی جسمانی صحت کے قیام وترقی کے لیے جسمانی ورزش لینے کا طریقہ جاری کریں اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ورزش بھی لازم کردی جائے تا کہ طلباء کا بڑھتا ہوا شوق اساتذہ کی نگرانی میں شرعی حدود سے بھی متجاوز نہ ہو اور ان کی صحت وقوت کی بقا وترقی کا بھی کفیل ہو۔

تجویز نمبر ۸: جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ مسلمانان صوبہ سرحدی سے عموماً اور علمائے کرام صوبہ سرحد سے خصوصاً پرزور استدعا کرتا ہے کہ مذہبی احکام کی تعمیل اور اطاعت کو اپنی مذہبی اور قومی نجات کا واحد ذریعہ سمجھیں۔ اور تمام ان مہلک اور تباہ کن رسوم کی اصلاح کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی اور مالی حالت کو تباہ کر رکھا ہے اور مسلمانوں کو تباہی اور بربادی اور افلاس وفلاکت کے گڑھے میں دھکیل رہی ہیں۔

شادیوں میں دعوتوں اور جہیزوں کی حدود معین کردی جائیں اور ان حدود سے کوئی تجاوز نہ کر سکے۔

اسی طرح غمی کی رسوم میں قوم کی مالی حالت اور احکام مذہبی کے موافق اصلاح کی جائے۔

ان رسوم کی ادائیگی کے لیے سودی اور غیر سودی قرضے کا طریقہ قطعاً بند کردیا جائے۔

یہ تمام فضول اور لایعنی امور جو محض عار وننگ کے خیال یا محض نام ونمود کے لیے لازم کردیے گئے ہیں ترک کردیے جائیں۔ غیر مشروع تماشوں اور تھیٹروں اور ہر قسم کی بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کے خلاف منظم طور پر جدوجہد کی جائے۔

ان تمام امور کی انجام دہی اور نگرانی اور ضبط قائم رکھنے کے لیے قومی کمیٹیاں مقرر کی جائیں۔ اور مشروعہ اور غیر مشروعہ کے امتیاز کے لیے علماء کرام ان کمیٹیوں میں داخل ہوں اور ان کی رہنمائی کریں۔ کمیٹی کے فیصلے قوم کی متفقہ طاقت سے نافذ کیے جائیں۔ اور اس فیصلے کے خلاف کرنے والے قومی مجرم قرار دیے جائیں۔

تجویز نمبر ۹: جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ اس آسمانی فیصلہ اور احکام الٰہی کا اعلان کرتا ہے کہ خدائے برتر نے میت کے ترکہ میں مردوں اور عورتوں کے جو حقوق معین فرمادیے ہیں ان کی تسلیم اور ادائیگی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ہندوستان کے جن صوبوں میں شرعی قانون میراث کے خلاف اس رواج پر عمل کیا جارہا ہے کہ عورتوں کو میراث نہ دی جائے وہاں کے علمائے کرام سے جمعیت کا یہ اجلاس پرزور طریقے سے استدعا کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس قانون الٰہی کی خلاف ورزی کے تحت عذاب اور قہر خداوندی سے آگاہ کریں۔

اور تمام مسلمانوں سے درخواست کرتا ہے کہ اس رواج کو مٹانے اور اس کی جگہ شرعی قانون

میراث کو جاری کرنے کے لیے متفقہ کوشش شروع کردیں۔

اور جس قدر جلد ممکن ہو اس ہندوانہ رواج اور دور جاہلیت کے سیاہ داغ کو مسلمانوں کے چہروں سے مٹادیں۔

(حاشیہ: یہ وہی تجویز ہے جو شریعت بل کی محرک تھی اور دفعہ ۲ جب یہ تجویز ساحل مراد پر پہنچنے والی تھی تو مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح نے ترمیم پیش کر کے جمعیۃ علماء کی چند سالہ کوششوں پر پانی پھیر دیا، شریعت غراء کے حکم سے غداری کی اور انسانوں کے بنائے ہوئے ظالمانہ رواج کو کامیاب کرایا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو"جمعیت العلماء کیا ہے؟ حصہ اول) ("رسالہ شریعت بل" اور بد قسمتی یہ ہے کہ مسلمان انھیں مسٹر جناح کو محافظ ملت اور قائد اعظم کہہ رہے ہیں)۔

تجویز نمبر ۱۰: جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مسلمانوں سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ لڑکیوں کی شادی پر روپیہ لینے کی رسم کو بہت جلد مٹادیں۔ اور متفقہ طور پر فیصلہ کردیں کہ لڑکی کے معاوضہ میں شوہر سے کوئی رقم وصول نہ کی جائے اور شادیوں میں اسلامی سادگی اور شریعت مقدسہ کی پابندی کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

ہاں اگر نکاح کے وقت شوہر سے مہر معجل کے طور پر کوئی رقم لی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر اس کا لحاظ رکھا جائے کہ مہر کی رقم لڑکی کا حق اور خالص اس کی ملک ہے لڑکی کے اولیاء کو ہرگز یہ حق نہیں کہ وہ مہر معجل وصول کر کے برادری کو کھلائیں یا لڑکی کی رضامندی کے بغیر کسی دوسرے کام میں لائیں۔ اگر ایسا کریں گے تو یہ صریح ظلم ہوگا۔ (جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۳۷۔۱۳۶)

جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کے موقعے پر مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ، اور شیخ الاسلام مولانا مدنی وغیرہ شاہی مہمان خانے میں قیام پذیر تھے۔ ایک روز چاء پینے کی رائے ہوئی۔ آپ نے چولھا جلایا۔ مولانا محمد عرفان پانی لائے۔ مولانا مدنی پیالیاں اٹھا کر لائے۔ جائے کا پانی رکھ دیا گیا۔ اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ مولانا محمد عرفان صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں بہت نمایاں اور غیر معمولی فرق ہے۔ یعنی دایاں ہاتھ بہت بھاری اور طاقتور معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر ایسا نہیں دیکھا گیا۔ یہ کیا بات ہے؟ آپ نے مولانا مدنی کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان سے پوچھیے۔ اس نمایاں فرق کے ذمہ دار یہ ہیں۔ مولانا مدنی خاموش بیٹھے تبسم فرما رہے تھے۔ آپ نے ان کے گدگدی کرنی شروع کی اور فرمایا کہ بولتے کیوں نہیں۔ دیوبند میں پنجہ لڑاتے تھے یا نہیں؟ (مفتی اعظم کی یاد میں، ص ۱۰۰)

اشفاق اللہ خاں کو پھانسی کی سزا:

۱۲؍دسمبر ۱۹۲۷ء: سشن جج لکھنو نے کاکوری سازش کیس میں اشفاق اللہ خاں کے خلاف فیصلہ سنا دیا کہ ملزم اشفاق اللہ خاں کو قتل و ڈکیتی کے الزام میں سزائے موت دی جاتی ہے۔ ان کی وکیل شری چندر بھائی گپتا نے فیصلہ سن کر ان سے کہا مجھے اس فیصلے کا دلی صدمہ ہے۔ اشفاق اللہ خان نے ان سے کہا:

''میں تو یہ توقع کر رہا تھا کہ آپ مجھے مبارک باد دیں گے لیکن آپ صدمہ کا اظہار کر رہے جو میرے لیے باعث تعجب ہے۔ میں کل کی طرح آج بھی مطمئن ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھانسی کے پھندے پر بھی آپ مجھے خوش دیکھیں گے، جس طرح کہ آپ آج مجھے دیکھ رہے ہیں۔''

آئینی کمیشن اور علماء امت:

۱۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء: (مسلمانوں کے اکثر مشہور سیاسی رہنماؤں نے آئینی کمیشن کے مقاطعہ سے متعلق جو پرزور خیالات ظاہر کیے ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ذیل میں صرف ان مذہبی پیشواؤں کے بیانات درج کیے جاتے ہیں، جنھیں آج بہترین علماء امت قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان حضرات ثلثہ کے متفقہ فیصلہ سے امید ہے، کہ مذہبی گروہ کو بھی مقاطعہ کے باب میں پورا اطمینان حاصل ہو جائے گا)

(۱) حضرت مولانا انور شاہ صاحب شیخ الحدیث، دیوبند:

''میں ابھی کوئی قطعی رائے اس لیے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اس اجلاس جمعیۃ میں زعماء مسلمین کو خاص اس مسئلہ میں غور بحث کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اور بہت بہتر ہوگا کہ پورے غور وفکر اور بحث و مباحثہ کے بعد کوئی متفقہ فیصلہ کیا جائے، مگر ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر ہندوستان اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ سے کرانا چاہتا ہے، اور اجنبیوں کے اس نظریہ کی تصدیق پر آمادہ ہے کہ ہندوستانیوں کی حیات و موت کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے، تو ابھی اس نے آزادی اور غلامی کے مفہوم ہی کو نہیں سمجھا ہے۔''

(۲) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند:

''آخر کار کمیشن اصلاحات کی ترتیب اور اراکین کے ناموں کا وائسرائے ہند نے اعلان کر دیا، اور جو خطرہ تھا وہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ اور ہندوستان کی عزت اور خودداری کی یہ ایسی کھلی ہوئی توہین ہے جس کا احساس ہر طبقے کے ہندوستانی عمائد نے کرلیا ہے۔ حامیان اقتدار کو بھی اپنی امیدوں میں مایوسی ہوگئی۔ تاہم ملک کے اہل الرائے اور عمائد کا فرض ہے کہ وہ کمیشن کے معاملے میں پوری طرح بحث تمحیص کر کے متحدہ طور پر فیصلہ کریں کہ کمیشن کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ کیوں کہ متحدہ آواز ہی موثر ہوسکتی ہے۔ ہندوستان کی م ملتوں کے لیے یہ ایک قدرتی تازیانہ ہے، جس کا لازمی نتیجہ باہمی اتحاد و اتفاق ہونا چاہیے۔ ورنہ وطن کی بدنصیبی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

(سچ لکھنو۔ ۱۶/دسمبر ۱۹۲۷ء)

صدر جمعیۃ العلماء کا خطبہ:

۱۶/دسمبر ۱۹۲۷ء: جمعیۃ العلماء کے اجلاس پشاور کی مفصل کارروائی سطور ہذا کی تحریر کے وقت تک شایع نہیں ہوئی ہے، اس لیے اس کے متعلق ابھی کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا، لیکن جہاں تک خطبۂ صدارت کا تعلق ہے، بجز خالص داد اور مبارک باد کے اور کچھ کہنے کی گنجایش نہیں۔ حضرت مولانا انور شاہ مدظلہٗ کا مرتبہ، بحیثیت فن حدیث کے ایک فاضل متجر اور بحیثیت ایک متقی بزرگ کے مسلم تھا، لیکن یہ ہرگز توقع نہ تھی، کہ مسائل حاضرہ پر بھی ان کی نظر اس قدر وسیع، اور ان کے خیالات اس قدر صحیح و صائب ہوں گے اور وہ اس قدر بہتر اور جامع خطبہ ارشاد فرمائیں گے۔ خطبہ باوجود بہت طویل ہونے کے اول سے آخر تک لفظاً لفظاً پڑھنے کے قابل ہے۔ افسوس ہے کہ سچ کی مختصر گنجایش میں پورے ایڈریس کا درج کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ تاہم کوشش کی جائے گی، کہ انشاء اللہ چار پانچ نمبروں میں اس کے زیادہ اہم عنوانات نقل ہو جائیں۔ مولانا ممدوح کا وجود، دراصل اسلام کی صداقت کی ایک تازہ دلیل ہے، جو دوسری قوموں کو یہ بتاتا ہے، کہ مسلمان اگر صحیح معنی ہیں، اپنے مذہب کا عالم ہے، تو اس کی نظر سیاسی اور دنیوی مسائل میں کس قدر دقیقہ رس ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ مبارک باد کا مستحق دفتر جمعیۃ العلماء ہے، جس نے ایسے قابل صد عزت و احترام بزرگ کو گوشۂ عزلت سے نکال کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ حقیقۃً، اس دور خزاں میں بھی،

جس قوم کا طبقہ علماء ابھی تک حضرت شیخ الہند، مولانا شاہ بدر الدینؒ، (امیر شریعت بہار) اور مولانا محمد علی شاہؒ مونگیری کے نمونے رکھتا تھا، اور جس میں آج بھی اللہ کی فضل و کرم سے مولانا حسین احمد، مولانا انور شاہ، اور مولانا کفایت اللہ کے زندہ نمونے موجود ہیں، اس قوم کے موسم بہار کے لطف کا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں۔ (سچ لکھنو۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۷ء)

۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء: آج صبح سیتا پور جیل میں کاکوری کیس کے ملزم اشفاق اللہ خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ وہ آج صبح معمول کے مطابق اٹھے تھے غسل کیا، دھلے ہوئے کپڑے پہنے، نماز پڑھی، قرآن کی تلاوت کی، ملک کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ چھ بجے جیل کے آفیسر اور سپاہی انھیں لینے کے لیے آگئے۔ اور انھوں نے پھانسی کے تختے پر چڑھ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی جان ملک کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے جان آفریں کے سپرد کر دی۔

ان کے بھائی عزیز اور ہندو مسلمان بہت سے دوست موجود تھے۔ ان کی لاش کو شاہ جہان پور۔ لانے اور شاہ جہان پور ریلوے اسٹیشن کے قریب محلہ جلال نگر میں دفن کر دیے گئے۔

جیل میں موت کی سزا سننے سے پہلے اور بعد میں انھوں نے اپنا وقت بہت اطمینان سے گزارا تھا۔ وہ نہایت پر سکون تھے ان کے چہرے سے کوئی پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر نہیں ہوئی۔ موت کی سزا سننے کے بعد سزا پانے تک کے عرصے میں ان کا وزن کئی پونڈ بڑھ گیا تھا۔

۲۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء: نئی دہلی۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء۔ غیر سرکاری اطلاعات کے بموجب سر جان سائمن اور آئینی کمیشن کے ارکان کے ۳ر فروری ۱۹۲۸ء دہلی میں پہنچ جانے کی توقع ہے۔ (روزنامہ ہمدرد، دہلی۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۲۷ء)

علمائے امت کا فیصلہ کمیشن کا مکمل مقاطعہ

۲۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء: (ذیل کی تجویز جمعیۃ العلماء کے اجلاس پشاور میں، جس کے صدر حضرت مولانا انور شاہ شیخ الحدیث دیوبند تھے، اور جس کے شرکاء میں حضرت مولانا حسین احمد، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ تھے، مولانا محمد علی کی تحریک اور حسرت موہانی کی تائید سے بالاتفاق منظور ہوئی۔)

''جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اپنے اس اذعان و یقین کا اعلان کرتا ہے کہ آزادی عطا نہیں کی

جاتی بلکہ اپنی جدوجہد سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ کہ ہندوستان کی حکومت کا دستور اساسی وضع کرنے کا حق صرف ہندوستانیوں کو ہے اور کسی اجنبی قوم کو ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ ہندوستانی گول میز کے مطالبہ کے جواب میں برطانی پارلیمنٹ نے جس اساسی اصول پر رائل کمیشن مقرر کیا ہے اس سے ہندوستان کی عزت اور خودداری کی سخت توہین وتذلیل کی گئی ہے۔

برطانیہ کی طرف سے یہ کارروائی محل تعجب نہیں ہے۔ ہاں ہمارے لیے ایک قدرتی تازیانہ ہے۔ کیونکہ ہمارے باہمی کشت وخون اور بے اعتمادی کا یہی نتیجہ تھا جو اس وقت انتہائی ذلت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اب ہندوستانیوں کی طرف سے اس تذلیل کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندوستانی جلد از جلد باہمی سمجھوتا کر کے حکومت خوداختیاری کی ایسی اسکیم مرتب کرلیں، جس میں اقلیت کے حقوق کا تحفظ اس کے اطمینان کے موافق کردیا گیا ہو اور پھر اس صحیح اصول کے ماتحت کہ ہندوستان کی حکومت کا دستور اساسی بنانے کا حق صرف ہندوستانیوں کو ہے، ہندو مسلمان سب مل کر متحدہ قوت کے ساتھ آنے والے کمیشن کا مقاطعہ کریں۔

لیکن اگر بدقسمتی سے باہم سمجھوتہ نہ ہوسکے اور یہ صورت واقع ہوتی نظر آئے کہ اس خلاف اصول اور ناقص کمیشن کے سامنے مسلم مفاد کے خلاف مطالبات پیش ہونے کا خطرہ ہو تو یہ اجلاس معاملہ کی اہمیت کے لحاظ سے مسلم مفاد کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ جمعیۃ العلماء خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ اور دوسرے قومی کارکن جماعتوں کا مشترک جلسہ منعقد کیا جائے اور پورے غور وبحث کے بعد مسلم طرز عمل کے متعلق قطعی طور پر متفقہ فیصلہ صادر کیا جائے۔

(سچ۔لکھنو، ۲۳ردسمبر ۱۹۲۷ء)

۲۳ردسمبر ۱۹۲۷ء: آل انڈیا مسلم لیگ: آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا جلسہ حکیم اجمل خاں کی زیر صدارت دہلی میں منعقد ہوا۔ کثرت رائے سے یہ طے پایا کہ سالانہ اجلاس بجائے لاہور کے کلکتے میں ہو۔ ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر ضیاء الدین وغیرہ چند اراکین جلسہ سے ناراض ہوکر چلے گئے۔ یہ حضرات کوشاں ہیں کہ یہ فیصلہ مسترد کیا جائے۔ لیکن کلکتہ میں استقبالیہ کمیٹی بن چکی ہے اور دعوت نامے جاری کیے جاچکے ہیں۔ (سچ لکھنو۔ ۲۳ردسمبر ۱۹۲۷ء)

۲۳ردسمبر ۱۹۲۷ء: سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی جانشین حضرت شیخ الہندؒ نے ذیل کا بیان جاری فرمایا:

''شدھی اور سنگھٹن کی باد مخالف اور باہمی مناقشات کی وجہ سے ہمیں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے کہ ہم ملک کو مبتلائے آلام کر دیں، جس کا آخری نتیجہ خود ہماری ہی بربادی اور خرابی ہے۔ اب ایک نئی مصیبت رائل کمیشن کی آمد آمد ہے، جو ہماری دور بینی اور مال اندیشی ہی سے رحمت بن سکتا ہے ورنہ اس کے زحمت ہونے میں کلام ہی نہیں۔ یہ کمیشن ہمیں کچھ دینے کے لیے نہیں آ رہا ہے، بلکہ گمان غالب ہے کہ دی ہوئی چیز کو واپس لینے کی کوشش کرے گا۔ تم ملک کی آزادی کے خواہاں ہو جو بھیک مانگنے سے نہیں ملتی، لینے سے لی جاتی ہے آج گورنمنٹ خود ہندوستان کے ساتھ عدم تعاون کر رہی ہے اس نے ہمیں، ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے، تو کیا ہماری قومی غیرت اس بات کی مقتضی نہیں کہ ہم اس کی بے پروائی کا جواب تعاون سے نہ دیں۔ اگر حکومت ہم سے عدم تعاون کرتی ہے، تو ہمیں بھی شما بخیر ما بسلامت کہہ کر علاحدہ رہنا چاہیے۔ گورنمنٹ کا یہ فیصلہ کہ کمیشن خالص پارلیمنٹری ہوگا، اس کا خود ساختہ فیصلہ ہے۔ ہم اس کے پابند نہیں ہو سکتے۔ اور سوائے گول میز کانفرنس کے اور کسی نہج کے کمیشن کو قبول اور منظور نہیں کر سکتے۔ ملک کی بھلائی اور اپنی بہتری کے لیے بحالت موجودہ مسلمانوں کا فرض کمیشن کا مقاطعہ ہی ہے۔ جتنا حق سرزمین ہند کی بہبود کا ایک ہندو کی گردن پر ہے اس سے زیادہ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس سرزمین کا جس میں مسلمانوں کے باپ آدم علیہ السلام کا نزول ہوا، اور جن کے ایک پیغمبر شیث علیہ السلام کا مدفن ہے، بہی خواہ و خیر طلب رہے۔'' (ہمدرد۔ دہلی، ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء)

۲۶ر دسمبر ۱۹۲۷ء: ۲۶ ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو مدراس میں آل انڈیا کانگریس کا بیالیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری جو گاندھی جی کے دست راست کہے جاتے تھے۔ صدر منتخب ہوئے۔ مولانا حسرت اور بیگم حسرت نے ڈاکٹر صاحب کو اس سرفرازی پر مبارک بادی کے تار روانہ کیے۔ یہی وہ اجلاس تھا جس میں آزادی کامل کی تجویز پاس ہوئی۔ مندوبین کی تعداد ۲۶۹۴ تھی۔ اسی سال جرمنی اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۳۴)

۱۹۲۷ء میں سائمن کو ہندوستان بھیجا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا کوئی متفقہ حل دریافت کرلے۔ لیکن بعد میں جو حالات سامنے آئے، ان سے معلوم ہوا کہ مسئلے کا کوئی متفقہ حل

دریافت کرنے نہیں، مسئلے کو مزید الجھا کر پیچیدہ بنانے اور ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو مزید پھیلانے اور اختلافات کے شعلوں کو ہوا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ چناں چہ روزنامہ حریت، دہلی مورخہ ۱۷؍جنوری ...... کی اشاعت میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کا اس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ اِرون کے نام ایک خط شائع ہوا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے۔ اس میں وزیر ہند نے وائسرائے کو لکھا تھا:

> ''میں سائمن کو صلاح دونگا کہ وہ ہر منزل پر ان تمام لوگوں سے ملاقات کرے جو اس کمیشن کا بائیکاٹ نہیں کرتے خصوصاً مسلمان اور پست اقوام۔ میں صلاح دوں گا کہ وہ نمائندہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی تمام ملاقاتوں کا وسیع پیمانے پر اشتہار دے (انگریزی حکومت کی) اب یہ تمام پالیسی ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ ہندوؤں کی بہت بڑی آبادی کو خوفزدہ کردیا جائے کہ کمیشن پر مسلمانوں کا قبضہ ہو رہا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ایسی رپورٹ پیش کرے جو ہندوؤں کی پوزیشن کو بالکل برباد کردے گویا اس طرح پر مسلمانوں کی ٹھوس مدد حاصل کی جائے۔ اور مسٹر جینا کو بڑھایا جائے اور پاک وصاف رکھا جائے۔''

۱۹۲۸ء

۹؍جنوری ۱۹۲۸ء:

محترم المقام زید عنایاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج شریف!

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ اس سے پہلے بھی والا نامے پہنچے۔ لیکن عدیم الفرصتی اس قدر رہتی ہے کہ جس کی حد ونہایت نہیں اور اس وجہ سے اکثر احباب اور بزرگوں کی خطوط پڑے رہتے ہیں، جواب کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس عدیم الفرصتی پر آپ کا ارشاد ہے کہ مولانا شیخ الہندؒ کے کچھ احوال آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

میرے محترم یہ مقصد تو بحر ناپیدا کنارے۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب نے مختصر طور پر حضرت شیخ الہندؒ کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اس سے کچھ احوال معلوم ہوجائیں گے۔ میں نے احمد آباد جیل میں ارادہ کیا تھا۔ کہ اپنی معلومات کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق قلم بند کردوں۔ کچھ مصالحہ

بھی جمع کیا گیا مگر حکام سے ایک جھگڑا پیش آ گیا۔ جس کی بناء پر کاغذ، قلم، دوات وغیرہ چھن گئے۔ پھر اس کے بعد کوئی فرصت ہی نہ ملی۔ حضرت شیخ الہند مرحوم ومغفور نے دس پارے ترجمہ کے ہندوستان میں لکھتے تھے۔ باقی دس پاروں کے تراجم حضرتؒ نے مالٹا میں تحریر فرمائے۔ اس وقت عبارت قرآن شریف کی میں لکھتا تھا۔ اور حضرتؒ اردو میں ترجمہ قلم بند کر دیا کرتے تھے۔ میرا کوئی علاقہ نفس ترجمہ میں نہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدینہ منورہ میں وفات کر گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ جن کی آج کوئی اولاد زندہ نہیں ہے، مع اپنے بھائی حاجی مقبول احمد صاحب مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ البتہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی بڑی صاحب زادی جو کہ پہلی اہلیہ سے ہے، سہارنپور میں موجود ہے۔ آپ اگر تعزیت کا خط تحریر فرمائیں تو مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے نام تحریر فرمائیں۔ موصوف مولانا مرحوم کے داماد ہیں مگر ان کی اہلیہ وفات کر چکی ہیں۔

(دارالعلوم کے) کچھ طلبہ خارج شدہ اور کچھ ملازمین، مدرسین واہل شہر موجودہ دائرۂ اہتمام کے (جو کہ کامیابی کے ساتھ تیس برس سے مدرسہ کی خدمتیں انجام دے رہا ہے) مخالف ہو گئے ہیں۔ اور انھوں نے ہر طرح شور وشغب، فساد وشرارت بپا کر رکھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یا تو موجودہ اسٹاف بالکل علیٰحدہ ہو کہ مدرسہ ہمارے قبضہ میں کلیتاً آ جاوے یا مدرسہ بالکل فنا ہو جائے۔ اور چوں کہ بیرونی ہاتھ اس میں خفیہ طور سے کام کر رہا ہے۔ اس لیے دشمنوں کی غرض یہ ہے کہ جس طرح ہو جائے دیوبند کی اجتماعی قوت زائل ہو جائے، یہ مدرسہ برباد ہو جائے علمائے دیوبند کا اثر عام مسلمانوں سے اٹھ جائے۔ اس لیے وہ بیرونی ہاتھ خفیہ کارروائیاں کر رہے ہیں اور یہاں کے عاقبت نااندیش لوگوں کے اشاروں پر کود رہے ہیں۔ خدا انجام بخیر کرے۔ لوگ ہر طرح کے فساد برپا کر رہے ہیں اور مدرسہ کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ انھوں نے باقی نہیں رکھا ہے۔ طلبہ کو ورغلاتے ہیں، ان سے اسٹرائک کراتے ہوئے مدرسہ کی بنیادیں کھودتے ہیں۔ اسلام کا ستارہ چوں کہ گہن میں آ رہا ہے اس لیے ہر طرف سے اسی قسم کی متوحشانہ خبریں آ رہی ہیں۔ امید ہے کہ دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے، فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

از دیوبند آستانہ حضرت شیخ الہند مرحوم ومغفور

۱۶/ رجب المرجب ۱۳۴۶ھ

سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ:

۳ رفروری ۱۹۲۸ء رائل کمیشن نے ساحل بمبئی پر قدم رکھا۔ اس روز ہندوستان بھر کے تمام قصبات اور شہروں میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ ہر جگہ ہڑتال نہایت پر امن تھی۔ لیکن مدراس میں اجتماع کا رویہ کچھ تہدید آمیز تھا۔ لیکن ہجوم میں سے کسی نے تشدد کا عملی طور پر قطعاً کوئی اظہار نہ کیا۔ باوجود اس حقیقت کے پولیس نے گولی چلادی۔ جس کے باعث ایک آدمی ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔

کلکتہ میں بھی پولیس اور طلباء میں تصادم ہو گیا۔ دہلی میں تو نہایت مخالفانہ مظاہرے ہوئے۔ ہزار ہا آدمیوں کا انبوہ کثیر "سائمن واپس جاؤ" کے نعرے لگا رہا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ سوائے چند ایک مسلمان انجمنوں اور جسٹس پارٹی کے، بائیکاٹ بالکل مکمل تھا۔

حکومت کو ایسے زبردست بائیکاٹ کی توقع نہ تھی۔ لوگوں کے مخالفانہ مظاہرے اور اس قدر کامیاب بائیکاٹ کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے ظلم و سختی کی پالیسی اختیار کر لی۔

لاہور میں لاکھوں آدمیوں کا بے پناہ ہجوم لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے کرنے کے لیے اکٹھا ہوا۔ پولیس نے بے تحاشا اس ہجوم پر لاٹھیاں برسانا شروع کیں۔ لالہ لاجپت رائے ایسے لیڈر بھی ان لاٹھیوں کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ لالہ جی کو لاٹھیوں کی ضربات پہنچیں۔ اور یقین کیا جاتا ہے کہ ان کی وفات بھی انھی ضربات اور بزدلانہ حملوں کے باعث ہوئی۔ لیکن باوجود کھلم کھلا یہ الزام لگانے کے، حکومت نے غیر جانبدارانہ تحقیقات سے قطعی انکار کر دیا۔"

لکھنو میں پولیس نے غیر مسلح اور پر امن ہجوم پر کئی بار حملہ کیا۔ اور جو کچھ لاہور میں پیش آیا تھا۔ وہی کچھ لکھنو میں بھی دیکھنے میں آیا پنڈت جواہر لال نہرو پر بھی پولیس نے اپنی نظر عنایت رکھی۔ سوار اور پیدل پولیس نے ڈنڈوں کی بارش سے اپنے ہنر کا خوب مظاہرہ کیا۔ پولیس کے ان بزدلانہ حملوں سے کئی آدمی زخمی ہوئے۔ لکھنو میں پولیس کی تیاریاں قابل دید تھیں۔ چاروں طرف پولیس کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ برابر چار روز تک پولیس کی غیر معمولی سختی جاری رہی۔ پرائیویٹ گھروں پر چھاپے مار کر شریف آدمیوں کو گرفتار کیا جاتا۔ اور گلیوں ہی میں پیٹا جاتا۔ مگر باوجود اس قدر سختی کے سائمن کمیشن کی آمد پر شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ ہزار ہا آدمیوں کا ہجوم "سائمن واپس جاؤ" کے فلک شگاف نعرے بلند کر رہا تھا۔ لوگوں نے اس موقع پر ایک ایسا مخول کیا۔ جس سے

تمام حکام اور پولیس افسر بھی ہنسے بغیر نہ رُکے۔ جس روز قیصر باغ میں چند تعلقہ داروں کی طرف سے سائمن کمیشن کو پارٹی دی جارہی تھی۔ پولیس کے ہزار ہا سپاہیوں نے باغ کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ کسی شخص کو جس پر بائیکاٹ کرنے والے کا شبہ ہوتا باغ کی سڑکوں تک کے نزدیک نہ آنے دیا جاتا۔ باوجود اس قدر احتیاط کے باغ میں درجنوں بیسیوں غبارے اور پتنگ آ کر گرنے لگے۔ ان غباروں پر بھی جلی حروف میں "سائمن واپس جاؤ" "ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے" لکھا ہوا تھا۔ اس عجیب جدت سے کوئی شخص بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

پٹنہ میں بھی پچاس ہزار کے قریب آدمی سائمن کمیشن کی آمد پر مخالفانہ مظاہرے کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ جو لوگ سائمن کمیشن کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ ان میں اکثر سرکاری ملازم اور چپراسی تھے۔ کسان جن کو حکومت نواحی دیہات سے لائی تھی۔ حکومت کے کیمپوں کی طرف جانے کی بجائے بائیکاٹ کرنے والے کیمپوں میں آ داخل ہوئے۔ اسٹیشن پر جو ہجوم بائیکاٹ کے نعرے لگا رہا تھا۔ وہ حکومت کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ حکومت سمجھ سکتی تھی۔ کہ کتنے لوگ اس کے وفادار اور اس کے طرز عمل کو پسند کرنے والے ہیں۔

۳۱ر مارچ کو یہ کمیشن ہندوستان سے روانہ ہو گیا۔ اس کمیشن کی صدر سر جان سائمن نے جاتی دفعہ اپنے بیان میں کہا کہ "انھوں نے تمام اقوام اور جماعتوں کے خیالات کا اچھی طرح مطالعہ کیا۔" لیکن سرکاری رپورٹ ظاہر کرتی ہے۔ کہ "اسمبلی کے لیڈروں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا نہ صرف سرکاری طور پر بلکہ سوشل طور پر بھی بائیکاٹ کا حلف اٹھایا ہوا تھا۔ اس لیے سر جان سائمن اور ان کے رفقا کاران کے خیالات سے واقف نہ ہو سکے۔

ہندوستان میں اپنی آمد کے فوراً بعد سر جان سائمن نے وائسرائے کو ایک چھٹی لکھی۔ جس میں انھوں نے بیان کیا کہ کمیشن جائنٹ فری کانفرنس کی شکل اختیار کرے گا جس میں سات انگریز ہوں گے اور سات ہندوستانی جن کا انتخاب مرکزی لیجسلیچر کے ممبران کریں گے ہندوستانی اس کانفرنس میں مساوی حیثیت سے شامل ہوں گے صوبجاتی کونسلوں کو بھی اسی قسم کی ایک باڈی بنانے کے لیے کہا جائے گا۔ جب صوبجاتی مسائل پر غور کیا جائے گا تو صوبجاتی باڈی موجود ہوگی۔ اور جب مرکزی معاملات زیر بحث ہوں گے۔ اس وقت مرکزی مجلس آئین ساز کے سات نمائندے اس کانفرنس میں شامل ہوں گے برطانوی کمشنر اپنی رپورٹ علیحدہ حکومت برطانیہ کو بھیجیں گے۔ اور جائنٹ کانفرنس کے ممبر ہندوستان کی مرکزی لیجسلیچر کو اس اعلان کے دو

تین گھنٹے بعد ہی مختلف جماعتوں کے لیڈروں کی دہلی میں میٹنگ ہوئی۔ جس میں ظاہر کیا گیا کہ ان کے اعتراضات بدستور قائم ہیں۔ اور وہ کسی شکل میں اور کسی مرحلے پر بھی کمیشن کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسمبلی سینٹرل کمیٹی میں اپنے نمائندے بھیجنے کی مطلقا کوئی پروانہیں کرتی۔

۱۶ر فروری کو اسمبلی میں لالہ لاجپت رائے نے ذیل کا ریزولیشن پیش کیا ''کہ کمیشن کی اسکیم، کانسٹی ٹیوشن اسمبلی کے لیے قطعی ناقابل قبول اور غیر تسلی بخش ہے۔ اور اسے کسی شکل اور کسی مرحلے پر بھی اس کمیشن سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے'' پنڈت موتی لال نہرو نے اس ریزولیشن کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ کہ اگر حکومت ہندوستانیوں کا تعاون حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تو اس کمیشن میں اسی تعداد سے ہندوستانی ممبروں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ بہت بحث مباحثہ او ہنگامہ خیز تقاریر کے بعد یہ ریزولیشن چھ ووٹوں کی اکثریت سے پاس ہوگیا۔ چناں چہ اب حکومت کے لیے سوائے ممبر نامزد کرنے کے اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ یہاں یہ ذکر کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ بمبئی میں سائمن کمیشن کے آنے پر بائیس ناٹوں میں سے کسی نے بھی اس سے ملاقات کرنے کی پروا نہ کی۔ بائیکاٹ کی تکمیل اور کامیابی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔ (تواریخ کانگریس ڈاکٹر بی پٹا بھائی سیتارامیہ، لاہور نیشنل انڈسٹری بک ڈپو، ۱۹۳۵ء، ص ۳۱-۵۲۷)

حضرت شیخ الاسلام کا قیام دیوبند:

۱۱ر مئی ۱۹۲۸ء: حضرت شیخ الاسلام کا یہ مکتوب گرامی آستانۂ عالیہ حضرت شیخ الہند دیوبند سے مکتوب الیہ نامعلوم الاسم کو ۲۱ر ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ کو لکھا گیا تھا۔ اس سے حضرت کے قیام دیوبند کے زمانے کا پتا چلتا ہے۔

محترالمقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج مبارک؟

مدتوں کے بعد والا نامہ آیا۔ احوال معلوم ہوئے۔ میں نے دیوبند کا تعلق ملازمت وتدریس نہیں چھوڑا اور جب تک کوئی شخص صدر مدرسی کی خدمت انجام دینے والا نہیں آئے گا بظاہر میرا یہاں سے جدا ہونا غیر ممکن ہے۔ والعلم عنداللہ۔

میں سلہٹ میں محض تعطیل کے ایام میں وہاں کے لوگوں کے سخت تقاضوں پر چلا گیا تھا۔ پھر

تعلیمی اوقات پر یہاں پہنچ گیا۔ جناب حضرت شاہ صاحب ان دنوں دیو بند ہی میں ہیں۔ مگر خبر ہے کہ عنقریب بہ صیغۂ صدر مدرس ڈابھیل ضلع سورت میں چلے جائیں گے......

نہرو رپورٹ:

۱۹/مئی ۱۹۲۸ء:۱۹۔ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں آل پارٹیز کا ایک اجلاس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی مرتب کی گئی اور جس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو کے سپرد ہوئی:

۱۔ سرتیج بہادر سپرو　　　۲۔ سرعلی امام
۳۔ مسٹر شعیب قریشی　　　۴۔ سبھاش چندر بوس
۵۔ مسٹر جے کار　　　۶۔ سردار مینگل سنگھ
۷۔ مسٹر پردھان　　　۸۔ مسٹر اینے
۹۔ مسٹر جوشی

اس کمیٹی کے ذمہ لگایا گیا کہ وہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی درمیان مختلف سیاسی حقوق کے بٹوارے کا فیصلہ کر کے یکم جولائی ۱۹۲۸ء کو کانگریس کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے (اس رپورٹ کو آگے چل کر نہرو رپورٹ کا نام دیا گیا۔

ڈیڑھ ماہ کی مسلسل بیٹھکوں کے بعد آخر کمیٹی نے حسب ذیل رپورٹ مرتب کی۔

۱۔ ہندوستان سے جداگانہ انتخاب کو ختم کر کے اس کی جگہ مخلوط انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے۔

۲۔ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین بھی غیر مفید قرار دیا گیا۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں انتخاب کو کھلا رکھا گیا اور کسی کے لیے کوئی نشست مخصوص نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۴۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اور ان کو اسی تناسب سے نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا جو صوبہ جاتی نشستوں کے فیصلے کی رو سے انھیں مرکز میں حاصل ہو سکیں گی۔

نہرو رپورٹ کے اس فیصلے میں مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں ان کے موجودہ حق سے کم

نشستیں دنیا منظور کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیا گیا۔ مرکز میں انھیں ایک تہائی کا یقین دلانے سے بھی انکار کیا گیا۔ حالانکہ یہ ان کا آئینی حق تھا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا۔

۲۸/اگست ۱۹۲۸ء: ۲۸/اگست (۱۹۲۸ء) کو لکھنو میں رہنمایان ملک کا ایک عام اجتماع آخری فیصلے کے لیے منعقد ہوا۔ ممکن تھا کہ دوسرے صوبوں کا فیصلہ ہو جاتا لیکن پنجاب کے جھگڑے نے الجھن پیدا کر دی۔ سکھ رہنماؤں نے حسب عادت چلتی گاڑی میں بریک لگا دی۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ پنجاب کے مسلمان نہرو رپورٹ کے فارمولے پر دستخط نہیں کریں گے اور ہمارا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے مبرا رہے گا۔ آخر بحث اس بات پر ختم ہوئی۔

۱۔ ہر بالغ کو حق رائے دہندگی دی جائے۔

۲۔ حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہو۔

۳۔ کسی اقلیت یا اکثریت کے لیے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

۴۔ درجہ نو آبادیات کی حکومت قائم ہو۔

۵۔ دس سال تک مذکورہ بالا شرائط پر عامل رہنے کے بعد اگر کوئی قوم ضروری سمجھے تو فرقہ وارانہ نیابت کا سوال از سر نو بحث کے لیے اٹھایا جا سکتا ہے۔"

جب تک پنجاب کے مسلمان رہنماؤں نے اس فارمولے کو منظور نہیں کیا تھا۔ ہندو اور سکھ اس سمجھوتے کے حق میں رہے۔

پنجاب کے مسلم اکابرین کے دستخط ہوتے ہی ہندو اور سکھ رہنماؤں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اگرچہ سکھ رہنما بھی بادل نخواستہ اس فارمولے کو بغیر نشستوں کا تعین کیے مخلوط انتخاب کی ساتھ مان گئے۔ لیکن لکھنو سے واپسی پر اس فیصلے سے منحرف ہو گئے۔ حزب مخالف میں مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح تھے اور یہیں سے مسلم لیگ اور کانگریس کی درمیان اختلاف کی ابتدا ہوئی۔ (کاروان احرار، جلد ۱، ص ۷۷۔۴۷)

۱۲/جون ۱۹۲۸ء: لندن کے صرف ایک باغ ہائیڈ پارک میں ایک سال کے اندر یعنی یکم اپریل ۱۹۲۷ء سے ۲۱/مارچ ۱۹۲۸ء تک حسب ذیل ایسے فحش اور بے حیائی کے ظاہری جرائم پولیس کے ہاتھ لگے جن پر حسب قانون پولیس گرفتاری کا معاملہ کرنے پر مجبور ہوئی،

بے حیائی ۳۲۵

حرام کاری	۳۶۹
اعانت جرم بالا	۳۶
دلالی	۲
برہنگی	۱
زنا بالجبر	۱
توہین	۵۲
حملہ مجرمانہ	۸۱۶=/۲۶

یہ واقعات صرف ایک اس باغ کے ہیں جو کہ آبادی میں واقع ہے اور جس میں ہر وقت چہل پہل رہتی ہے۔ پولیس کا پہرہ ہر وقت موجود رہتا ہے اور جو کہ عام پبلک کے لیے تفریح گاہ بنی ہوئی ہے۔ یہ بدمعاشوں کا اڈا نہیں ہے کوئی غار اور تہہ خانہ اور خفیہ مکان نہیں ہے۔ اس سے پتا چل سکتا ہے کہ مخفی اور پوشیدہ طریقے پر کیا کیا نہیں ہوتا ہوگا۔

قیاس کن زگلستان اور بہارش را

(سچ لکھنو، ۱۲؍ جون ۱۹۲۸ء)

۲۷؍ اگست ۱۹۲۸ء: مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیت علمائے ہند کی صدارت میں بہ مقام لکھنو مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ اس میں مندرجۂ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی:

(۱) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند۔

(۲) مولانا حافظ احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند۔

(۳) مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ثم المدنی۔

(۴) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر الشریعۃ بہار۔

(۵) مولانا ظفر علی خان صاحب مالک اخبار زمیندار۔ لاہور۔

(۶) مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی۔

(۷) مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب ناظم مالیات جمعیۃ علماء ہند۔

(۸) مولانا محمد عبدالحلیم صاحب صدیقی ادیب دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

(۹) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔

سب سے اہم نہرو رپورٹ کے بارے میں غور کر کے فیصلہ کرنا تھا کہ ۲۱؍ اگست کو ہونے والی

آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا جائے۔ نہرو رپورٹ ۱۶راگست کو شائع ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں بحث کے بعد یہ تجویز پاس کی گئی۔

''جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس اس امر پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ آل پارٹیز کمیٹی نے نہرو رپورٹ کا کوئی نسخہ دفتر جمعیۃ کو نہیں بھیجا اور نہ جمعیۃ علماء کو آل پارٹیز کمیٹی نے ہندوستانی زبان میں اس کا ترجمہ مہیا کیا۔

تاہم باب سفارشات میں جو چیزیں مذکور ہیں ان میں چند اہم بنیادی امور پر یہ جلسہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور حسب ذیل ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کرتا ہے کہ وہ رپورٹ پر کامل طور پر غور کر کے مکمل تبصرہ کرے اور وہ تبصرہ جمعیۃ مرکزیہ کے ارکان کی خدمت میں بھیج کر ان کی قطعی رائے حاصل کرے۔

اس کے بعد مندرجۂ ذیل اہم نکات مرتب کیے گئے!

(الف) نہرو رپورٹ میں ہندوستان کے لیے حکومت بطرز نو آبادیات کے مطالبے پر قناعت کی گئی ہے اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اس میں کسی جماعت کے لیے آزادی کامل کی جدوجہد کرنے کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ تاہم مجلس عاملہ کے لیے اس کی تصدیق مشکل ہے کیوں کہ جمعیۃ علماء اپنے اجلاسوں میں ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے چکی ہے اور جمعیۃ عاملہ کے اختیار سے یہ باہر ہے کہ وہ اس نصب العین کے خلاف کسی تجویز کی تصدیق کرے۔

(ب) نہرو رپورٹ میں صوبوں کے گورنروں اور گورنر جنرل کونسلوں اور ایوانوں کے منظور شدہ قوانین کو مسترد کر دینے کا اختیار دے دیا گیا ہے اور بادشاہ کی منظوری کی شرط اس پر مستزاد کی گئی ہے جو شخصی استبداد کی قبیح صورت ہے۔

(ج) رپورٹ میں صوبوں کے اختیارات بہت محدود رکھے گئے ہیں اور جو اختیارات ان کو تفویض بھی کیے ہیں ان میں بھی صوبوں کی آزادی تسلیم نہیں کی گئی بلکہ گورنر جنرل کے اختیارات میں اس قدر توسیع کر دی گئی ہے کہ صوبوں کی برائے نام خود مختاری محض ایک کھلونا بن گئی ہے۔ حال آں کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود اور قیام توازن کے لیے صوبوں کی آزادی نہایت ضروری ہے۔

(د) رپورٹ میں مختلف اقوام بالخصوص ہندو مسلم تنازعات کے مسئلے کا کوئی صاف اور مکمل

حل نہیں پیش کیا گیا۔ بلکہ اس مسئلے کے حل کے لیے ملک کی مشترکہ ذمہ دار جماعت انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ مدراس میں جو صورتیں پیش کی تھیں ان کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(ہ) پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں غیر محفوظ رکھ کر ان کی تھوڑی سی اکثریت کو خطرہ میں ڈال دیا گیا ہے۔

(و) صوبۂ سندھ کی علیٰحدگی کو مشروط کر دیا ہے حال آں کہ وہ کانگریس کی منظور کردہ اور دلائل و براہین سے ثابت شدہ اور سندھ کے باشندوں کی اکثریت کا حتمی مطالبہ تھا۔ اور تعجب ہے کہ اندھرا، کرناٹک، اتکل وغیرہ کی علیٰحدگی کی بغیر کسی شرط کے سفارش کی گئی ہے۔

(ز) اقلیتوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے خلاف کمیٹی، جمعیۃ علماء کانگریس سب نے اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا کہ قانون ساز جماعتوں میں کوئی ایسا بل، ریزولیوشن ترمیم زیر بحث نہ آسکے جس کو کسی فرقہ کے نمائندوں کی ۳/۴ اکثریت اپنے مذہبی مفاد کے خلاف قرار دے۔ رپورٹ میں اس اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کے قائم مقام کوئی دوسرا قاعدہ بھی حفاظت کا نہیں بتایا۔ حال آں کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ اور اس کا اطمینان دلانے پر موقوف ہے۔

(ح) مرکزی مجالس میں مسلمانوں کی نمائندگی ۱/۴ کر دی گئی ہے حال آں کہ اس وقت ان کو ۱/۳ کی نمائندگی حاصل ہے جس کا قائم رکھنا ضروری ہے۔

(ط) حق رائے دہندگی کو دفعۃً اس قدر وسعت دے دی گئی ہے جو ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔ ضرورت تھی کہ سردست حق رائے دہندگی کو بالغ مردوں تک محدود رکھا جاتا۔

(ی) مرکزی حکومت کی سرکاری زبان اور رسم الخط کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

(ای) صوبہ بلوچستان کی علیٰحدگی اور مساویانہ حق حکومت کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔

ان مجمل اشارات کے ساتھ اس جلسے کی قطعی رائے ہے کہ ان حالات میں کہ ۱۵ راگست ۱۹۲۸ء کو رپورٹ شائع ہوئی اور آج ۲۷ راگست تک بھی کسی ہندوستانی زبان میں اس کا مکمل ترجمہ شائع نہیں ہوا اور ملک کی غالب اکثریت اس کے مضامین سے قطعاً ناواقف ہے۔ آل پارٹیز

کانفرنس کی ۲۸، ۲۹ راگست کے اجلاس میں اس پر کافی غور نہ ہو سکے گا اور نہ اس کانفرنس کا کوئی فیصلہ ہندوستان کی اکثریت کا فیصلہ ہوگا۔

اس اجلاس میں ایک سب کمیٹی بھی مقرر کی گئی جو نہرو رپورٹ پر غور وخوض کے بعد مفصل تبصرے کرے گی اور آیندہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں پیش کرے گی۔ اس سب کمیٹی میں مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اور مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کے علاوہ مولانا سید حسین احمد مدنی بھی شامل تھے۔ سب کمیٹی کے ارکان نے بہت جانکاہی سے رپورٹ پر غور کیا۔ اور اپنا مفصل تبصرہ مرتب کر کے مجلس عاملہ میں پیش کر دیا۔ اس تبصرے کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے ''مقالات سیاسیہ'' (حصہ سوم) میں شامل کر لیا گیا ہے۔

۲۸ راگست ۱۹۲۸ء: ۲۸ راگست ۱۹۲۸ء کو لکھنو میں آل پارٹیز کا دوسرا اجلاس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں مقررہ سب کمیٹی نے اپنے وضع کیے ہوئے دستور ملکی کی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ میں تجاویز دہلی سے کچھ انحراف بھی کیا گیا تھا۔ مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے مخصوص کرنے کے بدلے بالغوں کو حق رائے دہندگی عطا کر کے بلا تخصیص مخلوط انتخاب کی سفارش تھی اس کے علاوہ مرکز میں بھی مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دینے سے انکار کر کے مخلوط انتخاب کی پرزور سفارش کی گئی تھی۔ مولانا محمد علی اور مسٹر جناح اپنے اپنے طور پر یورپ گئے ہوئے تھے۔ البتہ مولانا شوکت علی اجلاس میں شریک تھے۔ انھوں نے ان تجویزوں کی مخالفت کی لیکن کانفرنس نے اس شرط کے ساتھ اسے منظور کر لیا کہ دسمبر ۲۸ء میں جب آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوگا تو ایک کنونشن کر کے اس رپورٹ کو آخری شکل دے دی جائے گی۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

متحدہ قومیت کے جذبے کی تاثیر:

۲۸ راگست ۱۹۲۸ء: پروفیسر سیلے کا ایک مقالہ رسالہ تنظیم امرتسر نے اکسپنشن آف انگلینڈ سے نقل کیا ہے۔ اس کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ یہ اقتباس متحدہ قومیت کے مخالفین کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ کاش وہ غور کریں۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

''اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہوجائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح نہ بھی ہو، بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہوجائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہندوستانیوں کے لیے شرمناک ہے تو اس وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہوجائے گا کیوں کہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور اس پر فاتحانہ حکمرانی نہیں کرسکتے۔ اگر ہم اس طرح کی حکومت کرنا بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہوجائیں گے۔

(تنظیم جلد ۶ نمبر ۱۵، ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء) (نیز دیکھیے: حسرت موہانی ...... ایک سیاسی ڈائری)

بہ سلسلہ نہرو رپورٹ:

۲۸ تا ۳۱ر اگست ۱۹۲۸ء: آل پارٹیز کانفرنس کے چوتھے اجلاس لکھنو کی متعدد نشستیں ۲۸ر اگست تا ۳۱ر اگست قیصر باغ بارہ دری لکھنو میں ہوئیں۔ اس اجلاس میں ملک کی اٹھارہ سیاسی جماعتوں اور ملک کے مختلف صوبوں کی کانگریس کمیٹیوں کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ ان میں مسلم لیگ اور جمعیت علمائے ہند کے نمائندے بھی شامل تھے۔ جمعیت کا وفد اس کے صدر اور ناظم مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید پر مشتمل تھا۔

آل پارٹیز کانفرنس کا مقصد نہرو کمیٹی کے تیار کردہ دستور ہند پر غور کرنا اور اختلاف کو دور کر کے اسے متفق علیہ بنانا تھا۔ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔

کانفرنس کی مختلف نشستوں میں سولہ تجاویز پیش ہوکر متفقہ طور پر پاس ہوئیں۔ پہلی تجویز نہرو کمیٹی کے ارکان کی کوششوں کے اعتراف اور شکریے کی تھی۔ اسے لالہ لاجپت رائے نے پیش کیا تھا اور مولانا ابوالکلام نے اس کی تائید کی تھی۔ تائید مزید کرنے والوں میں چند نام یہ ہیں: پنڈت مدن موہن مالویہ، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر اینی بیسنٹ، مولوی محمد یعقوب، مولانا احمد سعید، مسٹر طفیل احمد نہرو کمیٹی کے ارکان یہ حضرات تھے:

۱۔ پنڈت موتی لال نہرو (سربراہ کمیٹی)۔

۲۔ سر علی امام۔ رفیق

۳۔ سر تیج بہادر سپرو۔ رفیق

۴۔ مسٹر اینی۔ رفیق

۵۔ سردار منگل سنگھ۔ رفیق

۶۔ مسٹر شعیب قریشی۔ رفیق

۷۔ مسٹر سبھاش چندر بوس۔ رفیق

۸۔ مسٹر جی پردھان۔ رفیق

کانفرنس کی سولھویں اور آخری قرارداد کانفرنس کے صدر ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری نے پیش کی۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

''یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ چوں کہ اس رپورٹ کی مختلف دفعات آپس میں ایک دوسرے پر مبنی ہیں اور تمام جماعتوں کے نمائندگان جو اس کانفرنس میں موجود ہیں، اقرار کرتے کہ وہ اس رپورٹ کو من حیث المجموع عمل میں لائیں گے نہ کہ صرف بعض حصوں کو۔ دیگر تمام حصوں کو پوری طرح عمل میں لانے کے بغیر۔ اس لیے وہ تمام تجاویز جو اس کانفرنس میں منظور کی گئی ہیں من حیث المجموع عمل میں لائی جائیں گی۔''

نہرو کمیٹی کی رپورٹ اور اس کے ساتھ آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز پنڈت ہردت شرما نے اردو میں مرتب کر کے اور امرت الیکٹرک پریس۔ لاہور میں چھپوا کر شائع کردی تھی۔

لاہور...... سائمن گو بیک:

۳۰ راکتوبر ۱۹۲۸ء: ۳۰ راکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب سائمن کمیشن لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو باقی شہروں کی طرح یہاں بھی ان کی آمد پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ایک عظیم ہجوم نے سائمن کمیشن GO BACK کے نعرے لگائے۔ اس ہجوم میں پنجاب کے بزرگ رہنما لالہ لاجپت رائے بھی تھے پولیس کے ایک انگریز افسر مسٹر اسکاٹ نے جلوس پر لاٹھی چارج کا حکم دیا اور خود بھی عوام پر ڈنڈے برسائے۔ دوسرے لوگ کے ساتھ لالہ لاجپت رائے بھی زخمی ہوئے اور قریباً ایک ماہ بعد وہ انھیں ضربات کے باعث انتقال کر گئے۔ پنجاب نوجوان بھارت سبھا نے متعلقہ پولیس آفیسر سے لاجپت رائے کی موت کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔

سانڈرس کا قتل:

چناں چہ ۱۶ ردسمبر ۱۹۲۸ء کو چار بجے شام ہندو سبھا کالج کے ہوسٹل اور سول پولیس دفتر کے درمیان چوک میں مسٹر اسکاٹ کی بجائے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سانڈرس اور اس کے اردلی

ارجن سنگھ کو گولی مار کر ہلاک دیا گیا۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد ۸/اپریل ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی کے اجلاس میں ایک بم پھینکا گیا۔ جب اس بم کا دھواں صاف ہوا تو سامنے گیلری پر دو نوجوان کھڑے تھے۔ پنجاب کے سردار بھگت سنگھ اور بنگال کے مسٹر بی۔ کے۔ دت جنھیں پولیس نے بغیر کسی مزاحمت کے اسی وقت گرفتار کر لیا۔ ۲۳/دسمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی کے ایک میل کے فاصلے پر وائسرائے ہند لارڈ اروِن کی گاڑی کے نیچے بم کا دھماکہ ہوا۔ گو وائسرائے اور اس کا باقی عملہ اس حادثے میں محفوظ رہا۔ لیکن ریل گاڑی کے چند ڈبے تباہ ہو گئے۔ (کاروان احرار، ج ا)

کانگریس اور نہرو رپورٹ:

۵/نومبر ۱۹۲۸ء: ۵/نومبر ۱۹۲۸ء کو آل انڈیا کانگریس نے اپنے کلکتہ کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کی تمام تجاویز منظور کرتے ہوئے کہا، کہ

"موجودہ سیاسی صورت حال کے پیش نظر کانگریس اس دستور اساسی کو قابل قبول سمجھتی ہے بشرطیکہ ۳۱/دسمبر ۱۹۲۹ء تک برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ اسے منظور کر لے اور اس کو منظور نہ کرنے کی صورت میں کانگریس پرامن عدم تعاون کی مہم شروع کر دے گی اور لوگوں کو مالیہ اور ٹیکس ادا نہ کرنے کا مشورہ دے گی۔"

۲۸/دسمبر ۱۹۲۸ء: اس قرارداد کی تصدیق کے بعد ۲۸۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ کنونشن میں نہرو رپورٹ کو اپنے ہاتھ میں لے کر گاندھی جی نے حکومت برطانیہ کو ایک چیلنج دیا کہ:

"آئندہ سال ۳۱/دسمبر تک حکومت برطانیہ اس تجویز کو بہر حال منظور کر لے۔" (کاروان احرار، ج ا)

کانگریس کا اجلاس کلکتہ:

۲۹/دسمبر ۱۹۲۸ء: ۲۹/دسمبر ۱۹۲۸ء کلکتہ میں ۵۲۲۱ مندوبین کی معیت میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس (ساتھ ہی آل پارٹیز اجلاس) موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کا متن پیش کیا گیا جس میں کونسل کی مسلم نمائندگی ۳۰ فیصد رکھی گئی تھی۔ مسٹر جناح نے اس تجویز میں چار ترمیم پیش کی جس میں ایک یہ تھی کہ ۳۰ کے بجائے ۳۳ فیصد کی جائے جو نامنظور ہو گئی۔ یہیں سے مسٹر جناح ناراض ہو کر دہلی چلے گئے دہلی پہنچ کر جناح کے چار نکات بڑھ کر چودہ ہو گئے۔

مذکورہ ہر دو اجلاس میں مولانا حسرت موہانی بھی شریک تھے اور کنونشن کے بعد رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ ادھر کئی سال سے مجلس خلافت صرف باہمی فتنہ و فساد کے سبب بن کے رہ گئی ہے اس لیے اسے توڑ دیا جائے چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ اور اب مجلس خلافت کی تختیاں پلٹ دی جانے لگیں۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بہت ناراض ہوئے اور کانگریس سے اپنی علیحدگی پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔

مسٹر جناح کے چودہ نکات جن کو وہ خود آخری اور قطعی نہیں سمجھتے تھے حسب ذیل ہیں:

(۱) وہ چند نکات جو مسلم لیگ نے دسمبر ۲۸ء کے اخیر میں مرتب کیے۔ (۲) کانگریس کمیونل ایوارڈ کی مخالفت ترک کردے اور اسے نیشنلزم کے منافی قرار دے۔ (۳) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا انتخاب آئینی طور پر معین کر دیا جائے۔ (۴) دستور اساسی میں مسلمانوں کے پرسنل لا اور کلچرل امور کی حفاظت کا یقین دلایا جائے۔ (۵) کانگریس مسئلہ مسجد شہید گنج اپنے ہاتھ میں لے (۶) اذان اور دیگر مذہبی رسوم کی مسلمانوں کو پوری آزادی ہو۔ (۷) مسلمانوں کو ذبیحۂ گاؤ کی کھلی اجازت ہو۔ (۸) ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایسی علاقائی بندیاں نہ کی جائیں جن سے ان کی اکثریت پر اثر پڑے۔ (۹) بندے ماترم ترک کر دیا جائے۔ (۱۰) اردو کو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کر لیا جائے اور اس کی ضمانت دی جائے کہ اردو کے استعمال میں مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ (۱۱) بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے اصول پر نمائندگی دی جائے یعنی جداگانہ انتخاب آبادی کے لحاظ سے ہو۔ (۱۲) کانگریس جھنڈا ترک کر دیا جائے۔ (۱۳) مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ (۱۴) اتحادی وزارتیں قائم کی جائیں۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۳۶-۱۳۵)

۱۹۲۸ء:

نہرو رپورٹ کے بارے میں اصحاب رائے کے تین گروہ بنے:

پہلے گروہ کا خیال تھا کہ یہ ایک معقول دستوری دستاویز ہے اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی صحیفہ آسمانی تو نہیں کہ اس میں کبھی کوئی ردوبدل نہ ہو سکے۔ برٹش گورنمنٹ کے چیلنج کا یہی جواب ہے۔

دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ رپورٹ بنیادی اصولوں کی جامع ہے لیکن نقائص سے بھی خالی نہیں اس لیے نقائص کو ابھی دور کردینا چاہیے۔ برٹش حکومت کے چیلنج کے ساتھ ملک کو ایک معقول دستور بھی مل جائے گا۔

تیسرے گروہ کا خیال تھا کہ اسے کلیتاً مسترد کردینا چاہیے اور دستور کا ایک نیا متوازن، منصفانہ اور حقیقت پسندانہ مسودہ تیار کرنا چاہیے جس میں ملک کے فرقہ وارانہ مسئلے کا اس سے بہتر حل موجود ہو۔

ان میں سے کسی کے دل اخلاص، وطن کی محبت اور آزادی کے جذبات صادقہ سے خالی نہ تھے۔ لیکن ایک اور گروہ ہندوؤں مسلمانوں کا ایسا بھی تھا جو کسی صورت نہ چاہتا تھا کہ کسی حل پر دونوں قومیں متفق ہوں۔ اس کا اختلاف کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے نہ تھا بلکہ اختلاف کی خلیج کو مزید وسیع کرنے کے لیے تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کا تعلق پہلے گروہ سے تھا۔ حضرت کا یہ خط محمد فاضل صدیقی ساکن محلہ بڑے بھائیاں، دیوبند کے نام سے خط کا متعلقہ مضمون یہ ہے:

''آپ نے تو مولانا ظفر علی خاں صاحب سے میرٹھ میں نہرو رپورٹ کے بارے میں لیکچر دلا کر رپورٹ کو پاس ہی کرالیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سب حضرات ان کے ہم نوا ہیں۔ مگر کیا کریں ہماری سمجھ تو اب تک قاصر ہے۔''

ان سطروں سے نہرو رپورٹ کے بارے میں حضرت کی رائے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ حضرت کی مفصل رائے کا اظہار جمعیت علماے ہند کی قرارداد اور اس رپورٹ میں ہوا ہے جو اس کی ایک سب کمیٹی نے مرتب کی تھی۔

۱۹۲۹ء

آل انڈیا مسلم کانفرنس کا انعقاد:

یکم جنوری ۱۹۲۹ء: دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد ہوئی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد کے بارے میں کہا گیا ہے:

(الف) ہندوستان میں ذمہ دار حکومت خود اختیاری قائم کرنے کے لیے جو دستوری اور

آئینی ترقیاں ہوں گی، ان میں ہمیشہ مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کرنا اور انہیں ترقی دینا۔

(ب) مسلمانان ہند کو منظم کرنا اور موجودہ اسلامی تنظیموں میں جو آل انڈیا حیثیت رکھتی ہیں اشتراک پیدا کرنا تاکہ وہ اپنی مخصوص حیثیت اور اغراض کو قائم رکھتے ہوئے، ان مسائل پر مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کرسکیں جن کا اثر عام مسلمانان ہند پر پڑنے والا ہے۔

ہندوستان کا طرز حکومت وفاقی ہو:

اس کے قومی مسلک کے بارے میں کہا گیا ہے:

نمبرا۔ ہندوستان کی وسعت اور اس کی نسلی، لسانی، انتظامی، جغرافی یا ملکی تقسیمات کو مدنظر رکھتے ہوئے حالات کے مطابق صرف وفاقی حکومت ہی مناسب ترین اور موزوں ترین طرز حکومت ہے جس میں ان ریاستوں کو جو اس وفاقی حکومت کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہوں، کامل خودمختارانہ اور فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور مرکزی حکومت کو صرف ان امور کے متعلق قطعی اختیارات حاصل ہوں جو مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں اور جو دستور اساسی کی رو سے خاص طور پر اسے تفویض کیے گئے ہوں۔

تین چوتھائی نمایندوں کی تائید ضروری ہے:

نمبر۲۔ یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا مسودۂ قانون، قرارداد، تحریک یا ترمیم جو بین الملی معاملات کے متعلق ہو، کسی مجلس مقننہ میں خواہ وہ صوبہ دار ہو، یا مرکزی پیش نہ کیا جائے یا زیر بحث نہ لایا جائے یا منظور نہ کیا جائے اگر اس ملت کے جس پر اس کا اثر پڑتا ہو، خواہ وہ ہندو ملت ہو یا مسلم ملت تین چوتھائی ارکان کی اکثریت مجلس مقننہ میں اُسے پیش کرنے، اس پر بحث مباحثہ کرنے یا اس کو منظور کرنے کی مخالفت کریں۔

جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب:

نمبر۳۔ مسلمانوں کا یہ حق کہ مختلف ہندوستانی مجالس مقننہ میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخابات کے ذریعے اپنے نمایندہ منتخب کریں، ملک کا مروجہ قانون ہے مسلمان اپنے اس حق سے بغیر اپنی رضامندی کے محروم نہیں کیے جاسکتے۔

مسلمانوں کا حق نیابت:

نمبر۴۔ ان حالات کے ماتحت جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں اور جب تک یہ حالات موجود رہیں گے مختلف مجالس مقننہ اور دیگر آئینی خود مختار مجلسوں میں مسلمانوں کی نیابت اپنے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے ضروری ہے تاکہ حقیقی نمائندہ جمہوری حکومت قائم کی جا سکے۔

مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے:

نمبر۵۔ اس وقت تک جب تک مسلمانوں کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ دستور اساسی میں ان کے حقوق اور مفاد کی مناسب حفاظت کی گئی ہے وہ کسی سورت میں بھی اس پر رضامند نہ ہوں گے کہ خواہ مشروط یا غیر مشروط طریقے پر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کیے جائیں۔

وزارتوں میں مسلمانوں کا حصہ:

نمبر۶۔ مذکورۃ الصدر مقاصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ مرکز اور صوبجاتی وزارتوں میں مسلمانوں کو ان کا واجبی حصہ حاصل ہو۔

میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کا حق:

نمبر۷۔ یہ ضروری ہے کہ مختلف مجالس مقننہ اور آئینی خود مختار مجالس میں مسلمانوں کی نیابت ایک ایسے طریقے پر مبنی ہو جس سے ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان کی اکثریت میں کسی صورت سے بھی فرق نہیں آئے گا اور ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے کسی حالت میں بھی ان کی نیابت اس سے کم نہ ہوگی جو ان کو موجودہ قانون کے ماتحت حاصل ہے۔

مرکزی مجالس میں ۳/۱ نشستیں:

نمبر۸۔ ہندوستان کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندہ جمعیتوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستان میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کی غرض سے مرکزی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت کا حق ملنا چاہیے، اور یہ کانفرنس مطالبے کی کامل تائید کرتی ہے۔

سندھ کی علیحدگی:

نمبر ۹۔ نسلی، لسانی، جغرافی اور انتظامی وجود کی بنا پر صوبہ سندھ بقیہ احاطہ بمبئی سے کوئی بھی مناسبت نہیں رکھتا اور اس کے باشندوں کے مفاد کے لحاظ سے اس کا غیر مشروط طور پر ایک ایسا علاحدہ صوبہ بنانا جس میں ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح اپنا علاحدہ نظام حکومت اور مجلس قانون ساز موجود ہو، ضروری ہے۔ ہندو اقلیت کو اس کے تناسب آبادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمایندگی دے دی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے، جہاں ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

صوبہ جات سرحد اور بلوچستان کے لیے اصلاحات:

نمبر ۱۰۔ آئینی اصلاحات کا نفاذ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اسی طریقے پر جو ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اختیار کیا جائے، ضروری ہے اور یہ نہ صرف ان اصولوں کے مفاد کے خیال سے بلکہ بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان کی آئینی ترقی کے لحاظ سے بہتر ہے۔ ان صوبوں کی ہندو اقلیتوں کو ان کے تناسب آبادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمایندگی دے دی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جائے جہاں ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

خدمات ملکی میں مسلمانوں کے حقوق:

نمبر ۱۱۔ انتظام ہندوستان کے مفاد کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں ایسا بندوبست کیا جائے جس کی رو سے سرکاری اور آئینی خود مختار مجالس کی ملازمتوں میں اہلیت کا مناسب لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ مناسب حصہ دیا جائے۔

اسلامی تمدن کا تحفظ:

۱۲۔ ہندوستان کے موجودہ معاشرتی اور سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے تمدن کے تحفظ اور مسلمانون کی تعلیم، زبان، مذہب شخصی قانون اور مسلمانوں کے خیراتی ادارات کے تحفظ اور ترقی اور سرکاری امداد میں ان کے مناسب حصے کے لیے مناسب تحفظات شامل کیے جائیں۔

دستور اساسی میں تبدیلی:

نمبر ۱۳۔ یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں یہ قرار دیا جائے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں اس کے نفاذ کے بعد کوئی تغیر و تبدل اس وقت تک نہیں کیا جائے گا۔ جب تک کہ وہ تمام ریاستیں جن پر ہندوستانی وفاقی حکومت (انڈین فیڈریشن) مشتمل ہو، متفقہ طور پر اس کی خواہش نہ کریں گی۔

مسلمانوں کا اعلان:

نمبر ۱۴۔ یہ کانفرنس نہایت زور کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی دستور کو خواہ اس کو کوئی مرتب یا تجویز کرے اس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک کہ وہ ان اصولوں کی تصدیق نہ کرے جو ان تجویزوں میں پیش کیے گئے ہیں۔

پروگرام:

''یہ آل انڈیا مسلم کانفرنس مسلمانانِ ہند سے نہایت ہی پرزور الفاظ میں استدعا کرتی ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہر مسلمان مختلف العقائد اور مختلف الخیال باہم متحد ہو کر عامۃ المسلمین کے فلاح و بہبود کی غرض سے حسب ذیل امور کی طرف پوری توجہ کرے۔''

(۱) ''مسلمانوں کی عام ابتدائی تعلیم کے لیے موزوں معلمین، موزوں منتظمین اور موزوں نصاب کا التزام کرنا تاکہ مسلمانوں کے بچے اور بچیاں علم کے زیور سے مزین ہوں اور شبینہ مدارس کے ذریعے بڑی عمر والے مسلمانوں کو دینی اور دنیوی تعلیم حاصل ہو۔

(۲) مسجدوں کو مرکز بنا کر فکر اسلامی کے جذبے کو ہر مسلمان میں پیدا کرنا، برے رسوم اور برے اخلاق سے مسلمانوں کو بچانے کی تدبیر کرنا۔

(۳) دستکاری، صنعت، حرفت تجارت کی طرف مسلمانوں کو رجوع کرانا اور ہر مسلمان کو باکار بنانا۔

(۴) کم از کم ہر صوبے میں ایک ایسے اخبار کو چلانا جس سے امور بالا اور دیگر تحریکات اسلامی کی کافی ترویج ہو۔

ہمدرد دہلی مرحوم ہو گیا:

۱۲؍اپریل ۱۹۲۹ء: روز نامہ ہمدرد دہلی کے دوسرے دور کا آخری پرچہ ۱۲؍اپریل کو نکلا اور ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

ہمدرد مولانا محمد علی کا مشہور اور تاریخی اخبار تھا۔ اس کا پہلا نمبر ۲۳؍فروری ۱۹۱۳ء کو دہلی سے شائع ہوا تھا۔ یہ اس کی اشاعت کے آغاز کا پہلا دور تھا اس دور کا آخری شمارہ جون ۱۹۱۵ء میں نکلا تھا۔ اس کا دوسرا دور ۹؍نومبر ۱۹۲۴ء کو شروع ہوا تو ۱۲؍اپریل کو اختتام پذیر ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کے خاتمے پر ایک نہایت اثرانگیز شذرہ معارف میں تحریر کیا تھا۔ جو ہفت روزہ سچ لکھنو نے اپنی اشاعت ۱۲؍جولائی ۱۹۲۹ء میں نقل کیا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں۔

ملک کے تمام لوگوں نے اس خبر کو افسوس کے ساتھ سنا ہوگا کہ مولانا محمد علی نے اپنا روزانہ اخبار ہمدرد اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے خریداروں کی تعداد اس قابل نہیں رہی کہ وہ اخبار کی اشاعت کا بار اٹھا سکتی۔ مولانا محمد علی کے مسلک اور مشرب سے جس کسی کو بھی جس قدر بھی اختلاف ہو، تاہم اس اظہار میں باک نہیں کہ ہمدرد تنہا اردو کا روز نامہ تھا، جس کا اصول عوام پرستی کے سیلاب میں بہنا نہیں، بلکہ اپنے مسلک پر عوام کو چلانا تھا۔

وہ تفریح و تہقہہ کا اخبار نہ تھا، بلکہ عوام اور اردو دانوں کو سیاسی مسائل کا سکھانے والا نصاب درس تھا۔ اس میں خبریں اپنی تبلیغ، پروپیگنڈے، اور خریداری بڑھانے کے اصول پر نہیں شائع ہوتی تھیں، بلکہ ملک کو حقیقت اور واقعیت سے باخبر رکھنے کے لیے۔ اس کے مضامین صرف دور از کار انشا پردازی، اور بے معنی لفاظی سے پاک ہوتے تھے۔ اس کے مقالے، معلومات سے لبریز، دلائل سے معمور، اور سنجیدگی و متانیت کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ بازاری لطائف و ظرائف، عامیانہ پھکڑ اور بے سلیقہ الفاظ سے وہ پاک ہوتا تھا۔ اس کی ناکامی نے یہ افسوسناک حقیقت ثابت کر دی کہ مسلمان اب تک سنجیدہ، متین، اور باوقار لٹریچر کی قدر دانی کے لیے تیار نہیں؟ (معارف)

سائمن کمیشن کی واپسی اور انگلستان میں انقلاب وزارت:

۱۴؍اپریل ۱۹۲۹ء: ۱۴؍اپریل ۱۹۲۹ء کو سائمن کمیشن جب دوسری بار ہندوستان سے اپنی

ناکامی کے بعد انگلستان پہنچا تو برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی (جس کے لیڈر مسٹر چرچل تھے) لیبر پارٹی کے ہاتھوں الیکشن میں شکست کھا چکی تھی۔ اس طرح ۴ر جون ۱۹۲۹ء کو جب مسٹر ریمزے میکڈونلڈ نے اپنی وزارت بنائی اور وہ برطانیہ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تو ہندوستان کو ایک گونہ مسرت ہوئی۔ کیوں کہ ہندوستان سے متعلق ان کی پالیسی مسٹر چرچل سے مختلف تھی۔ گو نئے وزیر اعظم سیاسی اعتبار سے اس قدر انتقامی جذبہ نہیں رکھتے تھے جس قدر کہ مسٹر چرچل ہندوستان کے دشمن تھے۔ تاہم بحیثیت انگریز اپنی غلام رعایا سے انھیں بھی کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔

جون کے آخری دنوں میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اردن وزیر اعظم سے حکومت کی نئی پالیسی سمجھنے کے لیے انگلستان گئے اور واپسی پر ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انھوں نے ایک بیان کے ذریعے برطانوی پالیسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''برٹش گورنمنٹ اپنے وعدے اگست ۱۹۱۷ء کے مطابق'' ہندوستان کو اب بھی بتدریج ذمہ دار حکومت دینے کو تیار ہے۔ جیسے کہ سلطنت برطانیہ کے مختلف وزراے نے گاہے گاہے ہندوستان کو یقین دلایا اور وعدہ کیا تاکہ ہندوستان برطانیہ کا ایک جز ولاینفک رہے۔'' (کاروان احرار، ج۱)

۳ تا ۶ر مئی ۱۹۲۹ء: جمعیت علماے ہند کا نواں سالانہ اجلاس ۳ تا ۶ر مئی ۱۹۲۹ء قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد میں مولانا شاہ معین الدین اجمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے بھی اس میں شرکت فرمائی اجلاس کی ایک مفصل قرارداد میں آزادی کی جنگ میں کانگریس سے تعاون، سارادا ایکٹ کی مخالفت، مسلمانوں کے پرسنل لا کی حفاظت، ضبط شدہ فتوے کی حفاظت، شراب اور دیگر مسکرات کے استعمال پر پابندی، ولایتی مال خصوصاً کپڑے کے مقاطعے کی اپیل کی گئی۔ یہ قرارداد مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے پیش کی اور جن حضرات نے اس کی تائید کی ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی بھی شامل تھے۔ (جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۷۲۔۱۷۱)

۱۲ر جولائی ۱۹۲۹ء:

غیروں کا اعتراف: یو، پی، (صوبہ متحدہ) کے تعلیم یافتہ ہندوؤں کی سوشل کانفرنس (انجمن اصلاحِ معاشرت) کچھ روز ہوئے لکھنو میں منعقد ہوئی تھی۔ جلسہ کا سب سے زیادہ اہم ریزولیشن حسب ذیل تھا:

''اس کانفرنس کی رائے میں ہندوؤں کے قانون وارثت میں ایسی ترمیم ہونی چاہیے، جس سے ہندو عورتیں، جو اب تک اس حق سے محروم ہیں، جائداد میں حصہ پانے لگیں۔''

تحریک سر تیج بہادر سپرو نے پیش کی، اور اپنی تقریر کے دوران فرمایا:

''ہندوؤں کا قانون، نہ صرف مسئلہ وراثت میں، بلکہ اور بہت سے معاملات میں مسلمانوں کے قانون سے بہت پیچھے ہے، اور عورتوں کے حق میں نہایت نامنصفانہ بلکہ ظالمانہ ہے۔''

طلاق، تعددِ ازدواج اور حرمت شراب کے بارے میں مغربی قومیں بار با قانون اسلام پر رشک کر چکی ہیں۔ اب قانون وراثت سے متعلق ہمسایہ تعلیم یافتہ قوم کی زبان سے یہ اظہار رشک ہو رہا ہے! کیا دنیا کی عمر جتنی بڑھتی جائے گی کفر و انکار، طغیان والحاد کے باوجود بھی، سچے ﷺ کا پیغام، اور سچے ﷺ کے لائے ہوئے احکام یوں ہی دلوں میں گھر کرتے چلے جائیں گے؟

(سچ لکھنو، ۱۲ر جولائی ۱۹۲۹ء)

۱۲ر جولائی ۱۹۲۹ء:

مدینۂ طیبہ کی ایک صحیح خدمت:

حجاز کا سفر کیے بغیر غیر اہل حجاز کی موجودہ دردناک اور عبرت انگیز پستیوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ مدینہ طیبہؐ کے دوران قیام میں، اس کی بیشمار فضیلتوں اور بحساب برکتوں کے باوجود، یہ منظر دیکھ کر قلب کو کس درجہ تکلیف ہوتی تھی، کہ ہر ہاتھ ہر موقع پر آپ کی طرف پھیلا ہوا ہے، اور وہ جن کا کام غیر تمندی و استغنا کا سبق دینا تھا، عین اس محترم ہستی ﷺ کے جوارِ محترم میں، جس نے مسجد میں سوال علاج سختی نہیں۔ اور اہل مدینہ کے ساتھ سختی اور بیدردی تو کسی صاحب ایمان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ تاہم نفس علاج نہایت ضروری ہے، اور مرض سے بے پروا مریض کے ساتھ دوستی نہیں، دشمنی ہے صحیح علاج صرف یہ ہے، کہ صحیح دینی تعلیم میں لگا کر اور ایثار، استغنا، وغیر تمندی کا عملی نمونہ پیش کر کے عادتوں کو بگڑنے سے روکا جائے، اور بگڑی ہوئی عادتوں کو حتی الا مکان درست کیا جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس خطۂ پاک کی اس اہم خدمت کا شرف ہمارے ایک ہندی بزرگ کے نصیب میں آیا ہے۔ اور انھوں نے نہایت صحیح اصول پر ایک دن درس گاہ ''مدرسۃ الیتامیٰ'' کے نام سے، انھیں اصلاحی مقاصد کے ساتھ، حرم نبوی سے بالکل متصل قائم کر دی ہے ان

بزرگوار کا (جو رسماً و تعظیماً نہیں، حقیقۃً اور اپنے صحیح معنی میں ایک قابل صد رشک بزرگ ہیں) اسم مبارک مولانا سید احمد فیض آبادی ہے۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب (شیخ الحدیث، دیوبند) کے برادر کلاں ہیں، اور اپنی عمر جوار و جیران رسول ﷺ کی خدمت کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ مدرسہ کا تفصیلی ''معائنہ''، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے قلم سے انشاء اللہ آئندہ نمبر میں نکلے گا۔ مختصراً اس وقت اس قدر عرض ہے، کہ سچ کے جو پڑھنے والے اہل ایمان اپنے دل میں اہل مدینہ کی حقیقی خدمت کا ارمان اور ولولہ رکھتے ہوں وہ بلا تامل اور بے تکلف، اس مدرسے کی اعانت کو اپنا فرض سمجھیں۔ مولانا موصوف سے بڑھ کر امین اور قابل اعتماد و اطمینان بزرگ اس زمانے میں، تلاش کے بعد بھی شاید نہ مل سکے۔ (ہفت روزہ سچ۔ لکھنو، ۱۲ ر جولائی ۱۹۲۹ء ص ۲۔۱)

انقلاب افغانستان کی ذمہ داری:

۱۹ ر جولائی ۱۹۲۹ء: برطانوی حکومت نے امان اللہ خاں کے اقتدار اور افغانستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا لیکن اسے دونوں میں سے ایک بات بھی پسند نہ تھی۔ برطانوی حکومت نے ایک طرف تو امان اللہ خاں کو ترقی پسندی کی راہ پر آگے بڑھنے کی ترغیب دی دوسری طرف افغانستان کی رجعت پسندی قوتوں کو اس کے خلاف بھڑکایا اور بالآخر ایک تاجیک ڈاکو حبیب اللہ (بچہ سقا) کو اس کے مقابلے پر کھڑا کر دیا۔ جس نے جنوری ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خاں کو ناکام بنا دیا۔ امان اللہ خاں چمن کے راستے افغانستان سے نکل گئے اور اٹلی میں جا کر سکونت اختیار کر لی۔

(اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۴، لاہور ص ۱۰۰۳)

افغانستان میں انقلاب اقتدار کے پس منظر پر الجمعیۃ، دہلی کے ایک مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جسے سچ لکھنو سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

۱۹۱۹ء میں جب امیر حبیب اللہ خاں کے قتل اور ان کی غیر متوقع شہادت کے بعد جس دن سے شاہ امان اللہ خاں تخت کابل پر متمکن ہوئے تھے اسی وقت سے اس جواں بخت تاجدار کے ساتھ عالم اسلامی کی ہزار ہا امیدیں وابستہ ہو چکی تھیں۔ اور جب اس محب ملک و وطن نے ۱۹۱۹ء میں اپنی قوت بازو اور حسن تدبر نیز ملائے شور بازار کے فتوے اور جنرل نادر خاں کی شجاعت سے افغانستان کو آزاد کرایا اس وقت سے تو شاہ امان اللہ خاں کے ساتھ عالم اسلام کی گرویدگی اور شیفتگی کی یہ حالت ہو گئی کہ مصطفےٰ کمال نے جب خلافت کے الغا کا اعلان کیا تو عام طور سے مسلمانوں کا

یہ خیال ہوگیا کہ شاہ امان اللہ خاں کو خلافت کے منصب جلیلہ پر فائز کیا جائے۔ چنانچہ متعدد بار مختلف گوشوں سے اس قسم کے خیالات کا اظہار بھی کیا گیا۔ پھر بھی بعض حضرات اس فکر میں ضرور تھے کہ مسلمانوں کے لیے ایک مرکز قائم کیا جائے اور وہ افغانستان ہو۔ یہ تحریک اگرچہ صرف چند دماغوں ہی میں تھی، لیکن جس طرح مسلمان اس امر پر غور کر رہے تھے کہ افغانستان کو دارالخلافہ بنایا جائے اسی طرح شاطران یورپ بھی اس فکر میں تھے کہ افغانستان کا وہ مہرہ جو دو قبیلوں کے درمیان آپھنسا ہے، زیادہ طاقتور نہ ہو جائے۔ یورپ کی دور بین نگاہوں نے مسلمانوں کے اس مقدس خیال کا یہی توڑ مناسب سمجھا کہ جس طرح ممکن ہو اس نوجوان اور ناتجربہ کار بادشاہ کو یورپ کی تعلیم وتمدن سے اتنا قریب کر دیا جائے کہ مصطفےٰ کمال کی طرح مسلمان اس سے بھی ناامید ہو جائیں اور شاہ امان اللہ خاں کا بڑھتا ہوا اقتدار خاک میں ملا دیا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ شاہ امان اللہ خاں پر محمود طرزی اور ان کے خاندان کو مسلط کر دیا گیا، اور جنرل نادر خاں جیسے محب وطن کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ محمود طرزی کا تسلط حقیقۃً یورپ اور اس کی تہذیب کا تسلط تھا۔ جس نے آہستہ آہستہ ایک افغان بادشاہ کو یورپین طرزِ تہذیب کا دلدادہ بنا دیا اور ایک ناتجربہ کار نوجوان یہ سمجھ بیٹھا کہ ملک کی ترقی کا دارومدار ہی یورپین تہذیب پر موقوف ہے۔ شاہ امان اللہ خاں اس غلط اعتقاد پر یہاں تک راسخ اور مضبوط ہو گئے کہ آخر انھوں نے یورپ کے سفر کی تیاری کی اور ۱۹۲۸ء میں یورپ تشریف لے گئے۔ جس وقت شاہ افغانستان کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے اور ملکہ ثریا نے برقعے کو خیر باد کہا اسی وقت ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ خدا خیر کرے۔ ملکہ کا یہ اقدام موجب خیر و برکت نہیں ہے۔ دورانِ سفر میں جو خبریں ہم کو موصول ہوتی رہیں وہ بھی حوصلہ شکن اور مایوس کن تھیں۔ لیکن ہمارا خیال تھا کہ یہ تہذیب یورپ ہی میں ختم ہو جائے گی اور یہ بلا شاہ امان اللہ خان کے ساتھ افغانستان میں داخل نہ ہوگی، لیکن ہمارا خیال غلط ثابت ہوا۔ اور شاہ امان اللہ خان نے یورپ کی واپسی پر فوراً ہی اصلاحات کا نفاذ شروع کر دیا۔ جن کی مذہبی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو، لیکن افغانستان کے اولڈ فیشن اور کٹر مسلمانوں کے لیے یقیناً ناقابل برداشت تھیں۔ باوجود اس کے کہ یہ اصلاحات اگرچہ قبل از وقت تھیں۔ افغانستان نے ان کو طوعاً یا کرہاً برداشت کیا۔ ان اصلاحات کے خلاف کئی نوٹ لکھے اور اعلیٰ حضرت کو بھی نہایت ادب واحترام کے ساتھ کئی بار توجہ دلائی۔

ان تمام نوٹوں کے فارسی تراجم بھی اعلیٰ حضرت کی خدمت میں بھیجے گئے، لیکن شاہ امان اللہ

خاں پر ان معروضات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہندوستان کے بعض دیگر مسلم اخبارات نے بھی اعلیٰ حضرت کو توجہ دلائی، افغانستان کے بعض مقتدر علماء مشائخ نے بھی ان اصلاحات کے خلاف آواز بلند کی، لیکن ان تمام امور کے باوجود انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں فرمائی، بلکہ ان علماء و مشائخ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جن کے ایک اشارہ پر ۱۹۱۹ء میں پچاس ہزار مجاہد امیر صاحب کو مل گئے تھے۔ اور جو افغانستان کی آزادی کے سب سے بڑے حامی تھے۔ اور جن کی سعی سے جنرل نادر خاں کو تھل پر فتح نصیب ہوئی تھی۔ جب اس قسم کے مقدس اور محب وطن علماء کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تو افغان قوم کے لیے امیر صاحب کا یہ رویہ نا قابل برداشت ہو گیا اور افغانستان کے ان پڑھ اور جاہل قبائل نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔

سب سے پہلے امیر صاحب کے اس رویے اور اقدام سے شنواری باغی ہوئے۔ شنواریوں کی یہ بغاوت اس قدر عام ہوئی کہ تمام افغانستان کی فضا مکدر ہوگئی۔ شاطران یورپ جو عرصے سے موقع کی تاک میں تھے انھوں نے اس شورش سے فائدہ اٹھایا اور بعض علماء و مشائخ کو اپنی چالوں کا شکار بنالیا۔ علماء جو امیر صاحب کے اصلاحی قوانین سے پہلے ہی متاثر تھے جب ان کو دینی خدمت کے ساتھ ساتھ یورپ کی ٹکسال کے سنہرے سکے بھی ملنے لگے، تو انھوں نے ہم خرما و ہم ثواب سمجھ کر خوب اچھی طرح بغاوت کو مستقل کیا۔ اور بجائے فتنۂ باغیہ کو قابو میں کرنے کے، اس کو امیر صاحب کے خلاف ابھانے میں سعی کی۔ اور دن بدن یہ آگ بڑھتی گئی۔

(ہفت روزہ سچ لکھنو۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۲۹ء، بہ حوالہ الجمعیۃ۔ دہلی)

بدیسی کپڑے کا مقاطعہ

۲ر اگست ۱۹۲۹ء:

مقاطعہ کی ضرورت:

حصول سوراج کی تحریک کو امداد دینے کی غرض سے کانگریس نے آپ سے ہر قسم کے غیر ملکی کپڑے کے مقاطعے کی درخواست کی ہے۔ قوم کی آنکھیں بیتابی سے آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور وہ یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ آپ خود اپنے عمل سے اور اپنے ہمسایوں اور دوستوں تک یہ پیام پہنچا کر کانگریس کی اس دعوت کا کس طرح جواب دیتے ہیں۔ اب پس و پیش یا تاخیر کی کیا ضرورت ہے؟ کانگریس آپ سے قلیل ترین قربانی کا مطالبہ کرتی ہے اور اگر آپ کے دل میں واقعی سوراج

کی تڑپ موجود ہے تو آپ کو اتنی قربانی کرنا چاہیے۔

حقیقی قوم دیہات میں بستی ہے:

سوراج کی وجہ سے دیہات میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کو اگر کم از کم اقتصادی آزادی نصیب نہ ہو تو یہ ان کے لیے ایک بے حقیقت چیز ہوگی۔ ہندوستانی قوم دیہات میں بستی ہے، نہ کہ شہروں میں۔ مندرجۂ ذیل اعداد ملاحظہ ہوں:

ہندوستان کی کل آبادی	۳۱ کروڑ ۸۸ لاکھ
شہروں میں بسنے والی آبادی	۳ کروڑ ۲۴ لاکھ
دیہاتی آبادی	۲۸ کروڑ ۶۴ لاکھ

اوسط روزانہ آمدنی:

ہمارے ۲۸ کروڑ ۶۴ لاکھ برادرانِ وطن کی اقتصادی حالت کیا ہے؟ ایک ہندوستانی کی روزانہ آمدنی کیا ہے اور اسی کے مقابلے میں اور ممالک کے باشندوں کی روزانہ آمدنی کا اوسط کیا ہے؟ اس کے جواب کے لیے ذیل کے اعداد ملاحظہ ہوں:

(فی شخص کی روزانہ اوسط آمدنی)

	پائی	آنہ	روپیہ
ممالک متحدہ امریکہ	۰	۰	۳
اسٹریلیا	۰	۴	۲
برطانیۂ عظمیٰ		۴	۲
کنیڈا	۸	۱۰	۱
ہندوستان	۷	۱	ـ

اس کا بھی خیال رہے کہ ۳ کروڑ اور ۲۴ لاکھ شہری آبادی کی غیر معمولی آمدنی شامل کر کے یہ ایک آنہ ۷ پائی کا اوسط پڑتا ہے، ورنہ اسے اگر کم کر دیا جائے تو شاید اس سے بھی کم اوسط پڑے گا۔

۶۶ کروڑ کا نقصان سالانہ:

ادھر تو ملک کی آبادی کی اوسط آمدنی ایک ایک آنہ سات پائی ہے اور دوسری طرف ملک کا ہر

سال ٦٦۵ کروڑ سے زائد روپیہ غیر ملکی کپڑے اور سوت کی درآمد کی صورت میں ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ اس غیر ملکی کپڑے کا بڑا حصہ یہی ہندوستان کی ۲۸ کروڑ ۶۴ لاکھ کی دیہاتی آبادی صرف کرتی ہے۔

گذشتہ دس سال میں نیم فاقہ کش ہندوستان نے کپڑے کی خریداری کی صورت میں کل ٦٦٣ کروڑ سے زائد روپیہ برطانیۂ عظمیٰ، جاپان اور دیگر ممالک کی جیبوں میں بھر دیا۔

ذیل کے اعداد سے اس کی تشریح ہوگی:

سال	برآمدشدہ غیر ملکی کپڑے اور سوت کی قیمت (لاکھ روپیہ)
۱۹۱۸-۱۹	۵۷۴۱
۱۹۱۹-۲۰	۵٦۱۲
۱۹۲۰-۲۱	۹۷۳٦
۱۹۲۱-۲۲	۵۴٦۷
۱۹۲۲-۲۳	٦۷۷۷
۱۹۲۳-۲۴	٦۴۷۹
۱۹۲۴-۲۵	۷۹۰۹
۱۹۲۵-۲٦	٦۲۲۰
۱۹۲٦-۲۷	٦۱٦۳
۱۹۲۷-۲۸	٦۱۹۲

ہر شخص کو تیرہ گز کپڑا:

ہندوستان میں جو کپڑا تیار ہوتا ہے اور غیر ممالک سے جو کپڑا آتا ہے اس کے گذشتہ ۲۹ سال کے یعنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۲۸ء تک کے اعداد وشمار سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں اوسطاً ہر شخص ۱۲٫۸٦ گز کپڑا کام میں لاتا ہے۔ اگر صرف گذشتہ دس سال کے اعداد دیکھے جائیں تو یہی اوسط ۱۳٫۰۸ یا ۱۳ گز پڑتا ہے۔ بخلاف اس کے ۲۰-۱۹۱۹ء میں ہم نے اوسطاً ۹ گز سے بھی کم کپڑے میں دن گزارے ہیں۔ اس سال کا اوسط ۸٫۸ گز فی شخص پڑتا ہے۔

مقاطعہ کس طرح ممکن ہے؟

اب سال بھر میں فی کس تیرہ گز کپڑے کا اوسط مان کر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ غیر ملکی کپڑے کا مکمل طقاطعہ کس طرح ممکن ہے۔ اس تیرہ گز فی کس میں سے کتنا کپڑا غیر ممالک سے آتا ہے؟ گزشتہ دس سال کے اعداد و شمار مظہر ہیں کہ اس ضرورت کا ۳۳ فی صد حصہ غیر ملکی کپڑے سے پورا ہوتا، فی کس ۲/۱ ۴ گز کپڑا غیر ممالک سے آتا ہے اور باقی ماندہ ۲/۱ ۸ گز فی کس ہندوستان کی ملوں میں اور کرگوں پر تیار ہوتا ہے۔ غرض کہ تحریک مقاطعہ کی کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی پوری آبادی کے لیے فی کس ۳/۱۔۴ گز کپڑا اسالانہ تیار کیا جائے۔ (سچ لکھنو۔ ۱۲؍اگست ۱۹۲۹ء)

’’نئی دنیا‘‘ کی ’’ترقیاں‘‘:

۲۳؍اگست ۱۹۲۹ء: امریکہ میں بینک پر دن دہاڑے ڈاکے پڑتے رہنے کا جو رواج عام ہوتا جاتا ہے اس نے گزشتہ چند برسوں میں جو ترقی کی ہے، اس کا اندازہ اعداد ذیل سے ہوگا:

۱۹۲۱ء	میں	۱۳۳	ڈاکے بینکوں پر دن دہاڑے پڑے
۱۹۲۲ء	میں	۱۴۵	ایضاً
۱۹۲۳ء	میں	۱۲۹	ایضاً
۱۹۲۴ء	میں	۲۳۶	ایضاً
۱۹۲۵ء	میں	۲۲۳	ایضاً
۱۹۲۶ء	میں	۲۱۳	ایضاً
۱۹۲۷	میں	۲۲۷	ایضاً
۱۹۲۸ء	میں	۲۹۲	ایضاً

گویا آٹھویں برس سو فی صدی سے زائد اضافہ ہوگیا! اور یہی معنی ہیں ’’ترقی‘‘ کے! یہ اعداد صرف ایک خاص قسم کی ڈاکہ زنی کے تھے۔ عام ڈکیتی کے واقعات کی ترقی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے، کہ جیل خانوں میں جو سزایاب مجرم ہیں، ان میں جہاں تک مردوں کی مردم شماری کا تعلق ہے، ۱۹۱۰ء میں صرف ۲۶ فی دس لاکھ تھے، ۱۹۲۳ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۵۱ فی دس لاکھ تک پہنچی، اور ۱۹۲۶ء میں بڑھتے بڑھتے پوری ۶۸ فی دس لاکھ ہوگئی!

اور کیا عجب ہے کہ اس وقت مزید ترقی کر کے ۱۰ء کی پوری تگنی (سہ چند) ہوگئی ہو! ڈاکوں کو چھوڑ کر سب سے بڑے جرم، قتل انسانی کو لیجیے، یہاں بھی آپ ''نئی دنیا'' کی رفتارِ ترقی پر عش عش کر جائیں گے۔ اکتیس شہروں کے اعداد ملاحظہ ہوں:

۱۹۰۰ء	میں	دس لاکھ نفوس میں	۵۱	قتل ہوئے
۱۹۰۵ء	میں	دس لاکھ نفوس میں	۶۶	قتل ہوئے
۱۹۱۰ء	میں	دس لاکھ نفوس میں	۸۱	قتل ہوئے
۱۹۱۵ء	میں	دس لاکھ نفوس میں	۹۱	قتل ہوئے
۱۹۲۰ء	میں	دس لاکھ نفوس میں	۹۵	قتل ہوئے
۱۹۲۵ء	میں	دس لاکھ نفوس میں	۱۱۳	قتل ہوئے

ان ''ترقیوں'' کا مقابلہ، مشرق اپنے دقیانوسی نظام تعلیم و مذہب کے ساتھ کہاں تک کرے گا؟ (سچ لکھنو۔۲۳ اگست ۱۹۲۹ء)

ہر ہندوستانی کا فرض:

۲۳ر اگست ۱۹۲۹ء: ہر وہ روپیہ جو آپ کھدر پر خرچ کریں گے، آپ کے نادار ہم وطنوں کے درمیان بہ تناسب ذیل تقسیم ہوگا:

	پائی	آنہ	روپیہ
روئی کی کاشت کرنے والا	۹	۳	۰
بنولے نکالنے والا	۶	۰	۰
دھنیا	۹	۱	۰
کاتنے والا	۹	۳	۰
بافندہ	۹	۴	۰
دھوبی	۶	۰	۰
فروخت کنندہ	۰	۱	۰
میزان	۰	۰	۱

اس روپیہ میں سے ایک پائی بھی ہندوستان سے باہر نہیں جاتی۔ اس لیے اپ کا فرض ہے کہ

آپ جب کبھی کپڑا خریدنے کا ارادہ کریں تو اپنے آپ سے مندرجۂ ذیل سوالات کا جواب حاصل کرلیں:۔آیا مجھے اپنے وطن عزیز کے ان مصیبت زدہ ذکورواناث کی امداد کرنی چاہیے جو دیہات میں اپنے اپنے گھروں کے اندر بیکاری کی وبا کا شکار ہوکر فاقہ کشی کررہے ہیں؟ یا آیا مجھے اپنے مذاق اوراپنی پسند کو مطمئن کرنا چاہیے اور غیر ملکی کپڑا خرید کر اپنے ہم وطنوں کے منہ کا نوالہ ان غیر ملکیوں کے حوالہ کرنا چاہیے جسے اس کی ضرورت نسبۃً کم ہے۔(سچ لکھنو۔۲۳راگست ۱۹۲۹)

کیا اب بھی لاپروائی برتی جائے گی؟

۶رستمبر ۱۹۲۹ء: ہندوستان میں ملوں ریلوں اور دیگر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ۱۵لاکھ ہے۔کرگھوں سے جتنے آدمیوں کو کام ملتا ہے ان کی تعداد ۴۰لاکھ ہے۔ جن لوگوں کی گذراوقات زراعت پر ہے ان کی تعداد ۲۲کروڑ ۹۰لاکھ ہے۔

کسی زراعت پیشہ خاندان میں اگر ایک چرخہ چلتا رہے تو اس کی آمدنی میں ۱۲ سے لے کر ۲۸ فی صدی تک کا اضافہ ہوسکتا ہے۔چرخہ کاتنے سے کسانوں کی قلیل آمدنی میں بہت کافی اضافہ ہوتا ہے۔خواہ یہ اضافہ آپ کی نظر میں حقیر ہی کیوں نہ ہو۔

چرخہ کاتنے والے دس دس میل کا فاصلہ پا پیادہ طے کرکے کھادی سینٹروں پر جاتے ہیں، تاکہ وہاں سے روئی لے آئیں،اور کتا ہوا سوت وہاں پہنچائیں۔

کیوں؟

اس لیے کہ ان کے حق میں ان کی آمدنی میں یہ اضافہ بہت قیمتی ہے

وجہ یہ ہے کہ

ایک امریکن کی اوسط آمدنی روزانہ	۳	روپیہ	ہے
ایک اسٹریلین کی اوسط آمدنی روزانہ	۲	روپیہ ۴	ہے
ایک انگریز کی اوسط آمدنی روزانہ	۲	روپیہ	ہے
ایک کنیڈین کی اوسط آمدنی روزانہ	۱	روپیہ ۱۲۔	ہے

لیکن مادر ہند کے فرزندوں کو ایک آنہ ۷ پائی یومیہ میں گزارنا پڑتا ہے!(فارن کلاتھ بائی کاٹ کمیٹی)

(سچ لکھنو۔۶رستمبر ۱۹۲۹ء)

۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۹ء: حبیب اللہ (بچہ سقا) نے افغانستان پر قبضہ کر لیا تھا کہ لیکن وہ ملک کا انتظام برقرار رکھنے اور چلانے میں ناکام رہا۔ ملک میں ابتری پھیل گئی۔ ان حالات میں ملک کے بااثر قبائل نے سپہ سالار نادر خاں کو برسر اقتدار لانے کا فیصلہ کیا۔ نادر خاں اس زمانے میں فرانس میں تھے۔ اگرچہ وہ بیمار تھے لیکن انھیں افغانستان آنا پڑا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ان کی بادشاہت کا اعلان ہوا۔ نادر خاں نے اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ ملک کو ترقی کے راستے پر آگے بڑھایا۔ لیکن ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک شخص نے انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے ظاہر شاہ کو بادشاہ بنانے کا اعلان کیا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲، لاہور، ص ۴-۱۰۰۳)

ایک عالم دین کا نعرۂ حق:

۲۰ر ستمبر ۱۹۲۹ء: مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے اخبار سچ میں جانشین شیخ الہند مولانا مدنی کے جمعیت علماء صوبہ متحدہ کے خطبۂ صدارت سے ایک اقتباس ''ایک عالم دین کا نعرہ حق'' کے عنوان سے نقل کیا ہے اور اس پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ذیل میں یہ اقتباس اور اس پر تبصرہ نقل کیا جاتا ہے:

''میرے محترم بزرگو! مکمل آزادی اسلام اور مسلمانوں کا ہندوستان میں فریضہ ہے۔ یہ جملہ مسلمانوں کا ہمیشہ مطمح نظر ہونا چاہیے۔ قواعد شرعیہ کی بنا پر بھی اگر مسلمان اس سے غافل ہوئے تو عنداللہ ماخوذ ہو جانے کے مستحق ہوں گے۔ مسلمانوں پر حسب طاقت ضروری ہے، کہ اس راہ میں گامزن رہیں، اور کبھی بھی اس فریضہ کو نہ بھولیں ......ہم جب تک جان میں جان ہے، اپنی طاقت کے موافق آزادی کے لیے سعی کریں گے، خواہ کوئی ہمارا ساتھ دے یا نہ دے، اللہ ہمارا والی ہے۔''

یہ اقتباس ہے، جانشین شیخ الہندؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب محدث صدر جمعیۃ العلماء صوبہ متحدہ کے خطبۂ صدارت کا، جو سچ میں تمام و کمال شائع ہو رہا ہے۔ آج ہمارے جن ''آزاد خیال'' عزیزوں اور دوستوں کو اپنی نیشنلزم (قوم پروری) پر ناز ہے اور جو قومیت کو مذہب کے قیود سے بلند تر سمجھ رہے ہیں، کیا وہ اپنی تحریر و تقریر کے سارے انبار میں، اس سے زیادہ پرزور الفاظ میں آزادی وطن کی حمایت دکھا سکتے ہیں؟ مولانا فرماتے ہیں، کہ نہرو رپورٹ والی حکومت بہ طرز نوآبادیات کا نہیں، آزادی کامل کا مطمح نظر، کسی وقتی مصلحت کی بناء پر نہیں، کسی ہنگامی جوش و خروش کی بناء پر نہیں، بلکہ دینی و مذہبی حیثیت سے ایک مستقل فریضہ ہے، اور مسلمان اگر اس سے

کسی حال میں بھی غافل رہے، تو عنداللہ مواخذہ کے مستحق ہوں گے! دینداری کو جذبۂ قومیت کے منافی سمجھنے پر اصرار اب نہیں قائم رہے گا؟ (سچ لکھنو، ۲۰ ستمبر ۱۹۲۹ء)

۷ نومبر ۱۹۲۹ء: صدر جمعیت علمائے ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے شاردا بل کے مسئلے پر لارڈ اروِن وائسرائے ہند کو ایک نہایت مفصل اور مدلل خط لکھا ہے کہ یہ بل شریعت اسلامیہ میں مداخلت کی بدترین مثال ہے۔ اس لیے اسے فوراً منسوخ کر دینا چاہیے۔ یہ مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ یہ خط اخبارات میں اشاعت کے علاوہ ''قانون شریعت کی حفاظت'' کے عنوان سے کتابچے کی شکل میں بھی چھاپ دیا گیا تھا۔ اب اسے مقالات سیاسیہ کی جلد...... سوم میں شامل کر دیا گیا ہے۔

شراب خانہ خراب قابل عبرت اعداد:

۶ دسمبر ۱۹۲۹ء: ذیل میں وہ اعداد و شمار دیے جاتے ہیں جن سے پتا چلے گا کہ غیر ملکی شراب نے ہندوستان کو کس طرح تباہ کیا ہے:

قسم بدیشی شراب	۲۳-۱۹۲۲ء میں	۲۸-۱۹۲۷ء میں
ایل بیر اور پورٹ	۲۸۳۶۷۹۳ گیلن	۲۴۸۷۱۷۸ گیلن
برانڈی	۳۴۸۴۰۸ گیلن	۴۲۵۶۹۳ گیلن
جن	۸۵۱۸۲ گیلن	۱۱۴۱۰۸ گیلن
لکور	۱۳۹۰۵ گیلن	۱۶۳۹۳ گیلن
رم	۱۲۳۱۴۲ گیلن	۹۰۶۵۹ گیلن
وسکی	۵۲۶۸۱۳ گیلن	۵۴۷۳۵۹ گیلن
ٹوٹل	۳۹۳۴۲۴۳ گیلن	۵۶۸۱۴۲۶ گیلن

ذیل کی فہرست سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں صوبہ وار حسب ذیل تعداد میں لائسنس دیے گئے:

صوبہ سرحد	۲۲۶
مدراس	۵۵۹
بمبئی	۱۹۷

بنگال	۶۹۶
صوبہ متحدہ	۱۰۲۰
پنجاب	۷۰۸
برما	۶۷۴
صوبہ متوسط	۲۵۹
آسام	۱۲۴
	۴۶۵۹

بدیسی شراب پر حکومت حسب ذیل حساب سے ٹیکس لیتی ہے:

۱۹۰۱ء	میں بحساب	۸/۴	فی گیلن
۱۹۰۵ء	میں بحساب	۸/۶	فی گیلن
۱۹۰۹ء	میں بحساب	۱۱/۶	فی گیلن
۱۹۱۳ء	میں بحساب	۵/۸	فی گیلن
۱۹۱۸ء	میں بحساب	۱۱/۱۰	فی گیلن
۱۹۲۲ء	میں بحساب	۱/۱۲	فی گیلن
۱۹۲۶ء	میں بحساب	۴/۱۲	فی گیلن

۲۸-۱۹۲۷ء میں بدیسی شراب سے ۲۵۴۹۶۷۲ روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ بدیسی اور دیسی ہر قسم کی شراب سے مرکزی حکومت اور صوبہ وار حکومتوں کو حسب ذیل آمدنی ہوئی:

نام حکومت	آمدانی ۲۲-۱۹۲۱ء	آمدنی ۲۷-۱۹۲۶ء
مرکزی حکومت کو	۵۳۰۳۹۹ روپیہ	۱۱۳۲۱۷ روپیہ
حکومت مدراس کو	۴۸۷۲۴۵ روپیہ	۵۱۰۵۳۶۹۶ روپیہ
حکومت بمبئی کو	۳۴۲۶۸۷۵۲ روپیہ	۴۰۹۹۳۳۵ روپیہ
حکومت بنگال کو	۱۸۳۰۰۸۸۸ روپیہ	۲۴۵۰۷۱۳۳ روپیہ
حکومت یوپی کو	۱۴۸۹۲۳۱۹ روپیہ	۱۳۰۱۹۷۰۳ روپیہ
حکومت پنجاب کو	۱۱۵۹۶۰۴۶ روپیہ	۱۲۴۲۳۱۳۱۳ روپیہ

حکومت برہما کو	۹۷۹۴۶۴۶ روپیہ	۱۳۲۱۲۰۳۴ روپیہ
حکومت بہار واڑیسہ کو	۲۳۶۳۴۱۷ روپیہ	۱۹۷۳۴۵۶۲ روپیہ
حکومت صوبہ متوسط کو	۱۰۴۹۰۲۱۲ روپیہ	۱۳۵۴۵۱۸۹ روپیہ
حکومت آسام کو	۵۹۵۷۹۵۰ روپیہ	۷۱۹۲۷۱۷ روپیہ

ذیل میں صوبہ وار فہرست ان بدیسی شرابوں کی دی جاتی ہے جو ہندوستان کے اندر بنائی جاتی ہیں۔ ان اعداد سے پتا چلے گا کہ ہندوستان کے اندر تیار کی ہوئی بدیسی شراب کی فروخت بڑھ گئی ہے۔ یہ تعداد ۲۷-۱۹۲۶ء کی ہے۔

نام صوبہ	اسپرٹ گیلن	مالٹ لیکور
پنجاب	۲۷۵۶۵ گیلن	۱۴۸۶۹۳۱ گیلن
مدراس	۲۶۵۱۸ گیلن	۵۴۰۶۷۶ گیلن
صوبہ سرحد	۵۷۷۸ گیلن	۲۲۴۰۳۴ گیلن
صوبہ متحدہ	۵۲۴۱ گیلن	۹۶۱۷۲ گیلن
بمبئی	۳۵۲۵۱ گیلن	۴۰۳ گیلن
بہار واڑلیہ	۱۸۵۹ گیلن	۱۸۳ گیلن

بعض صوبجات نے ہندوستان میں بنی ہوئی بدیسی شراب کی قیمت ۲۱ روپیہ چار آنے کی جگہ کم کر کے ۱۷ روپیہ آٹھ آنے فی گیلن کر دی ہے جس سے آمدنی بہت بڑھ گئی ہے۔

(سچ لکھنو۔ ۶ ردسمبر ۱۹۲۹ء بہ حوالۂ خلافت بمبئی)

"بڑے کلوار" کی آمدنی

۱۳ ردسمبر ۱۹۲۹ء: ۲۸-۱۹۲۷ء میں بدیسی شراب سے ۲۵۴۹۸۹۷۲ روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ بدیسی اور دیسی ہر قسم کی شراب سے مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو حسب ذیل آمدنی ہوئی:

نام حکومت	آمدنی ۲۲-۱۹۲۱ء	آمدنی ۲۸-۱۹۲۷ء
مرکزی حکومت کو	۵۳۸۰۳۹۹ روپیہ	۴۱۱۳۲۷۱ روپیہ
حکومت مدراس کو	۳۴۲۶۸۷۵۲ روپیہ	۴۸۸۱۷۲۴۵ روپیہ

حکومت بمبئی کو	۳۴۲۶۸۷۵۲روپیہ	۵۱۰۵۲۶۹۶روپیہ
حکومت بنگال کو	۱۸۳۰۰۸۸۸روپیہ	۳۲۵۱۷۱۳۳روپیہ
حکومت یوپی کو	۱۴۸۹۲۳۱۹روپیہ	۱۳۰۹۹۷۰۳روپیہ
حکومت پنجاب کو	۱۱۵۹۶۰۸۶روپیہ	۱۴۴۳۲۳۱۳روپیہ
حکومت برہما	۹۷۹۴۶۴۶روپیہ	۱۳۳۱۲۶۳۴روپیہ
حکومت بہار واڑیسہ کو	۱۲۳۶۳۴۱۷روپیہ	۱۹۷۳۴۵۶۲روپیہ
حکومت صوبہ متوسط کو	۱۰۴۹۰۲۱۲روپیہ	۱۳۵۴۵۱۸۹روپیہ
حکومت آسام کو	۵۹۵۷۹۵۰روپیہ	۷۱۹۲۷۱۷روپیہ
میزان	۱۷۱۸۱۶۹۴روپیہ	۲۰۷۹۲۸۴۹۹روپیہ

(سچ لکھنو، ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۹ء)

نصف دسمبر ۱۹۲۹ء (نصف رجب ۱۳۴۸ھ): شاردا بل کے خلاف مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔ اخبارات میں اس کے خلاف مضامین لکھے گئے۔ بیانات شائع ہوئے، احتجاج کیے گئے۔ فتوے مرتب ہوئے، اسے مداخلت فی الدین قرار دیا گیا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ سے بھی اس باب میں فتویٰ دریافت کیا گیا تھا۔ حضرت مولانا تھانوی نے صغرسنی کی شادی کی اجازت کی حکمت پر بے نظیر تحریر ارشاد فرمائی۔ لیکن سیاسی پہلو سے اس پر اظہار رائے سے علماً و عملاً اپنے تئیں قاصر گرداناہے۔ حکیم الامت" فرماتے ہیں:

''اور سیاسی پہلو پر اس لیے کلام مقصود نہیں کہ میں نہ عملاً اس پر قادر ہوں کہ اس قانون میں تمدنی و معاشرتی خرابیاں دکھلا سکوں اور نہ عملاً اس پر قادر ہوں کہ اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں بتلا سکوں۔ باقی کسی موقع پر غیر سیاسی طرز پر اس کا تبعاً و استرداداً ذکر آ جانا اور بات ہے۔''

تعجب ہے کہ وقت کا حکیم الامت کسی قانون کے نفاذ سے پیدا ہونے والی تمدنی و معاشرتی خرابیاں نہ علماً بتا سکے اور نہ اس بارے میں کوئی عملاً رہنمائی کر سکے۔ آزادی کے اس موضوع پر افراد کی تقریروں، تحریروں اخبارات کے مقالوں، جماعتوں اور انجمنوں کی قرار دادوں اور احتجاجوں کی کمی نہ تھی۔ جن سے استفادہ کر لیا جا سکتا تھا۔ تحریر کے آخر میں حضرت مولانا تھانوی

فرماتے ہیں اگر عدم مداخلت فی الدین کا فریقین (مسلمانوں اور حکومت) کے مابین کوئی معاہدہ ہوتو ''درخواست'' البتہ کی جاسکتی ہے۔ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

''یہ سب کلام اس وقت تھا جب بناء درخواست نسخ کی، معاہدہ وعدم مداخلت فی المذہب ہو اور ایک دوسری بناء درخواست نسخ کی اور ہے اور دوسری بناء اسلم ہے۔ بالخصوص جو لوگ سیاست میں علماً وعملاً قاصر ہیں، ان کے لیے تو بالتعیین اسی بناء کے اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یعنی اگر کریں اور تحریک کے عام کرنے کے لیے کر ہی لینا اصلح ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت سے درخواست کی جاوے کہ اس قانون کو خلاف معاہدہ ہونے کی بناء پر آپ منسوخ نہیں کرتے تو ترحم اور راحت رسانی ہی کی بناء پر منسوخ کر دیجیے۔ کیا رعایا کے صرف وہی حقوق ہیں جن کی فہرست منضبط کر دی جاوے؟ کیا ان کا یہ حق نہیں ہے کہ ان کو تکلیف و پریشانی سے بچایا جاوے۔ کیا وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے مصالح کی رعایتیں ہوتی نہیں رہتیں۔ اور اس قانون سے جو کلفتیں اور زحمتیں ہوں گی کیا وہ متیقن ومتبین نہیں۔ پھر ان دونوں مقدموں کے بعد ترتیب نتیجہ یعنی نسخ قانون میں کا ہے کا انتظار ہے؟ یہ تو خطاب تھا حکام سے مگر اس پر اکتفا نہ کریں بلکہ حق تعالیٰ سے بھی التجا و دعا کرتے رہیں کہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ یہی گناہ اصل ہے نزول دواہی کی اور حکام کے قلوب کو قلت رعایت سے صاف کرنا جو فرع ہے عفومنا ہی کی۔ واللہ الموفق۔'' (بوادر النوادر جلد دوم، صفحہ ۶۰-۵۴۵)

لیکن حضرت حکیم الامت نے تو اس مداخلت فی الدین کو خلاف معاہدہ سمجھتے ہوئے بھی ازرہ ترحم وراحت رسانی رعایا منسوخ کرنے کی حکومت برطانیہ سے صاف لفظوں میں درخواست بھی نہیں کی۔ اگر حضرت کے انداز سیاست فرمائی کے مطابق اشارے کنایے میں درخواستوں، التجاؤں اور دعاؤں پر عمل کیا جاتا تو نہ ہندوستان آزاد ہوتا اور نہ پاکستان کا قیام ہی عمل میں آتا۔ حضرت حکیم الامت کے متبعین نے جو انداز سیاست اختیار فرمایا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خانقاہ تھانہ بھون میں جسے ہندوستان میں تاریخ دورۂ آخر میں اسلامی سیاست کا انقلابی مرکز سمجھا جاتا تھا، خدا کا نام لینے والا بھی موجود نہیں۔ کیا کسی نے اس خانقاہ کی دائمی آبادی کے لیے دعا نہ کی ہوگی؟ ضرور کی ہوگی لیکن ان علماء کے غلط اعمال سیاست کی پھٹکار نے ان سے تاثیر اجابت چھین لی تھی اور پاکستان میں اسلام کے حصے میں جو رسوائی آئی ہے، وہ بھی اس سلسلے کے مصلحت اندیشوں اور منصب طلبوں کی وجہ سے آئی ہے۔ ہندوستان میں ان کے انداز سیاست سے برٹش استعمار کی

آب یاری ہوتی رہی اور پاکستان میں انھیں غاصب اور آمر ہی اچھے لگے اور جتنی دعائیں یاد تھیں آمریت کے استحکام و بقا کے لیے صرف ہوگئیں۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۲۹ء: ''۲۳ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے سے ملاقات کے دوران میں مہاتما گاندھی نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے سوال پر کوئی گفت وشنید نہ کی تھی۔ کیوں کہ وہ تو درجہ نو آبادیات کے متعلق خاص وعدہ چاہتے تھے جو موجودہ ہندوستان کا کم سے کم مطالبہ ہے لیکن لارڈ اروِن نے اس قسم کا وعدہ کرنے سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔'' مہاتما وائسرائے سے ایسا وعدہ کیوں چاہتے تھے اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ۱۹۲۵ء میں مسٹر لینسبری کے ایک سوال کے جواب میں کہ آیا لارڈ بران ہیڈ گاندھی اور اس کو انگلستان گفت وشنید کے لیے بلایا چاہتے ہیں نائب وزیر ہند ارل ونٹرٹن نے کہا تھا:

''ہندوستان کے متعلق براہ راست کارروائی کے اختیارات لوکل گورنمنٹوں اور حکومت ہند کو دے دیے گئے ہیں۔ اس لیے اس قسم کی گفت وشنید رہنما کے ساتھ ہوسکتی ہے اور حکومت کی مداخلت سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا کیوں کہ بالآخر فیصلہ کے لیے معاملہ اسی کے پاس آتا ہے جس کے لیے وہ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے۔ ثانیاً گو وائسرائے ہندوستان کی سیاسی صورت حالات کے متعلق گفت وشنید و تبادلہ خیالات کرنے کے لیے یہاں آنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ان کے یہاں آنے کو ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے گفت وشنید کا ذریعہ بنایا جائے تو انھیں حکومت ہند کو غلط شکل میں پیش کرنے کے مترادف ہے''

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کنجی وائسرائے کے ہاتھوں میں تھی اور اس کنجی پر قبضہ کرنے کے لیے مہاتما گاندھی نے وائسرائے سے گفت وشنید کرنا منظور کرلیا تھا۔ لیکن وائسرائے کی طرف سے جو مایوس کن جواب ملا اس سے حکومت کے ارادے بالکل بے نقاب ہوگئے۔''
(تواریخ کانگریس، ص ۹۸۔۵۹۷)

مجلس احرار اسلام کا قیام:

۲۸ر دسمبر ۱۹۲۹ء: ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس نے لاہور دریائے راوی کے کنارے اپنے سالانہ اجلاس میں نہرو رپورٹ کو دریاے راوی کے سپرد کر کے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کردیا۔ بنیاد کانگریس (۱۹۰۵ء) سے کانگریس سمیت دوسری جماعتیں

انگریزوں سے ہندوستان کے لیے صرف درجہ نوآبادیات کا مطالبہ کرتی چلی آئی تھیں۔لیکن ۱۹۲۹ء کا سال ہے کہ کانگریس نے برطانیہ سے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔

نہرو رپورٹ کے خاتمے سے ان مسلمانوں کو بے حد صدمہ ہوا جنھوں نے ملت اسلامیہ کی ناراضگی کے باوجود صرف آزادی وطن کے لیے نہرو رپورٹ پر دستخط کیے تھے۔لیکن کانگریسی رہنماؤں نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کرتے وقت ان سے مشورہ لینا بھی مناسب نہ سمجھا اور ایسی بے اعتنائی کا ثبوت دیا کہ بہی خواہان وطن کو کانگریس کی اس بے وفائی پر دلی رنج ہوا۔اسی لمحے ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں نے اپنی الگ تنظیم کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ۲۹ ردسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے اسی پنڈال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے پر حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی صدارت میں اپنا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں فیصلہ کیا کہ،

''ہندوستان کی آزادی کا سہرا دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے سر بھی رہنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں سے گلوخلاصی کے لیے مسلمانوں کے اندر حریت پسند تنظیم کا ہونا نہایت اہم ہے۔''

اس اجلاس میں امیر شریعت کے علاوہ چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا ظفر علی خاں، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، شیخ حسام الدین اور مولانا داؤد غزنوی نے شرکت کی، اسی اجلاس میں مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔

ہندو کاروباری ذہن رکھتا تھا۔اور سیاسیات میں بھی اس نے یہی روش اختیار کی۔نتیجہ یہ ہوا کہ نہرو رپورٹ کا فارمولا جسے پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے اپنی قوم کی مخالفت کے باوجود قبول کر لیا تھا۔محض پنجاب میں ایک نشست کی زیادتی کی بناء پر ہندو اور سکھوں نے رد کر دیا۔جیسے کہ مولانا مظہر علی اظہر اپنی کتاب ''ہمارے فرقہ وارانہ فیصلے کا استدراج'' کے صفحہ ۷۴ تا ۷۶ پر لکھتے ہیں:

''تجاویز دہلی اور نہرو رپورٹ کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ہم ایک اور فارمولا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو پنجاب کے سامنے آیا۔

پنجاب کا مسئلہ ہی ہمیشہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کی راہ میں بدترین رکاوٹ رہا۔فیصلے کی جتنی کوششیں ہوئیں وہ بیکار گئیں۔

سائمن کمیشن کی آمد پر صوبوں میں کونسلوں کے ممبروں کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔جو سائمن کمیشن

کے ساتھ مل کر اس کا کام آسان بنانے کی خاطر کارروائی کرتی تھیں۔ پنجاب کی اس ریفارمز کمیٹی کے ارکان حسب ذیل تھے!

سر سکندر حیات خاں صدر، مسٹر اودن رابرٹس، چودھری چھوٹو رام، چودھری ظفر اللہ خاں، راجہ نرندر ناتھ، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اور سردار اجل سنگھ۔

اس کمیٹی نے تحقیق و بحث کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے ساتھ راجہ نرندر ناتھ اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے مل کر اپنا علاحدہ اختلافی نوٹ شامل کیا اور سردار اجل سنگھ نے اپنا علاحدہ اختلافی نوٹ لکھا۔

مخلوط انتخاب کا فارمولا:

ہمیں اس جگہ اس رپورٹ اور ان اختلافی نوٹوں کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ مسلم ارکان نے اپنی رپورٹ اور تجویزوں کے علاوہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر آئندہ پنجاب اسمبلی میں نشستوں کی تعداد طاق رکھی جائے۔ یعنی ایسی تعداد جو دو پر تقسیم نہ ہوسکے تو مسلموں اور غیر مسلموں کی نشستوں میں فقط ایک نشست کا فرق رکھا جائے۔ یعنی آخری فالتو نشست مسلمانوں کو دی جائے۔ مثلاً اگر دو سو ایک نشستیں مقرر کی جائیں تو ایک سو ایک نشست مسلمانوں کو دی جائے۔ اور اگر ایک سو پچہتر نشستیں مقرر ہوں تو ان میں سے اٹھاسی مسلمانوں کو دی جائیں۔ ستاسی نشستیں غیر مسلموں کو، اور حلقہ ہائے انتخاب مخلوط رکھا جائے۔

مسلم راج کی رٹ:

مگر راجہ نرندر ناتھ اور گوکل چند نارنگ ایک طرف اور سردار اجل سنگھ دوسری طرف اس تجویز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

پنجاب کے صوبے میں ایک مسلم نشست کی اکثریت بھی منطقی حیثیت سے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے کیسے قابل قبول ہوسکتی تھی۔ جب کہ وہ تجاویز دہلی کو مسترد کرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو بھی رد کر چکے تھے۔ ان کو تو پنجاب میں ایک مسلم نشست کی زیادتی بھی ظالمانہ اور مسلم راج نظر آتی تھی۔ چناں چہ ملک کے طول و عرض میں تقریروں اور تحریروں کا ٹھاٹھیں مارتا وہ سمندر امڈ آیا۔ جس نے صاف صاف کہہ دیا کہ پنجاب میں مسلم راج قائم نہیں ہوسکتا۔ پنجاب کا ہندو اور

سکھ کٹ مرے گا لیکن پنجاب میں مسلم راج قائم نہیں ہونے دے گا۔''

ہندو کا مذہبی اور سیاسی تعصب مسلمانوں کے جذبہ حریت کو تو مجروح نہ کر سکا۔ البتہ ایسے زخم ضرور آئے جس سے دونوں قوموں کے اتحاد باہمی کا خواب پھر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

غیر مسلموں کی انہی حرکات کے باعث مسلمانوں کا وہ طبقہ جو آزادی وطن کے لیے ہمیشہ ہندو کے ساتھ رہا اپنی الگ تنظیم قائم کرنے پر مجبور ہوا۔ ورنہ پیشتر ازیں انہی لوگوں نے ہندوؤں کے دوش بدوش غیر ملکی غلامی کا جوا اتارنے کے لیے فرنگی حکمرانوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔

(کاررواں احرار، ج ۱)

۲۹ رد سمبر ۱۹۲۹ء: ۲۹ رد سمبر ۱۹۲۹ء تحریک خلافت کے خاتمے پر پنجاب کے انقلاب پسند مسلمانوں نے آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے نام سے ایک جماعت قائم کی اس کا تاسیسی اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس کے بانیوں میں چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں اور غازی عبدالرحمٰن شامل تھے۔

احرار اسلام کے قیام کے محرکین میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اور ایک دوسری روایت کے مطابق مولانا انور شاہ کشمیری کا نام لیا جاتا ہے۔ (احرار اور کانگریس، مولانا محمد رفیق اختر، لاہور، ۱۹۸۵ء صفحہ ۴۶)

مجلس احرار اسلام کے مقاصد قیام:

۱۔ برصغیر سے انگریزوں کا انحصار اور فرنگی اقتدار کا خاتمہ۔
۲۔ سیاسی اور غیر سیاسی معاملات میں مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی رہنمائی۔
۳۔ مسلمانوں کے مذہبی وقومی حقوق کا حصول اور ان کا تحفظ۔
۴۔ فتنۂ مرزائیت کا تعاقب اور سرکوبی۔
۵۔ مسلمانوں کی سماجی، اخلاقی اور معاشی اصلاحات کے لیے جدوجہد۔
۶۔ مزدوروں اور کسانوں کی اقتصادی اصولوں پر تنظیم۔
۷۔ دیسی مصنوعات کی ترقی اور سودیشی اشیاء کی ترویج کے لیے جدوجہد۔
۸۔ خدمت قوم وملت کے لیے جیش احرار اسلام کے نام سے مسلمان نوجوانوں کی تنظیم

(صفحہ ۵۵، ایضاً)

مجلس احرار اسلام کی تاریخ قیام اور خدمات کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے، تاریخ احرار از مفکر احرار امیر افضل حق، ناشر مکتبہ مجلس احرار اسلام پاکستان، ملتان، ۱۹۶۸ء۔

۱۹۳۰ء

یکم جنوری ۱۹۳۰ء: کانگریس کے چوالیسویں سالانہ اجلاس کے موقع پر یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو لاہور میں انقلاب زندہ باد کے نعروں کی گونج میں آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرایا گیا، آزادی کا اعلان نامہ پڑھ کر سنایا گیا اور ۲۶ رجنوری کو ہر سال یوم آزادی منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ (سکسٹی ایئرس آف کانگریس، ص ۲۹۴۔۲۹۳)

کلوار خانہ کی آمدنی:

۱۴ رجنوری ۱۹۳۰ء: صوبۂ مدارس کی حکومت نے ۲۹......۱۹۲۸ء میں محکمۂ آبکاری پر تقریباً ۱۷ کروڑ روپیہ خرچ کیا، اور اس محکمہ کی آمدنی کچھ اوپر پانچ کروڑ ہوئی۔ گویا پونے بارہ کروڑ کا خسارہ رہا! اور یہ رقم صوبہ کی مال گذاری کی آمدنی سے، بقدر چار کروڑ کے زیادہ ہے!
(ینگ انڈیا، ۲۶ ردسمبر ۲۹ء)

یہ اعداد صرف مالی پہلو کے متعلق ہیں۔ باقی اس سرکاری کلوار خانہ سے، سترہ کروڑ کے شاہانہ خرچ سے کتنے انسان بدست ہو کر نکلے، اور ان بدمستوں کے ہاتھ سے کتنے جرائم، کتنی چوریاں، کتنی بدمعاشیاں سرزد ہوئیں، خالق اور مخلوق کے کتنے حقوق تلف ہوئے، ان کے اعداد کا پتا ممکن ہے آج کسی سرکاری رجسٹر سے نہ چلے، لیکن ''کل'' جب ہر راز آشکار ہو کر رہے گا، اس وقت اللہ کے فرشتوں کے دفتروں اور رجسٹروں کے اعداد کا کیا جواب ہوگا؟ اور اس وقت کتنے انسان ہی کے نہیں، کتنے مسلمانوں کے، کتنے فرزندان توحید کے، کتنے شافع محشر کے امتیوں کے نام، اس عظیم الشان کلوار کانہ کے سرپرستوں، قدردانوں، دلالوں، اور چاکروں کی سیاہ اور شرمناک فہرست میں درج نظر آئیں گے؟ (سچ لکھنؤ۔ ۱۳ رجنوری ۱۹۳۰ء)

وفاداریوں کے انعام:

پچھلی جنگ عموی میں، جو ہندوستان سے نہیں، برطانیہ و جرمنی سے زر و زمین کی رقابتوں کی

بناپر برپا ہوئی تھی، ہندوستان کو اپنے ہاں سے ۱۴۰۱۳۵۰ آدمی، اور ۱۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ یا ڈیڑھ ارب روپیہ کا نذرانہ دینا پڑا تھا، اور اسی قدر رقم قرضۂ جنگ وغیرہ کے مختلف ناموں سے اور وصول کی گئی تھی۔ (ماخوذ از خطبۂ صدارت استقبالیہ، کانگرس ص ۲۹ ء لاہور)

خوب سمجھ لیجیے۔ آدمی دس بیس ہزار نہیں، لاکھ دو لاکھ بھی نہیں، کچھ اوپر چودہ لاکھ! اور روپیہ لاکھ دو لاکھ نہیں، کروڑ دو کروڑ بھی نہیں، پورا تین ارب، جس کے تین سو کروڑ ہوتے ہیں!! یہ سب آپ نے دیا، اور اس کے صلہ میں آپ کو ملا کیا؟ رولٹ ایکٹ پاس ہو گیا، جلیانوالہ باغ میں آپ پر گولیاں برسائی گئیں، جیل خانے آباد ہوئے، نظر بندیاں اور گرفتاریاں شروع ہوئیں، کتنے حبس دوام میں ڈالے گئے، کتنوں نے پھانسیاں پائیں، جاں باز شوکت علی، اور سرفروش محمد علی، پیکر شریعت حسین احمد، اور رہبر طریقت غلام مجدد، چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح جیل خانوں میں بھرے گئے، اور وہ سب کچھ ہولیا جسے ہم اور آپ سب، دس برس سے برابر دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس پر بھی ایک جماعت ہمارے ہی اندر موجود ہے، جسے اس پر حیرت ہے، کہ لوگ آزادی مطلق اور حریت کاملہ کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور سرکار فیض آثار کے ساتھ اپنے تعلقات عبودیت و پرستاری سے مطمئن نہیں رہتے!

...... ''نیکی کا بدلہ نیک ہے'' سنتے ہیں کہ دنیا کا دستور ہمیشہ سے چلا آتا ہے، فرنگی عہد حکومت نے جس طرح صدہا پرانے اصول اور دستور مٹا دیے، کیا اس دستور کو بھی ''تقویم پارینہ'' کے حکم میں رکھ دیا ہے؟ (سچ لکھنؤ۔ ۱۴۔ جنوری ۱۹۳۰ء)

۱۷ر جنوری ۱۹۳۰ء: اس تاریخ کو شارد ا ایکٹ کے خلاف تمام ہندوستان میں یوم احتجاج منایا گیا اور جلسے کیے گئے جن میں پرزور تقریریں کی گئیں، حکومت کے خلاف قراردادیں پاس کی گئیں۔ اس ایکٹ کو دین میں مداخلت قرار دیا گیا ہے اور اسے واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا۔ جمعیت علمائے ہند کے صدر مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے ایک زبردست مضمون شاردا ایکٹ کے خلاف لکھا ہے۔ جسے مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیت علمائے ہند نے اقبال پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع بھی کر دیا ہے اس مضمون کی تاریخ تحریر ۷ر نومبر ۱۹۲۹ء ہے۔

۲۵ر جنوری ۱۹۳۰ء: ۲۵ر جنوری کو وائسرائے نے اسمبلی میں جو تقریر کی وہ یوم آزادی کی کامیابی میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ کیوں کہ وہ لوگ بھی جو ابھی کچھ نہ کچھ آس حکومت پر لگائے بیٹھے تھے، بالکل مایوس ہو گئے، ہم اس سے پیشتر بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح وائسرائے، مسٹر

رامزے میکڈانلڈ اور مسٹر ویجوڈ بین بار بار انھی الفاظ کو دہراتے تھے جن میں ظاہر کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ ہندوستانی لوگوں کی رائے اور مشورے سے دستور اساسی تیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مگر کسی شخص نے بھی درجۂ نو آبادیات کے آئین کے متعلق کوئی خاص وعدہ نہ کیا اور لائڈ جارج نے بھی دار العوام میں مسٹر بین کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا کہ گول میز کانفرنس میں صرف درجہ نو آبادیات پر غور کیا جائے گا۔ لیکن جو ذرائع اس کے حصول کے ہیں ان کا حل پیش نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستانی لیڈروں کے مختلف بیانات کے باعث بعد میں، وائسرائے نے پھر اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''بیان میں ایک راستہ دکھادیا ہے اور اس کی منزل کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن ابھی اس سفر کو ختم کرنے کے لیے نہیں کہا گیا'' لارڈ اردن نے مسٹر بین کے اس بیان کے متعلق بھی اظہار خیال کیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان میں درجہ نو آبادیات کا آغاز ہوگیا ہے لارڈ اردن نے اپنی تقریر کے دوران کہا:

''یہ صحیح ہے کہ دوسری نو آبادیات سے تعلقات کے باعث ہندوستان میں سیلف گورننگ نو آبادیات کے سے آثار پیدا ہوں گے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہندوستانی سیاسی آرا ان مراعات کو کوئی وقعت نہیں دیتی کیوں کہ ان کے خیال میں عملی طور پر یہ سب برطانوی کنٹرول اور منظوری کے ماتحت ہیں۔

''ملک معظم کی حکومت جو کانفرنس طلب کر رہی ہے یقیناً وہ کانفرنس نہیں جس کے متعلق کہا گیا کہ ہندوستانی نمائندوں کی اکثریت سے جس دستور اساسی کی اسکیم منظور ہو جائے وہ پارلیمنٹ بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے قبول کرلے بلکہ یہ کانفرنس صرف ملک معظم کی حکومت کو اس کے فیصلے میں امداد دینے کے لیے ہوگی اور تجاویز اور اسکیم وغیرہ بنانے کی ذمہ داری اسی پر ہوگی جو بعد میں پارلیمنٹ میں پیش کی جائے گی۔

وائسرائے نے اپنی تقریر میں واضح کر دیا کہ اپنا انتظام آپ کرنے (سیلف گورننگ) کا سوال بالکل بے معنی سا ہے۔ بلکہ ہندوستان کو وہی کچھ ملے گا جو انگلستان دینا چاہے گا۔ ہندوستانی آرا اور پبلک کے جذبات کو بالکل ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔ ہندوستانی نمائندوں کو محض مشورہ کے لیے طلب کیا جائے گا۔ ان مشوروں کی کتنی وقعت اور حقیقت ہوگی اس کا اندازہ بھی لارڈ اردن کی تقریر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وائسرائے کی اس تقریر کے جواب میں مہاتما گاندھی نے ''ینگ انڈیا'' میں لکھا:

''وائسرائے کانگریسیوں کے شکریہ کے مستحق ہیں کیوں کہ انھوں نے پوزیشن کو بالکل صاف کر کے ان کو ان مخمصوں سے نجات دلا دی ہے۔ جن میں وہ عرصے سے پھنسے ہوئے تھے اب انھیں بخوبی معلوم ہوگیا ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔''

''میرے خیال میں وائسرائے درجہ نوآبادیات کے لیے اس وقت تک انتظار کرنا بُرا نہ سمجھیں گے جب تک کہ ہندوستان کے بچے کھچے چند لکھ پتی بھی سات پیسے روز کمانے کی پوزیشن تک نہ پہنچ جائیں اور آج سے کانگریس ہر ایک کسان اور مزدور کو اس درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرے گی جس سے وہ ایک لکھ پتی کے برابر روزی کمانے کے قابل ہو سکے اور جس وقت کسان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس کی قسمت نے اسے اس قابل رحم اور بری حالت تک نہیں پہنچایا بلکہ اس کی ذمہ دار موجودہ حکومت ہے تو وہ آئینی اور غیر آئینی تشدد اور عدم تشدد کے ذرائع کی تمام تمیز و تخصیص بھول جائے گا۔ کانگریس کسانوں کو ''صراط مستقیم'' کی طرف رہنمائی کرنے کی توقع رکھتی ہے'' اس کے بعد مہاتما جی نے وائسرائے کو ذیل کی پیش کش کی:

(۱) نشی اشیا کا مکمل طور پر ممنوع قرار دیا جانا۔

(۲) شرح تبادلہ ۱۸ پنس کی بجائے ۱۶ پنس

(۳) مالیہ زمین میں پچاس فی صدی تخفیف اور لیجس لیٹو کنٹرول میں کرنا۔

(۴) محصول نمک کی تنسیخ۔

(۵) فوجی اخراجات میں کم از کم پچاس فی صدی تخفیف۔

(۶) اعلیٰ اسامیوں کی تنخواہوں میں نصف کی کمی یا جو تخفیف شدہ مالیۂ زمین کے متناسب ہو۔

(۷) غیر ملکی کپڑے پر حفاظتی محصول۔

(۸) کوسٹل ٹریفک ریزرویشن بل کا راستہ۔

(۹) قتل کے ملزموں کے علاوہ تمام سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی تمام ہندوستانی جلا وطنوں کی واپسی کی اجازت اور دفعہ ۱۲۴ (الف) کے ماتحت چلائے گئے تمام مقدمات کی واپسی۔

(۱۰) محکمہ سی آئی ڈی کو توڑ دیا جائے۔

(۱۱) آتشیں اسلحہ کے لیے عام لائسنس جاری کیے جائیں۔

یہ شرائط مہاتما گاندھی نے صلح کے لیے پیش کیں۔ ان کو منظور نہ کرنے کی صورت میں جنگ یقینی تھی۔ (تواریخ کانگریس، ص ۲۰۲۔۶۰۲)

اعلان آزادی:

۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء: ۲ر جنوری کو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۲۶ر جنوری کو

"یوم آزادی" منایا جائے۔

۲۶ر جنوری کو جو اعلان پڑھا گیا وہ حسب ذیل ہے:

ورکنگ کمیٹی نے پورن سوراجیہ ڈے کے دن ہندوستان کے تمام شہروں میں جلسوں کے موقع پر ذیل کا ریزولیوشن پاس کیا ہے:

"ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان کو بھی دوسری تمام اقوام کی مانند آزادی کی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہو کر اپنی محنتوں کا پھل حاصل کرنے کا حق حاصل ہے، تاکہ اس کے لوگوں کی زندگی خاطر خواہ نشوونما پا سکے، اور ہم اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ جو حکومت لوگوں کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم رکھتی ہے۔ وہ اسے تبدیل یا ختم کرنے میں حق بجانب ہیں۔ برطانوی گورنمنٹ نے نہ صرف ہندوستانی لوگوں کو ان حقوق سے ہی محروم کر دیا ہے۔ بلکہ اس کی لوٹ نے اسیں سیاسی، اقتصادی، روحانی اور اخلاقی طور پر بھی تباہ کر دیا گیا ہے۔ ہم لوگوں سے جو مالیۂ زمین وصول کیا جاتا ہے وہ ہماری آمدنی سے بہت زیادہ ہے۔ ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روزانہ ہے۔ لیکن اس مفلسی اور تباہ حالی میں ۲۰ فی صدی مالیۂ زمین اور تین فی صدی نمک کا ٹیکس بڑھا دیا گیا ہے اور یہ تمام کا تمام بار غریب اور مفلس طبقے کی کمر توڑ رہا ہے۔"

"گھریلو صنعتیں اور خصوصاً دستی پا[illegible]۔ بافی کی صنعت کو تو بالکل تباہ کر کے بچارے کسانوں کو چار ماہ تک بیکار کر دیا ہے اور دوسرے ممالک کی طرح ان صنعتوں کو تباہ کر کے کوئی اور چیز ان کے بدل کے طور پر پیش نہیں کی گئی۔"

"محصولات اور کرنسی کی پالیسی نے ہندوستانی کسانوں پر ایک اور ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا ہے۔ برطانوی مال ہماری درآمد کا سب سے بڑا حصہ ہے اور اس برطانوی مال کو ہندوستان میں کھپانے کے لیے خاص سلوک روا رکھا جاتا ہے اور غریب کسانوں سے جو مالیۂ زمین وصول کیا جاتا ہے وہ ان کی بہتری کی بجائے ملک کے غیر ضروری ایڈمنسٹریشن کی فضول خرچیوں

میں صرف کیا جارہا ہے۔ اسی پر بس نہیں شرح تبادلہ سے کروڑوں روپیہ ہندوستان کی جیبوں سے ہر سال نکالنے کا اور راستہ اختیار کر لیا گیا ہے۔''

''سیاسی طور پر ہندوستان کا مرتبہ کبھی اتنا نیچے نہیں گرا جتنا کہ برطانوی عہد حکومت میں، اصلاحات میں ہندوستان کو مطلقاً کوئی سیاسی اختیارات نہیں دیے گئے۔ ہمارے معزز ترین آدمی کو بھی غیر ملکی اختیارات اور طاقت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ ہمیں تحریر و تقریر اور جلسوں کی آزادی سے محروم کر دیا گیا اور آج ہمارے کئی قابل ترین ہم وطنوں کو غیر ممالک میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہے۔ تمام انتظامی قابلیت ضائع کر دی گئی ہے اور معمول دیہاتی عہدوں اور محرری سے ہندوستانی عوام کی تسلی کر دی گئی ہے۔ ہماری پرانی..... تہذیب کو تباہ کر دیا گیا ہماری تعلیم اور ہماری تربیت غلامی کی زنجیروں کو مضبوط تر بنانے میں ثابت ہو رہی ہے۔''

''غیر مسلح کر کے ہمیں روحانی طور پر بالکل تباہ کر دیا گیا ہے ہماری مزاحمت کی اسپرٹ کو کچلنے کی انتہائی سعی کی گئی ہے اور اس بے سروسامانی نے ہمیں سوچنے کے لیے مجبور کر دیا ہے کہ ہم اپنی حفاظت آپ کرنے کے ناقابل ہیں۔ ہم بیرونی حملوں سے اپنے ملک اور اپنے وطن کو نہیں بچا سکتے۔''

''ہم سمجھتے ہیں کہ اس گورنمنٹ کے ماتحت رہنا جس نے ہمیں اور ہمارے وطن کو اس طرح تباہ و برباد کر دیا ہے گناہ اور گناہ عظیم ہے اور اگر ہم نے آزادی کی کوئی کوشش نہ کی تو خدا ہم سے ناراض ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ آزادی حاصل کرنے کا موثر ترین طریقہ تشدد نہیں اس لیے ہم حتی الامکان پوری پوری سعی برطانوی گورنمنٹ سے تعلقات منقطع کرنے اور سول نافرمانی کی تیاری کے لیے کریں گے۔ اس میں عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم بھی شامل ہوگی۔ اگر ہم بغیر کسی تشدد کا اظہار کیے عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم کو کامیاب بنالیں تو اس غیر منصفانہ حکومت اور راج کا خاتمہ یقینی ہے۔ اس لیے ہم کانگریس کی ہدایات پر جو وقتاً فوقتاً پورن سوراجیہ کے حصول کے لیے جاری ہوں گی عمل کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔'' (تواریخ کانگریس، ص ۶۰۱ - ۵۹۹)

نمکین ستیہ گرہ:

۱۴ تا ۱۶ ر فروری ۱۹۳۰ء: ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقعے پر حکومت برطانیہ کو نہرو رپورٹ کے منظور کرنے کا جو چیلنج دیا گیا تھا۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو اس نوٹس کی میعاد ختم

ہوگئی۔ مگر برطانوی حکومت نے نہرو رپورٹ کی منظور کردہ تجاویز کو قابل قبول نہ سمجھ کر اسے رد کر دیا۔ تو کانگریس نے نہرو رپورٹ کی بجائے فرقہ وارانہ فیصلے کا حل صرف مکمل آزادی میں سمجھا اور اس کے لیے لاہور کے سالانہ اجلاس میں مکمل آزادی کا ریزولیوشن منظور کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی تھی۔

اس دوران مسلم لیگ، کانگریس اور برطانوی حکومت کے مابین کافی دیر گفتگو اور خط و کتابت رہی۔ لیکن غیر ملکی غلامی سے اکتائے ہوئے ذہن اور گذشتہ سالوں کی جدوجہد آزادی نے برطانیہ کے خلاف ایسی آگ بھڑکائی کہ لڑائی کے بغیر اس کا کوئی دوسرا حل نہیں تھا۔

کانگریس نے حکومت سے پرامن جنگ سے پیشتر ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو ہندوستان بھر میں اپنی جدوجہد کا ایک اہم دن منایا۔ اس دن ملک بھر میں انگریزی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی لڑائی کا عملی آغاز کیا۔

۲۷ر فروری ۱۹۳۰ء: گاندھی جی نے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کہا ہے:

''سول نافرمانی شروع کرنے کے بعد میری گرفتاری یقینی ہے اس لیے اسباب پر غور کرنا ضروری ہے۔ کہ اس واقعے کے بعد کیا ہونا چاہیے۔

میں نے ۱۹۲۲ء میں اپنی گرفتاری سے پیشتر عوام کو کسی قسم کا مظاہرہ کرنے سے منع کر دیا تھا اور ان سے اپیل کی تھی کہ وہ مکمل طور پر جذبۂ عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے سول نافرمانی کی مہم کو آرگنائز کریں اور کسی صورت میں بھی کانگریس کے تعمیری پروگرام کو نظر انداز نہ ہونے دیں۔ پرماتما کا شکر ہے کہ میری ہدایات کے پہلے حصہ پر تو نہایت خوبی سے عمل کیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ میری گرفتاری پر انگریزوں کی طرف سے کہا گیا کہ ''ایک کتا تک نہ بھونکا'' لیکن اگر میری گرفتاری پر کتے بھونکتے، اور تشدد کا مظاہرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ میرے لیے تو اس کا تصور کرنا ہی حماقت اور بیوقوفی کے مترادف ہے۔''

''ہمیں اب مستقبل قریب کے متعلق سوچنا چاہیے اس دفعہ میری گرفتاری پر ہندوستان کے کسی باشندے کو بھی جو عدم تشدد میں عقیدہ رکھتا ہے خاموش نہیں بیٹھا رہنا چاہیے بلکہ اپنی پوری پوری سرگرمی سے غلامی کی مزاحمت کرنا اس کا فرض اولین ہوگا۔'' (تواریخ کانگریس، صفحہ ۶۲۷)

وائسرائے کے نام گاندھی جی کا خط

ستیہ آگرہ آشرم سابرمتی

۲؍مارچ ۱۹۳۰ء:

پیارے دوست!:

''سول نافرمانی کے اجرااور اس خطرے میں داخل ہونے سے پیشتر جس سے کہ میں کئی سال بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں میں آپ تک پہنچنا ضروری تصور کرتا ہوں۔

''میرا ذاتی عقیدہ بالکل واضح ہے میں کسی زندہ چیز کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا خواہ وہ ایسے انسان ہوں جنھوں نے مجھے زیادہ سے زیادہ نقصان ہی کیوں نہ پہنچایا ہو اور باوجود اس حقیقت کے کہ میں انگریزی حکومت کو ایک لعنت سمجھتا ہوں میں نہ تو کسی انگریز کو اور نہ ہی اس کے جائز مفاد کو نقصان پہنچانے کا طالب ہوں۔ میرے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہنی چاہیے۔ گو میں انگریزی حکومت کو لعنت سمجھتا ہوں۔ مگر میں انگریزوں کو عام طور پر دنیا کی دیگر اقوام سے برا نہیں سمجھتا۔ اور کئی انگریز میرے عزیزترین دوست ہیں اور مجھے برطانوی حکومت کی برائیاں بھی انگریز دوستوں کی تحریروں سے معلوم ہوئی ہیں۔ جنھوں نے حق وصداقت کو ظاہر کرنے میں کبھی کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا۔

''اب آپ سوال کریں گے کہ میں برطانوی حکومت کو لعنت کیوں سمجھتا ہوں؟''

''اس حکومت نے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان انسانوں کو ایڈمنسٹریشن کے فضول سسٹم اور فوج کے غیر معمولی اخراجات سے مفلس وقلاش بنا دیا ہے اور ان پر ان اخراجات کا ایسا بار ڈالا ہے جو ہندوستان جیسے ملک کے لیے ناقابل برداشت ہے۔''

''اس نے سیاسی طور پر ہمیں پاتال میں پھینک دیا ہماری تہذیب اور پرانی سمتیا کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور غیر مسلح کرنے کی پالیسی نے تو ہمیں روحانی طور پر بھی ذلیل کر دیا ہے اور اس کے باعث غیر معمولی طور پر بے بس ولاچار اور بزدل بنا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

''اپنے دوسرے کئی ہم وطنوں کے ساتھ میرا بھی خیال تھا کہ گول میز کانفرنس کچھ خوشگوار اور تسلی بخش حل پیش کرے گی۔ لیکن آپ کے یہ کہنے پر کہ آپ یا برطانوی وزارت درجہ نو آبادیات

کے متعلق کوئی خاص وعدہ نہیں کر سکتی۔ گول میز کانفرنس سے کسی قسم کے تسلی بخش نتیجہ کی توقع رکھنا ہی فضول ہے اور نہ ہی اس کے نتائج کسی طرح ہندوستان کے غریب اور مفلس طبقے کو مطمئن کر سکتے ہیں۔ یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ پارلیمنٹ کی منظوری کے متعلق کبھی سوال پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ کئی ایک ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پارلیمنٹ کے فیصلے سے پیشتر ہی برطانوی وزارت نے خاص مواعید کر لیے تھے۔

''دہلی کا انٹرویو کلکتہ کانگریس کے ریزولیوشن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا۔''

''اگر آپ اپنی تقریر میں درجہ نوآبادیات، کا لفظ عجیب معنوں میں استعمال کر سکتے ہیں تو آپ کو آزادی کے لفظ پر خطرہ کا احساس و اظہار نہ کرنا چاہیے۔ کیا برطانوی مدبرین اور سیاستدانوں نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ درجہ نوآبادیات آزادی ہی ہے؟ لیکن خطرہ تو یہ ہے کہ برطانیہ نے کبھی بھی مستقبل قریب میں اس قسم کا درجہ نوآبادیات ہندوستان کو دینے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ لیکن یہ باتیں سب ماضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اعلان کے بعد کئی ایک اور ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں جو برطانوی پالیسی کے رجحان کو صاف ظاہر کر دیتے ہیں۔

''یہ تو ریزولیوشن کی طرح عیاں ہے کہ ذمہ دار برطانوی سیاستدان ہندوستان کے متعلق برطانوی پالیسی میں کسی قسم کی ایسی تبدیلی کرنے کے لیے تیار نہیں جس سے اس کی تجارت پر کوئی اثر پڑے۔ اگر اس تجارتی لوٹ کو ختم کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا تو رہا سہا ہندوستان جلدی ہی تباہ ہو جائے گا۔ ممبر مالیات خود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ۱۶ پنس سے ۱۸ پنس شرح تبادلہ کر کے ایک ہی جنبشِ قلم سے غریب ہندوستان سے کروڑوں روپیہ سالانہ چھین لیا جانے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر اس غیر منصفانہ قوانین کو ختم کرنے کے لیے کوششیں کی جاتی ہیں تو آپ ہندوستان کے امیر طبقے اور زمینداروں سے امداد کی اپیل کرتے ہیں تاکہ اس قانون کے نام پر جو ہندوستان کو پیس رہا ہے، اس کوشش کو کچل ڈالا جائے۔''

''جب تک کہ قومی کارکن اور ملک کی خاطر قربانیاں کرنے والے آزادی کے صحیح و درست مقاصد کو پیش نظر نہ رکھیں خطرہ ہے کہ وہ آزادی جو ہمیں ملے گی ان کروڑوں بے زبان سادہ لوح اور تباہ حال ہندوستانیوں کے لیے مفید نہ ہوگی جن کے لیے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ میں پبلک کو آزادی کے صحیح مفہوم سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کے سامنے بھی چند حقائق اس کے متعلق رکھنے چاہئیں۔

''آزاد ہندوستان میں مالیۂ زمین کے کڑے اور ظالمانہ طریقہ کی کافی اصلاح ہونی چاہیے۔ ہندوستان کا موجودہ مستقل بندوبست کسانوں کو نہیں بلکہ مٹھی بھر زمینداروں کو ہی فائدہ پہنچاتا ہے کہ کسانوں کی حالت ویسی ہی خراب ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ وہ ایک معمولی مزارع سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔''

''نہ صرف مالیۂ زمین ہی کافی حد تک کم ہونا چاہیے بلکہ کسانوں کے مفاد کے پیش نظر تمام ریونیو سسٹم کو ہی تبدیل کرنا ضروری ہے کیوں کہ برطانوی سسٹم تو ان غریب کسانوں کو تباہ کرنے کے لیے بنایا گیا ہے یہاں تک کہ نمک پر محصول لگا دیا گیا ہے جو ان کی روزانہ کی ضروریات کا لازمی جزو ہے محنت و مشقت کے باعث جس کا زیادہ مقدار میں استعمال نہایت ضروری ہے۔ شراب وغیرہ کا ٹیکس بھی ہندوستان کے غریب طبقہ کی جیبوں سے نکالا جا رہا ہے، یہ ان کو جسمانی روحانی اور اخلاقی طور پر تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ انفرادی آزادی کے پردے میں اس کی حفاظت کی جاتی ہے مگر یہ دیدہ دانستہ عائد کیا گیا ہے اور اگر وزرا اس محصول اور ٹیکس کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ کسی تعلیم کے شعبہ کی طرف سے پوری کی جاتی ہے۔ جیسا کہ تجربہ ہو چکا ہے۔ حال آں کہ ہندوستان ایسے ملک میں زیادہ سے زیادہ تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ٹیکسوں کے غیر معمولی بار نے غریب ہندوستانیوں کا کچومر نکال دیا ہے تو گھریلو صنعتوں کی تباہی نے روپیہ پیدا کرنے سے بھی ان کو عاری کر دیا ہے۔

''ہندستان کے نام پر جو قرضہ جات لیے گئے ہیں ان کے بیان کے بغیر اس ملک کی تباہی کی داستان غیر مکمل رہے گی۔ اور ان قرضہ جات کے متعلق پریس میں کافی کہا جا چکا ہے اور آزاد ہندوستان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اس قسم کے قرضہ جات کو ایک زبردست تحقیقات کے بعد ہی قبول کرے اور جو غیر منصفانہ معلوم ہوں ان سے قطعی انکار کر دے مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر بھی باک نہیں ہے کہ ہندوستان میں برطانوی ایڈمنسٹریشن دنیا کے تمام نظام ہائے حکومت سے مہنگی ہے۔ اپنی تنخواہ ہی کو لیجیے یہ اکیس ہزار ماہوار ہے الاونس وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ آپ غور کیجیے کہ برطانوی وزیراعظم پانچ ہزار پونڈ سالانہ یعنی ۵۴۰۰ روپے ماہوار کے قریب تنخواہ پاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں آپ ۷۰۰ سو روپے روزانہ حاصل کر رہے ہیں۔ حال آں کہ ہندوستان کی روزانہ اوسط آمدنی دو آنے سے بھی کم ہے۔ برطانیہ کا وزیراعظم برطانوی لوگوں کے دو روپیہ اوسط آمدنی کے مقابلہ میں صرف ۱۸۰ روپیہ ماہوار لیتا ہے، اس طرح آپ ہندوستانی اوسط آمدنی سے

پانچ ہزار گنا زیادہ تنخواہ لے رہے ہیں اور برطانوی وزیراعظم وہاں کے لوگوں کی آمدنی سے صرف نوے گنا زیادہ۔ میں گھٹنے جھکاتے ہوئے آپ سے ان حالات پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ میں نے ایک تکلیف دہ حقیقت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں آپ کے لیے ایک زبردست جذبۂ احترام رکھتا ہوں۔ میرا مقصد آپ کے جذبات کو تکلیف دینا نہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کو اس تنخواہ کی ضرورت نہیں جو آپ حاصل کر رہے ہیں۔ اور غالباً آپ کی تمام تنخواہ ہی خیراتی کاموں میں صرف ہوتی ہے لیکن جس سسٹم کے ذریعہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ اس کی مذمت کرنا نہایت ضروری ہے۔ جو کچھ وائسرائے کی تنخواہ کے متعلق صحیح ہے وہی ایڈمنسٹریشن کی دوسری باتوں کے متعلق بھی درست ہے۔''

''مالیۂ زمین میں تخفیف کرنے کے لیے ایڈمنسٹریشن کے اخراجات میں بھی اسی قدر تخفیف اور کمی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی تمام اسکیم ہی تبدیل کرنی پڑے گی اور بغیر آزادی کے یہ تبدیلی ناممکن ہے چناں چہ ان لاکھوں لوگوں نے جنھوں نے ۲۶ جنوری کو مظاہروں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا آزادی اسی ناقابل برداشت بار سے نجات کا نام ہے۔ لیکن میرے اپنے خیال میں برطانیہ کا کوئی باشندہ بھی ہندوستانی لوٹ کو بند کرنا نہیں چاہتا جس سے وہ روز بروز زیادہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔''

''بہر حال اگر ہندوستان کو ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے اور اگر ہندوستانی لوگوں کی فاقہ مستی کا خاتمہ ہونا ہے تو اس کے لیے فوری حل کی ضرورت محسوس ہوگی۔ مجوزہ کانفرنس ہرگز ہرگز اس فاقہ مستی کا علاج نہیں۔ اس کے لیے دلائل و براہین کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ برطانیہ اپنے تجارتی مفاد کو ضرور ہندوستان پر ترجیح دے گا اور ہندوستان اس موت کے پنجہ سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔''

اس میں انکار نہیں ہوسکتا انہیں وجوہات کے باعث تشدد پیدا ہو رہا ہے خواہ وہ کتنا ہی غیر منظم کیوں نہ ہو لیکن تشدد حصول مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ ہی یہ لاکھوں اور کروڑوں فاقہ مست ہندوستانیوں کی تکالیف ہی کا حل کر سکتا ہے اور روز بروز میرا عقیدہ راسخ ہوتا جا رہا ہے کہ حکومت کی جابرانہ پالیسی اور غیر معمولی سخت گیری کو صرف عدم تشدد ہی روک سکتا ہے اور خاموشی اور سکوت اختیار کر لینے کے معنی ان بردہ طاقتوں کو ترقی دینا ہے اور ان حقیقتوں کو جانتے ہوئے اور عدم تشدد کی طاقت کا اندازہ ہوتے ہوئے بھی انتظار کرنا میرے خیال میں گناہ ہے۔

''عدم تشدد کا اظہار سول نافرمانی کے ذریعے کیا جائے گا۔ جو فی الحال آشرم کے مکینوں تک ہی محدود رہے گی لیکن آہستہ آہستہ ہندوستان بھر کے ان تمام احباب کی طرف سے شروع ہو جائے گی جو ایسا کرنا چاہیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ سول نافرمانی کے اجرا سے میں ایک زبردست خطرہ میں داخل ہو رہا ہوں کہ صداقت کی فتوحات بغیر خطرے کے نہ حاصل ہوئی ہیں اور نہ کبھی ہوں گی اور جو قوم عرصے سے دوسری قوم کے غلبہ میں ہو جس سے وہ کسی صورت میں بھی کم مہذب نہ ہو اس کے لیے یہ خطرہ لینا ضروری ہے۔''

''میں نے دیدہ دانستہ تبدیلی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ میں عدم تشدد کے ذرائع اور عقائد سے انگریز لوگوں میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر کے انھیں صحیح صورت حالات دیکھنے کے لیے مجبور کر دوں گا۔ میں آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتا اور میں ان کی اسی طرح خدمت کرنا چاہتا ہوں جس طرح کہ اپنے ہم وطن بھائیوں کی اور مجھے یقین ہے کہ میں نے ان کی ہمیشہ خدمت کی ہے۔ اور خصوصاً ۱۹۱۹ء تک تو بالکل بغیر سوچے سمجھے ان کی خدمت میں مصروف رہا ہوں۔ لیکن جب میرے سامنے عدم تعاون کا مسئلہ پیش ہوا تو اس وقت بھی یہ جذبہ نظر انداز نہ ہوا اور میں نے حکومت کے خلاف وہی ہتھیار اٹھایا جو میں نے ایسے موقع پر اپنے خاندان کے ممبروں کے خلاف ہمیشہ کامیابی سے استعمال کیا ہے اور اگر مجھے اپنے ہم وطنوں کے برابر ہی آپ کے لوگوں سے بھی محبت ہے تو وہ بہت عرصہ تک پوشیدہ نہیں رہے گی۔ اور وہ بالآخر اس کا اعتراف کریں گے۔

''سول نافرمانی کے ذریعے ان برائیوں کا مقابلہ کرنا ہے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اگر ہم برطانیہ سے اپنے تعلقات منقطع کرنا چاہتے ہیں تو وہ انھی عیوب اور نقائص کے باعث اور اگر یہ تمام عیوب و نقائص دور ہو جائیں گے۔ تو پھر راستہ نہایت آسان ہو جائے۔ اور دوستانہ گفت و شنید کے ذرائع پیدا ہو جائیں۔ اگر ہندوستان سے برطانوی تجارت حرص و آز سے مبرا ہے تو اسے ہماری آزادی کو تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے میں آپ سے مؤدبانہ طور پر درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان تمام برائیوں کو دور کر کے مساوی حیثیت سے گفت و شنید کرنے کے لیے کانفرنس کی راہ صاف کر دیں۔ آپ نے غیر ضروری طور پر ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل پر زور دیا ہے۔ گو یہ مسائل نہایت اہم اور ضروری ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ اہم معاملات پر کبھی آپ نے غور کرنے کی سعی ہی نہیں کی۔ اور اگر آپ مذکورہ بالا برائیوں کو دور کرنے

کا کوئی ذریعہ نہیں دیکھتے اور میری چھٹی کا آپ پر مطلقاً اثر نہ ہو تو میں اسے اس ماہ کی گیارہ تاریخ کو اپنے آشرم کے ساتھیوں کے ہمراہ سمندر کے کنارے قانون نمک کو توڑنے کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ میں اس ٹیکس اور محصول کو سب سے زیادہ غیر منصفانہ سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ اس محصول نے غریب طبقہ پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا ہے۔ اس لیے ابتدا اسی سے ہونی چاہیے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ہم عرصۂ دراز سے آپ کی اس اجارہ داری کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور اس کے خلاف کوئی مہم جاری نہیں کی۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے گرفتار کر کے آپ میری اسکیموں کو ناکام کر سکتے ہیں'' میں ہرگز آپ کو غیر ضروری طور پر تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر ان مسائل پر آپ تبادلہ خیالات اور بحث کرنے کے لیے تیار ہوں تو میں آپ کا تار موصول ہونے پر میں اس چھٹی کی اشاعت کو ملتوی کر سکتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ میرے راستہ میں تاخیر پیدا کرنے کی اس وقت تک کوشش نہ کریں گے جب تک کہ میری چھٹی میں بیان کردہ برائیوں کو دور کرنے کا ارادہ آپ کے دل میں پیدا نہ ہو۔''

''یہ چھٹی کسی قسم کی دھمکی کی مظہر نہیں ہے بلکہ وہ ایک فرض کے طور پر لکھی گئی ہے جو ایک سول نافرمانی کے لیے ضروری ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کہ میں اس چھٹی کو ایک انگریز دوست کے ذریعے بھیج رہا ہوں۔ جو ہندوستانی کاز میں یقین اور عدم تشدد میں پورا پورا عقیدہ رکھتے ہیں اور جسے تقدیر نے شاید اسی خاص مطلب کے لیے یہاں بھیج دیا ہے۔

میں ہوں آپ کا مخلص دوست

ایم۔ کے گاندھی۔

یہ چھٹی نوجوان انگریز مسٹر ایجی نلڈز ریناالڈز کے ذریعہ وائسرائے کو بھیجی گئی تھی۔

نمک ستیہ گرہ

۱۲ر مارچ ۱۹۳۰ء: آخر حکمران اور غلام ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

۱۲ر مارچ ۱۹۳۰ء: کو گاندھی جی ہاتھ میں بانس کی ایک چھڑی لے کر ۷۹ رضا کاروں کی معیت میں اپنے آشرم سابرمتی سے سول نافرمانی کے لیے ڈانڈی کی طرف روانہ ہوئے۔ (ڈانڈی سمندر کے کنارے دو سو میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے) اور اپنے بعد عباس طیب جی کو اپنا جانشین مقرر کیا اور ساتھ ہی انھوں نے ہندوستان سے اپیل کی کہ وہ اپنے بدن پر کھدر استعمال کریں۔ اور

اخبارات کے نمایندوں کے جواب میں انھوں نے کہا:

''برطانوی حکومت ہندوستان کی جسمانی، اقتصادی، روحانی، مالی اور اخلاقی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اور میں اس نظام حکومت کو تباہ کرنے کے لیے نکلا ہوں۔ میں نے بادشاہ کی وفاداری خود کی تھی۔ اور لوگوں کو اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی تلقین خود کی تھی۔ میں سیاسیات میں گفت و شنید اور درخواستوں کا قائل تھا لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس حکومت کو راہ راست پر لانے کے یہ طریقے نہیں ہیں۔ اس حکومت سے بغاوت میرا مذہب اور ایمان ہوگیا ہے۔

ہماری یہ جنگ نہایت پرامن ہے۔ ہم کسی کو قتل کرنے نہیں جا رہے، بلکہ انگریزی حکومت کی لعنت کا دھبہ ہندوستان کے دامن سے دور کرنے جا رہے ہیں۔ اس طرح سے یا تو میری لاش سمندر میں تیرتی نظر آنے گی اور یا پھر میں آزادی حاصل کرکے رہوں گا۔

نمک ستیہ گرہ کا آغاز:

خالق کی ہر شے اس کی مخلوق کے لیے ہے۔ اس پر نہ تو کسی حکمران کو ملکیت کا حق پہنچتا ہے اور نہ ہی کسی قانون کی کوئی قدغن اس پر زیب دیتی ہے۔ ہوا اور پانی کے علاوہ زمین کی پیداوار پر اس کے مالک حقیقی کا ہی اختیار ہے۔ یہ حق اور بھی زیادہ محفوظ ہو جاتا ہے جب کوئی غیر ملکی حکمران اس کو اپنے آئین کے تابع کر کے اس پر ایسی پابندیاں عائد کرے کہ مخلوق خدا کے لیے اس کا حصول مشکل ہو جائے۔

نمک لندن یا یورپ کے کسی شہر سے درآمد نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ فطرت نے انسانی ضرورت کے لیے ہندوستان میں اس کے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ لیکن غلام ہندوستان کے غیر ملکی آقاؤں نے اس ملک کی ہر چیز کو اپنی حاکمانہ جاگیر سمجھ کر اس پر اس قدر ٹیکس یا محصول عائد کیا کہ نمک ایسی عوامی ضرورت کی چیز بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

گاندھی جی نے انگریزوں سے پرامن لڑائی کا آغاز نمک پر ٹیکس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ڈانڈی پہنچ کر سمندر کے پانی سے نمک تیار کر کے اس خلاف انصاف برطانوی قانون کی خلاف ورزی کریں گے۔

حال آں کہ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ سمندر اپنا، پانی اپنا، اور ان سے بنائی جانے والی چیز اپنی۔ لیکن انگریزی قانون کی رو سے یہ بھی جرم تھا۔ (کاروان احرار: ج ا،ص ۹۰_۸۹)

۱۲؍ مارچ ۱۹۳۰ء: مہاتما گاندھی اپنے ۷۱ ساتھیوں کے ہمراہ ۱۲۔ مارچ کو ڈانڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ نظارہ تاریخ ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے یاد رہے گا۔ یہ سنہری حروف میں لکھا جانے کے قابل ہے۔ یہ نظارہ ہمارے سامنے شری رام کی چڑھائی اور پانڈوں کے حملہ کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اس روانگی نے سارے گجرات میں عجیب جذبات پیدا کر دیے۔ گجرات بھر کے لوگوں کے دلوں میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ اس کے اثر کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً تین سو دیہاتی عہدیداروں نے استعفے داخل کر دیے۔ مہاتما جی نے روانگی سے پہلے لوگوں کے مختلف سوالات کے جواب میں کہا تھا ''منتظر رہو میری روانگی کا انتظار کرو۔ منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد آپ پر سب کچھ بخوبی روشن ہو جاوے گا۔'' (تواریخ کانگریس، ص ۶۲۵)

۱۳؍ مارچ ۱۹۳۰ء: گاندھی جی سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ جہاں وہ سمندر کے کنارے نمک بنا کر قانون شکنی سے سول نافرمانی کا آغاز کریں گے۔ ان کے اس اقدام سے ہندوستان میں جوش پیدا ہو گیا ہے اور حکومت پریشانی میں مبتلا ہو گئی ہے۔ نمک ستیہ گرہ کی اس تحریک میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی جوش کے ساتھ شریک ہو گئی ہیں۔

۲۱؍ مارچ ۱۹۳۰ء: ۲۱؍ مارچ کو احمد آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ سول نافرمانی کرنے والوں کے لیے ذیل کی شرائط رکھی گئیں۔

۱۔ میں ہندوستان کی آزادی کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی شروع کردہ تحریک سول نافرمانی میں حصہ لینے کا خواہش مند ہوں۔

۲۔ میں کانگریس کے مکمل آزادی کے کریڈ میں جو جائز اور پر امن ذرائع سے حاصل کی جانے یقین رکھتا ہوں۔

۳۔ میں جیل جانے اور اس مہم میں آنے والی دیگر تمام تکالیف برداشت کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔

۴۔ جیل جانے کی صورت میں میں اپنی فیملی کے لیے کانگریس کے فنڈ سے امداد طلب نہیں کروں گا۔

۵۔ میں اس مہم کے ذمہ دار اصحاب کے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کروں گا۔

(تواریخ کانگریس صفحہ ۶۲۶)

۲۵؍ مارچ ۱۹۳۰ء: روزنامہ تیج دہلی نے سنڈے ٹائمز آف لندن کی اشاعت ۲۵۔ مارچ

۱۹۳۰ء میں مطبوعہ ایک مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

''ہمیں صاف طور پر اس بات کو واضح کر دینا چاہیے کہ انگریز ہندوستان میں بحالی صحت کی غرض سے مقیم نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد روپیہ پیدا کرنا ہے ہم ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا ہمارے مفاد اور مصلحت کے سراسر خلاف ہے۔ ہندوستان میں رہنا اور اپنا مقصد حاصل کرنا ہمارا فرض ہے۔''

سر ولیم جوانسن ہیکس ہوم سیکریٹری انگلستان کہتا ہے:

''ہم نے ہندستان ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے فتح نہیں کیا اور ہم ہندوستان میں ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے نہیں ہیں۔''

۲۸ مارچ ۱۹۳۰ء: اس وقت حکومت ہند کو نمک کے محصول سے، ۷ کروڑ سے زیادہ کا نفع ہوتا ہے۔ اس آمدنی کی صورت یہ ہے کہ نمک کی حرفت حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ جو شخص حکومت سے نمک خریدتا ہے اسے قیمت کے ساتھ ساتھ محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ یعنی جو نمک ہم کھاتے ہیں اس کی قیمت ادا کرتے ہوئے ہم اس کا محصول بھی دیتے ہیں۔ قیمت اور محصول میں کیا تناسب ہے۔ یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ دونوں کی نسبت معلوم ہونے کے بعد ہندوستانیوں کی آنکھیں کھل جانا چاہییں۔ اور انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ ہماری مہربان حکومت ہم پر کتنی مہربان ہے اور کس کس طرح سے ہندوستان کے غریب سے غریب مزدور اور کسان سے روپیہ وصول کرنے کا اسے ملکہ حاصل ہے۔

سرکاری مطبوعات کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ۸۲ پونڈ نمک یعنی ایک من کی قیمت ۱۰ پائی پڑتی ہے۔ یعنی ایک آنہ سے بھی کم تین پیسہ سے صرف ایک پائی زیادہ۔ اس پر ۲۰ آنے محصول عائد ہوتا ہے۔ جس نمک کی قیمت صرف ۱۰ پائی ہے اس پر ۲۴۰ پائی حکومت محصول عائد کرتی ہے۔ اور خریدار سے ۲۵۰ پائی فی من وصول کرتی ہے۔ سیدھا حساب یہ ہے کہ جس چیز کی قیمت ایک پیسہ ہے اس کی قیمت ہم سے ۲۵ پیسے لے جاتی ہے۔ یہ ہے ہماری مہربان حکومت کی مہربانی کا ایک ادنیٰ سا نمونہ۔

اس کے بعد بھی اگر کوئی اللہ کا بندہ حکومت کی سرد مہری کی شکایت کرے تو وہ باغی نہیں تو کیا ہے۔ نمک کا انسانی ضروریات میں ہوا اور پانی کے بعد نمبر آتا ہے۔ اس پر بھی ٹیکس عائد کیا گیا ہے۔ اور ٹیکس بھی پچیس گنا یعنی ۲۴ فیصد۔ اللہ اکبر! لطف یہ ہے کہ یہ ۱۰ پائی فی من نمک نکالنے کی

نہیں ہے بلکہ یہ فروخت کرنے کی قیمت ہے۔ جس سے نمک بنانے والے مزدوروں کو اجرت بھی ملتی ہے۔ ہندوستانی شاید اسے بھی گوارا کر لیتے اگر تمام نمک جو ہندوستان میں صرف ہوتا ہے وہ ہندوستان ہی میں بنتا۔ مگر نمک تو لورپول سے آتا ہے۔ بنگال میں غیر ملکی نمک کھایا جاتا ہے۔ بعض ڈاکٹروں اور اطبا کی رائے ہے کہ غیر ملکی نمک سے ملکی نمک ہندوستانیوں کی صحت کے لیے کہیں بہتر ہے۔ لیکن ہماری سرکار کو ہندوستانیوں کی صحت اور خرابی صحت سے کیا سروکار۔ اسے تو اپنے محصول سے کام ہے۔ اور دوسری فکر اسے یہ ہے کہ مانچسٹر اور لورپول سے جہاز نمک لاد کر چلیں۔ تاکہ ان کے پیندوں میں اتنا ''گالا'' بھرا ہو کہ وہ کھلے سمندر کی موجوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ''گالے'' کے لیے نمک سے بہتر کون چیز ہو سکتی ہے جو جہاز کو سمندر میں متوازن بھی کرے اور پھر ہندوستان میں لا کر بیچ بھی لیا جائے۔ غیر ملکی نمک کو ہندوستان میں جس طور سے کوشش کی گئی ہے اس کی داستان مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ بنگال کی غذا اس وقت غیر ملکی نمک ہے۔ حالانکہ وہاں اتنا نمک پیدا ہو سکتا ہے جو بنگال کی ضروریات کے لیے بخوبی کافی ہو سکتا ہے۔ لیکن بھلا ہو اس حکومت کا جس کی بدولت ہم اپنے گھر کی پیداوار سے بھی مستفید نہیں ہو سکتے۔ گجرات کا حال سنیے اور اپنی غلامی کو دعا دیجیے کہ نمک تک کے لیے آپ غیر ملکی حکومت کے کس قدر دست نگر ہیں۔ سواحل گجرات کے علاقوں میں کوکن میں سمندر کی موجیں ساحل پر نمک کی تہیں چھوڑ جاتی ہیں، محکمہ پرمٹ کی پولیس انھیں پھر سمندر میں پھینک دیتی ہیں لیکن پھر بھی لوگوں کو موقع مل جاتا ہے اور وہ ساحل سے نمک جمع کر لاتے اور اسے کام میں لاتے ہیں۔ (سچ لکھنو۔ ۲۸ر مارچ ۱۹۳۰ء)

۳۰ر مارچ ۳۰ء: ۳۰ر مارچ ۳۰ء کو مہاتما گاندھی کے عام اعلان سول نافرمانی کے تحت کانگریسیوں نے اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کانگریس کے ٹکٹ پر انتخاب پر نہیں لڑے تھے اس لیے چپ بیٹھے رہے۔ مگر بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلباء نے ان سے استعفیٰ دینے کی استدعا کی تو انھوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا اور مستعفی ہو گئے۔

اپریل ۳۰ء کا مہینہ ہے گاندھی جی کی رہنمائی میں عظیم الشان پیمانے پر سائمن کمیشن اور ادائیگی ٹیکس کے خلاف ہندوستان گیر عام سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ بدیسی کپڑوں کی ہولیاں جلائی جانے لگیں۔ اور کھدر گاڑھے کا پرچار گلی گلی دروازہ دروازہ ہونے لگا۔ اسی مہینہ میں سر فضل حسین وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل کے ممبر منتخب ہو کر دہلی جا براجے

(حسرت موہانی ....ایک سیاسی ڈائری)

۵ر اپریل ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی سابرمتی سے پیدل سفر کرتے ہوئے بمعہ اپنے ساتھیوں کے

ڈانڈی پہنچ گئے ۔ اور ۶ / اپریل (۱۹۳۰ء) صبح انھوں نے نمک بنانے کا اعلان کیا ۔ ساتھ ہی ہندوستانی عوام کو ہدایت کی۔

''ہوائیں انسان کے لیے خدا کا انعام ہے ۔ سمندر اور ان کے پانی غیر ملکی نہیں ۔ ہمارا ان پر حق ہے ۔ ہم اگر اس پانی سے نمک تیار کرتے ہیں تو یہ کوئی جرم نہیں ۔ لیکن اگر حکومت اس پر گرفتار کرے اور مقدمہ چلائے تو میں کہوں گا کہ آپ عدالتوں کا بائیکاٹ کریں ۔ نہ تو ضمانت دیں اور نہ مقدمہ کی کارروائی میں حصہ لیں ۔ جلوس یا دوسرے اجتماع پر پولیس اگر کسی قسم کا تشدد کرے تو آپ پرامن رہیں ۔ اسی طرح کی پابندیاں اگر اخبارات پر عائد ہوں تو انھیں بھی ضمانت نہیں دینی چاہیے ۔ اخبار بند ہی کیوں نہ ہو جائیں ۔

اس اعلان کے بعد ۶ / اپریل کو جب گاندھی جی نے نمک بنایا تو حکومت نے انھیں گرفتار نہ کیا ۔ اور اس کے بعد سارے ہندوستان میں پانی اور مٹی سے نمک بنانے کی تحریک شروع ہوگئی ۔ اس قسم کا نمک ملک میں عوام کے رہنما فروخت کرتے اور لوگ اسے زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدتے ۔

انھی دنوں حکومت نے ۲۳ / اپریل ۱۹۳۰ء کو بنگال آرڈیننس از سر نو جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ کو از سر نو استعمال کرنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کیا اور گاندھی جی کو گرفتار کر کے یورودا جیل میں بھیج دیا گیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ہندوستان میں نمک ستیہ گرہ پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں ۔ (کاروان احرار: ج ۱، ص ۹۱-۹۰)

۶ / اپریل ۱۹۳۰ء: ۵ / اپریل کی صبح کو گاندھی ڈانڈی پہنچ گئے تھے ۔

دوسرے دن صبح کو ہی پرارتھنا کے بعد والنٹیروں نے کنارے پر پڑے ہوئے نمک کو اٹھا کر قانون شکنی شروع کر دی اور اس قانون شکنی کے فوراً بعد مہاتما جی نے ذیل کا اعلان پریس کو بغرض اشاعت بھیجا ۔

اب جب کہ نمک کے قانون کو عملی طور پر توڑا جا چکا ہے ۔ آسانی کے ساتھ گرفتاریوں کا خطرہ لیا جا سکتا ہے ۔ میرا مشورہ یہ ہے ۔ کہ اب ہندوستان کے ہر ایک شہر، ہر ایک قصبہ اور کونے کونے میں کارکنوں کو نمک بنا کر قانون شکنی کا ارتکاب کرنا چاہیے ۔ اور جو لوگ اچھی طرح نمک بنانا جانتے ہیں ۔ انھیں اپنے دیہاتی بھائیوں کو اس کے متعلق ہدایات دینی چاہئیں ۔ بالفاظ دیگر دیہاتیوں کو نمک کی قانون شکنی کے تمام ذرائع سے مکمل طور پر آگاہ کر دینا چاہیے ۔ تاکہ تعلیم یافتہ لوگوں کے جیل جانے کے بعد بھی سلسلہ بدستور جاری رہے ۔ یہاں تک کہ حکومت اس قانون کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو جائے ۔

''دیہاتیوں پر یہ واضح ہو جانا چاہیے۔ کہ قانون شکنی پوشیدہ طور پر نہیں بلکہ منظر عام میں ہونی چاہیے۔ اور اس طرح سے تیار کیا گیا نمک انھیں اپنے اور مویشیوں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح سے تیار کردہ نمک کو بر سر عام فروخت کرنا بھی جرم ہے۔ غرض یہ کہ کسی طریقہ سے بھیا پنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔

نمک کے قانون کے خلاف یہ جنگ قومی ہفتہ میں پوری شد و مد سے جاری رہنی چاہیے۔ جو لوگ اس مقدس کام میں مصروف نہ ہونا چاہیں۔ انھیں کھدر کے استعمال اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کا سرگرمی سے پروپیگنڈا کرنا چاہیے۔ شراب اور کھدر کے استعمال کے متعلق میں خواتین کے لیے ایک پیغام بھیج رہا ہوں۔ اور میرے خیال میں وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے بڑھ چڑھ کر قربانیاں کر سکتی ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ وہ عدم تشدد کا پرچار کرنے کے لیے آدمیوں سے زیادہ موزوں ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ کمزور ہیں۔ جیسا کہ اکثر مغرور آدمی خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ صحیح جذبات کی مالک ہیں اور ان کے اندر تیاگ اور قربانی کی اسپرٹ مردوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔'' (تواریخ کانگریس، صفحہ ۳۹۔۶۳۸)

قانون نمک اور اس کی خلاف ورزی

سچی باتیں:

۱۱ر اپریل ۱۹۳۰ء: اگر ہم، آپ، سب، نمک کا محصول ادا کرنا چھوڑ دیں، تو ملک کا ۶ کروڑ روپیہ بچ جائے۔

اگر ہم، آپ، سب، شرابیں پینا اور پلانا چھوڑ دیں، تو ملک کا ۲۵ کروڑ روپیہ بچ جائے۔

اگر ہم، آپ، سب، بدیسی کپڑا پہننا چھوڑ دیں، تو ملک کا ۶۰ کروڑ روپیہ بچ جائے۔

اس طرح، ہم، آپ، بغیر جیل خانہ گئے، بغیر اپنے اوپر کوئی خاص سختی اٹھائے، ملک کا ۹۱ کروڑ روپیہ ہر سال بچا سکتے ہیں۔ (سچ لکھنو۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۳۰ء)

۱۲ر اپریل ۳۰ء: مہاتما جی کے بعد مسٹر عباس طیب نے ہندوستان کی رہنمائی کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا انھیں بھی ۱۲ر اپریل کو گرفتار کر لیا گیا۔ (تواریخ کانگریس، ص ۶۵۱)

۱۴ر اپریل ۱۹۳۰ء: چودہ اپریل کو پنڈت جواہر لال نہرو صدر انڈین نیشنل کانگریس گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی گرفتاری ساری کانگریس کی گرفتاری تھی۔ کئی آرڈی نینس نافذ کیے گئے۔ جن کی رو سے پکٹنگ اور عدم ادائیگی ٹیکس کا پرچار جرم قرار دیا گیا۔''

(تواریخ کانگریس، ص ۵۹۔۶۵۸)

۱۶اپریل ۱۹۳۰ء: شریمتی سروجنی دیوی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں شمولیت کے لیے الہ آباد تشریف لے گئی تھیں۔ لیکن جب انھوں نے شری یت عباس کی گرفتاری کی خبر سنی تو آپ دھرسانہ کے کارخانے کی مہم کا چارج لینے کے لیے فوراً دھرسانہ پہنچ گئیں۔ ۱۶اپریل کی صبح شریمتی سروجنی دیوی اور ان کے جیٹھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن پولیس کے احاطے سے باہر نکل کر پھر رہا کر دیا گیا۔

والنٹیر پھر فیکٹری کی طرف نہایت پر امن طریقے سے قومی گیت گاتے ہوئے بڑھے، اس دفعہ پولیس نے لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے کام لیا اور انھیں طاقت کے زور سے پیچھے ہٹا دیا گیا۔ ایک والنٹیر گرفتار ہوتا تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لینے کے لیے آ جاتا۔ شام تک ۲۲۰ والنٹیر گرفتار کر لیے گئے۔ دھرسانہ کے بعد ۱۹۔ اپریل کی صبح کو وڈالہ سالٹ فیکٹری پر ستیہ آگرہوں نے اچانک دھاوا بول دیا۔ لیکن پولیس بھی ریوالوروں وغیرہ سے مسلح ہو کر وہاں پہنچ گئی۔ اور چار سو کے قریب ستیہ آگرہی زیرِ حراست کر لیے گئے۔ مگر مئی کے مہینہ میں جب ورکنگ کمیٹی نے دھرسانہ کو نمک کے دھاوا کے لیے آل انڈیا مرکز مقرر کر دیا۔ یہاں بہت سرگرمی کا اظہار ہونے لگا۔ ۲۰رمئی کو ہندوستان بھر کے مختلف علاقوں سے ۲۵۰۰ والنٹیر دھرسانہ کی سالٹ فیکٹری پر دھاوا کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ اس دھاوے کی رہنمائی مہاتما گاندھی کے جنوبی افریقہ کے ایک ۶۲ سالہ رفیق امام صاحب نے کی جس وقت صبح کو کانگریسی والنٹیروں نے مختلف اطراف سے فیکٹری پر دھاوا کیا پولیس لاٹھیاں لے کر ان پر حملہ آور ہوئی۔ وہ لاٹھیاں کھاتے کھاتے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہزارہا آدمی اس منظر کو دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ اس دھاوے کے رہنما امام صاحب، مسٹر پیارے لال اور منی لال گاندھی گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شریمتی سروجنی دیوی بھی گرفتار کر لی گئیں۔ اس دھاوے میں پولیس کی لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے تقریباً ۲۹۰ آدمی زخمی ہوئے۔ ان زخمی والنٹیروں سے ایک مسٹر بھیلا بھائی راجا بھائی زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ کچھ دنوں بعد مہاراشٹر کے بابو بھیوں بھی زخموں کے باعث چل بسے۔ ستیہ آگرہوں کا جوش وخروش اور سرگرمی دیکھ کر پولیس اور ملٹری نے سڑک پر قبضہ کر کے دھرسانہ اور انادی کو بالکل ایک دوسرے سے علاحدہ کر دیا۔ کسی شخص کو بھی دھرسانہ کی طرف جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ انادی میں جس قدر والنٹیر بھی مقیم تھے سب کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ پر پہنچا کر رہا کر دیا گیا۔ لیکن ۲رجون کو دو سو کے قریب والنٹیر انادی سے دھرسانہ سالٹ فیکٹری پر حملہ کرنے کے لیے پھر روانہ ہوئے۔ مگر پولیس نے اس بے رحمی سے ان پر دھاوا کیا کہ ان میں سے اکثر سخت زخمی ہوئے۔ اور انھیں کیمپ

ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ دھالا میں بھی والنٹیر وں کے دھاوے بدستور جاری رہے۔ ۲۲ رمئی کو ۱۸۸ والنٹیر وں کو گرفتار کر کے دروَلی پہنچایا گیا۔ ۲۵ رمئی کو ایک سو والنٹیر پھر دھرسانہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ دو ہزار کے قریب تماشائی تھے۔ پولیس نے اس پرامن جتھ پر نہایت بے رحمی سے لاٹھیوں کی بارش کی۔ ۱۷ آدمی زخمی ہوئے اور دوسرے دھاوے میں ۱۱۵ والنٹیر گرفتار ہوئے۔ دوسرے روز پھر ۶۳ والنٹیر وں کے جتھے نے حملہ کیا۔ ان میں سے ۴۳ گرفتار کر لیے گئے۔ اور باقی کے بیس کچھ نمک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حکومت نے ایک اعلان میں واضح کیا۔ کہ تماشائیوں کا رویہ بھی والنٹیر وں جیسا تھا۔ چناں چہ لوگوں کو متنبہ کیا گیا۔ کہ وہ دھاوے کے دوران میں ودھالا کے نزدیک نہ آئیں۔''

''لیکن سب سے قابل ذکر اور کامیاب چھاپہ یکم جون کے روز عمل میں آیا۔ وار کونسل اس چھاپے کے لیے خاص طور پر تیاریاں کر رہی تھی۔ چناں چہ یکم جون کو تقریباً پندرہ ہزار والنٹیر وں اور دوسرے لوگوں نے اس دھاوے میں حصہ لیا۔ والنٹیر وں کے جتھے متواتر پولیس اور فوج کے دائروں میں سے گزر کر فیکٹری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پولیس نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا لیکن عورتوں اور مردوں نے اس محاصرے کو توڑ کر فیکٹری کی طرف منہ کر لیا اور مٹی کیچڑ میں سے بھاگتے ہوئے نمک کے ذخیرہ کی طرف بڑھے۔ پولیس نے اب چاروں طرف سے لاٹھیوں کی بارش شروع کر دی۔ ۱۵۰ آدمی زخمی ہو گئے مگر ان کی رفتار میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوئی۔ ۳ رجون کو تو صورت حالات نہایت پیچیدہ ہو گئی۔ پولیس اور فوج نے اس قدر سختی سے کام لیا۔ کہ ان زخمی آدمیوں سے پچیس آدمیوں کے تو بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔

پولیس اور فوج نے والنٹیر وں کے ساتھ جو سلوک کیا اس پر چاروں طرف سے اظہار نفرت کیا گیا۔ اس ظالمانہ سلوک سے عوام جوش میں آ جاتے تھے۔

مسٹر حسین سابق جج عدالت خفیفہ بمبئی، مسٹر کے نرنجن اور مسٹر جی کے دیودھر صدر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے اپنی آنکھوں سے یہ تمام واقعات دیکھ کر ذیل کا بیان شائع کیا:

''انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ستیہ آگرہوں کو یورپین سوار اپنی پوری رفتار سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے لاٹھیوں کے زور سے منتشر کرتے تھے۔ والنٹیر وں اور عوام کو جو راستے میں آتے تھے۔ بری طرح زدوکوب کیا جاتا تھا یہ سوار گاؤں کے بازاروں میں سے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پوری رفتار سے گھوڑے دوڑاتے۔ دیہاتی اپنی جانیں بچانے کے لیے گلیوں میں

گھس کر مکانوں کے دروازے بند کر لیتے۔ اور جو بدقسمت ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوتے وہ بری طرح پیٹے جاتے تھے۔"

"نیوفری مین" کے نامہ نگار مسٹر ڈیب ملر نے دھرسانہ کے دھاوے کا ذکر ذیل کے الفاظ میں کیا۔ "گذشتہ اٹھارہ سال سے بائیس مختلف ممالک میں میں نے نامہ نگاری کا کام کیا ہے۔ بیسیوں فسادات اور بلووں کے حالات لکھے اور اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ لیکن دھرسانہ ایسے روح فرسا حالات اب تک میری نگاہوں سے نہیں گزرے۔ بعض اوقات تو نظارہ اس قدر دردناک ہو جاتا تھا کہ مجھے وہاں سے ایک عارضی عرصہ کے لیے ہٹ آنا پڑتا۔ اس مار پیٹ ظلم اور زدوکوب کے دوران میں والنٹیروں کا ضبط اور ڈسپلن قابل تعریف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہاتما گاندھی کی عدم تشدد کی تعلیم اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی۔"

۱۹۳۰ اور ۱۹۳۲ء میں کرناٹک کے ذخیروں پر بھی حملے کیے گئے۔ یہ دھاوے نہایت کامیاب تھے۔ ان دھاووں میں بعض اوقات دس دس پندرہ پندرہ ہزار والنٹیر وغیرہ حصہ لیتے تھے۔ اور انھوں نے ہزاروں من نمک اس ذخیرہ سے حاصل کر لیا۔ باوجود اس حقیقت کے کہ کئی نامہ نگار خاص طور پر انگلستان سے آئے تھے۔ وہاں کے اخبارات کو ہندوستان کے متعلق صحیح صحیح اطلاعات نہ ملتی تھیں۔ وہاں ہندوستان کی اس عظیم تحریک آزادی کو خاص اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ انھیں خیالات کے مدنظر مسٹر سلوکومب نے دھرسانہ ستیہ آگرہ کے واقعات کو اشاعت کے لیے بھیجا ان کو پڑھ کر انگلستان میں سنسنی پھیل گئی۔ دارالعوام کی بھی گہری نیند ٹوٹی۔ مسٹر سلوکومب نے یرودہ جیل میں مہاتما گاندھی سے بھی ملاقات کی اور ذیل کا مضمون اس ملاقات کے بعد بغرض اشاعت ارسال کیا۔

"اس نازک وقت میں بھی سمجھوتا بالکل ممکن ہے۔ مہاتما گاندھی چند شرائط پر سول نافرمانی کے معطل اور گول میز کانفرنس میں تعاون کرنے کی سفارش کر سکتے ہیں وہ شرائط ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) گول میز کانفرنس میں آزادی کے دستور اساسی کی اسکیم کو مرتب کیا جائے۔

(۲) قانون نمک کی تنسیخ، شراب کو ممنوع قرار دیے جانے اور بدیشی کپڑے کی درآمد پر پابندیاں عائد کرنے کے سلسلہ میں مہاتما جی کی تشفی کی جائے۔

(۳) سول نافرمانی تک کے سیاسی قیدیوں اور نظربندوں کی رہائی۔

(۴) دوسری شرائط ان نکات کے پورے ہونے کی صورت میں مہاتما گاندھی آیندہ ملتوی کرنے کو تیار ہیں۔

(۵) ''میں کہہ چکا ہوں کہ سمجھوتا اور صلح اب بھی ممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ صلح کا جواب صلح ہی میں دیا جائے گا۔ اور اس طرح ایک زبردست مصیبت ٹل سکتی ہے۔ انگلستان کے لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے۔ کہ اس وقت مہاتما گاندھی سارے ہندوستان کے دل و دماغ پر مکمل طور پر قابض ہیں۔''

۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء: ۱۸ تا ۲۰ر اپریل چارسدہ تحریک میں نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں ایک کانفرنس تھی۔ اس میں پنجاب سے مولانا ظفر علی خان اور مولانا عبدالقادر قصوری کو شریک ہونا تھا۔ لیکن انھیں پشاور اسٹیشن روک دیا اور شہر میں ان حضرات کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا، باچا خان کو اور مولانا عبدالرحیم پوپل زئی، آغا سید لال بادشاہ، سردار عبدالرب نشتر، ارباب عبدالغفور وغیرہ کو ان کے گھروں سے گرفتار کرلیا گیا۔ رہنماؤں کو کابلی تھانے میں حراست میں رکھا گیا تھا۔ ۲۳ر اپریل کو ایک بڑا مجمع تھانے پر جمع ہوگیا لیکن ڈاکٹر خان اور دوسرے حضرات نے انھیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ عوام پرامن واپس آرہے تھے کہ قصہ خوانی بازار میں گورا پلٹن کے دستے اور بکتر بند گاڑیاں موجود تھیں۔ انھیں دیکھ کر عوام کے جذبات مشتعل ہوگئے اور ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر ایک انگریز فوجی افسر کو جو رہنماؤں کو گالیاں دے رہا تھا، قتل کر دیا۔ اس پر گورا پلٹن نے آگے بڑھ کر بغیر کسی وارننگ کے ہجوم پر اندھا دھند فائرنگ کردی۔ دیکھتے ہی دیکھتے قصہ خوانی بازار چوک یادگار تک شہیدوں کی نعشوں سے پٹ گیا۔ اس خونی حادثے میں پانچ سو سے زیادہ پٹھان شہید ہوئے۔ شہر میں مارشل لا لگا دیا گیا۔

جمعیت علماے ہند کے نویں سالانہ جلسے میں جو مولانا معین الدین اجمیریؒ کی صدارت میں ۳ تا ۶ر مئی ۱۹۳۰ء، امروہہ ضلع مرادآباد میں ہوا۔ اس میں پہلی قرارداد میں پشاور کے واقعے پر رنج و افسوس کا اظہار، شہدا کی قربانیوں کا اعتراف اور مظلومین کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس خوں چکاں واقعے پر جمعیت علماے ہند، مجلس احرار اسلام، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے علاوہ ملک کی تمام دیگر حریت پسند جماعتوں نے اپنے رنج و افسوس کا اظہار کیا، شہدا کو خراج تحسین پیش کیا، متاثرین سے ہمدردی ظاہر کی، حکومت کے خلاف احتجاج اور غصے کا اظہار کیا۔ لیکن مسلم لیگ نے اپنی عاملہ کے کسی جلسے میں یا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۳۰ء میں کسی قسم کا تاثر ظاہر نہیں کیا۔

۲۳/اپریل ۱۹۳۰ء: نے ۲۳/اپریل کو بنگال آرڈیننس از سرنو جاری کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ کے اختیارات کو از سرنو حاصل کرنے کے لیے ایک اور آرڈی نینس جاری کیا۔ (تاریخ کانگریس، صفحہ ۶۴۱)

اپریل ۱۹۳۰ء: ڈانڈی میں نمک کا قانون اعلانیہ توڑنے کے بعد مہاتما جی نے دھرسانہ کی نمک فیکٹری پر چھاپہ مارنے کا ارادہ کیا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے وائسرائے کو ایک دوسری چھٹی لکھی۔ لیکن اس چھاپہ سے پیشتر ہی مہاتما گاندھی کی گرفتاری عمل میں آگئی اور اس وقت تک لوگوں کو گرفتاری کا علم نہ ہوا۔ جب تک کہ وہ یرودہ کے جیل خانے میں نہ پہنچا دیے گئے۔

دھرسانہ کی سالٹ فیکٹری ضلع سورت میں واقع ہے۔ مہاتما جی کا اعلان تھا کہ نمک، ہوا اور پانی پر عوام کا قدرتی قبضہ ہے۔ اور دنیا کی کوئی حکومت ان پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کی مجاز نہیں۔ اور وہ نمک کو گوداموں وغیرہ میں بھر کر محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ وہ عوام کی ملکیت ہے۔ اور وہ لوگوں کو طاقت کے زور سے ہی ایسا کرنے سے باز رکھ سکتی ہے۔ چناں چہ انھیں خیالات کے مدنظر انھوں نے وائسرائے کو چھٹی لکھی:

"پیارے دوست:

"اگر پرماتما کو منظور ہوا تو میری مرضی اپنے رفقا سمیت دھرسانہ سالٹ فیکٹری پر قبضہ کرنے کی ہے۔ عوام کو بتایا گیا ہے کہ دھرسانہ ایک پرائیویٹ فیکٹری ہے۔ یہ محض غلط بیانی ہے۔ یہ سالٹ فیکٹری بھی وائسریگل لاج کی مانند گورنمنٹ کے مکمل کنٹرول میں ہے اور حکام کی منظوری اور اجازت کے بغیر نمک کا ایک ٹکڑا بھی وہاں سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔ آپ اس چھاپہ کو تین طریقوں سے روک سکتے ہیں۔

(۱) محصول نمک کو منسوخ کر کے۔

(۲) مجھے اور میری پارٹی کو گرفتار کر کے کیوں کہ میرا اپنا خیال ہے کہ ملک ہر ایک گرفتار شدہ کی جگہ دوسرا آدمی پیدا کر سکتا ہے۔

(۳) غنڈہ ازم کے ذریعے جب تک کہ ملک سر تڑوانے کے لیے آدمی بھیجتا رہے۔ یہ قدم نہایت سوچ اور بچار کے بعد اٹھایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حکومت سول نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ مہذبانہ طور پر مقابلہ کرے گی۔ اگر حکومت عام قانون کا ہی اطلاق کرتی تو مجھے یہ الفاظ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ سول نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے۔ وہ وحشیانہ

اور نہایت غیر مہذبانہ ہے۔ (تاریخ کانگریس، صفحہ ۶۴۳-۶۴۲)

اپریل مئی ۱۹۳۰ء:

مسٹر ایس سی مترا کے ایک سوال کے جواب میں مسٹر ایچ جی ہیگ نے بتایا کہ سول نافرمانی کے دوران میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں یکم اپریل سے لے کر ۳۱/ مئی تک فائرنگ میں مندرجہ ذیل افراد ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں:

صوبہ، شہر	تاریخ	ہلاک	زخمی	کیفیت
مدراس سٹی	یکم اپریل	۲	۶	ایک زخمی بعد میں ہلاک ہو گیا
بنگال۔ کلکتہ	یکم اپریل	۷	۵۹	ایضاً
بنگال۔ کلکتہ	۱۵/ اپریل	--	۳	بعد میں تینوں ہلاک ہو گئے
پرگنہ	۲۴ اپریل	۱	۳	----
چٹاگانگ	۱۸/۱۹/۲۰//	۱۰	۲	بعد میں دونوں ہلاک ہو گئے
مدراس	۳۰/ مئی	-	۲	----
بمبئی۔ شولاپور	۸//	۱۲	۲۸	----
واوالا سالٹ پانس	۲۴/ مئی	-	۱	----
بھنڈی بازار	۲۶، ۲۷//	۵	۶۷	----
بنگال۔ باوڑا	۶//	-	۵	----
چٹاگانگ	۷/ مئی	۴	۶	بعد میں تین انتقال کر گئے
میمن سنگھ	۱۴ مئی	۱	۳۰، ۴۰ کے درمیان	-----
پرانا پڈی گھی	۱۳/ مئی	۲	۲	-----
یوپی، لکھنؤ	۲۶/ مئی	۱	۴۲	بعد میں دو انتقال کر گئے
پنجاب، کولو جہلم ضلع	۱۸/ مئی	-	۱	----
برما۔ رنگون	مئی آخری ہفتہ	۵	۳۷	----
صوبہ سرحد	مئی آخری ہفتہ	۱۷	۳۷	----
دہلی	۶/ مئی	۴	۴۰	----

(سکسٹی ایئرز آف کانگریس، ص ۳۰۴)

۳؍مئی ۱۹۳۰ء: جمعیت علماے ہند کا نواں سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مراد آباد میں مولانا معین الدین اجمیری کی صدارت میں ہوا۔ حضرت مولانا اجمیری کا خطبہ اجلاس کی پہلی نشست میں پیش کیا گیا۔ چوں کہ اس زمانے میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ شاردا ایکٹ کا تھا اس لیے پورا خطبہ اسی ایکٹ کے خلاف ہے۔ یہ خطبہ اپنے مباحث، اور اسلوب بیان اور طرز استدلال کے لحاظ سے ایک لاجواب تحریر ہے۔ خطبہ کی ایک اہم بحث یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے کس طرح رفتہ رفتہ مسلم پرسنل لا میں تنسیخ اور تبدیلیوں کا عمل جاری رکھا ہے اور اب شاردا ایکٹ کے نفاذ کے بعد معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ خطبے کے آخر میں مولانا نے نہرو رپورٹ اور کانگریس سے تعاون کے بارے میں جمعیت علماے ہند کی پالیسی پر روشنی ڈالی اور جمعیت علماے ہند کے قیام کی اہمیت اور علماے کرام کی قیادت کی خدمت پر روشنی ڈالی۔ حضرت مولانا اجمیری کا خطبۂ صدارت نہایت اہم اور بہت فکر انگیز ہے۔ ''اوراق گم گشتہ'' مرتبہ شہد رئیس احمد جعفری (لاہور) اور جمعیت علماے ہند خطبات صدارت اور تجاویز'' مرتبہ زرینہ (اسلام آباد) میں شامل ہے۔

جمعیت کا یہ اجلاس ۳ تا ۶؍مئی چار روز تک جاری رہا۔ دیگر اجلاسوں میں دوسرے علماے دین اور اکابر جمعیت نے تقاریر فرمائیں۔ اس کے بعد کے اجلاسوں میں متعدد تجاویز پاس کی گئیں۔ ان میں سے دو اہم ترین تجاویز یہ ہیں:

تجویز نمبر ۱/۵:

جمعیۃ علماء ہند کی مجلس مرکزیہ کا یہ جلسہ پشاور کے شیدائیان حریت کی جرأت و بسالت کا پورا اعتراف کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ جن فرزندان توحید نے اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں اور آزادی ملت و وطن کی راہ میں اپنی جانیں قربان کر دیں وہ احکام شریعت کے ماتحت شہید فی سبیل اللہ ہیں اور خدائے تعالیٰ کی خاص رحمت کے مستحق ہیں۔

انگریزی حکومت کی فوج کا نہتے اور پر امن مجمع پر بغیر اس کے کہ ان کی طرف سے کسی قسم کی تشدد آمیز کارروائی ہوئی ہو۔ مشین گن چلا دینا اور سیکڑوں فرزندان توحید کو جام شہادت پلا دینا بربریت کا ایسا ہولناک مظاہرہ ہے جس کی جنگ آزادی کے سلسلہ میں نظیر نہیں ملتی۔ اور جس کا علاج استخلاص وطن کی کامل جد و جہد اور آزادی وطن کے حصول کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور جو مظلوم شہید یا زخمی ہوئے یا مقدمات کی مصیبت میں گرفتار ہوئے ان سے اور ان کی اہل و عیال سے اپنی

دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ اور تجویز کرتا ہے کہ تمام ہندوستان میں ۳۰ رمئی کو بعد نماز جمعہ شہداء کے لیے دعاے مغفرت کی جائے اور عام جلسے منعقد کر کے مظلومینِ پشاور سے اظہارِ ہمدردی کی تجاویز پاس کی جائیں۔

محرک: مولانا محمد نعیم صاحب (لدھیانوی)

مؤید: مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (سیوہاروی)

تجویز نمبر ۲/۶:

(الف) چوں کہ نیشنل کانگریس نے اجلاس لاہور میں مکمل آزادی کا اعلان کر دیا ہے جو جمعیۃ علماء کا پہلے سے نصب العین ہے اور نہرو رپورٹ کو جس سے جمعیۃ نے شدید اختلاف کیا تھا (جیسا کہ جمعیۃ کی تنقیدی رپورٹ سے ظاہر ہے) اور کالعدم کر دیا ہے۔ اور ایک تجویز میں یہ بھی طے کر دیا ہے کہ آیندہ کوئی دستور اساسی اس وقت تک کانگریس قبول نہ کرے گی جس سے متعلقہ اقلیتیں پورے طور پر مطمئن نہ ہو جائیں۔

اس لیے جمعیۃ علماء کے اس اجلاس کے نزدیک بہ حالات موجودہ مسلمانوں کے لیے کانگریس سے علاحدہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(ب) مسلمانوں کے مذہبی و قومی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اجلاس اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہے کہ کانگریس کا کوئی آیندہ عملی پروگرام اس وقت تک مسلمانوں کے لیے آخری فیصلہ نہ ہوگا جب تک جمعیۃ علماء ہند اس کی تصدیق نہ کر دے۔

(ج) چوں کہ شاردا ایکٹ بحق اہل اسلام صریح مداخلت فی الدین ہے اور اسلامی پرسنل لا پر شدید حملہ ہے اور حکومت ہند نے انتہائی احتجاج و تنبیہ کے بعد بھی مسلمانوں کو آج تک اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح اس حکومت نے ملک پر جابرانہ قبضہ کر کے تمام اہل وطن کو غلام اور مفلس و بے کس بنا دیا ہے اور ظالمانہ قوانین کے وضع و نفاذ اور اخلاق و معاشرت کی تخریبی حکمت عملی پر اسے اصرار ہے اسی طرح وہ اب اسلامی پرسنل لا کے واجب الحفظ قلعہ کو بھی مسمار کر کے دین و ملت کو بھی برباد کر دینا چاہتی ہے جو تمام اہل ملک اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہے اور ان تمام مقاصد کے سد باب اور ناموس شریعت کی حفاظت کے لیے آخری صورت یہ ہے کہ ملک کو حکومتِ متسلطہ کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد کرا لیا جائے۔

اس لیے یہ اجلاس مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ ملک وملت کی آزادی اور اپنے پرسنل لا کی حفاظت کے لیے پورے جوش اور کامل استقلال سے احکام شرعیہ کے موافق کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہوئے سرفروشانہ، پرامن جنگ آزادی کی راہ میں گامزن ہوں۔ (جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۷۵۔۱)

۵ رمئی ۱۹۳۰ء: حکومت نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دے دیا ہے اور ۵ رمئی کو گاندھی جی سول نافرمانی اور نمک بنانے کے جرم بے گناہی میں گرفتار کر لیے گئے۔

۶ رمئی کو جمعیت علماے ہند نے سول نافرمانی اور تحریک میں کانگریس سے تعاون کا ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ اس کے ایک سال ڈھائی ماہ کے بعد مولانا احمد سعید دہلوی نے جمعیت علماے متحدہ کے ساتویں اجلاس میں خطبۂ صدارت میں اس میں جمعیت کی شرکت کے اثرات و نتائج پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے:

سول نافرمانی اور جمعیۃ علماے ہند:

''حضرات! گزشتہ تحریک سول نافرمانی میں جمعیۃ علماء ہند نے جس استقلال اور مستعدی سے حصہ لیا ہے۔ وہ مسلمانوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ جمعیۃ علماء ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانان ہندوستان کسی دوسری قوم سے شرمندہ نہیں ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے ۶ رمئی ۱۹۳۰ء کو سول نافرمانی کی اسکیم اور کانگریس کی شرکت کا ریزولیوشن پاس کیا تھا جس وقت امروہہ میں یہ تجویز پاس کی جارہی تھی اس وقت خوف وطمع اور ترغیب وترہیب کی تمام صورتیں جمعیۃ علماء ہند کے سامنے موجود تھیں۔ لیکن اس حق گو جماعت کے ارکان نے تمام خطرات ومطامع سے بے نیاز ہو کر آزادی وطن کے راستے میں قدم بڑھایا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی دعوت دی۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے جمعیۃ علماء کی آواز کو سنا، قبول کیا اور سرکاری طبقے کی مخالفانہ جدوجہد کے باوجود بارہ ہزار مسلمان جیل میں گئے۔ اور جس جماعت سے یہ توقع تھی کہ وہ میدان جنگ میں ہماری رہنمائی کرے گی، ہمیں افسوس ہے کہ اس نے ہمت ہاردی اور اس نے مسلمانوں کو رجعت پسندی پر مجبور کیا۔ جس طبقے نے اپنے سیاسی معلم ہونے کا بارہا فخر کیا، افسوس ہے کہ وہ استاد خود اس موقع پر اس سبق کو بھول گیا۔ مغربی تعلیم کے حاصل کرنے والوں نے ٹھوکر کھائی اور بوریہ نشین کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے دنیا کو بتادیا کہ جن لوگوں کو تنگ خیال اور دقیانوسی کہا جاتا تھا اور جن کو ڈرپوک

اور مفت کی روٹیاں توڑنے والا بتایا جاتا تھا، وہی میدان جنگ کے شہسوار بنے اور انھوں نے عالم اسلامی کے مظلوم مسلمانوں کی دعائیں حاصل کرلیں۔ بزدل اور سیاست سے ناآشنا بہادر بن کے نکلے اور کامیاب ہوکر لوٹے اور انھوں نے اپنے ایثار وقربانی سے یہ ثابت کردیا کہ امت کی صحیح رہنمائی اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہ علماء ہی کا طبقہ ہے۔ جس کو اپنی بہادری اور سیاست دانی پر ناز تھا وہ تذبذب کی دلدل میں پھنس کر رہ گئے اور زمانۂ جنگ میں بجائے مظلوم کے ظالم کی مجلس استبداد میں ایٹ ہوم کے مزے لوٹتے رہے۔ لیکن ایک جماعت نے جیل خانوں کی کوٹھریوں میں رات گزاری، ہر طرح کے مصائب برداشت کیے، مالی نقصانات اٹھائے اور دنیا کو یہ بتادیا کہ آزادی وطن کا سچا حامی کون ہے؟ آپ میں سے جو لوگ عربی اخبارات پڑھتے ہوں گے ان کو معلوم ہوگا کہ جمعیت علماے ہند کے اس فیصلے کو عالم اسلامی نے کس نظر سے دیکھا ہے؟

صاحبو! ملک فقط ہندو کا نہیں ہے یہ ملک جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی ہے آخر یہ کون سا طریقہ ہے کہ جب قربانی کا وقت آئے تو ہم اپنے عشرت کدوں میں بیٹھ کر سول نافرمانی کرنے والوں کا مذاق اڑائیں اور جب حقوق ملنے کا وقت آئے تو ہم سب سے آگے آکر کھڑے ہوجائیں۔ یہ ہے وہ طرز عمل جس کے باعث آج ہم دوسری قوموں کے لیے سنگ راہ ہیں۔'' (خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم جمعیت علماے صوبہ متحدہ ۱۹،۲۰ر جولائی ۱۹۳۱ء، بہ مقام میرٹھ، صفحہ ٦)

فرمان تھانہ بھون کی حقیقت:

۳۰ر مئی ۱۹۳۰ء: مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ہفت روزہ سچ لکھنو کی اشاعت ۳۰ر مئی و ٦ر جون ۱۹۳۰ء میں جمعیت علماے ہند کے نویں سالانہ اجلاس امروہہ کے حوالے سے بہ عنوان'' تھانہ بھون اور موجودہ تحریک...... فرمان کی حقیقت'' ذیل کا مختصر مضمون شائع کیا ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

'' جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ نے کانگریس کی موجودہ تحریک قانون شکنی کی تائید اگرچہ بہت بچ بچ کر، اور شرائط وقیود کے ساتھ مشروط ومقید کرکے کی، لیکن بہرحال کی۔ ادھر اس تجویز کا بعض مستند ومتدین علماء کرام کے نام سے شائع ہونا تھا، کہ دوسری طرف سے ایک ''فرمان'' شائع ہوا، جس کے ذریعہ سے یہ بتایا گیا، کہ حکیم الامۃ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی اس تجویز کے

قطعی مخالف ہیں۔ اور دہلی کے ایک اخبار نے تصریح کے ساتھ لکھ دیا، کہ ''ابھی جمعیۃ العلماء کی تجویز شایع ہوئے کچھ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کے خلاف مسلمانوں کے جلسے ہندوستان میں شروع ہوگئے ہیں اور اکثر مقامات سے خود علماء اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، یہاں تک کہ علمائے تھانہ بھون بالخصوص حضرت مولانا اشرف علی صاحب سرپرست دارالعلوم دیوبند کا ''فرمان'' اس کے خلاف شایع ہو چکا ہے۔''

اور سخت افسوس ہے کہ خلافت کمیٹی جیسی ذمہ دار مجلس کے ترجمان، روزنامہ خلافت نے بلا تامل اس قسم کی تحریروں کو اپنے ہاں نقل کرنا شروع کر دیا۔ اس پروپیگنڈے میں حقیقت وواقعیت کا جزو کس حد تک شامل ہے، اس کا جواب مراسلت ذیل پڑھنے کے بعد خود حضرت مولانا کی زبان سے مل جائے گا۔

''بخدمت گرامی حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب مدظلہ العالی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ حال میں ایک تحریر ''فرمان علمائے تھانہ بھون'' کے عنوان سے اتحاد پریس مظفر نگر سے منجانب محمد نبی بصورت اشتہار نیز بعض اخبارات میں اس حیثیت سے شایع ہورہی ہے کہ گویا موجودہ تحریک کے متعلق جناب والا نے اسی زمانے میں مستقل طور پر بغرض اعلان تحریر فرمایا ہے۔ تحریر مذکور منسلک عریضہ ہذا ہے۔ اس کے متعلق بہ ادب دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا تحریر مذکور جناب نے شایع کرائی ہے، یا جناب کی اجازت وایماء سے شایع کی گئی ہے؟

والسلام۔

خادم عبدالماجد

الجواب:

مکرمی دام لطفکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جواباً اجزائے ذیل عرض کرتا ہوں:

(۱) یہ مضمون نہ میں نے شایع کرایا ہے اور نہ مجھ سے کسی نے اجازت لی ہے اور نہ قبل اشاعت اطلاع کی ہے۔

(۲) مجھ کو یقینی طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ مضمون میرا ہے بھی یا نہیں گو بعض اجزاء کی نسبت احتمال ہوتا ہے کہ میرا ہوگا مگر تحریک موجودہ کے قبل کا۔

(۳) اور اگر میرا ہی ہے تو معلوم نہیں کہ یہ پوری اور مسلسل عبارت ہے یا ناتمام اور متفرق۔ کیوں کہ دونوں صورتوں میں بعض اوقات مدلول و مقصود بدل جاتا ہے۔

(۴) پھر جتنی عبارت لکھی ہے اس کا موجودہ تحریک سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ اس کا حاصل تو صرف ان لوگوں کی شکایت ہے جو بانی تحریک کے اس درجہ معتقد ہیں کہ اس کی ہر تحریک کی قرآن و حدیث سے تائید کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ شکایت اب بھی ہے۔

(۵) میں نے جب اول اشتہار مالک پریس کو خط لکھا کہ شایع کنندہ سے دریافت کریں کہ مضمون میری کس تحریر سے لیا ہے اس کا حوالہ بتلا دیں اور کس زمانہ کا ہے اور بدوں اپنی کسی تمہید کے مستقل طور پر میری طرف منسوب کر کے کیوں شایع کیا ہے؟ جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ گویا میں نے مستقل اشاعت ہی کی غرض سے لکھا ہے، مگر کافی سے زیادہ مدت گزر گئی جواب نہیں آیا۔ قبل استفسار مالک پریس نے اس قدر اطلاع دی تھی کہ یہ شایع کرنے والے مدرسہ مخزن العلوم سہارنپور کے کوئی ملازم ہیں اھ۔

اگر کسی کو مزید تحقیق کی ضرورت ہو وہ پریس مذکور یا مشتہر مذکور سے تحقیق فرمالیں۔

نوٹ۔ اس جواب سے مقصود صرف واقعہ اشتہار کی حقیقت بتلانا ہے نہ کہ اس تحریک کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنا کہ اس کا اس جواب سے کوئی تعلق نہیں۔ والسلام

اشرف علی عفی عنہ ۲۵ رذی الحجہ ۱۳۴۸ء"

مولانا کے مکتوب میں جو عبارتیں زیر خط اور جلی کر دی گئی ہیں، وہ خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں۔ مولانا تصریح ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ مضمون نہ انھوں نے شایع کرایا، نہ کسی کو شایع کرنے کی اجازت دی، نہ قبل اشاعت انھیں اس کا علم ہوا، اور نہ وہ مضمون ہرگز انھوں نے موجودہ تحریک کے متعلق تحریر فرمایا! بلکہ مولانا کو تو اس میں بھی شبہ ہے، کہ آیا وہ مضمون ان کا ہے بھی! اور اگر ہے، تو آیا صحیح و بلا تحریف نقل بھی ہوا ہے؟ بانی تحریک، گاندھی جی کے ساتھ بعض مسلمانوں کو محبت و عقیدت میں جو غلو ہے، اس کی اصلاح اور اس کا تدارک یقیناً ضروری ہے، اس مقصد میں علماء جمعیۃ العلماء کا قدم حضرت مولانا سے ہرگز پیچھے نہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کو تحریک موجودہ کی موافقت و مخالفت سے کیا تعلق؟ کاش ہمارے اہل صحافت، خلق و خالق کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے"

مولانا دریابادی نے اوپر کے مضمون میں امروہہ کے جس اجلاس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ

حضرت مولانا شاہ معین الدین اجمیریؒ کی صدارت میں ۳ رتا ۵ رمئی ۱۹۳۰ء کو ہوا تھا۔ اس اجلاس کی دوسری قرارداد میں کہا گیا تھا:

ا۔ ''کانگریس کا کوئی آیندہ عملی پروگرام اس وقت تک مسلمانوں کے لیے آخری فیصلہ نہ ہوگا، جب تک جمعیت علماے ہند اس کی تصدیق نہ کردے۔''

۲۔ اس اجلاس نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی'' کہ ملک ملت کی آزادی اور اپنے پرسنل لا کی حفاظت کے لیے پورے جوش اور کامل استقلال سے احکام شریعہ کے موافق کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہوئے سرفروشانہ پرامن جنگ آزادی کی راہ میں گامزن ہوں۔''

۳۔ اس اجلاس میں تین حضرات کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ جس کا کام یہ تھا کہ وہ مخصوص ملی نظام کے ماتحت حصول آزادی اور پرسنل لا کے تحفظ کے لیے تعمیری لائحہ عمل اور سول نافرمانی کا پروگرام مرتب کرے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دے۔ یہ تین حضرات یہ تھے:

ا۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صدر جمعیت علماے ہند

۲۔ مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی اور

۳۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت صوبۂ پنجاب

قرارداد کی ''ب، ج اور د'' یہ تین دفعات تھیں، جن کے بارے میں مولانا دریابادی کا خیال بھی یہی ہے:

> ''کانگریس کی موجودہ تحریک قانون شکنی وسول نافرمانی کی تائید اگرچہ بہت بچ کر اور شرائط وقیود کے ساتھ مشروط ومقید کر کے کی، لیکن بہر حال کی۔''

اس پر تھانہ بھون سے متعلق لیگی ذہنیت کے سازشیوں نے جعل وتلبیس کا یہ کارخانہ کھول دیا، جس کی طرف مولانا دریابادی نے اوپر کے مضمون میں تحقیق بیان کی ہے۔ لیکن جمعیت کے اس اجلاس کی ان تجاویز کو ان صاحبوں نے قابل اعتناء اور لائق تائید نہیں سمجھا۔

ا۔ پشاور کے قصہ خوانی بازار میں انگریزی فوج نے کئی سونہتے شہریوں کو کسی اشتعال دلائے بغیر قتل کردیا تھا۔ جمعیۃ نے اس بربریت کے خلاف احتجاج اور اظہار نفرت کیا تھا اور مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ۳۰ رمئی کو بعد نماز جمعہ ان شہداے ستم کے لیے دعاے مغفرت اور مظلومین و متاثرین حادثۂ پشاور کے ساتھ اظہار ہمدردی کی تجاویز پاس کریں۔

۲۔حکومت نے شاردا ایکٹ کے دایرہ نفوذ میں مسلمانوں کو شامل کر کے مداخلت فی الدین کا جوارتکاب کیا تھا، اس پر اظہار ناراضگی اور مسلمانوں کے لیے اس ظالمانہ اور مخرب اخلاق وخلاف شریعت قانون پر احتجاج اور ناموس شریعت کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے اتحاد اور حکومت کے خلاف تحریک چلانے کے عزم کا بھی اظہار کیا تھا۔

۳۔شراب اور دیگر مسکرات کے استعمال وتجارت پر احتساب۔

۴۔پریس آرڈیننس کے خلاف احتجاج۔

۵۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جمعیت علماے ہندان حضرات سے اور تھانہ بھون کے بزرگوں سے اپنی اس قرارداد کے حق میں بھی ایک حرف تائید حاصل نہ کرسکی۔ جس میں کہا گیا تھا:

''جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس حکام ضلع مرادآباد کی اس ظالمانہ کارروائی پر اظہار ملامت و نفرت کرتا ہے کہ انھوں نے موضع مونڈھے مانڈے کی مسجد پر دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے اذان ونماز کو بند کر دیا ہے اور اس ظالمانہ حکم کے ازالہ وتنسیخ کے لیے جمعیت علما ضلع مرادآباد کو توجہ دلاتا ہے کہ فوراً مناسب کارروائی اور اگر سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کی ضرورت لاحق ہو تو پہلے صدر جمعیت علماے ہند سے مشورہ وہدایت لے کر سول نافرمانی شروع کی جائے۔''

ان بزرگوں کی اس سیرت کی روشنی میں کیا یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انھیں نہ ملک کی آزادی اور انسانیت کی فلاح سے تعلق تھا اور نہ مسلمانوں کے مفادات وحقوق کے تحفظ کے مسائل سے دل چسپی تھی۔ وہ صرف انگریزی حکومت کی بقاے دوام کے لیے متمنی اور اسی کے لیے ساعی تھے اور اگر انھیں کسی بات سے غرض تھی تو صرف برٹش استعمار کے مفادات کے تحفظ سے اور اس کے لیے تمام اعمال عبودیت بجالانے کو ہر وقت آمادہ ومستعد رہتے تھے۔

تحریک نمک اور سول نافرمانی

مختلف واقعات مختصر تبصرہ:

مئی ۳۰ء: مئی ۳۰ء کا مہینہ شروع ہوتے ہی ساحل جو ہو چوپاٹی اور جہاں جہاں نمک بنایا جاتا تھا نمک کے اجارہ کے خلاف مظاہرہ کیا گیا۔ ہزاروں معزز افراد نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس سلسلے میں جناب عابد علی جعفر بھائی۔ یوسف مہر علی۔ صادق علی صاحب اور مسٹر

نریمان کو حکومت نے بمبئی میں گرفتار کر لیا۔ گاندھی جی خود ۷۸ آدمیوں کے ساتھ سمندر کے کنارے پر نمک بنانے گئے۔ تب حکومت نے کانگریس کو خلافِ قانون قرار دے دیا اور ۵ رمئی ۳۰ء کو گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے ساتھ ہی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی گرفتاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ اس کے بعد جگہ جگہ دیگر کانگریسی کارکنوں کی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ حکومت اور عوام کی یہ آنکھ مچولی اس طرح چل رہی تھی کہ اس کا خاتمہ دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ لوگ انفرادی طور پر اپنے گھر بھی نمک بنا بنا کر قانون توڑنے لگے۔ جون کی درمیانی تاریخوں میں موتی لال نہرو کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے مہینے اندھا دھند گرفتاریاں ہوتی رہیں۔ (حسرت موہانی ......ایک سیاسی ڈائری)

چند سبق آموز اعداد:

۳۰ رجون ۱۹۳۰ء: ولایتی کپڑے کا مقاطعہ بحمد اللہ ملک میں خاصی رفتار سے شروع ہو ہی چکا ہے۔ بہتر ہوگا، کہ ولایتی مال کے بعض دوسرے اصناف کی درآمد کی قیمتوں کے متعلق بھی اعداد ذیل پیش نظر رہیں، بمبئی کرانیکل کی ایک تازہ اشاعت سے ماخوذ ہیں:

	قیمت درآمد ۲۱۔۲۲ء میں	قیمت درآمد ۲۸۔۲۹ میں
ولایتی نمک	۱ کرور ۹۶ لاکھ روپیہ	۱ کرور ۴۶ لاکھ روپیہ
ولایتی شرابیں	۴ کرور روپیہ	۲ کرور ۴۶ لاکھ روپیہ
ولایتی تمباکو	۲ کرور ۶۰ لاکھ روپیہ	۲ کرور ۶۷ لاکھ روپیہ
ولایتی دوائیں	۳ کرور ۹۰ لاکھ روپیہ	۴ کرور ۶۷ لاکھ روپیہ
ولایتی گاڑیاں (موٹر، سائیکل وغیرہ).	۶ کرور ۰۷ لاکھ روپیہ.	۱۱ کرور ۵۸ لاکھ روپیہ
ولایتی صابون	۱ کرور ۲۱ لاکھ روپیہ	۱ کرور ۵۸ لاکھ روپیہ

آپ نے دیکھا، کہ آپ کا روپیہ، کن کن طریقوں سے، اور کتنی تعداد میں آپ کی جیب سے نکل نکل کر فرنگیوں کے خزانے میں داخل ہو رہا ہے! آپ روز بروز مفلس ہوتے جا رہے ہیں! کاش اب بھی آپ کی حمیت و غیرت ملی کے جذبات حرکت میں آئیں گے!

حکومت کے مسلمان کارپرواز:

"خدمت کے جذبات میرے دل میں لڑکپن سے موجود رہے ہیں، لیکن میرا فرض تھا، کہ

جب تک میں سرکاری ملازمت میں ہوں سرکار کا وفادار رہوں، اس لیے مجبوراً برابر اپنے ضمیر کے خلاف کرتا رہا، اب ادھر دو مہینوں میں میں نے ۳۵ دلیر خادمانِ وطن کو جیل خانے بھیجا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میرے قلب کو یہ احکام دیتے وقت کتنی تکلیف ہوتی رہی۔ اب آج میں علانیہ ایسی حکومت سے اپنی بے تعلقی اور اس کی ملازمت سے ۲۶ سال کے بعد اپنے استعفےٰ کا اعلان کرتا ہوں۔ جب ضمیر کی تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی، تو بجز استعفےٰ کے چارہ نہ رہا۔"

یہ ایک غیر مسلم (ڈرلا بھائی ڈیسائی) ڈپٹی کلکٹر (ضلع کھیڑا۔ علاقہ بمبئی) کی تقریر کا اقتباس ہے۔ مسلمانوں میں بھی ہزاروں کی تعداد میں ڈپٹی کلکٹر اور تحصیل دار، جج اور سب جج، کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس، انسپکٹر اور سب انسپکٹر، ادنیٰ اور اعلیٰ ہر درجے کے سرکاری عہدہ دار ہیں، بہتوں کی نظر سے یہ سطریں گزریں گیا، اپنے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ اس حکومت کے احکام کی تعمیل کے وقت، خصوصاً اپنے بھائی ہندوؤں کو بلا جرم و بے قصور جیل خانے بھجواتے وقت ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہے؟ کیا ان کے پہلوؤں میں دل نہیں ہیں، پتھر ہیں؟ اگر دل ہیں تو ان دلوں پر کیا گزرتی ہے؟ علماء کے فتوے کی ضرورت نہیں، خود اپنے ہی نفس سے استغناء کافی ہوگا۔ "اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبا (سچ لکھنؤ۔ ۱۳ و ۲۰ رجون ۱۹۳۰ء)

امیر شریعت صوبہ بہار، اور موجودہ تحریک:

۲۷ رجون ۱۹۳۰ء: کیا مسلمانانِ ہند اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ تمام ایشیا میں اس وقت ایک عام بیداری ہے اور حکومت انگلستان کے مستبدانہ پنجے کی سخت گرفت سے ہر قوم نکلنے کی کوشش کررہی ہے۔ اگر ایسے وقت میں تا تصفیہ حقوق ہم بے عمل رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف ہماری غلامی کی زنجیر دراز ہوگی بلکہ عالم اسلام اور پورے ایشیا اور افریقہ کا اس سے نقصان ہوگا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو جو تجربہ ہندوستان میں ہوا ہے اس نے اس امر کو صاف کردیا ہے کہ حکومت جھکانے سے جھکتی ہے اور دبانے سے دبتی ہے، اور جس قوم نے اس پر اعتماد کیا یا سرفروشانہ طرز عمل حصول مقاصد کے لیے اختیار نہیں کیا اس کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔

تقسیم بنگالہ کی تنسیخ، صوبہ سرحدی کا پنجاب سے علیحدہ کرکے غیر آئینی علاقہ قرار دینا، صوبہ سرحد میں اصلاحات کا نافذ نہ ہونا، اور صوبۂ بہار میں اردو کی جگہ ہندی زبان کو سرکاری زبان قرار دینا۔ پھر کونسل میں اردو کو عدالتوں میں اختیاری قرار دینے کی تجویز پاس ہونے کے بعد بھی اس کی

عدم ترویج وغیرہ ایسے امور ہیں جو صرف اس وجہ سے ہوئے کہ مسلمان ان طریقوں پر عمل نہ کر سکے۔ جن کی انگریزی حکومت عادی ہے سب سے آخر ساردھا ایکٹ کا مسلمانوں پر جبری نفاذ اور باوجود شدید احتجاج کے مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ نہ کرنا، اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ ہم اپنا کوئی مقصد بغیر جذبۂ فدویت وقربانی پیدا کیے ہوے حاصل نہیں کر سکتے۔

مسلمانوں کے لیے اس ملک میں ملکی آزادی کے ساتھ قومی اور مذہبی آزادی بھی ضروری ہے۔ اس بارے میں ۱۸ء میں مسٹر مان ٹیگو کے دورے کے وقت حضرات علماء کی کوششوں سے ادارۂ اسلامیہ کے حصول کی جو سعی مشکور کی گئی اور بعد میں جمعیت علماء ہند نے جس کے حصول کا تہیہ کیا اس میں بھی آج تک ناکامی رہی۔

یہ اور اسی قسم کے تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہو، میرا خیال ہے کہ مسلمانوں نے قومی اور ملکی آزادی کے حصول کے لیے جو عمل ۲۰ء اور ۲۱ء میں شروع کیا تھا۔ جب اور جس وقت اس کے بڑھانے کا موقع ملے، بڑھانا چاہیے۔ اس قسم کے مقاصد ایک دفعہ کی کوشش سے نہیں بلکہ پیہم عمل سے حاصل ہوں گے۔ اس لیے اس جنگ میں ایک دفعہ تھک کر بیٹھ جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اور آج جب کہ صوبۂ سرحد وصوبۂ پنجاب وصوبۂ بمبئی، مشرقی بنگال کے مسلمان آزادی ملک وملت کی راہ میں قدم بڑھا کر ناقابل فراموش قربانیاں کر چکے ہیں، اور مسلمانان صوبۂ سرحد نے تو ایسی قربانی پیش کی ہے جس کی نظیر سرزمین ہند میں کوئی دوسری قوم آج تک نہیں پیش کر سکی۔ یقیناً ان مسلمانوں کی بے مثل قربانیاں مقصد اسلام کے ماتحت ان تعلیمات کا نتیجہ ہیں جو آج سے دس سال پیشتر تمام زعماے ہند اور اکابر علماے ملت نے مسلمانوں کو پیہم اور مسلسل دی ہیں۔ اس لیے ان حالات میں صوبۂ بہار کے مسلمانوں کا معطل بیٹھے رہنا اپنے ہم مذہبوں کی قربانیوں کی ناقدری اور اخوت اسلامی وجذبۂ ملی کے خلاف ہے۔ (سچ لکھنو۔ ۲۷رجون ۱۹۲۰ء، ص ۷)

شقاوت کا کمال:

۴رجولائی ۱۹۳۰ء: قانون شکنی کی موجودہ تحریک کس حد تک مناسب تھی، یہ ایسا سوال ہے، جس میں اختلاف خیال کی گنجایش ہے اور اس کے متعلق مختلف رائیں موجود ہیں۔ لیکن ''سرکار نامدار'' اس تحریک کو کچلنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ہوئے ہے، جن نئے نئے طریقوں سے اس بیسویں صدی میں نیرو کی سفاکی اور چنگیز کی شقاوت کی یاد تازہ کی جارہی ہے۔ ملک کے

گوشے گوشے میں، شیر برطانیہ جس جس طرح اپنی درندگی کا ثبوت دے رہا ہے، اور آج سے چند ماہ پیشتر سر ملکم ہیلی (گورنر صوبہ متحدہ) نے کونسل چیمبر میں کھڑے ہو کر جو دھمکی دی تھی کہ ہماری حکومت عنقریب اپنی سلطنت کا عملی ثبوت دینے والی ہے، اس وعید کا ظہور اپنی پوری شقاوتوں کے ساتھ جس طرح شروع ہو گیا ہے، کیا اس کے متعلق بھی کسی اختلاف خیال کی گنجایش ہے؟ کیا اس باب میں بھی کوئی دو رائیں ہو سکتی ہیں؟ گرفتاریوں کو چھوڑنے، قید با مشقت کی مشقتوں سے قطع نظر کیجیے۔ کیا یہ واقعہ نہیں۔ کہ نہتوں کے مجمع پر بے تامل لاٹھیاں برسائی گی ہیں؟ بڑے بڑے انگریز افسروں کی آنکھوں کے سامنے بلکہ ان کے حکم سے، بوڑھوں اور بوڑھیوں، کمسن بچوں اور بچیوں، جوانوں اور ادھیڑوں، سب کے سر اور سینے، پیٹ اور پیٹھ پر یکساں لاٹھیاں برسائی گئی ہیں؟ مردوں کے جسموں سے کپڑے اتار اتار کر انھیں مادر زاد برہنہ کر کے انہیں پیٹا گیا ہے؟ سیکڑوں ہزاروں اللہ کے بندوں کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا گیا ہے؟ لہولہان اور بیدم ہو ہو کر گرنے والوں کی مرہم پٹی اور طبی اعانت کے بجائے، اس حالت میں ٹانگیں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا گیا ہے، خاردار جھاڑیوں سے ان کے جسموں کو چھلنی کیا گیا ہے، اور کہیں کہیں انھیں نمک دار پانی کے اندر غوطے دیے گئے ہیں؟ زمین پر لیٹے ہوئے اور بیٹھے ہوئے نہتوں کے اوپر سے گھوڑے دوڑا دیے گئے ہیں؟ بڑے سے بڑے شریف زادوں اور بڑی سے بڑی شریف زادیوں کو گندی سے گندی گالیاں اور فحش کلامیاں سننی پڑی ہیں؟ مردوں کے جسم کے نازک ترین حصوں کے ساتھ وہ وہ قساوتیں، وہ وہ بے حیائی، وہ وہ بے ہودگیاں برتی گئی ہیں، جن کا ذکر بھی صراحت کے ساتھ زبان قلم پر نہیں آ سکتا؟ کیا ان میں سے کوئی بات خلاف واقع ہے؟ کیا ان میں سے کوئی جزیہ غلط ہے؟ عرب جاہلیت کی ایک وحشیانہ رسم مثلہ کرنا بھی، لیکن یہ مثلہ بھی ذی حس زندوں کے جسم کے ساتھ نہیں، بلکہ مردوں کی بے حس لاشوں کے ساتھ کیا جاتا تھا، اور نہتوں کے ساتھ نہیں، ہتھیار بند غنیم کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ زندوں اور نہتوں کے ساتھ مثلہ کرنے کا فخر بیسویں صدی کی مذہب و روشن خیال، آئین نواز و قانون دوست فرنگی حکومت کے لیے اٹھ رہا تھا؟..... جس حکومت کے یہ پُرفخر کارنامے ہوں، کیا اس کے انجام اور ''فریبی انجام کی پیش گوئی کے لیے کسی غیب دانی کی ضرورت ہے؟ سَیَعْلَمُ الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ (سچ لکھنو۔ ۴ر جولائی ۱۹۳۰ء)

ولایتی کپڑا:

۴ر جولائی ۱۹۳۰ء: '' کاتنے والوں اور بننے والوں کی مستقیم حالت میں کوئی اصلاح نہیں،

کاتنے اور بننے دونوں کے دونوں کام بہت سرد پڑ گئے ہیں، اور تیار شدہ مال کی نکاسی رکی ہوئی ہے۔ لنکاشائر اس وقت ایک دور مصیبت سے گزر رہا ہے، اور آئندہ کی حالت بھی یاس انگیز ہے۔ ہندوستان کی خبریں مایوس کن ہیں، اور ولایتی مال کے مقاطعہ کی تحریک کے سبب سے فرمائشیں برابر منسوخ ہو رہی ہیں۔" (مسٹر فریڈرک ٹیسٹرسال، مقام مانچسٹر، مورخہ ۳۰ مئی۔ در پانیر، مورخہ ۱۴ جون)

یہ الفاظ تھے، الفاظ کے بعد اب اعداد ملاحظہ ہوں۔

"۱۹۲۸ء لنکاشائر کا جتنا ہندوستان میں آیا تھا، ۱۹۲۹ میں اس سے بہ قدر ۲/۱-۸، کرور گز کے کم آیا! اور ۱۹۲۷ء میں جتنا آیا تھا اس سے بقدر ۲/۱-۴۴ کرور گز کے کمی رہی!" (لیڈر، ۱۰ جون ۳۰ء)

بے گناہوں پر لاٹھیاں اگر برستی ہیں تو برسنے دیجیے ہاتھ اور پیر توڑے جاتے ہوں تو ٹوٹنے دیجیے، سروں اور سینوں کو اگر گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، تو بننے دیجیے، ملکم ہیلی (گورنر یو، پی) کے الفاظ میں حکومت اپنی سلطنت کا عملی ثبوت جو کچھ دے رہی ہے، دینے دیجیے، لیکن ولایتی کپڑے کے مقاطعہ کی کامیابی کا اقرار تو اب زبان حال و زبان قال دونوں سے کرنا ناگزیر ہو گیا۔ ملک نے اگر خدا کے فضل و کرم سے کچھ اور روز اور مستعدی و استقلال کا ثبوت دیا، تو کم از کم اس محاذ جنگ پر تو کامیابی یقینی ہے۔ (سچ لکھنو ۴ جولائی ۱۹۳۰ء)

۳۰ جون: جون کے آخری ہفتے میں ورکنگ کمیٹی بھی خلاف قانون قرار دے دی گئی اور پنڈت موتی لال نہرو۔ ۳۰ جون کو گرفتار کر لیے گئے۔ ان کو چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ (تاریخ کانگریس، ص ۱۶۴)

آنریبل مسٹر ایچ جی ہیگ ہوم ممبر نے ان سولات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

(۱) یہ حقائق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پشاور کے ہیں۔ جون ۱۹۳۰ء کے فیصلہ میں بیان کیے گئے جس کی نقل لائبریری میں رکھی گئی ہے۔ یہ نہایت افسوسناک محض ایک حادثہ تھا۔

دوسرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا گیا لیکن تیسرے سوال کے جواب میں کہا گیا" مجھے اطلاع موصول ہوئی کہ جلوس کے لوگ بہت جوش میں تھے۔ راہ میں وہ ایک برطانوی فوجی دستہ کے نزدیک سے گزرے ہجوم کے لوگوں نے سپاہیوں سے رائفلیں چھیننے کی کوشش کی اور منتشر ہونے سے انکار کر دیا اس پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا گولی چلنے سے ۹ آدمی ہلاک اور ۱۸ زخمی ہوئے۔

چوتھے سوال کا جواب نفی میں ہے۔

مسٹر ایس جوسی مترا نے گولی چلنے کے تمام واقعات کی تفاصیل طلب کیں ہوم ممبر کی طرف سے ذیل کی تفاصیل پیش کی گئیں۔

سرکاری اعداد و شمار:

وسط جولائی ۱۹۳۰ء تک سول نافرمانی کے سلسلے میں ذیل کی تفصیلات کے مطابق لوگ پولیس کے مظالم کا نشانہ بنے: شولا پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ۱۲رمئی کو رات کے ساڑھے آٹھ بجے شہر کا انتظام ملٹری کے ہاتھوں میں دے دیا اسی روز بعد از دوپہر بمبئی گورنمنٹ کو اپنے ارادے سے مطلع کر دیا۔ بمبئی گورنمنٹ نے اسی شام کو منظوری دے دی۔ حکومت ہند کو اس کی اطلاع دوسرے روز پہنچی اور ۱۵رمئی کو شولا پور میں مارشل لا آرڈی نینس نافذ کر دیا گیا۔ ۸رمئی کو شولا پور میں چھ مختلف مقامات پر گولی چلائی گئی جس سے ۱۲ آدمی ہلاک اور ۲۸ زخمی ہوئے۔

ضلع کنارہ میں عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم میں قریباً آٹھ سو خاندانوں نے حصہ لیا سداپور اور انکولا کے تعلقوں میں جہاں کہ لوگوں کو سب سے زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا آٹھ سو کے قریب گرفتاریاں عمل میں آئیں ان میں سو عورتیں بھی شامل تھیں زمینوں جائیدادوں مویشیوں کی ضبطی اور فصلوں کی تباہی کے سلسلے میں تقریباً پندرہ لاکھ روپیہ کا نقصان ہوا۔ ذیل میں ان نقصانات کا تخمینہ تفصیل سے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس نقصان میں منقولہ جائداد شامل نہیں۔

انکولا اور سداپور کی ۳۳۰ خاندانوں کی زمینیں ضبط کی گئیں اس کا اثر دو ہزار کی آبادی پر ہوا اور دو ہزار ایکڑ کے قریب زمین ضبط ہوئی۔ اور اس کی قیمت آٹھ لاکھ روپیہ کے لگ بھگ تھی۔ ۱۶۶۰ مکانات پر قبضہ کر لیا گیا ۲۱۸ آدمی سزایاب ہوئے اور منقولہ جائیداد بیس ہزار روپیہ کی مالیت کی تھی۔ کئی کسانوں کو زبردستی مکانات سے نکال دیا گیا اور ان کے مکانوں کو پولیس کے کیمپوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ ضبط شدہ زمینوں میں سے فصلیں کاٹنے کے لیے باہر سے مزدور بلائے گئے۔ سداپور کے جن اشخاص نے ان کسانوں کی جائیدادوں کو خریدا تھا ان کے دروازوں پر ۲۷ ستیہ آگرہی عورتوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی اور ۳۱ روز تک یہ بھوک ہڑتال جاری رہی اسپیشل پولیس کے ۱۱۰ سپاہی انکولا اور سداپور میں تعینات کیے گئے۔ اور تقریباً ۲۷۰۰۰ روپیہ تعزیری پولیس کے لیے وصول کیا گیا۔ عدم ادائیگی لگان کے متعلق جو آرڈی نینس پاس ہوا تھا وہ کنارہ میں

مہم کے اختتام تک نافذ کیا گیا۔

سردار ولبھ بھائی ٹپل قائم مقام صدر نے گجرات کے کسانوں کو پیغام دیتے ہوئے کنارہ کے کسانوں کی قربانیوں کا خاص طور پر اعتراف کیا۔ انکولا میں تو عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم سیاسی شکل کی تھی مگر سرسی اور سداپور کے حلقوں میں مالی بدحالی کے باعث تھی کرالا جیسے چھوٹے سے صوبے میں بھی سول نافرمانی کے جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا گیا اور تحریک کے اختتام تک اس نے اپنی جدو جہد کو نہایت کامیابی سے جاری رکھا۔ آسام اور سلہٹ وغیرہ نے بھی پورا پورا حصہ لیا۔

تمام صوبجات میں دفعات ۱۴۴ اور ۱۰۸ ضابطۂ فوجداری کا استعمال زوروں پر تھا۔ پبلک میٹنگوں اور جلسوں کو لاٹھی چارجوں سے منتشر کیا جاتا تھا۔ میدناپور میں سختی کا چکر سب سے زیادہ خوفناک تھا کانگریس والنٹیروں کو خوراک وغیرہ مہیا کرنے کے جرم میں معززترین شہریوں کو تنگ کیا جاتا تھا معمولی بہانوں پر گولی چلادی جاتی۔ جون ۱۹۳۰ء میں کون ٹائی میں نمک بنتے ہوئے دیکھنے والے ہجوم پر گولی چلادی گئی جس سے پچیس آدمی سخت زخمی ہوئے۔ کھیرسائی میں بھی اسی طرح ہجوم پر گولیاں برسائی گئیں۔ گیارہ بے گناہ اور معصوم ان گولیوں کا شکار ہو گئے بائیس جون کو دیش بندھوداس کی برسی پر جلسے ممنوع قرار دے دیے گئے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بُری طرح زدوکوب کیا گیا۔ کئی آدمی سخت زخمی ہوئے۔ سپاہی بے تحاشہ گھوڑے ادھر ادھر ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے دوڑاتے پھرتے تھے کئی آدمی گھوڑوں کے نیچے آکر کچلے گئے۔ پولیس نے ایک کالج میں داخل ہو کر طلبا کو پیٹا۔ باری سال میں ایک ہی دن میں پانچ سو آدمی لاٹھی چارج سے زخمی ہوئے ستوک میں پولیس نے ستیہ آگرہیوں کی جائدادوں اور مکانات کو آگ لگادی۔ جن پر ستیہ آگرہیوں سے ہمدردی کرنے کا شک ہوا پولیس کے مظالم سے بچ نہ سکے۔

گوپی ناتھ پورہ میں کئی دیہاتیوں کو پیٹا گیا۔ پٹنے والوں میں ایک نابالغ مسلمان لڑکا بھی تھا۔ دیہاتی پولیس کی سختی کو دیکھ کر اس قدر جوش میں آگئے کہ انھوں نے پولیس والوں کو پکڑ ایک کمرے میں بند کر کے آگ لگادی جب کانگریس کے والنٹیروں کو اس واقعے کی خبر ہوئی وہ فوراً موقع پر پہنچے اور دو والنٹیروں نے تو اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر دروازے توڑ ڈالے اور آگ کے شعلوں میں سے سپاہیوں کو بچایا ۳۱؍جولائی کو ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے سبھاش بابو کو بھی پیٹا گیا وہ ابھی ابھی جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔

لاہور کی پولیس اور حکام تو اس تحریک سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے۔ کہ انھوں نے ''عدم

تعاون کے درخت'' کی تصویر بھی خطرناک سمجھ کر ضبط کر لی۔ لدھیانہ میں ایک پردہ دار عورت کو پکٹنگ کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ بدیشی کپڑا بیچنے والوں کے گھروں پر سیاپہ کیا گیا۔ راولپنڈی میں بری خوراک کھانے سے انکار کے باعث قیدیوں پر مقدمات چلائے گئے۔ منٹگمری جیل میں کئی روز کی مسلسل بھوک ہڑتال کے بعد لالہ ملکھی رام کوچ کر گئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں گورنر پنجاب پر حملہ ہونے کی وجہ سے پولیس کو ہر ایک گھر پہ چھاپہ مارنے کا بہانہ مل گیا۔ بنگال اور سی۔ پی کے مختلف علاقوں میں سیکڑوں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ ان علاقوں میں حکومت شراب کے ٹھیکوں سے لاکھوں روپیہ کا نقصان ہوا۔

۲۷ر جون ۱۹۳۰ء: کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمقام الہ آباد منعقد ہوا۔ اس میں دیگر تجاویز کے ساتھ فیصلہ کیا گیا کہ نمک سازی اور غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ کی تحریک جاری رہے گی۔ گاندھی جی اس وقت گرفتار ہو چکے تھے۔ (سکسٹی ایئرس آف کانگریس، ص ۳۰۳)

گول میز کانفرنس:

اگست ۱۹۳۰ء وبعدہ: یکم اور ۲ر اگست کو مسٹر جیاکار اور سر سپرو مہاتما گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس ملاقات کے دوران مہاتما جی نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ اس وقت تک انھیں کوئی دستور اساسی منظور نہ ہوگا جب تک کہ ہندوستان کو برطانوی سلطنت سے اپنی مرضی پر علاحدہ ہونے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ اور جو میرے گیارہ نکات پر پورا نہ اترے گا۔ مہاتما جی نے ان ہر دو اصحاب سے کہا، کہ وہ ان کے خیالات کو وائسرائے تک پہنچا دیں۔ اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت موتی لال اور ڈاکٹر سید محمود کو یرودہ جیل میں مہاتما جی سے گفت وشنید اور تبادلہ خیالات کرنے کے لیے لایا گیا۔

۱۴ر اگست ۱۹۳۰ء کو شرائط صلح پر غور کرنے کے لیے یرودہ جیل میں کانگریس رہنماؤں کی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال، ڈاکٹر سید محمود، مہاتما گاندھی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مسٹر جے رام داس، دولت رام اور شریمتی سروجنی دیوی شریک ہوئیں۔ اس کانفرنس میں انھی مطالبات اور شرائط کا اعادہ کیا گیا۔ جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مسٹر جے رام داس، دولت رام، مہاتما گاندھی و دیگر اصحاب نے صلح کی پیامبروں کی خدمات اور کوششوں کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔

۲۸ راگست کو وائسرائے نے ایک چھٹی لکھی۔ جس میں اس بات کا اظہار کیا گیا۔ کہ وہ مقامی حکومتوں کو سیاسی قیدیوں کی عام رہائی کے متعلق آمادہ کریں گے۔ لیکن دو قیدیوں کے معاملات پر انفرادی طور پر غور ضرور کریں گے نہروؤں کو واپس نینی جیل میں لے جایا گیا۔ انھوں نے ۳۰ ر اگست کو مہاتما جی کو لکھا کہ حکومت ابتدائی معاملات پر بھی غور کرنا ناممکن سمجھتی ہے اور چھٹی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حکومت صلح کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اس چھٹی کا یہ اثر ہوا۔ کہ صلح کی گفت وشنید ناکام ہوگئی۔

صلح کی گفت وشنید کی ناکامی سے ہندوستان کے خیر خواہ مایوس نہ ہوئے۔ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیاکار کی بعد مسٹر ہورلیس الیگزینڈر نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا۔ انھوں نے وائسرائے اور مہاتما گاندھی ہر دو سے ملاقات کی مہاتما جی کے مطالبات سن کر ان پر بہت اثر ا ہوا۔ جو صرف ہندوستان کی غیر معمولی غربی وافلاس کو دور کرنے سے تعلق رکھتے تھے۔ لارڈ ارون ایک طرف تو صلح کی گفت وشنید کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف سخت گیری کی پالیسی کو شدت سے عمل میں لا رہے تھے۔ تقریباً ایک درجن آرڈی نینس نافذ کیے جا چکے تھے۔ وہ نہایت ہوشیاری اور کامیابی سے دوطرفہ چال چل رہے تھے۔ لندن میں وزیر ہند گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تیاریوں میں مصروف اور ہندوستانی صوبجات کے گورنران کے ساتھ اس کھیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۲ ر نومبر ۱۹۳۰ء کو پہلی گول میز کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس کانفرنس میں کل ۸۶ ڈیلی گیٹ تھے۔ جن میں سے ۱۶ ریاستوں کے ۵۷ برطانوی ہندوستان کے اور ۱۳ انگلستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے تمام نمایندوں نے اپنی تقاریر میں درجہ نوآبادیات کا مطالبہ کیا۔ والیان ریاست نے بھی ہندوستان کی آزادی کی اپیل کرتے ہوئے فیڈریشن کے لیے اظہار خیال کیا۔ وزیر اعظم نے بعد ازاں ان ہر دو اسکیموں کی کامیابی کے اسباب اور ذرائع کی وضاحت کی۔ تقاریر کے بعد مختلف وسائل کے متعلق رپورٹیں تیار کرنے کے لیے بہت سی سب کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان سب کمیٹیوں میں ہوتا، صوبہ سرحد، فرنچائز، پبلک سروسز اقلیتوں وغیرہ کے مسائل پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ چناں چہ ۱۹ ر جنوری ۱۹۳۱ء کو کانفرنس کا دوبارہ باقاعدہ اجلاس ہوا۔ جس میں یہ تمام رپورٹیں غور وخوض کے لیے پیش کی گئیں۔

وزیر اعظم نے اس کانفرنس میں واضح طور پر بیان کر دیا کہ فیڈرل بنا پر مرکزی لیجسلیچر

بنائی جائے گی۔ جس میں تمام صوبجات اور ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں گے۔ حکومت ایگزیکٹو کی اس لیے جسمس لیچر کے سامنے ذمہ داری تسلیم کرلے گی۔ صرف ڈیفنس اور معاملات خارجہ ہی ریزروڈ رکھے جائیں گے۔ ملک کے امن وامان قائم رکھنے کی خاطر گورنر جنرل کو خاص اختیارات دیے جائیں گے۔ اس کے بعد اور بھی کئی معاملات کی وضاحت کرتے ہوئے ملک معظم کی حکومت کی پالیسی کے متعلق ذیل کا اعلان کیا گیا:

''ملک معظم کی حکومت کا خیال ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری صوبجاتی اور مرکزی مجالس آئین ساز پر ڈال دی جائے لیکن مقررہ عرصہ تک صرف چند اختیارات اس کے پاس رکھے جائیں، جن سے خاص حالات پر قابو پایا جاسکے اور جن سے اقلیتوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کی جاسکے۔ اس قسم کے آئینی تحفظات کی صورت میں بھی ملک معظم کی حکومت کا یہ پہلا فرض ہوگا۔ کہ وہ دیکھے کہ خاص اختیارات ہندوستان کے نئے دستور اساسی میں اس کی مکمل ذمہ دارانہ حکومت میں مداخلت نہیں کرتے۔''

وزیراعظم نے یہ بھی اعلان کیا کہ ''اگر ان لوگوں کی طرف سے جو اس وقت سول نافرمانی میں مصروف ہیں۔ وائسرائے کی اپیل کا جواب دیا گیا۔ تو انھیں بھی شمولیت کی دعوت دی جائے گی۔''

گول میز کانفرنس کی کارروائی کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتی لیکن ۲۱ر جنوری ۱۹۳۱ء کو یکا یک مہاتما گاندھی اور ان کے بیس رفقاء کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ تاکہ وہ گول میز کانفرنس میں شمولیت اور حکومت سے سمجھوتے کے متعلق کسی قسم کا آزادانہ فیصلہ کر سکیں۔

۲۶ر جنوری ہی کو سوراجیہ بھون الہ آباد میں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں ذیل کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

''انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی اس گول میز کانفرنس کی کارروائی کو کسی قسم کی منظوری دینے کو تیار نہیں ہے جو برطانوی نمائندوں اور حکومت کی طرف سے نامزد کیے گئے برطانوی ہند کے چند افراد اور والیان ریاست کے نمائندوں میں ہوئی ہے۔ کمیٹی کے خیال میں برطانوی گورنمنٹ کا وہ رویہ قابل مذمت ہے جو اس نے گول میز کانفرنس کے کھیل کو بنانے کے لیے اختیار کیا ہے۔ دراصل ہندوستان کے اصل لیڈروں مہاتما گاندھی و پنڈت جواہر لال نہرو ایسی شخصیتوں کو قید کرنے آرڈی نینس نافذ کر کے ہزار ہا بلکہ ان لاکھوں پر امن شہریوں کو لاٹھیوں سے منتشر کر کے جو سول نافرمانی میں مصروف تھے۔ ملک کی آواز کو دبانے کی ناجائز سعی کی گئی ہے۔ کمیٹی کا یقین

ہے کہ تمام مظلوم اقوام کے ہاتھوں میں سول نافرمانی ہی ایک موثر ہتھیار ہے۔''

''کمیٹی نے اس اعلان کا بغور مطالعہ کیا ہے جو برطانوی کیبنٹ کی طرف سے مسٹر رامزے میکڈ لنلڈ وزیر اعظم نے کیا ہے اور اس کے خیال میں یہ اعلان بالکل فضول اور معمولی ہے اس سے کانگریس کی پالیسی میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔''

''لاہور میں پاس شدہ مکمل ریزولیوشن کے مدنظر ورکنگ کمیٹی مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت موتی لال نہرو کے اس خیال کو منظور کرتی ہے۔ جس کا اظہار ان کو ۱۵ راگست ۱۹۳۰ء کی چھٹی میں کیا ہے اور اس کی رائے میں وزیر اعظم کا اعلان اس خیال کے مقابلے میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا۔ ورکنگ کمیٹی کے خیال میں اس وقت جب کہ ہزار ہا مرد اور عورتیں جیلوں میں قید و بند کے مصائب برداشت کر رہے ہیں۔ اور جب کہ حکومت کی سختی پورے زوروں پر ہے اس قسم کا اعلان ملک میں کسی قسم کا امن و امان پیدا نہیں کرسکتا اور نہ ہی سول نافرمانی کے تعطل کا سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ کمیٹی اس صورت حالات میں ملک کو اس جدوجہد آزادی کو جاری رکھنے کا ہی مشورہ دے سکتی ہے اور توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کرے گی۔''

''کمیٹی ملک کے بچوں عورتوں اور مردوں کی اس بے نظیر بہادری و استقلال کا اعتراف کرتی ہے جس کا اظہار اس نے ۷۵ ہزار گرفتاریوں، لاٹھی چارجوں، گولیوں کو چھاتیوں پر کھانے، مکانوں جائیدادوں اور زمینوں کی ضبطی اور پولیس کی زدوکوب کو برداشت کرنے سے کیا ہے۔''

''ورکنگ کمیٹی ملک سے ۲۶ رجنوری کو یوم آزادی پوری شان سے منانے کی اپیل کرتی ہے اس روز اس پروگرام پر عمل کر کے جس کا پہلے اعلان کیا جاچکا ہے ظاہر کر دیا جائے کہ ملک اپنی پوری طاقت سے جدوجہد آزادی کو جاری رکھے گا۔''

جس وقت یہ ریزولیوشن پاس ہوا، اس وقت بابو راجندر پرشاد صدر تھے، جن کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنی گرفتاری پر نامزد کیا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو کو بھی علالت کی باعث سزا ختم ہونے سے پہلے ہی رہا کر دیا گیا۔ ان کی علالت روز بروز نازک صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ اس میٹنگ میں پنڈت مدن موہن مالویہ بھی موجود تھے۔ زیر بحث معاملہ یہ تھا کہ آیا ریزولیوشن شائع کیا جائے یا نہ؟ مختلف اصحاب کی مختلف آراتھیں۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ اسے دوسرے روز تک شائع نہ کیا جائے۔ لیکن دوسرے روز یکا یک ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ لندن سے سر تیج بہادر سپرو کا بحری تار موصول ہوا جس میں لکھا کہ وہ ہندوستان آرہے ہیں۔ اس لیے ان کے آنے سے

پیشتر وزیراعظم کے اعلان کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ نہ کریں۔ چناں چہ اس تار کے مطابق اس قرار داد کی اشاعت ملتوی کردی گئی۔

۲۵ر جنوری (۱۹۳۱ء) کو وایسرائے کی طرف سے بھی ذیل کا اعلان شائع ہوا:

''میری حکومت صوبجاتی حکومتوں کے مشورے سے اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وزیراعظم کے ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو کیے گئے اعلان پر اچھی طرح غور کرنے کے لیے ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو آزاد کر دینا چاہیے۔ اس فیصلے کے مطابق ان کی کمیٹی کی میٹنگ جو قانون ترمیم ضابطۂ فوجداری کے ماتحت خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی ہے، کرنے کے لیے اس پر سے مقامی صوبجاتی حکومتیں پابندیاں دور کر دیں گی۔ اور مہاتما گاندھی اور دوسرے اصحاب کی جو جنوری ۱۹۳۰ء سے کمیٹی کے ممبر رہے ہیں، رہائی عمل میں آجائے گی۔

ان تمام اصحاب کی رہائی غیر مشروط ہوگی کیوں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ صلح کی گفت وشنید اور امن وامان کی گفتگو غیر مشروط آزادی کی صورت ہی میں اچھی طرح کامیاب ہو سکتی ہے۔ حکومت ہند کی یہ کارروائی وزیراعظم کے اعلان کے مطابق اس پالیسی کی مظہر ہے کہ ہم ہندوستان میں پرامن صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔''

''مجھے توقع ہے کہ جن لوگوں کی اس اعلان کے مطابق رہائی عمل میں آئے گی وہ بھی اسی اسپرٹ کا اظہار کرتے ہوئے اس معاملے کی اہمیت پر خاطر خواہ توجہ دیں گے۔''

۷ر اکتوبر ۱۹۳۰ء: نوجوان بھارت سبھا کے رہنما سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی رواج گرددوار اور بی کے دت (بنگالی) کو پولیس کے ڈی آئی جی سانڈرلیس کے قتل اور سنٹرل اسمبلی مین بم پھینکنے کے جرم کی سزا سنا دی گئی۔ بھگت سنگھ کو سزائے موت اور ان کے دونوں ساتھیوں کو بیس بیس سال قید سخت کی سزا دی گئی ہے۔

شیخ الاسلام اور تھانہ بھون کی تحریک:

۸ر اکتوبر ۱۹۳۰ء: حضرت شیخ الاسلام کا یہ مکتوب گرامی جلمانہ ضلع کرنال کے مولانا محمد سلیمان کے نام ہے انھوں نے حضرت سے بعض سوالات کیے تھے یا ممکن ہے اعتراضات کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا تھا۔ حضرت نے نمبروار تمام سوالات کے جواب تحریر فرمائے۔ اگرچہ سوالات درج نہیں لیکن جوابات سے ان کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نمبر ۳ کا تعلق خانقاہ تھانہ بھون کے

کسی طالب علم یا منتسب کے قول سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان اس کا اپنا نہیں اس کے اساتذہ اور بزرگوں میں سے کسی کا ہوگا کہ مولانا حسین احمد مدنی کے وجود سے دارالعلوم کو نقصان پہنچ رہا ہے یا اس کی عزت کو بٹا لگ رہا ہے۔ حضرت نے اس اعتراض کا کیسا معقول جواب دیا کہ اگر ایسا ہے تو اسے نکال دیں! نہیں نکالتے تو اس نقصان کے وہ خود ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ یہ عجیب نقصان ہے کہ ایک قرن تک حضرت کا دارالعلوم سے تعلق رہا لیکن دارالعلوم میں طلبہ کی تعداد بڑھتی رہی، اساتذہ میں اضافہ ہوا نئی عمارات بنیں، اس کی شہرت کو تمام عالم اسلامی میں چار چاند لگ گئے۔ دینی اور تعلیمی حلقوں میں اس نے ہر آنے والی صبح کو زیادہ اعتماد اور اعتبار حاصل کیا جنگ آزادی میں اس کے طلبہ اور اساتذہ اور خود حضرت کے وجود سامی کے تعلق اور آپ کے ایثار اور قربانیوں کی بدولت اسے جو وقار اور تاریخی مقام حاصل ہوا، برصغیر کا کوئی دوسرا ادارہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اگر اسے نقصان پہنچنا کہتے ہیں تو کاش حضرت کی حیات مستعار کی مہلت اور طویل ہو جاتی تاکہ کچھ اور نقصان پہنچ جاتا۔ اب آپ حضرت کا مکتوب سامی ملاحظہ فرمائیں:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کے ہمدردی بھرے الفاظ اور دعاؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جواب آپ کے سوالات کا اختصار کرتے ہوئے پیش کرتا ہوں۔

(۱) بیشک میں کانگریس کا حامی ہوں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ کانگریس ملک کی مشترکہ جماعت ہے۔ اس میں ملک کا ہر ایک باشندہ ممبر ہے اور ہو سکتا ہے۔ ۱۸۸۵ء سے قائم ہے ۸ یا ۹ اس کے صدر مسلمان ہو چکے ہیں۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء ۱۹۲۰ء سے برابر اس میں شریک ہو کر کام کرنے کی ہدایت کرتے رہے۔ یہ خالص ہندوؤں کی جماعت نہیں ہے۔ ہندوؤں کی خالص جماعت مہاسبھا ہے وہ صرف ہندوؤں کے فریقانہ حقوق کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ جس طرح مسلم لیگ خالص مسلمانوں کے حقوق کی ذمہ دار ہے۔ جس طرح میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسل، اسمبلی میں مسلمان ملکی حقوق کی حفاظت وغیرہ کے لیے جاتے ہیں، اسی طرح کانگریس میں جانا اور تمام ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانا اور اس کے لیے جنگ بقدر طاقت کرنا ضروری ہے اور میں اس کو جہاد اور افضل الجہاد اس وقت سمجھتا ہوں۔

(۲) مولانا اشرف علی صاحب زید مجدہم کے خیال سے ان امور میں صرف میں ہی مخالف

نہیں ہوں بلکہ حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز بھی خلاف تھے۔ خلافت کی تمام تحریک میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کا شریک ہونا اور جدو جہد کرنا ضروری اور واجب سمجھتے تھے اور مولانا تھانوی اس کو فتنہ وفساد اور حرام سمجھتے رہے۔ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ادنیٰ خادم اور ان کی رائے کا متبع ہوں۔ باوجود اس اختلاف کے میں مولانا تھانوی کا دشمن نہیں، ان کی بے ادبی نہیں کرتا، ان کو بڑا اور بزرگ جانتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مولانا اس امر میں غلطی پر ہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں۔

(۳) جو قصہ آپ سے خانقاہ کے طالب علم نے دارالعلوم دیو بند کے متعلق بیان کیا وہ اس کی نادانی ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو اس نادان کو خبر نہیں کہ دارالعلوم دیو بند پچاس برس سے بہت زیادہ تجاوز کر گیا ہے۔ آج اس کی عمر کا سڑسٹھواں سال گزر رہا ہے۔ حضرت نانوتوی کے ارشاد سے ستر ہ ۱۷ سال زیادہ گزر چکے ہیں۔ خدا کے فضل سے ابھی تک مدرسہ نہایت آب وتاب سے زندہ ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ حسین احمد کی وجہ سے مدرسہ کے انعدام کا خطرہ ہے تو حسین احمد صرف ایک نوکر ہے۔ جس کو مہتمم، ممبران مدرسہ، سرپرست سب کے سب علاحدہ کر سکتے ہیں۔ مدرسہ کا بچانا ان لوگوں کا اولین فرض ہے۔ اگر حسین احمد کے کسی فعل کی بناء پر مدرسہ خطرہ میں ہو تو ان پر فرض ہے کہ حسین احمد کو کان پکڑ کر ذلت اور رسوائی کے ساتھ نکال دیں یہ ان لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ قیامت کو یہ سب جوابدہ ہوں گے۔ یہ سب حضرات اجتماعاً وانفراداً کیوں نہیں حسین احمد کو علاحدہ کر دیتے۔ اگر ایسی صورت میں یہ ذمہ دار حضرات ایسے خطرناک گہنگار شخص کو علاحدہ کر کے مدرسہ کو نہ بچائیں گے تو یہی حضرات مدرسہ کے بگڑنے اور فنا ہونے کے باعث ہوں گے۔ جو کچھ ذمہ داری ہوتی ہے وہ آقا پر آتی ہے۔ ملازم پر نہیں آتی۔ آخر ممبر، سرپرست، مہتمم کس کام کے لیے ہیں؟

(۴) روئے زمین پر اور ہندوستان میں سب سے بڑا دشمنِ اسلام انگریز ہے۔ اس نے جس قدر اسلام کو برباد کیا ہے اور کر رہا ہے اور کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ دنیا بھر میں کسی قوم اور کسی ملک نے نہیں کیا۔ ہندو کی دشمنی اس کی دشمنی کے سامنے ایسی ہے۔ جیسا ذرہ پہاڑ کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ اس لیے انگریز کی مدد اور حمایت کرنا کسی حال میں (درست اور جائز) نہیں سخت حرام ہے۔ کانگریس میں شریک ہونا ہندو کی حمایت نہیں بلکہ ایک مشترک مقصد میں ساتھ ہے۔ جس طرح ریل گاڑی کے ایک ڈبہ میں بیٹھ کر ایک ہندو اور ایک مسلمان دہلی کا سفر کرتے ہیں، اسی طرح

انگریزوں کی قوت کو ضعیف کرنا، ملک سے ان کا اقتدار گھٹانا اور نکالنا، اپنے ملک اور قوم کو آزاد کرانا، دارالحرب کو سخت دشمن سے نکال کر باشندوں کو نجات دلانا جو ہندو قوم کا مقصد ہے، یہی مسلمان کا بھی ہے، وہی سکھ کا بھی ہے، وہی پارسی کا بھی ہے۔ لہٰذا محاذ جنگ اور میدان عمل مشترک ہے۔ اس میں ایک کا دوسرے کو مدد کرنا نہیں ہے بلکہ ہر ایک کا مشترک میدان میں اتر کر اپنے اپنے مقصد کو حاصل کرنا ہے۔ جب گاؤں میں آگ لگ جائے تو سب کا فرض ہے کہ اس کو بجھائیں بلکہ مسلمانوں کا فرض اولین ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرائیں۔

(الف) یہ دارالاسلام تھا، انگریزوں نے ہجوم کر کے دارالحرب بنایا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کو نکالیں۔

(ب) مسلمانوں کو غیر مسلموں کی رعایا بن کر نہ رہنا چاہیے۔ لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا۔

(ج) مسلمان بادشاہوں اور حاکموں کو قتل و غارت کر کے انھوں نے اس اسلامی ملک پر غاصبانہ قبضہ کیا۔

(د) ہندوستان کی فوجوں اور خزانوں اور ہتھیاروں سے تمام ممالک اسلامیہ کو برباد کیا اور لاکھوں مسلمان ہر جگہ میں قتل و غارت کیے گئے۔

(ہ) مسلمانان ہند کی جان، مال، عزت، دین سب کو برباد کر رہے ہیں اور اسی طرح ہمارے غیر مسلم پڑوسیوں کو۔ مسلمانوں پر جس طرح اپنے دین، جان، مال، عزت اور اہل وعیال کی حفاظت فرض ہے اسی طرح پڑوسیوں کی بھی خبر گیری اور ہمدردی ضروری ہے اگرچہ وہ غیر مسلم ہوں۔

ہندو اگر جنگ آزادی لڑ رہے ہیں تو محض ملکی ضروریات کی بنا پر، مگر ہمارے لیے تو ملک، دین، سیاست، فقر و فاقہ وغیرہ سب اسی کے متقاضی ہیں۔ ہندو اگر ہمارا خون چوسنا چاہتا ہے اور اس کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا تو انگریز تقریباً تین سو برس سے ہمارا خون چوس رہا ہے اور باوجود ہر طرح سے ہر ملک میں فنا کر دینے کے آج بھی اس کو چین نہیں آیا۔ آج بھی علاوہ ہندوستان کے فلسطین اور سرحد میں ہم کو قتل و غارت کرتا ہے، ہندوؤں کو بھی اسی نے ہمارا دشمن بنایا، انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں اس قدر نفرت نہ تھی، تاریخ اور پرانے واقعات شاہد ہیں، مسلمانوں کو لازم ہے کہ کوئی بھی آج ان کے اصلی اور سب سے بڑے دشمن کو شکست دینا ہو تو

اس کے ساتھ ہوکر اس دشمن کو اور اس کی قوت کو دنیا سے مٹا دیں۔ آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے سب سے بڑی عبادت الٰہی یہی ہے کہ سب سے بڑے دشمن اسلام کے مٹانے میں جس قدر بھی ممکن ہو حصہ لیا جائے قرآن میں ہے۔ قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقا تلونکم...... الآیہ . قاتلو ا المشر کین کافۃ کما یقاتلو نکم کافۃ...... الآیۃ ......

پھر میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ خبردار خبردار انگریزوں کی ادنیٰ درجہ کی بھی حمایت اور خیر خواہی یا مددگاری نہ کیجیے۔ یہ دنیا اور آخرت کا وبال ہے۔ ولایتی چیزوں سے خصوصاً کپڑوں سے خود رکیے اور دوسروں کو روکیے اور جس قدر بھی ممکن ہو مسلمانوں میں اتحاد و تنظیم پیدا کیجیے اور گورنمنٹ (برطانیہ) کی قوت کو برباد کرنے کی تدبیر کیجیے۔ والسلام۔

ننگ اسلاف حسین احمد

دیوبند ۱۵ر جمادی الاول ۱۳۴۹ھ (۸ر اکتوبر ۱۹۳۰ء)

"مقاطعہ" کا حیرت انگیز اثر:

۲۸ر نومبر ۱۹۳۰ء: ہندوستان کی تحریک مقاطعہ نے انگلستان کی تجارت برآمد اور بالخصوص کپڑے کی تجارت نیز بیکاری پر جو اثر ڈالا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اعداد اور شمار سے ہوسکتا ہے۔ ان اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ سال گذشتہ کے ماہ جولائی میں برطانوی تجارت ۵ر کروڑ ۳۲ لاکھ پونڈ کی تھی مگر سال رواں کے ماہ جولائی میں وہ گھٹ کر تین کروڑ ستانوے لاکھ رہ گئی ہے۔ کپڑے کی برآمد کے سلسلے میں سال گزشتہ کی بہ نسبت پچاس فی صد خسارہ ہے۔

اعداد و شمار عام مصنوعات:

جولائی ۱۹۲۹ء	۵ کرور	۳۲ لاکھ	پونڈ
جنوری ۱۹۳۰ء	۴ کرور	۴۷ لاکھ	پونڈ
فروری ۱۹۳۰ء	۴ کرور	۱۲ لاکھ	پونڈ
مارچ ۱۹۳۰ء	۴ کرور	۲۵ لاکھ	پونڈ
اپریل ۱۹۳۰ء	۲ کرور	۶۷ لاکھ	پونڈ
مئی ۱۹۳۰ء	۳ کرور	۹۸ لاکھ	پونڈ

جون ۱۹۳۰ء	۳ کرور	۳۸ لاکھ	پونڈ
جولائی ۱۹۳۰ء	۳ کرور	۹۷ لاکھ	پونڈ

سوتی کپڑا

اگست ۱۹۲۹	۸۷۷۵۴۲۹	پونڈ
جنوری ۱۹۲۰ء	۸۰۷۵۹۹۷	پونڈ
فروری ۱۹۲۰ء	۷۵۲۰۰۰۸	پونڈ
مارچ ۱۹۲۰ء	۶۹۱۱۲۰۳	پونڈ
اپریل ۱۹۲۰ء	۶۴۰۹۱۵۷	پونڈ
مئی ۱۹۲۰ء	۵۴۹۰۶۹۹	پونڈ
جون ۱۹۲۰ء	۴۱۷۵۸۵۸	پونڈ
جولائی ۱۹۲۰ء	۵۱۷۴۸۸۴	پونڈ
اگست ۱۹۲۰ء	۴۴۳۵۲۳۰	پونڈ

مصنوعات فولاد و آہن وغیرہ

اگست ۱۹۲۹ء	۵۵۷۲۵۳۹	پونڈ
جنوری ۱۹۳۰ء	۵۴۷۱۳۵۸	پونڈ
فروری ۱۹۲۹ء	۴۷۳۴۱۱۸	پونڈ
مارچ ۱۹۲۹ء	۵۱۹۳۶۴۰	پونڈ
اپریل ۱۹۲۹ء	۴۲۲۴۸۵۹	پونڈ
مئی ۱۹۲۹ء	۴۹۴۲۲۸۱	پونڈ
جون ۱۹۲۹ء	۴۱۰۳۱۸۹	پونڈ
جولائی ۱۹۲۹ء	۴۸۹۴۲۰۰	پونڈ
اگست ۱۹۲۹ء	۳۶۰۶۰۲۸	پونڈ

بیکاری

اگست ۹۲۲۹ء	۱۹۹۰۰۰

جنوری ۱۹۳۰	۱۵۲۰۰۰۰
فروری ۱۹۳۰ء	۱۵۸۸۰۰۰
مارچ ۱۹۳۰ء	۱۶۹۴۰۰۰۰
اپریل ۱۹۳۰ء	۱۷۶۱۰۰۰
مئی ۱۹۳۰ء	۱۸۵۶۰۰۰
جون ۱۹۳۰ء	۱۹۱۲۰۰۰
جولائی ۱۹۳۰ء	۲۰۷۰۰۰۰
اگست ۱۹۳۰ء	۲۰۳۶۱۳۲
ستمبر ۱۹۳۰ء	۲۱۰۹۶۵۸

درآمد مصنوعات قطن:

جنوری	۴ کرور	۸۹	لاکھ	روپیہ
فروری	۳	۹۹	لاکھ	روپیہ
مارچ	۴	۵۴	لاکھ	روپیہ
اپریل	۳	۹۷	لاکھ	روپیہ
مئی	۳	۲۴	لاکھ	روپیہ
جون	۲۰	۴۱	لاکھ	روپیہ
جولائی	۱	۶۴	لاکھ	روپیہ

تجارت وصنعت کے متعلق مختلف برطانوی مراکز کی رپورٹیں حسب ذیل ہیں:

صنعت فولاد کو سخت نقصان پہنچا۔

برمنگھم میں بازار سرد رہا۔

شفیلڈ میں ماہ گزشتہ کی بہ نسبت صورت حالات ردی تھی۔

والی سال میں کارخانہ ہائے آہن خاموش رہے۔

گلاسگو میں بازار کا حال پتلا ہو رہا ہے۔

انجنیئرنگ کے اسباب کی تجارت گھٹ رہی ہے۔

کلائڈ کے گودی کے مالی گودام یونا فیوما خالی ہو رہے ہیں۔

برمنگھم میں دھات کا بازار سرد ہے۔

مغربی انگلستان میں معاون کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ حالات حوصلہ شکن ہیں۔

سوتی کپڑے کے متعلق عام رائے یہی ہے کہ جب تک ہندوستان اور چین کی منڈیوں میں یہی حالت رہے گی، یہاں کے حالات حوصلہ شکن رہیں گے۔

پارچہ باف جا بجا بیکار ہو رہے ہیں۔ بوٹوں اور چمڑے کی اشیاء کی قیمتیں کم کر دینے کے باوجود ان چیزوں کی تجارت بالکل کم ہو گئی ہے۔ خریدار مستعدی کا اظہار نہیں کرتے۔ (سچ لکھنؤ۔ ۲۸۔ نومبر ۱۹۳۰ء)

ولایتی کپڑا:

۲۶ دسمبر ۱۹۳۰ء: اس سال ہندوستان میں بہ قدر ۹ کروڑ ۲۰ لاکھ گز کے کم آیا۔ اکتوبر ۲۹ء میں ولایتی سوتی کپڑے کی درآمد ۲/۱۔۱۳ کروڑ گز ہوئی تھی۔

ستمبر ۳۰ء میں ولایتی سوتی کپڑے کی آمد گھٹ کر ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ گز رہ گئی۔

اکتوبر ۳۰ء میں ولایتی سوتی کپڑے کی درآمد گھٹتے گھٹتے ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔

گویا سال میں تقریباً ۵ کروڑ گز کی اور ایک مہینہ کے اندر ۶۰ لاکھ گز کی کمی ہوئی۔ کیا جنگ آزادی کے اس جزو میں بھی، ہندو مسلمان کی کمی ہوئی۔ کیا جنگ آزادی کے اس جزو میں بھی، ہندو مسلمان کا کوئی اختلاف ہے؟ (سچ لکھنؤ۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۰ء)

قصہ خوانی فائرنگ سے قرارداد پاکستان تک:

۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء: قصہ خوانی بازار پشاور کے قتل عام کے بعد سول نافرمانی کی آگ پورے صوبہ سرحد میں پھیل گئی تھی۔ یہ تحریک اپنے جوہر میں عدم تشدد کی تحریک تھی۔ اسے بندوقوں سے کچلنے کی ایک کوشش کا انجام سامنے تھا۔ آگ دور دور تک بھڑک اٹھی تھی۔ اسکندر مرزا نے راس کیمل سے جو تربیت پائی تھی، یعنی تشدد سے مسائل حل نہیں کیے جا سکتے، اب اسے عملی طور پر برتنے کا وقت آ گیا تھا۔ ان کے اپنے لفظوں میں:

''مجھے جلد ہی ایسے طریقے استعمال کرنے کا موقع ملا۔ میری اگلی تقرری پشاور کینٹ میں ہوئی، جہاں ڈپٹی کمشنر مسٹر اولف کیرو (جنھوں نے بعد میں سر کا خطاب پایا) تھے۔ میں اسسٹنٹ

کمشنر بنااور میرا ہیڈکوارٹر نوشہرہ میں تھا۔ پشاور کا ضلع تشدد آمیز تصادم کا مرکز تھا۔ سرخ پوش شہر میں سرگرم تھے اور پھر قبائلی لشکر (حملہ آور دستے) تھے، جو قریبی پہاڑیوں سے اپنی کارروائیاں کرتے تھے۔ ۲۵ر اگست ۱۹۳۰ء میں صوبے میں خصوصی قوانین نافذ کر دیے گئے۔ پھر حکومت نے انڈین نیشنل کانگریس کو ایک غیر قانونی تنظیم قرار دے دیا۔ نتیجتاً سرخ پوش بھی اس پابندی کی زد میں آئے۔ مزاحمت جاری تھی اور کرسمس کے دن ایک بڑے آپریشن کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔

حکومت کے خلاف نوشہرہ سب ڈویژن میں سرگرمیوں کا مرکز ایک گاؤں تھا جو پہی کہلاتا تھا۔ یہ جی ٹی روڈ کے پشاور نوشہرہ سیکشن پر واقع تھا۔ میں نے برطانوی پیدل دستوں کی بٹالین گھڑ سواروں کا ایک دستہ اور پولیس کی تین سو کی نفری کو پہی کے ایک کھلے مقام پر جمع کیا اور ۲۵۔ دسمبر کو صبح صادق کے وقت وہاں پہنچ گیا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ سرخ پوشوں پر ہیبت طاری کی جائے اور مجھے امید تھی کہ فورس کے اس بڑے مظاہرے کے بعد فائرنگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میری پرانی رجمنٹ پونا ہارس سے تعلق رکھنے والے گھڑ سوار دستے کے کمانڈر میجر برانز اور پیدل دستے کے انگریز کمانڈر میرے خیالات سے متفق تھے۔ اس لیے بھی کہ فوجی دستوں کے لیے بغیر حملہ آور ہجوم کے خلاف فوجی ایکشن سے زیادہ نفرت انگیز کام کوئی اور نہیں ہوتا۔ سرخ پوش پوری طرح منظم تھے اور گاندھی کے عدم تشدد کے اصول پر پوری طرح کاربند۔ ہم کسی خونریزی کے بغیر ہجوم کو خاموش کرنے میں کامیاب ہوگئے تاہم مجھے پولیس کو اکثر و بیشتر بیٹن چارج کا حکم دینا پڑا۔ میں ایک گھڑ سوار دستے اور لاریوں میں پولیس کو لے کر پہی کے گرد آٹھ میل کے محور میں گشت کرتا رہا۔ اس طرح ہم نے جلد ہی اس صورت حال پر قابو پایا۔ (انگریز راج اور پشتون سیاست از احمد، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۹۔ ۴۸)

علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد:

۳۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء: آل انڈیا مسلم لیگ کا اکیسواں سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء کو بمقام الہ آباد منعقد ہوا اس میں علامہ اقبال نے تاریخی خطبۂ صدارت پیش کیا جو خطبہ الہ آباد کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانان ہند کو معاشرتی اور اجتماعی طور پر واحد منظم گروہ قرار دیا اور اس گروہ کے لیے جو تاریخی، نسلی، اقتصادی اور مذہبی مشترکہ مفادات رکھتا ہے علاحدہ ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی۔

''میں سمجھتا ہوں اور اب یہ بات واضح ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں، عقائد اور معاشرت میں اختلاف کی خلیج حائل ہے۔ ان کے پیش نظر مستقل و مستحکم حکومت کے قیام کی ایک ہی صورت ہے کہ ہندوستان میں مختلف آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو تاریخ، مذہب، نسل اور اقتصادی مفادات کے اشتراک پر مبنی ہوں۔''

''میں تو چاہتا ہوں کہ پنجاب، صوبہ شمال مغربی سرحدی، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست کی صورت دے دی جائے۔ چاہے پھر یہ ریاست برطانوی ہند ہی کے اندر اپنی خود مختار حکومت کا قیام عمل میں لائے۔ یا اس سے باہر۔ مگر میرا احساس ہے کہ آخر کار شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک علاحدہ اسلامی ریاست لازماً قائم کرنا ہوگی۔'' (ولی خان اور قرارداد پاکستان از محمد فاروق قریشی، صفحہ ۲۰۷)

لیکن علامہ اقبال نے جو کچھ فرمایا اس کا تعلق پاکستان کے اس تصور اور اسکیم سے کچھ نہ تھا جو بعد میں سمجھا گیا۔ چناں چہ جب ایڈورڈ تھامسن نے پاکستان اسکیم کے بانی کی حیثیت سے علامہ اقبال کو پیش کیا تو انھوں نے مسٹر تھامسن کے نام خط میں اس کی تردید کر دی اور کلکتہ کے ایک لیگی رہنما مولانا راغب احسن کے نام خط میں اس غلط فہمی کو اخبار میں بیان دے کر دور کرنے کے لیے تاکید کی۔ تھامسن کے نام ۴۔ مارچ کا اور راغب احسن کے نام ۶؍ مارچ ۱۹۳۴ء کے خطوط علامہ اقبال کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۳۰ء:

سید ممتاز احمد سجادہ نشین خانقاہ اخوند جی (فراش خانہ، دہلی) نے صدر جمعیت علمائے ہند سے چند سوالات کیے تھے ان کا جواب حضرت مفتی کفایت اللہ کے قلم سے یادگار ہے۔ سوالات کی اہمیت کے پیش نظر سوالات اور جوابات دونوں درج کیے جاتے ہیں۔ سوالات یہ ہیں:

(۱) ایک شخص غیر مسلم و غیر معاہد حکم کرتا ہے کہ قوانین مروجہ، حکومت حاضرہ کی خلاف ورزی اس کی قوم اور اس کے ہم وطن کریں جس سے رام راج حاصل ہوگا۔ بہ صورت قانون شکنی بغیر استطاعت اندفاع و بغیر کوشش اندفاع برداشت کرنے کی حتیٰ کہ گولی چلنے کے وقت گولی کو اپنے سینے پر لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے تو شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) اگر اس غیر مسلم کے حکم کی تعمیل میں کوئی مسلمان اس خطرے میں یہ جانتے ہوئے کہ گولی لگنے سے موت واقع ہوسکتی ہے اپنے آپ کو مبتلا کرے اور گولی لگنے سے مرجائے تو اس کی موت کیسی موت ہوگی؟ آیا اس کو شہادت کہیں گے یا خودکشی؟

(۳) ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ کھدر پہنو اس کی تعمیل میں کوئی مسلمان کھدر پہنتا ہے۔ اور فخر کرتا ہے کہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس حکم کو فرض قرار دے کر دوسرے مسلمانوں کو اس غیر مسلم کے حکم پر آمادہ کرتا ہے اور جو شخص کھدر پہنے اس سے نفرت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا کھدر پہننا اور حکم غیر مسلم کی تعمیل کو فرض سمجھنا کھدر نہ پہننے والے مسلمان سے نفرت کرنا کیسا ہے؟

(۴) حکومت حاضرہ کی طرف سے نمک بنانے پر عرصے سے محصول لیا جاتا ہے۔ ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ یہ محصول دیے بغیر نمک بناؤ اور گرفتار ہو جاؤ۔ اس پر ایک مسلمان کہتا ہے کہ اس نے باوجود غیر مسلم ہونے کے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس لیے اس غیر مسلم کے حکم کی تعمیل ہر مسلم پر فرض ہے۔ مسلم کا یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟

اس سوالات کے جوابات یہ ہیں:

غالباً یہ سوالات تحریک حاضرہ سے متعلق ہیں اگر ایسا ہے تو تحریر سوالات میں کسی قدر تلبیس سے کام لیا گیا ہے جو مناسب نہ تھا بلکہ چاہیے یہ تھا کہ واقعہ صاف صاف ذکر کر کے اس کا حکم دریافت کیا جاتا۔ مثلاً سوال اول یوں لکھنا چاہیے تھا کہ ہندوستان پر ایک غیر ملکی حکومت کا جبریہ قبضہ ہے، جس کو ہندوستان کے رہنے والے کسی طرح پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پردیسی قوم جو ہزاروں میل دور سے آکر ہمارے ملک و وطن پر قابض و متسلط ہے اور ہمارے تمام خزائن اور منافع کو ہمارے ہاتھوں سے چھین کر لے جارہی ہے۔ اور جس کی بدولت اہل ملک بھوکے اور محتاج ہو گئے ہیں، جلد سے جلد ہمارا ملک خالی کردے تاکہ اہل ملک خود اپنی مرضی کے موافق حکومت قائم کریں اور اپنے ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں۔ لیکن وہ پردیسی حکومت کسی طرح ہندوستانیوں کی خواہش کا احترام کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اپنی مادی طاقت کے بل پر جبراً حکومت کررہی ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس مادی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ کیوں کہ تمام مادی طاقتیں اور قوتیں اسی پردیسی قوم نے اپنے قبضے میں کررکھی ہیں حتیٰ کہ ہندوستانیوں کو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے بھی ہتھیار رکھ سکیں۔ اس لیے ہندوستان کی ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستان کی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں یہ طے کیا کہ اس غیر ملکی

حکومت متسلطۂ جابرہ سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے جبریہ قوانین کی خلاف ورزی کی جائے اور اس سلسلے میں جو تکالیف اور مصائب برداشت کرنے پڑیں ان کو برداشت کیا جائے اور اپنی طرف سے تشدد پر ہرگز اقدام نہ کیا جائے تاکہ تحریک آزادی کی کامیابی کی امید ہو ورنہ بصورت تشدد حکومت کو تشدد کا بہانہ مل جائے گا۔ اور پھر وہ اپنی مادی قوت سے قوم کو تباہ کردے گی۔ خلاف ورزی قوانین کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ملک میں سے ایک شخص تیار ہوا جو غیر مسلم تھا۔ اس مجلس مشترک نے اس کو اس مظلومانہ جنگ کی انجام دہی کے لائق سمجھ کر اس جنگ کی تکمیل کے اختیارات دے دیے۔ اب وہ غیر مسلم تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے آداب بتا رہا ہے اور قوم کو لڑا رہا ہے تو آیا اس کے حکم کی تعمیل جائز ہے یا نہیں؟ اور اس مظلومی کی جنگ میں اگر مطالبہ حق آزادی کی وجہ سے کسی کی جان تلف ہو جائے تو وہ شہید ہوگا یا نہیں؟ اور آیا بحالات مذکورہ آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے آپ کو ایسے خطرات میں مبتلا کرنا جس میں جان تلف ہو جانے کا خطرہ ہے جائز ہے یا نہیں؟ سوال کی صحیح شکل یہ ہے اب اس کا جواب یہ ہے کہ:

۱۔ ہندوستان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قومیں آباد ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی اصول سے مسلمانوں پر ایک غیر مسلم حکومت متسلطہ جابرہ سے اپنے ملک کو آزادی کرانا اولین فریضہ ہے مسلمان جو ان الحکم الا للہ. اور لن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلاً پر ایمان رکھتے ہیں وہ طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کرسکتے۔ اگر اطاعت کرتے ہیں تو مجبوری اور اضطراری طور پر کرتے ہیں اور اگر اس مجبوری اور اضطرار کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو ان پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس جبری حکومت کے جوے کو اپنی گردن سے اتار پھینکیں۔ یہ وجہ تو ایسی ہے کہ اس میں غیر مسلم شریک نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے (جس میں ہندوستانی اقوام برابر کی شریک ہیں) کہ ایک اجنبی قوم کو جو ہزاروں میل پرے کی رہنے والی ہے کوئی حق نہیں کہ وہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے۔ ہم اس کی حکومت کو ایک لمحے کے لیے بھی طوعاً برداشت کرنے کو تیار نہیں اور یہ ہمارا فطری، عقلی، عرفی، بین الاقوامی حق ہے اور جس تدبیر اور جس طریقے سے ہم اپنا یہ حق حاصل کرسکیں اختیار کرنے اور عمل میں لانے میں حق بجانب ہوں گے۔ چوں کہ ہمارے پاس مادی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے معذور و مجبور ہیں۔ مگر عدم تشدد کے ساتھ سول نافرمانی کی مظلومانہ جنگ یقیناً لڑ سکتے ہیں اور اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ

لاٹھیاں کھائیں، سنگینیں، برچھیاں، چھرے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً ان کو اپنے حق آزادی کے مطالبہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے۔ کیوں کہ ان کا فعل فی حد ذاتہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر حکوت لاٹھیاں برسائے یا سنگینیں بھونکے یا چھرے اور گولیاں مارے تو یہ بربریت اور ظلم حکومت کا فعل ہے۔ اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ نہ ان مظلوموں پر جو اپنا حق مانگتے ہیں اور کسی ایسے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس کو وہ پہلے ناپسند کرتے تھے مگر مجبوراً اس کی تعمیل کیا کرتے تھے۔

۲۔ رہی یہ بات کہ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت بسا اوقات اپنی بربریت کے مظاہرہ کے لیے لاٹھیاں چلاتی ہے، گولیاں برساتی ہے کسی کو ایسے خطرے میں پڑنا جائز ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ مطالبۂ حقوق ہمیشہ خطرات سے پر ہوتا ہے۔ مذہب و وطن کی آزادی کا مقصد چوں کہ اعلیٰ ترین مقصد ہے اس لیے اس راستے کے خطرات بھی بہت بڑے اور ہیبت ناک ہیں۔ مگر بغیر خطرے کے تو کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو۔ اور اگر بغیر اس کے کہ ہماری طرف سے کوئی تشدد آمیز حرکت ہو حکومت بلا وجہ تشدد پر اتر آئے اور ہمیں مار مار کر زخمی یا شہید کر دے تو اس کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ مثلاً یہ قصد ہو کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کریں اور پانسو اشخاص ایسے مہیا کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ منتشر نہ ہوں اس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کرو کہ صرف یہی پانسو اشخاص تھے اور یہ سب عدم تشدد کے پابند تھے۔ اب حکام آئے اور انھوں نے حکم دیا کہ منتشر ہو جاؤ انھوں نے منتشر ہونے سے انکار کیا مگر کوئی اور حرکت نہیں کی تو اس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ ان سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے۔ مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاٹھیوں سے پٹوا کر منتشر کراتی ہے اور کبھی گولیاں چلوا کر بہیمیت اور بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے۔

اس ظالمانہ کارروائی کی وجہ سے مظلوموں کا وہ فعل ناجائز نہ ہو جائے گا جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اس بربریت اور بہیمیت کا شکار ہو کر شہید ہوں گے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان کو خودکشی کا مرتکب کہنا سخت جہالت اور ناواقفیت احکام شرعیہ کی دلیل ہے۔ سول نافرمانی کی اس مظلومانہ جنگ میں جو اپنے مذہب اور وطن

کو ایک غیر ملکی حکومت کے جابرانہ قوانین سے آزاد کرانے کے لیے اپنی وطنی مشترک مجلس کی طرف سے جاری کی گئی ہے۔ شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کرنا جائز ہے کیوں کہ یہ کوئی مذہبی رہنمائی اور دینی ہدایت نہیں ہے۔ محض جنگی رہنمائی ہے جو لوگ اسے ناجائز کہنے کی جرأت کرتے ہیں اور اس جنگ میں زخمی ہونے والوں کو ملامت کرتے ہیں اور مرجانے والوں کو شہادت سے محروم کرتے ہیں؛ وہ پہلے ان مسلمانوں کا حکم بتائیں جو کسی غیر مسلم، جابر، دشمن اسلام حکومت کی حمایت اور اس کی حرص ملک گیری کی خاطر اس کے مقرر کیے ہوئے غیر مسلم افسروں کی کمان میں رہ کر ان غیر مسلموں کے فوجی احکام کی اطاعت کرتے ہیں اور بسا اوقات غیر مسلم حکومت کی طرف سے اپنے مسلمان بھائیوں کو نشانہ بندوق بناتے ہیں یا خود گولی کھا کر مرجاتے ہیں۔ ان مسلمانوں کا کیا حکم ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ حکومت کے غیر مسلم افسروں کی ماتحتی میں کام کریں اور مسلمانوں پر گولیاں چلائیں۔ اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ غیر مسلم ججوں کے سامنے اپنے مقدمات لے جائیں اور ان سے خلاف شرع فیصلے کرائیں اور ان پر عمل کریں۔ اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ شرعی معاملات نکاح طلاق، آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ نزاعات کے مقدمات غیر مسلم حکام کی عدالتوں میں فیصلے کے لیے لے جائیں۔ اگر ان تمام باتون کا جواب نفی میں ہے تو ان حضرات کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ قوت ایمانی کا ثبوت دینے کے لیے پہلے ان امور کے متعلق فتویٰ شائع کرتے اور مسلمانوں کو ان مہلکات سے بچانے کی کوشش کرتے جنھوں نے ان کے اسلام اور قومیت دونوں کو فنا کر دیا ہے۔

۳۔ کھدر پہننے کا جو حکم اس غیر مسلم نے دیا ہے وہ اس نے اپنے مذہب کی بناء پر نہیں دیا ہے بلکہ ملک و وطن کی بھلائی اور دشمن کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر سمجھ کر دیا ہے۔ اور مسلمانوں کے لیے کھدر پہننا مذہبی احکام کے بموجب ناجائز نہیں ہے۔ یہ حکم ان احکام سے بدرجہا زیادہ قابل تعمیل ہے جو انگریزی عدالتوں کے غیر مسلم حکام سے حاصل کیے جاتے ہیں اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کھدر ہی بہترین لباس ہے۔ اور جب کہ پہننے والوں کی نیت اپنے بھائیوں کی فائدہ رسانی بھی ہو تو ایک پنتھ دو کاج دوہرا ثواب ملے گا۔ اس کو گاندھی پرست فرقہ کا شعار بتانا میری سمجھ سے باہر ہے۔ اول تو کھدر پہننے والے مسلمانوں کو گاندھی پرست کہنا ہی ظلم عظیم ہے۔ کیوں کہ وہ مسلمان ہیں اور خدا پرستی کے سوا کسی کی پرستش ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی؛ وہ تو رسول پرست بننے سے بھی توبہ کرتے ہیں۔ پھر ان کو گاندھی پرست کہنا کتنی

بڑی جرأت وجسارت ہے۔

دوسرے یہ کہ وکیلوں کے گون اور اسی طرح بعض اداروں کے مخصوص لباسوں کے متعلق ان حضرات نے کبھی کوئی فتویٰ شائع کیا ہے یا نہیں اور اس کو حکومت پرستی یا ادارہ پرستی کی بناء پر ناجائز فرمایا ہے یا نہیں؟ نہیں تو کیوں نہیں؟

۴۔ قانون نمک کی خلاف ورزی اس کی سہولت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اختیار کی گئی ہوگی۔ اصل مقصد تو قانون شکنی ہے۔ ابتداءً ایسا قانون اختیار کیا گیا جس کی خلاف ورزی ہر مقام پر ہر صوبے میں ہو سکے اور ہر شخص انفرادی طور پر کر سکے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس قانون کو منتخب کرنے میں یہ فائدہ بھی ظاہر ہوا کہ شریعت اسلامیہ میں نمک کو اپنے فطری معاون میں آزاد رکھا گیا ہے۔ اگر کسی مسلمان

تحریک سول نافرمانی میں مسلمانوں کی قربانیاں:

۱۹۳۰ء میں کانگریس نے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی جو تحریک شروع کی تھی۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اس میں گرفتار ہونے والے مختلف صوبوں کے صرف مسلمانوں کے اعداد و شمار مرتب کر دیے ہیں۔ مولانا قاسمی صاحب کی تحقیق کے مطابق ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ سرحد: چالیس ہزار، ۲۔ پنجاب: پانچ ہزار، ۳۔ یوپی: دس ہزار، ۴۔ بہار: تین ہزار، ۵۔ بنگال: چار ہزار، ۶۔ آسام: تین ہزار، ۷۔ بمبئی: تین ہزار، ۸۔ سی پی: ڈیڑھ ہزار، ۹۔ سندھ: تین ہزار، ۱۰۔ اڑیسہ: ایک ہزار، ۱۱۔ مدراس: ایک ہزار، کل میزان (۷۴۵۰۰) چوہتر ہزار پانچ سو افراد۔

مولانا قاسمی صاحب نے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۲ء کی گورنمنٹ آف انڈیا کی مختلف رپورٹوں سے اسی زمانے میں تحریک خلافت سے سول نافرمانی کی تحریک تک تمام گرفتار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد، دو لاکھ ستر ہزار پانچ سو بتائی ہے۔

(مسلمانان ہند کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا مستند اور معتبر تاریخی جائزہ، دہلی، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۱۰۹ء)

نمک ستیہ گرہ میں گرفتار ہونے والوں کی تعداد نوے ہزار ہے۔ جب کہ پولیس تشدد سے مرنے والوں کی تعداد تین ہزار ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق مختلف صوبوں سے گرفتار ہونے والوں میں مسلمانوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

پنجاب سے پانچ ہزار، یوپی سے دس ہزار، بہار سے تین ہزار، بنگال سے چار ہزار، آسام سے تین ہزار، بمبئی سے تین ہزار، سی پی سے ڈیڑھ ہزار، سندھ سے تین ہزار، مدراس سے ایک ہزار، اڑیسہ سے ایک ہزار، صوبہ سرحد سے دس ہزار...... کل تعداد ساڑھے چوالیس ہزار۔

(کارروان احرار، ج ۱)

۱۹۳۱ء

۴ر جنوری ۱۹۳۱ء: مولانا محمد علی لندن میں انتقال فرما گئے۔ وہ خلافت کمیٹی کے رہنما کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔ انھیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا ہے۔

۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء: مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ۱۵ر جنوری کو دفتر جمعیت علماے ہند میں بمقام دہلی ہوا۔ جلسے کا آغاز ساڑھے چار بجے ہوا۔ اجلاس دو روز جاری رہا۔ متعدد انتظامی امور زیر بحث آنے اور قراردادیں پاس ہوئیں۔

دو قراردادوں میں الگ الگ مولانا محمد علی اور شاہ محمد زبیر مونگیری کی وفات پر تعزیت کی گئی اور ان کی سیاسی و ملی خدمت کا اعتراف کیا گیا۔ ایک قرارداد میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی گرفتاری پر مبارک باد پیش کی گئی اور ان کی سیاسی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ایک قرارداد میں عوام اور اہل ثروت سے اپیل کی گئی کہ وہ محبان وطن اور جانبازان حریت کی وہ جائیداد ہرگز نہ خریدیں جو برٹش استعماری حکومت ضبط کر کے نیلام کرتی ہے۔ ایک قرارداد میں کانگریس سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ جلد از جلد اس امر کا اعلان کرے کہ آزادی کی راہ میں جن لوگوں کی جائیدادیں ضبط ہوں گی یا جن خاندانوں کو شدید جانی و مالی نقصان پہنچے گا، آزاد ہندوستان کی حکومت ان سب کی پوری تلافی کی کوشش کرے گی۔ ایک قرارداد کے ذریعے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ کانگریس کے ممبر بنیں۔

(جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۷۷-۱۷۵)

۲۱ر جنوری: ہم بورسد کی عورتوں کی بہادری اور قربانیوں کا ذکر کر کے اس دردناک داستان کو ختم کر دیں گے۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۳۱ء کو بورسد میں ہنگامی تیوہار اور دن منانے کے لیے ایک بڑا

بھاری جلوس نکالا گیا۔ بورسد کی عورتوں نے پانی پلانے کے لیے بازاروں اور گلیوں میں جگہ جگہ انتظام کیا ہوا تھا۔ پولیس ان مظاہروں کو مکمل طور پر دبانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ ان عورتوں کی ہمدردی کو بھی برداشت نہ کر سکی۔ اس نے پانی کے برتن توڑ پھوڑ ڈالے اور عورتوں کو دھکے مار کر وہاں سے ہٹا دیا اس موقعے پر پولیس کی بے حیائی اور بد معاشی کی انتہاء ہو گئی۔ بعض سپاہی برتنوں سمیت گری ہوئی عورتوں کی چھاتیوں پر قدم رکھ کر کچلے چلے جاتے تھے۔ پولیس کی اس کارروائی سے تمام علاقہ میں جوش و غصہ کے جذبات انتہاء کو پہنچ گئے۔

(تاریخ کانگریس، ص ۸۸۔۶۸۷)

۲۶ رجنوری ۱۹۳۱ء: سبھاش چندر بوس گرفتار کر لیے گئے (کرنل محبوب احمد، ص ۵۴)

کانگریس رہنماؤں کی رہائی، مشورے اور فیصلے:

۲۶ رجنوری تا ۷ رفروری ۱۹۳۱ء: ۲۶ رجنوری ۱۹۳۱ء کو ۲۶۔ کانگریس رہنما رہا کر دیے گئے جن اصحاب کی دھرم پتنیاں جیلوں میں تھیں وہ بھی رہا کر دی گئیں۔ مہاتما جی نے رہا ہوتے ہی اپنے مخصوص انداز میں ملک کے نام یہ پیغام دیا۔

> ''میں جیل سے بالکل خالی دماغ لے کر نکلا ہوں اور میں سر تیج بہادر سپرو سے وزیر اعظم کے اعلان کے متعلق تبادلہ خیالات کرنے کو تیار ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں ملک کی موجودہ حالت کا بھی بغو معائنہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے اس خیال کا اظہار سر تیج بہادر سپرو کے اس بحری تار کی بنا پر کیا ہے جو انھوں نے لندن سے روانہ کیا ہے۔''

گو پنڈت موتی لال نہرو بھی رہا ہو چکے تھے اور پنڈت مدن موہن مالویہ بھی جیل سے باہر تھے۔ مگر انھوں نے ورکنگ کمیٹی کے اصل ممبروں کی عدم موجودگی میں کسی قسم کا فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس ورکنگ کمیٹی میں جو قرارداد پاس کی وہ دراصل اشاعت کے لیے نہ تھی۔ مہاتما گاندھی نے جیل سے باہر آتے ہی محسوس کیا کہ ملک میں تحریک اس قدر زور پکڑ گئی ہے کہ عوام کو جلدی کسی سمجھوتے کے لیے مجبور کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ گورنمنٹ بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ مہاتما جی نے شرائط صلح کے متعلق کسی قسم کا اشارہ نہ کیا لیکن وہ یہ ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکے کہ'' پکٹنگ اور نمک بنانے کے حقوق کو کسی صورت میں بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ بدیشی اشیاء،

کا بائیکاٹ، شراب کے خلاف جہاد صرف موجودہ حکومت کے خلاف نہیں کیے جارہے بلکہ یہ ہندوستان کے دائمی مفاد کے لیے ہیں۔" مہاتما جی نے ایک اور انٹرویو میں کہا" وہ امن اور صلح کے لیے بیتاب ہیں۔ بشرطیکہ وہ عزت سے حاصل ہوں اور اس امن اور صلح کو ہرگز ہرگز منظور نہیں کریں گے۔ جس میں ان کے تین سوالات کو پورا نہ کیا جائے گا اور میں گول میز کانفرنس کے درخت کو بھی اس کے پھل سے ہی پہچانو گا۔"

مہاتما جی اپنی رہائی کے بعد پنڈت موتی لال نہرو کی بیمار پرسی کے لیے فوراً الہ آباد کو روانہ ہو گئے۔ ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو بھی وہیں بلایا گیا تھا۔ سوراجیہ بھون میں میٹنگ ہوئی جس میں ذیل کا ریزولیشن پاس ہوا:

"ورکنگ کمیٹی نے سرتیج بہادر سپرو اور مسٹر شاستری کی خواہشات کے مدنظر ریزولیشن کی اشاعت ملتوی کردی ہے۔ اس سے غیر ممالک میں مشہور ہو گیا ہے کہ سول نافرمانی معطل کردی ہے اس لیے کمیٹی یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ کہ سول نافرمانی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ اس کے تعطل کے متعلق کسی قسم کی ہدایات نہ جاری کی جائیں۔ یہ میٹنگ پبلک کو یاد دلاتی ہے کہ بدیشی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرنا بذات خود سول نافرمانی کی مہم میں شامل نہیں ہے اور جب تک یہ بالکل پرامن رہے پبلک کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے۔"

۳ و ۷ر فروری ۱۹۳۱ء کے درمیان: " یہ میٹنگ بدیشی کپڑے اور سوت کے سوداگروں اور کانگریسی کارکنوں کو یاد دلاتی ہے کہ ہندوستانیوں کے مفاد عامہ کے مدنظر بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ مستقل قومی سرگرمیوں کا ایک حصہ ہے۔ اور جب تک مکمل طور پر بدیشی کپڑے کی خرید و فروخت بند نہ ہو جائے گی۔ یہ سرگرمی جاری رہے گی۔"

"کانگریس کی اپیل پر بدیشی کپڑے اور سوت کی فروخت بند کرنے کی کارروائی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہوئی یہ کمیٹی ان سوداگروں اور دکانداران مال کو یاد دلاتی ہے کہ کمیٹی، کانگریس کمیٹی کو یہ اختیار نہیں کہ انہیں موجودہ بدیشی مال کو ہندوستان کے کسی حصہ میں فروخت کرنے کی امید دلائے۔"

موتی لال نہرو کا انتقال:

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ۳ر فروری تک الہ آباد میں رہے کیوں کہ پنڈتی موت لال نہرو

کی حالت روز بروز زیادہ خطرناک ہوتی جارہی تھی مہاتما جی پنڈت موتی لال کے ساتھ لکھنو بھی گئے۔مگر وہاں بھی انھیں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ان کی حالت مایوس کن ہوتی جاتی تھی۔بالآخر وہ پھرالہ آباد واپس آ گئے کہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ سوراجیہ بھون میں ہی کریں اور میرے سامنے مجھے بھی اپنی مادر وطن کی قسمت کے باعزت فیصلے میں شامل ہونے کا موقع دیں۔اگر مجھے مرنا ہی ہے تو آزاد ہندوستان کی گود میں مروں۔مجھے اپنی آخری اور دائمی نیند ایک غلام نہیں بلکہ آزاد ملک میں نصیب ہو۔'' اور اس طرح وہ عظیم شخصیت، وہ کامیاب سیاستدان، وہ بے نظیر محب الوطن ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا۔اس نازک موقعے پر جب کہ اس بھارت ورش کی قسمت کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ ان کی وفات ملک کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔پنڈت جی دنیا کے کامیاب ترین سیاستدانوں اور مدبروں میں شمار ہوتے تھے۔کرنل ویجوڈ بین وزیر ہند نے ان کے متعلق فرمایا تھا ''پنڈت موتی لال نہرو برطانوی تدبر کا مسکت جواب ہیں۔'' وہ کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہ تھے۔انھوں نے اپنی پریکٹس میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا۔لیکن مہاتما جی کے زیر اثر انھوں نے عیش و عشرت پر لات مار کر اپنے فاقہ مست اور مفلس ہندوستانی بھائیوں کے دوش بدوش مصائب و تکالیف برداشت کیں۔اپنا روپیہ قوم و ملک کی بہبودی پر خرچ کیا۔ان کا ملک کو آخری تحفہ ''سوراجیہ بھون'' تھا اور سب سے بڑا تحفہ انھوں نے اپنے قابل بیٹے جواہر لال نہرو کی شکل میں ملک کو دیا۔انھوں نے اپنا سب کچھ ہی ملک و قوم اور مادر وطن کے نام پر نچھاور کر دیا۔کتنے ایسے باپ ہیں جو اپنے اکلوتے بیٹے کو کامیاب بیرسٹر جج وزیر و دیگر اعلے عہدوں کی بجائے جیل کی چار دیواری میں دیکھنے کی ہمت رکھتے ہیں۔آج پنڈت جی ہمارے درمیان نہیں ہیں۔لیکن ان کی روح ہمارے سروں پر بیتابی سے منڈلا رہی ہے ان کی بے نظیر قربانیاں آنے والی نسلوں کو مشعل ہدایات کا کام دیں گی۔''

مہاتما جی کو پنڈت جی کی وفات سے جو صدمہ ہوا اس کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔آپ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔۷رفروری کو آپ نے اخبارات کو ذیل کا پیغام برائے اشاعت بھیجا:

''پنڈت موتی لال نہرو کی وفات ہر ایک محب الوطن کے لیے باعث رشک ہونی چاہیے۔وہ اپنا سب کچھ ملک پر نچھاور کر کے بالآخر خود بھی اس پر قربان ہو گئے۔مرتے وقت بھی ان کے لبوں پر ملک اور آزادی کے الفاظ تھے۔ہمیں بھی ان کی قربانیوں کا اعتراف کرنے کے لیے وطن کی آزادی کے لیے ہر ممکن قربانی کرنی چاہیے۔جس کے لیے وہ آخری دم تک ترستے رہے'' لبرٹی

کے نامہ نگار کو آپ نے جو بیان دیا وہ اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔

۱۷ر فروری سے ۴ رمارچ ۱۹۳۱ء تک لارڈ اردن وائسرائے ہند اور گاندھی جی میں جو ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان کے نتیجے میں جو معاہدہ طے پایا ہے۔ ۵ر مارچ کو اسی پر دستخط ہو گئے۔

گاندھی جی وائسرائے معاہدہ

حکومت ہند

ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی

۵ر مارچ ۱۹۳۱ء

اعلان

گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے ذیل کا اعلان عام پبلک کی واقفیت اور آگاہی کے لیے شایع کیا جاتا ہے!

(۱) ہز ایکسی لینسی وائسرائے اور مسٹر گاندھی کے مابین جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ سول نافرمانی واپس لے لی جائے گی اور ملک معظم کی منظوری سے حکومت ہند اور صوبجاتی حکومتوں کی طرف سے کوئی خاص ایکشن نہیں لیا جائے گا؟

(۲) کانسٹی ٹیوشنل مسائل کے متعلق طے ہوا ہے کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے لیے دستور اساسی پر غور کیا جائے گا۔ اور اس کے لیے جو اسکیم تیار کی گئی ہے اس میں فیڈریشن ایک ضروری جزو ہے۔ اور ہندوستان کے مناد کے پیش نظر ''ڈیفنس'' معاملات خارجہ اور اقلیتوں کے مسائل کے متعلق حکومت ہند کو تحفظات دینے بھی منظور کیے گئے ہیں۔

(۳) ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم نے جو اعلان کیا ہے، اس کے مطابق گول میز کانفرنس میں کانسٹی ٹیوشنل مسائل کی بحث میں حصہ لینے کے لیے کانگریسی نمایندوں کی شرکت کے متعلق قدم اٹھایا جائے گا۔

(۴) اس سمجھوتے کا تعلق سول نافرمانی سے متعلقہ تمام سرگرمیوں سے ہے۔

(۵) سول نافرمانی مکمل طور پر واپس لے لی جائے گی۔ سول نافرمانی کی واپسی کا مطلب اس سے متعلقہ تمام سرگرمیوں کا خاتمہ ہے۔ مثلاً؛

(۱) قانون کی کسی دفعہ کی منظم مزاحمت۔

(۲) عدم ادائیگی ٹیکس اور لگان کی مہم۔

(۳) سول نافرمانی کی تائید میں پمفلٹوں اور پوسٹروں کی اشاعت۔

(۴) سول اور ملٹری کے ملازموں کو گورنمنٹ کے خلاف ابھارنے یا ان کو مستعفی ہو جانے کے لیے کہنا۔

(۶) بدیشی مال کے بائیکاٹ کی دو صورتیں ہیں: اولاً بائیکاٹ کی شکل اور ثانیاً بائیکاٹ کے ذرائع! اس سلسلے میں حکومت کی پوزیشن حسب ذیل ہے:

حکومت ہندوستان کی اقتصادی اور صنعتی ترقی میں اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے حق میں ہے۔ اور وہ پروپیگنڈے کے ان ذرائع پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کرنا نہیں چاہتی۔ جو انفرادی آزادی اور لا اینڈ آرڈر کے قیام کے خلاف نہیں۔ بائیکاٹ تمام بدیشی دغیر ملکی مال کا ہوگا نہ صرف برطانوی مال کا جو سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے خاص طور پر شروع کیا گیا تھا۔ یہ منظور کیا گیا ہے کہ اس قسم کا بائیکاٹ برطانوی، ہندوستانی اور ریاستوں کے نمایندوں کے مابین دوستانہ گفت وشنید پر کسی طرح اثر انداز نہ ہوگا۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے آیندہ برطانوی مال کا بائیکاٹ بطور سیاسی ہتھیار کے نہیں کیا جائے گا۔

(۷) غیر ملکی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کو پکٹنگ کے قانون کی حد سے باہر نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کا عام قانون کی حدود کے اندر رہنا ضروری ہے۔ اس قسم کا پکٹنگ بالکل پر امن ہونا چاہیے ایسے مظاہرے نہ ہونے چاہئیں جس سے کسی شخص کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا ہو جس جگہ اس قسم کا واقعہ ظہور پذیر ہوا کا پکٹنگ ممنوع قرار دیا جائے گا۔

(۸) مسٹر گاندھی نے پولیس کی کارروائیوں اور حرکات کے متعلق چند خاص الزامات ظاہر کر کے تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں حکومت اسے مناسب نہیں سمجھتی۔ کیوں کہ اس قسم کی تحقیقات سے پبلک اور پولیس کے تعلقات بدتر ہو جانے کا اندیشہ ہے اور قیام امن میں مشکل پیدا ہو جائے گی۔ ان معاملات کے مدنظر مسٹر گاندھی نے اس مطالبے پر زور دینے کا خیال چھوڑ دیا۔

(۹) حکومت سول نافرمانی کو واپس لینے پر ذیل کی شرائط پر عمل پیرا ہوگی۔

(۱۰) تحریک سول نافرمانی پر نافذ کردہ۔ تمام آرڈی نینسوں کو واپس لے لیا جائے گا۔

۱۹۳۱ء کا آرڈی نینس جو تحریک دہشت انگیزی کو دبانے کے لیے جاری کیا گیا اس ضمن میں

نہیں آتا۔

(۱۱) ۱۹۰۸ء کے قانون ترمیم ضابطۂ فوجداری کے ماتحت کیے گئے اعلانات کو واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطے کہ یہ سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں جاری کیے گئے ہوں۔ اس قانون کی رو سے جلسوں اور جلوسوں کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

برما گورنمنٹ نے حال ہی میں اس قانون کے ماتحت جو اعلانات کیے ہیں وہ اس میں شامل نہیں ہیں۔

(۱۲) (الف) سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے کے سلسلے میں بھی تمام مقدمات واپس لے لیے جائیں گے۔ بشرطے کہ وہ تشدد کی زد میں نہ آتے ہوں۔

(ب) یہی اصول ضمانتوں کے سلسلے میں بھی اختیار کیا جائے گا۔

(ج) اگر کسی جگہ لوکل گورنمنٹ نے لیگل پریکٹیشنرز ایکٹ کے ماتحت وکلا کے خلاف ہائی کورٹ میں درخواست دی ہو تو وہ مقدمہ کو واپس لے لینے کی سفارش کرے گی۔ بشرطے کہ وکیل کسی تشدد اور جرم کا مرتکب نہ ہوا ہو۔

(د) فوج کے سپاہیوں اور پولیس کے خلاف حکم عدولی کے سلسلے میں جو مقدمات چل رہے ہیں یا سزائیں ہوئی ہیں۔ وہ اس شرط کے دایرے میں نہیں آئیں۔

(۱۳) (الف) وہ قیدی رہا کیے جائیں گے۔ جن کو سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں سزا ہوئی ہے۔ جو تشدد یا کسی ٹیکنیکل تشدد کے جرم کے مرتکب نہیں ہوئے۔

(ب) اگر کسی قیدی کو جسے نمبر الف کے مطابق سزا ہوئی ہے جیل کے قوانین کی خلاف ورزی میں بھی سزا ہوئی ہے تو بھی معاف کردی جائے گی اور اگر ان کے خلاف مقدمات دایر ہیں تو وہ واپس لے لیے جائیں گے۔

(ج) افسران کی حکم عدولی کے سلسلے میں جن سپاہیوں یا پولیس کے آدمیوں کو سزائیں ہوئی ہیں ان پر یہ شرائط عائد نہ ہوں گی۔

(۱۴) جو جرمانے ابھی تک وصول نہیں کیے گئے وہ معاف کردیے جائیں گے۔ ضمانت کی ضبطی کے سلسلے میں جاری کیے گئے احکام بھی واپس لے لیے جائیں گے۔ جو جرمانے وصول ہو چکے ہیں اور ضمانتیں ضبط ہو چکی ہیں وہ واپس نہیں کی جائیں گی۔

(۱۵) سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں جو امدادی پولیس عوام کے اخراجات پر تعینات

کی گئی ہے واپس بلالی جائے گی امدادی پولیس کے لیے جو جرمانے وغیرہ وصول کیے جا چکے ہیں۔ واپس نہیں کیے جائیں گے۔ اور وصول (نہ) ہونے والی رقوم معاف کردی جائیں گی۔

(۱۶) **(الف)** منقولہ جائداد جو سول نافرمانی کی تحریک میں حکومت کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ واپس کردی جائے گی۔ بشرطے کہ ابھی تک حکومت کے قبضہ میں ہو۔

(ب) مالیۂ زمین کو وصول کرنے کے لیے جو غیر منقولہ جائداد ضبط کی گئی ہے، واپس کردی جائے گی۔ بشرطے کہ کلکٹر یہ سفارش کرے کہ وہ آدمی ایک معینہ میعاد کے اندر اندر قابل ادائیگی رقوم کو ادا کردے گا۔ اور وقت کا تعین ان کسانوں پر ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ اور بعض حالتوں میں اگر مناسب سمجھا گیا تو مالیہ چھوڑ بھی دیا جائے گا۔

(ج) کسی کے لیے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جائے گا۔

(د) جہاں منقولہ جائداد کو فروخت کردیا گیا ہے، معاوضہ ہی ادا کیا جائے گا اور نہ ہی فروخت کی قیمت ادا کی جائے گی۔ سوائے ان حالات کے جب کہ جائیداد قابل ادائیگی رقوم سے زیادہ قیمت پر فروخت کی گئی ہو۔

(۱۷) **(الف)** غیر منقولہ جائداد جو ضبط کرلی گئی ہے یا جس پر حکومت نے مالیۂ زمین کی وصولی کے لیے قبضہ کرلیا ہے واپس کردی جائے گی۔

(ب) زمین و دیگر غیر منقولہ جائداد جو ۱۹۳۰ء کے آرڈی نینس نمبر ۹ کے ماتحت ضبط کرلی گئی ہے یا جس پر حکومت نے مالیۂ زمین کی وصولی کے لیے قبضہ کرلیا ہے واپس کردی جائے گی۔ بشرطے کہ کلکٹر سفارش کرے کہ نادہند ایک معین عرصہ کے اندر اندر اپنی رقوم ادا کردے گا۔ اس عرصے کا تعین اسی نادہند پر چھوڑ دیا جائے گا۔

(۳) تیسری پارٹی کے پاس فروخت کی جا چکی غیر منقولہ جائداد کا جہاں تک حکومت کا تعلق ہے یہ تبدیلی آخری اور فیصلہ کن تصور کی جائے گی۔

نوٹ: مسٹر گاندھی نے حکومت کی توجہ اس طرف دلائی تھی کہ چند ایک فروختیں بالکل غیر منصفانہ اور خلاف قانون ہیں۔ گورنمنٹ اس بیان کو ان اطلاعات کی بنا پر جو اس کو پہنچی ہیں تسلیم نہیں کرسکتی۔

(د) حکومت کو یقین ہے کہ بہت ہی کم حالت میں رقوم کی وصولی ناجائز ذرائع سے کی گئی ہے۔ اور اگر لوکل حکومتیں اس قسم کے واقعات کی تحقیقات کرکے شکایات کو دور کرنے کے لیے ضلع

کے افسرون کے نام ہدایات جاری کردے تو کوئی اعتراض نہیں سمجھا جائے گا۔

(۱۹) جن آدمیوں کے مستعفی ہو جانے کے بعد آسامیاں پُر ہو گئی ہیں حکومت ان کو بحال کرنے کا ذمہ نہیں لیتی لیکن دوسرے آدمیوں کے معاملے میں جن کی آسامیاں ابھی پُر نہیں ہوئیں مقامی حکومت نہایت فراخدلی سے غور کرتی ہوئی ان کی درخواستوں پر بحالی کی پوری پوری سعی کرے گی۔

(۲۰) حکومت نمک کی نہ تو قانون شکنی ہی برداشت کرسکتی ہے اور نہ ہی اقتصادی بدحالی کے زمانے میں قانون نمک میں کوئی خاص تبدیلیاں ہی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ہندوستان کے غریب طبقے کی امداد کے لیے ان دیہات کے لوگوں کو جہاں نمک بنایا جاتا ہے یا جہاں سے دستیاب ہوتا ہے نمک اکٹھا کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ لیکن ایسا نمک انھیں اپنے دیہات سے باہر فروخت کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۲۱) اس سمجھوتے کی شرائط پر مکمل طور پر کاربند نہ رہنے کی صورت میں حکومت انفرادی اور پبلک کے لیے مناسب کارروائی کرنے کا حق رکھتی ہے۔

دستخط

ایچ ڈبلیو ایمرسن

سیکرٹری حکومت ہند

ہم یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ گفت وشنید کے دوران میں مہاتما گاندھی نے میسرز بھگت سنگھ راجگورو اور سکھدیو کی پھانسی کی سزاؤں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہوئے ان کو منسوخ کر دینے کے لیے کہا۔ کیوں کہ ملک میں ان سخت سزاؤں کے خلاف جوش وخروش پھیلا ہوا تھا۔ اور کانگریسی تک یہی چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طور ان کو پھانسی کے تختہ سے بچا لیا جائے۔ لیکن لارڈ اروِن نے اس مسئلے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ اور صرف اتنا کہا کہ وہ پنجاب گورنمنٹ سے اس معاملہ پر گفتگو کریں گے۔ وائسرائے خود اپنے اختیارات سے ان سزاؤں کو منسوخ کر سکتے تھے۔ مگر سیاسی وجوہات کی بنا پر ایسا کرنے سے قاصر تھے۔ ان ہر سہ اصحاب کی سزائیں بدستور قائم رہیں۔ لارڈ اروِن اس معاملے مہاتما گاندھی کی کوئی امداد نہ کر سکے۔ صرف کراچی کے اجلاس تک پھانسی کو ملتوی کر دینے کا وعدہ کیا۔ کراچی میں کانگریس کا اجلاس اسی مارچ کے آخری ہفتے میں ہونا قرار پایا تھا۔ مہاتما جی نے صاف طور پر کہا کہ اگر حکومت نے ان بچوں کو پھانسی دے ہی دینا ہے تو

بہتر ہے کہ کراچی کے اجلاس سے پہلے ہی دے دیا جائے تاکہ صورت حالات تمام ملک پر اچھی طرح واضح ہو جائے اور ہمارے دلوں میں جھوٹی امیدیں باقی نہ رہیں۔اور کراچی کے اجلاس میں ملک کی قسمت کا درست فیصلہ ہو جائے۔

۵ر مارچ کو گاندھی اردن معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔

(تاریخ کانگریس،ص ۱۵۔۷۰۸)

صوبہ سرحد کی صورت حال:

۲۸ر فروری ۱۹۳۱ء کو اتمان زئی میں ایک جلسہ ہوا۔ یہ خاں برادران کا گاؤں ہے۔تب گاندھی اردن مذاکرات کا سلسلہ جاری تھا۔اس گاؤں میں فوج آ دھمکی۔پھر ڈاکٹر خان صاحب کے الفاظ میں صورت حال کا بیان ”وہاں فوج موجود تھی۔لاٹھی چارج سے خدائی خدمت گاروں کو منتشر نہ کیا جا سکا۔حقیقت میں انھیں اس مقصد کا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔فوج کے چند جوان بے قابو ہو گئے اور انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔کیپٹن بینز (Captain Baines) اس فوجی دستے کا کمانڈر تھا۔اس نے چلاتے ہوئے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا،لیکن کسی نے اس کی آواز پر کان نہ دھرا۔فائرنگ جاری رہی لیکن خدائی خدمت گاروں کو منتشر نہ کیا جا سکا اور وہ وہیں کھڑے رہے۔فائرنگ کے نتیجے میں دو افراد جاں بحق اور تیس زخمی ہوئے۔

جب خدائی خدمت گاروں کے تحریک عروج پر تھی تو ایک انگریز برنائیز (Barnays) یہاں آیا۔یہ بالکل وہی وقت تھا جب بدترین قسم کا ظلم و ستم انتہا پر پہنچ چکا تھا۔وہ اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل آف پولیس کا مہمان تھا۔وہ بھی انگریز تھا اور سی آئی ڈی کے محکمے کا انچارج تھا۔برنائیز اپنی تصنیف ”دی نیکڈ فقیر“ (The Naked Faquir) میں سرحد کے حالات کے بارے میں رقم طراز ہے۔(اس کی کتاب سرکاری مطبوعات سے برعکس ہے اور اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں) ”مجھے خوشی ہے کہ میں نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔یہ ہندوستان کا قدیم علاقہ ہے اور یہاں کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔یہاں کی انتظامیہ سنگدل اور نااہل ہے۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سائمن نے کس طرح اپنی رپورٹ میں لکھ دیا کہ صوبہ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ نہیں ہونا چاہیے۔ صوبہ سرحد کی طرف سے خطرے کا پروپیگنڈا زیادہ تر فضول اور واہیات ہے۔

اگر حکومت فوج پر اٹھنے والے اخراجات کا ایک چوتھائی حصہ بھی اس بنجر علاقے کی آب پاشی

پر خرچ کرے تو اسے فوج کے اخراجات کے برابر رقم حاصل ہو جائے گی۔ آفریدی اس لیے لوٹ مار کرتے ہیں کیوں کہ وہ بھوکے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس علاقے میں ہونے والی زیادتی اور ظلم کو بے نقاب کروں۔'' لیکن یہ پردہ جلد ہی اٹھ گیا اور پتا چلا کہ پٹھانوں نے حصول آزادی کی خاطر بے شمار تکالیف اور صعوبتیں بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

انھی دنوں چارسدہ کے اسسٹنٹ کیپٹن بارنیز (Cap : Barnes) پر قاتلانہ حملے کا الزام ایک بدنصیب پٹھان حبیب نور پر لگایا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قاتلانہ حملے کے وقت پستول کی لبلبی نے کام نہ کیا۔ آفیسر کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ یہ مقدمہ زیادہ سے زیادہ ارادۂ قتل کا تھا جو انڈین پینل کوڈ کے مطابق دفعہ ۳۰۷ کا بنتا تھا۔ حبیب نور پر عام قانون کے تحت مقدمہ نہیں چلایا گیا بلکہ (Murderous Out Rager Act) کے تحت کارروائی کی گئی۔ اسے سیشن کورٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسے صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ دو دن کے اندر اسے موت کی سزا دے دی گئی۔ اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کا حق نہیں دیا گیا۔ صرف نظر ثانی کے لیے مقدمہ چیف کمشنر کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ چیف کمشنر نے نظر ثانی کی درخواست خارج کر دی۔ اس واقعے کے بارے میں برنائیز کے صحیح الفاظ یہ ہیں۔ ''ایک برطانوی افسر کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی، جو کامیاب نہ ہوئی لیکن دو روز سے بھی کم عرصے میں ملزم کو پھانسی دے دی گئی۔'' اس بدنصیب صوبے میں روشن خیالی کی دعوے دار حکومت اس انداز میں انصاف اور انتظام کے نام پر کام کرتی تھی۔

مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی اروِن پیکٹ ہوتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں عبدالغفار خاں کو واردھا سے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ ان پر بمبئی میں عیسائیوں کے مجمع کے سامنے باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں اصلاحات نافذ ہوتی ہیں اور انتخابات ہوتے ہیں۔ خدائی خدمت گار، جنھوں نے اگست ۱۹۳۱ء میں کانگریس سے الحاق کیا تھا، انتخاب کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ صوبے پر دو عملی کا نظام نافذ کر دیا گیا۔ قدامت پرست سر عبدالقیوم کو وزیر بنا دیا گیا وہ صرف انھی محکموں کے انچارج تھے جو صوبہ کی تحویل میں آنے تھے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے ساتھ ہی اس کا دائرہ صوبہ سرحد تک بڑھا دیا گیا کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح یہاں بھی ذمہ دار حکومت قائم ہو۔ صوبے میں

انتخاب کا ڈول ڈالا گیا اور سرخ پوشوں نے پہلی مرتبہ انتخاب میں حصہ لیا۔ لیکن انتظامیہ میں عدم اعتماد کی پرانی روح کارفرما تھی۔ انتظامیہ نہیں چاہتی تھی کہ کانگریس انتخاب میں کامیابی حاصل کرے اور اس طرح صوبہ کے اقتدار پر قابض ہو۔ انتخاب میں کانگریس کے خلاف تمام حربے استعمال کیے گئے۔ خوانین اور سرکاری ملازمین کو جنھیں صوبے کے انتہائی رجعت پسند حلقوں سے لیا گیا، اکٹھا کر کے کانگریس کی مخالفت پر لگا دیا گیا۔ (پختون قوم اور باچا خان از خان عبدالقیوم خان: ترجمہ گولڈ اینڈ گن......، لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۸۱۔۷۹)

لیکن خدائی خدمت گار اور اس کی حلیف کانگریس پھر بھی جیت گئی۔

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی اور فسادات کان پور:

۲۳ر مارچ ۱۹۳۱ء: ۲۳ر مارچ کو بھگت سنگھ اور ان کے رفقا پھانسی دیے گئے۔ دوسرے روز تمام ملک میں ہڑتال ہوئی۔ بمبئی، کراچی، لاہور، کلکتہ، مدراس اور دہلی میں تو یہ امن و امان سے گزر گئی۔ لیکن یہی ہڑتال کانپور کے فسادات کا باعث ہوئی۔ وہاں کے مسلمانوں نے ہڑتال میں حصہ نہ لیا۔ اس روز سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ ایک زبردست ماتمی جلوس نکالا گیا۔ مسلمانوں کے ہڑتال میں حصہ نہ لینے کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی۔ کہ مولانا محمد علی کی وفات پر ہندوؤں نے ہڑتال نہ کی تھی۔ القصہ ۲۴ر مارچ کو ہندو دکانوں کے لوٹنے کے واقعات ہوئے۔ اور ساتھ ہی فسادات کا بھی آغاز ہونا لازمی تھا در اصل ۲۳ر مارچ کی شام کو ہی اس کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اور پچاس کے قریب آدمی زخمی ہو گئے تھے۔ ۲۵ر مارچ کو آتش زدگی کی وارداتیں عمل میں آنے لگیں۔ مندر اور دکانیں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ پولیس نے اس لوٹ مار اور غارت گری کو بند کرنے میں ذرا بھی امداد نہ دی۔ فسادات اس قدر خوفناک شکل اختیار کر گئے کہ پانچ سو خاندان اپنے گھر بار چھوڑ کر دیہاتوں میں پناہ گزین ہوئے۔ ڈاکٹر رام چندرا کو ان فسادات میں سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ ان کی بیوی بچے اور بوڑھے والدین قتل کر دیے گئے۔ اور ان کی لاشوں کو شہر کی بدروؤں میں پھینک دیا گیا۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق ان فسادات میں ۱۶۶ آدمی ہلاک اور ۴۸۰ زخمی ہوئے۔ فسادات کے فوراً بعد کانگرس کی طرف سے بابو شوتم داس ٹنڈن اور چند ایک اور اصحاب کو موقع پر بھیجا گیا۔ مگر ان کی کوششوں سے بھی امن قائم نہ ہو سکا۔

گنیش شنکر ودیارتھی کا قتل:

گنیش شنکر ودیارتھی ۲۵ر مارچ ہی سے گم تھے۔ بعد از تلاش بسیار ۲۹ر مارچ کو ان کی لاش

ملی۔ جو خالص کھدر اور ان کے ایک بازو پر گجندر کے نام سے پہچانی گئی۔ ان کی جیبوں میں سیکراچی کانگریس سے متعلق چند مضامین کے مسودے بھی ملے۔ انھوں نے کئی مسلمانوں کو موت کے منہ سے بچایا تھا وہ اس قدر دل کے سچے اور دلیر واقع ہوئے تھے۔ کہ بغیر کسی قسم کا خوف محسوس کیے وہ مسلمانوں کے محلوں میں گھس جاتے تھے۔ بالآخر ایک سچے ستیہ گرہی کی طرح قربان ہو گئے۔ اگر ان کا خون ہی ان کی پیاس بجھا سکتا تھا۔ وہ موت کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھے۔ ان کی وفات پر ذیل کا ریزولیوشن پاس ہوا:

''کانگریس کانپور کے فسادات کے دوران میں گنیش شنکر ودیارتھی صدر یو۔ پی پراونشل کانگریس کمیٹی کے قتل کو بہت افسوس اور صدمہ سے سنتی ہے۔ مسٹر ودیارتھی کا شمار کانگریس کے ان کارکنوں میں ہوتا تھا۔ جو اپنی دیانتداری اور بے غرض خدمات کے باعث تمام اقوام میں ہر دل عزیز ہیں۔ مرحوم کے خاندان سے اظہار ہمدردی کرتی ہوئی کانگریس ان کی قابل رشک وفات پر فخر کا اظہار کرتی ہے۔ جو مصیبت زدگان اور کمزور لوگوں کو بچانے میں واقع ہوئی۔ کانگریس قومی اتحاد حاصل کرنے کے لیے ان کے نقش قدم پر چلنے کی اپیل کرتی ہوئی انتقام سے باز رہنے کی اپیل کرتی ہے۔ اور ان فسادات کی تحقیقات کرنے اور وہاں پر امن فضا پیدا کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر کرتی ہے۔''

یہ کمیٹی چھ ممبران پر مشتمل تھی۔ اور اس کے صدر ڈاکٹر بھگوان داس تھے۔

گاندھی اروِن معاہدہ اور کانگریس کی قرارداد:

ہم یہاں یہ بتا دینا چاہتے ہیں۔ کہ رپورٹ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی۔ اور کچھ عرصہ بعد شائع بھی ہوئی۔ مگر حکومت کی طرف سے اس کی تقسیم بند کر دی گئی۔ اس اجلاس میں سب سے اہم سوال گاندھی اروِن معاہدہ تھا۔ کانگریس نے اس کے متعلق ذیل کی قرارداد پاس کی:

''ورکنگ کمیٹی اور حکومت ہند کے مابین معاہدہ پر غور کرتے ہوئے کانگریس اسے منظور کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس خواہش کا اظہار بھی کر دینا چاہتی تھی۔ کہ پورن سوراجیہ کے نصب العین میں کسی قسم کی تبدیلی اس معاہدے سے واقع نہیں ہوئی۔ اور برطانوی گورنمنٹ کے نمائندوں سے کانگریسی نمائندے گفت و شنید اور بحث کے وقت اسی مقصد کے پیش نظر مطالبات پیش کریں گے۔ خصوصاً وہ جن سے قوم کو ڈیفنس، امورات خارجہ، مالی پالیسی پر کنٹرول اور قرضہ جات کے

سلسلے میں ایک غیر جانبدار ٹریونل کا حق حاصل ہو سکے۔ جس سے وہ معلوم کر سکے کہ کون سے قرضہ جات ہندوستان کے مفاد کے لیے صرف کیے گئے ہیں۔"

"کانگریس کا یہ اجلاس گول میز کانفرنس میں کانگریس کی نمایندگی کے لیے مہاتما جی کو مقرر کر کے ان کو پورے اختیارات دیتا ہے۔ دوسرے ڈیلیگیٹ جو ان کی رہنمائی میں کام کریں گے ورکنگ کمیٹی کی طرف سے منتخب کیے جائیں گے۔"

سول نافرمانی کے قیدی:

"یہ کانگریس ان تمام کارکنوں کو مبارک باد دیتی ہے۔ جنھوں نے گزشتہ تحریک سول نافرمانی میں قید کے ذریعے لاٹھیاں اور گولیاں اپنے سینوں پر کھا کر، جائیدادیں ضبط کرائیں اور گھر بار چھوڑ کر انواع واقسام کی تکالیف اور مصائب برداشت کی ہیں۔ کانگریس ہندوستان کی عورتوں کو بھی ان کی اس دلیری اور بہادری پر پُر زور مبارک باد دیتی ہے۔ جو انھوں نے قوم کی جنگ آزادی میں دکھائی۔ اور انھیں یقین دلاتی ہے۔ کہ کانگریس کو کوئی بھی ایسا دستور اساسی منظور نہیں ہوگا، جس میں فرنچائیز کے معاملے میں ان سے کوئی امتیاز روا رکھا جائے گا۔"

فرقہ وارانہ فسادات:

"کانگریس مرزاپور، آگرہ، بنارس اور کانپور کے فرقہ وارانہ فسادات کو تحریک آزادی کی ترقی افواہیں پھیلا کر اور اشتعال انگیز تقاریر کے ذریعہ فساد پیدا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کی غیر امن پسندانہ سرگرمیوں کے خلاف سخت بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا جانا چاہیے۔ یہ کانگریس معصوم اور پر امن شہریوں کے قتل کے واقعات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہوئی تہ دل سے ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتی ہے۔"

شراب:

"گزشتہ بارہ ماہ میں ملک نے شراب کے استعمال کو مکمل طور پر بند کرنے میں جو ترقی کی ہے۔ اسے کانگریس نگاہ اطمینان سے دیکھتی ہوئی تمام کانگریس کمیٹیوں سے اپیل کرتی ہے۔ کہ وہ نشی اشیا اور خصوصاً شراب کے خلاف جو جسم واخلاق ہر دو کو تباہ اور آباد گھروں کو ویران کرتی ہے

پوری رفتار سے مہم جاری رکھیں۔''

کھدر:

''گزشتہ دس سالوں میں سیکڑوں دیہات میں کام کرنے سے جو تجربات حاصل ہوئے ہیں۔کانگریس ان کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ان کے روز بروز بڑھتے ہوئے افلاس کی وجہ گھریلو اور دستی صنعتوں کی تباہی سے پیدا شدہ بیکاری ہے۔اور اس کو صرف چرخہ اور کھڈیوں کی ترقی ہی دور کر سکتی ہے اور جو لوگ کھدر اور ہندوستانی ملوں کا کپڑا چھوڑ کر بدیشی کپڑا خریدتے ہیں ۔وہ دیہاتیوں کو دگنا نقصان پہنچاتے ہیں۔اولاً ان کو بیکار رکھ کر اور ثانیاً اپنا روپیہ ملک سے باہر بھیج کر، یہ ڈبل نقصان صرف بدیشی کے مکمل بائیکاٹ سے روکا جا سکتا ہے۔اس لیے یہ کانگریس تمام ہندوستانیوں سے اپیل کرتی ہے۔کہ وہ بدیشی کپڑے کی خرید و فروخت بالکل بند کر دیں، کیوں کہ کروڑوں فاقہ مست اور مفلس ہندوستانیوں کے مصائب کا باعث ہو رہی ہے۔''

(تاریخ کانگریس، ۳۴۷ـ۳۴۷)

مارچ ۱۹۳۱ء: ہندوستان میں فرقہ وارانہ حقوق کے تحفظ اور ایک متفقہ تصفیہ کی تلاش میں ملک کی ہر سیاسی جماعت سرگرداں تھی۔جمعیت علمائے ہند نے اس میں سرگرم حصہ لیا اور تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر نہ صرف مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی، معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی، معاشی حقوق کے لیے معقول تحفظات کے لیے اس نے بہترین فیصلے کیے۔ بلکہ ملک کی تمام مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھی، سب کے لیے قابل قبول اور اطمینان بخش تجاویز پیش کیں۔مولانا احمد سعید دہلوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی، کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کی تجاویز پر ایک نظر ڈالی ہے اور جمعیت کی تجویز کی جامعیت اور معقولیت پر توجہ دلائی ہے۔مولانا فرماتے ہیں:

سمجھوتے کی مختلف تجاویز:

''ملک میں چوں کہ فرقہ وارانہ جراثیم موجود ہیں، اس لیے اب تک جو تجاویز مرتب کی گئی ہیں ان میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جس سے تمام فرقے مطمئن ہو جائیں اس وقت مسلم کانفرنس، ہندو مہا سبھا، سکھ لیگ، مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیۃ علماء ہند، کانگریس ورکنگ کمیٹی، غرض ملک کی کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جس کی تجاویز منظر

عام پر نہ آ چکی ہوں۔ اب تک یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ان تجاویز میں سے کانگریس کون سی تجویز قبول کرنے کو آمادہ ہے۔ قوم پرور حضرات سے بار بار یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ کانگریس تمھاری تجاویز کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بمبئی میں جو تجویز منظور کی ہے، اس سے ایک حد تک غلط فہمی دور ہوگئی ہے۔ اور مسلمانوں کو عام طور سے کانگریس کی رائے معلوم ہو چکی ہے۔ کانگریس کی اس تجویز کے بعد یہ ممکن ہے کہ مسلمانون کا بہت بڑا طبقہ مطمئن ہو جائے لیکن مجھے افسوس ہے کہ بعض دفعات کے ابہام اور بعض دفعات کے ترک نے مجھے اس امر پر مجبور کیا ہے کہ میں اپنے عدم اطمینان کا اظہار کروں۔

فرقہ وارانہ حقوق کے متعلق میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کسی قسم کی مداہنت نہیں کی جاسکتی۔ معاملات کا جہاں تک تعلق ہے وہ بالکل صاف ہونے چاہییں۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے پرسنل لا کی حفاظت کے متعلق جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا وہ ہے، جو ۲۳؍ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی کے پاس بھیج دیا گیا تھا جس کا میں آگے چل کر ذکر کروں گا۔ اگر کانگریس نیشنلسٹ مسلم کانفرنس اور جمعیۃ علماء کے اقل قلیل مطالبات کو تسلیم کر لیتی تو میں یقین کرتا ہوں کہ مسلمان عام طور سے اس کی حمایت کرتے۔ لیکن کانگریس نے تجویز پاس کرتے وقت کچھ ایسا ابہام پیدا کر دیا ہے کہ شاید میری طرح اور بھی بعض حضرات اس تجویز سے مطمئن نہ ہوں گے۔ میں نے احتیاطاً اس خطبے میں دونوں تجویزوں کو نقل کر دیا ہے تاکہ آپ حضرات دونوں کے فرق کو اچھی طرح معلوم کر سکیں۔ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی مفصل تجویز وہ ہے جس کا ڈاکٹر انصاری نے فرید پور میں ذکر کیا ہے،

”مسلم نیشنلسٹ پارٹی تجویز:

۱۔ ہندوستان کے مجوزہ دستور اساسی میں نمایندگی کی بنیاد بالغوں کو حق رائے دہی کے ساتھ مخلوط انتخاب پر ہونی چاہیے۔

۲۔ (الف) بالغوں کو حق رائے دہی کے ساتھ صرف ان اقلیتوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے نشستیں معین ہوں جو ۲۵ فیصدی سے کم ہیں اور یہ تعین مرکزی مجالس قانون ساز اور صوبہ کی مجالس قانون ساز دونوں میں ہو لیکن عام نشستوں میں حصہ لینے کا بھی اختیار حاصل ہو۔

(ب) ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۲۵؍ فی صدی سے کم ہے، وہاں آبادی

کے تناسب سے ان کی نشستیں معین کر دی جائیں لیکن انھیں اس کا اختیار حاصل رہے کہ وہ زاید نشستوں میں بھی حصہ لے سکیں۔ لیکن ایسی صورت میں اگر دیگر فرقوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جائیں تو مسلمان اس کے مستحق ہوں گے اور انھیں جس اعتبار سے زاید نشستیں اس وقت حاصل ہیں وہی برقرار رہیں۔

(ج) اگر بالغوں کا حق رائے دہی منظور نہ کیا جا سکے یا رائے دینے والوں کا رجسٹر اس طرح نہ بنایا جائے کہ اس میں آبادی کا تناسب قائم رہے تو بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی نشستیں معین رہیں تاکہ بالغوں کو حق رائے دہی حاصل ہو جائے یا حقوق انتخاب میں اس قدر توسیع ہو جائے کہ انتخاب کنندگان کے رجسٹر میں آبادی کا تناسب اس طرح قائم ہو جائے کہ مسلم اکثریت کسی حالت میں اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ ہو سکے۔

۳۔ مرکزی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں میں مسلمانوں کو ۱/۳ نشستیں حاصل ہوں۔

۴۔ ملازمتوں میں ہر قسم کا تقرر پبلک سروسز کمیشن کے ذریعہ ہو اور قابلیت کا آسان ترین معیار رکھا جائے اور کسی فرقے کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے اور ماتحت اسامیوں پر کسی جماعت کو تفوق اور اجارہ حاصل نہ ہو۔

۵۔ مرکزی اور صوبوں کی وزارتوں میں مسلم مفاد کا کافی طور پر اس قسم کے رواج کے ذریعے لحاظ رکھا جائے جو مجالس قانون ساز کی مختلف جماعتوں میں باہمی طور پر طے ہو جائے۔

۶۔ سندھ ایک علاحدہ صوبہ بنایا جائے۔

۷۔ صوبۂ شمال مغربی سرحد اور بلوچستان کو بالکل ایسی نوعیت کی اصلاحات دی جائیں جس نوعیت کی ہندوستان کے دیگر صوبوں کو ملیں۔

۸۔ ملک کا مجوزہ دستور اساسی وفاقی ہو۔ اختیارات غیر مصرحہ وفاقی حکومتوں (اجزائے ترکیبیہ) کو حاصل ہوں۔

۹۔ (الف) بنیادی حقوق میں اس قسم کی ایک دفعہ بھی داخل ہو جس مین ہر باشندے کی تہذیب، اس کے تمدن، اس کی زبان، اس کا رسم الخط، اس کی تعلیم، اس کا پیشہ اور اس کے مذہبی مراسم، اوقاف اور اقتصادی مفاد سب حکومت کی زد سے محفوظ رہیں۔

(ب) پرسنل لا اور بنیادی حقوق کا تحفظ دستور اساسی میں صاف و صریح دفعات کی ذریعے طے کر دیا جائے۔

(ج) جہاں تک بنیادی حقوق کا تعلق ہے دستور اساسی میں کوئی ترمیم نہ ہو سکے گی الا یہ کہ مرکزی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں کے اراکین کی ۳/۴ تعداد اس کی تائید کرے۔"

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز:

۱۔ (الف) دستور اساسی میں بنیادی حقوق کے ماتحت جو دفعات ہوں گی ان میں مختلف ملتوں کو ان کی تہذیب و تمدن، ان کی زبان ان کے رسم الخط، ان کی تعلیم، ان کا پیشہ، ان کے مراسم، ان کے مذہب اور مذہبی اوقاف کے تحفظ کے متعلق اطمینان دلا دیا جائے گا۔

(ب) پرسنل لا (شریعت) کا تحفظ دستور اساسی میں ایک خاص دفعہ کے ذریعے کر دیا جائے گا۔

(ج) مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کا تحفظ مرکزی حکومت کے ذمہ اور اختیار میں ہوگا۔

۲۔ حقِ انتخاب ہر بالغ مرد اور عورت کو حاصل رہے گا۔

تشریح:

مجلس عاملہ کراچی کی ایک قرارداد کے مطابق بالغوں کو حق رائے دہی کی پابند ہے اس لیے اس میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے سے مجبور ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ بعض حلقوں میں اس بارے میں جو شک پایا جاتا ہے، اسے رفع کرنے کی غرض سے یہ مجلس یہ ظاہر کر دینا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ حقوق انتخاب میں توسیع کی جائے تو اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا جائے کہ اس میں ہر ملت کی آبادی کا تناسب باقی رہے اور کسی ملت کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

۳۔ (الف) ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی میں مخلوط انتخاب نمائندگی کی بنیاد ہوگی۔

(ب) سندھ میں ہندوؤں کے لیے، آسام میں مسلمانوں کے لیے، صوبہ سرحد اور پنجاب میں سکھوں کے لیے اور ہندو اور مسلمانوں کے لیے تمام دیگر صوبوں میں جہاں ان کی آبادی کا تناسب ۲۵ فیصدی ہے نشستیں آبادی کے تناسب پر معین ہوں گی لیکن انھیں عام انتخاب میں بھی حصہ لینے کا اختیار ہوگا۔

۴۔ حکومت کی آسامیوں پر تقرر ایک غیر جانبدار کمیشن کے ذریعے ہوگا اور جو قابلیت کا کم سے کم معیار معین کرے گا۔ اور ملازمتوں کے لیے قابل امیدواروں کی بھرتی کا بھی خیال رکھے گا

ور یہ خیال رکھے گا کہ ہر ملت کو یکساں طور پر حصہ ملے۔

۵۔ مرکزی اور صوبجاتی وزارتوں کی ترتیب میں رواج کے ذریعے اقلیتوں کے حقوق کی نمایندگی ہوا کرے گی۔

۶۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اس قسم کی اصلاحات دی جائیں جو ملک کے دیگر صوبوں کو ملیں۔

۷۔ سندھ علاحدہ صوبہ بنا دیا جائے بشرطے کہ اہل سندھ اگر زاید خرچ ہو تو اسے خود بر۔ نت کرلیں۔

۸۔ ملک کا آیندہ دستور اساسی وفاقی ہوگا محفوظ اختیارات دفاقیہ کے مختلف اجزاء کو حاصل ہوں گے۔ الا یہ کہ مزید غور وخوض کے بعد یہ ثابت ہو کہ یہ صورت مفاد ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔

"مجلس عاملہ نے ان مندرجہٗ بالا تجاویز کو اس طرح قبول کرلیا ہے کہ فرقہ پروری اور قوم پروری کے مابین ایک صورت نکل آئے لیکن پھر بھی اگر ایک طرف مجلس عاملہ لاہور کی قرارداد کی پابند ہے تو دوسری طرف اہل ملک سے امید کرتی ہے کہ وہ اس اسکیم کو منظور کریں گے وہ ان لوگوں کو بھی جو اس سے مختلف خیال رکھتے ہیں یہ یقین دلاتی ہے کہ اگر وہ کوئی اور ایسی تجویز سوچیں جو لاہور کی قرارداد کے مطابق ہو اسے قبول کرلے گی بشرطے کہ متعلقہ جماعتیں بھی اس سے مطمئن ہو جائیں۔"

ان تجاویز کو پیش کرنے کے بعد مولانا احمد سعید دہلوی فرماتے ہیں:

"معزز حاضرین! ان دونوں تجاویز کو غور سے پڑھیے تو آپ کو دونوں کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ کانگریس نے بعض تجاویز کو مطلق نظر انداز کردیا ہے۔ مثلاً مرکزی مجلس کے دونوں ایوانوں میں مسلمانوں کی ۱/۳ نمایندگی یا دستور اساسی کی ترمیم کے لیے ۳/۴ کی شرط اسی طرح بعض دفعات میں کچھ قیود کا اضافہ کرکے مشتبہ کردیا گیا ہے۔ بعض کو مبہم کردیا گیا ہے۔ اگرچہ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کانگریس کی تجویز مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تجویز سے بہت قریب ہے۔ اقلیتوں کے مسئلے کو بھی اس نے ایک حد تک سلجھا دیا ہے۔ پنجاب و بنگال کے مسئلے کو سلجھانے میں بھی اس نے پوری سعی کی ہے۔ بہر حال اس نے فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے میں ایک خوشگوار قدم اٹھایا ہے۔

چوں کہ کانگریس نے اپنی تجویز کے ساتھ مفاہمت کا دروازہ بند نہیں کیا ہے، اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ باہمی گفتگو سے شکوک وشبہات کا دور ہو جانا بہت سہل ہو گیا ہے۔ جو لوگ نیشنلسٹ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ تمھارے مطالبات بھی کانگریس نے اس وقت تک منظور نہیں کیے ان کے لیے اب موقع ہے کہ وہ رواداری کی اسپرٹ کے ساتھ کانگریس کی تجویز پر غور کریں اگر وہ کسی اور دفعہ کا اضافہ کرانا چاہیں یا کسی دفعہ کو تبدیل کرانا چاہیں تو مسلم نیشنلسٹ پارٹی کو اس پر توجہ دلائیں تاکہ باہمی تبادلۂ خیالات کے ساتھ اس تجویز میں ترمیم کی جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر مسلمانوں کے اتحاد کا موقع نہیں ہے۔ اگر کانگریس کمیٹی مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تجویز کو بلا کسی ترمیم کے قبول کر لیتی تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ مسلم مطالبات کے قریب ترین ہو جاتی کانگریس نے بعض ایسی دفعہ کا بھی اضافہ کیا ہے، جو مزید تشریح کی محتاج ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات کانگریس کمیٹی کی تجویز کو منظور کرنے میں عاجلانہ اقدام نہ کریں گے، بلکہ مسلمانوں کو غور و فکر کا موقع دیں گے۔ یہ توموں کی موت وحیات اور بقا وفنا کا معاملہ ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ انتہائی غور وفکر کے بعد ہو۔ اور آپ جلدی میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو مسلم قوم کے لیے کسی ایسے نقصان کا موجب ہو جس کی تلافی آئندہ آپ کے امکان میں نہ ہو"۔

"جمعیۃ علماء ہند اور مسلم حقوق:

اس موقع پر یہ مناسب ہوگا کہ میں اس تجویز کو بھی آپ کے سامنے پیش کردوں جو جمعیۃ علماء ہند کی ایک سب کمیٹی نے مرتب کی تھی اور جس کو مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے ارکان نے اپنے عام اجلاس میں منظور کیا تھا۔ اس تجویز کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں جمعیۃ علماء ہند نے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی تشریح کی ہے اور دوسرے حصے میں ان حقوق کا اظہار کیا ہے، جو آج کل عام طور پر سیاسی جماعتوں میں ما بہ النزاع ہیں۔ پہلے حصے کی نقل گزشتہ مارچ میں گاندھی جی کو دے دی گئی تھی۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے جو تجویز بمبئی میں پاس کی ہے اور جس کو ابھی آپ نے سنا ہے اس تجویز میں بعض چیزیں کانگریس کمیٹی نے منظور کر لی ہیں لیکن اکثر حصہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگرچہ جو دفعات کانگریس نے منظور کی ہیں وہ اصولی حیثیت سے صحیح ہیں، لیکن جب تک وہ تمام فارمولا جو مارچ ۳۱ء میں گاندھی جی کو دیا گیا ہے کانگریس منظور نہ کرے گی، مذہبی طبقہ مطمئن نہ ہوگا۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ میں کسی تفصیلی منظوری کا خواہش مند ہوں۔ منظوری خواہ اجمالی ہو، لیکن اصول

تسلیم کرلیا جائے بہر حال تجویز کے الفاظ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ کی جماعت ان تمام حقوق کی پوری تائید کرے گی:

جمعیۃ علماء ہند کی تجویز:

پہلا حصہ، جمعیۃ علماء کے نزدیک ضروری ہے کہ مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے دستور اساسی میں حسب ذیل دفعات شامل ہوں:

(۱) مسلمانوں کے لیے قربانی گاؤ و ذبیحہ گاؤ کی آزادی۔

(۲) مسلمانوں کی بہت سی مذہبی ضرورتیں بغیر مسلمان قاضی کے پوری نہیں ہوتیں اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لیے دارالقضاء کے قیام کو اصولاً تسلیم کرلیا جائے اور حکومت مشترکہ ہند اس کی کفیل ہو۔

(۳) مسلمانوں کو آزادی ہو کہ وہ امارۃ شرعیہ کا ادارہ قائم کریں جیسے کہ آج بھی صوبۂ بہار میں اس کا نمونہ قائم ہے۔

(۴) مذہبی تعلیم، مذہبی تعلیم کی زبان، مذہبی تعلیم کا نصاب، مذہبی ادارے، مذہبی تحریکیں، مساجد، عیدگاہیں، تکیے، امام باڑے، کربلائیں اوقاف، خانقائیں، مدارس، مقابر وقبرستان، آثار قدیمۂ اسلامیہ، عماراتِ اسلامیہ محفوظ رکھی جائیں گی اور آیندہ بھی ان کی تشکیل وتعمیر و قیام واستعمال کے لیے مسلمان آزاد ہوں گے۔

(۵) حکومت کے مدارس میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ نصاب تعلیم، طریقۂ تعلیم، اشیاء متعلقۂ تعلیم میں کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جو مسلمانوں کی تہذیب یا ان کے مذہب پر برا اثر ڈالتی ہو یا ان کے جذبات کو مجروح کرتی ہو۔

(۶) مسلمان اپنے مذہبی مدارس اور مذہبی اداروں میں ممالک اسلامیہ کے ماہرین سے خدمات لینے اور اس غرض کے لیے ان کو بلانے اور ان کا تقرر کرنے میں آزاد ہوں گے۔ حکومت اس کے خلاف پابندی عاید نہ کرے گی۔

(۷) مسلمانوں کو کسی ایسی چیز پر مجبور نہ کیا جائے گا جو ان کے مذہب کے خلاف ہو اور نماز کے اوقات میں بالخصوص جمعہ کے لیے ادائے نماز کی غرض سے ان کو چھٹی دی جاوے۔

(۸) مذہبی تبلیغ آزاد رہے گی۔

(۹) مسلمانوں کے مذہبی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، وراثت، ولایت، حضانت، بلوغ، تفریق زوجین، خلع، فسخ نکاح، عنین مفقود، سفرحج وزیارت، اوقاف کے لیے اسلامی احکام کے خلاف قانون نہ بنایا جائے گا۔ نہ کوئی غیر مسلم ایسے قانون بنانے والی کمیٹی میں شریک ہوگا اور نہ کوئی ایسا قانون اسلامی مذہبی اداروں کی تصدیق کے بغیر قابل قبول ہوگا۔

(۱۰) ان تمام امور مذکورہ دفعات بالا کا اہتمام وانتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا۔

دوسرا حصہ:

چوں کہ مسلم قوم قلت تعداد کے ساتھ تمول اور تعلیم میں بھی پیچھے ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اقتصادی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے حسب ذیل دفعات کی دستور اساسی میں تصریح کردی جائے۔

(۱) حق رائے دہندگی کا ایسا طریقہ قائم کیا جائے کہ ہر قوم کو اس کی تعداد کے موافق رائے دہندوں کی تعداد حاصل ہو جائے۔

(۲) پنجاب و بنگال کی اکثریت کی پوری حفاظت کردی جائے۔

(۳) صوبہ سرحدی و بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ اور دوسرے صوبوں کے طرز حکومت کے موافق ان دونوں میں قیام حکومت کے لیے فوراً متفقہ سعی شروع کردی جائے اور اس سعی کو کسی دوسری چیز پر معلق و مشروط نہ رکھا جائے۔

(۴) صوبۂ سندھ کی علیحدگی بلا شرط تسلیم کرلی جائے۔

(۵) مرکزی مجلس قانون اور قوت عاملہ میں مسلمانوں کو ایک ثلث نشستیں دی جائیں۔

(۶) یہ قاعدہ تسلیم کرلیا جائے کہ کسی قانون ساز مجلس میں کوئی مسودہ قانون، تجویز یا ترمیم یا اضافہ پیش نہ ہو سکے گا اگر مسلم یا غیر مسلم جماعتوں کے ۳/۴ ارکان اس کو اپنی ملت کے مفاد کے خلاف قرار دیں۔

(۷) صوبوں کی مسلم اقلیتوں کو باہمی سمجھوتے سے اگر اکثریت کوئی رعایت دے تو اسی نسبت سے غیر مسلم اقلیتیں بھی اپنے صوبوں میں رعایت کی مستحق ہوں گی اور اس باہمی مفاہمت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔ بشرطے کہ کوئی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے۔

(۸) اقلیتوں کی نشستوں کو محفوظ کردینے کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس

کو دس سال کے ساتھ مقید نہ کیا جائے بلکہ اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک اقلیتیں اس کو ضروری سمجھیں۔

(۹) ملازمتوں کے لیے ایک کم از کم معیار قابلیت معین کر دیا جائے کہ خوش اسلوبی سے کام ہو سکے اور پھر اس معیار کے ماتحت ہر قوم کو اس کی تعداد کے موافق اعلیٰ اور ادنیٰ ہر قسم کی ملازمتوں میں حصہ دیا جائے۔

(۱۰) ہر ملت کو اس کی تعلیم و تہذیب کو فروغ دینے کے لیے سرکاری امداد میں اس کی آبادی کے تناسب سے حصہ دیا جائے اور اس کی ملت کی تعلیم کا انتظام اسی ملت کے افراد کے سپرد کیا جائے۔

(۱۱) حلقہ ہائے انتخاب ایسے طریقے سے قائم کیے جائیں کہ اکثریت کی حیثیت پر کوئی ناگوار اور مضر اثر نہ پڑے۔

(۱۲) دولت متحدہ کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جس کا رسم الخط اردو اور ہندی ہوگا۔

(۱۳) نیابت متناسبہ کے مذکورہ بالا اصول تمام انتخابی مجالس میں جاری ہوں گے۔

(۱۴) جب تک یہ تمام ضمانتیں دستور اساسی میں داخل نہ ہو جائیں گی اس وقت تک مسلمان انتخاب جداگانہ سے دستبردار نہ ہوں گے اور دستور اساسی کو قبول نہ کریں گے۔" (خطبۂ صدارت جمعیت علمائے صوبۂ متحدہ، ساتواں اجلاس منعقدہ میرٹھ، صفحہ ۲۲-۱۹)

کانگریس کی قراردادِ کراچی:

اپریل ۱۹۳۱ء: آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس منتظمہ نے اپنے اجلاس کراچی اپریل ۱۹۳۱ء میں مندرجۂ ذیل قرارداد پاس کی ہے:

۱۔ (الف) دستور ساسی میں بنیادی حقوق کے سلسلے میں جو دفعات ہوں گی۔ ان میں مختلف قوموں کو ان کی تہذیب و تمدن، زبان، رسم الخط تعلیم، پیشوں، مذہبی اعمال اور مذہبی اوقاف کے متعلق اطمینان دلایا جائے گا۔

(ب) شخصی قوانین (پرسنل لا) کا تحفظ دستور اساسی میں ایک خاص دفعہ کے ذریعہ کر دیا جائے گا۔

(ج) مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کا تحفظ مرکزی حکومت کے ذمہ

اوران کے محیط اقتدار میں ہوگا۔

۲۔تمام بالغوں کوحق رائے دہی حاصل ہوگا، جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں گے۔

(تشریح) کانگریس مجلس عاملہ کراچی کانگریس کی ایک قرارداد کے مطابق بالغوں کے رائے دہی کی پابند ہے۔اوراس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔تاہم اس خیال سے کہ بعض حلقوں میں اس کے متعلق شک ظاہر کیا جاتا ہے، اس کوصاف کرنے کی غرض سے مجلس عاملہ یہ بتادینا چاہتی ہے کہ جس وقت بھی میعادرائے دہی میں توسیع کی جائے گی اس وقت اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ یہ توسیع دو چیزوں کو لیے ہوئے ہو۔ایک تو یہ کہ میعادرائے دہی تمام فرقوں کے لیے مساوی ہو۔ اوردوسری یہ کہ ہرفرقہ کی آبادی کے تناسب سے اس کے رائے دہندوں کی فہرست مرتب ہو۔

۳۔(الف) ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی میں مخلوط انتخاب نمایندگی کی اساس اور بنا ہوگا۔

(ب) ہندوؤں کے لیے سندھ میں، مسلمانوں کے لیے آسام میں، سکھوں کے لیے پنجاب اور سرحد میں اور ہندواور مسلمانوں کے لیے ہراس صوبے میں جہاں ان کی تعداد پچیس فی صد سے کم ہو ہندوستان کی مرکزی مجلس اوراسی طرح صوبجاتی مجالس قانون ساز میں آبادی کے تناسب سے ان کے لیے نشستیں محفوظ ہوں گی اور انھیں علاوہ محفوظ نشستوں کے باقی ماندہ نشستوں میں بھی عام انتخاب کے وقت مقابلہ کرنے کاحق ہوگا۔

۴۔ملازمتیں ایک غیرجانبدار پبلک سروس کمیشن کے سپرد کردی جائیں گی، جوقابلیت کا ایک کم سے کم معیار مقرر کرے گا اور تمام فرقوں کوملک کی ملازمتوں میں منصفانہ حصہ حاصل کرنے کے مساوی مواقع دلائے گا۔

۵۔مرکزی اور صوبجاتی وزارتوں کی ترتیب وتشکیل میں کونشن (مختلف پارٹیوں کے لیڈرز کے ساتھ وزیراعظم کی مجلس مشاورت وزارتوں کے مرتب کرنے کے لیے) کے ذریعے اقلیتوں کے حقوق کی نمایندگی ہوا کرے گی۔

۶۔صوبہ سرحداور بلوچستان کودوسرے صوبوں کے مساوی آئین حکومت حاصل ہوگا۔

۷۔سندھ کواس شرط پرعلاحدہ صوبہ بنایا جائے گا کہ وہاں کے باشندے علاحدہ صوبے کے مصارف برداشت کرنے کوتیار ہوں۔

۸۔ملک کا آئندہ دستور اساسی ترکیبی (فیڈرل) ہوگا۔اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو

حاصل ہوں گے۔ سوائے اس کے کہ مزید تجربے سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ صورت ملک کے بہترین مفاد کے خلاف ہے۔"(''تاریخ کانگریس'' مصنفہ ڈاکٹر بی۔ پٹا بھائی ستیہ رامیہ)

مندرجۂ بالا قرارداد کراچی کے اجلاس اپریل ۱۹۳۱ء میں منظور کی گئی۔

مجلس احرار اسلام کی قرارداد:

۲۲ر جولائی ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی جس میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا احمد علی لاہوری، ڈاکٹر عبدالقوی لقمان شریک تھے۔ مجلس احرار کی مجلس عاملہ نے کانگریس فارمولا کی مختلف دفعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اعتراضات کیے وہ قرارداد کی صورت میں حسب ذیل ہیں:

ا۔کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ مان لیا ہے کہ ہندوستان کا آئندہ دستور ترکیبی (فیڈرل) ہو۔ لیکن اقلیتوں کے مسائل کو براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت رکھ کر اس نظام ترکیبی کی حقیقی حیثیت بالکل بدل ڈالی ہے۔ باقی ماندہ اختیارات بھی مشروط طریق پر صوبوں کے حوالے کیے گئے ہیں۔ اور لکھ دیا گیا ہے کہ اگر مزید تحقیق پر ضرورت سمجھی گئی تو انھیں مرکزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ گویا مجوزہ دستور اگرچہ بظاہر فیڈرل ہوگا لیکن حقیقتاً باعتبار عمل اسے یونٹری سمجھا جائے گا۔ سارے اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوں گے۔ جہاں ہندوؤں کو ہمیشہ زبردست اکثریت حاصل رہے گی۔

۲۔ بالغوں کے حق رائے کو غیر مبہم بنا دیا گیا ہے۔ اور نہرو رپورٹ کی طرح اسے دستور اساسی کا بنیادی پتھر نہیں سمجھا گیا۔ ایک متبادل اسکیم بھی پیش کر دی گئی ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ معیار رائے دہی سب کے لیے یکساں بالکل مہمل ثابت ہوگی، لہٰذا ایسے قانون کی تنسیخ کی فوری ضرورت ہے۔" (کاروان احرار، ج ۳، ص ۵۹۔ ۵۷)

ہندو مہاسبھا کی قرارداد:

اار مئی ۱۹۳۶ء: اار مئی ۱۹۳۱ء کو پنجاب اور سرحد کے ہندوؤں کا ایک مشترک اجتماع لاہور ڈی اے وی کالج ہال میں ہوا۔ جس میں بھائی پرمانند، راجہ نریندر ناتھ، پنڈت نیکی رام شرما، ڈاکٹر

مونجے، لالہ اچسنت رام شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ

اگر مسلمان فرقہ وارانہ فیصلے سے مطمئن نہ ہوں تو پنجاب کو اس طرح تقسیم کر دیا جائے۔ ملتان اور راولپنڈی کو سرحد سے ملا دیا جائے۔ انبالہ اور کانگرہ کا الحاق میرٹھ سے کر دیا جائے۔ باقی پنجاب کو علاحدہ صوبہ قرار دیا جائے۔ (کاروان احرار، ج ۳، ص ۱۸۵)

۹ر جون ۱۹۳۱ء: مسز جان گنتھر نے ''کامن سینس'' امریکی اخبار میں طویل مقابلہ لکھا ہے۔ جس کا اقتباس مندرجۂ ذیل ہے:

''اس برطانوی جناح باہمی کھیل کا نتیجہ پاکستان کی صورت نمودار ہوا ہے اور یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی دو علاحدہ خیال ریاستوں کا نام ہے۔ جن کے درمیان باقی تمام ہندوستان پولینڈ کے کاریڈور (ملانے والے راستے) کی طرح رہے گا۔ ابھی تک تو ذمہ دار مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اگر اس اسکیم پر عمل کیا گیا تو ہندوستان میں بھی بلقان بن جائے گا جہاں خانہ جنگیوں کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

(مدینہ منورہ ۹ر جون ۱۹۴۳ء، جلد ۳۲ نمبر ۴۳)

۱۹ر ۲۰ر جولائی ۱۹۳۱ء: سرحد، بلوچستان میں اصطلاحات کے لیے جمعیت علماے ہند نے ہمیشہ کوششیں جاری رکھیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی نے جمعیت علماے صوبہ متحدہ کے ساتویں اجلاس میرٹھ میں اس سلسلے میں فرمایا:

حضرات! اہل سرحد میں حصول آزادی اور اصلاحات کی جو زبردست خواہش پیدا ہو چکی ہے اس سے خود حکومت کے ذمہ دار ارکین کو بھی مجال انکار نہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس تحقیقات سرحد کے نام سے جو کمیٹی سرڈینس براے حکومت ہند کے وکیل امور خارجہ کی صدارت میں مقرر ہوئی تھی اور جس کے سیکرٹری سرنارمن بولٹن تھے جو بعد میں سرحد کے چیف کمشنر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں اعتراف کیا گیا ہے:

''باشندگان سرحد لیاقت و ذہانت اور اپنے معاملات کے انصرام و انتظام کی اہلیت میں بقیہ ہندوستان کے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔''

''اصلاحات کے لیے ان میں زبردست خواہش پیدا ہو چکی ہے اور وہ ان اصلاحات سے ذرہ برابر کم پر مطمئن نہیں ہو سکتے جو ملک کے دوسرے صوبوں کو عطا کی گئی ہیں۔''

آگے چل کر یہ کمیٹی لکھتی ہے:

''اگر پٹھانوں پر بے اعتمادی کی وجہ سے انھیں اپنے علاحدہ صوبے میں ترقی اور حکومت خود اختیاری کے حق سے محروم رکھا گیا تو ان کے'' ''مغرب کی جانب متوجہ ہونے کا خطرہ مبدل بہ حقیقت ہوسکتا ہے۔''

ان واقعات وحقائق کے سامنے آجانے اور اہل سرحد کی زبردست خواہش آزادی کا علم ہوجانے کے بعد بھی فرنٹیر ریگولیشنز کو باقی رکھنا اور اس صوبہ کے لیے ہندوستان سے الگ کوئی دستور حکومت مرتب کرنا، نہ صرف انتہائی ناانصافی اور ظلم ہوگا بلکہ انتہا درجہ عاقبت نااندیشی ہوگی اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس خواہش کا اظہار نہ صرف اہل سرحد کی طرف سے کیا جارہا ہے اور اس کی تائید نہ صرف مسلمانان ہند کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ اور نمایندہ جماعت کانگریس بھی اس کی حمایت میں ہے۔ اور اپنے اجلاس منعقدہ کراچی میں ان کے حقوق آزادی و مساوات کو غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کرچکی ہے۔ ان حالات میں حکومت کی یہ انتہائی دانشمندی ہوگی کہ وہ گول میز کانفرنس کے نتائج کا انتظار کیے بغیر وہ تمام ریفارم صوبہ سرحد کو دے دے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو اس وقت حاصل ہے۔''

مولانا احمد سعید دہلوی نے اسی خطبے میں ''آزاد علاقہ میں برٹش حکومت کے جارحانہ اقدام'' کے بارے میں فرمایا:

حضرات! اب ہمیں صوبہ سرحد کے مغربی علاقہ پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ خیبر پار کا علاقہ ''آزاد علاقہ'' کے نام سے مشہور ہے کیوں کہ اس علاقہ کے باشندے فطرتاً آزادی پسند ہیں اور ہزاروں سال سے وہ اس نعمت سے متمتع ہو رہے ہیں۔ انھوں نے نہ کبھی ہندوستانی سلطنتوں کے سامنے سر اطاعت خم کیا اور نہ افغانی حکومت کے غلام بنے۔ وہ آزاد پیدا ہوئے ہیں اور آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اس علاقہ کا رقبہ تقریباً ۲۶ ہزار مربع میل ہے جس میں کم وبیش ۲۸ لاکھ پٹھان آباد ہیں۔

انگریزی حکومت کی یہ مشہور پالیسی ہے کہ وہ اپنی قدرتی حدود پر کبھی قانع نہیں رہتی اور سرحد کی حفاظت کے بہانے سے اقدام اور پیش قدمی کی پالیسی پر عمل کرتی رہتی ہے اور ہمسایہ اقوام کے امن وسکون کو تباہ وبرباد کرنے کی سعی میں مصروف رہتی ہے۔ چناں چہ صوبہ سرحد پر قابض ہوتے ہی اس نے آزاد علاقہ پر اپنا تسلط جمانے کی کوششیں شروع کردیں اور ۱۸۵۰ء سے لے کر اس وقت تک اس مقصد کے لیے بہت سی لڑائیاں لڑی جاچکی ہیں اور ہندوستان کا بے شمار روپیہ ان

مہموں پر صرف کیا جا چکا ہے۔ اگر چہ انگریزوں نے ان پیہم جنگوں سے آزاد علاقہ کی تقریباً سترہ لاکھ آبادی کو اپنے زیر اثر کر لیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس جارحانہ پیش قدمی کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ چناں چہ ۱۹۳۰ء کے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ رہے سہے آزاد قبائل کی آزادی کو کچل ڈالنے کے لیے صرف ۵ لاکھ پونڈ کے بم ہوائی جہازوں کے ذریعے اس علاقہ کے باشندوں پر گرا دیے گئے ہیں اور کھجوری میدان میں انگریزی فوجوں نے مستقل طور پر اپنی چھاؤنیاں ڈال دی ہیں۔ اس پیش قدمی کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھجوری میدان کے علاقہ کو ایک نیا برطانی صوبہ بنا کر اہل قبائل کی آزادی کو سلب کر لیا جائے اور افغانستان و ہندوستان کے درمیان آزاد علاقہ کی جو حد فاصل قائم ہے اسے ختم کر دیا جائے۔

حضرات! ملک گیری کا یہ مذموم طریقہ ایسا نہیں ہے۔ جس کی مذمت میں کوئی سنجیدہ اور منصف انسان پس و پیش کرے گا۔ آج جب کہ دنیا کی ان قوموں میں بھی جو صدیوں سے غلامی کی عادی ہو چکی ہیں، حریت طلبی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ ایک ایسی قوم کو غلام بنانے کی کوشش کرنا جو ہزاروں سال سے آزاد ہے اور جس کے نزدیک غلامی ایک ایسی لعنت ہے۔ جس کا تصور بھی قابل نفرت ہے۔ قابل مذمت نہیں تو اور کیا ہے۔ نہ صرف اپنے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ آزاد قبائل ہمارے ہم مذہب ہیں، میرے خیال میں ہندوستان کے ہر مسلمان کو ان کے ساتھ دلی ہمدردی ہونی چاہیے اور ان کے خلاف انگریزی حکومت کی جارحانہ پیش قدمی کو لائق نفرت و مذمت سمجھنا چاہیے۔

میں حکومت کو دوستانہ مشورہ دوں گا کہ وہ جلد از جلد اپنی جارحانہ پیش قدمی کو ختم کر دے اور آزاد علاقہ سے اپنی تمام فوجی چوکیاں ہٹا لے۔ کھجوری میدان سے اپنی فوجوں کو واپس بلا لے۔ اور آزاد قبائل کو اسی طرح آزادی کی زندگی بسر کرنے دے جیسی کہ وہ صدیوں سے بسر کر رہے ہیں۔ ورنہ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی یہ غیر دانش مندانہ حکمت عملی اس کے لیے کبھی مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔''

مولانا احمد سعید دہلوی نے جمعیت علماے صوبہ متحدہ کے خطبہ صدارت میں شاردا ایکٹ کے بارے میں فرمایا:

شاردا ایکٹ:

''محترم حاضرین! گزشتہ سال اسمبلی میں ایک قانون صغرسنی کی شادی کے متعلق پاس کیا گیا

تھا۔ یہ قانون اسلامی پرسنل لا کے صریح مخالف اور منافی تھا۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس قانون کو مسترد کرانے کے لیے ہر قسم کی آئینی جدوجہد کی لیکن حکومت جس کی ضد اب آئینی چیخ و پکار سے بالاتر ہو چکی ہے اور جو اپنے قانون کو خود ہی ذلیل کرانا چاہتی ہے اس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ تمام ہندوستان میں ہڑتالیں ہوئیں، جلوس نکالے گئے، جلسے ہوئے لیکن لارڈ اروِن نے جب تقریر کی تو اس منحوس قانون کی حمایت ہی کی۔ صدر جمعیۃ علماء ہند نے ایک مفصل مکتوب میں وائسرائے کو توجہ دلائی اور صاف طور پر بتا دیا کہ ہم صغر سنی کی شادی کو رائج کرنا نہیں چاہتے نہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ ہم چھوٹے بچوں کی شادی کو ضروری یا لازمی جانتے ہیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ نے جس امر کی اجازت دی ہے اس کو ہم قانون سے ناجائز کرنا نہیں چاہتے۔ نکاح مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے اس قانون سے خالص مذہبی مسئلے میں مداخلت لازم آتی ہے۔ ان تمام تنبیہات کے باوجود بھی گورنمنٹ اپنے اصرار پر قائم رہی۔ تمام آئینی مراحل کے بعد بھی جب گورنمنٹ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو یکم اپریل ۱۹۳۰ء کو جو اس قانون کے نفاذ کی تاریخ تھی عام طور سے اس قانون کی سول نافرمانی کی گئی۔ گورنمنٹ نے اس وقت کوئی گرفتاری نہیں کی لیکن قانون کو منسوخ نہیں کیا۔ اگرچہ قانون مردہ ہو چکا ہے لیکن موجود ضرور ہے۔

آپ کو اس امر سے مسرت ہوگی کہ حاجی وجیہ الدین ایم۔ ایل۔ سی نے شاردا ایکٹ کی تنسیخ کے متعلق اسمبلی مین ایک بل پیش کیا ہے وائسرائے نے اس بل کو پیش کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ اگر مسلمانان ہندوستان نے حاجی صاحب موصوف کے اس بل کی تائید کی تو امید کی جاتی ہے کہ یہ قانون مسترد ہو جائے گا۔''

محمد دین ملک کا مسودۂ قانون:

۱۹/۲۰ر جولائی ۱۹۳۱ء: اسی خطبۂ صدارت میں مولانا احمد سعید دہلوی فرماتے ہیں:

ملک صاحب پنجاب کونسل میں ایک مسودۂ قانون پیش کرنے والے ہیں، جس کا مفاد یہ ہے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے مذہبی معاملات مثلاً وراثت، ہبہ، وصیت، نکاح، مہر، طلاق وغیرہ میں مسلمانوں کے تمام فیصلے شریعت اسلامی کے موافق ہونے چاہییں۔ امور مذکورۂ بالا میں کسی شخص کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنا فیصلہ رواج کے موافق کرائے۔ میرا خیال ہے کہ ملک صاحب کے اس مسودہ کی تمام مسلمانوں کو حمایت کرنی چاہیے۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ مسلمان متفقہ طاقت کے

ساتھ گورنمنٹ سے قاضی کے حق کو تسلیم کرائیں جب تک با اختیار قاضیوں کا تقرر نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے مرض کا صحیح علاج نہیں ہوسکتا۔ ملک کے ہر گوشے سے مسلمان اس قسم کی آواز بلند کریں کہ جن مسائل کے لیے شریعت اسلامی میں قاضی کا فیصلہ ضروری ہے ان کے لیے قاضی کے تقرر کی ضرورت ہے۔ گورنمنٹ مسلمانون کے اس حق کو تسلیم کرے اور مقررہ قاضی جو فیصلہ کر دے وہ نافذ سمجھا جائے۔ اس کام کے لیے روپیہ اور وقت کی ضرورت ہوتی۔ لیکن اگر کوشش کی جائے تو مسلمان کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اگر پنجاب کونسل میں محمد دین صاحب کا مسودہ منظور ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں آپ کے اصلی مطالبے کو بہت کچھ تقویت حاصل ہوگی۔ اس لیے ملک صاحب کے مسودہ کی آپ حضرات کو پر زور تائید کرنی چاہیے۔" (خطبہ صدارت جمعیت علماے صوبہ متحدہ، ۱۹۳۱ء بہ مقام میرٹھ، ص ۸، ۹)

یکم اگست ۱۹۳۱ء: ۲۲ر جنوری ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار اسلام کا ایک جلسہ امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تحریک کشمیر کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا۔

یکم اگست سے تحریک کا آغاز کر دیا گیا۔ سیال کوٹ مرکز تحریک قرار پایا اور رضا کاروں کے جتھے روانہ کیے جانے لگے جن کی وجہ سے ڈوگرہ حکومت تھوڑے ہی دنوں میں گھبرا گئی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۴۴، ب، ج)

جمعیت علماے ہند کا سیاسی فارمولا ۱۹۳۱ء:

۳ر اگست ۱۹۳۱ء: دوسری گول میز کانفرنس لندن (۱۹۳۱ء) میں شرکت کے موقع پر کانگریس نے اپنے مطالبے کے طور پر ایک فارمولا مرتب کیا تھا اور مختلف جماعتوں کے پاس اظہار راے اور مشورے کے لیے بھیجا تھا۔ جمعیت علماے ہند نے اس پر غور کیا اور اس میں ترامیم پیش کرنے کے ساتھ اپنا بھی ایک جامع فارمولا مرتب کر کے پیش کر دیا۔ یہ فارمولا مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کے اجلاس مورخہ ۳ر اگست ۱۹۳۱ء سہارن پور میں متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا تھا اور مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم ناظم اعلیٰ جمعیت علماے ہند نے اسے انگریزی اور اردو میں طبع کرا کر کانگریس، مسلم لیگ، دیگر سیاسی جماعتوں اور وقت کے بڑے سیاست دانوں کے پاس غور وخوض کے لیے بھیجا تھا۔ اگر چہ کسی دوسری جماعت یا سیاسی شخصیت نے اس پر کوئی تنقید یا تبصرہ نہیں کیا لیکن جمعیت نے اس پر غور وفکر جاری رکھا۔ جمعیت کے اجلاس لاہور ۱۹۴۲ء میں اور پھر مجلس عاملہ کے اجلاس دہلی

فروری ۱۹۴۵ء میں اس پر مزید غور کیا اور ترمیم وتشریح ووضاحت کر کے اسے نہایت جامع اور بہت مفید بنا دیا تھا۔ ۱۹۳۱ء کا منظور شدہ فارمولا یہ ہے:

''چوں کہ ہندوستان کی مختلف ملتوں نے اس نازک ترین موقعے پر اس وقت کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کیا تھا۔ جس کو کانگریس ہندوستان کے متحدہ فیصلہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں پیش کر سکتی۔ اس لیے کانگریس کی مجلس عاملہ نے وقت کی انتہائی نزاکت کے لحاظ سے مختلف ملتوں کے غور وفکر کے لیے ایک فارمولا پیش کیا ہے اور اس کی تصریح کر دی ہے کہ یہ آخری فیصلہ نہیں ہے بلکہ اگر اس سے بہتر کوئی اسکیم مختلف طبقوں کے اطمینان کے ساتھ کانگریس کے سامنے آئے تو اسے کانگریس بخوشی منظور کر لے گی۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ہندوستان کی آیندہ حکومت خود اختیاری کے دستور اساسی کی بنیاد آزادی اور ایسے اصول پر ہونی چاہیے جس سے تمام طبقوں کے جائز حقوق اور مفاد محفوظ ہو جائیں اور اقلیتوں کو اکثریتوں کی جانب سے کسی قسم کا خوف وخطر نہ رہے اور ہندوستان کے لیے ترقی اور خوش حالی اور امن واطمینان کا راستہ کھل جائے۔ نیز اس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ موجودہ حالت میں قومیت کے اعلیٰ تخیل پر دستور کی بنیاد پر رکھنی ناممکن ہے۔ جیسا کہ کانگریس نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ تاہم قومیت متحدہ کے لیے جہاں تک ممکن ہو راستہ صاف کیا جائے۔

مجلس عاملہ نے کانگریس کے فارمولے پر غور کیا۔ مجلس کی رائے میں کانگریس فارمولا کی دفعہ نمبر ۱ کا ضمن (ج) اور دفعہ ۲ کے ماتحت نوٹ کی عبارت کا ابہام اور دفعہ ۳ کا ضمن (ب) اور ۴ کی محتمل المعنیین عبارت اور دفعہ ۷ لفظ بشرطے کہ سے آخر تک اور دفعہ ۸ میں اول سے آخر تک موجودہ صورت میں ناقابل قبول ہے۔

اس جلسے کی رائے میں مسلمانوں کے اطمینان اور تمام ملتوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے حسب ذیل فارمولے کی منظوری ضروری ہے۔

یہ فارمولا دستور اساسی میں بنیادی دفعات کے طور پر درج کیا جائے گا۔ اور دستور اساسی کا لازمی جز و ہوگا۔

فارمولا:

(۱) ہندوستان کے مختلف ملتوں کے کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی

ادارے، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی جس میں تصریح ہوگی کہ مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی۔ اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی (مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین خلع، عنین ومفقود، نفقہ زوجیت، حضانت، ولایت نکاح و مال، وصیت، وقت، وراثت، تکفین وتدفین، قربانی وغیرہ)

(۳) مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے۔ مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔

(۴) صوبوں اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کی حفاظت کے متعلق شکایات سننے اور فیصلہ کرنے کے لیے سپریم کورٹ قائم کیا جائے گا جو مختلف ملتوں کے ارکان پر مشتمل ہوگا۔ اس کے فیصلوں کی تنفیذ فیڈرل حکومت کرے گی۔

(۵) صوبہ سرحد اور بلوچستان اور ان صوبوں میں جو نئے قائم کیے جائیں طرز حکومت وہی ہوگا جو دیگر صوبوں میں قرار دیا جائے گا۔

(۶) سندھ کو علاحدہ مستقل صوبہ بنادیا جائے گا اور اس کا نظم اس طرح قائم کیا جائے گا کہ اس کی آمدنی اس کے مصارف کو کافی ہو جائے۔

(۷) حق رائے دہی تمام بالغوں کو دیا جائے گا اور کسی صورت میں کوئی ایسا طریقہ قبول نہ کیا جائے گا جس سے کوئی ملت اپنی تناسب آبادی کے مطابق رائے دہندگی کے حق سے محروم رہ جائے۔

(۸) طریقۂ انتخاب مخلوط ہوگا۔

(۹) پنجاب و بنگال میں کسی ملت کے لیے ریزرویشن نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی اقلیت ریزرویشن کے لیے اصرار کرے تو تمام ملتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے اعتبار سے ریزرو کردی جائیں گی۔ باقی صوبوں کی انتخابی مجالس اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے مطابق ریزرو کردی جائیں گی اور مزید نشستوں کے لیے مقابلہ کرنے کا حق بھی حاصل ہوگا۔

(۱۰) طرز حکومت وفاقی ہوگا۔ تمام صوبے کامل خود مختار ہوں گے۔ فیڈرل اسمبلی کو صرف

وہی اختیارات دیے جائیں گے جن کا تعلق تمام ہندوستان کے ساتھ یکساں ہوگا۔ غیر مفوضہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔ الا یہ کہ تمام صوبے بالاتفاق تسلیم کرلیں کہ غیر مفوضہ اختیارات فیڈرل اسمبلی کو دیے جائیں۔

(۱۱) ملازمتوں پر تقرر ایک غیر جانب دار پبلک سروس کمیشن کی طرف سے کیا جائے گا جو لیاقت کا کم از کم معیار مقرر کرکے اس امر کا لحاظ رکھے گا کہ اس معیار کے ماتحت ہر ملت اپنی تناسب آبادی کے موافق حصہ پانے سے محروم نہ رہے۔ نیز ماتحت ملازمتوں میں بھی کسی خاص فرقے کی اجارہ داری نہ ہوگی۔ تمام فرقوں کو ان کا واجبی حصہ ملے گا۔

(۱۲) وفاقی اور صوبجاتی حکومتوں کی وزارتوں میں اقلیتوں کی نمایندگی باہمی تفاہم کے ذریعے قائم کردی جائے گی۔

(۱۳) دستور اساسی کی بنیادی دفعات میں کوئی تغیر، ترمیم، اضافہ اس وقت تک نہ ہوسکے گا جب تک تمام وفاقی اجزا اسے منظور نہ کریں۔

(۱۴) یہ تمام دفعات ایک دوسرے کے ساتھ مرتب ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک دفعہ بھی منظور نہ ہوئی تو تمام فارمولا کالعدم ہو جائے گا۔

مخلوط زندگی اور اسلامی اثرات کا نفوذ:

۳/ اگست ۱۹۳۱ء: ایک واقعے کے بعد مکتوب الیہ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کھانے پینے کی چیزوں کو ہندوؤں سے نہ خریدنا چاہیے۔ لیکن انھیں یہ بھی اعتراف تھا کہ ان کا تعصب یہ فیصلہ کرتے ہوئے انتقامی جذبات سے خالی نہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام سے رہنمائی کی درخواست کی تھی۔ حضرت نے ان کی ہدایت کے لیے یہ مکتوب گرامی تحریر فرمایا۔ اس میں تاریخ ہند اور مذاہب کی بہت سی قیمتی باتیں اور فکر انگیز خیالات آ گئے ہیں۔ مکتوب یہ ہے:

''واقع میں ایک غیرت دار شخص کا یہ خیال بجا ہے، مگر اسی کے ساتھ چند امور قابل ملاحظہ ہیں تاریخ بتلاتی ہے کہ ہند میں ابتداءً جب مسلمان آئے، عام طور سے اہل ہند بودھ مذہب رکھتے تھے اور ترک چھوت چھات تو درکنار، بیاہ شادی تک بخوشی کرتے تھے، جس طرح آج بھی برہما، سیام، چین کھمبایا پہاڑوں وغیرہ میں رائج ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اختلاط نے نہایت قوی تاثیر کی اور

خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے، مغربی پنجاب خصوصاً سندھ میں مسلمانوں کی زیادتی کا بڑا راز یہی ہے، اس کے بعد جب محمود غزنوی مرحوم کا زمانہ آیا ہے تو ہندوؤں میں مختلف احوال کی وجہ سے اشتعال پیدا ہوتا ہے اور شنکراچاریہ عام مذہب ہند کو بودھ سے نکال کر برہمنی بناتا ہے اور حکومت بودھ کی کمزوری کی بنا پر جو کہ افغانستان، بلوچستان، سندھ، لاہور سے فنا کردی گئی تھی اور وسط ہند کے بھی بودھ رجواڑے محمود مرحوم کے پے در پے حملوں سے یکسر کمزور ہو گئے تھے، شنکراچاریہ کو عوام پر بڑی کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، چاروں طرف دبے ہوئے برہمن جن کو بودھوں نے تقریباً دفن کردیا تھا۔ اٹھ پڑتے ہیں اور تھوڑی سی مدت میں پھر برہمنی مذہب اقطار ہند میں پھیل جاتا ہے، لوگ اسی کے دلدادہ ہو جاتے ہیں، برہمن چوں کہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کا سیلاب اختلاط کی بناء پر اس کے اقتدار ہی کو نہیں، بلکہ مذہب کو بھی مٹا رہا ہے، جس کی بنا پر ان کی مذہبی اور دنیاوی سیادتوں کا خاتمہ ہو جائے گا، اس لیے انھوں نے عوام میں نفرت کا پروپیگنڈا پھیلایا اور مسلمانوں کو ملیچھ کا خطاب دیا۔ گاؤکشی اور گوشت خوری کو اس کے لیے ذریعہ بنایا، عوام کی ذہنیت ہمیشہ سے تارکین دنیا کی پرستش کرنے والی واقع ہوئی ہے۔ خصوصاً ہندو ذہنیت جس قدر سادھو اور فقیر کی پرستش کرتی ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ ذہنیت بہت جلد شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک پھیل گئی اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے، چوں کہ اسلامی قوت کا قوت سے ان کو مقابلہ کرنے میں باوجود مساعی عظیمہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیے اسی طریقے پر ان کی جدوجہد محصور ہو گئی اور اسی کو انھوں نے آلۂ کار مدافعت بالقویٰ کا بھی بنانا چاہا۔ پادشاہانِ اسلام نے اولاً اس طرف توجہ ہی نہیں کی، بلکہ وہ تمام باتوں کا قوت سے مقابلہ کرتے رہے، مگر شاہان مغلیہ کو ضرور اس طرف التفات ہوا خصوصاً اکبر نے اس خیال اور اس عقیدے کو جڑ سے اکھاڑنا چاہا اور اگر اس کی جیسے چند بادشاہ اور بھی ہو جاتے یا کم از کم اس کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور بالضرور برہمنوں کی یہ چال مدفون ہو جاتی اور اسلام کے دلدادہ آج ہندوستان میں اکثریت میں ہوتے، اکبر نے نہ صرف اشخاص پر قبضہ کیا تھا، بلکہ عام ہندو ذہنیت اور نفرت کی جڑوں کو کھوکھلا کردیا تھا، مگر ادھر تو اکبر نے نفس دین اسلام میں بھی کچھ غلطیاں کیں، جن سے مسلم طبقے میں اس سے بدظنی ہوئی، اگرچہ بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے ادھر برہمنوں کے غیظ و غضب میں اپنی ناکامی دیکھ کر اشتعال پیدا ہوا۔ ادھر یورپین قومیں خصوصاً انگلستان کو اپنے مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ تلاش کرنا پڑا اور سب سے بڑا ذریعہ اس کا منافرت بین الاقوام تھا اور ہے۔ اب سیواجی

کی تاریخ اور سکھوں کی کارروائیوں اور صوبہ جات کے باغیانہ کارناموں لارڈ کلایو کے بنگال وغیرہ میں بذریعہ ہندو قوم فتح مندیوں میں اس ہاتھ کو بہت زیادہ کھیلتے ہوئے پائیں گے، آج ہماری مہربان گورنمنٹ اس کے ذریعے بہت زیادہ کامیاب ہو رہی ہے۔ اس بنا پر اگرچہ بڑے درجے تک برہمنوں نے مسلمانوں سے اپنی قوم کو بڑی حد تک محفوظ رکھا، مگر اس نے ان کی متحدہ قومیت کا بھی شیرازہ بکھیر دیا، اور خود ان میں بھی چھوت چھات کا عقیدہ جہلا نے پیدا کر دیا حتیٰ کہ بعض بعض خاندان برہمنوں کے بھی دوسرے برہمن سے چھوت چھات کرنے لگے۔

آپ کو معلوم ہے کہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ اور فتح عرب کی پیش خیمہ ہے اور جس روز صلح حدیبیہ اتمام وکمال کو پہنچی ہے، اسی روز انا فتحنا ...... الآیہ نازل ہوتی ہے، جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعجب کرتے ہوئے استفسار فرماتے ہیں۔ او فتح ھو یارسول اللہ آپس میں اختلاط ہونا، نفرت میں کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا، دلوں سے ہٹ اور ضد کا اٹھ جانا، یہی امور تھے، جنہوں نے افلاذ اکباد قریش کو کھینچ کر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بناتے ہوئے مکہ سے مدینے کو پہنچا دیا، حضرت خالد بن ولید، عمرو ابن العاص وغیرہ رضی اللہ عنہم اس طرح حلقہ بگوش اسلام بن گئے کہ قریش کی ہستی فنا ہو گئی۔

الغرض اختلاط باعث عدم تنافر ہے اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا اور تنافر باعث ضد اور ہٹ اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے۔ اور وہ اسلامی ترقی میں سدراہ ہونے والا اور چوں کہ اسلام تبلیغی مذہب ہے، اس لیے اس کا فریضہ ہے کہ جس قدر ہو سکے غیر کو اپنے میں ہضم کرے، نہ یہ کہ ان کو دور کرے۔ اس لیے اگر ہمسایہ قومیں ہم سے نفرت کریں، تو ہم کو ان کے ساتھ نفرت نہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ ہم کو نجس اور ملیچھ کہیں، تو ہمیں ان کو یہ نہ کہنا چاہیے، اگر وہ ہم سے چھوت چھات کریں، ہم کو ان سے ایسا نہ کرنا چاہیے۔ وہ ہم سے ظالمانہ برتاؤ کریں، ہم کو ان کے ساتھ ظالمانہ، غیر منصفانہ برتاؤ نہ کرنا چاہیے۔ اسلام پدر شفیق ہے، اسلام مادر مہربان ہے، اسلام ناصح خیر خواہ ہے۔ اسلام جالب اقوام ہے، اسلام ہمدرد بنی نوع انسان ہے۔ اس کو غیروں سے ''جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا'' پر کاربند ہونا شایان شان نہیں، بلکہ اس کی غرض کے لیے سدیاجوج ہے، کفر نے کبھی اسلام سے عدل وانصاف نہیں کیا۔ ان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ (الخ) وغیرہ شاہد عدل ہیں، مگر اسلام نے انصاف عدل واحسان کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور نہ چھوڑنا مناسب تھا۔ اگرچہ انتقامیہ جذبات بہت کچھ چاہتے تھے، اگرچہ بعض دنیادار بادشاہوں

نے کوئی ظلم وستم کیا ہے تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں، اسلام ان کا روادار نہیں! اب تفصیلی باتیں عرض کرتا ہوں:

(۱) مشرکین بے شک نجس ہیں، مگر علت حکم آیۃ حسب سلیقہ عربیہ کہ مشتق کو محکوم علیہ قرار دینا ماخذ اشتقاق کو علت قرار دینا ہے، لہذا علت نجاست شرک ہوگا، جو کہ نجس معنوی ہے۔ اسی بناء پر اگر مشرک کو سات سمندر سے غسل دیا جائے، تب بھی بوجہ شرک وہ نجس ہی رہے گا۔ حالانکہ تین مرتبہ غسل سے نجاست ظاہری زائل ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہور اسلام متفق ہیں کہ مشرک کا سور عرق وغیرہ پاک ہے، آیت میں مسجد حرام سے صرف خانہ کعبہ یا مسجد مکۂ معظمہ مراد نہیں، بلکہ تمام حد حرم مراد ہے۔ اس میں مشرکین داخل ہو کر یا قریب آ کر تجارت کر سکتے ہیں۔ اسواق اربعہ میں سے کوئی بھی مجلس مکۂ معظمہ بلکہ نفس مکۂ معظمہ میں منعقد نہیں ہوتی تھی تو پھر "عربی خط میں وان خفتم علیۃ" سے کیا مناسبت؟ متنبی کہتا ہے:

لا تشتروا لعبد الا والعصادصه. ان العبید لا نجاس مناکید.

ترجمہ: غلام اگر خریدے تو ساتھ ہی اس کی تادیب وتعلیم کے لیے چھڑی بھی ضروری ہے، کیوں کہ غلام طبیعت کے ناپاک اور بے خبر ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں بھی مراد وہی نجاست معنوی ہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے تمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ، کو مسجد میں باندھا وفود مشرکین کو مسجد میں داخل فرمایا وغیرہ۔

(۲) کفر ہمیشہ سے ایسا ہی کرتا آیا ہے۔ آنحضرت علیہ السلام اور صحابۂ کرام اور اسلام کے کارنامے یاد کیجیے۔ انبیاء علیہم السلام کی تذلیل کفار نے اس سے بدر جہا زاید کی۔ پھر کیا وہ ذلیل ہو گئے۔

(۳) احکام سیاسیہ ایک حالت نہیں رکھتے، کبھی زہر علانیہ دینے کا موقعہ ہوگا تو کبھی شکر کا شربت پیش کرنا ہوگا، آپ کو محض انتقام کبھی لینا ہوگا اور کبھی شفقت کے ساتھ درگزر کرتے ہوئے اپنی طرف کھینچنا، آج موقعہ ہے کہ بڑے دشمن سے ترک موالات کیجیے اور اس کو زک دینے کے لیے غیروں کو ساتھ لیجیے، جیسے یہود بنی حارثہ کو خیبر میں، صفوان بن امیہ اور دیگر طلقاء مکہ کو حنین میں، خزاعہ کو حدیبیہ وغیرہ میں ساتھ لیا گیا۔ ایسی ان کی تذلیلات نے ہی اسلام کو بڑی مدد پہنچائی، ادھر مسلمانوں کو ان سے نفرت ہوئی، ادھر ان کی اقوام کو اسلام کی طرف رغبت ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کروڑوں آدمی تھوڑی سی مدت میں مسلمان ہو گئے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی مردم شماری

موجودہ کی تقریباً نصف ہے کہ مساوات اور عدالت آپ کے خیال کی تائید کرتی ہے، مگر جاذبۂ اسلامیہ تنگ دلی کی اجازت نہیں دیتا مداراۃ بالاعداء مع البغض الباطنی بالفعل زیادہ ضروری اور مفید ہے اور حتیٰ الوسع موالاۃ ممنوعہ سے بچتے رہنا چاہیے۔

(۴) ضروریات اسلامیہ اور وقتیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے الانفع فالانفع پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اھونھما کو اختیار کرنا چاہیے۔

(۵) انگریزوں کے ساتھ معاملہ سیاسی غیر مذہبی نہیں ہے، البتہ وہ اکبرالاعدا، قوی الاعداء اور اضرالاعداء ہیں اور ان کے اسلامیت سے ناامیدی ہے، مانحن فیہ ایسا نہیں، اگر وہ اسلامی دنیا پر مظالم گزشتہ سے تلافی اور آئندہ کے لیے دست بردار ہو جائیں۔تو ترک موالات وغیرہ میں تخفیف ضرور ہوگی، البتہ تابقاءِ کفر مصالحت کی بنا پر نہ موالات تامہ ہوگی اور نہ معادات۔

(۶) اگرچہ انگریز وہ معاملہ چھوت چھات کا نہیں کرتے، مگر اسلام کے بدترین اور اعلیٰ ترین دشمن ہیں، بخلاف ہنود۔ یہ ہمارے پڑوسی ہیں اور پڑوسی اگرچہ کافر ہو۔ پڑوسی پر حق رکھتا ہے، کما وردفی الحدیث۔ ان کے ساتھ ہمارا خون ملا ہوا ہے۔ رشتہ اور قرابتداری ہے یا۔ با کے ساتھ یا جدات کے ذریعے سے۔ ان کے ساتھ ہندوستان میں ہم کو مجبوراً رہنا اور درگزر کرنا ہے۔ بغیر میل جول جس قدر بھی ممکن ہو، ہندوستان میں میں گزر کرنا عادت مستحیل ہے۔ اس لیے ضروریات زندگیہ اس طرف تخفیف ضرور پیدا کریں گی، انگریزوں سے، ہم کو نہ یہ تعلقات ہیں نہ مجبوریت۔

(۷) جائز بلکہ مستحسن ہے۔

(۸) یہ بھی جائز بلکہ باعث ثواب ہے۔

نئے تعلیم یافتہ اس چھوت چھات میں نہ صرف قومیت متفقہ کا ضرر سمجھتے ہیں، بلکہ اپنی مذہبیت کا بھی شیرازہ بکھرتا ہوا پاتے ہیں اور انسانی اخوت کے خلاف پاتے ہوئے ازالے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنی سیاسی زندگی کے لیے وبال جان جانتے ہیں۔ گاندھی جی خود اس کے ازالے کے لیے کوشاں ہیں، مگر جو مرض قرنہا قرن سے آرہا ہے، وہ اس قدر جلد کس طرح دور ہو جائے، تجربہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ چھوت چھات ہندو قوم کو روز افزوں کمی کی طرف ڈھکیل رہا ہے اور اسلام باوجود ہر طرح کی کمزوریوں کے ترقی پا رہا ہے، پس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے، قلت وقت کی بناء پر چند مرتبہ ریل میں مضمون کو پورا کیا ہے۔ معاف فرمائیے گا والسلام

ننگ اکابر حسین احمد غفرلہ،

۱۸ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

۳ر اگست ۱۹۳۱ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لیے جو فارمولا اپنے ۳ر اگست کے اجلاس، میں منظور کیا تھا اور ملک کے مختلف رہنماؤں کو غور و تدبر کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح نے اسے پسند کیا اور الہ آباد کی اپنی تقریر میں اس کا حوالہ دیا ہے، اس پر جمعیت علماے ہند کے ترجمان ''الجمعیۃ'' دہلی نے اس پر اداریہ لکھا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

''مسٹر جناح نے الہ آباد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے کامل یقین ہے کہ اگر ہندو پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کے قیام پر رضامند ہو گئے تو بہت تھوڑے عرصے میں سمجھوتا ہو جائے گا اور اگر پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو گئی تو میں ذاتی طور پر مخلوط انتخاب کو ترجیح دوں گا۔''

''یہی وہ اصول ہے جو حضرت مولانا احمد سعید نے اپنے میرٹھ والے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا ہم جمعیت کے فارمولے سے مسٹر جناح کے ذاتی طور پر متفق ہونے کو ایک نیک کام سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اگر مسٹر جناح نے اس فارمولے پر پوری طرح غور کیا تو وہ اس کے پر زور حامی ہو جائیں گے اور آیندہ اس کی بناء پر کوئی سمجھوتا ہو سکے گا۔''

(روزنامہ الجمعیۃ، دہلی ۱۳ر اگست ۱۹۳۱ء، ص ۳)

۲۱ر اگست ۱۹۳۱ء: ۱۹۳۱ء میں ممالک متحدہ کے ایک جج مسٹر پلوڈن نے ایک خط اپنے کسی دوست کو لکھا تھا اور اس میں ۱۹۳۱ء کی سول نافرمانی کے حوالے سے ہندوسان کی سیاسی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے آیندہ پیش آنے والی صورت حال پر اظہار خیال کیا تھا۔ اتفاقاً یہ خط سنڈے گرافک کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کا ترجمہ مدینہ، بجنور نے اسی زمانے میں چھاپ دیا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نے اس کا حوالہ اپنے رسالے پاکستان کیا ہے؟ میں اور جمعیت علماے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۴۸ء میں اور کئی اہل قلم نے اپنے رسائل اور مقالات میں دیا ہے۔ مسٹر پلوڈن نے لکھا ہے:

''مدت سے ہندوستان کی صورت حالات قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ ہم نیم پارلیمنٹری حکومت کا حتمی وعدہ کر چکے ہیں جو برطانوی افسروں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ برطانوی افسر زیادہ عرصے تک نہیں رہیں گے۔ سول سروس کے تمام شعبے یہاں تک ہندوستانیوں سے بھر دیے گئے ہیں یا بھرے جا رہے ہیں کہ آیندہ چند سال میں ان میں ڈھونڈے سے بھی انگریز کا نام نہیں ملے

گا۔ میں ان حالات میں ہندوستان کے مسئلے کا ایک ہی حل دیکھتا ہوں کہ اسے ہندو اور مسلمان حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تنازعہ ختم کرنے کے لیے ۳۵ سال کی مسلسل پارلیمنٹری جنگ کے بعد ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ہندوستان کے ساتھ کاروبار کرنے سے روک دیا ہے، اب ہمیں مالیہ معاف کر دینا پڑا ہے تاکہ کاشتکار زندہ رہ سکیں، یہ ایک نہایت ہی یاس انگیز صورت حالات ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس تعفن کو پھیلنے سے روکا جائے اور قدرتی تقسیم کے مطابق ملک کے حصے کر دیے جائیں۔ اگر ہندو کاروبار تجارت نہیں کریں گے تو بمبئی کی جگہ کراچی شہر تجارتی بندرگاہ کا کام دے سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مزید ۲۵ یا ۳۰ سال کے لیے ہندوستان پر ہمارا اثر و اقتدار قائم رہے، اب برطانوی حکومت کے پرانے طریق کار کی طرف عود کرنا ناممکن ہے، ہمارے پاس اب کارکن اصحاب موجود نہیں ہیں، اب ہم دور ماضی کو قائم نہیں کر سکتے نیز ہم نے اپنا کام بھی کر لیا ہے۔ کیوں کہ ہندوستان میں ریلیں اور نہریں وغیرہ قائم کی ہیں۔ اب اسے ایسا طرز حکومت دے دو جو اس کے لیے موزوں اور قدرتی ہو۔ لیکن جب تک ہندوستان میں ہمارا اثر و اقتدار قائم ہے ہمیں تحریک مقاطعہ کو پورے زور سے روکنا چاہیے۔ خونریزی کو روکنے اور دقیانوسی ہندو سسٹم کا سدباب کرنے کے لیے ہمیں کراچی اور دہلی سے کام شروع کرنا چاہیے، جہاں دنیا کی ایک بڑی مسلم طاقت قائم ہوگی، ہم خواہ کچھ کریں یہ ہو کر رہے گا، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اسے جلد از جلد معرض عمل میں نہ لائیں۔ اور اس کے ساتھ سب سے پہلے تاجرانہ تعلقات کیوں نہ قائم کریں۔ جب بحر قزوین اور بحیرۂ روم کی طرف وسیع ملکوں کا خیال جائے تو بڑے بڑے امکانات نظر آتے ہیں۔" (مدینہ بجنور۔ ۲۱ راگست ۱۹۳۱ء)

۹ رستمبر ۱۹۳۱ء: ۹ رستمبر ۱۹۳۱ء کو مدینہ، بجنور نے اپنی اشاعت میں بمبئی کرانیکل کے نامہ نگار مقیم لندن کا مضمون شائع کیا۔ نامہ نگار لکھتا ہے۔ ہندوستان کی ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے تاکہ اس کے بعد ہمیشہ ہندوستانیوں میں جھگڑا ہوتا رہے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق مذکورہ نامہ نگار آگے رقم طراز ہے کہ شہنشاہیت پرست برطانوی مدبرین کو جب گاندھی جی کے نرم رویے سے گاندھی جی اور والیان ریاست کو لڑانے میں ناکامی ہوئی تو اب وہ مسلمانوں کو اپنا آلۂ کار بنا رہے ہیں انھوں نے مسلمان مندوبین کو اس لیے متحد کیا ہے کہ وہ کامل آزادی کے حصول میں گاندھی جی کو ناکام کر دیں۔

ستمبر کی دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر انگلستان میں گاندھی جی کی آمد کا ایسا غلغلہ بلند ہوا کہ حکومت بھی اس سے مرعوب ہوگئی۔ میاں فضل حسین نے اپنے پٹھو شفاعت احمد خان کو لکھا کہ لندن میں جو گاندھی جی کی آؤ بھگت ہو رہی ہے اس کی پروا مت کرو۔ اگر کانفرنس کے مسلمان مندوبین نے اپنے پتے ہوشیاری سے استعمال کیے تو یقین کرو کہ تم دوسری قوموں سے بازی لے جاؤ گے۔ آغا خاں تمہارا لیڈر ہے جسے انگلینڈ کی معاشرتی زندگی میں بے حد نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہاں کا کوئی باشندہ خواہ انگریز ہو خواہ ہندوستانی اس عظمت میں آغا خان کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اگر تم نے متحدہ ہو کر آغا خان کی قیادت میں کام کیا تو پھر کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۴۴)

۹ر ستمبر ۱۹۳۱ء: بمبئی کرانیکل کے نمایندے مقیم لندن کے ایک مقالے کا اقتباس مدینۂ بجنور سے نقل کیا جاتا ہے جس میں اس نے برطانوی مدبرین کے مساعی و مقاصد کے بارے میں لکھا ہے:

''ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے تاکہ اس کے بعد ہمیشہ ہندوستان میں جھگڑا ہوتا رہے۔'' (مدینۂ بجنور، صفحہ ۲۰ نمبر ۶۹ مورخہ ۹ر ستمبر ۱۹۳۱ء)

تحریک نظم جماعت، امیر الہند کی تجویز اور شیخ الاسلام:

۲ر اکتوبر ۱۹۳۱ء: نظم جماعت یا قیام امارت شرعیہ کا مقصد جمعیت علمائے ہند کے قیام کے پہلے سال سے آخر تک اس کے سامنے رہا، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اس کا قیام ممکن نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۱ء میں چند درد مندان ملت اسلامیہ نے پھر اس تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ حضرت شیخ الاسلام کے امیر الہند ہونے کا اعلان کر دیا جائے اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت امارت کر لی جائے۔ لیکن حضرت کے انکار اور بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ اس کے لیے تیار ہی نہ ہوئے اور دوسرے اصحاب علم ورائے کی طرف اشارہ کر دیا۔ حضرت ممدوح گرامی کا یہ مکتوب نفی ذات کی ایسی مثال پیش کرتا ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک چراغ لے کر بھی ڈھونڈیے کا تو دوسری کوئی اور مثال ملے گی۔ مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ مولانا نجم الدین اصلاحی نے ایک عالم دین کے نام لکھا ہے:

''آپ نے بہت اچھا کیا کہ رنگون کے خط کو شائع نہیں کیا۔ میں بے حد شکر گزار ہوں اور نہایت ادب اور پرزور التجا کے ساتھ عرض رساں ہوں کہ مہربانی فرما کر اس قسم کی تحریر کبھی بھی اوراق میں نہ آنے دیجیے، بلکہ زبانی تذکرہ تک سے بھی قطعی پرہیز فرمائیے، مجھے تو آپ سے یہ بھی شکایت ہے کہ آپ میری تعریف جو کہ میرے نزدیک بالکل غیر واقعی ہوتی ہے اور انسان کو اپنا علم حضوری اور صحیح ہوتا ہے دوسروں کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے جو کہ میں بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ اس سے آپ کلی پرہیز فرمائیں۔ اگر آپ میرے واقعی عیوب ظاہر نہیں فرماتے یا خداوندی ستر کی وجہ سے واقع میں آپ کو اطلاع نہیں ہے تو ان غیر واقعی مدائح کو تو زبان پر نہ لایا کریں، اگر آپ کسی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو دوسروں کو تو ایسے ناخوشگوار گڑھے میں نہ دھکیلیں۔ واللہ باللہ ثم تاللہ۔ میں اس قدر نالائق، نانجار، گنہگار، دنیا پرست، سگ دنیا اور بدکردار ہوں کہ اگر محض اپنے فضل و کرم سے اس غفار الذنوب، ستار العیوب نے کام نہ لیا تو اشد الناس عذابا اور اخسر الخاسرین میں ہوگا فلہ الحمد علی حلمہ وعلیٰ عفوہ بعد قدرتہ۔ میرا اپنے آپ کو ننگ اسلاف کہنا اور لکھنا واقعیت کی بنا پر ہے کسر نفسی کی بنا پر نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری برائیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے، ورنہ لوگ مجھ سے اس سے زیادہ نفرت کرتے، جتنی سور اور کتے سے کرتے ہیں:

یظن الناس لی خیراً وانی
لشر الخلق ان لم یعف عنی

میں آپ سے پھر خدا اور رسول (علیہ السلام) کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ اس قسم کے خطوط اور تحریروں کو ہرگز اپنے یا کسی اخبار میں جگہ نہ دیں۔ امارت کے لیے بہت سے اہل اور لائق اشخاص موجود ہیں، مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب وغیرہ۔

میں ان حضرات کے دست مبارک پر بیعت امارت کے لیے تیار ہوں اور انشاء اللہ حتی المقدور اطاعت کروں گا۔ خواب مبارک ہے۔ اگر خداوند کریم اپنے فضل و کرم سے مجھے کچھ نوازے، تو اس کا کرم ہے۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

از دیوبند ۱۹ر جمادی الاول ۱۳۵۰ھ

نتائج تحریک آزادی کشمیر:

۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء: ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء تا ۹ رجنوری ۱۹۳۲ء مجلس احرار کی تحریک میں احرار دفاتر کی رپورٹ کے مطابق چونتیس ہزار مسلمان قید ہوئے اور بائیس نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

روز نامہ ''اسٹیٹ مین'' شملہ کی رپورٹ کے مطابق جسے اس نے اپنی ۴ رمئی ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ احرار سول نافرمانی کرنے والوں کی تعداد پینتالیس ہزار پانچ سو چھیاسی ہے۔

قید و بند کے مصائب اور خون ریز قربانیوں کے سلسلے میں مسلمانان کشمیر کو مجلس احرار کی خواہش کے مطابق ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے وہ کچھ تو نہ مل سکا تاہم باغبان نے بارضائے صبا: گل وغنچہ کو چمن کی ہر شاخ پر چہکنے کی اجازت دے دی۔

۱۔ وہ کشمیری کاشتکار جس کے پاس زمین تھی لیکن وہ اس کا مالک نہیں تھا۔ (کیوں کہ ریاست کی تمام اراضی مہاراجہ کی ملکیت تھی) تحریک احرار کے بعد کسان اس کا مالک بن گیا۔ اور ریاست کے مالکانہ حقوق ختم ہو گئے۔ اب ذمہ دار صرف مالیہ ادا کرتا ہے۔

۲۔ پچاس فیصد لگان تحریک کے بعد صرف پانچ فیصد رہ گیا۔

۳۔ تقریر و تحریر اور جماعت بنانے کی اجازت مل گئی۔

۴۔ اخبار نکالنے اور آزادی رائے پر کوئی پابندی نہیں رہی۔

۵۔ آزاد اسمبلی کا وجود تسلیم کر لیا گیا (مگر یہ اسمبلی برائے نام تھی)

ننانوے سال کے لیے برطانیہ اور مہاراجہ کشمیر کے مابین ایک معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے انگریز کو بطور پولیٹیکل ایجنٹ کے عارضی طور پر کشمیر میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔

(کاروان احرار، ج ۱)

نومبر ۱۹۳۱ء: تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے علامہ اقبال نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہندوستان سے انگلستان کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس سفر کی ایک یادداشت سید امجد علی کے حوالے سے فقیر سید وحید الدین نے اپنی کتاب ''روزگار فقیر'' میں قلم بند کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے واقعات کا اعادہ کرتے ہوئے سید امجد علی ایک نہایت ہی دلچسپ اور قابل ذکر واقعے کا انکشاف کرتے ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور

سید امجد علی پیرس سے بذریعہ ٹرین لنڈن پہنچے، تو ریلوے اسٹیشن پر ایک نومسلم انگریز خالد شیلڈرک ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھا۔ خالد شیلڈرک نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مشہور برطانوی سیاست داں جان برائٹ کی تقریروں کا مجموعہ دیا، اور عرض کیا کہ آپ کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اہم سیاسی مباحث میں حصہ لینا ہے اس لیے میری درخواست ہے کہ ان تقریروں کو آپ جیسے بھی ممکن ہو، وقت نکال کر ضرور پڑھ لیں۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے اسی رات اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا اور رات کے دو بجے کتاب کو ختم کر کے دم لیا!

اس واقعے کا سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں، ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر جب ڈاکٹر صاحب نے تقریر فرمائی، تو جان برائٹ کے خیالات کی جھلک اور تاثر ان کی تقریر میں موجود تھا۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب نے بعض مقامات پر جان برائٹ کے نظریات اپنے موقف کی تائید میں پیش کیے۔

اس انگریز کی فراست اور دور بینی کا کمال دیکھیے کہ اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک سال بعد برطانوی حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان چھوڑنے سے قبل اسے کم از کم پانچ خود مختار یونٹوں میں تقسیم کرنے کا اہتمام کرے۔ (روزگار فقیر جلد اول، ص ۱۴۲-۴۳)

جان برائٹ کے افکار کا حوالہ ۲۴ر جون ۱۸۵۸ء کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

۱۳ر نومبر ۱۹۳۱ء: مفتی اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی کا صدر جمعیت علمائے ہند کا ایک فتویٰ الجمعیت دہلی مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۳۱ء کے حوالے سے کفایت المفتی میں شامل کیا گیا ہے۔ مفتی صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''نہ کانگریس کی ممبری کفر ہے اور نہ کانگریس کی ان تجویزوں سے جو ملک و وطن کے مفاد کے لیے ہوں، اتفاق کرنا کفر ہے۔ نہ اس سے ایمان میں ضعف آتا ہے، نہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ جو لوگ کانگریس کی ممبری یا مفید وطن تجاویز سے جو اصول اسلامیہ کے خلاف نہ ہوں اتفاق کرنے کو کفر بتاتے ہیں وہ شریعت اسلامیہ سے ناواقف ہیں یا شریعت پر افترا کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

محمد کفایت اللہ غفرلہ،

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

گول میز کانفرنس اور اقلیتوں کے معاہدے پر تبصرہ:

دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے بارے میں جو معاہدہ کیا گیا تھا، جس میں مسٹر محمد علی

جناح اور لیگ کے ارکان پیش پیش تھے، اسے عام طور پر حتیٰ کہ مسلم لیگی حلقے میں بھی سخت ناپسند کیا گیا اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے حق میں اسے سخت مضر قرار دیا گیا ہے۔ ذیل میں چند اخبارات کے تبصرے درج کیے جاتے ہیں۔ دوسری گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۱ء میں لندن میں ہوئی تھی۔

بجنور کا مشہور آزاد خیال اخبار مدینہ اپنی ۲۱ر جنوری ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

"انھوں نے ایک محضر غلامی پر جس کو یورپینوں نے تیار کیا تھا اپنے دستخط ثبت کر دیے اور اس طرح ان دعاوی کو جن کو دہراتے ہوئے ہندوستان میں ان کی زبانیں خشک ہوگئی تھیں اور ان کے منحوس گلے خود بیٹھ گئے تھے پامال کر دیا۔ انھوں نے صوبہ سرحد کو قربان کر دیا۔ صوبہ سندھ کے گلے پر چھری پھیر دی۔ پنجاب و بنگال کی آئینی اکثریت قائم کرنے کے دعویٰ کو خود جھٹلایا! الغرض بجز جدا گانہ انتخاب کے جس کا فائدہ صرف ان رجعت پسندوں کی ذات کے سوا ملت اسلامیہ کو قطعاً نہیں پہنچ سکتا کوئی چیز حاصل نہ کی۔

خود ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کا بیان ہے کہ ان کی جماعت حصول مطالبات میں بالکل ناکام رہی۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ لندن میں مسلمانوں کے ان خود غرض اور خود پرست نمائندوں نے خود اپنے دعاوی کے ساتھ جو غداری کی تھی کیا وہ ہندوستان میں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے اسے جاری رکھیں گے"

یہی اخبار ۲۵ر جنوری ۱۹۳۲ء کے پرچہ میں لکھتا ہے:

مثلاً سب سے اول وہ محضر غلامی ہے جو اقلیتوں کے مطالبات پر مشتمل ہے۔ اس میں مسلمان ارکان کانفرنس نے ہندو راج کے وہمی خطرہ سے بچنے کے لیے انگریز کی غلامی اور یورپینوں کے اقتدار کی حقیقی مصیبت بطیب خاطر قبول کر لی۔ صوبہ سرحد کو پامال کر دیا، سندھ کی مشروط علیحدگی گوارا کر لی، فیڈرل گورنمنٹ کا گلا گھونٹ دیا، پنجاب و بنگال کی اکثریت فنا کر دی، حریت طلبی کے ادعا کو رد کر دیا، مسٹر میکڈانلڈ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اسلام کے نام پر ملک و ملت دونوں سے غداری کی"

اسی اقلیتوں کے معاہدے اور ان لیگیوں کی کارروائیوں کے متعلق انقلاب، لاہور مورخہ ۶ر فروری ۱۹۳۲ء زیر عنوان "مرکزی دستور کمیٹی کے مسلم ممبروں کے نامۂ اعمال" مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے:

''ان حالات میں اگر ہم یہ کہیں کہ مسلم ممبروں نے قوم کے ساتھ، قوم کے حقوق کے ساتھ قوم کے مفاد کے ساتھ غداری کی تو یہ لوگ روئیں گے کہ انقلاب بے انصافی کر رہا ہے، لیکن ہمارے لیے اس فعل کو کھلی ہوئی غداری قرار دینے کے سوا چارہ نہیں ان کی نیتیں نیک ہیں تو ہوں، ملک کو اس نیکی کی پوجا سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس فعل کی بدی اور برائی سے ہولناک نقصانات کا دروازہ اس کے منہ پر کھل گیا ہے۔ خدا ایسے نیک نیت خادمان۔ ملت کی بلا سے نہیں تو کم از کم ان کی ایسی خدمت کی بلا سے ہر قوم کو محفوظ رکھے!''

روز نامہ انقلاب، لاہور نے اپنی ۱۰ر اپریل ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں کرنل سر ہنری گڈنی کا طویل مضمون ''اقلیتوں کے معاہدے کی مفصل تاریخ'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ حضرت شیخ الا سلام نے ''کشف حقیقت'' میں اس مضمون کا ایک اقتباس نقل فرمایا ہے۔ اس میں سر ہنری گڈنی لکھتے ہیں:

''سر آغا خان نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ ہماری تجاویز کو مسلم پارٹی کے سامنے پیش کر دیں گے اگلے روز میں نے گول میز کانفرنس کے نمائندوں کے یورپین گروپ سے ملاقات کی اور اپنی کارروائی سے مطلع کیا۔ اور ایک معاہدہ کے مسودہ پر سر ہربرٹ کے ساتھ بحث کی اور اس کے بعد بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ مشورہ کیا۔ مسلمانوں سے ایک جلسہ میں اس معاملے پر بحث کر کے مجھے اس موضوع پر مفصل یادداشت بھیجنے کے لیے کہا میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد سر ہربرٹ کار سے گفتگو کی۔ اب یورپین گروپ، اینگلو انڈین، ہندوستانی عیسائی اور اچھوتوں کے نمائندے متحد ہو چکے تھے اور مسلمان ہمارے اجتماعی خیالات سننے کے لیے بیتاب تھے۔ چناں چہ سر ہربرٹ نے رِٹز ہوٹل میں ایک جلسے کا انتظام کیا کیوں کہ اب تمام معاملہ انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس طرح کے متعدد جلسوں اور بے حد بحث وتمحیص کے بعد ہم نے ۱۱ر نومبر ۱۹۳۱ء کو اقلیتوں کے معاہدے پر دستخط کر دیے اور ۱۲ر نومبر کو یہ معاہدہ وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ۱۳ر نومبر کو ہز ہائنس سر آغا خاں نے اس کو رسمی طور پر مینارٹی سب کمیٹی میں پیش کیا اور اس پر بحث ہوئی۔ یہ اس دستاویز کی مختصر تاریخ ہے جو اب اقلیتوں کے معاہدہ کے نام سے مشہور ہے۔''

۱۹۳۲ء

۲ر جنوری ۱۹۳۲ء: سبھاش چندر بوس جب بمبئی سے لوٹ رہے تھے تو انھیں کسی معقول وجہ

بتائے بغیر گرفتار کرلیا گیا۔ اس گرفتاری کے بعد مارچ ۱۹۳۳ء تک وہ نظر بند رہے۔ (کرنل محبوب احمد، ص ۵۴)

یکم فرروری ۳۲ء کی اپنی اشاعت میں مدینہ بجنور نے لکھا کہ جب گاندھی جی نے مسلم لیگیوں کے ۱۴ نکاتی مطالبات منظور کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تو ان احمق اور فریب خوردہ حضرات نے اچھوتوں کی حمایت کا بیڑا اٹھالیا اگرچہ ان کا دعویٰ حقوق مسلمین کی حفاظت کا تھا اس احمقانہ طرز عمل کی جو قیمت ان کو ملی وہ ان کے طرز سے بھی زیادہ شرم ناک ہے (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

۶ رفروری ۱۹۳۲ء: ۲۱ رسالہ خاتون ورکر بیناداس نے ۶ رفروری ۱۹۳۲ء کو گورنر بنگال سر اسٹینلی جیکسن چانسلر کلکتہ یونیورسٹی پر اپنے ریوالور سے دو فائر کیے۔ گورنر بنگال یونیورسٹی میں جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کررہے تھے۔

مس بیناداس نے ۱۹۳۱ء میں انگریزی زبان اور ادب کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی۔ ۶ رفروری کو بیناداس بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کرنے یونیورسٹی گئی تھی کہ اس نے گورنر پر قاتلانہ حملہ کردیا۔ مگر وہ بچ گیا۔

ملزمہ کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس نے پندرہ فروری کو عدالت میں اپنے جرم کو اقرار کرتے ہوئے کہا،

''میں اقرار کرتی ہوں کہ سینٹ ہاؤس میں میں نے کونشن کے آخری دن گورنر بنگال پر فائر کیے تھے۔ میں اس کے لیے اپنے کو قطعی ذمہ دار ٹھہراتی ہوں۔ آخر کو اگر مرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ اس آمرانہ اور غیر ملکی نظام کے خلاف لڑتے ہوئے باعزت طریق پر شریفانہ موت مرا جائے۔

اس غیر ملکی نظام کے خلاف جس نے ہمارے ملک کو دائمی غلامی اور ذلت ورسوائی کے جوئے تلے دبا رکھا ہے۔ میں نے اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوکر گورنر پر گولی چلائی تھی۔ میں نے اپنے ملک کے لیے جو قدم اٹھایا وہ ایک زبردست تشدد کا اقدام تھا۔ اور خود میری فطرت کے خلاف بھی۔ ساتھ ہی مجھے اس بات پر مسرت بھی ہے کہ قدرت نے سر اسٹینلی جیکسن کو بچالیا اور اس طرح لیڈی جیکسن اور ان کے بچے ایک دردناک حادثے سے بچ گئے۔

میرے لیے یہ بات باعث مسرت ہے کہ میں نے اپنا مقصد بغیر کسی انسانی جان کے اتلاف کے حاصل کرلیا۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ کونشن ہال میں ڈینیش چندر سین زخمی ہوگئے۔ ان کو یا کسی اور کو ذرہ بھر بھی نقصان پہنچانا میرا مقصد نہ تھا اور مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ میرے اس اقدام سے انھیں یہ تکلیف پہنچے گی۔

میں نے اپنی دماغی کیفیت اور دل کی گہرائیوں میں اپنے ملک کی غلامی کی ذلت کو محسوس کیا

ہے۔ میں یہ سوچتی رہی۔ کیا ایسا ہندوستان زندگی بسر کرنے کے قابل ہے۔ جو مظالم کی آماجگاہ ہو اور مسلسل غیر ملکی حکومت کی زیادتیوں کے تحت بے چینی سے کراہ رہا ہو؟ اور کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ان سب چیزوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک شخص اپنی زندگی نچھاور کر دے۔ کیا ہندوستان کی ایک بیٹی اور انگلستان کے ایک فرزند کی قربانی ہندوستان کے عوام کو ان کی مسلسل غلامی کے خلاف بیدار کرنے کے لیے کافی نہ ہوگی اور انگلستان کو اس کی زیادتیوں پر تنبیہہ نہ کرے گی؟

یہ سوالات تھے جو میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتے رہے اور مجھے سکون حاصل نہ تھا۔

میری مذہبی اور اخلاقی حس سیاسی آزادی کے جذبے سے بے تعلق اور بے جوڑ نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو شخص سیاسی طور پر غلام ہو وہ خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا ہی آزادی کی روح ہے اور اس نے اپنے انسانوں کو آزاد بنایا ہے۔ تاکہ وہ اس مسرت سے ہم کنار ہو سکیں جو اس میں ہے۔ اس لیے میں نے سیاسی آزادی کو مذہب اور اخلاق کا ایک جزو بنایا ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ اس موقعے پر بینا نے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا کہ انسانیت کا بہترین اور فطری تقاضہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں ہر جور و ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور بغاوت کرے۔

میں نے اپنے عملی اقدام کے لیے اپنی متدس مادر تعلیم کا کونش ہال منتخب کیا۔

بینا داس کے اس تحریری بیان کے بعد کلکتہ ہائی کورٹ نے ملزمہ کو ۹ سال قید سخت اور بی کلاس میں رکھنے کا حکم دیا۔ (کاروان احرار، ج ۱)

۱۰ مارچ ۱۹۳۲ء: ۱۰ مارچ ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی نے اچھوتوں کی نمایندگی اور علیحدگی سے متعلق وزیر سر موئیل ہور کو خط لکھا کہ اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب نہ دیا جائے بلکہ ان کے ہر بالغ مرد عورت کو رائے دہندگی کے رجسٹر میں جگہ دی جائے۔ ان کا شمار ہندو دھرم سے ہے ورنہ جداگانہ انتخاب سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منتشر ہو جائیں گے۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۴۴)

۲۲ مارچ ۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس (جسے احرار کی اعانت حاصل تھی) نے ایک قرارداد میں کہا کہ ہرگاہ کہ مسلم قوم گزشتہ دو گول میز کانفرنسوں کی کارروائی سے خوش نہیں ہے کیوں کہ مسلمانوں کے وہ مطالبات جو یکم جنوری ۲۹ء اور ۵ رجولائی ۳۱ء کو مرتب کیے گئے اور ہرگاہ کہ اس

کانفرنس میں رار عامہ یہی ہے کہ چوں کہ اس کی تعاونی حکمت عملی تاحال تسلی بخش نتائج پیدا نہیں کر سکی۔ اس لیے یہ کانفرنس فیصلہ کرتی ہے کہ اب مسلمانوں کے لیے گول میز کانفرنس اور اس کی ان ماتحت کمیٹیوں سے تعاون کرنا خارج از امکان ہے اور یہ تعاون اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ فیصلہ نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات اس آئین میں شامل کیے جائیں گے۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

۲۵ر مارچ ۳۲ء لاہور میں سکھوں نے اپنی پولیٹکل کانفرنس میں مجلس قانون ساز اور ملازمتوں میں ۳۰ فیصد کی صوبائی مانگ کی اور مرکز میں ۵ فیصد کی۔ ساتھ ہی یہ بھی حلف اٹھایا کہ پنجاب میں مسلم راج کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ وغیرہ۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

۱۲ار پریل ۱۹۳۲ء: ۲۱ر اپریل ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا کانگریس نے اپنا سالانہ اجلاس دہلی چاندنی چوک گھنٹہ گھر پر مالویہ جی کی صدارت میں کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ مالویہ جی دہلی پہنچتے حکومت نے انھیں راستے ہی میں گرفتار کرلیا اور ان کے ہمراہیوں کو بند کر دیا۔

حکومت کی انتہائی کوشش تھی کہ کانگریس کا یہ اجلاس منعقد نہ ہو سکے۔ پولیس کا خیال تھا کہ اجلاس کی جگہ کا اعلان محض چال ہے، اس لیے مختلف طور پر غلط سلط پروپیگنڈا اور دہشت کے ساتھ خطرے کی دھمکیاں دی جاتی رہیں اور پولیس اپنا ہر حربہ استعمال کرتی رہی۔ دوسری طرف اسی دہلی میں اکالیوں کے ایک جلوس پر پولیس کی توجہ مرکز ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی چاندنی چوک گھنٹہ گھر پر پولیس نے گھیراؤ ڈال دیا۔

بڑی کوشش رہی کہ اجلاس نہ ہونے پائے، اس کی باوجود بھی پانچ سو نمایندے چھپتے چھپاتے اسٹیج تک پہنچ گئے اور شری رنچھوڑ داس، امرت لال سیٹھ احمد آباد والے کی زیر صدارت اجلاس کی کارروائی شروع ہو گئی۔ کانگریس کی سالانہ رپورٹ کے بعد چار تجویزیں بالاتفاق راے منظور کرتا ہوا یہ اجلاس افراتفری میں برخاست ہو گیا۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے باوجود علالت مولانا حسین احمد مدنی گھر سے نکل پڑے تھے مگر درمیان میں مظفر پور اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

سکسٹی ایئرس آف کانگریس کی صراحت کے مطابق یہ کانگریس کا چھیالیسواں سالانہ اجلاس تھا۔ (ص ۱۶۔۳۱۲)

۱۹۳۰ء میں کانگریس کا اجلاس رہنماؤں کی گرفتاری کی وجہ سے منعقد نہیں ہو سکا تھا۔

جانشین شیخ الہندؒ سے!

اپریل ۱۹۳۲ء: جانشینِ شیخ الہندؒ حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ العالی، پچھلے مہینہ ایک تقریب سے مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں سرسری تشریف فرما ہونے تھے، اعظم گڑھ میں فارسی کے ایک بہترین شاعر رہتے ہیں، ذیل کی نظم خوش آمدید میں انھوں نے اپنے ہی دل کی نہیں اسلامی ہند کے جذبات کی ترجمانی، بہترین عنوان سے کردی ہے۔ مقطع میں نام اس طالب علم کا ڈال دیا ہے، جس نے خوش الحانی کے ساتھ نظم پڑھ کر سنائی تھی۔ صحیح زبان میں اتنی صحیح مدح، صحیح موقع پر، صحیح مخص کے لیے، شاعری کے عالم میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اللہ مادح کو جزاے خیر دے اور ممدوح کی عمر میں برکت نصیب فرمائے۔ (سچ)

اے سایہ ات بال ہما خوش آمدی خوش آمدی
اہلاً وسہلاً مرحبا، خوش آمدی خوش آمدی
اے شمعِ ایوانِ حرم ، اے سرد بستان حکیم
اے خضرِ اربابِ ہدائی ، خوش آمدی خوش آمدی
اے خازنِ اسرارِ حق، اے مہبطِ انوارِ حق
اے حق پسند وحق نما، خوش آمدی خوش آمدی
سرکردۂ اربابِ دیں ، سر دفترِ اہلِ یقیں
سرچشمۂ صدق وصفا ، خوش آمدی خوش آمدی
اے مستشارِ موتمن، اے مقتداے ممتحن
اے بادلِ درد آشنا ، خوش آمدی خوش آمدی
اے قاسم فیض کہن ، اے ظلِ محمودِ احسن
اے یادگارِ اتقیا، خوش آمدی خوش آمدی
اے یوسفِ کنعان ما ، بادا فدایت جان ما
ہاں ! اے اسیرِ مالٹا، خوش آمدی خوش آمدی
اے رایتِ فتحِ مبیں ، اے آیۂ علم دیقیں
اے شمعِ جمعِ اصفیا خوش آمدی خوش آمدی

اے کنزِ اخبارِ نبی ﷺ، مقبولِ سرکارِ نبی ﷺ
اے پرتوِ شمعِ حرا خوش آمدی خوش آمدی

اے نازشِ خاکِ وطن، اے مرجعِ اربابِ فن
اے درد و لہارادوا، خوش آمدی خوش آمدی

آئینۂ فیضِ ازل ، گنجینۂ علم و عمل
تصویرِ تسلیم و رضا خوش آمدی خوش آمدی

از مقدمت دل شادشد، ویرانہ ام آباد شد
اے برتوچوں من صدفدا خوش آمدی خوش آمدی

دلہا تہ اقدامِ تو ، ورد زبانہا نامِ تو
آید زہر سوایں صدا خوش آمدی خوش آمدی

ایں گلشنِ علم و ہنر ، شد از قدومت مفتخر
گوید ہمیں نور الہدیٰ خوش آمدی خوش آمدی

(سچ لکھنؤ ۲ر ستمبر ۱۹۳۲ ء ص ۶)

''کمیونل ایوارڈ'' اور ''پونا معاہدہ''

۱۶ر اگست ۱۹۳۶ء: ''کمیونل ایوارڈ'' سے مراد برطانوی ہند کی صوبائی مجالس قانون ساز میں مختلف فرقوں کی نمایندگی کے لیے تناسب مقرر کرنے والی وہ اسکیم ہے جس کا اعلان برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ۱۶ر اگست ۱۹۳۲ء کو کیا۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہندوستان کے دستوری مسائل پر ہندوستانی رہنماؤں اور برطانوی حکومت کے درمیان گول میز مذاکرات فرقہ وارانہ نمایندگی کے مسئلے پر تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔ اس ایوارڈ کے تحت مسلمانوں، سکھوں، ہندوستانی نسل کے عیسائیوں اور اینگلو انڈین فرقے کو جداگانہ نیابت دی گئی۔ بمبئی کے عام حلقہ ہائے نیابت میں سات نشستیں مراٹھوں کے لیے مخصوص کی گئیں۔ اچھوتوں کو عام حلقوں میں ووٹ دینے کا حق دیا گیا، لیکن ان کے لیے خصوصی نشستوں کا بھی انتظام کیا گیا اور ان نشستوں کے لیے اچھوتوں کے خصوصی حلقے قائم کیے گئے۔ اسی طرح عورتوں کو بھی فرقہ وارانہ خطوط پر نمایندگی دی گئی۔ صنعت و تجارت، کان کنی اور باغبانی کے مفادات کے لیے خصوصی نشستوں کا

انتظام کیا گیا جن کے لیے ایوان ہائے تجارت اور دوسری انجمنوں کے ذریعے چناؤ کا اصول مانا گیا۔اسی طرح زمینداروں کے لیے زمینداری کے حلقے قائم کیے گئے۔

کمیونل ایوارڈ نے اصلاً اچھوتوں کے لیے بھی جداگانہ نیابت کا حق تسلیم کیا تھا لیکن مہاتما گاندھی نے اچھوتوں کو ہندو سماج کا انوٹ انگ قرار دیتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کی اور برطانیہ پر الزام لگایا کہ وہ ہندو قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہے۔ اپنا مطالبہ منوانے کے لیے انھوں نے مرن برت شروع کیا، جس کے نتیجے میں ہندوؤں اور اچھوتوں کے رہنماؤں کے درمیان ''پونا معاہدہ'' ہوا جس کی رو سے اچھوتوں کے لیے جداگانہ نیابت کی جگہ محفوظ نشستوں کا اصول تسلیم کیا گیا۔ چناں چہ اس سمجھوتے کے مطابق حکومت نے کمیونل ایوارڈ میں ترمیم کر دی۔ (فرہنگ سیاسیات، ص ۳۲۴)

۲ر ستمبر ۱۹۳۲ء:

دیوبند کا ایک نادان دوست

(ایک عالم دین کے قلم سے)

۱۹۳۲ء میں دوبارہ تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی پروگرام کے مطابق حضرت شیخ الاسلام کو دہلی کی جامع مسجد میں تقریر کر کے گرفتاری پیش کرنی تھی۔ لیکن حضرت دہلی پہنچنے نہ پائے تھے کہ مظفر نگر کے اسٹیشن پر، سول نافرمانی کے ارتکاب سے قبل ہی ''سول نافرمانی'' کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

دارالعلوم کے اندر اور باہر ہمیشہ کچھ لوگ ایسے رہے جنھیں حضرت شیخ الہند کی مسند جانشین پر حضرت شیخ الاسلام کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا تھا۔ انھیں حضرت کی گرفتاری کے بعد یہ موقع مناسب معلوم ہوا کہ ملکی و وطنی سیاسیات سے دارالعلوم کا رشتہ ہی منقطع کر دیا جائے اور حضرت کی سیاسی سرگرمیوں کو ناروا اور دارالعلوم کی روایت کے خلاف ثابت کر کے دارالعلوم میں حضرت کے خلاف فضا پیدا کر دی جائے۔ اس سلسلے میں مدرسہ کمیٹی کے ایک رکن شیخ رشید احمد نے ایک بیان اخبارات میں شائع کرایا۔ اس کے جواب میں حضرت شیخ الہند کے ایک مسترشد، جن کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ایک مدلل جوابی مضمون سچ لکھنو میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ مولانا دریابادی نے یہ مضمون ''دیوبند کا ایک نادان دوست'' کے عنوان اور ایک نوٹ کے اضافے کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔ ذیل میں یہ مضمون مع ادارتی نوٹ کے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون ۲ر ستمبر ۱۹۳۲ء، ہفت روزہ سچ

لکھنو میں شائع ہوا تھا (ا۔س۔ش)

''حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ کی گرفتاری پر ایک عجیب وغریب بیان، بالکل بلا ضرورت، ممبر مدرسہ کمیٹی، شیخ رشید احمد صاحب کی جانب سے شائع ہوا، جو طبعاً اکثر طلبۂ دارالعلوم اور وابستگان حضرت مولانا کے لیے تکلیف دہ اور اشتعال انگیز تھا۔ ذیل کا مراسلہ اسی سے متعلق ایک ایسے عالم کے قلم سے موصول ہوا ہے، جو حضرت شیخ الہندؒ کے مسترشدین میں ہیں۔ شیخ صاحب کی بابت بعض الفاظ قدرۃً ذرا نا ملائم آ گئے تھے، ان الفاظ کی ترمیم اور عبارت میں کسی قدر اختصار کے بعد مراسلہ درج ذیل ہے:

''دارالعلوم دیوبند کی تاسیس اور بنیاد حضرت قاسم العلوم مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے ایسے وقت میں ہوئی جب کہ کفر الحاد کی شر انگیزیاں ہر چہار طرف سے خرمن اسلام کو بھسم کرنے کے لیے پھیل رہی تھیں۔ اس کی بنیاد اور تاسیس کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ امت مسلمہ کی حس عملی باطل ہو کر ناکاروں کے گروہ پیدا ہوں، جو صرف ''طہر متخلل'' اور ''یجوز ولا یجوز'' کے الفاظ رٹ کر جماعت اسلام کے لیے تیغ تفریق وخذلان لیکر نکلیں، بلکہ اس کی تاسیس سے منشا صرف یہ تھا کہ یہاں سے مسلمانان ہند کے نونہال روح اسلام سے سرشار ہو کر نمونۂ اسلام بن کے نکلیں، اور مردانہ وار اعداء اللہ کا مقابلہ کریں۔ چناں چہ یہی مسلک حضرت قاسم، حضرت رشید، اور ان کے سچے جانشین وخلیفہ حضرت محمود رحمۃ اللہ علیہ وعلیہم کا اس جامعۂ قاسمیہ کے لیے ہر وقت اور ہر زمانے میں طرۂ امتیاز رہا۔ اور اسی وجہ سے ''گورنمنٹ کی استعمار آگیں نگاہیں ہمیشہ اس کی طرف رہیں۔ چناں چہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ایام اسیری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم ومولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے دوران اہتمام میں فی الجملہ کامیابی ہوئی اور اس کے مہتمم اعظم کو ''شمس العلماء'' مکروہ خطاب میں بھی زنجیر کش کر لیا گیا۔ لیکن جب حضرت شیخ الہندؒ ۱۹۲۰ء میں جزیرۂ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان تشریف لائے تو اپنی علالت کی جانکاہ حالتوں میں بھی کوشش فرما کر جامعہ کو اس طوق مذلت سے نجات دلائی۔ اس کے بعد ۲۲ء اور ۲۵ء میں اسی امن سوز عسکریت کی ریشہ دوانیوں سے پھر ایک زبردست فتنہ برپا ہوا۔ جس کا نام تاریخ دارالعلوم میں ''فتنۂ بجنوری'' ہے جس میں جامعۂ قاسمیہ کو اپنے عزیز ترین عدیم المثال صدر مدرس مولانا سید انور شاہ صاحب مدظلہ سے محروم ہونا پڑا۔ اس وقت دارالعلوم کی بقائے ذات کا مسئلہ تھا۔ اس لیے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ، جامعۂ سلہٹ کو چھوڑ کر دیوبند پہنچے اور صدارت

تدریس کے منصب کو سنبھالا اس فتنے کے بعد چشم بصیرت رکھنے والوں کی نگاہیں دارالعلوم کے دیگر مختلف شعبوں پر آنسو بہا چکی تھیں۔ لیکن اس قدر ضرور امید باقی رہی کہ شعبۂ صدارت جو دارالعلوم کے لیے بمنزلہ قلب کے ہے وہ جب سالم اور مستحکم ہے تو دیگر شعبہ جات کی اصلاح بھی آئندہ ممکن ہو سکے گی۔ گو اس کے ممبروں میں ضرور ایسے جراثیم ہیں جن سے زہر کے ساری ہو جانے کا اندیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ آج مولانا شیخ الحدیث جناب سید حسین احمد صاحب مدظلہ بانیان دیوبند کے سچے نمونہ ہیں۔ ان کی گرفتاری پر شیخ رشید احمد صاحب نے گورنمنٹ کی عبودیت میں مست ہو کر جو گلفشانی کی ہے اس سے زہر کے سریان کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند ایک خالص مذہبی ادارہ ہے۔ جہاں صرف مذہبی تعلیمات و دینیات کا کام ہوتا ہے اور آج تک یہ بیرونی معاملات سے علاحدہ ہو کر ایک خالص مذہبی کام کر رہا ہے۔ دارالعلوم بیرونی واقعات اور سیاسیات ملک سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔''

شیخ صاحب کے یہ الفاظ ان کی اسلامیت کا آئینہ ہیں۔ اس سے صاف ظاہر کہ شیخ صاحب کے دل و دماغ پر گورنمنٹی جاہ و جلال چھایا ہوا ہے اور مذہب کی روح سے کوسوں دور ہیں۔ شیخ صاحب کو یہ نہیں معلوم ہے کہ مذہب نام ہے جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کا، جس کو مذہب جاننا اور پہچاننا ہو وہ آپ کی ذات گرامی کا مطالعہ کرے۔ شیخ صاحب کو شاید یہ نہیں معلوم کہ ۱۳ برس تک مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ نے باوجود کسی مادی طاقت کے نہ ہونے کے جبابرہ قریش کے سامنے غار حرا کو چھوڑ کر تبلیغ کی اور پکار پکار کر کہتے رہے کہ حکومت و سطوت و جبروت صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول ﷺ کے لیے اور مسلمانوں کے لیے ہے۔

غالباً شیخ صاحب کی مذہبی معلومات کی کتاب میں کوئی ایسا صفحہ نہیں ہے، جس میں یہ لکھا ہوا کہ صحابۂ کرام حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت حمزہ، حضرت ابوذر، حضرت بلال، حضرت عمار بن یاسر، حضرت صہیب رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہم جناب رسول اللہ ﷺ سے اسلامی روح لے لے کر مجمع عرب اور قریش کے سامنے علی الاعلان جا کر اسلامی علم بلند کرتے تھے اور پٹتے تھے اور اذیتیں برداشت کرتے تھے مگر جناب رسول اللہ ﷺ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ ایسا نہ کرو اس میں نقصان ہے ابھی تم اس لائق نہیں ہو، یہ سیاست ہے، میں تو صرف مذہبی تعلیم دینے کے لیے آیا ہوں، مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حیف ہے! شیخ صاحب کو سوچنا چاہیے کہ ایک روز مرنا بھی ضرور ہے۔

اس کے علاوہ یا تو عمداً کتمان حق ہے یا شیخ صاحب کو آج تک مدرسہ دار العلوم کے مسلک اور طرز عمل کا پتا ہی نہیں۔ یہ امر آفتاب روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح تعلیمی روح کو پھیلایا اسی طرح نتیجۂ تعلیم یعنی حیات ملت مسلمہ کے لیے بھی ہمیشہ تدبیر سوچتے رہے۔ جب روس سے ترکوں کی جنگ تھی تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں ایجی ٹیشن کیے اور امداد کی صورتیں فراہم کیں۔ علاوہ ازیں دیوبند میں ایک ایسی جماعت کو تنظیم دی جو آپس کے مقدمات کا فیصلہ کرے اور مسلمانوں کو طاغوت کی جبہ سائی سے محفوظ رکھے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اللہ روحہ نے کفر کی طاقت سے بیزاری کا اعلان کیا اور ہندوستان کو دار الکفر قرار دے کر جیل خانے تک کی مشقتیں جھیلیں۔ جنگ بلقان کے موقع پر تمام مدرسین مع اراکین اور طلبہ کے ہمہ تن کوشاں و سرگرداں رہے۔ طول و عرض ہندوستان میں دورہ اور گشت کیا بلکہ کچھ دنوں تعلم کا بھی حرج رہا۔ اب اخیر میں اس کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ نے جلا وطنی اور جیل کی تلخ کامیوں کو برداشت کیا ۲۰ء اور ۲۲ء کی حرکت وطنیہ میں بھی مدرسۂ دیوبند پیش پیش رہا۔ کیا ان مذہبی باتوں کے بعد بھی شیخ صاحب یہی کہتے رہیں گے کہ اس مدرسہ کو سیاسیات سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا؟

نہ معلوم شیخ صاحب کے نزدیک ''سیاسیات'' کس کو کہتے ہیں۔ اگر سیاسیات نام ہے تدبیر ملک کا، عباد اللہ کی نگہبانی کا، حقوق مدنیہ کی حفاظت کا، اعداء متسلطین اور محاربین سے گلوخلاصی کا، تو پھر یہ تو عین وہ چیز ہے، جس کی تعلیم سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تیئیس ۲۳ سال تک متواتر دیتے رہے اور جس کے لیے قرآن جلیل البرہان کہتا ہے: ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ۔ اور عملاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امصار اور ممالک کی طرف کہیں حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو، کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، کہیں حضرت علاء الحضرمی کو کہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو گورنری پر مامور کر کے بھیجا، ادھر غیر مسلم طاقتوں سے لڑنے کے لیے کہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو، کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، کہیں زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ وغیرہ وغیرہ صحابہ کو منظم کر کے بھیجتے رہے۔ خود بھی فتح مکہ وغیرہ غزوات کی مہم میں ہمیشہ مشغول رہے۔ جہاں پنج وقتہ نماز اور صوم کی تعلیم تھی وہاں روزانہ تیر اندازی، شمشیر زنی کی بھی تعلیم تھی۔ حسن سیاست و تدبیر مملکت کا بھی سبق برابر جاری رہا۔ کیا شیخ صاحب اسی سے تبرا فرما رہے ہیں؟

اور اگر سیاست مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ کسی چیز کا نام ہے تو کون شخص اس کی طرف قدم اٹھا

رہا ہے جو آپ تحریر فرماتے ہیں۔

اس کے بعد معلوم نہیں کہ مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ، نے کون سا ایسا ''انتہا پسندانہ'' اقدام کیا ہے جو آپ کے نزدیک نا محمود و نا ملائم ہے۔ اگر اسوۂ رسول ﷺ اور صحابہؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خلاف ہے تو بیان فرمائیے، ورنہ شرمائیے، یہ دنیا اور اس کی رہنمائیاں چند روزہ ہیں۔ بہر حال ہمارے مدنظر سرزمین ہند کا مرکز تعلیم و تعلم دار العلوم دیوبند ہے۔ میں اس کے پاک طینت، نیک نہاد ممبران کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ اگر ان کو دار العلوم دیوبند کو قدیمی روایات اور اس کی امتیازی شان کے ساتھ قائم رکھنا ہے تو للہ اس طرف جلد توجہ فرمائیں اور بلا خوف لومۃ لائم اس کو ہلاکت سے بچائیں۔ اگر ان حضرات نے غفلت سے کام لیا اور شیخ صاحب کی حکمت عملی کارگر رہی تو معاذ اللہ کل ہی کو قوم اور ملک دار العلوم دیوبند کو بھی یونیورسٹی لاہور اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ وغیرہ کی صف میں دیکھ لے گی!

۲۱ر جولائی ۱۹۳۲ء (بہ روز جمعرات)

۱۹۳۲ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں کانگریس اور جمعیت علمائے ہند، دونوں جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن سول نافرمانی کا پروگرام کے سبب بنانے کے لیے ڈکٹیٹروں کا ایک نظام جاری کیا تھا۔ جمعیت کے پروگرام کے مطابق پہلے ڈکٹیٹر حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم دہلویؒ اور حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ مقرر ہوئے تھے جو گرفتاریاں پیش کر چکے تھے۔ تیسرے ڈکٹیٹر حضرت ممدوح شیخ الاسلامؒ تھے جنھیں ایک جمعہ کو دہلی جا کر جامع مسجد میں تقریر کرنا اور گرفتاری پیش کرنی تھی۔ لیکن حضرت کو دہلی پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حضرت کے مکتوب میں قانون شکنی کے عزم سے اسی طرف اشارہ ہے۔ مکتوب کے مطالعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس وقت بعض بزرگانِ دیوبند حضرت کے بارے میں کیا سوچتے تھے۔ مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

''مجھ کو تعلیمی مشاغل سے فرصت نہیں ملتی، ادھر دہلی جانا بخوف نوٹس غیر مناسب معلوم ہوتا ہے، حسب پروگرام وقت پر قانون شکنی کے لیے جانا ہو جائے گا۔ تلامذہ کی تعلیم کے لیے دوسرے اساتذہ موجود ہیں، کسی کے تڑپنے کی ان شاء اللہ نوبت نہ آئے گی، مولانا عبد الحلیم صاحب کو دو سال کی مہمانی کا شرف حاصل ہو گیا۔ کچھ بعید نہیں کہ کارکنانِ دار العلوم دیوبند اس مرتبہ کی مہمانی

جیل کے بعد میرا تعلق ہی دارالعلوم سے قطع کر دیں۔ جہاں تک سنا جاتا ہے لوگ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح اس کا پاپ کٹے۔ واللہ اعلم۔ خیر اللہ تعالیٰ جو کچھ بہتر ہو اس کو ظاہر فرمائے۔ آمین۔ والسلام ۱۷ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ"۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۳ نومبر ۱۹۳۲: الہ آباد میں مسٹر د جیار گھوا چاریہ کی صدارت میں اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ہندو ۷۰، مسلمان ۴۰، سکھ ۸، اور کچھ عیسائی رہنماؤں نے شریک ہو کر اتحاد بین القوم پر غور کیا۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

۱۹۳۳-۳۴ء

علامہ اقبال اور تحریک ختم نبوت:

علامہ اقبال قادیانیت سے متعلق کبھی خوش رائے نہ تھے۔ لیکن اس کے مضمرات کا مطالعہ انھوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے تجرباتی دور ۳۲-۱۹۳۱ء میں کیا۔ میرزا بشیر الدین محمود کمیٹی کے صدر تھے۔ علامہ اقبال ان کے شرعی اللّے تللوں اور سیاسی لہو ولعب سے بیزار ہو گئے۔ میرزا نے ۲۵ر جولائی ۱۹۳۱ء کو بعض مسلمان اکابر کو جمع کیا، پھر ان سے مل کر آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی، لیکن علامہ اقبال اور ان کے بارہ احباب مثلاً سید محسن شاہ ایڈوکیٹ اور خان بہادر حاجی رحیم بخش وغیرہم پر جلد آشکار ہو گیا کہ میرزا بشیر الدین محمود اپنی امت کی معرفت کیا گل کھلا رہا اور کیا ناٹک کھیل رہا ہے۔ انھوں نے کمیٹی کو لکھ دیا کہ آئندہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہو۔ اس پر ۱۷ر مئی ۱۹۳۲ء کو لاہور سسل ہوٹل میں میرزا بشیر الدین محمود مستعفی ہو گیا۔ علامہ اقبال صدر منتخب کیے گئے، لیکن علامہ نے محسوس کیا کہ میرزائیوں نے ایک ایسا جال بچھا رکھا ہے جس سے کشمیر کمیٹی کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ آپ نے ۲۰ر جون ۱۹۳۳ء کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک پریس بیان میں کہا کہ

"بد قسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت) کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی قبر کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔"

علامہ اقبال کا یہ بیان ۲۰ر جون ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا۔ دوسرا بیان ۲ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جاری کیا، جس میں صدارت سے اپنی سبک دوشی کا سبب بیان کرتے ہوئے قادیانی امت کے پوشیدہ

اغراض پر اشارات کیے کہ تحریک کشمیر کی آڑ میں اس نے اپنا دام تزویر بچھا کر مسلمانوں کو شکار کرنا چاہا، اس کے بعد علامہ قادیانیت کے بالا ستیعاب مطالعہ میں مشغول ہو گئے ۔ اور سید سلیمان ندویؒ، علامہ انور شاہؒ اور سید نا مہر علی شاہؒ کو خطوط لکھ کر بعض استفسارات کیے ۔ پہلا بیان ۳ رمئی ۱۹۳۵ء کو جاری کیا ۔ اس سے قادیانی قلعے میں تھرتھری پیدا ہو گئی ۔ انگریزوں کا مضطرب ہونا طبعی امر تھا کہ ان کی تخلیق کا مسئلہ تھا ۔ ادھر پنڈت جواہر لال نہرو نے میرزائی امت کے دفاع میں ’’ماڈرن ریویو‘‘ کلکتہ میں تین مقالے تحریر کیے ۔ علامہؒ نے ان مقالوں کے جواب میں ’’اسلام اور احمدیت‘‘ کے زیر عنوان ایک معرکہ آرا مقالہ لکھا، پنڈت جواہر لال نہرو خاموش ہو گئے ، لیکن خود قادیانی فضلاء بھی اس مقالے کے علمی نکات اور واضح سوالات کا جواب نہ دے سکے ، علامہؒ نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے ایک نجی خط محررہ ۲۱ر جون ۱۹۳۶ء میں لکھا کہ میرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں ! سید سلیمان ندویؒ کے نام علامہ نے اپنے ایک خط محررہ ۷ر اگست ۱۹۳۶ء میں لکھا ’’الحمد للہ ، اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے ۔‘‘ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں ۔ (تحریک ختم نبوت، ص ۹۸ ـ ۹۶)

امیر شریعت کی رہائی:

۱۷ر جنوری ۱۹۳۳ء: ۱۷ر جنوری کو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری حریت کشمیر کے جرم میں اپنی میعادِ اسیری گزار کر نیو سنٹرل جیل ملتان سے رہا کر دیے گئے ۔ (کاروان احرار، ج ۱)

رحمت علی کی تجویز پاکستان:

۲۸ر جنوری ۱۹۳۳ء: ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی ریاست ہندوؤں سے الگ کر لینا چاہیے ...... یہ تجویز جب پہلی بار مختصراً تحریر کی گئی تو ٹائپ کیے ہوئے ساڑھے چار صفحات پر پھیلی ہوئی تھی ۔ یہ کام کیمبرج کی ہمبرسٹن روڈ کی کاٹج نمبر ۳ میں ہوا تھا ۔ اس کے مصنف کا نام رحمت علی تھا ۔ وہ چالیس سال کا ایک طالب علم تھا ۔ رحمت علی کی تجویز پر جو تاریخ درج تھی ...... ۲۸ ـ جنوری ۱۹۳۳ء ۔

اپنی تجویز میں اس نے صاف صاف لکھا تھا کہ ہندوستان کو متحد رکھنے کی بات مضحکہ خیز اور بے تکی ہے ۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے جن شمالی مغربی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت

ہے، انھیں الگ کر کے ملا دیا جائے۔ پنجاب، کشمیر، سندھ، سرحد، بلوچستان، اس نئے ملک کا نام بھی رحمت علی نے رکھا ''پاکستان'' پاک سرزمین!

اس تجویز کے آخر میں اس نے بڑے جوش کے ساتھ لکھا تھا کہ ہندو قومیت کی صلیب پر ہم خودکشی نہیں کریں گے۔

مسلمانوں کے ملی جذبے اور ان کی امنگوں نے مسلم لیگ کے روپ میں جنم لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رحمت علی کی تجویز ہندوستانی مسلمانوں کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترتی گئی۔ کانگریس کے ضدی ہندو لیڈروں نے بھی بتدریج ایسا رویہ اختیار کیا کہ ان کے مسلمان ساتھیوں کو ان کے ساتھ اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا۔ (آدھی رات کی آزادی ترجمہ فریڈم ایٹ مڈ نائٹ، ص ۲۷)

ہٹلر کا اقتدار:

۳ر فروری ۱۹۳۳ء: پہلی جنگ عظیم کے فاتح تسخیر یورپ کے باوجود باہم غیر مطمئن تھے۔ فرانس، برطانیہ اور امریکہ سے اپنے تحفظ کی ضمانت مانگ رہا تھا۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ فرانس کو یہ ضمانت دینے کو تیار نہیں تھے۔

جرمنی میدان جنگ میں ہار کر ان شرائط کے تحت!

جرمنی کے بہت سے علاقے چھین کر اتحادیوں کو دے دیے گئے۔ مثلاً السیس اور لورین کے صوبے فرانس کو دے دیے گئے۔ سار کا علاقہ ایک بین الاقوامی کمیشن کے تحت کر دیا گیا۔ اور اس میں جو کوئلے کی کانیں تھیں وہ فرانس کے سپرد کر دی گئیں۔ ڈینزک کے علاقے کو خود مختار بنا دیا گیا۔ جرمنی کی تمام نوآبادیات اتحادی حکومتوں نے اپنی عمل داری میں لے لیں۔ مثلاً کیمرون کی آبادی فرانس اور انگلستان نے آپس میں بانٹ لی۔ جنوب مغربی جرمنی افریقہ کو ایک یونین کے تحت کر دیا گیا۔ مشرقی جرمنی افریقہ پر بلجیم اور انگلستان قابض ہو گئے۔ اور بحرالکاہل کی نوآبادیوں میں سے جزائر مارشل جاپان کو، سمو نیوزی لینڈ کو، نیوگنی آسٹریلیا کو، اور جزیرہ نوردا نگلستان کو ملا۔''

اسی عہد نامے کی رو سے جرمنی کی بحری، بری اور فضائی طاقت کو بھی سلب کر لیا گیا۔ اسلحہ کا تعین کیا گیا۔ کئی قلعے مسمار کر دیے گئے۔ نیز جرمنی کو حکم دیا گیا کہ وہ خاص علاقوں میں اپنی فوج نہیں

رکھ سکتا۔ ان حد بندیوں کے علاوہ جرمنی پر چھ سو ساٹھ کروڑ پونڈ تاوان عاید کیا گیا۔ بعد ازاں ینگ کمیشن کے فیصلے کے تحت انسٹھ کروڑ پونڈ کر دیا گیا۔''

۲۲ر جون ۱۹۱۸ء کو متذکرہ عہد نامہ (وارسائی) پر دستخط کر کے جرمنی اپنی شکست کی منظوری دے چکا تھا۔

باعزت قومیں ہار کر بھی میدان جنگ میں فتح یاب ہونے کی قسم اٹھاتی ہیں اور ان کا یہی یقین انہیں زندگی کی جدو جہد میں آگے بڑھاتا ہے۔

معاہدۂ وارسائی (۱۹۱۸ء) کی ذلت کے بعد جرمنی قوم نے ۱۹۳۳ء میں ایک نئی کروٹ لی۔ اور نئے ارادوں سے تسخیر عالم کی قسم اٹھائی۔

۳ر فروری ۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے انتخاب جیت کر اہل جرمنی کو پیغام دیا۔

''معاہدۂ وارسائی کی تلوار سے مجروح ہونے والے جرمنو! میری طرف آؤ، میں تمہیں اس بلندی پر لے جاؤں گا جہاں تم ۱۹۱۴ء میں تسخیر عالم کے خواب دیکھ رہے تھے۔

(کاروان احرار، ج ۱)

۱۵ر مارچ ۱۹۳۳ء: ۱۵ر اور ۲۱ر مارچ (۱۹۳۳ء) کو چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی بھی ملتان نیو سنٹرل جیل سے رہا کر دیے گئے۔ یہ آخری قیدی تھے جو تحریک حریت کشمیر کے جرم میں سزا کے مستحق قرار دیے گئے تھے۔ (کاروان احرار، ج ۱)

۳۱ر مارچ ۱۹۳۳ء: ۳۱ر مارچ ۳۳ء کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کا ہنگامی اجلاس بہت خطرناک ماحول میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر پر پھلا گھوش استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ پنڈت مالویہ جو صدر اجلاس منتخب ہوئے تھے وہ کلکتہ آ ہی رہے تھے کہ راستے میں آسنول اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ مالویہ جی کی ساتھ شریمتی نہرو اور ڈاکٹر سید محمود کے علاوہ جتنے لیڈر اس سفر میں تھے سب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس طرح حکومت نے ہر ممکن کوشش کی کہ کانگریس کا یہ اجلاس منعقد نہ ہونے پائے اور اگر ہو بھی تو کامیاب نہ ہونے پائے۔ کانگریس کے موجودہ صدر مادھوراؤ بھی کلکتہ جاتے ہوئے راستے میں ہی گرفتار کر لیے گئے کلکتہ میں استقبالیہ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا اور تقریباً آنے والے ایک ہزار نمائندوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

سرکردہ افراد میں فقط شریمتی نیلی گپت اور ڈاکٹر محمد عالم گرفتاری سے بچ گئے تھے اس لیے شریمتی نیلی سین گپت کی صدارت میں کسی طرح اجلاس منعقد کیا گیا اور حکومت کی اس قدر سختی کے

باوجود بھی تقریباً گیارہ سو نمایندے اجلاس میں شریک ہوئے۔ پولیس نے یہ ماجرا دیکھا تو غصہ سے پاگل ہوگئی اور اسٹیج پر بے تحاشہ لاٹھی چارج کر دیا کافی لوگ گھائل ہوگئے لیکن اجلاس میں شریک نمایندے اور ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے عوام ٹس سے مس نہ ہوئے گویا اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور اس حملے کے باوجود اجلاس کی کارروائی جاری رہی۔ پولیس نے جب یہ دیکھا کہ عوام کا اتنا بڑا مجمع اپنی جگہ پر صبر کے ساتھ ہمالیہ کی طرح اٹل ہے تو ناچار پنڈال سے باہر نکل آئی اور اجلاس نے جرأت مندانہ حوصلوں کے ساتھ اپنی ساتوں تجویزیں بالاتفاق رائے منظور کیں اور یہ اجلاس اس طرح اللہ خیر منا تا ہوا ختم ہوگیا۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری)

سکسٹی ایر آف کانگریس کے مولف نے اس اجلاس کو کانگریس کا سینتالیسواں اجلاس قرار دیا ہے۔ (ص ۳۱۴)

انڈین نیشنل کانگریس کلکتہ کے اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قراردادیں پاس ہوئیں:

۱۔نصب العین آزادی:

یہ کانگریس لاہور میں ستائیسویں اجلاس منعقدہ ۱۹۲۹ء میں پاس شدہ اس ریزولیشن کا اعادہ کرتی ہے کہ ہمارا نصب العین مکمل آزادی ہے۔

۲۔سول نافرمانی جائز ہتھیار ہے:

یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت، قومی خودداری کی حمایت اور قومی نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے سول نافرمانی ایک بالکل جائز طریقہ ہے۔

۳۔سول نافرمانی کے پروگرام کی متابعت:

یہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلے کا اعادہ کرتی ہے۔ جو انھوں نے یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو پاس کیا تھا گذشتہ پندرہ مہینوں میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے کانگریس کی یہ پختہ رائے ہے۔ کہ جن حالات میں سے ملک گزر رہا ہے۔ وہ اس بات کے متقضی ہیں۔ کہ تحریک سول نافرمانی کو زیادہ مضبوط اور زیادہ وسیع بنایا جائے اور اس لیے یہ کانگریس لوگوں سے مطالبہ کرتی ہے۔ کہ وہ متذکرہ قرارداد کے مطابق زیادہ سرعت سے کام کریں۔

۴۔بائیکاٹ:

یہ کانگریس لوگوں کے تمام قسم اور تمام طبقوں سے مطالبہ کرتی ہے۔کہ وہ بدیشی کپڑے سے بالکل پرہیز کریں اور کھدر کو ترجیح دیں۔اور برطانوی مال کا بائیکاٹ کریں۔

۵۔وائٹ پیپر:

یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ جب تک برطانوی گورنمنٹ بے رحمانہ جبر وتعدی کی پالیسی پر کار بند ہے۔جس کی وجہ سے قوم کے نہایت ہی معزز و معتمد لیڈروں کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا ہے،آزادانہ تقریر اور جلسے کرنے کے بنیادی حقوق کو پائمال کر دیا گیا ہے،اخبارات کی آزادی پر کڑی بندشیں عائد کر دی گئی ہیں اور معمولی سول قوانین کی جگہ مارشل لا کے مشابہ قوانین جاری کر دیے گئے ہیں جن کی ابتدا مہاتما گاندھی کی انگلستان سے واپسی سے عین پہلے ہی قومی اسپرٹ کو کچلنے کے لیے کی گئی تھی۔کوئی دستور سیاسی جن کو برطانوی گورنمنٹ تعمیر کرے،ہندوستانی لوگوں کو نہ ہی تو منظور ہو سکتا ہے اور نہ ان کے لیے قابل غور ہے۔کانگریس کو پبلک کا اعتماد حاصل ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ دھوکے میں نہیں آئے گی،جس کو حال میں ہی وائٹ پیپر کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔وائٹ پیپر کی اسکیم ہندوستانی لوگوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کو قائم اور برقرار رکھنے کے خیال سے بنائی گئی ہے۔

۶۔گاندھی جی کا برت:

باعث مسرت ہے کہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں مہاتما جی کا یہ گھور برت بہ احسن پایۂ تکمیل کو پہنچا اور توقع کی جاتی ہے کہ اچھوت پن بہت جلد ماضی کا ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔

۷۔بنیادی حقوق:

عوام الناس پر سوراجیہ کی حقیقت اور ماہیت ذہن نشین کرنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کی پوزیشن کو اس طرح سے واضح کیا جاوے کہ وہ اس کو آسانی سے سمجھ سکیں۔اس نظریے سے کانگریس کے اجلاس کراچی میں پاس کردہ ریزولیوشن نمبر ۱۴ کا اعادہ کرتی ہے۔''

گاندھی جی کا برت:

کلکتہ کانگریس کے فوراً بعد ہی ملک میں ایک غیر متوقع واقعہ ظہور پذیر ہوا۔۱۵ رمئی کو اچانک

ہی مہاتما گاندھی کو رہا کیا گیا۔ تحریک ہریجن کے کارکنوں کی مدد کرنے کے وہ اپنے کام کو زیادہ پاکیزہ اور زیادہ سچی اسپرٹ سے انجام دیں۔ مہاتما گاندھی نے ۸ رمئی ۱۹۳۲ء کے دن اکیس دن کا ایک برت اپنی پاکیزگی کے لیے شروع کیا۔ ان کے اپنے ہی الفاظ میں ان کی ذات ان کے ساتھیوں کی پاکیزگی اور تحریک ہریجن کے متعلق میں زیادہ چوکس اور زیادہ احتیاط برتنے کے لیے دلی پرارتھنا مانگنے کے واسطے یہ برت رکھا گیا ہے۔''

''اس لیے میں نے اپنے ہندوستانی اور دنیا بھر کے دوستوں سے درخواست کی ہے کہ وہ میرے ساتھ میرے لیے دعا مانگیں کہ میں اس آزمائش میں پورا اتروں۔ خواہ میں زندہ رہوں یا مرجاؤں۔ جس مطلب کے لیے میں نے برت رکھا ہے۔ اس کو فروغ حاصل ہو۔ کیا میں اپنے سناتن بھائیوں سے اس بات کی دعا مانگنے کے لیے درخواست کرسکتا ہوں۔ کہ برت کا خواہ کچھ ہی نتیجہ ہو۔ اس طلائی سرپوش کو اٹھا دیا جائے جس کے نیچے سچائی چھپی ہوئی ہے۔''

نمائندہ پریس کی ملاقات کے دوران میں آپ نے فرمایا۔ کوئی مذہبی تحریک اس کے معاونین کے دماغی اور مالی ذرائع کے بل بوتے پر ہی کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کو صرف روحانی ذرائع ہی تقویت دے سکتے ہیں اور اس کے لیے برت موثر ترین طریقہ ہے''۔

(تاریخ کانگریس، ص ۹۷-۹۹۵)

قرآن کا صحیح محل تلاوت:

۳ رجون ۱۹۳۳ء: شاہ حفیظ عالم جنیدی دایرۂ شاہ محمد اجملؒ، الہ آباد کا ایک نہایت اہم خط اور حضرت مفتی اعظم کا بہت فکر انگیز جواب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ شاہ حفیظ عالم لکھتے ہیں:

''مسٹر گاندھی کے نیم فاقہ کشی کے موقع اختتام پر جب مراسم تہنیت و بہجت ادا ہورہے تھے کتب مذہبی کے انتخابات بھی پڑھے گئے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے قرآن پاک کی آیات کریمہ متعلق روزہ ماہ صیام تلاوت کیں۔ جس کے بعد گانا شروع ہوا۔ گاندھی جی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے عامۃ المسلمین نے اس سے نہایت خراب اثر لیا۔ اور ان کے حسیات مذہبی کو صدمہ پہنچا۔ یعنی یہ کہ معاذ اللہ ڈاکٹر انصاری نے گاندھی جی کے نیم فاقہ کشی یا متاطعہ جوئی کو روزہ ماہ صیام کے برابر تصور کیا۔ اور قرآن کریم کی بھی عزت ان کے خیال میں ایسی ہی ہے جیسی گیتا، ژند، اوستا وغیرہ کی! ورنہ اس کی تلاوت ایک مشرک کے سامنے جب کہ وہ لیٹا ہوا ہو کیوں کرتے؟ میں نے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی خط لکھا ہے۔ اور آپ کی خدمت میں بھی عریضہ ارسال ہے کہ جناب

اپنی مذہبی رائے سے اس بارے میں میری رہنمائی فرمائیں۔ فقط۔ شاہ حفیظ عالم جنیدی (دائرۂ حضرت شاہ محمد اجمل رحمۃ اللہ علیہ، الہ آباد) ۳؍جون ۱۹۳۳ء۔

''جواب: گاندھی جی نے برت کھونے کے وقت قرآن مجید، انجیل، وید، ژند، اوستا وغیرہ کے اقتباسات پڑھوائے۔ ایک غیر مسلم کی طرف سے دوسری کتب مذہبیہ کے اقتباسات بغرض برکت حاصل کرنے کے پڑھوانے کی خواہش اگر سزاوار تحسین نہ سمجھی جائے تو محل اعتراض بھی نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یوں کہا جائے کہ وہ ابھی تک حق کو متعین کرنے میں یکسوئی حاصل نہیں کرسکا ہے اور تمام کتب مذہبیہ کو ایک درجے میں قابل تبرک سمجھتا ہے۔ تو ایک غیر مسلم کی طرف سے یہ بات قابل گرفت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے گاندھی جی کی درخواست کو قبول کر کے ایک رکوع تلاوت کرنے میں کوئی توہین کلام پاک نہیں کی۔ بلکہ اگر ان کی نیت تبلیغ حق ہو تو وہ ماجور ہو سکتے ہیں کہ بجائے اکیس روزہ برت کے قرآن پاک کے احکام متعلق صیام پہنچادیے۔ گاندھی جی کا لیٹے لیٹے سننا تو مجبوری و معذوری کی وجہ سے تھا جس میں کوئی شبہ اور خفا نہیں ہے۔ بہر حال یہ واقعہ اپنی نوعیت و خصوصیت کے لحاظ سے قابل گرفت و مواخذہ نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم قرآن پاک کو اس کے احترام کے لحاظ سے اور برکت حاصل کرنے کے خیال سے سننا چاہے تو مسلمان کو سنانے میں باک نہ ہونا چاہیے اور یہ بات قرآن پاک کی آیات تعویذوں میں لکھ کر غیر مسلموں کو دینے سے بدرجہا سالم عن الخطا ہے۔ محمد کفایت اللہ غفرلہ،

(سہ روزہ الجمعیۃ، دہلی، بحوالہ کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

اسلام اور بھوک ہڑتال:

۱۴؍جون ۱۹۳۳ء: صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب رکن دستور ساز اسمبلی صوبہ سرحد نے صدر جمعیت علماء ہند کی خدمت میں ایک تار بھیجا تھا، جس میں حضرت سے گزارش کی تھی:

حیات گل نے جو اتمان زئی کا ایک سیاسی قیدی ہے ہری پور جیل میں یکم مئی سے مکمل روزہ رکھا ہے مقصد نامعلوم ہے۔ حالت نازک ہے۔ تاریخ ۲۰؍جون مقرر ہے۔ بذریعۂ تار اپنی ہدایات سے مطلع فرمائیے۔

حضرت مفتی اعظمؒ نے اس کا یہ جواب دیا

''کوشش کیجیے کہ اس کا جائز مطالبہ پورا کر دیا جائے اور روزہ کھلوا دیا جائے اور حیات گل کو

بتائیے کہ اسلام اپنے جائز حق کے مطالبہ کو تو جائز قرار دیتا ہے لیکن کسی ایسے فعل کی اجازت نہیں دیتا جس کا نتیجہ یقینی اور ارادی ہلاکت ہو۔

محمد کفایت اللہ

۴ر جون ۱۹۳۳ء:

(الجمعیۃ دہلی مورخہ ۹ر جون ۱۹۳۳ء، بحوالہ کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۱۹ر تا ۲۱ر اگست ۱۹۳۳ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ مراد آباد میں منعقد ہوا، اس میں مولانا سید حسین احمد مدنی نے بھی شرکت فرمائی۔ اس جلسے میں آیندہ کے لیے جمعیت کا عملی پروگرام مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں جمعیت کے صدر اور ناظم کے علاوہ حضرت مولانا مدنی اور مولانا محمد سجاد شامل ہیں ان اجلاسوں میں متعدد اہم تجاویز پاس کی گئیں۔ من جملہ ان کے معلمین حجاج کے متعلق مجوزہ بل کے خلاف اپنی راے کا اظہار کیا اور حج کے متعلق منظورہ شدہ بلوں پر سخت احتجاج کیا۔

علامہ اقبال کا ایک خط:

۱۵ر ستمبر ۱۹۳۳ء: مولانا راغب احسن (کلکتہ) کے نام علامہ اقبال نے خط لکھا جس میں انھوں نے علماء کی اسمبلی، مسلمانوں کے پرسنل لا اور مسلمان قاضیوں کے تقرر کے مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے اس خط میں شمال مغرب میں مسلم ریاست کے قیام اور پاکستان اسکیم کا ذکر بھی کیا ہے۔ علامہ لکھتے ہیں:

''علماء کے اختلاف کی وجہ سے محکمہ قضاء اور علماء کی اسمبلی کا خیال مجھے اندیشہ ہے کہ محض خیال ہی رہے گا...... جو کچھ میرے خیال میں ہے وہ تو صرف اسی قدر ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کے لیے علماء کی ایک اسمبلی بنائی جائے جس کا فرض یہ ہو کہ کوئی قانون جس کا تعلق مسلمانوں کے مسلمانوں کے پرسنل لا سے ہو، مرکزی اسمبلی میں وضع نہ کیا جائے۔ جب تک علماء کی اسمبلی اس پر غور نہ کر لے۔

دوسری بات یہ ہے کہ چوں کہ بعض امور شریعہ ایسے ہیں کہ ان کا فیصلہ صرف مسلمان قاضی ہی کر سکتا ہے۔ اس لیے مسلمان سب جج خاص اس مطلب کے لیے مقرر کیے جائیں اور باقی کورٹوں میں سابق کی طرح صدر الصدور ہوا کریں۔

میرے خیال میں موجودہ حالات میں صرف اس قدر ممکن ہے۔ اگر مسلمان جدوجہد کریں۔ جو کچھ آپ کے خیال میں ہے اس کا پورا ہونا بہت سے نئے حالات واسباب پر منحصر ہے۔ جن میں بڑا ضروری امر یہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست پیدا کی جائے یا پاکستان کی اسکیم بروئے کار آئے۔ ان اسکیموں کے ہوتے ہوئے بھی کامل شرعی آزادی حاصل کرنے کے لیے مزید جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔''

(اقبال۔ جہان دیگر مرتبہ: محمد فرید الحق کراچی، گردیزی پبلشرز، ۱۹۸۳ء ص ۴۹ تا ۵۱)

جمعیت علمائے ہند کا وجود علامہ اقبال کی مجوزہ ''علماء کی اسمبلی'' سے ہرگز مختلف نہ تھا۔ جمعیت علماء مختلف مکاتب فکر کے علماء کا سب سے بڑا اتحاد اور ان کی تنظیم تھی۔ جس میں حنفی، اہل حدیث اور دیوبند، لکھنو، بدایوں، اجمیر وغیرہ کے حنفی علماء کے تمام مقتدر خاندانوں کے علماء شامل تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس سے بڑا علماء کا اتحاد قائم نہیں ہو سکا۔ جمعیت علماء کا وجود ''علماء کی کونسل'' ہی تھی جس کے قیام کی آرزو کا حضرت علامہ نے اظہار کیا تھا۔

مسلمانوں کے لیے شرعی نظام کا قیام اور مسلمان قاضیوں کا تقرر جمعیت علماء کے مقاصد میں ہمیشہ سرفہرست رہا۔ اس کے قیام کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ لیگی خیال کے مسلمان ارکان اسمبلی کا وجود ثابت ہوا۔ جس کی وجہ سے جمعیت کو بار بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ خلع بل یا انفساخ نکاح کا بل پاس ہوا تو انھیں حضرات کی تجویز پر مقدمات کے تصفیے کے لیے مسلمان قاضی کی شرط ختم کر دی گئی۔

جانشین شیخ الہند کا قول زرّیں:

۲۲ ستمبر ۱۹۳۳ء: ۱۹۳۳ء میں لاہور سے روزنامہ آزاد جاری ہوا تھا۔ یہ قوم پرور خیالات کا ترجمان اخبار تھا۔ حضرت شیخ الاسلام سے اس کے آغاز اشاعت پر پیغام کی درخواست کی گئی تھی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے، یہ پیغام ''قول زریں'' کے عنوان اور اپنے تبصرہ کے ساتھ اپنے اخبار سچ لکھنو میں چھاپ دیا تھا۔ حضرت کا یہ پیغام مولانا دریا بادی کے تبصرے کے ساتھ یہ ہے:

لاہور سے ایک نیا روزنامہ ''آزاد'' کے نام سے بڑی آب و تاب سے نکلا ہے۔ اس کے ایک ابتدائی نمبر میں، ایک پیام حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ، جانشین شیخ الہند کا شائع ہوا ہے۔ اخبارات کے ابتدائی نمبروں میں پیغامات کی حیثیت، عموماً بس ایک رسم کی سی ہو کر رہ گئی ہے، لیکن

مولانا کے اس پیام کی حیثیت اس سے کہیں بلند تر ہے۔ مولانا کی تحریر گرامی کے آخری حصے اس قابل ہیں، کہ ''آزاد'' ہی نہیں، ملک کا ہر اخبار، خواہ کسی پارٹی، کسی جماعت کا بھی ترجمان ہو، انھیں اپنا دستور العمل بنائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''میرے محترم عنایت فرما! میں امیدوار ہوں کہ دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے اس نالائق کو فراموش نہ فرمائیں گے۔ اور اپنے پرچہ کو ان نازیبا کلمات سے ہمیشہ محفوظ رکھیں گے جن کے عام اسلامی پرچے آج کل عادی بن کر ننگ دعار قوم بنے ہوئے ہیں۔ خواہ آپ پر کوئی کتنے ہی گندے حملے کیوں نہ کرے، آپ اگر جواب دینا ضروری سمجھیں تو نہایت متانت اور پرزور دلیلوں سے جواب دیں۔ سوقیانہ کلمات، بزدلانہ جملے، سفیہانہ جملے، شخصی معارضے، ان گندگیوں سے آپ اپنے مؤقر اخبار کو ہمیشہ پاک وصاف رکھیے، کلمات حقہ کہیے اور کسی غیر خداوندی طاقت سے خائف نہ ہوجیے اور اللہ پر توکل رکھیے وہی آپ کا معین ومددگار ہے۔''

اخبار کی پالی ٹیکس ایک بالکل علاحدہ چیز ہے۔ ہوسکتا ہے، کہ ایک اخبار نویس پوری دیانت کے ساتھ فلاح ملک وملت کو کانگریس ہی سے وابستہ سمجھتا ہو، اور دوسرا اپنی بصیرت کے مطابق، کانگریس کی مخالفت ہی کو صحیح قومی خدمت سمجھتا ہو۔ لیکن بہر حال زبان تو دونوں، شریفانہ رکھ سکتے ہیں۔ اصول پر، پالیسی پر، کسی قومی ادارے کی روش ومسلک پر، بحث کرنا، آخر ذاتی حملوں اور ایک دوسرے پر گندگی اچھالنے کے مستلزم کیوں ہوگیا ہے؟

۲۴ر ستمبر ۱۹۳۳ء: الجمعیت دہلی میں مفتی اعظم ہند کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے۔ جس میں حضرت فرماتے ہیں:

''جمعیۃ علماے ہند کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی رہنمائی اور ان کی اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اصلاح ہے۔

(۲) جہاں تک تبلیغ وتذکیر کا تعلق ہے جمعیۃ علماء اپنا فرض ادا کرتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے ہاتھ میں قانون کی تنفیذ اور حکومت کی طاقت نہیں ہے۔

(۳) جمعیۃ کے اراکین اپنے اپنے مقامات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اپنی استطاعت کے موافق ادا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی سعی تبلیغ وتذکیر کی حدود میں ہی رہ سکتی ہے۔ کسی کو جبراً روکنا ان کی وسعت سے باہر ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ۔

(الجمعیۃ، دہلی، ۲۴ ستمبر ۱۹۳۳ء، بہ حوالۂ کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

دعوتِ ناؤنوش اور تحریک پاکستان:

''ہندوستان اپنے حصار میں'' کے مصنف (ایم جے اکبر) ۱۹۳۳ء میں لندن کی ایک دعوت کا ذکر کیا ہے، جو کیمبرج یونی ورسٹی کے ایک طالب علم رحمت علی نے جناح صاحب کی کی تھی۔ یہ وہی طالب ہے جس نے پاکستان، نام تجویز کیا تھا اور چودھری رحمت علی کے نام سے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں شہرت پائی۔ مصنف موصوف لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا خیال اس وقت تشکیل ہوا تھا جب جناح صاحب خود ترک وطن کیے ہوئے لندن میں تھے۔ ۱۹۳۳ء میں کمیبرج یونیورسٹی کے ایک طالب علم رحمت علی نے لندن کے والڈورف ہوٹل میں ایک عشائیے کا اہتمام کیا۔ کھانوں کی فہرست انتہائی غیر اسلامی تھی۔ فہرست میں گھونگھے بھی تھے اور اچھے قسم کی وائن بھی۔ مگر کھانے کے موقع پر جو خیال پیش کیا گیا وہ تھا مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کے قیام کا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں پاکستان کو ''طالب علم کی تجویز'' کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ء تک جناح صاحب بالکل تیار ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک اخباری نمائندے کو بتایا بھی تھا کہ لیگ کا لاہور سیشن ایک تاریخی سشن ہوگا۔ پاکستان کا نام نہیں لیا گیا تھا۔ مگر یہ بات طے ہوگئی تھی کہ ''وہ علاقے، جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، جیسے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں، ایک ساتھ سمجھے جانے چاہئیں اور ان علاقوں پر مشتمل ایک ''آزاد ریاست'' بنائی جانی چاہیے، جس میں شامل اکائیاں خودمختار اور آزاد ہوں گی'' ۱۹۴۷ء آتے آتے جناح صاحب کا فیصلہ کامیاب ہوا۔ ایک طرف گاندھی جی نے ہندوستان کو یوم آزادی کی خوشی منانے سے انکار کیا کہ یہ وہ ہندوستان نہیں جو وہ چاہتے تھے دوسری طرف جناح صاحب نے تالیوں کی گونج میں ایک نئے ملک کی پیدائش کا اعلان کیا۔'' (صفحہ ۲۷)

برطانوی اعلان اور اس پر ردعمل:

دسمبر ۱۹۳۳ء وبعدہ:

ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں برطانوی اعلان پر بحث کا آغاز ہوا۔ ان دنوں سنٹرل اسمبلی (دہلی) کی گذشتہ معیاد ختم ہورہی تھی اور ملک میں نئے انتخاب کی تیاریوں پر جماعتوں کے

درمیان اتحاد باہمی، جوڑتوڑ اور دوڑ بھاگ شروع تھی۔ مسٹر محمد علی جناح بھی انھی دنوں لندن سے عارضی طور پر ہندوستان پہنچے۔ وہ ۲۳؍دسمبر ۱۹۳۳ء کو لندن سے روانہ ہوئے تھے۔

مسٹر جناح نے پہلی گول میز کانفرنس کے بعد سر آغا خاں اور سر فضل حسین کے رویے سے مایوس ہو کر لندن میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن برطانوی اعلان نے جن حالات کو جنم دیا ان کے پیش نظر ان کا ہندوستان پہنچنا اہم سمجھا گیا۔ چناں چہ بمبئی پہنچ کر سب سے پہلے مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں میں اتحاد کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ وقتی طور پر کامیاب رہے۔

برطانوی وزیر اعظم نے اپنے اعلان میں ترمیم کرنے کی شرائط میں اس نقطے کو اولیت دی تھی کہ اگر ہندوستان متحد ہو کر کوئی ترمیم لائے تو میں اسے منظور کر لوں گا۔ یہ بات کہتے وقت اس کے ذہن میں اپنی حکمت عملی اور سیاسی شرارتیں کارفرما تھیں۔ اس نے جس انداز سے یہ دانہ پھینکا، ناممکن تھا کہ اقوام ہند اسے کسی طرح بھی قبول کرے۔ کانگریس ہندو نظریہ سمیت اس کی حامی نہیں تھی۔ گو مسلمان بھی اس تجویز کے حق میں نہیں تھا تاہم متبادل تجویز کے آنے تک وہ اس کو من حیث القوم منظور کر چکا تھا۔ اس پر بھی بات آگے نہ بڑھ سکی۔ آخر مارچ ۱۹۳۳ء میں چند مسلمان رہنماؤں نے ماسوائے مجلس احرار، نیشلسٹ مسلمان، جمعیۃ علمائے ہند اور رجعت پسند حضرات شامل تھے۔ راجہ سلیم پور کے مکان پر انھی کی صدارت میں مسلم یونٹی بورڈ قائم کیا گیا۔ اس کارروائی کے داعی چودھری خلیق الزمان، مولانا شوکت علی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، حضرت مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ اس اجلاس میں چودھری خلیق الزماں نے جداگانہ انتخاب کو مسلمانوں کے لیے قبول کرنے کی حمایت کی۔ اسی یونٹی بورڈ کی ایگزیکٹیو باڈی نے ۱۲؍جنوری ۱۹۳۴ء کو آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے لیے حسب ذیل دعوت نامے جاری کیے:

''ہندستان میں ہر خیال اور ہر طبقے کے لوگوں کا وائٹ پیپر میں اصولی نقائص کے متعلق اتفاق ہے۔ اس نازک موقع پر محسوس کیا گیا ہے کہ یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ملک اس وقت تک وائٹ پیپر کی تجویز سے مطمئن نہیں ہوگا جب تک ان میں ملک کی ترقی پسند رائے عامہ کے مطابق ضروری تبدیلیاں عمل نہیں لائی جائیں گی۔

اس مقصد کے پیش نظر تجویز کیا گیا ہے کہ ہندوستان بھر کی تمام جماعتوں کے نمایندوں کی ایک کانفرنس فروری ۱۹۳۴ء میں منعقد کی جائے۔ اس بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے متعلق منافی بحث نہیں کی جائے گی۔ نیز اس امر پر بھی اس

کانفرنس میں غور نہیں کیا جائے گا کہ اگر کم از کم سیاسی مطالبات جن پر کامل اتفاق ہوگا قبول نہ کیے گئے تو کیا کارروائی کی جائے گی؟

ایگزیکٹو کمیٹی نے غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ان مسائل کو ایجنڈے سے خارج کر دیا جائے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے حاصل ہوگی بلکہ اس لیے بھی کہ اس طرح مختلف انجمنوں کے نمایندے وائٹ پیپر میں تبدیلیوں کے متعلق تجویز پیش کرنے کے متعلق آزاد ہوں گے۔ کیوں کہ یہ امر تو ظاہر ہے کہ ملک منظم طور پر وائٹ پیپر کی تجویز کو موجودہ شکل میں منظور نہیں کرتا۔''

۱۱ر جنوری ۱۹۳۴ء: کو پنڈت جواہر لال نے الہ آباد سے مجوزہ آل پارٹیز کے متعلق اپنے ایک بیان میں کہا:

''آل پارٹیز کانفرنس کی اس طرح معاہدوں کی گفتگو کوئی عملی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے اس کی پوزیشن واضح ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وائٹ پیپر پر غور اور اس میں ترمیم کی کوشش غیر مناسب ہے۔ اگر وہ کانگریس یا دیگر اشخاص جو ہندوستان میں بنیادی تبدیلیوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ وائٹ پیپر کو بہتر بنانے کی کوشش میں شامل ہو جائیں تو وہ ان اصولوں کے ساتھ غداری کریں گے۔ جن کے لیے وہ لڑ رہے ہیں۔ ان حالات میں جو لوگ آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے خیالات ملک کے لیے نقصان دہ ہیں۔''

۱۶ر جنوری ۱۹۳۴ء: کو جمعیۃ علماے ہند نے برطانوی اعلان اور پنڈت جواہر لال کے متذکرہ بیان پر اپنی راے کا اظہار صاف اور واضح طور پر کر دیا۔

''اگر ہندوؤں میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ موجود ہے۔ اگر وہ کمیونل ایوارڈ کو بدلوانا چاہتے ہیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے برطانیہ کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وائٹ پیپر کی اسکیم کو واپس لے کر ذمہ دارانہ حکومت کا خاکہ پیش کرے تو انھیں بھی اس تحریک اتحاد کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر آل پارٹیز مسلم کانفرنس سے اتحاد باہمی کے لیے گفت وشنید کرنی چاہیے۔ ورنہ یاد رکھنا چاہیے کہ کمیونل ایوارڈ محض دل خوش تمناؤں سے ہرگز نہیں بدل سکتا۔

ملک کی جو جماعت اتحاد باہمی سے گریز کرے گی اور کمیونل ایوارڈ کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھے گی۔ اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ کمیونل ایوارڈ کو بدلوانا نہیں چاہتی۔ اور ہندو مسلم فساد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔''

اسی دوران ۱۳/جنوری ۱۹۳۴ء کو لندن سے مسٹر جناح کے نام برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر ایچ۔ کے ہیلز نے ایک خط لکھا۔ جو ملک کے عام اخبارات میں شائع ہوا روزنامہ انقلاب سے ہم اس خط کو نقل کر رہے ہیں:

"مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ بمبئی میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں نمایاں حصہ لیں گے۔

میں اس تجویز کو پسند نہیں کرتا کہ کمیونل ایوارڈ پر کسی قسم کی بحث نہ کی جائے۔ کیوں کہ مجوزہ آئین کے کسی حصے پر اگر نہایت تلخ نکتہ چینی کی گئی ہے تو وہ کمیونل ایوارڈ ہی ہے۔ اگر اس کانفرنس میں بھی اس پر بحث نہ کی گئی تو کانفرنس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (کاروان احرار، ج ۱)

۱۹۳۴ء

زلزلۂ بہار:

۱۵/جنوری ۱۹۳۴ء: ۱۵/جنوری ۱۹۳۴ء کو صوبۂ بہار میں ایسا خوفناک زلزلہ آیا جس نے ہزار ہا انسانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ زلزلہ کا اثر کم از کم تیس ہزار مربع میل علاقہ پر ہوا۔ دربھنگہ، چمپارن، مظفر پور، سرائے مونگیر، بھاگل پور اور پورنیا کے اضلاع پر اس کا خاص اثر ہوا۔ اموات کی مقدار کا اندازہ بیس ہزار کے لگایا جاتا ہے۔ دس لاکھ مکانات وغیرہ کو نقصان پہنچا جن میں سے ایک لاکھ بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ ۸ لاکھ ایکڑ سے زیادہ سرسبز و شاداب زمین آنکھ جھپکنے میں ریت کے ٹیلوں سے پر ہو گئی۔ جہاں ایک لمحہ پہلے ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے اب وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ ریلوے لائنیں ٹوٹ گئیں خط و کتابت اور، آمد و رفت کی تمام ذرائع منقطع ہو گئے۔

جس طور گجرات کی طغیانیوں کے وقت سردار پٹیل فوراً میدان عمل میں آ کودے تھے اسی طرح زلزلہ کے بعد بابو راجندر پرشاد اچانک منظر عام پر آ گئے۔ اس وقت اکثر کانگریسی رہنما اور کارکن سول نافرمانی کے سلسلے میں جیلوں میں پڑے ہوئے تھے، چناں چہ راجن بابو صدر سنٹرل ریلیف کمیٹی نے حکومت سے تعاون کی پیش کش کی۔ بابو راجندر پرشاد نے بہار کے زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے روپے اور اشیا کی ایک موثر اپیل کی۔

اس اپیل کا نہایت حوصلہ افزا جواب ملا۔ کپڑوں اناج و دیگر اشیاء کے علاوہ ۲۱ لاکھ روپیہ نقد

اکٹھا ہو گیا۔ مکانات وغیرہ کے لیے جو اشیاء اکٹھی کی گئیں ان کی مجموعی قیمت تین لاکھ روپیہ کے قریب بتائی جاتی ہے۔

ملک کے ہر صوبہ اور ہر بڑے شہر کی طرف سے کافی تسلی بخش امداد پہنچی۔ مہاتما گاندھی اور سیٹھ جمنالال بجاج والنٹیئر لے کر آئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جیل سے رہا ہوتے ہی بہار کے مصیبت زدہ بھائیوں کی امداد کے لیے آموجود ہوئے۔ انھوں نے خود کدال ہاتھ میں لے کر کئی روز تک متواتر کام کیا۔ لیکن انھیں جلد ہی ایک باغیانہ تقریر کے سلسلے میں گرفتار کر کے اپنے بھائیوں کی امداد سے محروم کر دیا گیا۔ بہار میں دو ہزار کے لگ بھگ والنٹیئر کام کر رہے تھے۔ ان میں ڈاکٹر، انجینئر اور آڈیٹر وغیرہ بھی شامل تھے۔

والنٹیئر وں نے ہر قسم کا امدادی کام کیا۔ ملبہ کو ہٹا کر لاشیں نکالی گئیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔ تباہ شدہ لوگوں کو سردی کی تکالیف سے بچانے کے لیے جھونپڑیاں تعمیر کی گئیں۔ جو فصلیں باقی رہ گئیں تھیں ان کو کاٹنے میں امداد دی گئی تاکہ ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ فوری امداد کے طور پر سنٹرل ریلیف کمیٹی نے پانچ ہزار من اناج بیس ہزار روپیہ نقد اور ۲۸ ہزار کمبل تقسیم کیے ۳۶۰ دبے ہوئے کوئیں کھودے گئے۔ ۲۷ ہزار کے قریب جھونپڑیاں بنائی گئیں۔ ان تمام چیزوں پر ایک لاکھ نوے ہزار روپیہ خرچ کیا۔

(تاریخ کانگریس، از ڈاکٹر بی۔ پٹا بھائی سیتا رامیہ ص ۸۹۔۱۰۸۸)

تواریخ کانگریس میں ایک اور جگہ بھی یہاں کے اس ہولناک زلزلہ اور اس کی تباہ کاریوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

۱۶ جنوری کے روز صبح کے اخباروں میں لوگوں نے یہ خبر پڑھی کہ بہار پر گذشتہ دوپہر قہر ٹوٹ پڑا۔ تمام ہندوستان میں ایک ہیجان سا بپا ہو گیا۔ چند منٹوں کے اندر اندر صوبہ کا نقشہ ہی بالکل پلٹ گیا۔ ہزاروں عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ زمین کے تلے سے جو ریت کے فواروں نے نکل کر بڑے بڑے رقبوں میں لہلہاتی فصلوں کو اجاڑ دیا۔ پندرہ سوفٹ کی گہرائی سے ۱۱۶ درجے کی حرارت کا کھولتا ہوا پانی باہر نکلنے لگا۔ ابھی ایک بھی منٹ گزرنے نہ پایا تھا کہ دریاؤں میں زندگی بخش سیلاب زمینوں کی آب پاشی کے لیے رواں تھا۔ جہاں ہرے ہرے کھیت لہلہا رہے تھے مٹی اور ریت کے تودے نظر آتے تھے۔ ہاں ہاں ابھی ایک منٹ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ نہ صرف یہ کہ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے، سیکڑوں عورتیں بیوائیں ہو گئیں اور سیکڑوں والدین بے اولاد ہو گئے چشم

زون میں قیامت کا منظر پیدا ہو گیا۔ ابھی ابھی جو آرام سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے مٹی کے تودوں کے نیچے سسکتے نظر آتے تھے۔ بہار کی تباہی کا ذکر محال ہے اگر اس تباہی کو قدرت کا قہر کہا جاوے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس زلزلے کا اثر پچاس ہزار مربع میل کے رقبے اور ڈیڑھ کروڑ کی آبادی پر ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بیس ہزار اشخاص کی جانیں تلف ہوئیں۔ دس لاکھ سے زائد گھروں کو یا تو نقصان پہنچا یا مسمار ہو گئے۔ پینسٹھ ہزار کوئیں یا تالاب مسمار ہو گئے یا ان کو نقصان پہنچا۔ تقریباً دس لاکھ بیگھے فصلیں ریت سے ڈھک جانے کی وجہ سے خراب ہو گئیں۔ (تواریخ کانگریس، ص ۹۱۱۔۱۲)

اس حادثے کے علاج کے لیے بہار اور ہندوستان دونوں نے موقع کے مناسب مدد بہم پہنچائی۔ مختلف فنڈوں سے ایک کروڑ سے زیادہ چندہ اکٹھا ہوا۔ بہار مرکزی امدادی کمیٹی کے پاس اخیر ماہ جون تک ستائیس لاکھ روپیہ جمع ہوا۔ مصیبت زدہ لوگوں کے بچانے اور با قاعدہ امداد مرتب کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف مقامات سے لیڈر اور کارکن اڑتے ہوئے مدد کے لیے آئے۔ اس کمیٹی کی ایک شاندار رپورٹ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے نقصانات اور مختلف مقامات کے کارکنوں نے جو امداد پہنچائی اس کا صحیح صحیح اندازہ لگ سکتا ہے۔

باہر سے جن لیڈروں نے برباد شدہ رقبے کا دورہ کیا۔ ان میں سے ایک پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ ان کے دل میں ہمدردی اور خدمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک موقعے پر جب ان کو اطلاعات موصول ہوئیں۔ کہ ملبے کے نیچے زندہ آدمی دب گئے ہیں۔ تو انھوں نے والنٹیر کا بلہ لگا کر اپنے کندھے پر کدال رکھ لی اور والنٹیر وں کے ایک گروہ کے ساتھ کدالیں، پھاوڑے اور ٹوکریاں لیے ہوئے جائے مقام پر پہنچ گئے۔ تب انھوں نے پھاوڑے اور کدالوں سے ملبے کو ٹوکریوں میں بھر بھر کر اپنے سروں پر اٹھا کر ایک طرف کیا۔ زلزلہ بہار کی وجہ سے گاندھی جی کو اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنی پڑی۔ زلزلے...... نے کئی ایک پیچیدہ معاملات پیدا کر دیے۔ جن کو بہار اور اس کے کارکنوں کو سلجھانا پڑا۔ ایک مہینہ بھر تک گاندھی جی ان کارکنوں کو اپنا مشورہ دیتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام نمایندگان کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں امداد کا انتظام کرنے کے لیے بہار مرکزی امدادی کمیٹی کو مرتب کیا گیا۔ اور موجودہ زمانے میں امداد پہنچانے کی ایک بڑی اسکیم کے لیے راستہ صاف کیا گیا۔ بہار میں اپنے قیام کے دوران میں گاندھی جی نے مصیبت زدہ شہروں اور دیہات کا دورہ کیا اور تباہ شدہ لوگوں کی الم ناک حالت کو بچشم خود ملاحظہ کیا اور نئی جاری

شدہ کمیٹی کو اپنا پروگرام مرتب کرنے میں مدد دی۔ انھوں نے اپنے سدھے ہوئے کارکنوں کو جائے مقام پر لاکر دیہات کی خدمت کرنے کے لیے پیش کر دیا۔

پنڈت نہرو کی گرفتاری:

بہار میں اپنے مختصر دورے کے اختتام پر پنڈت جواہر لال کو گورنمنٹ نے دوبارہ قید کر لیا۔ جب پنڈت جی کلکتے گئے تھے۔ اور انھوں نے بنگال کی صورت حالات اور ضلع مدنا پور میں جو واقعات حال ہی میں رونما ہوئے تھے، ان پر دو تقریریں کی تھیں۔ حکومت بنگال بھلا یہ کب برداشت کر سکتی تھی کہ اس صوبے کے نام نہاد دہشت انگیز لوگوں کی بابت سوائے ان کی پرزور مذمت کرنے کے اور کوئی ذکر کیا جائے۔ بنگال کی ...... حکومت کو بھلا یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہشت انگیزی کی وجوہات اور ان طریقوں پر جو حکام نے ان کو دبانے کے لیے اختیار کیے تھے، منظر عام میں نکتہ چینی کریں۔ شائستگی نے بنگال پولیس کو اجازت نہ دی کہ پنڈت جی کو اسی وقت گرفتار کر لیں، جب وہ بہار میں خلق خدا کی بہتری میں کوشاں تھے۔ لیکن وہ الہ آباد میں اپنے گھر پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کو پھر ایک بار جیل خانے جانا پڑا۔ کلکتہ میں ان کی دو تقریروں کی بنا پر مقدمہ چلا کر دو سال قید کی کڑی سزا دی گئی۔''

(تواریخ کانگریس، ص ۱۴۔۹۱۱)

۴ر مارچ ۱۹۳۴ء: علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبۂ الہ آباد میں ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا جو حل پیش کیا تھا۔ اس کی جو تعبیر مختلف حضرات نے کی ہے اس کا تو اقبال کے تصور سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو پاکستان ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آیا، اس کا اس تعبیر سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن کسی نہ کسی کو فکری رہنما بنانا پاکستان کی فلسفیانہ تاریخی ضرورت تھی۔ اس لیے طے کر دیا گیا کہ علامہ اقبال مفکر پاکستان ہیں۔ لیکن علامہ مرحوم کی فکر کا خود ان سے بڑا شارح اور ترجمان دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ ان کا تصور کیا تھا؟ یہ بات انھوں نے خود اپنے قلم سے ایڈورڈ تھامسن کے نام ایک خط میں لکھ دی تھی۔ تھامسن نے علامہ اقبال کے کلام پر مضمون لکھا تھا ان کی خصوصیات میں یہ بھی بیان کیا کہ پاکستان کی اسکیم کے بانی مبانی بھی علامہ اقبال ہیں۔ علامہ مرحوم چوں کہ پاکستان اسکیم سے متفق نہ تھے اسی لیے اس غلط انتساب کی تردید میں ایک طرف تو تھامسن کو فوراً خط لکھا دوسری طرف ملک کے ایک اہل قلم مولانا راغب احسن کو خط لکھا کہ وہ ''اسٹار آف انڈیا'' میں اور خود اپنے اخبار میں

اس غلط بیانی یا غلط فہمی کی تردید کر دیں۔ علامہ اقبال نے ایڈورڈ تھامسن کو جو خط لکھا تھا، اس کا ترجمہ یہ ہے:

لاہور، ۴ رمارچ ۱۹۳۴ء:

مائی ڈیر تھامسن!

آپ نے میری کتاب پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ مجھے مل گیا۔ یہ ایک اعلیٰ پایے کی تحریر ہے اور آپ نے میرے بارے میں جن اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔

لیکن اس میں آپ سے ایک بڑی گھمبیر غلطی سرزد ہو گئی ہے، جس کا اظہار میں جلد سے جلد ضروری سمجھتا ہوں، آپ نے مجھے اس اسکیم کا محرک لکھا ہے، جسے ''پاکستان اسکیم'' کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میری اسکیم نہیں۔ میں نے اپنے خطبے میں جس چیز کو پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مجوزہ ہندوستانی فیڈریشن میں شمال مغربی ہند میں غالب مسلم اکثریت کا ایک نیا صوبہ تخلیق کیا جائے۔ جب کہ پاکستان شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریت کے صوبوں پر مشتمل ایک الگ خود مختار فیڈریشن کی تجویز ہے، جو ایک الگ ڈومینیں کی حیثیت سے انگلستان سے براہ راست تعلق رکھے گی۔

پاکستان اسکیم کیمبرج میں بنائی گئی تھی اور اس کے بنانے والوں کا خیال تھا کہ گول میز کانفرنس کے ہم شرکا نے مسلمان قوم کو ہندو قربان گاہ پر یا نام نہاد ہندوستانی قومیت کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

آپ کا مخلص محمد اقبال

(اقبال...... ہز پولیٹکل آئیڈیاز ایٹ کراس روڈ (اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط تھامسن کے نام) مرتبہ ایس شان احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۸۰ و ۹۴ (عکس)۔

۶ رمارچ ۱۹۳۴ء: ایڈورڈ تھامسن سے اس کے مضمون میں علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں جو غلط ترجمانی قصداً یا سہواً ہوئی تھی، اس نے علامہ مرحوم کو بہت بے چین کر دیا تھا۔ تھامسن کے نام خط میں تردید کر دینے کے بعد بھی ان کی بے چینی دور نہیں ہوئی۔ انھیں خیال ہوا کہ ہندوستان میں بھی وہ مضمون سیکڑوں لوگوں کی نظر سے گزرے گا اور اگر یہاں کے کسی اخبار نے اسے نقل کر دیا تو

یہ تعداد ہزاروں تک پہنچ جائے گی۔ چناں چہ علامہ مرحوم نے اپنے ایک عقیدت مند صاحب قلم کو خط لکھا کہ وہ اس مضمون کو اس کے مصنف کی اہمیت کے پیش نظر خود اپنے اخبار میں جگہ دیں اور اسٹار آف انڈیا، کلکتہ میں بھی چھپوائیں لیکن اس گمبھیر غلطی کی تردید بھی کر دیں جو مصنف نے پاکستان اسکیم کو ان سے منسوب کر کے کی ہے۔ وہ پاکستان اسکیم سے اپنی غلط نسبت کو خاموش رہ کر برداشت کرنے پر تیار نہیں ہو سکے۔ اس سلسلے میں علامہ نے راغب احسن کو یہ خط لکھا:

"۶ مارچ ۱۹۳۴ء

عزیز من راغب!

میرا خیال ہے، یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ میں فاضل رحمت اللہ سے کروں اور یہی کروں گا لیکن آپ شفیع داؤدی صاحب سے فرمائیں کہ وہ اپنا خط تحریر فرما کر مجھے ارسال کر دیں۔ اس خط پر ہم دونوں کے دستخط ہوں گے:

مجھے توقع ہے کہ آپ مجھے جمہوریت اور آئین کے بارے میں اپنے خیالات سے جلد از جلد آگاہ کریں گے۔ میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کے تبصرے کی دو نقول ارسال کر رہا ہوں۔ ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں۔ تبصرہ کئی اعتبار سے دل چسپ ہے اور شاید آپ اسے اپنے اخبار میں شائع کرنا مناسب خیال کریں۔ تبصرے کی دوسری نقل اسٹار آف انڈیا، کلکتہ کو بھیج دیجیے۔ براہ کرم یہ بات ضرور نوٹ فرما لیں کہ اس تبصرے کا مصنف اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پاکستان اسکیم سے میرا کوئی تعلق ہے۔

جہاں تک میری تجویز کا تعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے۔ جب کہ پاکستان اسکیم کا مفاد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علاحدہ ہو اور انگلستان سے براہ راست وابستہ ہو۔

آپ مضمون کے تعارفی کلمات میں اس نکتے کی وضاحت کرنا نہ بھولیے گا اور اسٹار آف انڈیا کے ایڈیٹر کو بھی اس نکتے کی طرف توجہ دلا دیجیے گا۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا مخلص محمد اقبال

(اقبال جہان دیگر (مکاتیب اقبال بنام مولانا راغب احسن) مرتبہ محمد فرید الحق۔ کراچی، ۱۹۸۳ء ص ۱۶-۱۱۴)

۱۴تا۱۶ر مارچ ۱۹۳۴ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس مرادآباد میں ۱۴تا۱۶ر مارچ ۱۹۳۴ء کو منعقد ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں:

تجویز نمبر۱: جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہ وقف ایک خالص شرعی عبادت ہے اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب کا پیش کردہ وقف بل احکام وقف کی صریح مخالفتوں پر مشتمل ہے۔ ارکان کونسل اور حکومت پر یہ امر واضح کردینا ضروری سمجھتا ہے کہ یہ بل موجودہ صورت میں اسلامی نقطۂ نظر سے ناقابل برداشت و ناقابل قبول ہے۔ اسی طرح بہار وقف بل اور بمبئی وقف بل اور کوئی بل بھی جو شرعی احکام کے مطابق نہ ہو مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

تجویز نمبر۲: جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ حکومت کے اس منتقمانہ تساہل کو جو خان عبیداللہ خان کی رہائی میں وہ برت رہی ہے، غم وغصہ کی نظر سے دیکھتا ہے خان موصوف کی بھوک ہڑتال ڈیڑھ مہینے سے جاری ہے اور ان کی حالت انتہائی نزاکت تک پہنچ چکی ہے۔ حکومت کا یہ تساہل انسانیت کے معمولی اصول کے لحاظ سے بھی قابل مذمت ہے اگر حکومت کی تغافل شعاری سے خان موصوف کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تو نہ صرف صوبہ سرحد کی آبادی بلکہ تمام ہندوستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ جائے گی اور اس کے نتائج کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔

تجویز نمبر۳: جمعیۃ علماے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حکومت کشمیر کے ان مظالم اور وحشیانہ جبر وتشدد کو جو اپنی رعایا کے جائز مطالبات کو کچلنے کے لیے اختیار کیے گئے ہیں، انتہائی نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور حکومت کشمیر پر اس امر کو واضح کردینا چاہتا ہے کہ اس کی انصاف کش پالیسی اور وحشیانہ مظالم کے خطرناک نتائج کشمیر کے امن واطمینان کو برباد کردینے کا باعث ہوں گے۔"

ایک تجویز میں بہار کے مصیبت زدگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے منظور ہوا کہ ایک عام اعلان شائع کیا جائے جس میں بہار کے مصیبت زلزلہ زدگان کی امداد واعانت کے لیے اہل ملک سے اپیل کی جائے اور تمام جماعتوں سے التماس کی جائے کہ وہ متحد ہوکر تعاون کے ساتھ اس سلسلے میں کام کریں۔ (جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم)

۱۵ر مارچ ۳۴ء: زیر نگرانی مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند مجلس مشاورت کا جلسہ مرادآباد میں منعقد ہوا۔ جس میں ارکان مجلس عاملہ کے علاوہ صوبہ کے دیگر اصحاب الرائے حضرات کو بھی شرکت کی

دعوت دی گئی تھی اس مشترکہ مجلس مشاورت نے اپنی تجاویز میں ایک سب کمیٹی مقرر کی جو مجلس کے مقرر کردہ اصول کی روشنی میں وقف بل صوبہ متحدہ پیش کردہ خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب پر غور کر کے شرعی نقطۂ نگاہ سے اس میں ترمیم کر کے اپنا مسودہ مجلس مشاورت کے سامنے پیش کرے۔ یہ کمیٹی حسب ذیل حضرات پر مشتمل تھی:

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کنوینر، مولانا عبدالحامد صاحب قادری۔ مولوی بدرالدین صاحب وکیل نگینہ۔ مولوی فضل علی صاحب وکیل بدایوں۔

صدر محترم نے مجلس کے اختتام پر مولانا احمد سعید صاحب کی مزید نامزدگی فرمائی۔ چناں چہ مذکورہ حضرات پر مشتمل سب کمیٹی نے بچھرایوں اور دہلی کی متعدد نشستوں میں کافی غور وخوض کے بعد حافظ ہدایت حسین صاحب کے مسودہ وقف بل صوبہ متحدہ میں شرعی نقطہ نگاہ سے جو ترمیمات ضروری سمجھیں مجلس مشاورت کے سامنے ۱۹/اپریل ۳۴ء کو نگینہ میں پیش کیں اور مجلس مشاورت میں غور وخوض کرنے کے بعد جمعیۃ عاملہ کے جلسہ میں شوری کی تمام کارروائی پیش کرے گی۔

(جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم)

۲۲/مارچ ۱۹۳۴ء: لیگ کے صدر منتخب ہونے پر مسٹر محمد علی جناح نے ایک بیان میں کہا ہے کہ میں لیگ کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھوں گا۔ لیکن حصول مقصد کے لیے مجھے اکیلے مسلمانوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دیگر اقوام کی امداد بھی درکار ہے۔ انقلاب اور پیسہ اخبار (لاہور) نے ۱۳/اور ۲۲/مارچ کی اشاعتوں میں اس بیان پر تائیدی اداریے لکھے ہیں۔ (پیسہ اخبار، لاہور: ۲۲/مارچ ۱۹۳۴ء)

۱۹/اپریل ۱۹۳۴ء: مجلس عاملہ کا اجلاس نگینہ (ضلع بجنور) جمعیۃ علماء کے صدر مولانا کفایت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا اور قرارداد کے مطابق وقف بل کے متعلق سب کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئی۔ خان بہادر حافظ ہدایت حسین کے بل میں ترامیم پیش کی گئیں اور ممبران کونسل سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان ترامیم کے ساتھ بل کی تائید کریں اور بل کو پیش کردہ مسودے کی صورت میں ہرگز پاس نہ ہونے دیں۔

۱۷/مئی ۱۹۳۴ء: ماہ مئی ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی کا جنم ہوا۔ اس کی پہلی آل انڈیا کانفرنس ۱۷/مئی ۱۹۳۴ء کو آچاریہ نریندر دیو کی زیر صدارت میں بہ مقام پٹنہ منعقد ہوئی۔

داخلہ کونسل اور ہڑتال کنندگان کے سوالات پر بحث کرنے کے علاوہ اس کانفرنس نے قرار دیا کہ حلقہ کانگریس کے اندر تمام ہندوستان کے سوشلسٹوں کا ایک نظام قائم کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب اس غرض کے لیے اس کانفرنس نے ایک ڈرافٹنگ کمیٹی مقرر کی۔ کہ وہ آل انڈیا سوشلسٹ کانگریس کے اجلاس بمبئی کے سامنے رکھنے کے لیے اس قسم کے نظام کا پروگرام اور اس کے قواعد و ضوابط کا مسودہ تجویز کرے۔ جلسہ پٹنہ کے بعد کئی صوبوں میں سوشلسٹ پارٹی کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔

(تاریخ کانگریس، ص ۹۲۶)

۶ رجون ۱۹۳۴ء

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف؟

عرصہ کے بعد والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اہل بہار کی امداد کی طرف توجہ فرمانا بہت خوب اور بہتر ہے۔ اس میدان میں قابل اطمینان کام کرنے والی صرف دو جماعتیں ہیں۔ مونگیر مسلم ریلیف کمیٹی اور امارت شرعیہ پھلواری شریف بہار۔

میں ایک نالائق اور ناکارہ خادم قوم ہوں۔ آپ کو اس طرف توجہ کرنی کہ اخباروں کے پرچے محفوظ رکھیں اور ان کے شائع کرنے کا خیال کریں، بے موقع ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات کی تکمیل توفیق عطا فرمائے اور مسلم قوم کو احساس اور ظفر و کامیابی عطا کرے۔ آمین۔

دارالعلوم دیوبند علوم دینیہ کا مرکز ہو گیا ہے۔ اس وقت میں تقریباً گیارہ سو چھیاسٹھ طالب علم ہیں۔ اس میں مختلف علوم فنون کی تعلیم پاتے ہیں۔ جن میں نو سو (۹۰۰) سے زیادہ باہر کے طالب علم ہیں۔ ان میں ترکستان، چینی، بخارا، افغانستان، بلوچستان وغیرہ کے طلباء کی بہت بڑی تعداد ہے۔ افسوس کہ ان دنوں ملک سے امداد و اعانت میں بہت کمی ہو رہی ہے۔ اس لیے اس پر مصارف کا بار بہت زیادہ ہے۔ عمارت دارالطلبہ میں بہت کمی ہے۔ عمارات کی بہت حاجت ہے۔ اہل ڈربن اور ساؤتھ افریقہ کے باہمت مسلمانوں کو اس طرف خصوصیت سے متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے اور نہایت ضروری کام ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کا ہمیشہ اور فوق العادت خیال رکھا جائے گا۔

میں آپ کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کی امداد و اعانت بہت مفید اور ضروری ہے۔

جس قدر ممکن ہو اس کو زمانہ میں ترقی دینا ازبس ضروری ہے۔ والسلام

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ،

۲۲ر صفر المظفر ۱۳۵۳ھ (۶ر جون ۱۹۳۴ء)

۱۲ر جون ۱۹۳۴ء: ۱۹۳۲ء کے آغاز میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے علاوہ کانگریس اور اس کی ملحقہ تمام جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ ۱۲ر جون ۱۹۳۴ء کے روز گورنمنٹ نے کانگریس پر سے یہ پابندیاں ہٹا دیں۔ لیکن صوبہ سرحد کی سرخ پوش انجمنوں، بنگال کی کانگریس اور ہندوستانی سیوادل پر پابندیاں بدستور عاید ہیں۔

بعض صوبوں میں گورنمنٹ نے وہ عمارات بدستور اپنے قبضے میں رکھیں۔ جو اس کے خیال میں ان خلاف قانون جماعتوں کی میٹنگوں وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ (تواریخ کانگریس، ص ۹۲۷)

بعض مقامات کو تو ۱۹۳۵ء کے وسط تک بھی گورنمنٹ نے واپس نہیں کیا۔ سول نافرمانی کرنے والے قیدیوں کو جلد رہا کرنے کی ایک عام پالیسی کا گورنمنٹ نے اعلان کیا۔ لیکن ان میں سے بہت سے خصوصاً گجرات کے قیدی اب بھی جیلوں میں بند رہے۔ گجرات کے بہت سے ممبران کانگریس کو باوجود برطانوی ہند میں عرصے سے بود و باش رکھنے کے اس صوبے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی اور عملاً ہندوستانی ریاستوں میں نظر بند ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں جن اشخاص کا تحریک سول نافرمانی کے ساتھ تعلق رہا ہے، انھیں جائز کاروبار کرنے کے لیے بھی ہندوستان سے باہر جانے کے لیے پروانہ راہداری نہیں ملا۔"

(تواریخ کانگریس، ص ۲۸۔۹۲۷)

مسٹر تھامسن کے نام علامہ اقبال کا ایک اور خط:

۲۶ر جولائی ۱۹۳۴ء: علامہ اقبال نے تھامسن کے نام ایک اور خط میں اپنی تجویز کے مطابق ہندوستان کے شمال مغرب میں اسلامی صوبے کے قیام کو نہ صرف ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا صحیح حل بتایا ہے بلکہ ان کے نزدیک یہ اسلام اور انگلستان کے لیے بھی لامحدود فوائد کا باعث ہوگا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہ اقبال کے سامنے یہ صرف مسلمانوں اور اسلام کے بہترین مفاد ہی میں نہ تھا اور یہ کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ نہ تھا بلکہ ایک خالص سیاسی مسئلہ تھا اور ہندوستان اور

انگلستان کے لیے ہر طرح سے فوائد کا حامل تھا۔ علامہ اقبال نے اس خط کے ایک کونے میں "پرائیویٹ اینڈ کونفیڈنشیل" لکھ دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کے نزدیک ان افکار کی کتنی اہمیت تھی۔ حضرت علامہ لکھتے ہیں:

مائی ڈیر تھامسن

یہ آپ کی مہر مفرط ہے کہ عنایت نامہ کے ساتھ منسلکہ سر ہنری لارنس کے مضامین بھی ملے جو کہ قرطاس ابیض پر ہیں از راہ کرم انھیں میرا شکریہ پہنچا دیجیے اس میں شبہ نہیں کہ سر ہنری نے ان حالات کا مشاہدہ کیا جو ان کے ابنائے وطن نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ ان کی تجاویز ہندوستانی عوام کی سلامتی اور بقاء کے لیے اور ان کی حیثیت منوانے میں انسب اور موزوں کوشش ہے۔ میں صوبہ جات کی تعداد سے متعلق ان کی تجاویز سے متفق ہوں۔ مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے یہ میرا منصبی فریضہ تھا کہ سندھ کی علیحدگی کی حمایت کروں، ذاتی طور پر مجھے ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے تینوں صوبوں کا الحاق انگلستان، ہندوستان اور اسلام کے لامحدود فائدہ کا حامل ہوگا۔"

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں جمہوریت میں یقین نہیں رکھتا تاہم جمہوریت کی سمت پہلے ہی اقدام کیا جا چکا ہے۔ (میری رائے میں جمہوریت مہلک ہے) اب ہمیں اپنے تئیں اقتصادی تباہی، سیاسی خلفشار اور ہندوازم کے خاتمہ کی تیاری کرنی چاہیے۔ یہ بربادیاں وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں جمہوریت کی ترویج پر متوقع ہیں۔ ہندوستان میں جاہ طلب سیاستدانوں کے طرز عمل کے منطقی نتائج سے ہمیں کوئی قرطاس ابیض محفوظ نہیں رکھ سکتا جس کے معاملات نے ہند اور بیرون ہند بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا۔

آپ کے بقول مغرب میں حالات کی جوالا مکھی پھٹنے کو ہے، میں اس سے بخوبی آگاہ ہوں تاہم کچھ عرصہ پہلے ہندوستانی آتش فشاں پھٹ پڑا جس نے کسی کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا اب صورت حال یہ ہے کہ شہری ہندو آبادی باہم مصروف جنگ ہے اور غریب دیہی عوام کو معلوم نہیں کہ ملک میں کیا گل کھل رہے ہیں؟ مقابلتاً مسلمان بہتر طور پر متحد ہیں لیکن ان کے زیادہ تر قائدین معمولی قابلیت و اہلیت کے حامل ہیں جو مستقبل میں مشرق و مغرب کے تعلقات کے بارے میں

شعور مندانہ تیقن نہیں رکھتے ان کا انداز وفکر نظر صرف ذاتی ملحوظات تک محدود ہے اور ان کا فوری مقصد اپنی تیقن کردہ موجودہ برطانوی مشکلات سے فوائد کا حصول ہے۔ اگر مجھے دو گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے تاثرات قلم بند کرنے ہوتے تو میں بے تامل اپنے ہم مذہب ابنائے وطن کے متعلق بہت سی ناخوشگوار باتیں بیان کرتا جن میں آپ کے ہم وطن بھی اسی طرح شامل ہوتے ان میں چند دانشوروں نے اپنی باطنی بصیرت کے باوجود خیال آرائی اور حوصلہ وہمت کے غیر معمولی فقدان کا مظاہرہ کیا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ انگلستان کی موجودہ برسر اقتدار پارٹی ہندوستانی معاملات سے نمٹنے میں ناکام رہی ہے۔......

جہاں تک میرا تعلق ہے میں آیندہ انتخابات میں ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتا ہز ہائینس آغا خاں اس پر بیحد مصر ہیں کہ میں مسلم کانفرنس کا صدر ہوں مگر میں نے اپنے بہترین افراد کے کرتوت اور ان کے اطوار کے پیش نظر یہ عہدہ وحیثیت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی جزوی وجہ میرے دماغ میں جذبہ بغاوت کا پیدا ہونا اور دوسرا سبب گلے کی تکلیف ہے۔......''

(اقبال...... ہنر پولیٹیکل آئیڈیاز ایٹ کراس روڈ۔ ص ۸۲۔۸۱)

اس خط میں قرطاس ابیض سے مراد ہندوستان کے لیے ۱۹۳۳ء میں شائع ہونے والی مجوزہ اصلاحات تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہنری لارنس کے مضامین میں علامہ اقبال نے جو خاص نکتہ محسوس کیا، وہ یہ تھا کہ ہندوستان کو ۱۲ صوبوں کے بجائے بہت سے چھوٹے چھوٹے صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ علامہ اقبال نے اس تجویز سے اتفاق ظاہر کیا ہے۔ علامہ اقبال کے استدلال کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ بہت سے صوبوں کی تجویز ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں رکاوٹ ڈالنے اور ملکی سیاسی مسائل میں مزید پیچیدگیاں پیدا کرنے کے لیے تھی۔ اس لیے کہ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک کے بعد انگریزوں کے لیے یہ مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو کس طرح سبوتاژ کیا جائے یا آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کر دیا جائے۔ (ا۔س۔ش)

سندھ اور پاکستان:

۳۱ر جولائی ۱۹۳۴ء: ۳۱ر جولائی ۱۹۳۴ء کے روزنامہ انقلاب لاہور میں یہ خبر شائع ہوئی۔

''۲۸ر جولائی (کراچی) سندھ آزاد کانفرنس کا دوسرا اجلاس سر غلام حسین ہدایت اللہ کی

صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں سر موصوف نے کہا کہ

مسلمانان سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان کو ملا کر ایک بڑا اسلامی صوبہ پاکستان ہرگز بنانا نہیں چاہتے۔

مسلمانان سندھ، پنجاب میں جہاں (پنجابی) مسلمانوں کی اکثریت ہے مدغم ہونا نہیں چاہتے۔

سندھ کی علیٰحدگی سے ہمارا صرف یہ منشا ہے کہ ہم اپنے گھر (سندھ) کے خود مالک ہوں۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مخالفانہ مقصد نہیں۔''

اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے جانباز مرزا لکھتے ہیں:

متذکرہ بالا خبر سے شبہ گزرتا ہے کہ اس تجویز کا محرک چوں کہ برطانیہ کا بااعتماد اور قریب ترین آدمی تھا لہٰذا اسے سرکاری ذرائع سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آگے چل کر ایسا ہوگا۔ یہاں تک تو درست ہے کہ ۱۹۳۵ء ایکٹ کے تحت سندھ کو بمبئی سے علاحدہ کر کے ایک صوبہ قرار دیا جارہا تھا۔ لیکن جہاں ''پاکستان بنے گا؟'' ہنوز کوئی ذکر نہیں تھا۔ مگر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو یہ اندر کی بات کیسے معلوم ہوئی؟''

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

''۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے دوران متحدہ ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبوں کو باقی ہندوستان سے علیٰحدگی کا مطالبہ کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر چودھری رحمت علی نامی شخص نے انگریزی میں ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ جس میں ہندوستان سے مسلم اکثریت کے صوبوں کو علیحدگی کے بعد پاکستان کا نام دیا گیا تھا۔

۱۹۳۴ء کے آخر تک مزید کہیں پاکستان کا ذکر نہیں۔ لیکن سندھ کے سرکاری وڈیروں نے نہ جانے اچانک اس انجانی حقیقت کے جنم لینے سے پیشتر کیوں اور کیسے جان لیا کہ ایسا ہوگا اور قبل از مرگ واویلا شروع کر دیا۔'' (کاروان احرار، جلد۲، ص ٦٢)

مجلس عاملہ کا اجلاس مرادآباد:

۱۰ تا ۱۲ راگست ۱۹۳۴ء: ۱۰ تا ۱۲ راگست جمعہ تا یک شنبہ مرادآباد میں جمعیت کی مجلس عاملہ کا

ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں گزشتہ اجلاس نگینہ کی قراردادوں اور کارروائی کی توثیق وتصدیق کے علاوہ متعدد اہم تجاویز پاس کی گئی۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے بھی اس کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ ایک قرارداد کے مطابق لکھنو یونٹی بورڈ کے جلسہ مجوزہ ۱۹ر اگست میں حصہ لینے اور وقت کے مسائل میں جمعیت کے نقطۂ نظر اور مسلک کی وضاحت کے لیے پانچ ارکان پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیا گیا۔ اس وفد میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا محمد سجاد، مولانا بشیر احمد کے علاوہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی بھی شامل کیے گئے ہیں۔

(جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۹۵۔۱۹۴)

ہٹلر اور جرمنی

۱۹ر اگست ۱۹۳۴ء: ۱۹ر اگست ۱۹۳۴ء کو جب اڈولف ہٹلر جرمنی کا مستقل صدر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوا تو برطانوی سامراج کے رہے سہے حواس جاتے رہے۔ اس سے ایک ہفتہ قبل ۹ر اگست کے ''ڈیلی میل'' لندن میں ہٹلر کا ایک بیان شائع ہوا۔

''ہم اس وقت تک انگلستان سے نبرد آزما نہیں ہوں گے جب تک کہ'' وہ ہم پر حملہ نہیں کرے گا''۔ اسی بیان میں آگے چل کر ہٹلر نے کہا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انگلستان کی مدافعانہ سرحد دریائے رائن کا کنارا ہے تو ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے ملک کی سرحد کے اندر اپنی حفاظت کا انتظام کریں۔ ہم انگلستان سے کوئی نو آبادی بھی نہیں چاہتے۔ میں ایک جرمنی نوجوان کی جان بھی اس کام کے لیے قربان کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی ہم آسٹریلیا پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اسٹریلیا ہم سے وہی تعلقات قائم کرے جو پہلے تھے۔

اگر جرمنی کو مجبور کیا گیا تو وہ تمام دنیا کی خام اجناس سے بے نیاز اور خود مختار ہو جائے گا۔ دو تین سال کے اندر دنیا دیکھے گی کہ جرمنی کس طرح اپنا لوہا منواتا ہے''

صدارتی انتخاب میں نوے فیصد جرمن عوام نے ہٹلر کو ووٹ دیے، لیکن اس پر بھی ہٹلر کو یقین تھا اور اسی یقین کی بنا پر اس نے کہا:

''وقت آئے گا کہ دس فیصد جرمنی مجبور ہو جائیں گے کہ میرا ساتھ دیں۔ اور جرمنی کا ہر آدمی نازی پارٹی کا حامی بن جائے گا اور آیندہ بھی میرا اسی طرح ساتھ دیں گے جس طرح گزشتہ واقعات میں میرا ساتھ دے کر انھوں نے وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔''

صدارتی انتخاب کے ایک ہفتہ بعد ۲۷؍اگست ۱۹۳۴ء کو ہٹلر نے کہا:

''اگر کوئی غیر قوم ہم پر حملہ آور ہوئی تو اس کی وجہ محض یہ ہوگی کہ ہم اپنے وطن کے مفاد کا تحفظ نہیں کر سکتے یا پھر بین الاقوامی جماعت کے مخصوص لوگ ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ لیکن میں ان لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کسی طاقت کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہیں۔''

''یہودیوں اور کمیونسٹوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر انھوں نے مذہب کی آڑ لے کر جرمنی قوم یا نازی پارٹی کی مخالفت کی تو ہم ہر ممکن ذرائع سے ان کا مقابلہ کریں گے۔''

(کاروانِ احرار، ج ۲)

۲۳؍اگست ۱۹۳۴ء: اب الیکشن کی انتخابی فضا میں شیخ الاسلام مولانا مدنی کا دورہ جہاں جہاں ہوا۔ لیگیوں کی طرف سے ناروا اور ذلیل حرکتیں ہوتی رہیں۔ انھیں میسور ہبلی اسٹیشن پر اگر ریلوے پولیس اپنی پناہ میں نہ لیتی تو مولانا کا چراغ زندگی گل ہو گیا ہوتا۔ تاہم ان کے حوصلے بلند ہی رہے۔ (مولانا آزاد...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۶۰)

سر اکبر حیدری کے خیالات:

۱۵؍ستمبر ۱۹۳۴ء: نواب سر اکبر حیدری وزیر مالیات حکومت حیدر آباد دکن نے بمبئی میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس میں اپنے خطبۂ صدارت میں ہندو مسلم اتحاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''یہ فسادات کہلانے کو تو مذہبی کہلاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب سے ان کو بعید سے بعید تعلق بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے فسادات مسلمان بادشاہوں، ہندو راجاؤں، برہمن پیشواؤں اور غرض کہ کسی عہد میں بھی نہیں ہوئے۔ کیوں کہ خود پیشواؤں کی حکومت میں مساجد کا احترام کیا جاتا تھا، ان کے سامنے باجا نہیں بجایا جاتا تھا اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہرگز نہیں کی جاتی تھی......''

(آگے چل کر آپ نے ان شر انگیز کتب تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا، جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں)

''ان شر انگیز کتب کے باعث نہ صرف ہم اپنی تاریخ سے بے خبر رہتے ہیں، بلکہ مختلف قوموں کے درمیان فساد اور منافرت کی تخم ریزی بھی ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایسی کتابوں کو جلد سے جلد تعلیمی اداروں سے خارج کر کے ان کی جگہ ایسی کتب کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا چاہیے۔ جن

کے مطالعہ سے ہندو اور مسلمانوں میں حسین تعلقات پیدا ہوں۔ اور وہ اپنی تاریخ صحیحہ سے بھی واقف ہوں۔"

(خطبہ کے آخری حصہ میں انھوں نے کہا)

جو قومیں دوسری قوموں کو قربان کر کے خود طاقت حاصل کرنا چاہتی ہیں، وہ خودکشی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ کیوں کہ قوموں کا وجود اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے۔" (روزنامہ انقلاب ۱۵۔ ستمبر ۱۹۳۴ء)

خواتین اور سماجی خدمات:

۲۴ر ستمبر ۱۹۳۴ء

سوال۔ (۱) کونسلوں اور اسمبلیوں میں جہاں مسلم عورتوں کی نشست محفوظ ہو عورتوں کا ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) میونسپل کمیٹی کی مسلم امیدوار عورتوں کو ووٹ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب۔ (۱) عورتوں کا کونسل میں جانا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ لیکن اگر جائیں تو حجاب کے ساتھ جانا ضروری ہوگا۔

(۲) اگر اس کا اطمینان ہو کہ عورتیں حجاب شرعی کی رعایت رکھیں گی اور کسی ناشروع فعل کی مرتکب نہ ہوں گی تو ان کو ووٹ دینا مباح ہوگا۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،۔

(الجمعیت، دہلی، ۲۴ر ستمبر ۱۹۳۴ء، کفایت المفتی (جلد نہم، کتاب السیاسیات) بحوالہ۔

قادیان میں پہلی احرار کانفرنس:

۲۱ر تا ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۴ء:

پہلی احرار کانفرنس ۲۱ر۲۲ر۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو بصدارت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قادیان میں منعقد ہوئی۔ میرزا بشر الدین محمود کی خوشنودی کے لیے حکومت نے قادیان کے میونسپل حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ احرار نے میونسپل حدود سے باہر کانفرنس کا ایک عظیم الشان پنڈال بنایا۔ پشاور سے دہلی تک کے ہزار ہا لوگوں نے شمولیت کا اعلان کیا۔ اس غرض سے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئیں۔ جب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ قادیان کے ریلوے اسٹیشن پر اسپیشل ٹرین سے

پہنچے، تو ہزار ہا رضا کاروں نے ان کا استقبال کیا۔ تقریباً دو لاکھ افراد شریک اجلاس ہوئے۔ شاہ جی نے دس بجے رات تقریر کا آغاز کیا اور صبح کی اذان تک تقریر جاری رکھی۔ اس تقریر سے قادیانی امت کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ میرزا بشیر الدین نے حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا، چودھری سر ظفر اللہ خاں نے وائسرائے اور گورنر سے فریاد کی، تو شاہ جی کے خلاف دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت وارنٹ جاری کر دیے گئے اور انھیں شروع دسمبر ۱۹۳۴ء کو مسوری سے گرفتار کر لیا گیا۔ ذیوان سکھا نند مجسٹریٹ گورداسپور کی عدالت میں دو ماہ مقدمہ چلتا رہا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے بھی چار دن تک شہادت دی۔ آخر مجسٹریٹ نے ۲۰/اپریل ۱۹۳۵ء کو ۶ ماہ قید بامشقت کا حکم سنایا۔ اس فیصلے کے خلاف سیشن جج گورداسپور کی عدالت میں اپیل کی گئی۔ انھوں نے ابتداً شاہ جی کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ پھر ۶/جون ۱۹۳۵ء کو ایک تاریخی فیصلہ لکھا، جس سے قادیانی امت بے نقاب ہو گئی۔ مسٹر کھوسلہ نے شاہ جی کے جرم کو محض اصطلاحی قرار دے کر تا اجلاس عدالت قید محض کی سزا دی۔ اس فیصلے نے عوام کے احتساب کو ثبات دے کر خواص کر بیدار کیا۔ (تحریک ختم نبوت، ص ۸۱-۸۰)

۲۶ تا ۲۸/اکتوبر ۱۹۳۴ء: ۲۷/اکتوبر ۱۹۳۴ء بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس سیٹھ جمنالال بجاج کی عدم موجودگی کے باعث بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ہوا پارلیمنٹری بورڈ کی تجویز منظور ہوئی۔ دوسری تجویز تھی کہ شہری اور قصباتی ان تمام عورتوں، مردوں، جوانوں اور بوڑھوں کو مبارک باد پیش کی جاتی ہے جنھوں نے ملک کی آزادی اور سوراج کے لیے پر امن طریقے پر ستیہ گرہ کر کے اپنی پر خلوص خدمات پیش کی ہیں اور ان کے حوصلوں کی داد دی جاتی ہے۔ ایک تجویز میں پنڈت جواہر لال نہرو کی اہلیہ کملا نہرو کے لیے دعائے صحت کے ساتھ انھیں کسی پہاڑی علاقے کی سیر و تفریح کی سفارش کی گئی، اور قصباتی معاشی کاشتکاری تعمیری ترقی کے لیے لمبی چوڑی تجویز پاس ہوئی۔ جو کانگریس الیکشن میں حصہ لینا چاہے اسے کم سے کم چھ مہینے کے لیے شدھ کھادی، دھاری ہونا ضروری ہے اور وہ کم سے کم پانچ سو گز دس نمبر کا سوت اپنے ہاتھ سے کاتے جسمانی طور پر کوئی کام کر کے اپنی کمیٹیوں کو دکھاتا رہے۔ یہ بھی ایک خاص تجویز تھی۔ لیکن گاندھی جی چاہتے تھے کہ اہنسا اور کھادی کا پرچار زوروں پر ہو۔ چرخے کی اسکیم کامیاب ہو۔ کوئی کام مطلب براری کے لیے نہ ہو۔ بلکہ عوامی خدمات کے ماتحت ہو اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو وہ یعنی گاندھی جی کانگریس سے علاحدہ ہو جانے پر مجبور ہیں۔

اور جب تک کانگریسی اپنے آپ کو مذکورہ باتوں کا اہل نہ بنا لیں گے، وہ کانگریس سے دور

رہیں گے۔ اور معمولی ممبر بھی رہنے کو تیار نہ ہوں گے۔ المختصر گاندھی جی نے یہیں پر اپنی علیحدگی کا اعلان بھی کر دیا اگرچہ ان کے لیے کانگریس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا گیا۔ اس وقت ایک سوال سب کے دلوں میں اٹھنے لگا کہ اب گاندھی جی کیا کریں گے اور کانگریس کیا کرے گی؟ لیکن صدر اجلاس نے اس موضوع کو پس پشت ڈال کر گول میز کانفرنس کی کارگذاریوں پر بڑی اچھی روشنی ڈالی۔ باپو جی نے کہا ہمارا کوئی بھی اقدام ایک بار یا دو بار ناکامیاب ہوگا لیکن بار بار نہیں ہوگا آخیر میں ہمارے ہی اصولوں کی جیت ہوگی۔ اس طرح یہ اجلاس ختم ہو گیا۔''

(حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۸۔ ۱۴۷)

(سکسٹی ایئرس آف کانگریس کے مولف نے بمبئی کے اس اجلاس کو کانگریس کا اڑتالیسواں سالانہ اجلاس قرار دیا ہے۔ ص ۱۵۔۳۱۴)

۲۸/۲۶ / اکتوبر ۱۹۳۴ء: اب ہم ان قراردادوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو ۲۶ / اکتوبر سے ۲۸ / اکتوبر ۱۹۳۴ء تک کانگریس کے اس اجلاس میں پاس ہوئیں یہ اجلاس زیر صدارت شری راجندر پرشاد منعقد ہوا تھا استقبالیہ کمیٹی کے صدر شری یت کے ایف نریمان تھے۔ کانگریس کا افتتاح اس ریزولیوشن سے ہوا جس میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ان ریزولیوشنوں کی تصدیق کی جو کہ مئی ۱۹۳۴ء اور ازاں بعد کے جلسوں میں پاس ہوئے تھے۔ خصوصاً ان قراردادوں کی جو پارلیمنٹری بورڈ اس کی پالیسی اور تعمیری پروگرام وغیرہ سے نہیں رکھتے تھے۔ اس کے اور قوم کی قربانیوں اور سول مزاحمت میں اعتقاد رکھنے کے بارے میں ریزولیوشن پاس کیے گئے۔

کانگریس نے ان ہزارہا سول نافرمانی کرنے والے مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کی بہادرانہ قربانی اور سختیاں سہنے پر مبارک باد دی۔ جنہوں نے ملک کے مختلف حصص میں جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اور عدم تشدد میں اپنے عقیدہ کا اظہار کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اگر عدم تشدد اور سول مزاحمت سے کام نہ لیا جاتا تو عوام الناس میں اتنی غیر معمولی بیداری پیدا ہونی ناممکن تھی۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کہ کچھ عرصہ کے لیے سوائے مہاتما گاندھی کے اور کسی کو مزاحمت نہیں کرنی چاہیے۔

کانگریس نے اس بات کا اعادہ کیا کہ ہمارا پر امن عدم تعاون اور سول مزاحمت میں دائمی اعتقاد ہے۔ اور حصول سوراجیہ کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ تجربہ نے کافی سے زیادہ ثابت کر دیا ہے کہ

تشدد کے طریقے...... دلوں میں دہشت پیدا کر رہے ہیں۔

آل انڈیا ولیج ایسوسی ایشن کے متعلق بڑی گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ اور اس کے متعلق ایک طول طویل ''ریزولیوشن'' پاس ہوا کہ چوں کہ ممبران کانگریس کی امداد سے اور علاحدہ ملک بھر میں ایسی جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں جو سودیشی کو فروغ دینے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اور چوں کہ سودیشی کی اصلیت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں بہت غلط سلط خیالات بھرے ہوئے ہیں اور چوں کہ ابتدا سے ہی کانگریس کا مدعا یہ رہا ہے کہ عوام الناس کے مفاد کے ساتھ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ وابستہ کیا جائے۔ اور چوں کہ دیہات کو از سر نو منظم کرنا کانگریس کے تعمیری پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اور چوں کہ اس قسم کی تعمیر کے لیے یہ از بس ضروری ہے کہ ہاتھ سے کاتنے کی مرکزی حرفت کے علاوہ مزدہ اور نیم جان دیہاتی صنعتوں میں جان ڈال کر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور چوں کہ ہاتھ سے کاتنے کے کام کو دوبارہ منظم کرنے کی طرح یہ کام بھی تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب کانگریس کے سیاسی کام سے بالاتر ہوکر یکسوئی سے خاص کوشش کی جاوے۔ ایسی خاص مقصد کے لیے آل انڈیا ولیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن ہوگا۔

(تاریخ کانگریس، ص ۶۶-۹۶۴)

مسلمانوں کا انداز سیاست:

سری پرکاش لکھتے ہیں:

دسمبر ۱۹۳۴ء: نومبر، دسمبر ۱۹۳۴ء کے عام انتخابات کے بعد میں سنٹرل لیجس لیٹو اسمبلی (مرکزی مجلس قانون ساز) کا ممبر پہلی بار منتخب ہوا۔ اس وقت سنٹرل اسمبلی کے ممبران کی تعداد صرف ڈیڑھ سو تھی جن میں سے پچاس دیسی اور پچاس سرکاری ممبر تھے۔ مسلمان ممبروں کی بڑی تعداد نے ایک آزاد (انڈی پنڈنٹ) پارٹی زیر قیادت مسٹر محمد علی جناح بنالی تھی۔ یہ جماعت اپنے کو مسلم لیگی نہیں کہتی تھی چناں چہ دو پارسی، سرکاؤس جی جہانگیر اور سر ہومی مودی بھی اس میں شامل تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس آزاد جماعت کے ممبروں کی تعداد پینتیس تھی۔ بقیہ اور دوسرے ممبر کسی پارٹی میں شریک نہیں ہوئے۔ اور جب ووٹ دینے کے لیے تقسیم ہوتی تھی تو یہ حضرات جس پارٹی کو مناسب سمجھتے ووٹ دیتے تھے۔ متذکرہ بالا دونوں پارسی ممبر محض مسٹر جناح کا احترام کرتے ہوئے ان کی پارٹی میں شامل ہوگئے تھے۔ عموماً ایسا ہوا کہ اگر کوئی مسئلہ صرف

مسلمانوں سے متعلق نہیں ہوتا تھا تو آزاد ممبروں کے ووٹ کانگریس کو ملتے تھے۔ ایک موقع پر جب تقریریں ہورہی تھیں تو مولانا شوکت علی اور سر ہومی مودی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔

مولانا شوکت علی نے گھونسا تان کر سر ہومی مودی کو دھمکایا۔ چوں کہ یہ گرما گرمی بنچوں کے درمیان ہورہی تھی اس لیے پریسیڈنٹ سر عبدالرحیم کی نظر نہیں پڑی اور دوسرے روز سر ہومی مودی سرکاری بلاک میں بیٹھے نظر آئے۔ اس اسمبلی میں بارہ یورپین ممبروں کی ایک جماعت تھی۔ اس میں ہر فرد کی معلومات بہترین تھیں اور یہ سب ہندوستان میں یورپین باشندوں کے مفاد کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک نامزد اینگلو انڈین ممبر، سر ہنری گڈنی کو اپنی پارٹی میں شامل کر لیا تھا، کیوں کہ کسی پارٹی کو گورنمنٹ اسی وقت مانتی تھی جب اس میں کم از کم ۱۳ ممبر ہوں۔ یہ یوروپین جماعت شاذ و نادر حالات کے سوا ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیتی تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد مسٹر جناح کی پارٹی مسلم لیگ پارٹی بن گئی۔ چناں چہ سر کاؤس جی جہانگیر کو بھی اس سے علاحدہ ہونا پڑا۔ اور ان کو مرکزی بنچوں کی صف اول میں جگہ ملی۔

پاکستان، انگریز اور مسلمان:

مجھے یاد ہے کہ اسمبلی کے پہلے اجلاس میں ایک پمفلٹ بہ عنوان ''پاکستان'' ممبروں کو ملا۔ یہ کیمبرج سے بھیجا گیا تھا اور جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے لکھنے والے کا نام رحمت علی تھا۔ اس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ایک علاحدہ ریاست بنام ''پاکستان'' قائم کی جائے۔'.........

اس وقت مشہور و معروف سر ہنری کریک ہوم ممبر تھے۔ وہ اس کو پڑھ کر خوب ہنسے، اور اگر میرا حافظہ غلطی پر نہیں ہے تو مسٹر جناح اور زیادہ ہنسے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا حالات بدلتے گئے اور جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا انگریز اور مسلمان دنوں ہی قیام پاکستان کے حامی ہو گئے۔ ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی گئی اور فسادات نے ہندوستان کی فضا کو پراگندہ کر دیا۔ اسمبلی کو ۱۹۳۷ء میں ختم ہونا تھا لیکن اس کی مدت میں توسیع کر دی گئی۔ اس طرح یہ اسمبلی ۱۹۴۵ء تک قائم رہی۔'' (پاکستان......قیام اور ابتدائی حالات از سری پرکاش)

سوشلسٹ پارٹی (ہند):

ہندوستان میں اشتراکی تحریک کی ابتدا ۱۹۳۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اندر کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے قیام سے ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں اشتراکی کانگریسیوں نے اختلافات کی بنا پر

کانگریس کو چھوڑ دیا اور سوشلسٹ پارٹی قائم کی۔ اس پارٹی نے ۱۹۵۲ء کے پہلے پارلیمانی چناؤ میں تیسری حیثیت حاصل کی۔ اسی چناؤ سے قبل ایک اور اشترا کی پارٹی آچاریہ جیوت رام بھگوان داس نے کسان مزدور پرجا پارٹی کے نام سے قائم کی۔ ۱۲؍ستمبر ۱۹۵۲ء کو سوشلسٹ پارٹی اور کسان مزدور پرجا پارٹی نے ایک دوسرے میں ضم ہو کر پرجا سوشلسٹ پارٹی تشکیل کی۔ لیکن اس کے ایک قائد ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے جو اس سے نکال دیے گئے تھے، دوبارہ سوشلسٹ پارٹی قائم کی۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے فرہنگ سیاسیات، ص ۲۶۰)

۱۹۳۵ء

لیگ کانگریس اتحاد اور گورنمنٹ کی پریشانی:

۲۱؍جنوری ۱۹۳۵ء: سے مرکزی اسمبلی کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ جو برابر تیس دن تک چلتا رہا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے قوم پرست عنصر نے جس میں کانگریس کے ساتھ لیگ کے افراد بھی شریک تھے حکومت کو پے در پے شکستیں دیں۔ پہلی شکست بابو سرت چندر کی نظر بندی کے خلاف تحریک التوا پر ہوئی۔

دوسری شکست انڈو برٹش تجارتی معاہدہ کی تنسیخ پر ہوئی۔ تیسری شکست خدائی خدمت گاروں کی تحریک کو خلاف قانون قرار دیے جانے پر ہوئی۔ چوتھی شکست ریلوے بجٹ پر تخفیف زر کے سلسلے میں ہوئی۔ پانچویں شکست کراچی میں گولی چلائے جانے کے خلاف ہوئی۔ چھٹی شکست سالانہ بجٹ کو مسترد کیے جانے پر ہوئی اور ساتویں شکست وائسرائے کے اختیارات خصوصی سے منظور شدہ بجٹ کو مسترد کیے جانے پر ہوئی۔ جب اسمبلی کے پہلے اجلاس میں ہی حکومت کو یکے بعد دیگرے سات شکستیں ہوئیں تو دہلی سے لے کر لندن کے وائٹ ہال تک ایک کھلبلی سی مچ گئی اور حکومت سوچنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ کو کانگریس سے علاحدہ کرنا چاہیے۔

اسٹیٹسمین جیسا باوقار اخبار بھی اس صورت حال پر بوکھلا گیا اس نے اپنا اداریہ لکھتے ہوئے نہایت اچھے انداز میں کہا ہمیں اس بین اور نمایاں حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے سیاستدانوں اور صنعت کاروں کا ایک زبردست طبقہ برطانیہ کے خلاف ہے یہ طبقہ برطانیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کا حامی نہیں اور نہ تجارتی نہ کاروباری معاملات پر

ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ بغض کی بناء پر ذاتی فوائد سے دست بردار ہو جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کانگریس پارٹی کو ملک میں بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اس پارٹی کا سب سے بڑا حربہ نسلی منافرت کا جذبہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس کو وقتاً فوقتاً ایسے حامی بھی مل جاتے ہیں جیسے مسٹر جناح جو ابتدا میں گول میز کانفرنس کے سرگرم رکن اور فیڈریشن کے زبردست حامی تھے۔ لیکن چوں کہ انھیں گول میز کانفرنس کے آخری اجلاسوں میں مدعو نہیں کیا گیا تھا اس لیے اب وہ حکومت سے ناراض ہیں۔

جناح راجندر بات چیت:

۲۲ر جنوری ۳۵ء سے بابو راجندر پرشاد اور مسٹر جناح میں گفتگو شروع ہوئی اور یکم مارچ ۳۵ء تک جاری رہی۔ لیکن اس گفتگو کا کوئی حاصل نہ نکلا آخر کار ملک کو ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اب تک حکومت کو کانگریس کی زبردست طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے تشدد کے ذریعے اُسے کمزور کرنے کی ٹھان لی اور سختیوں پر سختیاں شروع کر دیں۔ معمولی معمولی باتوں پر کانگریس کے کارندوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا یا گھروں میں نظر بند کر دیا جاتا صرف بنگال ہی میں ۲۷۰۰ افراد کو گرفتار کر کے جیلوں میں بھر دیا۔ گھروں کی تلاشیاں شروع کر دیں۔ سرحدی گاندھی عبدالغفار خان کو بمبئی کی تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے دو سال کے سزا تجویز ہوئی۔ اسی طرح ڈاکٹر ستیہ پال کو بھی تقریر ہی کے جرم میں ایک سال کی سزا دی گئی۔ بنگال کے ہزاروں مقید لوگوں کے گھروں میں قحط سالی سی پیدا ہونے لگی۔ لوگ بھوک سے بے حال ہونے لگے۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۵۱۔۴۹)

یوم آزادی کے لیے ہدایت اور ریزولیشن:

کانگریس کے پچاسویں سال یعنی ۱۹۳۵ء میں کانگریس نے جن جن باتوں میں ترقی کی اس کا ایک خلاصہ دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ورکنگ کمیٹی جنوری ۱۹۳۵ء کی سولہ سے اٹھارہ تاریخ کو دوبارہ اکٹھی ہوئی۔ اور اس لیے مسٹر ابھینکر اور اچاری گدوانی کی وفات پر افسوس کرتے ہوئے لواحقین سے اظہار ہمدردی کیا۔ اور ہر دو اصحاب کی بیش قیمت ملکی اور قومی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ گذشتہ سالوں کی نسبت اس سال بھی

پورن سوراج کا دن یعنی یوم آزادی منایا اور سارے ہندوستان کے لیے یہ پاس کیا گیا۔ کہ اس روز ہر جگہ اس خاص ریزولیوشن کو پاس کیا جائے۔ ورکنگ کمیٹی نے جو ہدایات اور قرارداد یں پاس کی تھیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:

''چوں کہ کانگریس نے سول نافرمانی کو معرض التوا میں ڈال دیا ہے۔ اس لیے اس روز آرڈیننسوں و دیگر قوانین اور مقامی حکام کے جاری کردہ احکام کی کوئی خلاف ورزی نہ ہونی چاہیے۔ اس احتیاط کے مدنظر پیشتر مقرر شدہ مقام جلسوں کی طرف خاموش جلوس نکالنے چاہئیں اور صدر جلسہ اور حاضرین کو کھڑے ہوکر بغیر کسی تقریر کے مندرجہ ذیل ریزولیوشن بزبان ہندوستانی یا کسی مقامی بولی میں پاس کر دینا چاہیے۔ جہاں کہیں جلسوں کی ممانعت ہو۔ ہر ایک کنبہ کو مقررہ وقت پر اکٹھے ہوکر ریزولیوشن پاس کر کے نزدیک ترین کمیٹی کو اس امر کی اطلاع دے دینی چاہیے۔ ہر ایک جلسے اور ہر ایک گھر میں ریزولیوشن کو پاس کرنے سے پہلے قومی جھنڈے کو لہرانا چاہیے۔

ریزولیوشن حسب ذیل ہیں:

''اس سنجیدہ قومی دن ہم اس بات کو تر و تازہ کرتے ہیں کہ مکمل پیدائشی آزادی ہمارا حق ہے۔ اور ہم اس وقت تک دم نہ لیں گے۔ جب تک ہم اس کو حاصل نہ کر لیں گے۔''

''اس غرض کے لیے ہم دل و جان سے کوشش کریں گے کہ دل اور قول و فعل میں ہم سچائی اور عدم تشدد سے کام لیں گے۔ اور جتنی بھی زیادہ سے زیادہ قربانی کرنی پڑے یا مصیبت اٹھانی پڑے، ہم اسے کم سمجھیں گے۔''

''سچائی اور عدم تشدد ان دونوں ضروری اوصاف کے اظہار کے نظریے سے ہم مندرجۂ ذیل باتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے:

(۱) مختلف فرقوں کے دلوں میں اتحاد کو پیدا کریں گے۔ اور بلا امتیاز مذہب و ملت اور ذات و نسل تمام لوگوں کے درمیان مکمل مساوات کے درجہ کو قائم کریں گے۔

(۲) منشیات سے مکمل پرہیز کرنے کے لیے پرچار کریں گے۔

(۳) ہاتھ سے کاتنے اور دیگر دیہاتی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ اور غیر ملکی مال کو بالکل چھوڑ کر کھدر اور دیہاتی صنعتوں کی دیگر ساختہ اشیاء اپنے استعمال میں لائیں گے۔

(۴) اچھوت پن کو بالکل دور کریں گے۔

(۵) ہر ممکن طریقے سے کروڑوں فاقہ کش آدمیوں کی خدمت کریں گے۔

(۶) دیگر قومی اور تعمیری کوششوں میں حصہ لیں گے۔ اس بات کی بھی سفارش کی جاتی ہے۔ کہ قومی دن کو جہاں تک ممکن ہو کسی خاص تعمیری کوشش کے لیے وقف کیا جائے اور پورن سوراج کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ وقت اور زیادہ کوششیں وقف کی جائیں۔ کسی قسم کی ہڑتال نہ منائی جائے۔

شاہ جارج کے عہد کی جوبلی منانے کے متعلق قدرتاً یہ ریزولیوشن پاس کرنا پڑا۔ ''حکومت کی طرف سے اعلان ہوا ہے۔ کہ ہز برٹینک میجسٹی کے عہد کی ہندوستان میں جوبلی منائی جائے۔ ورکنگ کمیٹی کو یہ ضروری معلوم ہوا ہے۔ کہ وہ اس معاملے میں پبلک کی رہنمائی کرے۔

'ہز میجسٹی کی ذاتی بہبودی کے لیے کانگریس کی خواہشات نیک رہی تھیں اور نیک ہیں۔ لیکن کانگریس اس بات کو نظرانداز نہیں کرسکتی۔ کہ جس حکومت کے ساتھ ہندوستان میں ہز میجسٹی کا نام وابستہ ہے۔ وہ قوم کی اخلاقی ترقی میں بالکل روڑے اٹکاتی رہی ہے۔ اس وقت یہ حکومت اس آئین کے اجرا کی دھمکی دے رہی ہے جس کو نافذ کرنے سے ملک کی مزید تباہی اور سیاسی اقتصادی غلامی کے اور بھی مضبوط ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

ورکنگ کمیٹی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ ان انگریزوں اور دیگر لوگوں کی مخالفانہ مظاہرے کر کے دل آزاری کرے جو ان جلسوں میں شریک ہونا چاہیں۔ اس لیے ورکنگ کمیٹی عام پبلک اور کونسلوں کے منتخب کانگریس ممبران کو مشورہ دیتی ہے۔ کہ وہ جلسوں سے غیر حاضر رہنے پر ہی قناعت کریں۔''

ورکنگ کمیٹی کو یہ یقین ہے کہ حکام اور ذمہ دار انگریز ورکنگ کمیٹی کی نیک نیتی پر مبنی اور لازمی وتیرے کی داد دیں گے۔ اور آئندہ ہونے والے جلسوں میں شرکت کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ لوگوں کو مجبور کر کے قومی خودداری کو بلاضرورت زخمی کرنے سے احتراز کریں گے۔ کپڑے کے کارخانوں کے متعلق ورکنگ کمیٹی نے اپنی پوزیشن کو اس طرح سے واضح کیا۔ ''چوں کہ بہت سے کپڑے کی ملوں کے مالکوں نے ان وعدوں کو نہیں نبھایا۔ جو انھوں نے کانگریس سے کیے تھے۔ اس لیے ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ کانگریس یا اس کی متعلقہ جماعتوں کے لیے اب ناممکن ہوگیا ہے کہ وہ تصدیق کرنے کے سسٹم کو آئندہ جاری رکھ سکیں۔ اس لیے پرانی جاری کردہ سندات کو کالعدم سمجھنا چاہیے۔

ورکنگ کمیٹی کی یہ بھی رائے ہے۔ کہ تمام ممبران اور حامیاں کانگریس کا یہ فرض ہے کہ وہ

صرف ہاتھ سے کاتے ہوئے اور ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے کو ہی فروغ دینے کی طرف اپنی توجہ دیں اور اس کی حمایت کریں:

ترمیم شدہ کانسٹی ٹیوشن کی دفعہ ڈی ۳ کے بموجب ورکنگ کمیٹی نے ضبط قائم کرنے کے لیے قواعد بنائے چوں کہ کانگریس کانسٹی ٹیوشن میں رہائشی قابلیتوں کے مفہوم کے مطابق شکوک پیدا کیے تھے۔ اس لیے ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ اس کو واضح کیا۔

اس کے بعد جائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ میں مندرج اصلاحات کی اسکیم کے تحت برہما کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ اس وقت تو برہما پراونشل کمیٹی بدستور سابق کام کرتی جاوے۔ نئی اسکیم کے تحت برہما میں ہندوستان کی پوزیشن کی متعلق کمیٹی نے اس رائے کا اظہار کیا۔ کہ چوں کہ تمام اسکیم ہی نامنظور ہے۔ اس لیے کانگریس کوئی ترمیم پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔ اس لیے برہما کے ہندوستانیوں کو کوئی ممانعت نہیں ہے کہ وہ اسکیم کے ان حصوں پر اعتراضات اٹھائیں۔ جن سے ان کی پوزیشن اور درجے میں نمایاں فرق آتا ہے۔

پریذیڈنٹ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ آسام کے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے واسطے چندہ کے لیے اپیل کریں ۷ر فروری ۱۹۳۵ کو جائینت پارلیمنٹری کمیٹی کے برخلاف آل انڈیا پروٹسٹ ڈے مناکر یہ ظاہر کیا گیا کہ کانگرس کا حکم مان کر ملک عملی طور پر اتفاق کو اتحاد کا ثبوت دے سکتا ہے۔ اس بارے میں جو اپیل صادر کی گئی تھی اس کی پیروی میں نہ ہر ایک صرف مشہور مشہور شہروں میں جلسے ہوتے بلکہ اکثر صوبوں کے دور دراز کونوں میں ہی اور ان جلسوں میں صدر کی منشا کے مطابق ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

برہما پراونشل کانگرس کمیٹی کے ماتحت جو مظاہرہ ہوا وہ اس لحاظ سے بےنظیر تھا کہ برہمی اور ہندوستانی لوگوں نے پلیٹ فارم پر ایک جگہ کھڑے ہوکر رپورٹ کو رد کرنے کے ریزولیوشن پاس کیے اب ہم اتحاد کے متعلق اس گفت وشنید کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو جنوری اور فروری کو رونما ہوئی۔

ایک مہینہ سے بھی زیادہ کانگرس کے پریذیڈنٹ بابو راجندر پرشاد اور آل انڈیا لیگ کے صدر مسٹر جناح کے مابین مختلف فرقوں کے درمیان ایک ایسے متفقہ سمجھوتے کے لیے گفت وشنید ہوتی رہی۔ جو برائے نام کمیونل ایوارڈ کی جگہ لے سکے۔ اور جو فرقہ وارانہ نفاق دور کر کے ملک کو متحدہ مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکے۔

یہ گفت وشنید ۲۳ر جنوری کو شروع ہوئی اور تھوڑے سے وقفہ کے سوائے ۳۱ر مارچ ۱۹۳۵ء

تک جاری رہی۔ ملک کو یہ جان کر نہایت ہی مایوس ہوئے کہ اس سے کوئی نیک نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کانگرس کی جارحانہ کاروائی کو بند کرنے سے گورنمنٹ کی جابرانہ پالیسی کی نہایت ہی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ کہ وہ بغاوت کا نام ونشان مٹانے کے لیے دشمن کے خاموش ہونے کا فایدہ اٹھاتی ہے۔ جائینٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ اوراس کے پیدا شدہ بل کی عالمگیر مذمت سے گورنمنٹ اور بھی برانگیختہ ہوگی کلکتہ میں بغاوت کے متعلق اب بھی گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں۔ گورنمنٹ بنگال نے کلکتہ میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کو جلسہ منانے کی اجازت نہ دی۔ بعض اضلاع سے شکایات موصول ہوتی ہیں کہ کانگرس کے پروگرام کی تکمیل میں امن سے کام کرتے ہوئے کارکنان کانگرس کو بھی پولیس دق کررہی ہے۔

۱۹۳۵ء گزر گیا۔ لیکن گورنمنٹ کے وطیرے یا اس کی پالیسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ کانگرس کو ایک ایسی مشکوک ہستی سمجھا جاتا ہے جس سے دشمنی کا امکان ہے۔ اور ذرا سی احتجاج کرنے پر بھی کارکنان کانگرس کے برخلاف کاروائی کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا جن لوگوں کو دہشت انگیزیوں کے شبہ میں پکڑا گیا تھا۔ وہ آج تک بغیر ان پر مقدمہ چلائے جانے کے جیل خانوں میں..... نظر بند رکھے ہوئے تھے۔ اور اکیلے بنگال میں ان کی تعداد ستائیس سو ہے۔ جگہ جگہ وقتاً فوقتاً خانہ تلاشیاں ہوتی رہی ہیں۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور بہار کی طرح پراونشل کانگریس کمیٹی کے دفتروں کو بھی ان عنایات سے محروم نہیں کیا۔ بمبئی میں ایک تقریر کرنے کے سلسلے میں خان عبدالغفار خاں کو دو سال کی سزا ہوئی۔ اور انتخابی مہم کے سلسلہ میں ایک تقریر کی پاداش میں ڈاکٹر ستیہ پال کو ایک سال کی قید ہوئی۔ بنگال میں نظر بند لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کے کنبے عجیب بے بسی و بے چارگی کی حالت میں ہیں۔ گورنمنٹ نے ان کنبوں سے ان نوجوانوں کو جدا کر دیا ہے، جو ان کی روٹی کمانے کا سہارا تھے۔ ان نوجوانون کو مقدمہ چلانے کے بغیر سال ہا سال یا تو نظر بند رکھا گیا ہے۔ یا جلاوطن کیا گیا ہے یا حراست میں رکھا گیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ۲۴۔۲۵ اپریل کے روز جبل پور اکٹھے ہوکر اظہار ہمدردی کے لئیے ایک ریزولیشن پاس کیا۔ اور یہ بات طے ہوئی کہ نظر بندوں کے کنبوں اوران کے رشتہ داروں کی امداد کے لیے چندہ اکٹھا کیا جائے۔ ۱۹ ر مئی کا دن اس بات کا پروٹسٹ کرنے کے لیے منایا گیا کہ نظر بندوں کی اتنی بڑی تعداد کو مقدمہ چلانے کے بغیر کیوں روک رکھا گیا ہے اور چندہ اکٹھا کرنے کے لیے پریزیڈنٹ نے اپیل بھی کی۔ کانگریس کی اس تحریک کے خلاف بنگال گورنمنٹ نے انڈین پریس

ایمرجنسی پاورز ایکٹ دفعہ نمبر ۱۰۲ کے تحت احکام جاری کر کے اس بات کی ممانعت کر دی کہ کانگریس پریذیڈنٹ کی زیر ہدایات ہندوستان میں جہاں کہیں بھی نظر بندوں کا دن منایا جاوے۔ اس کے متعلق کسی قسم کی خبر کی بالکل اشاعت نہ کی جاوے۔ اس بات سے برانگیختہ ہو کر بنگال کے جرنلسٹوں نے اپنے اپنے اخبارات کی اشاعت کو ایک دن کے لیے ملتوی کر کے پروٹسٹ کیا۔ اپریل ۱۹۳۵ء کی ۲۴۔۲۵ تاریخ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جبل پور پر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ انتخابات میں جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک پنچایت کا فیصلہ کیا۔ اور آڈیٹروں کو مقرر کیا اور کمیٹی نے مسٹر ٹی اے شروانی (تصدق احمد خان شروانی) کی موت پر اظہار افسوس کیا۔ اور اسمبلی نے کانگریس پارٹی کے کام کے متعلق اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ اور ملک کی توجہ اس طرف دلائی کہ سرحدی صوبے میں کانگریس کی جماعتیں اور بنگال کے ضلع مدنا پور میں کانگریس کمیٹیاں اور کانگریس سے ملحقہ یا اس سے متعلق جماعتیں مثلاً خدائی خدمت گار۔ بنگال گجرات اور دیگر صوبوں میں ہندوستانی سیوا دل ابھی تک بدستور سابق ممنوع قرار دی جارہی ہیں۔ اور بنگال، احاطۂ بمبئی، پنجاب اور دیگر علاقوں میں مزدور لوگوں اور نوجوانوں کے جتھوں کو اس لیے نہیں دبایا جارہا کہ وہ کسی کھلم کھلا جرم کے مرتکب ہوتے ہیں، بلکہ اس بہانے کے پیش نظر کہ ان سے ان جرائم کے سرزد ہونے کا احتمال ہے۔ کمیٹی نے تمام لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اس مشکل سے رہائی پا لینے کے لیے نظام کانگریس کی طاقت کو بڑھانے میں مدد کریں۔

کمیٹی نے اس بات کا بھی نوٹس لیا۔ کہ ایک پرانے قانون موسومہ فورنیز را یکٹ کا صریحاً ناجائز فائدہ اٹھا کر اس قانون کے تحت میں ممبران کانگریس کو برطانوی ہندوستان میں جائز طور پر رہائش رکھنے اور کاروبار کرنے سے محروم کیا جارہا ہے۔ کمیٹی نے اس بات کی پرزور مذمت کی اور نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد کو بنگال میں حراست میں رکھ کر یا نظر بند کر کے ان پر جبر کیا جارہا ہے۔ اور ان کے کنبوں کو گزارے سے محروم کیا جارہا ہے۔ اور خود گورنمنٹ بھی مصیبت زدہ کنبوں کے گزارے کا کوئی بندوبست نہیں کر رہی۔ کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ بنگال گورنمنٹ کو یا تو ان نظر بندوں کو رہا کرنا چاہیے یا ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانا چاہیے۔ کمیٹی نے بنگالیوں اور نظر بندوں کو اس مصیبت میں اپنی پوری پوری ہمدردی کا یقین دلایا۔ اس نے بنگال پراونشل کمیٹی سے مطالبہ کیا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے پاس نظر بندوں کی ایک ایسی فہرست بھیجے۔ جس میں عرصۂ نظر بندی اور کنبوں کی مالی کیفیت درج ہو۔ کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے ماتحت نظر بندوں کے کنبوں کی

حفاظت کے لیے ایک آل انڈیا فنڈ کے جاری کرنے کا ریزولیوشن پاس کیا۔

کمیٹی نے فیروز آباد میں بے لگام ہجوم کے تشدد آمیز اور مکروہ افعال پر افسوس ظاہر کیا۔ اس تشدد کی وجہ سے ڈاکٹر جیوارام کا تمام کنبہ بمعہ بچوں اور مریضوں کو زندہ جلایا گیا۔ لیڈروں کی توجہ ان افسوس ناک نتائج کی طرف مبذول کی گئی۔ جو فرقہ وارانہ پاگل پن سے پیدا ہوتے ہیں اور اس بات کی اپیل کی کہ عوام الناس کو یہ بتانے کے لیے موثر طریقے برتے جائیں کہ وہ آپس میں پر امن اور دوستانہ طریقے سے رہیں۔ اور ایک دوسرے کی نیت کا عزت کے ساتھ احترام کریں۔

کمیٹی نے اس بات کو واضح کیا کہ انڈین نیشنل کانگریس کو ہندوستانی ریاستوں کے لوگوں کے مفاد کا اتنا ہی خیال ہے۔ جتنا کہ برطانوی ہند کے لوگوں کا اور ان لوگوں کو یقین دلایا کہ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے میں ہم آپ کے بالکل ساتھ ہیں۔ (تاریخ کانگریس، ۸۸۔۹۷۸)

مسٹر جناح کی تقریر۔ انقلاب کا تبصرہ:

۱۰ رفروری ۱۹۳۵ء: ۷ رفروری کو اسمبلی میں مسٹر محمد علی جناح کی تقریر پر روز نامہ انقلاب، لاہور نے ایک مفصل اداریہ لکھا ہے۔ جس میں مہاتما گاندھی کے پران تیاگ برت (بھوک ہڑتال) اور میثاق پونا پر تنقید کی ہے اور کانگریس کے رہنما مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی تقریر پر مسٹر جناح کے تبصرے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ (مسٹر جناح) نے کہا: میں مسٹر ڈیسائی سے اتفاق کرتا ہوں کہ مذہب، نسل اور زبان کو سیاست کے دایرے میں داخل نہیں کرنا چاہیے۔ کہ اقلیتوں کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ ہے اور دوسرے ملکوں نے اسے سیاسی مسئلہ سمجھ کر حل کیا ہے۔'' (انقلاب، ۱۰ رفروری ۱۹۳۵ء ص ۳)

افسوس کہ اپنے اس عقیدے کے برعکس اس کے بعد جو دن آیا مسٹر جناح نے مذہب اور نسل وزبان کی سیاست ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور نہ صرف ہندو مسلم منافرت کو انتہا تک پہنچا دیا اور مسائل کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیا بلکہ جس کی بدولت پاکستان کی سیاست میں مذہب اور مذہبی جذبات اس درجہ دخیل ہو گئے کہ مختلف اسلامی مذاہب اور مختلف مذہبی مکاتب فکر میں اختلاف و تعصبات کی خلیج روز بہ روز وسیع سے وسیع تر ہو جاتی ہے۔

صوبہ سرحد کا شریعت بل:

۲۰ رفروری ۱۹۳۵ء: الجمعیۃ دہلی کے حوالے سے حضرت مفتی صاحب کا ایک جواب شریعت

بل صوبہ سرحد کے بارے میں کفایت المفتی جلد نہم، کتاب السیاسیات میں نقل ہوا ہے۔ سوال وجواب یہ ہے:

سوال: شریعت بل جو صوبہ سرحد کی کونسل میں بہت سے مشکلات کے مدارج طے کرتا ہوا اب برائے رائے عامہ مشتہر ہو چکا ہے۔ ایک گروہ مسلمانوں کا اس شریعت بل سے انکار کرتا ہے۔ دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ یہ مکمل شریعت نہیں دوسرے یہ کہ غیر مذہب سے شریعت کو مانگا ہے۔ آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

جواب: شریعت بل کا مسودہ اگرچہ ضرورت سے بہت کم ہے لیکن اس کو بطور توطیۂ وتمہید کے پیش کر کے منظور کرانے کی سعی کرنا ناجائز نہیں ہے۔ اس کی منظوری کے بعد بقیہ ضروریات کی تحصیل کے لیے کوشش کرنے کا راستہ نکل آئے گا۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،

(کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

کراچی میں جلوسِ جنازہ پر فائرنگ:

۲۶ر مارچ ۱۹۳۵ء: سر محمد یامین خاں اپنی خودنوشت ''نامۂ اعمال'' میں ۲۱ر مارچ کی ڈائری میں لکھتے ہیں:

کل کے اخبار میں خبر تھی کہ عبدالقیوم کو کراچی میں پھانسی لگنے کے بعد: جس نے نا تھورام کو قتل کیا تھا، اس کی لاش کا جنازہ بہت سے مسلمان لے جا رہے تھے کہ کلکٹر نے فوج سے جو انگریزی تھی، فیر کرا دیے جس سے بہت لوگ زخمی ہوئے اور بہت مارے گئے۔ اس پر فوری سوالات راجہ غضنفر علی خاں اور محمود سہروردی نے آج کیے۔ جن کا جواب مسٹر ہیلٹ ہوم سیکرٹری نے ان تاروں پر فراہم ہوئی معلومات سے دیے جو گورنمنٹ بمبئی اور کلکٹر کراچی سے آئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ۳۵ مارے گئے، ۶۷ر زخمی ہوئے ہیں اور ۳۳ کم زخمی ہیں۔'' (صفحہ ۸۴-۵۸۳)

۱۰ر اپریل ۱۹۳۵ء: حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے مسلم ووٹروں کے نام اپنے مکتوب گرامی میں ''رپورٹ کونسل آف اسٹیٹ'' کے حوالے سے شہید عبدالقیوم کی پھانسی اور بلا نماز جنازہ میت کے دفن پر اہل کراچی کے ردعمل کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

''۱۹۳۵ء میں شہید قوم عبدالقیوم مرحوم کو پھانسی دے کر جیل والوں نے بلا نماز جنازہ پڑھے ہوئے اندھیرے میں علی الصباح دفن کر دیا تھا۔ اور اس کی اطلاع مسلمانان کراچی کو پہنچی جو کہ لاش

ملنے کے منتظر تھے تو انھوں نے قبر کھود کر لاش نکال کر عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھنے کے لیے لے جانا چاہا۔ پولیس اور حکام نے مزاحمت کی لیکن مسلمانوں نے اپنا مذہبی فریضہ جان کر پولیس کے احکام کو نہ مانا۔ پولیس نے بحکم افسران بالا گولی چلوادی جس سے ۴۷ مسلمان شہید اور ایک سو سے زیادہ زخمی ہوگئے۔ اس پر مرکزی اسمبلی میں تحریک التواپیش کی گئی جو کہ ۶۷ آرا کی اکثریت سے بمقابلہ ۵۲ پاس ہوگئی اور حکام کراچی مجرم اور مستحق سزا قرار دیے گئے۔ مگر سر یامین خان نے جو کہ لیگ کے نہایت سربرآوردہ رکن ہیں، گورنمنٹ کی طرف داری میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا کر نہایت طویل اور مہمل تقریر کی اور حکام کراچی کو بے قصور قرار دیتے ہوئے وقت اجلاس کو ختم کر دیا۔ اس خدمت کو انجام دینے کے بعد ہی ان کو سر کا خطاب گورنمنٹ سے عطا کیا گیا۔'' (صفحہ ۴،۵)

سر یامین خان نے جلوس جنازہ کو روکنے کی وجہ جو پولیس کے دفاع اور مسلمانوں کے خلاف جاتی ہے، یہ بیان کی ہے:

''گورنمنٹ نے مسلمانوں کو جلوس کے ساتھ جنازہ نکالنے سے اس لیے روکا تھا کہ مسلمان مشتعل ہو کر ہندوؤں کی دکانات و مکانات نہ لوٹیں۔'' (نامۂ اعمال، صفحہ ۵۸۴)

عوام کے مکانات و رکانات کے حفظ و دفاع میں پولیس کی پیش بندی و مستعدی کیا خوب تھی کہ لوٹنے کے عزم و ارادہ اور سعی و عمل سے پہلے ہی بقول سر یامین خاں کے ۳۵ مارے گئے'' اور کونسل آف اسٹیٹ کی رپورٹ کے مطابق بقول حضرت شیخ الاسلام ۴۷ مسلمان شہید ہوئے۔''

۱۸/اپریل ۱۹۳۵ء: مولانا فضل احمد صاحب (حیدرآباد۔ سندھ) نے یہ سوالات دریافت کیے تھے:

''جوبلی کا مقاطعہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جمعیت علماے ہند کا ممبر کس طرح بنا جا سکتا ہے اور یہ کہ کراچی کے واقعہ ہائلہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب تحریر فرمایا:

''جوبلی فنڈ میں مسلمانوں کے لیے شرکت مناسب نہیں۔ جمعیۃ علماے ہند کے رکن آپ فارم کی خانہ پری کر کے بن سکتے ہیں۔ فارم دفتر سے مل سکتے ہیں۔ شہداے کراچی کے متعلق ضروری تبلیغ کی جا رہی ہے آپ بھی دعا کریں کہ تحقیقات کے مسئلے میں خدا تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے۔

محمد کفایت اللہ''

کوئٹہ کا قیامت خیز زلزلہ:

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء: اگر زلزلہ بہار نے ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کے دن ملک کو بیتاب کیا تھا تو ۱۹۳۵ء ۳۱ مئی کے دن زلزلہ کوئٹہ سے تمام ملک میں غم واندوہ کے بادل چھا گئے۔ چوں کہ شہر ایک مرکز تھا۔ اس لیے گورنمنٹ کو قدرتاً امداد بہم پہنچانے میں بھی پہل کرنی پڑی۔ لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ امداد دینے یا اس کو مرتب کرنے کے لیے بیروں جات کے لوگوں کو کوئٹہ میں داخل ہونے کی کیوں ممانعت کی گئی۔ نہ ہی کانگریس پریذیڈنٹ اور نہ ہی گاندھی جی کو اس جگہ جانے کی اجازت ملی۔ ان حالات میں سوائے اس بات کے اور کیا ہوسکتا تھا کہ ممنوعہ رقبہ کے مقامات سے دور ڈیرے ڈال کر امداد پہنچانے کا بندوبست کیا جائے۔ صدر کانگریس نے ایک کمیٹی مرکزی ریلیف کمیٹی مرتب کی ہے۔ جس نے سندھ پنجاب کو سرحدی صوبہ کی شاخوں کی وضاحت سے ان مصیبت زدگان کو امداد پہنچائی ہے۔ جو کوئٹہ سے بھاگ کر ان صوبوں میں آئے ہوئے تھے۔ مصیبت زدگان کے ساتھ اظہار ہمدردی اور مزارعوں کے واسطے دعائیں مانگنے کے لیے ۲۰ جون کا دن منایا گیا۔ اس سلسلے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ اور بے اعتمادانہ پالیسی میں کمال حاصل ہوگیا ہے۔ اور مجبوراً ورکنگ کمیٹی کو یکم اگست ۱۹۳۵ء کے دن کو کوئٹہ ریلیف کے متعلق حسب ذیل ریزو لیوشن پاس کرنا پڑا۔

ورکنگ کمیٹی ان ہزارہا لوگوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی ہے۔ جن کو کوئٹہ اور بلوچستان میں زلزلے کی وجہ سے عزیزوں سے جدائی اور مال ودولت کے برباد ہونے کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے:

اور پس ماندگان اور مصیبت زدگان کے ساتھ بھی اظہار ہمدردی کرتی ہے۔

ورکنگ کمیٹی نے پریذیڈنٹ کے اس کام کو صلاحیت کی نگاہ سے دیکھا اور پبلک کی طرف سے دی گئی غیر معمولی امداد کا بھی اعتراف کیا گیا۔

ورکنگ کمیٹی اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ پریذیڈنٹ نے اپنے ذرائع سے کام لیتے ہوئے کوئٹہ کی صورت حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کی ہے۔ تاہم سرکاری اور غیر سرکاری موقعے کے گواہان کے شائع شدہ بیانات کی بنا پر یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ اگر کھدائی

کے کام کو وسیع پیمانے پر جاری رکھا جاتا تو ملبے کے تلے دبے ہوئے اور بہت لوگوں کی جانیں بچ جاتیں۔

ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے۔ کہ گورنمنٹ کو سرکاری اور غیر سرکاری ممبران پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کرنا چاہیے۔ جو پبلک اور بعض حالتوں میں سرکاری شائع شدہ بیانات کے الزامات کی پڑتال کرے:

(۱) کہ گورنمنٹ کی جانب سے اس بیان کی واقعات کی بنا پر کچھ تردید نہیں ہوتی کہ گورنمنٹ کے پاس مذکورہ بالا پیشکش کے وقت کوئٹہ کے صورت حالات پر قابو پانے کے لیے کافی ذرائع موجود تھے۔

(۲) کہ انھوں نے پیش کردہ مدد کو بے وجہ ٹھکرادیا۔

(۳) کہ ان کو اتفاقیہ ضرورت حاوی ہونے کے لیے رقبہ قرب وجوار سے بھی مدد مل سکتی تھی۔

(۴) اگرچہ برباد شدہ رقبے کے ہر ایک یورپین باشندے کی مردم شماری کی گئی۔ لیکن ہندوستانی باشندوں کے بارے میں اس لحاظ سے کافی کوشش نہیں کی گئی۔ اور بچانے اور مدد پہنچانے اور دبے ہوئے مال کو نکالنے کے بارہ میں بھی ہندوستانیوں اور یورپین لوگوں میں اس قسم کے امتیاز کو روا رکھا گیا۔ (تواریخ کانگریس، ص ۹۱-۹۸۹)

مسجد فنڈ سے سلور جوبلی کا چراغاں!

یکم جون ۱۹۳۵ء: احمد محمد اچھا (رنگون) نے ذیل کا سوال حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا تھا:

''ملک معظم کی سلور جوبلی کے سلسلے میں مساجد کو بقعۂ نور بنانا جس کا صرفہ خواہ مسجد کی رقوم موقوفہ سے ہو یا عامۃ المسلمین کے چندہ سے ہو یا کسی شخص کی جیب خاص سے ہو جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو مسجد کے جن متولیوں نے چراغاں کا انتظام کیا وہ شرعاً مجرم ہوئے یا نہیں؟''

حضرت مفتی صاحب نے انھیں یہ جواب دیا:

''سلور جوبلی یا گولڈن جوبلی یا اور کسی ایسی تقریب میں جس کا منشا اعلائے کلمۂ توحید یا اظہار شوکت اسلام نہیں بلکہ کسی خاص شخص کے بقائے اقتدار و امتدادِ حکومت کی خوشی میں مظاہرہ کرنا ہو مساجد کا روپیہ صرف کرنا جائز نہیں اور نہ مساجد اس قسم کے مظاہرات کے لیے موزوں۔ متولیوں

نے مساجد کواس مظاہرے کے لیے استعمال کرنے میں غلطی کی اور روشنی کے مصارف کے بھی وہ خود ضامن ہوں گے۔"

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،
(کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

سیرت مدنی کا تابندہ نقش:

۲۴ر جون ۱۹۳۵ء: مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا قاری محمد طیبؒ کے نام حضرت شیخ الاسلام کا ایک تاریخی خط

بخدمت جناب مہتمم صاحب زید عنایتہم

جناب عالی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج شریف چوں کہ کچھ عرصہ سے میرے متعلق دربارۂ حاضری وغیر حاضری وانجام دہی خدمات دارالعلوم واخذ تنخواہ وغیرہ مختلف افواہیں شائع ہورہی ہیں، اس لیے میں جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ دفتر کے رجسٹروں وغیرہ کی تفتیش فرما کر مندرجۂ ذیل سوالات کا جواب عنایت فرمادیں تاکہ صحیح واقعات لوگوں کے نزدیک پہنچ سکیں۔

نمبر ا۔ سال گزشتہ یعنی ابتداے سال تعلیمی ۱۳۵۲ھ تا آخر سال تعلیمی ۱۳۵۳ھ ماہوار میری حاضری کی مقدار کیا ہے؟

نمبر ۲۔ ایام جمعہ اور ایام تعطیل اس میں کتنے ہیں؟

نمبر ۳۔ جمعہ اور تعطیل کے ایام غیر حاضری میں شمار ہوں گے اور تنخواہ قطع کی جائے گی؟ یا حاضری میں شمار ہوں گے اور تنخواہ قطع نہ کی جائے گی؟

نمبر ۴۔ جو جلسے مدارس اسلامیہ ملحقہ دارالعلوم کے سالانہ ہوتے ہیں ان میں شرکت کار ہاے مدرسہ میں شمار ہوگی یا نہیں؟

نمبر ۵۔ انجمن ہاے اسلامیہ تبلیغیہ اور انجمن ہاے اصلاحیہ کے تبلیغی اور اصلاحی جلسے آیا ان میں شرکت کار ہاے مدرسہ میں شمار ہوگی یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو آئینہ دارالعلوم کے چند اولین نمبروں میں ان کو کار ہاے مدرسہ میں آیا شمار کیا گیا ہے یا نہیں؟

نمبر۶۔ جمعیۃ العلماء کے مجلس عاملہ یا منتظمہ کے جلسے اور اسی طرح اس کے سالانہ جلسے، آیا ان کی شرکت کارہائے مدرسہ میں شمار ہوگی یا نہیں اگر جواب نفی میں ہے تو کیا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے گیا، لاہور، سیوہارا وغیرہ میں ایسے جلسوں کی صدارت کی یا نہیں اور کیا ایسے جلسوں کے سفرخرچ وغیرہ مدرسہ پر پڑتے رہے یا نہیں؟ والسلام

ننگ اسلام حسین احمد غفرلہ،

۲۲ر ربیع الاول ۱۳۵۴ھ

حضرت شیخ الاسلام کے اس مکتوب گرامی سے جس فتنے کے سر اٹھانے کا پتا چلتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں یہ بہت زور شور سے اٹھا۔ دہلی و لاہور کے چند اخبارات نے اس فتنے کو ہوا دینے میں خاص حصہ لیا۔ اسی زمانے میں اس کی سرکوبی کے لیے حضرت نے قلم اٹھایا اور ''اظہار حقیقت'' کے نام سے ایک نہایت تحقیقی رسالہ لکھا۔ لیکن ۴۶-۱۹۴۵ء کے مرکزی اور صوبائی انتخابات کے ساتھ ہی فساد کی یہ فصل بھی تباہ ہوگئی۔ حضرت کا یہ رسالہ حضرت کی روشن اور تابندہ سیرت کا یادگار ثبوت ہے اور ''مقالات سیاسیہ'' (حصہ اول) متعلقہ وملحقہ سیاسی ڈائری میں یہ بھی شامل ہے۔ مکمل رسالہ اور اس قسم کی نکتہ چینیوں کا مفصل اور مدلل جواب وہیں ملاحظہ فرمایئے۔

خواتین اور سماجی خدمات:

۳۰ر جون ۱۹۳۵ء: ملک محمد امین (جالندھر) نے حضرت مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی سے دریافت کیا تھا:

''موجودہ دورِ فتن میں مسلم عورتوں کا ووٹ دینا یا مسلم عورتوں کا کونسل و اسمبلی و میونسپلٹی میں بطور امیدوار کھڑا ہونا از روے شریعت کیسا ہے؟

حضرت مفتی صاحب نے اس کا یہ جواب دیا:

''عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع نہیں ہے۔ ہاں ووٹ دیتے وقت شرعی پردے کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا اور بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لیے مستحسن نہیں۔ کیوں کہ اس میں ضروریات شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لیے متعذر ہے''۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

(کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

انڈیا بل کی منظوری:

۲ راگست ۱۹۳۵ء: کئی ماہ کی مسلسل بحث اور باہم گفتگو کے بعد ۲ راگست ۱۹۳۵ء کو گیارہ بج کر چالیس منٹ پر ملک معظم نے انڈیا بل پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس طرح برطانوی شہنشاہ نے اپنے نزدیک ہندوسان کو آزادی دے دی اور ایکٹ ۱۹۳۵ء کو آخری شکل میں منظور کرلیا۔

اس ایکٹ پر ۱۹۲۸ء سے برطانوی دستوری کمیشن نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ روز نامہ ''ٹیلیگراف'' لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''آج حکومت انگلستان نے موجودہ پارلیمنٹ کا سب سے اہم کام ختم کردیا ہے۔''

ہندوستان کا نیا وائسرائے:

۶ راگست کو سرکاری اعلان کے مطابق لارڈ ولنگڈن کی جگہ لارڈ لنلیتھگو نے وائسرائے ہند کا عہدہ سنبھال لیا۔ (کاروان احرار، ج ۲)

اسمبلی میں حکومت کی شکست:

۲ رستمبر ۳۵ء سے اسمبلی کا دوسرا اجلاس شروع ہوا اور ۲۵۔ ستمبر تک ۲۴ دن جاری رہا۔ اس میں حکومت کو دو شکستیں ہوئیں۔ پہلی شکست قبائلی علاقے پر بمباری کے خلاف اور دوسری شکست مسودۂ قانون فوجداری کی ترمیم پر۔ اس مسودے پر ایوان میں مسلسل تین دن بحث ہوتی رہی۔ حکومت نے انڈیپنڈنٹ پارٹی کے بعض مسلمان ممبروں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہی اس طرح ۷۱۔ اور ۶۱ ووٹوں کی تقسیم سے حکومت کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

(مولانا حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۵۴)

پاکستان کا تعارف:

۹ رستمبر ۱۹۳۵ء: ''ڈیلی ٹیلیگراف'' نے ۹ رستمبر ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں پاکستان کا نقشہ شائع کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل شذرہ سپرد قلم کیا:

''مجھے یہ عتراف ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر، میں نے پاکستان وطنی تحریک کا نام تک نہیں سنا تھا۔ اب مجھے چند خوبصورت اور دیدہ زیب پمفلٹ، تحریک کے بانی اور صدر، چودھری رحمت

علی صاحب کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا نام، ہندوستان کے پانچ اسلامی صوبوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: پنجاب (پ) سرحد، افغانی صوبہ (الف)، کشمیر (ک)، سندھ (س) اور بلوچستان (تان)۔ ایک رسالہ میں تحریک کے اغراض ومقاصد بیان کیے گئے ہیں، جس کا عنوان شاعرانہ سا ہے۔ ''فیصلہ کن ساعت۔'' (اب یا کبھی نہیں Now Or Never!)۔ دوسرے کا عنوان ہے۔''

''کیا ہمیں زندہ رہنا ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جانا ہے؟''

پاکستانی قوم، ہندوستان کے وفاقی دستور کو ناپسند کرتی ہے اور اس کا مطالبہ ایک ملی وطن یعنی پاکستان کے قیام کا ہے، جو پاکستانی صوبجات پر مشتمل ہو۔ اس ملی وطن کے نام سے متعلق جملہ شکوک، چودھری صاحب کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے رفع ہو جاتے ہیں:

''پاکستان کے معنی ہیں، پاک لوگوں کی سرزمین۔ اس لفظ کا مفہوم انگریزی میں کما حقہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو انسانی زندگی میں مقدس اور پاک ہے۔''

چودھری صاحب کا، جنھوں نے یہ نام تجویز کیا ہے، خیال ہے کہ یہ لفظ، پاکستانی قوم کی صحیح روح کا ترجمان اور آئینہ دار ہے۔''

(تصور پاکستان سے قرار داد پاکستان تک ص ۱۶۵ مرتبہ: سرفراز حسین مرزا ۱۹۸۳ء، ص ۱۶۵، پاکستان اسٹڈی سینٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور)

۱۸؍ ستمبر ۱۹۳۵ء: مسجد شہید گنج لاہور کی تحریک میں حصہ لینا کیسا ہے؟ رضا کاروں کو لیڈران قوم کا یہ تعلیم دینا کہ مقابل پر دست اندازی نہ کرو۔ لاٹھیاں، کوڑے، گولیاں وغیرہ کھا کر شہید ہو جاؤ۔ کیا اس طور کی شہادت کا ثبوت شرعاً ادلہ اربعہ سے پایا جاتا ہے؟

المستفتی حکیم عطا حسین (جالندھر) ۱۹؍ جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ م ۱۸؍ ستمبر ۱۹۳۵ء

جواب: مسجد شہید گنج کی واپسی کے سلسلے میں آئینی طریق پر حصہ لینا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔ یہ صورت بھی بسا اوقات اختیار کرنی ہوتی ہے۔ اس کے لیے رہبر و رہنما موقعہ شناسی سے حکم دیتا ہے اور اس کا اتباع کرنا ہی اصلح و انفع ہوتا ہے۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،

(کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

صدر مہتمم کے عہدے پر حضرت مدنی کا تقرر:

یکم اکتوبر ۱۹۳۵ء: ۳؍ رجب کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں طے کیا گیا تھا کہ

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی عدم موجودگی میں حضرت شیخ الاسلام ان کے منصب کے فرائض بھی انجام دیں گے۔ اس سلسلے میں مہتمم مولانا قاری طیب صاحب نے حضرت کو ضابطے کی اطلاع دی۔

''مخدوم ومحترم مولانا صدر المدرسین صاحب مدظلہم''

سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ اجلاس مجلس شوریٰ دار العلوم منعقدہ ۳۰ ؍ رجب ۱۳۵۴ھ میں زیر صدارت حضرت مولانا عبدالرحمٰن خان صاحب خورجوی آنحضرت کے متعلق تجویز ذیل پاس ہوئی ہے، مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نے تجویز پیش کی کہ

مولانا شبیر احمد عثمانی کی غیبت میں اہتمام کے فرائض مولانا حسین احمد صاحب صدر مدرس اور مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم مشترک انجام دیں گے کسی معاملے میں اختلاف رائے ہوگا تو حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی رائے کو ترجیح ہوگی۔ جناب خواجہ فیروز الدین صاحب کی تائید سے تجویز بالا منظور ہوئی اطلاعاً عرض ہے۔

محمد طیب غفرلہٗ

۳۰ ؍ رجب ۱۳۵۴ھ

مسجد شہید گنج اور اس کی واگزاری:

۲؍ نومبر ۱۹۳۵ء: مسجد شہید گنج کے بارے میں کسی صاحب کے سوالات کے جواب میں حضرت مفتی اعظم یہ مفصل خط تحریر فرمایا۔ سوالات کے مضمون کا اندازہ خط کے مطالب سے ہو جاتا ہے۔ جواب یہ ہے:

جناب مکرم دام مجدہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ نے ممنون فرمایا۔ جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ ''بعض اخبارات (اکثر غیر مسلم) اور بعض افراد یہ پرچار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جناب اعلیٰ حضرت امیر ملت سے مسئلہ شہید گنج کے بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں، چوں کہ اس کے متعلق کوئی مصدقہ اطلاع نہیں اس لیے از راہ کرم بدین خط ارشاد فرمائیں کہ ان بیانات میں کہاں تک صداقت ہے؟''

جواباً گزارش ہے کہ مسجد شہید گنج کے متعلق میرا واضح اور غیر مشتبہ بیان اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اس کا خلاصہ جناب کی مزید توجہ کے لیے درج ذیل ہے:

(۱) جو مسجد کہ ایک مرتبہ باقاعدہ شرعی طور پر مسجد ہو جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے۔

کسی غاصب کے غاصبانہ قبضے اور کسی جابر کی جابرانہ دستبرد سے اس کی مسجدیت باطل نہیں ہو سکتی۔

(۲) سکھوں کو باوجود اس کے کہ عدالتی فیصلے ان کے قبضے کے حق میں تھے مسجد کو منہدم کرنے کا حق ہرگز حاصل نہ تھا۔ انھوں نے مسجد کو شہید کر کے ایک شدید اخلاقی جرم کا اور قانونی حیثیت سے نقض امن عامہ کی جنایت کا ارتکاب کیا ہے۔

(۳) حکومت نے بندوقوں اور سنگینوں کی حمایت میں سکھوں کو مسجد منہدم کرنے کا موقع بہم پہنچا کر عدالتی فیصلوں کی منزلوں کی حدود سے تجاوز کیا اور حفظ امن عامہ کے فرائض ادا کرنے سے تغافل اور تساہل کی ذمہ داری سے وہ سبک دوش نہیں ہو سکتی۔

(۴) مسجد شہید گنج کا انہدام یقیناً مسلمانوں کے لیے دل آزار، اشتعال انگیز اور ناقابل برداشت تھا۔

(۵) مسجد کی واگزاری کے لیے جدوجہد کرنا اور قابل عمل متحدہ نتیجہ بخش ذرائع سے اسے واگزار کرانا مسلمانوں کا مذہبی اور شرعی وظیفہ ہے۔

جہاں تک مسجد شہید گنج کے معاملے کا تعلق ہے اس کے بارے میں اس بیان سے میری رائے ظاہر ہے۔ رہا اس کی واگزاری کے سلسلے میں پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کے طریقۂ کار سے میرا اتفاق یا اختلاف کرنا تو جہاں تک واقعات کا تعلق ہے وہ یہ ہیں کہ راولپنڈی کانفرنس نے مسجد کی واگزاری کے لیے پروگرام تجویز کرنے کی غرض سے ایک مجلس شوریٰ مقرر کر دی تھی اور مجلس کے پروگرام پر عمل کرنے اور مسلمانوں سے عمل کرانے کے لیے پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کر دیا تھا۔ اگرچہ یہ بات میرے علم میں نہیں آئی کہ اس مجلس شوریٰ کا کوئی جلسہ منعقد ہوا اور اس نے کوئی پروگرام تجویز کیا یا نہیں؟ مگر یہ واقعہ ہے کہ راولپنڈی کانفرنس کے انعقاد پر دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود پیر صاحب نے مسجد کی واگزاری کے سلسلے میں کوئی عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا اور نہ کوئی پروگرام شائع فرمایا۔

رجب سے پہلے لاہور میں پیر صاحب نے اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ ”چوں کہ مسجد شہید گنج کا معاملہ تمام مسلمانوں کا معاملہ ہے، اس کے لیے کوئی اقدام تمام مسلمانوں کے مشورے سے ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نے اس کو اجمیر شریف کے عرس تک ملتوی کر دیا ہے، کیوں کہ عرس کے موقع پر صوفیا و سجادہ نشینان ہندوستان اور ہر طبقے کے مسلمانوں کا اجتماع عظیم اجمیر شریف میں ہوتا ہے۔ اس لیے سب کے مشورے سے کوئی پروگرام تجویز کیا جائے گا اجمیر شریف کے عرس میں پیر

صاحب تشریف بھی لے گئے اور عرس کو کامل ایک مہینے کا عرصہ بھی گزر گیا۔ مگر کوئی پروگرام شائع نہیں ہوا۔

اس کے بعد بدایوں میں جمعیۃ علماء کانپور رجسٹرڈ کے جلسے پر محول کیا گیا تھا۔ وہ جلسہ بھی پیر صاحب کی صدارت میں ہو چکا۔ اس کے بعد مجلس شوریٰ یا مجلس اتحاد ملت کا کوئی موثر پروگرام بھی شائع نہیں ہوا۔

الحاصل مسجد کی واگزاری کے لیے اس وقت تک پیر صاحب کی کوئی عملی سرگرمی بروئے کار ہی نہیں آئی جس سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا سوال بھی پیدا ہو سکے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ مسجد شہید گنج کا معاملہ ایسا معاملہ نہیں ہے کہ اس میں مسلمانوں کی دو رائیں ہو سکیں۔ مسجد کی واگزاری کا مسئلہ متفق علیہ اور مسلمانوں کا شرعی وظیفہ ہے اس میں تو اختلاف کی گنجائش ہی نہیں یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یا استبدادی طرز عمل یا غیر متعلق سرگرمیاں موجب اختلاف ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔

مجلس اتحاد ملت کی کانفرنس منعقدہ راولپنڈی نے بجا طور پر مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں یہ کام دے دیا تھا کہ وہ اہل الرائے کے مشورے سے کوئی متحدہ اور قابل عمل اور نتیجہ بخش پروگرام تجویز کرے۔ اور مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ پروگرام کو عمل میں لانے اور مسلمانوں سے عمل کرانے کے لیے ڈکٹیٹر مقرر کرنا بھی ضروری تھا۔ مگر اس مسئلے کو امارت شرعیہ کے مسئلے کے ساتھ (جو فی حد ذاتہ نہایت اہم اور غور طلب مسئلہ ہے) خلط کر دینا موقع شناسی اور اصابت رائے کی حد سے متجاوز ہے۔

ڈکٹیٹر کو بھی اپنی تمام تر توجہ مسجد کی واگزاری کے معاملے پر مرکوز کر دینی چاہیے اور ایسی تمام باتوں سے قطعاً مجتنب رہنا چاہیے جو اتحاد بین المسلمین کے منافی ہوں یا جن کا نتیجہ یہ ہو کہ مسجد کی واگزاری جیسا اہم اور متفق علیہ مسئلہ بھی خدانخواستہ اختلاف کا آماجگاہ بن جائے۔ مجلس اتحاد ملت کو اس نازک ترین موقع پر ان امور کی نگہداشت لازم ہے۔

جناب کے عنایت نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اخبارات کچھ غلط فہمی پھیلا رہے ہیں تو اگر آپ اجازت دیں تو میں اس خط کی نقل اخبارات میں بغرض اشاعت بھیج دوں۔ میں نے اس کی نقل رکھ لی ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی ۲ر نومبر ۱۹۳۵ء

(کفایت المفتی (جلد نہم) کتاب السیاسیات)

۱۹۳۶ء

جارج پنجم کا انتقال:

۲۰؍جنوری ۱۹۳۶ء: رات ۱۱ بجے شاہ انگلستان جارج پنجم کا انتقال ہوگیا۔

تالیف وتدوین قانون فسخ نکاح:

یکم و۲؍فروری ۱۹۳۶ء: مسودۂ قانونِ فسخِ نکاح مرتبہ مجلس شوریٰ مرکزیہ جمعیت علماے ہند کے بارے میں مشورے کے لیے جمعیت علماء نے ایک عام مجلس مشاورت کا انعقاد کیا جس میں مجلس عاملہ کے ارکان کے علاوہ ملک کے اکابر علماے دین، رہنمایان ملت اور اصحاب راے کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ جلسۂ مشاورت یکم ۲؍فروری ۱۹۳۶ء کو مرادآباد میں منعقد ہوا اور بڑی تعداد میں علماے قوم نے اس میں شرکت کی۔ مجلس مشورت کی کارروائی میں درج ہے کہ

بدین غرض کہ مسلمان عورتوں کے لیے فسخ نکاح کے ان حقوق کو حاصل کرنے کا راستہ نکالا جائے جو شریعت اسلامی نے ان کو عطا کیے ہیں۔ مگر موجودہ ملکی قانون ان کے لیے ناکافی ہے۔

ہرگاہ کہ ہندوستان میں مسلمان عورتیں اپنے نکاحوں کو فسخ کرانے کے ان حقوق سے محروم ہیں جو بروے شریعت اسلامی ان کو حاصل ہیں مگر ملک کا موجودہ مرجبہ قانون ان کے حصول کے لیے ناکافی ہے۔ اس لیے حسب ذیل قانون نافذ کیا جاتا ہے:

(۱) اس قانون کا نام ''مسلم قانون فسخ نکاح'' ہوگا۔

(۲) یہ قانون تمام برٹش انڈیا میں اطلاق پذیر ہوگا اور فوراً نافذ ہو جائے گا۔

(۳) اس قانون کے منشا یا کسی دفعہ کے خلاف برطانوی ہند کا کوئی قانون یا ریگولیشن یا آرڈیننس موجود ہو تو وہ قانون اور ریگولیشن اور آرڈیننس اس قانون پر یا اس کی کسی دفعہ پر اثر انداز نہ ہوگا۔

(۴) اس قانون میں جب تک مضمون یا سیاق وسباق میں کوئی امر متناقض نہ پایا جائے،

(۱) مالکی قانون سے شریعت اسلام مطابق مذہب امام مالکؒ مراد ہوگی۔

(۲) حنفی قانون سے شریعت اسلام مطابق مذہب امام ابوحنیفہؒ مراد ہوگی۔

(۵) مسلمان عورت مندرجۂ ذیل وجوہ میں سے کسی ایک وجہ یا زیادہ کی بنا پر اپنے شوہر کے

خلاف فسخ نکاح کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

(الف)(۱) یہ کہ اس کا شوہر مفقود الخبر ہو۔

(۲) یہ کہ اس کا شوہر جنون یا جذام یا برص میں مبتلا ہو جب کہ یہ امراض سخت قسم کے ہوں۔

(۳) یہ کہ اس کا شوہر اس کو نفقہ نہ دیتا ہو یا دینے پر قادر نہ ہو۔

(۴) یہ کہ اس کا شوہر اس پر متواتر نا قابل برداشت مظالم کرتا ہو۔

(۵) یہ کہ شوہر کی مفقود الخبری یا طویل قید یا تعنت کی وجہ سے اس کی عصمت خطرے میں ہو۔

(ب)(۱) یہ کہ عورت کو خیار بلوغ حاصل تھا اور اس حق سے اس نے نکاح کو مسترد کر دیا ہو۔

(۲) یہ کہ اس کا نکاح فاسد منعقد ہوا تھا یا بعد میں کسی وجہ سے فاسد ہو گیا ہو۔

(۳) یہ کہ اس کا شوہر عنین یا مجبوب ہو۔

(۴) کسی اور وجہ کی بناء پر جو بروے فقہ حنفی فسخ نکاح کے لیے کافی ہو۔

(۶) جو مقدمات زیر دفعہ ۵ (الف) دایر کیے جائیں گے ان کی سماعت اور فیصلہ بروے قانون مالکی کیا جائے گا۔

(۲) جو مقدمات زیر دفعہ ۵ (ب) دایر کیے جائیں گے ان کی سماعت اور فیصلہ بروے قانون حنفی کیا جائے گا۔

(۷)(الف) مقدمات کی سماعت کے بارے میں ضابطہ دیوانی ایکٹ ۱۹۰۸/۵ء کے احکام کے ماتحت مسلمان عورت کا دعویٰ انفساخ نکاح عدالت مجاز میں دایر کیا جائے گا بشرطے کہ اس عدالت کا حاکم مسلمان ہو۔

(ب) اگر عدالت مذکورہ (الف) کا حاکم مسلمان نہ ہو تو ایسا دعویٰ عدالت ڈسٹرکٹ جج میں دایر کیا جائے گا جو خود اگر مسلمان ہوگا وہ اس کی سماعت کرے گا یا اپنے ضلع کے کسی مسلمان جوڈیشل افسر کے یہاں بغرض سماعت بھیج دے گا اور اس معاملے میں حدودِ سماعت ارضی و مالی کا خیال نہ کرے گا۔

(ج) اگر ڈسٹرکٹ جج مسلمان نہ ہو اور حسب ضمن

(ب) ضلع میں کوئی مسلمان حاکم دستیاب نہ ہو تو ڈسٹرک جج اس مقدمے کو سماعت کے لیے کسی قریب ترین ضلع کے مسلمان حاکم کے اجلاس میں بھیج دے گا۔

(د) اگر مقدمہ بھیجے جانے کے بعد مسلمان حاکم کی جگہ کسی وجہ سے غیر مسلم حاکم آجائے تو مقدمہ اس ضلع کے ڈسٹرکٹ جج کے یہاں واپس کیا جائے گا جہاں دایر ہوا تھا۔ اور وہ حسب ضمن (ب) و (ج) متذکرۂ صدر مقدمے کے فیصلے کے لیے سپرد کردے گا۔

(۸) ابتدائی عدالت کے فیصلے کی اپیل ہائی کورٹ میں ہوگی اور کوئی مسلم جج عدالت مذکور اس کی سماعت اور فیصلہ کرے گا۔

۳ رفروری ۱۹۳۶ء: جلسۂ مشاورت کے بعد مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا اور اس میں مشاورت کی کارروائی کو توثیق کی گئی اور دیگر تجاویز کے علاوہ ایک تجویز اس مضمون کی پاس کی گئی۔

''فسخ نکاح کے مسودات قانون مرتبہ سید غلام بھیک صاحب نیرنگ و سید محمد احمد صاحب کاظمی و مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب و سید بدرالحسن صاحب بہاری پر علماء کی مشترک مجلس شوریٰ نے غور و بحث کر کے ایک ترمیم کردہ مسودہ تیار کرلیا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ مسلمان عورتوں کے ان ناقابل برداشت مصائب پر نظر کرتے ہوئے جن میں وہ مبتلا ہیں اور شرعی دارالقضاء نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کوئی صحیح حل مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس مسودۂ قانون کو منظور کرتا ہے اور مسلم ارکان اسمبلی سے توقع رکھتا ہے کہ وہ علماء کی مشترک مجلس شوریٰ اور جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا منظور کردہ مسودہ اسمبلی میں پاس کرانے کی متحدہ قوت سے سعی کریں گے۔

تجویز نمبر ۲: جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ اس معاہدے کو جو حکومت سعودیہ اور ایک انگلش کمپنی کے درمیان حجاز میں کان کنی کے متعلق ہوا ہے سخت خطرے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یوروپین طاقتوں کی استعماری پالیسی کے خطرناک نتائج اور تباہ کن اثرات جمعیۃ علماء کے سامنے ہیں۔ جن کی بناء پر جمعیۃ جزیرۃ العرب میں ان طاقتوں کے داخلہ کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو اطمینان کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ جزیرۃ العرب کا تقدس اور بالخصوص حجاز کی غیر مسلم اثرات سے حفاظت مسلمانان عالم کے نزدیک اہم ترین مسئلہ ہے اور اس کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ جمعیۃ حکومت عربیہ سعودیہ کی مالی حالت اور وسائل و ذرائع کی بہم رسانی کی اہمیت سے غافل نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ جزیرۃ العرب پر غیر مسلم اقتدار کے قیام کے تصور سے بھی لرزہ براندام ہے جمعیۃ کو یہ بھی یقین ہے کہ جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز بن فیصل السعود بھی دول یورپ کی استعماری ہوس سے خوب واقف ہیں اور یہ کہ جزیرۃ العرب کا تقدس اور ممالک عربیہ کی حفاظت بھی ان کے نزدیک عزیز ترین متاع ہے۔ باوجود اس کے وہ اپنی طرف سے اور مسلمانان ہند کی

طرف سے جلالۃ الملک کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ جزیرۃ العرب کی غیر مسلم اثر سے حفاظت ان تمام فوائد و منافع سے جو معاہدے کے ذریعے سے حاصل ہو سکتے ہیں زیادہ قیمتی اور زیادہ اہم واقدم ہے۔

۲۸ر فروری ۱۹۳۶ء: پنڈت جواہر لال نہرو کی اہلیہ شریمتی کملا نہرو کا جرمنی میں انتقال ہو گیا۔

۱۴ر مارچ ۱۹۳۶ء: مسجد شہید گنج کے قضیۂ نامرضیہ کے تصفیے کے لیے مسٹر محمد علی جناح لاہور تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اپنے قیام لاہور کے دوران مسلمان اور سکھ راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، وہ گورنر سے بھی ملے اور لاہور سے روانگی سے قبل انھوں نے اخبارات کو ایک بیان دیا ہے، جس میں کہا ہے:

''میں دیکھتا ہوں کہ صورت حالات میں ایک نمایاں تغیر رونما ہو گیا ہے۔ اور فضا سازگار ہو گئی ہے۔ سکھ اور مسلم قائدین کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جانبین ایک قابل قبول مفاہمت اور باعزت سمجھوتے کے دل سے خواہاں ہیں۔ دونوں جماعتوں کی خواہش ہے کہ پنجاب کے بہتر مفادات کے لیے ان کے درمیان یک جہتی اور محبت کا رشتہ استوار ہو جائے۔ اس سلسلے میں میرے سامنے متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس مسئلے کی نزاکت اس کی مشکلات سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ مذہبی جذبات بہت زیادہ بیدار ہو چکے ہیں۔ مختلف طریقوں اور متضاد تجویزوں پر غور و خوض کرنے کے لیے صرف پر امن فضا ہی نہیں چاہیے بلکہ اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ان تجاویز کا تجزیہ اور توازن اس انداز میں کیا جائے کہ دونوں جماعتیں اس آخری فیصلہ سے مطمئن ہو جائیں جو ان تجویزوں میں سے مرتب ہو۔ یہ مناقشہ افراد کا نہیں بلکہ اس کا تعلق دو عظیم المرتب جماعتوں سے ہے۔ اس لیے عوام سے استصواب رائے کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ چناں چہ اس تمام کام کو پوری طرح سرانجام دینے کے لیے بہتر سمجھا گیا ہے کہ مستقبل میں سعی و جہد کو جاری رکھا جائے اور ایک خوشگوار اور باعزت تصفیہ کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

انجمن مصالحت قضیۂ شہید گنج:

لہذا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس مہم کو سرانجام دینے کا بہترین طریقہ ایک مجلس صلح کی تشکیل ہے جس کا نام ''انجمن مصالحت قضیہ شہید گنج'' رکھا جائے۔ یہ مجلس مندرجۂ ذیل ارکان پر

مشتمل ہوگی۔ اور مجھے توقع ہے کہ یہ لوگ اس مقصد کے لیے اپنی اپنی جماعتوں کے قایدوں سے استصواب رائے کرنے کے بعد ایک ایسا متفقہ فارمولا پیش کریں گے جو جانبین کے لیے قابل قبول ہو۔ معاملہ پر کافی غور وخوض کرنے کے بعد میں انجمن مصالحت کی رکنیت کے لیے چند اصحاب کا نام پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں اور یہ لوگ ارکان کی تعداد میں اضافہ کرنے کے مجاز ہیں۔

ارکان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) ڈاکٹر محمد اقبال (۲) مولانا عبدالقادر قصوری (۳) میاں عبدالعزیز (۴) راجہ نریندر ناتھ (۵) پنڈت نانک چند (۶) سردار بہادر بوٹا سنگھ (۷) سردار اجل سنگھ (۸) سردار سمپورن سنگھ (۹) خان بہادر میاں احمد یار خاں دولتانہ اجلاس کے انعقاد کے مہتمم ہوں گے۔

میں نے مذکورۂ بالا اصحاب میں سے اکثر کے ساتھ گفتگو کی ہے اور انھوں نے اس عظیم الشان مہم کو سرانجام دینے کا بیڑا اٹھانے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے اور میں ان کے نیک عزائم کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آخر میں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ انھیں جب اور جس گھڑی میری ضرورت پڑے وہ میری خدمات سے استفادہ کر سکتے ہیں اور اس اثنا میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ پنجاب میں صلح و امن کی جو فضا پیدا ہو چکی ہے وہ بدستور قائم رہے گی۔''

گورنمنٹ پنجاب ایمرسن کا بیان:

اخبار زمیندار کی اسی اشاعت میں گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن کا ایک بیان بھی شائع ہوا ہے، اس میں مسٹر جناح کی مصالحتی کوششوں کی تعریف کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر جناح نے سکھوں کو یہ یقین بھی دلایا ہے کہ ان کے مفادات کو کوئی خطرہ نہیں پہنچے گا۔ گورنر کے الفاظ میں:

''مسٹر جناح نے سکھوں سے ملاقات پر انھیں یقین دلایا کہ باعزت سمجھوتے سے ان کے اقتدار کو کسی قسم کے نقصان پہنچنے کی جگہ ان کے کلاہِ افتخار کو چار چاند لگ جائیں گے۔''

گورنر کے بیان کا مکمل متن یہ ہے:

آج میں ان واقعات کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ جن سے پنجاب کی سرزمین لالہ زار بن گئی تھی۔ اور نہ میں اس کی ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ صرف اسی قدر کہنا مناسب ہے کہ کئی ماہ کے بعد فضا میں اب خوشگواری پیدا ہوئی ہے۔

اگر ذرا کوشش سے کام لیا گیا تو کتاب پنجاب کا یہ خونین باب بند ہوسکتا ہے۔

فضا میں اس سازگاری کے لیے ہم مسٹر محمد علی جناح کی سعی مشکور کے رہینِ منت ہیں۔ میں مسٹر جناح کے اس مستحسن کارنامہ کو اعماق قلب سے خراج تحسین ادا کرتا ہوں۔ مسٹر جناح کا کام دشواریوں سے گھرا ہوا تھا۔ خود اپنی قوم میں انھیں ایسی فضا پیدا کرنی تھی۔ جس سے وہ آئینی ذرائع اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ دوسری طرف سکھوں سے باعزت مفاہمت بھی آپ کی کوشش کا مطمح نظر تھا۔ سکھوں سے ملاقات پر مسٹر جناح نے انھیں یقین دلایا کہ باعزت سمجھوتے سے ان کے اقتدار کو کسی قسم کے ضعف پہنچنے کی جگہ ان کے کلاہِ افتخار کو چار چاند لگ جائیں گے۔ مسٹر جناح اپنے پہلے مشن میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے ہر طبقۂ خیال نے آپ کی نصیحت کو مان لیا ہے۔ جس سے حکومت پنجاب اس اقدام کے لیے آمادہ ہوگئی ہے۔ جس کے لیے وہ موقع کی منتظر تھی۔ اس سلسلے میں مسٹر جناح نے حکومت کے لیے بھی بہت بڑا کام کیا ہے آپ کے کام کا دوسرا حصہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ اس حقیقت کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں کہ مسٹر جناح کی مساعی ابھی لیلائے مقصد سے ہمکنار نہیں ہوئیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ناکام رہی ہیں گفتگوے مفاہمت کا سلسلہ جاری ہے اور پرامید طریق پر جاری ہے۔''

اس قضیے کی مصالحت کے لیے جو انجمن بنائی گئی تھی۔ اس کے نو ارکان میں سے چار نواب احمد یار خان دولتانہ (رجا) (۶ر اگست ۱۹۴۰ء)، نریندر ناتھ ۱۹۴۵ء، مولانا عبدالقادر قصوری (۶۱ر نومبر ۱۹۴۲ء) ور علامہ اقبال (۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء) انتقال فرمائے گئے، اس وقت تک اور اس کے بعد بھی اس کا کوئی اجلاس نہیں ہوا۔ مولانا مظہر علی اظہر (۴ر نومبر ۱۹۷۴ء) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مسٹر جناح نے اپنا چھٹکارا کرانے کے لیے ''انجمن مصالحت قضیۂ مسجد شہید گنج'' کی بنیاد ڈالی اور دوسروں کے سر بلا ڈال کر گھر کو روانہ ہوگئے۔ پھر نہ ان کو کبھی کسی نے بلایا کہ آ کر مسجد شہید گنج کی مفاہمت میں دخل دیجیے اور نہ خود انھوں نے اپنی انجمن مصالحت یا اس کے داعی سے دریافت کیا کہ آپ نے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں؟''

(مسٹر جناح اور تحریک مسجد شہید گنج از مولانا مظہر علی اظہر، ص ۱۳)

مولانا مظہر علی اظہر نے لکھا ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھی یہاں تک آمادہ تھے کہ مسجد کو شہید نہ کرایا جائے بلکہ اس کی مرمت کرادی جائے اور اسے ایک مقدس مقام کی طرح سکھ

اور مسلمان دونوں اپنی زیارت گاہ بنالیں مگر مولانا ظفر علی خان نے اس پیش کش کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ ایک سرکاری آفسر کہتا ہے کہ راضی نامہ نہ کرنا حکومت مسجد دلا دے گی۔ جس قوم کے لیڈر اپنی تمام سیاست وفراست کو ایک غیر ذمہ دار سرکاری افسر کے غیر محفوظ الفاظ کی موہوم امید پر بے دردی سے قربان کردیں وہ قوم کی کامیاب رہنمائی کب کر سکتے ہیں!

اگر مقصد مسجد کا تحفظ یا سکھوں سے راضی نامہ ہوتا تو ماسٹر تارا سنگھ کی ایک بات سے دونوں مقاصد حاصل ہوتے تھے اور ایک ننھی سے ہاں کی ضرورت تھی، پھر نہ گولی چلتی، نہ قتل ہوتے، نہ پھانسیاں لٹکتیں، نہ نظر بندیوں اور جیلوں تک نوبت آتی۔"

مولانا مظہر علی اظہر نے بہ تفصیل لکھا ہے کہ مسجد شہید گنج کا ڈراما محض احرار کو کچلنے اور انتخابات میں انھیں راستے سے ہٹانے کے لیے مسلم لیگ کے رہنماؤں اور گورنر پنجاب کی ملی بھگت سے رچایا گیا تھا۔ اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو اس مسئلے کو التوا میں ڈال دیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد آج (۲۰۰۲ء کے وسط) تک مسجد میں تالا پڑا ہوا ہے اور اسے مسلمانوں کو دار گذار نہیں کیا گیا۔

(تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے "مسٹر جناح اور تحریک مسجد شہید گنج از مولانا مظہر علی خاں اظہر، ناظم اعلیٰ مجلسِ احرارِ اسلام ہند" ناشر مکتبۂ احرار۔ لاہور، ۱۹۴۵ء)

سر وزیر حسن اور جناح صاحب کی تقاریر:

۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء: آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی میں جو سر وزیر حسن کی صدارت میں شروع ہوا، صدارتی تقریر کرتے ہوئے سر وزیر حسن نے کہا:

"ہر آزمائش میں تاج برطانیہ سے ہماری وفاداری مستحکم ثابت ہوئی ہے۔ یہاں تک ہماری وفاداری کو آتشیں آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ہماری مساجد اور مندر منہدم کر دیے گئے۔ اندھا دھند لاٹھیاں اور گولیاں چلائی گئیں۔ ہمارے رہنماؤں کو مقدمات چلائے بغیر جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔ تحریک آزادی میں ہمارے کارکنوں پر بے جا تشدد کیا گیا۔ بغیر کسی ثبوت کے نقل وحرکت پا پابندیاں عائد کی گئیں۔ تقریر وتحریر کی آزادی سلب کر لی گئی۔ اس طرح کثیر تعداد میں تشدد انہ قانون بنائے گئے اور آرڈیننس نافذ کیے گئے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے بیاض آئین کے حواشی پر تاج برطانیہ نے ہماری وفاداری کا ثبوت تحریر کرنے کے لیے کوئی گنجائش

نہیں رکھی۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۴/اپریل ۱۹۳۶ء)

اسی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح نے کہا:

"اس آئین کے پردے میں ہم سے دھوکا کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس دستور اساسی کے خلاف علم جہاد بلند کریں گے۔ اگر ہندو نے اس قومی جنگ میں مسلمان کا ساتھ دیا تو بہتر ورنہ مسلمان اکیلا ہی اس راہ پر گامزن ہوگا۔

کانگریس کو دیگر اقوام کی کوئی پروا نہیں لیکن مسلمانوں کا تعاون حاصل کیے بغیر کانگریس کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر کانگریس اپنی اس پالیسی کے پیش نظر چاہتی ہے کہ ملک میں برطانوی حکومت کو دوام حاصل ہو تو اسے یہ نظریہ مبارک ہو۔ مسلمان اپنا فرض ادا کریں گے۔"

(کاروان احرار، ج ۲ ص ۳۵۵)

حریت پسند جماعتوں سے مسٹر جناح کی ملاقاتیں:

۲۶/اپریل ۱۹۳۶ء: مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) کی دعوت پر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے قریباً سبھی رہنما ۲۶/اپریل کو امپریل ہوٹل دہلی میں ان سے ملے اور یہ ملاقاتیں ۲۸/اپریل تک جاری رہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے رہنما مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید مسلم لیگ کے صدر سے ملے۔ اسی شام احرار رہنما مولانا حبیب الرحمٰن اور چودھری افضل حق نے ان سے ملاقات کی۔ اس وقت سر فیروز خان نون قائد اعظم کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے طنزاً احرار رہنماؤں سے کہا "جناح صاحب کو کامیاب کرائیں۔" اس پر مسٹر جناح نے مولانا حبیب الرحمٰن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اگر آپ مسلم لیگ میں آجائیں تو میں ان سرکار پرستوں کو سزا دے سکتا ہوں۔" مولانا حبیب الرحمٰن نے فوراً کہا۔ "مسٹر جناح! آپ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوں گے اور جلد ہمارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔" سیاسیات میں کسی پر سولہ آنے یقین نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس سے پیشتر دوسری جماعتوں کے رہنما بھی ان سے مل چکے تھے۔ آئندہ الیکشن اور ملت اسلامیہ کی فلاح اس تمام گفتگو کا محور تھا۔

مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند مشروط طور پر مسٹر جناح کے ساتھ متفق ہو گئے۔ لیکن مولانا حبیب الرحمٰن نے مسلم لیگ کے مشترک محاذ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ تاہم لاہور آنے تک بات حتمی فیصلے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

اس کارروائی سے فارغ ہو کر قائداعظم ۲۹ر اپریل کو تیسری مرتبہ لاہور آئے۔ ان دنوں آپ نواب احمد یار خان دولتانہ کی کوٹھی پر ٹھہرے۔ اب کی بار شہید گنج کے لیے نہیں بلکہ انتخاب کے سلسلہ میں سر فضل حسین اور مجلس احرار سے مذاکرات ان کے پروگرام کا اہم جزو تھا۔

مسٹر محمد علی جناح کے سیاسی مستقبل کا انحصار صرف آزاد خیال مسلمانوں سے وابستہ تھا۔ لیکن رجعت پسند گروہ اور برطانوی ذرائع نے مسلم عوام میں انھیں ہندو کا زرخرید ظاہر کر کے اس قدر رسوا کر دیا تھا کہ جیسے ہی مسٹر جناح نے جمعیۃ علمائے ہند، مجلس احرار اور دیگر آزادی پسند مسلم جماعتوں سے تعاون کی راہیں ہموار کرنا چاہیں، چاروں طرف سے ٹوڈی مسلمان ان پر ٹوٹ پڑے۔ دوسری طرف نیشنلسٹ مسلمانوں نے کانگریس سے ناراض ہو کر مسٹر جناح سے اپنا ناتا جوڑنا چاہا تو کانگریس سمیت سارا ہندو پریس ان کے گلے پڑ گیا۔ چناں چہ اس لڑائی میں مسٹر جناح پر سب سے بڑا حملہ سر محمد یامین نے ایک پریس بیان کے ذریعے کیا:

مسٹر یامین، سر یعقوب اور دیگر کا ردعمل:

"۲۶ر۲۷ر اپریل (۱۹۳۶) کو مسٹر جناح نے خود غرض لوگوں کی باتوں میں آن کر چوں کہ وہ خود سوائے شہر بمبئی کے، دوسرے صوبوں کے اندرونی حالات سے واقف نہیں اور کئی سال انگلستان رہ کر ابھی ڈیڑھ سال ہوا کہ واپس آئے ہیں۔ اس لیے یوپی کے حالات سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ چند سازشی لوگوں کے اس لالچ میں آ گئے کہ اگر لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے گئے تو وہ ہندوستان کے سب سے زیادہ زوردار پولیٹیشن ہو جائیں گے۔

درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں، جن کا مسلمانوں میں کوئی اقتدار باقی نہیں ہے۔ اور ساری پبلک جانتی ہے کہ یہ کانگریس کے پٹھو اور کانگریس کے آلۂ کار ہیں اگرچہ بھیڑیے ہیں، لیکن بھیڑ کی کھال پہن کر پبلک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اور مسٹر جناح کی شخصیت اور لیگ کے نام سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اگرچہ سالہا سال سے لیگ کے مخالف رہے ہیں۔

مسٹر جناح نے ان کی باتوں میں آن کر یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک ہی

اصول پر تمام صوبوں میں لیگ الیکشن لڑے چوں کہ میں صوبائی اسمبلی سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور گذشتہ سال ہی کانگریسیوں کو شکست فاش دے چکا تھا۔ اس لیے میں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ مگر اس کو یو پی کے لیے سخت مضر سمجھا کہ اس سے مسلمان زمینداروں کی وزارت ختم ہو جائے گی اور لیگ کی وزارت کبھی نہ بنے گی۔"

(''نامۂ اعمال'' مصنفہ سر یامین، ص ۶۳۲-۶۳۱)

سر محمد یعقوب نے بھی ایک دہلی اجلاس کے سلسلے میں جناح صاحب پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا:

''جناح ان لوگوں کو ساتھ لے کر نکلنا چاہتے ہیں، جو ان سے رائے میں اتفاق نہیں کرتے۔ مثلاً مسلم لیگ کا نصب العین آئینی طریق پر درجہ نو آبادیات حاصل کرنا ہے۔ جب کہ احرار اور جمعیۃ مکمل آزادی کی دعویدار ہیں۔ ان حالات میں کون سا سول میرج مطلوب ہے، جو انھیں اور مسٹر جناح کو متحد کر سکتا ہے۔ مسٹر جناح خواب دیکھ رہے ہیں کہ ان کا پلان کامیاب ہوگا۔ حالانکہ اس خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ قبل از انتخاب ہی یہ عمارت دھڑام سے گر جائے۔''

(سہ روزہ ''الجمعیۃ دہلی'' یکم مئی ۱۹۳۶ء)

راجہ غضنفر علی نے بھی انھیں دنوں ایک نئی پارٹی کا اعلان کیا۔

ان دنوں دہلی اور پنجاب کے سیاسی حلقوں میں ایک افواہ عام تھی کہ راجہ غضنفر علی نے پنجاب میں نئی سیاسی جماعت بنائی ہے، جس کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے:

''پنجاب میں محض اقتصادیات کی بناء پر حکومت قائم نہیں ہو سکتی، جب تک اسے نیشنل لائنوں پر نہ چلایا جائے گا، اس کا چلنا ممکن نہیں۔ راجہ صاحب کی رائے میں سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک پارٹی ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اور یہی پارٹی پنجاب میں کامیاب حکومت کر سکتی ہے۔'' (روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ۲۸ر اپریل ۱۹۳۶ء)

یو۔پی کے زمیندار اور تعلقہ دار قسم کے لوگ پیشتر سے الگ ہو چکے ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی جناح صاحب سے ناراض تھا۔ سندھ کے وڈیرے اپنا ڈیرہ الگ بنائے بیٹھے تھے۔ پنجاب میں سر فضل حسین جناح صاحب کے قدم جمنے نہیں دینا چاہتے تھے، اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں مجلس احرار کے رہنماؤں نے قائداعظم کا پنجاب میں استقبال کیا۔

(کاروان احرار، ج ۲، ص ۶۷-۳۶۰)

لیگ کا جلسہ اور زعمائے جمعیت کی شرکت:

۲۶ر اپریل ۱۹۳۶ء: مسٹر محمد علی کی صدارت میں مسلم لیگ کا دہلی میں جلسہ ہوا۔ جس میں مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید جمعیۃ علمائے ہند کے صدر اور ناظم کے علاوہ مولانا سید حسین احمد مدنی نے شرکت فرمائی۔ اور مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ، کی رکنیت قبول فرمائی۔

۱۵ر مئی ۱۹۳۶ء: ۱۵ر مئی کو آل انڈیا کانگریس کے سرگرم رکن جنگ آزادی کے ناقابل فراموش مجاہد، وطن کے پرخلوص و بے لوث رہنما جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا ریل کے سفر میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ انا للہ......

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۶۰)

نوابزادہ لیاقت علی خاں کی علاحدگی:

۱۷ر مئی ۳۶ء: یوپی ایگریکلچر پارٹی کا قیام ہوتے ہی ۱۷ر مئی کے تمام اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مسٹر لیاقت علی خاں جنھیں ۲۶ر اپریل کو دہلی اجلاس میں مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح کی موجودہ پالیسی کے خلاف ان سے الگ ہو کر ایگریکلچر پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ پارٹی یوپی میں اپنے ٹکٹ پر کانگریس کا مقابلہ کرے گی۔ اس جماعت کی شاخیں یوپی میں قائم کی جا رہی ہیں۔

نواب چھتاری، سر محمد یعقوب، نوابزادہ لیاقت علی خاں، سر شفاعت احمد اور سر محمد یوسف اس جماعت کے خصوصی رہنما ہیں۔ (کاروان احرار، ج ۲، ص ۳۷۹)

۲۶ر مئی ۱۹۳۶ء: روزنامہ انقلاب لاہور کی ۲۶ر مئی کی اشاعت میں ایک اداریہ شائع ہوا ہے۔ جس میں ایڈیٹر نے پنجاب میں مسلم لیگ پارلیمنٹری کے ارکان کے انتخاب کے سلسلے میں مسٹر محمد علی جناح کی مساعی پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے چند اقتباس یہ ہیں:

''مسٹر جناح جب لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی اسکیم لے کر پنجاب آئے، تو ہمارا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کے اہم مقاصد ملی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتحاد بین المسلمین کا وہ مفہوم سامنے رکھیں گے جو بعض دوسرے احباب لیتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تشریف آوری سے قبل یا ان کے قیام لاہور کے درمیان ان کی مساعی کے خلاف ایک حرف بھی نہ لکھا۔ لیکن جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ مسٹر جناح بھی صرف چند عناصر کے اتحاد کو اتحاد بین المسلمین قرار دے رہے ہیں تو پھر ہمیں رنج

دقلق کے ساتھ ان کی مساعی کو تفرقہ انگیز قرار دینا پڑا۔......"

"پنجاب کے متعلق مسٹر جناح کے تجویز کردہ ارکان بورڈ کی فہرست سامنے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اتحاد مسلمان نہیں، بلکہ تفرقہ بین المسلمین کو تقویت پہنچانے اور مضبوط و مستحکم بنانے کی ایک افسوسناک صورت ہے۔...... غرض صاف ظاہر ہے کہ مسٹر جناح نے پنجاب میں جو پارٹی بنائی ہے یا بنانے کی سعی فرمائی ہے وہ اتحاد بین المسلمین کی اساس پر مبنی نہیں ہے۔"

۳۰ رمئی کے روزنامہ انقلاب میں پنجاب کے ان ارکان کی شخصیت اور افکار و سیرت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ثابت یہ کرنا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ انتخاب کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ جانباز مرزا کے بہ قول "ارکان بورڈ کے ایک ایک ممبر کا نام لے کر ان میں کیڑے نکالے ہیں۔" (کاروان احرار، جلد دوم، ص ۸۲-۳۸۱)

مسلم یونٹی بورڈ کی حمایت:

۲۷ رمئی ۱۹۳۶ء: جمعیت علمائے ہند کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ اور مجلس احرار اسلام ہند کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مسلم یونٹی بورڈ کے ارکان نے ایک مشترکہ اعلان میں کہا ہے کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کے مرتب کردہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

مسٹر جناح کی پالیسی سے اختلاف:

مئی ۱۹۳۶ء: مولانا ظفر علی خاں کی جماعت "اتحاد ملت" چوں کہ سر فضل حسین کی رہنمائی میں شہید گنج کا ڈرامہ کھیل چکی تھی۔ ہنوز اس ڈرامے کے کچھ پلاٹ باقی تھی۔ اس لیے وہ باوجود تمام کوششوں کے مسٹر محمد علی جناح سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اور حسب ذیل بیان دے کر مسلم پارلیمنٹری بورڈ سے الگ ہو گئے۔

"چوں کہ مسٹر جناح مکمل آزادی کے حامی نہیں ہیں اور "اتحاد ملت" مکمل آزادی کی حامی ہے، بنابریں ہم مسٹر جناح کا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

اس سے پیشتر ۶ رمئی کو سر محمد یامین نے میرٹھ سے ایک پریس بیان میں محمد علی جناح کی موجودہ پالیسی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

"یہ پالیسی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمام مسلمان ایک ہی ٹکٹ پر انتخاب لڑیں اور کونسل میں

جا کر کسی ہندو پارٹی سے گفت و شنید کر کے نئی اصلاحات میں ترمیم کرائی جائے اور وہاں نیک نیتی سے ملت اور ملک کے مفاد کے لیے کام کیا جائے۔

مسٹر جناح کی یہ پالیسی مجھے پسند نہیں۔ کیوں کہ جہاں تک یو پی کا تعلق ہے مجھے اس امر کی اچھی طرح واقفیت ہے کہ یہاں کے مسلمان اور ہندو سیکڑوں سالوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض دفعہ ان میں کشیدگی ہوتی ہے۔ لیکن جناح کی مروجہ اسکیم پر عمل کرنے سے وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے ایسے لوگ مسٹر جناح کو گمراہ کر رہے ہیں۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور، ۸ رمئی ۱۹۳۶ء)

۱۱ رمئی: الٰہ آباد سے سر شفاعت احمد نے کہا: "مجھے مسٹر جناح کی کامیابی مشکوک نظر آتی ہے اور میں اس امر کا سخت مخالف ہوں کہ مجلس آئین ساز میں فرقہ وارانہ اصول کے تحت پارٹیاں تشکیل کی جائیں۔ اگر مسٹر جناح کی پالیسی ہی کو مان لیا جائے تو یہ امر ملک کے عام فساد اور فرقہ وارانہ امور کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہوگا۔

صوبجاتی آئین سازی میں میرے ذاتی تجربات واضح کر رہے ہیں کہ ایسی پارٹیوں کی تشکیل دوسرے مذاہب کے لیے زبردست ہیجان کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم ارکان کے حقوق کے بارے میں اتحاد و اتفاق کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے، مگر جس حد تک اقتصادی اور معاشرتی اسکیم کا تعلق ہے۔ مسلم ممبروں کو اپنی ہم خیال پارٹیوں میں شامل ہونے سے نہیں روکنا چاہیے۔

مجھے امید نہیں کہ کوئی صوبہ بھی مسٹر جناح کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے پر آمادگی ظاہر کرے گا۔" (کاروانِ احرار، ج ۲، ص ۸-۲۷۶)

شریعت بل صوبہ سرحد۔۔۔ چند احکام و مسائل:

یکم جون ۱۹۳۶ء: صوبہ سرحد میں شریعت بل مشتہر کیا گیا تا کہ عام مسلمان اس کے بارے میں اظہار رائے کر سکیں، اس میں حکومت نے بعض مسائل میں اسلامی شریعت کے مطابق مسلمانوں کو عمل کرنے کی سہولت بہم پہنچائی تھی لیکن وہ شریعت بل کی بعض دفعات کو منظور کرنے کو تیار نہ تھی۔ اس پر بعض خوانین نے گورنمنٹ کو یہ درخواست دی کہ اگر مکمل طور پر شریعت بل کو منظور

اور مسلمانوں پر اس کا نفاذ کیا جائے تو ہم اسے منظور کریں گے ورنہ ہم محض چند دفعات میں حکومت کی رعایت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ حضرت مفتی کفایت اللہ نے اسے کفر وجہل قرار دیا۔ صورتیں دو ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ شریعت کے احکام پر عمل کرنے کا اختیار مسلمانوں کو حاصل ہو۔ اس صورت میں شریعت کے ایک ایک حکم اور اس کے چھوٹے سے چھوٹے جز پر عمل کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا اور اس کے کسی چھوٹے سے جز کا ترک بھی موجب فسق وکفر ہوگا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو عمل کا اختیار حکومت متسلطہ کی اصلاحات پر مبنی ہو۔ اس صورت میں جہاں تک اجازت ہوگی وہاں تک فرض ہوگا اور اس میں سے کسی جز کا ترک فسق وکفر پر منتج ہوسکتا ہے۔ جن امور میں گورنمنٹ شریعت کے مطابق عمل کرنے کی اجازت نہ دے۔ ان میں وہ مجبور ہوگا البتہ اجازت میں وسعت کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

یہ فتویٰ قاضی محمد جان (ڈیرہ اسماعیل خان) نے پوچھا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا جواب نہایت مدبرانہ اور حکیمانہ ہے ملاحظہ ہو:

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت کرے اور شریعت کے سامنے گردن جھکادے۔ اور اپنے اختیار اور ارادے سے کسی ادنی سے ادنی حکم میں سرتابی نہ کرے۔ تنفیذ احکام شریعت اسلامی سلطنت کے فرائض میں سے ہے۔ اور سلطنت ہی اس پر قادر ہوسکتی ہے۔ اگرچہ مسلم مخلص کے لیے کسی منفذ کی حاجت نہ ہونی چاہیے۔ اس کی سعادت اسی میں ہے کہ بغیر کسی جبر وقوت کے خود ہی تسلیم وانقیاد کا راستہ اختیار کرے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بدقسمتی سے ان پر ایک حکومت غیر مسلمہ مسلط ہے اور اسے تنفیذ احکام شریعت سے مطلقاً کوئی غرض نہیں۔ لیکن اس کا وعدہ یہ ہے کہ وہ رعایا کے کسی فرقہ کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی۔ اور افراد رعایا میں سے ہر فرد کو اپنے اپنے مذہب کے موافق عمل کرنے سے نہیں روکے گی۔ اس لیے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کے موافق عمل کرنے کی کوشش کریں جن مسائل میں کہ حکومت مانع نہ ہو ان میں تو کوئی عذر باقی نہیں رہتا اور جن احکام میں حکومت مانع آئے ان میں اس وقت تک وہ مجبور ومعذور ہوں گے جب تک کہ حکومت کو رفع ممانعت پر آمادہ نہ کرلیں اور اس کی سعی ان پر لازم ہوگی پس بحالت موجودہ اگر حکومت مسلطہ سیاسیات اور فوجداری مقدمات میں مسلمانوں کو یہ آزادی نہیں دیتی کہ وہ اسلامی احکام کے مطابق عمل کریں تو

اس میں تو ایک درجہ تک مسلمان معذور ہو سکتے ہیں لیکن جن مقدمات میں وہ مسلمانوں کو مذہب کے موافق عمل کرنے میں آزادی دیتی ہے یا دے سکتی ہے، ان میں مسلمانوں کے لیے کوئی عذر نہیں کہ وہ اسلامی احکام سے سرتابی کر کے مشرکانہ اور کفریہ رسوم ورواج کے پابند رہیں۔ اگر ایسا کریں گے تو گویا اپنے ارادہ واختیار سے وہ آسمانی اور الٰہی شریعت کو چھوڑ کر طاغوت وشیطان کے متبع ہوں گے۔ اور اس صورت میں ان پر کفر کے احکام جاری ہوں گے۔ یہ درخواست یقیناً اسلامی احکام کے ماتحت موجب کفر ہے۔ اگر ایک مسئلے میں بھی حکومت مسلطہ مسلمانوں کو اسلامی شریعت کے مطابق عمل کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہو یا پہنچانے کو تیار ہو اور مسلمان اپنے ارادہ واختیار سے اس سے سرتابی کریں تو وہ یقیناً دائرہ اسلام سے خارج ہو کر حزب الشیطان میں داخل ہو جائیں گے اور یہ کفر بھی کفر عناد وجحود ہوگا۔ اعاذنا اللہ منہ۔ یہ عذر کہ تمام احکام میں شریعت ملے تو لیں گے ورنہ نہیں، مہمل ہے اور ناقابل اعتبار۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جن احکام میں مسلمان مجبوری کی وجہ سے شریعت پر عمل نہیں کر سکتے ان کی وجہ سے وہ ان احکام کو بھی چھوڑ بیٹھیں جن پر عمل کرنے میں وہ قانوناً آزاد ہیں اور یہ صریح جہالت ہے۔ کیا اس وجہ سے کہ ہندوستانی مسلمان سیاسی اور فوجداری معاملات میں مجبور ہیں۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ کو چھوڑ سکتے ہیں اور یہ عذر کر سکتے ہیں کہ جب ہم کو سازی شریعت نہیں ملی تو ہم جزوی شریعت بھی اختیار نہیں کرتے؟

الحاصل یہ درخواست شریعت سے بھاگنے اور رواج پر قائم رہنے کا ایک حیلہ ہے اور حیلہ بھی ایسا جس کا بطلان آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ اس کے مرتکب فاسق تو یقیناً ہیں اور ان کے اسلام میں بھی خطرہ شدید لاحق ہے ان کو فوراً اس سے توبہ کرنی چاہیے اور خدا اور رسول کے دین کے سامنے سر اطاعت جھکا دینا چاہیے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

یہ جواب پانے کے بعد قاضی محمد جان نے جواب سے پیدا شدہ ذیل کے سوالات کے جوابات کے لیے درخواست کی تھی:

(۱) اہل درخواست پر شرعاً حکم کفر یا فسق عائد ہو سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) علماء فریق اول جو کہ منکرین شریعت بل کو صحیح وصواب کہتے ہیں شرعاً کس درجہ کے مجرم ہیں؟

(۳) علمائے معاون شریعت بل جو کہ فریق دوم ہیں۔ حکم لگاتے ہیں کہ علماء فریق اول کے پیچھے اقتدائے نماز خمسہ و نماز جنازہ ہرگز جائز نہیں۔ یہ حکم شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ جواب دیا:

(۱) درخواست کا مضمون اور درخواست دہندوں کا یہ فعل تو بے شک کافرانہ ہے لیکن افراد اور اشخاص کی شخصی تکفیر کرنے میں احتیاط لازم ہے۔ کیوں کہ شخصی طور پر کوئی ایسی تاویل جو کفر سے بچالے ممکن ہے۔

(۲) یہ ان کی غلطی ہے اور ان کی رائے نا قابل قبول ہے۔

(۳) یہ حکم لگانا کہ درخواست دہندگان اور علمائے فریق اول سب مرتد ہو گئے اور ان کی امامت ناجائز ہے، تشدد ہے اور خلاف احتیاط ہے۔

کسی عمل کو عموماً کفر کا عمل بتانا اور بات ہے اور اس کے مرتکب کو شخصی طور پر کافر قرار دینا اور بات ہے۔ شخصی طور پر احتمال تاویل قائم ہو کر کفر سے بچا سکتا ہے۔ اور احوط یہی ہے کہ تکفیر نہ کی جائے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،

محمد علی جناح اور مسلم پارلیمنٹری رپورٹ:

۸ / جون ۱۹۳۶ء: ۸ / جون کو مسٹر محمد علی جناح نے مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا جو اعلان کیا تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے پریس بیان میں کہا:

''میں نہایت مخلصانہ طریق پر مسلمانان ہند سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر لیگ کے امیدواروں کے علاوہ کسی کو ووٹ نہ دیں۔ کیوں کہ مسلم لیگ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی دولت سے مالا مال کرے اور انھیں صوبجاتی ساز باز کرنے والی جماعتوں میں منقسم نہ ہونے دے۔''

مسلم لیگ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا:

۱۔ مسلمانان ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی اور دوسرے حقوق کی حفاظت کے لیے کوشش کرنا۔

۲۔ ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوستان کی دوسری اقوام میں دوستانہ روابط کا قیام۔

۳۔ ہندوستانی مسلمانوں اور دنیا کے ممالک کے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا قیام اور ان

کے باہمی تعلقات کے استحکام کی کوشش۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے مندوبین کونسلوں میں جا کر دستور اساسی سے وسیع استفادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ جس طرح ہو سکے قومی زندگی کی حالت کو سدھارنے اور عوام الناس کی ترقی کے لیے کوشش کی جائے۔

مسلم لیگ پارٹی کو جداگانہ انتخاب کے اصول پر قائم ہونا چاہیے۔ مگر یہ پارٹی کونسلوں میں جا کر ایسی پارٹی سے تعاون کر سکے گی، جس کے اغراض و مقاصد لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے مفاد سے مشابہت رکھتے ہوں۔

لہٰذا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ مسلمانوں سے ملتمس ہے کہ اقتصادی اور دوسرے اہم معاملات کے بارے میں دوسروں کا راستہ نہ روکیں۔ اتحاد و اتفاق کے اصول پر کاربند ہیں۔''

مسٹر محمد علی جناح کے اس اعلان کے خلاف روز نامہ ''انقلاب'' نے ۱۳/۱۶/اور ۱۹/جون کے شماروں میں پارلیمنٹری بورڈ کے خلاف مسلسل اداریے لکھے اور ۳۰/جون کے اداریے میں لکھا کہ۔

''مسٹر جناح اور اس کا پارلیمنٹری بورڈ ہند اور مسلمانوں کی پوزیشن کمزور کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔'' (کاروان احرار: ج ۲ص ۱۰۱۔۴۰۰)

ووٹ کا حق دار:

۱۴/جولائی ۱۹۳۶ء: ایک صاحب کے استفتیٰ کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

''اگر مسلمانوں کے ووٹ سے کسی سیاسی مجلس کا انتخاب کیا جائے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ امور سیاسیہ میں جو شخص ماہر اور مسلمانوں کا خیر خواہ اور ان کے حقوق کی حفاظت کا اہل ہو اس کو ووٹ دیں۔ ان اوصاف کے ساتھ اگر شریعت کا بھی پابند اور نیک صالح ہو تو وہی مستحق ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی''

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

سیٹھ عبداللہ۔ جناح اختلاف:

۱۸/جولائی ۱۹۳۶ء: ۱۸/جولائی کو شملہ سے اطلاع آتی ہے کہ سیٹھ عبداللہ ہارون جو اسمبلی

میں مسٹر جناح کے انڈیپنڈنٹ لیڈر تھے، مسٹر جناح کی موجودہ پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے مستعفی ہو گئے ہیں۔ (کاروان احرار: جلد۲، ص۴۰۵)

میثاق منترے (۱۹۳۶ء):

۲۰ر جولائی ۱۹۳۶ء: اس میثاق پر جو ترکی کی باسفورس اور درۂ دانیال کی آبنایوں میں جہاز رانی سے متعلق ہے، ۲۰ر جولائی ۱۹۳۶ء کو دستخط ہوئے اور اس نے ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کے اپنے پیشرو میثاق کو جو معادہ لوزان کا ایک ضمیمہ تھا، کالعدم کر دیا۔ ۱۹۲۳ء کا میثاق ان آبنایوں پر ترکی کی حاکمیت وسیادت کے منافی اور اس کے قومی مفادات کے خلاف تھا۔ اس نے باسفورس بحیرۂ مرمرہ اور بحیرۂ ایجین کے بعض جزائر کو غیر فوجی منطقہ قرار دیا تھا اور ان آبنایوں کی نگرانی کے لیے ایک "آبنائے کمیشن" تشکیل کرنے کی تجویز رکھی جو جمعیت اقوام کے سامنے ذمہ دار ہو اور ان آبنایوں میں جہاز رانی کی آزادی اور غیر فوجی منطقہ کے تحفظ کی بین الاقوامی ضمانت دے۔ لیکن میثاق منترے نے ترکی کو اپنی آبنایوں کو از سر نو مسلح کرنے اور وہاں فوج رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ساحلی ملکوں کے سوا دوسرے تمام ملکوں کے جنگی جہازوں کی انتہائی تعداد مقرر کر دی گئی۔ جنگ کے زمانے میں کسی بھی غیر ساحلی طاقت کا کوئی بڑا بحری بیڑا ترکی کی دعوت کے بغیر بحر اسود میں نہیں داخل ہو سکتا۔ (فرہنگِ سیاسیات، ص۴۱۹)

لیگ پارلیمانی بورڈ میں اختلاف:

۵ر اگست ۱۹۳۶ء: ۴ر اگست کو لکھنو میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا اجلاس راجہ سلیم پور کی صدارت میں سلیم پور ہاؤس میں ہوا۔ جس میں راجہ محمود آباد، مولانا شوکت علی، نواب اسماعیل خاں اور نوابزادہ لیاقت علی خاں نے خاص طور پر شمولیت کی۔ اجلاس کے شروع میں نوابزادہ لیاقت علی خاں رکن نیشنل ایگریکلچر پارٹی، اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔

یہ مظاہرہ انھوں نے مسٹر جناح کی موجودہ پالیسی کے خلاف بطور احتجاج کیا۔ کیوں کہ اس اجلاس میں فیصلہ ہونے والا تھا کہ ۱۵/۱۶ر اگست کو صوبہ بھر کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجلاس بلایا جائے اور اس اجلاس کے افتتاح کے لیے مسٹر محمد علی جناح کو دعوت دی جائے۔

بورڈ میں اس فیصلے پر سخت اختلاف پایا گیا۔ اس اجلاس میں یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ راجہ

سلیم پور اور راجہ محمود آباد نے نیشنل ایگریکلچر پارٹی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

(یونائیٹڈ پریس ۵/اگست ۱۹۳۶ء بحوالہ کاروان احرار: ج ۴، ص ۴۱۶)

۷/اگست ۱۹۳۶ء: ۷/اگست کو نوابزادہ لیاقت علی خاں نے حسب ذیل بیان کے ذریعے مسلم لیگ کے منتخب پارلیمنٹری بورڈ سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔

''مسٹر جناح نے پارلیمنٹری بورڈ میں صرف ایک خیال کے لوگوں کو کثرت سے بھر دیا ہے، جن کا کوئی وقار قوم میں نہیں ہے اور ان لوگوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں۔ اور انتخاب میں الیکشن کے ذریعے آئے ہیں۔

میرا ایسے بورڈ میں ہونا فضول ہے، جس میں اکثریت اس ایک پارٹی کے ممبران کی ہو، جو عرصۂ دراز سے مسلمانوں سے دور ہیں۔ اور اپنے اپنے پٹھوؤں کو لیگ کا ٹکٹ دلوا کر مسلمانوں میں راخنہ ڈلنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں طے کر کے ایک ساتھ ووٹ دیتے ہیں۔ اس لیے میرا اس بورڈ کا ممبر ہونا بیکار ہے میں اس میں شریک نہیں رہ سکتا۔ اور اس کو ملک وملت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں استعفیٰ دیتا ہوں۔'' (''نامۂ اعمال'' حصہ اول، ص ۸۴۔۶۸۳)

۱۳/اگست ۱۹۳۶ء: تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلے میں منتخب امیر پیر جماعت علی شاہ کے حج پر چلے جانے کے بعد ماہ رواں کے پہلے ہفتے میں شاہی مسجد لاہور میں ایک جلسے کے دوران مسٹر عزیز ہندی نے امیر ملت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا نام تجویز کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا آزاد نے عزیز ہندی کے نام حسب ذیل مراسلہ ارسال کیا:

''لاہور کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ بعض حضرات نے ایک جلسہ میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ کوئی امیر منتخب کرنا چاہیے، اور اس کے لیے میرا نام پیش کیا گیا ہے۔ میں ان صاحبوں کا شکر گزار ہوں لیکن انھیں بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرح مسائل حل نہیں کیے جاسکتے۔ البتہ ایک بات ضرور کی جاسکتی ہے، یعنی ان کی ہنسی آڑائی جاسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حضرات کو اس کا خواہش مند نہیں ہونا چاہیے۔

ان صاحبوں کو شاید معلوم نہیں کہ میں اب سے پندرہ برس پہلے نہ صرف اس پر غور وفکر کر چکا ہوں، بلکہ بطور ایک انتہائی تجربے کے ایک صوبے میں اسے قائم بھی کر چکا ہوں۔ بایں ہمہ ۱۹۲۳ء میں مجھے یہی رائے قائم کرنا پڑی کہ موجودہ حالات میں اس طرح کے کسی نظام کی مزید سعی سودمند نہ ہوگی۔

بہر حال اگر میری رائے سے انھیں اتفاق نہ ہو تو ایک بات انھیں یاد رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ اس سلسلے میں میرا نام نہ تجویز کیا جائے۔

(ابوالکلام آزاد کلکتہ۔ ۱۳ر اگست ۱۹۳۶ء)

(کاروان احرار: ج ۴، ص ۲۱۔ ۴۲۰)

۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء: صوبہ سرحد کے ایک صاحب اکرام خان کے انجمن سازی کے سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

''مسلمانوں کو شرعی اور معاشرتی اور اصلاحی ضرورتوں کو رفع کرنے کے لیے انجمن بنانا اور اس میں مل کر خلوص کے ساتھ کام کرنا بہت اچھی بات ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی''

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

روپیہ لے کر ووٹ دینا:

۲۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء: پیسے لے کر ووٹ دینے کے بارے میں کرنال کے رفیق احمد خاں و رشید احمد خاں کے ایک استفسار کے جواب میں حضرت مفتی صاحب کا جواب ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''ہندوستان کی حالت بہت نازک ہے۔ انتخاب کا معاملہ بہت سخت ذمہ داری کا ہے اور رائے دینے والوں پر فرض ہے کہ وہ اس شخص کو رائے دیں جو نیک اور سمجھ دار اور ملک وقوم کا خیر خواہ ہو۔ روپیہ لے کر غیر مستحق کو رائے دینا حرام اور ملک وقوم کی خیانت وغداری ہے۔ اور مستحق کو پیسہ لے کر رائے دینا رشوت ہے۔ اگر مستحق کو رائے دینے والا خود پیسہ نہ مانگے اور وہ خود دے دے تو خیر مباح ہوسکتا ہے۔ لیکن غیر مستحق کو رائے دینا کسی طرح بھی حلال نہیں۔

کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی۔''

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

سر فضل حسین کے جانشین۔۔۔ سر سکندر حیات خاں:

۴ر اکتوبر ۱۹۳۶ء: ۴ر اکتوبر کو نواب ممدوٹ کی قیام گاہ پر سر سکندر حیات کی صدارت میں یونینسٹ پارٹی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں خان بہادر حبیب اللہ، ملک فتح خان، خان بہادر

مشتاق احمد گورمانی، چودھری ریاست علی، رائے بہادر چھوٹو رام نے شرکت کی۔ میاں سر فضل حسین کے انتقال کے بعد ضرورت تھی کوئی شخص یونینسٹ پارٹی کی صدارت اور پنجاب کی حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لے سر سکندر حیات اس سے قبل بنکوں کے ڈپٹی گورنر تھے اور ایک بیش قیمت تنخواہ پاتے تھے۔ اجلاس میں ان کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انھوں نے قومی خدمت اور صوبے اور پارٹی کی رہنمائی کے لیے بنکوں کی ڈپٹی گورنری چھوڑ کر بہت بڑا ایثار کیا ہے۔

(کاروان احرار: جلد۲، صفحہ ۴۲۵)

پنجاب میں انتخابی کشمکش کا آغاز:

۱۲؍اکتوبر ۱۹۳۶ء: مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے آنے والے الیکشن کے لیے پروپیگنڈے کا آغاز کر دیا ہے۔ انھوں نے لاہور میں ایک تقریر میں ان چھ مقاصد کا اعلان کیا ہے:

۱۔ ہم کونسلوں اور اسمبلیوں کے اندر غیر فرقہ وارانہ پارٹیاں بنانے کے لیے تیار ہیں۔

۲۔ پنجاب کا پریس دیدہ و دانستہ بورڈ کے مقاصد کو غلط طریق پر پیش کر رہا ہے۔ کہ لیگ فرقہ وارانہ پارٹی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، یونینسٹ پارٹی میں کئی ہندو ممبر ہیں۔ کیا وہ فرقہ وارانہ پارٹی ہے؟

۳۔ پنجاب کا حال تو یہ ہے کہ یہاں وزارت پہلے ہی سے بن چکی ہے۔ میں اس وزارت کو توڑنا چاہتا ہوں۔

۴۔ پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ پھر میں انھیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ دوسرے فرقوں سے ناانصافی کریں۔

۵۔ اگر سر سکندر حیات غیر ذمہ دارانہ پارٹی بنانا چاہتے تھے تو کیوں انھوں نے آج سے پہلے ریزرو بنک کی ممبری سے استعفیٰ نہ دیا؟

۶۔ میں ایسا آئین تیار کرانا چاہتا ہوں جو آزادی ملک کے لیے ہندوؤں سے تعاون کرے۔

(روزنامہ ''انقلاب'' لاہور۔ ۱۵؍اکتوبر ۱۹۳۶ء)

ایڈیٹر انقلاب لاہور نے اگلے روز ان مقاصد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''لیگ بورڈ اور مسٹر جناح کے ارشادات مسلمانوں کی تنظیم کی بجائے تفرقہ انگیز ہیں۔''

(ایضاً ۱۶؍اکتوبر ۱۹۳۶ء)

ایک روز کے بعد پھر اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایڈیٹر انقلاب نے لکھا:

مسٹر جناح کی لاہور والی تقریر کے متعلق جو ہم اپنی گزشتہ اشاعتوں میں عرض کر چکے ہیں اور قارئین ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔

''انھوں (مسٹر جناح) نے صوبے کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں سے ترقی خواہ عناصر کو متنبہ کیا ہے کہ پنجاب میں ایک ایسی وزارت بن چکی ہے جو گورنر کی تجویز پر بنائی گئی ہے۔ سب کو چاہیے کہ اس کے مقابل اپنی مرضی کی وزارت قائم کریں۔ نیز کہا کہ اتحاد اسی اسکیم کا پہلا مرحلہ ہے۔'' (ایضاً ۱۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء)

یو پی کی صورت حال:

۲۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء: پنجاب ہی کی طرح یو پی لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں بھی ردوبدل جاری تھا۔ نواب چھتاری، سر محمد یوسف، نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مرکزی بورڈ سے مستعفی ہو کر نیشنل ایگری کلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر یو پی سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ پارٹی پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا ثنیٰ اور ہم زاد تھی۔

(مولانا حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری بہ حوالہ سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور۔ ۲۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء)

جناح فضل الحق کشمکش

۲۹/اکتوبر ۱۹۳۶ء: ۲۹/اکتوبر کو مسٹر محمد علی جناح نے، مسٹر فضل الحق سے جو کلکتہ کارپوریشن کے میئر اور بنگال کے مزارعوں کے صدر بھی تھے، ایک خط کے ذریعے یہ دریافت کیا ہے کہ انھوں نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے غداری کیوں کی؟ اس کے جواب میں فضل الحق نے کہا، کہ

''مسٹر جناح مزارعین کے حامی اور سرمایہ داروں کے شدید مخالف تھے، مگر جس وقت سے آپ نے گورنمنٹ ہاؤس میں وزیروں کی پارٹی سے ملاقات کی ہے۔ آپ کے حالات میں دفعتاً انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ یہی انقلاب ہے، جو مزارعین کے مفاد کو زخمی کرتا ہے۔''

آگے چل کر مسٹر فضل الحق نے مسٹر جناح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''آپ کا اپنا طریق کار مسلمانوں کا اعتماد کھو چکا ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں کی

خواہشات کو آپ مسخ کر رہے ہیں۔ لیکن پارلیمنٹری بورڈ آپ کی ہوس کا تیار کردہ ہے۔ اور وہ مسلم طبقات میں گہری خلیج حائل کر رہا ہے۔ آپ کی پرائیوٹ گفت وشنید سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے اتحاد کے سب سے بڑے علم بردار ہیں اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے بہت زیادہ مصروف عمل ہیں۔ مگر جس وقت آپ پبلک پلیٹ فارم پر کھڑے ہوتے ہیں، آپ اپنے آپ کو ہندوستانی وطن پرستی کے سخت پیرو کار ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کے سوا کچھ بھی بھلا معلوم نہیں ہوتا۔

(روزنامہ ''انقلاب'' ۳۱/اکتوبر ۱۹۳۶ء بہ حوالہ کاروان احرار: جلد۲، ص ۴۵۵)

جناح اور سیاست:

۴/نومبر ۱۹۳۶ء: روزنامہ نوائے وقت۔ لاہور مورخہ ۴/نومبر ۱۹۳۶ء میں '' جناح اور سیاست'' کے عنوان سے نواب زادہ خورشید علی خان سیکرٹری اتحاد پارٹی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کے چند اقتباسات بہ حوالہ کاروان احرار مولفہ جانباز مرزا درج کیے جاتے ہیں:

(۱) '' بمبئی مسٹر جناح کا وطن ہے۔ حال ہی میں جو فرقہ وارانہ فسادات وہاں رونما ہوئے وہ مسٹر جناح کی عام حیثیت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے۔ جن کے پروان چڑھانے کے لیے وہ چند ماہ سے کوشاں ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات روز بروز زیادہ ہو رہے ہیں اور نہایت شرمناک صورت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ مسٹر جناح کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ان کا سیاسی پرچار ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان حائل خلیج کو روز بہ روز وسیع تر کیے جارہا ہے۔ اس بھیانک صورت حال پر قابو پانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ مختلف صوبوں کی غیر فرقہ وار پارٹیوں کو مضبوط بنایا جائے''۔

(۲) '' اپنے نام نہاد پارلیمنٹری بورڈ کو منظم کرنے کی غرض سے گزشتہ چند ماہ میں مسٹر جناح کئی دفعہ پنجاب آئے۔ مگر ان کی کوششیں ناکام رہی ہیں۔ اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن ان کا وعظ صدا بہ صحرا ثابت ہوا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہندوستان میں کسی جگہ بھی مسٹر جناح کو کامیابی نہیں ہوئی تو میرے اس بیان میں ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا۔۔۔۔۔۔''

(۳) '' یہ کہہ کر مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک ڈالنے سے کچھ فائدہ نہیں کہ مسلمانوں کو

منظم کیا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس جناح کو جب بھی موقع ملا ہے، انھوں نے مخالف فرقوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس وقت باوجود ے کہ تمام ہندوستان کے مسلمان جداگانہ طریق انتخاب کے حامی تھے۔ مگر مسٹر جناح مخلوط انتخاب کے علم بردار تھے۔

مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کرتے ہوئے انھوں نے مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کیا۔ خوش قسمتی سے وہ اجلاس کامیاب نہ ہوا اور ان کی اسکیم کو تقویت نہ پہنچ سکی۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے لیجس لیٹو اسمبلی میں سنٹرل مسلم پارٹی بنائے جانے کے راستے میں کتنے روڑے اٹکائے تھے؟ اس کے خلاف مسٹر جناح کی دلیل یہ تھی کہ میری اپنی پارٹی انڈیپنڈنٹ غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے اور یہ کہ مجالس آئین ساز میں فرقہ وارانہ پارٹیاں نہیں بنانی چاہئیں......''

(۴) ''مسٹر جناح کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مدت ہوئی ان کا مشن پنجاب میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں مسٹر جناح نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی۔ جس میں انھوں نے اتحاد پارٹی کے لیڈر کو بہت بری طرح کوسا۔ مسٹر جناح جیسی پوزیشن اور تجربہ رکھنے والے کے لیے یہ بات شایانِ شان نہ تھی۔ لیکن یہ ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ سیاستدان کی آخری جائے پناہ بدزبانی ہوتی ہے......'' (کاروانِ احرار: جلد۲، ص ۵۷۔۴۵۶)

سندھ مسلم پولیٹیکل پارٹی:

۵رنومبر ۱۹۳۶ء: ۵رنومبر ۱۹۳۶ء کو کراچی کے اخبارات میں ایک نئی سیاسی جماعت کے متعلق خبر شائع ہوئی۔ یہ تھی سندھ مسلم پولیٹیکل پارٹی۔ یہ جماعت سندھ یونائیٹڈ فرنٹ کے خلاف ایک نیا محاذ تھی۔ اس کے رہنماؤں میں سر غلام حسین ہدایت اللہ، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور سردار علی بخش تالپور نمایاں تھے۔ (کاروانِ احرار: جلد۲، ص ۴۵۸)

۵رنومبر ۱۹۳۶ء: ''مسلم لیگ کا ڈکٹیٹر''۔ ''مسٹر فضل الحق کو سزا''۔ ''غداری اور سرکشی کا الزام'' کے دوہرے تہرے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ جس کا متن یہ ہے:

'' بمبئی ۲رنومبر آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر مسٹر جناح نے مسٹر فضل الحق کو بورڈ کی ممبری سے خارج کر دیا ہے۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے سنٹرل بورڈ کے اصولوں کی خلاف ورزی، غداری اور سرکشی کی ہے۔'' (روزنامہ ''انقلاب'' ۵رنومبر ۱۹۳۶ء)

بہار میں انتخابی کشمکش:

۲۹ر دسمبر ۱۹۳۶ء: شفاعت حسین (ضلع مونگیر) نے حضرت مفتی صاحب کو ذیل کا استفتا بھیجا تھا اور شرعی فتویٰ دریافت کیا تھا:

''امارت شرعیہ صوبہ بہار کی انڈیپنڈنٹ پارٹی جس کے رکن ابوالمحاسن مولوی سجاد صاحب نائب امیر شریعت ہیں اور یونائیٹڈ پارٹی جس کے رکن آنریبل مسٹر عبدالعزیز بیرسٹر پٹنہ ہیں۔ دونوں پارٹیوں کے کارکن ہم لوگوں کے پاس ووٹ لینے آتے اور ہر طرح کی بات کہتے ہیں۔ مہربانی فرما کر ہم لوگوں کو بتایا جاوے کہ کس پارٹی کو ووٹ دے کر ہم لوگ حق بجانب رہیں گے۔''

حضرت مفتی صاحب نے انھیں جواب میں تحریر فرمایا:

''امارت شرعیہ کی انڈیپنڈنٹ پارٹی یونائیٹڈ پارٹی سے بہتر ہے یونائیٹڈ پارٹی کے امید واروں کو ووٹ دینا سرکار کی تائید کرنا ہے۔ ان دونوں پارٹیوں کے امید واروں کا مقابلہ ہو تو انڈیپنڈنٹ پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دینا لازم ہے۔ فقط

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی''

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

ووٹ کی قیمت اور مسجد کی تعمیر:

۲۹ر دسمبر ۱۹۳۶ء: کسی صاحب نے ووٹ دینے کے عوض پیسے لینا اور انھیں مسجد کی مرمت میں خرچ کرنا جائز بتایا تھا۔ عبدالحیط خاں (سندھ) نے اس کے جواز و عدم جواز کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

''ووٹ کی قیمت وصول کرنا جائز نہیں اور ایسا روپیہ مسجد میں نہیں لگ سکتا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی''

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

عبداللہ ہارون کا بیان:

۳۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء: کراچی ۳۰ر دسمبر سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے لیڈر سیٹھ عبداللہ ہارون ایم۔ ایل اے نے پریس بیان میں کہا،:

''ماضی میں ہم سے کئی فروگذاشتیں ہو چکی ہیں۔ لیکن اب کے بار سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے ہر رکن نے اپنے کو صوبے کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہ امید رکھنا دراصل ایک قسم کی زیادتی ہوگی کہ سندھ اسمبلی کے ایک سو ساٹھ ارکان جو چھ لاکھ رائے دہندگاں کے نمائندے ہوں گی۔ اپنے صوبے کی بڑھتی ہوئی غربت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے کاری کا کوئی حل ان کے پاس نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی دیہاتی یا شہری مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا، جب تک ہندو مسلمان کونسل یا اسمبلیوں کے اندر یا باہر باہم اتفاق نہیں کر لیں گے۔''

(کاروان احرار، جلد ۲، ص ۴۷۳۔۴۷۴)

سرزمین سندھ:

حضرت شیخ الاسلام کا یہ مضمون مولانا دین محمد وفائی ایڈیٹر الوحید کراچی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور الوحید کے ''آزاد سندھ نمبر ۱۹۳۶ء'' میں ''سرزمین سندھ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

سرزمین صوبہ سندھ کو ہندوستان اور اسلامی ممالک میں نہ صرف زمانہ قریب سے بلکہ ابتدا سے ہی ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

جن لوگوں نے عہد عتیق (بائبل) کی ورق گردانی کی ہوگی وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہند اور سندھ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو بھائیوں کے نام ہیں جو کہ اس سرزمین پر آ کر آباد ہوئے اور بعد میں یہ سرزمین ان کے نام سے مشہور ہوئی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں غازی محمد بن قاسم ثقفی مرحوم کے ذریعہ اسلام کا پرچم اس سرزمین پر بلند ہوا اور یہ بہت عرصہ تک اسلامی سلطنت کے حدود میں داخل رہا۔

اس ملک کے باشندے سلطان محمود غزنوی مرحوم کے دور تک اسلام سے پوری طور پر فیض یاب ہو چکے تھے۔ اس وقت ہندوستان کے دوسرے ممالک میں مکمل تاریکی تھی۔ غالباً یہ ہی وجہ ہے کہ اس ملک کے باسی بھی اسلامی تہذیب، رسم ورواج وغیرہ کے اس قدر پابند اور دلدادہ ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے ملکوں میں اس کا نصف یا چوتھائی بھی نہیں ہے۔ اس ملک کی سرزمین اور پیداوار بھی قدیم اسلامی ممالک سے جس قدر مناسبت رکھتی ہے۔ دوسرے صوبے اس سے محروم ہیں۔ یہاں کا طرز تحریر، زبان اور رہائش کا اسلوب جس قدر عربیت اور اسلامی تہذیب و تمدن سے مناسبت رکھتا ہے وہ بات دوسرے صوبوں کو نصیب نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کے دور میں یہ صوبہ

علم اور علماء کا مرکز تھا۔ کیپٹن الیگزینڈر ہیملٹن کے بیان کے مطابق اس کے فقط ایک شہر ٹھٹہ میں علوم وفنون کے ۴۰۰ کالج (اعلیٰ تعلیم کے ادارے) تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے اسکولوں اور پرائمری اسکولوں وغیرہ کس قدر تعداد میں شہروں اور دیہاتوں میں ہوں گے۔ اور اس دور میں کس قدر وسیع پیمانہ پر علم کی اشاعت ہوتی ہوگی۔ اس سرزمین نے ایسے عالم پیدا کیے جن کی علمیت اور کمال کو نہ صرف ان کے وطن یا سندھ کے آس پاس کے ممالک میں تسلیم کیا گیا بلکہ ان کے شاگرد اور ان سے فیض حاصل کرنے والے تمام اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اسلامی دنیا نے ان کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے۔ شیخ رحمت اللہ سندھی، ابن ہمام کے محقق شاگرد شیخ ابو الحسن سندھی کبیر، شیخ ابوالحسن سندھی صغیر، شیخ محمد عابد سندھی اور علامہ محمد ہاشم وغیرہ جیسے اکابر اور محقق علماء (رحمہم اللہ تعالیٰ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کی بہت سے عمدہ تصنیف شدہ کتابیں دنیا میں مشہور ہیں۔ اس سندھ کی سرزمین پر صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظام کے مقابر اور مزارات موجود ہیں جو کہ آج تک مرجع خلائق ہیں۔

بہر حال جغرافیائی خواہ تاریخی، تمدنی یا معاشرتی، مذہبی یا دنیاوی، تجارتی یا زرعی طور پر سندھ کا صوبہ اس بات کا حق دار تھا کہ اس کو الگ کیا جائے۔ اور عظیم الشان امتیاز عطا کیا جائے۔ لیکن ہمیشہ اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی بجائے اس کے اس کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر لایا جائے ہمیشہ اس کی حیثیت کم کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ اس کے پھیلاؤ کو کم کیا گیا، اس کے ہنروں کو کچلا گیا، کاروبار اور تعلیم کو نقصان پہنچایا گیا۔ اس حد تک کہ اس کو ایک بہت چھوٹا اور پس ماندہ، جاہل محتاج اور مفلس صوبہ بنایا گیا۔ محتاج بھی کس کا بنایا گیا صوبہ بمبئی کا جس کے ساتھ سندھ کی کسی کی بھی قسم کی کوئی مناسبت اور تعلق نہ تھا۔ جب بھی سندھ کی علیحدگی کے لیے آواز بلند کی گئی تو یہ جواب دیا گیا کہ سندھ اپنا خرچ نہیں برداشت کر سکے گا۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی اور بقا کے لیے بمبئی سے چمٹے رہنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے

۱۹۳۱ء کی سندھ کی مردم شماری کے مطابق سندھ کی آبادی ۳۸۸۷۰۷۰ ہے جس میں ۷۵ فیصد یعنی ۲۸۱،۹۸۷۰ مسلمان دکھائے گئے ہیں۔ لیکن تاریخی شواہد کے مطابق اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ میں صرف ٹھٹھہ شہر اور اس کے گردونواح کی آبادی مذکورہ اعداد وشمار کے لگ بھگ تھی۔ دریائے سندھ کاروبار کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ اس ذریعے سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر خلیج فارس، عراق، نجد، عمان، یمن، حجاز، مصر اور سوڈان تک بڑے پیمانے پر کار

دباری کام جاری تھا۔

اس کمزور حالت میں بھی سندھ اپنی پیداوار کے لحاظ سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے ریاست گوالیار مردم شماری میں اگرچہ سندھ سے بڑا ہے۔ جیسا کہ اس کی مردم شماری ۴۰ لاکھ ہے لیکن اس کی آمدنی صرف ۲ کروڑ ۲ لاکھ ہے اسی طرح ریاست...... کی آبادی سندھ کے برابر ہے لیکن اس کی پیداوار (آمدنی) صرف ایک کروڑ چالیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اور دوسری طرف سندھ کی آمدنی دو کروڑ سے زیادہ ہے اخبار مدینہ۔ بجنور، ۲۵ راگست ۱۹۳۱ء نے سندھ کی بابت لکھا تھا کہ:

''دسمبر ۱۹۱۷ء میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی سرکردگی میں ایک وفد مسٹر مان ٹیگو وزیر ہند کی خدمت میں سندھ کی علیحدگی کی درخواست لے کر گیا جس میں آمدنی خرچ سے زیادہ دکھائی گئی تھی ۔حکومت بمبئی اور اس کے اہل کاروں نے بھی ان اعداد و شمار کا انتہائی سوچ بچار سے جائزہ لیا تو یہ ان کو درست نظر آئے۔ جس کے بعد مسٹر مان ٹیگو وزیر ہند نے اپنی رپورٹ میں لکھا کے سندھ اس رقم سے زیادہ دیتا ہے جو کہ وہ بمبئی سے لیتا ہے''۔

''اس کے بعد اہالیان سندھ نے متفقہ طور پر ایک مہم چلائی اور مسلمانوں سے بڑھ کر ہندو بھی اس مسئلہ میں پیش پیش تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ہم بمبئی کو زیادہ رقم دیتے اور کم وصول کرتے ہیں تو ہم کو بمبئی سے جدا کیوں نہیں کیا جاتا۔ اسی بنیاد پر ۱۹۲۲ء میں پارسیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ایک وفد نے گورنر بمبئی سے ملاقات کی۔ اس وفد کو یہ حیرت انگیز بات بتائی گئی کہ آپ کا صوبہ خسارہ میں چل رہا ہے۔ جب نقصان کی حقیقت معلوم کی گئی تھی تو یہ جواب دیا گیا کہ ۱۹۲۲ء میں آمدنی ایک کروڑ پچانوے لاکھ تھی اور خرچ ۲ کروڑ ۹ لاکھ ہوا ہے''۔

تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ۱۹۱۸ء میں سندھ والوں کی تحریک دیکھ کر بمبئی حکومت نے سندھ پر زیادہ اخراجات کرنا شروع کر دیے جیسا کہ ۱۹۲۲ء میں تقریباً ۱۵ لاکھ روپیہ سڑکوں پر خرچ کیے گئے اور فوج کے توپ خانہ کے لیے ایک میدان خریدا گیا جس میں بارگوں کی تعمیر کی گئی جس کی وجہ سے ۳۰ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ اس کے علاوہ چیف کورٹ اور نہروں کی کھدائی پر بھی کتنے ہی لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ اس وجہ سے ایک پیداواری صوبہ کو خسارے والا دکھایا گیا۔ مزید حیرت اس بات کی ہے کہ بمبئی گورنمنٹ اپنے سولہ کروڑ کے بجٹ میں صرف ۲ کروڑ سندھ کے لیے مختص کرتی تھی اور دوسری طرف وصولی ۴ کروڑ کے لگ بھگ کرتی تھی۔ اس قسم کی بے انصافیوں کے سبب

سندھ کو ہمیشہ کچلا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً بمبئی کو کراچی کی بندرگاہ سے جو رقابت ہے اس نے کراچی کو انتہائی زبوں حالی تک پہنچانے کی کوشش کی کیوں کہ بمبئی کو ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہا کہ اگر کراچی بحری کاروبار کا مرکز بن گیا تو بمبئی کی عظمت اور جاہ وجلال کو شدید دھچکا لگے گا۔ اس وجہ سے بمبئی کراچی کو ابھرنے نہیں دیتا تھا۔

ہم کو برادران وطن کی ذہنیت پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا واضح حقائق کے باوجود جن کو وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ سندھ کی علیٰحدگی کی طرف اس وجہ سے مخالفت کرتے رہے کہ اگر صوبہ سندھ بمبئی سے جدا ہوا تو پھر مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ اور وہ خود اقلیت میں رہ جائیں گے۔ بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد کی طرح یہ بھی مسلمانوں کا اکثریتی صوبہ بن جائے گا۔ افسوس! اگر کے ہندو انصاف اور عدالت کے خوگر بن کر اور تنگ دلی اور تعصب کو چھوڑ کر حقیقی طور پر وطن پرستی کا ثبوت دیتے تو سندھ کی علیٰحدگی کی تحریک کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتی۔ اس کے باوجود بھی گورنمنٹ نے مسلمانوں کے متفقہ مطالبہ کی طرف توجہ کی اور سندھ کی علیٰحدگی کا اعلان کیا جو سندھ کے باشندوں کے لیے خصوصاً اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کے لیے عموماً خوشی اور اطمینان کا باعث ہوا ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ حکومت سندھ کے باشندوں کی حقیقی ذمہ داریوں کو مدنظر رکھے اور ایک ذمہ دار اور جوابدہ نظام قائم کرے اور خود غرضی اور یورپ نوازی سے گریز کرے۔ سندھ کے مفلس ہاریوں وغیرہ کی بھلائی کے لیے مکمل انتظام کرے اور جس افلاس سے پورا ہندوستان اور خصوصاً سندھ کے باشندے ہلاکت کے کنارے پہنچ چکے ہیں ان کو دور کرے اور سارے ملک کی آفرین و ستائش کی حقدار بنے۔ فقط

۲۷/دسمبر ۱۹۳۶ء: کانگریس کا اپچاسواں سالانہ اجلاس ۲۸/۲۷/دسمبر ۱۹۳۶ء کو فیض پور میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ (سکسٹی ایرس آف کانگریس، ص ۱۷۔۳۱۵)

۱۹۳۷ء

حضرت شیخ الاسلام کا آٹو گراف:

۶/جنوری ۱۹۳۷ء: جنید احمد نامی ایک صاحب کی درخواست پر ان کو آٹو گراف کی طور پر

حضرت شیخ الاسلام نے دو شعر اپنے قلم سے تحریر فرما کر دیے:

ہر نفس بہرت مسیحائیست چست
گر نداری پاس او از جہل تست
ایں چنیں انفاسِ خوش ضائع مکن
غفلت اندر شہر جاں شائع مکن

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

۲۳ر شوال ۱۳۵۵ھ!

ووٹ کا صحیح حقدار:

۷ر جنوری ۱۹۳۷ء: سیو ہارہ (ضلع بجنور) کے مولوی حبیب الرحمٰن نے انتخاب میں ووٹ دینے کے وعدے اور استحقاق کے بارے میں شرعی مسئلہ دریافت کیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے انھیں یہ جواب دیا:

''یہ وعدہ کہ میں تمھارے حق میں بہر صورت ووٹ دوں گا شرعاً وعقلاً اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ موعودلہ، سے بہتر کوئی امیدوار موجود نہ ہو اور اسی صورت میں یہ وعدہ صحیح اور واجب الایفا بھی ہے۔ لیکن اگر کسی بہتر نمایندے کے موجود ہوتے ہوئے اس سے ادون اور غیر مستحق کو رائے دینے کا وعدہ کر لیا جائے تو یہ قومی امانت میں خیانت کرنا ہے۔ اور جو وعدہ ایسا ہو کہ خود وہ وعدہ اور اس کا ایفاء خیانت ہو وہ وعدہ ہی درست نہیں ہوا۔ اور اس کا ایفا بھی جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے دوست سے وعدہ کرے کہ میں تمھارے ساتھ مل کر عمر مظلوم بے گناہ کو ماروں گا تو یہ وعدہ بھی ناجائز اور اس کا ایفا بھی ناجائز۔ کونسل یا اسمبلی میں قوم کا نمایندہ بن کر جانا کسی ایسے شخص کا حق نہیں ہے، جس کو قوم کے افراد اپنا نمایندہ بنا کر بھیجنا پسند نہ کریں۔ اور ہر رائے دہندہ کو یہ حق ہے کہ اپنی رائے بہتر سے بہتر نمایندہ کی تائید میں دے۔ اگر کسی بہتر نمایندہ کے ہوتے ہوئے کسی ووٹر نے غیر مستحق امیدوار کو رائے دینے کا کسی خوف یا طمع یا مروت کی بنا پر وعدہ کر لیا تو وہ اس وعدہ کرنے میں خیانت قومی کا مرتکب ہوا اور یہ وعدہ بھی درست نہیں ہوا۔ اور اگر کوئی بہتر نمایندہ موجود نہ تھا۔ اس وقت کسی امیدوار سے وعدہ کر لیا تو یہ وعدہ اگرچہ قومی خیانت نہیں ہوا۔ لیکن واجب الایفاء بھی نہیں جب کہ کوئی ایسا امیدوار کھڑا ہو جائے جو ملک وقوم وملت کے لیے مفید ہے

تو ہر ووٹر کا فرض ہے کہ وہ بہتر اور مفید تر نمائندہ کو اپنا ووٹ دیں۔ ایفائے وعدہ اور ایفائے عہد وہی لازم اور واجب ہے کہ وہ وعدہ اور عہد بھی فی حد ذاتہ صحیح ہو۔ ورنہ وعدہ اور عہد کیا حلف اور یمین بھی اگر ناجائز اور منکر پر کر لے تو اس کا پورا نہ کرنا اور حلف کا کفارہ دے دینا جائز بلکہ بعض صورتوں میں (جب کہ محلوف علیہ معصیت ہو) واجب ہے۔......''

اس کے بعد مفتی صاحب نے تفسیر خازن اور تفسیر کبیر سے اس بیان پر استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''ان عبارتوں کا خلاصہ یہی کہ وعدہ اور عہد اور قسم واجب الایفاء ہیں مگر جب کہ وعدہ اور عہد اور قسم ایسی چیز سے متعلق ہوں کہ ان کا ایفاء متضمن معصیت یا خیانت کو ہو تو ایفاء لازم نہیں بلکہ وہ کام کرنا واجب ہو جاتا ہے جو طاعت و مصلحت کے ماتحت اس پر لازم تھا۔

(۲) اگر اس حلقہ سے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے اپنا نمائندہ کھڑا نہیں کیا تو تمام مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ زید کے حق میں ووٹ دیں اور بکر کو جو سرکاری آدمی ہے ہرگز رائے نہ دیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی''

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

حلف نامۂ آزادی خلاف قانون قرار دے دیا گیا:

۲۲ر جنوری ۱۹۳۲ء: ۲۲ر جنوری کو مدراس گورنمنٹ نے ۲۶ر جنوری ''یوم آزادی'' کے موقعہ پر پڑھا جانے والا حلف نامہ خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس کے بعد بمبئی، سی پی اور پنجاب کی صوبائی حکومتوں نے بھی یہ حلف نامہ ممنوع قرار دے دیا۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے ریزولیشن کے مطابق ہر سال ۲۶ر جنوری کو یوم آزادی منائے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس میں اس ریزولیشن کا اعادہ کیا جاتا اور اسے بطور حلف نامہ کے ہر سال پڑھا جاتا تھا۔ لیکن امسال صوبائی حکومتوں نے ایمرجنسی پاور ایکٹ ۱۹۳۱ء کی دفعہ ۱۹ کے تحت بحکم ملک معظم اس حلف نامے کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ چناں چہ پولیس نے اس ریزولیشن کی تمام کاپیاں سارے ملک میں کانگریس کے دفاتروں پر چھاپہ مار کر ضبط کر لیں۔ (کاروانِ احرار، ج ۲)

انتخابات اور جمعیت علماء کی پالیسی:

۲۴ر جنوری ۱۹۳۷ء: یکم فروری کو صوبائی انتخابات ہونے والے تھے۔ ضلع پشاور کی جمعیت علماء کے ناظم مولوی عبدالغفور نے اپنے حلقے میں ووٹ دینے کے لیے مشورہ طلب کیا تھا۔ مفتی صاحب نے انھیں یہ جواب دیا:

جمعیۃ علماء ہند نے الیکشن کے بارے میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ اشتراک عمل کیا ہے۔ اس لیے جمعیۃ کی طرف سے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کی حمایت کرنی جمعیۃ علماء کی صحیح پالیسی ہے اور جس حلقے مین مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا امیدوار نہ ہو وہاں مسلم امیدواروں میں سے جو امیدوار کہ آزاد خیال، ترقی پسند اور جمعیۃ علماء کے مسلک کا حامی ہو اور سرکاری اثر میں نہ ہو اس کی امداد کرنی چاہیے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۲۷ر جنوری ۱۹۳۷ء: ڈھاکا کے عبدالکریم صاحب نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں ایک خاتون امیدوار کو ووٹ دینے کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا تھا۔ یہاں سوال اور جواب دونوں درج کیے جاتے ہیں۔ تاکہ حضرت مفتی صاحب کے جواب کا پورا پس منظر بھی علم میں آ جائے۔ سوال یہ ہے:

" زید اور اس کی بیوی ایک حد تک تعلیم یافتہ ہیں۔ اب ہر دو کونسل میں جانے کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں اور عامۃ المسلمین سے اپیل کی جا رہی ہے کہ ان کو ووٹ دے کر اسلام کی عزت برقرار رکھی جائے۔ محاسن حسب ذیل ہیں۔ بیوی موسومہ قیصر ہند کا تمغہ حاصل کر چکی ہیں۔ اور خود لاٹ صاحب بہادر نے اس کو سینہ پر آویزاں فرمایا۔ جس سے خود شوہر اور بیوی ہر دو مسرور ہی نہیں بلکہ فخریہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ انگریز کی ہر پارٹی اور کلب میں بموجودگی شوہر ہر دو دونوں بلا روک ٹوک شریک ہوتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور بیوی صاحبہ ان سے مصافحہ کرتی ہیں، ان کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ مگر مسلمانوں سے پردہ کرتی ہیں۔ اب کونسل میں جا کر بلا حجاب مردوں کے پہلو بہ پہلو ہر کام میں حصہ لیں گی اور تقریریں کریں گی اور یہ رہا سہا پردہ بھی ختم ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو شوہر خود ان تمام امور پر راضی ہے اور اس کی کونسل کے لیے

امیدواری اسلام کی عزت تصور کی جاتی ہے۔ کیا ایسی عورت کو واقعی ووٹ دینا تاکہ وہ کونسل میں جا کر مردوں کے پہلو بہ پہلو تقریر کر سکے اعانت فی الاسلام ہے۔ شرعاً ایسے کو کیا کہا جائے گا۔ اگر ایسا شوہر بھی امیدوار ہو تو کیا ایسے شخص کو ووٹ دینا شرعاً جائز ہے؟

جواب یہ ہے:

یہ تمام افعال و اعمال اسلام اور اسلامی غیرت کے خلاف ہیں اور انگریزی طرز معاشرت اور یورپین تہذیب کی اندھی تقلید کے نتائج ہیں۔ اسلام کا دامن اس قسم کے حیا سوز اعمال سے پاک ہے۔ مسلمان عورتوں کی یہ حرکتیں مسلمانوں کے لیے موجب حسرت ہیں نہ کہ موجب فخر و مسرت!

رہا ووٹ دینے نہ دینے کا سوال وہ اور بھی بہت سے وجوہ اور اعتبارات پر مبنی ہے اس لیے ان امیدواروں کے مقابل امیدواروں کی پوزیشن کا بھی سامنے آنا اور پھر کونسل کے اندر ان کی وطنی خدمات کی نوعیت اور صلاحیت کو دیکھنا لازم اور اس پر حکم دینا مناسب ہوگا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

ووٹ کا معیارِ استحقاق:

۱۵ر فروری ۱۹۳۷ء: ممتاز الدین نامی ایک صاحب (سبزی منڈی۔ دہلی) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا:

ممبر کے لیے رائے دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنا نمائندہ بنا کر کمیٹی یا کونسل میں بھیجنا ہے۔ کمیٹی یا کونسل میں جا کر جس کام کی حاجت ہوتی ہے۔ اس کی لیاقت اور صلاحیت ممبر میں ہونی لازم ہے۔ اور اسی لیاقت اور صلاحیت کو ووٹ دینے کا معیار قرار دینا چاہیے۔ ووٹ کسی طمع یا خوف یا معاوضہ کی بنا پر دینا درست نہیں۔ غیر مستحق اور ایسے شخص کو جس میں لیاقت اور صلاحیت نہیں ہے، ووٹ دینا قومی خیانت ہے۔

وعدہ اگر مستحق اور اہل سے کیا گیا ہو تو اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ بلکہ وعدہ کے بغیر بھی مستحق اور اہل کو ووٹ دینا چاہیے۔ لیکن اگر وعدہ غیر مستحق اور نا اہل سے کر لیا گیا ہو تو ایسا وعدہ ہی صحیح وعدہ نہیں اور اس کو پورا کرنا ایسا ہے جیسا کسی سے شراب پلانے کا وعدہ کر کے اس کو شراب پلانا اور اس کو وعدہ کا ایفا قرار دینا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایفائے عہد اسی صورت میں لازم ہے کہ وہ عہد بھی جائز

ہو۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی۔ مدرسہ امینیہ دہلی۔

الجواب صحیح۔ حبیب المرسلین عفی عنہ نائب مفتی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

راجہ غضنفر علی کا بیان:

۱۷ر فروری ۱۹۳۷ء: ۱۷ر فروری کے روزنامہ ''انقلاب'' لاہور میں راجہ غضنفر علی کا ایک بیان شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے کہا:

''میں ہمیشہ سے ہندو مسلم اتحاد کا حامی رہا ہوں۔ چناں چہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہونا اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ میں زمینداروں کی خدمت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اتحاد پارٹی کے تمام افراد کو اس کا بہت زیادہ احساس ہے۔ اس پارٹی کا نصب العین بھی مسلم لیگ کی طرح درجہ نو آبادیات ہے۔ اتحاد پارٹی کے لیڈر سے مجھے مدت سے نیازمندی کا تعلق ہے۔ مختلف قوموں میں اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ مخلص ہے تو وہ سر سکندر حیات ہے۔ وہ جب گورنر ہوئے تو فرقہ وارانہ حالات بہت خراب تھے۔ لیکن ان کے گورنر بنتے ہی حالات درست ہو گئے۔ اس پر تمام اخبارات نے انھیں مبارک باد دی۔ وہ مذہبی تعصب سے بالاتر ہیں۔'' (کاروانِ احرار: ج ۴)

ہٹلر کا اعلان:

۱۹ر فروری ۱۹۳۷ء: برلن ۱۹ر فروری کو ہٹلر نے جرمنی کے تمام سابق برخاست شدہ فوجی سپاہیوں اور افسران کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''جرمنی قوم کسی قوم سے جنگ نہیں چاہتی۔ اس وقت ہمارے دل میں اپنے قدیم مخالفین کے لیے سوائے احترام کے اور کچھ نہیں۔ آج تک جنگیں کسی قوم کے لیے مفید نہیں رہیں، بلکہ تباہی لائی ہیں۔

جس حالت میں جرمنی حالات سے برہم ہو جائیں گے یا ہمارے امن میں خلل وارد ہوگا اور جرمنی کے حالات بگڑ جانے کا خدشہ ہوگا تو جرمنی مجبور ہوگا کہ وہ اپنا دفاع کرے اور اس کی تمام تر ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔''

(روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ۲۱ر فروری ۱۹۳۷ء)

راجا غضنفر علی کی بے وفائی:

۲۲؍فروری ۱۹۳۷ء: پنجاب میں مسلم لیگ کے دو امیدوار تھے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی۔ اول الذکر نے مجلس اتحاد ملت کا ٹکٹ بھی برائے کامیابی حاصل کرلیا تھا۔ جس پر مسلم لیگی حلقوں میں تعجب کیا گیا۔ ۹؍فروری کے اعلان کے مطابق مسلم لیگ کے دو ممبر کامیاب ہوئے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی۔ لیکن آخر الذکر کامیاب ہو کر یونینسٹ پارٹی میں جا ملے راجہ صاحب کا استقبال کرتے ہوئے سر سکندر حیات نے کہا:

''راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایماء پر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے شروع ہی سے میرے ساتھ وعدہ کرلیا تھا کہ وہ کامیاب ہونے کے فوراً بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔''

راجہ صاحب کے اس فعل پر ہفت روزہ نیو ٹائمز نے اپنی ۲۲؍فروری کی اشاعت میں لکھا:

''یہ صاف سیدھا فریب اور دھوکا ہے۔ اگر مسلم لیگ کو معلوم ہوتا کہ راجہ غضنفر علی اور سر سکندر کے درمیان کوئی عہد و پیمان قائم ہے تو پارلیمنٹری بورڈ کبھی ایسے شخص کو ٹکٹ نہ دیتا، جو فریق مخالف کے لیڈر کے ساتھ خفیہ ساز باز میں شریک تھا۔''

(اقبال کے آخری دو سال: عاشق بٹالوی، لاہور، ۸۷۔۲۷۷)

سیاسی قیدیوں کی رہائی:

یکم مارچ ۱۹۳۷ء: امرتسر یکم مارچ کو ایک سرکاری اعلان کے ذریعے کہا گیا کہ ۱۵۔۱۹۱۴ء کے وہ قیدی جنہیں ایک سازش کے تحت عمر قید کی سزا دی گئی۔ وہ رنگون جیل سے رہا کر دیے گئے ہیں۔ ان قیدیوں میں بابا امر سنگھ نامی شخص گرفتاری سے پہلے ملایا میں انجینئر تھا۔

ان لوگوں نے انگریزوں کے خلاف عسکری جنگ لڑنے کے لیے جاپان سے گاما گاتا مارو جہاز خریدا تھا۔ یہ بحری جہاز جب بج بج کے گھاٹ پر پہنچا تو انگریزوں سے اس کا مقابلہ ہوا جس سے بہت سے ہندوستانی مارے گئے، جو بچے وہ گرفتار کر لیے گئے۔ سردار گوردت سنگھ اس جہاز کا لیڈر تھا۔

گرفتاری کے وقت ان لوگوں کی عمریں بیس تیس سال کے درمیان تھیں اور جب رہا ہوئے تو ان کی داڑھیاں سفید ہو چکی تھیں۔ پھر یہ لوگ بابے کہلائے۔ ہر ہندوستانی انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ (کاروان احرار: ج ۲)

پنجاب میں ناکامی پر مسٹر جناح کا بیان:

۳/ مارچ ۱۹۳۷ء: پنجاب میں مسلم لیگ کی شکست پر ۲۸/ فروری کو بمبئی میں مسٹر محمد علی جناح نے حسب ذیل بیان دیا:

''یہ پہلا موقع ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے کسی موثر صوبائی یا ڈسٹرکٹ اداروں کے بغیر انتخاب میں حصہ لیا۔ اگر چہ یہ ابتدائی کوشش ہے، تاہم اس کے نتائج سے مطمئن ہوں۔ بنگال میں مسلم لیگ نے پچاس فیصد مسلم نشستوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ یوپی مسلم لیگ کے پینتالیس امیدواروں میں انتیس کامیاب ہوئے ہیں۔ مدراس میں گیارہ امیدوار تھے، دس کامیاب ہوئے ہیں۔ بمبئی میں دوتہائی مسلم نشستیں لیگ کے حصہ میں آئی ہیں۔''

پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم نے پنجاب میں مسلم لیگ کی ناکامی کا افسوس ناک لہجے میں اعتراف کیا:

''لیگ کی طرف سے بہار، صوبہ سرحد، اڑیسہ اور سندھ میں پارلیمنٹری بورڈ قائم نہیں کیے گئے تھے۔ آسام میں چوبیس مسلم نشستوں میں سے لیگ کو صرف ایک نشست ملی ہے۔ اس جگہ مسلم لیگ کے دودھڑوں کی قیادت میں باہم تنازعہ تھا۔'' (روز نامہ ''انقلاب'' لاہور، ۳/ مارچ ۱۹۳۷ء)

۲۸ و ۲۹/ مارچ ۱۹۳۷ء: حضرت شیخ الاسلام نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر کانفرنس کے شعبۂ مدارس اسلامیہ کے جلسے کی صدارت فرمائی۔ حضرت نے اس موقعے پر ایک نہایت پر معنی اور فکر انگیز خطبہ پیش کیا اس میں انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں تعلیم کے رواج عام اور ملک پر انگریزوں کے قبضے، ان کی تعلیمی پالیسی اور اس کے نتائج پر بہت تحقیق کے ساتھ بحث فرمائی۔ نیز تعلیم کے فروغ واشاعت میں اسلامی عربی مدارس کے کردار، ان کی اہمیت اور ان کے بارے میں انگریزی حکومت کے معاندانہ رویے پر روشنی ڈالی اور عربی تعلیم یافتہ طبقے کے مسائل پر توجہ دلائی۔ حضرت نے فرمایا:

''چوں کہ اسلامی تعلیمات، اسلامی تواریخ، اسلامی معاشرت، اسلامی تمدن، اسلامی علوم و فنون یہ سب عربی زبان میں ہیں۔ اس ساڑھے تیرہ سو برس میں مسلمانوں نے بڑے بڑے مذہبی اور تمدنی انقلابات برپا کیے ہیں اور علوم وفنون کے بہت سے شعبوں میں مسلمانوں کا مستقل اور

پائیدار اثر قائم ہوا ہے اور یہ سب کچھ عربی زبان میں ہے۔ مسلمانوں کے خاص خاص علوم میں جو اور کسی زبان میں پوری طرح نہ مکمل ہو سکتے ہیں نہ ترجمہ کیا جا سکتا ہے جیسے حدیث، تفسیر، اصول، اسماء الرجال، وغیرہ۔ الغرض مسلمانوں کا سارا علمی سرمایہ عربی زبان میں ہے اس لیے من حیث القوم مسلمان عربی تعلیم کے لیے مجبور ہیں۔ نہ اس کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ان کو چھوڑنا چاہیے۔

عربی تعلیم یافتہ اشخاص کے مسائل:

غور طلب یہ امر ہے کہ صرف ہندوستان میں شاید کئی لاکھ مسلمان ہر سال عربی تعلیم میں مشغول رہتے ہیں اور ہر سال ہزاروں طالب علم آٹھ دس برس کی محنت شاقہ کے بعد سند فراغ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لیے بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہی لوگ قومی اور مذہبی رہنما اور قومی رہبر ہوتے ہیں مگر معمولی بسر اوقات اور اپنی قوت سے قدر کفاف حاصل کرنے کا موقع بھی ان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رہنما ہوتے ہیں مگر محتاج، رہبر بنتے ہیں مگر مفلس اور احتیاج کی وجہ سے جو جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ہوتی رہتی ہیں۔

یہ چیز ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو عربی تعلیم سے روک دیا جائے اور روکنا مناسب اور جائز بھی نہیں ورنہ یہ مسلمانوں کی مذہبی اور ملی تباہی کا باعث ہو جائے گا۔ لہٰذا کیا مسلمانوں کی اس تعلیمی کانفرنس کے لیے یہ امر غور طلب نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی عربی تعلیم کے مسئلے کی طرف اپنی مکمل توجہ منعطف کرتی ہوئی عربی تعلیم یافتہ اشخاص کے ذرائع معاش کے مسئلے کو حل کرے۔''

حضرت شیخ الاسلام نے کانفرنس کو اس غفلت پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

''یقیناً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اس سے اب تک بہت بڑی غفلت برتی ہے۔ شکایت کی جاتی ہے کہ اچھے علماء پیدا نہیں ہوتے! مگر اچھے علماء پیدا ہونے کے اسباب و ذرائع کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے ''لو کلفت بصلة ما عرفت مسئلة'' (اگر مجھ کو پیاز کی تکلیف دی جاتی تو ایک مسئلہ کو بھی نہ پہچانتا) ضروری ہے کہ علماء کو احتیاج اور افلاس سے نکالا جائے۔ ان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی روزی اپنے قوت بازو سے حاصل کر سکیں تاکہ ان میں فارغ البالی، خودداری، آزادی رائے پیدا ہو سکے اور ''چہ خورد بامداد فرزندم'' سے فی الجملہ آزاد ہو جائیں۔ یہ امر مشکل نہیں ہے مگر اس کے لیے متفقہ قومی آواز کی ضرورت ہے۔ مسلم تعلیمی کانفرنس کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے۔ مجھ کو قوی امید ہے کہ پوری مسلم قوم اس مسئلے میں کانفرنس کا ساتھ دے گی۔''

چند تجاویز:

اس کے بعد حضرت نے عربی تعلیم یافتہ حضرات کے مسائل کے حل کے لیے مندرجۂ ذیل چند تجاویز پیش فرمائیں:

(۱) کچھ کچھ معتدبہ وظائف ان طلبہ کے لیے مقرر کیے جائیں جو عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انگریزی پڑھنا چاہیں اور علیٰ ہذا القیاس انگریزی مدارس کے ان فارغ شدہ طلبہ کے لیے بھی جو عربی پڑھنا چاہیں۔ ان کے لیے بھی وظائف امدادیہ جاری کیے جائیں۔

(۲) جس طرح مولوی فاضل وغیرہ کے سند یافتہ صرف زبان انگریزی میں گورنمنٹی امتحانات میں شرکت کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، اسی طرح مسلم یونیورسٹی اپنے یہاں ایسے قوانین بنائے جن کے رو سے عربی مدارس کے فارغ شدہ طلبہ صرف انگریزی زبان کے امتحان میں شامل ہو سکیں۔ ان کے لیے تعلیم کا مستند انتظام کیا جائے کہ ایف اے کے بعد وہ بی اے کا امتحان دے سکیں۔

(۳) عربی مدارس کے طلبہ کے لیے ریلوے وغیرہ سے وہ تمام مراعاتیں ملنی چاہئیں جو انگریزی مدارس کے طلبہ یا ایڈ گرفتہ مدارس کے طلبہ کو ملتی ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس مستند مدارس عربیہ کی ایک فہرست تیار کرے جس کو گورنمنٹ بھی تسلیم کرے۔

(۴) قانون کے امتحانوں میں انگریزی زبان دانی کی شرط نہ رکھی جائے۔ امتحانات ملکی زبانوں میں ہوں۔ علمی استعداد شرط رکھی جائے، مگر حسب مراتب جن امتحانوں کے لیے میٹرک، انڈر گریجویٹ یا گریجویٹ کی شرط ہے وہ رکھی جائے اور اسی درجہ کے عربی اسنادوں کو بھی کافی سمجھا جائے عربی نصاب میں اس کے لیے مدارج قائم ہو سکتے ہیں اور بعض ضروری چیزوں کا نصاب میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

(۵) کورٹ کی لینگویج بدل دی جائے۔ اگر فوراً ہائی کورٹ کی زبان بدلی نہ جا سکے تو وہ انگریزی ہی رہنے دی جائے، لیکن دوسرے تمام کورٹوں کی زبان لازمی طور پر بدل دی جائے۔

(۶) رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں عربی کی اسناد کو بھی ملازمت کے لیے کافی سمجھا جائے۔

(۷) اوقاف کے تمام ذمہ دار عہدوں کے لیے عربی اور مذہبی تعلیم کی تکمیل کو ضروری سمجھا جائے۔ اور شرط کر دی جائے۔

(۸) محکمہ منصفی اور ججی (صدارت اعلیٰ) کے لیے جس میں اکثر قضاء شرعی اور تقسیم وراثت

وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ مذہبی تعلیم کی سند ضروری قرار دی جائے۔

(۹) مسلمانوں کو محکمہ قضاء حسب طلب عطا کیا جائے جس کا مطالبہ عرصہ دراز سے مسلمان کر رہے ہیں۔

(۱۰) آرٹ اور صنعت کی تعلیم میں عربی تعلیم کے سند یافتوں کو شرکت کا موقع دیا جائے۔

(۱۱) محکمہ ہائے انہار، زراعت، تجارت کی تعلیمات میں عربی تعلیم یافتوں کو شریک کیا جائے۔

(۱۲) یونیورسٹیوں کے وہ طلبہ جو عربی پڑھتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے کسی عربی دینی مدرسے میں جا کر قیام کیا کریں اور عربی کی اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کریں۔"

(خطبات صدارت: گوجرانوالہ (پاکستان)، ۱۹۹۰ء، صفحہ ۷۔۲۰۴)

جمعیت علماء ہند کا اجلاس:

۳۱ر مارچ (۱۹۳۷ء) کو الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کیا جائے۔ اس کے لیے الگ شعبہ قائم کیا گیا۔ جس کی ذمہ داری ڈاکٹر محمد اشرف سابق پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی کو سونپی گئی تھی۔

کانگریس کے اس فیصلے پر مسلم سیاسی جماعتوں میں خاصی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ آخر جمعیت علماء ہند نے ۵ر مئی کو مراد آباد میں مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا،

جمعیت کے اس اجلاس کی ضروری تفصیل ۵ر مئی کے ضمن میں ملاحظہ فرمائیں۔

صوبائی انتخابات کے نتائج:

اسمبلی کا اجلاس جاری تھا کہ اس دوران صوبائی اسمبلیوں کے انتخابی نتیجوں کا اعلان کر دیا گیا۔ سنٹرل اسمبلی کی طرح صوبوں میں بھی لیگ نے نمایاں کامیابی حاصل کی یا پھر کانگریس کامیاب ہوئی۔ لیکن سو فیصد نہیں بلکہ باسٹھ غیر مسلم سیٹوں میں اس نے ستاون سیٹیں حاصل کیں۔ اس کے برعکس غیر لیگی جماعتوں نے بری طرح شکست کھائی۔

پنجاب کی کل نشستیں	۸۶ تھیں	مسلم لیگ نے پچھتر پر قبضہ کر لیا
بنگال کی کل نشستیں	۱۱۹ تھیں	مسلم لیگ نے ۱۱۳ جیت لیں

آسام کی کل نشستیں	۳۷ تھیں	مسلم لیگ کو ۳۳ پر کامیابی ہوئی
سندھ کی کل نشستیں	۳۴ تھیں	مسلم لیگ نے ۲۸ حاصل کر لیں
یو پی کی کل نشستیں	۶۶ تھیں	مسلم لیگ کے پاس ۵۴ رہیں
بمبئی کی کل نشستیں	۳۰ تھیں	مسلم لیگ ۳۰ لے گئی
مدراس کی کل نشستیں	۲۹ تھیں	مسلم لیگ ۲۹ لے گئی
سی پی کی کل نشستیں	۱۴ تھیں	مسلم لیگ نے ۱۳ حاصل کر لیں
اڑیسہ کی کل نشستیں	۴ تھیں	مسلم لیگ نے ۴ حاصل کر لیں
سرحد کی کل نشستیں	۳۸ تھیں	مسلم لیگ نے ۱۷ حاصل کیں
بہار کی کل نشستیں	۴۰ تھیں	مسلم لیگ نے ۳۴ حاصل کیں

انتخابات (۱۹۳۷ء) میں کانگریس کی پوزیشن:

فروری کے آخر تک تمام صوبوں کے نتائج نکھر کر سامنے آ چکے تھے۔ اس کے نتیجے میں کانگریس کی پوزیشن حسب ذیل تھی

مدراس	کل دو سو پندرہ نشستیں	کانگریس	ایک سو اکیاون
بمبئی	کل ایک سو پچھتر نشستیں	کانگریس	اٹھاسی
اڑیسہ	کل ساٹھ نشستیں	کانگریس	چھتیس
یو پی	دو سو اٹھارہ نشستیں	کانگریس	ایک سو بارہ
سی پی	ایک سو بارہ نشستیں	کانگریس	اکہتر
بہار	ایک سو باون نشستیں	کانگریس	ستانوے
شمال مغربی صوبہ سرحد	پچاس نشستیں	کانگریس	انیس
آسام	ایک سو اٹھ نشستیں	کانگریس	پینتیس
بنگال	دو سو پچاس نشستیں	کانگریس	بیالیس
پنجاب	ایک سو پچھتر نشستیں	کانگریس	اٹھارہ
سندھ	ساٹھ نشستیں	کانگریس	سات

اس کے مقابل آل انڈیا مسلم لیگ کسی جگہ بھی ایسی پوزیشن حاصل نہ کر سکی کہ وہ اپنی وزارت

بنا سکتی۔ مثلاً بنگال میں مسلمانوں نے ایک سوتیس نشستیں حاصل کیں۔ یہاں کا لیڈر فضل الحق تھا اور وہ پرجا پارٹی بنا کر بیٹھا ہوا تھا گو اس کا اتحاد مسلم لیگ سے تھا مگر وزارت فضل الحق نے ترتیب دی، جسے لیگی وزارت نہیں کہا جا سکتا، پنجاب میں مسلم لیگ کے ناعاقبت اندیش کارکنوں کی وجہ سے مسلم لیگ کو شکست ہوئی۔ البتہ صوبجات متحدہ میں مسلم لیگ نے انیس نشستیں حاصل کیں یعنی اسی فیصد کامیاب رہے۔ لیکن یہاں وزارت بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ یہ علاقہ یو پی میں شامل تھا۔

مختصراً نتائج یہ ٹھہرے کہ مسلمانوں کے چار سو اکانوے حلقوں میں مسلم لیگ نے ایک سو چار نشستیں حاصل کیں۔ جب کہ کانگریس مدراس، یو پی، سی پی، بہار اور اڑیسہ میں واضح اکثریت سے کامیاب ہوئیں۔ (کاروان احرار، ج ۲)

۳۰ / مارچ ۱۹۳۷ء: ضلع کلھیڑہ کے محمد اسمعیل کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب تحریر فرمایا۔ سوال کا مفہوم جواب سے ظاہر ہے۔

''اگر پولنگ اسٹیشن پر عورتوں کے لیے پردے کا انتظام ہو اور غیر محرم مرد منتظم نہ ہوں بلکہ پیپر دینے لینے والی عورتیں کام کرتی ہوں تو عورتوں کو ووٹ دینے کے لیے جانا جائز ہے اور غیر محرم مرد ہوں تو عورتیں نہ جائیں بلکہ مطالبہ کریں کہ ان کے لیے زنانہ منتظم مقرر کیے جائیں۔ (محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی'' ۔ (کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ:

یکم اپریل ۱۹۳۷ء: یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا عملی طور پر نفاذ کر دیا گیا۔ اس کے تحت تمام صوبوں میں وزارتیں قائم کر دی گئیں۔ اس موقع پر ملک معظم نے گورنر جنرل کے نام حسب ذیل پیغام ارسال کیا:

''آج دستور اساسی کا پہلا حصہ نافذ ہو گیا ہے۔ جس کی تیاری کے لیے برطانیہ اور ہندوستان کے بہترین دماغوں نے متحدہ طور پر کام کیا تھا۔ اس موقع پر میں اپنی ہندوستانی رعایا کو یقین دلاتا ہوں کہ میری دعائیں ان کے ساتھ ہوں گی۔

آج ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے کامل امید ہے اور میری دعا ہے کہ جدید دستور اساسی کے پیدا کردہ مواقع سے فائدہ اٹھانے میں بصیرت سے کام لیں کیوں کہ اس سے میری ہندوستانی رعایا کو پورا فائدہ پہنچے گا۔''

برما علاحدہ کردیا گیا:

رنگون۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء نصف رات سے نئے آئین کے تحت صوبہ برما رسماً ہندوستان سے علاحدہ کردیا گیا۔ اس اعتبار سے برما اب برطانیہ کے زیر سایہ ایک الگ ملک قرار دیا گیا ہے۔ ایک تقریب میں غیر سرکاری افراد اور ملک کے اہم مندوبین کے روبرو برما کی علاحدگی کا اعلان کیا گیا اور تاجِ برطانیہ سے وفادار رہنے کا حلف لیا گیا۔

وزیر اعظم بنگال کا اعلان:

یکم اپریل ۱۹۳۷ء: کلکتہ یکم اپریل کو وزیر اعظم بنگال مسٹر فضل الحق نے اعلان کیا، کہ میں اخباروں میں دیکھتا ہوں کہ کہیں ہندوراج اور کہیں مسلم راج کے متعلق خوف و ہراس کا اظہار کیا جارہا ہے۔ میں اس موقعے پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بنگال میں مسلم راج اسی طرح نہیں ہوگا جس طرح بہار میں اور یوپی میں ہندوراج کا امکان نہیں۔ ہر جگہ برطانوی راج ہوگا۔ مختلف صوبوں میں یہ نمایاں خصوصیت ہوگی کہ کسی صوبے میں نظم ونسق چلانے والے زیادہ تر ہندو ہوں گے اور کسی صوبے میں یہ کام زیادہ تر مسلمانوں کے ذمہ ہوگا۔ لیکن حکومت کا تخیل اور نصب العین ہر جگہ برطانوی ہوگا۔ (روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ۳؍اپریل ۱۹۳۷ء)

۲۵؍اپریل ۱۹۳۷ء: الہ آباد ۲۵؍اپریل کو مسلم ماس کنٹیکٹ کے صدر ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف نے ایک اخباری بیان میں کہا:

''بعض حلقوں میں یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ میرے اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیت علمائے ہند کے درمیان کوئی ایسی گفتگو ہوئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے داخلے کے لیے شرائط متعین کی جائیں۔''

ایسی اطلاعات کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرف نے کہا:

''کانگریس نے بنیادی حقوق کے بارے میں جو ریزولیشن منظور کیا ہے۔ اس میں اقلیتوں کے تمام حقوق محفوظ کر دیے گئے ہیں، لہٰذا جدید معاہدات اور ضابطوں کی ضرورت نہیں۔ اقلیتوں کے تمدن، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی۔ مذہب، عقیدہ اور قوموں کے دیگر مسائل کے مطمح نظر قانون کے نزدیک ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ کسی شخص کو مذہب، قوم اور عقیدے کی بنا پر سرکاری ملازمت یا تجارت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ حکومت مذہبی امور میں غیر

جانبدار رہے گی۔'' (کاروانِ احرار، ج ۳)

مدنی اور بخاری میں مفاہمت:

۱۹۳۶ء کے انتخابات میں مجلس احرار، جمعیت علمائے ہند، کانگریس اور مسلم لیگ میں ایسا قضیہ ٹھہرا کہ اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھ سکا۔ تاہم ایک موڑ آیا کہ جمعیت علمائے ہند کا مسلم لیگ سے رشتہ طے پا گیا (گو اس رشتے کی گرہ مضبوط نہیں تھی) مجلس احرار اپنے موقف پر رہی اور کانگریس اپنے فعال ہونے پر۔ احرار ان سب جماعتوں سے الگ تھلگ چل رہی تھی۔

صوبہ یوپی جہاں کے مسلمانوں کی آبادی ہندو کے مقابل صرف چودہ فی صد تھی۔ سارے ہندوستان کی سیاست سے اس کا ذہن منفرد رہا۔ اس کے باوجود اس صوبے کا تعلقہ دار مسلمان اپنے زعم میں یہاں کے غیر مسلم سے اپنے کو برتر سمجھتا تھا۔ کانگریس پر مہاسبھا کا لیبل چسپاں تھا۔ مذہب کی رہنمائی جمعیت علمائے ہند کو حاصل تھی۔ سرمایہ دار مسلمان لیگ کو اپنی لونڈی سمجھے ہوئے تھا۔ احرار نہ کانگریس کے ہمنوا تھے نہ مسلم لیگ سے ان کی سانجھ تھی۔ البتہ مذہبی اصولوں کی بنیاد پر جمعیت اور احرار میں اشتراک تھا۔ سیاسی سوجھ بوجھ میں بھی اکثر مقام پر ہم آہنگی تھی لیکن کبھی کبھار ان مسافروں کے راستے بدلتے رہتے، جیسے کہ ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں احرار اپنے امیدواروں کی حمایت پر تھے۔ اور جمعیت علمائے ہند مسلم لیگ کے حق میں پروپیگنڈا کر رہی تھی۔

یوپی کے ایک حلقے میں مجلس احرار کے ٹکٹ پر مولانا محمد قاسم شاہجہانپوری انتخاب لڑ رہے تھے۔ ان کے مقابل مسلم لیگ کا امیدوار تھا۔ اس حلقے میں مسلم لیگ کی حمایت میں کانگریسی رہنما پنڈت پنتھ بھی پہنچے۔ اسی طرح ضلع سہارنپور میں نواب مقصود علی خاں احرار کے امیدوار تھے۔ ان کا سامنا کانگریس، جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ کر رہی تھی۔ احرار کی طرف سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن تھے۔ اس سیٹ پر معاملہ اس قدر نازک ہو گیا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی مسلم لیگ کی حمایت میں آن کھڑے ہوئے اور آمنے سامنے تقریریں ہوتی رہیں۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ بجنور سے الٰہ آباد جاتے ہوئے ریلوے اسٹیشن پر حضرت مدنی اور حضرت شاہ جی کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ چناں چہ شاہ جی نے عقیدت اور احترام کے پیش نظر حضرت مدنی سے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہا، لیکن حضرت مدنی نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا کہ آپ کا

مسلک غلط ہے۔ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں:

اس پر شاہ جی نے کہا:

''حضرت! اگر آپ حکم دیں تو میں اپنا دورہ ملتوی کر کے پنجاب واپس چلا جاؤں۔ چوں کہ آپ اس وقت مسلم لیگ سے اشتراک کیے ہوئے ہیں اور نیاز مندوں پر ناراض ہیں، حالانکہ آپ ہی فرمایا کرتے تھے کہ مسلم لیگ سرکار پرستوں کا ٹولہ ہے۔ خیر...... آپ کی مرضی۔''

اس مختصر گفتگو کے بعد دونوں اپنی اپنی منزل پر روانہ ہوگئے۔

اس واقعے کے قریباً آٹھ ماہ بعد ۳، ۴، ۵ر مئی ۱۹۳۷ء کو جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس مرادآباد میں ہورہا تھا۔ اس کے لیے حضرت امیر شریعت ۲ر مئی کو یہاں پہنچے۔ اور سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کی وساطت سے حضرت مدنی سے صلح ہوئی۔ (کاروانِ احرار، ج ۳)

۳ تا ۵ر مئی ۱۹۳۷ء: جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ان تاریخوں میں مرادآباد میں منعقد ہوا۔ اس کے متعدد اجلاسوں میں کئی اہم قرار دادیں پاس ہوئیں۔ اہم ترین بحث کانگریس میں شرکت کے جواز و عدم جواز کے مسئلے پر تھی۔ مولانا محمد میاں نے اس کارروائی کا خلاصہ اور فیصلہ مرتب کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۵ر مئی ۱۹۳۷ء کو مجلس عاملہ کے مباحثہ میں دوسرے دن حضرات کو بھی شریک کیا گیا جن کو جمعیۃ عاملہ نے اسی غرض کے لیے مدعو کیا تھا۔ اور جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں مولانا محمد صادق صاحب کراچی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، چودھری افضل حق صاحب، چودھری خلیق الزماں صاحب، مولانا کرم علی خان صاحب، مولانا مفتی محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولانا محمد میاں صاحب فاروقی، مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ایم ایل اے، مولوی عبد السلام صاحب، حافظ محمد ابراہیم صاحب ایم ایل اے، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا ابوالوفا صاحب، مولانا محمد منظور صاحب، ایڈیٹر الفرقان بریلی، مولانا حامد الانصاری غازی ایڈیٹر اخبار مدینہ بجنور، مولانا محی الدین صاحب قائد سب ایڈیٹر اخبار الجمعیۃ دہلی، مولانا سلطان الحق صاحب ایڈیٹر استقلال دیوبند۔

تیسرے دن شام تک اسی موضوع پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ اور شام کو ۶ بجے مجلس عاملہ کے ملتوی شدہ جلسہ کا باضابطہ آغاز ہوا۔ جس میں سب سے پیشتر سہ روزہ مباحثہ کی روشنی میں ذیل کا بیان مجلس عاملہ کی جانب سے مرتب کیا گیا اور بالاتفاق منظور ہوا۔

''ملک کے سیاسی حالات اور گزشتہ الیکشن کے نتائج اور اس سے پیدا شدہ ماحول اور کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کو کانگریس سے قریب تر لانے کی مساعی اور اس کے اثرات پر غور کرنے کے لیے جمعیت علماء ہند نے اپنی مجلس عاملہ کے جلسے سے قبل مسلم زعما کو مدعو کیا تھا۔ اور تین روز تک بے ضابطہ طور پر مجلس مشاورت جاری رہی۔ ارکان مجلس عاملہ اور حضرات مدعوین نے مباحثے میں پورے غور و انہماک کے ساتھ حصہ لیا اور ہر معاملے اور ہر گوشے پر روشنی ڈالی۔ مجلس عاملہ کے نزدیک یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ جہاں تک تحصیل آزادی اور ملکی و وطنی مفاد اور اجنبی طاقت کے اثر و نفوذ کی مدافعت کا تعلق ہے جمعیۃ علماء ہند نے ہر موقع پر اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے کانگریس کے ساتھ آزادی کی جنگ میں اشتراک عمل کیا ہے اور ہر قسم کی قربانیاں پیش کی ہیں۔ لہٰذا آزادی وطن اور ملکی مفاد کے سلسلے میں کانگریس کے ساتھ شریک ہونے یا نہ ہونے کا اس کے سامنے کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ہاں ہندوستان میں اکثریت کی حکومت قائم ہونے اور امن و امان کے ساتھ زندگی گزارنے اور وطن کو ایک اچھے منظم طاقتور نظام حکومت کے ماتحت ترقی دینے کا جہاں تک سوال ہے اس کے متعلق مجلس عاملہ کا یقین ہے کہ یہ بات صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ اقلیتوں کو اکثریت پر پورا پورا اعتماد ہو اور ان کے قلوب میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے، باہمی اعتماد اور دوستانہ روابط کے بغیر امن و اطمینان کی زندگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس اکثریت کا حتمی اور قطعی فریضہ یہ ہے کہ وہ اقلیتوں کو مطمئن کرنے اور ان کے قلوب میں اعتماد و محبت پیدا کرنے کے لیے مفید اور موثر طریقے اختیار کرے۔''

اس اجلاس میں حسب ذیل تجاویز بھی باتفاق رائے سے منظور ہوئیں۔

۱۔ حکومت کی جنگی کاروائی جو اس نے آزاد علاقے میں اختیار کر رکھی ہے، کی مذمت کی گئی۔

۲۔ ہندو اخبارات کے رویے کو ناپسند کیا گیا جو انھوں نے شمال مغربی سرحد کے آزاد علاقے کے خلاف حکومت کی جابرانہ جنگی کاروائی کو سراہنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے میں حکومت کو ان کے خلاف برانگیختہ کرنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔

۳۔ مجلس عاملہ نے اجلاس کی آخری قرارداد میں کانگریس کو اس شدید خطرے کی طرف توجہ دلائی، جو ہندوستان میں وطنی مفاد کو تباہ کرنے کے لیے فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ کانگریس اور ہر محب وطن کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے فسادات کو روکیں'۔

(کاروانِ احرار: ج ۳)

۶؍جون ۱۹۳۷ء: مولوی غلام حبیب (ضلع پشاور) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے انھیں تحریر فرمایا:

''کانگریس کو ہندوؤں کی جماعت کہنا بھی اصولاً درست نہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی جماعت ہے اور ہندوستانیوں میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ اور ہندوؤں کی اس میں کثرت ضرور ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد ہی زیادہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان شرکت کانگریس میں غفلت اور کوتاہی کرتے ہیں۔ بہر حال اپنے فائدے کے لیے کفار کے ساتھ اشتراک عمل کرنا جائز ہے۔'' محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی۔ (کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۱۵؍جون ۱۹۳۷ء: لکھنو میں شیعہ سنی اختلاف کے مسئلے پر گورنمنٹ نے جو مدح صحابہ کمیشن مسٹر السپ کی سربراہی میں گزشتہ سال قائم کیا تھا، اس نے ۱۵؍جون کو اپنی رپورٹ گورنمنٹ کو پیش کر دی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے مدح صحابہ کے حق کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ رپورٹ ابھی شائع نہیں کی گئی۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے کمیشن کے سامنے بیان دیا تھا اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش فرمایا تھا۔ (تاریخ احرار: افضل حق، ۱۹۶۸ء، ملتان، صفحہ ۳۳۲-۳۳۳)

اعلان بالفور:

۷؍جولائی ۱۹۳۷ء: جنگ عظیم آخری مراحل میں داخل تھی۔ شریف مکہ کے عرب دوست خوش تھے کہ اب انھیں تمام حجاز کا وارث بنا دیا جائے گا کہ دفعتہً ۲؍نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے اعلان کر دیا کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنایا جائے گا۔ اس اعلان کے الفاظ یہ ہیں:

''ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی قوم کے قومی وطن کے قیام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہ واضح طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں کی جائے گی جو فلسطین کی موجودہ غیر یہودی اقوام کے شہری اور مذہبی حقوق کو نقصان پہنچا سکے۔ یا ان حقوق اور سیاسی موقف کو جن سے یہودی کسی اور ملک میں بہرہ اندوز ہوں، مضرت پہنچائیں۔''

اس اعلان پر عربوں نے سخت احتجاج کیا تو برطانیہ کی ایک اور سحر انگیز آواز نے انھیں بیوقوف بنا دیا۔ انھیں یہ کہا گیا:

''بے شک فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کا وعدہ اعلان میں ہے۔ مگر ساتھ یہ بھی مذکورہ ہے کہ عربوں کے سیاسی و معاشی وقار کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

عرب پھر فریب کھا گئے۔ انھیں یقین تھا کہ حسب وعدہ برطانیہ سے جب ہم تمام عرب سلطنت حاصل کر لیں گے تو یہودیوں سے نپٹ لیں گے۔

اعلان بالفور کے فوراً بعد اس علاقے میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا:

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

آخر اپریل ۱۹۲۰ء کا ایک دن آیا۔ جب یہودیوں اور عربوں کے درمیان فلسطین میں پہلا فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس فساد میں پانچ یہودی مارے گئے اور دو سو سے زائد زخمی ہوئے عرب غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے۔ اسی دوران ایک یہودی سر ہربرٹ سموئیل کو فلسطین کا ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا۔ اس پر یہودی جس قدر خوش ہوئے، اسی قدر عربوں کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔

۲۴ر جولائی ۱۹۲۲ء کو عملی طور پر فلسطین الگ کر کے برطانوی انتظام میں دے دیا گیا تو عربوں کی آنکھیں کھلیں کہ برطانیہ نے ان سے جو وعدے کیے تھے، وہ سب کے سب ریت کے گھروندے ثابت ہوئے۔

آخر وقت کو ٹالنے اور عربوں کی دل جوئی کے لیے دکھاوے کے طور پر اگست ۱۹۳۶ء کو لارڈ پیل کی صدارت میں ایک شاہی کمیشن قائم کر دیا گیا۔ جس نے ۷ر جولائی ۱۹۳۷ء کو مندرجہ بالا رپورٹ پیش کی۔

(مندرجہ بالا تاریخی مواد میجر جنرل محمد اکبر کی کتاب ''محشر فلسطین'' اور سید نصیر احمد جاہی کی تصنیف کردہ ''مشہور تاریخی واقعات'' سے ماخوذ ہے۔)

یہودیوں کے قومی وطن کے قیام پر احتجاج:

شاہی کمیشن کی رپورٹ اور برطانوی فیصلے کے خلاف افریقہ سے مڈل ایسٹ اور ایشیا کے تمام لوگوں نے بلا امتیاز احتجاج کیا کہ فلسطین کو تقسیم کر کے اور اسے وطن یہود قرار دے کر برطانوی سامراج نے عربوں سے نہ صرف غداری کی بلکہ ان کی آزادی اور آبادی کو سلب کر کے انسانیت پر ظلم کیا ہے۔ اس کا اعتراف خود لارڈ جارج شاہی کمیشن کے سامنے شہادت دیتے وقت ان الفاظ میں ادا کرتا ہے:

''منصوبہ یہ تھا کہ اکثریت کی خواہش کا جائزہ لیے بغیر معاہدہ صلح کے ذریعے فی الفور یہودی

ریاست قائم کردی جائے گی۔ بلکہ خیال تھا کہ فلسطین میں نمائندہ وزارت کے قیام تک اگر یہودی قومی وطن کے مواقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور فلسطین کی آبادی میں قطعی اکثریت بنالیں گے تو خود بخود فلسطین ایک یہودی ریاست کی حیثیت اختیار کر لے گا۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر برطانیہ نے یہودیوں کے لیے تمام دروازے کھول دیے۔ برطانیہ کی اس حرکت نے عربوں کے اندر یہودیوں سے نفرت کے جذبات پیدا کر دیے۔''

یہودیوں کا قومی وطن اور مولانا مودودی کی منطق:

اس پر دنیا بھر کے اخبارات، سیاسی و مذہبی جماعتوں نے سالہا سال تک اپنے اجلاسوں میں برطانیہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ البتہ اس واقعے سے کئی سال بعد جماعت اسلامی کے رہنما مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے عالم اسلام اور ملکی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی جماعت کے ایک ہفت روزہ میں لکھا:

''ہم بھی یہ سوچ سکتے ہیں کہ عربوں کی خاطر ہم ساری دنیا کے یہودیوں سے اپنے تعلقات کیوں خراب کریں۔ یہودی دنیا کی تمام بڑی بڑی طاقتوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیں اپنی تجارت سے زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

(ہفت روزہ ایشیا لاہور ۹ر نومبر ۱۹۶۹ء بہ حوالہ ترجمان اسلام لاہور ۲۰ر مارچ ۱۹۷۰ء)

کانگریس نے وزارتیں قبول کرلیں:

۹ر جولائی ۱۹۳۷ء: کئی ماہ کی ردوکد کے بعد وائسرائے ہند کی یقین دہانی پر کہ گورنر، وزرا کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۷ر جولائی کو واردھا میں ان صوبوں میں جہاں سے اسے گذشتہ الیکشن میں کامیابی حاصل ہوئی تھی، اپنے ممبران کو وزارتیں قبول کرنے کا مشورہ دیا اور اس فیصلے کے مطابق ۹ر جولائی کو سی۔ پی کے سابق وزیر اعظم کی جگہ کانگریس نے وزارت بنائی۔ مدراس میں راج گوپال اچاریہ اور بمبئی میں مسٹر بی۔ جے۔ کھیر وزیر اعظم بنائے گئے۔ اسی طرح یوپی میں نواب چھتاری کی جگہ پنڈت پنت یوپی کے وزیر اعظم بنے۔ (کاروان احرار، ج ۳)

مولانا آزاد نے وزارت سازی کے حق میں رائے دی:

انتخابات کے خاتمہ کے ساتھ ہی کانگریس نئے اختلافات کا شکار ہوگئی۔ ایک گروہ ایکٹ

۱۹۳۵ء کے تحت محدود اختیارات کے پیش نظر صوبوں میں حکومتی عہدے قبول کرنے کے حق میں نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ گورنر حکومتوں کو الیکشن مینی فیسٹو کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں مزاحم ہوں گے اور ٹکراؤ پیدا ہوگا لہذا کانگریس کے ممبران حکومتی عہدے قبول نہ کریں البتہ قانون ساز مجالس میں ایکٹ کو ناقابل عمل بنانے کی پالیسی اختیار کی جائے۔

مولانا آزاد کی رائے اس سے بالکل مختلف تھی ان کا استدلال تھا کہ ایکٹ میں صوبائی حکومتوں کو جو اختیارات تفویض کیے گئے ہیں، ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور جب گورنر سے تصادم کا موقع پیدا ہو تو حالات کے مطابق مناسب قدم اٹھایا جائے۔ مزید برآں وزارتوں کے گورنر سے اختلافات منظر عام پر آئیں گے تو قوم کی ہمدردی کانگریس کے ساتھ ہوگی اس سے عوام پر کانگریس کا اثر اور غلبہ بڑھ جائے گا، اس سے کانگریس کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا اور برطانوی حکومت خسارے میں رہے گی۔ جب وردھا میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تو حقیقت کا اعتراف کرنے میں پس وپیش سے کام لیا جارہا تھا کیوں کہ کانگریس کے ذمہ دار حلقے اقتدار نہ سنبھالنے کے بارے میں قطعی رائے ظاہر کرچکے تھے یہاں تک کہ کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے عہدے قبول کرنے کے خلاف بڑا واضح اظہار خیال کیا تھا اس سے کانگریس کے لیے نئی پوزیشن اختیار کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس نازک موقع پر مولانا آزاد نے صورت حال کو سنبھالا۔ انھوں نے صاف الفاظ میں تجویز پیش کی کہ کانگریس کو عہدے قبول کرلینا چاہیے گاندھی جی نے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کی اور کانگریس نے صوبوں میں وزارت سازی کا یادگار فیصلہ کیا۔

قصہ یو۔ پی میں وزارت سازی کا:

یوپی، بہار، سرحد، پنجاب سندھ اور بنگال کے پارلیمنٹری معاملات مولانا آزاد کے سپرد تھے۔ چناں چہ وہ یو۔ پی میں وزارت سازی کے لیے لکھنو پہنچے۔ صوبے میں کانگریس اگرچہ تنہا وزارت سازی کرسکتی تھی (۱) لیکن انھوں نے ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد کی خاطر کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب لانے کے لیے مخلوط حکومت بنانے کو ترجیح دی۔ انھوں نے اس سلسلے میں چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں سے گفت وشنید کی۔ اگرچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس ۲۷ر فروری تا یکم مارچ ۱۹۳۷ء میں فیصلہ کردیا تھا کہ صوبائی اسمبلیوں کی پارٹیاں

---

(۱) یو۔ پی اسمبلی ۲۲۸ ارکان پر مشتمل تھی جس میں کانگریس کے ۱۳۴ اراکین تھے ان میں کانگریسی مسلمان بھی تھے۔ (Towards Freedom: ڈاکٹر پی۔ این چوپڑا، صفحہ ۲۲۷ جلد نمبر اول (۱۹۸۵ء) نیو دہلی)۔

ورکنگ کمیٹی کی اجازت کے بغیر اسمبلیوں کے دیگر گروپوں سے ہرگز الائنس نہیں کریں گی (۱)۔ پھر بھی مولانا نے اس خوش اعتقادی پر کہ شق نمبر۱۰ میں گنجائش موجود ہے (۲) سلسلہ جنبانی کی، وہ کہتے ہیں:

''چودھری خلیق الزماں اور نواب محمد اسماعیل خاں اس وقت یوپی مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ جب میں وزارت بنانے کے سلسلے میں لکھنو آیا تو ان دونوں سے بات کی۔ ان دونوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ نہ صرف کانگریس سے تعاون کریں گے، بلکہ کانگریس کے پروگرام کی پوری پوری حمایت کریں گے، قدرتی طور پر ان کو امید تھی کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ بھی شریک کی جائی گی، مقامی حالات کچھ ایسے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کو چھوڑ کر وزارت میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا، یا دونوں لیے جاتے یا دونوں چھوڑ دیے جاتے۔ اس لیے میں نے امید دلائی تھی کہ دونوں لیے جائیں گے۔ اگر وزارت صرف سات ارکان پر مشتمل ہوتی، تو ان میں دو مسلم لیگی ہوتے اور باقی سب کانگریسی، اگر کابینہ نو ممبروں کی بنتی تو کانگریس کی اکثریت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ مجھ سے گفتگو کے بعد ایک نوٹ تیار کیا گیا تھا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس سے اشتراک عمل کرے گی اور کانگریس کا پروگرام قبول کرے گی۔ نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں نے اس پر دستخط کر دیے۔'' (۳)

یوپی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مولانا وزارت سازی کے لیے بہار کے صدر مقام پٹنہ روانہ ہو گئے۔ جب وہ چند دنوں بعد الٰہ آباد پہنچے تو انھیں یہ معلوم کر کے شدید صدمہ ہوا کہ جواہر لال نے چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو لکھ دیا ہے کہ ان میں سے صرف ایک کو وزارت میں لیا جائے سکے گا اور اس کا فیصلہ مسلم لیگ پارٹی کر سکتی ہے کہ ان میں سے کون وزارت

---

(۱) دی انڈین نیشنل کانگریس، ریزولیوشنز ۳۷-۱۹۳۶ء الٰہ آباد اے۔ آئی۔ سی۔ سی (۱۹۳۸ء) صفحہ ۴۴-۴۶ شق نمبر۹)

(۲) کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب نہ ہونے والا کوئی ممبر کانگریس کا حلف نامہ قبول کر کے کانگریس میں شامل ہو سکتا ہے۔ اسے کانگریس کے اصولوں اور نظم وضبط کا پابند ہونا پڑے گا۔ (ایضاً شق نمبر۱۰)

(۳) ہماری آزادی ۲۶-۳۴۵ نواب سر یامین خان نے بھی بالکل یہی لکھا ہے کہ خلیق الزمان اور نواب اسماعیل خان نے ایک مسودہ پر دستخط کر کے کانگریس کو دے دیے۔ کہ وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کریں گے اور کانگریس کے ساتھ رہیں گے۔ (نامۂ اعمال صفحہ ۶۷۶ جلد اول ۱۹۷۰ء)

میں لیا جائے؟ جواہر لال کا استدلال یہ تھا کہ جب ایوان میں مسلم لیگ کے ممبروں کی کل تعداد چھبیس ہے(۱)۔تو اس تناسب سے کابینہ میں اس کی ایک وزارت بنتی ہے اسے زیادہ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔(۲) پنڈت جواہر لال نہرو معاملہ کو خالصتاً (۳) حساب کے فارمولے کے تحت حل کرنا چاہتے تھے جب کہ مولانا اس مسئلے کو سیاسی نظر سے دیکھتے تھے۔دونوں اصحاب میں ہم آہنگی نہ ہوسکی۔مولانا نے گاندھی جی کو معاملے کے تمام پہلوؤں سے آگاہ کیا انھوں نے مولانا سے اتفاق کیا اور وعدہ کیا کہ وہ جواہر لال کو اپنے فیصلے میں مناسب ترمیم کرنے کا مشورہ دیں گے۔مولانا رقم طراز ہیں:

---

(۱) خلیق الزمان یہ تعداد ۲۹ بتاتے ہیں (پاتھ وے ٹو پاکستان صفحہ ۱۵۲) لیکن سریا مین نے مسلم لیگ کی ممبروں کے تعداد چھبیس ہی لکھی ہے (نامہ اعمال صفحہ ۶۶۵ جلد اول ۱۹۷۰ء) وزیر ہند نے ۱۲/مارچ ۱۹۳۷ء کو جو سرکلر برطانوی کابینہ کے ارکان کو بھیجا اس میں یو۔پی اسمبلی میں مسلم لیگ کے ممبروں کی کل تعداد چھبیس ہی درج ہے (ڈاکومنٹ نمبر ۱۰۷، کیبنٹ پیپر ۲۶۴، ۲۴، بحوالہ چوپڑہ صفحہ ۲۲۷ جلد اول نئی دہلی ۱۹۸۵ء) البتہ یوپی کے گورنر مسٹر ہیگ نے ۳۱/مارچ ۱۹۳۷ء کو جو مکتوب وائسرائے لارڈ لن لتھگو کو لکھا اس میں یہ تعداد ستائیس لکھی ہے۔(ڈاکو منٹ نمبر ۱۵۴ بحوالہ چوپڑہ صفحہ ۳۱۰ جلد اول) دی گریٹ ڈیوائڈ کے مصنف ایچ۔وی ہڈسن نے بھی مسلم لیگی ممبروں کی تعداد ۲۶ ہی رقم کی ہے (صفحہ ۶۷) چودھری خلیق الزماں کے دعوے کی تصدیق کسی ذریعے سے نہیں ہوتی اندریں حالات مولانا کی روایت کو درست تسلیم کرنے کے سوا چارہ کار نہیں۔یو۔پی کے مسلم لیگیوں نے ۲۵ افراد پر مشتمل پارلیمنٹری بورڈ بنایا تھا بڑی کاوش اور تگ ودو کے بعد ۶۶ مسلم سیٹوں پر صرف چھتیس امیدوار نامزد کیے گئے تھے۔(پاتھ وے ٹو پاکستان صفحہ ۱۴۶) ایس آر مہرترا کے مطابق یو۔پی اسمبلی کے لیے مسلمانوں کی مخصوص سیٹوں کی تعداد چونسٹھ تھی۔(صفحہ ۶۔۳۰۵)۔

(۲) ہماری آزادی صفحہ ۳۲۷۔

(۳) چودھری خلیق الزماں پنڈت جواہر لال نہرو کے رویے سے سخت پریشان تھے ان کا کہنا تھا کہ کانگریس نے جمہوری اصولوں کو آڑ بنا کر اعانت کی پروا نہ کی یہ اصول ہندوستان کے خصوصی حالات میں قابل عمل نہ تھے۔(شاہراہ پاکستان صفحہ ۶۴۳) چودھری خلیق الزمان کا فارمولا یہ تھا کہ مسلم لیگ کے وزرا کی تعداد کابینہ میں ایک تہائی ہونی چاہیے۔یعنی چھ میں دو اور نو میں تین (ایضاً صفحہ ۶۴۱ و پاتھ وے ٹو پاکستان صفحہ ۱۶۰) چناں چہ وہ جواہر لال نہرو سے ملے اور کہا کہ انھیں اور نواب اسماعیل کو وزارت میں لے لیں جیسا کہ ابوالکلام آزاد نے انھیں اطمینان دلایا ہے (نامۂ اعمال: جلد اول، ۱۹۷۰ء)

''جب جواہر لال نے معاملہ کو دوسرے رنگ میں پیش کیا تو گاندھی جی ان کی بات مان گئے اور جتنا اصرار ان کو کرنا چاہیے تھا نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یوپی میں مسلم لیگ سے سمجھوتا نہیں ہوسکا۔ مسٹر جناح نے صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جارحانہ اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کردیا۔ جس کا آخری نتیجہ پاکستان کا قیام تھا۔'' (۱) اس مسئلے پر چودھری خلیق الزماں نے شاہراہ پاکستان میں روشنی ڈالی ہے اور ان کی تصنیف اس وقت منظر عام پر آئی جب ''انڈیا ونس فریڈم'' زیور طبع سے آراستہ ہوکر بازار میں آچکی تھی۔ چودھری خلیق الزامان نے مولانا کے بیان کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے اور انکار کے باوجود اقرار کرنے کے سوا چارہ نہیں ملا۔ چودھری خلیق الزماں کے بیان کی اکثر مقامات پر نواب اسماعیل خان کے صاحبزادے آئی۔ اے خان نے زبردست تردید کی ہے اور ان کے بیان کو کذب وافترا سے تعبیر کی ہے۔ بعض واقعات کو بالکل غلط اور چودھری خلیق الزماں کے ذہن کی اختراع قرار دیا ہے۔ میرٹھ سے مولانا کے ساتھ ٹیلیفون پر گفتگو کرنے کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں بتایا البتہ دومرتبہ پنڈت پنتھ سے بات چیت ہوئی جس کو وہ مولانا سے مذاکرات کا نام دیتے ہیں۔ مسٹر آئی۔ اے خان کا یہ آرٹیکل روزنامہ ''ڈان'' کراچی کے شمارہ ۲ ردسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے یہاں چودھری خلیق الزماں کی تصنیف ''شاہراہ پاکستان'' اور مسٹر آئی۔ اے خان کے آرٹیکل سے ضروری حصے درج کیے جاتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے چودھری خلیق الزماں کے دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے کہ کس طرح تاریخ کے معصوم چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟ اس سے قبل ''مارشل لا سے مارشل لا تک'' سے ایک اقتباس کا اندراج خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس سے یو۔ پی میں مسلم لیگ کے وجود وعدم کا حال معلوم ہوتا ہے۔ سید نور احمد صفحہ ۱۸۶ پر رقم طراز ہیں:

''یو۔ پی میں مسلم لیگ اور کانگریس نے صوبائی انتخابات غیر رسمی اور ذہنی تعاون اور یک جہتی کی فضا میں لڑے۔ اس صوبے کی مسلم لیگ عملاً وہی تھی، جس نے ۱۹۳۴ء میں مسلم یونٹی بورڈ کے نام سے مرکزی اسمبلی کے انتخابات کانگریس کے مسلم بازو کی حیثیت سے لڑے تھے۔''

چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں ۱۲؍ جولائی کو مولانا آزاد لکھنو پہنچے اور کانگریس لیگ سمجھوتے کے لیے گفتگو کا آغاز ہوا۔ مولانا نے استفسار کیا کہ کسی سیاسی مسئلے پر لڑائی لڑ کر کانگریسی وزارت

(۱) ہماری آزادی صفحہ ۳۲۶۔ یو۔ پی میں وزارت سازی کا مسلم لیگ کو شدید صدمہ تھا (ڈاکٹر تاراچند، صفحہ ۲۸۳: جلد نمبر ۴)

مستعفی ہو جائے اور اسمبلی کا بائیکاٹ کر دے تو مسلم لیگ کا رویہ کیا ہوگا؟ چودھری خلیق الزماں نے جواب دیا ''اگر کانگریس کسی سیاسی مسئلے پر گورنمنٹ سے ٹکر لیتی ہے تو مسلم لیگ اس کا ساتھ دینے کی اخلاقی طور پر پابند ہے۔'' مولانا نے پوچھا ''آپ حافظ ابراہیم کو مسلم لیگ کے وزرا میں شریک کرلیں گے؟ چودھری صاحب نے جواب دیا میرے شریک کار نواب اسماعیل خاں ہوں گے؟'' چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں کہ انھوں نے مولانا کے کہنے پر انھیں یہ لکھ دیا کہ اگر کسی ملکی مفاد کی خاطر کانگریس حکومت سے مستعفی ہوگی تو مسلم لیگ کے وزرا بھی جو کابینہ میں شریک ہوں گے؟ مستعفی ہو جائیں گے۔''(۱)

کہتے ہیں کہ تین یوم بعد مولانا سے پنڈت پنتھ کے ہمراہ پھر ملاقات ہوئی اور انھوں نے دو صفحات پر مشتمل انگریزی میں ٹائپ شدہ ایک مسودہ حوالے کیا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ اسمبلی کا مسلم لیگ گروپ کانگرس میں مدغم ہو جائے، اپنا علاحدہ تشخص ختم کر دے، کانگریس پارٹی میں ممبر کی حیثیت سے شامل ہو جائے۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے اسے مسترد کر دیا۔(۲) چودھری خلیق الزماں کا کہنا ہے کہ انھوں نے پنڈت پنتھ سے کہا کہ مسلم لیگ کا معاشی پروگرام وہی ہے جو تمام تر کانگریس کا ہے(۳)۔ اب جو صورت حال آپ پیدا کر رہے ہیں وہ کانگریس کے لیے نہایت خطرناک ہے۔(۴) چودھری خلیق الزماں مولانا سے پنڈت پنتھ کی سرکاری رہائش گاہ

---

(۱) شاہراہ پاکستان صفحہ ۶۳۷

(۲) پنڈت جواہر لال نہرو کے مکتوب بنام ڈاکٹر راجندر پرشاد ۲۱۔ جولائی ۱۹۳۷ء سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ (بحوالہ چوپڑہ صفحہ ۶۸۔۷۶۶) خلیق الزمان لکھتے ہیں ''وزارتوں کے سلسلہ میں میں نے یہاں تک مولانا کو لکھ کر دے دیا تھا کہ ملکی مسائل میں مسلم لیگ کے ممبر کانگریس کا گلے گلے تک ساتھ دیں گے'' (شاہراہ پاکستان صفحہ ۶۴۲)

(۳) لیکن جب حصول اقتدار کی امیدیں معدوم ہوگئیں تو ان کے یہ خیالات بھی تبدیل ہو گئے اب وہ معاشیات کے حوالے سے بھی فرقہ وارانہ نہج پر گفتگو کرنے لگے تھے ان کا کہنا تھا۔ ''اس ملک میں ایک بڑی حد تک معاشیات بھی ہندو مسلمان ہیں۔'' (ایضاً صفحہ ۶۴۰)

(۴) کیوں کہ اب معاملات الیکشن سے پہلے کی افہام و تفہیم کے مطابق طے نہ پا رہے تھے۔ چناں چہ ۱۲ مئی ۱۹۳۷ کو چودھری خلیق الزمان پنڈت جواہر لال نہرو سے آنند بھون میں ملے۔ وہ صاحب فراش تھے اس ملاقات کا احوال لکھتے ہیں۔ کہ ان سے گفتگو شروع کرنے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ وہ ان حالات سے باخبر تھے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

پر ایک بار پھر ملے اور بقول ان کے مولانا نے انھیں پہلے مسودہ سے کچھ لفظ اوپر نیچے کر کے ا
سے بات کر کے جواب دیں گے۔

چودھری صاحب میرٹھ گئے اور شرائط نامہ نواب اسماعیل کو دکھایا۔ دراصل وہ میرٹھ اس لیے
گئے تھے کہ پنڈت جواہرلال نہرو کے انکار کرنے سے جو صورت حال بنی ہے اس کو کس طرح

(بقیہ حاشیہ نمبر ۴ یہاں دیکھیں)

جن کے باعث مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ تشکیل دیا گیا تھا، مسلم لیگ نے الیکشن میں حصہ لیا تھا۔ مسلم لیگ نے الیکشن مینی فیسٹو تیار کرتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا تھا کہ یہ ممکن حد تک کانگریس کے معاشی پروگرام کے قریب تر ہو۔ (پاتھ وے ٹو پاکستان، صفحہ ۱۵۶) اس سے صاف ظاہر ہے کہ خلیق الزمان اور پنڈت جی کے درمیان الیکشن سے پہلے ہی افہام وتفہیم ہوگئی تھی اور معاملات طے پا گئے تھے۔ ''اس ملاقات میں وہ یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ اسمبلی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے تعاون سے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۷) لیکن الیکشن میں کانگریس کی غیر متوقع کامیابی دیکھ کر پنڈت جی کے اندازِ فکر میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ان کے دیرینہ دوست عبدالولی کے مکتوب سے اسے مزید تقویت ملی۔ چناں چہ انھوں نے ۳۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو جو مکتوب پنڈت پنت کو لکھا اس میں کہتے ہیں۔ ''میں ذاتی طور پر اس کا قائل ہوں کہ مسلم لیگ کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ یا مخلوط حکومت کی تشکیل شدید نقصان دہ ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم بطور استحقاق اس سے تقریباً دستبردار ہو جائیں کہ مسلمانوں کو کانگریس میں براہ راست شامل ہونے کی دعوت دیں۔ لیکن ابوالکلام آزاد اس کے زبردست مخالف ہیں (بحوالہ چوپڑہ صفحہ ۲۹۹) عبدالولی ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے کل وقتی اسسٹنٹ سیکرٹری تھے انھوں نے ۲۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو بارہ بنکی سے پنڈت جواہرلال نہرو کو ایک خط لکھا۔ جس میں انکشاف کیا کہ رفیع احمد قدوائی کے ذریعے ان کا رابطہ خلیق الزمان سے ہوا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران میں جو نتیجہ اخذ کیا اس کے مطابق خلیق جاہ طلبی کی ہوس میں بری طرح گرفتار ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اپنے داؤ و پیچ پر انحصار کرتے ہیں جو اسے گم کردہ راہ بنا دیں گے۔ گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان مخلوط حکومت بنانے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہتا ہوں کہ میں اس کا زبردست مخالف ہوں۔ میرا یہ یقین ہے کہ اگر کانگریس مسلم لیگ سے کوئی معاہدہ کرتی ہے یا مخلوط حکومت بناتی ہے تو کانگریس اپنا فرض ادا نہ کرے گی ..... اسے فرقہ پرست گروہوں سے ایسے معاہدے نہیں کرنے چاہئیں۔ میرا خیال ہے اگر کانگریس ایک مرتبہ مسلم لیگ سے معاہدہ کرتی ہے تو وہ مسلمانوں کو شرکت کی دعوت دینے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔..... مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی حمایت رکھنے کا دعویٰ کرنے کی حق دار نہیں ہے، اندریں صورت ایسی تنظیم سے معاہدہ کرنے سے کیا حاصل؟ جو ذمہ داریاں سنبھالنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ..... یہاں تک کہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں بھی مسلم لیگ کا نام و نشان نہیں۔ (اے۔ آئی۔ سی۔ سی۔ فائل نمبر پی ۵ (۱) ۱۹۳۷ء، بحوالہ چوپڑہ صفحہ ۸۹۔۲۸۸)

سیاسی لبادہ اوڑھایا جائے اور سرخروئی حاصل کی جائے؟ چناں چہ فرقہ واری مسئلہ پیدا کرنے کا فیصلہ ہوا تا کہ کانگریس یہ نہ کہہ سکے کہ مسلم لیگ معاشی پروگرام سے گھبراتی ہے۔ باہر یہ تاثر دیا جائے کہ اختلافات مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں ہیں اب اس پر اصرار کیا جانے لگا کہ مسلمانوں کے مذہب، مذہبی روایات، زبان، ملازمتوں اور دیگر سیاسی حقوق کے بارے میں مسلم لیگ اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے میں آزاد ہوگی (۱)۔ اس پہلو پر شام کو چھ بجے پنڈت پنتھ نے لکھنو سے ٹیلیفون پر چودھری صاحب سے گفتگو کی اور مولانا سے بھی استفسار کیا۔

چودھری صاحب کے دونوں وعاوی کی نواب اسماعیل خاں کے صاحبزادے مسٹر آئی۔ اے خان نے تردید کردی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تب نواب اسماعیل خاں کی رہائش گاہ پر ٹیلیفون نصب نہ تھا اس لیے پنڈت پنتھ کا میرٹھ ٹیلیفون پر بات چیت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چودھری خلیق الزماں نے خود میرٹھ سے دو مرتبہ ٹیلیفون پر پنڈت پنتھ سے بات چیت ضرور کی۔ دونوں مرتبہ انھوں نے جنرل پوسٹ آفس جا کر ٹیلیفون کیا اور مسٹر آئی۔ اے خان ان کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے چودھری صاحب کی گفتگو سنی تھی۔ مسٹر خان لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ٹیلیفون پر گفتگو کرنے اور پنتھ جی کی لکھنو سے کال کے بارے میں لکھا ہے۔ حقیقت میں یہ بالکل غلط ہے۔ صرف دو مرتبہ ٹیلیفون کیا گیا اور دونوں مرتبہ ٹیلیفون چودھری صاحب نے خود کیا۔ نواب اسماعیل خاں ان کے ساتھ لکھنو نہیں گئے۔ میں چودھری صاحب کو ریلوے اسٹیشن لے کر گیا اور انھیں الوداع کہا۔'' (۲) جب کہ

---

(۱) چودھری خلیق الزمان نے ۳۰ رجولائی ۱۹۳۷ء کو جو اخباری بیان جاری کیا اس میں ان شرائط کا بطور خاص ذکر تک نہیں کیا بلکہ ان کا کہنا تھا ''میں ایک ناممکن کام کو نہایت شائستگی سے سرانجام دینے کی کوشش کر رہا تھا'' (''لیڈر'' ۴ راگست ۱۹۳۷ء) یہ کام واقعی بہت مشکل تھا بابو راجندر پرشاد ایک بیان میں کہہ چکے تھے کہ کانگریس کسی دوسری جماعت سے مل کر اسمبلی کے اندر وزارت سازی نہیں کرے گی (مرزا جانباز صفحہ ۴۹۲ جلد دوئم) چناں چہ اس بیان سے چودھری خلیق الزماں کافی پریشان تھے وہ اپنی پریشانی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں'' آخر اس بیان کی اتنی جلدی کیا تھی جب کہ ابھی دوسرے صوبوں کے انتخابی نتائج کا اعلان باقی ہے۔ علاوہ ازیں الیکشن کے دوران لیگ اور کانگریس کا کوئی باقاعدہ تحریری سمجھوتا نہ تھا پھر بھی دونوں ادارے ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے تھے۔ (شاہراہ پاکستان صفحہ ۶۲۰)

(۲) روزنامہ ''ڈان'' کراچی ۲ر دسمبر ۱۹۸۸ء

چودھری کا دعویٰ ہے کہ ۲۶؍جولائی ۱۹۳۷ء کو نواب اسماعیل خاں اور وہ دونوں صبح کی گاڑی سے لکھنؤ پہنچ گئے، مولانا سے ملے اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا کیوں کہ رفیع احمد قدوائی کو وزارت میں لے لیا گیا قبل ازیں حافظ محمد ابراہیم بھی حلف اٹھا چکے تھے۔ یو۔ پی کی کابینہ چھ وزرا مشتمل تھی۔ جن میں چار ہندو اور دو مسلمان تھے۔ اب اس میں توسیع کا امکان نہ تھا۔ اس سلسلے میں چودھری صاحب نے میرٹھ کا سفر کیا۔ نواب اسماعیل خاں کو کانگریس کا فارمولا دکھایا۔ اس سلسلے میں ان کے صاحبزادے اور اہلیہ سے مدد کے خواستگار ہونے۔ ان کی اہلیہ سے بذات خود گفتگو کی اور کہا۔ ''بہن وزارت کا تحفہ آپ کے دروازے پر لے آیا ہوں...... ایسی نہایت عمدہ پیش کش کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ مجھے آپ کا تعاون اور مدد درکار ہے تاکہ احساس دلایا جا سکے کہ یہ آپ کے شوہر اور خاندان کے لیے کس قدر احترام کا باعث ہوگا۔''(۱)

اس سے ثابت ہوا کہ وزارت کی پیش کش موجود تھی جسے اصولوں کی بنا پر مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کی وجہ سے مسترد نہیں کیا گیا بلکہ اصل وجہ وہی ہے جو مولانا نے بیان فرمائی ہے کہ جواہر لال کی فرد گذاشت سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا(۲)۔ یہی وجہ ہے کہ چودھری صاحب نے اس واقعے کے اس حصے کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا اور مسٹر خان نے اپنے آرٹیکل کے اس حصہ کا نام ہی (OMITTED STORY) ''فراموش شدہ داستان'' رکھا ہے۔ حال آں کہ یہ حصہ نا قابل فراموش ہے۔

یہ فراموش شدہ داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جمعیت اعلماے ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید دہلوی نے چودھری خلیق الزماں کو ۱۹؍اگست ۱۹۳۷ء کو ایک خط میں لکھا ہے:

''آپ کی لیگ کچھ نہ کرے گی اور نہ اس سے کچھ ہوگا۔ اگر لیگ کسی قابل ہوتی تو آج مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔''

''ہاں یہ تو فرمائیے کہ اس خبر میں کس حد تک صداقت ہے کہ آپ کے لیے اور نواب اسماعیل

---

(۱) ایضاً۔

(۲) پنڈت جواہر لال نہرو نے اس معاملے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ۱۹۳۷ء میں کانگریس یو پی میں زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی شدید متمنی تھی۔ یہ مسلم لیگ کے نظریے سے متصادم تھا۔ جو صوبہ کے بڑے زمینداروں کی نمائندہ تھی جنھیں کابینہ میں شامل کیا جانا متوقع تھا۔ (Formative Phase p.88 by SYeed Khalid Bin)

خان کے لیے کوئی جگہ نکل آتی تو آپ کا کانگریس سے سمجھوتا ہو جاتا۔ کانگریس ایک منسٹری تو نکالنے کے لیے تیار تھی لیکن آپ نواب صاحب کو چھوڑ نا نہ چاہتے تھے اوران کے لیے کوئی موقع نہ تھا، اس لیے صلح ناکام رہی۔" (۱)

چودھری صاحب نے مولانا احمد سعید کے خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے استفسار پر خاموشی اختیار کی حال آں کہ معاملہ کی اہمیت جواب کی متقاضی تھی۔ انھوں نے یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ "یہ تبصرہ کا محتاج نہیں ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے یو پی میں مخلوط وزارت سازی کے مسئلے پر ڈاکٹر راجندر پرشاد کو جو ار پورٹ ۲۱ر جولائی ۳۷ء کو بھیجی تھی اس میں لکھا ہے۔ "جون کے اواخر میں ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے کچھ قبل یو۔ پی مسلم لیگ کے لیڈروں خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان نے کانگریس سے رابطہ قائم کیا، اس کا تعلق یقیناً وزارت سازی سے تھا۔ جب مولانا واردھا سے واپسی پر لکھنوء گئے تو خلیق الزماں سے ملاقات ہوئی۔ وہ مولانا کو Blank Cheque کورے کاغذ پر دستخط کر کے دینے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ نواب اسماعیل خاں اور انھیں (خلیق الزماں) کابینہ میں شامل کر لیا جائے۔ مولانا کو اس میں یہ کشش نظر آئی کہ اس پر عمل درآمد سے مسلم لیگ کا علاحدہ وجود عملی طور پر ختم ہو جائے گا اور مسلم لیگ کانگریس میں مدغم ہو جائے گی۔ اس طرح یو۔ پی میں مسلم لیگ ختم ہو جائے گی۔ اس کا نہ صرف یو۔ پی میں بلکہ پورے ملک اور باہر زبردست اثر مرتب ہوگا۔ اس کا مطلب ہوگا کہ ہمارے لیے سیاسی میدان کھلا ہے، فرقہ وارانہ پریشانیاں نہ ہوں گی۔ یہ صورت حال برطانوی حکمرانوں کو حیرت زدہ کر دے گی جو ان اختلافات پر زیادہ تر انحصار کرتے ہیں۔"

---

(۱) پاتھ وے ٹو پاکستان صفحہ ۱۸ا، اپنڈ کس 2۔ سر یامین خان لکھتے ہیں ان لوگوں کا اصل مقصد تو کانگریس سے مل کر وزارت میں شامل ہونا تھا اس لیے کانگریس سے ساز باز جاری کی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ خلیق اگر اکیلے کانگریس وزارت میں جائیں تو مسلم لیگ کے سب ممبر منحرف ہو جائیں گے اور نواب اسماعیل کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر بنالیں گے اور خلیق الزمان کا سب پول کھل جائے گا اور اگر تنہا کانگریس کے خلاف سازش شروع کر دیں گے۔ اس لیے اگر وزارت میں جائیں تو دونوں جائیں ورنہ کوئی نہ جائے گا (نامہ اعمال صفحہ ۳۷۶ جلد اول) اصل مسئلہ یہی تھا کہ جواہر لال نہرو نے وزارت ایک کر دی تھی جب کہ امیدوار دو تھے۔ یعنی ایک انار اور دو بیمار والا قصہ تھا۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی توقع کی جاسکتی تھی۔

چودھری صاحب کے لیے شرائط نامہ:

چناں چہ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت پنتھ، اچاریہ کرپلانی اور نریندرا دیو نے نہایت غور و خوض کے بعد ورکنگ کمیٹی کے مارچ ریزولیوشن کی روشنی میں مخلوط کابینہ تشکیل دینے کے لیے شرائط نامہ تیار کیا۔ جس میں کہا گیا تھا:

(۱) مسلم لیگ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کو مکمل قبول کرے جو اسمبلی میں پالیسی کے متعلق ہے۔

(۲) مسلم لیگ گروپ بمعہ یو۔ پی پارلیمنٹری بورڈ ختم کر دیا جائے۔

(۳) مسلم لیگ کے تمام ممبران اسمبلی (یو۔ پی) کانگریس کے پورے ممبر بنیں گے، (لیکن انہیں کانگریس کے حلف نامہ پر دستخط کرنے کے لیے نہیں کہا گیا)

(۴) تمام ممبران مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے نظم و ضبط کی پابندی کریں گے۔

(۵) ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ علاحدہ امیدوار کھڑے نہیں کرے گی اور کانگریسی امیدواروں کی مدد کرے گی۔

(۶) اگر کانگریس وزارتوں یا اسمبلی کی رکنیت سے علیحدگی کا فیصلہ کرے گی تو مسلم لیگ بھی ایسا ہی قدم اٹھائے گی۔

ان شرائط پر تبصرہ کرتے ہوئی پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

''یہ شرائط کانگریس کے حلف نامہ پر دستخط کرنے سے زیادہ کڑی تھی۔''(۱)

خلیق الزماں کے ساتھ ان شرائط پر مولانا آزاد اور پنڈت جی کی گفتگو کا احوال بھی اس مکتوب میں مذکور ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ خلیق الزمان سوائے دو کے باقی شرائط پر رضامند ہو گئے تھے۔ یہ دو شرائط حسب ذیل تھیں؛

(۱) مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا خاتمہ۔

(۲) ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کے علاحدہ امیدوار کھڑے نہ کرنا۔

پنڈت نہرو لکھتے ہیں'' یہ اہم شرائط تھیں۔ خلیق الزماں نے کہا کہ وہ ذاتی طور پر ان سے اتفاق

---

(۱) نہرو کا خط راجندر پرشاد کے نام ۲۱ ر جولائی ۱۹۳۷ء بحوالہ (ڈاکٹر پی۔ این چوپڑا ۱۹۸۵ء)، صفحہ ۷۶۷

کرتے ہیں لیکن وہ مسلم لیگ کی طرف سے قبول کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ انھوں نے یقین دلایا کہ نتیجہ آخر کار ایسا ہی ہوگا۔" (یعنی مسلم لیگ کو قبول کرنے پر تیار کرلیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے مہلت طلب کی۔)

چودھری صاحب کی سیرت:

۲۱ر جولائی کو خلیق الزماں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے ایک مرتبہ پھر ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا اور تجویز پیش کی کہ اگر آپ وزارت سازی کا مسئلہ کچھ دنوں کے لیے موخر کردیں تو وہ مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کا اجلاس بلاکر ضمنی انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار کھڑے نہ کرنے کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔(۱)

یہ ہے حقیقت اس لاف زنی کی جو چودھری خلیق الزماں نے اپنی تصنیف میں کی ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔ کہ انھوں نے "یہ سب پوتھی پڑھ کر مولانا سے کہا کہ یہ سب کیا واہیات باتیں لکھ کرلائے ہیں۔ کہ میں اس بورڈ کو پھانسی دے دوں۔ اور مسلم لیگ کو جہنم واصل کردوں۔ میں ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔" (۲)

درحقیقت وہ مسلم لیگ کو جہنم واصل کرنے کے لیے تو پہلے ہی تیار ہو گئے تھے جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خط سے ظاہر ہے۔ ضمنی انتخاب میں امیدوار کھڑے نہ کرنا اور پارلیمنٹری بورڈ کے خاتمے کے مسئلے پر وہ ذرا متامل تھے اگرچہ وہ ذاتی طور پر متفق تھے اور اس کا انھوں نے عملی مظاہرہ بھی کردیا تھا۔ جب ضمنی انتخاب میں مسٹر رفیع احمد قدوائی کانگریس کے ٹکٹ پر امیدوار بنے تو مسلم لیگ نے ان کے مقابلے پر کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا اور وہ بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے۔ چودھری خلیق الزماں یوپی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے چیئرمین تھے اور مسلم لیگ کا امیدوار نامزد نہ کرنے کا فیصلہ انھوں نے کیا تھا۔(۳) تاکہ کانگریس کو مکمل یقین دہانی کرائی جاسکے یہ مسلم لیگ

(۱) ایضاً صفحہ ۶۸۔۶۷

(۲) شاہراہ پاکستان صفحہ ۶۳۸۔۶۳۹

(۳) پاتھ وے ٹو پاکستان صفحہ ۱۸۵ بحوالہ تاریخ کانگریس از پنا بھائی سیتارامیہ۔ عبدالوحید خان نے خلیق الزماں پر الزام لگایا ہے کہ مسٹر قدوائی کی ضمنی انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب خلیق الزمان کی وجہ سے ہوئی۔

Quaid - e Azam, As I Know him , Isfahani p. 35 (1976)

پارلیمنٹری بورڈ کی بے عملی ثابت کرنے کا عملی مظاہرہ تھا۔ اب وہ ورکنگ کمیٹی کو قائل کرنے اور ہم نوا بنانے کے لیے مہلت کے خواستگار تھے ورنہ شرائط تو وہ تسلیم کر کے عمل درآمد شروع کر چکے تھے۔ اس وقت انہیں مسلمانوں کی روایات، زبان، ملازمتوں اور سیاسی حقوق کا ذرہ برابر خیال نہ آیا۔ جب شریک اقتدار ہونے کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں تو مسلمانوں کے غم سے سینہ فگار ہونے لگا۔ سر محمد یامین نے بالکل درست لکھا ہے "اگر تنہا نواب اسمٰعیل کو کابینہ میں لیا گیا تو خلیق سازشیں شروع کر دیں گے۔ (۱) خلیق نے واقعی ایسا ہی کیا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ خلیق الزماں کے لیے مہلت نکالنا ناممکن ہو گیا تھا۔ کانگریس نے کابینہ تشکیل دے لی تو چودھری خلیق الزماں کو شدید قلق ہوا۔ اب اقتدار میں شامل ہونے کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں تھیں۔ ان کا کرب "شاہراہ پاکستان" کے اوراق پر بکھرا پڑا ہے وہ لکھتے ہیں:

"وہ رات میری بڑی بے چینی سے گزری بیس برس اپنی کانگریسی زندگی کی تاریخ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس کی خدمت میں میں نے اپنی جوانی، اپنا روپیہ اور اپنا وقت بلا کسی طمع یا منفعت کے خیال کے محض ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے صرف کیا تھا۔" (۲)

چودھری خلیق الزماں وزارت کے اس قدر دیوانے تھے کہ انھوں نے نواب چھتاری کی غیر جمہوری کابینہ میں شامل ہونے کی پیش کش کی تھی لیکن نواب چھتاری نواب اسمٰعیل خاں کو کابینہ میں شامل کرنا چاہتے تھے کیوں کہ مسلم لیگ کے ممبران اسمبلی کی زیادہ تعداد نواب اسمٰعیل خاں کی حامی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے تعاون کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ (۳)

چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں کہ انھوں نے نواب چھتاری کی کابینہ میں شمولیت کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ بلکہ جب نواب سلیم پور مسلم لیگ کو چھوڑ کر چھتاری کابینہ میں شامل ہو گئے تو انہیں اس کا بھی شدید قلق تھا کہ وہ بلا مشورہ کیے وزیر بن گئے اور ان کا راستہ روک دیا۔ چودھری صاحب کے غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ ناراضگی کے باعث دو برس تک نہ تو نواب سلیم پور سے ملے اور نہ ہی ہم کلام ہوئے۔ (۴)

---

(۱) نامہ اعمال ۶۷۳ جلد اول۔

(۲) شاہراہ پاکستان صفحہ ۶۴۲

(۳) نامہ اعمال مصنف سر یامین خان ۶۷۳ جلد اول

(۴) شاہراہ پاکستان صفحہ ۶۲۲۔

گورنر یو۔ پی نے چودھری خلیق الزماں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اقتدار کا زبردست خواہش مند ہے اور وہ کانگریس کے ساتھ ان دنوں وزارت سازی کے سلسلے میں قریبی رابطہ قائم کیے ہوئے ہے۔ اس کے خیال میں اس کی کامیابی زیادہ دور نہیں ہے۔ نواب چھتاری کی کابینہ میں شمولیت پر انکار سے پردہ اٹھاتے ہوئے گورنر یو پی نے لکھا ہے کہ اس کی دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ نئی کابینہ چار ماہ سے زیادہ نہیں چلے گی اور جو بھی اس میں شامل ہوگا وہ سیاسی طور پر دیوالیہ بن جائے گا۔ اگر چودھری صاحب کو یقین ہوتا کہ کابینہ کی عمر مختصر نہیں ہوگی اور ان کی سیاسی زندگی پر اس کے منفی اثرات مرتب نہیں ہوں گے تو وہ چھتاری کی کابینہ میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے۔ وہ اس پہلو سے بھی خوف زدہ تھے کہ کانگریس غیر جمہوری کابینہ کے خلاف ایجی ٹیشن چلا سکتی ہے۔ جسے کچلنے کے لیے طاقت استعمال کرنا پڑے گی اور اس سے حکومت بدنام ہوگی اور عوام کی نفرت کا شکار ہونا پڑے گا۔(۱)

مسٹر ابوالحسن اصفہانی کی دوٹوک رائے:

خلیق الزماں نے ''پاتھ وے ٹو پاکستان'' اور ''شاہراہ پاکستان'' میں جس قدر تعلّی اور خودسرائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسٹر اصفہانی نے اس کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس کے مطابق چودھری خلیق الزماں کے دعاوی بالکل بے بنیاد بن جاتے ہیں۔ اور متذکرہ بالا دونوں تصانیف تاریخی اعتبار سے زیادہ مستند اور قابل اعتماد نہیں رہتیں۔ مسٹر اصفہانی رقم طراز ہیں:

''جب کوئی یہاں یا باہر کا شخص چودھری خلیق الزماں کی ''پاتھ وے ٹو پاکستان'' کا مطالعہ کرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مسٹر خلیق الزماں ہی مسلم لیگ کے واحد مفکر، بیانات اور قرار دادیں مرتب کرنے والے اور گفت وشنید کرنے والے تھے۔ مزید برآں ان کی کتاب سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ محمد علی جناح نہیں بلکہ وہی پاکستان کے عملی ''ارتقا'' کے کفیل تھے...... اگر میں یہ نہ کہوں کہ مسٹر خلیق الزماں نے اپنے ساتھ جو متکبرانہ کردار چپکا لیا ہے وہ اس سے کوسوں دور تھے تو یہ غلط نہ ہوگا...... مسٹر خلیق الزماں بہت زیادہ مواقع پر بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے کے خواہش مند ہوتے تھے...... مسٹر خلیق الزماں زیادہ سے زیادہ ایک بہت خوشامدی شخص تھا، لیکن مسلم لیگ میں اس کا ذاتی وقار کوئی نہ تھا۔ وہ ورکنگ کمیٹی، کونسل اور جلسۂ عام میں بولتا تھا اور وہ قرار دادیں مرتب

---

(۱) گورنر یو پی کا خط وائسرائے لارڈ لن لتھگو کے نام ۳۱ر مارچ ۱۹۳۷ء جس میں یو۔ پی میں نواب چھتاری کی وزارت سازی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔(بحوالہ چوپڑا صفحہ ۳۱۱)

کرنے والوں میں ایک ہوتا تھا اور یہ قرار دادیں ہدایات کے مطابق مرتب کرتے تھے۔ اسے کوئی خاص مرتبہ حاصل نہ تھا۔ وہ قائداعظم کا اس درجے کا اعتماد بھی نہ رکھتا تھا، جو میرٹھ کے نواب اسماعیل خاں اور راجہ صاحب آف محمود آباد کو حاصل تھا، اور یہ دونوں اصحاب چودھری صاحب کے صوبے سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے قائداعظم کو کئی مرتبہ نواب اسماعیل خاں کی بلند اخلاقی کی تعریف کرتے ہوئے سنا...... لیکن میں برسوں قائداعظم کے قریب ترین رفقا میں رہا اور میں نے "پاتھ وے ٹو پاکستان" کے مصنف کے بارے میں قائد سے ایسی رائے نہیں سنی۔"

مسٹر خلیق الزماں کے دعووں کی تکذیب کے ثبوت میں مسٹر اصفہانی نے دو دستاویزی ثبوت بھی شامل تصنیف کیے ہیں۔ مسٹر خلیق الزماں نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے محمد علی جناح کو کبھی بھی "قائداعظم" کہہ کر نہیں خطاب کیا۔ مسٹر اصفہانی نے ریکارڈ کی صحت کے لیے مسٹر خلیق الزماں کے قائداعظم کے نام دو خطوط ۲۳ر جولائی ۱۹۴۵ء و ۲۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء کے عکس بھی شامل کیے ہیں۔ جن میں مسٹر خلیق الزماں نے Dear Quaid - e- Azam لکھا ہے۔ خطوط کے اختتام پر رائے زنی کرتے ہوئے مسٹر اصفہانی رقم طراز ہیں:

"مجھے اس کا اظہار کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے لیکن عوام کے مفاد کی خاطر ایسا کر رہا ہوں، کیوں کہ غلط بیانات کو بغیر چیلنج کے نہیں چھوڑنا چاہیے، وقت گزرنے کے ساتھ جعل سازی حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تاریخ اور آئندہ نسلوں کے لیے مضرت رساں ہوگا۔"(۱)

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۱۳۲-۱۴۵)

تحریک آزادی۔۔ایک وطنی فرض:

۲۷ر جولائی ۱۹۳۷ء: ابراہیم کاریہ (جنوبی افریقہ) نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے نہ لینے کے بارے میں شرعی فتویٰ پوچھا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے انھیں یہ جواب دیا:

"ہندوستان کی تحریک آزادی ایک وطنی تحریک ہے۔ اس میں ہر محب وطن ہندوستانی کو شریک ہونا لازم ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی"

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

---

(۱) Quaid - e- Azam , As I Know him p.p .69- 71

ضمنی انتخاب میں حافظ ابراہیم کی کامیابی:

جولائی ۱۹۳۷ء: ملک کی صوبائی اسمبلیوں میں جب صوبائی وزارتیں تشکیل پا چکیں تو یو پی میں حافظ ابراہیم کو کانگریس نے اپنی وزارت میں لے لیا۔ لیکن یہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر چن کر آئے تھے۔ یو پی مسلم لیگ کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور حافظ ابراہیم سے استعفیٰ طلب کر لیا۔ حافظ صاحب لیگ سے مستعفی ہو گئے اور وزارت بھی چھوڑ دی۔ جب ضمنی الیکشن ہوا تو مسلم لیگ نے اپنا نمائندہ کھڑا کر کے دھواں دھار تقریریں شروع کر دیں مسلم لیگ کے ستون مانے جانے والے نواب لیاقت علی خاں نے زمین کے قلابے ملانا شروع کر دیے۔ حافظ ابراہیم کی مخالفت میں ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا جو مسلم لیگ کے شایان شان نہ تھا۔

حافظ ابراہیم نے بھی جو مسلم لیگ کے خلاف امیدوار تھے طوفانی تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وقت مقررہ پر الیکشن ہوا۔ نتیجے کے طور پر مسلم لیگ شکست فاش کھا کر منہ کے بل گر پڑی جس کی خجالت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ حافظ ابراہیم فاتحانہ شان سے پھر اسمبلی میں پہنچے اور انھیں دوبارہ وزارت ملی اور کافی عزت افزائی ہوئی۔ (حسرت موہانی...... ایک سیاسی ڈائری)

حضرت شیخ الاسلام اور خاکسار:

۱۷ اگست ۱۹۳۷ء: ۱۷ اگست ۳۷ء کو مولانا خورشید احمد ہاشمی کا بیان ہے کہ میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کی خدمت میں دیو بند حاضر ہوا۔ ایک اخباری بیان پر تحریک خاکسار کے متعلق تحریری دریافت کیا کہ جناب والا کو تحریک خاکسار کا حامی کہا جا رہا ہے۔ جواباً شیخ نے تحریر فرمایا کہ "میں نے تحریک خاکسار کی حمایت میں کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ میری نسبت سے نہایت غلط اور ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ میں اس تحریک کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتا ہوں۔ اور بانی تحریک ہرگز قابل اطمینان نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اس سے دور رہنا اور اس کی تصنیف سے بچنا چاہیے۔"

(حسرت موہانی...... ص ۱۷۴)

حضرت مفتی اعظم کی فتویٰ نویسی اور جمعیت علماء:

یکم ستمبر ۱۹۳۷ء: دہلی کے کوچہ دکھنی رائے کے محمد جلیل صاحب نے بعض لوگوں کی حضرت مفتی صاحب کے بارے میں ایک رائے تحریر کی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے انھیں لکھا:

اللہ تعالیٰ ان مہربانوں کو جو بے بنیاد باتیں کہتے ہیں اور مفت میں بدنام کرتے ہیں نیک راہ کی توفیق عطا فرمائے۔ میں فتویٰ نویسی کی تنخواہ جمعیۃ العلماء ہند سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا۔ اور جمعیۃ العلماء کسی اور شخص کو بھی فتویٰ نویسی کی تنخواہ نہیں دیتی۔ ہاں اس کو عرصہ سے ایک مفتی کی تلاش ہے۔ جس کو تنخواہ دے کر فتویٰ نویسی کے لیے مقرر کرے۔ مگر ابھی تک کوئی لائق مفتی دستیاب نہیں ہوا۔ فتویٰ نویسی کا تمام بوجھ مجھ جیسے ضعیف آدمی کی گردن پر ہے۔ دفتر کے فتوے بھی میرے پاس بھیج دیے جاتے ہیں اور میں بلا کسی معاوضہ کے لکھ دیتا ہوں"

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

جمعیت علماء اور وطنی وملی خدامات:

۳ر ستمبر ۱۹۳۷ء: منشی آدم خان پور (ضلع بہرائچ) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں ایک غیر ملکی (انگریزی حکومت) قائم ہے اور ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً انگریزی حکومت نے بے حد نقصانات پہنچائے ہیں۔ ہندوستان کے باشندے اس غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو یہ فریضۂ وطنیہ مسلمانوں پر بھی اسی طرح عاید ہوتا ہے جس طرح غیر مسلموں پر، اور تحریک آزادی میں جب تک ہندوستان کی تمام اقوام داخل نہ ہوں کامیابی مشکل ہے اس لیے مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں قومی مجلس کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل لازمی ہے اور جمعیت علماء نے آج تک اسی اصول کے موافق کام کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ مسلمان قوم کو اپنی قومی اور مذہبی زندگی کے لیے اندرونی تنظیم اور اجتماعی قوت بھی لازمی ہے۔ اس کے لیے جمعیت علمائے ہند کا پلیٹ فارم ہے۔ سب مسلمانوں کو مل کر جمعیت علمائے ہند کی نگرانی میں وطنی آزادی اور مذہبی حفاظت کا فریضہ ادا کرنا لازم ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

تحریک آزادی، کارٹون اور اسلام:

۱۲ر ستمبر ۱۹۳۷ء: اخبار ہند جدید کلکتہ کے ایڈیٹر (مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی) نے حضرت

مفتی صاحب سے ایک مسئلہ دریافت فرمایا۔ ذیل میں سوال اور جواب مدفون درج کیے جاتے ہیں۔

ایڈیٹر ہند جدید لکھتے ہیں:

زید اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ توحید و رسالت کا قائل ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق مانتا ہے۔ کفر و شرک سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو بعض مسلمانوں سے سیاسی معاملات میں اختلاف ہے۔ وہ انھیں منع کرتا ہے کہ اسلام کے مقدس نام سے ذاتی سیاسی اغراض حاصل نہ کی جائیں اور اسلام کے مقدس نام سے غیر مسلم طاقتوں کو ناجائز فائدہ نہ پہنچایا جائے۔

اپنے اسی نقطۂ نظر سے زید اخبار میں ایک کارٹون نکالتا ہے۔ زید اس کارٹون میں اپنی مخالف دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح ان مسلمانوں کی ذہنیت بھی دکھاتا ہے، جو اسلام کے پاک نام سے زید کے خیال میں ذاتی اغراض حاصل کرتے اور غیر مسلم طاقتوں کی ناجائز خدمت انجام دیتے ہیں۔ چناں چہ اس ذہنیت والے لوگوں کو نعرہ ''اسلام'' کو وہ شیر کی تصویر پر (انور نڈر کا ماز) کے اندر لکھ دیتا ہے تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ اسلام کا مقدس نام ناجائز طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کلمہ گو اور مسلمان ہونے کے باوجود کیا زید محض اس کارٹون کی اشاعت کی وجہ سے کافر، ملحد، لامذہب سمجھا جائے گا؟ اگر ایسا نہیں سمجھا جائے گا تو ان لوگوں کا شرعی حکم کیا ہے؟ جو محض اس کارٹون کی وجہ سے کلمہ گو مسلمان زید کو کافر، ملحد، لامذہب کہیں؟

حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب دیا:

''تصویر بنانے اور شائع کرنے کے عدم جواز کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کارٹون سے جو غرض ہے اس کا حکم یہ ہے کہ کارٹون بنانے والے نے یہ دکھانا چاہا ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان سے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی عیاریاں کرتی ہے اور قسم قسم کے حیلے تراشتی ہے۔ جن کے ذریعے سے خود ہندوستانیوں کو بے وقوف بنا کر ان کی ہی زبان سے ایسی باتیں نکلواتی ہے جو بظاہر ہندوستانیوں کے لیے مفید معلوم ہوتی ہیں مگر درحقیقت ان سے برطانوی حکومت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ چناں چہ وہ ہندستانیوں کو آپس میں لڑانے کے لیے (جو درحقیقت برطانوی حکومت کے بقا و استحکام کے لیے ضروری ہے) کسی فریق کو مذہب کے نام سے، کسی کو صوبہ وارانہ پوزیشن کے لحاظ سے، کسی کو روٹی کے بہانے سے ابھارتی ہے اور یہ آپس میں لڑ کر برطانوی حکومت کو فایدہ پہنچاتے ہیں۔ پس کارٹون میں لفظ اسلام لکھنے سے صرف یہ مطلب ہے

کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کو درحقیقت مذہب کا کوئی درد نہیں ہوتا۔ مگر وہ مذہب اور اسلام کا نام محض اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ سادہ لوح مسلمان یہ سمجھ کر کہ انگریزی حکومت کے بقا میں اسلام محفوظ اور انگریزی حکومت کے زوال سے اسلام خطرے میں ہے۔ انگریزی حکومت کی حمایت کرنے لگیں تو گویا انگریزی حکومت کے ہتھکنڈوں میں جن کے ذریعے سے وہ اپنا مفاد حاصل کرتی ہے اسلام کا نام استعمال کرانا بھی ہے۔ پس اس غرض سے کارٹون میں اسلام کا لفظ لکھ دینا، نہ کفر ہے، نہ الحاد، نہ لامذہبی! کیوں کہ اس سے مراد وہی مصنوعی، فرضی اور نام کا اسلام ہے جو برطانوی مداری کے لیے روزی کا ذریعہ ہو سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حقیقی اور معنوی صحیح اسلام برطانیہ کی روزی کے ذرائع میں داخل نہیں اور نہ کوئی مسلمان ایسا خیال کر سکتا ہے۔ اور نہ حقیقی اسلام برطانوی حکومت کے وجود پر موقوف ہے۔ فقط

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

ہٹلر کی پریس کانفرنس:

۱۴ ستمبر کو برلن میں غیر ملکی نامہ نگاروں کی ایک کانفرنس میں جرمنی کے ڈکٹیٹر ہر ہٹلر نے کہا:

''جب تک نوآبادیات کے مسئلے کا تصفیہ نہیں ہوگا۔ یورپ میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ نوآبادیات کے لیے جرمنی کے مطالبے کو جنگ یا صلح سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اس کا تعلق عقل خاص سے ہے اور اس پر میرا یقین ہے کہ جس طرح جرمنی کے مساوات کا مسئلہ طے ہوا تھا اسی طرح اس مسئلے کو بھی حل کرنا پڑے گا۔ جس نوآبادی پر جنگ عظیم سے پہلے ہمارا قبضہ تھا، اس پر ہمیں ہر طرح کا اخلاقی حق حاصل ہے۔''

ایک اخبار نویس کا سوال:

''اگر بین الاقوامی مالیات کا انتظام اس طرح کر دیا جائے کہ جرمنی اپنے لیے خام مال خرید سکے اور اپنی مصنوعات بھی فروخت کر سکے تو کیا جرمنی اس سے مطمئن ہو جائے گا؟''

جواب: ''جرمنی کی خواہش ہے کہ اس کی جو آبادیات اس کے اپنے جھنڈے تلے ہوں۔''

سوال: ''کیا جرمن کا یہ ارادہ ہے کہ جو نوآبادیات حاصل کی جائیں، ان میں سے کسی نوآبادی پر وہ بحری اڈہ قائم کرے؟''

جواب: ''بحری مستقر قائم کرنے سے پہلے ہمارے پاس جنگی بیڑہ ہونا ضروری ہے کیوں کہ جنگ سے پیشتر جرمن کے پاس کسی نوآبادی میں کوئی بحری مستقر نہیں تھا۔ نوآبادیوں میں جرمنی کا مفاد محض تجارت ہے۔''

سوال: ''کیا آپ کے خیال میں نوآبادیوں کے مسئلے کا حل کیے بغیر کوئی اور صورت نہیں، جس سے یورپ میں امن قائم رہے؟''

جواب: ''اس سوال کا جواب میں اوپر دے چکا ہوں۔''

(روزنامہ ''انقلاب'' لاہور۔ ۱۶ ر ستمبر ۱۹۳۷ء)

لیگ آف کونسل کی قرارداد:

لندن ۱۷ ر ستمبر کو لیگ آف کونسل نے ایک ریزولیشن منظور کیا، جس کی رو سے برطانیہ کو اختیار دیا گیا کہ حکومت اپنی اعلان شدہ پالیسی کے مطابق زیر بحث مسئلہ (فلسطین) کو حل کرے۔ یہ قرارداد رومانیہ کے وزیر خارجہ نے پیش کی جو ابتدائی کمیشن کا اہم رکن تھا۔ نمائندہ فرانس نے اس قرارداد کی تائید میں کہا کہ:

'' حکومت فرانس اس ریزولیشن کو پورے طور پر منظور کرتی ہے۔ نیز تمام متعلقہ اقوام سے انصاف کرنے میں حکومت برطانیہ نے جو اقدام کیے ہیں اسے قابل تعریف قرار دیتی ہے۔''

(روزنامہ ''انقلاب'' ۱۹ ر ستمبر ۱۹۳۷ء)

شریعت بل:

۱۶ ر ستمبر ۱۹۳۷ء: دو سال قبل ۹ ر ستمبر ۱۹۳۵ء کو مرکزی دستور ساز اسمبلی میں جو شریعت بل پیش کیا گیا تھا، وہ پاس ہو گیا۔ اس کی تفصیل مرزا غلام نبی جانباز نے کاروان احرار جلد سوم (صفحہ ۶۱۔۱۵۹) میں درج کی ہے۔ شریعت بل چوں کہ جمعیت علمائے ہند کا خاص موضوع رہا ہے اور اس کی تالیف و تدوین اور اس کے پاس کرانے کی مساعی میں جمعیت پیش پیش رہی تھی اس لیے یہ تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے:

انگریزی عمل داری کے ساتھ ہی اسلامی احکام کو عملاً روک کر مسلمانوں کے پرسنل لا کی جگہ مذہب سے ناآشنا اور غرض مند افراد کی خواہش پر دنیاوی رواج کو غیر ملکی حکمرانوں نے قانون کا درجہ دے دیا۔ وراثت اور تبنیت (متبنیٰ، لے پالک بنانا) اور وصیت کے وہ احکام جو قرآن

شریف کی آیات میں صریحاً موجود ہیں یا حدیث حجہ میں وضاحت کے ساتھ اجاگر کیے گئے ہیں، رواج کے ذریعے منسوخ کردیے گئے۔

چناں چہ اودھ، شمال مغربی صوبہ سرحد، پنجاب اور بمبئی وغیرہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت سے قانون جاری ہے کہ مذکورۂ بالا مسائل میں احکام شریعت اور قانون اسلام پر عمل نہیں کیا جاتا، بلکہ رواج ہی قانون سمجھا جارہا ہے۔

ہندوستان میں رواج بالعموم ہندوؤں کے طریق پر مبنی ہے۔ اس میں بیوہ کو اور دوسری لڑکیوں کو منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے حصہ نہیں دیا جاسکتا۔ جب کہ اسلام دونوں صورتوں میں عورت کو باپ کی وراثت کا حصہ دار قرار دیتا ہے۔ اسی طرح لے پالک بنانے کا شرعاً اختیار نہیں۔ جیسے کہ حضرت زید بن حارث رضی اللہ عنہ کا واقعہ موجود ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بیٹے کہے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ زید بن حارث کو بن رسول اللہ کہا جانے لگا۔ آخر قرآن حکیم کی سورۂ احزاب میں پورا ایک رکوع اس کی تردید میں نازل ہوا۔ چناں چہ متبنی ہونے کی بنا پر شرعاً ابن کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ مگر ہندوستان کے رواج میں وصیت میں بھی تسلیم ہے کہ جو شخص جس کو چاہے جتنا مال اور جائیداد کی چاہے وصیت کردے، اور متبنی بنانا بھی معتبر مانا جاتا ہے۔ اور ابن کی حیثیت اس کو دے دی جاتی ہے۔

شمال مغربی صوبۂ سرحد کے مسلمانوں نے مولانا مفتی کفایت اللہ کی رہنمائی میں اپنے صوبے کے لیے شریعت ایکٹ بنوالیا، تو پنجاب کی طرف سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ سارے ہندوستان میں شرعی قانون منظور ہونا چاہیے۔ چناں چہ اس کے لیے لائل پور کے حافظ محمد عبداللہ نے ۱۹۲۵ء کو شریعت بل کا مسودہ وائسرائے کی اسمبلی میں پیش کردیا۔ یہ بل دیر تک زیر بحث رہا۔ اور سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کردیا گیا۔ آخر ۹ رستمبر ۱۹۳۵ء کو شریعت بل مختلف آرا کے ساتھ اسمبلی میں پیش کیا گیا، جس پر تقریر کے دوران حافظ محمد عبداللہ نے کہا:

''سلیکٹ کمیٹی نے رپورٹ پیش کردی ہے، کہ اسے برطانوی ہند کے مسلمانوں کے لیے منظور کیا جائے۔ یعنی اسلامی شریعت کی رو سے جائیداد میں سے عورت کا جائز حق دیا جائے۔''

اس پر خان عبدالقیوم خان (کانگریس) نے کہا کہ صوبہ سرحد میں یہ قانون منظور ہوچکا ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے سے مسلمان عورتوں کو زرعی زمین سے بھی حصہ دیا گیا ہے، جو زیر بحث بل میں نہیں۔ لہٰذا صوبہ سرحد کو اس بل سے مستثنیٰ کردیا جائے۔

سرمحمد یامین نے لفظ شریعت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ چوں کہ مختلف فرقوں کے نزدیک اس کا مفہوم مختلف ہے۔ اس پر سید محمد احمد کاظمی (احرار) نے کہا کہ لفظ شریعت میں کوئی غلط فہمی نہیں رہی اس کے کوئی دوسرے معنی ہو سکتے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح نے بل کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

اس بل کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی قانون پر عمل کیا جائے جو دوسرے قوانین سے کہیں زیادہ منصفانہ ہے۔ کیوں کہ اس کی رو سے لڑکیوں کو جائیداد سے ان کا جائز حق ملتا ہے اور لفظ شریعت ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔''

اس بل پر مسٹر جناح کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں نے بھی ترمیم پیش کی، جسے منظور کر لیا گیا۔ سرمحمد یعقوب نے بل کی سخت مخالفت کی۔

اس بل پر مسلسل دو سال تک بحث جاری رہی۔ آخر ۱۶ر ستمبر ۱۹۳۷ء کو یہ بل پاس ہو گیا۔

(کاروان احرار)

حافظ محمد عبداللہ:

شریعت بل کی تحریک لائل پور (موجودہ نام فیصل آباد) کے حافظ محمد عبداللہؒ نے کی تھی۔ اس لیے کاروان احرار کے مولف نے اس کے محرک و مجوز کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۸۵۷ء کی ہنگامہ آرائیوں سے فارغ ہو کر انگریز نے پنجاب میں نو آبادی نظام کو پختہ کرنے کی طرف توجہ دی۔ دیگر علاقوں کی طرح ساندل بار بھی ویران اور بے آب و گیاہ سرزمین تھی۔ ۱۸۹۰ء کے بعد سر جیمز لائل (جو بعد میں پنجاب کا گورنر بنا) نو آبادی اسکیم کے تحت علاقہ کے سر آوردہ لوگوں کو پانچ مربعہ فی گھرانا زمین مفت دی۔ چناں چہ چک نمبر ۲۲۴ ر ب کے منشی فتح دین کو بھی مذکورہ اسکیم کے تحت زمین ملی۔ اس دوران ایک دوسرے موقعے پر جب لائل پور کے بانی سر جیمز لائل نے اجتماع کیا تو منشی فتح دین نے اپنے بیٹے محمد عبداللہ کے متعلق لائل سے کہا کہ میں نے اپنے بیٹے کو قرآن مجید حفظ کرایا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ تلاوت قرآن مجید کرے۔ چناں چہ حافظ محمد عبداللہ نے سر جیمز لائل کی صدارت میں قرآن کریم کی تلاوت کی۔ اس پر صاحب صدر نے حافظ صاحب کو پانچ مربعے مزید دیے۔

آج لائل پور (فیصل آباد) میں ''عبداللہ پور'' کی معروف بستی اسی زمین پر آباد ہے۔

منشی فتح دین کے چار بیٹے تھے۔ حافظ محمد عبداللہ سب سے بڑے اور میاں نور اللہ سب سے

چھوٹے تھے۔ یہ گھراناساندل بار کے چند مخیر خاندانوں میں شمار تھا۔ لائل پور شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد انھی کی وقف کردہ زمین پر تعمیر ہے۔

حافظ محمد عبداللہ ۹۔ فروری ۱۹۵۱ء کو پینسٹھ سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے اور ''عبداللہ پور'' کی مسجد میں دفن کیے گئے۔

پنجاب سمیت ہندوستان کی دوسرے صوبے حافظ محمد عبداللہ کے ممنون احسان ہیں کہ ان کی مساعی سے مسلمان عورت کو اس کی جائز حق کا وارث شریعت کے مطابق قرار دیا گیا۔''

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء: امین الدولہ پارک لکھنو میں مولانا حسرت موہانی نے کالی جھنڈیوں سے مسٹر جناح کا خیر مقدم کرنے اور خفگی کے باوجود لیگ کے اجلاس میں نمایاں حصہ لیا۔

(مولانا آزد...... ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۶۹ و شاہراہ پاکستان، ص ۶۵۴)

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء: ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں پنجاب میں مسلم لیگ کی سیٹوں پر چودھری برکت علی اور راجہ غضنفر علی، دو صاحبان کامیاب ہوتے تھے راجہ صاحب دوسرے ہی دن یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور اب تقریباً ڈیڑھ سو کے ہاؤس میں مسلم لیگ کا صرف ایک نمائندہ تھا۔ لیکن مسلم لیگ کی خواہش تھی کہ اس کی مرضی اور مشورے کے بغیر وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ پنجاب کے لیگی ان کے لیے سخت پریشانی کا باعث تھے۔ بالآخر انھیں مسٹر محمد علی جناح سے رجوع کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل چودھری خلیق الزماں نے شاہراہ پاکستان میں بیان کی ہی۔ وہ لکھتے ہیں:

''سر سکندر حیات نے نواب احمد یار خان دولتانہ کے ذریعے سے مسٹر جناح کو بمبئی پیغام بھیجا کہ وہ مسلم لیگ کی عام سیاسی پالیسی سے بالکل متفق ہیں۔ البتہ پنجاب کے خصوصی حالات میں وہ یونینسٹ پارٹی کو ختم کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اگر متذکرہ بالا شرائط پر مسلم لیگ سے ان کا کوئی اتحاد ہو جائے تو وہ اس کو قبول کر لیں گے اور اس وقت پنجاب کے جتنے مقتدر زعماء تھے مثلاً نواب شاہ نواز خان ممدوٹ، نواب مظفر خان، نواب قزلباش، نواب گرمانی و ملک خضر حیات خان سب سر سکندر کے ہم خیال تھے۔ جناح صاحب نے یہ تجویز قبول کر لی۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء: کو مسلم لیگ کونسل کا پہلا اجلاس محمود آباد ہاؤس میں ہوا جس میں سر سکندر حیات نے کونسل کے ممبران کو پنجاب کے حالات سے آگاہ کیا اور اپنی یہ تجویز پیش کی کہ یونینسٹ پارٹی کے سب ممبران مسلم لیگ کے ممبر ہو جائیں۔ مگر پنجاب کے خصوصی معاملات کے لیے

یونینسٹ پارٹی کو قائم رکھا جائے اور اس میں مسلم لیگ مداخلت نہ کرے انھوں نے اپنی تقریر میں یو
، پی مسلم لیگ کے مطالبات کی پوری تائید کی اور کانگریس کی پالیسی پر بڑی کڑی تنقید کی۔ جناح
صاحب نے کھڑے ہو کر سر سکندر کی تائید کی اور کونسل کے تمام ممبران نے تالیوں کی گونج میں سکندر
جناح پیکٹ کو قبول کیا۔''

۱۵/اکتوبر ۱۹۳۷ء: جمعیت علماے ہند نے اپنے قیام کے بعد سے ایک لمحے کے لیے
انگریز کے زیر سایہ کسی قسم کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ کانگریس نے ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی کا رزو
لیوشن پاس کر دیا تھا، لیکن مسلم لیگ ۱۹۳۷ء تک مکمل آزادی کے لفظ کو سننے کے لیے تیار نہیں ہو سکی۔
یہ روداد چودھری خلیق الزماں کی زبانی سنیے۔ اس سے مسٹر محمد علی جناح کے مزاج و سیرت پر بھی
روشنی پڑتی ہے۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں:

''اسی رات نو بجے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس راجہ صاحب محمود آباد کی کنکر والی کوٹھی میں منعقد
ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں سر محمد شفیع کی صدارت میں لکھنو میں پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں
سیلف گورنمنٹ کے الفاظ شریک کیے گئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء تک کوئی تغیر اس پالیسی میں
نہیں ہوا مسلم یونٹی بورڈ سے مفاہمت کے سلسلے میں مسٹر جناح نے مولانا حسین احمد سے یہ کہا تھا کہ
جب ہم آپ کو مسلم پارلیمنٹری بورڈ میں اکثریت دیتے ہیں تو آپ مکمل آزادی کا تخیل اس بورڈ
سے قبول کرا سکتے ہیں یہ گفتگو مسلم یونٹی بورڈ کے نمایندوں سے جناح صاحب نے ۸/فروری ۱۹۳۶ء
کو کی تھی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے بمبئی کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ نے سیلف
گورنمنٹ کے الفاظ کو خارج کر کے اپنے اغراض و مقاصد میں .Responsible Good یا
ذمہ دار حکومت کے الفاظ داخل کیے۔ اب اس کونسل کے اجلاس میں میں نے سب سے پہلے یہ
تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں یہ ترمیم کی جائے کہ مسلم لیگ کا مطمح نظر
ہندوستان کی مکمل آزادی ہے جس کے اجزا پوری آزاد جمہوری حکومتیں ہوں گی جن میں مسلم اور
تمام دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ جیسے ہی میں اپنی تائید میں تقریر ختم
کر چکا تو جناح صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ وہ آزادی کے لفظ کو قبول کرنے کے لیے بالکل تیار
نہیں ہیں۔ اس پر مولانا حسرت موہانی فوراً کھڑے ہو گئے اور ایک بڑی تکلیف دہ بحث شروع
ہو گئی اور سارے مجمع میں سناٹا چھا گیا۔ ادھر بحث بڑھتی جا رہی تھی ادھر میری اس وقت بہت بری
حالت تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر اس وقت یہ نزاع جاری رہا تو بالآخر ووٹ شماری کی نوبت آئے

گی۔ اس میں اگر ہم جیت گئے، جو یقیناً ہوتا تو ہم مسٹر جناح کو ہاتھ سے کھو دیں گے اور اگر ہار گئے تو جمعیۃ العلماء کی فتح ہو جائے گی کیوں کہ ان کو موقع مل جائے گا کہ وہ مسلم لیگ کو بدنام کرتے رہیں کہ اس جماعت کو انگریزوں نے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے اور وہ انھیں کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہندوستان کی آزادی تک کے بھی خلاف تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا اور دوسری طرف تقریر بازی ہو رہی تھی مگر مسٹر جناح کسی طرح آزادی کے لفظ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ جب دو ڈھائی بج گئے، اس وقت آخری مرتبہ میں نے مسٹر جناح سے اپیل کی کہ آپ گاندھی جی کی طرح نہ بنیں اور ہمارے حالات کا پورا جائزہ لے کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ میری تحریک کو رد کرنے سے مسلم لیگ کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا خدا کے لیے اس کو بچایئے اور اپنے ہی ہاتھوں آپ اس کو ہلاکت کی دعوت نہ دیجیے۔ مسٹر جناح بہت جھنجھلا کر اٹھے اور کہا کہ میں .Full Independence پوری آزادی مان لوں گا مگر مکمل آزادی .Complete Independence نہیں قبول کروں گا اس ایک فقرے سے ان کی اندرونی ذہنیت اور طرزِ تخیل کا پتا لگ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کبھی شکست قبول نہیں کر سکتے اور اس کو وہ بہر نوع کسی نہ کسی نوعیت سے اپنی فتح بنا لیتے ہیں چوں کہ دونوں الفاظ میں کوئی فرق نہ تھا اس لیے میں نے اور تمام مجمع نے جناح صاحب کی فل انڈی پنڈنس کو لبیک کہا۔ (شاہراہ پاکستان، ص ۶۵۴-۵۵)

۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۷ء: لکھنو میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقعے پر یہ قول چودھری خلیق الزماں:

''دوسرے دن یعنی ۱۵/ اکتوبر کو مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ہوا جس میں مسٹر جناح نے اس وقت کے حالات پر مکمل تبصرہ کیا جس میں انھوں نے کانگریس کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندوستان میں مکمل ہندو راج کا خواب دیکھ رہی ہے۔ ان کے بعد مسٹر فضل الحق نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ اقلیتوں کی ایک جان کے بدلے میں ہندوؤں کو بنگال میں چار جانیں دینی پڑیں گی۔'' (شاہراہ پاکستان، صفحہ ۶۵۶)

مسلم لیگ سے اخراج:

۲۲/ اکتوبر ۱۹۳۷ء: ۲۲/ اکتوبر کے اخبارات میں کونسل مسلم لیگ کا حسب ذیل بیان شائع

ہوا:

''مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماے ہند اور مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیت علماے ہند کو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ اور لیگ کی ممبری سے خارج کر دیا۔'' (کاروان احرار، ج ۳)

۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۷ء: انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جو انتخابات ہوئے تھے، اس میں جمعیت علماے ہند کے بزرگوں نے مسلم لیگ پاولی مینٹری بورڈ کے ساتھ اتحاد کیا اور لیگ کے رہنماؤں کے وعدوں پر اعتماد کر کے لیگی امیدواروں کو کامیاب بنوایا تھا جب لیگی رہنماؤں نے وعدوں کا ایفا نہ کیا تو اتحاد ٹوٹ گیا۔ اسی زمانۂ اتحاد کے کسی بیان اور اشتہار کے حوالے سے سردار بیگ صاحب (بجنور) نے سوال کیا تھا۔ مفتی صاحب نے یہ جواب دیا:

یہ فتویٰ نہیں بلکہ مشورہ تھا جو گزشتہ الیکشن کے وقت مسلم لیگ کے ذمہ داروں کے حق میں اس بنا پر دیا گیا تھا کہ مسلم لیگ کے ذمہ دار عہدیداروں نے اطمینان دلایا تھا کہ لیگ کے نمایندے وہی ہوں گے جو ترقی پسند اور آزادی کی تحصیل میں کانگریس سے اشتراک عمل کریں گے۔ لیکن جب لیگ نے خالص سرکاری آدمیوں کو ہی نمایندہ بنایا اور ترقی پسندی کی جگہ رجعت پسندی کا عملی ثبوت بہم پہنچایا تو اب اس مشورہ کو لیگ کے امیدواروں کے لیے کام میں لانا درست نہیں ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفات المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

بندے ماترم گیت پر کانگریس کا فیصلہ:

۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۷ء: کلکتہ، ۲۸ر اکتوبر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بندے ماترم کے قضیے کے سلسلے میں ایک بیان کے دوران کہا:

یہ گیت ۱۹۰۵ء سے کہیں پہلے سے گایا جا رہا ہے۔ کمیٹی کو اس امر کا احساس ہے کہ اس گیت کے پہلے دو بند ہماری قومی تحریک کا جز ولاینفک ہیں۔ ان دونوں بندوں میں ایسی کوئی بات نہیں، جس پر کوئی اعتراض کر سکے۔ گیت کے بقیہ بند عموماً نہیں گائے جاتے۔ ان میں بعض اشارے اور مذہبی خیالات ہیں، جو ہندوستان کی دیگر مذہبی جماعتون کے مذہبی تخیلات کے خلاف ہیں۔

کمیٹی گیت کے بعض حصوں کے متعلق مسلمانوں کے اعتراضات کو تسلیم کرتی ہوئی یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ موجودہ نسل کا اس گیت کو قومی زندگی کے طور پر ایک جزو کے طور پر استعمال کرنا،

قومی تحریک کی شکل سے پہلے اس کا ایک تاریخی ناول میں موجود ہونا بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔
لہٰذا تمام باتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ورکنگ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ جہاں کہیں بھی بندے ماترم کا گیت گایا جائے، اس کے صرف پہلے دو بند گائے جائیں۔ البتہ منتظمین کو کامل آزادی ہے کہ وہ بندے ماترم کے ساتھ یا اس کی جگہ کوئی اور گیت جو قابل اعتراض نہ ہو وقتی طور پر استعمال کریں۔'' (کاروان احرار، ج ۳)

۲۸ را کتوبر ۱۹۳۷ء: بندے ماترم گیت ۱۷۷۳ء میں بنگال کے ناول نگار بنکم چندر نے اپنے ناول میں لکھا۔ تب ہندوستان کی آبادی سات کروڑ تھی جیسے کہ گیت کے ایک مصرعے سے ظاہر ہے۔ جب اس پر اعتراضات شروع ہوئے تو ۲۸ را کتوبر ۱۹۳۷ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ بندے ماترم کے صرف پہلے دو بند گائے جائیں۔ البتہ منتظمین کو کامل آزادی ہے کہ وہ بندے ماترم کے ساتھ یا اس کی جگہ کوئی اور گیت جو قابل اعتراض نہ ہو وقتی طور پر استعمال کریں۔ یہ گیت ۱۹۰۵ء سے پہلے سے گایا جارہا تھا۔ اسے کانگریس نے منتخب نہیں کیا تھا۔ کئی سال پیشتر یہ نعرہ اور ترانہ حکومت نے جرائم میں داخل کر دیے تھے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے پر ہزاروں لوگوں کو مصیبت میں مبتلا ہونا پڑا تھا۔

چناں چہ برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کرنے والے لوگ اس گیت کو گانے لگے اور رفتہ رفتہ یہ گیت قومی علامت بن گیا۔ انگریز اسے بغاوت پر اکسانے والا گیت تصور کرتے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں صبح کی اسمبلی میں یہ گیت گایا جاتا تھا۔

۶ ردسمبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بندے ماترم کی جگہ نیا قومی گیت تلاش کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی قائم کی۔ جس کا مقصد ہندوستان کے تمام باشندوں کے عقاید کو سامنے رکھ کر قابل قبول گیت کی منظوری دینا تھا۔ اس کمیٹی میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور نریندر دیو شامل تھے۔ اس دوران میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا گیت ''ترانہ ہندی ہر جگہ گایا جاتا تھا۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

بندے ماترم گیت کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے اس میں بھی ہندوستان کے اس حسن و جمال اور قدرت کے انعامات وعنایات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ''ترانۂ ہندی'' میں موجود ہے۔ نامعلوم بندے ماترم پر اعتراضات کرنے والوں کے لیے علامہ اقبال کا ترانہ کیوں قابل قبول ہے جب کہ بندے ماترم نا قابل قبول؟ حال آں کہ نفس مضمون، الفاظ اور تخیل کے اعتبار سے دونوں میں بہت مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے اور دونوں کی روح ایک ہے۔

(۱)

ماں ہم تیرے آگے جھکتے ہیں
اچھے پانی والی، اچھے پھولوں والی
دکن کی ٹھنڈی ہواؤں والی
ماں! ہرے بھرے کھیتوں والی

(۲)

حسین چاندنی سے روشن رات والی
گنجان درختوں والی
کھلے ہوئے پھلوں والی
میٹھی میٹھی ہواؤں والی
ماں سکھ دینے والی، برکت دینے والی

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص، ۱۳۶-۳۷)۔

مسلمانوں کو کانگریس کی یقین دہانی:

اکتوبر ۱۹۳۷ء: اگر چہ کانگریس کے نو منتخب صدر کی تقریر ہی کفایت کرتی تھی لیکن کانگریس نے مزید یقین دہانی اور گورمنٹ کے پیش نظر آخری سیشن میں ایک قرارداد کے ذریعہ صدر کی

تقریر کی زیادہ واضح انداز میں تصدیق وتوثیق کردی۔قرارداد میں کہا گیا تھا:

''کانگریس ہندوستان کے مسلمانوں اور اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے مخالف سامراج جذبہ اور جوش کا خیر مقدم کرتی ہے،اور ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں جو سب کے لیے یکساں ہے اور جو متحدہ وقومی بنیاد پر ہی لڑی جاسکتی ہے۔اس میں ان تمام فرقوں اور طبقوں کی متحدہ شرکت کا خیر مقدم کرتی ہے۔کانگریس خاص طور پر ان اقلیتوں کی کثیر تعداد کا جو پچھلے سال کانگریس میں شریک ہوئی اور آزادی واستحصال سے نجات کی جدوجہد اور کشمکش میں اس نے جو اجتماعی طاقت بہم پہنچائی ہے اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ورکنگ کمیٹی نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اپنے کلکتہ کے اجلاس میں اقلیتوں کے حقوق پر جو تجویز پاس کی تھی،اسے بھی کانگریس منظور کرتی ہے۔نیز نئے سرے سے اعلان کرتی ہے کہ۔

''ہندوستان کی اقلیتوں کے تمدنی،مذہبی اور لسانی حقوق کی حفاظت کرنا کانگریس کا پہلا فرض اور بنیادی پالیسی ہے،تاکہ حکومت کسی بھی ایسی اسکیم میں جس میں کانگریس شریک ہو،اقلیتوں کو ترقی اور نشو ونما کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے،اور وہ قوم کی سیاسی،اقتصادی اور کلچرل زندگی میں پورا حصہ لیں سکیں۔''

''بنابریں مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آزادی ہندوستان اور سوراج کی حکومت میں ان کا مذہب اور مذہبی فرائض اذان،نماز،عید،روزہ،حج،زکوٰۃ،مذہبی تبلیغ،مساجد،مقابر،قربانی، مذہبی جلوس،مذہبی جلسے وغیرہ جملہ مذہبی رسوم اور مذہبی ادارے محفوظ ہوں گے۔اس طرح ان کی تہذیب وتمدن،ان کے تعلیمی ادارے،خانقاہیں،امام باڑے،تکیے،کربلائیں،آثار قدیمہ و اوقاف وغیرہ سب محفوظ ہوں گے۔اسی طرح ان کی زبان،شاعری،رسم الخط وغیرہ سب کے سب آزاد اور محفوظ ہوں گے۔کسی پر کوئی رکاوٹ اور قید نہ ہوگی۔''

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست......،ص ۶۹۔۱۶۸)

لیگی علماء کا رویہ:

یکم نومبر ۱۹۳۷ء: کان پور کے محمد قیام،عزیز احمد،ظہور احمد اور عبدالعزیز صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا تھا:

''اب جب کہ دونوں جماعت سے یعنی مسلم لیگ وکانگریس سے تعلق رکھنے والے علماء

کرام مسلم عوام کے سامنے اپنی اپنی جماعت کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ اور محض اسی پر اکتفا نہیں بلکہ ایک جانب کے علمائے کرام دوسری جانب کے علمائے کرام کے خلاف ناسزاوار الفاظ استعمال کرتے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سواد اعظم اسلام سے فرداً فرداً مسلمان ہٹتے جاتے ہیں۔ مسلم وقار اور اتحاد بین المسلمین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایسی ہیجانی حالت میں مسلم عوام عموماً اور جاہل دیہاتی مسلمان خصوصاً سخت پریشان ہیں کہ کیا طرزِ عمل اختیار کریں، کس کی پیروی کریں، کس کو حق بجانب سمجھیں؟''

حضرت مفتی صاحب کا جواب نقل کرنے سے پہلے یہ وضاحت کردی جائے کہ یہ جو مستفتی نے تحریر کیا ہے کہ ''ایک جانب کے علمائے کرام دوسری جانب کے علمائے کرام کے خلاف کا ناسزاوار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔'' تو یہاں جانب اول سے مراد مسلم لیگی علماء ہیں۔ یہ طرز اور اخلاق انھوں کا تھا۔ جمعیت علمائے ہند سے تعلق رکھنے والے علما ان بے ہودگیوں اور بد اخلاقیوں سے دور ونفور تھے۔

حضرت مفتی صاحب نے اس استفتا کا یہ جواب دیا:

''مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں شرکت تو سب کے نزدیک لازمی ہے، مگر طریقۂ عمل کے اختیار کرنے میں رائے مختلف ہے۔ کچھ لوگ دیانتداری سے یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی اقوام ہند کی مشترکہ جدوجہد سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے مشترکہ مجلس کانگریس میں شریک ہونا مفید اور لازم ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے حلقے میں یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو علاحدہ منظم ہوکر جدوجہد کرنی چاہیے۔ ان میں سے کون صحیح راستے پر ہے اور کون غلط، اس کا فیصلہ میں ابھی کرنے سے قاصر ہوں۔ مگر ایک فریق کا دوسرے فریق کو برا بھلا کہنا اور مخالف کے حق میں ناسزاوار اور نالائم الفاظ کہنا تو کسی حال میں بھی زیبا نہیں آپ اپنے لیے راہ عمل اختیار کرنے میں اس جماعت کے ساتھ رہیں جو ذاتی اغراض سے بالاتر ہو، اور ایثار پیشہ، اور قربانی پیش کرنے کے لیے تیار اور اس کے ساتھ اسلامی تعلیم سے باخبر اور عمل صالح سے آراستہ ہو۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۲۰ر نومبر ۱۹۳۷ء:

حضرت شیخ الاسلام نے اس خط کا یہ جواب دیا:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

متعدد والا نامجات باعث سرفرازی ہوئے، ہمدردی سے بھرے ہوئے الفاظ واعمال کا جن کو کہ عزیزم وحید مرحوم کی وفات پر عمل میں لایا گیا ہے، تہ دل سے شکر گذار ہوں فجزاکم اللہ احسن الجزاء

چوں کہ ان تحریرات میں کوئی چیز طالب جواب نہیں ہے اس لیے ان سے درگذر کرتے ہوئے امور مستفسرہ کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

(۴ر رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ کے خط کے امور:)

(۱) مولانا محمد ابراہیم صاحب کے متعلق سال گذشتہ میں بھی اہل دربھنگہ کو مولانا شبیر احمد صاحب نے لکھ دیا تھا کہ دارالعلوم ان سے کسی طرح مستغنی نہیں ہوسکتا، البتہ اگر وہ چاہیں تو مولانا محمد سہول صاحب سے براہ راست گفتگو کرلیں یہی جواب ہمارا اب بھی ہونا چاہیے، مولانا سہول صاحب نے یہاں کے لوگوں کو میرے سر کردیا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ اگر حسین احمد مجھ کو سلہٹ رہنے کی اجازت دے گا تو میں رہوں گا ورنہ نہیں۔ مگر ساتھ ساتھ رغبت کا اظہار اور آیندہ کے انتظامات بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ابھی تک کسی سے کوئی اقرار یا انکار نہیں کیا ہے، مگر گردوپیش کے احوال پر نظر ڈال کر یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو آزاد کردیا جائے اور ان کو یہاں رہنے یا کسی دوسری جگہ جانے سے نہ روکا جائے آپ کے فتویٰ خانہ کا کام اللہ تعالیٰ کسی دوسرے طریقہ سے چلائے گا۔ مولانا سہول صاحب کو ۲۵۰ روپے ماہوار سے روکنا اور وہ بھی اپنی مصلحتوں کی بنا پر مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) ٭رے متعلق انقلاب اور الامان اور وحدت کا رویہ کب اطمینان بخش رہا ہے جو آپ اس کی امید کی جائے؟ یہ دونوں گورنمنٹی اخبار ہیں ان کو جمعیۃ العلماء اور تحریکات قومیہ سے سخت عداوت ہے۔ انھوں نے جمعیت کے اراکین کے متعلق کب نظر عفو وکرم کو استعمال کیا ہے؟ آج سے پہلے کے ہر سال اور بالخصوص کسی تحریک کے زمانے کے پرچے نکال کر دیکھیے ان میں کس قدر

گالی گلوج استعمال کیا گیا ہے اسی بغض وعناد کی بناء پر جہاں سے بھی کوئی وسیلہ کسی قسم کے اعتراض کا جھوٹا یا سچا مناسب ہو یا غیر مناسب شائع کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور خوب اس پر ملمع سازی کرتے ہیں۔ ابھی کا واقعہ ہے کہ بحال آں کہ میں میرٹھ کی فلسطین کانفرنس میں شریک نہیں ہوا دیوبند سے جدا بھی نہیں ہوا، مگر انقلاب میں نامہ نگار کی تحریر موجود ہے کہ حسین احمد اور عطاء اللہ شاہ بخاری میرٹھ میں آئے اور کوئی جگہ ان کو ٹھہرنے کی نہیں ملی، ایک طوائف کے مکان میں ٹھہرے او رپھر اس کے بعد انقلاب اور اس کے ہم نوا اخباروں نے (الہلال وغیرہ) مذاقیہ مضامین میں خوب پھبتیاں اڑائی ہیں۔ ایسی صورت میں تو ان لوگوں کو میرا موجود ہونا ہی آنکھوں میں خار ہے اس کا علاج ہی کیا ہے؟

بخاری شریف کی دونوں جلدیں محرم کے مہینہ سے شروع ہوتی ہیں اور برابر آٹھ مہینہ پڑھائی ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ کہا جانا کہ بیس دن میں ختم ہوگئی یا خود عبارت پڑھ کر ختم کر دیا جو کچھ بھی کہا جائے اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے، ترمذی شریف کی تقریروں اور بخاری شریف کی تقریروں سے طلبہ کے کاغذات بھرے ہوئے موجود ہیں، انھیں کو دیکھ لیا جائے۔ بے شک ہم پر مولانا شبیر احمد صاحب کا اعتراض بجا ہے کہ طرز تعلیم غلط ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ہونا چاہیے جس پر وہ خود عامل ہیں، مگر میرا خیال یہ ہے کہ اب وہ یہاں کے لیے کارآمد نہیں اور نہ اس پر عمل درآمد ہوسکتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اس میں تبدیلی کردی تھی اور اتنے بڑے مجمع میں اس کا چلانا غیر ممکن ہے بہرحال جہاں تک میری ذات سے اس کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اور مجھ میں زمین وآسمان بلکہ اس سے زاید کا فرق ہے۔

مجھ کو بخوبی یاد ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ساتھ تھا اور بخاری ساتھ تھی وہ زمانہ بخاری شریف کے پڑھنے کا تھا۔ خانقاہ کی سہ دری یا چھپر میں حضرت نانوتویؒ نے پڑھانا شروع کیا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ عبارت پڑھنے والے تھے۔ نہایت تیز عبارت پڑھ رہے تھے مگر حضرت نانوتویؒ چیں بجبیں تھے کہ عبارت تیز کیوں نہیں پڑھتے ہو اس پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ میاں کیوں اس کو تہدید کرتے ہو اس سے زیادہ تر تیز وہ کس طرح پڑھ سکتا ہے۔

کیا وہ روایات جو کہ ایک مرتبہ آچکی ہیں وہ بار بار آئیں تو ہر مرتبہ پر تقریر ہونی چاہیے کیا سات مہینے میں جب کہ دس پارے بخاری شریف کے پوری تفتیش وتنقید کے ساتھ ہو چکے ہوں تو

غیر مکرر احادیث الا ماشاء اللہ باقی رہ جائیں گی، کیا ایک سو بیاسی ۱۸۲ طلبہ کا پڑھانا اور وہ بھی جن کی لیاقت معمولی نہ ہو اور آٹھ دس طلبہ کا پڑھانا برابر ہو سکتا ہے؟

میرے خلاف تو پروپیگنڈے ابتدا ہی سے ہو رہے ہیں، اس کی فکر جناب کو نہ ہونا چاہیے، میں اپنا جواب دیتا رہوں گا۔

دشمن اگر قوی ست مہرباں قوی تراست

البتہ دارالعلوم کی پوزیشن صاف ہونا اور رہنا چاہیے میں نے ایک تحریر مدینہ، الجمعیۃ، ہند، انصاری میں بھیجی ہے جس میں دارالعلوم کا سیاسیات اور بالخصوص الیکشن سے علاحدہ رہنا دکھلایا ہے بالخصوص حافظ محمد ابراہیم صاحب کے الیکشن سے۔ کیوں کہ وہ زمانہ امتحان کا تھا کسی مدرس یا ملازم کو فرصت ہی نہ تھی۔

یہ سب جناب مظہر الدین صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی ناپاک کارروائیاں ہیں جب تک الیکشن نہیں ہوا تھا جب تک بھی دروغ اور افترا انیز اپنی کامیابی کے پل باندھ رکھے تھے اور ہر روز اور ہر جلسہ میں عام پبلک کو اپنی کامیابی کے فیصدی نوے اور اسی فوٹو دکھائے جاتے تھے اور جب ناکام ہو گئے اور اس طرح پر کہ جس کے برابر کوئی ذلت ہو ہی نہیں سکتی تو ہر خس و خاشاک پر الزام دینے لگے اور گالی گلوج دینے اور شرارت پر اتر آئے۔

بہر حال دارالعلوم کے متعلق تو مضامین بھیج چکا ہوں اور دوسرا مضمون چندہ کی اپیل کا بھی بھیج چکا ہوں اور بھیج رہا ہوں البتہ اپنے اور لیگ کے متعلق بھی بیان دینے والا ہوں مگر ابھی تک لکھنے کی فرصت نہیں ہوئی۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی جگہ کے لیے کوئی مطالبہ آپ سے کیا گیا ہے یا نہیں؟ مجھ سے اب تک کسی نے کچھ نہیں کہا، البتہ مولانا مبارک علی صاحب کی صاحبزادے مولوی سعید فرماتے ہیں کہ میرے لیے سعی کر دینا، مگر اہل کلکتہ کی طلب مجھ کو نہیں معلوم ہوئی جن صفات کا موصوف آپ خیال فرما رہے ہیں آیا کوئی شخصیت آپ کے خیال میں ہے یا نہیں؟ میری سمجھ میں کوئی نہیں آیا آپ کے خیال میں کوئی آیا ہو تو بتائیں؟ یہاں یکم جمعہ کو ہوئی، رویت بھی ہوئی، خبریں بھی آئیں۔

(دوسرا والا نامہ ۹ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ کے امور)

(۱) بعض باتیں پہلے معروضات میں آ گئی ہیں یہ پروپیگنڈا تو جب تک میں زندہ ہوں اور

جب تک میں گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف رائے رکھتا ہوں، جاری رہے گا، ہاں ارباب اغراض کی وجہ سے اس میں چار چاند لگ جانے بھی ضروری ہیں جو جوابات میرے متعلق جناب نے تحریر فرمائے ہیں وہ بجائے خود نہایت صحیح ہیں مگر جو اشکال جناب نے مولوی محمود صاحب اور مولوی سلطان الحق صاحب مولوی عبدالوحید صاحب کے متعلق ذکر فرمایا ہے، اس کے لیے قانونی جواب تو یہی ہے کہ یہ لوگ ہم سے اپنی شدید اور شخصی ضرورتوں کے اظہار کی بناء پر غائب ہوئے تھے اور وہ بھی بہت تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے اب ہم نہیں جانتے کہ انھوں نے اس مدت میں کیا کام کیا؟ اس کام کی ذمہ داری مدرسہ پر عاید ہی نہیں ہوسکتی۔ ایسا کام رخصت لینے والے کی ذمہ داری ہی پر عاید ہوسکتا ہے۔

اور غیر قانونی بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ مولوی محمود اور مولوی سلطان الحق کی رشتہ داری حافظ ابراہیم صاحب سے ہے، نیز پڑوس کا معاملہ ہے، بالخصوص مولوی محمود کے لیے، دن رات کا علاقہ ہے۔ پھر آپ ہی بتلائیے کہ وہ ایسے وقت میں جب کہ لیگ کے سرگروہوں نے اپنی تمام طاقتیں لاکر میدان میں ڈال دی تھیں اور جناح سے لے کر ادنیٰ والنٹیر تک حاضر ہوکر ڈیرہ ڈال چکا تھا، مولوی ظفر علی خاں صاحب تک نے اپنے اتحاد ملت کے والنٹیر لاہور و کانپور وغیرہ سے لاکر میدان میں حاضر کر دیے تھے۔ اہل فرنگی محل و اہل بدایوں و حضرت الامان کے مواعظ صرف تجہیل بلکہ تکفیر تک کے۔ بیانات روزانہ میدان میں حافظ ابراہیم صاحب اور ان کے ہمدردوں کے متعلق ہو رہے تھے یہ لوگ اتنے تعلقات کے باوجود کب بیٹھ سکتے تھے! یہ انھوں نے کارروائی مناسب اور موزوں کر دی کہ اپنی ضرورت شدیدہ اور سخت لزوم کو ظاہر کر کے گئے وہاں کے حالات دیکھ کر ان کو کودنا پڑا۔ مولوی عبدالوحید صاحب غازی پوری بھی۔

بجنور میں دورہ کر کے چندہ کر چکے تھے اور دوران دورہ۔ حافظ ابراہیم صاحب کے لوگوں نے ان کی امداد کی تھی اور انھوں نے وعدہ لے لیا تھا کہ ہماری امداد کرنا وغیرہ وغیرہ پھر کیا ان کا فریضہ یہ نہ تھا کہ یہ بھی ان کی حسب وعدہ امداد کرتے، بہر حال مدرسہ پر ذمہ داری جب ہی عائد ہوتی ہے کہ مدرسہ بحیثیت مدرسہ کوئی کام کرے نیچے کے درجہ کے ملازم اگر کچھ کریں اور وہ بھی شخصی رخصتوں کے بعد تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ بالکل ہی غلط الزام ہے۔ بہر حال میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ عائد نہیں ہوسکتا۔

امور ذیل کی طرف بھی توجہ فرمائیں!

(۱) حیدر آباد سے اگر گھٹ دار صاحب کی رقم نہ آئی ہو تو مطالبہ فرمائیں۔

(۲) جدید حجروں میں جن کے چندے آ چکے ہیں ان پر پلاسٹر کرا دیا جائے۔

(۳) سی عبدالحلیم صاحب کو وعدہ کی یاددہانی کی جائے، واللہ اعلم۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

۱۶؍رمضان ۱۳۵۶ھ

اس مکتوب کی ابتدائی سطروں میں ''عزیزم وحید مرحوم'' کی تعزیت کا ذکر آیا ہے۔ مراد وحید احمد حضرت شیخ الاسلام کے بھتیجے ہیں، جو حضرت کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق کے بیٹے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے تربیت فرمائی۔ مالٹا میں حضرت شیخ الہند کی خدمت میں تھے اور حضرت سے پڑھتے بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے تکمیل کی۔ معین مدرس بھی رہے۔ مظفر نگر سے رسالہ ''جمیل'' جاری ہوا۔ وہ اس کے ایڈیٹر تھے۔ سیاست سے بھی دل چسپی تھی۔ مدرسہ عزیزیہ بہار میں صدر مدرس تھے۔ طاعون میں مبتلا ہوئے۔ حضرت شیخ الاسلام انھیں ٹانڈہ الہٰ داد پور ضلع فیض آباد لے آئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں نے حادثۂ انتقال کی تاریخ کے لیے غالباً دسمبر ۱۹۳۸ء کا جملہ استعمال کیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کے مکتوب گرامی مورخہ ۱۶؍رمضان ۱۳۵۶ھ (مطابق ۲۰؍نومبر ۱۹۳۷ء) میں ان کی تعزیت کے جواب سے پتا چلتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا اعلان:

۲۴؍نومبر کو ڈاکٹر چوئتھ رام گڈوانی صدر سندھ پروونشل کانگریس نے کراچی سے مولانا عبید اللہ سندھی کو مکہ مکرمہ میں ایک خط لکھا تھا اور پوچھا تھا:

''اب آپ کے سیاسی خیالات کیا ہیں؟''

اس کے جواب میں مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا:

''میں نے اپنا ترکی کا مشن مکمل کر چکنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں عدم تشدد کا فلسفہ تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جو اس اصول کے خلاف ہو۔ اگر مجھے ہندوستان آنے کی اجازت دی جائے تو میں کسی بیرونی تحریک سے اپنا تعلق نہیں رکھوں گا۔''

(روزنامہ ''انقلاب'' لاہور۔ ۲۶؍نومبر ۱۹۳۷ء)

صدر، سندھ کانگریس نے مولانا کے اس خط کی ایک نقل وزیر ہند کو بھیج دی۔ نیز اس پر لکھا کہ

ان حالات میں آپ سے درخواست ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت دی جائی۔ ۱

۳۱ردسمبر: ۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو مرکزی حکومت نے سندھ حکومت سے سفارش کی کہ:

''مولانا سندھی کے داخلہ ہند پر جو قیود عائد ہیں۔ اگر انھیں رفع کر دیا جائے اور مولانا سندھی کو سندھ میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی جائے تو حکومت ہند کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

(کاروان احرار، ج ۳)

۲۴ر نومبر ۱۹۳۷ء:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج مبارک: اس سے پہلے عریضہ روانہ کر چکا ہوں، متعدد اخباروں کو دارالعلوم کی الیکشن اور سیاسیات سے پاک دامنی کے بارے میں اور علاحدہ ایک اپیل برائے چندہ روانہ کر چکا ہوں، ہر دو تحریریں مدینہ بجنور، الجمعیۃ دہلی، انصاری دہلی، ہند کلکتہ کو بھیجی گئی ہیں، تحریر اپیل فقط صدق لکھنو، خلافت بمبئی، اجمل بمبئی، الوحید کراچی حافظ محمد صالح صاحب راندیر کو بھیج چکا ہوں۔ وقت بالکل نہیں ملتا قرآن کا یاد کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لیے کما ینبغی سب کو مفصل تحریرات لکھنا نہایت دشوار ہے شیخ سراج الدین صاحب نے وہ مضامین دکھلائے اور بھیجے جو میرے متعلق لکھے جا رہے ہیں۔ یقیناً کسی سازش کا یہ عمل ہے مجھ کو اپنی ذاتی حیثیت میں پریشانی ہرگز نہیں۔ مگر اس میں دارالعلوم پر حملہ کیا گیا ہے اور چندے کے توقف کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ چیز البتہ باعث فکر ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ واقعات ہیں، کیا یہ واقعہ ہے کہ بخاری شریف بیس دن میں ختم ہوئی ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ابتدائی محرم سے بخاری جلد اول اور ابتدائی صفر سے بخاری جلد ثانی شروع ہوئی اور ثانی الذکر بعد از عشاء ڈیڑھ گھنٹہ یا اس سے زائد اور اول الذکر بعد از عصر ایک گھنٹہ یا اس سے زائد ہوتی رہی ترمذی روزانہ ۹ بجے سے لے کر ۱۲ بجے تک، کبھی تین گھنٹے اور کبھی ڈھائی گھنٹے ہوتی رہی، آخر حرف تک ترمذی میں مباحث تفصیلی طور پر ہوتے رہے، جس پر طلباء کی لکھی ہوئی تقریریں موجود ہیں۔ جلد ثانی مولانا اعزاز علی صاحب نے پانچویں

گھنٹہ میں پڑھائی اور جب جلد ثانی ختم ہوگئی تو میں نے ترمذی جلد اول بھی اسی گھنٹہ میں کردی، ترمذی روزانہ چار گھنٹے ہوتی تھی اور بخاری شریف روزانہ ڈھائی گھنٹہ اور کبھی تین گھنٹہ ہوتی تھی۔

ابتدائی محرم سے لے کر ۲۵ رشعبان تک آپ رجسٹر حاضری میں میری غیوبت دیکھیے اور ملاحظہ کیجیے کہ اوسط ہر ماہ میں تین چار دن سے زائد غیوبت کا پڑتا ہے یا نہیں، رجسٹر موجود ہیں، باقی رہا مسئلہ ۱۶ رشوال سے اواخر ذیقعدہ تک کا وہ میں نے بوضع تنخواہ مدرسہ سے رخصت لے کر مسلم لیگ کے الیکشن میں خرچ کیا ہے۔ اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ ذی الحجہ میں تعطیل کے بعد کے ایام بیماری کی وجہ سے حرج کے نذر ہوئے ہیں، جس میں کوئی مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ حال آں کہ یہ سفر بھی تعلیمی اور تبلیغی جلسوں کے لیے ہوا تھا اگر اسی کو واقعیت کہا جائے گا تو میں نہیں سمجھتا کہ غیرواقعی کس چیز کو شمار کیا جائے گا۔ بخاری شریف آٹھ مہینہ تک روزانہ ڈھائی تین گھنٹہ ہوتی رہی اور بعض اوقات میں چار گھنٹہ اور اس سے زائد ہوئی، امتحان شروع ہونے تک دس پارے ہوچکے تھے عموماً احادیث مستو جب بحث میں آچکی تھیں، احادیث مکررہ کے آنے کا اقعہ چوں کہ ترمذی میں ابحاث مذاہب ہوتی ہیں اور تمام صحاح ستہ کے امتحان کا مدار ترمذی ہی پر ہے اس لیے اس کو پورا کرانا ضروری تھا اسی لیے کوشش کی گئی اور وہ ضروری بھی تھی کہ کتب حدیث کے امتحان شروع ہونے سے پہلے ترمذی کی تمام ابحاث مکمل طریقہ پر طے ہوجائیں، طلباء ہی سے پوچھو کہ البیعان بالخیار کی بحث، مصراۃ کی بحث، ومرض حیوان بالحیوان کی بحث، بیع مدبر کی بحث، عتق بعض کی بحث، مزارعت کی بحث، عرایا کی بحث، قضاء قاضی کے ظاہر و باطن ہونے کی، قضاء بمشاہد واحد کی نصاب سرقہ...... وحد خمر وغیرہ کی بحث، علی ہذا القیاس نکاح وطلاق حج وغیرہ کی ابحاث کیا انھی اخیر زمانوں میں نہیں ہوئیں اور مذکورہ بالا مضامین عموماً امتحان تقریری شروع ہوجانے یا اس کے قریب میں ہوئے ہیں اور بہت سے مضامین تحریری امتحان کے زمانے میں ہوئے ہیں اور ایک ایک بحث میں اس وقت میں بھی ایک ایک اور دو دو دن خرچ ہوئے ہیں اور متواتر گھنٹوں کا خرچ ہونا تو معمولی بات تھی کیا میں ان کتابوں کو تیز روی کے ساتھ خود عبارت پڑھ کر چلارہا تھا ایسا کہنا کس قدر ظلم ہے اگر میں ایسا کرتا تو یقیناً رجب ہی کے مہینہ میں دونوں کتابوں سے فارغ ہوگیا ہوتا، باقی رہا اعتراض طرز تعلیم پر اس کو میں ایک درجہ تک تسلیم کرنے کو تیار ہوں اور اس کے متعلق میرے پاس جوابات بھی ہیں۔

سید لقاء اللہ شاہ بخاری انبالوی سابق متعلم دار العلوم و مقیم حال اجمیری گیٹ کا جو مضمون شائع کیا گیا ہے اور اس میں بڑے شد و مد سے اپنی صداقت کا ادعا ہے ذرا اس کو دیکھیے (یہ مضمون ص ۵ کالم ۱و۲ جلد انمبر ۶۰، ۲۰ نومبر کو الہلال میں شائع کیا گیا ہے غالباً الامان سے نقل ہے۔

اتنے زور کے ادعاء کے بعد اولین کارنامہ ہمارا یہ دکھایا ہے کہ وفد مصری کے سامنے حسین احمد نے عربی میں تقریر کی اور مولانا السید محمد انور شاہ اور ان کے نادر روزگار ساتھیوں کا نام تک نہیں لیا، مولانا محمد طیب صاحب نے چاہا کہ وہ ازہری علماء کے آگے ان اکابرین کے کارنامے بیان کریں اور ان کے مسلک کو توضیح فرمائیں مگر مولوی حسین احمد نے ان کو سختی کے ساتھ روک دیا الخ۔

کیا یہ محض افترا نہیں ہے؟ میں کب وفد کے وقت موجود تھا اور کب ایسا واقعہ پیش آیا اسی طرح نمبر ۲، ۳ وغیرہ کو دیکھیے مولانا شبیر احمد صاحب کا استعفاء وغیرہ، ظفر علی خاں اور حسرت موہانی کو گالیاں دینا کبھی خیال میں نہیں آیا چہ جائے کہ گالی دی جاتی ہو۔ طلبہ کو کب اس انتخاب میں چھٹی دی گئی اسی طرح کی جملہ خرافات جو کہ اس میں درج ہیں ان کی برائے خدا کوئی واقعیت بھی تو بتا دیجیے۔

اور اگر یہ واقعات ہیں تو ایسے شخص کو دار العلوم میں ایک منٹ کے لیے رہنے دینے میں کیا کوئی ذمہ دار شخص بری الذمہ ہو سکے گا۔

ان بیانات وغیرہ میں آپ حضرات سے مطالبہ کیا گیا ہے اگر کوئی بیان مدرسہ کی مصالح کے لیے ضروری ہو تو لکھیے، باقی رہا میں، تو مجھ کو تو ایسے ایسے افترا آت کی پروا نہیں ہے :

تو پاک باش مدارائے برادر از کس پاک
زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ

مہربانی فرما کر منشی محمد شفیع صاحب کو میری تنخواہ میں سے مبلغ ۷۰ روپے دے دیجیے۔ موصوف اس میں سے ۲۵ روپے بنام مولوی عزیز احمد اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد اور مبلغ ۲۵ روپے مولوی فضل الرحمن اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد اور مبلغ ۲۰ روپے میرے نام پر یہاں جلد روانہ کر دیں، میں ان شاء اللہ یکم شوال کو یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا، راستہ میں ایک یا دو دن کلکتہ میں اور اسی طرح بہار میں اور اسی طرح ٹانڈہ میں گزارتا ہوا جلد خدمت میں پہنچوں گا۔

قرضہ فنڈ کے متعلق جو کچھ ارشاد ہے اس کی فکر کروں گا۔(۱)

دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں، مولانا مبارک علی صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا عبدالسمیع صاحب، مولانا اعزاز علی صاحب اور دیگر حضرات کی خدمات عالیہ میں سلام مسنون معروض ہو، مولانا جلیل احمد صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی بالخصوص جس روز ان کو بیٹی کی پیدائش کی خبر ملی تمام رات بخار رہا۔ سینہ اور کمر میں درد رہا رات کو قرآن نہ تراویح میں سنایا نہ نوافل میں۔ مگر کل شب میں سنایا۔

اس وقت ابھی آرام فرما ہیں ان کا بھی سلام مسنون بلا پوچھے ہوئے لکھ رہا ہوں۔ والسلام

ننگ اسلام حسین احمد غفرلہ،

۲۰ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

۳۰ رنومبر ۱۹۳۷ء: حضرت کا یہ مکتوب گرامی مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے اس خط کے جواب میں ہے جس میں مرحوم نے لکھا تھا کہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کی جانب سے صدر مدرسی پر مولانا محمد سہول صاحب یا مولانا محمد ابراہیم صاحب کو مانگا گیا ہے۔ اس کے متعلق کیا جواب دیا جائے؟

ان دونوں حضرات میں سے ممکن ہے کہ مولانا محمد سہول صاحب تیار ہو جائیں کیوں کہ بحالت ملازمت دارالعلوم بھی ممدوح بیرونی ملازمتوں کی طرف نظر التفات رکھتے ہیں۔ غالباً آج کل سلہٹ میں بھی ملازمت کا تعلق ہے مگر دارالعلوم سے رخصت پر ہیں۔

---

(۱) دارالعلوم میں ایک فنڈ قائم کر دیا گیا جس میں ضرورت مندوں کو قرضہ فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق حضرت مہتمم قاری محمد طیب مرحوم نے اپنے خط مورخہ ۲۰ رنومبر ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا:

''مہتمم صاحب کے خط کا اقتباس مولانا مدنی کے نام: قرضہ فنڈ میں بے حد تنگی ہے پیشگی تنخواہیں پہلے سے بند ہیں ماذجب دیا جاتا تھا اس میں بھی کچھ قیود بند عائد کر دی گئی ہیں۔ لوگوں کی ضروریات ہر ماہ میں مقتضی ہوتی ہیں کہ تنخواہ سے زائد بطور قرض لیں مگر قرضہ فنڈ میں بھی تین سو روپے ہیں دس دس بیس بیس۔ درخواستیں قرضوں کی ہر ماہ میں رکھی رہتی ہیں۔ ماہ پر وصول نہیں ہونے پاتا کہ اسی آن پھر بٹ جاتا ہے۔ اس لیے اس کی توسیع کی ازحد ضرورت ہے اگر اس فنڈ میں ایک ہزار روپیہ ہر وقت رہے تو بضرورت تمام اس فنڈ سے بڑے چھوٹے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ایسی توسیعات میں نظر صرف حضرت ہی پر جاتی ہے یہ فنڈ چوں کہ مدرسہ کا راس المال نہیں ہے، اس لیے کسی ایک بڑے متولی کو یا کسی کو وقیع شخصیت ہی اس مد میں رقم دینے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اس سفر میں کلکتہ وغیرہ میں اس کے لیے ضرور سعی فرمادی جائے۔''

آج کل آں مخدوم کے خلاف ناشائستہ طرز تحریر الامان (دہلی) اور انقلاب (لاہور) زیادہ لکھ رہے ہیں اور اس سلسلے میں دارالعلوم کے طرز تعلیم اور بالخصوص ختم بخاری شریف پر زیادہ برس رہے ہیں۔ کل ملاقات کے لیے مولانا شبیر احمد صاحب کے پاس گیا تھا۔ ممدوح نے خصوصیت سے یہ مضامین مجھے دکھلائے اور نفس اعتراض کو واقعہ بتلایا ادھر اسی سلسلے میں بعض خطوط بھی موصول ہوئے ہیں، جن کا مضمون وہی ہے جو اخبارات میں شائع ہوا ہے! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چیز شاید اتفاقی نہیں اخبارات خطوط اور بعض ذمہ داروں کی اس سے دلچسپی وغیرہ کے جمع ہونے سے خیال ہو جاتا ہے کہ شاید کسی تحریک کے ماتحت ہو۔ واللہ اعلم۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر آں مخدوم کی جانب سے اخبارات میں کوئی اعلان امداد دارالعلوم کے لیے چلا جائے تو مناسب ہے جس میں اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو ان امور کے متعلق بھی کوئی کلمہ آ جانا چاہیے تاکہ تلبیس یا غلط فہمیاں رفع ہو جاویں کیوں کہ ان مضامین میں مختلف اعتراض معلوم ہوئے ہیں، بعض کو دارالعلوم ہی سے دلچسپی نہیں بعض کو آں مخدوم کی ذات سے نہیں ہے اور بعض کو مجلس کانگریس اور لیگ کی کشمکش اس سے دلچسپی لینے کا سبب بنی ہے، بہی خواہی دارالعلوم کسی کا بھی منشا نہیں ہے۔ ہاں! اس سلسلے میں جو واقعی کمزوری نظم یا تعلیمات کی ہو اسے باہمی مشورے سے رفع کر لینا خود دارالعلوم ہی کا فرض ہونا چاہیے سوا سے آپ حضرات سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے، کلکتہ کولوٹولہ کی مسجد کو مولوی عتیق الرحمان صاحب عثمانی چھوڑ رہے ہیں۔ غالباً شوال سے وہ دہلی میں قیام کریں گے۔ انھوں نے آٹھ دس ہزار روپیہ دارالتصنیف کے نام سے تجار کلکتہ سے جمع کیا ہے اس جگہ کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو دارالعلوم کا بہی خواہ بھی ہو اور کام بھی کرے اس جگہ پر مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کو آں مخدوم ہی کی سعی نے پہنچایا تھا۔ اب بھی کسی موزوں شخصیت کا انتخاب فرما کر اگر ذمہ داران مسجد سے خود اپیل فرما دیں تو یہ ایک مرکزی جگہ دارالعلوم کے ہاتھ میں رہے گی میری سمجھ میں ابھی تک کوئی نام نہیں آیا ورنہ عرض کرتا، یہاں یک شنبہ کو نہ رویت ہوئی نہ شہادت آئی۔

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۴ر رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء: ''۱۹۳۷ء میں سرحد اسمبلی کے الیکشن ہو گئے۔ اس میں اکثریتی پارٹی خدائی خدمت گاروں کی تھی۔ مگر گورنر نے وزارت بنانے کی دعوت سر نواب صاحبزادہ عبدالقیوم کو دی۔ جسے اس کے اپنے حلقے میں خدائی خدمت گاروں کے ہاتھوں شکست فاش کھانی پڑی تھی اور

ضلع ہزارہ کے غیر پختون حلقے سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ حکومت کی امداد سے ہندو، سکھ اور آزاد ممبران کا تعاون اسے حاصل ہوگیا اور اس نے اپنی وزارت قائم کی لیکن وہ بہت دن چل نہ سکی اور وہ پانچ چھ ماہ کے بعد شکست کھا گئی۔ ۳/دسمبر ۱۹۳۷ء کے دن جب صاحبزادہ صاحب کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور ہوگئی تو ڈاکٹر خان صاحب نے خدائی خدمت گار ممبران کے تعاون سے وزارت بنائی۔ اس وزارت میں قاضی عطاء اللہ صاحب وزیر تعلیم تھے۔ قاضی صاحب نے پرائمری تک اسکولوں میں پشتو تعلیم جاری کرنے کے علاوہ اس زبان کو لازمی قرار دے دیا اور اس وزارت نے لوگوں کی بہبودی کے لیے اور بھی تھوڑے بہت کام کیے تھے۔

''اس وزارت نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ پشتو زبان ملک میں رائج کر دی۔ انگریزوں نے اس زبان سے بڑی بھاری بے انصافی کی تھی۔ ہندوستان بھر میں ہندوستانی بچوں کو ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دی جاتی تھی لیکن ایک پشتون قوم تھی کہ اس کے بچے اس سے محروم کیے گئے تھے۔

اس وزارت نے ہماری تحریک کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچایا۔ کیوں کہ دراصل طاقت اور اختیار گورنر کے ہاتھوں میں تھے اور ماتحت افسر نہ تو وزیروں کا حکم مانتے تھے اور نہ ہی وزیروں سے تعاون کرتے تھے۔ وہ گورنر کی آنکھ کے اشارے کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ وہ جیسا اشارہ کرتے ویسا ہی وہ کام کرتے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم نے تو محض آٹھ آنے حاصل کیے تھے اور قوم مانگتی تھی پورا روپیہ۔ لیکن ہمارے پاس روپیہ کہاں تھا۔ علاوہ ازیں ہماری تحریک میں سنڈیکیٹ کی ایک نئی بلا بھی نازل ہوگئی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہمارے کارکن دیانت داری اور ایمانداری سے کنٹرول کی چیزوں کی تقسیم نہیں کر پائے تھے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہوگئی اور ہندوستان کے تمام صوبوں کی کانگریسی وزارتوں کے ساتھ ہماری وزارت بھی مستعفی ہوگئی۔''

''جس وقت جنگ میں جاپان بھی شامل ہوگیا تھا اس وقت (پونا میں) کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ ہم جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے کو تیار ہیں لیکن اس شرط پر کہ انگریز جنگ کی بعد ہمیں آزادی دینے کا اعلان کر دیں۔ اس موقع پر میں نے اور مہاتما گاندھی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفے دے دیے کیوں کہ ہم تشدد کے قائل نہیں تھے اور جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے کے معنی تشدد کو تقویت پہنچانا

تھا۔''(انگریز اور پشتون سیاست از مرزا احمد سلیم، ص ۷۱-۷۰)

بندے ماترم کی جگہ:

۶ر دسمبر ۱۹۳۷ء: ۶ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بندے ماترم کی جگہ دوسرا گیت تلاش کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی قائم کردی۔ اس کمیٹی میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور نریندر دیو شامل تھے۔ یہ کمیٹی قومی گیت کے انتخاب میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی مشورہ کرے گی اس سلسلے میں شعرا سے تاکید کی گئی کہ وہ سلیس ہندوستانی زبان میں منظوم کوئی گیت لکھیں اس دوران ڈاکٹر سر محمد اقبال کا گیت اسکولوں، کالجوں اور جلسوں میں گایا جاتا رہا۔

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

(کاروانِ احرار، ج ۳)

۱۵ر دسمبر ۱۹۳۷ء: شیخ محمد شفیع صاحب (فیروز پور) نے پوچھا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں سے مسلمانوں کی رہنمائی کون سی جماعت کرسکتی ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے جواب دیا:

> ''نیت مذہب کی حفاظت اور ملک و وطن کی آزادی کی جدوجہد ہو تو کانگریس میں رہ کر بھی ایک پکا مسلمان صحیح خدمت کرسکتا ہے۔''
>
> محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی
>
> (کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

فتویٰ تھانہ بھون کا جواب:

۱۵ر دسمبر ۱۹۳۷ء: کانگریس اور مسلم لیگ کے بارے میں خانقاہ تھانہ بھون کے ایک فتوے کے حوالے سے کسی صاحب نے حضرت شیخ الاسلام سے بعض سوالات کیے تھے۔ حضرت کا یہ خط انھیں سوالات کے جوابات میں ہے۔ حضرت کا یہ مکتوب 'فتویٰ تھانہ بھون کا جواب'' کے عنوان سے چہار ورقہ کی شکل میں سید حامد حسن جون پوری نے اسی ماہ (۲۸ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو) شائع

بھی کر دیا تھا۔ حضرت مرحوم کا مکتوب سامی یہ ہے:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج مبارک؟ والا نامہ مع آواز حق (محمد زمان صاحب) فتویٰ خانقاہ تھانہ بھون دربارۂ کانگریس ولیگ وغیرہ باعث سرفرازی ہوا۔ مجھ کو ایسی تحریر اور زبان کے ایسے فتویٰ پر تو تعجب نہیں ہوا مگر آپ کے بھولے پن پر ضرور سخت تعجب ہوا کہ آپ جیسا مخلص اور سمجھ دار شخص ایسی کھلی ہوئی غلطی میں پڑ گیا اور اضطراب و بےچینی کی رو میں بہنے لگا۔

(۱) میرے محترم! جب سے تحریک آزادی پر ہندوستان گامزن ہوا ہے اور مسلمانوں کو اس طرف قدم بڑھانے کی توجہ دلائی گئی ہے کب خانقاہ تھانہ بھون نے ایسے مضامین شائع نہیں کیے اور کب ایسی آیتیں نہیں سنائیں۔ ہم نے ترک موالات کی تحریک پر یہ اور اسی قسم کی آیتیں پیش کر کے انگریزی حکومت سے مقاطعے کی تجویز مسلمانوں کے سامنے رکھی تو ان آیتوں کی تاویلات کی گئیں (خواہ وہ صحیح تھیں یا غلط) اور بتلایا گیا کہ ہم انگریزوں کو دلی دوست نہیں بناتے، ہم اُون کے ساتھ صرف اشتراک عمل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم کو وہی آیتیں کانگریس سے مقاطعہ کرنے کے لیے سنائی جارہی ہیں۔

(۲) کانگریس کو فرض کر لیا گیا ہے بلکہ یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ خالص مذہبی اور ہندو جماعت ہے اُوس سے دور رکھنے کے لیے ہم کو کفار اور مشرکین سے موالات کی آیتیں بطور وعظ سنائی جاتی ہیں۔ آپ ہی بتلایئے کہ یہ دونوں نظریے یعنی اول یہ کہ وہ خالص مذہبی جماعت ہے اور دوم یہ کہ وہ ہندو جماعت ہے، صحیح ہیں یا نہیں؟

امر اول کے متعلق یہ عرض ہے کہ وہ خالص سیاسی جماعت ہے، مذہبی نہیں ہے۔ اس کی تجاویز اور اصول پر غور فرمایئے موالات ایسی غیر مذہبی جماعت سے ممنوع ہے تو ٹاؤن ایریا، میونسپل بورڈ، لوکل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلی، ایجوکیشنل بورڈ تجارتی بورڈ، زمیندار پارٹی مارشل وغیرہ جس میں اکثریت یا کلیت غیر مسلم کی ہوتی ہے اور سول سروس کے جتنے محکمات اور حکومت کے جتنے دوائر ہیں اور جن میں سراسر حکومت غیر مسلمہ کی امداد ہوتی ہے، انگریزی اقتدار کے تحفظ ہی نہیں بلکہ اس کے استحکام اور بڑھانے کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔ وہ سب کیوں جائز یا واجب یا حلال ہیں اور مسلمان ان میں کیوں بھیجے جاتے ہیں اور آپ کیوں ریلوں میں بازاروں میں، اسٹیشنوں پر اور دوسری مجالس میں جن میں اکثریت یا کلیت کفار کی ہوتی ہے، جاتے ہیں۔ اور آپ کیوں ان

بورڈوں وغیرہ میں لاکھوں روپے صرف کرنے اور تکالیف شاقہ کے بوجھ اٹھانے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں؟

اور امر ثانی کی نسبت یہ عرض ہے کہ اگر کانگریس خالص ہندو جماعت ہے تو کیوں اس کے ممبر مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، یہودی، جینی، بودھ وغیرہ بنتے اور حصہ لیتے ہیں اور ہر ہندوستان کے باشندے کو اس میں ہر طرح حق دیا جاتا ہے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اور کیوں وہ اپنے بنیادی حقوق میں تمام مذاہب کو مذہبی آزادی دیتی ہے اور ہر اقلیت کو اس کے کلچر اور زبان وغیرہ کے متعلق مکمل طریقہ پر آزاد کرتی ہے۔ کیوں اس کی کرسی صدارت پر کبھی عباس طیب جی، کبھی ڈاکٹر انصاری، کبھی مولانا محمد علی، کبھی مولانا ابوالکلام آزاد، کبھی حکیم اجمل خاں وغیرہ براجتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (دیکھیے فنڈامنٹل، نہرو رپورٹ، تواریخ کانگریس وغیرہ)

باقی رہا یہ امر کہ اس میں ہندو بکثرت، ہیں مسلمان تھوڑے ہیں تو اس میں مسلمانوں کا قصور ہے یا کانگریس کا حال آں کہ اس نے اپنا دروازہ ہر باشندۂ ہندستان کے لیے کھول رکھا ہے۔ یہ کہنا کہ اس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے تو بتلائیے کہ اس دارالکفر ہندوستان کی کون سی مجلس ملکی اور اقتصادی، تجارتی، زراعتی، سیاسی وغیرہ ایسی ہے جس میں غیر مسلم کی اکثریت نہیں ہے اور جس میں اکثریت ہی کے قواعد پر فیصلہ نہیں ہوتا اور اکثریت اپنی ہی رائے نہیں ہتلائی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندو متعصب اور اکثریت کی بناء پر اپنی تعصبانہ آراء کو منوانا ہے تو بتلائیے کہ جس قدر بھی لوکل باڈیز ہیں ان سب کے ہندو کیا غیر متعصب ہیں۔ صرف کانگریس ہی کے متعصب ہیں اور کیا تمام باڈیز مین مہاسبھائی ممبروں کے موجود ہونے بلکہ اکثریت پر فائز ہونے کی بنا پر کانگریس کیا اہون اور اخفا نہیں ہے؟ پھر اس کے کیا معنی ہیں کہ اوروں کو تو ضروری الشمول قرار دیتے ہیں اور اس کو حرام؟

میرے محترم! ایک غلطی سرسید نے کرائی تھی کہ جب سے ہندوستانی اقوام میں سیاسی بیداری شروع ہوئی (یعنی ۱۸۸۴ء سے) اس وقت سے مسلمانوں کو علاحدہ رکھ کر وہ مسلمان جو کہ ۵۷ء سے پہلے سیاسیات کا دیوتا اور معلم تھا اور ہندو قوم اس کے سامنے طفل مکتب تھی (جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی رپورٹ میں انگریزوں نے تسلیم کیا ہے) آج وہ ہندو قوم کے سامنے طفل مکتب بھی نہیں مانا جاتا۔ دوسری غلطی آج کل کے لیڈر اور ان کے ہمنوا علماء کر رہے ہیں۔ آج کانگریس سے جدا کر کے تمام مسلم قوم کو اچھوتوں سے بھی زیادہ ہندوستان میں ذلیل اور بیدین بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک معمولی غلطی نہیں ہے۔ انتہائی شرمناک غلطی ہے۔ کیجیے اور کرائیے دس پندرہ برس کے

بعد خمیازہ چکھنا پڑے گا۔

(۳) رہا مسلمانوں کی تنظیم کا سوال تو یہ مسئلہ بجائے خود ہمیشہ اور ہر حال میں لازم اور ضروری ہے مگر اس اسپرٹ میں جو کہ مسلم لیگ کے اہل حل وعقد کرنا چاہتے ہیں کہ کانگریس کے خلاف محاذ جنگ قائم کیا جائے اور ہر امر میں مخالفت ہر قسم کی کی جائے انتہائی مضرت رساں اور تباہ کن ہے۔ کیوں نہ آپ کی منظم قوت کانگریس کے اندر اور باہر موجود کردی جائے جیسی کہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں کی گئی اگرچہ غیر مکمل تھی۔ کانگریس کے ماتحت مشترکہ مفاد کی جدوجہد کی جائے اور خصوصی مفاد کی جدوجہد اپنی تنظیمی کارروائی سے اندر اور باہر عمل میں لائی جائے جیسے کہ سکھ، پارسی اور دوسری اقلیتیں کررہی ہیں اور باوجود معمولی اور نہایت کم اقلیت ہونے کے کانگریس میں اپنا لوہا منواتی رہتی ہیں۔

(۴) اپنے اور اپنے مذہب، کلچر اور دیگر حقوق کے شرط کرانے کا سوال اگر فنڈامنٹل اور بنیادی حقوق کے تسلیم کردہ اعلانات موجود یا کافی نہیں ہیں۔ تو ان کا مطالبہ اپنی جگہ پر جائز اور صحیح ضرور ہے اور ہر جگہ اکثریت پر لازم ہے کہ اقلیت کو مطمئن کردے۔ مگر کانگریس کے داخلہ کو اس پر موقوف کرنا اس وقت میں صحیح ہوسکتا ہے جب کہ مشترکہ مفاد کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں پر مثل دیگر غیر مسلم اقوام ضروری نہ ہو اور انگریزی موجودہ اقتدار سے مسلمانوں کو اس قدر نقصان نہ پہنچتا ہو۔ جتنا کہ غیر مسلم اقوام کو پہنچ رہا ہے اور اگر معاملہ اس کے خلاف ہے۔

جیسا کہ واقعہ ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ شرطیت کا ڈھونگ کس طرح ہمارے لیے سبکدوشی فرائض کا ذریعہ بن سکے گا۔ کیا اگر کانگریس نے شرطیت کا انکار کردیا تو مسلمانوں پر مشترکہ مفاد کے لیے جدوجہد کرنا اور آزادی کے حاصل کرنے میں سعی بلیغ کرنا انگریزی آہنی پنجہ کو ڈھیلا کرنا ضروری نہ رہ جائے گا اور کیا مسلمانان ہند تمام غیر مسلم ہندوستانی آبادی سے علاحدہ ہوکر برطانیہ سے آزادی حاصل کرسکیں گے اور کیا مسلمانوں کو اور مدت میں ہندوستان میں انگریزوں کے دائمی باقی رکھنے کی جدوجہد کرنی جائز ہوگی۔ اور کیا مسلمان ایسا کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ اور کیا انگریز مسلمانوں کی خاطر ہندوستان میں اپنا موجودہ اقتدار باقی رکھیں گے اور رکھ سکیں گے اور کیا یہ معاملہ مسلمانوں کے لیے مستقبل میں انتہائی بربادی کا باعث نہ بنے گا؟

میرے محترم! یہ زمانہ سرکاٹ کر حکومت کرنے کا نہیں ہے، نیز اس وقت شخصی حکومت کے پیدا ہونے اور کامیاب ہونے کا امکان بظاہر نہیں ہے۔ یہ زمانہ دوسروں کو گن کر اور دونوں کو شمار کر

کے جمہوریت اور کثرت آرا پر فیصلہ کرنے کا ہے ستائیس کروڑ غیر مسلموں میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یعنی ایک زبان کو بتیس دانتوں میں زندہ رہنے اور بسر کرنے کا سوال ہے ذرا غور وفکر سے کام کیجیے۔ اگر میری عرض آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر میری رائے پر انا للہ پڑھیے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے زیادہ لکھنے سے معذور ہوں۔ والسلام۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۱۱رشوال ۱۳۵۶ء

وارد حال قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد

کفار سے دوستی، اتحاد اور دیگر مسائل:

۱۶ردسمبر ۱۹۳۷ء: محمد فضل الرحمٰن صاحب مالکی الوری (بجنور) نے آٹھ سوال دریافت کیے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے تمام سوالات کے مفصل جواب دیے۔ یہاں کل سوالات بھی درج کیے جاتے ہیں تاکہ مستفتی کا پورا ذہنی پس منظر سامنے آجائے۔ اور حضرت مفتی صاحب کی علمی شان، بلند فکری، فراخ حوصلگی اور وسعت قلبی بھی معلوم ہوسکے۔

سوالات یہ ہیں:

(۱) قرآن شریف میں آتا ہے۔ (سورۂ نساء) بشر المنا فقین بان لھم عذاباً الیماً الخ اس کی تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے قرآن مجید مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ص ۱۵۹ پر کی ہے۔ تحریر کیا ہے کہ ''دنیا کی عزت حاصل کرنے کے لیے کافروں کو اپنا دوست مت بناؤ'' لہٰذا جب وزارت یا ممبری وغیرہ صاف معلوم ہے کہ اس میں دنیا کی عزت اور وجاہت ضرور ہے تو اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ ہندو جماعت سے اس معاملے میں کیوں تعاون کیا جائے۔ دوسرے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے جو جنگ موجودہ وقت میں جاری ہے یہ بھی اگر کامیاب ہوتی ہے تو بہت بڑی عزت ہے جو کہ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے تعاون سے ضرور ہوئی۔ لہٰذا اس کے متعلق بھی صاف صاف فرمایئے گا آیا یہ کہاں تک درست ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ نے غزوۂ تبوک میں جو لڑائی لڑی ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا کہ مشرک سے امداد نہیں لینی چاہیے۔ خواہ مالی ہو یا جسمانی ہو یا لسانی ہو۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے

تحریر کیجیے گا کہ اہل ہنود کے ساتھ تعاون کیسا ہے؟

(۳) مذہب عین سیاست ہے اور سیاست عین مذہب ہے۔ اکثر علمائے دین نے بجنور کے الیکشن میں اکثر کہا ہے۔ لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذہب تو سیاست ہو سکتا ہے لیکن سیاست مذہب نہیں بن سکتا چوں کہ سیاست میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مگر مذہب میں نہیں۔

(۴) فمن یکفر آیت الکرسی کے ختم سے اگلی آیت کے شروع میں درج ہے۔ آیت مذکورہ کا مطلب یا ترجمہ کسی حالت میں مندرجۂ ذیل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مسلمان اور ہندو دونوں کافر ہیں لیکن مسلمان بتوں کے کافر ہیں اور ہندو خداوند تعالیٰ کے کافر ہیں۔ لیکن کافر دونوں ہیں۔ کیا مسلمان کسی حالت میں کافر کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر اس ترجمہ یا تفسیر کو کوئی محقق عالم پیش کرے تو کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ اور یہ فعل اگر غلط ہے تو مولوی صاحب کی نسبت کیا حکم ہے؟

(۵) اگر جنگ آزادی جہاد ہے تو یہ فرمائیے کہ ہندو جماعت کو جہاد میں شریک کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۶) اگر جنگ آزادی کا بیڑا ہندو جماعت نے اٹھا رکھا ہے تو اس کے ساتھ تعاون کر کے اس جنگ میں شریک ہونا چاہیے یا نہیں؟

(۷) اگر ایک فنڈ میں بہت سا روپیہ جمع ہوتا ہے اور اس کے فنڈ میں سود اور رشوت وغیرہ کا روپیہ بھی شامل ہے اور وہ روپیہ بین الاقوامی ہے تو اس روپے میں سے ایک دیندار شخص کے لیے سفر خرچ لینا جائز ہے یا نہیں اور اس میں سے کھانا بھی چاہیے یا نہیں؟

(۸) مسلم لیگ جماعت اگر ہمیں یہ اطمینان دلائے کہ واقعی ہم آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان و مال قربان کر دیں گے اور انگریز کو بہت جلد ہندوستان سے نکالنے کی کوشش کریں گے تو ایسی صورت میں ہم مسلم لیگ کے ممبر بن سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب تحریر فرمائے:

(۱) آیت کے مفہوم کی تشریح جو جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے کی ہے درست ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عزت حاصل کرنے کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر کفار سے دوستی کرنا درست نہیں۔ لیکن اگر مقصد دین کی حفاظت ہو اور وہ کفار سے اشتراک اعمال کر کے (نہ کہ دوستی و محبت کر کے) حاصل ہو سکتی ہو تو ایسا اشتراک عمل اس آیت کے مفہوم کے ماتحت داخل نہیں ہے۔ یہ

دوسری بات ہے کہ اس اشتراک عمل سے دنیاوی اقتدار تبعاً حاصل ہو جائے۔ لیکن وہ مقصود بالذات نہ ہو تو وہ ممنوع و محظور نہیں۔

(۲) جب کہ مسلمان کی قوت دشمن کے مقابلے اور مدافعت کے لیے کافی ہو تو بے شک مشرک سے امداد حاصل کرنا درست نہیں۔ لیکن جب کہ ایک کافر قوت مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہو اور مسلمان کسی غیر مسلم طاقت سے اشتراک عمل کر کے اپنے آپ کو بچا سکتے ہوں تو ایسے وقت میں یہ حکم شرعی نہیں ہے کہ اپنے آپ کو ہلاک اور برباد ہو جانے دو مگر غیر مسلم سے اشتراک عمل کر کے اپنی جان نہ بچاؤ۔

(۳) مذہب عین سیاست (شرعیہ) ہے۔ اور سیاست (شرعیہ) عین مذہب ہے۔ یہ مقولہ بالکل صحیح اور مطرد ہے۔ جس قدر تبدیلی سیاست شرعیہ میں ہوتی رہے گی وہ مذہب کے ماتحت ہو گی یعنی اتنی تبدیلی کی مذہب اجازت دے گا جس کے اصول قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ مثلاً آیت کریم الا من اکرہ وقلبہ، مطمئن بالا یمان اور الا ما اضطر رتم الیہ اور من ابتلی ببلیتین فلیختر اھو نھما .

(۴) یہ بات ایک تفنن پر مبنی ہے کہ مسلمان کو کافر بالصنم یا کافر بالطاغوت کہا جائے قرآن مجید میں مومن کو کافر بالطاغوت فرمایا گیا ہے۔ اور اس اضافت کے ساتھ اطلاق کافر کا مومن پر نہ غلط ہے اور نہ ناجائز ہے۔ تفنن کے طور پر تو بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ اطلاق موجود ہیں۔ مثلاً ''کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست''، ''ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست'' اور اسی ضمن میں یہ بھی ہے کہ ''رب'' اللہ تعالیٰ کی صفت اور اس کا خاص نام ہے۔ مگر اضافت کے ساتھ اس لفظ کا اطلاق غیر خدا پر جائز اور مستعمل ہے۔ مثلاً ''رب المال۔''

(۵) جنگ آزادی۔ سعی تخلص من ید الظالم ہے اور اس کے لیے غیر مسلم سے تعاون اور اشتراک عمل کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ اگر گاؤں پر ڈاکو حملہ آور ہوں تو گاؤں کی مسلم و غیر مسلم آبادی باہم تعاون و اشتراک عمل کر کے ان کے حملے سے اپنے گاؤں اور اپنی جانوں کو بچا سکتی ہے اور مسلم آبادی پر ایسے وقت غیر مسلموں سے اشتراک عمل کرنا کسی درجے میں ناجائز اور مذموم نہیں ہے۔

(۶) اگر ہندوستان مسلمانوں کا بھی وطن ہے اور اس پر انگریزوں کا تسلط ان کے نزدیک بھی درست نہیں ہے تو جنگ آزادی ان کے ذمے بجائے خود فرض ہے۔ ہندوؤں کا اپنے وطن کو آزاد

کرانے کے لیے جدوجہد کرنا اور مسلمانوں کا اپنے وطن کو مقبوضہ غیر رہنے دینا مسلمانوں کے لیے موجب غیرت وشرم ہونا چاہیے۔

(۷) ایسا مشترک فنڈ مختلف حیثیتوں کا ہوتا ہے اور مختلف احکام رکھتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ مسلمان اگر سود کا روپیہ حاصل کر کے کسی کو دے اس کا حکم اور ہے اور ہندو اگر سود کا روپیہ حاصل کر کے کسی کو دے اس کا حکم اور ہے اور یہ سوال لیگ کے فنڈ کے ساتھ بھی اسی طرح متعلق ہے۔ جیسا کہ کانگریس کے فنڈ کے ساتھ۔

(۸) اگر لیگ کا بھی یہی مقصد ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے جان و مال کو قربان کر دے گی تو بہت درست اور صحیح مقصد ہے۔ لیکن اگر اہل عقل اور اصحاب الرائے اس نظریے کو تسلیم کرلیں کہ تنہا لیگ اس مقصد کو حاصل کر سکتی ہے تو بے شک مسلمان کو لیگ کا ممبر بننا اور کانگریس سے تعاون نہ کرنا لازم ہے اور پھر یہ نظریہ بھی سامنے آجائے گا کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمان جو دولت و تعلیم اور تعداد میں ہندوؤں سے کمزور ہیں اور ایک چوتھائی کی نسبت رکھتے ہیں۔ تنہا انگریزوں کو نکال سکتے ہیں تو ۲۴ کروڑ ہندو جو مسلمانوں سے تعداد میں دگنے اور دولت و تعلیم میں اس سے بھی زیادہ طاقتور ہیں تنہا انگریزوں کو نکال کر ہندستان پر کیوں قابض نہیں ہو سکتے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ نہ آج تک تسلیم کیا گیا ہے اور نہ کوئی اہل الرائے اور ذی عقل اسے تسلیم کرنے کو تیار ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمان تنہا انگریزوں کو ہندستان سے نکال سکتے ہیں کیوں کہ انقلاب تدریجی اور آئینی جمہوری اصول سے آرہا ہے اور اس میں جب تک اقوام ہند باہم اشتراک عمل نہ کریں انگریز کا پنجۂ تسلط ڈھیلا نہیں ہو سکتا۔ اور موجودہ دستور جدید مسلمانوں نے ہندوؤں سے گول میز کانفرنس میں تعاون کر کے خود مسلط کرایا ہے اور اپنے ہاتھوں ہندوستان کی مجارٹی کے ہاتھ میں حکومت کی باگیں دے دی ہیں۔ اگر ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کرنا اور تعاون کرنا منظور نہ تھا یا ناجائز تھا تو گول میز کانفرنس کا لیگ کو بائیکاٹ کر دینا فرض تھا تاکہ ان کی شرکت کے بغیر یہ دستور جدید نہ بنتا اور نہ مجارٹی کے ہاتھ میں حکومت آتی بلکہ انگریز ہی قابض اور حکمراں رہتا۔ فقط

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

حاجی ترنگ زئی کا انتقال:

۱۸ر دسمبر ۱۹۳۷ء: ۱۸ر دسمبر کے اخبارات میں یہ خبر جلی عنوان اور سیاہ حاشیوں سے شائع

ہوئی کہ افغانستان کے مشہور مجاہد حاجی ترنگ زئی ۱۶ دسمبر کو انتقال کر گیے۔ آپ کی میت کو دور دراز تک کے عوام کی زیارت کے لیے رکھا گیا۔ ہزاروں لوگوں نے اس مرد مجاہد کی زیارت کی۔ انتقال کے وقت حاجی صاحب کی عمر ایک سو پانچ سال کی تھی۔

حاجی صاحب مرحوم ۱۸۳۲ء میں ترنگ زئی (پشاور) میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۲۰ء میں آپ انگریزوں کے خلاف ہجرت کر کے آزاد قبائل میں چلے گیے، اور یہیں آپ نے برطانیہ کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ انگریز نے آزاد قبائل میں داخل ہونے کی انتہائی جدوجہد کی۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے قبائل پر کئی دفعہ بمباری کی گئی لیکن حاجی صاحب اور ان کے بہادر ساتھیوں کے عزم و ہمت سے اپنے ارادوں میں ناکام رہا۔ (کاروان احرار، ج ۳)

اتخاذ و بطانہ کا مطلب:

۱۹ دسمبر ۱۹۳۷ء: میر مشتاق احمد (عربک کالج، دہلی) کے ایک اعتراض نما سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا:

''آیت کریمہ میں کفار کے ساتھ موالات (اتخاذ بطانہ) یعنی دلی دوستی اور محبت کرنے کی ممانعت ہے نہ یہ کہ اس کے ماتحت کفار کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا بھی جائز نہیں یا کسی صحیح مقصد میں اشتراک عمل بھی جائز نہیں۔

اگر آیت کا مفہوم اس قدر عام کر لیا جائے کہ ہر ایک اشتراک عمل کو موالات (قلبی دوستی یا اتخاذ بطانہ) قرار دیا جائے اور آیت کریمہ کو اس پر بطور حجت پیش کر کے اس کو حرام کیا جائے تو تجارتی کمپنیوں میں، اداروں کی ملازمت میں، کونسلوں میں، میونسپل بورڈوں میں، ڈسٹرکٹ بورڈوں میں غیر مسلموں اور ہندوؤں کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کو بھی حرام کہنا پڑے گا۔

ہندوستان کو غیر ملکی حکومت کے تسلط سے آزاد کرانا ہندوستانیوں کا فریضۂ وطنی ہے یا نہیں اور مسلمانوں پر بھی یہ فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً ہے کیوں کہ کوئی سمجھدار مسلمان یہ نہیں کہتا کہ ہم انگریزی حکومت سے خوش ہیں اور اسی کو ہندوستان میں قائم اور مسلط رکھنا چاہتے ہیں۔ اور مسلم لیگ بھی اپنے لکھنو کے اجلاس میں آزادی کامل کو اپنا نصب العین قرار دے چکی ہے۔

تو اس حالت میں مسلمانوں کا آزادی کے لیے جدوجہد کرنا خود اپنے نصب العین کے واسطے

اور اپنے مقصد کے لیے جدو جہد کرنا ہے۔ اور ہندوستان کی دوسری قومیں بھی ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد کرنے میں اپنا وطنی فریضہ ادا کر رہی ہیں اور یہ لازمی ہے کہ جب مقصد ایک ہے تو مختلف قومیں سب اس مقصد کے حصول کی سعی میں فطرتاً اور طبعاً شریک ہوں گی۔ بس یہ ایک مقصد کے حصول میں اشتراک عمل ہے۔ نہ کہ وہ موالات جو آیۂ کریمہ میں ممنوع ہے اور جس کو اتخاذ بطانہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ نظریہ بھی مسلم ہے کہ آزادی کامل کا حصول آئینی طور پر تمام اقوام کے اشتراک عمل کے بغیر غیر متصور ہے۔ مسلمان یا مسلم لیگ اپنے نصب العین (کامل آزادی) کو تنہا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی نظریے کے ماتحت انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جدید کے بنانے میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی حالاں کہ یہ بات بدیہی تھی کہ جس اصول پر یہ ایکٹ بنایا جا رہا ہے اس کے مطابق حکومت مجارٹی کی ہوگی تو گویا انھوں نے گول میز کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں میں شریک ہو کر خود حکومت کی باگیں ہندو مجارٹی کی تحویل میں دے دیں۔

اگر حصول حکومت کے بعد تاسیس اور قانون جدید کی ترتیب میں تعاون اور اشتراک عمل کو حرام کہتے ہیں تو اس گول میز کانفرنس کا مقاطعہ کرتے جس کے ذریعے سے حکومت ہندوؤں کو دی جا رہی تھی اور آج بھی یہ فرض ہے کہ کونسلوں اور اسمبلیوں کا جن میں غیر مسلم مجارٹی ہے مقاطعہ کریں۔ یہ بات عجیب ہے کہ قانون جدید جو مجارٹی کو حکومت دیتا ہے چلانے اور اس کو محکم کرنے کے لیے تو اسمبلیوں میں جائیں اور اشتراک عمل کریں اور اپنا واجبی حصہ حاصل کرنے کے وقت کھڑے ہو کر مخالفت اور عداوت کے مورچے قائم کرلیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی۔

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

غیر مسلم کی سرداری اور اس کی اطاعت:

۲۱ر دسمبر ۱۹۳۷ء: محمد حنیف (دہلی) نے حضرت مفتی صاحب سے چند سوالات کیے تھے۔ مفتی صاحب نے ان کا جواب دیا۔ ذیل میں سوالات و جوابات درج کیے جاتے ہیں:

سوالات:

(۱) کیا مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت کی یا کسی غیر مسلم سردار کی سرداری قبول کرنا جائز ہے کیا مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت یا کسی غیر مسلم رہنما کے حکم پر عمل کرنا جائز ہے؟

(۲) کیا مسلمانوں نے کسی زمانے یعنی رسول خدا ﷺ یا خلفاے اسلام یا شاہان اسلام جو پابند شرع تھے کے زمانے میں کسی غیر مسلم جماعت یا سردار کی سرداری میں جب کہ کوئی باعزت شرع شریف کی رو سے شرائط عہد نامہ نہ ہوا ہو کوئی مذہبی یا ملکی کام کیا ہے؟ کسی تاریخ اسلام یا کسی صحیح احادیث نبوی میں کہیں ثبوت ہے کہ غیر مسلم کو بغیر کسی عہدے کے سردار منتخب کیا ہے اور اس کی ماتحتی میں کوئی مذہبی یا ملکی جنگ کی ہے۔

(۳) کیا مسلمانوں کو اسلام کی تاریخ واحادیث نبوی سے کنارہ کش ہو کر اپنی ذاتی رائے سے کسی غیر مسلم جماعت میں یا کسی غیر مسلم کی سرداری میں بغیر معاہدے کے شریک ہونا جائز ہے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرے تو کیا حکم ہے؟

جوابات:

(۱) اسلامی امور میں غیر مسلم کی سرداری قبول کرنی درست نہیں ہے۔ سیاسی امور یا اقتصادیات میں غیر مسلموں کی شرکت یا ان کی صدارت میں کام کرنا یا کسی مجبوری سے ان کی قیادت تسلیم کرنا منع نہیں جیسے میونسپلٹیوں میں غیر مسلم کی چیرمینی یا کونسلوں میں غیر مسلم کی پریزیڈنٹی یا پولیس کی ملازمت میں غیر مسلم افسر کی قیادت یا فوج میں غیر مسلم افسر کی اطاعت یا دکان میں غیر مسلم کی شرکت یا انگریزی حکومت اور اس کے قانون کی تعمیل کرنا یا غیر مسلم ڈاکٹر یا طبیب کی ہدایات پر عمل کرنا۔

(۲) آنحضرت ﷺ نے یہود سے ایک دوسرے کی اعانت کا معاہدہ کیا تھا۔ صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں بھی معاہدات ہوئے۔ شاہان اسلام کے زمانے میں بہت سے غیر مسلم افسر اور عہدہ دار ہوتے رہے ہیں۔

(۳) غیر مسلم کی قوت اور تسلط کو دفع کرنے اور عالم اسلامی کو ان نقصانات عظیم سے بچانے کے لیے جو انگریزی طاقت دول اسلامیہ اور اقوام مسلمہ کو پہنچا رہی ہے۔ ہندوستانی قوم کا سیاسی طور پر مل کر کام کرنا من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما (حدیث) کے ماتحت جائز ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

کانگریس میں شرکت:

۲۵ر دسمبر ۱۹۳۷ء: ایم اے قادر (مدراس) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی

صاحب نے تحریر فرمایا:

آپ اسلامی حقوق اور مفاد کی حفاظت کی غرض سے کانگریس میں بھی شریک ہو سکتے ہیں کیوں کہ وہ وطن کی فعال جماعت ہے اور غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتی ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

لیگ اور قادیانیوں سے تعاون:

۳۰ر دسمبر ۱۹۳۷ء: غلام محمد صاحب اور تاج السلام صدر جمعیت علماء (پٹوہ) کے سوالات کے جوابات میں:

(۱) مسلم لیگ کا حصول آزادی کے لیے کوئی عملی پروگرام نہیں ہے۔

(۲) قادیانی پارٹی مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے اشتراک عمل کے لائق نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اشتراک عمل کرنا مذہب کے لیے بھی مضر اور سیاسی مفاد کے لحاظ سے بھی خطرناک ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

کانگریس میں شرکت:

۳۱ر دسمبر ۱۹۳۷ء: محمد حنیف (دہلی) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا:

''کانگریس ایک سیاسی جماعت ہے مذہبی ادارہ نہیں ہے اور ہندوستان میں جو آئین کہ نافذ ہے اور آئندہ بھی جو ترقی پیش نظر ہے وہ جمہوری اصول پر ہے اور ہوگی اور ہر قوم کو اس کی آبادی کے تناسب سے حصہ ملے گا۔ اب یا تو مسلمان ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شرکت نہ کریں اور اعلان کر دیں کہ ہمیں انگریزی حکومت کی ماتحتی یا غلامی منظور ہے یا خود مستقل حکومت اسلامی قائم کرنے کا اعلان کریں یا کانگریس میں بقدر حصہ شرکت اختیار کریں۔ رہی یہ بات کہ شرکت انفرادی ہو یا بحیثیت جماعت کے تو یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں اور بحیثیت جماعت کے ہو تو یہ اعلیٰ ہے بشرطے کہ تحریک آزادی میں دلی خلوص سے عملی حصہ لیا جائے یہ نہ ہو کہ عملی کام کے وقت تو علاحدہ بیٹھے رہیں اور حصہ مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلائیں۔

۱۹۳۷ء

صوبائی انتخابات میں لیگ کا تناسب کامیابی:

۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلیوں کے جو انتخابات ہوئے تھے ان کے نتائج پنجاب کے ایک لیگی رہنما سردار شوکت حیات خاں نے اپنی خود نوشت ''گم گشتہ قوم'' میں اسی طرح شائع کیے ہیں۔ شوکت حیات خاں سردار سکندر حیات کے بیٹے ہیں۔

نام صوبہ	کل نشستیں	مسلم نشستیں	مسلم لیگ کی کامیابی	دوسرے مسلم گروپوں کی کامیابی
بنگال	250	117	40	77
پنجاب	175	84	1	83
شمال مغربی سرحدی صوبہ	50	36	-	36
آسام	108	34	9	25
سندھ	60	35	-	35

(گم گشتہ قوم، ص ۱۲۶)

''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' حضرت شیخ الاسلام کی رائے گرامی:

۱۸ دسمبر ۱۹۳۷ء: سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) نے ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' کے عنوان سے ایک تالیف فرمائی ہے اور شائع ہوگئی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کے بارے میں یہ رائے ظاہر فرمائی:

''یہ کتاب اپنے ذاتی محاسن اور کمالات حقیقہ کی وجہ سے مستغنی عن التوصیف والمدح ہے۔'' مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔'' حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے لیے روشن مستقبل کی کفالت کرنے والی اور اس باب میں نہایت مفید ہے اور وہ ایسی ایسی صحیح اور مفید

معلومات پر مشتمل ہے جن کا کسی دوسری جگہ پایا جانا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ ایسی ایسی ہدایات کرتی ہے جن کی مسلمانوں کو ہندوستان میں بہت زیادہ ضرورت ہے۔ وہ ایسے ایسے چھپے ہوئے رازوں کو ظاہر کرتی ہے جن پر مطلع ہونا ترقی پسند مسلمانان ہند کو ازبس ضروری ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے ہندوستانی سیاست کے میدان میں نہایت تیز اور روشن مشعل ہے وہ نوجوانان اسلام کے لیے ماضی، حال اور مستقبل کی ایسی عظیم الشان رہنمائی کرتی ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اور جس سے استفادہ حاصل کرنے اور استقامت برتنے پر وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور بام عروج و ترقی پر پہنچ سکتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ خود اس کا مطالعہ کرے اور غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کے مضامین سے مطلع کرے۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ۱۹۴۵ء اشاعت پنجم، دہلی، ص ۱۸۔۱۷)

"مسلمانوں کا روشن مستقبل پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوتی تھی۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں اس کا پانچواں ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن نکلا تھا۔ فاضل مصنف نے جس "روشن مستقبل" کا خواب دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر اس طرح تو نہیں نکلی جیسی کہ مصنف کی خواہش تھی لیکن آنے والے انقلاب کے جن خطرات کا اظہار کیا تھا وہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک ایک کر کے مسلمانوں کے سامنے آ چکے ہیں۔ اور روشن مستقبل تاریک اور ذراؤنا ماضی بن چکا ہے۔ آیندہ کیا پردۂ غیب میں ہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

صوبہ سرحد۔۔۔۱۹۳۷ء اور اس کے بعد:

۱۹۳۷ء کے انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار تلاش کرنے کے لیے صدر آل انڈیا مسلم لیگ محمد علی جناح بذات خود صوبہ سرحد گئے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لینے کے لیے امیدواروں کو بڑا ڈھونڈا لیکن انھیں اس مقصد میں کامیاب نصیب نہ ہو سکی تھی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سردار عبدالرب نشتر اور پیر بخش خاں کو آمادہ کرنے کی بڑی کوشش کی کہ وہ لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں لیکن دونوں نے انکار کر دیا اور بطور آزاد امیدوار الیکشن میں حصہ لیا۔ جب صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی سربراہی میں سرخ پوشوں کی حکومت قائم ہو گئی تو اس کا راستہ روکنے کے لیے منصوبہ بندی کی گئی۔ قیوم خان لکھتے ہیں:

''صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی آبادی کا غلبہ رہا ہے۔ مسلمان صوبہ کا کانگریس کا طرفدار ہونا مسلم لیگ اپنے لیے اہانت آمیز تصور کرتی تھی، پٹھانوں کو کانگریس سے الگ کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ کے تحت کوششیں کی گئیں۔ اس مقصد کے لیے مولانا شوکت علی، قاضی محمد عیسیٰ نوابزادہ لیاقت علی خاں اور دوسرے لیگی قائدین ایک دوسرے کے بعد صوبہ سرحد بھیجے گیے۔ تاکہ وہ کانگریس کی حکومت کے خلاف مہم چلائیں اور ممکن ہو تو اس کا تختہ الٹ دیں۔'' (گولڈ اینڈ گن)

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی کانگریس کے برطانوی حکومت سے اختلاف پیدا ہوگئے۔ چناں چہ آٹھ صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے صوبائی امور میں مرکز کی مداخلت کے خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دے دیے۔ ان میں صوبہ سرحد بھی شامل تھا۔ صوبہ میں گورنر راج نافذ ہوگیا۔ ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' کے باعث سرحد اسمبلی دس کانگریسی ارکان کو گرفتار کرلیا گیا تو اس سے توازن درہم برہم ہوگیا۔ اس سے صوبہ میں نئی صورت حال نے جنم لیا۔ اس بارے میں قیوم خاں لکھتے ہیں:

> ''مسلم لیگ نے سمجھا کہ اس کے لیے حکومت سازی کا موقع نکل آیا ہے۔ یہ برطانوی پالیسی کے لیے بھی موزوں تھا۔ تاکہ دنیا کو دکھایا جاسکے کہ مسلمان بحیثیت قوم کانگریس کے خلاف ہیں۔ اس صورت حال سے امریکہ کو بھی متاثر بنایا جاسکتا تھا۔''

اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سردار اورنگ زیب خاں نے نعرہ لگایا کہ وہ صوبہ سرحد سے ہندو کانگریس کا خاتمہ چاہتے ہیں اور اس کی جگہ ''قرآن اور شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں۔'' اس سے تو برطانوی کومت کا کام بن گیا۔ وہ تو یہی چاہتی تھی کہ اس قسم کا عنصر سامنے آئے کیوں کہ اس کے عالمی مفادات کا تقاضا یہی تھا کہ دنیا کو دکھاسکے کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے جس کا مقصد ہندوستان میں ہندو غلبہ قائم کرنا ہے۔ چناں چہ گورنر نے مئی ۱۹۴۳ء میں گورنر راج ختم کردیا اور صوبہ پر اقلیتی مسلم لیگی وزارت مسلط کردی۔ قیوم خاں نے لکھا ہے، ''شاید گورنر کو اوپر سے اشارا ہوا تھا۔''

قیوم خاں نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی وزارت کے قیام کے مقاصد کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مسلم لیگ نے مئی ۱۹۴۳ء میں صوبے کے اقتدار پر قبضہ جمالیا۔ جو لوگ مسلم لیگ کی

پالیسی کے کرتا دھرتا تھے انھوں نے کئی ماہ سے صوبہ سرحد پر نظریں لگائی ہوئی تھیں۔ ۹۵ فیصد مسلم آبادی کے صوبے کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر صوبہ سرحد ساتھ نہ دے تو شمال مغربی پاکستان کا خواب کس طرح شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا؟ ۱۹۴۳ء میں ۵۰ کے ایوان میں ۱۰ ایم ایل اے جیلوں میں محبوس تھے۔ کانگریس نے قانون سازی میں دلچسپی لینا بند کر رکھی تھی۔ لیگ حکومت برطانیہ کی مدد سے برسر اقتدار آئی تھی۔ دونوں کے نظریات و مقاصد مختلف تھے۔ برطانیہ کا مقصد امریکہ پر واضح کرنا تھا کہ مسلمان کانگریس کے مخالف ہیں۔ لیگ کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے لیگ کے ساتھ ہیں۔'' (پختون قوم اور باچا خان)

۱۹۳۸ء

شیخ الاسلام کی تقریر دہلی اور مسئلہ قومیت کا شاخسانہ:

۸؍جنوری ۱۹۳۸ء: صدر بازار، دہلی باڑا ہندو راؤ متصل پل بنگش میں زیر صدارت مولانا نور الدین، ایک جلسہ ہوا، جس میں حضرت شیخ الاسلام کی قومی و ملی خدمات کے اعتراف میں حضرت کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ حضرت نے عوام کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ انھوں نے قوم و ملک اور مذہب و ملت کی جو کچھ تھوڑی یا بہت خدمات انجام دی ہیں وہ صلہ وستائش کے لیے نہیں، ایک فریضۂ اسلامی سمجھ کر انجام دی ہیں۔ حضرت نے عوام کو بتایا کہ اسلامی ممالک کی آزادی کے لیے ہندوستان کا استعمار سے نجات پانا کس قدر ضروری ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ مسلمان اہل وطن کے ساتھ مل کر برٹش استعمار کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں اور انگریزی حکومت کی جڑوں کو ہندوستان سے اکھاڑ پھینکیں۔ اگر ہندوستان سے انگریزی حکومت کو مٹا دیا گیا تو اسلامی ممالک میں اور ایشیا و افریقہ میں جہاں کہیں بھی برطانوی نو آبادیات ہیں، اس کے قدم جم نہ سکیں گے اور بالآخر ہندوستان کی آزادی کے ساتھ تمام اسلامی ممالک بھی آزاد ہو جائیں گے۔

اسی سلسلۂ بیان میں حضرت نے فرمایا کہ انسانیت کی فلاح، نوع انسانی کے بہبود اور ملک کی آزادی اور اہل وطن کی بھلائی کے کاموں میں ان سے مل جانا، ان سے تعاون کرنا مذہب کے ہرگز خلاف نہیں، مذہب اس سے نہیں روکتا۔ ان میں تو اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی بھی ہے۔ حضرت

نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ نسل یا مذہب سے نہیں۔ اس سلسلے میں حضرت نے انگلستان، امریکہ، جاپان، فرانس وغیرہ کی مثالیں بھی دیں اور بتایا کہ ان ملکوں میں مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں لیکن وہ سب اپنے وطنی تعلق سے جانے پہچانے جاتے ہیں"۔

مولوی مظہر الدین شیرکوٹی نے جو ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے زمانے سے اپنی بعض اخلاقی کمزوریوں کی بنا پر دیو بند کے علمائے حق سے دور ہوتے چلے گئے تھے اور بالآخر لیگ میں پناہ ڈھونڈھی تھی، اپنے اخبار روزنامہ الامان دہلی میں جلسے کی رپورٹنگ اس انداز سے کی کہ گویا حضرت نے مسلمانوں کو اپنے خصائص اسلامی ترک کر کے ایک متحدہ قومیت اختیار کر لینے کا مشورہ دیا ہے، پھر لاہور کے اخبارات، زمیندار، انقلاب، احسان وغیرہ میں مزید رنگ آمیزی کے ساتھ یہ خبر آئی

"انقلاب" کا اداریہ:

۱۲ر جنوری ۱۹۳۸ء: باڑہ ہندوراؤ متصل پل بنگش میں ۸ر جنوری کو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نے جو تقریر کی تھی، اس پر مدیر انقلاب، لاہور نے "مولانا حسین احمد صاحب کی قوم" کے عنوان سے مندرجۂ ذیل اداریہ شائع کیا ہے:

"مولانا حسین احمد صاحب پچھلے دنوں دہلی تشریف لائے اور باڑہ ہندوراؤ میں ان کے بعض عقیدت مندوں نے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا، اس کے بعد آپ نے تقریر کی۔ جب تک آپ عام سیاسی مسائل بیان کرتے رہے۔ مسلمان خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے اور کانگریس کی حمایت کو بھی برداشت کر گئے، لیکن مولانا نے ایک مقام پر قوموں کے بننے اور بگڑنے کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے یہ فرمادیا کہ "قوم مذہب سے نہیں بنتی۔ قوم ملک سے بنتی ہے۔" اس پر مسلمانوں کا جام صبر لبریز ہوگیا، کیوں کہ مسلمانوں کے نزدیک قومیت کی بنا و اساس مذہب کے سوا کچھ نہیں۔ ملک و وطن اور رنگ و نسل کا امتیاز اسلام میں ہرگز معتبر نہیں۔ اس فقرے کو سن کر مسلمانوں میں جوش پیدا ہوگیا۔ "اسلام زندہ باد، مذہب زندہ باد" اور تکبیر کے پیہم نعرے بلند ہونے شروع ہوئے۔ منتظمین جلسہ نے نعرے لگانے والوں پر حملہ کر دیا۔ اتنے میں پولیس آگئی اور حضرت "شیخ الاسلام" نے پولیس کے پہرے میں اپنی تقریر ختم فرمائی۔

مولانا نے اپنی تقریر میں ہندوستان کی اقتصادی خوش حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک اور

جملہ یہ فرمایا کہ ’’غربت و فاقہ کی حالت میں مذہب بھی نہیں مل سکتا۔ اسلام کی نجات بھی نہیں ہو سکتی۔‘‘ اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی اقتصادی خوش حالی کے لیے کوشاں ہونا بے حد ضروری ہے، لیکن مولانا کو معلوم ہوگا کہ مذہب مقدس اسلام دولت کا محتاج نہیں اور وہ صرف دولت مندوں اور مال داروں کے لیے موجب ہدایت نہیں۔ حضور علیہ السلام سرور کاینات اور صحابہؓ کرام (کی) ناداری اور فاقہ کشی ایک حقیقت ثابتہ ہے، بلکہ یہ فقر و فاقہ ان نفوس قدسیہ کے لیے موجب فخر تھا۔

علمائے اسلام سے ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ سیاسیات میں کیا اور اقتصادیات میں کیا، مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلامی زاویۂ نگاہ پیش کریں گے اور ’’خطوات الشیطان‘‘ کا اتباع نہ کریں گے۔ مولانا نے بعض ہندو کانگریسیوں سے اس قسم کے کافرانہ فقرے سن لیے ہیں کہ ’’قومیت جغرافیائی وطنیت کا نام ہے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور غلاموں اور مفلسوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔‘‘ انھی فقروں کو آپ بھی دہرا رہے ہیں۔ خدا کے لیے اپنے علم کو دیکھیے۔ اپنے منصب کا لحاظ کیجیے اور مسلمانوں کو یہ بتائیے کہ تم ہر چیز سے پہلے مسلمان ہو۔ تم محمد رسول اللہ علیہ السلام کی قوم ہو۔ تم نے ہمیشہ فقر و فاقہ کی حالت میں اپنی عظمت اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا ہے۔ آج بھی اپنی غریبی سے نہ گھبراؤ، یہ ہمارے بڑوں کی وراثت ہے، عمل کرو، اللہ تعالیٰ تم پر فوز و فلاح کے دروازے کھول دے گا۔

آپ کانگریس کی حمایت کیجیے یا مسلم لیگ کی یا ہندو سبھا کی، اس سے آپ کو کون روک سکتا ہے، لیکن خدا کے لیے مذہبی احکام کو مسلمانوں تک پہنچانے میں خیانت نہ کیجیے۔ آج کل کا فلسفۂ قومیت اسلام پر صادق نہیں آتا، کیوں کہ ’’خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی‘‘ کیا آپ نے حضرت اقبال کا یہ شعر نہیں سنا:

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

(انقلاب، لاہور۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۳۸ء)!

علامہ اقبال کا فلسفۂ قومیت کچھ ہو اور خواہ ان کے لفظ کتنے ہی دل نشیں کیوں نہ ہوں اور مولانا حسین احمد مدنی کا نظریۂ قومیت کچھ ہو اور خواہ وہ کسی کو بالکل پسند نہ آئے لیکن اس سلسلے میں جہاں تک اسلامی احکام کے مسلمانوں تک پہنچانے کا تعلق ہے تو وہ علامہ اقبال کا نہیں مولانا مدنی کا

منصب تھا۔ اور جہاں تک اس اسلامی فریضے کی ادائیگی میں خیانت کا تعلق ہے تو یہ بات معلوم ہے کہ اس وقت حضرت مولانا نے یہ فریضہ انجام ہی نہیں دیا تھا۔ یہ ایڈیٹر الامان دہلی کی فتنہ پردازی کا کرشمہ تھا۔ بالفرض یہ خیانت تھی تو علامہ اقبال اس خیانت کو زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس سے قبل ہی انجام دے چکے تھے۔ رہا یہ مسئلہ کہ حضرت مولانا مدنی نے اسلامی احکام کی ترجمانی میں کس حد تک خیانت کی تھی اس کا فیصلہ اور مولانا سید سلیمان ندوی جو کہ حضرت علامہ کے نزدیک ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد'' اور'' امت کے خاص اور مامور من اللہ افراد میں سے تھے'' کے تائیدی اور علامہ اقبال کی تردید میں مضمون ہی سے ہو جاتا ہے۔ حضرت مدنی نے'' متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے اس واقعے کے بعد ایک رسالہ تحریر فرمادیا تھا۔ قومیت کے مسئلے میں اسلامی احکام کے تفصیلی مطالعے کے لیے اس سے رجوع کرنا چاہیے۔

فتویٰ ترک موالات اور تغیرِ حالات

۱۸ر جنوری ۱۹۳۸ء: دہلی کے کسی صاحب نے پوچھا تھا کہ ترک موالات کا فتویٰ (۱۹۲۰ء) اب بھی برقرار ہے یا منسوخ ہوگیا اور یہ کہ اگر منسوخ ہوگیا ہے تو کیا اس کی تنسیخ کا کوئی فتویٰ بھی جاری ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا:

''ترک موالات کا فتویٰ جن حالات اور وجوہ کی بنا پر دیا گیا تھا ان میں جیسے جیسے تغیرات رونما ہوتے گئے ان کے ماتحت احکام بھی بدلتے رہے اور اس تمام نشیب وفراز میں اصلِ شرعی یہ تھی من ابتلی ببلیتین فلیختر اھو نھما

اس متفقہ فتویٰ کے شائع ہونے کے بعد باقتضائے تغیر حالات جو احکام وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ ان کے لیے جمعیۃ العلماء کے ریزولیوشن ہیں جن کے ماتحت کارکنان جمعیۃ علما کام کرتے رہے ہیں۔ کوئی ایسا فتویٰ طبع کرا کے شائع نہیں کرایا گیا۔ ان متعدد ریزولیشنوں کی نقول آپ دفتر جمعیۃ علماء سے حاصل کر سکتے ہیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی
(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

کانگریس حکومت کی شرعی حیثیت:

۲۳ر جنوری ۱۹۳۸ء: حضرت شیخ الاسلام کا یہ مکتوب نامعلوم الاسم مکتوب الیہ کے نام ہے۔

اس پر مرتب مکتوبات شیخ الاسلام مولانا نجم الدین اصلاحی نے ایک حاشیہ تحریر فرمایا ہے جس میں حضرت کے ارشادات عالیہ کے فقہی مآخذ اور اصول پر نیز ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات کے فرق پر روشنی ڈالی ہے۔ جو قارئین کرام اس کے تفصیلی پس منظر کا مطالعہ کرنا چاہیں انھیں مکتوبات شیخ الاسلام کی جلد چہارم سے رجوع کرنا چاہیے۔ حضرت کا مکتوب گرامی یہ ہے:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا والا نامہ باعث سرفرازی ہوا تھا، مگر عدیم الفرصتی کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ آپ کا خواب محتاج تعبیر نہیں ہے۔ آپ کے دیرینہ تعلقات اور سیاسی تعلقات کے استحسان پر روشنی ڈال رہے ہیں جو امور آپ سوال فرما رہے ہیں ان کے متعلق اختصاراً عرض ہے:

بالفعل کانگریس قوت حاکمہ نہیں ہے۔ حکومت انگریزی ہی ہے، قوانین واحکام وہی ہیں، تعزیراتِ ہند اور جملہ قوانین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ جس طرح پہلے انگریزوں کے ماتحت حکمرانی کرتے تھے اسی طرح یہ وزرا بھی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کا تعین قوم نے کیا ہے، مگر تقرر انگریز ہی کرتا ہے۔ پروگرام عملی بھی انگریز ہی کرتا ہے بعض جزئیات جو ان کو دیے گئے ہیں وہ بھی انگریز ہی کی منظوری سے جاری ہوتے ہیں۔ ہاں اس جماعت میں چوں کہ قومیت اور قوم کی نمایندگی ہے اس لیے یہ جزئیات قانونیہ بنانے میں ملک اور قوم کے منافع کا حتی الوسع خیال رکھتے ہیں اور اسی طرح اجرا احکام میں۔ پہلے لوگ اس پر قادر نہ تھے، بہرحال کانگریس مستقل طریقے پر قوت حاکمہ بھی ہو جائے گی تو یقیناً غیر اسلامی حکومت ہی ہوگی۔ جس طرح انگریزی حکومت تھی، فرق فقط لحاظ منافع ملک وقوم کا ہوگا اور اہون البلیتین کی بنا پر ہمارے فرائض ہوں گے۔

تخفیف لگان اور دیگر حقوق کاشت کاری وغیرہ مسائل پیچیدہ مسائل ہیں۔ جن میں اولین مسئلہ یہ ہے کہ یہ اراضی ملک زمیندار ہیں یا کہ اس کو وصول لگان کے لیے ٹھیکے پر ملی ہوئی ہیں جیسی کہ ریاستوں میں جاری ہیں۔ یہی طریقہ سلطنت مغلیہ کا تھا۔ بعض ذمہ دار انگریز بھی اسی کے قائل ہیں۔

اور اگر بالفرض زمیندار کا قبضہ مالکانہ ہے تو کیا حکومت کو غبن فاحش اور ضرورت عامہ کے وقت میں مملوکہ اجناس کا بھاؤ وغیرہ مقرر کرنے اور تجارت پیشہ حضرات کو مجبور کرنے کا اختیار شرع نے نہیں دیا ہے۔ کرایہ اراضی اور مکانات وغیرہ میں بھی اسی قسم کے نصوص کتب فقہ میں آپ پائیں گے۔ کیا عام طور پر زمیندار اس مقدار لگان سے جو درج کاغذات پٹواری ہے، دوگنا چوگنا

بلکہ دس گنا وصول نہیں کرتے ہیں؟ حال آں کہ وہ مقدار بھی متجاوز عن الحدود ہے۔ غبن فاحش کی تعریف پر غور کیجیے، لہٰذا چوں کہ یہ حکومت بھی مثل سابق حکومت غیر مسلمہ ہے، اس لیے اس کے احکام بھی مثل سابق ہوں گے، البتہ اھون البلیتین ضرور ہیں۔

اشتراکیت کے خلاف پر خود کانگریس زور دے رہی ہے اور اب تک اس کی تجاویز وغیرہ بالکل مخالف ہیں اور اس کی جدو جہد اس کے برخلاف جاری ہے۔ اکثریت کی حکومت میونسپل بورڈ، ٹاؤن ایریا، نوٹی فائڈ ایریا، ڈسٹرکٹ بورڈ کونسلوں اور لیجس لیٹو وغیرہ میں عرصۂ دراز سے جاری ہیں، اسی طرح یہ بھی ہوگی۔

جب کہ یہ حکومت ہمارے اختیار سے نہیں ہے۔ ملک دار الاسلام نہیں ہے تو یہ سوالات بے موقع ہیں۔ ہمارا شریک ہونا اضطراری ہے، اختیاری نہیں ہے۔ انگریزی حکومت ''اضر ار الاشیاء للملک والاسلام '' ہوئی اور ہے۔ اس لیے اس کا زائل کرنا اشد ضروری ہے اور اھون البلیتین کا اختیار کرنا واجب ہے، ہماری استطاعت اگر اسلامی حکومت کو قائم کرنے کی ہوتی تو ہم اسی کی کوشش کرتے۔ ہمارے دماغ اس سے خالی نہیں ہیں۔ درجہ بدرجہ چلنا ضروریات عقلیۂ شرعیہ میں سے ہے۔ ''مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ. '' اکثریت کی حکومت مسلمانوں کے لیے یقیناً انگریزی حکومت سے بدرجہا بہتر ہے اور ہوگی۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ، ۲۰ / ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ ۔ ۲۳ / جنوری ۱۹۴۸ء

تحریک مسجد شہید گنج:

۲۲ / جنوری ۱۹۴۸ء: حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: (سوال جو اب سے واضح ہے)

مسجد شہید گنج کی واگذاری کی غرض سے قانون شکنی میں شریک ہونا لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ میں داخل نہیں۔ کیوں کہ جائز شرعی حق کے مطالبے کے سلسلے میں جو تکلیف پہنچنے والی ہو اسے اختیار کرنا جائز ہے۔ ہاں لوگوں کو اپنے اہل وعیال کا انتظام کر کے جانا ضروری ہے اور اگر والدین ناراض ہوں اور وہ اجازت نہ دیں تو ایسی صورت میں بھی نہ جانا چاہیے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

شیخ الاسلام کے خلاف علامہ اقبال کا قطعہ:

۳رفروری ۱۹۳۸ء: علامہ اقبال اس خبر سے خاص طور پر متاثر ہوئے کہ حضرت نے مسلمانوں کو اس قسم کا مشورہ دیا ہے۔ انھوں نے جذبات میں آ کر حضرت کے رد میں ذیل کا قطعہ لکھا جو روز نامہ انقلاب لاہور کی اشاعت مورخہ ۳رفروری میں شائع ہوا ہے:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس قطعے کی اشاعت سے ایک طرف تو حضرت کی متوسلین میں جوش پھیل گیا دوسری طرف لیگیوں کو حضرت کے خلاف ہرزہ سرائی و یاوہ گوئی کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور انھوں نے آسمان پر اٹھالیا۔

شیخ الاسلام کا ایک تاریخی خط اور مسئلے کی وضاحت:

۹رفروری ۱۹۳۸ء: حضرت شیخ الاسلام کی تقریر کی غلط رپورٹنگ اور اس سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کے نامناسب قطعے سے اخبار میں قومیت کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی اور جواب اور جواب الجواب کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت کے نام بھی بہت سے حضرات نے صورت حال کے استفسار کے لیے خطوط لکھے اور اخبارات کے ذریعے بھی سوالات کیے گیے۔ لیکن حضرت چوں کہ کسی ناروا بحث میں نہیں پڑنا چاہتے تھے اس لیے خاموش ہی تھے۔ البتہ پنجاب کے ایک عقیدت کیش مولوی عبدالرشید نسیم طالوت نے نہایت متانت سے مسئلہ دریافت کیا تھا اس لیے حضرت نے جواب کے لیے ان کے خط کو منتخب فرمایا اور تفصیل کے ساتھ صورت واقعہ بھی بیان فرمائی اور ملکی سیاست کے پس میں مسئلہ قومیت کی عملی، فکری اور شرعی حیثیت پر بھی بہت اہم اشارات فرمائے ہیں۔ حضرت کا یہ مکتوب گرامی جہاں بعض اخبار نویسوں کے جعل و تلبیس کو ظاہر کرتا ہے؛ وہاں اصل

مسئلے پر بھی فکر انگیز روشنی ڈالتا ہے۔ طالوت صاحب کے نام مکتوب میں حضرت تحریر فرماتے ہیں:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف؟

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ میں آپ کی ہمدردانہ محبت کا شکرگذار ہوں۔ بالخصوص اس بنا پر کہ باوجود عدم ملاقات کے اس قدر التفات فرماتے ہیں۔ میرے پاس بہت سے خطوط، مضامین اس کے متعلق استفسار کے آئے، مگر میں انتہائی درجے میں عدیم الفرصت ہوں اور اس قسم کے افترا آت اور سب وشتم کا سیلاب کم وبیش (اس زمانے سے جب کہ میں نے تحریکات وطنیہ وملیہ میں قدم اٹھایا ہے) برابر جاری ہے۔ اس لیے ایسی باتوں میں وقت صرف کرنا اضاعت وقت سمجھتا ہوں واذا خاطبھم الجاھلون...... الخ پر عمل پیرا رہتا ہوں۔ میں اس وقت بھی چپ تھا مگر آپ کے والا نامہ نے مجبور کیا کہ حقیقت واضح کی جائے اس لیے باوجود عدیم الفرصتی مختلف اوقات میں لکھ کر مندرجہ ذیل مضمون پیش کرتا ہوں اور تاخیر کی معافی کا خواستگار ہوں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ صدر بازار دہلی متصل پل بنگش زیر صدارت مولانا نور الدین صاحب جلسہ کیا گیا۔ اس میں اہل محلّہ کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا اور اس میں میری ملی اور وطنی خدمات کو سراہا گیا۔ جلسہ وعظ ونصیحت کا نہ تھا اور نہ اسلامی تعلیمات کے بیان کرنے کا! اس روز صبح کو جلسہ مذہبی ہو چکا تھا۔ مولانا نور الدین صاحب نے تین یا چار برس میں ترجمہ قران شریف ختم کیا تھا اور اس کی خوشی میں جلسہ ہو چکا تھا، اس میں مذہبی تقریر (فضائل قرآن اور اس کی تعلیمات کے متعلق) تقریباً دو گھنٹہ ہو چکی تھی۔ نیز جامع مسجد میں تبلیغ کے متعلق مذہبی وعظ اس سے پہلے اسی دن ہو چکا تھا۔ شب کے جلسے کے اعلان میں یہ طبع کیا جا چکا تھا کہ حسین احمد کو ایڈریس پیش کیا جائے گا۔ ایڈریس کے جلسے سے لیگیوں اور بالخصوص مولوی مظہر الدین صاحب اور ان کو ہمنواؤں میں انتہائی غصہ پھیلا ہوا تھا۔ کوشش کی جا رہی تھی کہ جلسہ کو درہم برہم کیا جائے جس کو احساس کر کے جناب صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ اس جلسے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق کوئی تقریر نہ ہوگی۔ اس کے بعد میں ایڈریس کا جواب دینے کے لیے کھڑا ہوا (صدارتی تقریر کے بعد ایڈریس پیش کیا گیا تھا) میں نے بعض ضروری مضامین کے بعد ملک کی حالت بیرونی ممالک اور غیر اقوام نیز اندرون ملک میں آزادی کا تمہیدی مضمون شروع کیا تو کہا کہ

موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ دیکھو انگلستان کے بسنے والے سب ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ حال آں کہ ان میں یہودی بھی ہیں، نصرانی بھی، پروٹسٹنٹ بھی، کیتھولک بھی۔ یہی حال امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ کا ہے الخ۔ جو لوگ جلسہ کو درہم برہم کرنے آئے تھے انھوں نے شور مچانا شروع کیا۔ میں اس وقت یہ نہ سمجھ سکا کہ شور کی وجہ کیا ہے۔ جلسہ جاری رکھنے والے لوگ اور وہ چند آدمی جو کہ شور غوغا چاہتے تھے سوال و جواب دیتے رہے اور ''چپ رہو'' کے الفاظ سنائی دیے۔ اگلے روز الامان وغیرہ میں چھپا کہ حسین احمد نے تقریر میں کہا کہ قومیت وطن سے ہوتی ہے مذہب سے نہیں ہوتی اور اس پر شور وغوغا ہوا۔ اس کے بعد اس میں اور دیگر اخبارات میں سب وشتم چھاپا گیا۔ کلام کے ابتدا اور انتہا کو حذف کر دیا گیا اور کوشش کی گئی تھی کہ عام مسلمانوں کو ورغلایا جائے۔ میں اس تحریف اور اتہام کو دیکھ کر چپکا ہو گیا۔ اور تقریر کا بڑا حصہ ''انصاری'' اور ''تیج'' میں بھی چھپا مگر اس کو کسی نے نہیں لیا۔ ''الامان'' اور ''وحدت'' سے ''انقلاب'' ''زمیندار'' وغیرہ نے لیا اور اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالی، ۸ر یا ۹ر جنوری کے ''انصاری'' اور ''تیج'' کو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب وملت کا دارو مدار وطنیت پر ہے۔ یہ بالکل افتراء اور دجل ہے ''احسان'' مورخہ ۳۱ر جنوری کے صفحہ ۳ پر بھی میرا قول یہ نہیں بتایا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ مذہب وملت کا مدار وطنیت پر ہونا میں نے نہیں کہا تھا، شملہ کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والے ایسے افترا اور اتہام کرتے ہی رہتے ہیں، اس قسم کی تحریف اور سب وشتم ان کے فرائض منصبیہ میں سے ہیں ہی، مگر سر اقبال جیسے مہذب اور متین شخص کا ان کی صف میں آجانا ضرور تعجب خیز امر ہے۔ ان سے میری خط وکتابت نہیں، مجھ جیسے ادنیٰ ترین ہندوستانی کا ان کی بارگاہ عالی تک پہنچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اگر غیر مناسب نہ ہو تو ان کی عالی بارگاہ میں یہ شعر ضرور پہنچا دیجیے:

هنيأ مريأ غير داء مخامر

لعزة من اعراضنا ما استحلت

افسوس کہ سمجھ دار اشخاص اور آپ جیسے عالی خیال تو یہ جانتے ہیں کہ مخالفت کی بنا پر یہ اخبار ہر قسم کی ناجائز اور ناسزا کارروائیاں کرتے رہتے ہیں، ان پر ہرگز اعتماد ایسے امور میں نہ کرنا چاہیے اور سر اقبال جیسے عالی خیال اور حوصلہ مند مذہب میں ڈوبے ہوئے تجربہ کار شخص کو یہ خیال نہ آیا، نہ تحقیق کرنے کی طرف توجہ فرمائی، آیہ اذا جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ...... الآیہ گویا کہ ان

کی نظر سے نہیں گزری، سر اقبال فرماتے ہیں:

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد ﷺ عربی است

کیا انتہائی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ملت اور قوم کو سر اقبال ایک قرار دے کر ملت کو وطنیت کی بنا پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیت کو بھی اس سے منزہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بوالعجبی نہیں تو کیا ہے؟ زبان عربی اور مقام محمد عربی (علیہ السلام سے) کون بے خبر ہے؟ ذرا غور فرمائیے میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیت کا کہا ہے ملت کا نہیں کیا ہے۔ دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ملت کے معنی شریعت اور دین کے ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں!

قاموس میں ہے وبالکسر الشریعة او الدین یہ ملت کی بحث میں ہے۔

نیز قاموس میں ہے۔ القوم الجماعة من الرجال والنساء معا او الرجال خاصة او تدخله النساء تبعيةً (بحث قوم)

مجمع البحار میں ملت کی معنی ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں ما شرع الله لعباده علی سنة الانبياء عليهم السلام ويستعمل فی جملة الشرائع لا فی احادها ثم اتسعت فاستعملت فی الملة الباطلة فقيل الكفر ملة واحدة . الخ

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ منطق کون سی ہے۔ لفظ قوم، ملت، دین، تینوں عربی ہیں۔ ان کے معانی کو لغت عربی سے پوچھیے اور دیکھیے کہ کسی لغت عربی کی معتبر کتاب میں قوم اور علیٰ ہذا القیاس قوم اور دین کو مرادف اور ہم معنی اقرار دیا ہے یا نہیں؟ آیات و روایات کو ٹٹولیے اور سر صاحب کی بوالعجبی کی داد دیجیے۔

اگر میری تقریر کے سیاق و سباق کو بھی حذف کر دیا جائے اور عبارت میں حسب اعلان جریدہ ''احسان'' قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے'' بتائی جائے تب بھی میں نے کب کہا کہ ملت یا دین کی اساس وطن پر ہے۔ پھر سر موصوف کی یہ نسبت '' سرود بر سر منبر'' الخ افترا محض نہیں ہے تو کیا ہے؟ اور ان کا ان تینوں کو ایک قرار دینا عجمیت اور زبان عربی سے ناواقفیت نہیں ہے تو کیا ہے؟ یا للعجب ولضیعة الا دب۔

آپ مجھ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ تو اپنے خیالات سے مجھ کو مطلع کر۔ جواباً عرض ہے کہ قوم کا لفظ ایسی جماعت پر اطلاق کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت کی موجود ہو: خواہ وہ مذہبیت ہو یا

وطنیت یا نسل یا زبان یا پیشہ یا رنگت یا کوئی صفت مادی یا معنوی وغیرہ وغیرہ۔

کہا جاتا ہے عربی قوم، عجمی قوم، ایرانی قوم، مصری قوم، پختون قوم، فارسی بولنے والی قوم، سیدوں کی قوم، شیخوں کی قوم، کنجڑوں کی قوم، موچیوں کی قوم، کالوں کی قوم، گوروں کی قوم، صوفیوں کی قوم، دنیاداروں کی قوم وغیرہ وغیرہ۔ یہ محاورات تمام دنیا میں شائع وذائع ہیں اور زبان عربی بلکہ احادیث وآیات میں بکثرت وجوہ پر اطلاق لفظ قوم کا پایا جاتا ہے۔ انھیں میں ہندوستانی قوم بھی ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستانی قوم سے بیرونی ممالک میں تمام باشندگان ہندوستان سمجھے جاتے ہیں خواہ اردو بولنے والے ہوں یا بنگلہ، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا سکھ، انڈین کا لفظ ہر ہندوستانی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ میں ہندوستان سے باہر تقریباً سترہ برس رہا ہوں۔ عرب، شام فلسطین، افریقہ، مصر، مالٹا وغیرہ میں رہتے ہوئے ہر ملک کے باشندوں سے ملنا جلنا، بیٹھنا اٹھنا ہوا، جرمن، اسٹرین، بلگیرین، انگریز، فرانسیسی، آسٹریلین، امریکی، روسی، چینی، جاپانی، ترکی، عربی وغیرہ وغیرہ مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ سالہا سال ملنا جلنا نشست وبرخاست کی نوبت آئی۔ اگر یہ لوگ عربی یا ترکی یا فارسی یا اردو سے واقف ہوتے تھے تو بلا ترجمان ورنہ بذریعہ ترجمان گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ سیاسی مسائل اور مذہبی امور زیر بحث رہتے تھے۔ میں نے بیرونی ممالک کے عام لوگوں کو اسی خیال اور عقیدے پر پایا کہ وہ ہندوستانی لوگوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں اور سب کو باوجود مختلف المذاہب ومختلف اللسان والالوان ہونے کے ایک ہی لڑی میں پروتے ہیں۔ لغوی معنیٰ اس سے انکاری نہیں عرف اس کا متقاضی ہے، پھر اس کے انکار کے کیا معنی ہیں۔ یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد، جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگت کی یکسانی کے بجائے شرف انسانی اور اخوت بشری پر رکھتی ہے۔ (جیسا کہ مدیر احسان کا دعویٰ ہے) مجھے نہیں معلوم کہ نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے جس کی بنا پر اختلاف اوطان وغیرہ پر اطلاق لفظ قوم ممنوع ہو، لوگوں میں مساویانہ برتاؤ اور برادرانہ معاملات دوسری چیز ہیں۔ حال آں کہ ان میں امتیاز عرفاً وشرعاً معتبر ہے۔ اس کے علاوہ تقریر میں تو اسلامی تعلیم اور نظریے کا ذکر بھی نہیں تھا۔

میرے محترم! اس اجنبی اور خود غرض حکومت اور پردیسی خون چوسنے والی قوم نے جس قعر مذلت اور ہلاکت اور قحط وافلاس کے تیرہ وتاریک گڑھے میں تمام ہندستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو عرصۂ دراز سے ڈال رکھا ہے۔ اور جس طرح وہ ہندوستانیوں کو روز افزوں فنا کے گھاٹ اتارتی جارہی ہے، وہ اس قدر ظاہر وباہر ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔ نیز اس سے آزاد ہونا

اور ملک وملت کی زندگی اور بہبودی کی فکر اور سعی کرنا ہر حیثیت سے سبھوں کا فریضہ ہونا بھی اظہر من الشمس ہے (ان دونوں چیزوں سے بجز غبی یا مکابر کوئی بھی شخص منکر نہیں ہوسکتا) اگر چہ اس پردیسی خونخوار قوم سے نجات کے اور بھی ذرائع عقلاً ممکن ہیں مگر جس قدر قوی اور مؤثر ذریعہ تمام ہندوستانیوں کا متفق اور متحد ہو جانا ہے، اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے آگے اس حکومت کے جملہ اسلحہ اور تمام قوتیں بیکار ہیں اور بغیر نقصان عظیم ہندوستانی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور اس کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں، جس کی اساس وطنیت ہی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور دوسری چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے ابتدا ہی سے اس امر کو اپنے اغراض و مقاصد میں داخل کیا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب کہ کانگریس کا اولین اجلاس ہوا تو سب سے پہلا مقصد مندرجۂ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا:

''ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق اور متحد کر کی ایک قوم بنایا جائے۔''

یہی متحدہ قومیت انگلستان کے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتی رہی ہے اور ہر انگریز اس سے خائف اور اس کے زائل کرنے کے لیے ہر طرح سے سائی ہے۔ پروفیسر سیلے نے ''اکسپنشن آف انگلینڈ'' میں اس کے متعلق لکھا ہے:

''اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح بھی نہ ہو بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہندوستانیوں کے لیے شرم ناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور اس پر فاتحانہ حکمرانی نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اس طرح کی حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔''

اس بنا پر ہمیشہ سے یہی کوشش مدبران برطانیہ کی جاری ہے کہ یہ جذبہ ہندوستانیوں میں پیدا نہ ہونے دیا جائے اور اگر کبھی اس کی کوئی صورت پیش آ بھی جائے تو اس کو جلد از جلد ہر ممکن صورت سے تفرقہ ڈلوا کر فنا کر دیا جائے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی انگریزی پالیسی مشہور تر اور مشاہد ہے۔ بالخصوص کانگریس کے پیدا ہونے کے بعد تو اس راہ میں انتہائی جدوجہد جاری ہے۔

مسٹر بیک اور مسٹر ماریسن اور سر اکلانڈ کالون وغیرہ کی انتہائی انفرادی مساعی اور پھر ۱۸۸۸ء کی اجتماعی مساعی اس کی شاہد عدل ہیں، جس کے ماتحت اولاً اسی سنہ میں ''یونا یٹنڈ انڈین پٹیر یاٹک ایسوسی ایشن'' قائم کرائی گئی ہے جس کا دوسرا نام ''انٹی کانگریس'' تھا اور پھر ۱۸۹۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا' تخلیق کی گئی جس کے مقاصد حسب ذیل قرار دیے گیے تھے:

''(ا) مسلمانوں کی رائیں انگریزوں اور گورنمنٹ ہند کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(ب) عام سیاسی شورش کو مسلمانوں میں پھیلنے سے روکنا۔

(ج) ان تدابیر میں امداد دینا جو سلطنت برطانیہ کے استحکام اور سلطنت کی حفاظت میں ممد ہوں۔ ہندوستان میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور لوگوں میں وفاداری کے جذبات پیدا کرنا''۔

مسٹر بیک اور مسٹر کالون وغیرہ کی انفرادی مساعی کا نتیجہ تھا کہ سرسید جیسے تیز اور سخت سیاسی آدمی کے خیالات پر نہایت زہریلا اثر ڈالا گیا۔ ''اسباب بغاوتِ'' ہند کے لکھنے والے شخص کے عقاید اور ارادوں کو روزانہ اور پیہم مساعی سے بالکل ہی جامد اور انگریز پرست ڈرپوک بنا دیا گیا۔ انھیں مساعی کی بنا پر ۱۹۰۰ء میں لارڈ میکڈانلڈ نے ناگری اور اردو کا قصہ اٹھایا اور انھیں وجوہ کی بنا پر ۱۹۰۶ء میں متعدد ذمہ داران برطانیہ کی کوششوں سے مسلم لیگ کی تخلیق شملہ کی چوٹیوں سے ظہور پذیر ہوئی اور آج تک اسی پالیسی پر گامزن ہے۔ اسی بنا پر بار بار امن سبھائیں قائم کرائی گئیں اسی بنا پر شدھی اور سنگھٹن کو میدان میں پیش کیا گیا۔

مسٹر ماریسن اور مسٹر بیک وغیرہ کی کارروائیاں اگر دیکھنی ہوں تو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پرچے ملاحظہ ہوں۔ مسلمانوں کو خصوصی طور پر کانگریس سے متنفر کرنے اور اس سے دور کرنے کی پالیسی آج سے نہیں بلکہ ۱۸۹۵ء یا اس سے بھی پہلے سے جاری ہے اور کامیاب ہوتی جاتی ہے، آج بھی یہی شراب ارغوانی جو کہ مسلم لیگ کی گھٹی میں ڈالی گئی تھی اس کے ممبروں کو گورے گورے ہاتھوں سے پلائی جارہی ہے اور وفاداران ازلی اپنے خداوندوں کی مختلف پیرائوں میں خدمات جلیلہ انجام دیتے ہوئے لیگ کے پلیٹ فارم پر گرجتے اور جمعیۃ علماء اور دیگر سچے مخلصین خدا ملک وملت سے نفرت دلاتے ہیں، طول کے خوف سے میں مفصل کیفیت اس بیان میں نہیں لاتا۔ اگر آیندہ کوئی موقع ملا تو عرض کروں گا، مسلمانوں کو ہمیشہ دھوکا دیا گیا اور آج بھی نہایت قوت اور

چالاکی سے دیا جارہا ہے، ان کو چاہیے کہ گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کریں اور اپنے تحفظ وزندگی کا سامان کرلیں۔ اہل مطالعہ سے میری پرزور درخواست ہے کہ وہ ضرور بالضرور کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' جو کہ ابھی ابھی مطبع نظامی میں چھپی ہے منگائیں اور اس کے آئینے میں انگریزی پالیسی اور مسلم لیگ وغیرہ کی حقیقت اور نام نہاد لیڈروں کی برہنہ تصاویر مشاہدہ کریں۔ فاعتبروا یا اولی الالباب! والسلام۔

ننگ اسلام حسین احمد غفرلہ،

۸؍ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ (۹؍فروری ۱۹۳۸ء)

۱۰؍فروری ۱۹۳۸ء: حضرت مولانا مدنی نے ایک اخباری بیان میں مسئلہ قومیت کے مسئلے پر اہل ملک کو توجہ دلائی ہے اور فرمایا کہ اگرچہ دہلی کی تقریر کے بارے مین ہیجان رفع ہوگیا کہ اس میں ترغیب بالکل نہ تھی۔ لیکن جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے تو وہ اپنی جگہ پر ہے۔ حضرت مدنی نے مسئلے کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اب چوں کہ اس مسئلے پر حضرت کی ایک جامع الاطراف بسیط تحریر ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اس لیے مسئلے کی اسلامی حیثیت اور ہندوستان کے خاص تاریخی اور سیاسی پس منظر میں اس کی اہمیت کے مطالعے کے لیے حضرت مدنی کی مذکورۃ الصدر تحریر سے رجوع کرنا چاہیے۔

حضرت کا یہ مقالہ اس ڈائری سے متعلق سلسلہ ''مقالاتِ سیاسیہ'' (جلد اول) میں شامل ہے۔

۱۶؍فروری ۱۹۳۸ء: ۹؍فروری کو حضرت شیخ الاسلام نے طالوت صاحب کو جو مفصل مکتوب گرامی تحریر فرمایا تھا۔ طالوت صاحب نے اس کے اہم حصے علامہ اقبال مرحوم کے نام خط میں نقل کردیے۔ علامہ اقبال نے اس کے جواب میں لکھا:

''جناب من! مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے، ان میں سے بعض میں تو اصل معاملہ کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے مگر بعض نے معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کو بھی اس ضمن میں خطوط لکھے ہیں۔ چناں چہ آپ کے خط میں مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج ہیں اس واسطے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کے لیے انتخاب کیا ہے۔ جواب انشاء اللہ اخبار ''احسان'' میں شائع ہوگا۔ میں فردا فردا

علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں۔ فقط۔

مخلص محمد اقبال"

آل انڈیا کانگریس اور بنیادی حقوق کی ضمانت:

۱۹ تا ۲۱ رفروری ۱۹۳۸ء: ۱۹، ۲۰، ۲۱ رفروری ہری پور ضلع سورت میں آل انڈیا کانگریس کا اکیاونواں سالانہ اجلاس بابو سبھاش چندر بوس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے سبھاش بابو نے کہا:

"برطانیہ زمین، سمندر اور ہوا میں اپنی آخری حدود تک مسلح ہو لے۔ جنگی جہاز فضائی بمباری کر لیں، لیکن موجودہ جنگ کے طریقوں میں ہوائی طاقت کا یہ نیا مضبوط عنصر اپنی جگہ پر موجود ہے۔ فاصلوں کی اب وقعت ہی نہیں رہی ہے۔ اور خلاف فضائی حملوں کی محافظتوں کے باوجود لندن، براعظم کے ہر کسی مرکز کے بمبار ہوائی دستے کے سامنے ہر کسی کے حملوں کے لیے کھلا پڑا ہے۔ مختصر یہ کہ ہوائی طاقت نے موجودہ جنگ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ برطانیہ کی شخصی پوزیشن ختم ہو چکی ہے اور دنیا کی سیاست نے توازن طاقت کو برہم کر دیا ہے۔ اس زبردست، عظیم الشان برطانوی سلطنت کی بنیاد ہی ایسی کھوکھلی ہو چکی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔"

"کانگریس نے پوری ذمہ داری سے ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق پر اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہے کہ کانگریس اپنا فرض سمجھتی ہے کہ ان حقوق کی محافظت کرے اور اقلیتوں کی نشوونما، ان کی قومی سیاست، اقتصادیات اور معاشرے میں شریک ہونے کے وسیع سے وسیع مواقع پہنچانے کا ذمہ لے۔ کانگریس کا مقصود یہ ہے کہ آزاد اور متحدہ ہندوستان حاصل کرے، جہاں کوئی طبقہ یا گروہ اکثریت یا اقلیت اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو نہ کچلے۔"

"کانگریس کی اس پالیسی کو غلط معنی پہنانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ آل

انڈیا کانگریس کمیٹی اپنی اس پالیسی کو پھر دہراتی ہے، جسے کانگریس نے اپنے بنیادی حقوق والے ریزولیوشن میں شامل کرلیا ہے۔

۱۔ ''ہندوستان کے ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ آزادانہ رائے کا اظہار کرے، اسے حق حاصل ہے کہ آزادانہ اداروں اور جماعتوں میں شریک ہو، کسی ایسے مقصد کے لیے جو خلاف قانون یا خلاف اخلاق نہ ہو وہ امن پسندانہ بغیر ہتھیاروں کے جمع ہو۔

۲۔ ہر شہری کو آزادی ضمیر کا حق حاصل ہوگا اور حق ہوگا کہ آزادی سے اپنے مذہب کا اقرار کرے اور اس پر عمل پیرا ہو، بشرطے کہ امن عامہ اور اخلاق اس سے خراب نہ ہو۔

۳۔ اقلیتوں کی معاشرت، زبان، رسم الخط اور مختلف زبانوں کے رقبے کی حفاظت کی جائے گی۔

۴۔ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہوں گے۔ خواہ ان کا مذہب، ذات، فرقہ یا جنس کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ سرکاری نوکریوں، ذمہ دار عہدوں، اعزاز اور پیشوں یا کاموں کے لیے کسی شہری کو بوجہ اس کی جنس، مذہب، فرقہ یا ذات محروم نہیں رکھا جائے گا۔

۶۔ کنوئیں، تالاب، سڑکیں، اسکول اور منظر گاہیں، خواہ وہ سرکاری طور پر جاری کی گئی ہوں، یا مقامی فنڈ سے ان کی اپنی یا کسی شخص نے مفاد عامہ کے لیے انھیں وقف کیا ہو۔ ان سب پر تمام شہریوں کو برابر کے حقوق اور فرائض حاصل ہوں گے۔

۷۔ تمام مذاہب کے متعلق حکومت غیر جانبدار رہے گی۔

۸۔ ووٹ دینے کا حق تمام بالغ باشندوں کے ووٹ دینے کے حق کے اصول پر قائم ہوگا۔

۹۔ ہر شہری کو آزادی ہوگی کہ ہندوستان بھر میں جہاں چاہے پھرے، ٹھہرے یا اس کے کسی حصے میں بس جائے یا ملکیت حاصل کرے یا کوئی

پیشہ یا کام اختیار کرے ہندوستان کے تمام حصوں میں اس پر قانونی چارہ جوئی اور محافظت یکساں ہوگی۔"

کانگریس کے آخری اجلاس میں حسب ذیل بنیادی قرارداد منظور کی گئی:

"کانگریس ہندوستان کے مسلمانوں اور اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے مخالف سامراج جذبہ اور جوش کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اور ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں جو سب کے لیے یکساں ہے اور جو متحدہ قومی بنیاد پر ہی لڑی جا سکتی ہے۔ اس میں ان تمام فرقوں اور طبقوں کی متحدہ شرکت کا بھی خیر مقدم کرتی ہے۔ کانگریس خاص طور پر ان اقلیتوں کی کثیر تعداد کا جو پچھلے سال کانگریس میں شریک ہوئی اور آزادی کی جدوجہد اور استحصال سے نجات کی کشمکش میں اس نے جو اجتماعی طاقت پہنچائی ہے، اس کا بھی خیر مقدم کرتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اپنے کلکتہ کے اجلاس میں اقلیتوں کے حقوق پر جو تجویز پاس کی تھی، اسے بھی کانگریس منظور کرتی ہے۔ نیز نئے سرے سے یہ اعلان کرتی ہے کہ:

"ہندوستان کی اقلیتوں کے تمدنی، مذہبی اور لسانی حقوق کی حفاظت کرنا کانگریس کا پہلا فرض اور بنیادی پالیسی ہے، تاکہ حکومت کی کسی بھی ایسی اسکیم میں جس میں کانگریس شریک ہو، اقلیتوں کو ترقی اور نشوونما کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے۔ اور وہ قوم کی سیاسی، اقتصادی اور کلچرل زندگی میں پورا حصہ لے سکیں۔

بناء بریں مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آزاد ہندوستان اور سوراج کی حکومت میں ان کا مذہب اور مذہبی فرائض، اذان، نماز، جمعہ، عید، روزہ، حج، زکوٰۃ، مذہبی تبلیغ، مساجد، مقابر، قربانی، مذہبی جلوس، مذہبی جلسے وغیرہ جملہ مذہبی رسوم اور مذہبی ادارے محفوظ ہوں گے۔ اسی طرح ان کی تہذیب و تمدن، ان کے تعلیمی ادارے، خانقاہیں، امام باڑے، تکیے، کربلائیں، آثار قدیمہ، اوقاف وغیرہ سب محفوظ ہوں گے۔ اور اسی طرح ان کی زبان، شاعری، رسم الخط وغیرہ سب کے سب آزاد اور محفوظ

ہوں گے۔ کسی پر کوئی رکاوٹ اور قید نہ ہوگی۔ ہاں اس کا ضرور لحاظ کیا جائے گا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، جس سے انتظام عامہ، امن وسکون یا اخلاق عامہ میں نقص واقع ہو۔" (جے۔ بی کرپلانی، جنرل سیکرٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی سوراج بھون الہ آباد)

شیخ الاسلام کا ایک اور تاریخی خط:

۲۶؍فروری ۱۹۳۸ء: ۹؍فروری کو حضرت شیخ الاسلام نے جو مکتوب لکھا تھا، وہ جب حضرت کے بعض احباب کی نظر سے گزرا اور اس کی اہمیت اور مسئلہ زیر بحث میں اس کی قطعیت کا اندازہ ہوا اور چوں کہ مدینہ اخبار کے ذریعے بھی حضرت سے اس مسئلے پر اظہار خیال کی درخواست کی گئی تھی، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ یہ مکتوب اخبارات کو اشاعت کے لیے دے دیا جائے۔ اگر چہ ضروری تھا کہ اس فیصلے سے طالوت صاحب کو اطلاع دی جائے، لیکن حضرت کے اخلاق کریمانہ نے ضروری نہ سمجھا کہ اس فیصلے کی انھیں بھی اطلاع دے دی جائے۔

اس مسئلے کے بارے میں اس مکتوب میں چند نئی باتیں آئی ہیں، اس لیے حضرت کا یہ مکتوب بھی قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لیے درج کیا جاتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج شریف؟

والا نامہ مجھ کو کلکتہ میں ۲۴؍ذی الحجہ کو ملا۔ میں دیوبند سے ۱۱؍ذی الحجہ کو ہری پور کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ ادھر سے بمبئی ہوتا ہوا کلکتہ آیا ہوں۔ اس وقت مجھ کو بنگال آسام کے متعدد جلسوں میں شریک ہونا ہے۔ انشاء اللہ ہفتے عشرے کے بعد دیوبند پہنچوں گا۔ میں نے جب عریضہ لکھا تھا تو بعض احباب نے اصرار کیا تھا کہ چوں کہ جگہ جگہ پروپیگنڈہ کیا گیا ہے اور ہر طرف سے خطوط آرہے ہیں، نیز بذریعہ "مدینہ" وغیرہ مجھ سے استفسار کیا ہے۔ بنا بریں لازم ہے کہ اس خط کی نقل شائع کردی جائے۔ میں نے ان کے اصرار پر اجازت دے دی تھی۔ چناں چہ آپ کے پاس عریضہ روانہ کردینے کے بعد انھوں نے اس کی نقلیں "مدینہ"، "الجمعیۃ"، "انصاری"، "ہند جدید"، "ترجمان سرحد"، "پاسبان"، "اجمل" وغیرہ کو بھیج دیں وہ شائع ہوگئی ہیں۔ بنا بریں عرض

ہے کہ جناب کا اس عریضہ کو سر اقبال صاحب کی خدمت میں بھیجنے کے متعلق استفسار فرمانا اب غیر ضروری ہے اور اس میں کوئی پرائیویٹ مضمون تھا بھی نہیں۔ اگر ان کو ان اخباروں کے مضامین نہ پہنچے ہوں اور غالباً نہ پہنچے ہوں گے کیوں کہ بڑے حضرات اردو کے اخبار اور بالخصوص قومی اخبار ملاحظہ نہیں فرماتے، تو بھیج دیجیے۔ میرے محترم سر موصوف کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے، اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے، میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے میں جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہیے، خبر ہے انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں کیا، نہ امر و انشا کا لفظ ذکر کیا ہے۔ پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے اور واقعہ اصلی یہ تھا کہ میں تقریر میں ان امور کو گنوا رہا تھا جو کہ ہندوستانیوں کو اور بالخصوص مسلمانوں کو انگریزوں سے پہنچے ہیں۔ ان میں پہلی چیز ذکر میں ذلت آئی تھی کہ تمام دنیا میں اس زمانے میں ہم ذلیل شمار کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ساری دنیا کا خیال ہے کہ ہندوستانی (ہندوستان کے باشندے) ایک قوم ہیں اور وہ سب کے سب غلام ہیں اور غلام ذلیل و خوار ہوتا ہی ہے۔ اس لیے ہم بیرون ممالک میں نہایت ذلیل دیکھے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، یہودی وغیرہ کا مذہبی یا نسلی یا صنفی فرق نہیں دیکھتے ہیں اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کے متعلق نٹال، ٹرانسوال، کیپ کالونی، ماریشیس، زنجبار، نیروبی، کینیا، فجی، آسٹریلیا، کینڈا، امریکہ وغیرہ نہایت شرم ناک اور ذلیل ترین قوانین اپنے یہاں بناتے ہیں اور ہندوستانی باشندوں کو شہری حقوق سے محروم کرتے ہیں اور ہم کوئی امداد وہاں کے ہندوستانی باشندوں کی نہیں کر سکتے۔ کیا ایسا وہ جاپان یا چین یا اطالین یا انگلینڈ یا ڈچ وغیرہ آزاد قوموں کے ساتھ کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے متعلق جو کہ فلسطین یا سیریا یا مصر یا عراق، طرابلس یا الجیریا وغیرہ میں موجود ہیں۔ آوازیں اٹھاتے ہیں مگر کوئی یورپین طاقت ہماری آواز کی طرف رخ نہیں کرتی اور نہ متاثر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ذلت ہے۔ خود برطانیہ کے مقابل ہم اس کے کھلے ہوئے مظالم پر جو کہ ہندوستان اور سرحد وغیرہ میں ہو رہے ہیں پروانشت کرتے ہیں، مگر وہ کان بھی نہیں دھرتی، ہم بیرون ممالک میں دیگر اقوام کے سامنے اسی غلامی کی وجہ سے ہندوستانی قوم کو ذلیل کرتے ہوئے بار ہا مشاہدہ کر چکے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دوسری چیز میں نے ذکر کی تھی ''بزدلی اور جبن'' امور جنگ سے ناواقفیت اور اس کو واضح طور پر ثابت کیا تھا۔ تیسری چیز نفاق، چوتھی چیز فقر و فاقہ، پانچویں چیز جہل، چھٹی چیز کسل اور سستی، ساتویں چیز بد عقلی، آٹھویں بیکاری وغیرہ مسلمانوں کے لیے خصوصاً دارالاسلام کا دارالحرب ہو جانا، عالم اسلامی کا اس غلامی کی وجہ سے برباد ہونا مذہبی امور کا غارت ہونا وغیرہ یہاں کوئی مشورہ بجز اس کے ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ اشد ضروری ہے کہ جلد از جلد کوشش کر کے ہندوستان کو آزاد کرائیں اگر اس مشورے کو خلاف دین وامانت شمار کیا جاتا ہے تو باعلان کہتا ہوں کہ میں اسی کو فرض سمجھتا ہوں۔

فذالک ذنب لست منه اتوب (یہ ایسا گناہ ہے جس سے توبہ نہیں کر سکتا)

دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے اس کو مشورہ دوں گا اور میرا اعتقاد ہے کہ اس میں تقصیر کرنا مسلمان کے لیے حرام ہے، اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لینا ضروری ہے۔

باقی رہا ملت اسلامی کا بلا انساب، بلا الوان، بلا اوطان، بلا صنائع وغیرہ متحد ہونا اور کرنا تو یہ دوسرا امر ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں، ہماری گھٹی میں پڑا ہے، اس کی بنا پر ہم مالٹا میں قید رہے۔ ہم نے کراچی کا جیل کاٹا اور سیکڑوں مصائب اٹھائے اور بچپن سے اس کی تعلیم پائی۔ قرآن کی آیات واحادیث صحیحہ اور روایات آج نہ سطور میں بلکہ صدور میں موجود ہیں، جن کو بار ہا منابر پر مجامع میں ہم پڑھتے اور اس کا وعظ سناتے ہیں۔ کوئی تو صرف اس کا قوال ہی ہوگا، ہم قوال اور فعال دونوں ہیں۔ قوم کی بے حسی اور کمزوری کی وجہ سے اس حالت میں پڑے ہوئے ہیں پھر کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ قوم اور ملت اور دین کو ایک قرار دیا گیا۔ میں فرق کو نقل کر چکا ہوں۔ اگر خلاف لغت سر صاحب موصوف کا نظریہ دونوں کے اتحاد وغیرہ کا ہے تو ان کو اپنے نظریے کے مخالف کو ایسے ناشائستہ الفاظ کہنے کا کیا حق ہے بہرحال

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

میرے محترم! ہم تو ایسی سب وشتم کے عادی ہو گئے ہیں، سن کر کچھ تغیر نہیں ہوتا:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب سے میں علاحدہ ہوا ہوں ہر

قسم کے سب وشتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوا ہوں، وہ کون سے الفاظ اور معاملات ہیں جو نہیں کیے گئے۔ سر موصوف صاحب تو جب بھی غیر ہیں۔ یہاں اپنے ہی کیا کمی کر رہے ہیں۔

والسلام۔

دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ اس وقت میں نے یہ عریضہ اسٹیمر میں گوالندو اور چاند پور کے درمیان لکھا ہے، تاخیر پر مواخذہ نہ فرمائیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میرے عریضہ کی نقل ''احسان'' کو بھیج دیں شاید وہ شائع کر دے اور جب کہ اس نے سر موصف کا مقالہ ابتدا میں شائع کیا ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ اس کو بھی شائع کر دے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس عریضہ کو بھی شائع فرما دیں یا سر موصوف کی خدمت میں بھیج دیں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲۵ ر ذی الحجہ (۱۳۵۶=۲۶ ر فروری ۱۹۳۸ء)

سندھ وزارت کا خاتمہ:

۸ ر مارچ ۱۹۳۸: کراچی ۸ ر مارچ کانگریس پارٹی نے سندھ اسمبلی کے اجلاس میں جو تخفیف کی صورت میں وزارت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی تھی، وہ چوبیس آرا کے مقابلے میں تیس آرا سے منظور ہوگئی۔ آئین کی رو سے سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت ختم ہوگئی۔ خیال کیا جارہا ہے کہ گورنر سندھ ''خان بہادر اللہ بخش کو نئی وزارت بنانے کی دعوت دیں گے۔

(کاروان احرار، جلد سوم، ص ۲۹۶)

سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کا خاتمہ:

۲۳ ر مارچ ۱۹۳۸: مسلمانوں کی باہم آویزش کا نمونہ سندھ میں بھی دیکھا گیا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں یہاں کوئی پارلیمنٹری بورڈ قائم نہیں ہوسکا تھا۔ اسمبلی کے ممبران کی تعداد ساٹھ تھی۔ جن میں پینتیس مسلمان تھے۔ ان میں اٹھارہ سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے ساتھ اور باقی مسلم لیگ، کانگریس اور احرار میں تھے۔ سر عبداللہ ہارون مسلم لیگ بنانے پر مصر تھے۔ جب کہ باقی پارٹیاں ان سے جدا تھیں۔ آخر صوبے کے اقتصادی معاملات پر سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کو ایک ووٹ سے شکست ہوگئی۔ اس پر گورنر سندھ نے خان بہار اللہ بخش سومرو کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے اٹھارہ، مہا سبھا کے گیارہ اور کانگریس کے دس

ممبروں نے خان بہادر اللہ بخش سومرو کا ساتھ دیا اس پر ۲۳ر مرچ ۱۹۳۸ء کو خان بہادر اللہ بخش سومرو کی وزارت قائم ہو گئی۔

(کاروان احرار، جلد سوم، ص ۱۷۔۳۱۶)

السپ کمیشن کی رپورٹ:

۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء: جولائی ۱۹۳۷ء سے کانگریس نے عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لی۔ اس کے بعد اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مدح صحابہ کے اس معاملے میں اپنا فیصلہ دے اور السپ کمیشن کی رپورٹ کو شائع کر دے لیکن اس نے دیگر اہم مصروفیتوں کے ہونے کی وجہ سے مہلت طلب کی۔ سنیان لکھنو برابر صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہے لیکن جب فروری ۱۹۳۸ء تک بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا تو لوگوں میں بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ بالآخر ۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء کو گورنمنٹ نے مدح صحابہ کمیشن کی رپورٹ اور اپنا فیصلہ شائع کیا۔ اگرچہ گورنمنٹ کے فیصلہ کے الفاظ مختلف تھے۔ لیکن مطلب و مقصود وہی تھا جو ۱۹۰۹ء کے فیصلہ کا تھا۔ اس فیصلہ کے پیراگراف ۵ میں گورنمنٹ تحریر کرتی ہے:

> ”گورنمنٹ اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ سنیوں کا یہ حق ہرگز مابہ النزاع نہیں ہے کہ آیا انھیں مجالس عام یا مجالس خاص میں خلفائے ثلاثہ کی مدح کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ بلاشک ان کو یہ حق حاصل ہے جھگڑا صرف اس بات کا ہے کہ کس طریقہ اور کن حالات میں ان کو لکھنو میں مدح صحابہ پڑھنی چاہیے۔ جب مختلف اقوام کے عقائد اور نقطہ نظر میں فرق ہو تو گورنمنٹ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ امن عامہ کو قائم رکھنے کے لیے مداخلت کرے اور عام لوگوں کی سہولت کا خیال رکھے۔“

اس طرح پر مدح صحابہ کا حق جیسے پہلے تسلیم کیا گیا تھا گورنمنٹ کے اس فیصلے میں بھی تسلیم کیا گیا۔ لیکن وقت اور حالات کا تعین کچھ نہیں کیا گیا۔ (تاریخ احرار از افضل حق، صفحہ ۲۰۳)

علامہ اقبال کا اپنی رائے سے رجوع:

۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء: مولانا عبدالرشید نسیم طالوت صاحب نے حضرت شیخ الاسلام اور علامہ اقبال کے مابین غلط فہمی دور کرنے کے لیے جو سعی کی تھی الحمد للہ وہ مشکور ہوئی۔ علامہ اقبال کی ملاط

فہمی دور ہوگئی اور انھوں نے ایک بیان میں اپنے خیالات سے جو انھوں نے اپنے قطعے میں ظاہر کیے تھے رجوع فرمالیا۔ یہ بیان ایک خط کی صورت میں ہے جو انھوں نے ایڈیٹر احسان لاہور کے نام لکھا ہے اور ۲۸ / مارچ کے شمارے میں قومیت اور وطنیت کے سلسلے میں ایک علمی بحث کا ''خوش گوار خاتمہ'' علامہ اقبال کا تردیدی بیان کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ علامہ نے لکھا ہے:

جناب ایڈیٹر صاحب ''احسان'' لاہور السلام علیکم

میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے، اس میں اس امر کی تصریح کردی تھی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد کہ ''زمانہ حال میں اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔ محض بر سبیل تذکرہ ہے، تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اور اگر مولانا نے مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریۂ وطنیت کا اختیار کریں تو دینی پہلو سے اس پر مجھ کو اعتراض ہے، مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار انصاری میں شائع ہوا، مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

''لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے، ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت اور کوئی رشتہ نہیں، جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔''

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانان ہندوستان کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار ''احسان'' میں شائع ہوا ہے، لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط ''طالوت'' صاحب کے نام آیا، جس کی ایک نقل انھوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے، اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

> ''میرے محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا، تو اس میں کوئی کلام نہیں، اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق وسباق پر نظر ڈالی جائے، میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔'' یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا

کرنا چاہیے، خبر ہے، منشا نہیں ہے کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں۔ پھر
اس مشورے کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔"

"خط کے مندرجۂ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا، میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں، جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں، خدا ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے، نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔

محمد اقبال"

حضرت علامہ کے قطعے پر ردِ عمل:

مارچ ۱۹۳۸ء: علامہ اقبال مرحوم نے حضرت شیخ الاسلام کے رد میں جو ایک جذباتی قطعہ لکھا تھا۔ ایک طرف تو اس کا اثر لیگی حلقوں میں یہ ہوا کہ انھیں حضرت کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک بہت گھٹیا ہتھیار ہاتھ لگا۔ لیکن سنجیدہ علمی حلقے اور حضرت کے معتقدین و منتسبین کے حلقے میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ ان میں سے بعض حضرات جو شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے، انھوں نے علامہ اقبال کے رد میں کئی پرزور نظمیں لکھیں جن میں خیالات اور جذباتِ صادقہ کا اظہار کیا اور عام طور پر فارسی میں اور اسی وزن و بحر میں لکھی گئیں تھیں۔ ان میں سے مولانا اقبال سہیل (ایڈوکیٹ اعظم گڑھ) کے اشعار زبان کی سلاست، بیان کے جوش، فکر کی بلندی، دلائل کی فراوانی جواب کی بداہت اور شاعرانہ خصایص میں بلند پایہ تھے جو بہت پسند کیے گیے تھے۔ اشعار یہ ہیں:

معاندے کہ بشیخ الحدیث خردہ گرفت
سبک بچشم فروز ایں سحاب بے سببی است
بیان او ہمہ تحلیل و بحث در تفسیر
زبان او عجمی و کلام در عربی است
کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن است

دروغ گوئی و ایراد ایں چہ بوالعجبی است
درست گفت محدث کہ قوم از وطن است
کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبی است
زبان طعن کشودی مگر نہ دانستی
کہ فرق ملت و قوم از لطائف ادبی است
تفاوتے است فراواں میان ملت و قوم
یکے ز کیش دگر کشوریست یا نسبی است
بملت ارچہ براہیمی است سرورِ ما
ولے بہ قوم حجازی نسل مطلبی است
ز قوم خویش شمرد اہل کفر را بہ احد
رسول پاک کہ نامش محمد عربی است
خدائے گفت بقرآن ''لکل قوم ہاد''
ولے بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است
بقوم خویش خطاب پیمبراں بنگر
پراز حکایت یا قوم مصحف عربی است
بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت
کہ حبل دین قوی تر ز رشتۂ نسبی است
کسے کہ ملت اسلام نور سینۂ اوست
برادراست اگر زنگی است یا حلبی است
ولے بہ ہم وطناں در مصاف آزادی
مجاہدانہ تعاون جہاد حق طلبی است
سلوک رفق و مدارا بہ جار و ذی القربیٰ
عمل بہ حکم الٰہی و اتباع نبی است
محبت وطن است از شعائر ایماں
ہمیں حدیث پیمبر فدیۃ ، بابی است
نظر نہ بودن و با دیدہ ور در افتادن

دو گونہ شیوۂ بوجہلی است وبولہبی است
رموز حکمتِ ایماں زفلسفی جستن
تلاشِ لذت عرفاں زبادۂ عنبی است
خموشی از سخن نا سزا گزیدہ تر است
کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی وبے ادبی است
بہ دیو بند گذر، گر نجات می طلبی
کہ دیو نفس سلح شورود انش تو صبی است
بگیر راہ حسین احمد از خدا خواہی
کہ نائب است نبی راوہم زآل نبی است

دوسرے شعرا میں عزیز احمد قاسمی، مولانا سید محمد اصلح الحسینی، مولانا محمد سلیمان آسی قاسمی، محمد کفیل، پروفیسر محبوب الٰہی، حامد الانصاری غازی، ارشد تھانوی، مولانا زاہد الحسینی شمس آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مولانا قاضی زاہد الحسینی نے وہ تمام منظومات جو علامہ اقبال کے قطعے کے جواب میں کہی گئی تھیں، ایک کتابچہ بہ عنوان ''اذان حجاز'' میں جمع کر کے ''ملٹری پریس کیمبل پور'' سے چھپوا دی تھیں۔

تحریک مدح صحابہؓ:

مارچ ۱۹۳۸ء: مجلس احرار اسلام نے اس مضمون کا ایک ریزولیشن پاس کیا کہ گورنمنٹ کے فیصلہ کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ جب تک اس کا عمل نہ دیکھ لیا جائے۔ نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ اس فیصلہ کے متعلق مجلس علماء سے استفتاء کر کے اس کی ہدایت کے مطابق عمل درآمد کیا جائے۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں مجلس احرار نے بطور آزمائش محفل میلاد کے منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ جو قریب قریب کلیۃً سنیوں کی آبادی تھی۔ لیکن اس محفل میلاد کے منعقد ہونے پر لکھنو کی تمام پولیس اور افسران موقعہ پر پہنچ گئے۔ دفعہ ۱۴۴ کی دھمکی دی جس کی وجہ سے کارکنان نے اس وقت اجتماع جلسہ کو ملتوی کر دیا۔

مذکورہ بالا فیصلے کے نفاذ میں گورنمنٹ مسلسل دیر کرتی رہی۔ لیکن اس طرز عمل سے فضا کے پرسکون ہونے میں کوئی مدد نہ ملی۔ برعکس اس شیعہ جو پہلے گورنمنٹ کی تجویز کو ماننے کے لیے کم وبیش تیار بھی

تھے۔انھوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر فضا کو مکدر رکھا جائے تو بحالات موجودہ مدح صحابہ کے عام مقامات پر نہ پڑھے جانے یا مدح صحابہ کا جلوس نہ نکالنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ کوشش ۱۹۳۷ء ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ جب کہ السپ کمیشن نینی تال میں اپنی رپورٹ تحریر کر رہا تھا۔

''جون ۱۹۳۶ء میں ایام عزاداری ختم ہونے کے بعد شیعوں کی طرف سے حملہ ہوا اور اس کے بعد لکھنو میں بلوہ ہوگیا۔ اس سے قبل بھی چہلم کے موقعے پر شیعوں کا جو جلوس پاٹا نالہ میں دارالمبلغین کے سامنے گزرا تھا۔ اس کے متعلق بھی شکایت تھی کہ اس نے بہت سے اشعار سب و شتم کے پڑھے تھے مثلاً:

وہ ہاتھ اگر آگ میں جل جائے تو اچھا
جس ہاتھ سے شبیر کا ماتم نہیں ہوتا
او کہنے والے تعزیہ داری حرام ہے!
دشمن ہے تو نبی کا عدوّے امام ہے
جہاں میں کس لیے بے دیں ہمارا دل جلاتے ہیں
عزاداری کو کیا سمجھے ہیں جو بے دیں مٹاتے ہیں
یہی ہے بخشش امت کا ساماں سوچ لے بے دیں
لعین ابن لعیں ہیں جو عزاداری مٹاتے ہیں

غرض فضا کے پرسکون ہونے کے بجائے روز روز فضا کے مکدر ہونے کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں اور گورنمنٹ کے اعلان کے بعد اس میں اضافہ ہوتا رہا چناں چہ دارالمبلغین پر حملہ کیا گیا۔ جلوس پر گلی میں سے اینٹیں پھینکی گئیں اور بلوہ ہوا اس کے نتیجہ میں مولوی عبدالشکور (لکھنوی) اور ان کے رفقاء کو دفعہ ۱۰۷ کے ماتحت گرفتار کرلیا گیا۔''

مسئلے کے حل کے لیے شیخ الاسلام کی کوشش:

''اس نوبت پر مولانا حسین احمد صاحب جو شروع سے تحریک مدح صحابہ کے حامی اور اس کے پرجوش مددگار رہے تھے۔ انھوں نے مداخلت کی اور سنیان لکھنو کے لیے تحریری اعلان شائع کیا کہ ان کو موقعہ دیا جائے کہ وہ گورنمنٹ سے کوشش کر کے اس مسئلے کو ختم کرادیں۔ آپ نے اس دوران میں سنیان لکھنو کو صبر کے ساتھ انتظار کرنے کی تلقین کی اور کسی قسم کی تحریک سول نافرمانی

وغیرہ شروع نہ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ نیز یہ بھی یقین دلایا کہ اگر خدانخواستہ ان کو اس مسئلہ کے حل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو وہ خود مدح صحابہ کے ایجی ٹیشن میں سب سے آگے ہوں گے۔ چناں چہ مولانا حسین احمد صاحب قبلہ کے احترام میں سنیان لکھنو پھر خاموش ہو گئے اور صبر وسکون کی ساتھ حکومت کے تصفیہ کا انتظار کرنے لگے۔

اس دوران میں مولانا حسین احمد صاحب کی گفتگو حکومت یو۔ پی اور کانگریس سے ہوتی رہی اور حکومت کی طرف سے التوا کا عذر ہوتا رہا۔ اور مجلس احرار اور مجلس تحفظ ناموس صحابہ کی طرف سے پبلک کو یقین دلایا جاتا رہا کہ عنقریب گورنمنٹ اپنے مذکورہ بالا فیصلہ کو جامۂ عمل پہنادے گی۔ لیکن اس کو مہینہ دو مہینہ چار مہینے چھ مہینے گزر گئے۔ مگر ہنوز روز اول رہا۔ یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کے مذکورہ بالا اعلان کے شائع ہونے کے سال بھر انتظار کرنے کے بعد مولانا عبدالشکور صاحب (لکھنوی) ودیگر حضرات نے ایک روز یہ مطبوعہ اعلان شائع کرادیا کہ امین الدولہ پارک میں مدح صحابہ کا جلسہ منعقد ہوگا۔ اس اعلان کے شائع ہوتے ہی گورنمنٹ نے مولانا موصوف اوران کے رفقاء کو حسب دفعہ ۱۰۷ گرفتار کرلیا۔ اب مولانا حسین احمد صاحب نے حکومت یو۔ پی کی وعدہ خلافی سے مجبور ہو کر اس بات کا اعلان کردیا کہ وہ سنیان لکھنو کر مزید انتظار کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ چناں چہ اس کے بعد وہ خود اپنے وعدے کے مطابق میدان عمل میں اتر آئے۔ احرار کی جانب سے بھی سول نافرمانی شروع کردی گئی۔

اس سول نافرمانی کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ زیادہ دنوں کی بات نہیں یعنی حکومت نے سال بھر میں ایک دن (یعنی ۱۲/ربیع الاول کو) جلوس نکالنے کی اجازت کا وعدہ کیا۔ اب شیعہ اس بات پر بہت چراغ پا ہیں۔ حال آں کہ سنیوں کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی ہے۔ اس کی تلافی اب تک نہیں ہوئی۔ ہے۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس نے معلوم ہوسکتا ہے کہ سنی تین دن کی مدح صحابہ کی پابندی کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔ ان تین دنوں کے علاوہ سال کے بقیہ ایام میں ۱۹۰۸ء سے ان کا حق علانیہ مدح صحابہ پڑھنے کا تسلیم شدہ چلا آرہا تھا۔

مصالحت کا سوال:

اب مصالحت کا سوال پھر اٹھا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مصالحت کس طرح ہو؟ اگر سنیوں کو مدح صحابہ کے لیے ۱۰ یوم دیے جاتے تو ممکن تھا کہ مصالحت ۹ پر ہوجاتی، اگر ۵ دیے جاتے تو ممکن

تھا کہ ہم پر مصالحت ہو جاتی۔ لیکن اب ملا کیا ہے جس پر مصالحت کی جائے؟ موجودہ حالات میں تو مصالحت کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ سنی اپنے حق سے بالکلیہ دستبردار ہو جائیں۔

لیکن واضح رہے کہ یہ مسئلہ کا تصفیہ پورے طور پر لکھنو سے باہر رہنے والے حضرات کے طے کرنے کا نہیں ہے۔ جب تک کہ سنیان لکھنو کا اطمینان نہ کر دیا جائے اس ہیجان کے ختم ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ لکھنو میں سنیوں کی تعداد ۸۰،۰۰۰ اسی ہزار کے قریب ہے اور شیعوں کی تعداد بیس ہزار ۲۰،۰۰۰ کے قریب ہے۔ سال بھر میں شیعوں کے بیسوں جلوس نکلتے ہیں۔ لیکن سنیوں کا کوئی جلوس خالصۃً سنی ہونے کی حیثیت سے نہیں نکلتا۔ لکھنو میں ان کو کسی جلوس ہی کے نکالنے کی ممانعت نہیں بلکہ جلسے کرنے کی بھی ممانعت ہے وہ جلسوں میں بھی مدح صحابہ نہیں پڑھ سکتے۔ پچھلے ایجی ٹیشن میں جن اشعار کے پڑھنے پر سنیوں کی گرفتاریاں ہوئیں ان میں سے بعض بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ لکھنو میں سنی کس کس حق کے لیے تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اور وہ کون سا حق ہے جس کی مخالفت تبرا پڑھنے کی دھمکی دے کر کی جا رہی ہے؟

خدا وندا قسم تجھ کو شفیع روز محشر کی
محبت دے ابو بکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ کی
خدا شاہد نبی شاہد، زمیں شاہد، زماں شاہد
صداقت کل جہاں نے مان لی صدیق اکبر کی
مشرف جب ہوئے فاروق اعظم دین احمد سے
صدا کانوں میں پہنچی ہر طرف اللہ اکبر کی
ہمیں اے جذبۂ اسلام تجھ سے کام لینا ہے
ابو بکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ کا نام لینا ہے
"اَشِداء علی الکفار" ان کی شان میں آیا
کلام اللہ کی تفسیر ان کا نام لینا ہے
نہ تخت روم لینا ہے، نہ ملک شام لینا ہے
ہمیں دنیا کے ہر گوشے میں حق کا نام لینا ہے
ابو بکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ کا ہم پہ احساں ہے
ہمیں اس واسطے یہ نام صبح و شام لینا ہے

جلال و جذبۂ فاروق اعظم ہم کو دے یارب
اگر دنیا میں ہم سے خدمت اسلام لینا ہے
دل آزاری کسی کی ہم نہ کرتے تھے نہ کرتے ہیں
ہمیں تو صرف آقاؤں کا اپنے نام لینا ہے
شجاعان جہاں ڈرتے تھے فاروق ؓ دلاور سے
کہ ان کا سامنا تو موت کا پیغام لینا ہے

یہ ہیں وہ اشعار جن کے متعلق شیعوں کا قول ہے کہ ان کو سن کر انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے یا للعجب! لیکن حکومت کے لیے تو صرف شیعوں کا کہنا کافی نہیں ہونا چاہیے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا عام طور سے اور عام اصول اخلاق و آداب معاشرت کے لحاظ سے یہ اشعار دل آزار ہیں یا نہیں؟ البتہ اس بات کے متعلق شیعوں کو اطمینان کرایا جاسکتا ہے کہ ان جلسوں اور جلوسوں میں کبھی ایسے اشعار نہ پڑھے جائیں گے نہ ایسی باتیں کہی جائیں گی جن سے اشارۃ یا کنایۃً ان پر کسی قسم کا حملہ ہو۔

ایک مطالبہ حضرات شیعہ کی جانب سے یہ کیا جاتا ہے کہ جب سنیوں کو ایک حق مل گیا تو ان کو چاہیے کہ اپنے بھائیوں کی دل آزاری کے خیال سے دستبردار ہوجائیں مجھے اخلاقی طور سے ان کے اس مطالبہ سے انکار نہیں اور میں ایسے بہت سے حضرات کو جانتا ہوں جنھوں نے بارہا یہ کہا کہ جلوسوں کی اگر عام اجازت ہوجاتی ہے تو سنیوں کی ان کے ترک کردینے میں کوئی عذر نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت تک اجازت ملی بھی ہے یا نہیں؟ اگر بارہ مہینے کی عام اجازت مل جاتی ہے۔ اور پھر شیعہ حضرات لکھنو میں ایک اور جلوس سکون کے ساتھ نکل جانے دیتے تو پھر بے شک ان کو یہ کہنے کا حق ہوسکتا تھا کہ وہ جلوسوں سے دستبردار ہوجائیں۔ لیکن جب زبردستی اور زور سے اس جائز حق کے استعمال سے روکا جاتا ہے تو دوسرے لوگوں اور بالخصوص سنیان لکھنو سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس حق سے دستبردار ہوجائیں گے ایک ناممکن بات ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب اور تحریک مدح صحابہ:

اکثر حضرات مولانا حسین احمد صاحب اور احرار کے متعلق یہ اعتراضات کرتے ہیں کہ انھوں نے تحریک مدح صحابہ میں کیوں حصہ لیا؟ لیکن شاید ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جب حضرت

مولانا حسین احمد صاحب کا بیان السپ کمیٹی کے سامنے بطور گواہ کے ہوا تھا۔ تو انھوں نے صراحت سے اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے مدح صحابہ کی مخالفت کو مداخلت فی الدین فرمایا تھا۔ اور اس کی وجوہات تفصیل کے ساتھ کمیشن کے سامنے پیش کی تھیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے جسے وہ بار بار مختلف موقعوں پر بیان فرما چکے ہیں۔ تحریک مدح صحابہ میں شرکت نہ شیعوں کی مخالفت پر مبنی ہے اور نہ اس کا باعث پچھلی تحریک مدح صحابہ ہے۔ جب مدح صحابہ کا ایجی ٹیشن ملتوی ہوا۔ اور مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا۔ تو مولانا حسین احمد صاحب ہی مسلم لیگ۔ پارلیمنٹری بورڈ کے روح رواں تھے۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں بعض شیعہ امیدوار سنی امیدواروں کے مقابلے میں منتخب کیے گئے اور مولانا موصوف نے ان امیدواروں کی پوری تائید کی اور بعض شیعہ امیدوار تو ایسے ہیں جو صرف مولانا موصوف کی امداد سے ہی کامیاب ہوئے۔ مجلس احرار نے بھی خود لکھنو میں شیعہ امیدواروں کی پورے طور پر تائید کی۔ ہمیشہ سے ان کا دعویٰ ہے کہ مدح صحابہ کی جنگ ایک شہری اور مذہبی حق کی جنگ ہے وہ شیعوں کی عداوت یا اقلیتوں کی حق تلفی کرنے پر مبنی نہیں ہے۔ چناں چہ ہمیشہ گورنمنٹ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ بجائے دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ اور دفعہ ۱۸۸ میں سزا دینے کے مدح صحابہ پڑھنے والوں کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۸ کے ماتحت گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلا کر سنیوں کو یہ موقع دے کہ وہ عدالت عالیہ ہائی کورٹ سے اس امر کا فیصلہ حاصل کر سکیں کہ آیا مدح صحابہ پڑھنا قانوناً جرم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ چناں چہ میں سارے سنیان ہندوستان کی طرف سے علی روس الاشہاد یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا کوئی ہائی کورٹ یہ طے کر دے کہ مدح صحابہ پڑھنا دفعہ ۲۹۸ تعزیرات ہند کا جرم ہے تو ہم اپنے اس حق سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جائیں گے۔ اسی طرح سے اگر تبرا کے متعلق مقدمہ چلا کر ہائی کورٹ سے تجویز لے لی جائے تو وہ بھی ہمارے لیے قابل پابندی ہوگی۔ لیکن گورنمنٹ نے کبھی مدح صحابہ پڑھنے والوں پر ہمارے مطالبہ کے موافق اور خود گورنمنٹ کے ۱۹۰۹ء تک کے ریزولیشن کے مطابق مقدمہ نہیں چلایا۔

ان معروضات سے یہ معلوم ہوگا کہ اس تحریک کے چلانے میں نہ اکثریت کا غرور ہے نہ اقلیت کی تحقیر بلکہ لکھنو کے ۸۰ ہزار پریشان حال سنیوں کے ایک جائز مطالبے اور حق کی تائید ہے۔

۱۹۳۹ء میں کانگریس حکومت کے زمانے میں بارہ وفات کے روز جلوس مدح صحابہ نکالا گیا۔ اس وقت صوبہ میں سر ہنری ہیگ گورنر تھے۔ پھر ۱۹۴۰ء میں جب صوبہ میں جمود پیدا ہو چکا تھا۔ اور مسٹر گوبند ولبھ پنتھ کی وزارت مستعفی ہو چکی تھی۔ صوبۂ متحدہ کے گورنر سر مارس ہیلٹ کے زمانے میں

بھی یہ جلوس نکلا۔ اسی طرح برابر دو سال تک یہ جلوس نکالا گیا۔ اس سال ۱۹۴۱ء میں بھی حسب دستور مسلمان جلوس مدح صحابہ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دفعتہً ۵/اپریل ۱۹۴۱ء کو سنیوں کے ایک وفد کو جو جلوس مدح صحابہ کے راستے کے لیے مسٹر لوئیس لائیڈ ینے ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا تھا۔ موصوف نے بتایا کہ شیعوں کو ایک جوابی جلوس کی اجازت دی جانے والی ہے۔ اور یہ بتایا کہ اس میں تاریخی نکات ہیں جو نظم میں بصورت درخواست انجمن تنظیم المومنین کے سیکرٹری نے پیش کیے ہیں۔ ایک شیعہ مجسٹریٹ نے جو اس وقت موجود تھے۔ یہاں تک کہا کہ اس کو دکھلا دیا جائے۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ یہ مناسب نہ ہوگا کہ کسی کے جذبات کو مجروح کیا جائے۔ اس لیے کہ کئی روز قبل اخبار تنظیم میں جو شیعہ جماعت انجمن تنظیم کا ایک ذمہ دار آرگن ہے یہ شائع ہو چکا تھا کہ مسٹر سید اشرف حسین وکیل نے جو انجمن تنظیم کے سیکرٹری ہیں تبرا کے جلوس کے لیے ایک درخواست ڈپٹی کمشنر کو دی ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر کہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ایک ایسے غیر قانونی جلوس کی اجازت دینے والے ہیں۔ جو صحابہ کرام کی ذات پر تبرا و تنقید یا قدح کرے گا۔ لکھنو کے مسلمانون میں ایک آگ لگ گئی اور انتہائی بے چینی پیدا ہوگئی۔

چناں چہ ایک بہت بڑا جلسہ مجلس احرار لکھنو اور انجمن ناموس صحابہ کا مشترکہ احاطہ شیخ شوکت علی مرحوم میں ۷/اپریل ۱۹۴۱ء کو بصدارت مسٹر وصی احمد منعقد کیا گیا جس میں ۵۰/ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔

مقررین نے حکومت کو انتباہ کیا کہ اگر خدانخواستہ اس جلوس کی شیعوں کو اجازت دے دی گئی تو ہم سنی مسلمان اپنی جانیں قربان کر دیں گے اور کسی طرح ایسے جلوس کو نہ نکلنے دیں گے۔

اس جلسے میں دو روز کے لیے مکمل ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ چناں چہ ۸ اور ۱۰/اپریل تک شہر میں مکمل ہڑتال منائی گئی۔ ۸/اپریل ۱۹۴۱ء اخبار پانیر میں مسٹر لوئیس لائیڈ کا یہ حکم نکلا کہ شیعوں کو ایک جوابی جلوس کی اجازت بارہ وفات کے روز دے دی گئی اور شیعہ جلوس شاہ نجف سے شرغہ پارک تک کشمیری محلے میں رہے گا۔ سنیوں کو اجازت نہ ہوگی۔ کہ وہ اس جلوس کے قریب جائیں۔ شیعہ اخبار تنظیم نے اپنا ایک اسپیشل نمبر نکالا جس میں یہ بتایا گیا کہ شیعہ جس حق کے لیے ہر ممکن مساعی سے جدوجہد کر رہے تھے، وہ حق مل گیا۔ کانگریس حکومت کی ناانصافی انصاف سے بدل گئی یہ یاد رہے کہ سر سلطان احمد وغیرہ کانگریس حکومت کے زمانے میں بھی اس جلوس کے لیے کوشش میں رہے مگر ناکام رہے۔ یہ اطلاع جیسے ہی مسلمانوں کو معلوم ہوئی۔ انھوں نے فوراً ہی ایک جلسہ احاطہ

شوکت علی میں سہ پہر کو طلب کیا۔ لیکن کرفیو آرڈر کے نفاذ کے باعث دوسرے دن صبح کو ہوا۔ اگرچہ ہر طرف پولیس تھی۔ اور مولانا عبدالقیوم کان پوری سالار اعظم جیوش احرار یو۔پی، مسٹر وصی احمد سیکرٹری مجلس احرار۔ حافظ مشتاق احمد سابق صدر مجلس احرار اسلام، غازی منے خاں اور مولانا کلیم اللہ وغیرہ کے پہلے سے وارنٹ نکال دیے گئے تھے۔ کہ یہ لوگ جلسہ ہونے سے قبل ہی گرفتار ہو جائیں۔ لیکن یہ لوگ کسی نہ کسی طرح سے جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ اور انھوں نے مولانا عبدالشکور صاحب کے نائب مولوی کلیم اللہ کے ہاتھ پر اپنی اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے بیعت کی اور مسلمانوں سے شرعی عہد لیا کہ وہ اب ایسی حالت میں زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ اور نہ کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب ہے۔ عین جیسے میں یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔

تین بجے کے بعد اسی ۹؍اپریل سہ پہر کے وقت ایک جلسہ پھر ہوا۔ جس میں مولانا عبدالشکور خاں صاحب نے بھی تقریر کی۔ اور آخر میں یہ اطلاع ملی کہ ڈپٹی کمشنر نے قدح صحابہ کا جلوس ایک ہفتہ کے لیے بند کر دیا۔ اسی کے ساتھ بارہ وفات کے روز جلوس مدح صحابہ کو بھی نقض امن کے پیدا ہونے کے اندیشے سے روک دیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کے اس اعلان سے صورت بدل گئی۔ کیوں کہ شیعہ جلوس روک دیا گیا تھا۔ لیکن مدح صحابہ کے جلوس پر یہ پابندی کسی طرح سے مبنی بر انصاف نہ سمجھی گئی۔ کیوں کہ ۳۱؍مارچ ۱۹۳۹ء کو یو۔پی گورنمنٹ نے جو کیونک شائع کیا تھا۔ اس میں یہ صاف تصریح تھی کہ ہر حالت میں یہ جلوس اٹھے گا۔ صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ راستہ کا تعین کریں گا۔

چناں چہ ۱۰؍اپریل کو بارہ وفات کے روز تقریباً ایک ہزار سے زائد مسلمانوں نے عیدگاہ سے جلوس نکالا اور گرفتار ہونے۔ اگرچہ ۹؍اپریل کو سہ پہر کے وقت یہ اطلاع ملی کہ گورنمنٹ نے ۳۶ گھنٹہ کا کرفیو آرڈر نافذ کر دیا ہے تاکہ شیعہ اور سنی گھروں سے نہ نکلیں۔

دو گھنٹے کا وقت ملنے پر سات بجے سے پہلے ہی ہزاروں مسلمان عیدگاہ پہنچ گئے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی پولیس اور سوار بھی پہنچے اور رات بھر ان کا محاصرہ جاری رکھا گیا۔ حتیٰ کہ ہندو خوانچہ والے بھی نہ جا سکے اور وہ لوگ بھوکے پیاسے رہے۔ ۲ بجے دن سے عین جلوس نکلنے کے وقت سے سول نافرمانی شروع کر دی گئی اور چار چار آدمیوں کے جتھے مدح صحابہ پڑھتے ہوئے گرفتار ہونے لگے۔ شام تک ایک ہزار سے زاید گرفتار ہو گئے جس میں مولانا انور صابری، مولوی وحید الحسن وکیل، حافظ مشتاق احمد لدھیانوی صدر مجلس احرار، نذیر احمد ایڈوکیٹ، مسٹر بادشاہ علی، مسٹر عبدالحی،

ڈاکٹر محبوب وغیرہ بھی شامل تھے۔ رات کو تمام لوگ چھوڑ دیے گیے اور پانچ روپیہ فی کس جرمانہ کیا گیا۔ لیکن مولانا صابری، حافظ مشتاق احمد، مسٹر نذیر احمد ایڈوکیٹ کو تین تین ماہ کی قید سخت اور دو دو سو روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

۱۱ر اپریل جمعہ کو عیدگاہ میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں مولانا عبدالشکور صاحب نے تقریر کی اور ۱۴ر اپریل تک کے لیے سول نافرمانی بند کر دی گئی۔

۱۴ر اپریل دوشنبہ کو عیدگاہ میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس کے بعد سول نافرمانی شروع ہو گئی اور ۸ سو سے زاید مسلمان گرفتار ہوئے۔ خود مولانا عبدالشکور صاحب اور مجلس احرار کے تمام بڑے بڑے لیڈر پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے اور غازی منے خاں، مولانا عبدالقیوم، مسٹر وصی احمد، مولانا کلیم اللہ پر دفعہ ۳۰۲ لگائی گئی۔ سول نافرمانی جاری ہے اور چھبیس سو (۲۶۰۰) سے زاید مسلمان بارہ وفات ۱۰ر اپریل سے اب تک اپنے کو گرفتار کرا چکے ہیں۔ اور گرفتاریوں کا سلسلہ مدح صحابہ پڑھے کو جاری ہے۔

مسلمان صرف ایک جائز حق کے لیے جو ہندوستان کے دوسرے فرقوں کو حاصل ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کریں، قربانیاں کر رہے ہیں۔ آج لکھنو میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت مولا علیؓ کی تعریف کرنا اور ان کا نام لینا جرم ہے۔ جن کو دنیا کی بڑی بڑی غیر مسلم ہستیاں خراج عقیدت پیش کر چکی ہیں۔

لکھنو کی سرزمین پر شیعہ حضرات سال بھر میں ایک سو چوالیس ۱۴۴ جلوس نکالتے ہیں۔ لیکن سنی مسلمان اپنا کوئی مذہبی جلوس نہیں نکال سکتے جو سنیوں کا خالص مذہبی جلوس ہو۔

(تاریخ احرار از افضل حق، صفحہ ۲۴۱۔۲۴۳)

مارچ ۱۹۳۹ء: کانگریس کا باون واں سالانہ اجلاس تری پوری میں سوبھاش چندر بوس کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے پندرہ ممبران میں سے بارہ نے سوبھاش بابو کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں راجندر پرشاد کو منتخب کر لیا گیا تھا۔ سوبھاش بابو نے کانگریس میں فورورڈ بلاک قائم کر لیا۔ (سکسٹی ایئرس آف کانگریس، ص ۳۱۸۔۱۹)

علامہ اقبال کے رد میں سید سلیمان ندوی کا مضمون:

۱۳ر اپریل ۱۹۳۸ء: نثر میں علامہ اقبال کے قطعے کے جو جواب تحریر کیے گئے ہیں ان میں

علامہ سید سلیمان ندوی کا مضمون نہ صرف اپنے دلائل کی محکمی، بیان کی قاطعیت، علمی متانت اور سنجیدہ اسلوب کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ علامہ اقبال سے قریبی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور علامہ اقبال کے ان کے بارے میں بہت بلند خیالات تھے اور انھیں مامور من اللہ' امت کے خاص افراد اور ان لوگوں میں سے خیال کرتے تھے جن میں امر الٰہی ودیعت کیا جاتا ہے۔ وہ سید صاحب مرحوم کو' علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد' سمجھتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کے قلم سے حضرت شیخ الاسلام کے دفاع اور علامہ اقبال کے خیالات کے رد کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ سید صاحب اس زمانے میں تھانہ بھون کے بزرگ سے جوش عقیدت میں مسلم لیگ کے انداز سیاست سے متاثر ہو چکے تھے اور اس سے کچھ عرصہ قبل مسٹر محمد علی جناح کی مدح میں ایک زوردار نظم لکھ چکے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ مضمون سہ روزہ مدینہ، بجنور کی اشاعت مورخہ ۱۲/اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا فرید الوحیدی نے اپنی تالیف لطیف ''شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی'' میں علامہ ندوی کے اس مضمون کے خاص حصے نقل کیے ہیں، سید صاحب لکھتے ہیں:

''جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے سیاسی خیالات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی شخصی عزت واحترام، علمی فضل وکمال اور تقویٰ اور حسن نیت کی نسبت ایک لمحے کے لیے بھی کوئی خلاف بات گوارا نہیں کی جا سکتی۔

دلی کے بعض اخباروں میں مولانا کی تقریر کے ایک فقرہ کو جس طرح سیاق وسباق سے قطع کر کے اچھالا گیا ہے، اور اس کے جو جو معنی پہنائے گئے، وہ صریحاً دیانت کے خلاف تھے اور اسی لیے ان کا اعتبار کر کے شاعر اسلام ڈاکٹر اقبال کا ایک ایسا قطعہ کہہ دینا جس میں حد درجہ کی بری تلمیح حافظ شیراز کے مشہور شعر کی بنا پر تھی۔ صاف کہہ دوں کہ باوجود ڈاکٹر صاحب سے میرے خاص تعلقات ہونے کے میرے لیے بہت اندوہناک تھا، میں بے چین ہو گیا۔''

''صحیح وفصیح عربی اور قرآن پاک کے محاورے میں ''ملت'' کے ایک ہی معنی اور وہ مذہب کے ہیں:'' ملت ابیکم ابراھیم ''(حج)

''قوم کا لفظ عربی ہے، اس کے معنی مطلق گروہ کے ہیں۔ یہ قرآن پاک اور عربی محاورہ میں تین معنوں میں آیا ہے۔

مطلق گروہ اور جماعت کے معنی ہیں جیسے: ذالک بانھم قوم لا یعقلون (مائدہ) یہ اس

لیے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔

بانهم قوم لا یفقهون (توبہ) اس لیے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔

انکم قوم منکرون (حجر) تم انجان لوگ ہو۔

وغیرہ بہت سی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں میں قوم کا ترجمہ لوگ، گروہ اور جماعت ہو سکتا ہے۔''

''ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے ''لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں، لیکن اپنے اس خیال کی قطعیت پر اصرار نہیں کہ وفوق کل ذی علم علیم.

''اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں، اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر، اس ملک کی کوئی مشترک سیاسی یا وطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نقطے میں بھی نقطے یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں۔ اقبال کا ہندی ترانہ جب تک موجود ہے، ان کے وطنی جذبے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں جنھوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے:

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں۔ کیا وہ ڈاکٹر اقبال ہی ہیں جنھوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے؟

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انھی کا بخشا ہوا ہے:

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

پھر ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' قابل اعتراض نہیں، اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام، اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیوں کہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں، جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا...... ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے

جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔“

مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہوسکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترکہ مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی ”ملت“ ہی کی خاطر! جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں فرمایا۔“

”آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بہ شانہ رہتے ہیں۔ اس سے ہمارے ان کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت بہر حال پیدا ہوتی ہے۔ اس جامعیت کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کون سا لفظ ہے۔ ملت وامت کے لفظ تو قطعاً نہیں ہیں۔ اور اب تو میت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیے۔ تو کیا اس کے لیے ”جنسیت“ کا لفظ بول سکتے ہیں؟ مگر بولنے سے پہلے قوم کے منفیوں اور مفتیوں کی قوم سے بہر حال پوچھ لینا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ اب اس فتنہ کو یہیں دبا دیا جائے گا۔ اور امت کے منتشر عناصر کو ایک غلط روایت کی بنا پر اور زیادہ پراگندہ بنانے کی حکمت عملی سے گریز کیا جائے گا۔“

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی از فرید الوحیدی)

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مضمون میں علامہ اقبال کی جن تین نظموں کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے، یہ مصرع ”نیا شوالہ“ کا ہے۔ پوری نظم یہ ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں

بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتروہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

۲۔ میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے، یہ مصرع ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا ہے۔
پورا گیت یہ ہے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے آسماں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

۳۔ ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا، یہ مصرع "ترانہ ہندی" کا ہے۔ پورا ترانہ یہ ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آب رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

یہ تینوں نظمیں علامہ اقبال کے مجموعہ کلام ''بانگ درا'' میں شامل ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ فرمانا کہ ''مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے۔'' اور یہ کہ ''مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں۔''

ان منظومات میں جو کیف و لذت خیال، جوشِ فکر اور حقیقت آشنائی ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ پر جوش اور والہانہ انداز میں ہندو مسلم اتحاد و اخوت اور لذت قرب و وصل کی آرزو کا نغمہ اور دونوں قوموں کی نفاق انگیزی، فراق، نا آشنائی، جدائی، چمن کے پھولوں میں اخوت کی خوشبو نہ ہونے کی وجہ سے لطف نغمہ پیرائی سے بے کیفی، لذتِ قربِ حقیقی کی آرزو، آتشِ پیکار سے چمن کی تباہی وغیرہ کے مضامین کو انھوں نے جس درد و الم کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں شاید ہی ملے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے اپنے دل درد مند کے ٹکڑے کاغذ پر بچھا دیے ہیں۔ اس نظم کا عنوان ہی ''صدائے درد'' انھوں نے رکھا ہے:

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا، یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں مین اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن مین کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں مین
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں
دانۂ خرمن نما ہے شاعر معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں
حسن ہو کیا خود نما، جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب، جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں
کب زباں کھولی ہماری لذت گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتش پیکار نے

علامہ اقبال مرحوم کی ایک اور نظم ''تصویرِ درد'' کے عنوان سے ''بانگ درا'' ہی میں شامل ہے، اس میں ان کی یہ ''صدائے درد'' اور زیادہ الم انگیز و دردناک ہو جاتی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
رلاتا ہے، ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگ گل تک بھی چھوڑ، اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت ہو دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑ دوں گا
تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیاز ماوتو رہنا!
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا
شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے

کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے
سکوت آمیز طول داستان درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے
"نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں، بخاموشی ادا کردم"

ان منظومات کے علاوہ بھی نظمیں، اشعار اور نثر پارے ہیں، جن میں علامہ اقبال نے متحدہ قومیت، ہندو مسلم اتحاد، اخوت، بھائی چارے کے بارے میں اور نفرت، تعصب، افتراق وغیرہ کے بارے میں اپنے دلی جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بانگ دراہی میں یہ منظومات ہیں جن کا مطالعہ اس باب میں بہت اہمیت رکھتا ہے:

ہمالہ، آفتاب (ترجمہ گایتری)، سوامی ترتھ رام، شری رام چندر جی، گرونانک اور اسی نظم کے ایک شعر میں گوتم بدھ کی مدح ہے اور انھیں پیغمبر قرار دیا ہے۔ ان منظومات میں افکار کی بلندی اور جذبات کی فراوانی میں مولانا مدنی ان سے بہت پیچھے ہیں۔ یہ تمام منظومات بانگ درا میں شامل ہیں۔ بانگ دار علامہ نے خود مرتب کیا تھا اور پہلی بار ۱۹۲۴ء میں اور دوسری بار ۱۹۲۶ء میں علامہ مرحوم نے خود ہی شائع کیا تھا اور تیسرا ایڈیشن اگرچہ علامہ مرحوم نے اپنی زندگی میں تیار کر دیا تھا لیکن اس کی اشاعت علامہ کی وفات کے بعد ۱۹۳۹ء میں عمل میں آئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ مرحوم اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ان خیالات پر قائم تھے۔ ان کے قوم پرستانہ اور ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا مدنی کے تو ان خیالات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وہ خیالات ہیں جن کا جواز پاکستان میں علامہ اقبال کا کوئی بڑے سے بڑا معتقد بھی پیش نہیں کر سکتا۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ علامہ مرحوم کے خیالات نہیں یا انھوں نے ان خیالات سے رجوع کر لیا تھا؟

جاوید نامہ کی فکری اور فنی سطح بانگ درا سے بہت بلند ہے۔ اسے بھی علامہ اقبال نے خود مرتب کیا اور ۱۹۳۲ء میں خود ہی شائع کیا تھا۔ اس میں بھارت ماتا کو "حور پاک زاد" کی شکل میں

پیش کیا ہے اور جن خیالات اور جذبات عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اس کی مثال اردو، ہندی ادب میں نادر اور شاذ کے درجے میں ہوگی۔ جاوید نامہ میں دشوامتر......ایک ہندو بزرگ جسے علامہ نے عارف ہندی قرار دیا ہے، کے حضور اپنی عقیدت کا نذرانہ اور بھرتری ہری ایک فلسفی کے بلند افکار کو خراج تحسین پیش کیا ہے، نہرو خاندان سے اپنے تعلق خاطر کا بیان نہایت جوش محبت سے کیا ہے اور انھیں ''برہمن زادگان زندہ دل'' کے لقب سے ملقب کیا ہے۔

ضرب کلیم کے نام سے علامہ اقبال کا مشہور مجموعہ کلام ۱۹۳۶ء میں خود علامہ نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس میں ''شعاع امید'' کے نام سے جو نظم ہے۔ اس میں بھی علامہ مرحوم نے انھیں قوم پرستانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں روح اقبال اہل ہند کو یہ پیغام دیتی ہے:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازے پر سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یہ چند حوالے تاریخی ترتیب سے بانگِ درا (۱۹۲۴ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) اور ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) سے پیش کیے گئے۔ اس ترتیب کے خلاف بھی دو حوالوں پر نظر ڈال لیجیے،

پہلا حوالہ علامہ کے ایک خط کا ہے جو انھوں نے لندن جاتے ہوئے مولوی انشاء اللہ خان

مالک وایڈیٹر وطن لاہور کے نام ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۵ء کو عدن سے لکھا تھا۔ وہ ایک یونانی سے چینیوں کی قومی سیرت اور وطن دوستی کا تذکرہ سن کر بے قابو ہو کر لکھتے ہیں:

''......ہاں! ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سر نو قائم کرنے میں تمھاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں کاش! خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔

مولوی صاحب! میں بے اختیار ہوں، لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں؟ اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے۔''

کیا علامہ اقبال کے یہ خیالات بعد میں بدل گئے تھے یا انھوں نے ان خیالات سے رجوع کر لیا تھا؟ اس بات کا کوئی سراغ ہمیں نہیں ملتا۔

۲۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے زمیندار (لاہور) میں ایک نظم چھپوائی پنڈت مدن موہن مالویہ اور گاندھی جی کے خیالات کو پیش کیا ہے اور تحریک ترک موالات کے پس منظر میں پنڈت مالویہ کے مقابلے میں گاندھی جی کو پر وقار شخصیت کا مالک اور مرد پختہ کار، حق اندیش اور باصفا قرار دیا ہے اور ان کے جواب کو جو انھوں نے پنڈت جی کو دیا تھا ''قول حق وسدید'' قرار دیا ہے:

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کم زور کی کمند ہے دنیا میں نارسا
نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
گاڑھا ادھر ہے زیب بدن اور ادھر زرہ
صرصر کی رہ گزار میں کیا عرض تو تیا
پس کر ملے گا گرد رہ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما
بولا یہ بات سن کے کمال وقار سے

وہ مرد پختہ کار و حق اندیش وبا صفا
خارا حریف سعی ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ ایست در بن دنداں خلال را

زمیندار۔ لاہور، ۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء

اگر گاندھی جی، نہرو خاندان، یا کسی اور رہنما کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات میں کوئی تبدیلی آگئی ہو تو جائے تعجب نہیں۔ ترک موالات کے پروگرام کے خاتمے کے اعلان سے کتنے ہی کانگریسیوں اور قومی خیالات رکھنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کو گاندھی سے اختلاف تھا اور اس کے بعد گاندھی جی چھبیس سالہ زندگی میں اور پنڈت نہرو کی تقریباً چوالیس سالہ زندگی میں ان کے قریبی دوستوں اور ہم سفروں کو اختلافات پیدا ہوئے۔ خود حضرت مدنی نے کانگریس کے بیسیوں منصوبوں اور تجویزوں سے اور گاندھی جی اور نہرو کے خیالات سے اختلاف کیا تھا۔ لیکن جب وہ ان فیصلوں اور خیالوں میں ان سے متفق تھے تب بھی انھیں ''مرد پختہ کار و حق اندیش و با صفا'' نہیں کہا تھا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں علامہ اقبال نے قوم پرستانہ خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ یہ بات بھی حقیقت سے بعید ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے مجموعہ ہائے کلام بانگ درا (۱۹۲۴ء)، جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) اور ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) خود ہی مرتب کیے اور چھپوائے تھے۔ کسی اور نے نہیں، ان میں خیالات کی تبدیلی کا کہیں کوئی اشارہ نہیں، پھر کیسے یہ بات کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم یہاں علامہ اقبال کے ایک عقیدت کیش اور ان کے افکار پر محققانہ نظر رکھنے والے خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی فاضلانہ رائے پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں کا یہ خیال کہ آخری دور میں وطن کی محبت اقبال کے دل سے نکل گئی تھی، بالکل باطل ہے۔ ہندوستان اور اس کے رہنے والوں کے ساتھ اس کا قلبی رشتہ آخر تک نہیں ٹوٹا۔ اقبال ہندوستان کی زبوں حالی اور غلامی پر آخر تک آنسو بہاتا رہا......''

یہ اقبال کی شاعری کا ایک اور اہم اور دل چسپ پہلو ہے جس کی طرف خلیفہ عبدالحکیم نے اشارہ کیا ہے، جسے بہ قول عتیق صدیقی اقبال کو اسلامی شاعر کہنے والے یکسر نظر انداز کرتے رہے ہیں (اقبال.... جادوگر ہندی نژاد۔ ص ۲۲۔ ۱۲۱) خلیفہ مرحوم لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی روحانیت نے جو برگزیدہ انسان پیدا کیے ہیں، اقبال نے

ان پر نہایت خلوص فراخ دلی اور وسیع المشربی سے نظمیں لکھی ہیں..... "بابا گرو نانک پر اقبال کی ایک مستقل نظم ہے۔ جو اس وقت لکھی گئی تھی، جب وہ زیادہ تر اسلامی نظمیں لکھ رہے تھے۔ اس نظم کے پہلے شعر میں گوتم بدھ کو بھی پیغمبر قرار دیا ہے،

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

...... بانگ درا میں بڑے خلوص کے ساتھ شری رام چندر جی کی توصیف میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ اقبال ان کو ہندستان کا امام یا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں......

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند

(فکر اقبال۔ از خلیفہ عبدالحکیم، ص ۴۸، ۵۲، ۵۳)

اقبال نہایت ذہین، بلند فکر، وطن پرست اور صاحب اخلاص شخص تھے۔ لیکن وہ ایک غریب باپ کے بیٹے اور معمولی خاندان کے فرد تھے اور ان کے اپنے بیان کے سوا کوئی دوسری شہادت موجود نہیں کہ ان کا تعلق کشمیر کے کسی برہمن خاندان سے تھا۔ ان کے اپنے بیان کی صحت پر بھی شبہ کیا گیا ہے۔ یہ احساس انھیں زندگی بھر رہا اور اپنی غربت کو دور کرنے اور سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے خیال سے وہ اپنے ذہن کو کبھی آزاد نہیں کر سکے تھے، ان کی عملی زندگی میں کمزوریوں اور حقیقی خیالات کے برخلاف بعض منظومات کی تخلیق کا واقعی پس منظر یہی ہے۔ ان میں ایثار و عزیمت کی کمی بھی تھی۔ اسی وجہ سے وہ سیاسیات میں کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت، ان کے ذوق وطن پرستی اور استعمار کے خلاف ان کے واقعی افکار کو ان کے بعض ہندوستانی اور برطانوی استعمار پسند دوست خوب سمجھتے تھے۔ وطن پرستی سے اسلام کی طرف ان کے سفر کا تعلق فکری ارتقاء سے زیادہ ان کے دوستوں میں آرنلڈ، براؤن نکلسن، سر سید امیر علی، میجر حسن بلگرامی کی معلوم رہنمائی کا نتیجہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اقبال کو اس کا احساس تھا۔ عتیق صدیقی مرحوم نے اپنی تالیف "اقبال...... جادوگر ہندی نژاد" میں بعض اہم اشارے کیے ہیں۔

اقبال نے ایک بار ترک شاعری کا ارادہ کرلیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی عملی میدان میں کام کرنے کی زیادہ ضرورت ہے:

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

لیکن مدیرِ مخزن شیخ عبدالقادر اور آرنلڈ نے اقبال کے اس خیال سے اختلاف کیا اور انھیں اس سے باز رکھا۔ آرنلڈ نے انھیں مشورہ دیا کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں تبلیغ اسلام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سیاسی میدان میں جانے سے اقبال کو روکنے کے لیے پیش بندی تھی اور یہ کہ جب مسلمان ہندوؤں میں تبلیغ کو زندگی کا مشن بنائیں گے تو ان میں مسلمانوں کے خلاف ردعمل پیدا ہوگا اور اختلاف کوئی اور کسی درجے میں بھی ہو، برٹش استعمار کے لیے بہرصورت مفید تھا۔ اقبال کے بقول آرنلڈ کو اسلام سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ صرف خاک انگلستان کا وفادار اور شہنشاہیت پسندوں کا دست و باز و تھا۔ تبلیغ اسلام کے مشورے میں اس کی اسلام دوستی کو تلاش نہ کرنا چاہیے۔ یہ مشورہ اس کی استعمار پسندی، وطن (برطانیہ) دوستی اور برٹش قوم کے ہندوستان میں مفاد کے تحفظ کے جذبۂ صادق کا لازمی اقتضا تھا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد لاہور میں بھی ان کا تعلق ایسے ہی لوگوں سے زیادہ رہا یا وہ ایسے لوگوں میں گھرے رہے جو برطانوی مفادات کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ پنجاب میں مسلم لیگ سے ان کی وابستگی بھی لندن مسلم لیگ سے تعلق کے تسلسل میں تھی۔ تفصیلی مطالعے کے لیے عتیق صدیقی کی تالیف ''اقبال...... جادوگر ہندی نژاد'' (صفحہ ۵۱ تا ۵۲) سے رجوع کرنا چاہیے۔

نہرو خاندان سے علامہ کی عقیدت:

مرزا غلام نبی خانباز نے ''کاروان احرار'' میں علامہ اقبال کی ''کشمیری عصبیت'' کے عنوان سے لکھا ہے:

''اب علامہ اگرچہ قوم پرستی سے شدید متنفر نظر آتے ہیں اور اسے اسلام اور مسلم قومیت کے لیے مہلک تصور کرتے ہیں لیکن جاوید نامہ میں انھوں نے نہرو خاندان کی قومی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جو بنیاد تلاش کی ہے وہ حد درجہ حیران کن اور استعجاب انگیز ہے۔ وہ مسلم قومیت اور قوم پرستی کو یکسر فراموش کر کے علاقہ پرستی میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں۔ کہاں وہ

وسعت نظر اور کہاں یہ عصبیت کی تنگ دامانی؟ علامہ موصوف نے اس خاندان کی استخلاص وطن کے لیے جدو جہد کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اہل ہند کو ذوق آزادی سے آشنا کرنے کا سہرا ان کے سر پر باندھا ہے جنھوں نے اپنی ذہانت، فطانت، دور رس نگاہ اور سخت محنت سے برطانوی استعمار کو متزلزل کر دیا۔ اس سے بڑھ کر ان کی اصل خوبی (حسن) یہ ٹھہرا کہ ان کا خمیر سر زمین کشمیر دل پذیر کی مردم خیز خاک سے اٹھایا گیا اور نسلی اعتبار سے وہ کشمیر کے برہمن زادے ہیں ۔ان مشترک اقدار کے سبب وہ معزز، معظم اور محبوب قرار پائے۔ جاوید نامہ میں تذکرہ کے باعث ان کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔:

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد
صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالہ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامنگیر ماست
مطلع ایں اختراں کشمیر ماست
خاک مارا بے شرر دانی اگر
بر درون خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست
ایں دم باد بہاری از کجاست
ایں ہماں باد است کز تاثیر او
کو ہسار ما بگیرد رنگ و بو"

(جاوید نامہ: لاہور، ۱۹۷۰ء (ساتواں ایڈیشن)، صفحہ ۱۹۳)

علامہ اقبال نے یہ اشعار "غنی" (کشمیری) کی زبان سے کہلائے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:
وہ کون ہے جس نے ہندوستان میں آزادی کا ذوق پیدا کر دیا ہے اور جو خود شکار ہور ہا تھا اسے شکار کرنا سکھا دیا ہے؟ یہ کارنامہ اُن زندہ دل برہمن زادوں کا ہے جن کے سرخ چہروں کو دیکھ

کر لالۂ سرخ بھی شرما جائیں۔ ان کی نگاہیں تیز ہیں، وہ پختہ کار، سخت کوش اور صاحب ہمت ہیں۔ ان کی سخت نگاہوں نے فرنگیوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کردی ہے۔ ان کا تعلق اسی مٹی سے ہے جو میرے دامن سے چمٹی ہوئی ہے۔ آزادی کے یہ پیکر اور حریت کے یہ ستارے کشمیر کے مطلع پر نمودار ہوئے ہیں۔

اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میری خاک میں آزادی کی کوئی جنگاری اور حریت طلبی کی کوئی حرارت باقی نہیں ہے تو ذرا اپنے اندر جھانک کر دیکھ۔ یہ تیرے اندر جو سوز و تپش ہے، وہ کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے اور یہ باد بہاری جو چمن میں ذوق آزادی کے پھول کھلا رہی ہے، کیوں کر پیدا ہوئی؟

یہ سب انھیں برہمن زادگان کی صحبت کا فیضان اور انھیں کے ذوق حریت پرستی سے چلنے والی باد بہاری کی تاثیر ہے کہ کشمیر کے کوہساروں میں رنگ و بو پیدا ہو گیا ہے۔''

۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء: آج حضرت شیخ الاسلام میرٹھ میں انجمن اصلاح المسلمین کے جلسے میں شرکت کے لیے پہنچے۔ انھیں اطلاع دی گئی کہ لاہور میں علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ حضرت نے یہ خبر سنتے ہی انا للہ۔ پڑھا اور رات کے جلسے میں تعزیت کی اور دعاے مغفرت فرمائی۔ مسعود حسین صدیقی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''ہماری انجمن اصلاح المسلمین کا جلسہ تھا رات مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ، کی تقریر تھی اسی دن مولانا کو جامع مسجد میرٹھ کے باہر کار سے اترتے وقت اطلاع دی گئی تھی کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حضرت نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور رات کو جلسے میں تقریر سے پہلے اس حادثے کا دلدوز انداز میں تذکرہ فرمایا اور حاضرین سے کہا کہ سب ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ چناں چہ مولانا کے ساتھ ہزاروں کے مجمع نے دعاے مغفرت کی۔ یہ بات غیر معمولی نہ ہوتی اگر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے حضرت مولانا کے خلاف قومیت کے مسئلے پر اتنے سخت الفاظ استعمال نہ کیے ہوتے۔''

(''مولانا حسین احمد مدنی۔ حیات اور کارنامے'' از ڈاکٹر رشید الوحیدی، ص ۲۵۶)

ارشاد صدر مسلم لیگ:

۲۵/اپریل ۱۹۳۸ء: ''لیگ کے قائد اعظم صاحب اپنے خطبۂ صدارت اسپیشل اجلاس مسلم لیگ کلکتہ میں کہتے ہیں:

''ہم نے نام نہاد مولاناؤں کا خاتمہ بھی بہت حد تک کر دیا ہے، جو دوسروں کی انگیخت پر قوم کے جذبات سے

کھیلتے ہیں۔" (الامان، دہلی مورخہ ۲۵/اپریل ۱۹۳۸ء بہ حوالہ مسلم لیگ کی زریں بخیہ گری (صفحہ ۱۰) از مولانا محمد میاں قادری برکاتی مارہری، اولادرسول)

مولانا محمد میاں نے مسٹر جناح کے اس دعوے پر سخت تنقید کی ہے اور علمائے دین کے اثرات کے خاتمے کے سخت نقصانات بھی بیان فرمائے ہیں (ایضاً صفحہ ۱۰،۱۱)

آزاد قبایل پر بمباری:

۱۶/مئی ۱۹۳۸ء: ۱۶/مئی ۱۹۳۸ء کو آرمی کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل کولرج کے ساتھ کانفرنس کے بعد تعزیری بمباری کرنے کا فیصلہ ہوا جس کو عام طور پر فضائی ناکہ بندی کہا جاتا ہے۔اس بمباری کا مقصد جس کی اطلاع ہمیشہ پہلے ہی اشتہارات کے ذریعہ کی جاتی رہی ہے، انسانی جانوں کو ہلاک کرنا نہیں تھا بلکہ چراگاہوں اور زرعی اراضی کے نقصانات کو روکنا تھا، محفوظ علاقہ میں کسی قسم کی حرکت پر فضائی حملہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایسا اقدام تھا جس سے اکثر و بیشتر مویشی ہلاک ہوجاتے تھے لیکن شاید ہی کسی انسان کی جان ضائع ہوئی ہوتی تھی۔ یہ طریقہ براہ راست جنگ کے مقابلے میں ہر صورت میں بہتر تھا۔ بمباری ۱۹/مئی کو شروع ہوئی ابتدا میں مخالفانہ ردعمل پیدا ہوا۔ اسکاؤٹس کی چوکیوں پر چھپ کر گولیاں چلائی گئیں اور ۳۰/مئی کو میران شاہ سے زرمک جانے والی بڑی سڑک کے قریب ایک لشکر جمع ہوگیا۔ صورت حال سے نپٹنے کے لیے دو بریگیڈ فوج بھیجی گئی یہ اقدام لشکر کو منتشر کرنے کے لیے کافی تھا اور کچھ وقت کے لیے معاملات پرسکون ہوگئے۔

شامی پیر:

۱۲ تا ۳۰/جون ۱۹۳۸ء: ایک خوش لباس شکل جو اپنے آپ کو شامی پیر کہتا تھا۔ اپریل میں ٹانک سے گزرا اور راستے میں اس نے پولیٹکل ایجنٹ میجر بارنس کو بتایا کہ وہ شام سے آیا ہے، جہاں اس کی جائیداد ہوا کرتی تھی، جس کو اب وہ کھو چکا ہے اور خونی جھگڑے وغیرہ طے کر کے پیسے حاصل کرنے کے لیے وہ وزیرستان آیا ہے۔ بہ ظاہر اس نے اس طرح کافی کمائی کرلی ہے۔ کیوں کہ ۱۴۔ جون ۱۹۳۸ء کو اس نے بارنس کو آٹھ سو روپے دیے کہ وہ جرمنی میں اس کی بیوی کو بھیج دیے جائیں۔ حکومت افغانستان بے انتہا مشکوک تھی۔ یہ کوئی فقیرانہ ہی کی بات نہیں تھی۔ اگرچہ بعد میں اس کے متعلق جو کہانی مشہور ہوئی، اس میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ کہانی یہ تھی کہ شامی پیر نے افغانستان کے سابق بادشاہ امان کی بھتیجی سے شادی کی تھی۔ جو ۱۹۲۶ء کی بغاوت میں اپنے تخت د

تاج سے محروم ہوگیا تھا۔ امان اللہ اٹلی میں مقیم تھا، افغانستان کے جنوبی صوبے کے لوگ ہمیشہ سے اس کے وفادار تھے۔ یہ شبہ کیا جا رہا تھا کہ پراسرار پیر مسولینی کے اکسانے پر جنوبی وزیرستان آیا ہے تاکہ محسودوں اور افغانوں کو امان اللہ کی طرف سے بغاوت پر ابھارا جائے جو برطانوی حکومت کے لیے ایسے وقت میں پریشانی اور مشکل کا باعث ہو سکتی تھی جس وقت کہ یورپ میں جنگ کے خطرات بڑھ رہے تھے ۱۵ر جون کو واضح ہوگیا کہ یہ پیر افغان حکومت کے خلاف سازش کر رہا تھا جب یہ خبر پہنچی کہ اس نے کانی گرام میں جرگہ منعقد کیا ہے اور محسود قبائل سے کہا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ وہ کابل سے غاصب کو نکال باہر کریں۔ ملاؤں تک نے اس کی حمایت کی۔

کننگھم نے فوراً ہی رزمک جانے کا انتظام کیا اور وہاں ۱۷ر جون کو بارنس نے انھیں بتایا کہ محسودوں میں بڑا ہیجان ہے لیکن وہ حکومت کے مخالف نہیں ہیں۔ وہ لوگ حیران رہ گئے کہ حکومت (جیسا کہ انھیں بتایا گیا) افغانستان میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرے گی۔ معاہدے کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے ضروری تھا کہ طاقت کے زور پر کسی لشکر کو افغانستان میں داخل ہونے سے روکا جائے اور بارنس نے محسودوں کو اس معاملے میں کسی شک وشبہ میں نہیں رہنے دیا۔ کددھا میں کئی دنوں کی کوششوں کے بعد وہ ملکوں اور خاصہ داروں کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ یہ حلف اٹھائیں کہ وہ پیر کے ساتھ سرحد پار نہیں کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی بیرون ملک یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ غاصب کو نکالنا اسلامی فریضہ نہیں ہے۔ مزید برآں پیر کے متعلق یہ شبہ بھی پیدا ہوگیا کہ کیا وہ واقعی پیر ہے۔ شامی پیر نے بارنس کو ایک دوستانہ پیغام بھیجا جس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ اس کی وجہ سے انھیں پریشانی اٹھانا پڑی اور یہ پیشکش کی کہ وہ کننگھم کو بھی یہ خط لکھنے پر تیار ہے کہ جو فتنہ وفساد ہوا اس کی ذمہ داری بارنس پر عائد نہیں ہوتی۔ جنرل کولرج اور کننگھم میں اس پر اتفاق ہوگیا تھا کہ اگر کوئی لشکر افغانستان جائے تو اس پر بمباری کردی جائے۔ ۲۴ر جون کو ایسا ہی واقعہ پیش آیا جب وانا کے نواح میں ایک لشکر کو منتشر کر دیا گیا۔ پیر نے اپنے قاصد کے ذریعے بارنس کو مطلع کیا کہ وہ ایک شرط کے ساتھ وزیرستان سے جانے کے لیے تیار ہے۔ وہ ۲۶ر جون کو وانا میں بارنس سے ملا اور اس شرط پر ۲۵ ہزار پونڈ پر معاملہ طے ہوگیا کہ لشکر مستقل طور پر منتشر ہو جائے۔ اس دن شملہ، وانا، مری اور رزمک کے درمیان ٹیلی فون مصروف رہے اور اخراجات کی منظوری دے دی گئی۔ ۲۹ر جون کو پیر کو وانا روانہ کر دیا گیا۔

جہاں اس کو چیک دیا گیا جو کننگھم نے اپنے بینک کے نام لکھا تھا۔ بعد میں یہ منسوخ شدہ چیک ان کے گراں قدر اثاثوں میں موجود رہا۔ پیر ۲۹ر جون کو دہلی اور ۳۰ر جون کو کراچی پہنچا اور ۴ر جولائی کو وہ امرائیل ایئرویز کے ذریعہ بغداد روانہ ہوگیا اور اس طرح تاریخ سے نکل گیا۔ اس کا اصل ورثہ کابل میں تلخی کی فضا تھی۔ کیوں کہ جو کچھ ہوا اس کے متعلق افغان حکام کی اپنی رائے تھی جنھوں نے الزام لگایا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے جو ناکامی ہوئی، برطانوی حکام نے پیر سے ساز باز کر رکھی تھی۔ (انگریز راج اور پشتون سیاست از احمد سلیم، ص ۴۶۔۴۵)

بہاول پور میں تبلیغ کی بندش:

۹ر جون ۱۹۳۸ء: ریاست بہاول پور میں ۱۹۳۴ء سے اصلاحات اور بعض سیاسی مطالبات کا اعادہ کیا جارہا تھا لیکن انتظامیہ ان مطالبات پر کوئی توجہ نہیں دے رہی تھی۔ ۳۶ء کے بعد ان مطالبات میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔ ۳۸ء میں انتظامیہ نے شیعہ سنی مسئلہ پیدا کر دیا اور اس کی آڑ لے کر ۹۔ جون کو ریاست کی تمام مساجد میں مذہبی تقاریر پر پابندی لگادی۔ حکم نامہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر بیرون ریاست کا کوئی مقرر تقریر کرنا چاہے تو اس کے لیے مجسٹریٹ سے اجازت لینی ضروری ہے۔ مقامی واعظین کو بھی تاکید کی گئی کہ وہ ائمہ مساجد کی اجازت سے مساجد میں تقریر کریں۔ یہ حکم دراصل مجلس احرار اسلام کو ان کے سیاسی مذہبی مساعی سے روکنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ اس حکم کے متعلق انجمن حزب اللہ کے ایک رکن مستری عبدالرحمٰن نے علماے ہند سے فتویٰ پوچھا:

''کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین مندرجۂ ذیل امور کے متعلق:

۱۔ کیا مذہبی وعظ اور تبلیغ دین پر شرط عائد کرنا شرعاً جائز ہے۔

۲۔ کیا مساجد میں مذہبی وعظ و تبلیغ کو اس طرح شرعاً بند کیا جاسکتا ہے کہ بغیر مجسٹریٹ کی اجازت سے تبلیغ دین اور مذہبی وعظ نہ کیا جائے؟

۳۔ کیا شرعاً اس حکم کو مداخلت فی الدین سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟

اس کے جواب میں مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیت علماے ہند نے کہا:

''مذہبی تذکیر و تبلیغ شرعاً آزاد اور ہر عالم کا بموجب ''بلغوا عنی ولو آیۃ ولو کلمۃ'' مذہبی حق ہے۔ اس پر کوئی قید یا بندش عائد کرنا جس کا نتیجہ انسداد تبلیغ و تذکیر ہو ایک مذہبی حق کو غصب کرنا ہے۔ پھر

مجسٹریٹ کبھی غیر مسلم بھی ہوگا جو تبلیغ وتذکیر کی ضرورت، اہمیت ونوعیت سے بے خبر ہوگا اور اس کی بے خبری حق تبلیغ کے جائز استعمال کے لیے سدراہ ہوگی۔ نیز اس قانون کے نفاذ سے تمام ایسے مقامات جو مسلمانوں کی بستیاں ہیں مگر وہاں مجسٹریٹ درجہ اول، دور دور تک نہیں قطعاً مذہبی وعظ و تبلیغ سے محروم ہو جائیں گی۔ یہ تمام وجوہ اس قانون کے غلط اور اسلامی احکام کے خلاف ہونے کے شواہد ہیں اور اسلامی ریاست کی طرف سے یہ بات سخت افسوسناک ہے''۔

اس فتویٰ پر مولانا حسین احمدؒ مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند اور مولانا مسعود احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند نے بھی ''الجواب صحیح'' لکھ کر دستخط کیے ہیں۔'' (کاروان احرار: ج ۴، ص ۷۳، ۷۴)

لیگ اور کانگریس....اشتراک وتعاون کی بنیاد:

۹ر جون ۱۹۳۸ء: حاجی سلیمان کریم محمد صاحب (بمبئی) نے دریافت کیا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں آزادی کی جدوجہد کے لیے کس کے ساتھ اشتراک وتعاون کیا جائے؟ حضرت مفتی صاحب نے اور ان کے نائب مفتی نے الگ الگ جواب تحریر کیے، جو یہ ہیں:

(از مولوی حبیب المرسلین نائب مفتی)

''ان دو جماعتوں میں سے جس جماعت کی کوشش کو آزادی وطن کے لیے زیادہ مفید بظن غالب جانے گا تو اسی جماعت میں شریک ہونا اس کے لیے افضل ہوگا۔'' فقط واللہ اعلم۔ حبیب المرسلین عفی عنہ نائب مفتی مدرسۂ امینیہ دہلی۔

(از حضرت مفتی اعظمؒ)

''اپنے حقوق طبعیہ کی حفاظت کے ساتھ برطانوی شہنشاہیت کے خلاف جنگ کرنے میں جو جماعت عملی اقدام کرتی ہو اس میں شرکت مفید اور مناسب ہے۔''

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

تبرّیٰ ومدح صحابہ پر پابندی:

۲۷ر جون ۱۹۳۸ء: محمد مسیح صاحب (اعظم گڈھ) نے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو لکھا تھا:

(۱) ''کانگریس منسٹری نے صوبہ یوپی میں مدح صحابہ بند کر رکھا ہے نیز شاردا بل کو نافذ کر دیا ہے۔

(۲) بہار میں متعدد مقامات پر گائے کی قربانی کو بند کر دیا ہے۔

(۳) صوبہ سرحد میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے خالص دینی رسالوں کی تعلیم موقوف کرا دی ہے۔

کیا یہ امور مداخلت فی الدین میں داخل ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو ایسی حکومت کو تقویت پہنچانا ازروئے شریعت جائز ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور ایسی صورت میں کانگریس میں شریک ہونا اور اس کا ممبر بننا اور بنانا جائز ہو سکتا ہے؟''

حضرت مفتی صاحب نے اس کا یہ جواب دیا:

اگر یہ واقعات صحیح ہوں تو کانگریس کی حکومت کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ انگریزی حکومت کی ہوگی اور اس کی کونسلوں اسمبلیوں میں شریک ہونے کا حکم وہی ہوگا جو انگریزی حکومت کی کونسلوں اسمبلیوں میں شریک ہونے کا تھا اور دیکھنا یہ پڑے گا کہ اس کے بالمقابل بہتر حکومت قائم کرنے کی عالم وجود میں صورت کیا ہے اور اس کے ذرائع ممکن الحصول ہیں یا نہیں؟ فقط۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسایت)

سوالات جس ذہنیت کے غماز ہیں، صاف ظاہر ہے۔ اس میں مسلم لیگ کے پروپیگنڈے اور پیرپور کمیٹی کے اعتراضات صاف معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر کانگریسی حکومت نے مدح صحابہ کو بند کرا دیا تھا تو اس لیے کہ مدح صحابہ تحریک تبرا کے جواب میں تھی تبرائی بندش کے بعد اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ شاردا بل انگریزی حکومت کے دور میں مسٹر محمد علی جناح کی تائید وحمایت سے پاس ہوا تھا اور ۱۹۴۷ء تک جاری رہا اگر مسلم لیگ اور جناح صاحب کے نزدیک بھی وہ غلط تھا تو کسی لیگی ممبر کے لیے تو اسمبلی میں اس کی تنسیخ یا اس میں ترمیم کے لیے کوئی بل پیش کرنے کی ممانعت نہ تھی اور جن صوبوں میں مسلم لیگ کی حکومت تھی وہاں تو انھیں اس کی تنسیخ کا کامل اختیار تھا۔ وہاں انھوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟

گائے کی قربانی کی بندش پچاسوں شہروں میں انگریزی حکومت کے زمانے سے تھی۔ مسلم

لیگ نے کہیں اور کبھی لس کے خلاف تحریک نہیں چلائی، مسلم لیگ نے شریعت بل، خلع بل، قاضی بل کے پاس ہونے میں خود رکاوٹیں پیدا کیں اور جس حد تک جو پاس ہوئے تو لیگی ارکان کی طرف سے ان میں اتنی ترمیمات ہوئیں کہ ان کے بعد ان کی اسلامی افادیت ختم ہوگئی۔ سول میرج کا بل پاس کرانے اور ایکٹ بنوانے میں سب سے زیادہ حصہ مسٹر محمد علی جناح کا تھا۔

دینی رسائل کے سرکاری اسکولوں کے نصاب سے اخراج کا الزام سرحد کی کانگریسی حکومت پر ہے۔ اگر اس حکومت نے بے دینی اور اسلام دشمنی کا یہ عمل انجام دیا تھا تو جب ڈاکٹر خان کی حکومت برطرف کر کے انگریز نے جہاں زیب کی لیگی حکومت بنوادی تھی تو فوراً کانگریسی حکومت کے فیصلے کو کالعدم قرار دے کر ان دینی رسائل کو پھر نصاب میں داخل کر دیا جاتا؟ پھر کیا لیگی حکومت نے سرحد میں یہ اسلامی خدمت انجام دی تھی؟ اور دین کو مداخلت سے محفوظ کر دیا تھا؟

شاردا ایکٹ کے سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا تعلق مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی یا وائسرائے کی کونسل سے تھا۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس وزارتیں صوبوں میں قائم ہوتی تھیں، کسی بل کی تنسیخ یا اس میں ترمیم کا حق کسی صوبائی حکومت کو حاصل نہ تھا۔ اور اگر ایسا تھا تو بنگال، سندھ میں لیگی وزارتوں کے زمانے میں یہ کارنامہ انجام دے لیا ہوتا۔ اس لیے کہ صوبوں میں جو اختیارات کانگریسی وزارتوں کو حاصل تھے۔ ٹھیک وہی اختیارات بعض صوبوں میں لیگی حکومتوں کو حاصل تھے۔

محمد ابراہیم صاحب (فورٹ بمبئی) نے دریافت کیا تھا:

۴؍جولائی ۱۹۳۸ء: (۱) شیعہ مسلمان ہیں یا نہیں؟ (۲) مسٹر محمد علی جناح کی سیاسی متابعت شرعاً مسلمان کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ (۳) مہاتما گاندھی کی سیاسی متابعت شرعاً مسلمان کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحب نے اس کا یہ جواب دیا:

(۱) شیعہ اسلامی فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے لیکن اہل سنت والجماعۃ فرقۂ ناجیہ ہے اور باقی تمام فرقے ناجیہ نہیں ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے موافق شیعوں کے کئی فرقے اسلام سے خارج ہیں۔ یہ فرقے فرقۂ شیعہ کی ضمنی شاخیں ہیں باوجود اس کے ادعائی طور پر وہ فرقہ

ہا ے اسلام میں داخل سمجھے جاتے ہیں ان کا حکم اہل کتاب کی طرح ہے کہ وہ باوجود کفریہ عقائد کے (مثلاً الوہیت مسیح یا ابنیت مسیح کے) دوسرے غیر کتابی کفار سے جداگانہ حکم رکھتے ہیں۔

(۲و۳) مسلمانوں کا سیاسی رہنما مسلمان متبع شریعت، احکام الٰہیہ کا پابند ہونا چاہیے لیکن اگر کوئی ایسا شخص بدقسمتی سے موجود نہ ہو یا مسلمان اپنی بدقسمتی سے اس کو پہچاننے اور مقتدا بنانے سے غافل ہوں تو پھر کسی سیاسی مدبر کی سیاست میں اتباع کر لینا مباح ہوگا خواہ وہ جناح ہوں یا گاندھی بشرطے کہ ان کی سیاسی رہنمائی کی صحت اور افادیت کا یقین ہو۔ اس کی اصل الضرورات تبیح المحظورات اور نظیر انگریزی حکومت کی متابعت ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

بنوں، ۲۳/ جولائی ۱۹۳۸ء: کو ایک سنگین واقعہ پیش آیا جب ایک قبائلی گروہ بدنام غنڈے ہردل کی قیادت میں غروب آفتاب کے وقت شہر میں گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔ جو متعدد ہندو ہلاک کر کے اور لوٹ مار کر کے فرار ہوگیا۔ یہ گروہ اتنا بڑا تھا کہ اس پر لشکر کا گمان ہوتا تھا اور اگست کے اوائل میں یہ ضلع بنوں میں موجود تھا۔ قبائلی ذمہ داریوں کے متعلق احمد زئی قبیلے کے وزیروں سے حسب معمول تلخ مذاکرات ہوئے جن میں کوئی خاص پیش رفعت نہ ہو سکی۔

واردھا تعلیمی اسکیم:

۳/ اگست ۱۹۳۸ء: واردھا میں کانگریس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں ملک کے تعلیمی نظام کی ترتیب کے لیے ایک تعلیمی کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کی رپورٹ شائع ہوگئی تھی جس کا نام ''بیسک نیشنل ایجوکیشن'' تھا لیکن عام طور پر واردھا تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی۔ جمعیت علماء کی مجلس عاملہ نے اپنے ۳/ اگست کے اجلاس دہلی میں اس اسکیم پر غور کرنے اور اس کے قابل تنقید پہلوؤں کے بارے میں راے دینے کے لیے ایک سب کمیٹی مقرر مقرر کی اس کی ارکان مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا نور الدین بہاری کو اور اس کا کنوینر مولانا احمد سعید دہلوی کو مقرر کیا گیا ہے اور درخواست کی گئی ہے کہ وہ مجلس عاملہ کے آئندہ جلسے میں اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔

ودیا مندر اسکیم:

اسی زمانے میں حکومت سی پی نے اپنے صوبے کے لیے ایک تعلیمی اسکیم بنائی تھی۔ ہندی

زبان میں جس کا نام ''ودیا مندر اسکیم'' تھا اور اس کے ساتھ اردو میں اس کا نام ''بیت العلم'' تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن لیگی اخبارات نے ''ودیا مندر'' کے لفظ کو اچھالا اور ایسا تاثر دیا کہ گویا یہ اسلامی تعلیم و تہذیب کے خلاف ایک سازش ہے۔ ۳؍اگست کے مجلس عاملہ کے اجلاس دہلی میں اسی تاثر کے تحت ایک قرارداد پاس کی گئی، جس میں کہا گیا تھا کہ عام قومی تعلیم گاہوں کے لیے ودیا مندر کا نام ایسا ہے، جس سے خاص ایک فرقے کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ اس لفظ کو جلد از جلد تبدیل کر کے ایسا نام تجویز کیا جائے جو تمام ہندوستانیوں کے لیے یکساں قابل قبول ہو۔''

۱۱؍اگست ۱۹۳۸ء: محمد حنیف (دہلی) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

(۱) ''کانگریس کے عقائد ظاہر ہے کہ اسلامی عقاید نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ خالص مسلمانوں کی جماعت نہیں ہے اس میں مختلف مذاہب اور مختلف عقاید کے لوگ شریک ہیں۔ رہی پالیسی سیاسی تو وہ بھی مشترک پالیسی ہو سکتی ہے۔

(۲) کانگریس اسلامی حکومت تو قائم کرنا نہیں چاہتی، نہ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے اور نہ موجودہ حالات میں کوئی دوسری جماعت یہ مقصد پیش نظر رکھتی ہے۔

(۳) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ کانگریسی حکومتیں اسلامی سیاسیات و تعلیمات کے مطابق ہیں مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ انگریزی حکومت کا اقتدار اسلامی اور مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے یا کانگریسی حکومت کا بشرطے کہ انگریزی طاقت کمزور ہو جائے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۱۹؍اگست ۱۹۳۸ء: وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا کہ مسٹر جناح نے اس تجویز پر اپنی بات ختم کی کہ مرکز کو جوں کا توں ہی رہنے دیا جائے یعنی انتخاب نہ کرائے جائیں۔ اختیارات غیر ملکی حکمرانوں کے پاس رہیں اور ہندوستانیوں کو نہ سونپے جائیں۔ مسٹر جناح کی یہ سوچ اس لیے پیدا ہوئی کہ صوبوں کے بعد مرکز میں بھی مسلم لیگ کو صوبوں جیسی صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا اور اس صورت میں اس کے مسلمانوں کے ترجمان ہونے کے دعوے بالکل بے بنیاد ہو کر رہ جاتے۔ لہٰذا انھوں نے انتخاب سے گریز کی پالیسی اختیار کی۔

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست از محمد فاروق قریشی، ص ۱۷۰)

۱۹۳۷ء کے انتخاب میں مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کی پارٹی پوزیشن یہ تھی:

۵۔ بلوچستان کو صوبے کی حیثیت ہی حاصل نہ تھی۔ برطانوی حکومت کے زیر انتظام تھا۔ اس لیے وہاں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔

سر عبداللہ ہارون نے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کو ایک تار بھیجا ہے۔ اس میں مسٹر جناح کی طرح کہا ہے کہ انگریز یہیں رہیں۔ اختیارات ہندوستانیوں کو نہ سونپے جائیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ مسلم قوم میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے، اس پر محمد فاروق قریشی نے ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

''گویا مسلمان آزادی کے خواہش مند نہیں تھے اور غلامی کی زنجیروں سے مفاہمت کر لی تھی۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑی گالی اور کیا ہو سکتی ہے؟ جنھوں نے جلیانوالہ باغ میں اپنا خون بہایا۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں جوش و جذبہ سے حصہ لیا اور جیلوں میں گئے، برطانوی استعمار سے لڑے، پھانسی کے پھندے کو گلے کا ہار بنایا، جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں اپنا عہد شباب قربان کر دیا، ماں باپ، بہن بھائیوں، بیوی بچوں اور عزیز و اقارب کی جدائی برداشت کی، یہ سب کس لیے تھا؟ انگریزوں کو سرزمین ہندوستان سے نکالنے کے لیے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا یا اس سے مقبولیت کی بو آتی ہے؟ مسلمانوں میں انگریزوں کی مقبولیت کا دعویٰ ہوا خواہان تاج برطانیہ اور خطاب یافتہ ہی کر سکتا ہے کوئی غیرت مند اور خوددار مسلمان جس کے سینہ میں ایمان کی معمولی رمق بھی باقی ہے جو آزادی کی لذت سے آشنا ہے۔ اس قسم کا شرم ناک دعویٰ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ دراصل انگریزوں نے اپنے گماشتوں کو مسلمانوں کا لیڈر بنا کر مسلم قوم کے سروں پر مسلط کر رکھا تھا ان کا وظیفۂ حیات اپنے آقاؤں کی خدمت گذاری تھا۔ مسلم قوم کے مفادات کی نگہبانی اور حفاظت سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ یہ حضرات تو مسلمانوں کے گلے میں برطانوی غلامی کی زنجیروں کو مستحکم بنانے میں مصروف تھے آزادی اور حریت کی تحریکوں کے سخت مخالف تھے۔'' (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ۱۷۱۔۱۷۰)

اگست ۱۹۳۸ء: ۱۹۳۷ء میں الیکشن کی آمد آمد کے موقع پر مسلم لیگ نے جمعیت علماے ہند کا تعاون حاصل کیا تھا۔ الیکشن کے بعد مسلم لیگ نے جو پالیسی اختیار کی اس میں اسے جمعیت کے تعاون کی ضرورت باقی نہ رہی۔ مولانا حسین احمد مدنی کا وجود گرامی لیگ کے من مانی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ اسے دوبارہ رجعت پرستی کے راستے پر چلنے نہ دیں گے اور اس کے

بر ہر فیصلے میں رکاوٹ بنیں گے اور جب خبریں عوام تک پہنچیں گی تو لیگی رہنماؤں کے خلاف بد گمانیاں پھیلیں گی۔ اس لیے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ۱۹راگست ۱۹۳۸ء کو مسٹر محمد علی جناح نے شملہ سے ایک بیان جاری کیا، جس میں مولانا مدنیؒ کی ۱۵راگست کی تقریر غازی آباد کے حوالے سے مرحوم پر الزام تراشی کی۔ خاص بات یہ ہے کہ ۱۵راگست یا اس کے قریب کی تاریخوں میں مولانا کا غازی آباد میں تقریر کرنا تو درکنار وہاں کا سفر ہی نہ کیا تھا۔ غلط فہمی دور کرنے کے لیے مولاناؒ نے ایک بیان جاری فرمایا جو اسی زمانے میں مدینہ بجنور میں شائع ہوا۔ اس جوابی بیان کو بہانہ بنا کر حضرت مولانا کو مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ سے خارج کر دیا گیا۔ کاروان احرار (جلد سوم) کے مولف مرزا جاں باز مرحوم لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیت علماے ہند اور قائد اعظم محمد علی جناح کے درمیان بیانات کے بعد ۱۵راکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ سے خارج کر دیا۔ ان کے ساتھ ہی راجہ سلیم پور بھی مسلم لیگ سے نکال دیے گئے۔'' (صفحہ ۱۶۸)۔

کاروان احرار (جلد سوم) میں مدینہ بجنور کے حوالے سے مسٹر جناح کا یہ بیان اور اس کے جواب میں مولانا مدنی ﷺ کا بیان بھی درج کیا گیا ہے۔ جو یہ ہیں:

شملہ، ۱۹راگست مسٹر محمد علی جناح نے مولانا حسین احمد مدنی کی ایک تقریر کے سلسلے میں جو اخر الذکر نے ۱۵راگست کو غازی آباد میں کی تھی، ایک بیان میں کہا:

''مولانا حسین احمد کے متعلق میں نے سنا ہے کہ انھوں نے اپنی اس تقریر میں کہا کہ عام انتخابات کے موقع پر ہم نے مسلم لیگ کی اس لیے مخالفت نہ کی تھی کہ اس وقت ہمیں مسٹر جناح نے یقین دلایا تھا کہ مسلم لیگ کی پالیسی اب بدل گئی ہے اور مسلم لیگ اب آزادی کامل کی حامل ہے۔ لیکن انتخابات ختم ہونے کے بعد جب مسٹر جناح نے ہی یہ کہا، کہ وہ گفتگو محض ایک سیاسی چال تھی، تو ہماری آنکھیں کھل گئیں۔''

مسٹر جناح نے اپنے بیان میں کہا:

''مولانا حسین احمد کا یہ بیان سرتا پا غلط ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جمعیت علماے ہند کے بعض ارکان کیوں مسلم لیگ کے ساتھ مل گئے تھے اور لیگ کے امیدواروں کی انھوں نے کیوں تائید اور حمایت کی تھی اور پھر فوراً ہی وہ کیوں الگ ہو گئے۔ میرے لیے یہ ایک پراسرار معمہ ہے، جسے میں حل نہیں

کر سکا۔"

اس کے جواب میں مولانا حسین احمد مدنی کہتے ہیں:

مذکورہ بالا بیان دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے لیے یہ تمام بیان ایک مایوس کن چیستان ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ مسٹر جناح اور ان کے مراسلہ نگاروں کی قوت حافظہ بالکل بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اور شدت ماؤفیت کی بناء پر وہ صحیح حالات کے انکشاف کے خوف سے بھٹکتے جاتے ہیں یا جان بوجھ کر یہ سب اس یورپین ناپاک پروپیگنڈے کے تحت عمل میں لایا گیا ہے، جس کی مشق اہل لیگ الیکشن کے ختم ہونے کے بعد سے برابر کر رہے ہیں۔ واقعات ذیل ملاحظہ ہوں:

الف: ۱۴، ۱۵، ۱۶ اگست کو میں دیو بند ہی میں مقیم رہا، کہیں باہر نہیں گیا۔ پھر غازی آباد میں میری تقریر ۱۵۔ اگست کو کس طرح ہوئی؟

ب: کئی سال سے غازی آباد میں مجھے کسی سیاسی یا مذہبی تقریر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہاں کے متعدد حضرات کے تقاضوں کے باوجود، آج تک مجھ کو وہاں تقریر کرنے کا موقعہ ہی نہیں مل سکا۔ پھر اس افترا کے کیا معنی ہیں؟

ج: بے شک ۱۲ اگست کو نابل ضلع میرٹھ سے واپسی پر میں غازی آباد ہوتا ہوا، دیو بند آیا تھا۔ مگر وہاں اس وقت اتنا موقعہ ہی نہ تھا کہ کوئی تقریر کی جاتی۔

د: غازی آباد کے علاوہ مختلف مقامات پر مجھ سے پوچھا گیا کہ تو کیوں لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں الیکشن کے زمانے میں شریک ہوا، اور کیوں آج علاحدہ ہے؟ تو میں نے یہ جواب ضرور دیا کہ ہمیں مسٹر جناح نے یقین دلایا تھا کہ ہم رجعت پسند اور خود غرض لوگوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ بنا بریں ہم چاہتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ایسے عناصر کو لیگ سے خارج کر دیں اور آزاد خیال، ترقی پسند، قومی اور مخلص لوگوں کی بھرتی کثرت سے کر کے ان کی آواز کو قوی کر دیں۔ (یہ الفاظ یا ان کے ہم معنی جواب میں ہمیشہ کہے گئے۔

ہ: میں نے کبھی اور کسی مجلس میں وہ جواب نہیں دیا، جو کہ مسٹر جناح کو ان کے مراسلہ نگاروں نے پہنچایا ہے کہ مسلم لیگ کی پالیسی اب بدل گئی ہے اور مسلم لیگ اب آزادی کامل کی حامی ہے۔ مجھ کو بخوبی معلوم ہے کہ مکمل آزادی کا نصب العین باہزار دقت اگست ۱۹۳۶ء میں لکھنو کے اجلاس میں پاس ہوا تھا۔ اگرچہ عرصہ سے بہت سے غیور اور انتہا پسند مسلمان اس کے لیے کوشاں تھے، مگر

کامیاب نہ ہوئے تھے۔ اس وقت سے پہلے تو لیگ کا ''فل ریسپانسبل گورنمنٹ'' ہی (نصب العین) تھا، جو کہ صرف داخلی آزادی تک ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

بے شک مسٹر محمد علی جناح نے نہایت زوردار الفاظ اور طریقوں سے ہم کو اطمینان دلایا کہ رجعت پسند طبقے اور خود غرض لوگوں کو ہم آہستہ آہستہ لیگ سے نکالیں گے اور آزاد خیال، قوم پرست مخلص لوگوں کی اکثریت کی کوشش کریں گے اور ایسے ہی لوگوں کے انتخاب کو عمل میں لائیں گے۔

ہم نے بعد بحث و مباحثہ اس پر اطمینان کیا اور تعاون پر آمادہ ہو گئے۔ جس کی زوردار خواہش مسٹر محمد علی اور ان کے رفقا کی اس وقت تھی۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ الیکشن ختم ہو جانے کے بعد ہی جب کہ لکھنو میں بورڈ کی پہلی میٹنگ ہوئی تو مسٹر محمد علی جناح نے اپنے تمام وعدوں کو بھلا دیا اور انتہائی جدوجہد فرمائی کہ ایگریکلچرسٹ پارٹی اور انڈیپنڈنٹ پارٹی کو لیگ میں شامل کر لیا جائے۔ حال آں کہ ایام الیکشن میں ان پارٹیوں کے ساتھ سخت مقابلہ کرنے کی نوبت آچکی تھی۔

دوران بحث جب کہ مولانا محمد میاں صاحب فاروقی الہ آبادی اور مولانا اسماعیل صاحب سنبھلی نے مسٹر جناح کو وعدہ ہائے سابقہ یاد دلائے، تو جواب میں فرمایا کہ وہ سیاسی وعدے تھے۔

مسٹر جناح فرماتے ہیں کہ ''۱۹۳۶ء میں جمعیت علماء کے بعض ارکان کیوں مسلم لیگ کے ساتھ مل گئے اور لیگ کی امیدواروں کی کیوں انھوں نے تائید و حمایت کی تھی اور پھر فوراً ہی وہ کیوں لیگ سے الگ ہو گئے، میرے لیے خود یہ ایک پراسرار معمہ ہے، جسے میں حل نہیں کر سکا''، انتہائی تعجب خیز اور حیران کن ہے۔

کیا مسٹر جناح اور ان کے رفقاے کار مندرجۂ ذیل امور کا انکار کر سکتے ہیں؟

الف: کیا یہ واقعہ نہیں کہ خود مسٹر جناح، مولانا شوکت علی، چودھری عبدالمتین، چودھری خلیق الزمان، نواب اسماعیل خاں وغیرہ حضرات مارچ ۱۹۳۶ء سے آیندہ الیکشن کے لیے بورڈ وغیرہ بنانے میں بے قرار نظر آتے تھے۔ جلسے اور اجتماعات اس کے لیے کیے جاتے تھے اور ان میں غور کیا جاتا تھا کہ کس طرح اس میں حسب منشاء کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، اور جس طرح یونٹی بورڈ میں کوشش کر کے جمعیت علماء کو داخل کیا گیا تھا، ان کی مختلف جماعتوں میں صلح کرائی گئی تھی۔ اسی طرح آیندہ بورڈ کے لیے ان کی امداد و اعانت حاصل کرنے کی مساعی کی جاتی تھیں، جس کی بڑی وجہ یہ

تھی کہ مسلم عوام پر جمعیت کے ارکان کا اثر تھا۔

ب: کیا یہ واقعہ نہیں کہ مسٹر جناح نے اراکین یونٹی بورڈ کو مشورہ دیا کہ وہ زیر قیادت مسلم لیگ مشترک بورڈ بنائیں، جو کہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیت علماء، خلافت کمیٹی، مجلس احرار وغیرہ سب پر حاوی ہو۔ اس کے لیے خصوصی جلسے کیے گئے اور اراکین جمعیت کو بار بار بلایا گیا اور تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئی اور انتہا پسند جماعتوں اور اشخاص کو متحد العمل بنانے اور لیگ میں شامل کرنے کی سعی بلیغ کی گئی۔

ج: کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ کہ دو یا تین اجتماع کے بعد قرار پایا کہ حسین احمد کو بلایا جائے اور اس کو اس مفاہمت میں شریک کیا جائے اور باوجودے کہ بعض رجعت پسندوں نے یہ کہا کہ سب کے ساتھ اشتراک عمل کر سکتے ہیں، مگر حسین احمد کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کر سکتے، تاہم مجھ کو تار دے کر ملتان سے (جب کہ میں وہاں بعض جلسوں میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا) بلایا گیا؟

ہ: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ملتان سے میرے دہلی پہنچنے پر اراکین جمعیت کا اجتماع مسٹر جناح کے کمرے میں جب کہ وہ نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، کرایا گیا؟ جس میں حسب ذیل لوگ شریک تھے۔

مولانا کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماء، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علماء، مولانا سجاد احمد نائب امیر شریعت بہار، مولانا عبدالحلیم صدیقی اور راقم الحروف۔

و: کیا یہ واقعہ نہیں کہ صبح کو تقریباً آٹھ بجے سے دس بجے تک تبادلۂ خیالات اور گفت و شنید ہوتی رہی اور مسٹر جناح نے زور دیا کہ پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو کر آپ لوگوں کو الیکشن میں حصہ لینا اور عمدہ سے عمدہ آزاد خیال لوگوں کو امیدوار اور کامیاب بنانا چاہیے۔ آپ لوگ اس وقت جب کہ آرڈیننس ایکٹ موجود ہے۔ دوسری کوئی صورت ملکی خدمات کی بجز اس کے نہیں کہ آزاد خیال قومی لوگوں کو الیکشن میں کامیاب بنائیں اور ان کو اسمبلیوں کے لیے منتخب کریں۔ اس پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی؟

ز: کیا یہ واقعہ نہیں کہ اراکین جمعیۃ نے جب یہ عذر کیا کہ ہمارا نصب العین کامل آزادی ہے۔ اور لیگ کے اراکین میں بہت سے رجعت پسند اور خود غرض لوگ ہیں۔ وہ برطانیہ کے ازلی وفادار اور صرف ڈومینین اسٹیٹس تک چلنے والے ہیں۔ ہمارا، ان کا اجتماع کیسے ہو سکتا ہے؟ اس پر مسٹر جناح نے پرزور طریقے سے فرمایا کہ مولانا ہر شخص کامل آزادی ہی کا عقیدہ رکھتا ہے۔ مگر مصلحت

وقت کی بنا پر زبان پر نہیں لاتا۔ کامل آزادی دینے سے نہیں حاصل ہوتی۔ وہ صرف دھکیل دینے سے ہی حاصل ہوگی۔ ہم بورڈ میں اکثریت قومی آزاد خیال مسلمانوں کی رکھیں گے۔

ح: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسٹر جناح نے اسی مجلس اور اس سے پہلے کی مجالس میں نہایت زور دار الفاظ میں وعدہ کیا تھا کہ ہم مرکزی بورڈ اور صوبجاتی بورڈوں میں صرف آزاد خیال قومی لوگوں کی اکثریت رکھیں گے۔ ہم خود اس رجعت پسند طبقہ سے تنگ آ گئے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ آہستہ آہستہ ان میں سے ایک ایک کو لیگ سے خارج کر دیں۔

ط: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خود مسٹر جناح نے مرکزی بورڈ کے چھپن (۵۶) ممبروں میں سے بیس ممبر صرف جمعیۃ علماء اور دو احرار کے چنے تھے، جن میں صدر جمعیۃ علماء، ناظم صاحب اور میں بھی تھا۔

ط: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مرکزی بورڈ کی ان آسامیوں میں ان ارکین جمعیت اور احرار کا نام خود چن کر، جب کہ وہ کشمیر میں تھے شائع کرایا اور پھر لاہور کے اجلاس میں دعوتی خطوط بھیج کر سب کو بلوایا۔

ی: کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ کہ میری اور صدر و ناظم جمعیۃ علماء کے یہ نام چن لیے گئے تھے۔ اور پھر میرا نام بلا میری خواہش صوبہ یوپی کی مجالس میں بھی چن لیا گیا اور باوجود ہر قسم کی مشکلات اور اعذار کے مجھ پر کام کرنے اور ہر امیدوار کے حلقے میں جانے کا حکم دیا گیا، جس کو میں نے بغیر کسی قسم کے لالچ و نفع مالی کے انجام دیا۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ دارالعلوم سے چھوڑ کر کام کرنا پڑا اور مدرسہ سے بلا معاوضہ رخصت لینا پڑی۔

محترم صدر مسلم لیگ مسٹر جناح سے جو ابتدائی گفتگو ہوئی، اس کو سن کر معمولی تعلیم کا آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا، کہ اراکین جمعیت بلا اطمینان کیے امیدواران مسلم لیگ کی تائید کے واسطے تیار ہو گئے تھے۔

صورت واقع یوں پیش آئی کہ ۲۹ر مارچ ۱۹۳۶ء کو جب کہ جمعیت علماء صوبہ دہلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ انہی تاریخوں میں مسلم یونٹی بورڈ کا اجلاس بر قیام گاہ سید مرتضیٰ بہادر ایم ایل اے آف مدراس شروع ہوا۔ سب سے پہلے اس مسئلے پر غور کیا گیا کہ چوں کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق الیکشن ہوں گے لہٰذا مسلم یونٹی بورڈ کی شاخیں صوبہ وار اور ضلع وار کس طرح قائم کی جائیں، تاکہ ہر جگہ سے امیدوار کھڑے کیے جا سکیں۔ چوں کہ مسلم یونیٹی بورڈ کی

ترکیب مختلف جماعتوں کے نمائندوں سے ہوتی ہے، لہٰذا جس ضلع اور صوبے میں وہ جماعت قائم نہیں ہے، وہاں کس طرح مسلم یونٹی بورڈ قائم کیا جائے۔ بہت دیر تک بحث کے بعد اس پر غور شروع ہوا کہ اس مقصد کے واسطے کوئی دوسری جماعت بنائی جائے۔ چودھری عبدالمتین (جو کہ مسٹر جناح پارٹی کے بہ منزلہ سیکرٹری تھے) نے فرمایا، کہ کسی دوسری جماعت کی ضرورت نہیں۔ مسٹر جناح مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا چاہتے ہیں، آپ بھی اس میں شریک ہو جائیں۔ اس پر نواب اسماعیل خاں صاحب، چودھری خلیق الزمان صاحب نے فرمایا کہ مسٹر جناح کا ماحول ایسا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ چودھری عبدالمتین صاحب نے فرمایا کہ جناح صاحب فرماتے ہیں کہ میں آزاد خیال امیدوار لانا چاہتا ہوں۔ اس پر کہا گیا کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے اور وہ اس جماعت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کی تائید مولانا شوکت علی نے بھی کی۔ اس پر بہت دیر تک بحث رہی۔ آخر یہ طے پایا کہ ایک وفد اسی وقت منتخب ہو جائے، جو خود جناح صاحب سے اس کی گفتگو کرے۔ چناں چہ نواب اسماعیل، مولانا شوکت علی، چودھری خلیق الزمان، سید محمد احمد کاظمی اور چودھری عبدالمتین منتخب ہوئے۔ ان حضرات نے گفتگو کی اور واپس ہو کر یہ فرمایا کہ جناح صاحب پوری جماعت کے سامنے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا اس غرض کے واسطے کل گیارہ بجے شوکت علی کی قیام گاہ پر جلسہ ہوگا۔ اور اس میں جناح صاحب بھی شریک ہوں گے۔ چناں چہ دوسرے روز وقت مقررہ پر جلسہ ہوا۔ اس وقت جس قدر حضرات شریک تھے، ان میں سے جو نام مجھ کو یاد ہیں، وہ تحریر کرتا ہوں۔

مولانا شوکت علی، جناح صاحب، چودھری عبدالمتین، نواب اسماعیل خاں، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالحامد، سید طفیل احمد منگلوری، سید محمد احمد کاظمی، مولانا منظور النبی، بشیر احمد، سید ذاکر علی، چودھری خلیق الزمان۔

ان سب کی موجودگی میں گفتگو شروع ہوئی کہ آزاد خیال حضرات کا پارلیمنٹری بورڈ کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اس دوران اولاً جناح صاحب نے ایک مفصل تقریر بھی فرمائی اور بڑی شدت سے ظاہر کیا کہ میں رجعت پسندوں سے تنگ آ گیا ہوں، اور میں ان کو بالکل علاحدہ کر دینا چاہتا ہوں۔ حتیٰ کہ خود جناح صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اس قسم کے رجعت پسند ہیں کہ میری پارٹی ہونے کے باوجود اسمبلی میں گورنمنٹ کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ تب ان سے کہا کہ جب مسلم لیگ میں اکثریت رجعت پسندوں کی ہے پھر کس طرح آزاد خیال بورڈ منتخب ہو سکتا ہے۔ اس پر

چودھری عبدالمتین نے ممبران کونسل مسلم لیگ کی فہرست پیش کی اور اس پر غور کیا کہ آزاد خیال آدمی کس قدر ہیں اور رجعت پسند کس قدر؟ بہت سے نام گنائے گئے۔ تین نام مجھ کو یاد ہیں، جن کو ظاہر کر کے بحث کی گئی۔ سر محمد یعقوب، سر محمد یامین خاں، مولوی مظہر الدین۔ خصوصیت سے جناح صاحب نے سر محمد یعقوب کو علاحدہ کرنے کو کہا۔ بہر حال یہ گفتگو ہوتی رہی کہ کیا طریقہ آزاد خیال بورڈ بنانے کا اختیار کیا جائے۔ تب یہ ظاہر کیا گیا کہ اول تو رجعت پسندوں کی جماعت وہاں زیادہ جائے گی نہیں اور پھر یہ کہ آزاد خیال آدمیوں کے جانے کی پوری سعی کی جائے۔ تب یہ بتلایا گیا کہ اکثر آزاد خیال آدمی مسلم لیگ کونسل کے ممبر ایسے ہیں، جو بمبئی جانے کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی تعداد اور مصارف کا اندازہ کیا گیا۔ اس پر جناح صاحب نے وعدہ فرمایا کہ ایسے حضرات کے واسطے میں بمبئی جا کر ایک ہزار روپیہ بھیجوں گا۔ اس کے بعد خواہش تو سب بڑے آدمیوں کی تھی مگر تکلفاً کہنا پسند نہیں کرتے تھے کہ جناح صاحب سے وعدہ لیا جائے چناں چہ میں اور مولوی عنایت اللہ قریب بیٹھے تھے۔ ان کے اشارے پر میں نے عرض کیا کہ اور حضرات تو نہیں کہنا چاہیے۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہی پارٹی (رجعت پسند) بمبئی زیادہ پہنچ گئی، تب آپ کیا کریں گے تو انھوں نے یہ فرمایا کہ اس وقت آپ یہ کوشش کیجیے کہ پارلیمنٹری بورڈ بنانے میں مجھ کو تنہا اختیار دے دیے جائیں۔ چوں کہ دوسری پارٹی بھی مجھ سے مطمئن ہے وہ اس سے اختلاف نہیں کریں گے۔ تب میں نے مقرران سے کہا کہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو ہمارے ان جلسوں کی خبر ہو جائے۔ اور وہ آپ پر اعتماد نہ کریں۔ لہٰذا ہم کو یہ بتلا دیا جائے کہ اگر ہم یا آپ کسی طرح کامیاب نہ ہو سکے کہ پارلیمنٹری بورڈ میں آزاد خیال منتخب ہوں، پھر آپ کی کیا پوزیشن ہوگی۔ اس پر (جناح صاحب نے) بڑے جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ میں اگر کسی طرح بھی اس پر قادر نہ ہوا تو مسلم لیگ چھوڑ کر آپ کے ساتھ آ جاؤں گا۔ اس پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا گیا اور سب حضرات نے فرمایا کہ ہم یہی چاہتے تھے اور پوری مسرت کے ساتھ جلسہ ختم ہو گیا۔''

بعد میں مولانا مدنیؒ کا یہ بیان بعض مطالب کے اضافے کے بعد رسالہ قائد مراد آباد کے شمارہ ذی قعدہ ۱۳۵۷ء (مطابق جنوری ۱۹۳۹ء) میں شائع ہوا۔ نیز مدینہ بجنور کی اشاعت مورخہ ۵ر مارچ ۱۹۴۴ء میں اس کا ایک حصہ شائع ہوا اور اسی زمانے میں اسے مکمل شکل میں ''مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل'' کے نام سے جمعیت علمائے ہند دہلی سے شائع کر دیا گیا تھا۔ اس

رسالے کی کئی اشاعتیں خاکسار کی نظر سے گزری ہیں۔

مذہبی تعلیم کا انتظام:

اگست ۱۹۳۸ء: ۱۹۳۸ء میں جو اہم واقعات پیش آئے، ان میں ایک اہم مسئلہ آزاد ہندوستان کے لیے تعلیمی اسکیم کا تھا۔ اس سلسلے میں دو تعلیمی اسکیمیں سامنے آئی تھیں۔ ایک بنیادی تعلیم کی اسکیم تھی جو پورے ملک کے لیے مشہور ماہر تعلیم اور مفکر ڈاکٹر ذاکر حسین نے پیش کی تھی اور ''واردھا تعلیمی اسکیم'' کے نام سے مشہور ہوئی اور دوسری اسکیم صوبۂ متوسط کے ابتدائی سرکاری مدارس کے لیے پیش کی گئی تھی جو ''ودیا مندر اسکیم'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ جمعیت علمائے ہند کی تنفیدات ان دونوں اسکیموں پر اور قرار دادوں میں جمعیت نے اپنے نقطۂ نظر اور پالیسی کی وضاحت کردی ہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ان اسکیموں پر نہایت جامع اور فکر انگیز تبصرہ کیا ہے جو جمعیت کی پالیسی کے عین مطابق ہے۔

اس سلسلے میں ایک یہ وضاحت ضروری ہے کہ ابتدا میں بہت سے اہل علم اور اصحاب فکر کا یہ خیال تھا، جیسا کہ مولانا اکبرآبادی کا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم کا انتظام بھی حکومت ہی کو کرنا چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی یہی رائے تھی، لیکن بعد میں حکومت کے زیرانتظام مذہبی تعلیم، اس کے نصاب، نظام امتحان، اس کے لیے خاص خاص عقیدے اور صلاحیتوں اور سیرتوں کے حاصل اساتذہ کے تقرر اور بہت سی پیچیدگیوں کا اندازہ کر کے اس رائے کو ترک کر دیا تھا۔ مسئلہ دراصل صرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا نہیں تھا، بلکہ ہندوستان کے پچاسوں مذاہب کی تعلیم اور ان کے جدا جدا انتظامات کا تھا۔ اور بالآخر یہی طے پایا تاکہ تمام مذاہب کے لوگ اپنی اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام خود کریں۔ بعد میں یہی رائے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی بھی ہوگئی تھی۔ اب واردھا اور ودیا مندر کی تعلیمی اسکیموں پر مولانا اکبرآبادی کی تنقید مطالعہ فرمائیں:

ا۔ واردھا تعلیمی اسکیم:

ہندوستان کے بچوں اور بچیوں کی ابتدائی تعلیم کی اسکیم جو واردھا تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہے ہماری وطنی حکومتوں کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ اس اسکیم میں اخلاقی تربیت کے ساتھ ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی عملی تجاویز کو شامل کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس اسکیم کی

افادی حیثیت کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسکیم لارڈ میکالے کے اس خواب کا جواب ہے جو انھوں نے ہندوستان میں انگریز تعلیم کے جاری کرانے پر زور دیتے وقت ۱۸۳۵ء میں دیکھا تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس پر خلوص اور سچائی کے ساتھ عمل کیا جاتا تو اس سے ہندوستان کی اخلاقی، اقتصادی اور معاشرتی حالات بہت کچھ خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

اس اعتراف کے ساتھ چند ایسی باتیں بھی ہیں جن کی طرف ہمیں ارکان کمیٹی کو متوجہ کرنا ہے۔ سب سے پہلی اور ضروری چیز یہ ہے کہ اس اسکیم کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کا جزء ضرور شامل ہونا چاہیے۔ مذہبی تعلیم سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ بچوں اور بچیوں کو دینیات کی مکمل تعلیم دی جائے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ مذہب کی اعلیٰ تعلیم کو تو اسٹیٹ کی نگرانی اور اس کے تصرف سے بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ تاکہ ہر قوم اپنی اپنی ضرورت اور حوصلہ و ہمت کے مطابق اس کا انتظام خاطر خواہ طریقہ پر کر سکے۔ البتہ جہاں تک جبری تعلیم کا تعلق ہے۔ مبادیات مذہب مثلاً مسلمان بچوں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کو ایک اہم جزء کی حیثیت سے اس کی اسکیم میں شامل ہونا چاہیے۔

ہندوستان ایسے ملک میں جہاں مذہب ہی پر قومیت کا دار و مدار ہے، اور یہی سرمایۂ زندگی ہے، کوئی ایسا نصاب تعلیم تجویز کرنا جس میں مذہب کو شامل نہ کیا گیا ہو، اصلاح جسم کے ساتھ استکمال روح کو فراموش کر دینے کے مترادف ہے۔

گاندھی جی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں کہا ہے کہ مذہبی تعلیم اسکول کے اوقات کے علاوہ خارج وقت میں دی جا سکے گی۔ اور ہر قوم اپنی ضرورت کے مطابق اپنا انتظام کرے گی۔ لیکن کیا ہم یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ موجودہ عہد تمدن میں جب کہ اسٹیٹ افراد قوم کی تعلیم و تربیت کا خود ذمہ لے رہا ہے، مذہبی تعلیم کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو سبک دوش رکھنا اور اس کو قوموں کے سپرد کر دینا نتائج کے اعتبار سے مذہبی اسپرٹ کو کم کر دینے کا باعث تو نہیں ہوگا؟ اس اسکیم کی رو سے جبری تعلیم کی مدت سات برس ہے، جو بچے کی سات برس کی عمر سے شروع ہو کر اس کی چودہ برس کی عمر تک جاری رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اگر چودہ برس کی عمر تک بچے کو مذہب کی ابتدائی تعلیم بھی نہیں دی گئی تو کتنے ہی بچے ہوں گے جو اپنے اقتصادی حالات کے باعث اور بالخصوص کوئی ہنر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ حاصل کر لینے کے بعد، دوسرے مشاغل حیات میں لگ جائیں گے، اور یہ جاننے کے بعد کہ 'خاص خاص باتوں میں تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہی ہے۔'' وہ مسلمان یا ہندو ہو کر اپنے اپنے مذہب کی

مبادیات سے) بھی واقف نہیں ہوں گے ۔ رہا اس سات برس کی مدت میں اوقات مدرسہ کے علاوہ خارج میں مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کا خیال! تو ہمیں ڈر ہے کہ غریب اور متوسط طبقے کے بچے اپنے خصوصی احوال معاشرت و معیشت کے باعث اس کو عملی صورت میں نہیں لاسکیں گے ۔ اسٹیٹ کا فرض ہے کہ جس طرح وہ اقتصادی مرفہ الحالی کے لیے ایک ایسا مکمل لائحہ عمل بنا رہا ہے ۔ اسے بچوں کی مذہبی تربیت دینے کا کام بھی اپنے ہی ذمہ لینا چاہیے ۔ کسی اور سے کہنے کی بات نہیں ۔ ہم ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے روشن خیال اور باخبر بزرگ سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ مثال کے طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کو اپنے سامنے رکھیے ۔ وہاں اسلامی دینیات کا مستقل شعبہ ہے ۔ اور مشرقی زبانوں کے باقاعدہ محکمے قائم ہیں ۔ لیکن پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے عربی زبان اور دینیات کے پروفیسر سے تعلیم پانے والے طلبہ نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے ناآشنا رہتے ہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں وہ ان سے نفور بھی نظر آتے ہیں ۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی گرم بازاری سے وہاں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے کہ طلبہ کی ذہنیت سرتاسر " دفتری " ہو کر رہ گئی ہے ۔ اور دوسری چیزیں ان کی توجہات پر اس طرح چھائی ہیں کہ مذہب اور عربی زبان کی طرف یا تو انھیں متوجہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور اگر وہ متوجہ ہوتے بھی ہیں تو اس لیے کہ انھیں کسی کالج میں عربی کا پروفیسر بننا ہے ۔ یا " آئی سی ایس " کے امتحان میں انھیں عربی مضمون لینا ہے ۔ پس اگر جبری تعلیم کی اس نئی اسکیم میں مذہب کے ساتھ بھی یہی " اچھوت پن " برتا گیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کل " اتحاد مذاہب " کا سبق لینے والے طلبہ مذہب کی ابجد سے ناواقفیت کے باعث اس کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کریں گے یا کم از کم وہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کریں گے کہ زندگی کی شاہراہیں مذہب کی مشعل سے ہی منور ہونی چاہئیں ۔

بہر حال ہماری درخواست ہے کہ مذہبی تعلیم اوقات مدرسہ میں ہی ہونی چاہیے ۔ اور دوسرے مضامین کی طرح کافی نگرانی اور احساس اہمیت کے ساتھ ۔ ورنہ یہ سب طفل تسلیاں بیکار ثابت ہوں گی ، اور اس تغافل و تساہل کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی بھگتنا پڑے گا ۔

دوسری چیز مخلوط تعلیم کا مسئلہ ہے ۔ لڑکیوں کے لیے اگرچہ یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ ان کے والدین انھیں بارہ برس کی عمر میں مدرسہ سے اٹھا سکتے ہیں ۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لڑکیوں کے لیے مدرسے دو قسم کے ہوں گے ۔ ایک وہ جن میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں گی ، اور

دوسرے وہ جو صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مخصوص ہوں گے۔ لیکن ہم بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کسی حالت میں بھی مخلوط تعلیم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اس اسکیم میں اس کی صراحت ہو جانی چاہیے کہ مسلمان لڑکیوں کی لیے تعلیم گاہیں ایسی ہوں گی جن میں صرف لڑکیاں ہی تعلیم پا سکیں گے۔

۲۔ ودیا مندر اسکیم:

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اسی سلسلے میں ''صوبہ متوسط'' کی ابتدائی تعلیمی اسکیم کا ذکر کریں اس اسکیم میں ان مدرسوں کا نام جن میں یہ تعلیم دی جائے گی ''ودیا مندر'' تجویز کیا گیا ہے جو ایک بڑی حد تک قابل اعتراض ہے۔ جو اسکیم ہر مذہب وملت کے بچوں کی تعلیم کے لیے بنائی جائے، ضروری ہے کہ اس کے کسی جزءِ مشترک میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ایک قوم کے ساتھ کوئی مذہبی خصوصیت رکھتی ہو۔ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ آئندہ جو کتب خانے قائم کیے جائیں گے ان کا نام ''بیت العلوم'' ہوگا۔ لیکن یہاں کسی قوم کو خوش کرنے نہ کرنے کا سوال نہیں بلکہ ایک اصول کو مرعی رکھنے کا سوال ہے۔ ان کتب خانوں کا نام 'بیت العلوم' نہیں اگر ''کعبۃ العلوم'' بھی رکھ دیا جائے تو ہمیں اس پر بھی وہی اعتراض ہوگا جو ''ودیا مندر'' کے نام پر ہے۔

(برہان، دہلی، اگست ۱۹۳۸ء، ص ۷۴ تا ۷۷)

ہندوستان ہمارا وطن ہے

اگست ۱۹۳۸ء: پولیٹکل کانفرنس جون پور میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے خطبۂ صدارت میں شرعی طور پر ہندوستان کی تاریخی اور وطنی حیثیت کے حوالے سے فرمایا:

کل اقوام ہند کا مشترکہ وطن:

یہ ملک ہندوستان ہم سبھوں کا وطن اور دیس ہے۔ ہم سب خواہ مسلمان ہوں یا ہندو، سکھ ہوں یا پارسی اسی دیش میں پیدا ہوئے اور اسی میں بود و باش رکھتے ہیں، اسی میں ہم نے اور ہمارے اسلاف کرام اور گذشتہ بزرگوں نے عمریں گزاریں اور اسی میں ہماری آئندہ نسلیں بھی اپنی اپنی زندگی بسر کریں گی۔ نہ آٹھ کروڑ مسلمان اس کو چھوڑ کر کسی ملک میں جا کر بس سکتے ہیں اور نہ کوئی طاقت دنیاوی ان کو یہاں سے نکال سکتی ہے۔ جب کہ مسلمان اس سے بہت سے زیادہ اقلیت

میں تھے تو راجہ جے پال، انند پال، پرتھی راج وغیرہ نہ نکال سکے اور نہ ستائیس (۲۷) کروڑ ہندو اور اچھوت اس ملک کو چھوڑ کر کسی ملک میں جا کر بود و باش اختیار کر سکتے ہیں اور نہ کوئی طاقت دنیا کی ان کو نکال سکتی ہے۔ مسلمان بادشاہ اورنگ زیب، جہانگیر، شاہجہان وغیرہ اپنی پوری سطوت اور شوکت کے زمانے میں نہ ان کو نکال سکے اور نہ سب کو مسلمان بنا سکے۔ سب کو اسی وطن میں رہنا ہے اور اسی سرزمین میں اپنی ضروریات زندگی پوری کرنی ہیں۔

ہندوستان مسلمانوں کا قدیمی وطن ہے:

ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے، اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا وطن ہونا ہندوستان کی سرزمین کے لیے زیادہ تر قوی اور قدیم ہے۔

(الف) جس طرح ہندو اس سرزمین میں بود و باش رکھتے ہیں، اسی میں ان کے مکانات، باغات، کھیتیاں، دکانیں، معابد وغیرہ ہیں اسی طرح یہاں پر مسلمانوں کے مکانات، باغات، کھیتیاں دکانیں، مساجد، مقابر وغیرہ ہیں، جس طرح ہندو اپنی آئندہ نسلیں یہاں ہی رکھنا چاہتے ہیں اور کسی دوسرے وطن اور ملک کا ان کا ارادہ اور خیال نہیں ہے اس طرح مسلمان ہیں جس طرح ہندوؤں کی اعلیٰ ذاتیں باہر سے آ کر ہندوستان میں آباد ہوئیں اور یہاں کی ہوگئیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی بہت سی اعلیٰ ذاتیں باہر سے آئیں اور یہاں بس کر یہاں کی ہی ہوگئیں اور بہت سی مسلمانوں کی اعلیٰ ذاتیں ہندوؤں کی اعلیٰ ذاتیں ہیں جو کہ مسلمان ہو کر یہاں کی باشندہ رہیں۔ ہاں وہ قومیں ہندوستانی نہیں کہلائی جا سکتیں جو کہ ہندوستان میں اپنے اپنے ملکوں سے روپیہ بٹورنے کے لیے آتی ہیں اور روپیہ پیدا کر کے اپنے اپنے اوطان کو واپس چلی جاتی ہیں۔

(ب) مسلمانوں کی تاریخ اور مذہبی تعلیم کی حیثیت سے حضرت آدم اور حوا علیہم السلام (جو کہ سب انسانوں کے دادا دادی ہیں اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے) یہاں کے ہی حصۂ زمین جزیرہ سرندیپ میں اتارے گیے اور یہیں انھوں نے بود و باش اختیار کی۔ یہاں ہی سے ان کی اولاد پھیلی اس لیے یہاں مسلمانوں کا آبائی (باپ دادوں کا) وطن ہندوستان ہی ہوا۔ چوں کہ ہندوازم کی تعلیم یہ نہیں ہے اس لیے صرف مسلمانوں کا وطن قدیم ان کی مذہب کی رو سے ہندوستان ہی ہوگا۔

(ج) ہندو اپنے زندوں ہی کے لیے ہندوستان کی زمین کو قیام گاہ بنائے ہیں مردوں کو اس

سرزمین میں دفن نہیں کرتے بخلاف مسلمانوں کے وہ ہندوستان کی زمین کو زندوں اور مردوں سب کے لیے قرار کی جگہ بنائے ہیں اس لیے وطنیت مسلمانوں کی اس دیس میں بہ نسبت دوسری قوموں کے بہت زیادہ قوی ہے

(ز) اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس سرزمین میں بھی مثل دوسری زمینوں کے بہت سے خدا کے پیغمبر گزرے ہیں جو کہ سب کے سب مذہب اسلام ہی رکھتے تھے اگرچہ ان کی امتوں اور ان کے تابعداروں نے بعد کو مذہب بدل ڈالا ہو اس لیے ہمیشہ سے یہ ملک مسلمانوں ہی کا وطن ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ یہ ملک مسلمانوں کا وطن اور دیس ہے، نہ مسلمانوں کے لیے درست ہے کہ وہ اس ملک کو اپنا وطن اور اپنا دیس نہ سمجھیں اور نہ دوسری قوموں کے لیے درست ہے کہ یہ کہیں کہ یہ مسلمانوں کا وطن نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لیے ایک منٹ کے لیے درست نہیں کہ وہ اس ملک کی وطنیت اور اس کے حقوق سے ذرہ بھر بھی غفلت برتیں بلکہ ان کو لازم ہے کہ بہ نسبت دوسری ہندوستانی اقوام کے اس ملک کے حقوق وطنی کو اپنے اوپر سب سے زیادہ سمجھیں اور ان کے ادا کرنے کی فکر کریں۔

وطنیت کے حقوق لازمہ:

یہ امر ظاہر اور باہر ہے کہ دیس کی مصیبت اور تباہی تمام باشندوں کی تباہی کا ذریعہ ہے، جس طرح اس کی خوشحالی اور فارغ البالی تمام باشندوں کی خوشحالی اور فارغ البالی کا سبب ہے۔ اگر زلزلہ آئے گا، آگ لگے گی، قحط پڑے گا، خشک سالی ہوگی، تجارت برباد ہوگی، صنعت اور دستکاری مٹے گی، افلاس اور غربت پھیلے گی، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگا، بے تعلیمی اور جہالت کا زور شور ہوگا، نامردی اور بے ہمتی کا نشوونما ہوگا، بیکاری اور بے روزگاری عام طور پر شائع ہوگی، عزت اور شوکت کی موت آئے گی، وغیرہ وغیرہ تو تمام باشندے مبتلا ہوں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ ایک قوم برباد ہو اور دوسری محفوظ رہے۔ اس لیے تمام باشندوں کا فریضہ ہوگا کہ وطن اور دیس کو ایسی عام مصیبتوں اور فلاکتوں سے بچانے کی انتہائی جدوجہد اور کوشش عمل میں لائیں اور اگر اس میں کوتاہی کریں گے تو نہ صرف دوسری قومیں مٹیں گی بلکہ وہ اپنے پیروں میں بھی کلہاڑی مار کر اپنے آپ کو بھی اور اپنی قوم کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

ملک کے ان حقوق میں کوتاہی سے دین بھی برباد ہوگا:

اگر ایسی عام مصیبتوں میں کوتاہی کی گئی اور ان کے دور کرنے میں غفلت اور سستی کو راہ دی

گئی تو صرف یہی نقصان نہ ہوگا کہ دنیاوی زندگی اور اس کے اسباب وذرائع برباد ہوں بلکہ دین اور مذہب بھی برباد ہوگا جیسا کہ آج ہندوستان میں مشاہدہ ہے۔ افلاس اور ناداری، بیکاری اور بھوک کی وجہ سے لوگ ہر سال سیکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں خودکشی کر رہے ہیں۔ بیماریوں میں مبتلا ہو کر قبرستانوں اور مرگھٹوں کو آباد کر رہے ہیں۔ اخلاقی جرائم چوری، ڈکیتی، اچکا پن، رشوت ستانی وغیرہ میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔ فحش اور حرام کاری بڑھتی جاتی ہے۔ اپنے تئیں مذہب کو چھوڑ کر ایسے مذاہب میں داخل ہوتے جاتے ہیں جہاں پر مالی آمدنی کی امید ہے۔ ایسی ایسی ملازمتیں اور پیشے اختیار کر جاتے ہیں جو کہ اخلاقاً اور مذہباً ناجائز ہیں۔ دشمن اسلام کی فوجوں میں بھرتی ہو کر اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ تیر وتفنگ بناتے ہیں۔ بھوک اور کمزوری کی وجہ سے فرائض اسلامیہ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بیاہ نہیں سکتے'' جس کی بنا پر لاکھوں جرائم ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے نہایت زیادہ ضروری ہے کہ ایسی عام مصیبتیں تمام ہندوستانی باشندے مل کر اپنے وطن سے جلد از جلد دور کر دیں۔

(خطبہ صدارت شہر پولیٹکل کانفرنس۔ جون پورا، اگست ۱۹۳۸ء)

ستمبر ۱۹۳۸ء: مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار۔ صدر انڈی پنڈنٹ مسلم پارٹی۔ ممبر عاملہ جمعیۃ العلماء نے دیہات سدھار اسکیم کے خلاف ۲۳ر اگست ۱۹۳۸ء کو دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف (پٹنہ) سے آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم کانگریس وزارت بہار کو ایک احتجاج نامہ ارسال کیا جس میں لکھتے ہیں:

''ان دونوں ادارات (مدھوبنی آشرم اور پھلواری شریف کیمپ جیل) میں جن مضامین کی تعلیم دی جائے گی وہ حسب ذیل ہیں۔ تاریخ، گاؤں کی پنچایت، دیہات کی زندگی ستیا گرہ (سچائی) اور اہمسا (عدم تشدد کا مذہب) مہاتما گاندھی کی سوانح عمری خودنوشت (تلاش حق) اور مہاتما گاندھی کی تعلیم وغیرہ میں اس خط کے ذریعے اس اسکیم کے بدترین نقائص کی طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں اور آپ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ قابل اعتراض مضامین خارج کرنے کا اعلان کر دیں۔ آپ اور آپ کی حکومت نے اہمسا دھرم، گاندھی جی کی سوانح عمری (تلاش حق) اور ان کی تعلیم کو خصوصیت کی ساتھ ہر قوم وملت کے لڑکوں کے لیے لازم قرار دیا ہے۔

یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ اہمسا دھرم، گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کی سوانح عمری جو زیادہ تر ان کے مخصوص مذہبی معتقدات وتخیلات اور تلاش حق کی سرگردانیوں کی آئینہ دار ہیں۔

ہندوؤں کے لیے دل آویز اور بصیرت افروز ہوسکتی ہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، تمدنی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی ہیں۔ اس لیے مسلمان اس قسم کی تعلیم و تربیت ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی رواجات کی بیخ کنی اس اسکیم میں نمایاں ہے مسلمانوں میں بجائے اسلام ازم پھیلانے کے ہندوازم پھیلانے کا تہیہ کیا جارہا ہے۔"

(امارت شرعیہ بہار کا آرگن نقیب نمبر ۱۴ جلد ۶، بہ حوالہ روزنامہ عصر جدید، کلکتہ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء)

سندھ مسلم لیگ کی قرارداد تقسیم ملک:

۸/۹/اکتوبر ۱۹۳۸ء: کراچی میں صوبہ سندھ مسلم لیگ کا اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔ حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مجلس استقبالیہ کے صدر اور پیر علی محمد راشدی اس کے سیکرٹری تھے۔ ۹/اکتوبر کو جو قراردادیں پاس ہوئیں۔ ان میں دوسری قرارداد میں کہا گیا ہے:

سندھ پروونشل مسلم لیگ کانفرنس، ہندوستان جیسے وسیع براعظم کے امن عامہ، ثقافتی ترقی، اقتصادی اور معاشرتی بہبود اور دونوں قومیں، یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے سیاسی عزائم کے پیش نظر اس امر کی سفارش کرتی ہے کہ ہندوستان کو مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

۱۔ مسلم حکومتوں کی فیڈریشن۔

۲۔ غیر مسلم حکومتوں کی فیڈریشن۔

لہٰذا یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ ایسے دستور اساسی کی اسکیم مرتب کرے، جس میں مسلم اکثریت کے صوبوں، مسلم رعایا، مسلم والیان ریاست کی ریاستوں اور مسلمانوں کی اکثریت سے آباد مسلم علاقوں کو ان کی اپنی فیڈریشن کی صورت میں مکمل آزادی مل سکے۔ اس فیڈریشن کو ایسے حقوق بھی عطا ہوں کہ اس میں بیرون ہند کی کوئی مسلمان حکومت بھی جو نزدیک ہو شامل ہو سکے۔ اس فیڈریشن میں غیر مسلم اقلیت کے لیے ایسے تحفظات رکھے جائیں، جیسے کہ غیر مسلم فیڈریشن میں مسلم اقلیت کے لیے رکھے جائیں۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۳۸ء)

اس ریزولیوشن میں یہ ترمیم منظور کی گئی:

"یہ کانفرنس ہندوستان کے امن عامہ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی ثقافتی، اقتصادی، اجتماعی

اور سیاسی بہبود اور حکومت خود اختیاری کے متعلق ان کی اپنے اپنے عزائم کو پیش نظر رکھتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی کے مسئلے پر اسی طریقے سے تجدید نظر کرے کہ دستور اساسی مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم نہ کرے۔ یہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتا ہے کہ دستور اساسی کی اسکیم ایسے طریقے پر تیار ہونی چاہیے کہ مسلمانوں کو مکمل آزادی دے سکے۔''

(تصور پاکستان سے قرارداد پاکستان تک۔ از سرفراز حسین مرزا۔ پاکستان اسٹڈی سینٹر۔ پنجاب یونی ورسٹی۔ لاہور، ۱۹۸۳ء ص ۲۷۳)

قرارداد اور اس میں ترمیم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کے دستور اساسی کی تجدید اور ایک کنفیڈرل نظام کی تجویز تھی۔ اس سے کسی الگ، مستقل اور آزاد مملکت کے قیام کا تصور نہیں پیدا ہوا اور جب حاجی عبداللہ ہارون اور مسٹر محمد علی جناح نے ایک مرکز کی تجویز کی مخالفت کی تھی تو گویا اس کنفیڈرل نظام کی تجویز سے رجوع کر لیا تھا۔

۱۳/اکتوبر ۱۹۳۸ء: سندھ پراونشل مسلم لیگ کانفرنس کی قرارداد نمبر ۳ کی مخالفت کرتے ہوئے پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات نے دہلی سے ایک بیان کے ذریعے مسلم فیڈریشن اور ہندو فیڈریشن کی تجویز کو ایک بیہودہ تجویز قرار دیتے ہوئے کہا: 'میں ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔'' (روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ۱۴/اکتوبر ۱۹۳۸ء)

۱۶/اکتوبر ۱۹۳۸ء: محمد اشرف خان رضا سرحدی نے مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے چند سوالات مسجد شہید گنج کے بارے میں پوچھے تھے۔ سوالات کا مفہوم جوابات سے ظاہر ہے۔ حضرت مفتی صاحب کا جواب یہ ہے:

(۱) اس سوال کا تو ایک ہی جواب ہے کہ مسجد قیامت تک مسجد ہے اور مسلمانوں کو اپنی استطاعت کے موافق اس کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے اور استطاعت کے مدارج مختلف ہیں۔ قانونی استطاعت تو تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اگر پریوی کونسل میں مقدمہ جا سکتا ہو یا فیڈرل کورٹ میں سماعت ہو سکتی ہو اسے بھی ختم کر لینا چاہیے۔

(۲) مسلمانوں نے مسجد شہید گنج کے لیے گزشتہ زمانہ میں جو قربانیاں دی ہیں۔ وہ بقدر اپنی نیت وخلوص کے اجر وثواب کے مستحق ہیں جو مر گئے وہ شہید ہوئے اور جو زخمی ہوئے وہ بھی ماجور ہوں گے اور ہر ایک کو ان کے خلوص کے موافق ثواب ملے گا۔

(۳) مجلس احرار، اتحاد ملت اگر اپنے غلبۂ ظن یا یقین کی بنا پر کہ اس ذریعے سے مسجد حاصل ہوسکتی ہے۔ سول نافرمانی کررہی ہیں تو وہ مستحق اجر ہوں گی اور جمعیت علماء ہر اس شخص کو جو اس یقین کا حامل ہو سول نافرمانی کرنے میں حق بجانب سمجھتی ہے مگر یہ لازم نہیں کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں اس بات کا یقین کرنے میں بھی شریک ہوں۔ جو جماعت کہ اس ذریعے سے حصول مسجد کا یقین نہیں رکھے گی وہ اگر عمل میں شریک نہ ہو تو اسے نہ مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے ملامت کی جاسکتی ہے۔

(۴) مسجد کے حصول کا قانونی راستہ تو بظاہر بند ہے اور سول نافرمانی کا راستہ موجب تیقن نہیں، باہمی افہام وتفہیم کا راستہ مفید ہوسکتا ہے۔ اگر اس کے لیے کوئی معقول جد وجہد کی جائے اور جب ہر طرح استطاعت سے باہر ہوجائے تو اس وقت شریعت مقدسہ کا فرمان ''کہ وسعت سے باہر کا مرتبہ تکلیف کے دایرے سے باہر ہے'' صاف وصریح موجود ہے۔

(۵) ہاں اگر مسلم لیگ کوئی ایسا ذریعہ تجویز کرے کہ اس میں قید وبند یا جان جاتے رہنے کا بھی خطرہ ہو اور وہ اسے حصول مسجد کے لیے بظن غالب یا بدرجۂ یقین مفید سمجھے تو مسلم لیگ کی اس رائے سے اتفاق رکھنے والوں کے لیے اس پر عمل کرنا جائز اور ان کے لیے موجب اجر ہوگا اور اگر اس سلسلے میں وہ مرجائیں گے تو شہید ہوں گے۔ لیکن انھیں یہ حق نہ ہوگا کہ جو مسلمان اس ذریعے کو حصول مسجد کے لیے مفید نہیں سمجھتے ان کو بھی شرکت پر مجبور کریں، یا عدم شرکت کی بنا پر لعن طعن کریں۔

(۶) عدم استطاعت کی حد تک پہنچ جانے کے بعد خاموش رہنے کی رخصت ہے اور عدم استطاعت کی حد تک مسئلہ پہنچا یا نہیں اس میں اختلاف رائے ممکن ہے اور اختلافِ رائے پر طرق عمل کا اختلاف بھی لازم ہے۔

(۷) حکومت پنجاب اگر کوئی قابل قبول حل نکال سکے تو چشم ما روشن دل ماشاد! اور اگر کوئی ایسا حل نکالے جو مسجد کے احکام شرعیہ کے موافق نہ ہو تو مسلمان اسے بطوع خاطر منظور نہیں کرسکتے پھر اگر اس کی مخالفت سے کسی بہتر حل کا حصول ممکن ہو تو اس کی مخالفت کرنے میں حق بجانب ہوں گے اور اگر کسی بہتر حل سے مایوسی ہو تو عدم استطاعت کے مرتبے میں پہنچ کر سکوت کی رخصت ہوگی۔ واللہ اعلم

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۹ر نومبر ۱۹۳۸ء جمہوریہ ترکیہ کے پہلے صدر اتاترک غازی مصطفیٰ کمال پاشا انتقال کر گئے۔
(کاروان احرار، جلد سوم، ص ۴۱۵)

پیر پور کمیٹی رپورٹ...... تصویر کا دوسرا رخ:

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے تحت ہندوستان بھر میں انتخابات کا مرحلہ طے پایا گیا۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ میں کانگریس وزارت سازی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان وزارتوں کو قائم ہوئے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ مسلم لیگ نے واویلا شروع کر دیا کہ کانگریسی وزارتیں مسلمانوں سے معاندانہ سلوک کر رہی ہیں اور ان کا مسلم تشخص ختم کیا جا رہا ہے۔ اس شکایت کی صدائے بازگشت مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ میں بھی سنی گئی۔ سبجیکٹس کمیٹی میں ایک قرارداد پیش ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے سول نافرمانی کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے۔ عجیب قرار داد ہے۔ مسلمانوں کے حقوق سلب ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی مسلم لیگ جو مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کی واحد علمبردار ہونے کی دعوے دار تھی، مخمصے میں پھنسی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ فیصلہ کرنے کی استعداد نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کے مفادات کی خاطر سول نافرنی شروع کرے، بلکہ اس نے سول نافرمانی نہ شروع کرنے کے لیے بھی دروازہ کھلا رکھا ہے۔ اس سے مسلم لیگ کی مسلم مفادات سے سنجیدگی اور خلوص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے دراصل احتجاج و ایجی ٹیشن مسلم لیگ کی سیاست اور مزاج کے بالکل منافی رہا ہے۔ اس نے اس مقصد کی قرارداد محض دکھاوے کے لیے پیش کی تھی۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وقت گزرنے کے باوجود مسلم لیگ نے کانگریسی وزارتوں کے خلاف کبھی بھی سول نافرمانی کی تحریک نہیں چلائی۔ یہاں تک کہ کانگریسی وزارتیں ازخود مستعفی ہوگئیں۔ دراصل تحریک چلانا اور قربانیاں دینا بڑے دل گردے کا کام ہے اور مسلم لیگ اس فن سے قطعاً ناآشنا ہے۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کے زیر انتظام صوبوں میں مسلمانوں کے حالات اور حکومتوں کے سلوک کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس کے چیرمین راجہ سید محمد مہدی آف پیر پور بنائے گیے۔ چودھری خلیق الزمان'' پاتھ وے نو

پاکستان'' کے صفحہ ۲۲۸ پر رقم طراز ہیں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کمیٹی کے کسی دوسرے ممبر نے اس بہت بڑے قومی کام کے لیے راجہ صاحب سے تعاون نہیں کیا۔ انھوں نے جگہ جگہ گھوم کر اپنا فرض ادا کیا۔ افسوس اس امر کا ہے کہ مسلم لیگ نے ان کی قدر نہ کی، ان سے ناانصافی کی اور وہ نہایت کس پرسی کی حالت میں اس دنیا سے ناشاد سدھارے۔

پیر پور کمیٹی کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں مسٹر محمد علی جناح نے صدارتی تقریر میں کانگریس کی وزارتوں پر سنگین الزامات عائد کیے انھوں نے کہا:

طاقت کے زعم میں اب کانگریس ورکنگ کمیٹی اپنا تمدن دوسروں پر تھوپنا چاہتی ہے تاکہ ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کانگریس کی حسب ذیل سرگرمیاں اس کی پوشیدہ اغراض کی غمازی کرتی ہیں۔

(۱) بندے ماترم تمام ممبروں کے لیے لازمی ہے۔ حال آں کہ اس میں مسلمان ممبر بھی شامل ہیں۔

(۲) ہر سرکاری عمارت پر کانگریس کا جھنڈا لہرایا جانا ضروری ہے۔

(۳) ہندی اور ہندوستانی کے پردے میں اردو زبان کو ختم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

(۴) ہندوؤں کا نظریہ زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کر کے مسلمانوں پر مظالم ڈھانا رہ گیا ہے۔

(۵) مسلمانوں کے لیڈروں کو بے تحاشا گرفتار کیا جا رہا ہے۔

(۶) مسلمان اخباروں کا گلا دبایا جا رہا ہے۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ کا اداریہ:

۲۸ر دسمبر ۱۹۳۸ء: پٹنہ کانفرنس میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارتی تقریر پر لاہور کے انگریزی روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' نے ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں ایک ایڈیٹوریل لکھا جس میں مسٹر جناح کی تقریر کا تجزیہ کرتے ہوئے کئی سوالات اٹھائے اور استفسار کیا کہ کانگریس کے جرائم دہراتے رہنے سے مسلمانوں کو نجات مل جائے گی اور مسلم لیگ کا سیاسی پروگرام اور مقاصد کیا ہیں؟ اداریہ میں لکھا ہے:

''افسوس ہے کہ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے چوبیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں جو

خطبہ صدارت دیا ہے، اس میں انھوں نے کانگریس کے اغراض و مقاصد کے متعلق بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ خود ان کے پیش نظر کون سا طریق عمل ہے، جس سے وہ مسلمانان ہند کو اس سیاسی جنگ کے لیے منظم کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے وہ کانگریس یا کسی دوسری حریف جماعت کی دست درازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے اپنے حقوق کو محفوظ کر سکیں؟

''اگر مسٹر جناح کے قول کے مطابق کانگریس ہندو راج قائم کرنے میں کوشاں ہے تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ محض شکایتوں کے دفتر کھولنے سے کانگریس اپنا منصوبہ ترک تو نہیں کر دے گی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کانگریسی وزارتیں اپنے اپنے صوبے میں کھلم کھلا یا درپردہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق پر ڈاکا ڈال رہی ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صرف کانگریس کے جرائم کی داستانیں دہرانے سے مسلمانوں کو کانگریس کے مظالم سے نجات نہیں مل سکتی۔''

''بلا شبہ مسٹر جناح نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد و منظم ہونا چاہیے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اتحاد و تنظیم کے لیے کتنے مراحل اب تک طے کیے جا چکے ہیں اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ مسلم لیگ کا وہ کون سا پروگرام ہے، جس کے مطابق مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کیا جا سکے گا۔ منجملہ دیگر امور کے جو بحالات موجودہ مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہیں۔ اور جن میں یقیناً یہ امر بھی شامل ہے کہ کانگریس کی نگاہ میں لیگ کی حیثیت کیا ہے؟ بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی ایسی تائید و حمایت حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمایندگی کا دعویٰ کر سکے؟''

''اگر مسلمان بہ اتفاق مسلم لیگ کو اپنی نمایندگی کا پروانہ عطا کر دیں تو کانگریس کا اسے مسلمانان ہند کی واحد نمایندہ جماعت تسلیم کرنا یا نہ کرنا بالکل ثانوی بلکہ غیر ضروری حیثیت اختیار کرے گا۔''

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۵۷۔۵۵)

مسلم لیگ کے الزامات کے جواب میں کانگریسی وزارتوں نے جوابی کتابچے شائع کیے۔ یو۔ پی کی وزارت کے کتابچوں کی پیشانی پر ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' لکھا ہوتا تھا اور یہ نہایت شستہ اردو میں تھے۔ فضا ایسی تھی کہ صفائی بھی جرم بنا کر پیش کی جاتی تھی۔ انفرادی واقعات کو سیاسی رنگ دے کر کانگریس کے خلاف اشتعال پیدا کیا جاتا۔ اصلاً یہ ایک سیاسی جنگ تھی۔ لیگ کوئی موقع

ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ وہ ان واقعات سے سیاسی اثاثہ بنانے میں مصروف تھی۔ اسے اپنے سیاسی عزائم میں خوب کامیابی حاصل ہوئی۔ لیگ اس کے مہلک نتائج سے آشنا نہ تھی۔ مسلمان عوام کسی دوسری صدا پر کان دھرنے کو تیار نہ ہوئے۔ یہی ذہنیت تقسیم کے بعد شکایتی صوبوں کے مسلم عوام کے لیے تباہی کا باعث بنی اور مسلمانوں کی للکار فریاد بن گئی۔

مولانا آزاد کا بیان:

پیرپور رپورٹ کی اشاعت کے بعد مولانا آزاد نے اس میں عائد الزامات کو بالکل بے بنیاد اور جھوٹ کا پلندہ قرار دیا انھوں نے چیلنج کیا:

''میں متعدد بار اعلان کر چکا ہوں اور پھر اپنی پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ کانگریس کی وزارتوں کے خلاف تمام متذکرہ الزامات قطعاً بے بنیاد اور دروغ گوئیوں کا سرچشمہ ہیں۔ مسٹر جناح یا کوئی اور شخص جو ایسے الزامات عائد کرتا ہے، اس کا فرض ہے کہ دنیا کے جو طریقے رائج ہیں ان میں سے کسی ایک طریقے سے کام لے کر ان الزامات کو صحیح ثابت کرے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو ایک ہوش مند انسان ان سے کم از کم اس قدر ضرور توقع کرے گا تاکہ وہ اپنی تقریر و تحریر میں ضبط سے کام لے گا۔''

(کاروان احرار: ج ۴، ص ۵۲۔۲۵۱)

۱۹۳۸ء: کانگریس کا اکیاونواں سالانہ اجلاس سوبھاش چندر بوس کی زیر صدارت ہری پور میں منعقد ہوا۔ خطبۂ صدارت میں انھوں نے نہایت مدبرانہ خیالات کا اظہار کیا۔ جنھیں بہت خاموشی اور توجہ سے سنا گیا۔ انھوں نے کہا:

ہم صرف برٹش استعمار ہی کے خلاف نہیں استعمار دنیا میں جہاں بھی ہے ہم اس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہماری تحریک میں کسانوں کا مفاد جو ملک میں اکثریت میں ہیں، بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم صرف ہندوستان کی آزادی ہی کے لیے مصروف جنگ نہیں بلکہ انسانیت کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت محفوظ ہو گئی۔

(سکسٹی ایئرس آف کانگریس، ص ۱۸۔۳۱۷)

جماعت اسلامی کے قیام کا تاریخی سیاسی پس منظر:

کانگریس کی مفاہمت پرستی سے متنفر ہوکر اب ہندوستان کا نوجوان بھگت سنگھ اور اشفاق اللہ کی طرف تشدد پرستی پر مائل ہورہا تھا اور مسلمان اکثریت کے علاقوں مثلاً سرحد اور کشمیر میں سیاسی بیداری کا ایک نیا طوفان اٹھ رہا تھا حکومت کی بدحواسی اس لیے اور بھی بڑھی کہ پشاور میں گڑھوالی سپاہیوں نے چندر سنگھ گڑھوالی کی سرکردگی میں سرخ پوش پٹھانوں کے جلوس پر گولی چلانے سے انکار کردیا۔ اب برطانوی حکمرانوں کی سازش بڑے پیمانے پر شروع ہوئی اور ان کی ہدایت پر سر عبدالقیوم، نواب بھوپال، سر اکبر حیدری، میاں فضل حسین اور دوسرے جاگیرداروں اور نوابوں کے غول نے آغا خاں کی رہنمائی میں مسلمان سیاست پر قدم جمانا شروع کیے۔ اسی سازش کا کرشمہ تھا کہ اب احرار، لیگ اور علی برادران بھی ان کے شانہ بشانہ "مسلم تحفظات" کے مطالبہ میں شریک تھے، اور ایکٹ ۳۵ء کے اعلان کے بعد مسٹر جناح نے از سر نو مسلم لیگ کی تنظیم نئے بورژوا عناصر کی سرپرستی میں شروع کی۔ مودودیت نے فروغ اس ماحول میں پایا۔ اور جماعت اسلامی کی بنیاد ۲۵ راگست ۱۹۴۱ء کے دن پنجاب میں اس وقت پڑی جب مسلم لیگ سال بھر پہلے قرارداد پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دے چکی تھی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی یوں بھی اسی قسم کی تحریکوں کے لیے غیر معمولی طور پر موزوں ہیں۔ اول تو موصوف کا دعویٰ ہے کہ وہ براہ راست سادات اہل بیت کے گھر پیدا ہوئے جو عرب سے آکر چشت میں آباد ہوگیا تھا۔ پھر ان کی ننہال ترکی الاصل ہے اور ان کے اجداد اورنگ زیب عالمگیر سے شاہ عالم کے زمانے تک مغل بادشاہوں کے نمک خوار اور اس کے بعد ان کے پرنانا خاندان آصف جاہ کے حلقہ بگوشوں میں منسلک رہے ہیں۔ یعنی بزعم خود مولانا کو ننہال کی طرف سے دنیاوی بادشاہت اور ددھیال کی طرف سے دینی بادشاہت کا ورثہ عطا ہوا ہے بالفاظ دیگر جاگیری نظام کی ہواخواہی کا جذبہ مولانا کے دینی عقاید و عمل کی بنیاد ہے۔ چناں چہ جب حیدرآباد میں انجمن اتحاد المسلمین کا قیام وجود میں آیا تو نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ مولانا مودودی بھی اس میں شریک ہوئے اور بقول مولانا سلیمان ندوی نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانان ہند کو یاد دلایا کہ "یہ ملک تمھارا مفتوحہ اور مقبوضہ ہے تم اس کے کشور کشا اور فاتح ہو اور خانوادہ آصفی کا سر تاج تمھاری حکومت کا نمائندہ، تمھاری طاقت کا مظہر، تمھاری بادشاہی کا ستون اور وفاداری کا مرکز

ہے (معارف، اگست ۴۴ء) اس کے بعد مولانا مودودی کانگریس کی تحریک رابطہ مسلم عوام کے خلاف میدان میں اترے اور دہلی کے سرکاری مسلم حلقوں میں ان کی آؤ بھگت شروع ہوئی۔

۳۸ء سے مولانا نے پنجاب کی فضا کو موافق مزاج پا کر یہاں ڈیرے ڈال دیے جماعت اسلامی کا سنگ بنیاد یہیں رکھا گیا۔

مولانا کا دامن ہر اس جدوجہد کی شرکت کے گناہ سے پاک ہے جو برطانوی سامراج کے خلاف ۱۹۲۰ء سے برابر جاری تھی اور مسلمان اس میں شریک رہے تھے۔ اس کے بالمقابل قرآن اور رضائے الٰہی کی آڑ لے کر مولانا نے وقتاً فوقتاً مسلمانان ہند کو ہر ایسی تحریک کے خلاف ورغلایا جو برطانوی سامراج اور جاگیری مفاد کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ موصوف نے بھی امپیر چلزم اور جمہوریت کے متضاد مطالبات کو ہم معنی اور مساوی قرار دے کر دونوں کو "دو جھوٹے خداؤں" سے تشبیہ دی (سیاسی کشمکش، حصہ سوم صفحہ ۱۴۰) کبھی یہ کہہ کر ڈرایا کہ اگر برطانوی سامراج کی مسلمانوں نے مخالفت کی تو "انگریزوں کے دل کا دروازہ اسلام کی دعوت کے لیے بند ہو جائے گا (ایضاً صفحہ ۱۲۲) اور بالآخر انگریزی تسلط کو یہ ارشاد فرما کر مضبوط اور مستحکم کیا کہ

"کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے ضروری ہے...... ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں۔" (صفحہ ۱۰۸ ایضاً)

اس مجتہد کے نزدیک برطانیہ کے خلاف ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کو جہاد آزادی میں شامل کرنا خود "اسلامی قومیت" کے لیے اسی طرح زہر قاتل تھا۔ جیسے "آب زمزم سے تعلق قطع کر کے گنگا سے وابستگی پیدا کرنا یا بھیم وار جن کو قومی ہیرو سمجھنا۔"

بالآخر جب جماعت اسلامی کی اعلانیہ غداری اور سامراج پرستی کے باوجود وطن آزاد ہوا اور ہندوستان میں ایک سیکولر حکومت قائم ہوئی تو مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے ممبروں کو واضح الفاظ میں اس کے خلاف بغاوت کی تعلیم دی۔ مولانا نے فرمایا کہ:

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان سے تو میں صاف کہتا ہوں کہ موجودہ زمانے کی لادینی (سیکولر) قومی جمہوریت تمہارے دین وایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ تم اس کے آگے سر تسلیم خم کرو گے تو قرآن سے پیٹھ پھیرو گے، اس کے قیام و بقا میں حصہ لو گے تو اپنے رسول سے غداری کرو گے

اوراس کا جھنڈا اڑانے کے لیے اٹھو گے تو اپنے خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرو گے۔ جس اسلام کے نام پر تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو اس کی روح اس ناپاک نظام کی روح سے، اس بنیادی اصول، اس کے بنیادی اصولوں سے اور اس کا ہر جز واس کے ہر جز و سے برسر جنگ ہے۔ اسلام اور یہ نظام ایک دوسرے سے کہیں مصالحت نہیں کرتے ۔ جہاں یہ نظام برسر اقتدار ہوگا وہاں اسلام نقش برآب ہوگا۔ اور جہاں اسلام برسر اقتدار ہوگا وہاں اس نظام کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم اگر واقعی اس اسلام پر ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد ﷺ لائے تھے تو تمھارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو، اس قوم پرستانہ لادینی (سیکولر) جمہوریت کی مزاحمت کرو......''

(مودودی کا پٹھان کوٹ میں جماعت اسلامی کو خطبہ ۱۰ رمئی ۱۹۴۷ء بحوالہ ''مولانا مودودی کی تحریک اسلامی از محمد سرور۔ لاہور، صفحات ۴۷۔۲۴۶)

۱۹۴۸ء:

یوپی کی متحدہ زندگی اور جناح صاحب:

میں نے مسٹر جناح سے بہت دیر تک بحث کی کہ آپ اتر پردیش کی روحانی زندگی درہم برہم نہ کریں جہاں ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کی ایک متفقہ کلچر (ثقافت) بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت پر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا بہت زیادہ اثر ہے۔ لیکن مسٹر جناح اپنی آخری اٹل رائے قائم کر چکے تھے۔ پیر پور رپوٹ ان کے پیش نظر تھی، اور بہت سے یک طرفہ بیانات ہندوؤں کے مسلمانوں کے ساتھ سختی برتنے کے ان کے ذہن نشیں کر دیے گئے تھے۔ ساتھ ہی ان کو ادنیٰ درجہ کے ہندوؤں کے وہ اقوال ومضامین بتائے گئے تھے، جن میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بُرے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ آخر کار انھوں نے یہ کہا کہ ''سری پرکاش میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان قائم ہوتے ہی تمام مسائل ومعاملات حل ہو جائیں گے۔'' لیکن کیا ایسا ہوا؟ جہاں تک میری نظر جاتی ہے میں تو یہی دیکھ رہا ہوں کہ پرانے جھگڑے اپنی جگہ پر برقرار ہیں اور مزید برآں اور سنگین تر مسائل کا اضافہ ہوگیا ہے۔ (حوالہ)

تعدد قومی کا لزوم:

بصیر؛ ضلع شاہ پور (پنجاب) کے گلزار احمد کوئی صاحب تھے۔ انھوں نے اعتراض نما چند

سوالات حضرت شیخ الاسلام مرحوم سے دریافت کیے تھے کہ قوم اور وطن کی محبت غیر اسلامی اور قومیت متحدہ کا تصور دلائل سے خالی ہے۔ اسے ترک کر دینا چاہیے۔ حضرتؒ نے ان کے جواب میں چند سطریں تحریر فرمائی ہیں، وہ بصیرت کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ یہ چند سطریں بڑے سے بڑے محققانہ مقالے پر بھاری ہیں۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

(۱) قومیں نسل، مذہب، وطن، پیشوں وغیرہ سب سے بنتی ہیں، اس لیے اس میں منافات نہیں ہے کہ ایک جماعت کسی حیثیت سے دوسری جماعت کے ہم قوم بھی ہو، قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اور مسلمانوں کو کفار کا ہم قوم ایک دو نہیں بلکہ ستر ۷۰ اسی ۸۰ جگہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے مسلمانان ہند بحیثیت وطنیت جو کہ یورپین لسان میں مدار علیہ نیشن کا ہے، دیگر اقوام ہندیہ کے ہم قوم ہیں مگر بحیثیت مذہب مغائر ہیں، بحیثیت نسل خود مسلمانوں میں بہت سی قومیں ہوں گی، جن میں سے متعدد قومیں غیر مسلم قوموں سے بھی نسلی بناء پر متحد ہو جائیں گی، جیسے راجپوت، جاٹ وغیرہ۔ بہر حال مسلمان ہم قوم برادران وطن بھی ہیں اور غیر بھی۔

(۲) اس میں کوئی منافات نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں انسان ہندوستانی بھی ہو اور مسلمان بھی، تقدم اور تاخر کا لزوم ضروری نہیں ہے، ہم ایک وقت میں بیٹے بھی ہیں، بھائی بھی ہیں، باپ بھی ہیں، ماموں بھی ہیں، چچا بھی ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔

اور اگر تقدم و تاخر مراتب شمار کرنا ہے تو ہندوستانیت بحیثیت جسم اور اس کے لوازم کے ہے اور اسلامیت بحیثیت روحانیت اور اس کے لوازم و توابع ہے، بحیثیت وجود دنیاوی جسمانیت مقدم ہے۔ بچہ جب تین چلے اپنی پیدائش کی پورے کر لیتا ہے تب روح آتی ہے اور بحیثیت شرف و فضل روحانیت مقدم ہے۔

مسلم نیشنل کانفرنس سے حضرت کا خطاب:

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے زیر صدارت آندھرا میں مسلم نیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ حضرت شیخ الاسلام نے سیاست میں مسلمانوں کو کانگریس کے دوش بہ دوش چلنے اور کام کرنے کی ہدایت فرمائی۔

(حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، مرتبہ اثر ین یحییٰ انصاری، ۱۹۷۷ء، ص ۱۸۲)

فتویٰ حاصل کرنے کا طریقہ:

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو جمعیت علمائے ہند کا تعاون حاصل تھا۔ لیکن صدر مسلم لیگ کی بدعہدی کی وجہ سے ۱۹۳۸ء میں جمعیت علمائے ہند مسلم یونٹی بورڈ سے الگ ہوگئی۔ ادھر خان بہادر حبیب اللہ کا جو جھانسی کے حلقے سے منتخب ہوئے تھے، انتقال ہوگیا۔ ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کو علماء کے تعاون کی ضرورت پیش آئی تو علمائے تھانہ بھون کو استعمال کیا گیا۔ یہ کارنامہ چودھری خلیق الزماں کے ذریعے انجام پایا جو حضرت مدنی گروپ اور تھانوی گروپ کی اندرونی کشمکش سے واقف تھے مرزا جاں باز مولف کاروان احرار (جلد ششم) لکھتے ہیں:

چودھری خلیق الزماں نے مولانا ظفر احمد تھانوی کو اپنی سان پر لگایا اور وہ تھانہ بھون کے علماء کو لے کر مسلم لیگ کے ہم نوا ہوگئے۔ یہاں تک کہ مولانا ظفر احمد تھانوی نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ایسے درویش منش کو بھی اس بکھیڑے میں شامل کرلیا، جیسے کہ وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات ''انوار النظر'' اور ''تذکرہ الظفر'' میں لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد پہلا الیکشن جھانسی کے علاقے میں لڑا تھا۔ جھانسی کے مسلمانوں نے حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) سے بذریعہ تار دریافت کیا کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں سے کس کو ووٹ دیا جائے؟

ابھی تک حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کا ذہن مسلم لیگ کی حمایت کے بارے میں واضح نہیں تھا۔ بلکہ بجا طور پر خدشہ محسوس کرتے تھے کہ یہ لوگ کہیں مصطفےٰ کمال کی طرح دین کو مسخ نہ کردیں۔ اس لیے اس تار کا جواب دینے کے لیے آپ نے اپنے مشیران خاص سے مشورہ کیا تو حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی نے یہ مشورہ دیا کہ آپ کانگریس کے حمایت کی تو خلاف ہیں۔ صرف تامل مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ہے۔ اس لیے آپ یہ جواب دے دیں کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے۔

یہ جواب حضرت نے پسند فرمایا اور اس مضمون کا تار روانہ کردیا۔ نتیجہ میں مسلم لیگ الیکشن میں کامیاب ہوگئی۔''

(''تذکرۃ الظفر'' ص ۳۵۸۔۳۵۷؛ ''انوار النظر'' ص ۳۸)

مولانا ظفر احمد تھانوی (عثمانی) کی مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے حق میں اس سے پیشتر کے تمام فتاویٰ بھی اسی طرح حاصل کیے گئے ہوں گے۔ ورنہ حکیم الامت حضرت

تھانوی کو دنیاوی جھگڑوں سے کیا واسطہ! اور نہ ہی اخبارات کا مطالعہ ان کی روزمرہ زندگی میں شامل تھا کہ انھیں حالات سے آگاہی رہتی۔ لہٰذا اس طرح کے سادہ اور درویش دیندار آدمی کو دنیاوی فریب دے کر کوئی سیاسی فائدہ حاصل کر لینا مشکل کام نہیں۔

بہرحال مسلم لیگ کو تھانہ بھون کے علماء کا مکمل تعاون حاصل ہو گیا۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمان سیاسی طور پر ۱۹۳۷ء کی طرح پھر دو حصوں میں بٹ کر رہ گئے۔ پہلے گروہ میں مسلم لیگ تھانہ بھون کے علماء اور سرکاری و نیم سرکاری ملازم مسلمان شریک تھے۔

وفاقی نظام حکومت

مرکزی الیکشن سے مسلم لیگ کا فرار:

۱۹۳۷ء کے صوبائی الیکشن میں مسلم لیگ کی ناکامی کے بعد اس نے مرکزی انتخابات کے انعقاد سے پہلے عدم دلچسپی کا اظہار کیا پھر صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد وفاق کے نظام کی مسلمانوں کے حق میں افادیت سے انکار کیا اور آخر کار آزادی کے مطالبے ہی سے دستبرداری اختیار کر لی۔ محمد فاروق قریشی (لاہور) نے اپنی تالیف میں اس گریز کے مراحل کی نشان دہی کی ہے۔

جناح وائسرائے ملاقات:

وائسرائے ہند لارڈ لن لتھگو نے ۱۹؍اگست ۱۹۳۸ء کو سیکرٹری آف اسٹیٹ کو لکھا کہ ''مسٹر جناح نے اس تجویز پر اپنی بات ختم کی کہ مرکز کو جوں کا توں ہی رہنے دیا جائے۔'' یعنی انتخابات نہ کرائے جائیں۔ اختیارات غیر ملکی حکمرانوں کے پاس رہیں اور ہندوستانیوں کو نہ سونپے جائیں۔ مسٹر جناح کی یہ سوچ اس لیے پیدا ہوئی کہ صوبوں کے بعد مرکز میں بھی مسلم لیگ کو صوبوں جیسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا اور اس صورت میں اس کے مسلمانوں کے ترجمان ہونے کے دعوے بالکل بے بنیاد ہو کر رہ جاتے لہٰذا انھوں نے انتخاب سے گریز کی پالیسی اختیار کی۔ برطانیہ تو پہلے ہی بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سے اس کے ارادوں کو تقویت ملی۔

مسلم لیگ کا وفاق سے گریز:

اب مسلم لیگ نے وفاقیت سے ہی دست کشی اختیار کر لی۔ چناں چہ وائسرائے ۲۸؍فروری

۱۹۳۹ء کو لکھتا ہے: ''مسٹر جناح نے نظریہ وفاق (قبول نے) کا کوئی تاثر نہیں دیا۔ یورپ میں جنگ کی شعلے پھوٹ پڑے۔ ہٹلر کی افواج ملکوں کو تاخت وتاراج کرتی ہوئی آندھی کی طرح آگے بڑھنے لگیں تو مسلم لیگ نے اخباری بیانات، وائسرائے کے ساتھ خط وکتابت اور بالمشافہ گفتگو کے ذریعے یہ کہنا شروع کیا کہ ''مسلم قوم کو مرکز میں جمہوری نظام اور کانگریس کی جانب سے تمام ہندوستان کی نمایندگی کا دعویٰ اور ڈیفنس پر کنٹرول قطعی طور پر منظور نہیں۔''

سر عبداللہ ہارون کا تار بنام وائسرائے:

مسلم لیگ کے سندھی لیڈر سر عبداللہ ہارون نے وائسرائے کو ایک تار ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا:

''مغربی ممالک کی جمہوریت ہندوستان کے لیے مناسب نہیں اور مسلمانوں کا حکومت برطانیہ کے ساتھ ماسوائے وفاق کے نظریے کے اور کوئی اختلاف نہیں۔ اس وفاقی طرز حکومت کو ترک کر دینا چاہیے اور برطانیہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ مسلم قوم میں ان کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔''

مسٹر جناح کی طرح سر عبداللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ انگریز یہیں رہیں۔ اختیارات ہندستانیوں کو نہ سونپے جائیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیوں کہ مسلم قوم میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا مسلمان آزادی کے خواہش مند نہیں تھے اور غلامی کی زنجیروں سے مفاہمت کر لی تھی۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑی گالی اور کیا ہو سکتی ہے؟ جنھوں نے جلیانوالہ باغ میں اپنا خون بہایا۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں جوش و جذبہ سے حصہ لیا اور جیلوں میں گئے۔ برطانوی استعمال سے لڑے پھانسی کے پھندے کو گلے کا ہار بنایا۔ جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں اپنا عہد شباب قربان کر دیا۔ ماں باپ، بہن بھائیوں، بیوی بچوں اور عزیز و اقارب کی جدائی برداشت کی۔ یہ سب کس لیے تھا؟ انگریزوں کو سرزمین ہندوستان سے نکالنے کے لیے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا یا اس سے مقبولیت کی بو آتی ہے؟ مسلمانوں میں انگریزوں کی مقبولیت کا دعویٰ ہوا خواہان تاج برطانیہ اور خطاب یافتہ ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی غیرت مند اور خوددار مسلمان جس کے سینہ میں ایمان کی معمولی رمق بھی باقی ہے جو آزادی کی لذت سے آشنا ہے۔ اس قسم کا شرمناک دعویٰ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ دراصل انگریزوں نے اپنے گماشتوں کو مسلمانوں کا لیڈر بنا کر مسلم قوم کے سروں پر مسلط کر رکھا تھا ان کا وظیفہ حیات اپنے آقاؤں کی خدمت گذاری تھا۔ مسلم قوم کے مفادات کی نگہبانی اور حفاظت سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ یہ

حضرات تو مسلمان کے گلے میں برطانوی غلامی کی زنجیروں کو مستحکم بنانے میں مصروف تھے آزادی اور حریت کی تحریکوں کے سخت مخالف تھے۔

اب وفاقیت سے گریز کا سلسلہ زلف یار کی طرح دراز ہونے لگا۔ جناح سے ملاقات میں وائسرائے نے یہ تاثر لیا پھر یو۔پی مسلم لیگ کے صدر نواب اسماعیل خاں کے مشورے سے جمہوری نظام کی مخالفت سامنے آتی ہے اور سر عبداللہ ہارون کا تار کسی تبصرہ کا محتاج نہیں ہے۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ:

آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں یہ مسئلہ آتا ہے تو کمیٹی جناح کی صدارت میں فیصلہ کرتی ہے:

''مسلم لیگ نے قطعی طور کسی بھی فیڈرل نظام کی مخالفت کی ہے۔ کیوں کہ اس طرز حکومت سے اکثریتی فرقہ کو جمہوریت اور پارلیمانی نظام کے پردے میں فائدہ پہنچے گا۔ ایسے ملک میں جہاں مختلف قومیں بستی ہیں اور ایک واحد قومی ریاست نہیں اس کے لیے وفاقی آئین ہرگز مناسب نہیں۔''

کمیٹی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے چل کر ایک ایسا مطالبہ کیا ہے جس کا کوئی جمہوری یا اخلاقی جواز نہیں تھا۔ مسلم لیگ کو ایسے مطالبات پیش کرنے کا اختیار حاصل نہ تھا۔ اور نہ ہی اس نے انتخاب میں ان مطالبات پر ووٹ مانگے تھے۔ اگر الیکشن مینی فیسٹو میں یہ مطالبات شامل ہوتے تب بھی اسے یہ حق حاصل نہ تھا کیوں کہ مسلمانوں نے اسے اعتماد نہیں بخشا تھا اندریں صورت یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ مسلم لیگ کا وفاق گریز مطالبہ بالکل غیر جمہوری تھا۔

''کمیٹی نے حکومت برطانیہ پر اس یقین دہانی کے لیے مزید زور دیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مشورے اور تصدیق کے بغیر ہندوستان کے لیے آئینی سوال پر پیش قدمی نہ کرے اور نہ ہی کوئی آئین بنائے اور نہ ہی برطانوی پارلیمنٹ اسے منظوری دے جب تک کہ وہ مسلم لیگ سے مشورہ اور منظوری نہ لے لے۔''

لیگ کا مطالبہ اور مرکز میں انتخابات کے عدم انعقاد کا فیصلہ:

مسلم لیگ نے برطانوی سرکار کے لیے راہ ہموار کردی وہ پہلے ہی بہانے تلاش کر رہی تھی اب بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور وائسرائے نے اعلان کردیا کہ ''مرکزی اسمبلی کے انتخاب نہیں

ہوں گے۔"

"وائسرائے کے اعلان پر مسلم لیگ نے شادیانے بجائے۔ الیکشن سے فرار پر مسلم لیگ نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا:

"مجلس عاملہ وائسرائے کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتی ہے جو ہندوستان اور خصوصیت سے مسلمانوں کے لیے مفید ہے کہ ۱۹۳۵ء کے آئین کو جس میں وفاق کا تصور موجود ہے، معطل کر دیا ہے۔ مسلم لیگ یہ توقع رکھتی تھی کہ اسے معطل کرنے کی بجائے مکمل طور پر ختم کر دیا جاتا۔"

یعنی مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ قوم نے نصف صدی تک جدوجہد کرنے اور قربانیاں دینے کے بعد جو حقوق حاصل کیے تھے، انھیں ختم کر دیا جاتا اور ہندوستان بدستور سرزمین بے آئین بنا رہتا ہے اور اس کے چالیس کروڑ باشندوں کو برطانیہ بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا رہتا۔ یہ تھا مسلم لیگ کا طرزِ عمل بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے قریب الاختتام پر۔

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۵۶۔۱۵۴)

وفاقی طرز کا دستورِ اساسی ازالہ توہمات کی کلید:

مسلم لیگ نے رفتہ رفتہ وفاقی نظام حکومت کے قیام میں حصہ دار بننے سے قطعی انکار کر دیا جب کے مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک وفاقی نظام ہی فرقہ وارانہ سیاسی مسائل کا حل اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے توہمات کی کلید تھا مولانا فرماتے ہیں:

"ہندوستان کا آیندہ دستورِ اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو۔ مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا جس کے تمام حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خودمختار ہوں گے۔ اور فیڈرل کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ، جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے، ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحے کے لیے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی

جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے ''ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کود جانا چاہیے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا ہم معلوم کر لیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔''

''تقریباً ۳۰ برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلے پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب و ہوا میرے غور و فکر کی رواہ نہ روک سکتی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کر لیں۔ یہ فیصلہ ہم کیوں کر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملے کی سطح پر نہ رہیں، اس کی بنیادوں تک اتریں اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستور اساسی کا کوئی تحفظ ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے۔ اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اور ہمیں بھی یہ خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے، لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے۔ تو پھر ہماری راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پر چھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، ہماؤ، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا

کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھتے جائیں۔''

''مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے بشرطے کہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔''

(خطبات آزاد، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء ص ۹۵۔۲۹۳)

چودھری خلیق الزماں کا دعویٰ:

اس وقت تو مسلم لیگ نے فیڈرل نظام حکومت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن چودھری خلیق الزماں نے بعد میں یہ کریڈٹ خود لینا چاہا۔ اگرچہ فاروق قریشی ایڈوکیٹ (لاہور) نے ان کی اس غلط بیانی کی بہ دلائل نشان دہی کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

چودھری خلیق الزمان نے فیڈریشن آف انڈیا کے قیام کے بارے میں اعتراضات کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلم فیڈریشن کا تصور تو علامہ اقبال نے خطبۂ الہ آباد میں پیش کیا تھا۔ **(شاہراہ پاکستان، ص ۱۰۰۹)**

حال آں کہ ان کا یہ دعویٰ درست نہیں۔ مولانا راغب احسن کے نام اپنے مکتوب ۶/مارچ ۱۹۳۴ء میں علامہ اقبال رقم طراز ہیں:

''......کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے۔ جب کہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علاحدہ ہو اور انگلستان سے براہ راست وابستہ ہو۔''

علامہ اقبال کا یہ تصور بھی بڑا مبہم اور غیر واضح ہے کیوں کہ فیڈریشن کی تخلیق پر تو شاید اس وقت کسی کو اعتراض نہ ہوگا اصل مسئلہ مرکز اور وفاق کی اکائیوں کے درمیان حقوق و اختیارات کی تقسیم کا تھا۔ دوسرے وفاق میں ہندوؤں کی عددی اکثریت کا خوف تھا۔ جس سے بچنے کے لیے فرقہ وارانہ مسائل پر مسلمان کے لیے خاص (Weightage) کا مطالبہ ہوتا تھا۔

چودھری صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۲۰، مارچ ۱۹۳۹ء کو لارڈ زٹلینڈ وزیر ہند

کوفیڈریشن اور محدود شعبوں کا نظریہ پیش کیا تھا۔ چودھری صاحب نے ایسا ضروری کیا ہوگا۔ لیکن چودھری صاحب بقید حیات ہوتے تو ان سے یہ سوال ضرور کیا جاتا کہ جناب آپ نے یہ نظریہ کس کی جانب سے تجویز کیا تھا؟ کیوں کہ تاریخی دستاویزات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فروری ۱۹۳۹ء کے بعد تو مسٹر جناح اور مسلم لیگ فیڈریشن کے قیام کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس کا ذکر قبل ازیں آ چکا ہے۔ مسٹر جی الانہ کی ''تحریک پاکستان'' صفحات ۲۱۷ تا ۲۱۹ پر بڑا واضح طور پر لکھا ہے جس کا ایک حصہ مکرر تحریر ہے:

''مسلم لیگ نے قطعی طور پر کسی بھی فیڈرل نظام کی مخالفت کی ہے کیوں کہ اس طرز حکومت سے اکثریتی فرقے کو جمہوریت اور پارلیمانی نظام کے پردے میں فائدہ پہنچے گا۔ ایسے ملک میں جہاں مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور ایک واحد قومی ریاست نہیں اس کے لیے وفاقی آئین ہرگز مناسب نہیں۔''

اس اقتباس کے بعد اگرچہ موضوع پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس سے یہ امر بالکل عیاں ہے کہ مسلم لیگ فیڈریشن کو اقلیتوں کے مسئلے کا حل تصور نہ کرتی تھی تو یہ ان کا ذاتی معاملہ تو ہوسکتا ہے اسے مسلم لیگ کی تائید و حمایت حاصل نہ تھی جس کے وہ ممبر تھے اور جس کے ترجمان کی حیثیت میں وہ انگلستان گئے تھے تاکہ مسلم لیگ کا مقدمہ پیش کرسکیں۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلم لیگ نے انھیں فیڈریشن کے قیام کی تجویز پیش کرنے کا اختیار دیا تھا؟ اس پر چودھری صاحب کی تصنیف بالکل خاموش ہے۔

کانگریس کا اجلاس ہری پور اور اقلیتوں کو یقین دہانی:

مسلم لیگ نے فیڈریشن کے خلاف موقف اس وقت اختیار کیا تھا جب کانگریس کے ۵۱ ویں اجلاس (۱۹۳۸ء، ہری پور) کے نومنتخب صدر بابو سبھاش چندر بوس نے اقلیتوں کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی وضاحت سے کہا تھا:

''کانگریس نے پوری ذمہ داری سے ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق پر اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہے کہ کانگریس اپنا فرض سمجھتی ہے کہ ان کے حقوق کی محافظت کرے اور اقلیتوں کی نشو ونما ان کی قومی سیاست، اقتصادیات اور معاشرے میں شریک ہونے کے وسیع سے وسیع پہنچانے کا ذمہ لے۔ کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ آزاد اور متحدہ ہندوستان حاصل کرے۔ جہاں کوئی طبقہ یا گروہ

اکثریت یا اقلیت اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کو نہ کچلے"

کانگریس اور بنیادی انسانی حقوق:

اس واضح اور غیر مبہم یقین دہانی کے ساتھ وسوسوں اور عدم اعتماد کو دور کرنے کی خاطر بنیادی انسانی حقوق کے ریزولیشن کو دہرا کر تو ہمات کو دور کیا گیا تا کہ غلط فہمیاں دور ہوں یک جہتی اور اعتماد کی فضا قائم ہو اور تمام اہل ہند حصول آزادی کی خاطر یک جان ہو کر بھر پور جدو جہد کریں۔ ریزلیوشن میں کہا گیا تھا:

(۱) ہندوستان کے ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ آزادانہ راے کا اظہار کرے، اسے حق حاصل ہے کہ آزادانہ اداروں اور جماعتوں مین شریک ہو، کسی ایسے مقصد کے لیے جو خلاف قانون یا خلاف اخلاق نہ ہو، وہ امن پسندانہ بغیر ہتھیاروں کے جمع ہو۔

(۲) ہر شہری کو آزادی ضمیر کا حق حاص ہوگا، اور حق حاصل ہوگا کہ آزادی سے اپنے مذہب کا اقرار کرے اور اس پر عمل پیرا ہو، بشرطے کہ امن عامہ اور اخلاق اس سے خراب نہ ہو۔

(۳) اقلیتوں کی معاشرت، زبان، رسم الخط اور مختلف زبانوں کے رہتے کی حفاظت کی جائے گی۔

(۴) قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہوں گے۔ خواہ ان کا مذہب، ذات، فرقہ یا جنس کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

(۵) سرکاری نوکریوں، ذمہ دار عہدوں، اعزاز اور پیشوں یا کاموں کے لیے کسی شہری کو بوجہ اس کی جنس، مذہب، فرقہ، عقیدہ، مسلک یا ذات محروم نہیں رکھا جائے گا۔

(۶) کنویں، تالاب، سڑکیں، اسکول اور منظر گاہیں، خواہ وہ سرکاری طور پر جاری کی گئی ہوں، یا مقامی فنڈ سے یا کسی شخص نے مفاد عامہ کے لیے انھیں وقف کیا ہو۔ ان سب پر تمام شہریوں کو برابر کے حقوق اور فرائض حاصل ہوں گے۔

(۷) تمام مذاہب کے متعلق حکومت مکمل طور پر غیر جانبدار رہے گی۔

(۸) تمام بالغ باشندوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔

(۹) ہر شہری کو حق حاصل ہوگا کہ وہ ملک بھر میں جہاں چاہے آزادی کے ساتھ گھومے یا اس کے کسی حصہ میں بس جائے، یا ملکیت حاصل کرے، یا کوئی پیشہ یا کام اختیار کرے۔ ہندوستان کے تمام حصوں میں اس پر قانونی چارہ جوئی اور محافظت یکساں ہوگی۔"

کانگریس کے آخری سیشن کی قرارداد..... مزید یقین دہانی:

اگرچہ کانگریس کے نومنتخب صدر کی تقریر ہی کفایت کرتی تھی لیکن کانگریس نے مزید یقین دہانی اور گورمنٹ کے پیش نظر آخری سیشن میں ایک قرارداد کے ذریعہ صدر کی تقریر کی زیادہ واضح انداز میں تصدیق وتوثیق کردی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا:

''کانگریس ہندوستان کے مسلمانوں اور اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے مخالف سامراج جذبہ اور جوش کا خیر مقدم کرتی ہے، اور ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں جو سب کے لیے یکساں ہے اور جو متحدہ قومی بنیاد پر ہی لڑی جاسکتی ہے۔ اس میں ان تمام فرقوں اور طبقوں کی متحدہ شرکت کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کانگریس خاص طور پر ان اقلیتوں کی کثیر تعداد کا جو پچھلے سال کانگریس میں شریک ہوئی اور آزادی واستحصال سے نجات کی جدوجہد اور کشمکش میں اس نے جو اجتماعی طاقت پہنچائی ہے اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اپنے کلکتہ کے اجلاس میں اقلیتوں کے حقوق پر جو تجویز پاس کی تھی، اسے بھی کانگریس منظور کرتی ہے۔ نیز نئے سرے سے اعلان کرتی ہے کہ:

''ہندوستان کی اقلیتوں کے تمدنی، مذہبی اور لسانی حقوق کی حفاظت کرنا کانگریس کا پہلا فرض اور بنیادی پالیسی ہے، تاکہ حکومت کی کسی بھی ایسی اسکیم میں جس کا کانگریس شریک ہو، اقلیتوں کو ترقی اور نشوونما کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے، اور وہ قوم کی سیاسی اقتصادی اور کلچرل زندگی میں پورا حصہ لیں سکیں۔''

''بنابریں مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آزاد ہندوستان اور سوراج کی حکومت میں ان کا مذہب اور مذہبی فرائض اذان، نماز، عید، روزہ، حج، زکوٰۃ، مذہبی تبلیغ، مساجد، مقابر، قربانی، مذہبی جلوس، مذہبی جلسے وغیرہ جملہ مذہبی رسوم اور مذہبی ادارے محفوظ ہوں گی۔ اس طرح ان کی تہذیب وتمدن، ان کے تعلیمی ادارے، خانقاہیں، امام باڑے، تکیے، کربلائیں، آثار قدیمہ واوقاف وغیرہ سب محفوظ ہوں گے۔ اسی طرح ان کی زبان، شاعری، رسم الخط وغیرہ سب کے سب آزاد اور محفوظ ہوں گے۔ کسی پر کوئی رکاوٹ اور قید نہ ہوگی۔''

چودھری صاحب کا ایک دعویٰ باطل اور پاکستان کی مثال:

چودھری خلیق الزمان ایک اور دعوے میں کہتے ہیں:

''سب سے پہلے مسلم لیگ نے ۱۹۲۴ء میں لاہور کے اجلاس میں ایک فیڈرل نوعیت کے دستور کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت اس کی نظر میں بھی اس قسم کا دستور ہو سکتا تھا۔''

اس حوالے کے آخری حصہ میں شک وظن ڈال کر چودھری صاحب نے اپنے دعوے کو بالکل کمزور کر دیا ہے۔ بحث کو آگے بڑھانے کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلم لیگ نے ہی فیڈرل طرز کے دستور میں پہل کی تھی۔ لیکن اس میں تعین اختیارات وحقوق کا مسئلہ طے نہ تھا۔ بلکہ چودھری صاحب نے خود اعتراف کیا ہے۔ یہ امر طے نہ تھا۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے فیڈریشن پر اصولی اتفاق ہو بھی جائے تو حقوق واختیارات کی حد بندی کے بغیر اس پر اتفاق رائے نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی صورت اس وقت بھی تھی اور اب تک جاری ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ اب تک طے نہیں ہو سکا۔ آئین سازی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی رہی ہے۔ پہلے تو مرکز اور صوبوں کے درمیان تقسیم اختیارات اور حقوق وفرائض کے تعین پر اتفاق رائے نہ ہوا۔ ۱۹۷۳ء کے آخر میں اس مسئلے کا حل ڈھونڈھا گیا اور اتفاق رائے سے یہ مسئلہ طے پا گیا۔ اگرچہ بعض سیاسی جماعتوں نے اپنے جماعتی منشور سے انحراف کر کے ملک کی سلامتی اور مستقبل کی خاطر ۷۳ء کے آئین میں دی گئی صوبائی خود مختاری کو تسلیم کیا، مرکز کو بہت زیادہ اختیارات دیے، لیکن مرکز کی جانب سے وہ کم از کم اختیارات بھی صوبوں کو ابھی تک نہیں مل سکے اور آج بھی مرکز اور صوبوں کے درمیان اس مسئلے پر تنازعات کھڑے ہیں۔ ۷۳ء کے آئین میں دی گئی صوبائی خود مختاری سے مرکز نے ہمیشہ انحراف کیا۔ مرکز نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے صوبہ بلوچستان کے سردار عطا اللہ خان مینگل کی اکثریتی وزارت کو ختم کیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں جن میں چیف منسٹر بلوچستان اور ممبر نیشنل اسمبلی اور سردار خیر بخش مری ممبر نیشنل اسمبلی کے علاوہ صوبائی اسمبلی کے کئی ممبران سینٹ میں قائد حزب اختلاف محمد ہاشم خان غلزئی (جن کا تعلق صوبہ بلوچستان سے ہے) گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ بلوچستان میں ایسی جماعت کی حکومت مسلط کر دی گئی جس کا صوبائی اسمبلی میں ایک ممبر بھی نہ تھا۔ صوبہ سرحد میں اس جماعت کے پچاس کے ایوان میں صرف تین ممبر تھے یہاں بھی اس جماعت کی حکومت مسلط کر دی گئی اور اکثریتی جماعت نیپ کو حزب اختلاف کے بنچوں پر دھکیل دیا گیا۔ اس داستان سرائی کا مطلب صرف یہ ہے کہ حقوق واختیارات کے تعین کے باوجود مرکز نے سیاسی مقصد براری کے لیے آئین کی بے حرمتی کی۔ ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ نے فیڈرل نظام کا مطالبہ ضرور کیا لیکن جیسا کہ چودھری

صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ حدود اختیارات کا تعین نہیں ہوا تھا بلکہ امید ظاہر کی ہے کہ اس قسم کا دستور ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ مولانا نے پیش کیا یعنی مرکز کے پاس محدود اختیارات ہوں، جن میں میں صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے شعبہ جات ہوں اور باقی تمام اختیارات صوبوں کو سونپ دیے جائیں۔ مولانا نے اس وقت کی ملکی فضاء جو شکوک وظنون سے بوجھل، توہمات اور عدم اعتماد سے لبریز، وسوسوں اور اندیشوں سے بھرپور اور خود اعتمادی سے محروم تھی، اس کو صاف، واضح اور غیر مبہم بنانے کے لیے ٹھوس تجویز پیش کی تھی۔ چودھری صاحب نے تو یہ کہہ کہ ''اس کی نظر میں بھی اس قسم کا دستور ہو سکتا تھا۔'' مولانا کی کاوش کو کمتر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ اپنے دعوے کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر گئے کہ اس قسم کا دستور نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات نے درست ثابت کر دکھایا اور پاکستان ابھی تک دستوری بحران میں پھنسا ہوا ہے نہیں معلوم یہ سلسلہ کب تک دراز ہوتا چلا جائے گا۔'' (ابوالکلام آزاد اور......ص ۱۸۹۔۱۸۵)

۱۹۳۹ء

شرکت کانگریس.....ایک فتویٰ:

۱۳ رجنوری ۱۹۳۹ء: غلام مصطفیٰ صاحب (صوبہ سرحد) کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

''کانگریس میں شامل ہو کر مسلم حقوق کی حفاظت اور تحصیل کرنے کا جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کی شرکت کانگریس آیات محولہ (قرآنی) کے خلاف نہیں کیوں کہ آیات میں موالات ممنوع ہے نہ مطلق شرکت ورنہ تو شرکت تجارت، شرکت زراعت وغیرہ تمام شرکتیں ممنوع ہوتیں۔ خصوصاً شرکت اسمبلی بدرجۂ اولیٰ حرام ہو جاتی۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی''

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۱۴ رجنوری ۱۹۳۹ء: آج مسلم لیگ کے لیڈر جی ایم سید نے اللہ بخش سومرو کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کر دی۔ انھوں نے پینتیس الزامات پر مشتمل ایک فہرست ہاؤس میں پڑھ کر سنائی۔ کانگریس پارٹی غیر جانب دار رہی۔ لیکن بتیس ممبروں نے تحریک کے خلاف ووٹ دے

کرا سے نا کام بنا دیا۔ (کاروان احرار: ج ۴، ص ۱۷)

زمینداریوں کے خاتمے کی تحریک:

۳۰ رجنوری ۱۹۳۹ء: چودھری محمد شریف خاں (سہارن پور) نے مولانا مفتی محمد کفایت اللہ سے یو پی میں زمینداری کے خاتمے کے حوالے سے قانون سازی اور اس کی خلاف تحریک کے جواز اور متعلقات کے بارے میں درج ذیل سوالات کیے تھے۔

(۱) ایسے قوانین جن کی رو سے مالک زمین یعنی زمیندار کو اپنی زمین کاشتکار سے چھڑانے یا دوسرے کاشتکار کے پاس تبدیل کرنے اور لگان کو اپنی مرضی سے طے کرنے کا اختیار نہ رہے شرعاً جائز ہیں یا نہیں؟

(۲) اگر جائز نہیں تو ایسے قوانیں بنانے میں مسلم ممبروں کو تائید کرنی جائز ہے یا نہیں؟

(۳) اور ایسی جماعت جو ان قوانین کی مؤید ہو اس میں مسلمان علماء، صلحا اور عام مسلمانوں نیز اسلامی جماعتوں کا شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟

(۴) اگر ایسے ناجائز قوانین جبراً نافذ کیے جائیں تو ان کے خلاف احتجاج کرنا یا اور کوئی عملی قدم اٹھانا جس کا نتیجہ جنگ و جدل اور قتل و غارت ہو جائز ہے یا نہیں؟

(۵) ایسے قوانین کی مخالفت میں علماء پر عوام کی نسبت کچھ زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا ان پر کوئی خاص ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ چودھری محمد شریف خاں صاحب (سہارنپور) ۸ رذی الحجہ ۱۳۵۷ھ م ۳۰ رجنوری ۱۹۳۹ء

حضرت مفتی صاحب نے اس کا یہ جواب دیا:

ایسے قوانین جن سے مالکان زمین کے (جائز) مالکانہ حقوق تلف ہوتے ہوں، ناجائز ہیں۔ ایسے قوانین وضع کرنا بھی ناجائز اور ان کی تائید کرنا بھی ناجائز اور اس عمل میں اس جماعت کی حمایت بھی ناجائز۔ اور جبراً نافذ کرنے کی صورت میں مسلمانوں پر بقدر استطاعت مدافعت بھی لازم ہے۔ موجودہ قوانین میں بھی سیکڑوں دفعات اسلام کے خلاف موجود ہیں جو انگریزی حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں۔ شاردا ایکٹ بھی بعض مسلمانوں کی تائید سے نافذ ہو چکا ہے اور آج بھی نافذ ہے۔ قانون شہادت کا بیشتر حصہ شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے۔ خود زمین کے موروثی ہو جانے کا قانون بھی انگریزی حکومت کا موجود اور نافذ ہے۔ انگریزی حکومت نے سیکڑوں مرتبہ

مداخلت فی الدین کا ارتکاب کیا ہے اور کر رہی ہے آج بھی اس کی حرکتیں مرکز اسلام کو تباہ کرنے کے لیے مصروف عمل ہیں۔ یہ تمام باتیں پیش نظر رکھ کر کوئی اقدام کیا جائے تو صحیح ہوگا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

یوپی کی کانگریس حکومت نے زمینداریوں کی ضبطی کے لیے قانون بنانا چاہا تو یوپی کے مسلمان اور ہندو زمینداروں نے حکومت کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا۔ اس کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اس میں اسلام اور بعض علمائے دین کے فتوے کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ حال آں کہ انگریز کی غلامی سے کامل نجات کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پورے استحصالی نظام کو مٹا دیا جائے اور برٹش استعمار کے مفاد نے عوام اور حکومت کے درمیان جو زمینداروں کا طبقہ اپنے آلۂ کار کے طور پر پیدا کیا تھا، اسے ختم کر دیا جائے اس طبقے میں بلا تخصیص ہندو اور مسلمان...... دونوں قوموں کے لوگ شامل تھے۔ لیکن کانگریس حکومت نے جیسے ہی زمینداریوں کے ختم کرنے کے لیے بل اسمبلی میں پیش کیا، زمینداروں نے ایکا کر کے حکومت کے خلاف محاذ بنالیا۔

افسوس کہ ان علماء کو انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین جو اسلامی شریعت کے قطعاً خلاف اور مداخلت فی الدین کے حکم میں داخل تھے اور جو لیگی مسلمان ارکان اسمبلی کے تعاون سے پاس ہوئے تھے، نظر نہ آئے، نہ ان کی اسلامی غیرت جاگی اور نہ ان کی دینی جمیت نے کروٹ لی۔ اب جب کہ تیسری قوت کے اشارے پر قومی حکومت کو ناکام بنانے اور انگریز کی نظر میں سرخ رو ہونے کی ضرورت پڑی تو شریعت کے احکام اور اسلامی فتوؤں کے اسلحہ سے مسلح ہو کر غیر مسلم زمینداروں کے تعاون سے مقابلے کے لیے نکل آئے۔

حال آں کہ وہ زمینداریاں جو ۱۸۵۷ء کے بعد ملک وقوم سے غداری کے صلے اور برٹش حکومت کے بقا اور استحکام کے انعام میں باقی رہی تھیں یا نئی قائم ہوئی تھیں، وہ جائز ہی کب تھیں ، چہ جائے کہ ان کے بقا کے جواز کا سوال پیدا ہوتا، یا ان کے خاتمے کے لیے قانون سازی خلاف شریعت قرار پاتی اور اس کے خلاف جد و جہد میں مرنا شہادت ہوتا! حضرت مفتی صاحبؒ نے زمینداریوں کے خاتمے کے لیے قانون سازی کے عدم جواز کا اور ان کے تحفظ کے لیے جد و جہد کے جواز کا فتویٰ دیا ہے بہ شرطے کہ زمینداریوں کا وجود جائز ہو۔ ساتھ ہی مفتی صاحب مرحوم نے ان متعدد قوانین کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو انگریزی حکومت نے انھیں مسلمان زمیندار ارکانِ

اسمبلی کے تعاون سے خلاف شریعت اسلامیہ بنائے تھے، ان کے خاتمے کے لیے بھی انھیں جد و جہد کرنی چاہیے اور اس راہ میں قتل ہو کر شہادت کے درجے پر فائز ہونے کی آرزو کرنی چاہیے۔

۱۹۳۷۔۳۹ء میں قومی حکومت کو ملک اور قوم کی خدمت کی جو مہلت ملی تھی، اس وہ اپنے اجتماعی قومی اور انسانیت عامہ کے مفاد کے اس منصوبے میں کامیاب نہیں ہوسکی، البتہ وطن کی آزادی کے بعد نہ صرف یوپی میں جب کہ پورے ملک میں کانگریس اور تمام مسلمان اور غیر مسلمان انقلابی قوتوں اور افراد و خاندان کے مفاد کے مقابلے میں اجتماعی قومی و ملکی مصالح اور فلاح انسانیت کے نصب العین پر یقین رکھنے والی جماعتوں نے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دے دیا۔ یہ کارنامہ اسی لیے ممکن ہوسکا کہ ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے والی تیسری قوت موجود نہیں تھی۔

ہندستانی زبان:

۲۲رفروری ۱۹۳۹ء: سابق صدر کانگریس اور گاندھی کے مخصوص (معتمد رفیق کار) بابو راجندر پرشاد نے ۲۲رفروری ۳۸ء کی شام کو آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن سے کیا کہا تھا؟ یہ کہا تھا:

''ہندستانی اس بولی کو کہتے ہیں جس کو اتر ہندوستان کے سب ہی رہنے والے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہ ناگری اور فارسی دونوں اچھروں میں لکھی جاتی ہے۔ کانگریس نے اسی کو سارے ہندوستان کے لیے قومی زبان یا راشٹر بھاشا مان لیا ہے۔ اور جہاں کے لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے وہاں اس کے پھیلانے کی کوشش کی جاری ہے۔ اس لیے اس کی عزت اور بھی بڑھ گئی ہے۔''

اور پھر صحیح ہندوستانی کے نمونے کے طور پر ذیل کی عبارت ایک انگریزی خبر سے ترجمہ کر کے سنائی تھی۔

''فیڈرل لے جس لیچر کے لیے رائے دینے والوں کی فہرست تیار کرنے میں جو شروع کارروائی کی جائے گی اس کو لا ممبر سران ان سرکار نے آج اسمبلی میں کچھ بتلایا۔''

سودے بازی یا اصولی مانگ

کیم مارچ ۱۹۳۹ء: سر محمد یامین خاں نے اپنی آپ بیتی ''نامۂ اعمال'' میں ایک دعوت کی

روداد لکھی ہے۔ یہ دعوت سر ضیاء الدین خاں نے کی تھی اور اس میں مسٹر محمد علی جناح، چودھری ظفر اللہ خان، سید محمد حسین اور صاحب نامۂ اعمال کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس روداد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح نے پاکستان کو مسلم لیگ کا کریڈ کب، کن حالات اور کس پس منظر میں بنایا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ نامۂ اعمال کا یہ ''سولھواں باب'' ہے اور اس کا عنوان ہے: ''پاکستان کو مسلم لیگ اپنا اصول بنائے'' اور ذیلی عنوان ہے: ''پاکستان کا خیال'' (ص ۲۶-۷۲۵) سر یامین خاں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ضیاء الدین نے لنچ پر مجھ کو، مسٹر جناح، سر ظفر اللہ خاں، سید محمد حسین بیرسٹر الہ آباد کو بلایا۔ میرے ایک طرف مسٹر جناح بیٹھے تھے اور دوسری طرف سر ظفر اللہ خاں۔ مسٹر جناح کے دوسری طرف سید محمد حسین تھے اور سر ظفر اللہ خاں کے دوسری طرف ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ لنچ کھاتے میں سید محمد حسین نے چیخ چیخ کر جیسی کہ ان کی عادت ہے کہنا شروع کیا کہ چودھری رحمت علی کی اسکیم کہ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ و بلوچستان ملا کر بقیہ ہندوستان سے علاحدہ کر دیے جائیں۔ ان سے پاکستان اس طرح بنتا ہے کہ پ سے پنجاب الف سے افغان یعنی صوبہ سرحدی۔ ک سے کشمیر۔ س سے سندھ۔ تان بلوچستان کا آخیر ہے۔ چوں کہ سید محمد حسین زور زور سے بول رہے تھے سر ظفر اللہ خاں۔ نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ اس شخص کا حلق بڑا ہے مگر دماغ چھوٹا ہے سر ظفر اللہ خاں ان کی مخالفت کرتے رہے کہ یہ نا قابل عمل ہے۔ مسٹر جناح دونوں کی تقریر غور سے سنتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے کہ اس کو ہم کیوں نہ اپنا لیں اور اس کو مسلم لیگ کا کریڈ بنائیں ابھی تک ہماری کوئی خاص مانگ نہیں ہے۔ اگر ہم اس کو اٹھائیں تو کانگریس سے مصالحت ہو سکے گی۔ ورنہ وہ نہیں کریں گے۔ میں نے کہا کہ مغربی علاقے کے واسطے یہ کہہ رہے ہیں۔ مشرقی علاقہ کا کیا ہوگا؟ مسٹر جناح نے ذرا غور کیا اور بولے کہ ہم دونوں طرف کے علاقوں کو علاحدہ کرنے کا سوال اٹھائیں گے۔ بغیر اس کے کانگریس قابو میں نہ آئے گی۔ میں نے کہا ابھی کئی دن ہوئے کہ بھائی پرمانند نے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا اور آپ نے جواب ٹھیک دیا تھا۔ اگر بارگیننگ یعنی سودے بازی کے لیے یہ مسئلہ لیگ کا کریڈ یعنی اصولی مانگ بنا کر اٹھایا جائے تو پھر ہٹنا مشکل ہوگا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ہم کانگریس کا ردعمل دیکھیں گے۔ اس پر یہ معاملہ ختم ہو گیا چوں کہ یہ کھانے کی میز کی گفتگو تھی۔''

مسلمانوں کی کلچرل اٹانمی:

۳/تا۶/ مارچ ۱۹۳۹ء: جمعیت علماے ہند کا گیارھواں سالانہ اجلاس مولانا عبدالحق مدنی کے زیر صدارت ۳ تا ۶/ مارچ ۱۹۳۹ء دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں متعدد اہم تجاویز پاس ہوئیں۔ من جملہ ان کے ایک اہم تجویز مسلمانوں کی کلچرل اٹانمی (تہذیبی خود مختاری) کے متعلق تھی۔ جس میں کہا گیا ہے:

''چوں کہ مسلمانان ہند کا پرسنل لا مخصوص و ممتاز پرسنل لا ہے اور ملت اسلامیہ ایک مستقل ملت ہے۔ اس ملت کی اسلامی زندگی اور تہذیب کے بقا کے لیے از بس ضروری ہے کہ ایک بااختیار نظام قائم ہو۔ حکومت برطانیہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں پرسنل لا اور کسی ایسے نظام کے لیے کوئی چیز نہیں رکھی چوں کہ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی مسلمانوں کو ایک ملت تسلیم کیا اور ان کے پرسنل لا کے تحفظ و آزادی کا وعدہ کیا ہے اور صوبہ جات میں صوبجاتی حکومتیں بھی قائم ہوگئی ہیں۔ اس لیے جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ بحالات موجودہ ایک مسودہ قانون کلچرل اٹانمی کے اصول پر مرتب کیا جائے اور اس کو صوبجاتی مجالس قانون ساز میں پیش کر کے پاس کرانے کی سعی کی جائے۔ جس کے ذریعے مسلمانوں کی ملی و معاشرتی ضروریات پوری ہوسکیں۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کا مرتب کردہ مسودہ بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ایسا مسودہ مرتب کرنے کے لیے ذیل کی سب کمیٹی معین کی جاتی ہے۔ یہ سب کمیٹی آئندہ مئی ۱۹۳۹ء تک اپنی رپورٹ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے سامنے پیش کردے۔ اس کمیٹی کو اضافۂ ارکان کا حق ہوگا اور اس کے داعی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب ہوں گے:

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب (داعی)

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی (رکن)

مولوی امین احسن صاحب اصلاحی (رکن)

محرک: مولانا مفتی محمد نعیم صاحب

مؤید: مولانا بشیر احمد صاحب

تائید مزید: مولانا حفظ الرحمن صاحب

جمعیۃ علماء ہند کی پالیسی کا اعلان:

اس تجویز کے بعد سب جیکٹ کمیٹی اور جمعیۃ عمومیہ کے سامنے حسب ذیل اعلان پڑھا گیا، اعلان پر مختلف حضرات نے تقریریں کی۔ یہ اجلاس مسلسل شام تک جاری رہا۔ درمیان میں نماز اور کھانے کے لیے ملتوی ہوتا رہا۔ عصر کی نماز کے بعد اس اعلان میں ترمیموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مغرب کی نماز کے بعد جملہ ترمیمیں واپس لے لی گئیں۔ لیکن صرف ایک ترمیم پر ووٹ لینے کی نوبت آئی۔ رائے شماری سے قبل اصل محرک مولوی مفتی محمد نعیم صاحب نے ترمیم کو منظور کر لیا اور اعلان کے متعلق ذیل کی تجویز منظور کر لی گئی۔

تجویز نمبر ۶: جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتا ہے کہ جمعیۃ علماء کی طرف سے حسب ذیل اعلان کر دے:

اعلان

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس شریعت حقہ کی روشنی میں اور اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جو اس پر خدائے عزوجل اور سید المرسلین رحمۃ للعالمین ﷺ کی مقدس امانت کا حامل ہونے اور اسی مقدس امانت قوم و وطن کی حفاظت کے فریضے کی جہت سے عاید ہوتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی بصیرت کے لیے حسب ذیل حقائق کا اظہار و اعلان کرتا ہے۔

(۱) مسلمان کی فطرت میں آزادی کی محبت اور مخلوق کی غلامی سے نفرت قدرت نے ودیعت رکھی ہے۔ ہر راسخ العقیدہ مسلمان آزادی حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی جدوجہد کے لیے آمادہ اور جانی و مالی قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

(۲) جمعیۃ علماء ہند کا یوم تاسیس سے مطمح نظر اور نصب العین یہی رہا ہے کہ ہندوستان برطانوی امپیریلزم کے تسلط و اقتدار سے نجات پائے۔

(۳) تمام عقلاء و رہنمایانِ ہندوستان کے نزدیک یہ مسلمہ مسئلہ رہا ہے کہ ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے نکالنے اور کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے تمام اقوام ہند کی مشترکہ اور متحدہ جدوجہد ضروری ہے۔ جب تک امپیریلزم کے خلاف تمام اقوام ہند متحدہ محاذ پیش نہ کریں اور جنگ آزادی میں دوش بدوش کام نہ کریں۔ بظاہر اسباب ہندوستان کی نجات ناممکن ہے۔

(۴) جمعیۃ علماء ہند نے اسی نظریے کے ماتحت گذشتہ دور میں ہندوستان کی مشترکہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس سے جنگ آزادی میں اپنی مستقل حیثیت برقرار رکھتے ہوئے اشتراک عمل کیا اور اپنی مجاہدانہ دیرینہ روایات کو سرفروشانہ اقدام کے ذریعے سے ثابت بلکہ روشن کر دیا۔

(۵) مگر بدقسمتی سے یہ جدو جہد منتہائے مقصد (آزادی کامل) تک پہنچانے سے قبل درمیان میں رک گئی اور برطانوی امپیریلزم نے اپنی عیارانہ حکمت عملی سے ہندوستان کے سامنے (گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی صورت میں) حکومت ہند کا دستور جدید پیش کر دیا۔ اس دستور جدید کے وضع کرنے میں چند ہندوستانی بھی شریک کیے گئے۔ جن میں خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کے ارکان بھی تھے۔ مسلم ارکان نے دستور کی جمہوری اصول پر تشکیل کرنے سے اختلاف نہیں کیا اور اپنی طرف سے کوئی ایسا مطالبہ پیش نہیں کیا۔ جس میں مسلم حکومت یا اس کی جداگانہ تشکیل ہو۔

(۶) کانگریس اور اس کے ساتھ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی اور دیگر مسلمانوں نے اس ناقص اور غیر اطمینان بخش دستور کو چلانے اور اس کے ماتحت کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ کانگریسی اور غیر کانگریسی سب اسی دستور جدید کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ اسمبلیوں میں سب شریک ہیں اور اجتماعی قوت سے حکومت کی مشینری کو چلا رہے ہیں۔

(۷) اگر چہ دستور جدید نافذ ہو گیا تاہم اس میں شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان کے اصل مطالبہ آزادی کامل کو پورا نہیں کرتا۔ اور اس کے ذریعہ سے ملے ہوئے اختیارات اتنے کمزور اور ناقابل اعتبار ہیں کہ ہر وقت دستور کے فیل ہونے اور حکومت ٹوٹ جانے کا خطرہ لگا ہوا ہے۔

(۸) اس التوائے جنگ اور تعمیری زمانے میں مسلمانوں کے سامنے یہ اہم مسئلہ ہے کہ مسلمان انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کریں یا نہیں؟

جمعیت علماء اس مسئلے پر پورے تعمق نظر اور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جب کہ مسلمان اس دستور جدید کے جمہوری اصول اور مشترک ذمہ داری کو عملاً تسلیم کر چکے اور اس کے ماتحت اسمبلیوں اور کونسلوں میں باوجود اپنی قلت اور غیر مسلم ارکان کی اکثریت کے شریک ہو رہے ہیں اور حکومت کی مشینری کو باہمی اشتراک عمل سے چلا رہے ہیں تو اسلامی اصول اور عقل و بصیرت کی روشنی میں ان کو کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل بھی ضروری ہے۔ یہ اجلاس مسلمانان ہند سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ وہ ہر شہر اور دیہات میں کانگریس کے باضابطہ ممبر بنیں اور تمام کانگریس کمیٹیوں میں شریک ہو کر عملی کارروائی میں حصہ لیں۔ کیوں کہ ملک کی آزادی اور ملت اسلامیہ کے

قومی اور مذہبی حقوق کے حاصل کرنے کا اور ان کے تحفظ کا دستوری طریق سے یہی راستہ ہے۔

(۹) لیکن جمعیۃ علماء ہند نے کسی وقت اپنی مستقل حیثیت کو فنا نہیں کیا اس نے گذشتہ جنگ کے دور میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل تو کیا اور اس کی مبارک اور مشکور مساعی سے مسلمانوں کی قربانیاں ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت زیادہ رہیں تاہم اس نے یہ تمام کام اپنے پلیٹ فارم سے کیے اور آیندہ بھی وہ اپنی مستقل حیثیت برقرار رکھنے کی پالیسی پر قائم ہے۔

(۱۰) جمعیت علماء پر مخالفین کا یہ نہایت غلط الزام بلکہ افتراء ہے کہ اس نے ہر موقعے پر کانگریس کی جا و بیجا حمایت کی ہے یا اس کی ہر بات کو تسلیم کر لیا ہے۔ جمعیۃ علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ جس کے دستاویزی شواہد اس کے ریکارڈ اور اخبارات کے فائلوں میں موجود ہیں کہ جمعیۃ نے ہر موقعے پر کانگریس کی ان تجاویز اور اعمال پر سخت نکتہ چینی کی ہے جن کو مسلم مفاد کے خلاف پایا۔ نہرو رپورٹ پر تنقید و تبصرہ اور کانگریس کے مجوزہ ہندو مسلم تصفیہ کے فارمولے سے اختلاف اور جدید فارمولے کی تشکیل و ترتیب جمعیت نے کی، یہ سب باتیں کانگریس کے فائلوں میں موجود ہوں گی۔ کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی کہ جمعیت نے کسی ایسی بات کو تسلیم کر لیا ہو، یا سراہا ہو جس کو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف یقین کیا جا سکتا ہو۔

(۱۱) جمعیت تمام مسلمانوں کو بتا دینا چاہتی ہے کہ وہ اپنے اصل مطالبۂ آزادی کامل کی تحصیل سے غافل نہیں ہے اور ان مسلمانوں سے جو کانگریس میں شریک ہوں مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اسلام کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے حکومت کی ہر اس تجویز کی شدت سے مخالفت کریں جس سے آزادی کامل کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو یا جس کا اثر ملت اسلامیہ یا اسلام کے خلاف ہو۔

(۱۲) جمعیت علماء یہ اعلان کرتی ہے کہ موجودہ وطنی حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی مذہبی اور قومی ضروریات کو پامال کرنے یا بے اعتنائی برتنے کی صورت میں جمعیت علماء مدافعت کی مؤثر تدابیر کام میں لائے گی اور تدارک نہ کیے جانے کی صورت میں جمعیت علماء ہی پہلی جماعت ہوگی جو وطنی حکومت کے خلاف محاذ جنگ قائم کر کے ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے سے دریغ نہ کرے گی۔

(۱۳) جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک اقوام ہند کا اتحاد یا اتفاق صرف اس معنی میں ضروری ہے کہ برطانوی امپیریلزم کے خلاف تمام ہندوستانی متحدہ محاذ میں شریک عمل ہوں۔ یہ نہیں کہ تمام ہندوستانیوں کی وضع اور تہذیب ایک ہو جائے۔ مسلمان اپنی اسلامی تہذیب، اسلامی عقاید اور اسلامی

اعمال، اسلامی وضع سے سرمو ہٹنا گوارا نہیں کرسکتا۔ نہ وہ کسی غیر اسلامی تہذیب کو قبول کرسکتا ہے۔
(۱۴) جمعیۃ علماء ہند تمام مسلمانان ہند کو بتا دینا چاہتی ہے کہ مستقبل میں اسلام کو ہولناک خطرات سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی یہی سبیل ہے کہ وہ جمعیت علماء کو قوی اور مستحکم بنائیں۔ اور اس کی ہدایات پر عمل کریں کیوں کہ ناموس اسلام کے محافظ یہی نائبان رسول کریم ﷺ ہیں۔
(جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۱۳۔۸)

جمعیت علمائے ہند کے اسی اجلاس میں ودیا مندر اسکیم کے بارے میں ایک قرارداد میں کہا گیا ہے:
"جمعیت علماء ہند کا یہ اجلاس ودیا مندر سسٹم کے متعلق یہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت سی پی کا اس نام کے باقی رکھنے پر اصرار درست نہیں اور مسلمانوں کو بیت العلم یا مدینۃ العلم نام رکھنے کی اجازت دینے سے وہ سوال حل نہیں ہوتا جو تعلیم کو غیر فرقہ وارانہ اصول پر عام کرنے کے متعلق تھا جمعیت کا خیال یہ ہے کہ حکومت کے زیر اہتمام جو ٹرسٹ عام تعلیم کے لیے قائم ہو اس کے نام کو بھی فرقہ وارانہ امتیاز یا اس کے شائبے سے پاک ہونا چاہیے۔
اس قرارداد میں ایک غلطی فہمی کارفرما ہے کہ گویا حکومت سی پی نے مسلمانوں کو اجازت دے دی ہے کہ وہ اگر چاہیں تو "ودیا مندر" کے بجائے بیت العلم یا مدینت العلم کا نام رکھ سکتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ "بیت العلم" کا نام مسلمانوں کے شور وغوغا سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ ودیا کے ساتھ اول روز سے تجویز کر دیا گیا تھا۔

علامہ اقبال کی تعزیت:

علامہ اقبال مرحوم کو سیاسی مفکر اور رہنما کی حیثیت سے جمعیت علمائے ہند کے حلقے میں کبھی پذیرائی نہیں ملی۔ چناں چہ علامہ مرحوم کے انتقال سے چند ماہ قبل تصور قومیت کے مسئلے میں ایک شدید کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ایک صاحب فکر اسلامی شاعر کی حیثیت سے ان کے مقام کا کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ علامہ اقبال مرحوم کے انتقال پر تعزیت کی قرارداد بھی جمعیت کے اسی گیارھویں اجلاس مورخہ ۳ تا ۶ مارچ ۱۹۳۹ء میں پاس کی گئی تھی:
جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ شاعر مشرق جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو ایک قومی مفکر اور آزادی وطن کے داعی سے ہندوستان کی محرومی سمجھتا ہے اور یہ دعا کرتا ہے کہ حق تعالے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آزادی وطن

کی جو روح ان کے قومی ادب کی جان ہے اس پر مسلمانوں کو چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ جلسہ مرحوم کے صاحبزادوں کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے"۔

اسی اجلاس میں ترکی کے زعیم مصطفیٰ کمال پاشا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ان کی بیگم اور خادم کعبہ مولانا شوکت علی کے انتقال پر بھی گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔

نظارت امور شرعیہ کا منصوبہ:

جمعیت علمائے ہند کے اسی اجلاس میں جو مولانا عبدالحق مدنی کی صدارت میں ۳ تا ۶ / مارچ ۱۹۳۹ء بہ مقام دہلی ہوا تھا، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری کا مکتوب گرامی بھی پیش کیا گیا، جو "نظارت امور شرعیہ" کے متعلق اسکیم پر مشتمل تھا۔ اور اردو اور انگریزی زبان میں طبع کرا کر ممبران اسمبلی اور دیگر مشاہیر و عمایدینِ ملک کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اجلاس ہذا نے اس اسکیم کے پیش نظر تجویز نمبر ۵ منظور کی۔ جو نقل مکتوب کے بعد درج کی جائے گی۔

مکتوب:

مکرمی! السلام علیکم۔ ایک ضروری امر کے لیے یہ عریضہ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس پر آپ خاص توجہ فرمائیں گے۔

آپ کے علم میں ہے کہ ہندوستان میں علماء اور مسلمانوں کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ یہاں کے نظام حکومت میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت، معاشرت اور قوانین مذہبی کے تحفظ کے لیے ایک مخصوص ادارہ قائم کیا جائے۔ لیکن ان بارسوخ حضرات کی وجہ سے جن کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی یہ مطالبہ وہ قوت حاصل نہ کر سکا جس کا یہ مستحق تھا اور انگریزوں کی اس کھلی روش کے بعد جو انھوں نے سو برس کے عرصے میں ہندوستان سے اسلامی تمدن کے مٹانے میں اختیار کی ہے یہ توقع رکھنا کہ وہ آسانی سے اس مطالبے کو قبول کر لیں گے عبث تھا! لیکن اس مقصد کے حصول کی کوشش ہم لوگوں نے حتی الوسع جاری رکھی۔ اب جب کہ موجودہ اصلاحات کے نفاذ نے ہندوستان میں ناقص سہی، لیکن قومی حکومت کی بنیاد رکھ دی ہے اور بعض امور اب ایک حد تک نمایندگان جمہور کی ہاتھ میں آگئے ہیں ان مقاصد کے حصول کی ایک راہ نکل آئی ہے۔

مسلمانوں کا کم از کم مطالبہ یہ تھا کہ ایک بااختیار حاکم امور شرعیہ کی انجام دہی کے لیے مقرر کیا جائے جو قاضی کا تقرر کرے اور مسلمانوں کے تمام مذہبی قوانین اور امور مذہبی (جن کا تعلق صرف

مسلمانوں سے ہو) کا نگراں رہے اور خصوصیت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کا محافظ ہو۔

اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے بہتر راہ تو یہ تھی کہ اعلان بنیادی حقوق (FUNDAMENTEL RIGHTS) کے سلسلے میں ہندوستان کے نظام اساسی میں یہ چیز موجود ہوتی، لیکن افسوس یہ نہ ہوسکا۔ اب موجودہ حالات میں یہ مناسب ہے کہ نظام شرعی کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جائے جو موجودہ اصلاحات کے ذریعے بآسانی چل سکے۔ اس سے اصلی مقصد تو پورا نہ ہوگا۔ لیکن یہ ہوگا کہ کسی نہ کسی درجے میں ناقص نقش ہی تیار ہوجائے گا اور کسی حد تک مسلمانوں کی بعض شکایات ومشکلات کا ازالہ ہوجائے گا۔

اسکیم یہ ہے:

(۱) ہر حکومت میں "ناظر امور اسلامیہ" کا یک عہدہ رکھا جائے (جو مختلف محکموں کے ڈائریکٹر کے مثل ایک عہدہ ہو اور یہ عہدہ دار کسی مسلمان وزیر کے ماتحت ہو اور اس کے متعلق حسب ذیل امور ہوں:

(الف) مسلم اوقاف

(ب) تقرر قضاۃ یا تفویض اختیارات قاضی یا جیوری کے تعین میں مشورہ دینا۔

(ج) ہندوستانی بین الاقوامی معاملات کے متعلق اسلامی بین الاقوامی اصول کے ماتحت حکومت کو مشورہ دینا (اس کی رائے کا ان معاملات میں اکسپرٹ (ماہر) کی رائے کی حیثیت سے لحاظ رکھا جائے)

(د) تعلیم کے ہر صیغے اور درجے میں مذہبی تعلیم کا نظم یا نگرانی (جیسی صورت حال اور ضرورت ہو) اسی کے ماتحت ہو۔

(ہ) مسلمانوں کے "پرسنل لا" کے متعلق قانون سازی کی نگرانی اور اس کے متعلق اگر کوئی غلطی ہورہی ہو یا کسی ذریعے سے ہوگئی تو حکومت کو اصلاح کے لیے مشورہ دینا۔

(۲) ناظر امور اسلامیہ کے ساتھ ایک مختصر مجلس مشورہ لائق مسلمانوں کی ہو۔

(۳) تمام تقرر اور انتخابات مؤقت ہوں۔

(۴) الف: متذکرہ محکمہ کے ساتھ ساتھ حکومت ایک قانون فسخ نکاح اور طلاق وتفریق وخلع وغیرہ کے لیے اسلامی اصول کے ماتحت پاس کرائے جس سے وہ مشکلات دور ہوجائیں جو موجودہ

عہد میں شرعاً قاضی، مجتہد کے فقدان سے لاحق ہیں اور ہوں گی۔

(ب) تقرر قاضی کے لیے فی الحال یہ صورت اختیار کی جائے کہ مسلمان منصف اور جج کے تقرر کے معیار میں اس کا لحاظ رکھا جائے کہ فقہ اسلامی کی براہ راست معلومات ان کو ہوں یا اقل درجہ اس خاص صنف میں ہندوستانی (اردو) میں ضروری تالیفات مہیا کردی جائیں۔ (اور اس کا ڈیپارٹمنٹل امتحان بھی لے لیا جائے) اور تفویض اختیارات کے وقت ہائی کورٹ یا جوڈیشنل محکمہ جس کے بھی حدود ہوں ان ہی حکام کو نکاح، طلاق، اور تفریق وغیرہ مقدمات کی سماعت کے اختیار دے۔

(ج) ان مقدمات کی سماعت کا ضابطہ اسلامی آداب قضا کے مطابق اردو میں تیار کردیا جائے۔ اس طرح تقرر قضاۃ کا مسئلہ بغیر کسی مزید مالی بار کے کسی حد تک حل ہو جائے گا۔
ناظر امور اسلامیہ مسلم اوقاف کے ساتھ دوسرے امور کو انجام دے گا۔ تو کوئی مزید مالی بار بھی حکومت پر ایسا نہ پڑے گا جو غیر معمولی ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر تہذیب وتمدن اور معاشرت کی بناء مذہب پر ہے۔ اب تک انگریزوں نے مسلمانوں کے تمدن کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے نظریے پیدا کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ''حکومت مذہبی تعلیم کے نظم کی ذمہ دار نہیں ہوسکتی'' اب جب کہ نئی اصلاحات نے صوبوں میں قومی حکومت کی ایک شکل پیدا کردی ہے۔ یہ حکومتیں جیسی کچھ بھی ہوں بہر حال قومی حکومتیں ہیں تو ان کو مسلمانوں کے اس جائز اور واجبی مطالبہ سے کہ تعلیم کے درجہ میں مذہبی تعلیم کا نظم کیا جائے، بے اعتنائی نہ برتنی چاہیے۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ وقت کے تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے۔ اس لیے حکومت اور قوم کو اس طرف فوراً توجہ کرنی چاہیے۔ کیوں کہ مسلمانوں کے لیے ہر اجتماعی وانفرادی اخلاق کی کمزوری، ان کی مذہبی معلومات اور تربیت کی کمی ہی کی وجہ سے ہے اور ایک اصلاح سے ان بہت سی کمزوریوں کی اصلاح بیک وقت ہو جائے گی جو حکومت، قوم، ملک سب کے لیے یکساں مفید ہوگی۔

ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ پھلواری شریف۔ پٹنہ

قرارداد متعلق قانون فسخِ نکاح:

اس اجلاس میں ایک قرارداد قانون فسخِ نکاح کے بارے میں بھی پاس کی گئی۔ اس میں کہا گیا ہے:

مسلمان عورتوں کی دردناک مصیبتوں کا قانونی تدارک کرنے کے لیے جو قانون فسخ نکاح اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا اس کی دفعہ نمبر ۶ قانون کی روح رواں تھی کیوں کہ اسلامی قانون کا مسئلہ ہے کہ فسخ نکاح کا فیصلہ مسلمان حاکم ہی کر سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس دفعہ کے خلاف حکومت اور بہت سے منتخب ارکان اسمبلی نے رائے دے کر اس کو قانون سے خارج کرا دیا۔ اس دفعہ کے نکل جانے سے قانون کی اسلامی روح نکل گئی اور وہ ایک غیر اسلامی ایکٹ ہو گیا جو مضرت کہ قانون نہ ہونے کی صورت میں تھی وہ قانون کے اس شکل میں پاس ہونے سے کم نہیں ہوئی بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے مفاسد بہت زیادہ ہو گئے۔ جمعیت علماء کے نزدیک موجودہ شکل میں یہ قانون ہرگز منظوری کے قابل نہیں۔ سعی کی جائے کہ اس کو وائسرائے کی منظوری حاصل نہ ہو۔ نیز اس کے ساتھ دار القضاء اور نظارۃ اور شرعیہ کے قیام کی سعی کی تیزی اور سرعت کے ساتھ عمل میں لانا چاہیے کہ اس قسم کی ضرورتوں کے پورا ہونے کا وہی باقاعدہ اور صحیح علاج ہے۔

متحرک حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب

مؤید۔ مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب بہاری

واردھا تعلیمی اسکیم پر جمعیت علماء کی رپورٹ:

۳ تا ۶ مارچ ۱۹۳۹ء: جمعیت علمائے ہند کے گیارھویں سالانہ اجلاس دہلی کی انھی تاریخوں میں مجلس عاملہ کے متعدد اجلاس بھی ہوئے ایک اجلاس میں واردھا تعلیمی اسکیم کے متعلق سب کمیٹی نے مطالعے اور غور و فکر کے نتائج کو ایک جامع، متوازن اور مدلل رپورٹ کی صورت میں پیش کیا۔ رپورٹ کو منظور کر لیا گیا۔ چوں کہ مسلم لیگ کے پروپیگنڈے اور عدم واقفیت کی بنا پر عام مسلمان اس کے مخالف تھے اس لیے جمعیت علما نے یہ رپورٹ اخبارات میں اور ٹریکٹ کی صورت میں شائع کر دی تھی۔

مولانا محمد میاں نے اسے ''جمعیۃ العماء کیا ہے؟'' حصہ دوم کے ضمیمے میں بھی شامل کر لیا تھا، چوں کہ یہ ایک اہم رپورٹ ہے۔ اس سے جمعیت علمائے ہند کی سیاسی خدمات کا ایک اہم پہلو نمایاں ہوتا ہے اور اس کی سنجیدہ سیاسی قومی رہنمائی کا یہ ایک یادگار واقعہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسے اس مقام پر درج کر دیا جائے۔ رپورٹ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ہم نے واردھا تعلیمی اسکیم پر غور کیا۔ اول اجمالی طور پر ہم اس کے مفصلہ ذیل بنیادی اصول پر بحث کرتے ہیں:

(۱) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ (۲) نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی دستکاری بھی سکھائی جائے، بلکہ دستکاری ہی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ (۳) ابتدائی تعلیم کو عام اور لازم کرنا۔ (۴) بچوں کے ذہن میں ابتدا ہی سے رواداری اور روشن خیالی پیدا کرنے کے ذرائع اختیار کرنا اور ان کو تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مفید شہری اور کارگزار انسان بنانا۔

مقدم الذکر تین اصول تو بلاشبہ مستحسن اور قابل قبول ہیں۔ البتہ چوتھا اصول اگر اسی قالب میں ہوتا۔ جس میں ہم نے اسے ذکر کیا ہے تو وہ اصول ثلاثۂ مقدمہ کی طرح مستحسن اور قابل قبول تھا۔ لیکن جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب نے اس چوتھے اصول کو اپنی رپورٹ ص ۱۱۱ و ۱۱۸ ص ۱۱۹ (طبع ثانی از رسالہ جامعہ) میں ذکر فرمایا ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ ان کی عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ آیندہ ہندوستان میں اس اسکیم کے ماتحت تعلیم یافتہ ایک تہذیب اور ایک قسم کے عقاید اور مشابہ اعمال کے پابند ہوں وہ تمام مذاہب کی عزت کریں۔ (یعنی تمام مذاہب کو سچا سمجھتے ہوں) اور ان میں مذہبی لحاظ سے کوئی امتیاز باقی نہ رہے، نیز وہ اہنسا کی حقانیت کے معتقد اور اس پر عامل ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ اصول نہ صحیح ہے نا قابل عمل ہے اور اس میں ہندوستان کے مختلف مذاہب اور مختلف رجحانات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کے ساتھ رواداری برتنا اور چیز ہے اور مختلف (بلکہ متضاد مذاہب کو صحیح اور حق سمجھنا بلکہ سب کو ایک سمجھنا اور شے ہے، یہ بات دو ہندو فرقوں مثلاً سناتن دھرمیوں اور جینیوں میں بھی محقق الوقوع نہیں پھر غیر مسلموں اور مسلمانوں میں کس طرح اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے عدم تشدد کو اپنے موجودہ ماحول کی وجہ سے بطور پالیسی اختیار کرلیا تھا اور اب تک اختیار کیے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قرآن حکیم کی آیات جہاد کو بھول گئے یا چھوڑ بیٹھے اور تشدد کو اگرچہ وہ ضروری مواقع میں اختیار کیا جائے۔ گناہ اور پاپ سمجھنے لگے۔ نیز یہ لفظ ایسے انداز سے ذکر کیا گیا ہے۔

جس سے خطرہ ہوتا ہے کہ بچوں کے ذہنوں میں اس کا مفہوم ''جیو ہتھیا'' کے معنی میں بیٹھ جائے گا یا بٹھا دیا جائے گا۔ جس کا اثر مسلمانوں کے ایک خاص معاشرتی اور مذہبی عمل ذبح حیوانات پر بھی پڑے گا۔ اور آئندہ ہندوستان میں یہی ایک چیز ہمیشہ منشاے نزاع بنی رہے گی اور اگر خاکم بدہن یہ اسکیم اس معنی سے کامیاب ہوگئی کہ بچوں کے دماغ میں ابتدا ہی سے ذبح حیوانات اور عقیدۂ جہاد سے نفرت بیٹھ گئی اور سب کے سب انسان اس کو مذموم سمجھنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جدید تعلیم نے مسلمانوں کا ایک مذہبی عقیدہ بدل دیا اور ان کے ایک معاشرتی اور مذہبی حق کو باطل کر دیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بے شمار مختلف مذاہب موجود ہیں بغیر باہمی رواداری کے زندگی گزارنا مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ متحدہ قومیت کا یہ تخیل کہ مسلمان بھی اپنی خالص اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر کسی ایسی تہذیب میں مدغم ہو جائیں گے جس میں اسلامیت اور غیر اسلامیت کا امتیاز نہ ہو۔ اس سے زیادہ مشکل اور بداہتہً محال ہے۔ مسلمان ایسی رواداری کہ جس میں مختلف اور متضاد مذاہب کے لوگ امن واطمینان سے زندگی بسر کریں اختیار کرنے اور برتنے کے لیے نہ صرف مجبور ہیں بلکہ ان کی قدیمی روایات اس کی شاہد ہیں اور اس کے خلاف ان کو کسی ایسی متحدہ قومیت کا درس دینا جس میں اسلامی تہذیب کے نقوش بھی مٹ گئے یا مٹا دیے گئے ہوں، نہ صرف فضول بلکہ فتنہ وفساد کی بنیاد ڈالنا ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رپورٹ میں ابتدائی تعلیم کے خاکہ کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان میں مفصلۂ ذیل امور قابل ترمیم واصلاح ہیں۔ ان کی تفصیل سے پہلے ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ناقابل تزلزل عقیدہ اور یقین راسخ یہ ہے کہ ان کا دین اسلام کے ایمان اور اعمال اور معاشرت اور تمدنی زندگی کے تمام اصول وفروع کو حاوی ہے، ان کی اسلامی تہذیب ممتاز ہے اور اس کی حفاظت کے لیے اسلامی عقاید کی حفاظت ضروری اور لازمی ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی اس کے لیے تیار نہیں کہ اسلامی تعلیم وتہذیب کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کو اختیار کریں وہ سیاسی آزادی سے مذہبی آزادی کو اہم سمجھتے ہیں۔ وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو ان کے اسلامی عقاید یا اعمال یا معاشرت پر مخالفانہ اثر ڈالے۔ ہندوستان میں آٹھ کروڑ یا ساڑھے سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اتنی بڑی قوم کی ضروریات نظر انداز کر کے کوئی حکومت سرسبز نہیں ہو سکتی اور تعلیم کا مسئلہ تو ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ جس پر قوم کے تمام ذہنی نشو ونما کا مدار ہے۔ اس لیے کوئی تعلیمی اسکیم اس وقت تک مقبول اور کامیاب نہیں ہو سکتی جس پر مسلم قوم کے تعلیمی ادارے اور مذہب کے

ماہرین اطمینان ظاہر نہ کریں۔ ہمیں افسوس ہے کہ واردھا تعلیمی اسکیم پر کسی ذمہ دار مذہبی مسلم تعلیمی ادارے کی رائے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور مسلمانوں کی مذہبی جماعت جمعیت علماء سے بھی استصواب نہیں کیا گیا، یہ ایک اصولی غلطی ہے جس کا جلد از جلد ازالہ کر دینا لازم ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اس اسکیم میں حسب ذیل امور کی اصلاح لازم ہے؟

(۱) لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم نہ ہو۔

(۲) جداگانہ لڑکیوں کے اسکول میں بھی لڑکی پر ۱۲ سال کی عمر کے بعد جبری حاضری کی پابندی قبول نہیں کی جاسکتی۔

(۳) مسلمان بچوں کو گانے بجانے اور تال سر کی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔

(۴) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو تصویر کشی یعنی جان دار کی تصویریں بنانا اور سیکھنا جائز نہیں۔

(۵) مسلمان لڑکوں کو اگر وہ جبری تعلیم کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر رہے ہوں جبری تعلیم سے مستثنیٰ کر دینا لازمی ہوگا۔

ان کے علاوہ اسکیم میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہم ابتدائی تعلیم کے زمانے میں مذہبی تعلیم کے لزوم کو ضروری سمجھتے ہیں اور مسلمان لڑکیوں کے لیے امور خانہ داری، گھریلو صنعتوں کی تعلیم کا خاص انتظام چاہتے ہیں۔ یعنی کورس کی ترتیب کے وقت اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ لڑکوں کا کورس لڑکوں کے مناسب حال ہو اور لڑکیوں کا کورس ان کے لائق ہو۔ یہ بھی لازم ہے کہ تعلیم کی پوری اسکیم میں کوئی بات ایسی نہ آنے پائے جو مسلمانوں کے مذہب کے خلاف ہو۔ مثلاً کسی مجسمہ کی تعظیم کرانا یا غیر اسلامی طریق پر پرارتھنا کرانا یا کوئی غیر اسلامی گیت گانا وغیرہ وغیرہ۔

آخر میں ہم جمعیۃ العلماء سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ واردھا تعلیمی اسکیم کے متعلق حسب ذیل مضمون کی تجویز پاس کر دے:

مضمون تجویز:

جمعیۃ علماء ہند واردھا تعلیمی اسکیم کو قابل ترمیم و اصلاح سمجھتی ہے اور اس کے ذمہ دار اصحاب سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جمعیۃ العلماء کی منظوری اور اظہار اطمینان کے بغیر آٹھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کوئی اسکیم نافذ نہ کریں ورنہ مسلمان اسے قبول نہ کریں گے۔ اور ملک میں اختلاف و انتشار پیدا ہونے کی ذمہ داری اسکیم وضع کرنے والوں اور چلانے والوں پر عائد ہوگی۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ،

ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ،

فقیر احمد سعید کان اللہ لہ،

ہم رپورٹ کے تمام اجزاء سے کلی اتفاق رکھتے ہیں مگر مذہبی تعلیم کے بارے میں یہ جدا گانہ رائے رکھتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کا انتظام مشترک حکومت کے ہاتھوں میں مفید نہیں ہے۔ اس لیے مشترک تعلیمی اداروں کی بجائے مسلمانوں کے اپنے انتظام سے ہونا چاہیے۔ البتہ ایسے اسلامی مکاتب کے اجرا کے لیے حکومت سے بھی امدادی رقوم منظور کرائی جائیں اور خود بھی انتظام کریں، نیز اس اسکیم کے نفاذ کے ساتھ ساتھ یہ بھی تصریح کر دی جائے کہ جن مسلم پرائیویٹ مدارس میں مذہبی تعلیم دی جارہی ہے وہ اگر اس اسکیم کے منظور شدہ تعلیمی نصاب کو شامل کر لیں تو ان مدارس کے بچوں کو سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ، نور الدین بہاری۔

مجلس عاملہ کے اس اجلاس نے مذکورہ رپورٹ کو منظور کیا اور اس کے بارے میں ایک تجویز بھی پاس کی جس میں کہا گیا کہ

جمیعت علماء کا یہ اجلاس واردھا تعلیمی اسکیم کے متعلق سب کمیٹی کی اکثریت کی رپورٹ منظور کرتا ہے اور اسکیم میں کمیٹی کی رائے کے موافق اصلاح و ترمیم ضروری سمجھتا ہے اور قرار دیتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے کوئی تعلیمی اسکیم اس وقت تک منظور نہیں کی جا سکتی جب تک وہ نقائص مذکورہ سے صاف نہ ہو اور جمیعت علماء اس کی تصدیق نہ کر دے۔"

جے پور کا خونی حادثہ:

جمیعت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی (زیر صدارت مولانا عبدالحق مدنی) میں جے پور کے حادثے کے بارے میں بھی یہ قرارداد پاس کی گئی:

۲۷ر جنوری ۱۹۳۹ء کو جے پور میں جامع مسجد واقع جوہری بازار کے دروازہ کی توسیع کے مسئلے پر پولیس نے لاٹھی چارج اور اندھا دھند فائرنگ کیا اور جس سے سرکاری گزٹ کے مطابق "......؟ مسلمان اور تین ہندو ہلاک اور ۲۵ زخمی ہوئے اور پھر مختلف صورتوں سے مسلمانوں کو اتنا خوف زدہ اور مرعوب کر دیا گیا کہ صحیح طور پر وہ اخبارات کو اطلاعات ہی نہ دے سکے۔

رفتہ رفتہ جب یہ خبر دہلی پہنچی تو حضرت مولانا احمد سعید صاحب۔ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند نے مولانا، عبدالماجد صاحب دہلوی اور مولانا عظمت اللہ صاحب ملیح آبادی پر مشتمل ایک وفد تحقیقات کے لیے بھیجا۔ ۹رفروری ۱۹۳۹ء کو وفد نے جے پور میں قیام کر کے واقعات کی تحقیق کی اور اس تمام سانحہ کے متعلق رپورٹ مرتب کی۔

یہ رپورٹ اس اجلاس میں پیش کی گئی اور اس رپورٹ کی بنیاد پر مندرجہ ذیل تجویز پاس کی:

''جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس نے حادثۂ فاجعۂ جے پور کے متعلق اپنے نمائندوں کی رپورٹ پر غور کیا۔ علماء کو یقین ہے کہ اس حادثے کی ذمہ داری حکومت اور پولیس کے غیر منصفانہ رویے پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس ریاست جے پور سے مطالبہ کرتا ہے کہ ایک غیر جانب دار اور آزاد کمیشن کے ذریعے اس واقعے کی تحقیقات کرائی جائے اور جن عہدہ داروں اور افسروں پر اس ظالمانہ خوں ریزی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ان کو عبرت آموز سزائیں دی جائیں اور مجروحین کو معاوضے اور مقتولین کے پسماندگان کے گزارے کی سبیل کی جائے۔ قیدیوں کو بلاشرط رہا کر دیا جائے اور جامع مسجد کے دروازے کی توسیع میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے یہ اجلاس ان مسلم جماعتوں کے بعض افراد کے رویہ پر جنھوں نے حکام جے پور کے ساتھ ساز باز کر کے اس حادثۂ فاجعہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی یا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے خون کو ضائع کر رہے ہیں، سخت ملامت اور نفرت کا اظہار کرتا ہے یہ لوگ مسلمانوں کے مفاد کے دشمن ہیں اور امن و امان کے لیے ان کا رویہ بے حد خطرناک ہے۔''

(۱) وفد جمعیت علماء ہند کی رپورٹ کے بموجب ساٹھ مسلمان شہید اور تقریباً ڈھائی سو زخمی ہوئے تھے۔ (جمعیۃ العلماء ہند (دستاویزات اجلاس ہائے عام) مرتبہ پروین روزینہ، ص ۶۴۷)

جمعیت کے جلسے سے عدم سروکار کی نصیحت اور جناح صاحب:

۴رمارچ ۱۹۳۹ء: نئی دہلی، ۲رمارچ قائداعظم محمد علی جناح نے اعلان کیا ہے کہ مسلم لیگ کا کوئی آدمی دہلی میں ہونے والی جمعیت العلماء کانفرنس کے ساتھ کسی قسم کا سروکار نہ رکھے۔ کیوں کہ اس جمعیت کی کارروائیاں مسلم لیگ کے مفاد کے خلاف ہیں بلکہ مسلم لیگ کو تباہ کرنے کی غرض سے اختیار کی جارہی ہیں۔''

(روزنامہ انقلاب، لاہور، ۴رمارچ ۱۹۳۹ء، ص ۱)

جمعیت علماے ہند کے گیارھویں سالانہ اجلاس کے موقع پر مسلمان جماعتوں اور زعما کو دعوت دی گئی تھی کہ جمعیت کے اجلاس میں شریک ہوں اور قومی اور ملی مسائل میں باہم مشورہ و اتفاق راے سے مشترکہ پالیسی اور لائحہ عمل اختیار کریں۔ جناح صاحب کا بیان اسی دعوت کے جواب میں تھا۔

جمعیت علماء کا یہ اجلاس حضرت مولانا عبدالحق مدنی کی صدارت میں ۳ تا ۶ / مارچ ۱۹۳۹ء دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں بہت سی تجاویز منظور ہوئیں۔ اسی اجلاس میں نظارہ امورِ شرعیہ'' کا مسودہ منظور کیا گیا تھا۔'' تہذیبی خود مختاری (کلچرل اٹانمی) کے بارے میں تجویز منظور کی گئی۔ آزادی وطن اور ملکی سیاسیات میں جمعیت علماے ہند کی پالیسی کی وضاحت میں ایک اعلان کا مسودہ منظوری ہوا۔ واردھا تعلیمی اسکیم پر جمعیت کی مقرر کردہ سب کمیٹی کی رپورٹ پر بحث اور آخر میں ایک قرار داد کی صورت میں جمعیت علماء نے اپنے موقف کو بیان کیا، ایک قرار داد میں ہندوستانی زبان کو بدلنے کے کوشش پر تنقید کی گئی، جے پور میں جامع مسجد کے دروازے کی توسیع کے موقع پر بلا جواز پولیس فائرنگ پر غم وغصہ کا اظہار کیا گیا نیز اس حادثے کی تحقیق کے لیے جمعیت نے جو وفد بھیجا تھا۔ اس کی رپورٹ پر غور کیا اور ایک قرار داد میں اس واقعے کی ذمہ دار پولیس اور حکام کے خلاف ضابطے کی کارروائی اور متاثرین کو معاوضہ دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ قرار دادوں کی مجموعی تعداد ۳۴ ہے جو پاس ہوئیں جن کا تعلق مختلف قومی سیاسی، ملی بین الاسلامی، تعلیمی مسائل سے تھا۔ جمعیت کا یہ اجلاس بہت کامیاب رہا۔ جمعیت کے رہنماؤں کے علاوہ مختلف اسلامی، سیاسی جماعتوں کے زعما نے شرکت فرمائی اور مختلف قرار دادوں کی تالیف وترتیب میں حصہ لیا۔ مسلم لیگ نے اپنے قائد کے حکم کے مطابق اس اجلاس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

مولانا سندھی کی ہندوستان واپسی:

۷/ مارچ ۱۹۳۹ء: چوبیس برس کی جلاوطنی کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی ۷/ مارچ کو پانی کے جہاز کے ذریعے کراچی پہنچے۔ بندرگاہ کیماڑی پر سندھ کے وزیر اعظم خاں بہادر اللہ بخش سومرو، ان کی کابینہ کے ارکان، کانگریس کے لیڈر، جمعیت علماء کے رہنما، مجلس احرار سندھ ڈاکٹر محمد عمر اور سیکڑوں عوام نے ان کا پر جوش استقبال کیا۔ خاکساروں کا ایک دستہ بھی موجود تھا۔ اس نے سلامی دی۔ اس موقع پر مولانا سندھی نے عوام سے مختصر خطاب کیا۔

مظہرالدین شیرکوٹی کا قتل:

۱۴/مارچ ۱۹۳۹ء: لیگی اخبار الامان کے ایڈیٹر مولوی مظہرالدین شیرکوٹی کو ان کے اخبار کے دفتر دہلی میں ۱۴/مارچ ۳۹ء کو دو نوجوانوں نے قتل کر دیا۔ مسلم لیگی اخبارات نے اس کا الزام کانگریس پر لگایا ہے لیکن ان کے قتل کا پس منظر خود ان کی بعض کمزوریاں اور اعمال تھے۔ ان نوجوانوں کا تعلق کسی جماعت سے نہ تھا۔ اس قتل کا واقعی پس منظر" دہلی میں اس وقت کے تمام لوگوں کے علم میں تھا۔ اسی لیے لیگی اخبارات بھی خاموش ہو گئے تھے۔ مجھے اصل واقع علاءالدین خالد مرحوم (مالک اردو اکیڈمی سندھ، کراچی) نے بتایا تھا۔ ان کا تعلق دہلی میں حالی پبلشنگ ہاؤس سے تھا۔

محمد علی جناح اور اہل سنت کا فتویٰ:

۲۰/مارچ ۱۹۳۹ء:

محمد عمر خان قادری رضوی لکھنوی کے سوالات

۱۔ مسٹر محمد علی جناح جو ہیں تو کس مذہب، کس عقائد کے ہیں؟

۲۔ ان کو قائداعظم وسیدنا وغیرہ وغیرہ القابات سے خطاب کرنا شرعاً تو کوئی حرج نہیں؟

(۲۹ محرم ۱۳۵۸ھ (سہ شنبہ) از پیپلی بھیت)

کے جواب میں اولاد رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی سجادہ نشین خانقاۂ عالیہ غوثیہ برکاتیہ مارہرہ نے یہ فتویٰ شرعی تحریر فرمایا ہے:

۱۔ مسٹر محمد علی جناح مذہباً رافضی ہیں۔

(بحوالۂ بیان سر محمد یعقوب، اخبار، الامان، دہلی ۱۳/مئی ۱۹۳۹ء)

۲۔ کسی بھی بددین بدمذہب کو قائداعظم وسیدنا وغیرہ وغیرہ القابِ مدح وتعظیم سے خطاب کرنا شرعاً سخت شنیع وتبیع وتطیع اشد، محظور وممنوع وحرام صریح، مخالفِ قرآن مجید وحدیث حمید ہے۔

(مسلم لیگ کی زریں بخیہ گری، ناشر: دفتر جماعت اہل سنت خانقاہ برکاتیہ مارہرہ ضلع ایٹہ، مطبع: سدرشن پریس، ایٹہ، صفحہ۲)

محمد طاہر قاسمی کا جھوٹ:

۱۳/اپریل ۱۹۳۹ء: پیارم پیٹ ضلع نارتھ ارکاٹ سے ایک مستفسر عبدالحق نے ۱۳/اپریل

۱۹۳۹ء کو حضرت مفتی محمد کفایت اللہ کے نام ایک خط لکھا تھا اور اس میں ایک استفسار کیا تھا ذیل میں مستفسر کا خط اور حضرت مفتی کا جواب درج کیا جاتا ہے؛

مستفسر کا خط بنام مفتی صاحب:

''اخبار الامان مورخہ ۹ رمئی ۱۹۳۸ء مسلم لیگ نمبر خاص میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کو جناب مولانا قاری محمد طاہر صاحب قاسمی دیو بندی نے بغرض اشاعت بھیجا ہے اس میں لکھا ہے کہ منجانب خانقاہ امدادیہ۔ تھانہ بھون موجودہ سیاسی فضا کے متعلق مسلم لیگ سے بارہ سوالات اور جمعیۃ العلماء سے گیارہ سوالات کیے گئے مسلم لیگ نے تسلی بخش جوابات دیے مگر جمعیت علماء نے جوابات نہیں دیے بلکہ سکوت اختیار کیا گیا۔ اس کے بعد مسلم لیگ والوں کا تو یہ کہنا ہے بلکہ ہمارے یہاں (بیارم پیٹ) کے جمعیت علماء کے حامیوں میں ایک زبردست برہمی پیدا ہوگئی ہے کہ جمعیۃ علماء نے اگر اس میں صداقت ہے تو کیوں خانقاہ امدادیہ کے سوالات کے جوابات نہ دیے؟ اکثر حامیان جمعیت علماء اس کی اس پالیسی سے بدظن ہو کر مسلم لیگ کے جوابات پر تشفی ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کو حق پر سمجھ رہے ہیں۔ اور یہاں کے متدین لوگوں میں خود شکوک وشبہات کا اظہار کیا جارہا ہے۔ مذکورۂ بالا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے فتنے کا سدباب کرنے کے لیے حضرت استاذی جناب مولانا مولوی مفتی قاری بشیر الدین احمد صاحب مدظلہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ سے خط کے ذریعے میں اس کی تحقیق کرلوں کہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کی طرف سے سوالات کیے گئے یا نہیں اگر کیے گئے تو جمعیۃ العلماء نے کیا جواب دیا اور اگر سوالات نہ بھی کیے گئے ہوں تو براہ کرم مندرجہ ذیل سوالات کا جواب عنایت فرمائیے گا تاکہ عوم کو سمجھانے کے لیے سہولت ہو، کیوں کہ خاص وعام میں ازحد بدظنی پھیل گئی ہے۔ جس کا تدارک ہم پر اور بالخصوص آپ پر بے حد ضروری ہے۔

سوالات منجاب خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون:

''حامداً ومصلیاً ومسلماً!

(۱) جمعیت علماء کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے اور کانگریس سے علیحدگی میں کیا ضرر ہے؟

(۲) کانگریس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت میں سے انفرادی، غیر منظم اور غیر مشروط

طریقے پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلم نشستوں کے لیے کانگریس خود براہ راست امیدوار تجویز کرتی ہے، کیا اس سے اسلام اور مسلمانان ہند کو خطرہ نہیں؟ اگر ہے تو اس خطرہ سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

(۳) مسلم لیگ سے جمعیۃ العلماء کو کیوں اختلاف ہے جب کہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے۔ اور اس کا مقصد بھی آزادی کامل کی تحصیل ہے۔ جیسا کہ اس سال لکھنو کے اجلاس میں اس نے اعلان کر دیا ہے؟

(۴) اگر مسلم لیگ میں کچھ منکرات شرعیہ اور مفاسد موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمعیۃ العلماء مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور نیک افعال لوگوں سے بھر دے اور مسلمانوں کی تنظیم مکمل اور مفاسد و منکرات سے پاک کر دے؟

(۵) کیا مسلم لیگ اور جمعیت علماء کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا نہیں ہوتا اور کیا یہ تشتت مضر نہیں؟ اگر ہے تو جمعیت علماء نے اس ضرر کے انسداد کے لیے کوئی صورت اختیار کی ہے یا نہیں؟

(۶) کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہو گی اس کا انجام ایک حکومت مشترکہ ہے جس میں عنصر کفر غالب اور عنصر اسلام مغلوب ہو گا۔ ایسی حکومت یقیناً اسلامی حکومت نہ ہو گی تو اس کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے لیے کس دلیل سے واجب ہے۔ نیز اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے سایہ میں مسلمانوں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے کانگریس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے اور مسلمانوں پر بازاروں میں، دیہاتوں میں، ملازمتوں اور سرکاری حکومتوں میں جو مظالم وہ برپا کرنے لگے ہیں جمعیت علماء نے اس کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں؟

(۷) کانگریسی وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کاشتکاروں کی مملوک بنا دینے کی جو تجویز سوچی ہے یقیناً صریح ظلم ہے اور جو لوگ کانگریس میں شریک ہیں وہ سب کے سب اس ظلم میں شریک ہیں۔ پھر اس سے بچنے کی جمعیۃ العلماء نے کیا تدبیر کی اور کون سا عملی قدم اٹھایا ہے؟

(۸) کانگریس میں بندے ماترم کا گیت گایا جاتا ہے جو مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے جو قریب بشرک ہے۔ کانگریسی مسلمان بھی بندے ماترم کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں۔ کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ

نہیں؟ اگر ہے تو جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں کو کیا ہدایت کی اور اس پر اس قسم کی دیگر منکرات پر صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں؟

(۹) صدر کانگریس اور اس کی ہم خیال جماعت جو اشتراکیت کی حامی اور مذہب اور خدا کی دشمن ہے ان کی تقریریں خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جمعیۃ العلماء نے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم سے روکا ہے یا نہیں؟

(۱۰) کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہوگی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کی پوری حفاظت ہوگی جب کہ کانگریس اور اس کے ذمہ دار ارکان مذہب اور حقوق کا نام لینا بھی جرم سمجھتے ہیں اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمعیۃ العلماء نے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں اس وقت تک کیا کام کیا ہے؟

(۱۱) جمعیۃ العلماء نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں جس کی مذہباً و سیاسۃً سخت ضرورت ہے اور ان کے اسلام میں داخل ہو جانے کی بھی قوی امید ہے؟

محترمی! یہی وہ سوالات ہیں جو خانقاہ امدادیہ کی جانب سے جمعیۃ العلماء سے کیے گئے۔ جو الامان سہ روزہ کے خاص مسلم لیگ نمبر و میلاد نمبر مورخہ ۹ رمئی ۱۹۳۸ء میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں جس کے سبب سے پیارم پیٹ میں ایک زبردست انقلاب جمعیۃ العلماء کے خلاف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا ہمیں آپ سے قوی امید ہے کہ آپ مذکورہ بالا سوالات کا تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

جواب:

حضرت مفتی صاحب نے ان سوالات کا یہ جواب مرحمت فرمایا:

"(۱) نہ صرف جمعیۃ العلماء بلکہ ہندوستان کی تمام معتمد جماعتوں کا نصب العین یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے ہندوستان کو آزاد اور خود مختار بنایا جائے اور اس کے لیے یہ مسئلہ بھی متفق علیہ ہے کہ جب تک ہندوستان کی تمام قومیں متحد ہو کر انگریزی حکومت سے آزادی کا مطالبہ نہ کریں گی بظاہر اسباب آزادی حاصل نہ ہوگی۔ اس لیے جمعیۃ العلماء ملک کی آزادی کی خاطر کانگریس کی شرکت کو ضروری سمجھتی ہے۔ اور چوں کہ انگریزی حکومت سے مسلمانوں کے مذہبی مرکز اور اسلامی قومیت کو سخت ضرر پہنچ رہا ہے اور پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لیے مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ :

انگریزی اقتدار کو جہاں تک ہو سکے کمزور کرنے کی سعی کریں۔

(۲) کانگریس ایک مشترکہ جماعت ہے۔ مسلمان اپنے مذہب پر پختگی سے قائم رہتے ہوئے بھی کانگریس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اسلام سے بے تعلقی غیر کانگریسی مسلمانوں میں جو مغربی تعلیم اور یورپین تہذیب کے دلدادہ ہیں بہت زیادہ ہے۔ کانگریسی مسلمان کانگریسی ہونے کی جہت سے اس قدر بے تعلق نہیں ہیں جس قدر کہ یورپین تہذیب کے دلدادہ غیر کانگریسی مسلمان ہیں۔

(۳) اس لیے کہ مسلم لیگ کی اکثریت انگریزی حکومت کو خدا کی رحمت کا سایہ سمجھتی ہے اور انگریزوں کے دامن میں پناہ لینا چاہتی ہے اور انگریزی شہنشاہیت کی حمایت کرتی اور انگریزی اقتدار کی بنیادیں مضبوط کرتی ہے۔ اور سرمایہ داری کی نہ صرف حامی ہے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم رکھنا چاہتی ہے۔ قوم کے لیے کوئی ٹھوس کام نہیں کرتی بلکہ مسلم لیگ کی رکنیت اور عہدہ داری کو حصول مناصب جلیلہ کا ذریعہ سمجھتی ہے اور اس راستے سے حکومت کے بڑے بڑے عہدے حاصل کرتی ہے۔ لکھنو میں آزادی کامل کا اعلان تو کر دیا اور یہ بھی اقرار ہے کہ تنہا مسلمان آزادی کامل حاصل نہیں کر سکتے اس کے باوجود آزادی کامل حاصل کرنے کے طریقے یعنی اتحاد ہندو مسلم کو اختیار نہیں کرتی تو آزادی کامل کے محض زبانی اعلان کو ہم صرف ابلہ فریبی نہ سمجھیں تو کیا سمجھیں؟

(۴) مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو منکرات سے خالی کر دینا تجربے سے ناممکن ثابت ہوا ہے اور اگر ممکن ہے تو بقول مسلم لیگ کے نوے فیصدی مسلمان مسلم لیگ میں شریک ہیں لیکن کیا وہ لیگ سے کسی ایک منکر کو بھی آج تک ہٹا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ علماء بھی اسی فیصدی لیگ میں شریک ہیں۔ لیکن کیا اسی فیصدی علماء کا لیگ میں کچھ اثر ہے۔ اگر ہے تو یہ کہ لیگ کے پلیٹ فارم سے علماء کے اثر کو برباد کرنے اور ان کو ذلیل وخوار کرنے کی پرزور تلقین ہو رہی ہے اور حاملینِ مذہب کو حاملین افرنجیت کی خالص تقلید اور اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

(۵) ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ لیگ پر اور مسلم لیگ پر کہ وہ علماء کے خلاف عموماً اور کانگریسی مسلمانوں کے خلاف خصوصاً عوام مسلمین کو بھڑکاتی، طرح طرح کے فسادات اٹھاتی اور آپس میں لڑاتی رہتی ہے۔ ابھی حال میں جمعیۃ العلماء کے جلسے میں شرکت سے مسلم لیگیوں کو منع کرنے کے لیے مسٹر جناح کا بیان اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سے

آپ لیگ کے قائد اعظم کی ذہنیت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اتحاد و اتفاق بین المسلمین کی آڑ میں کس قدر تشتت اور افتراق پیدا کر رہے ہیں۔

(۶) لیکن کیا مسلم لیگ خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کی سعی کر رہی ہے؟ وہ بھی تو اس مشترک حکومت کے اصول کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں گول میز کانفرنس میں تسلیم کر چکی ہے۔ اگر ہندو انگریز کو نکالنا نہیں چاہتے تو پھر جمعیۃ العلماء ان کے ساتھ کوئی اشتراک ہی نہیں کرے گی۔ یہ اشتراک عمل تو صرف انگریزی قوت کو کمزور کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے مقصد کے لیے ہے۔

(۷) جو قوانین کہ شریعت کے خلاف وضع کیے جائیں ان کی پوزیشن انگریزی موجودہ قوانین ایسی ہے، حکومت کے موجودہ قوانین میں کس قدر قوانین شریعت کے خلاف ہیں اور آئے دن لے جس لیٹو اسمبلی میں قوانین غیر مشروعہ مسلم لیگ کی تائید وحمایت سے پاس ہو رہے ہیں۔ ابھی آرمی بل کا معاملہ سامنے ہے۔ جمعیۃ العلماء تو ہر خلاف شرع قانون کے خلاف انتہائی جدوجہد کرے گی اور کر چکی ہے اور کر رہی ہے اس کی ابھی حال کے جلسے کی تجاویز پڑھیے اور دیکھیے کہ اس نے کانگریسی حکومتوں سے کس قدر سخت احتساب کیا ہے اور جمعیۃ کے محترم ارکان کا مدح صحابہ کے قضیہ میں طرز عمل سامنے رکھیے تو آپ کو جمعیۃ کا مطمح نظر صاف معلوم ہو جائے گا۔ اور پھر مسلم لیگ کے طرز عمل سے آپ اسے جانچ سکیں گے۔

(۸) بندے ماترم کا گیت بے شک قابل اعتراض تھا مگر کانگریس نے اس کے قابل اعتراض بند اس میں سے علاحدہ کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ جھنڈے کی سلامی مسلم لیگ بھی کرتی ہے اور اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتی ہے وہ ایک قومی عمل ہے اس میں اصلاح ہو سکتی۔ مگر مطلقاً اس کو مشرکانہ فعل قرار دینا صحیح نہیں۔

(۹) صدر کانگریس کی شخصی رائے سے کانگریس کو الزام دینا معقول نہیں۔

(۱۰) مسلمان اپنے مذہبی وسیاسی حقوق کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کر سکتے ہیں، نہ کانگریس کے وعدوں، سے نہ انگریزوں کے وعدوں سے!

(۱۱) یہ سوال زیادہ تر اس جماعت سے کیا جانا چاہیے جو نوے فیصدی مسلمانوں کی نمائندہ ہے اور اسی جماعت کے علماء سے!

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

یہ مولوی طاہر قاسمی کا قطعی جھوٹ تھا کہ جواب دیا نہیں گیا تھا۔ جواب اسی زمانے میں نقیب پھلواری، جدید وغیرہ میں چھپ گیا تھا۔

مسلم لیگ کے خلاف اہل سنت کا محاذ:

۱۶/ اپریل ۱۹۳۹ء: مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے عرس کے موقع پر بریلی میں ۲۵/صفر ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۶/ اپریل ۱۹۳۹ء کو بریلوی مسلک کے علمائے کرام کی خدمت میں مسلم لیگ کے مقاصد، اس کے رہنماؤں کے افکار اور ان کی تائید وتعاون کے بارے میں دس سوالات پیش کیے گئے۔ علمائے کرام نے ان کے جوابات تحریر فرمائے تھے انھیں ''الجواب السدیہ علی زہاء السوالات اللیکیہ''، یعنی مسلم لیگ کے متعلق خوش نما سوالوں کے روشن جواب کے عنوان سے کتاب کی شکل میں مطبع سلطانی بمبئی سے چھاپ کر منشی مصطفیٰ خان قادری برکاتی فیض آبادی نے بمبئی سے شائع کر دیا ہے۔ اس رسالے کے بارے میں ناشرین کا دعویٰ ہے کہ ''یہ رسالہ مبارکہ مجموعۂ فتاوے مقدسہ...... صاف صاف واضح وروشن احکام شرعیہ سنانے والا، مسلمانوں کو زمانۂ موجودہ کی تمام کشمکشوں اور مصیبتوں سے نجات دلانے والا، سچی آواز، حقیقی ترقی، اسلامی کامیابی کا بالکل صحیح، بے خطر، شرعی راستہ دکھانے والا مسلم لیگ کی کفر نوازیوں اور کانگریس کی ستم شعاریوں سے بچانے والا ہے۔''

اس رسالے میں جن علمائے کرام کے فتوے شامل ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ حضرت عظم الدرجہ جلیل البرکۃ، تاج العلماء، سراج العرفاء مولانا مولوی حافظ مفتی سید شاہ اولادرسول محمد میاں صاحب قبلہ قادری برکاتی قاسمی دامت برکاتہم القدسیہ مسند نشین سجادۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ، سرکار کلاں، مارہرہ مطہرہ۔

۲۔ حضرت بابرکت مولانا مولوی سید العلماء، سید الحکماء، حافظ قاری حکیم سید آل مصطفیٰ صاحب قادری برکاتی قاسمی مارہری

۳۔ حضرت شیر بیشۂ سنت ناصر الاسلام مولانا مولوی حافظ قاری مفتی مناظر اعظم ابوالفتح عبید الرضا محمد حشمت علی خاں قادری برکاتی رضوی لکھنوی دامت مکارمہما العالیہ ودمت فیوضہما المبارکہ

اس رسالے میں مندرجۂ ذیل سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں:

۱۔لیگ کے نا قابل تبدیل اغراض و مقاصد کیا ہیں اور ان میں کوئی شرعی سقم ہے یا نہیں اور ہے تو کس درجہ کا اور اس کے ہوتے ہوئے اس میں شرکت کا کیا حکم ہے؟

۲۔بد مذہب کے صدر ہوتے ہوئے شرکت کا کیا حکم ہے؟ اس میں کسی ضرورت و مجبوری کا لحاظ ہوگا یا نہیں؟

۳۔اس نیت سے شرکت و رکنیت اختیار کرنا کہ ہم بد مذہب کو صدارت سے گرادیں گے، اس کا کیا حکم ہے؟

۴۔ایسی جمعیت میں، جس میں بد مذہب رکن ہوں، اس میں شرکت کا کیا حکم ہے؟

۵۔لیگ کی شرکت میں کیا عالم اور جاہل کے حق میں کوئی فرق ہے؟

۶۔لیگ کے مقاصد و دستور اساسی دیکھنے کے بعد اگر اس میں کسی درجے کی کوئی ناجوازی نظر آئے اور مقاصد و دستور اساسی کو دائرۂ شرعی میں لانے کے لیے لیگ تیار نہیں تو اس میں شرکت کا کیا حکم ہے؟

۷۔اگر ضلع مسلم لیگ کا صدر سنی ہے تو اس میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟

۸۔اگر اس کے دستور اساسی اور مقاصد ایسے ہوں کہ ہم کسی طرح اس میں شریک نہ ہو سکیں تو ہمارا طرز عمل مسلم لیگ کے ساتھ کیا ہونا چاہیے؟

۹۔کیا بایں امید کہ عوام کی شرکت سے کانگریس کو ضرر پہنچے گا، عوام مسلمیں کو شرکت لیگ کی ممانعت سے تغافل علماء کے لیے جائز ہے؟

۱۰۔کیا کوئی ایسی صورت ممکن ہے کہ لیگ کے نام سے جو جماعت قائم ہوگئی ہے اس کو بد مذہبوں سے نکال کر صحیح راستے پر چلایا جا سکے؟

ان سوالات کے جواب میں مفتیان کرام نے مسلم لیگ کے دستور اساسی، مقاصد و مساعی، اس کے رہنماؤں کے افکار و عزائم اور دعاوی کے حوالوں سے مفصل بحث کر کے اس کا قطعی رد فرما دیا ہے۔اس فتوے کی راندیر کے مولانا ابوالبرکات سید عبدالقادر قادری نے تصدیق فرمائی ہے۔

رسالہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔آخر میں ''فتوائے مبارکہ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند، لاہور کے عنوان سے دو ورق (ص ۲۹ تا ۳۲) شامل ہیں۔اس کے استفتاء میں زید و بکر کی بحث کے حوالے سے یہ سوالات پوچھے گئے ہیں:

۱۔جماعت مسلم لیگ کیسی ہے؟ کیا ان سے ہم اہل سنت کا اتفاق و اتحاد شرعاً جائز ہے اور کیا

ان لیڈروں کا رہنما ہونا درست ہے اور ان پر اعتبار صحیح ہے؟

۲۔ مسلم لیگ کی حمایت کرنی اس میں چندے دینا، اس کا ممبر بنا، اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا کیسا ہے؟

۳۔ ان کے احوال و اقوال سے گمراہی ظاہر ہوتی ہے یا نہیں؟

۴۔ جب کہ ہنود برسر پیکار اور مسلمانوں کے دشمن ہیں تو موجودہ صورت میں شریعت مطہرہ یہ اجازت دیتی ہے کہ تمام کلمہ گو جن میں رافضی، خارجی، قادیانی، وہابی، نیچری، چکڑالوی سبھی ہیں، اہل سنت کو ان سے متحد و متفق ہو جانا چاہیے؟

۵۔ ایسی صورت میں مصلحت وقت اجازت دیتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے فرمان واجب الاذعان "فلا تو اکلوهم ولا تشار ابو هم ولاتصلو عليهم ولا تصلو معهم کو پس پشت ڈال دیا جائے؟

۶۔ جو شخص اپنے کو سنی کہتا ہو اور پھر مسٹر جناح کو رافضی جانتے ہوئے اپنا پیشوا مانے اور قائد اعظم لکھے اور اس کی حمایت کرے، مبلغ بن کر لوگوں کو اس کی طرف ترغیب دلائے، وہ کیسا ہے اور اس کے لیے کیا حکم ہے؟

۷۔ زید و بکر میں سے اپنے اپنے قول میں کون حق پر ہے؟

اس استفتاء کے جواب میں جو فتویٰ دیا گیا ہے، اس میں ہر طرح سے مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کا رد کیا گیا اور ان کے مسلمان ہونے میں کوئی تسمہ لگا نہیں رکھا ہے۔ یہ فتویٰ "دارالافتاء مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند، لاہور، اور دارالعلوم مرکزی انجمن حزب الاحناف، لاہور کی مہروں اور مولانا ابوالبرکات سید احمد کے دستخط سے مزین اور مولانا ابوالطاہر محمد طیب قادری برکاتی داناپوری کی تصدیق سے موثق ہے

سالانہ جلسۂ احرار اسلام:

۲۰ رمئی ۱۹۳۹ء: بمبئی میں کل ہند احرار اسلام کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان شریک رہے۔ مقررین میں مولانا احمد سعید (دہلوی) شورش کاشمیری، حافظ علی بہادر خان، مولانا انور صابری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا حسین احمد مدنی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، صدر استقبالیہ مولانا داؤد غزنوی وغیرہم نے جم کر آزادی ہند پر تقریریں کیں۔ مسلم لیگیوں کی سخت مخالفت کے باوجود مسلمانوں کا جم غفیر موجود رہتا تھا۔

(مولانا آزاد۔ایک سیاسی ڈائری،ص ۲۸۷)

''مسئلہ قومیت'' از مولانا سید مودودی صاحب:

مولانا سید مودودی کی تالیف کا اصل پس منظر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کا رسالہ ''متحدہ قومیت اور اسلام'' تھا اگرچہ انھوں نے اپنی تالیف اصول وفن کے نام پر پیش کی، لیکن رسالے کے اندر انھوں نے مختلف اسالیب ومباحث کا میں سب سے زیادہ زور حضرت شیخ الاسلام کے افکار کی تردید اور حضرت کی تعریض میں صرف کیا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اس پر تبصرے میں کتاب کی علمی وفنی حیثیت کی وضاحت کی ساتھ حضرت شیخ الاسلام کے دفاع کا حق بھی ادا کردیا ہے۔ مولانا اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''اس رسالے میں مصنف نے پہلے قومیت اسلام کے زیرعنوان قومیت کی تعریف بیان کی ہے، پھر اس کے عناصر ترکیبی بتانے کے بعد ان میں سے ہر ایک پر بحث کرکے بتایا ہے کہ جو قومیت نسلی، وطنی، معاشی یا کسی سیاسی نظام وامتیاز سے وابستہ ہو وہ امن عالم کے لیے سرچشمۂ فتنہ وشر ہوتی ہے، ان عناصر پر تنقید کرنے کے بعد اسلامی قومیت پر بحث کی گئی ہے جو صفحہ ۳۴ پر ختم ہوجاتی ہے۔ صفحہ ۳۵ سے ''کلمہ جامعہ'' کے زیرعنوان ایک مختصر تقریر شروع ہوجاتی ہے جو مصنف نے حیدرآباد کے کسی جلسہ میں پڑھی تھی۔ صفحہ ۴۶ سے اخیر تک ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے زیرعنوان جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل مولانا حسین احمد مدنی کے رسالہ پر تنقید ہے، جو اسی نام سے ابھی حال میں دیوبند سے شائع ہوا ہے۔

قومیت اسلام سے متعلق اس رسالے میں جو کچھ لکھا گیا ہے ہم کو اس سے پورا اتفاق ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے عام اخباری پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر ''قومیت متحدہ اور اسلام'' کے زیرعنوان جس زورقلم کا مظاہرہ کیا ہے وہ انگلستان کے کسی مذہبی دہشت انگیز Religious Shocker کے طرز بیان کے شایان ہو تو ہو کسی سنجیدہ صاحب علم وقلم کے ہرگز شایاں نہیں ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں مولانا حسین احمد کو ''برطانیہ دشمنی'' کا جگہ جگہ اس انداز سے طعنہ دیا ہے کہ ہمیں ان کی ''برطانیہ دوستی'' کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

اور جی چاہتا ہے کہ انہیں بھی ''الحب فی اللہ و البغض فی اللہ '' کی وہ حدیث مع اس کے حقیقی مفہوم کے سنادی جائے جو وہ مولانا حسین احمد کو بار بار سنا رہے ہیں۔ معلوم نہیں جس حکیم نے ''حبک الشئی یعمی و یصم '' کہا ہے وہ اس باب میں مصنف کے غیر سنجیدہ طرز بیان کے لیے کوئی وجہ وجیہہ بتا سکے گا یا نہیں؟

مصنف کو شکوہ ہے کہ مولانا حسین احمد نے اپنے رسالہ میں جا بجا لفظی مغالطے دیے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ مصنف نے اپنی زبان قلم سے اس امر کی نہایت قوی شہادت بہم پہنچادی ہے کہ وہ خود عمداً یا سہواً شدید مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں اور رندانہ کے باوصف ''بدانذ'' کا دماغ پر اتنا زبردست استیلا ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کی کسی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ مصنف نے خود مولانا حسین احمد صاحب کا جو فقرہ نقل کیا ہے وہ یہ ہے ''آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' اگر ان میں سلامت روی کو جلا کر بھسم کر دینے والا شرارہ کج نظری نہ ہوتا تو انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ مولانا کا ''آج کل'' کہنا خود اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ان کا اپنا عقیدہ یہ نہیں ہے بلکہ وہ اس معاملے میں دوسروں کی محاکات کر رہے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ یہ محاکات صحیح ہے یا نہیں؟ تو اس کے متعلق مصنف نے بین الاقوامی تعلقات (Internationalrelations) اور مذہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا سے جو عبارتیں نقل کی ہیں ان سے مولانا کی ہی تائید ہوتی ہے۔ مصنف نے غضب کیا ہے کہ مولانا نے آج کل کے نظریۂ قومیت کو جو دوسروں کی زبان سے نقل کیا ہے اس کو خود مولانا کے سر تھوپ دیا ہے۔ اور پھر کانگریس کے نظریۂ متحدہ قومیت پر اس کو منطبق کر کے ثابت کرنا چاہا ہے کہ مولانا نے اپنا اسلامی نقطۂ نظر بدل کر کانگریس کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا ہے۔ حال آں کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ایسے راسخ العقیدہ مسلمان عالم کے تصور میں بھی یہ نہیں ہے کہ اسلامی قومیت کبھی بھی مصنف کی بیان کی ہوئی ''متحدہ قومیت'' پر منطبق ہو سکتی ہے۔ اور یہ کانگریس متحدہ قومیت سے وہ معنیٰ مراد لیتی ہے جو مولانا ابوالاعلیٰ بیان کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو کلچرل اٹانومی اور کراچی کے ریزولیوشن کے کیا معنی ہیں جو کانگریس کے نزدیک تسلیم شدہ حقیقتیں ہیں۔ یہاں عمل سے بحث نہیں سوال صرف یہ ہے کہ کیا کانگریس نے ''متحدہ قومیت'' کو مصنف کے بیان کردہ معنی کے اعتبار سے اپنے اصول میں داخل کر لیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو دو چار لیڈروں کے بیانات سے نہیں بلکہ کسی تجویز سے اس کی شہادت بہم پہنچانی چاہیے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے اسلامی قومیت کو اس کے حقیقی مفہوم پر باقی رکھتے ہوئے اس پر بحث کی ہے کہ کیا مسلمان ملکی و وطنی اشتراک کی بنا پر کسی دوسری قوم کے ساتھ کسی سیاسی معاملے میں اشتراک کر سکتے ہیں یا نہیں، اور اس وقت ایک خاص سیاسی نظام کے ساتھ وابستہ ہونے کی صورت میں ان ہر دو مشترک جماعتوں پر قوم کا اطلاق بمعنی عام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب آپ نے اثبات میں دیا ہے اور اس کے لیے کتب لغت اور آیات واحادیث سے شواہد پیش کیے ہیں کہ قوم کا لفظ وسیع معانی میں مستعمل ہوتا ہے، اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چند جماعتیں اختلاف مذہب، روایات، اور اختلاف تہذیب و معاشرت کے باوجود اگر کسی ایک چیز میں مشترک ہو جائیں تو ان پر قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ''قومیت'' کے مصنف اس ذرا سی بات کو نہیں سمجھ سکے۔ اور انھوں نے اس کو ''اسلامی قومیت'' قرار دے کر لعن طعن شروع کر دیا حال آں کہ یہ ''قومیت عامہ'' اسلامی قومیت پر مطلقاً اثر انداز ہی نہیں ہے۔ مصنف کو شکایت ہے کہ مولانا حسین احمد نے ''قومیت'' اور ''امت'' کے لفظ سے مغالطہ دیا ہے۔ لیکن اگر یہ مغالطہ ہے تو کیا اس مغالطے سے بھی زیادہ نا قابل معافی ہے جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پنجاب کے ایک گاؤں کا نام ''دارالاسلام'' رکھ کر تمام مسلمانان ہند کو دیا تھا۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟

ایک ہی مضمون کو بار بار کہنا، متضاد باتیں بیان کر جانا، یہ وہ نقائص ہیں جو ہر زیادہ اور بے ضرورت لکھنے والے کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے اگر اس رسالے میں بھی تکرار اور تضاد بیان پایا جاتا ہے تو ہمیں اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس رسالے کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس میں مصنف نے مولانا حسین احمد اور دوسرے علماء کرام پر جو سب و شتم کیا ہے وہ کسی طرح ایک مدعی اصلاح کے لیے سزاوار نہیں ہے۔ سیاسی اختلاف دوسری چیز ہے ہم خود اس معاملے میں کسی خاص جماعت کے نقطۂ نگاہ کے پابند نہیں۔ لیکن اس طرح اپنی تعلّی کرنا اور اکابر کی تحمیق و تجہیل کرنا شایان علم و متانت نہیں، بلکہ خود فضایل اخلاق سے فرومایہ ہونے کی دلیل ہے۔ خودداری ممدوح سہی مگر خود پرستی و خودستائی تو اور اپنے تئیں دوسروں کی نگاہ میں ذلیل کر دیتی ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ''!

(برہان، دہلی۔ مئی ۱۹۳۹ء، ص ۹۷۔۲۹۴)

مولانا سندھی کی صدارت میں:

۲۷ مئی ۱۹۳۹ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس مرکزیہ کا سہ روزہ اجلاس مراد آباد کے ٹاؤن ہال میں شروع ہوا۔ یہ اجلاس ۲۹ مئی تک جاری رہے گا۔ اس اجلاس کی خاص بات یہ تھی کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے بھی اس میں شرکت فرمائی۔ اور انھیں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کی تحریک اور مفتی محمد نعیم کی تائید سے حسب دفعہ ہے دستور سابق جمعیت مرکزیہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب صدر جمعیت نے اعلان فرمایا کہ جمعیت مرکزیہ کی کارروائی ان کی جانب سے حضرت مولانا سندھی انجام دیں گے۔ اس کے بعد مولانا سندھی کی صدارت میں مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں:

۱۔ ''جمعیت علماے ہند کی مجلس مرکزیہ کا یہ اجلاس برطانوی حکومت کے قرطاس ابیض کو جو فلسطین کے متعلق اس نے شائع کیا ہے، عربوں کے ساتھ ناانصافی اور وعدہ شکنی پر مبنی سمجھتا ہے۔ اور عربوں پر برطانیہ کے تشدد اور جابرانہ اور ظالمانہ اقدامات کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ برطانوی حکومت کو لازم ہے کہ وہ عربوں کو بغیر مزید تاخیر کے فوراً آزادی دے کر فلسطین میں امن قائم کرے اور مسلمانان عالم کے اضطراب اور بے چینی کو رفع کرے۔'' **(باتفاق منظور)**

۲ ''جمعیت علماے ہند کی مجلس مرکزیہ کا یہ اجلاس لکھنو میں شیعوں کی طرف سے تبرا ایجی ٹیشن کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس خلاف آئین وانسانیت حرکت کو ملک کے امن کے لیے خطرہ عظیم سمجھتا ہے۔ تبرا کسی حالت میں کسی وقت بھی قابل برداشت نہیں ہے۔ نہ اس کو کوئی ذی فہم انسان ایک لمحے کے لیے جائز قرار دے سکتا ہے۔ اس لیے یہ اجلاس حکومت سے پرزور طریق پر استدعا کرتا ہے کہ وہ اس ہنگامۂ شر وفساد کو جلد از جلد ختم کر دے۔'' (باتفاق منظور)

۳۔ ''جمعیت علماے ہند کی مجلس مرکزیہ کا یہ اجلاس سنیوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ لکھنو کے شیعوں کے تبرا ایجی ٹیشن سے اس درجہ متاثر نہ ہوں کہ لکھنو سے باہر کوئی نئی صورت حال پیدا ہو جائے۔ اگرچہ شیعوں کا یہ اقدام ناقابل برداشت ہے تاہم ملک کا امن وامان بہر صورت قائم کرنا ان کا فرض ہے۔

سنیوں کو صبر وسکون کے ساتھ اپنی اپنی جگہ دستور قدیم کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہوئے

حالات کا بغور ملاحظہ کرنا لازم ہے۔ اور تاوقتیکہ ذمہ دار علماء اعلان نہ کریں، لکھنؤ سے باہر کوئی نئی صورت حالات پیدا نہ ہونے دینی چاہیے۔" (باتفاق منظور)

۴۔ "جمعیت علماے ہند کی مجلس مرکزیہ کا یہ اجلاس مدح صحابہ کے متعلق صوبۂ متحدہ کی حکومت کے کیونک مورخہ ۳۰ ر مارچ ۳۹ء کو جو سنیوں کے جائز اور مبنی بر انصاف مطالبات سے بہت کم ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر غنیمت سمجھتا ہے اور بنظر استحسان دیکھتا ہے۔ اور حکومت یو، پی کو متنبہ کرتا ہے وہ اس کیونک کو جو سنیوں کے ایک مذہبی آئینی و شہری حق کے استعمال کی آخری حد ہے۔ شیعوں کے امن سوز پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر تبدیل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس ان مساعی کی پرزور مذمت کرتا ہے جو بعض حلقوں کی طرف سے حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کو یہ باور کرانے کے لیے کی جارہی ہیں کہ مدح صحابہ سنیوں کا اخلاقی و مذہبی و آئینی حق نہیں ہے۔ اور یہ کہ تبرا اور مدح صحابہ کی حیثیت یکساں ہے اگر حکومت ہند یا حکومت برطانیہ کی طرف سے اقلیتوں کے حقوق کے نام پر سنیوں کے اس مسلمہ حق میں کوئی مداخلت کی گئی تو مجلس مرکزیہ کی راے میں اس کے نتائج نہایت دوررس اور تباہ کن ثابت ہوں گے۔

جمعیۃ مرکزیہ کا یہ اجلاس بعض مخصوص افراد اور جماعتوں کے اس گمراہ کن اور شرارت آمیز پروپیگنڈے کی پرزور تردید کرتا ہے کہ مدح صحابہ کے ایجی ٹیشن میں حکومت یو پی کا ہاتھ ہے اور اس نے سنیوں کو اس مطالبہ پر جو ایک عرصۂ دراز سے مسلسل پیش کیا جارہا تھا، آمادہ کیا ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈا جیسا کہ ظاہر ہے۔ حکومت یو پی کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ سنیوں کے ایک قدیم مطالبہ کے حصول کو خطرے میں ڈالنے کے لیے ہے۔ اور اس کی ذمہ داری اسی جماعت پر عائد ہوتی ہے جو سنیوں کو اپنے حق کے استعمال سے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کررہی ہے۔

احکام شرعیہ، مسلم لیگ اور اہل سنت:

یکم جون ۱۹۳۹ء: بریلوی مسلک کے مشہور عالم مولانا حشمت علی قادری لکھنوی نے "احکام نوریہ شرعیہ بر مسلم لیگ" کے نام سے مسلم لیگ کے مقاصد اور اس کے رہنماؤں کے افکار و اعمال کے رد میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ یہ رسالہ مطبع سلطانی، بمبئی میں چھپا ہے اور "جماعت مبارکہ اہل سنت، سرکار کلاں، مارہرہ مطہرہ ضلع ایٹہ سے بہ تعداد ایک ہزار اول بار (۱۳۵۸ء) میں شائع کیا

گیا۔ رسالے کے خاتمے کی تاریخ تحریر ۱۲؍ ربیع الآخر ۱۳۵۸ھ بہ روز پنج شنبہ مطابق یکم جون ۱۹۳۹ء ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ اور تعداد صفحات ۴۰ ہے، رسالے کے آخر میں مولانا سید شاہ اولاد رسول محمد میاں صاحب قادری برکاتی تاجدار سجادۂ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ ضلع ایٹہ کی تصدیق مقدس'' اور مولانا حکیم سید شاہ آل مصطفیٰ صاحب قادری برکاتی قاسمی مارہری سرکار کلاں مارہرہ مطہرہ کی ''تصدیق مبارک'' شامل ہے۔

اسلامی جنگوں میں غیر مسلموں کی شرکت:

۸؍ جولائی ۱۹۳۹ء: سوال از محمد حنیف (دہلی)

''کیا نبی مقبول ﷺ نے غیر مسلموں کو شریک کر کے جنگ کی ہے؟

جواب: از حضرت مفتی صاحب:

''یہود کے ساتھ حضور نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے اور'' در مختار'' میں ہے:

مفاده جواز الا ستعانة بالكافر عند الحاجة وقد استعان عليه الصلوٰة والسلام باليهود على اليهود. (درمختار علی ہامش ردالمختار ج ۳ ص ۲۵۵)

یعنی عبارت ماقبل کا مفاد یہ ہے کہ کافر سے حاجت کے وقت جنگ میں مدد لینا جائز ہے اور آنحضرت ﷺ نے یہود کی ایک جماعت سے دوسری جماعت کے خلاف مدد لی

اس کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے غزوۂ بدر میں تو کافر کی مدد لینے سے انکار فرمادیا تھا مگر اس کے بعد غزوۂ خیبر میں یہود بنی قینقاع سے اور غزوۂ حنین میں صفوان ابن امیہ مشرک سے مدد لی۔ تو غزوۂ بدر میں استعانت سے انکار فرمانا یا تو اس لیے تھا کہ مدد لینا نہ لینا دونوں باتیں جائز تھیں اور اس صورت میں غزوۂ بدر اور غزوۂ خیبر وحنین کی واقعات میں تعارض نہیں۔ اور یا اس لیے کہ غزوہ بدر کی وقت مشرک سے مدد لینا جائز نہ تھا تو اس کے بعد غزوۂ خیبر و حنین کے واقعات نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ نیز ہندوستان کی موجودہ صورت میں تو شریعت مقدسہ کے دوسرے اصول سے کفار کے ساتھ اشتراک عمل کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ وواذا......

ابتلى ببليتين فليختر اهونهما کا اصول ہے اور ظاہر ہے کہ اگر کافر کے اشتراک عمل سے انگریزی اقتدار ٹوٹتا یا کمزور ہوتا ہو تو یہ صورت یقیناً دوسری صورت سے اہون ہے کہ انگریزی

اقتدار بڑھتا رہے اور تمام اسلامی حکومتوں اور مرکز اسلام کو کمزور کرتا بلکہ مٹاتا رہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی"

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

بدیشی اشیاء کے ترک کی تحریک:

۲ر اگست ۱۹۳۹ء: بدیشی اشیا کے استعمال اور ارکان جمعیت کے لیے ان کے عدم استعمال کے لزوم کے بارے میں مولوی محمد صدیق صاحب (دہلی) نے سوال کیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے جواب میں فرمایا:

"(۱) بدیشی کپڑا خریدنا اور پہننا فی حد ذاتہ مباح ہے۔ اس حکم میں تو غالباً کوئی اہل علم اختلاف نہیں کرتا اور بدیشی کپڑے اور دیگر مباح الاستعمال اشیاء کا حکم بھی ایک ہے۔ بدیشی کپڑا پہننے کی مخالفت اس نظریے پر مبنی نہیں ہے کہ فی حد ذاتہ بدیشی کپڑا پہننا اور خریدنا حرام ہے۔ بلکہ وہ جماعتی اور قومی و وطنی مصالح پر مبنی ایک جماعتی تحریک ہے۔ اور جس جماعت کی وہ تحریک ہو اس جماعت کے ہر عضو و رکن کو اس کا احترام کرنا لازم ہے۔

(۲) جمعیۃ العلماء نے چوں کہ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ بدیشی کپڑا استعمال کرنے والا اس کا رکن نہیں ہو سکتا اس لیے اس کا کوئی رکن اس بنا پر اس کی رکنیت سے خارج نہیں کیا جائے گا مگر چوں کہ جمعیت بدیشی کپڑے کو ترک کر دینے کی شدت سے ترغیب دیتی ہے اس لیے جمعیت کے ارکان کو اس کی تحریک کا احترام کرنا لازم ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

کفار سے موالات ومعاملات کے حدود:

۳۰ر اگست ۱۹۳۹ء: ایک خط کے جواب میں حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا:

اشتہار میں جو آیات قرآنیہ لکھی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو کفار سے محبت اور دوستی پیدا کرنا اور مسلمانوں کے خلاف کفار کے ساتھ میل جول محبت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ ان آیات کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ مطلقاً کافروں سے معاملہ کرنا حرام ہے۔ شریعت مقدسہ اسلامیہ کا

یہ حکم نہیں ہے کہ کافر سے کوئی معاملہ نہ کرو۔ بیع وشرا، داد وستد کفار کے ساتھ جائز ہے بلکہ کافر پڑوسی کو حق ہمسائیگی کی طور پر ہدیہ بھیجنا اور کافر کا ہدیہ قبول کرنا بھی جائز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں ایک بکری ذبح کی گئی اور اس کا گوشت پڑوس میں تقسیم کیا گیا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں تشریف لائے تو دریافت فرمایا اهدیتم لجارنا الیهودی. اهدیتم لجارنا الیهودی۔ یعنی گھر کے لوگوں سے پوچھا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو ہدیہ بھیجا۔ تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو بھی ہدیہ بھیجا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہودی پڑوسی کی بیماری میں مزاج پرسی یعنی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ذمی کافر تو دارالاسلام میں رہتے ہیں اوران کے قانونی حقوق مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسلمان اگر ذمی کافر کو قتل کردے تو مسلمان اس کے قصاص میں قتل کیا جائے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حربی کفار سے بھی بیع وشرا کی ہے، حربی کفار کے ہدایا قبول فرمائے ہیں، حربی کافروں کو صحابۂ کرامؓ نے ہدایا دیے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم نے اپنے ایک مشرک بھائی کو جو مکۂ معظمہ میں تھا ہدیہ بھیجا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امیہ بن خلف کو اپنی مکہ کی جائداد کا نگراں مقرر کیا اور اس کے عوض میں اس کی مدینہ کی جائیداد کی نگرانی اپنے ذمے لی یہ تمام باتیں بخاری شریف ودیگر کتب احادیث میں موجود اور ثابت ہیں۔

بہرحال کفار کے ساتھ معاملات رکھنا ناجائز نہیں ہے، نہ ممنوع ہے۔ اور ہندوستان جیسے ملک میں رہ کر تو اس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ قرآن پاک میں بھی ہم کو حضرت حق جل شانہ نے اجازت عطا فرمائی۔ لا ینهکم الله عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین الخ۔ یعنی: "اللہ تعالیٰ تم (مسلمانوں) کو اس سے منع نہیں کرتا جو کافر تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ تم نیکی اور سلوک کا معاملہ اور انصاف کا برتاؤ کرو۔"

خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے ساتھ ان کے مذہب کی پسندیدگی کے لحاظ سے دوستی اور محبت رکھنا تو حرام ہے اور محض یکجائی سکونت اور ہمسائگی کے طور پر یا تمدنی اور معاشرتی ضرورت کی وجہ سے ان سے ملنا، بات چیت کرنا، ان کے ساتھ بیع وشرا کرنا، ہدیہ دینا، ہدیہ قبول کرنا، یہ سب جائز اور مباح ہے۔ باقی اور تہمتیں جو پوسٹر میں مذکور ہیں کہ مسلمانوں کو کافروں کی غلامی میں دے رہے ہیں یا ان کے دین کو اختیار کر رہے ہیں یا ان کے وظیفہ خوار اور تنخواہ دار ہیں اس کا جواب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ان تہمتوں کا فیصلہ رب العزت کے دربار میں قیامت کے دن ہوگا۔ واللہ یهدی من

یشاء الی صراط مستقیم ۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

جنگ عظیم دوم اور مسلم لیگ:

۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء: وزیر اعظم پنجاب نے ۲ر ستمبر کو شملہ سے ایک بیان جاری کیا، جس میں آپ نے فرمایا:

''میں اپنے پنجابی بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے تیار ہو جائیں ۔ ہمیں وطن، تہذیب، انصاف کی حفاظت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔ اس مرتبہ گذشتہ جنگ کے مقابلے میں ہمیں آدمیوں روپیہ اور سامان کی زیادہ قربانی دینی ہوگی ۔ اس لیے میں اپنے پنجابی بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ آج ہی سے وہ اپنے سامان خورد نوش اور دیگر وسائل پر رضا کارانہ پابندی عائد کر لیں تا کہ اس مشترکہ کاز کے لیے زیادہ سے زیادہ بچت ہو سکے ۔

ہماری حب الوطنی کا پہلا ثبوت یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے تمام ذرائع ملک معظم اور ملک کے سپرد کر دیں ۔''

(مدینہ، ۱۳ر ستمبر ۳۹ء)

سر عبدالحلیم غزنوی نے ایک بیان میں فرمایا

مسلم لیگ کونسل نے حال ہی میں جنگ کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے ۔ اس پر!

سے نظر ثانی کرنی چاہیے کیوں کہ یہ وقت سودا کرنے کا نہیں ہے ۔''

(مدینہ، ۱۳ر ستمبر ۳۹ء)

۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء: سر محمد یعقوب صاحب نے ایک طویل بیان میں ارشاد فرمایا:

کانگریس کی تقلید میں انضباطی کارروائی کرنے کا فعل خود مسلم لیگ کے لیے نقصان دہ ہوگا ۔ اس کے علاوہ اشتعال انگیز اور توہین آمیز قرار دادیں منظور کرنا بھی لیگ کے مفاد کے منافی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلم لیگ غیر ذمہ دار اور ناشائستہ لوگوں پر مشتمل رہ جائے گی ۔''

برطانیہ کی طرف داری اور حمایت کے منطقی دلائل پیش کرنے کے بعد آپ نے فرمایا:

''کونسل کے اجلاس میں بعض مقررین نے بنیا پن کا ثبوت دیتے ہوئے حکومت برطانیہ سے سودا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ بے حد مذموم ہے۔ ہمیں غیر مشروط طور پر حکومت کی مدد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہم جہاں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے لڑیں گے وہاں ہماری یہ کوشش برطانوی ایمپایر کو محفوظ رکھنے پر منتج ہوگی۔ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے متین طبقے سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مسلم لیگ کے وقار اور عزت کو غیر ذمہ دار لوگوں سے بچانے کی کوشش کریں۔''

(مدینہ ۹ ر ستمبر ۱۹۳۹ء)

ارکان مسلم لیگ میں سب سے زیادہ آزاد اور محتاط بیان مسٹر جناح کا تھا۔ آپ اس کوشش میں کامیاب رہے کہ آپ کے بیان سے برطانیہ پرستی کا مظاہرہ نہ ہو۔ آپ نے بیان فرمایا:

میں نے ۴ ر ستمبر کو وائسرائے سے ملاقات کی۔ انھوں نے موجودہ صورت حالات کی وضاحت کی۔ میں لازمی طور پر ان کی بات چیت کو ظاہر نہیں کرسکتا۔ ابر آلود آسمان میں ہمیں کسی ستارے کی امید کرنی چاہیے۔

کوئی شخص اسلحہ جات کو ہاتھ میں لینے اور وحشیانہ طاقت کو استعمال کرنے کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی باوقار سمجھوتا نہ ہو سکا تو یورپ اس کے لیے فخر نہیں کرسکتا۔

اس وقت برطانیہ کی پالیسی کی مذمت کرنے کا موقع نہیں۔ بحران پیدا ہوگیا ہے اور ہمیں اس کا حتی المقدور مقابلہ کرنا ہے۔ لازمی طور پر میری ہمدردی پولینڈ، انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ ہے اگر برطانیہ اس جنگ کو کامیابی کے ساتھ لڑنا چاہتا ہے تو اسے مسلم لیگ کی وساطت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اعتماد میں لینا چاہیے اور اسے ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے جو ان اصولوں پر حاوی ہو جن کا ذکر وائسرائے نے جنگ کے اعلان کے فوراً بعد اپنی براڈ کاسٹ تقریر میں کیا تھا۔ مسلمان صرف انصاف چاہتے ہیں۔ میں وائسرائے کے خیالات کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں جو ۱۸ ر ستمبر کو دہلی میں منعقد ہوگی، پیش کروں گا۔ اس اثناء میں میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہو کر اکٹھے ہو جائیں۔

(مدینہ، بجنور، ۱۳ ر ستمبر ۱۹۳۹ء)

اس قسم کے بیانات کے افتتاحیہ کے بعد مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۸ ر ستمبر ۳۹ء کو دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی کوٹھی پر زیر صدارت جناب مسٹر محمد علی صاحب جناح ہوا۔ اس اجلاس میں بقول مدیر اخبار۔ مدینہ مسلم لیگ نے وہی فیصلہ کیا جس کی توقع سروں اور خان

بہادروں کی جماعت سے ہو سکتی تھی۔ یعنی سرکار ابد مدار کی خوشامد کے بعد جو کچھ کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''حضور ہم تو وفادار ازلی ہیں بھلا کب حضور کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔ اب بھی دل و جان سے خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ لیکن اگر گستاخی معاف ہو تو اتنی عرض ہے کہ ہم بندگان بے مقدار کو ہندوؤں سے سخت شکایت ہے۔ اس لیے اگر حضور نے ان کی گوشمالی کر دی تو پھر مسلمانوں کے دل بہت بڑھ جائیں گے اور اس وقت ان کی امداد زیادہ موثر اور کامل ہو گی۔''

(مدینہ، ۲۵ ستمبر ۳۹ء)

بقول مدیر مدینہ اس تجویز کا آغاز اس سجدۂ نیاز سے ہوا تھا کہ:

''آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی حضور وائسرائے کے اس طرز عمل کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ انھوں نے مسٹر ایم۔ اے جناح پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم لیگ کو شرف ملاقات بخشا اور ان کو مسلم لیگ تک پہنچانے کے لیے وہ تمام بین الاقوامی حالات بتائے جو جنگ پر منتج ہوں گے۔ نیز موصوف کو اپنی رائے عالی سے بھی باخبر کیا۔''

اس تجویز کے مندرجۂ ذیل فقرے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں:

۱۔ ''یہ کمیٹی ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے سے نہایت پرزور لفظوں میں بہ اصرار کہتی ہے کہ وہ گورنروں کو ہدایت کریں کہ جب مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی ہو یا جب ان پر ظلم کیا جائے یا ان کے سیاسی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی مفاد کو برطانیۂ عظمی کے مقدس وعدو اور تیقنات کے باوجود گڑبڑ کی جائے تو وہ مداخلت کریں۔ اس لیے کہ گورنروں کے مخصوص اختیارات آئین میں اسی لیے رکھے گئے ہیں۔''

۲۔ ''کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کی حقیقی اور ٹھوس امداد انگریزوں کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ کرائیں۔ جہاں آج ہماری آزادی، جان و مال اور عزت و آبرو سب خطرے میں ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں ہمارے بہت سے ابتدائی حقوق تک بے دردی سے کچلے جا رہے ہیں۔''

۳۔ ''اگر برطانوی حکومت اس نازک موقع پر مسلمانوں کی مکمل، موثر اور باعزت امداد چاہتی ہے اور اگر وہ چاہتی ہے کہ اس نازک حالت کو کامیابی کے ساتھ ختم کر دیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ

مسلمانوں کو مطمئن کرے اور انھیں یہ محسوس کرائے کہ وہ یہاں محفوظ ہیں۔ نیز اسے چاہیے کہ مسلم لیگ پر اعتماد کرے، جو ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے بولنے والی واحد جماعت ہے۔"

(مدینہ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۹ء/۱۲ شعبان ۱۳۵۸ھ)

جنگ عظیم دوم

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء:

جنگ عظیم دوم کا آغاز:

یورپ کی دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس جنگ میں جرمنی کے ہٹلر اور اٹلی کے مسولینی برطانیہ و روس کے خلاف جنگ میں شریک ہیں۔

جنگ عظیم دوم کا آغاز اور کانگریس کا رزولیوشن:

یورپ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس پر کانگریس کو افسوس تھا۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں تری پورہ کے اجلاس میں اس نے مندرجہ ذیل ریزولیوشن منظور کیا تھا:

"کانگریس اس بات کو ضبط تحریر میں لانا چاہتی ہے کہ وہ برطانیہ کی خارجہ پالیسی کو قطعی ناپسند کرتی ہے، جس کا انجام میونخ کا معاہدہ، برطانوی اطالوی معاہدہ اور ہسپانیہ کے باغیوں کی حرکت کو قانوناً تسلیم کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ پالیسی دوسرا نام ہے جمہوریت کے ساتھ غداری، متواتر عہد شکنی، اجتماعی تحفظ کے نظام کی بیخ کنی اور ایسی حکومتوں سے تعاون کا جو خود اپنے آپ کو جمہوریت اور آزادی کی دشمن ٹھہراتی ہیں۔ اسی پالیسی کی بدولت دنیا میں بین الاقوامی فساد کی ایک کیفیت پیدا ہو رہی ہے، جس میں بہیمانہ تشدد کو شاندار کامیابی ہوئی، وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پھل پھول رہا ہے اور قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کر رہا ہے اور امن قائم رکھنے کے بہانے سے ایک ہیبت ناک جنگ کی تیاری عظیم الشان پیمانے پر کی جا رہی ہے۔ وسطی اور جنوب مغربی یورپ میں بین الاقوامی اخلاق اس درجے گر گئے ہیں کہ دنیا کے سامنے یہودی نسل کے لوگوں کے ساتھ نازی حکومت کا منظم وحشت انگیز برتاؤ اور ہسپانیہ کی باغی فوجوں کے ہوائی جہازوں کے شہروں اور غیر مسلح آبادی اور بے سہارا پناہ گزینوں پر مسلسل بمباری کرنے کے وحشت ناک منظر پیش کیے گئے۔"

''کانگریس یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا برطانیہ کی اس بیرونی پالیسی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، جس نے پابندی کے ساتھ فاشست طاقتوں کو مدد پہنچائی ہے اور جمہوری ملکوں کی تباہی و بربادی میں معاون ہوئی ہے۔ کانگریس امپیریلزم اور فاشزم دونوں کے خلاف ہے اور اسے یقین ہے کہ دنیا کے امن اور ترقی کے لیے لازمی ہے کہ ان دونوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کانگریس کی رائے میں اس کی انتہائی ضرورت ہے کہ ہندوستانی ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی بیرونی پالیسی خود طے کریں اور اس طرح امپیریلزم اور فاشزم دونوں سے الگ رہتے ہوئے، امن اور آزادی کی راہ پر قدم بڑھائیں۔''

حالات پر مولانا آزاد کا تبصرہ:

جیسے جیسے بین الاقوامی افق پر طوفان گھرتے ہوئے نظر آئے، گاندھی جی کے ذہن پر گہری مایوسی طاری ہوتی گئی۔ اس سارے زمانے میں وہ ایک شدید ذہنی بحران سے گزر رہے تھے۔ یورپ اور امریکہ کی انجمنیں اور افراد ان سے درخواست کرتے رہتے تھے کہ جنگ کی ہلاکت، جو سر پر آن کر کھڑی ہوئی تھی، دفع کرنے کی کوئی تدبیر کریں اور اس سے ان کا روحانی کرب اور بڑھتا تھا۔ ساری دنیا کے امن پسند انہیں اپنا قدرتی رہنما مانتے تھے۔ جس کی مدد سے امن قائم رکھا جا سکتا تھا۔

گاندھی کی بے چینی:

گاندھی جی نے اس مسئلے پر بہت غور کیا اور آخر کار کانگریس ورکنگ کمیٹی سے کہا کہ ہندوستان کو اس خطرناک بین الاقوامی صورت حال کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کر دینا چاہیے۔ ان کی اپنی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کو کسی حالت میں بھی اس ہونے والی جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ خواہ شرکت کرنے سے ہندوستان کو آزادی ہی حاصل ہو جائے۔

مجھے گاندھی جی سے اس معاملے میں اختلاف تھا۔ مجھے یہ نظر آ رہا تھا کہ یورپ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک نازسزم اور فاشزم کی قوت کا نمائندہ ہے، دوسرا جمہوری طاقت کا۔ میرے دل میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر ان دونوں میں تصادم ہو تو ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیے، بشرطیکہ وہ آزاد ہو۔ لیکن اگر برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد تسلیم نہ کیا

،تو یہ توقع کرنا بہت بیجا ہوگا کہ ہندوستان خود آزادی سے محروم رہ کر دوسری قوموں کی آزادی کے لیے لڑے گا۔ ایسی صورت ہوئی تو ہندوستان کو تعاون نہ کرنا چاہیے اور جنگ کی سرگرمیوں میں برطانوی حکومت کی مدد نہ کرنی چاہیے۔ دوسرے مسائل کی طرح اس مسئلے میں بھی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں اختلاف تھا۔ ان میں سے بعض کے خیالات دراصل صاف نہیں تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بحیثیت مجموعی مجھ سے اتفاق تھا۔ مگر ایسے بہت تھے جو محسوس کرتے تھے کہ انھیں گاندھی جی کا ساتھ دینا چاہیے، لیکن وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ گاندھی جی کی پالیسی پر اس کی انتہا تک عمل کیا گیا ،تو وہ ایک بندگلی میں پہنچا دے گی ،اس وجہ سے وہ شش و پنج میں تھے، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے معاملے کے ہر پہلو پر غور کیا، مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

کانگریس کا پس وپیش:

ادھر کانگریس اس طرح پس پیش کر رہی تھی ، ادھر اعلان جنگ کے فوراً بعد ہندوستان میں ایک غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی، برطانیہ نے ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا، تو اس نے کامن ویلتھ کے تمام ارکان سے ایسا ہی کرنے کی درخواست کی۔ ہر ڈومینین کی پارلیمنٹ نے اپنا اجلاس کیا اور جنگ میں شرکت کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان میں ایسا ہوا کہ وائسرائے نے مرکزی قانون ساز مجلس سے رسمی طور پر بھی مشورہ کیے بغیر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اگر مزید ثبوت کی ضرورت تھی، تو وائسرائے کے اس عمل نے ثابت کر دیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنا حلقہ بگوش سمجھتی ہے اور اب بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اسے جنگ جیسے معاملے میں بھی اپنے طرز عمل کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔

کانگریس کا ریزولیوشن:

جب ہندوستان کو اس طرح بے تکلفی کے ساتھ جنگ میں شریک کر دیا گیا، تو گاندھی جی کی ذہنی تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی۔ وہ کسی حالت میں بھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتے تھے کہ ہندستان جنگ میں شریک ہو، لیکن ان کے احساسات کچھ بھی ہوں، وائسرائے کے ایک فیصلے نے، جس میں ہندوستانیوں کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا، ہندوستان کو جنگ میں مبتلا کر دیا۔

کانگریس نے اپنی رائے وضاحت کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے ایک طویل ریزولیوشن میں

بیان کردی، جو واردھا میں اس کے اجلاس ۸ تا ۱۵ ستمبر ۱۹۳۹ء میں منظور ہوا۔ اس لیے کہ جنگ کے معاملے میں کانگریس کا جو رویہ تھا اور اس کے نزدیک جمہوری ریاستوں کا بین الاقوامی سیاست کے میدان میں جو منصب تھا، اس کے متعلق یہ واضح ترین بیانات میں سے تھا، ریزولیشن میں کیا گیا تھا:

''یورپ میں جنگ کا اعلان ہونے کی وجہ سے جو تشویش ناک حالات پیدا ہوئے ہیں، ان پر ورکنگ کمیٹی نے پوری توجہ سے غور کیا۔ کانگریس کئی بار بیان کر چکی ہے کہ جنگ چھڑ جانے پر قوم کو کن اصولوں کے مطابق عمل کرنا چاہیے اور ایک ہی مہینہ ہوا اس کمیٹی نے ان اصولوں کو دہرایا تھا اور ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی رائے کی جو تحقیر کی تھی، اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ برطانوی حکومت کی اس پالیسی سے علیحدگی اور بے تعلقی ثابت کرنے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ورکنگ کمیٹی نے مرکزی قانون ساز مجلس کے کانگریسی ممبروں کو ہدایت کی کہ وہ مجلس کے اگلے سیشن میں شریک نہ ہوں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو جنگ میں شریک قرار دیا، آرڈیننس جاری کیے، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا ترمیمی بل پاس کیا اور ایسی ہی اور دوررس کارروائیاں کیں جو ہندوستانی قوم کے لیے موت وحیات کا مسئلہ بن سکتی ہیں اور جن سے صوبائی حکومتوں کے اختیارات اور عمل سب محدود اور مختصر ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف ہندوستانیوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ہی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ انھوں نے جو خواہشیں ظاہر کی تھیں، انھیں برطانوی حکومت نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی مجبور ہے کہ ان واقعات کے مضر اثرات ونتائج کی طرف توجہ دلائے۔''

''کانگریس نے بار بار اظہار کیا ہے کہ وہ فاشزم اور نازیزم کے فلسفے اور عمل اور ان کے اس طریقے کو کہ جنگ اور تشدد کو آسمان پر چڑھایا جائے اور انسان کے دل و دماغ کو کچلا جائے قطعی طور پر ناپسند کرتی ہے۔ اس نے ان جارحانہ اعمال کی مذمت کی ہے، جو ان سے بار بار سرزد ہوئے ہیں اور اس بات کی بھی مذمت کی ہے کہ انھوں نے مستقل اصولوں اور مہذب زندگی کے مسلّم معیاروں کو کوڑے کی طرح ہٹا کر الگ کر دیا ہے۔ اسے فاشزم اور نازیزم میں امپیریلزم کے وہی اصول زیادہ شدید شکل میں نظر آئے ہیں، جن کے خلاف ہندوستانی برسوں سے لڑتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ورکنگ کمیٹی اپنا فرض سمجھتی ہے کہ جرمنی کی نازی حکومت نے پولینڈ کے خلاف جو آخری جارحانہ کارروائی کی ہے، اس کی مذمت کرے اور ان لوگوں سے ہمدردی کرے جو اس حملے کا

مقابلہ کریں۔" (انڈیا ونس فریڈم، ص ۵۔۱۰۲)

۷/ستمبر ۱۹۳۹ء: ۷/ستمبر ۳۹ء کو واردھا میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے صورت حال کا جائزہ لینا شروع کیا اور پورے احتیاط کے ساتھ غور و فکر کر کے ۱۴/ستمبر کو اپنی رپورٹ شائع کر دی جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ لڑائی کے تعلق سے ہمارے لیے صورت حال بالکل واضح ہو گئی ہے۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح پہلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ چناں چہ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے ہرگز برطانوی سامراج کو فتح مند دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مخالف جارہی ہے۔ (حسرت موہانی......، ص ۱۸۵)

۸/ستمبر ۱۹۳۹ء: ۸/ستمبر ۱۹۳۹ء کو مرزائی لیڈر بشیر الدین محمود نے اپنے خطبۂ جمعہ میں کہا:

"جنگ کی صورت میں جو ذمہ داریاں مجھ پر عائد ہوتی ہیں۔ میں آج اس سلسلے میں مزید باتیں کرنا چاہتا ہوں؛

ہمیں انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ ان کے قوانین احمدیت کو ترقی کے لیے ممد و معاون ہوں گے اور جہاں جہاں ان کی حکومت ہوگی؛ وہاں احمدیت کی تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کے فضل سے راستہ کھل جائے گا۔ اور اس کا عملی ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ ہندوستان سے باہر جن ممالک میں انگریزوں کی حکومت نہیں وہاں ہم نے جب تبلیغ کی تو ہمارے راستے میں روکیں حائل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

بیشک بعض اور ممالک بھی ہیں، جہاں ہمیں تبلیغ میں آسانی ہے، مگر وہ بہت کم ہیں۔ اکثر ایسے ہی ہیں جہاں تبلیغ میں روکیں ڈالی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں انگریزوں کے ساتھ تعاون نہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ جہاں ہماری تبلیغ کے راستے کھلے ہیں، وہاں بھی احمدیت کی ترقی رک جائے۔ اب ایک طرف ہماری غیرتیں ہوں اور دوسری طرف یہ نتیجہ، تو کون سا احمدی برداشت کرے گا کہ تبلیغ تو بے شک بند کر دی جائے، مگر اس کی غیرت کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تبلیغ اگر بند ہوتی ہے تو ہو جائے، میری غیرت کا تقاضا پورا ہونا چاہیے تو مجھے اس کے متعلق یہی شبہ پڑ جائے گا کہ وہ احمدی نہیں ہے۔ بلکہ احمدیت کا دشمن ہے۔ (لہٰذا) حکومت برطانیہ اپنے سارے مجموعۂ نظام سمیت خطرے میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ اگر اس طرف سے کمزوری دکھائی جائے تو حکومت انگریزی کو شکست ہو جائے اور اس کے علاقے کسی دوسری حکومت کے ماتحت چلے

جائیں اوراس طرح مذہبی آزادی جاتی رہے اور ہماری تبلیغ رک جائے۔پس اس معاملے کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے اور وہ راہ اختیار نہ کرنی چاہیے جو نادانی اور ہلاکت کی ہے۔'' (ہفت روزہ ''الفضل'' فاروق نمبر، ۲۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء، بہ حوالۂ کاروان احرار: جلد۴،ص ۱۸۳۔۱۸۲)

۱۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء: ۱۱ر ستمبر (۱۹۳۹ء) کو امرتسر میں آل انڈیا مجلس احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔جس میں حسب ذیل تاریخی قرارداد منظور کی گئی:

۱۔ ہرگاہ کہ مجلس احرار اسلام ہند انگریزوں کو آگاہ کرتی ہے کہ جب ملک ہمارا ہے،فوج میں بھرتی بھی ہم دیتے ہیں، روپیہ بھی ہمارا ہے،تم انگریز سمندر پار سے آ کر ہم پر حکومت کرتے ہو، ان حالات میں تمھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہماری رائے کے بغیر تم ہم کو ایک ایسی جنگ میں شامل کرلو جس کا ہمارے ملک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ پھر جب کہ ہم (مسلمان) یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا اس جنگ میں شریک ہوکر انگریزوں کی طرف سے لڑنا وسط ایشیا کی عرب ریاستوں کی غلامی کو مزید بڑھانا ہے اور اس طرح سارے ایشیا پر انگریزوں کی غلامی قائم ودائم رہے گی۔

۳۔ بدیں وجہ مجلس احرار اسلام ہند اعلان کرتی ہے کہ ہمارا اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہم اس جنگ کے لیے انگریزوں کو فوجی بھرتی دینا چاہتے ہیں اور نہ ہی اس جنگ کے لیے کسی قسم کی، مالی امداد دینے کو تیار ہیں۔

۴۔ اس کے باوجود مسلمانان ہند اس وقت تک برطانوی حکومت کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کریں گے جب تک اسلامی ممالک سے برطانوی فوجیں واپس نہیں ہو جاتیں نیز ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد نہ کر دیا جائے۔ پھر مجلس احرار اس پر غور کرسکتی ہے کہ مسلمان کا موجودہ جنگ میں شریک ہونا انسانی تباہی کا باعث تو نہیں ہوگا؟

۵۔ پھر جب کہ مجلس احرار کئی سال سے ہندوستان کی آزادی اور عالم اسلام کی گلوخلاصی کو برطانیہ کے ساتھ اپنے تعاون کی شرط قرار دیتی چلی آئی ہے۔

۶۔ ہرگاہ کہ موجودہ دور میں حکومت برطانیہ کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ اس بناء پر کرنا پڑا کہ وہ کمزور اقوام کی آزادی کی حامی ہے، لیکن جمہوریت اور کمزور اقوام کی حمایت پسندی کے تمام دعوے کے باوجود برطانیہ نے ہندوستان اور عالم اسلام بالخصوص فلسطین اور آزاد قبائل کے ساتھ اپنے دعوے کے مطابق کسی قسم کا عملی ثبوت نہیں دیا۔اس بناء پر بھی غلام ہندوستان اور غلام مسلمان جو خود اپنے وطن میں غلامی کی وجہ سے زندہ درگور ہیں۔کیوں کر خوشی سے پولینڈ جیسے دور افتادہ ملک

کی جدوجہد آزادی کے لیے جان و مال دے سکیں گے۔
اندریں حالات مجلس احرار اسلام گورنمنٹ برطانیہ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتی ہے کہ کسی جنگ میں ہندوستان کا تعاون صرف اسی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے جب کہ ہندوستان آزاد ہو اور برطانیہ اور فرانس کے محکوم اسلامی ممالک بھی مکمل طور پر آزاد کیے جائیں۔''
(کاروان احرار: جلد۴، ص۸۲۔۱۸۱)

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا بیان:

۱۴ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ جس نے مندرجۂ ذیل بیان شائع کیا:

''یورپ میں اعلان جنگ کی وجہ سے جو خطرناک جمود پیدا ہو گیا ہے اس پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے سچے دل کے ساتھ غور کیا۔ جنگ کے حالات میں جن اصولوں پر قوم چلا کرتی ہے، ان کو کانگریس بار بار دہرا چکی ہے۔ ایک ہی مہینہ ہوا کہ اس کمیٹی نے ان اصولوں کا اعادہ کیا تھا اور ہندوستان میں برطانوی حکومت رائے عامہ کو جو ٹھکرا رہی ہے۔ اس پر غیر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ برطانوی حکومت کی اس پالیسی سے قطع تعلق کرنے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ کمیٹی نے مرکزی اسمبلی کانگریس پارٹی کے ممبروں کو ہدایت کی کہ وہ اسمبلی کے آئندہ سیشن میں شریک نہ ہوں۔ اس کے بعد سے برطانوی حکومت نے ہندوستان کو جنگ آور ملک قرار دے دیا۔ آرڈیننس نافذ کر دیے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ترمیمی بل پاس کر دیا اور دوسری دوررس تدبیریں اختیار کیں جن کے ہندوستانی باشندوں پر بنیادی اثرات پڑے اور انھیں باندھ دیا گیا اور صوبہ جاتی حکومتوں کے اختیارات اور سرگرمیاں محدود ہو گئیں۔

یہ سب کچھ ہندوستان کے باشندوں کی اجازت کے بغیر کیا گیا ہے جن کی اعلان کردہ خواہشات کو برطانوی حکومت نے اس قسم کے معاملات میں دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا ہے ورکنگ کمیٹی کو ان تمام حالات کو نہایت تشویش ناک نظر سے دیکھنا چاہیے۔

فاشزم اور نازی ازم کے اصولوں اور ان کے طریقۂ کار کے خلاف کانگریس بار بار اعلان کر چکی ہے اور جنگ تشدد اور انسانی جذبات کے دبانے کے خلاف کانگریس اظہار رائے کر چکی ہے اور انھوں نے بار بار جو حملے کیے ہیں اور قائم شدہ اصولوں اور باتہذیب برتاؤ کے تسلیم شدہ معیار

کی جو خلاف ورزی کی ہے، اس کی بھی کانگریس مذمت کر چکی ہے، فاشزم اور نازی ازم کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ سامراج کے اصولوں کو زیادہ شدید کر دیا جائے، جن کے خلاف ہندوستانی برسوں سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ [illegible] چاہیے کہ وہ بلا کسی پس و پیش کے جرمنی کی نازی حکومت کے اس حملے کی مذمت کرے جو پولینڈ کے خلاف کیا گیا ہے، اور جو حکومتیں اس حملے کی مدافعت کر رہی ہیں ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرے۔

کانگریس نے مزید قرار دیا ہے کہ ہندوستان کے امن اور جنگ کے معاملے کا فیصلہ خود ہندوستانیوں کو کرنا چاہیے اور کوئی باہری طاقت اس فیصلے کو ان پر ٹھونس نہیں سکتی اور نہ ہی ہندوستانی سامراجی مقاصد کے لیے اپنے وسائل سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ مگر ہندوستان پر کوئی فیصلہ ٹھونسا گیا یا ان کے وسائل کو ان مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، جن کو وہ پسند نہیں کرتے تو لازمی طور پر انھیں مخالفت کرنی پڑے گی۔ اگر اعلیٰ درجے کے کاز کے لیے تعاون کی ضرورت کی خواہش ہے، یہ زبردستی کرنے اور ٹھونسنے سے حاصل نہیں ہو سکتی، اور کمیٹی اس بات سے ہرگز اتفاق نہیں کر سکتی کہ ہندوستانی باہری طاقت کے جاری کیے ہوئے انتظامات پر عمل کریں۔

ہندوستانیوں نے ماضی قریب میں بڑے بڑے خطروں کا مقابلہ کیا اور اپنی آزادی حاصل کرنے اور ہندوستان میں آزاد جمہوری حکومت قائم کرنے کے لیے رضامندی کے ساتھ بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اور قطعی طور پر ان کی ہمدردیاں جمہوریت اور آزادی کے ساتھ ہیں۔ مگر ہندوستان ایسی جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ جمہوری آزادی کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ لیکن ہندوستان کو اس آزادی سے محروم رکھا گیا ہے اور جو محدود آزادی اسے ملی ہوئی تھی وہ بھی چھین لی گئی ہے۔ کمیٹی کو اس بات کا علم ہے کہ حکومت برطانیہ اور فرانس نے اعلان کیا ہے کہ وہ جمہوریت اور آزادی کے لیے لڑ رہی ہیں اور جنگ کرنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ جارحانہ کارروائیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن ماضی قریب کی تاریخ ایسے واقعات سے پر ہے کہ ۱۸-۱۹۱۴ء کے درمیان جو جنگ جاری رہی، اس میں قول و فعل، اعلان کردہ آدرشوں اور حقیقی نیت اور مقاصد میں مسلسل اختلاف رہا۔ جنگ کا ظاہرہ مقصد تو جمہوریتوں اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی آزادی کی حفاظت کرنا تھا لیکن جن حکومتوں نے پاک بازی کے ساتھ ان مقاصد کا

دعویٰ کیا تھا، انھی نے دولت عثمانیہ کے حصہ بخرے کرنے کے لیے سامراجی نوعیت کا خفیہ معاہدہ کر لیا۔

پانچ قوتوں نے یہ کہتے ہوئے کہ وہ علاقہ حاصل کرنا نہیں چاہتے، وسیع علاقہ کو اپنی نو آبادیات میں شامل کرلیا۔ یورپ کی موجودہ جنگ نے معاہدہ ورسیلز اور اس کے بنانے والوں کی قطعی ناکامی کو آشکار کر دیا۔ جنھوں نے مفتوح قوموں پر سامراجی امن تھوپ دیا اور اپنے عہد کی خلاف ورزی کی۔ جمعیۃ الاقوام کی شکل میں اس معاہدے کا جو امید افزا نتیجہ برآمد ہوا تھا، اس کا منہ باندھ دیا گیا۔ پہلے اس کا دم گھونٹا گیا اور بعد میں سرپرست حکومتوں نے اسے مردہ بنا دیا۔ بعد کی تاریخ سے یہ ظاہر ہوا کہ کس طرح جیتے جاگتے اعلانوں کو نظر انداز کیا گیا۔ منچوریا میں حکومت برطانیہ نے حملے کی طرف سے چشم پوشی کی۔ حبش میں بھی یہ حکومت علاحدہ رہی۔ چیکوسلاواکیہ اور اسپین میں جمہوریت خطرہ میں تھی لیکن اسے دیدہ ودانستہ دھوکا دیا گیا، اور اجتماعی تحفظ کا پورا سسٹم انھیں طاقتوں نے خراب کر دیا جو پہلے اس میں اپنے عقیدے کا اعلان کر چکی تھیں۔

دوبارہ پھر کہا گیا کہ جمہوریت خطرے میں ہے اور اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اس بیان سے کمیٹی کو پورا پورا اتفاق ہے۔ کمیٹی یقین رکھتی ہے کہ مغرب کے باشندوں نے اس آدرش اور اس مقصد کو سامنے رکھ حرکت کی ہے اور ان کے لیے قربانیاں کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن بار بار عوام کے آدرشوں اور جذبات اور ان لوگوں کو جنھوں نے خود جدوجہد میں قربانیاں کی ہیں، نظر انداز کیا جا چکا ہے اور ان کے ساتھ ایمان داری کا سلوک نہیں کیا گیا ہے۔

اگر سامراجی مقبوضات نو آبادیوں اور مخصوص مفاد اور موجودہ حیثیت کے لیے یہ جنگ لڑی جا رہی ہے تو پھر ہندوستان کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کسی طرح معاملہ جمہوریت کا ہے اور اس کا نظام جمہوریت پر مبنی ہے تو پھر ہندوستان کو اس سے انتہائی دلچسپی ہے۔ کمیٹی کو یقین ہے ہندوستان کی جمہوریت کے مفادوں کی، برطانوی جمہوریت کے مفادوں یا دنیا کی جمہوریت کے مفادوں میں ٹکر نہیں ہوتی۔ لیکن ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی جمہوریتوں کی فاشزم اور سامراج سے اشد مخالفت ہے۔ اگر برطانوی حکومت جمہوریت کو برقرار رکھنے اور اس کو وسیع کرنے کے لیے لڑ رہی ہے تو اسے لازمی طور پر اپنے مقبوضات سے سامراجیت کا خاتمہ کر دینا چاہیے اور ہندوستان میں مکمل جمہوریت قائم کرنی چاہیے اور ہندوستانیوں کو پورا پورا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ باہری مداخلت کے بغیر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے ذریعے خود اپنا قانون بنائیں اور اپنی

پالیسی چلائیں ۔ آزاد جمہوری ہندوستان حملے کے خلاف باہمی ڈیفنس کے لیے اور اقتصادی تعاون کے لیے بڑی خوشی کے ساتھ دوسری آزاد قوموں کا ساتھ دے گا۔ ہم ایک ایسے حقیقی عالمگیر نظام کے لیے کام کریں گے جو آزادی اور جمہوریت پر مبنی ہو، اور جس میں انسانیت کی ترویج وترقی کے لیے دنیا کی معلومات اور وسائل سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یورپ پر جمود چھایا ہوا ہے۔ وہ صرف یورپ کے لیے ہی نہیں ہے، بلکہ وہ انسانیت کے لیے ہے اور یہ دوسرے جمودوں اور جنگوں کی طرح دنیا کے موجودہ لازمی نظام کو صحیح وسالم چھوڑ کر نہیں گزر جائے گا۔ ممکن ہے یہ جمود دنیا کو بہتری کی طرف لے جائے۔ سیاسی اور اقتصادی طور پر یہ جمود سماجی اور سیاسی جھگڑوں اور وعدہ خلافیوں کا جو گذشتہ جنگ عظیم کے بعد خطرناک طریقے پر بڑھ گئی ہیں، لازمی نتیجہ ہے۔ جب تک وعدہ خلافیوں اور جھگڑوں کو دور نہیں کیا جائے گا اور ایک نئی مساوات قائم نہیں کی جائے گی، اس وقت تک یہ جمود انتطائی طور پر ختم نہیں ہوگا۔ جب تک حکمرانی اور ایک ملک کا دوسرے ملک سے ناجائز فائدہ اٹھانے کو ختم نہیں کیا جائے گا اور سب کے مشترکہ مفاد کے لیے اقتصادی تعلقات کو دوبارہ قائم نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک یہ مساوات قائم نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان اس مسئلے کا سب سے نمایاں پہلو ہے، کیوں کہ ہندوستان میں جدید سامراجیت کی نمایاں مثالیں موجود ہیں۔ اس اہم مسئلے کو نظر انداز کرنے کے بعد دنیا کی کوئی تنظیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان کو اپنے بے شمار وسائل کے ساتھ دنیا کے لیے نظم کی تربیت میں اہم حصہ لینا چاہیے مگر وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے یہ کرسکتا ہے جب کہ اس کی تمام قوتیں ایک عظیم تر مقصد کے لیے کام کرنے کے واسطے آزاد کردی جائیں۔ اس وقت آزادی ناقابل تسلیم ہے اور دنیا کے کسی حصے میں سامراجی غلبہ کو برقرار رکھنے کی ہر ایک کوشش لازمی طور پر ایک تازہ سانحہ کا موجب بنے گی۔

ورکنگ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ بہت سے ہندوستانی والیان ریاست نے اپنی خدمات اور وسائل پیش کیے ہیں اور انھوں نے یورپ کی جمہوریت کے کاز کی حمایت کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر وہ باہر کی جمہوریتوں کی حمایت میں اپنی خدمات پیش کرتے ہیں تو کمیٹی تجویز کرتی ہے کہ پہلے انھیں خود اپنی ریاستوں میں جمہوریت قائم کرنی چاہیے، جہاں کہ آج کل مطلق العنانی کا راج ہے۔ اس مطلق العنانی کے لیے برطانی حکومت زیادہ ذمہ دار ہے۔ یہ پالیسی اور خود والیان ریاست، جمہوریت کے بالکل منافی ہیں، جس کے لیے برطانیہ، یورپ میں جنگ کرنے کا دعویٰ

کرتا ہے۔ یورپ کے گذشتہ حالات افریقہ اور ایشیا اور بالخصوص ہندوستان کے پچھلے اور موجودہ واقعات کو دیکھنے کے بعد ورکنگ کمیٹی کو کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کر جمہوریت یا اختیارات کامل کی ترقی کے لیے کوشش کی گئی ہے یا برطانیہ موجودہ جنگ میں جو وعدے کر رہی ہے ان کی کوئی شہادت ملتی ہو۔ سچی جمہوریت کا صحیح پیمانہ سامراج اور فاشزم کے خاتمہ کے مترادف ہے اور ان جارحانہ کارروائیوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جو اس کے ساتھ وابستہ رہی ہیں، صرف اس بنیاد پر نیا نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اگر اس نئے عالمگیر نظام کے لیے جنگ لڑی جائے گی تو اس میں ہندوستان بڑے شوق اور خوشی کے ساتھ ہر طرح امداد کرے گا لیکن جو جنگ سامراجی اصولوں پر لڑی جائے گی یا اس کا مقصد ہندوستان یا کہیں اور سامراج کا استحکام ہوگا تو اس میں کمیٹی ساتھ نہیں دے سکتی اور کوئی تعاون نہیں کر سکتی۔

موقع کی نزاکت کے لحاظ سے اور اس حیثیت کے پیش نظر کہ گذشتہ چند روز میں حالات کی رفتار لوگوں کے تخیل کے مقابلے میں بھی زیادہ تیز رہی ہے۔ اس لیے کمیٹی اس موقع پر کوئی انقطاعی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تاکہ زیر نظر مسئلے کی تفصیل حقیقی نیت اور ہندوستان کی موجودہ اور آیندہ وضاحت کا موقع ملتا رہے، لیکن فیصلے میں تاخیر نہیں کی جا سکتی کیوں کہ ہندوستان روز بروز اس پالیسی کی طرف گھسیٹا جا رہا ہے جس میں اس کی کوئی آواز نہیں ہے اور جس کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا ورکنگ کمیٹی برطانوی حکومت کو دعوت دیتی ہے کہ وہ واضح الفاظ میں اعلان کر دے کہ جمہوریت اور سامراج کے بارے میں اس کے پیش نظر جنگ کے کیا مقاصد ہیں اور ان مقاصد کا ہندوستان پر کسی حد تک اطلاق ہوگا اور موجودہ حالات میں انھیں کہاں تک عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ کیا وہ اپنے ان مقاصد میں سامراج کا خاتمہ اور ہندوستان کے ساتھ ایک آزاد قوم کا سا سلوک بھی شامل کریں گے؟

آخر میں ورکنگ کمیٹی ہندوستانیوں سے سچے دل کے ساتھ امید کرتی ہے کہ انھیں تمام اندرونی جھگڑے ختم کر دینے چاہئیں اور اس نازک دور میں تیار رہنا چاہیے اور ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے مل جل کر کام کرنا چاہیے اور دنیا کی وسیع آزادی کے ساتھ ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لیے پختہ ارادہ رکھنا چاہیے۔"

اس تجویز کے بعد دوسرے اجلاسوں میں کانگریس نے اپنے مطالبات کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا جن کا حاصل یہ تھا:

''الف: ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا جائے۔

ب: آزادی کے لیے بعد از جنگ ایک مدت مقرر کردی جائے۔

ج: سردست مرکز میں بااختیار قومی حکومت قائم کردی جائے (جو آزادی ہند کے لیے پیش خیمہ ہو اور ایفاے وعدہ کے لیے وثیقۂ اطمینان ہو)

د: حق راے دہندگی بالغان کے اصول پر ایک کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی (دستور ساز مجلس) منتخب کی جائے۔'' (علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، حصہ دوم، ص ۵۹۔۵۱)

یکم ستمبر: یکم ستمبر ۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کردیا۔ ۳۔ ستمبر کو برطانیہ اور فرانس نے مل کر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ ہٹلر چھلاوا بن کر یورپ کے ملکوں پر دھاوا بولتا اور چٹکی بجاتے اسے فتح کرلیتا اور سوائے آہ و واویلا کے کسی سے کچھ نہ بن پڑتا۔ پولینڈ، آسٹریا۔ چیکوسلواکیہ نو سال کے اندر ہی چیں بول گئے۔ پھر وہ نیدرلینڈ میں گھسا اور ہالینڈ و بلجیم وغیرہ پر قبضہ کر کے جزائر برطانیہ عظمیٰ تک پہنچنے کا راستہ صاف کرنے لگا۔

ستمبر ۳۹ء آخیر تک پولینڈ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے اور وہ جرمن بوٹ کے نیچے بے سکت پڑا تھا۔ پولستان کے نصف مشرقی حصے پر سوویٹ یونین نے قبضہ جمالیا۔ فرانس اور جرمنی اپنی سرحدوں پر مسلح ہوکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ڈٹ گئے۔ لیکن جلد ہی فرانس کی طاقت جواب دے گئی اور مارشل پیتان نے فرانس کو ہٹلر کے قدموں میں ڈال دیا۔ جنرل ڈیگال بھاگ کر برطانیہ پہنچا اور وہاں آزادی فرانس کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگیا۔ اب ہٹلر کا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ برٹش کو یہ تشویش کھائے جارہی تھی کہ مبادہ لندن پر گولہ باری ہونے لگی تو کیا ہوگا؟ اور برطانیہ کے پیروں تلے کی زمین سرکنے لگی تھی۔ (حسرت موہانی......ایک سیاسی ڈائری، ص ۱۸۵)

جمیعت علماے ہند کا جلسہ:

۱۶ر ستمبر ۱۹۳۹ء: ۱۶ر ستمبر ۳۹ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس میرٹھ میں طلب کیا گیا۔ ارکان مجلس عاملہ کے علاوہ جماعت کے دوسرے اہل الراے حضرات کو اس اجلاس میں مدعو کیا گیا۔ نیز مسٹر جناح صدر مسلم لیگ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرار اسلام کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں متفقہ طور پر ایک فیصلہ صادر کریں اور ان کی پالیسی میں انتشار نہ پیدا ہو۔ مگر افسوس مسٹر جناح کے لیے کب ممکن تھا کہ وہ اس جماعت کی دعوت

پر التفات کریں۔ جس کے اقتدار ختم کرنے کا وہ ایک سال پہلے اعلان کر چکے تھے، چناں چہ مسٹر جناح نے دعوت نامہ کا جواب بھی نہیں دیا۔ (اخبار انصاف میرٹھ مورخہ ۲۰ ستمبر ۳۹ء)

البتہ مولانا حبیب الرحمٰن صدر احرار اسلام ہند، حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمہ اللہ اور دیگر اکابر نے اس اجلاس میں شرکت فرمائی۔

تین روز کے غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد مجلس عاملہ نے مندرجۂ ذیل بیان شائع کیا۔ دار الاسلام بنگال کی حکومت اس کو برداشت نہ کر سکی اور اعلاء کلمۃ الحق کے خلاف جہاد کرتے ہوئے اس کو ضبط کر لیا۔ (مدینہ ۲۵ / اکتوبر ۳۹ء)

اعلان

"جرمنی اور پولینڈ کی جنگ کی وجہ سے یورپ کی فضا میں پریشانی اور اضطراب تو پیدا ہونا ہی تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں روئے زمین کی حکومتوں اور دنیا کی قوموں کے باہمی اقتصادی اور سیاسی تعلقات کی نوعیت نے تمام بنی نوع انسان کو مختلف الجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ آزاد حکومتیں اور خود مختار قومیں اپنے نقطۂ نظر سے غور کر رہی ہیں کہ ان کو اس جنگ میں کس فریق کی حمایت و امداد کرنی چاہیے اور محکوم حکومتیں اور غلام قومیں اپنے اپنے آقاؤں کے اشاروں پر ان کی امداد کے ساز و سامان تیار کرنے میں مصروف ہیں اور ہر قسم کی جانی و مالی قربانیاں پیش کرنے کا یقین دلا دلا کر اپنے خداوندان نعمت کی خوشی اور رضامندی حاصل کرنے کی کوشش میں منہمک ہیں۔

جرمنی کا پولینڈ کے خلاف جارحانہ اقدام کن اسباب پر مبنی ہے اور اس کے حقیقی وجوہ کیا ہیں۔ صحیح طور پر خدا کو اور اقدام کرنے والوں کو معلوم ہے مگر جہاں تک قرائن اور شواہد کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ جارحانہ اقدام کرنے میں جرمنی کے مختار کل ہر ہٹلر کی تعدی ہے۔

خون کی ہولی:

جرمنی اور پولینڈ کے متنازع فیہ قضیے کے حل کرنے کے دوسرے مصالحانہ طریقے بھی ہو سکتے تھے، جو کام میں نہیں لائے گئے اور مساعی قیام امن کو آخری درجے تک پہنچانے سے پہلے ہی انسانی خون کے ساتھ ہولی کھیلی جانے لگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ معاملہ جرمنی اور پولینڈ کا تھا۔ برطانیہ اور فرانس نے جرمنی اور پولینڈ تک اسے محدود رکھنے اور صرف ان دو قوموں کے اندر کشت و

خون ہونے کے بجائے برطانوی اور فرانسیسی قوموں کو بھی اس آگ میں کیوں دھکیل دیا اور خونریزی کے ایک محدود حلقے کو وسعت دے کر بے شمار انسانی جانوں کو خطرے میں کیوں ڈال دیا؟

جنگ بہرحال جنگ ہے اور تباہی اور بربادی اور انسانی خون کی ارزانی اس کے لازمی نتائج ہیں۔ اس سوال کے جواب میں برطانیہ کی طرف سے کئی عذر بیان کیے گئے ہیں اور برطانیہ کی شرکت جنگ کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری بتایا گیا ہے۔

پہلا عذر یہ بیان کیا گیا ہے کہ چوں کہ برطانوی قوم اقوام کی آزادی کی داعی ہے اور آزادی کی حمایت اس کا ایک حتمی فریضہ ہے اور ہر ہٹلر پول قوم کی آزادی سلب کر کے ان کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے برطانیہ کا فریضہ تھا کہ وہ پول قوم کی آزادی کی حفاظت کے لیے برطانوی قوم کو بڑی جنگ کی آگ میں دھکیل دے اور پول کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے برطانوی قوم کا خون بہادے۔

دوسرا عذر یہ بتایا گیا ہے پولینڈ کی حکومت جمہوری حکومت ہے اور جرمنی کی حکومت ڈکٹیٹری اور آمریت کی حکومت ہے۔ برطانیہ جمہوریت پسند ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ جمہوریت کی حفاظت اور ڈکٹیٹری کی بیخ کنی کرے اور اس راہ میں اگر برطانوی قوم کا خون بہانا ضروری ہو تو بہا دے۔

تیسرا عذر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہر ہٹلر نے جارحانہ اقدام کرنے میں تعدی کی ہے اور وہ ظالم ہے اور پولینڈ مظلوم ہے اور برطانیہ مظلوم کی حمایت کو انسانی فرض سمجھتی ہے اس لیے وہ پولینڈ مظلوم کی نصرت و اعانت کی راہ میں برطانوی قوم کا خون بہادینے کے لیے مجبور ہے۔

چوتھا عذر یہ کہا گیا کہ چوں کہ جمعیۃ اقوام نے پولینڈ کو ایک آزاد حکومت قرار دے کر اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی اور حکومت برطانیہ بھی جمعیۃ اقوام کی رکن ہے۔ اس لیے برطانیہ پر فرض ہے کہ پولینڈ کی حفاظت کے لیے جس قدر بھی قربانیاں دینی پڑیں، دے اور اس کو جرمنی کی غلامی سے محفوظ رکھے۔

بہانوں کا سہارا:

ان وجوہ کا سہارا لے کر برطانوی حکومت جرمنی اور پولینڈ کی جنگ میں اپنی شرکت کو جائز

ثابت کرتی اور پھر اپنی ماتحت یا زیر اثر حکومتوں اور قوموں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ آزادی جمہوریت ،مظلوم کی حمایت اور عہد و مواعید کے احترام کے نام پر برطانیہ کی امداد کریں ہز ایکسی لینسی وائسرائے نے بھی ہندوستانیوں سے انھیں وجوہ کی بنا پر اپیل کی ہے کہ تمام ہندوستان اس جنگ میں آزادی، جمہوریت، مظلوم کی حمایت اور مواعید کے احترام کی خاطر برطانیہ کی معاونت کرے۔

مذہبی اخلاقی اور سیاسی غور:

جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ نے اس نازک موقعے پر اعلیٰ ترین اسلامی، وطنی اور اخلاقی اصول کو پیش نظر رکھ کر غور کیا اور مسئلے کے اس پہلو کو جانچا کہ اگر جرمنی اور پولینڈ کی جنگ کی آگ میں برطانیہ نے اپنی قوم کو دھکیل دیا تو کیا ہمارا اسلامی یا وطنی یا اخلاقی فرض ہے کہ ہم بھی برطانیہ کی حمایت کے لیے ہندوستانیوں کو اس آگ میں کود پڑنے اور اپنا خون بہا دینے کا مشورہ دیں؟

اس مرحلے پر ہمیں برطانیہ کی طرف سے بیان کیے ہوئے عذروں پر تفصیلی نظر ڈالنا پڑی تاکہ کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو۔ جہاں تک برٹش مدبرین اور وزرا کی نیتوں کا تعلق ہے وہ علام الغیوب ہی بہتر جانتا لیکن جہاں تک عمل اور نتائج کا تعلق ہے ہمیں افسوس ہے کہ اس میں ہندوستانیوں کے لیے یقین واطمینان کی کوئی روشنی نہیں ملتی۔

بہانوں کا تار پود اور حقیقت آشکار:

پہلے عذر یعنی اقوام کی آزادی کی حمایت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو چیکوسلواکیہ اور آسٹریا اور ابی سینیا اور البانیہ کے واقعات ہمارے سامنے آجاتے ہیں کہ برطانوی حکومت کی آنکھوں کے سامنے ان اقوام کی آزادی سلب کی گئی اور ڈکٹیٹروں نے قتل وغارت کے بازار گرم کیے اور ہر قسم کی تعدی، خونریزی سے آزاد انسانوں پر ہلاکت ڈال کر ان کو غلام بنایا گیا، اور اگر یہ بات صحیح بھی نہ ہو کہ حبش کی تباہی اور بربادی موطانوی مواعید حمایت کا نتیجہ ہے تاہم اس میں تو شبہ نہیں کہ برطانیہ ان اقوام کی آزادی کی حمایت کے لیے کھڑی نہیں ہوئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے یہ قومیں جرمنی اور برطانوی ڈکٹیٹروں کی غلام بنالی گئیں۔

ہندوستان فلسطین وغیرہ کی غلامی:

نیز برطانیہ خود بہت سی قوموں کو غلام بنائے بیٹھی ہے اور ملکی جدوجہد آزادی کو دبانے کے

لیے ہر قسم کے مظالم اور تشدد سے کام لے کر ان کا خون بہاتی اور غلامی کی زنجیروں کو مستحکم کرتی رہتی ہے۔

خود ہندوستان اور فلسطین کے ہولناک واقعات نظر کے سامنے ہیں، وزیرستان و دیگر آزاد قبائل پر بمباری اور حضرموت پر جابرانہ قبضہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اگر فی الحقیقت برطانیہ اقوام کی آزادی کے اصول کو پسند کرتی ہے اور آزاد قوموں کی آزادی کی محافظ ہے تو اس کے ان تمام اعمال وافعال کی کوئی صحیح تاویل نہیں ہو سکتی۔

دوسرے عذر یعنی جمہوریت کی حفاظت اور ڈکٹیٹری کے استیصال پر غور کیا جاتا ہے تو یہ بات کسی پہلو سے ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں کہ ڈکٹیٹری یا جمہوریت کا تعلق جرمنی قوم سے ہے اگر جرمنی قوم اپنے ڈکٹیٹر کی حکومت کو پسند کرتی ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ اگر جرمنی میں جمہوری حکومت ہوتی اور پولینڈ کی آزادی سلب کرنے کے لیے وہ اس قسم کی تعدی کرتی تو کیا محض اس وجہ سے کہ جرمنی کی حکومت بھی جمہوری ہوتی اس کی یہ تعدی جائز قرار دی جاتی۔ اگر ڈکٹیٹرازم پولینڈ پر قابض ہو گیا تو اس کی تباہی و بربادی اس سے زیادہ ہوگی جو جمہوریت برطانیہ کی طرف سے بالفورازم نے فلسطین میں برپا کی اور کیا وزیرستان اور آزاد قبائل میں جمہوریت کی طرف سے برپا کی ہوئی تمام بربادیاں اور بمباریاں محض اس وجہ سے جائز سمجھی جائیں گی کہ ان کی مرتکب برطانوی جمہوریت ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے برطانیہ کی جمہوریت پسندی کا یہی مظاہرہ ہے کہ ہندوستان کی رائے عامہ معلوم کیے بغیر وائسرائے نے خودرائی کے ساتھ اس جنگ میں ہندوستان کی شرکت کا اعلان کر دیا۔

بہر حال ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر برطانوی حکومت نے پول قوم کی جمہوریت کی حفاظت کی غرض سے برطانیہ کو جنگ کی بربادیوں اور ہلاکت خیزیوں میں مبتلا کیا ہے تو اسپین کی جمہوریت کی حفاظت کیوں نہ کی اور خود اپنے زیر اثر ممالک اور اقوام کے اندر جمہوریت قائم کرنے میں وہ کسی مستعدی کا اظہار کیوں نہیں کرتی؟

جمعیت علماء جمہوری اصول کو پسند کرتی ہے اور اس کے نزدیک اسلامی جمہوریت کا جو خاکہ ہے وہ یورپین جمہوریت کے اصول سے بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ اسلامی جمہوریت میں اکثریت اور اقلیت پورے اطمینان اور تحفظ حقوق کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ جمعیت یورپین ڈکٹیٹرازم کو غلط سمجھتی ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کو برطانیہ کے اس اقدام جنگ میں جمہوریت پسندی کا شائبہ بھی

نظر نہیں آتا۔

طرابلس البانیہ، چیکوسلواکیہ و آسٹریا وغیرہ کی غلامی:

تیسرے عذر یعنی مظلوم کی حمایت کی حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو طرابلس الغرب، شام، ابی سینا، البانیہ، چیکوسلواکیہ، فلسطین، پولینڈ سے کم مظلوم نہیں تھے ان کی حمایت کیوں نہیں کی گئی اور کیوں ان کو ظالموں کا شکار ہو جانے دیا گیا؟

چوتھا عذر وعدوں کا ایفاء اور عہد ناموں کا احترام ہے۔ اس کی حقیقت بھی ہمارے سامنے ملکہ وکٹوریہ اور سابقہ تمام شاہی مواعید ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دوران میں برطانیہ کے وعدوں اور ان کی پیہم خلاف ورزیوں کی صورت میں آ جاتی ہے۔ برطانیہ کے ذمہ دار مدبرین کے بار بار اعلان کے باوجود کہ جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہو مگر سلطنتوں کی حدود میں کوئی فرق نہ آنے دیا جائے گا۔ اور مقامات مقدسہ کے احترام اور حفاظت کی ذمہ داری لی گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد فاتحین نے مفتوحہ سلطنتوں بالخصوص ترکی سلطنت کے جو حصے بخرے کیے اور مقامات مقدسہ کے اہم اجزا کو جس طرح پامال کیا وہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

برطانیہ کے خوشامدیوں کی بے سبب حمایت:

بہر حال یہ تمام وجوہ ہیں جو ہمارے پیش نظر ہیں اور ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان عذروں کو حقائق واقعیہ کی طرح یقین کرنے سے قاصر ہیں جن حکومتوں یا قوموں یا جن افراد نے سیاسی مصالح یا ذاتی اغراض کی بنا پر برطانیہ کی امداد کرنے کا اعلان کر دیا ہے وہ ان عذروں کو اچھال اچھال کر بیان کر رہے ہیں۔ مگر ہم نہیں سمجھتے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں سے ان تمام واقعات کو جو جنگ عظیم کے زمانے سے اس وقت تک متواتر ہوتے چلے آئے ہیں۔ کس طرح محو کر سکتے ہیں اور کسی سچے مسلمان یا محب وطن کو کس طرح برطانیہ کی امداد پر آمادہ کر سکتے ہیں؟ پھر اگر ہم اس کو ہندوستان یا مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ آیا ہمارا برطانیہ کے ساتھ تعاون کرنا ہندوستان یا مسلمانوں کے اپنے لیے مفید ہوگا یا نہیں تو جہاں تک واقعات اور شواہد کا تعلق ہے ہمارے سامنے کوئی روشنی نہیں ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں ہندوستان نے ہر قسم کی تباہی اور بربادی اٹھا کر اور بیش از بیش جانی و مالی قربانیاں پیش کر کے برٹش امپیریلزم کو مضبوط کیا اور اپنی غلامی کی مدت بڑھالی تو اب انھیں کیسے اطمینان ہو سکتا

ہے کہ اس موقعے پر برطانیہ کی حمایت ان کو آزادی سے بہرہ ور کرے گی یا برٹش امپیریلزم کی فتح اور قوت برطانیہ کی مزید خودسری اور جمہوریت کے پردے میں استعماریت کے استحکام کا باعث نہ ہو جائے گی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی ترمیم جس کے ذریعے سے صوبوں کی ادھوری آزادی کو بھی مجروح کیا یا واپس لے لیا گیا ہے ہمارے لیے خطرہ کا الارم ہو سکتی ہے۔

مکمل آزادی کا نصب العین:

جمعیت علماء کا نصب العین ہمیشہ سے مکمل آزادی رہا ہے اور وہ اس کو اپنا شرعی، سیاسی اور اخلاقی حق سمجھتی ہے اور کوئی چیز جو اس حق کے راستہ میں مزاحم ہو، اس کے نزدیک قابل برداشت نہیں ہے!

خلاصۂ بیان اور عدم تعاون کا اظہار:

بہر حال جمعیت علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کسی نقطۂ نظر سے بحالت موجودہ جنگ میں برطانوی امپیریلزم کی امداد کرنے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں پاتی۔ نیز اس کے نزدیک لازم اور ضروری ہے کہ موقع کی اہمیت اور نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی مل کر ہندوستان کی طرف سے اپنی خودداری اور وقار کے لحاظ سے ایک فیصلہ کریں اور سب مل کر ایک ہی راستہ اختیار کریں کہ یہ ان کی نجات اور آزادی کا حقیقی مدار ہے۔''

(علمائے حق اور......ج ۲،ص ۵۱ـ۴۲)

حضرت مفتی صاحب کا ایک فتویٰ:

۱۷ رستمبر ۱۹۳۹ء: منورالدین (کلکتہ) نے حضرت مفتی صاحب سے چند سوالات کیے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے ان کا جو جواب دیا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ سوالات کی نوعیت جوابات سے ظاہر ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے:

(۱) اپنے ہم مذہب گروہ کو اپنے مذہبی رنگ میں رنگنے کی کوشش کا تصور کیا جا سکتا ہے دوسرے ادیان کے ماننے اور یقین رکھنے والے ایسی کوشش سے متاثر نہیں ہو سکتے۔

(۲) عدم تشدد بطور دینی حکم اور دینی عقیدے کے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اہل اسلام کی نزدیک قابل پذیرائی نہیں اور نہ اس طرح مسلمانوں نے اسے تسلیم کیا۔ البتہ موجودہ بے بسی کے

زمانے میں بطور وقتی پالیسی کے اس کو تسلیم کیا گیا تھا اور اس میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے۔

(۳) فاقہ کشی اور خاموشی کا روزہ اور خدا سے ہم کلامی کا دعویٰ (اگر کیا ہو) گاندھی جی کے ذاتی افعال ہیں مسلمانوں کو ان افعال سے کوئی واسطہ نہیں۔

(الف) ایک غیر ملکی تسلط کو دفع کرنے کے مشترکہ مقصد میں اسی مقصد کے سیاسی حدود تک کسی ایسے شخص یا جماعت کے ساتھ اشتراک عمل کیا جاسکتا ہے جو اس مقصد کے حصول کی سیاسی تدبیروں سے واقف ہو۔ بس اس سے زیادہ اور کوئی اہمیت اس کو حاصل نہیں۔

(ب) اسلام کے بعد اسلام کے سوا کوئی روحانی اور مذہبی تحریک مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بروئے کار نہیں آسکتی۔

(ج) اور نہ مسلمانوں کے عقیدے کے بموجب کوئی اور تحریک بموجب فلاح آخرت ہوسکتی ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

مسلم لیگ کی وار پالیسی:

۱۸ر ستمبر ۱۹۳۹ء: ۱۸ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو دہلی میں لیگ کی عاملہ کا اجلاس مسٹر لیاقت علی خاں کی کوٹھی پر ہوا۔ مسٹر جناح صدر تھے۔ خان بہادروں، سروں، نوابوں نے شرکت کی اور برطانیہ عظمیٰ سے اپنی وفاداری کی یقین دہانی کے ساتھ یہ طے کیا گیا کہ یہ کمیٹی ملک معظم اور وائسرائے ہند سے پرزور اپیل کرتی ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کی حقیقی اور ٹھوس امداد انگریزوں کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ کیا جائے۔ جہاں آج ہماری آزادی، جان و مال اور عزت سب خطرے میں ہیں۔

(مدینہ، بجنور......۴ر اکتوبر ۱۹۳۹ئمطابق ۱۹ر شعبان ۱۳۵۸ھ)

کو مدینہ بجنور مسلم لیگ کی تجویزوں پر تبصرہ کرتا ہے کہ اگر اسلام کی حقیقت یہی ہے جو محافظین اسلام میں نظر آتی ہے اور مسلمان کی شان یہی ہے جو ان تجویزوں سے ظاہر ہوتی ہے تو پھر ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ کفر اسلام پر خندہ زن ہو اور مدعیان اسلام کی گردنیں بے عزتی اور بے غیرتی کے ساتھ جھکتی ہوئی نظر آئیں۔

(مولانا آزاد......ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۹۱)

لیگ میں ردعمل:

۵/ اکتوبر ۱۹۳۹ء: لیگ کی اس تجویز کو لیگ کے ترقی پسند طبقے نے بھی ناپسند کیا۔ چناں چہ نیشنل ہیرالڈ کے نامہ نگار نے لکھا تھا کہ مسٹر ظہیر الحسن صاحب لاری نے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کے متعلق جو حال ہی میں دہلی کے جلسہ میں (۱۸/ستمبر کو) منظور کیا گیا ہے، ایک بیان اخبارات میں دیا ہے۔ اس میں موصوف لکھتے ہیں کہ اس ریزولیوشن سے سرسکندر حیات جیسے حضرات کی فتح ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ورکنگ کمیٹی سرسکندر حیات خاں سے مرعوب ہوگئی۔ اور ایسا رویہ اختیار کیا گیا جس سے مادر ہند کی توہین ہوئی۔ لاری صاحب نے فرمایا ریزولیوشن میں پہلے وائسرائے کی بڑی تعریف کی گئی۔ کیا لیگ کے لیے یہ ضروری تھا؟

سرسکندر حیات خاں نے برطانیہ کے ساتھ غیر مشروط اشتراک عمل کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن لیگ نے ۲۸/اگست کو اس سے اظہار بیزاری کیا تھا۔ کیا ورکنگ کمیٹی نے اپنے فیصلہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ لیگ کونسل کو سوچنا چاہیے۔ اور اپنے ریزولیوشن میں مسلمانوں کے جذبات اور خواہشات کے بموجب ترمیم کرنا چاہیے۔ کانگریس کے چیلنج کا ضرور جواب دینا چاہیے۔ یہ وقت ایسا نہیں کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر یا خودداری کو ٹھکرا دیا جائے۔

(مدینہ ۵/اکتوبر ۱۹۳۹ء) (بہ حوالہ علمائے حق...... ج ۲، ص ۷۱۔۷۰)

۱۲/اکتوبر ۱۹۳۹ء: حاتم احمد (بنگال) کے ایک سوال کے جواب میں مفتی صاحب نے تحریر فرمایا:

حمایت اسلام تو ارکان کی نیت اور عمل پر موقوف ہے۔ ارکان کانگریس بھی اسلام کی حمایت کر سکتے ہیں جس طرح مسلم لیگ کے ارکان کر سکتے ہیں۔"

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی (جلد نہم)، کتاب السیاسیات)

۱۸/اکتوبر ۱۹۳۹ء تا ۱۳/جنوری ۱۹۴۰ء: جنگ کے مسئلے پر گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد میں اختلاف رائے تھا۔ جنگ پھوٹ پڑی تو مولانا کی رائے تھی کہ ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کے گروہ میں شامل ہو جانا چاہیے مگر خود غلام ہوتے ہوئے ہندوستان دوسروں کی آزادی کے لیے کیسے لڑ سکتا تھا؟ اس مسئلے پر برطانوی حکومت سے کشمکش جاری تھی۔ ۱۸/اکتوبر ۱۹۳۹ء کو

حکومت نے حسب ذیل پیش کش کی:

(الف) وائسرائے کی موجودہ ایگزیکٹو کونسل میں توسیع۔

(ب) جنگی کونسل کے قیام اور حکومت کو جنگ کے بارے میں ہدایات۔

(ج) ایک کمیٹی کا قیام جو جنگ کے خاتمہ پر آئین سازی کے بارے میں مشورہ دے۔

کانگریس نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا تو وائسرائے نے ۱۷/۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ایک اور اعلان میں کہا کہ حکومت جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد ایکٹ ۱۹۳۵ء پر نظر ثانی کے لیے تیار ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے نمایندوں اور دیگر مفادات کے حامل فرقوں سے مشورہ کیا جائے گا کانگریس اور مسلم لیگ نے اسے مسترد کر دیا۔

حکومت کا غیر مفاہمانہ رویہ دیکھتے ہوئے کانگریس کی صوبائی وزارتوں نے استعفےٰ دے دیے تو حکومت کو شدید پریشانی لاحق ہوئی۔ وائسرائے نے ایک اور چال چلی اس نے کانگریس اور مسلم لیگ کو آمادہ کرنے کے لیے نومبر ۱۹۳۹ء کے اوائل میں نئی تجاویز پیش کیں۔

(ا) صوبوں میں از سرِ نو وزارتیں تشکیل دی جائیں۔

(ب) مرکز میں ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت قبول کی جائے۔

کانگریس نے ان تجاویز کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ "مستقبل کا آئین ہندوستان کے لوگوں کے منتخب نمایندے تشکیل دیں گے۔"

کانگریس اور مسلم لیگ کے انکار کی جداگانہ وجوہات کو دیکھتے ہوئے اس سے فایدے اٹھانے اور اس خلیج کو زیادہ وسیع کرنے کے پیش نظر ۱۴ دسمبر ۱۹۳۹ء کو وزیر ہند نے با اصرار کہا کہ اس کی حکومت کی رائے میں "کسی ایسے آئین کے قابل عمل ہونے کے امکانات نہایت معدوم ہیں جسے اقلیتوں کی تائید حاصل نہ ہو۔" اس نے ان وجوہات کا ذکر کیا جن کی بنا پر حکومت مسلمانوں کے ساتھ اقلیتوں جیسا سلوک نہیں کر سکتی یعنی حکومت کے نزدیک مسلمان ایک جداگانہ قوم بن گئے اور یہی مسلم لیگ کا مطالبہ تھا۔ جسے ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں نے ترجمانی کا اختیار نہ سونپا تھا۔

اس سے حکومت کا ایک مقصد تو یہ پورا ہوتا تھا کہ اس نے مسلمانوں کو کانگریس سے جدا کرنے کی چال چلی تھی دوسرے جناح نے پیش کش کر رکھی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے حکومت ثالث کے فرائض سرانجام دے۔ مسلم لیگ کے اصرار کو دیکھتے

ہوئے وزیر ہند نے لارڈ لن لتھگو کو دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہی لکھ دیا تھا۔" یہ صورت حال یقینی ہونی چاہیے اور مسلمان اس امر پر متفق ہو جائیں کہ وہ ہندو کی بالا دستی مرکزی حکومت میں کسی صورت میں بھی تسلیم نہیں کریں گے۔" اب مسلم لیگ کے اقدامات برطانوی سرکار کی خواہشات اور تمناؤں کے مطابق تھے مسلم لیگ الیکشن ہارنے کے باوجود کانگریس کے ہم پلہ بن گئی تھی۔ چناں چہ جناح نے اب محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اسے فرقہ وارانہ ویٹو حاصل ہو گیا ہے تو اس نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۰ء کو وائسرائے ہند لارڈ لن لتھگو سے ملاقات کی اور حکومت سے تعاون کرنے کی شرائط پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسلم لیگ دوران جنگ میں حکومت کے ساتھ انتظامی امور میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہے بشرطے کہ جنگ کے خاتمہ پر حکومت آئین پر نظر ثانی کے لیے تیار ہو۔ اس پیش کش کے ساتھ یہ اہم شرط وابستہ تھی کہ" کوئی آئینی انتظام خواہ عارضی ہو یا مستقل قابل قبول نہیں ہوگا جس کی مسلم لیگ نے منظوری نہ دی ہوگی۔ (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست از محمد فاروق قریشی لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۵۷۔۱۵۶)

۲۳ر اکتوبر ۳۹ء: آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر بابو راجندر پرشاد نے کانگریسی وزارتوں کے خلاف عائد الزامات کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کرانے کی پیش کش کی اور اس کے لیے چیف جسٹس فیڈرل کورٹ آف انڈیا سر مارس گارئر کا نام پیش کیا لیکن مسٹر جناح نے اس کو مسترد کر دیا کہ وہ یہ مسئلہ گورنر جنرل کے روبرو پیش کر چکے ہیں اور وائسرائے سے درخواست کر چکے تھے کہ ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے۔ لیکن وائسرائے لارڈ لن لتھگو نے اس مطالبے کو لائق اعتنا نہ سمجھا اور مسٹر جناح نے سکوت اختیار کر لیا۔

یہ طرز عمل عجیب و غریب ہے کہ انڈیا کے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سے تحقیقات کرانے پر مسٹر جناح رضامند نہ ہوئے اور رائل کمیشن کے قیام کا مطالبہ لے کر وائسرائے کے پاس گئے اس نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا اور پھر سکوت اختیار کر لیا گیا۔ پھر نہ معلوم مظالم کی داستان اور الزامات کا پلندہ کدھر گیا؟ جن کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا عزم پٹنہ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ کیا سکوت اختیار کر لینے سے مسلمانوں کی شکایات رفع ہو گئیں تھیں؟ یا یہ سارا ناٹک فرقہ وارانہ مناقشت تیز کرنے کے لیے رچایا گیا تھا؟ آخر مسلم لیگ نے کانگریس کے قائدین کی پیش کشوں کو قبول کیوں نہ کیا؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیر پور رپورٹ میں صداقت کا نام و نشان نہ تھا سیاسی مقصد براری کے لیے ڈھکوسلا کھڑا کیا گیا تھا۔ جب کانگریس نے اسے چیلنج کیا تو مسلم لیگ کے

غبارے سے ہوا نکل گئی۔

پروفیسر کپلینڈ (جن کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی مسائل کی تحقیقات کے لیے بھیجا تھا) اپنی یادداشتوں کے ساتویں باب میں لکھتے ہیں کہ

''پیر پور رپورٹ میں مندرج داستان ہائے مظالم جو کانگریس وزارتوں سے منسوب ہیں کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ میں نے مسٹر جناح سے اس سلسلے میں جس قدر گفتگو کی، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان کو یا کانگریس کی اسلام دشمنی کو ثابت نہیں کر سکے۔''

مولانا سید طفیل احمد نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''مسلم لیگ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے جو مسلمانوں پر کانگریس کے مظالم کی تحقیقات کرے، مگر اس پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ بلکہ بعض گورنروں نے کہہ دیا کہ ان کے صوبہ میں...... مظالم نہیں ہوئے تاہم کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کا پروپیگنڈا جاری رہا۔''

مولانا آزاد نے مسلم لیگ کے واویلا کو بالکل جھوٹا اور خلاف حقیقت قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں:

''...... میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ بے انصافی کرنے کے جتنے الزام مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے لگائے وہ بالکل جھوٹے تھے۔ اگر ان میں حقیقت کا شائبہ بھی ہوتا تو میں ضرور اس کا انتظام کرتا کہ بے انصافی کا تدارک کیا جائے۔ اگر کوئی صورت نہ ہوتی تو ایسے معاملے پر استعفیٰ بھی دے دیتا۔''

یہاں اس امر کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وزارتوں کے کام کی نگرانی کرنے اور انھیں ہدایات دینے کے لیے کانگریس نے پارلیمانی بورڈ قائم کیا تھا۔ مولانا کے پاس بہار، یوپی اور سرحد کے صوبے تھے جہاں کانگریسی وزارتیں قائم تھیں علاوہ ازیں مولانا بنگال، پنجاب اور سندھ کے صوبوں کے بھی نگران تھے۔ کانگریسی وزارتوں کو پارلیمانی بورڈ کی ہدایات کے مطابق صوبہ کا نظم ونسق چلانا تھا نہ کہ من مانی کرنی تھی۔ یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کی موجودگی میں بورڈ مسلم کش طریق کار اختیار کرتا؟ علاوہ ازیں بورڈ کے غیر مسلم ممبر بھی یہ جسارت کس طرح کر سکتے تھے؟ یہ سب حربے کانگریس کو بدنام کرنے کے لیے اختیار کیے گئے تھے۔ کانگریسی وزارتوں نے دو سال سے کم عرصہ میں جو اہم کام کیے اس کا زیادہ تر فائدہ ان صوبوں میں بسنے والے پسماندہ مسلمانوں کو پہنچا۔ ان صوبوں میں بڑی بڑی جاگیروں کے مالک ہندو تھے۔ مسلمان اور ہندو

مزارعین قرضوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس صورت حال کو تبدیل کرنا زمینداری کا خاتمہ اور زرعی قرضوں کی منسوخی معمولی مسئلے نہ تھے۔ مولانا نے ذاتی دلچسپی لے کر ایسا فارمولا تیار کیا جس سے قدیمی مالکان اور کسان راضی ہو گئے۔ یہ ایک بڑا معرکہ تھا جسے حسن تدبیر سے نپٹایا گیا۔

مسلم لیگ نے سیاسی مسئلوں پر جو رویہ اختیار کیا مولانا نے اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ لیگ کے پروگرام کے تیسرے اور آخری دور، جو دوسری جنگ عظیم کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور جب لیگ کی قیادت محمد علی جناح کے ہاتھوں میں تھی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں:

''......اس وقت کانگریس نے بہت اعتبار پیدا کر لیا تھا، اور یہ صاف ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گی۔ اب مسٹر جناح لیگ کے قائد ہو گئے تھے اور انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں کانگریس اور حکومت کے ہر اختلاف سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جب کبھی کانگریس اور حکومت کے درمیان اختیارات منتقل کرنے کی بات چیت ہوتی تو مسٹر جناح پہلے خاموش رہتے اگر گفتگو کامیاب نہ ہوتی تو وہ ایک بودا سا بیان دے دیتے کہ دونوں فریق مذمت کے قابل ہیں......''

اگر چہ نتائج اخذ کرتے ہوئے مولانا نے اس کا اطلاق اگست ۱۹۴۰ء کی پیش کش اور کرپس کی تجویزوں کے بارے میں مسلم لیگ کے رویہ پر کیا ہے۔ لیکن یہی رویہ پیرپور رپورٹ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ کانگریس نے آٹھ صوبوں کی وزارتوں سے مستعفی ہونے کا فیصلہ برطانوی سرکار کے غیر جمہوری طرز عمل کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کیا۔ جس کے مطابق اس نے اہل ہند کی رائے معلوم کیے بغیر ہندوستانی قوم اور ہندوستان کے وسائل کو جنگ میں جھونک دیا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو واردھا میں منعقد ہوا۔ جس میں طے پایا کہ تمام کانگریسی وزارتیں ۳۱ر اکتوبر تک مستعفی ہو جائیں۔ چناں چہ آٹھوں صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے بلا حیل و حجت استعفے دے دیے۔ کانگریس کی وزارتیں برطانوی حکومت کے غیر جمہوری رویہ کے خلاف بطور احتجاج ازخود مستعفی ہوئی تھیں۔ مسلم لیگ نے اسے اپنی کامیابی بنا کر پیش کیا اور مسٹر جناح نے ۲۲ر دسمبر کو ''یوم نجات'' منانے کی اپیل کر دی۔ حال آں کہ مسلم لیگ نے کانگریسی وزارتوں پر جو الزام تراشی کی تھی ان کے خلاف تحریک سول نافرمانی شروع کرنے کی دھمکی ضرور دی تھی مگر تحریک شروع کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ مسلم لیگ نے الزامات ضرور عاید کیے لیکن مستعفی

ہونے کا مطالبہ کسی مرحلے پر نہیں کیا تھا۔ ان کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ یہ تھا کہ کانگریسی وزارتیں اپنے زیر اقتدار صوبوں میں مسلمانوں پر ظلم کر رہی ہیں وائسرائے اس کی روک تھام کرے۔

کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر ایک طرف مسلم لیگ خوش ہو رہی تھی۔ اور یوم نجات منا رہی تھی تو دوسری طرف ہندوؤں کی فرقہ پرست جماعت ہندو مہا سبھا نے بھی یوم نجات منانے کا اعلان کیا۔ مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر مونجے نے ۲۷ ر دسمبر کو ایک اخباری بیان میں کہا:

''کانگریسی حکومتوں کے خلاف یوم نجات منانے کا حق تو ہم (ہندوؤں) کو ہے، نہ کہ مسلم لیگ کو! کیوں کہ کانگرسی حکومتوں نے مسلمانوں کو سر پر چڑھایا ہوا تھا اور ہندوؤں کو قربان کر ڈالا اور ذلیل کیا۔''

یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ شملہ ڈیپوٹیشن کی بعد ایک طرف مسلمانوں نے اشارۂ غیب سے مسلم لیگ قائم کی تو اسی زمانے میں ہندوؤں کی متعصب جماعت ہندو مہا سبھا نے بھی جنم لیا۔ دونوں نے ہندو مسلم منافرت کی خلیج وسیع کرنے مین کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ دونوں کے قیام کا مقصد کانگریس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا۔

دراصل جب کانگریس نے مسلم لیگ کے بغیر وزارتیں قائم کرلیں تو مسلم لیگ کی قیادت منتقم مزاج ہوگئی اور کانگریس کی اول نمبر دشمن بن گئی۔ اس نے تمام توانائیاں کانگریس کی شہرت کو نقصان پہنچانے پر صرف کرنا شروع کردیں۔ پیر پور کمیٹی کا قیام اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اگر مسلم لیگ صوبائی وزارتوں میں شامل ہوتی بلکہ صرف یو پی کی وزارت میں شامل کرلیا جاتا تو پیر پور کمیٹی کے قیام کی نوبت ہی نہ آتی۔ ڈاکٹر تارا چند نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ''یو پی میں کانگریس کی وزارت سازی سے مسلم لیگ کو شدید صدمہ پہنچا۔'' مسٹر جناح ۱۹۳۵ء سے مسلم لیگ کو کانگریس کے قریب لانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ کانگریس ان کی کوششوں کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتی۔ اس کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ڈاکٹر تارا چند نے لکھا ہے:''

مسلم لیگ کی گلہ گزاریاں درست تھیں یا غلط یا مبالغہ آمیز، مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کے ذہنوں کو کانگریس کے خلاف زہر آلود کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا اور خاص طور پر ھندوؤں کے خلاف اور اس کے ساتھ ہی علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت ملنے لگی۔''

سندھ میں غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت عظمیٰ سے ہٹایا گیا اور انھیں اس کا شدید دھچکا لگا۔

اگر چہ انھیں نئی کابینہ میں بھی شامل کرلیا گیا اور وہ بخوشی اس میں شریک ہو گئے تھے۔ کیوں کہ ان کا اصل مقصد تو اقتدار سے لطف اندوز ہونا تھا۔ لیکن دل کے زخم مندمل نہ ہو سکے انھوں نے کانگریس مسلم لیگ کے اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کراچی میں مسلم لیگ صوبہ سندھ کی کانفرنس منعقد کرا ڈالی۔ مسٹر جناح کو کرسی صدارت پر بٹھایا اور یہ مطالبہ کرڈالا کہ ''ہندوستان کو مسلمان اور غیر مسلمان وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔'' (ابوالکلام آزاد اور......ص ۱۳۷)

یو پی کے گورنر نے ''حقیقت کیا تھی؟'' کے عنوان سے ایک آرٹیکل لکھا۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل سے نپٹنے کے لیے وزرا نے معمول کی غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا۔ اقتدار کے آخری ایام میں ہندو سبھا نے سنگین الزام لگایا کہ کانگریسی وزارتوں نے ہندوؤں کی ساتھ انصاف نہیں کیا۔

Asiatic Review July 1940, Citedincoupland R.
The Constitutional Problem in
India, part II p.188

گورنری۔ پی اینڈ برابر (۱۹۳۸ء۔۴۰) مسٹر فرانسس دہلی کا کہنا ہے کہ کانگریس کی وزارتوں کے خلاف مسلمانوں کی مخالفت کرنے کا الزام عائد کرنا خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف تھا۔
(Wylic F.Federal Negotiations in Indial 1935-39) and after (philipswainwrightp 523
(. مدراس کے گورنر مسٹر اریسکین (Erskine) نے بھی ایسی ہی رائے ظاہر کی۔ لارڈ لن لتھگو نے مسلم لیگ کے الزامات کی تحقیقات کرانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کسی گورنر کی جانب سے مسلم لیگ کی الزام تراشیوں کے حق میں شکایت موصول نہیں ہوئی۔ چناں چہ وائسرائے نے سیکرٹری آف اسٹیٹ کو جو مراسلہ ۱۲؍دسمبر ۱۹۳۹ء کو روانہ کیا اس میں لکھا ہے کہ

''میرا تاثر یہ ہے کہ کسی خاص صوبہ میں کوئی واقعہ رونما ہوا ہو تو اسے چھوڑ کر یہ مسٹر جناح کے لیے بہت زیادہ مشکل ہوگا کہ وہ کانگریسی حکومتوں کا مسلمانوں کے خلاف رویہ ثابت کر سکیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً مسلمانوں میں احساس کمتری پایا جاتا ہے جب کہ ہندو احساس برتری میں مبتلا ہیں۔ اس سے ایک نفسیاتی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ اس کا مکمل جائزہ لینا چاہیے۔

(ڈاکومنٹ نمبر ۴۳۔ ایس۔ سی۔ بحوالہ تارا چند، صفحہ ۲۸۳ جلد چہارم)

اس نفسیاتی کیفیت اور تاثر کو جنم لینے سے روکنے کی خاطر مولانا آزاد نے کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومتیں قائم کرنا چاہی تھیں۔ بمبئی میں نریمان اور بہار میں ڈاکٹر سید محمود کو چیف منسٹر بنانے کی تجویز بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

۲۳راکتوبر ۱۹۳۹ء: ۲۳راکتوبر ۳۹ء کو دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب کی کوٹھی پر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل ایک تجویز منظور کی:

''ہز ایکسیلنسی وائسرائے کے بیان مورخہ ۱۷راکتوبر ۳۹ء پر احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ اس کی قدر کرتی ہے کہ ملک معظم نے پرزور طریق پر کانگریس کے اس بے بنیاد دعوے کو مسترد کر دیا ہے کہ تنہا کانگریس ہی تمام ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ اور اس کو اطمینان کی ساتھ نوٹ کیا ہے کہ ملک معظم کی حکومت اس واقعے کو تسلیم کرتی ہے کہ تنہا آل انڈیا مسلم لیگ ہی صحیح معنے میں مسلمانان ہند کی نمائندہ ہے اور ان کی طرف سے بول سکتی ہے۔ نیز یہ کہ اقلیتوں کے حقوق وفوایداور دیگر متعلقہ اہم مفادات کو واجبی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔''

مگر یہ کمیٹی اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتی ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے بیان مورخہ ۱۸ررر ۳۹ء میں جو نہایت اہم نکتے پیش کیے تھے۔ ان کا ٹھیک ٹھیک اور صراحت کے ساتھ جواب نہیں دیا گیا۔ اور انہیں پورا نہیں کیا گیا ہے۔ لہذا یہ کمیٹی تجویز پیش کرتی ہے کہ برابری کے درجے پر تعاون حاصل کرنے کے لیے جس کی خواہش ہز ایکسیلنسی نے کی ہے۔ ان معاملات کی مزید وضاحت اور ان کے متعلق مزید تبادلۂ خیالات ضروری ہے۔ جو مشتبہ چھوڑ دیے گئے ہیں اور نا قابل اطمینان طور پر پورے نہیں کیے گئے تا کہ مکمل مفاہمت ہو جائے کہ صرف ایسی مفاہمت ہی کے ذریعے سے مسلم لیگ اس معاملے میں تعاون کر سکے گی۔ جو نہ صرف مسلمانان ہند سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ کل ملک سے تعلق رکھتا ہے۔ تجویز کے آیندہ فقرے میں نہایت ادب کے ساتھ مطالبہ پیش کیا ہے کہ ہندوستان کے آیندہ دستور کے کل مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے۔ اور مسلم لیگ کی پوری پوری رضا مندی کو ضروری سمجھا جائے۔

تجویز کے آخری فقرے میں مشاورتی گروپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے متعلق اظہار رائے سے اس وقت تک اجتناب ظاہر کیا جب تک اس کے متعلق دستور، اختیارات، میدان عمل اور فرائض پورے طور پر معلوم نہ ہوں۔''

بہر حال تجویز میں سب سے زیادہ مسرت اس چیز پر ظاہر کی گئی جو مسلم لیگ کی بہ نسبت خود

برطانیہ کے لیے زیادہ مفید تھی یعنی مسلم لیگ کے لیے واحد نمایندگی کی ضد اور کانگریس کو تمام ہندوستان کی نمایندہ نہ تسلیم کرنا۔

کیوں کہ واحد نمایندگی کے بلند بانگ دعوؤں اور برطانیہ کے اس سارٹیفکٹ کے باوجود آج تک مسلمانوں کو تو کوئی ایک مفاد بھی حاصل نہیں ہوا۔ حتے کہ کانگریسی مظالم کی تحقیق کی طرف بھی کسی قسم کی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ البتہ برٹش کو یہ فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ واحد نمایندہ جماعت کی ناراضی کی سند پیش کرتے ہوئے آج ۴۶ء تک ہندوستان کو سیاسی ترقی سے محروم رکھا گیا۔ اٹلانٹک چارٹر کا بھی اس کو مستحق نہ قرار دیا گیا اور تحفظ مسلم کے بہانے سے تمام دنیا میں اپنی معصومیت اور اسلامی دنیا میں اپنی مسلم نوازی کا پروپیگنڈا دل کھول کر کیا جاتا رہا اور کیا جا رہا ہے۔

(علمائے حق اور......ج ۲، ص ۸۶۔۸۴)

کانگریس کا اقدام اور وزارتوں سے استعفا:

۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۹ء: مسلم لیگ کے کمزور اور خوشامدانہ رویہ کے خلاف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس مورخہ ۲۳ر اکتوبر بمقام واردھا میں مندرجۂ ذیل تجویز پاس کی اور اس کے اگلے روز یعنی ۲۴ر اکتوبر کو کانگریس کی پارلیمنٹری بورڈ نے اعلان کر دیا کہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۹ء تک تمام کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو جائیں۔ البتہ صوبہ سرحد کی وزارت کو اس وقت مستثنیٰ کر دیا گیا۔

(تجویز): ورکنگ کمیٹی کی رائے ہے کہ برطانیہ کے جنگی مقاصد بالخصوص ہندوستان کی پوزیشن کی شرح کرنے کی دعوت کے جواب میں وائسرائے نے جو بیان دیا ہے وہ بالکل ناتسلی بخش ہے۔ اور اس سے ان تمام لوگوں میں بیزاری ہوگئی جو ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ یہ دعوت نہ صرف ہندوستان کے لوگوں کی طرف سے تھی۔ بلکہ دنیا بھر کے ان کروڑہا آدمیوں کی طرف سے تھی جو جنگ وتشدد سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ اور محسوس کرتے ہیں کہ امپیریلزم اور نیسی ازم لوٹ کھسوٹ جاری رکھ کر جنگ کا باعث بنتے ہیں۔ یہ اپیل ان تمام لوگوں کی طرف سے تھی جو دنیا میں امن اور آزادی لانا چاہتے ہیں۔

وائسرائے کے بیان میں صرف پرانی ملوکیت پسندی کا اعادہ کیا گیا ہے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ وائسرائے کے بیان میں مختلف پارٹیوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ برطانیہ کے حقیقی ارادوں کو اس

پردے میں چھپایا جائے۔ کمیٹی نے مطالبہ کیا تھا کہ مخالف پارٹیوں کے طرز عمل سے قطع نظر برطانیہ اپنے جنگی مقاصد اور ہندوستان کے متعلق اپنی نیک نیتی کا ثبوت پیش کرے۔

کانگریس ہمیشہ اقلیتوں کی حفاظت کی علم بردار رہی ہے۔ کانگریس جس آزادی کا دعویٰ کرتی ہے وہ کانگریس یا کسی دوسرے خاص گروپ یا قوم کی آزادی نہیں بلکہ ہندوستان کے ان تمام فرقوں کی آزادی ہوگی جن سے پوری ہندوستانی قوم بنتی ہے۔

اس آزادی کو قائم کرنے اور قوم کی خواہش معلوم کرنے کا واحد طریقہ جمہوری نظام ہے۔ اس طرح سب کو پورے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کمیٹی وائسرائے کے بیان کو نہایت افسوسناک تصور کرتی ہے۔ اور ان معاملات میں برطانیہ کو پوری امداد نہیں دے سکتی۔ کیوں کہ ایسا کرنا امپیریلزم کو مضبوط کرنے کے مترادف ہے۔

حال آں کہ کانگریس ملوکیت پسندانہ پالیسی ہمیشہ ختم کرنے کی حامی رہی ہے اس وقت پہلے قوم کے طور پر ورکنگ کمیٹی تمام وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنے استعفے داخل کردیں۔

کمیٹی تمام ملک سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے اندرونی جھگڑوں کو ختم کردیں اور اس نازک وقت میں ہندوستان کی آزادی کے لیے متحد ہو جائیں۔ (مدینہ، بجنور۔ ۲۸ر اکتوبر ۳۹ء)

۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۹ء: کانگریس کے اس ریزولیشن کے جواب میں جو اس نے ۲۳ر اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں پاس کیا تھا، ۲۴ر اکتوبر کو مسٹر جناح نے اخبار ''مانچسٹر گارڈین'' کو جو بیان اشاعت کے لیے دیا۔ اس کی ذلت اور رسوائی کو اس وقت وہ جذباتی انسان نہیں محسوس کر سکے۔ جو ''مسلم لیگ'' کے لفظ ''مسلم'' پر مفتون اور از خود رفتہ تھے۔ لیکن آج یقیناً وہ اس بیان کو پڑھ کر شرم محسوس کریں گے۔ مسٹر جناح نے ۲۴ر اکتوبر ۳۹ء کو اخبار ''مانچسٹر گارڈین'' میں یہ بیان شائع کرایا:

''میں مانچسٹر گارڈین کی اس نوازش کا مشکور ہوں کہ اس نے مجھے برطانوی رائے عامہ کے اوپر اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع دیا۔ ہر اوسط انگریز کے لیے اس پوزیشن کو اچھی طرح سمجھنا مشکل ہے۔ جو کہ آج ہندوستان میں ہم ہندوستانیوں کے روبرو پیش ہے۔ لیکن میں چند خاص باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان سے ان مشکلات کا ایک تصور بندھ جائے گا جو ہمارے روبرو پیش ہیں۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں نمائندہ طرز حکومت تک سے ہمیشہ خوف اور ڈر رہا ہے۔ اور جمہوری طرز حکومت تو ان کے لیے اور بھی زیادہ خطرناک ہے ۱۹۰۸ء کے منٹو مارلے ریفارم اور

۱۹۱۶ء میں ہندو اور مسلمانوں کے تاریخی معاہدے لکھنو کے بعد سے مسلمانوں کی جانب سے جدا گانہ انتخاب وتیج اور آئینی تحفظات کا مطالبہ برابر جاری رہا ہے۔ جس سے ان کے ان اندیشوں کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جب سے صوبوں میں صوبہ جاتی خود مختاری قائم ہوئی ہے۔ اس بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ کانگریس ہائی کمانڈ جس طریقہ پر اپنی پالیسی اور پروگرام پر عمل کرر ہا ہے اس سے یہ بات صاف ہے کہ کانگریس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ملک کی ہر دوسری انجمن کو ختم کر دیا جائے۔ اور خود کو بدترین قسم کی ناسسٹ اور مطلق العنان آرگنائزیشن کے طور پر قائم کیا جائے۔ ساڑھے تین کروڑ ووٹروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے (جن میں ہماری اکثریت مکمل طور پر جاہل، ان پڑھ، غیر تربیت یافتہ اور ناسمجھ ہے اور جن پر صدیوں سے پرانی اور بدترین قسم کی توہم پرستی غالب ہے جو تمدنی اور سماجی طور پر ایک دوسرے کے خلاف ہیں) آئین پر عمل درآمد سے یہ صاف طور پر ثابت ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں پارلیمنٹری قسم کی حکومت کا چلنا ناممکن ہے۔ اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثریت والے فرقہ کی حکومت اقلیتوں پر ہمیشہ کے لیے قائم ہوگئی ہے۔ جو کہ اپنے اختیارات کو نیز حکومت کی مشنری کو اقلیتوں پر اپنے فرقہ کا غلبہ قائم کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔

اس لیے میرے خیال میں دیگر اسباب کے علاوہ جن کے بارے میں میں کسی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ ہندوستان میں جمہوری حکومت کے معنے ہندوراج کے ہوں گے یہ ایک ایسی پوزیشن ہے جس کو مسلمان ہرگز منظور نہیں کریں گے۔ ان کے علاوہ چھ کروڑ اچھوت اور دیگر اقلیتیں ہیں جیسے عیسائی، یہودی، پارسی وغیرہ۔ اس لیے بڑے غور وخوض کے بعد مسلم لیگ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستان کے آئندہ آئین کے مسئلے پر بالکل نئے سرے سے غور کیا جائے، اور ملک معظم کی حکومت کی جانب سے مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر کوئی اعلان یا وعدہ نہ کیا جائے، جو کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور بااختیار جماعت ہے۔''

(اس شدومد سے جمہوری طرز حکومت کی تردید کے بعد جو لارڈ لن لتھگو جیسے فرعون منش وائسرائے اور چرچل، زٹلینڈ اور ایمری جیسے ابوجہل وابولہب کی مرضی اور منشا کے عین مطابق تھی۔ مسلم نوجوانوں کو خوش کرنے کے لیے مسٹر جناح نے ارشاد فرمایا):

''برطانوی پبلک اس مغالطے میں نہ رہے کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کے خلاف ہیں۔ ہم آزادی چاہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس قسم کی آزادی؟ مسلم ہندوستان مکمل طور پر آزادی

سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور وہ اپنی منشا کے مطابق اپنی سیاسی، اقتصادی، سوشل اور تمدنی آزادی چاہتا ہے۔ وہ کسی کا غلبہ نہیں چاہتا۔ اور وہ ہندو ہندوستان کے لیے بھی ایسا ہی چاہتا ہے

(مدینہ مورخہ ۲۸ر اکتوبر ۳۹ء بہ حوالہ علمائے حق اور......، ج ۲، ص ۹۲۔ ۸۷)

۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۹ء: جنگ کے مسئلے میں ملک کی رائے کو یکسر نظر انداز کر دینے اور کانگریس کے کسی مطالبے پر توجہ نہ دینے اور جنگ کے بعد ملک کی آزادی کے بارے میں کسی صاف اعلان سے مسلسل گریز کے نتیجے میں کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس قسم کے غیر واضح حالات میں ملک کو جنگ میں فریق نہیں بنا سکتی اس لیے اس نے کانگریسی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ ۳۱ر اکتوبر تک استعفے کی تجویز اسمبلی میں منظور کروا کے گورنروں کے پاس بھیج دیں۔ چناں چہ تمام صوبوں کی کانگریسی حکومتوں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ یہاں صوبہ یوپی کی اسمبلی میں منظور کی جانے والی قرارداد نقل کی جاتی ہے۔ صوبہ یوپی میں دلبھ پنتھ وزیر اعظم تھے۔ ۲۷ر اکتوبر کو اسمبلی میں یہ قرارداد پیش ہو کر منظور ہوئی تھی:

''جناب والا...... میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ یہ اسمبلی اس امر پر اظہار افسوس کرتی ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ نے ہندوستان کے لوگوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ہندوستان کو اس جنگ میں شریک کر لیا ہے جو برطانیہ اور جرمنی کے مابین ہو رہی ہے۔ اور ایسی تدبیریں اختیار کی ہیں جن سے صوبجاتی حکومتوں کی کارروائیاں محدود اور ان کے اختیارات کم ہو گئے ہیں۔

یہ اسمبلی گورنمنٹ سے سفارش کرتی ہے کہ وہ حکومت ہند کو اور اس کے توسط سے حکومت برطانیہ کو اس امر سے مطلع کر دے کہ ہندوستان کے لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے یہ امر بے حد ضروری ہے کہ ان مقاصد جنگ کے مطابق جن کا اعلان برطانیہ کی جانب سے بار بار ہوا ہے۔ جمہوریت کے اصول کا اطلاق ہندوستان پر بھی اس طرح کیا جائے۔ جس طرح اور اقوام پر کیا جا رہا ہے۔ نیز ہندوستان کی پالیسی ہندوستان کے باشندے ہی طے کریں۔ نیز ہندوستان ایک آزاد ملک تسلیم کیا جائے، جس کو اس امر کا حق حاصل ہو کہ وہ اپنا نظام حکومت خود وضع کرے۔ اور یہ بھی کہ جہاں تک ہو سکے جلد از جلد ہندوستان کے موجودہ طریق حکومت پر اس اصول کو منطبق کرنے کے لیے مناسب کارروائی کی جائے۔ اس اسمبلی کو افسوس ہے کہ ملک معظم کی حکومت نے اس بیان کو صادر کراتے وقت جو اس کی جانب سے ہندوستان کے بارے میں کیا گیا ہے ہندوستان کی حالت کو ٹھیک طرح نہیں سمجھا۔ ہندوستان کے مطالبے کو پورا کرنے میں گورنمنٹ

برطانیہ نے جو کوتاہی کی ہے اس کی وجہ سے اس اسمبلی کی رائے ہے کہ یہ گورنمنٹ برطانوی پالیسی سے اپنے کو وابستہ نہیں کر سکتی۔'' (مدینہ۔۹ر نومبر ۳۹ء)

اس موقعہ پر اگر برطانوی سامراج انصاف اور ہوشمندی سے کام لیتا اور وہ پیشکش جو دو سال بعد ۴۲ء میں کرپس کے ذریعہ پیش کی اس وقت پیش کر دیتا تو کانگریس یقیناً منظور کر لیتی۔ اس وقت تک حالات اتنے نازک نہ ہوئے تھے۔ اور نہ مطالبات نے شدت اختیار کی تھی۔

چناں چہ سر اسٹیفورڈ کرپس نے کانگریس کے بیان کو معقول قرار دیا۔ مگر پارلیمنٹ کی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ چناں چہ وزارتوں کے استعفے سے متعلق کانگریس کی تجویز جو ۲۳ر اکتوبر کو پاس ہوئی تھی اس کے جواب میں ۲۶ر اکتوبر ۳۹ء کو'' سر سموئل ہور نے'' پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

'' جہاں تک مرکز میں براہ راست اور فوری ذمہ داری کا تعلق ہے۔ سو جب تک ہندوستان کے طبقوں اور قوموں کے درمیان اختلافات باقی ہیں۔ اس وقت تک کسی تاریخ مقررہ کو مرکز میں فوری اور مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا مطالبہ منظور کرنا ناممکن ہے۔''

آپ نے کانگریس کا ارادہ عدم تعاون کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

'' اگر ایسا ہوا تو ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ ملک معظم کی حکومت ضروری چلائی جائے گی۔ اور اسے قابلیت، طاقت اور انصاف سے چلایا جائے گا۔ اور وائسرائے کو پوری پوری امداد دی جائے گی۔'' (مدینہ۔ یکم نومبر ۳۹ء)

۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۹ء: اگر چہ کانگریسی حکومتیں ۲۳ر اکتوبر تک مستعفی ہو چکی تھیں لیکن اس زمانے کی لیگ کے شیر بنگال اے۔ کے فضل حق صاحب وزیر اعظم صوبہ بنگال نے ۲۷ر اکتوبر کو اجمیر سے ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا:

'' کانگریسی راج میں مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے اور ان کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کیا جا رہا تھا۔ میں اس قسم کی درجنوں مثالیں دے سکتا ہوں۔ پنڈت جی (پنڈت جواہر لال نہرو) کوئی وقت مقرر کر کے میرے ساتھ چلیں۔ اور میں ان کو ایسے ایسے واقعات دکھاؤں گا کہ ان کا دل بھی کانپ اٹھے گا۔ اگر الزامات غلط ہوئے تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ ورنہ کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو جائیں۔'' (مدینہ۔ ۵ر نومبر ۱۹۳۹ء)

پنڈت نہرو نے یہ چیلنج منظور کر لیا۔ اور وقت مقرر کرنے کے لیے خط و کتابت شروع کر

دی۔ ابھی یہ خط و کتابت جاری تھی کہ شیر بنگال نے ۱۷ر دسمبر ۳۹ء کو کلکتہ سے ایک بیان جاری کیا جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ

''کانگریسی مظالم کے سلسلے میں میں نے جو مواد فراہم کیا ہے وہ میں جواہر لال کے سامنے نہیں بلکہ رائل کمیشن کے سامنے پیش کروں گا جس کا مسٹر جناح نے اپنے بیان میں اظہار کیا ہے۔'' (مدینہ ۲۱ر دسمبر ۳۹ء)

چناں چہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اعلان کر دیا:

''اخبارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر فضل الحق نے مجھے یہ چیلنج دیا تھا وہ اب ختم ہو گیا۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اب بھی حاضر ہوں اور مسٹر فضل الحق کے ساتھ ان کی تجویز کے مطابق کسی بھی جگہ تحقیقات کے لیے جانے کو تیار ہوں۔'' (مدینہ۔ ۲۵ر دسمبر ۳۹ء)

مولانا سید محمد میاں نے پنڈت نہرو اور فضل الحق کے آخری خطوط نقل کر دیے ہیں، تاکہ دونوں صاحبوں کے رویوں کا اندازہ کیا جا سکے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا خط:

از آنند بھون۔ آلہ آباد

یکم دسمبر ۳۹ء

ڈیر مسٹر فضل الحق! کانگریس کے مظالم کے متعلق آپ نے تحقیقات کے لیے جو تجویز کی تھی۔ اس کے متعلق آپ کے مزید خط کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں مجھے امید ہے کہ جلد از جلد اس معاملے کا حل کیا جائے گا۔ اپنے سابقہ خط میں میں نے درخواست کی تھی کہ کانگریسی وزارتوں کے خلاف الزامات کی تفاصیل جو آپ کے پاس موجود ہیں مجھے بھیج دیں۔ اپنے پہلے بیان میں آپ نے کہا تھا کہ میرے پاس اس بات کے لیے قطعی ثبوت موجود ہیں کہ بے پناہ مظالم توڑے گئے ہیں۔ میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے یہ ثبوت مہیا کریں گے۔

آپ کا صادق جواہر لال

مولوی فضل الحق کا جواب

پارک سرکس کلکتہ

۳ر دسمبر (۱۹۳۹ء)

ڈیر مسٹر جواہر لال نہرو!

آپ کے یکم دسمبر کے خط کے لیے شکریہ۔ میں ان مختلف سوالات کے متعلق جن پر ہماری تحقیقات کا دارومدار ہوگا واقعات اکٹھے کر رہا ہوں۔ جوں ہی یہ رپورٹیں تیار ہوگئیں۔ میں آپ کو ان کی نقول بھیج دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ کرسمس سے پہلے کاغذات مہیا کرسکوں گا۔ میں اس معاملے کے متعلق بہت فکرمند ہوں اور میرا یقین ہے کہ مستقبل قریب میں چند قطعی ثبوت آپ کے ہاتھوں میں پہنچا سکوں گا۔

آپ کا صادق

اے۔ کے فضل الحق

پنڈت نہرو کا تار:

۱۲ردسمبر

آنریبل مسٹر فضل الحق وزیر اعظم۔ کلکتہ

سر عبداللہ ہارون نے نہایت ہی عجیب و غریب بیان دیا ہے۔ کہ میں آپ کی تجویز کردہ تحقیقات سے ہٹ گیا ہوں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری خط و کتابت شائع کرائی جائے۔ براہ کرم اپنی رضامندی سے بذریعۂ تار مطلع کیجیے۔

جواہرلال نہرو۔

کارمیکل روڈ بمبئی

مولوی فضل الحق صاحب کا تار:

مجھے خط و کتابت شائع کرنے پر کوئی اعتراض نہیں!

فضل الحق پنڈت نہرو کا خط:

بمبئی ۱۶ردسمبر

ڈیر مسٹر فضل الحق! آپ کے ۱۵ردسمبر کے تار کا شکریہ! جس میں لکھا ہے کہ آپ کو ہماری خط و کتابت کے شائع ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کی رضامندی سے میں یہ خط و کتابت ایک مختصر سے نوٹ کے ساتھ اخبارات میں بھیج رہا ہوں۔ آپ نے اپنے ۶ردسمبر کے خط میں لکھا تھا کہ میں بہت شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں پر کانگریس کی مبینہ زیادتیوں کا سوال ہمیشہ

کے لیے حل کر دینا چاہیے۔

اس لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے تحقیقات میں شامل ہونے کی میری دعوت منظور کر لی ہے اگر یہ مشترکہ جدوجہد دیانتداری اور نیک اسپرٹ سے کی جائے تو اس سے خوش گوار نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اب اخبارات میں آپ کے شائع شدہ ایک بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک میرے نام آپ کے چیلنج کا تعلق ہے۔ آپ مزید کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے۔ اور اب آپ مسٹر جناح کے تجویز کردہ رائل کمیشن کے سامنے اس شہادت کو پیش کریں گے جو آپ کے پاس موجود ہے۔ یا جو آپ اکٹھی کریں گے۔ میں نہیں جانتا ہوں کہ کیا یہ رائل کمیشن مقرر بھی کیا جائے گا یا نہیں اور اگر مقرر کیا جائے گا۔ تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ لیکن کچھ بھی ہو یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ آنے والے بہت سے عرصہ تک اس بارے میں کچھ بھی نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک آپ کی سابقہ پیشکش کا تعلق ہے معاملہ یہاں پر ہی ختم ہو گیا ہے۔ مجھے اس پر بہت افسوس ہے کیوں کہ آپ کی پیشکش کو منظور کرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اور آپ کی طرح مجھے بھی یہ امید تھی کہ مبینہ زیادتیوں کا سوال ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی سابقہ تجویز کے مطابق اب بھی میں آپ کے ساتھ تحقیقات میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں۔

آپ کا صادق

جواہر لال

(مدینہ۔ ۲۷؍دسمبر ۳۹ء)

مسٹر فضل حق جب پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے مظالم کی رپورٹ نہ پیش کر سکے۔ اور نہ اپنے چیلنج کے بموجب پنڈت نہرو کو ساتھ لے جا کر کوئی واقعہ دکھلا سکے تو شرم وحیا کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ خاموش ہو جاتے۔ مگر شیر بنگال کے نزدیک شرم وحیا عقل وانصاف بزدلی کی باتیں تھیں۔ آپ نے پوری دیدہ دلیری کے ساتھ مفروضہ اور مبالغہ آمیز واقعات کی داستان شائع کر دی۔ اس کو شائع کرتے ہوئے مدینہ نے جو نوٹ لکھا تھا وہ قابل توجہ ہے:

''ہم ان تمام واقعات کو صحیح مان کر ان لیڈروں سے جو مسلم لیگ کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں، یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان ہولناکیوں کو دیکھنے اور سننے کے بعد انھوں نے کیا کیا۔ آنریبل وزیر اعظم نے جو مظالم کی تفصیل بیان کی وہ اتنی زہرہ شگاف ہے کہ اس کے بعد اسلام اور اسلام

کے فرزندان کی حفاظت کے مدعیوں پر خواب و خور حرام ہو جانا چاہیے تھا۔ اوران کے عمل کی تمام طاقتوں کو ایک زبردست بے تابی و بے قراری کے ساتھ بیدار ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن کیا ایسا ہوا؟ یہ لوگ ڈھائی سال تک خاموش بیٹھے، ان ہولناک حالات کو دیکھتے رہے۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ حکومت کی اصل ذمہ داری خصوصیت کے ساتھ ان کو سونپی گئی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو برطانیہ کے آستانہ پر سجدہ ریز ہونے کی ترغیب دی اگر اس قسم کے مظالم کے بعد بھی ہمارے لیڈروں کی رگ عمل نہیں بھڑک سکتی۔ اور اگر ان مناظر کو دیکھنے کے بعد بھی ان کو میدان عمل میں نہیں دیکھا جا سکتا تو پھر آخر وہ کون سا وقت آئے گا۔ جب یہ سراپا ناز و سراپا نزاکت لیڈر اپنی عشرت گاہوں سے باہر آئیں گے۔ افسوس ہے اس بدنصیب قوم پر جس کو ایسے لیڈر ملیں اور حیرت ہے ان سادہ لوح افراد پر جوان لیڈروں کے پیچھے بھیڑ اور بکریوں کے گلے کی طرح دوڑے چلے جائیں۔

اگر آنریبل مسٹر فضل الحق اوران کے ساتھیوں کو اس امر کا یقین ہے کہ مظالم کی یہ تفصیلات صحیح ہیں تو پھر حیرت ہے ان کی اوران کے رفیقوں کی اس غیرت وحمیت پر جوان مظالم کو صرف ایک ناول نویس کی طرح کاغذ پر لکھ دینے کو کافی سمجھتی ہے اور جو ڈھائی سال تک دم بخود بیٹھی یہ انتظار کرتی رہتی ہے کہ کانگریس وزارتیں اپنی خوشی سے استعفےٰ دیں تو وہ یوم نجات منا کر تبرا بازی کر لیں۔

نامہ انگشت بد نداں ہے اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

(مدینہ، بجنور، ۹ر جنوری ۱۹۴۰ء بحوالہ علمائے حق اور...... جلد ۲، ص ۱۹۔۱۱۴)

۵ر نومبر ۱۹۳۹ء: پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''گذشتہ سال دو سال کے عرصہ میں مجھے کسی اور بات سے زیادہ حیرانی اور دکھ نہیں ہوا جتنا اس بات سے کہ مسلم لیگ کی طرف سے کانگریسی وزارتوں پر حیران کن الزامات لگائے جا رہے ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہے ہیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کانگریسی گورمنٹوں سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوئی ہیں لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ جہاں تک اقلیتوں کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے۔ کانگریسی وزارتوں نے ہر ممکن احتیاط کی ہے کہ ان کی کسی کارروائی سے اقلیتوں کے حقوق اور مراعات میں دست اندازی نہ

ہونے پائے۔ ہم نے کئی بار کہا ہے کہ ان الزامات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے۔ لیکن الزامات لگانے والوں نے آج تک ہماری پیشکش کو شرف قبولیت نہیں بخشا۔ اور بے بنیاد الزامات درالزامات کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ (مدینہ۔ ۵/نومبر ۱۹۳۹ء)

سردار پٹیل صدر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ نے مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھا:

''میری ہدایت پر ہر وزیر اعظم نے اپنے صوبے کے گورنر سے یہ درخواست کی کہ جب کبھی گورنر یہ سمجھیں کہ وزارت صحیح راستہ پر نہیں وہ بلا پس و پیش ایسے معاملات میں جن کا اثر اقلیتوں کے مفاد یا حقوق پر برا پڑنے کا امکان ہو مداخلت کریں۔ حال ہی میں جب مسٹر جناح نے الزامات لگائے تھے، میں نے ہر وزیر اعظم کو دوبارہ ہدایت کی کہ وہ ہر گورنر کی توجہ الزامات کی طرف بھی مبذول کرائیں کیوں کہ اس کا ان سے بھی تعلق ہے۔ لیکن مجھے یہ اطلاع ملی کہ گورنر ان الزامات کو بے بنیاد قرار دے رہے ہیں۔ (مدینہ۔ ۲۱/دسمبر ۳۹ء)

نومبر ۱۹۳۹ء: حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے رسالے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' پر شمس العلماء مولانا پروفیسر عبدالرحمن نے ''متحدہ قومیت اور اسلام...... اور معاہدۂ یہود علمی نقطہ نظر سے'' کے عنوان سے ایک تنقید لکھی تھی اور ماہنامہ برہان دہلی کے شمارہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے ایک مضمون ''متحدہ قومیت اور اسلام...... تصویر کا دوسرا رخ'' تحریر فرمایا تھا۔ یہ مضمون بھی برہان میں نومبر ۱۹۳۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ حضرت مدنی کے رسالے کے دفاع اور حضرت شمس العلماء کے مقالے کے رد میں ایک لاجواب مضمون تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر بستان ادب۔ دیو بند (یو۔ پی) کے ناظم نے ''دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے چھپوا کر مئی ۱۹۴۶ء میں پہلی بار کتابچے کی شکل میں شائع کر دیا۔ کتابچے میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین، دہلی نے اس رسالے کی تحریر کے پس منظر اور اہمیت کی وضاحت میں ''پیش لفظ'' تحریر فرمایا ہے۔ رسالے کے طابع و ناشر ''مولانا محمد وحید الدین قاسمی، دفتر جمعیۃ العلماء ہند۔ گلی قاسم جان، دہلی'' ہیں۔

۶/دسمبر ۱۹۳۹ء: ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح میں بات ہو رہی تھی۔ اور کوشش کی جا رہی تھی کہ جنگ کے معاملے میں کانگریس اور مسلم لیگ ہم خیال ہو کر ایک موقف اختیار کر لیں۔

چناں چہ یکم دسمبر کو پنڈت نہرو نے مسٹر جناح کو الہ آباد سے خط لکھا کہ جب دہلی میں ہماری

ملاقات ہوئی تھی تو یہ فیصلہ ہوا تھا کہ فرقہ دارانہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کرنے کے لیے ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ میں آپ کے خط کا منتظر ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ جوں ہی آپ کوئی تاریخ مقرر کر سکیں گے تو مجھے مطلع کر دیں گے۔ مگر پنڈت نہرو اور عام اہل ملک کی توقعات کے برخلاف مسٹر ایم۔ اے جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے ۶ / دسمبر کو بمبئی سے مندرجہ ذیل بیان شائع کیا۔

میری خواہش ہے کہ ۲۲ / دسمبر کو جمعہ کے دن مسلمانان ہند یوم نجات منائیں اور بطور اطمینان خدا کا شکریہ ادا کریں کہ بالآخر کانگریسی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمام ہندوستان کی صوبجاتی۔ ضلع اور ابتدائی مسلم لیگیں اس دن عام جلسے کر کے مندرجہ ذیل ریزولیشن پاس کریں گی۔ اس عام جلسہ کی رائے ہے کہ کانگریسی حکومتوں نے اپنی فیصلہ کن غیر مسلم پالیسی سے کانگریس کے اس دعوے کو بالکل غلط ثابت کر دیا کہ وہ منصفانہ طریقہ پر ایمانداری کے ساتھ تمام مفادوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس جلسہ کی قطعی رائے ہے کہ کانگریسی وزارت مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنے میں ناکامیاب رہی ہیں۔ لہذا یہ جلسہ مختلف صوبوں میں کانگریس کے راج کے خاتمہ پر گہرے اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ اور آج کے دن کو یوم نجات منانے میں بڑی مسرت محسوس کرتا ہے۔ کیوں کہ ڈھائی سال تک جو ظلم و زیادتی اور ناانصافی ہوتی رہی ہے اس سے نجات مل گئی۔

یہ جلسہ ہز ایکسیلنسی گورنر (صوبہ) اور ان کے مشیروں کی کونسل سے درخواست کرتا ہے کہ مسلمانوں کی جائز شکایتوں اور ان کے ساتھ سابق کانگریسی حکومتوں نے جو ناانصافیاں کی ہیں ان کی تحقیقات کی جائے۔ اور گورنروں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ نمبر ۹۳ کے ماتحت مختلف صوبجاتی حکومتیں اپنے ہاتھ میں لیتے وقت جو اعلان کیے تھے ان کی رو سے مسلمانوں کی ان جائز شکایتوں کو جلد سے جلد دور کر کے عوام کو یقین دلایا جائے کہ نئی حکومت تمام اقلیتوں اور متعلقہ مفادوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتی ہے۔" (مدینہ۔ ۱۳ / دسمبر ۳۹ء)

۱۳ / دسمبر ۱۹۳۹ء: مسٹر جناح صاحب نے کانگریسی رہنماؤں بیانات کے جواب میں خصوصاً صدر کانگریس کے خط کے حوالے سے اپنے بیان مورخہ ۱۳ / دسمبر ۱۹۳۹ء میں فرمایا:

"بابو راجندر پرشاد (صدر انڈین نیشنل کانگریس) نے ۱۵ / اکتوبر کو خط لکھا کہ کانگریس سر ماریس گائر (چیف جسٹس فیڈرل کورٹ آف انڈیا) یا کسی دوسرے موزوں اور مناسب شخص سے

یہ درخواست کرنے کے لیے تیار ہے کہ وہ کانگریسی وزارتوں کے خلاف لگائے ہوئے الزامات میں سے خاص خاص الزام کی تحقیق عمل میں لائیں۔ لیکن میں نے (مسٹر جناح نے) حسب ذیل وجوہ سے اس تجویز کو غیر معقول اور ناقابل عمل قرار دیا۔

(۱) قانون اور آئین کی رو سے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو کانسٹی ٹیوشن میں کوئی حق اور اختیار حاصل نہیں ہے۔

(۲) مسلمان اور دوسری اقلیتوں کی شکایات بعض صوبجات کی گورنمنٹ کے خلاف تھیں کہ جو اپنے افعال کی جوابدہ قانون ساز جماعتوں اور منتخب کنندگان کے سامنے تھیں نہ کہ ورکنگ کمیٹی کے روبرو۔

(۳) ورکنگ کمیٹی کا مجوزہ ریزولیوشن اس خیالی ٹریبونل کو گواہان کے طلب کرنے اور ان سے سچ بولنے کا حلف اٹھوانے کا اختیار نہیں دے سکتا تھا۔ نہ ٹریبونل ضروری کاغذات ثبوت کے پیش کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

(۴) یہ ٹریبونل اپنی رپورٹ کس کے روبرو پیش کرے گا۔ اور اگر ضرورت پڑی تو ریزولیوشن کے خلاف کارروائی کرنے کا کون مجاز ہوگا۔

اگر خود ورکنگ کمیٹی یہ آخری عدالت مجاز ہوگی تو میں اس رائے کا اظہار پہلے ہی کر چکا ہوں کہ ناانصافیوں اور زیادتیوں کی پہلی ذمہ داری خود اسی ورکنگ کمیٹی پر عائد ہوتی ہے۔ اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ کوئی موثر کارروائی وزارتوں کے خلاف کیوں کر کر سکے گی۔ جب کہ ورکنگ کمیٹی اس کا فیصلہ کر چکی ہے کہ تمام شکایتیں بے بنیاد ہیں۔ چناں چہ میں نے بابو راجندر پرشاد کو اطلاع دے دی کہ میں یہ کل مسئلہ گورنر جنرل کے روبرو اس درخواست کے ساتھ پیش کر چکا ہوں کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی محافظت اور ان کے ساتھ انصاف کرانے کے مسئلے میں بلا تاخیر اقدام کریں۔ (مدینہ۔ ۲۱ ردسمبر ۳۹ء)

بے شک برطانوی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کے بموجب وزارتوں پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کو قانونی اختیار حاصل نہ تھا۔ مگر خود کانگریس کے دستور و آئین کے بموجب یہ وزارتیں نہ صرف ورکنگ کمیٹی بلکہ اس کے بنائے ہوئے پارلیمنٹری بورڈ کے سامنے جواب دہ اور اس کے احکام کی پابند تھیں۔ چناں چہ مسٹر جناح خود دیکھ چکے تھے کہ مجلس عاملہ کی ایک تجویز پر بلا تردد تامل۔ صرف ایک ہفتہ کے اندر تمام منسٹروں نے وزارت کے قلم دانوں کو توڑ دیا۔ کرسیوں پر لات

ماردی۔ اور گورنمنٹ ہاؤس اور کونسل ہاؤس کے عالیشان اور پر تکلف محلات کو چھوڑ کر جیل خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں پہنچ گئے۔ علاوہ ازیں یہ ممکن تھا کہ مسٹر جناح کانگریس ہائی کمانڈ کے سامنے ان دشواریوں کو پیش کر کے متفقہ طور پر حل تجویز کر لیتے۔ اگر بالفرض کانگریس ہائی کمانڈ حل پیش کرنے سے قاصر رہتا تب وائسرائے ہند کی طرف رجوع کرتے اور رائل کمیشن کا مطالبہ کرتے مگر مسٹر جناح نے ان تمام صورتوں پر نخوت و غرور کی ٹھوکر مار کر وائسرائے ہند کے آستانے پر سر نیاز خم کر دیا۔

اور جب کہ وائسرائے ہند اپنے بیان مورخہ ۱۸/ اکتوبر ۳۹ء میں کانگریسی وزارتوں کے کام پر اظہار اطمینان کر چکے ہیں تو پھر وائسرائے کے آستانہ پر سجدہ ریزی کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد مسٹر جناح اسی بیان میں ارشاد فرماتے ہیں:

''میں درخواست کرتا ہوں کہ حکومت برطانیہ ایک رائل کمیشن مقرر کرے جس کے صدر پریوی کونسل کے لارڈ ہوں۔ اور ممبران میں ہز میجسٹی کی ہائی کورٹ کے جج ہوں۔''

(مدینہ۔ ۲۱/ دسمبر ۳۹)

جب کہ ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کا چیف جسٹس مسٹر جناح کی نظر میں یہ صلاحیت نہیں رکھتا تھا کہ ایسے معاملہ کا فیصلہ کر دے تو رائل کمیشن پر فیصلہ کرنے کے یہ معنے تھے کہ اس کو مہینوں بلکہ کئی سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے اور ہندو مسلم منافرت کو ہوا دی جاتی رہے، تا کہ انگریز کے مقابلے پر کوئی متحدہ محاذ نہ قائم ہو سکے لیکن برطانوی مشنری نے مسٹر جناح کی ان تمام موشگافیوں اور نکتہ چینیوں سے کیا اثر لیا۔ اس کے متعلق اینول رجسٹر نمبر ۴۰۔ ۱۹۳۹ء کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

''مسٹر جینا نے تحریک کی کہ ان مظالم کی تحقیقات کے واسطے رائل کمیشن مقرر کیا جائے۔ اس پر کانگریس ہائی کمانڈ نے خودداری، وطن دوستی اور غیرت سے کام لے کر تجویز کیا کہ فیڈرل کورٹ کے ججوں پر مشتمل کمیشن تحقیقات کرے۔ مگر مسٹر جینا نے اس تجویز کو نہ مانا اور وائسرائے سے درخواست کی کہ ایک رائل کمیشن مقرر کرائے۔ لیکن لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے اس مطالبے کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ جس کے بعد مسٹر جینا نے سکوت اختیار کیا''۔ (ص ۴۴ تا ۵۰)

(علمائے حق اور...... ج ۲، ص ۱۳۔ ۱۱۰)

یوم نجات...... مینی فسٹو کی تیاری:

ستمبر ۱۹۳۹ء: ستمبر ۳۹ء میں جنگ چھڑ گئی اور کانگریس اور وائسرائے میں کچھ ناکام گفتگوؤں کے بعد کانگریس نے اپنی صوبائی حکومتوں کو مستعفی ہوجانے کی ہدایات جاری کردیں۔ نومبر کے آخر تک استعفیٰ ہوگیا۔ کسی نے کہا ہے کہ موقع بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا مقصد، جناح صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی اپنی اہلیت کا مظاہرہ کیا۔ کانگریس کے فیصلہ کو لیگ کے فائدہ کے لیے استعمال کرنے کے واسطے انھوں نے لیگ کو ہدایات جاری کردی کہ تمام ہندوستان میں اسے ''یوم نجات وشکرانہ'' کے طور پر منایا جائے اور مجھ سے اس کے لیے مینی فیسٹو تیار کرنے کے واسطے کہا، لیکن اب انھیں میرے رویہ کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے مجھے یہ بتانے کی ضرورت بھی سمجھی کہ اس میں کیا کیا ہونا چاہیے! یہ ایسا کام تھا جس نے مجھے خلجان میں مبتلا کردیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ تو بات بالکل حدوں سے نکلی جارہی ہے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ لیگ کی ایک کمیٹی نے کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے نام نہاد مظالم کے بارے میں ایک پیر پور رپورٹ تیار کرائی ہے جس میں شروع سے آخر تک ہندو مسلم فسادات بھرے ہوئے تھے، صوبائی کانگریس حتیٰ کہ افسران ضلع تک اس میں ملوث تھے، یہ صحیح ہے، لیکن یہ بات کہ کانگریسی حکومتیں بھی ان فسادات میں شریک تھیں محض افترا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان حکومتوں نے اپنے ووٹروں کے خلاف سخت ایکشن البتہ نہیں لیا اور جس حد تک ان کے بس میں تھا، امن وامان کی بحالی کے لیے، انھوں نے وہ بھی نہیں کیا۔

لیکن اس زمانے تک میں کانگریس کو کافی قریب سے دیکھ چکا تھا۔ یہ ایک مشترک سیاسی عقیدہ والے افراد پر مشتمل ایک سیاسی پارٹی کے بجائے آزادی خواہ تحریک تھی جس میں وہ سب جو برطانوی حکومت سے مختلف وجوہات کی بنا پر آزادی چاہتے تھے، ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے تھے، اور چوں کہ ہندوستان ابھی تک عہد وسطیٰ کا ملک تھا اس لیے قدرتاً کانگریس کے زیادہ تر لوگوں میں ازمنہ وسطیٰ کی ذہنیت کارفرما تھی۔ ذات پات اور صوبائیت کا اچھا خاصا دور دورہ تھا اور مسلمان ان کے مجموعۂ فکر یا منصوبۂ اشیا میں بس یونہی سے نظر آتے تھے، بڑی اکثریت خصوصاً نچلی سطح پر بلاشبہ ''ہندو نشاۃ ثانیہ'' کے خواب دیکھتی تھی لیکن واقعہ یوں ہے کہ یہ لوگ ''پرو ہندو'' زیادہ تھے بہ نسبت اینٹی مسلمان کے مسلمان تو خواہ مخواہ ہی چکر میں آجاتے تھے۔ معاملہ یوں نہیں ہے کہ

کانگریس نے مسلمانوں کے خلاف کچھ کیا ہو، واقعہ یوں تھا کہ اسے مسلمانوں کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا اور وہ اس نے نہیں کیا تھا۔ کانگریس کا اوپر کا حلقہ جنھیں میں بیشتر ذاتی طور پر جانتا تھا، گاندھی جی، جواہر لال جی، مسز نائیڈو اور دوسرے کسی اینٹی مسلم اقدام کے اہل ہی نہ تھے۔

کانگریس نے جب استعفا دیا تو کروڑوں لوگ جو کانگریس کے فدائی تھے اور اس کی حکومت بننے پر مفتخر تھے۔ حیران و مضطرب رہ گئے اور جب مسلم لیگ نے اس اقدام پر خوشیاں منائیں اور اس نے چراغاں کیے تو اس نے جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔

یہ سب خیالات تھے جن کے تحت، جناح صاحب کے کہنے کے مطابق مینی فیسٹو تیار کرنے سے صریح انکار کا ارادہ، میرا سب سے پہلا ردعمل تھا۔ لیکن میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مجروح اکثریت کہیں ایسے نقطے پر نہ کھینچ لائی جائے جہاں ضبط تحمل کی طنابیں ٹوٹ جائیں، اس لیے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آخر والی خطرناک صورت حال میرے ہاتھوں کم خطرناک ہی بنادی جاسکے۔ یہ میں جانتا تھا کہ جناح صاحب جو مظاہرے کرانا چاہتے ہیں ان کی لے کو دھیما کرنے والا ان کے حواریوں میں کوئی ہیں، اور اسے دھیما کرنا کس قدر ضروری تھا، ورنہ جیسا کہ پہلے کئی بار ہو چکا تھا اکثریت اس کا انتقام ضرور لیتی۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ خود اقلیتی فرقہ ظاہرا فتحمندی کے نشے میں سرشار نہ معلوم کیا کچھ کر گزرے؟ ہندو مسلمان فسادات میں مسلمان ہمیشہ دفاعی پہلو پر رہے ہوں، یا بے بس لاچار شکار بنتے رہے ہوں، بات ایسی بھی نہیں تھی۔

اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ مینی فیسٹو میں ہی لکھوں گا، اور میرے ذہن میں جو مقصد تھا وہ اس سے پورا ہوتا ہوا دکھائی دیا تو اسے جناح صاحب کے پاس لے جاؤں گا ورنہ ان سے معذرت چاہوں گا کہ یہ کام کسی اور سے کرالیں۔ پھر فرینک (موریس) کے ساتھ لفظ لفظ پر بحث ہوتی رہی کہ یہ رکھا جائے یا یہ فرینک کو یوم نجات میں جو خوفناک مضمرات تھے ان کا اندازہ تھا اور وہ بھی انھیں کم سے کم نقصان رساں بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا خاص لحاظ رکھا کہ بیچ بیچ میں ایسے جملے بڑھاتا جاؤں جیسے:

''ہڑتال جلوس یا اس قسم کے مظاہروں کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ صرف خاکسارانہ انداز پر اپنا ردعمل ظاہر کردینا کافی ہے'' اور ''خصوصی طور پر میری اپیل یہ ہے کہ دعا کی جائے کہ ایسی اچھی ۔۔۔ وزارتیں بنیں جو تمام فرقوں اور تمام مفادات کے ساتھ انصاف کرسکیں۔''

ہمیں شک تھا کہ جناح صاحب اپنے جارحانہ انداز میں، جیسے کہ اس وقت وہ تھے، ہمارے

پیش کردہ مسودہ کو مان لیں گے، لیکن اگر انھوں نے مان لیا تو ہماری ترکیب کامیاب ہو جائے گی، کوشش کرنے میں کیا جاتا تھا! فرینک نے ضد کی کہ جاؤ اور دکھاؤ۔ میں مسودہ لے گیا تو جناح صاحب مشغول تھے، بولے، رکھ جاؤ! میں چھوڑ کے چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے اسے اخباروں میں دیکھا۔

چلتے چلتے یہ بات بھی عرض کردوں کہ ''یوم نجات'' بغیر کسی جھگڑے کے گزر گیا۔ کسی نے کسی کے ایک ہاتھ تک رسید نہیں کیا، ایک کنکری تک نہیں پھینکی۔ یہ تو بہت بڑا بول ہے کہ یہ سب کچھ مینی فیسٹو کے الفاظ کا نتیجہ تھا، لیکن میں پسند کروں گا کہ کم سے کم اتنا ہی کہوں ہی، کہ صورت حال کو اس طور پر پیدا کرنے میں اس نے مدد ضرور کی۔ اگلی بار جب جناح صاحب نے ''یوم'' منوایا تو وہ ایسے خوش نصیب نہیں رہے تھے، ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے ''راست اقدام کا یوم'' منایا، اور نتیجہ میں کلکتہ کا خوفناک فساد برپا ہوا۔ خیر۔

(محمد علی جناح۔ مرزا راشد علی بیگ/مترجم: عابد رضا بیدار، ناشر: خدا بخش لائبریری جرنل: ۱۰۳، صفحہ ۴۲۔۳۴۰)

یوم نجات پر مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان:

مسلمانوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ:

گذشتہ دو سال میں میں نے بار بار کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات دور ہو جائیں۔ اس کوشش میں میں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ میرا پورا یقین ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے تمام کوششیں ثابت قدمی اور پوری دیانتداری اور نیک نیتی سے کرنی چاہئیں۔ مگر مجھے یہ کہنے میں دکھ ہوتا ہے کہ جب بھی کانگریس نے گفت وشنید کے دروازے کو کھولا اچانک ہی مخالف سمت سے ایک ایسا ہاتھ نمودار ہوگیا جس نے اسے نہایت اہم مرحلہ پر بند کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہاتھ مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ مسٹر محمد علی جناح کے سوا اور کوئی نہیں۔ ان کے بیان میں ایک ایسی تجویز ہے جو کوئی خوددار مسلمان جسے ذرا بھی اپنی سیاسی ہستی کا احساس ہے اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔

آٹھ صوبوں میں کانگریس وزارتیں پوری ذمہ داری اور اسمبلیوں کے مکمل اعتماد سے کام کر

رہی تھیں وائسرائے اور گورنروں حتیٰ کہ مسلم لیگ کے ممبروں کو بھی ان کے مستعفیٰ ہونے پر افسوس ہوا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے بلا ہچکچاہٹ استعفے دے دیے اور اب جب کہ کانگریس نے اپنی آزادانہ مرضی سے آٹھ صوبوں میں وزارتیں ترک کردی ہیں مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ نے مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مسجدوں میں جائیں اور خدا کا شکر کریں کہ اس نے مسلمانوں کو ان کانگریس وزارتوں سے نجات دلا دی ہے۔ جنھوں نے حکومت کے مقابلے میں اپنے فرائض کو ترجیح دی اور نہ صرف آزادی وطن کے سوال پر مستعفیٰ ہوئی ہیں، بلکہ مشرق کی تمام پسماندہ اور روندی ہوئی اقوام کے لیے بھی! میرے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ ایسے نازک مرحلے پر مسلمانوں کی کوئی بھی پارٹی جو کانگریس کے کسی قدر ہی خلاف کیوں نہ ہو، اس رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کرنا گوارا کرے گی؟ مسلمان اپنے حقوق اور مفاد کی حفاظت کے لیے جو بھی جدو جہد کرنا مناسب سمجھیں۔ اس کے لیے انھیں حق حاصل ہے مگر یہ ایک اندرونی جھگڑا ہے۔ انھیں کسی حالت میں بھی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جسے آزادی وطن کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہو۔ مسٹر جناح کا موجودہ رویہ انھیں اس پوزیشن کی طرف لے جارہا ہے۔

اگر فی الحال یہ تسلیم کرلیں کہ مسٹر جناح نے کانگریس وزارتوں کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ درست ہے تو ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ آٹھوں صوبوں کی گورنمنٹیں اینٹی مسلم تھیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی اور سوشل معاملات میں مداخلت کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے ان کے تمدن کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ صرف چند دن ہی نہیں ہوا بلکہ پورے ڈھائی سال تک۔ آخر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں نے ان ناممکن واقعات کے خلاف کیا کارروائی کی۔ یہی کہ وہ کانگریس وزارتوں کے ازخود استعفوں کا ۳۰ ماہ تک انتظار کرتے رہے اور جب ان کا یہ خواب ازخود پورا ہوگیا تو خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے لگے اور اسرائیل کی اولاد کی طرح دنیا پر واضح کرنے لگے کہ آخر کار ان کا یوم نجات آ ہی گیا۔ مسٹر جناح ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ عجیب ہی نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس رذیل نظریے کو برداشت کروں۔

میں نے پہلے بھی کئی بار اعلان کیا ہے اور اب بھی اپنی پوری ذمہ داری محسوس کرتا ہوں۔ کانگریس وزارتوں کے خلاف یہ تمام الزامات سراسر بے بنیاد ہیں۔ یہ دریغ گوئیوں کا ایک چشمہ ہیں اور یہ کہنا غلط بیانی ہے کہ کانگریس وزارتیں قطعی طور پر اینٹی مسلم تھیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی

سیاسی اور اقتصادی حقوق کو کچل رہی تھیں۔

مسٹر جناح یا کسی دوسرے شخص کے لیے جو یہ الزامات پیش کرے فرض ہے کہ وہ دنیا کے کسی ایک عام طریقہ کے مطابق انھیں ثابت بھی کرے، اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو ہر ایک ہوشمند انسان ان سے کم از کم اس قدر ضرور توقع کرے گا کہ وہ اپنی تحریر و تقریر میں ضبط سے کام لے گا۔

مسلمانوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ
یوم نجات کے تباہ کن اثرات

شائع کردہ: آزاد مسلم کانفرنس، ص ۷، ۸۔ لاہور

یوم نجات ۲۲؍دسمبر ۱۹۳۹ء کو منایا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے کلکتہ سے یہ بیان جاری کیا تھا جو ملک کے متعدد اخبارات میں شائع ہوا۔ سہ روزہ زم زم، لاہور میں ۲۵؍دسمبر کو شائع ہوا تھا۔'' آزاد مسلم کانفرنس لاہور'' نے ''مسلمانوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ (ص ۷، ۸) کے عنوان سے شائع ہونے والے ایک کتابچے میں چھاپا تھا۔'' کاروان احرار، جلد چہارم میں بھی یہ بیان شامل ہے۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ایک سیاسی مطالعہ

مرتبہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری